ذخیرۃ الجنان

فی

فہم القرآن

جلد اول

افادات

امام اہلسنت حضرت شیخ الحدیث والتفسیر
مولانا محمد سرفراز خان صفدر رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

جمع و ترتیب

مولانا محمد نواز بلوچ
فاضل مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ۔

ناشر
لقمان اللہ میر برادران
سیٹلائٹ ٹاؤن گوجرانوالہ

ذخیرۃ الجنان

فی

فہم القرآن

جلد 1 ⟸ حصہ 1، 2، 3

افادات

امام اہلسنت حضرت شیخ الحدیث والتفسیر

مولانا محمد سرفراز خان صفدر رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

نظر ثانی

مولانا علامہ زاہد الراشدی

شیخ الحدیث نصرۃ العلوم گوجرانوالہ۔

جمع و ترتیب

مولانا محمد نواز بلوچ

فاضل مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ۔

ناشر

لقمان اللہ میر برادران

سیٹلائٹ ٹاؤن گوجرانوالہ۔

باسمہ سبحانہ وتعالیٰ

من ابی الزاہد

الی جمیع اولادی واحبابی وتلامذتی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

راقم اثیم گکھڑ میں قرآن کریم و حدیث شریف
کا پنجابی میں جو درس دیتا رہا اس درس
قرآن کریم کا بڑی عرق ریزی کے ساتھ اردو میں ترجمہ
مولانا محمد نواز بلوچ صاحب نے کیا جسکی طباعت
کا انتظام الحاج میر محمد لقمان اللہ صاحب
نے اور ان کے بھائیوں نے کیا ہے راقم اثیم
طباعت کے جملہ حقوق انکو دیتا ہے تاہم اگر علمی
طور پر اصلاح کی ضرورت پڑے تو راقم اثیم
کے بچے مثلاً عزیزم زاہد اور عزیزم قارن سلمہما اللہ
تعالیٰ وغیرہ مشورہ دے سکتے ہیں باقی
سب حقوق طباعت جناب میر صاحب
کو دیدئے ہیں واللہ الموفق

ابو الزاہد محمد سرفراز عفی عنہ
۱۲ صفر ۱۴۲۳ھ
۲۸ اپریل ۲۰۰۲ء

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

روزانہ درسِ قرآن پاک

تفسیر

سُوۡرَةُ الۡفَاتِحَةِ مَكِّيَّةٌ
سُوۡرَةُ الۡبَقَرَةِ مَدَنِيَّةٌ

پارہ ⇐ الٓمّٓ ①

ناشر

لقمان اللہ میر برادران

سیٹلائٹ ٹاؤن گوجرانوالہ۔

نام کتاب .... ذخیرۃ الجنان فی فہم القرآن

جلد 1 ⟸ حصہ 1،2،3

افادات .... امام اہلسنت حضرت شیخ الحدیث والتفسیر مولانا محمد سرفراز خان صفدر رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

مرتب .... مولانا محمد نواز بلوچ، فاضل مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ۔

نظر ثانی .... مولانا علامہ زاہد الراشدی، شیخ الحدیث نصرۃ العلوم گوجرانوالہ۔

سرورق .... محمد خاور بٹ، گوجرانوالہ

طابع وناشر .... لقمان اللہ میر برادران، سیٹلائٹ ٹاؤن گوجرانوالہ۔

فون .... 0300 - 8741292
0321 - 8741292

قیمت ....

ضروری وضاحت

ایک مسلمان جان بوجھ کر قرآن مجید، احادیث رسول ﷺ اور دیگر دینی کتابوں میں غلطی کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا بھول کر ہونے والی غلطیوں کی تصحیح و اصلاح کے لیے بھی ہمارے ادارہ میں مستقل شعبہ قائم ہے اور کسی بھی کتاب کی طباعت کے دوران اغلاط کی تصحیح پر سب سے زیادہ توجہ اور عرق ریزی کی جاتی ہے۔ تاہم چونکہ یہ سب کام انسانوں کے ہاتھوں ہوتا ہے اس لیے پھر بھی غلطی کے رہ جانے کا امکان ہے۔ لہٰذا قارئین کرام سے گزارش ہے کہ اگر ایسی کوئی غلطی نظر آئے تو ادارہ کو مطلع فرما دیں تاکہ آئندہ ایڈیشن میں اس کی اصلاح ہو سکے۔ نیکی کے اس کام میں آپ کا تعاون صدقہ جاریہ ہوگا۔ (ادارہ)

فہرست عنوانات

ذخیرۃ الجنان فی فہم القرآن

(حصہ اوّل)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

پیش لفظ

نحمدہ تبارك وتعالیٰ ونصلّی ونسلّم علی رسوله الكريم وعلی اٰله واصحابه وازواجه واتباعه اجمعین۔

شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن دیوبندی قدس سرہ العزیز برصغیر پاک وہند وبنگلہ دیش کو فرنگی استعمار سے آزادی دلانے کی جدوجہد میں گرفتار ہو کر مالٹا جزیرے میں تقریباً ساڑھے تین سال نظر بند رہے اور رہائی کے بعد جب دیوبند واپس پہنچے تو انہوں نے اپنے زندگی بھر کے تجربات اور جدوجہد کا نچوڑ بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ میرے نزدیک مسلمانوں کے ادبار و زوال کے دو بڑے اسباب ہیں۔ ایک قرآن پاک سے دوری اور دوسرا باہمی اختلافات وتنازعات۔ اس لیے مسلم اُمہ کو دوبارہ اپنے پاؤں پر کھڑا کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ قرآن کریم کی تعلیم کو عام کیا جائے اور مسلمانوں میں باہمی اتحاد و مفاہمت کو فروغ دینے کے لیے محنت کی جائے۔

حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کا یہ بڑھاپے اور ضعف کا زمانہ تھا اور اس کے بعد جلد ہی وہ دنیا سے رخصت ہو گئے مگر ان کے تلامذہ اور خوشہ چینوں نے اس نصیحت کو پلے باندھا اور قرآن کریم کی تعلیمات کو عام مسلمانوں تک پہنچانے کے لیے نئے جذبہ و لگن کیساتھ مصروف عمل ہو گئے۔ اس سے قبل حکیم الامت حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ اور ان کے عظیم المرتبت فرزندوں حضرت شاہ عبد العزیز، حضرت شاہ عبد القادر اور حضرت شاہ رفیع الدین رحمہم اللہ نے قرآن کریم کے فارسی اور اردو میں تراجم اور تفسیریں کر کے اس خطہ کے مسلمانوں کو توجہ دلائی تھی کہ ان کا قرآن کریم کیساتھ فہم وشعور کا تعلق قائم ہونا ضروری ہے اور اس کے بغیر وہ کفر وضلالت کے حملوں اور گمراہ کن افکار ونظریات کی یلغار سے خود کو محفوظ نہیں رکھ سکتے۔

جب کہ حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کے تلامذہ اور خوشہ چینوں کی یہ جدوجہد بھی اسی کا تسلسل تھی بالخصوص پنجاب میں بدعات واوہام کے سراب کے پیچھے بھاگتے چلے جانے والے ضعیف العقیدہ مسلمانوں کو خرافات ورسوم کی دلدل سے نکال کر قرآن وسنت کی تعلیمات سے براہِ راست روشناس کرانا بڑا کٹھن مرحلہ تھا۔ لیکن اس کے لیے جن اربابِ عزیمت نے عزم وہمت سے کام لیا اور کسی مخالفت اور طعن وتشنیع کی پروا کیے بغیر قرآن کریم کو عام لوگوں کی زبان میں ترجمہ وتفسیر کے ساتھ پیش کرنے کا سلسلہ شروع کیا ان میں امام الموحدین حضرت مولانا حسین علی قدس سرہ العزیز آف واں بھچراں ضلع میانوالی، شیخ التفسیر حضرت مولانا احمد علی لاہوری قدس سرہ العزیز اور حافظ الحدیث حضرت مولانا محمد عبد اللہ درخواستی نور اللہ مرقدہ کے اسماء گرامی سرفہرست ہیں۔

جنہوں نے اس دور میں علاقائی زبانوں میں قرآن کریم کے ترجمہ وتفسیر سے عام مسلمانوں کو روشناس کرانے کی مہم شروع کی جب عام سطح پر اس کا تصور بھی موجود نہیں تھا۔ مگر ان اربابِ ہمت کے عزم واستقلال کا ثمرہ ہے کہ آج پنجاب کے طول وعرض میں قرآن کریم کے دروس کی محافل کو شمار کرنا بھی مشکل معلوم ہوتا ہے۔

اسی سلسلۃ الذہب کی ایک کڑی شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر دامت برکاتہم کی ذات گرامی بھی ہے۔ جنہوں نے ۱۹۴۳ء میں گکھڑ کی جامع مسجد بوہڑ والی میں صبح نماز کے بعد روزانہ درسِ قرآن کریم کا آغاز کیا اور جب تک صحت نے اجازت دی کم وبیش پچپن برس تک اس سلسلہ کو پوری پابندی کیساتھ جاری رکھا۔ انہیں حدیث میں شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمہ اللہ سے اور ترجمہ وتفسیر میں امام الموحدین حضرت مولانا حسین علی رحمہ اللہ سے شرف تلمذ واجازت حاصل ہے اور انہی کے اسلوب وطرز پر انہوں نے زندگی بھر اپنے تلامذہ اور خوشہ چینوں کو قرآن وحدیث کے علوم وتعلیمات سے بہرہ ور کرنے کی مسلسل محنت کی ہے۔

حضرت شیخ الحدیث مدظلہ کے درس قرآن کریم کے چار الگ الگ حلقے رہے ہیں ایک درس بالکل عوامی سطح کا تھا جو صبح نماز فجر کے بعد مسجد میں ٹھیٹھ پنجابی زبان میں ہوتا تھا۔ دوسرا حلقہ گورنمنٹ نارمل سکول گکھڑ میں جدید تعلیم یافتہ حضرات کے لئے تھا جو سالہا سال جاری رہا۔ تیسرا حلقہ مدرسہ نصرت العلوم گوجرانوالہ میں متوسطہ اور منتہی درجہ کے طلبہ کیلئے ہوتا تھا اور دو سال میں مکمل ہوتا تھا اور چوتھا مدرسہ نصرۃ العلوم میں ۷۶ء کے بعد شعبان اور رمضان کی تعطیلات کے دوران دورۂ تفسیر کی طرز پر تھا جو پچیس برس تک پابندی سے ہوتا رہا اور اس کا دورانیہ تقریباً ڈیڑھ ماہ کا ہوتا تھا۔ ان چار حلقہ ہائے درس کا اپنا اپنا رنگ تھا اور ہر درس میں مخاطبین کی ذہنی سطح اور فہم کے لحاظ سے قرآنی علوم ومعارف کے موتی ان کے دامن قلب وذہن میں منتقل ہوتے چلے جاتے تھے۔ ان چاروں حلقہ ہائے درس میں جن علماء کرام، طلبہ، جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں اور عام مسلمانوں نے حضرت شیخ الحدیث مدظلہ سے براہِ راست استفادہ کیا ہے ان کی تعداد ایک محتاط اندازے کے مطابق چالیس ہزار سے زائد بنتی ہے۔

﴿ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ﴾

ان میں عام لوگوں کے استفادہ کے لئے جامع مسجد گکھڑ والا درسِ قرآن کریم زیادہ تفصیلی اور عام فہم ہوتا تھا جس کے بارے میں متعدد حضرات نے خواہش کا اظہار کیا اور بعض دفعہ عملی کوشش کا آغاز بھی ہوا کہ اسے قلمبند کر کے شائع کیا جائے تا کہ زیادہ سے زیادہ لوگ اس سے مستفید ہو سکیں لیکن اس میں سب سے بڑی رکاوٹ یہ تھی کہ درس خالص پنجابی میں ہوتا تھا جو اگرچہ پورے کا پورا ٹیپ ریکارڈ کی مدد سے محفوظ ہو چکا ہے مگر اسے پنجابی سے اُردو میں منتقل کرنا سب سے کٹھن مرحلہ تھا اس لیے بہت سی خواہشیں بلکہ کوششیں اس مرحلہ پر آ کر دم توڑ گئیں۔

البتہ ہر کام کا قدرت کی طرف سے ایک وقت مقرر ہوتا ہے اور اس کی سعادت بھی قدرت خداوندی کی طرف سے طے شدہ ہوتی ہے۔ اس لئے تاخیر در تاخیر کے بعد یہ صورت سامنے آئی کہ اب مولانا محمد نواز بلوچ فاضل مدرسہ نصرۃ العلوم اور برادرم

محمد لقمان میر صاحب نے اس کام کا بیڑا اٹھایا ہے اور تمام تر مشکلات کے باوجود اس کا آغاز بھی کر دیا جس پر دونوں حضرات اور ان کے دیگر سب رفقاء نہ صرف حضرت شیخ الحدیث مدظلہ کے تلامذہ اور خوشہ چینوں بلکہ ہمارے پورے خاندان کی طرف سے بھی ہدیۂ تشکر و تبریک کے مستحق ہیں۔ خدا کرے کہ وہ اس فرضِ کفایہ کی سعادت کو تکمیل تک پہنچا سکیں اور ان کی یہ مبارک سعی قرآنی تعلیمات کے فروغ، حضرت شیخ الحدیث مدظلہ کے افادات کو زیادہ سے زیادہ عام کرنے اور اَن گنت لوگوں کی ہدایت کا ذریعہ بنے اور بارگاہِ ایزدی میں قبولیت سے سرفراز ہو۔ (آمین)

یہاں ایک امر کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ چونکہ یہ دروس کی کاپیاں ہیں اور درس وخطاب کا انداز تحریر سے مختلف ہوتا ہے اس لیے بعض جگہ تکرار نظر آئے گا جو درس کے لوازمات میں سے ہے۔ لہٰذا قارئین سے گزارش ہے کہ اس کو ملحوظ رکھا جائے اس کے ساتھ ہی ان دروس کے ذریعے محفوظ کرنے میں محمد اقبال آف دبئی اور محمد سرور منہاس آف گکھڑ کی مسلسل محنت کا تذکرہ بھی ضروری ہے جنہوں نے اس عظیم علمی ذخیرہ کو زیکارڈ کرنے کے لیے سالہا سال تک پابندی کیساتھ خدمت سر انجام دی، اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر سے نوازے۔ آمین یارب العالمین

ابوعمار زاہد الراشدی
خطیب جامع مسجد مرکزی، گوجرانوالا
یکم مارچ ۲۰۰۲ء

شیخ الحدیث والتفسیر

حضرت مولانا محمد سرفراز خان صاحب صفدر دامت برکاتہم

نَحمَدُہٗ و نصلّی و نسلّم علی رسولہ الکریم و علی اٰلِہٖ و اصحابہ اجمعین.

فرمانِ نبوی ﷺ "العلماء ورثۃ الانبیاء" کے مطابق تا قیام قیامت علمائے حق کی ایک ایسی جماعت کا وجود ضروری و ناگزیر ہے جو نسلِ انسانی کی اعتقادی اصلاح اور فکری نشوونما کے لیے جدوجہد کرتی رہے، اور انبیاء کرام علیہم السلام کی وراثتِ علمی کی تقسیم کے لیے اپنی تمام جسمانی توانائیاں اور علمی و فکری صلاحیتیں صَرف کردے، کیونکہ خاتم الانبیاء حضرت محمد رسول اللہ ﷺ پر سلسلۂ نبوت ختم ہونے کی بناء پر تمام تر تبلیغی ذمہ داریاں علمائے حق کے کندھوں پر ہیں، اور علماء حق نے اپنی ان شرعی اور ملی ذمہ داریوں کو کماحقہ نبھا کر امت مسلمہ پر جو احسانِ عظیم کیا ہے وہ تاریخِ اسلامی کا ایک روشن اور سنہری باب ہے۔ علماء حق کے اس مقدس قافلۂ علم و عمل کا یوں تو ہر فرد گوہر یکتا کی حیثیت رکھتا ہے، لیکن اس کاروانِ زہد و اتقا کے کچھ میر کارواں ایسے بھی گزرے ہیں جو دین و ملت کے لیے اپنی ذات میں انجمن و ادارہ تھے، ان کی تقریری و تحریری اور دینی و ملی خدمات اس قدر ہیں کہ ان کے پیشِ نظر بآسانی یہ فیصلہ کرنا محال ہے کہ یہ خدمات فرد کی ہیں یا جماعت کی۔

اس قافلہ علم و عمل اور کاروانِ زہد و اتقا کے ایک میر کارواں عصر حاضر کے جید عالم دین، فقیہ العصر محدثِ اعظم پاکستان، شیخ القرآن والحدیث حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر کی ذاتِ گرامی ہے۔ شیخ الحدیث صاحب کی شخصیت محتاجِ تعارف نہیں، کیونکہ ان کا شمار عصر حاضر کی ان نابغۂ روزگار ہستیوں میں ہوتا ہے۔ جن کے علم و عمل، زہد و تقویٰ، اور شرافت و دیانت پر بلاخوف و تردّد اعتماد کیا جاسکتا ہے بے لوث خدمات اور بے داغ کردار کی بناء پر وہ علمی، ادبی اور عوامی حلقوں میں یکساں طور پر ایک منفرد مقام رکھتے ہیں۔

پیدائش:

آپ ۱۹۱۴ء میں ضلع ہزارہ تحصیل مانسہرہ (موجودہ ضلع مانسہرہ) کی ایک غیر معروف بستی ڈھکی چیڑاں داخلی "کڑمنگ بالا" کے ایک متوسط گھرانہ میں جناب نور احمد خان بن گل احمد خان کے گھر پیدا ہوئے۔ قومیت کے اعتبار سے سواتی (پٹھان) ہیں۔ اس وقت غالباً کسی کو معلوم نہ تھا کہ یہ بچہ بڑا ہو کر عزم و استقلال کی چٹان بن کر خداوندانِ ظلم و استبداد کے سامنے سینہ سپر ہوگا۔ کسی کو خبر نہ تھی کہ یہ بچہ علم و عمل کا آفتاب بن کر سرزمین ہند و پاک کو اپنی روشن کرنوں سے منور کرے گا۔ کسی کو علم نہ تھا کہ اس بچہ کے سینہ میں قرآن و حدیث، فقہ و تفسیر اور علوم اسلامیہ کے ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر موجزن ہوں گے، اور ہزاروں انسان بالواسطہ یا

بلاواسطہ اس کے علم کے نور سے روشنی پائیں گے، لیکن تقدیر اس بچہ کے مستقبل پر رشک کر رہی تھی۔

ابتدائی تعلیم

آپ نے ابتدائی تعلیم گھر پر ہی حاصل کی، جو ناظرہ قرآن پاک اور سکول کی چند کلاسوں تک محدود تھی۔ اور گھر کے دیہاتی اور پہاڑی ماحول میں اس سے زیادہ تعلیم کا انتظام نہ تھا جس کی وجہ سے زیادہ تر وقت پہاڑی ماحول کے مطابق بھیڑ بکریاں چرانے میں گزرتا، لیکن آپ کے قلب وفکر میں تو فطرتاً اس تعلیم کے تصورات غالب تھے جس تعلیم کے ذریعے آپ نے انسانی افکار کی تسکین اور انسانی قلوب کی آبیاری کرنا تھی۔ انسانیت کو گمراہی کی تاریکیوں سے نجات دلا کر ہدایت کی روشنی سے منور کرنا تھا۔ نسل انسانی کو شرک و بدعات کی آلودگیوں سے پاک کر کے توحید وسنت کے پاکیزہ تصورات کی طرف اس کی راہنمائی کرنا تھی۔ معاشرہ کی رسوماتِ باطلہ کے خلاف علم بغاوت بلند کر کے اس کی جگہ اسلامی معاشرہ کے قیام کے لیے جدوجہد کرنا تھی اور خداوندانِ ظلم واستبداد کو عدل وانصاف کا پیغام دینا تھا۔

دینی تعلیم کے لیے سفر

بچپن میں ہی والدہ محترمہ اور والد محترم کا انتقال ہو گیا اور تعلیم میں آگے بڑھنے کا بظاہر کوئی امکان باقی نہ رہا تو کسی نیک دل بزرگ نے انہیں اور ان کے چھوٹے بھائی حضرت مولانا صوفی عبدالحمید سواتی کو دینی تعلیم کے لیے دینی مدرسہ کا رُخ کرنے کا مشورہ دیا اور آبائی گاؤں کے قریب قصبہ بفہ میں حضرت مولانا غلام غوث ہزاروی رحمۃ اللہ علیہ کے مدرسہ میں پہنچا دیا جہاں کچھ عرصہ تعلیم حاصل کرنے کے بعد سیالکوٹ، ملتان، کوئٹہ وغیرہ کے مدارس میں درسِ نظامی کی ابتدائی کتب کی تعلیم حاصل کی، لیکن دل ابھی ذوقِ تعلیم سے سیراب نہ ہوا، مزید تعلیم کے لیے گوجرانوالہ کی قدیم دینی درسگاہ مدرسہ انوار العلوم جامع مسجد شیرانوالہ باغ گوجرانوالہ میں داخلہ لیا اور حضرت مولانا عبدالقدیر رحمہ اللہ سے مزید تعلیم حاصل کی۔ آپ کا فرمان ہے کہ میرا تعلیمی ذوق وشوق اور علمی استعداد استادِ محترم حضرت مولانا عبدالقدیر صاحب رحمہ اللہ کی خصوصی شفقت اور توجہ کی مرہونِ منت ہے اور اکثر و بیشتر کتب آپ نے مولانا عبدالقدیر صاحب رحمہ اللہ سے ہی پڑھیں۔ مولانا رحمہ اللہ کی ایک خصوصی شفقت آپ پر یہ بھی تھی کہ طالب علمی کے زمانہ میں ہی جو کتب پڑھائیں وہ اپنی نگرانی میں آپ سے طلباء کو پڑھواتے یعنی مہربان اُستاد کی شفقت و توجہ اور خصوصی نگرانی میں قابل و ہونہار شاگرد اپنی علمی و فکری استعداد کی خصوصی نشوونما کے لیے تعلیم و تدریس کے ابتدائی مراحل یکساں طور پر طے کرتا رہا۔ مہربان اُستاد کی خصوصی توجہ کے اثرات جو آپ کی تدریسی زندگی میں مؤثر ہوئے ان کا اندازہ وہی شخص کر سکتا ہے جن کو ان حالات سے واسطہ پڑا ہو۔ اس لیے جب بھی حضرت مولانا عبدالقدیر صاحب رحمہ اللہ آپ کے پاس تشریف لاتے تو آپ اپنے تمام معمولات (جن کو عام حالات میں ترک کرنا تقریباً ناممکن ہوتا تھا) ترک کر کے ہمہ وقت اُستادِ محترم کی خدمت میں مصروف رہتے۔

آپ کے برادرِ خورد حضرت مولانا صوفی عبدالحمید صاحب سواتی مدظلہ (مہتمم و بانی مدرسہ نصرت العلوم گوجرانوالہ) بھی آپ کے ساتھ زیر تعلیم تھے لیکن اسباق میں آپ سے دو سال پیچھے تھے۔ آپ نے تکمیل کے لیے عالم اسلام کی شہرۂ آفاق یونیورسٹی دارالعلوم دیوبند جانا تھا لیکن شوق تھا کہ دونوں بھائی اکٹھے تکمیل کریں چنانچہ اس شوق میں تکمیل یعنی دورۂ حدیث کو دو سال کے لیے مؤخر کر دیا۔ اور اسی دوران استاد محترم کے حکم و شفقت کی تعمیل میں مدرسہ انوار العلوم گوجرانوالہ ہی میں استادِ محترم کی زیر نگرانی تدریس کے فرائض سرانجام دیتے رہے۔ اور پھر ۱۹۴۰ء میں تکمیل کے لیے دارالعلوم دیوبند تشریف لے گئے جہاں آپ نے شیخ الاسلام والمسلمین حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی نور اللہ مرقدہٗ سے ۱۹۴۱ء میں سندِ فراغت حاصل کی۔ قیامِ دارالعلوم دیوبند کے دوران آپ نے جن اساتذہ سے تعلیم حاصل کی ان میں شیخ الادب حضرت مولانا اعزاز علی، مولانا محمد ابراہیم بلیاوی اور مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ وغیرہم کے اسماء گرامی نمایاں ہیں۔

سیرت وصورت کے خدّوخال

وسعتِ مطالعہ، ذہانت و فطانت اور فکر و تدبّر کے اعتبار سے بے مثل، ظاہر و باطن میں یکساں، سنجیدگی ان کی خوبی، علم ان کا کمال، عمل ان کا جمال، شرافت ان کا وقار اور سادگی ان کا شعار، گفتار اور کردار کی پختگی ان کے اسلامی افکار کی ترجمان ہے، لباس میں سادگی، انداز میں اپنائیت، چہرے پر نورانیت، افکار میں بلندی، آواز میں پستی، گفتگو میں ٹھہراؤ اراددں میں سختی اور عزم میں پختگی کسی دیکھنے والے کو متاثر کیے بغیر نہیں رہتی، کلام و طعام، نشست و برخاست اور سیرت وصورت میں دیکھنے والے کو سنت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جھلک نظر آتی ہے۔ زندگی عاجزانہ، چال باوقار، مزاج عارفانہ انداز ناصحانہ اور کلام عالمانہ سننے والے کی دل کی گہرائیوں میں اُترتا چلا جاتا ہے مضبوط بدن کی طرح عزم بھی قوی، بڑھاپے میں بھی ارادے جوان اور اس پر بیماریوں کا سیل رواں لیکن کوئی چیز ان کے عزم واستقلال کی راہ میں رکاوٹ نہ بن سکی۔

روحانی سلسلہ

علمی وفکری صلاحیتیں اور قابلیتیں اپنے مقام پر لیکن واردات نفسانی اور وساوس شیطانی سے پوری طرح تحفظ حاصل کرنے کے لیے کسی مرشد کامل کے دامان محبت وعقیدت سے وابستگی ضروری وناگزیر ہے۔ جید ومستند اساتذہ سے تحصیل وتکمیل کے بعد آپ کو کسی مرشد کامل کی تلاش ہوئی جس کے ہاتھوں میں ہاتھ دے کر وہ اپنے لیے روحانی تسکین کا سامان فراہم کر سکیں۔ انہی دنوں پنجاب میں رئیس الموحدین، سرتاج المفسرین حضرت مولانا حسین علی صاحب نور اللہ مرقدہ، (واں بھچراں ضلع میانوالی) کے دورۂ قرآن کا غلغلہ مچا ہوا تھا اور ہزاروں شائقین علوم قرآنیہ اپنی پیاس بجھانے کے لیے اس دورۂ تفسیر قرآن میں شرکت کرتے۔ آپ بھی یہی شوق لے کر ان کے دورۂ تفسیر قرآن میں شرکت کے لیے تشریف لے گئے اور دیدہ ودل ان کی اتباع سنت میں ڈوبی ہوئی زندگی پر نچھاور وقربان کر کے چلے آئے۔ نقشبندی سلسلہ میں ان سے بیعت کی۔ مرشد کامل نے بھی

اپنی ایمانی فراست سے اس جوہر قابل کو پہچاننے میں تاخیر نہ کی۔ اور خلعت خلافت سے سرفراز فرمایا۔

مرشد کامل کے ساتھ آپ کے انتہائی قلبی تعلق و محبت کا اندازہ اس وقت ہوتا ہے جب سبق کے دوران مرشد کامل کا نام آجائے آپ انتہائی عقیدت و محبت کے ساتھ مرشد کامل کا تذکرہ فرماتے ہیں، یعنی ہمارے حضرت نے یہ فرمایا، ہمارے حضرت نے اس کی تفسیر اس طرح کی، ہمارے حضرت نے اس کا ربط اس طرح بیان کیا، غرضیکہ آپ کے الفاظ اور انداز میں مرشد کامل کے ساتھ جس سچی اور والہانہ عقیدت کا اظہار نمایاں ہوتا ہے ان سے سننے والا با آسانی آپ کی دلی کفیت کا اندازہ کرسکتا ہے۔

معمولات

وہ کون سے معمولات ہیں جن میں استقامت آپ کا طرۂ امتیاز رہی ہے۔ رات کو نماز عشاء کے بعد جلدی سو جانا آپ کا معمول ہے۔ اگر گھر میں موجود ہوں اور کوئی مجبوری (مہمان وغیرہ کی) نہ ہو تو اس معمول میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی صبح تہجد کے لیے بیدار ہونا، اذان کے بعد نماز سے پہلے ناشتہ کر لینا۔ نماز پڑھانے کے لیے مسجد میں جانا، درس دینا اور درس سے فارغ ہو کر اسباق پڑھانے کے لیے گوجرانوالہ چلے جانا، اسباق سے فارغ ہو کر دوپہر کے وقت واپس آنا، کھانا کھا کر قیلولہ کرنا، ظہر کی نماز پڑھا کر بچیوں کو اسباق پڑھانا جو وقتاً فوقتاً آپ کے زیر درس رہتی تھیں اور گکھڑ کی بہت سی بچیوں نے آپ سے براہِ راست درسِ نظامی کے مختلف اسباق اس طرح پڑھے ہیں۔ مہمانوں کے پاس بیٹھنا اور تصنیفی کام کرنا، عصر کی نماز کے بعد اپنی (قرآن پاک کی) منزل پڑھنا، تصنیفی کام کرنا اور مقامی تعویذ کرانے والوں کے لیے تعویذ کرنا۔ نماز مغرب کے بعد کھانا کھانا اور تعویذ وغیرہ کرنا، نماز عشاء کے بعد آرام کرنا۔

جب تک صحت نے اجازت دی معمولات کا یہ تسلسل قائم رہا اور جوں جوں عمر، ضعف اور علالت میں اضافہ ہوتا گیا بتدریج ان معمولات کا متاثر ہونا بھی فطری بات تھی۔

پابندی وقت

آپ کی پابندی وقت ضرب المثل رہی ہے۔ نماز کے مقررہ وقت سے ایک منٹ پہلے مسجد میں موجود ہوتے۔ امامت کے فرائض خود سرانجام دیتے۔ درس کے لیے نصف گھنٹہ مقرر ہے اس میں ایک منٹ کی بھی کمی بیشی نہیں ہوتی تھی۔ اسباق میں بھی پابندی وقت کا پورا لحاظ ہوتا۔ پابندی وقت پر آپ ایک لطیفہ سنایا کرتے ہیں کہ استاذ محترم حضرت مولانا مفتی عبدالواحد رحمہ اللہ نے ایک دفعہ مجھے جامع مسجد شیرانوالہ باغ گوجرانوالہ میں درس دینے کا حکم فرمایا میں ان کے حکم پر درس دینے کے لیے چلا گیا۔ آدھا گھنٹہ درس دیتا رہا۔ جو مضمون میں نے شروع کیا تھا وہ وقت سے دو منٹ پہلے ختم ہو گیا، لہٰذا میں نے درس ختم کر دیا۔ ایک آدمی فوراً بولا کہ ابھی وقت ختم ہونے میں دو منٹ باقی ہیں میں نے یہ سوچ کر کہ انہیں دین کا کافی شوق ہے ان کے اصرار پر دوسرا موضوع شروع کر دیا، جب وقت سے دو منٹ اوپر ہو گئے تو پھر وہ آدمی بولا کہ دو منٹ اوپر ہو گئے ہیں، اس سے

حضرت شیخ مدظلہ کی پابندئ وقت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

ایفائے عہد

تبلیغی پروگراموں کے سلسلہ میں آپ پابندئ وقت اور ایفائے عہد کا پورا پورا اہتمام کرتے اور حتی الوسع کوشش کرتے کہ وعدہ کے مطابق پروگرام پر پہنچیں۔ اور اس کے لیے طوفانِ باد و باراں بھی آپ کی راہ میں رکاوٹ نہیں بن سکتا تھا۔ ضلع گوجرانوالہ میں منڈیالہ تیگہ اور فیروز والہ سے آگے کوٹلی ناگرہ ایک بستی ہے جہاں عرصۂ دراز سے مدرسہ تعلیم القرآن قائم ہے۔ اور قاری محمد عبداللہ صاحب مدرس مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ ایک عرصہ تک وہاں فی سبیل اللہ تدریس کی خدمات سرانجام دیتے رہے ہیں انہی کے زیر اہتمام وہاں تبلیغی جلسے بھی ہوتے تھے۔ وہ ایک واقعہ سناتے ہیں کہ ہمارے ہاں تبلیغی جلسہ تھا اور حضرت شیخ الحدیث (مولانا محمد سرفراز خاں صفدر) دامت برکاتہٗ نے تشریف لانا تھا۔ اتفاق ایسا ہوا کہ نمازِ عصر سے قبل تیز بارش شروع ہو گئی۔ بارش کی وجہ سے کوٹلی ناگرہ دوسری بستیوں سے تقریباً کٹ جاتا تھا۔ اب تو کسی حد تک کچا راستہ موجود ہے۔ پہلے یہ بھی نہ تھا۔ مغرب کے بعد قریبی بستیوں سے حضرت شیخ الحدیث صاحب کے عقیدت و محبت میں ڈوبے ہوئے دِیوانے و پروانے موسم کی خرابی کے باوجود سینکڑوں کی تعداد میں اکٹھے ہو گئے۔ بارش اگرچہ مغرب سے پہلے ختم ہو چکی تھی لیکن راستے بند ہونے کی وجہ سے حضرت شیخ الحدیث صاحب کے آنے کی امید ہرگز نہ تھی لیکن جب مغرب کے بعد بیرونی مہمانوں کو جو مختلف دیہاتوں سے آئے تھے۔ کھانا کھلانے سے فارغ ہوئے تو اچانک دیکھا کہ حضرت شیخ الحدیث صاحب شلوار گھٹنوں تک اٹھائے۔ کیچڑ میں بھرے ہوئے مسجد کے دروازے سے اندر داخل ہو گئے، ہمیں بڑی حیرت ہوئی۔ تو ان سے معلوم ہوا کہ منڈیالہ تیگہ سے پیدل چل کے آیا ہوں۔ اور منڈیالہ تیگہ سے کوٹلی ناگرہ کا فاصلہ تین میل ہے۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ایفائے عہد اور تبلیغی خدمات کا شوق آپ کے دل میں کس قدر ہے۔

آپ پر پابندیاں

آپ کی تقریر انتہائی اصلاحی اور مؤثر ہوتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود دیگر علماء کی طرح آپ پر بھی مختلف اضلاع میں داخلہ پر پابندیاں عائد ہوتی رہی ہیں اور داخلہ بند کر دیا جاتا رہا ہے۔ چنانچہ دورِ آمریت میں ضلع ہزارہ میں آپ کے داخلہ پر پابندی عائد ہو گئی۔ ضلع ہزارہ آپ کا آبائی علاقہ ہے۔ آپ کو پابندی کے بارے میں معلوم نہ ہو سکا۔ آپ جب راولپنڈی کراس کر گئے تو مختلف مقامات پر آپ کی تلاش کے لیے پولیس بس کی تلاشی لینے لگی لیکن اتفاق سے ناواقف ہونے کی وجہ سے پولیس آپ کو شناخت نہ کر سکی۔ اور آپ اپنے مقام پر پہنچ گئے۔ وہاں ساتھیوں کے مشورہ پر آپ نے اصل نام کی بجائے "کڑمنگ اُستاذ" کے نام سے تقریر فرمائی، کڑمنگ آپ کا آبائی گاؤں ہے۔ اس کے علاوہ بھی متعدد شہروں میں وقتاً فوقتاً آپ کا داخلہ بند ہوتا رہا۔

دیانت

آپ کی دیانت وامانت اپنوں اور غیروں کے ہاں مسلم ہے شدید تر اختلافات کے باوجود آج تک آپ کی دیانت پر کوئی حرف گیری نہیں کر سکا۔ آپ کی دیانت داری کا یہ عالم ہے کہ ایک دفعہ جامعہ رشیدہ ساہیوال کے سالانہ جلسہ میں شرکت کے لیے تشریف لے گئے اور واپسی پر انھوں نے آپ کو کرایہ کے لیے ایک لفافہ ہاتھ میں تھما دیا۔ آپ نے لفافہ اسی طرح جیب میں رکھ لیا۔ کیونکہ آپ کا معمول ہے کہ آپ تبلیغی سلسلہ میں کرایہ وغیرہ طلب نہیں کرتے اگر وہ خود دے دیں تو لے لیتے ہیں۔ جب واپسی پر آ کر اس لفافہ کو کھولا تو اس میں پانچ سو روپے تھے آپ کو بڑی حیرت ہوئی کہ ساہیوال کی آمد ورفت کا کرایہ (اس دور میں) پینتیس روپے سے زائد نہیں۔ انھوں نے پانچ سو روپے کیسے دے دیئے؟ فوراً اسی دن خط لکھ کر انھیں مطلع کیا کہ آپ نے غلطی سے پانچ سو روپے مجھے دیئے ہیں ان کی واپسی کی صورت کیا ہوگی۔ بذریعہ بنک ڈرافٹ بھیجوں یا بذریعہ منی آرڈر۔ چنانچہ ان کی طرف سے جواب موصول ہوا کہ واقعی ناظم صاحب نے غلطی سے پچاس کی بجائے پانچ سو روپے لفافہ میں بند کر دیئے ہیں۔ چنانچہ آپ نے ساڑھے چار سو روپے بذریعہ منی آرڈر فوراً واپس بھیج دیئے۔ اس واقعہ سے آپ کی دیانت کا اندازہ ہوتا ہے۔

گھریلو زندگی

آپ کی گھریلو زندگی بھی ایک نمونہ ہے۔ آپ نے دو شادیاں کیں دونوں بیویاں فوت ہو چکی ہیں۔ دونوں بیویوں کی زندگی تک ان کا اور ان کی اولاد کا کھانا پینا اور رہنا سہنا ایک جگہ رہا ہے۔ دونوں بیویوں اور ان کی اولاد کا باہمی اتحاد واتفاق آپ کی خصوصی توجہ اور گھریلو کنٹرول کی زندہ مثال ہے۔ دونوں بیویوں اور ان کی اولاد کے ساتھ آپ کا مساویانہ حُسنِ سلوک ضرب المثل ہے۔

آپ کی اولاد

دونوں بیویوں سے آپ کے نو بیٹے اور تین بیٹیاں ہیں۔ تین بیٹے (عبدالکریم، عبدالرشید، اور راشد) بچپن میں ہی وفات پا گئے۔ بڑی اہلیہ سے تین لڑکے اور دو لڑکیاں ہیں جبکہ چھوٹی اہلیہ سے چھ لڑکے اور ایک لڑکی ہے۔ آپ کی تمام بیٹیوں اور بیٹوں نے قرآن کریم حفظ کیا ہے ان میں اکثر باضابطہ عالم دین ہیں اور دینی خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔

اولاد کی تربیت

اولاد کی تعلیم وتربیت میں بھی آپ نے اخلاقی وشرعی تمام ذمہ داریوں کو کما حقہ، پورا کیا ہے۔ دنیوی تعلیم صرف ضروری حد تک دلوائی ہے۔ صرف دینی تعلیم کی طرف توجہ دی ہے۔ اسی طرح اب تک آپ کے بیٹے (۱) مولانا زاہد الراشدی (۲) مولانا عبدالقدوس قارن (۳) مولانا عبدالحق خان بشیر (۴) مولانا شرف الدین حامد (۵) مولانا رشید الحق خان عابد (۶) مولانا عزیز الرحمٰن خان شاہد (۷) مولانا منہاج الحق خان راشد درسِ نظامی کے فاضل ہیں اور تدریسی خدمات میں مصروف

ہیں جب کہ قاری محمد اشرف خان اور قاری عنایت الوہاب خان ساجد حافظ وقاری ہیں اور قاری ماجد مرحوم ایک عرصہ تک جامع مسجد گکھڑ میں قرآن پاک کی تعلیم دیتے رہے ہیں ان کے علاوہ حضرت مدظلہ کی تینوں بیٹیاں قرآن کریم کی حافظہ ہیں اور قرآن کریم کی تعلیم دیتی ہیں منجھلی صاحبزادی جہلم کے قاری مولانا خبیب احمد عمر کی اہلیہ ہیں اور جامعہ حنفیہ تعلیم الاسلام کے شعبہ بنات میں دورۂ حدیث کے اسباق پڑھاتی ہیں۔

علمی ودینی خدمات

مولانا نے محض اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے صرف احیائے دین کی غرض سے متعدد کتابیں تحریر کی ہیں جو بحمد اللہ کئی بار طبع ہو چکی ہیں اور خواص وعام نے ان سے خوب استفادہ کیا ہے۔ اور ان میں درج ٹھوس اور واضح دلائل اور معقول پیراہن اور صریح عقلی ونقلی حوالوں کی بہت ہی زیادہ قدر کی گئی ہے۔ اور ان کے معرض وجود میں آنے کو بے حد سراہا گیا ہے، اور قدردان حضرات نے خوب داد تحسین دی ہے۔ مگر کچھ حضرات کو ان سے بے حد کوفت ہوتی ہے اور ان سے خاصے سیخ پا ہوتے ہیں۔ ان مدلل کتابوں سے ان کا پریشان ہونا ایک نفسیاتی امر ہے اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شریعت حقہ سے شرک وبدعت اور رسم ورواج کے دبیز پردے دور ہو جائیں۔ دین اسلام اپنی اصلی شکل میں لوگوں کے سامنے اُجاگر ہو جائے اور محفوظ ہو جائے جس پر کار بند ہو کر دونوں جہانوں میں سرخرو ہو جائیں تو یہ ہمارے لیے سب سے بڑی سعادت ہے آخر بدعات ورسومات کی شب ظلمت اور تاریکی کب تک فضا پر چھائی رہے گی؟ حکمت خداوندی کے تحت آخر آفتاب ہدایت کا ظہور بھی تو ایک فطری امر ہے۔

شب گریزاں ہو گی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہو گا نغمۂ توحید سے

امامت وخطابت

دارالعلوم دیوبند سے سند فراغت حاصل کرنے کے بعد آپ گوجرانولہ تشریف لے آئے۔ اور استاذ محترم کے حکم سے انہی کی نگرانی میں تدریس شروع کر دی۔ آپ کی علمی شہرت کا چرچا سن کر گکھڑ منڈی (ضلع گوجرانوالہ تحصیل وزیر آباد) کے چند مخلص بزرگوں کی تحریک پر آپ گکھڑ تشریف لے آئے وہاں اپنی نئی علمی جدوجہد کا آغاز کیا اور جامع مسجد بوہڑ والی میں خطابت وامامت کے فرائض سنبھال لیے۔

گکھڑ منڈی میں اصلاح عوام کی جدوجہد

گکھڑ منڈی کی عمومی فضا اس وقت شرک وبدعت کی آلودگیوں کا شکار تھی۔ اور ہر طرف بدعات فاسدہ اور رسومات باطلہ کا دور دورہ تھا۔ پیشہ ور اور پیٹ پرست ملوانوں کی حکومت تھی ہر طرف گمراہی کے اندھیرے تھے اور عام آدمی کے لیے یہ حالت انتہائی مایوس کن تھی۔ لیکن اس مرد درویش نے کسی چیز کی پروا کیے بغیر اصلاح احوال کے لیے بے لوث جہدوجہد جاری رکھی۔

مسجد میں نماز فجر کے بعد درس قرآن پاک کا آغاز کیا۔عوام کے دینی رجحان کا عالم یہ تھا کہ ابتدا میں آپ کے درس قرآن میں صرف ایک آدمی بیٹھتا اور صرف ایک آدمی کے لیے آپ پورا درس دیتے اور اس درس کے لیے باقاعدہ تیاری کرتے۔بعض بزرگوں نے مشورہ دیا کہ جب لوگ درس میں نہیں بیٹھتے تو آپ اتنی محنت کیوں کرتے ہیں۔لیکن آپ کے سامنے چونکہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی زندگی کے استقلال کا کامل نمونہ موجود تھا۔اس لیے آپ نے یہ سلسلہ ترک نہ کیا۔اور درس قرآن دیتے رہے۔

درسِ قرآن کی مقبولیت

آپ کا یہ عزم واستقلال بالآخر رنگ لایا۔اور آپ کے درس قرآن کا چرچا ہونے لگا۔اور آہستہ آہستہ اس کی رونق بڑھنے لگی۔اور آپ نے معمول میں تبدیلی پیدا کر لی۔ہفتہ کے پہلے تین دن (ہفتہ، اتوار، پیر) درس قرآن اور آخری تین دن (منگل، بدھ، جمعرات) درسِ حدیث شروع کر دیا۔اور قرآن پاک کا کئی دفعہ درس مکمل کیا۔

حدیث کی چھ مستند کتب صحاح ستہ یعنی بخاری، مسلم، ترمذی، ابوداؤد، نسائی ابن ماجہ کا درس بھی مکمل کیا اور ان کے علاوہ مستدرک حاکم اور دیگر کئی کتب حدیث کا ترتیب کے ساتھ درس دیا۔ایک دور میں آپ کے درس میں حاضری تقریباً ایک سو کے قریب افراد کی ہوتی رہی ہے۔نماز فجر کے بعد آپ کا یہ درس قرآن وحدیث انتہائی مؤثر ثابت ہوا جس نے گکھڑ منڈی کے باشعور افراد میں دینی شعور کو پیدا کرنے میں بنیادی کردار ادا کیا۔اس کے علاوہ آپ کے خطبات جمعہ میں ہزاروں افراد شریک ہوتے۔

اندازِ بیان

آپ کے اندازِ بیان میں بے پناہ خوبیاں ہیں، اور اسی انداز بیان کی کشش اپنوں اور بیگانوں کو بے ساختہ آپ کے حلقۂ درس میں کھینچ لاتی ہے۔آپ کا طرز استدلال خالص علمی اور انداز بیان خالص عوامی ہوتا ہے۔گکھڑ منڈی میں آپ کی تقریر ہمیشہ پنجابی زبان میں ہوتی تھی۔اور دیگر علاقوں اور شہروں میں اُردو زبان میں۔علمی طور پر آپ کا طرزِ استدلال اس قدر مضبوط ہوتا ہے کہ پیش نظر مسئلہ کی تمام گرہیں کھلتی چلی جاتی ہیں مسئلہ پوری طرح سامعین کے ذہن میں بیٹھتا چلا جاتا ہے اور مسئلہ کا کوئی پہلو تشنہ و نامکمل نہیں رہتا۔سامع زیر بحث مسئلہ کے بارے میں مکمل طور پر تسلی وتشفی حاصل کر کے اُٹھتا ہے۔آپ کا انداز مقررانہ نہیں بلکہ واعظانہ اور ناصحانہ ہوتا ہے۔اور آپ کی کوشش ہوتی ہے کہ مجلس میں موجود کند ذہن سے کند ذہن آدمی بھی مسئلہ کی پوری حقیقت واصلیت کو جان لے۔اسی طرزِ بیان کی بناء پر آپ کے خطبات جمعہ اور مجالس میں دیہاتی عوام کی بھی کثیر تعداد موجود ہوتی تھی آپ کا بیان بھی تعمیری اور اصلاحی ہوتا۔تخریبی بیان سے آپ ہمیشہ گریز کرتے۔یہی وجہ ہے کہ آپ کے نظریاتی مخالفین بھی آپ کا بیان سننے کے لیے آپ کے خطبۂ جمعہ اور درس میں بکثرت شریک ہوتے تھے۔آپ کے بڑے بڑے مخالفین بھی تمام تر نظریاتی اختلافات کے باوجود آپ کی علمی حیثیت کو مسلم مانتے ہیں۔

تبلیغی خدمات

ملک کے مختلف حصوں میں دینی مدارس کی سالانہ تقریبات اور دیگر تبلیغی اجتماعات میں شرکت بھی فرماتے رہے ہیں۔ بڑی بڑی کانفرنسوں میں آپ کا خطاب بڑی توجہ اور شوق سے سنا جاتا تھا۔ عوام کے علاوہ علماء حضرات بھی آپ کے بیان کو بڑے شوق سے سنتے۔ موضوع کو اس کے تمام ضروری پہلوؤں سے نبھانا آپ کی خصوصیت ہے۔ آپ کے بیان میں فضولیات بالکل نہیں ہوتیں اور نہ موضوع سے ہٹ کر بات ہوتی ہے بلکہ موضوع سے متعلق دلائل و براہین سے مزین ایک ایک لفظ دل کی گہرائیوں میں اُترتا چلا جاتا ہے۔ اور موضوع کا ہر پہلو ذہن نشین ہوتا چلا جاتا ہے۔

ظرافت

طبیعت میں ظرافت کا عنصر بھی نمایاں ہے۔ تقاریر میں بسا اوقات ظرافت کا یہ عنصر سامعین کو بے حد محظوظ کرتا ہے۔ لیکن عام پیشہ ور مقررین کی طرح آپ کی ظرافت خلافِ حقیقت اور خلافِ واقعہ نہیں ہوتی۔ بلکہ اس ظرافت میں بھی آپ پورا مسئلہ سمجھا دیتے ہیں۔

ایک دفعہ جمعہ کی تقریر میں ایک شخص نے چٹ لکھی کہ جیب میں اگر تصویر ہو تو نماز ہوتی ہے یا نہیں۔ آپ نے ازراہ مزاح فرمایا کہ جس کو شبہ ہو وہ اپنی جیب میں سے وہ تمام نوٹ جن پر بانیٔ پاکستان کی تصویر ہے وہ مجھے دے دیں سامعین اس مزاح پر کافی محظوظ ہوئے اور مسئلہ بھی سمجھ آ گیا۔ پھر آپ نے مسئلہ کی وضاحت فرمائی کہ تصویر بنوانا۔ اپنے مقام پر بہت بڑا گناہ ہے۔ بغیر کسی عُذر اور مجبوری کے تصویر بنوانا جائز نہیں۔ مثلاً حج، پاسپورٹ، امتحان کے لیے شناختی کارڈ کے لیے بھی تصویر بنوانا مجبوری ہے۔ لیکن اگر کسی مجبوری کی وجہ سے تصویر جیب میں ہو اور سامنے نظر آتی ہو تو نماز ہو جاتی ہے۔

زیرِ تربیت اساتذہ کے لیے درسِ قرآن

گکھڑ منڈی میں زیرِ تربیت اساتذہ کے لیے عرصہ دراز سے ایک کالج قائم ہے جس کا نام پہلے گورنمنٹ ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ تھا۔ اور بعد میں اس کا نام تبدیل کر کے گورنمنٹ ایلیمنٹری آف دی ٹیچرز کالج رکھا گیا۔ جس میں پی۔ٹی۔سی۔ اور سی۔ٹی۔ اور ایس وی کی کلاسیں ہیں ان کلاسوں کے زیرِ تربیت اساتذہ کے لیے ۱۹۴۳ء میں کالج کے پرنسپل صاحب ملک عبدالحمید مرحوم نے اپنے دینی جذبہ اور مذہبی رجحان کی وجہ سے مستقل درسِ قرآن کا فیصلہ کیا۔ اور اس نیک مقصد کے لیے ان کی نظر انتخاب بھی آپ پر پڑی چنانچہ ان کی پُرخلوص تحریک پر آپ نے ۱۹۴۳ء میں درسِ قرآن کا سلسلہ شروع کیا۔ اگرچہ اس درس کا سلسلہ ملک عبدالحمید مرحوم کی ذاتی دلچسپی اور توجہ کا مرہونِ منت تھا۔ لیکن آپ کے عالمانہ طرزِ بیان اور محققانہ طرزِ استدلال کی وجہ سے اس درسِ قرآن کی خوب شہرت ہوئی۔ اور اس شہرت کی وجہ سے ملک عبدالحمید مرحوم کے بعد درس کا یہ سلسلہ مستقل جاری رہا۔ اگرچہ بعض متعصب پرنسپلوں نے مسلکی اختلاف کی بناء پر اپنے انتظامی دور میں اس سلسلہ درس کو روکنے کی کوشش کی لیکن وہ

اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے۔ اس درس قرآن کے سلسلہ میں جن پرنسپلوں نے پوری توجہ اور کوشش سے دلچسپی لی ان میں ملک عبدالحمید مرحوم کے علاوہ میاں عمرالدین اور میاں منیر احمد کے نام نمایاں ہیں۔

یہ زیر تربیت اساتذہ چونکہ فراغت کے بعد ملازمت کے سلسلہ میں ملک بھر کے تعلیمی اداروں میں پھیل جاتے ہیں اس لیے ملک بھر کے جن تعلیمی اداروں میں بھی اس درسِ قرآن میں شریک ہونے والے اساتذہ پہنچے وہیں وہیں اس درس کے حوالہ سے صاحب درس کی علمیت کا چرچا ہوتا چلا گیا۔ اور علمی حلقوں میں اس درسِ قرآن کو بے حد پذیرائی حاصل ہوئی۔ اس علمی شہرت کی بناء پر پرنسپل مرزا اشارعرف (لٹاں والی سرکار) نے محض مسلکی اختلاف کی بناء پر اس سلسلہ درس کو ختم کرنے کی بھرپور کوشش کی حالانکہ اس درسِ قرآن میں نہ تو آپ اختلافی مسائل پر معاندانہ انداز میں بحث کرتے ابتدائی دور میں صرف پندرہ روپے ملتے تھے۔ آخر میں پچاس اِس سے زیادہ نہیں ہوئے۔ آخر سالوں میں پرنسپل مذکور نے یہ بھی بند کر دیا اور کئی سال درس مفت ہوتا رہا۔ جب گھٹنوں کو تکلیف شروع ہوئی تو موقوف کر دیا اور یہ یاد رہے کہ یہ درس چالیس سال ہوتا رہا۔ آپ اس سے اندازہ کر سکتے ہیں کہ ان کی یہ خدمات سراسر رضائے الٰہی کے لیے تھیں۔ کوئی دنیوی مفاد ان کے پیشِ نظر نہیں تھا۔ اور پھر کالج آپ کے گھر سے تقریباً ایک میل دُور ہے اس چالیس سال کے عرصہ میں گرمیوں میں عصر کے بعد اور سردیوں میں عشاء کے بعد کا یہ درس ان کی مستقل مزاجی کی بین دلیل ہے جبکہ ان کے پاس سواری کا بھی کوئی انتظام نہیں ایک میل پیدل جانا اور ایک میل پیدل آنا محض درسِ قرآن کے لیے آپ کے خلوص اور للّٰہیت کا کھلا ثبوت ہے۔ جب تک جسمانی صحت نے اجازت دی۔ یہ سلسلہ جاری رہا مگر معذوری بڑھ جانے پر مجبوراً اسے منقطع کرنا پڑا۔

تدریسی خدمات

گکھڑ منڈی میں آپ نے ابتداءً ہی اپنے تعلیمی ذوق کے مطابق تدریس کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اس دوران بیس پچیس طلباء عموماً آپ کے زیر درس رہتے تھے۔

۱۳۷۴ھ/ ۱۹۵۴ء میں آپ کا تقرر مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ میں ہوا۔ اور اس وقت سے ۲۰۰۱ء تک وہاں مسلسل تدریس کے فرائض سرانجام دیتے رہے۔ درسِ نظامی کی کم و پیش سبھی کتابیں بار بار پڑھائیں اور خاص طور پر بخاری شریف، ترمذی شریف اور ترجمہ قرآن کریم مع تفسیر تو سالہا سال تک آپ کے زیر درس رہا۔

دورۂ تفسیر قرآن

۱۹۷۶ء میں بھٹو گورنمنٹ نے مدرسہ نصرۃ العلوم اور اس سے متصل جامع مسجد نور کو محکمہ اوقاف کی تحویل میں لینے کا فیصلہ کیا تو ارباب مدرسہ نے اس کے خلاف باقاعدہ احتجاجی تحریک کا اعلان کر دیا۔ چھ ماہ کی اس مسلسل تحریک میں تین سو کے قریب افراد گرفتار ہوئے جن میں آپ کے تین صاحبزادے مولانا زاہد الرشدی، مولانا عبدالقدوس قارن اور حافظ عبدالحق خان بشیر بھی

شامل ہیں۔اسی تحریک کے دوران مدرسہ کی سالانہ چھٹیاں ہوگئیں۔کسی بھی مدرسہ کی حفاظت کے لیے مدرسہ کے طلباء ایک مستحکم اور مضبوط قوت ہوتے ہیں سالانہ تعطیلات کی وجہ سے جب خالی مدرسہ پر جبری قبضہ کا اندیشہ پیدا ہوا تو دانشوران مدرسہ نے سالانہ تعطیلات کے دوران دورۂ تفسیر قرآن کا اعلان کردیا تاکہ ان سالانہ تعطیلات کے دوران بھی مدرسہ طلباء سے خالی نہ رہے۔ چنانچہ اس مجبوری کے تحت آپ نے دورۂ تفسیر کا آغاز فرمایا۔جسے بعد میں اس کی علمی اہمیت کی بناء پر مستقل طور پر جاری کردیا گیا جو کم وبیش پچیس برس جاری رہا اور اس میں ہر سال تقریباً تین سو سے پانچ سو تک طلباء شامل ہوتے رہے۔ان میں اکثر وبیشتر فارغ التحصیل علماء ہوتے تھے۔چونکہ یہ تقریباً دو ماہ کا مختصر کورس ہوتا تھا۔اس لیے اس میں جدید تعلیم یافتہ حضرات بھی بکثرت شامل ہوجاتے تھے آپ کا انداز تفسیر بعینہٖ اپنے شیخ حضرت مولانا حسین علی صاحب جیسا ہے۔ربط آیات اور ردشرک وبدعات کی جو اہمیت وانفرادیت آپ کے شیخ کا خاصا تھا وہی طرز یہاں بھی موجود تھا۔

تفسیر قرآن کی عصری ضرورت

یوں تو قرآن پاک کی بے شمار تفسیریں منظر عام پر آچکی ہیں۔لیکن آپ کا تفسیر قرآن کا منفرد انداز اس بات کا متقاضی ہے کہ اس طرز پر تفسیر قرآن لکھی جائے۔آپ اگر خود یہ کارنامہ سرانجام دیتے تو بہتر تھا۔کیونکہ آپ کے قلم میں خدا تعالیٰ نے بڑی تاثیر رکھی ہے۔لیکن مصروفیات کی وجہ سے ایسا نہ ہوسکا البتہ آپ کے فرزند مولانا عبدالقدوس قارن نے آپ کے ترجمہ قرآن کریم اور اس کی تفسیر کو ٹیپ ریکارڈر کی مدد سے محفوظ کرلیا اور اسے صفحۂ قرطاس پر منتقل کررہے ہیں حوالہ جات کے اصل ماخذ کی طرف رجوع کی وجہ سے تاخیر ہو رہی ہے۔مکمل ہونے پر یہ علمی تحفہ بھی قارئین کے سامنے آجائے گا۔

آپ کے فتاویٰ

فتویٰ نویسی ایک مستقل فن ہے جو اہم بھی ہے اور نازک بھی۔اگرچہ گزشتہ صدی میں فتویٰ نویسی کا قلمدان بہت سے ناتجربہ کار یا ناعاقبت اندیش ہاتھوں میں چلا گیا۔جس کی وجہ سے عرب وعجم کی پوری اُمت مسلمہ فتویٰ کفر وارتداد کے ثقیل پتھر کے نیچے کراہنے لگی۔فتویٰ نویسی انتہائی دشوار کام ہے جس میں مسئلہ کے تمام پہلوؤں پر نظر رکھ کر فتویٰ دینا ہوتا ہے۔حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی تحقیق کے مطابق اگر ایک لفظ کے سو معنی ہوں ایک اسلام کا اور ننانوے کفر کے تو اس لفظ کے استعمال کرنے والے پر اس وقت تک فتویٰ کفر نہیں دیا جاسکتا جب تک وہ اپنی مراد معنی کفر معین واضح نہ کردے فتویٰ نویسی میں تو حتی الامکان آدمی کو کفر سے بچانے کی کوشش کی جاتی ہے حتیٰ کہ یہ اصول ہے کہ اگر کسی نے ایسا جملہ استعمال کیا ہے جو بظاہر کفریہ ہے لیکن اس کی تاویل ہوسکتی ہے اس پر فتویٰ کفر نہ دیا جائے گا۔

فتویٰ نویسی جیسے دُشوار ترین کام میں بھی آپ کا قلم اپنے اکابر واسلاف کے نقش قدم میں راہ اعتدال سے نہیں ہٹا۔آپ مدرسہ نصرۃ العلوم میں صدر مفتی بھی رہے ہیں اور ملک بھر کے علمی وتحقیقی حلقوں میں آپ کے فتاویٰ کو خاص قدر ومنزلت اور اہمیت

حاصل ہے۔ ملک بھر کے بڑے بڑے مفتیانِ کرام بھی اپنے فتاویٰ پر آپ کے تائیدی وتصدیقی دستخط کروانے پر فخر محسوس کرتے ہیں اور ہزاروں کی تعداد میں فتاویٰ جاری ہو چکے ہیں۔ اگرچہ آپ کی دیگر مصروفیات کی بناء پر مدرسہ نے دو مفتی رکھے ہوئے ہیں لیکن بڑے بڑے اور اہم فتوے پھر بھی آپ کی طرف سے جاری ہوتے رہے ہیں۔

سیاست کے میدان میں

مزاجاً آپ اگرچہ سیاسی نہیں ہیں لیکن اپنے اکابرو اسلاف سے گہرے تعلق وربط کی بناء پر سیاست سے دلچسپی ضرور رکھتے ہیں۔

۱۹۴۰ء میں جب آپ دارالعلوم دیوبند میں زیر تعلیم تھے تو فرنگی دور تھا۔ تحریک آزادی عروج پر تھی۔ انگریزی حکومت نے آپ کے استاد محترم حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمہ اللہ کو گرفتار کر لیا۔ مولانا مدنی کی رہائی کے لیے دارالعلوم دیوبند کے طلباء کا جو پہلا احتجاجی جلوس نکالا گیا اس کی قیادت آپ نے کی۔ فراغت کے بعد تدریسی مشاغل کی وجہ سے آپ عملاً سیاست سے کنارہ کش رہے۔

۱۹۵۶ء میں جب جمعیت علماء اسلام کے دوسرے دور کا آغاز ہوا تو آپ بھی ملک میں اسلامی نظام کے نفاذ کی تحریک کے لیے جمعیت میں شامل ہو گئے اور عرصہ دراز تک جمعیت کے مرکزی مجلس شوریٰ کے رکن اور ضلع گوجرانوالہ کے امیر کی حیثیت سے خدمات سرانجام دیتے رہے۔

۱۹۶۸ء میں جمعیت کے وفد کے ساتھ مشرقی پاکستان (موجودہ بنگلہ دیش) کا دورہ کیا۔ ۱۹۷۰ء کے عام انتخابات میں خود تدریسی مصروفیات کی بناء پر حصہ نہ لیا۔ لیکن جمعیت کے منتخب کردہ امیدواروں کی تائید وحمایت میں بھرپور کردار ادا کیا۔ ۱۹۷۳ء کی تحریک سول نافرمانی (بحالی جمہوریت) میں گرفتاری کے لیے کارکن مہیا کرنے میں بھی آپ نے بھرپور کوشش کی۔ چنانچہ اس تحریک میں آپ کے خصوصی تلامذہ قاری محمد یوسف عثمانی اور قاری عبدالقدوس عابد نے گرفتاریاں پیش کیں اور ظلم وبربریت کا نشانہ بنے۔

۱۹۷۳ء کے سیلاب زدگان کے لیے جماعتی سطح پر آپ نے امدادی رقوم اور ضروریات زندگی کی اشیاء فراہم کیں۔

۱۹۷۴ء کی تحریک ختم نبوت میں بھی آپ نے مجلس عمل تحفظ ختم نبوت کے پلیٹ فارم پر خدمات سرانجام دیں۔

۱۹۷۵ء میں جمعیت علماء اسلام نے شیرانوالہ باغ گوجرانوالہ میں آل پاکستان نظام شریعت کانفرنس منعقد کرنے کا اعلان کیا تو بھٹو حکومت نے شیرانوالہ باغ میں کانفرنس کرنے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ جس کی وجہ سے یہ کانفرنس مدرسہ نصرت العلوم گوجرانوالہ میں منعقد ہوئی۔ حکومت نے سیاسی انتقام کے طور پر مدرسہ نصرت العلوم اور اس سے ملحقہ جامع مسجد نور کو اوقاف کی تحویل میں لینے کا اعلان کر دیا۔ اس وقت کے صوبائی وزیر اوقاف رانا محمد اقبال نے اپنی تمام سیاسی وحکومتی

سرگرمیاں اس مقصد کے لیے وقف کر دیں۔ ادھر جمعیت علماء اسلام نے شہر کے نوجوان سیاسی رہنما نوید انور نوید کی سربراہی میں ایکشن کمیٹی تشکیل دے دی اور باقاعدہ تحریک کا آغاز کر دیا۔ تین سو کے قریب افراد گرفتار ہوئے۔ اس تحریک میں بھی آپ نے پوری پوری سرپرستی کی اور آپ کے تین بیٹے مولانا زاہد الراشدی، مولانا عبدالقدوس قارن اور مولانا عبدالحق خان بشیر اس تحریک میں گرفتار ہوئے جو تقریباً چار ماہ تک ڈسٹرکٹ جیل گوجرانوالہ میں زیر حراست رہے۔ مجبوراً حکومت نے اپنا فیصلہ واپس لے لیا۔

۱۹۷۷ء کے عام انتخابات میں پاکستان پیپلز پارٹی کے مقابلہ کے لیے دینی وسیاسی جماعتوں پر مشتمل پاکستان قومی اتحاد کے نام سے نو جماعتی اتحاد معرض وجود میں آیا اور انتخابات میں دھاندلی کے بعد ان کے نتائج کو مسترد کرتے ہوئے تحریک نظام مصطفیٰ کا آغاز ہوا۔ اس تحریک میں بھی آپ نے بھرپور کردار ادا کیا اور ایک ماہ تک ڈسٹرکٹ جیل گوجرانوالہ میں گرفتار رہے۔ اس تحریک میں آپ کے صاحبزادہ حافظ عبدالحق خان بشیر بھی گرفتار ہوئے اور آپ کے ساتھ جیل میں رہے جبکہ آپ کے بڑے فرزند مولانا زاہد الراشدی نے پاکستان قومی اتحاد صوبہ پنجاب کے سیکرٹری جنرل کی حیثیت سے بھرپور کردار ادا کیا۔ ایک ماہ کیمپ جیل لاہور میں قید رہے اور جناب حمزہ، اقبال احمد خان مرحوم اور دیگر قائدین کے ساتھ مل کر صوبائی سطح پر تحریک کی قیادت کی۔

آپ کے استقلال کا ایمان افروز واقعہ

تحریک نظام مصطفیٰ کے دوران حسب معمول جب آپ جلوس کی قیادت کر رہے تھے آپ کی قیادت میں جلوس مسجد بوہڑ والی سے باہر نکلا تو فیڈرل سیکورٹی فورس (ایف۔ایس۔ایف) کے کمانڈر نے جلوس کو روکنے کی کوشش کی لیکن جلوس نہ رُکا۔ اس نے لکیر کھینچی اور اعلان کیا کہ اگر کسی نے یہ لکیر عبور کی تو گولی سے اُڑا دیا جائے گا۔ آپ نے انتہائی شان قلندری سے فرمایا:

"میں تریسٹھ برس کی مسنون عمر پوری کر چکا ہوں اور شہادت کی تمنا وآرزو رکھتا ہوں"۔

یہ کہتے ہوئے کمانڈر کی کھینچی ہوئی لکیر عبور کر گئے۔ اس مرد درویش کی شانِ قلندری کے سامنے فیڈرل سیکورٹی فورس کی گنیں اور رائفلیں ندامت سے جھک گئیں اور یہ مرد قلندر جلوس لے کر آگے بڑھ گیا۔

۱۹۵۳ء کی تحریک ختم نبوت

قادیانیت کے خلاف تحریک ختم نبوت میں بھی آپ نے مجاہدانہ کردار ادا کیا۔ ۱۹۵۳ء کی تحریک ختم نبوت میں دیگر علماء کی طرح آپ بھی گرفتار ہوئے اور ۹ ماہ تک سنٹرل جیل ملتان میں رہے۔ آپ کے برادر خورد مولانا صوفی عبدالحمید سواتی بھی اس تحریک میں چھ ماہ تک ڈسٹرکٹ جیل گوجرانوالہ میں گرفتار رہے۔ اس دوران آپ کو ملتان جیل میں زہر دینے کی کوشش بھی کی گئی جو کامیاب نہ ہو سکی۔

خواب میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا دیدار

اسی دوران جیل میں ہی رات کو خواب میں آپ کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا دیدار ہوا فرماتے ہیں کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ میں جیل میں ہی ہوں اور مجھے کسی نے اطلاع دی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام تیرے ساتھ ملاقات کے لیے تشریف لائے ہیں، میں پریشان ہوگیا کہ جیل میں میرے پاس ان کی خدمت کے لیے کوئی چیز نہیں ہے۔ میں نے دری پر بٹھایا اور عرض کی حضرت جیل میں اس وقت میرے پاس خدمت کے لیے کوئی اور چیز نہیں ہے۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں قہوہ بنالوں۔ آپ نے فرمایا فوراً بنالو کیونکہ میں نے جلدی جانا ہے اور دجال کو قتل کرنا ہے۔ میں نے جلدی سے قہوہ بنایا۔ آپ نے نوش فرمایا اور تیزی سے چلے گئے۔

تصنیفی کارنامے

تصنیف کے میدان میں بھی آپ کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ آپ کی تصانیف میں قاری کے لیے تمام دلچسپیوں کا سامان فراہم ہوتا ہے۔ اردو ادب کی چاشنی، دلائل و براہین کی بھرمار، ظرافت، انداز بیان میں شائستگی اور نفس مسئلہ کے ہر پہلو پر نظر آپ کی تصانیف کی انفرادی خصوصیات ہیں۔ اب تک ۶۰ کے قریب کتب تالیف فرما چکے ہیں جو علماء اور عوامی حلقوں میں بے حد مقبول ہیں۔

حضرت شیخ الحدیث صاحب نے مختلف موضوعات مثلاً ردِ بدعات، فاتحہ خلف الامام، سماع الموتی وغیرہ پر متعدد کتب تصنیف فرمائی ہیں جن کی تعداد تقریباً ساٹھ تک جا پہنچی ہے۔ ان کتب میں "راہ سنت" جو رد بدعات پر مفصل اور باحوالہ کتاب ہے اس کو اس قدر شہرت حاصل ہوئی کہ اس کے تقریباً پندرہ ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ اور مانگ بدستور جاری ہے۔ آپ کی کتابوں پر

① حضرت قاری محمد طیب رحمہ اللہ

② حضرت مولانا شمس الحق افغانی رحمہ اللہ

③ حضرت مولانا عبدالحق صاحب رحمہ اللہ

④ حضرت مولانا عبداللہ درخواستی رحمہ اللہ اور دیگر اکابر علماء دیوبند کی تصدیقات موجود ہیں۔

آپ کی کتابوں کا طرز و اسلوب یہ ہے کہ مدلل ہونے کے ساتھ ساتھ مسئلہ کے مخالف پہلو کر لے کر جوابات اس انداز سے دیئے جاتے ہیں کہ کتاب میں مناظرانہ رنگ نمایاں محسوس ہوتا ہے۔ راہ حق کا متلاشی آپ کی کتابوں کے مطالعہ کے بعد منزل کو پالیتا ہے۔ حضرت صاحب کی مشہور کتابیں یہ ہیں۔

(۱) راہِ سنت (۲) احسن الکلام (۳) گلدستۂ توحید (۴) تبرید النواظر (۵) باب جنت (۶) حکم الذکر بالجہر (۷) چالیس دعائیں (۸) طائفہ منصورہ (۹) تسکین الصدور (۱۰) سماع موتی (۱۱) مقام ابی حنیفہؒ (۱۲) تنقیدِ متین

(۱۳) ختم نبوّت قرآن وسنّت کی روشنی میں (۱۴) عمدۃ الاثاث (۱۵) تفریح الخواطر (۱۶) ارشادالشیعہ (۱۷) ازالۃ الریب (۱۸) اظہارالعیب (۱۹) اتمام البرہان فی ردّ توضیح البیان (حصہ اوّل) (۲۰) اتمام البرہان فی ردّ توضیح البیان (حصہ دوم) (۲۱) اتمام البرہان فی ردّ توضیح البیان (حصہ سوم) (۲۲) اتمام البرہان فی ردّ توضیح البیان (حصہ چہارم) (۲۳) ملاعلی قاری اور مسئلہ علم غیب وحاضر وناظر (۲۴) الشہاب المبین (۲۵) المسلک المنصور (۲۶) عباراتِ اکابر (۲۷) بانیٔ دارالعلوم (۲۸) ضوء السراج (۲۹) عیسائیت کا پس منظر (۳۰) الکلام المفید (۳۱) مسئلہ قربانی (۳۲) آئینہ محمدیؐ (۳۳) تبلیغ اسلام (۳۴) اخفاء الذکر (حصہ دوم) (۳۵) راہِ ہدایت (۳۶) حلیۃ المسلمین (۳۷) دل کا سرور (۳۸) شوقِ حدیث (۳۹) صرف ایک اسلام (۴۰) انکارحدیث کے نتائج (۴۱) ینابیع ترجمہ رسالہ تراویح (۴۲) درود شریف پڑھنے کا شرعی طریقہ وغیرہ۔

درسِ قرآن کریم کے افادات

درس قرآن کریم کے حوالے سے حضرت شیخ الحدیث مدظلہ کے تین جداگانہ معمول رہے ہیں۔ایک درس وہ تھا جو جامع مسجد گکھڑ میں نماز فجر کے بعد روزانہ ہوتا تھا اور کئی بار مکمل ہوا۔دوسرا ترجمہ وتفسیر وہ ہے جو مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ میں روزانہ صبح اسباق کے آغاز سے قبل حضرت مدظلہ پڑھاتے رہے۔یہ درس دو سال میں مکمل ہوتا ہے۔اور کافیہ سے اُوپر کے تمام طلبہ کی حاضری اس میں ضروری ہوتی ہے جبکہ تیسرا درس قرآن وہ ہے جو مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ کی سالانہ تعطیلات کے دوران دورۂ تفسیر کے عنوان سے کم وبیش ربع صدی تک تسلسل کے ساتھ ہوتا رہا ہے۔

مدرسہ نصرۃ العلوم والے دونوں درس چونکہ علماء کرام اور طلبہ کے لیے ہوتے تھے اس لیے ان میں علمی مباحث زیادہ ہوتی تھیں جن سے علماء کرام اور منتہی طلبہ ہی صحیح معنوں میں استفادہ کر سکتے ہیں جب کہ گکھڑ والا درس عوام کے لیے ہوتا تھا جو زیادہ تفصیلی ہونے کے لیے ساتھ ساتھ عام فہم بھی تھا اور عام لوگوں کے لیے اس کی افادیت بھی بہت زیادہ ہے۔

بہت سے دوستوں نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ اس درس کو منضبط کر کے شائع کیا جائے تا کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو اس سے فیض یاب ہونے کا موقع ملے مگر اس میں اُلجھن یہ تھی کہ یہ درس پنجابی میں ہوتا تھا جو اگرچہ ٹیپ ریکارڈ کی مدد سے مکمل محفوظ ہو چکا ہے مگر اسے اُردو میں منتقل کرنے اور پھر زبان کا معیار قائم رکھتے ہوئے مفہوم کو ادا کرنے کا مرحلہ خاصا مشکل تھا اس لیے بہت سے احباب شدید خواہش اور تمنا کے باوجود اس سمت عملی پیش رفت نہ کر سکے۔

اب حضرت شیخ مدظلہ کے خصوصی تلمیذ ومرید مولانا محمد نواز بلوچ نے حضرت مدظلہ کے خادم خاص حاجی میر محمد لقمان کی توجہ اور اصرار سے اس کام کا بیڑا اٹھایا ہے، اور حضرت شیخ مدظلہ کے گکھڑ والے تفصیلی اور عوامی درسِ قرآن کریم کو کیسٹوں کی مدد

سے پنجابی سے اُردو میں منتقل کرنے کا کام شروع کیا ہے جس کا پہلا حصہ آپ کے سامنے ہے۔

مولانا محمد نواز بلوچ کا طریق کار یہ ہے کہ وہ مضمون کو پنجابی سے اُردو میں منتقل کرتے ہیں اور اس کے بعد حضرت شیخ الحدیث مدظلہ کے فرزند اکبر اور مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ کے شیخ الحدیث حضرت مولانا علامہ زاہد الرشدی صاحب اس پر نظر ثانی کرتے ہیں پھر اس کی کتابت ہوتی ہے اور دونوں حضرات باری باری اس کو دوبارہ مطالعہ کر کے چیک کرتے ہیں

اس کے باوجود ان حضرات کی طرف سے گزارش ہے کہ اگر کہیں کوئی غلطی یا جھول رہ گئی ہو تو اسے حضرت شیخ الحدیث مدظلہ کی طرف منسوب کرنے کی بجائے کاتبین کی کوتاہی پر محمول کیا جائے اور اس کی انہیں اطلاع دی جائے تاکہ اگلے ایڈیشن میں اس کی اصلاح کی جاسکے۔

قارئین سے درخواست ہے کہ حضرت شیخ الحدیث مدظلہ کے لیے مسلسل دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ انہیں صحت کاملہ عاجلہ سے نوازیں اور ان کا سایہ تادیر ہمارے سروں پر قائم رکھیں نیز یہ دعا بھی کریں کہ اللہ تعالیٰ درسِ قرآن کے ان افادات کو کتابی شکل میں پیش کرنے کی کوشش کرنے والے سب حضرات کی محنت کو قبول فرمائیں اور انہیں اس کی بحسن وخوبی تکمیل کی توفیق سے نوازیں تاکہ زیادہ سے زیادہ مسلمان بھائی حضرت شیخ دامت برکاتہم کے ان گراں قدر افادات سے فیض یاب ہوسکیں۔

آمین یَارَبَّ الْعٰلَمِیْنَ

حالاتِ واقعی

ختم قرآن کے موقع پر میں نے بتایا تھا کہ پاکستان بننے سے پانچ سال قبل جولائی ۱۹۴۳ء میں گکھڑ میں آیا اور ۱۰ جولائی ۱۹۴۳ء سے درسِ قرآن کریم شروع کیا۔ تین دن قرآن پاک کا درس ہوتا رہا اور تین دن حدیث شریف کا درس ہوتا رہا۔

الحمد للہ! درس سننے والوں نے قرآن کریم کے ساتھ ساتھ صحاح ستہ یعنی بخاری شریف، مسلم شریف، ترمذی شریف، نسائی شریف، ابن ماجہ شریف، ابوداؤد شریف کے علاوہ مستدرک حاکم کی چار جلدیں اور ابوداؤد طیالسی، ادب المفرد، الترغیب والترہیب اور جامع الصغیر بھی دروس میں سنیں۔ یہ سب حدیث کی کتابیں ہیں۔ میں ان احادیث کے الفاظ بھی باقاعدہ پڑھتا تھا تاکہ تمہارے کان آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے الفاظ کے ساتھ مانوس ہو جائیں۔

میں ڈائریاں تو نہیں دیکھ سکا مگر میرے خیال کے مطابق (کیونکہ حافظہ کمزور ہو گیا ہے اور اس عمر میں ہونا بھی چاہیے) یہ دسویں مرتبہ قرآن کریم درس میں ختم ہوا ہے۔ اگر قرآن کریم کے ساتھ حدیث کا درس نہ ہوتا تو اس سے زیادہ مرتبہ ختم ہو چکا ہوتا۔ ساتھی درس کی کیسٹ کر رہے ہیں اور کچھ درس کیسٹ سے رہ گئے ہیں۔ اس لیے یہ طے کیا ہے کہ دو دن تسلسل کے ساتھ درس ہوگا اور تیسرے دن جن جن آیات اور سورتوں کا درس کیسٹ سے رہ گیا ہے ان کا اعادہ ہوگا تاکہ قرآن کریم کا جو حصہ کیسٹوں سے رہ گیا وہ بھی درج ہو جائے۔

آج صرف قرآنِ کریم کے کچھ فضائل بیان کیے جائیں گے۔ قرآنِ کریم آسمانی کتابوں میں سے آخری کتاب ہے اور صرف قرآنِ کریم کو یہ شرف اور فخر حاصل ہے کہ اپنی اصلی شکل میں موجود ہے تو راۃ، انجیل، زبور بھی برحق ہیں اور باقی جتنے صحیفے نازل ہوئے ہیں تمام کے تمام برحق ہیں۔ اور ہمارا سب پر ایمان ہے مگر قرآن کریم کے علاوہ کوئی آسمانی کتاب اور صحیفہ اپنی اصلی شکل میں موجود نہیں ہے ان میں تحریف کر دی گئی ہے۔

قرآنِ کریم اپنی اصلی شکل وصورت میں محفوظ ہے اور قیامت تک محفوظ رہے گا اور جب تک دنیا میں قرآن کریم موجود ہے قیامت نہیں آئے گی۔ قیامت قائم ہونے سے پہلے ورقوں سے الفاظ صاف کر دیئے جائیں گے۔

رات کو لوگ قرآن پڑھ کر سوئیں گے صبح کو جب اٹھیں گے تو ورقے صاف ہوں گے اور حافظوں اور قاریوں کے سینوں سے بھی قرآنِ کریم نکال لیا جائے گا۔ یہ ان کی توہین کے لیے نہیں ہوگا بلکہ دنیا کے نظام کو سمیٹنے کے لیے ایسا کیا جائے گا۔ اور جب قیامت قائم ہوگی اس وقت دنیا میں اللہ، اللہ کہنے والا بھی کوئی نہیں ہوگا۔ اور ایک روایت میں ہے کہ لا الٰہ الا اللہ کہنے والا کوئی نہیں ہوگا۔

فَعَلٰى اُولٰٓئِكَ تُقَامُ السَّاعَةُ. "پس ان لوگوں پر قیامت برپا ہوگی۔"

بہر حال اس وقت آسمانی کتابوں میں صرف قرآنِ کریم اصلی حالت میں موجود اور محفوظ ہے۔ اس کے لفظوں کی بھی حفاظت ہوئی ہے۔ ترجمے کی بھی حفاظت ہوئی ہے۔ اس کی تفسیر کی بھی حفاظت ہوئی ہے۔ اور اس کے لب ولہجے کی بھی حفاظت ہوئی ہے۔ آخری پیغمبر کی امت نے جس طرح قرآنِ کریم کی حفاظت کی ہے اس طرح کوئی اُمت بھی اپنی کتاب کی حفاظت نہیں کرسکی۔ اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم بہترین اُمت ہو۔

اور قرآنِ کریم میں ہے ﴿كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ﴾ تمام امتوں میں سے تم بہتر اُمت ہو یہی وجہ ہے کہ قیامت والے دن سب سے پہلے اس اُمت کا حساب ہوگا۔ حالانکہ قاعدے اور دستور کے مطابق اس کا حساب آخر میں ہونا چاہیے کیونکہ آخر میں آئی ہے اور پل صراط سے سب سے پہلے یہ اُمت گزرے گی اور جنت میں بھی سب سے پہلے یہ اُمت داخل ہوگی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ترتیب یوں ہوگی جنت میں پہلا قدم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اور دوسرا قدم حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا ہوگا اور تیسرا قدم حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور چوتھا قدم حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا ہوگا اور پانچواں قدم حضرت علی رضی اللہ عنہ رکھیں گے۔ کیونکہ تمام پیغمبروں کے بعد ان کا مقام ہے۔ پھر باقی اُمت داخل ہوگی۔ اس اُمت کو آخری پیغمبر اور قرآنِ کریم سے تعلق کی وجہ سے یہ مقام عطا ہوا ہے۔

قرآنِ کریم بڑی عظیم کتاب ہے صحاح ستہ میں سے ابن ماجہ بھی حدیث کی کتاب ہے۔ ابن ماجہ میں روایت آئی ہے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے ابوذر! اگر تو صبح کو ایک آیت سیکھ لے اللہ تعالیٰ کی کتاب سے تو اس سے بہتر ہے کہ تو سو رکعت پڑھے اور اگر تو صبح کو ایک باب سیکھ لے علم کا اور عمل کرے یا نہ کرے تو ہزار رکعت پڑھنے سے بہتر ہے۔

یعنی ایک آدمی قرآنِ کریم کی ایک آیت سیکھتا ہے بغیر ترجمہ اور تفسیر کے اور ایک آدمی سو نفل پڑھتا ہے تو سو نفل پڑھنے والے سے ایک آیت کریمہ سیکھنے والے کی فضیلت زیادہ ہے۔ اسی طرح ایک آدمی ہزار نفل پڑھتا ہے اور ایک آدمی قرآنِ کریم کی ایک آیت ترجمہ اور تفسیر کے ساتھ پڑھتا ہے اس کی شان فضیلت اور ثواب ہزار رکعت نفل پڑھنے والے سے زیادہ ہے۔

مثلاً: ایک آدمی نے صحیح تلفظ کے ساتھ ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝﴾ پڑھنا سیکھا تو اس کا درجہ سو نفل پڑھنے والے سے زیادہ ہے۔ اور اس کا معنی اور تفسیر سمجھ لے تو اس کا درجہ ہزار رکعات نفل پڑھنے والے سے زیادہ ہے۔ ہزار رکعات پڑھنا کوئی آسان کام نہیں ہے مگر جس کو اللہ تعالیٰ توفیق عطا فرمائے۔

امام زین العابدین رحمۃ اللہ علیہ ایک رات میں ایک ہزار نفل پڑھا کرتے تھے۔ ورد وظیفے جتنے بھی ہیں اپنی اپنی جگہ تمام کے تمام برحق ہیں۔ مگر قرآنِ کری پڑھنے کا ثواب سب سے زیادہ ہے۔ اور ترتیب کے ساتھ تمام کا تمام قرآنِ کریم پڑھنا چاہیے۔

بعض مرد اور عورتیں اس بیماری میں مبتلا ہیں کہ انہوں نے پانچ سورتے رکھے ہوئے ہیں۔ وہ انھی پانچ سورتوں کو ہی

پڑھتے رہتے ہیں۔ اور بعض صرف سورۃ یٰسین کو ہی پڑھتے رہتے ہیں۔ بے شک یہ بھی قرآنِ کریم کا حصہ ہیں۔ مگر قرآنِ کریم سارا پڑھنا چاہیے۔ تھوڑا پڑھو زیادہ پڑھو، اوّل سے لے کر آخر تک پڑھو۔ اور قرآنِ کریم روزانہ پڑھنے کا معمول بناؤ۔ بلکہ آج کے دن سے عہد کرلو کہ ہم سے جتنا بھی ہو سکا پارہ، آدھ پارہ یا پاؤ، ہم روزانہ ضرور پڑھیں گے۔ باقی وہ سورتیں جو اپنے مطلب کے لیے پڑھتے ہو بے شک وہ بھی پڑھو ان کی افادیت سے انکار نہیں ہے۔

اور پڑھو بھی صحیح تلفظ کے ساتھ کہ معلوم ہو کہ عربی پڑھ رہا ہے۔ اور لوگ تلفظ کی طرف بہت کم توجہ دیتے ہیں۔ تلفظ اتنا تو ضرور ہو کہ پتہ چلے کہ عربی ہے یا پنجابی ہے۔ اسی طرح اذان اور تکبیر کا بھی تلفظ صحیح ہونا چاہیے۔ الفاظ صحیح ہوں اعراب صحیح ہوں، لہجہ صحیح ہو۔ اگرچہ اب تم قاری تو نہیں بن سکتے مگر کم از کم اتنا تو ہونا چاہیے کہ سننے والا سمجھ جائے کہ یہ عربی پڑھ رہا ہے پنجابی اور گرمکھی نہیں پڑھ رہا۔

مردوں کی طرح عورتیں بھی صحیح تلفظ کی طرف توجہ دیں۔ اس سلسلے میں پہلے تو خاصی دقت اور پریشانی ہوتی تھی۔ اب تو الحمدللہ ثم الحمدللہ قاری بھی آپ کے پاس موجود ہیں ان کے پاس جائیں اور تلفظ درست کریں۔

قرآنِ کریم کے کچھ آداب بھی سن لیں۔

① قرآنِ کریم کا پہلا ادب یہ ہے کہ قرآن شریف کے پڑھنے سے پہلے ﴿ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ﴾ پڑھنا ہے پھر قرآنِ کریم پڑھنا شروع کریں اور یہ ادب خود قرآنِ کریم میں مذکور ہے اللہ تعالیٰ کا ارشادِ گرامی ہے ﴿ فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ﴾ (النحل:۹۸) "اور جب تو پڑھے قرآن تو پناہ لے اللہ تعالیٰ کی شیطان مردود سے۔ کیونکہ آدمی جب نیکی کرنے لگتا ہے تو شیطان درمیان میں کود پڑتا ہے کہ یہ نیکی نہ کرے۔ اور وہ ہمیں نظر بھی نہیں آتا اور ہے بھی ہم سے طاقتور اور مضبوط اور رب تعالیٰ تو اسے دیکھ رہا ہے۔ لہٰذا رب تعالیٰ سے دعا کریں کہ اے پروردگار! تو مجھے اس کے شر سے محفوظ فرما۔ میں تیری پناہ چاہتا ہوں تو مجھے اس مردود کے شر سے اپنی پناہ میں رکھ تاکہ وہ میرے دل میں وسوسے نہ ڈالے اور انسان جب نیکی کرتا ہے تو شیطان بڑے وسوسے ڈالتا ہے وہ کام جو آپ کو پہلے اور پیچھے یاد نہیں آتے نماز میں اور قرآنِ کریم پڑھتے وقت وہ یاد آجاتے ہیں کہ میں نے فلاں کام بھی کرنا ہے فلاں کام بھی کرنا ہے۔ فلاں جگہ ضروری جانا ہے۔

حدیث پاک میں آتا ہے کہ شیطان آکر کہتا ہے ((اُذْكُرْ كَذَا، اُذْكُرْ كَذَا)) فلاں چیز یاد کر، فلاں چیز یاد کر۔

② قرآنِ کریم کا دوسرا ادب یہ ہے کہ ﴿ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴾ پڑھنی چاہیے۔ حدیث پاک میں آتا ہے: ((كُلُّ اَمْرٍ ذِيْ بَالٍ لَمْ يُبْدَءْ بِبِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ فَهُوَ اَقْطَعُ)) ہر ذیشان کام جو ﴿ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴾ سے شروع نہ کیا جائے تو وہ دُم کٹا ہوتا ہے، بے برکت ہوتا ہے۔

دیکھو! جانور کی دم کٹی ہوئی ہو تو وہ کیسا بُرا لگتا ہے۔ لہٰذا جب بھی کوئی اچھا اور جائز کام کرو تو اس سے پہلے بسم اللہ پڑھو ورنہ اس کام میں برکت نہیں ہوگی۔ مکمل ﴿ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴾ نہ پڑھے صرف ﴿ بِسْمِ اللّٰهِ ﴾ کہہ لے تو بھی

ٹھیک ہے۔ مگر ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ، شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ، امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ﴾ مکمل پڑھنی چاہیے۔ وضو کرنے سے پہلے، کھانا کھانے سے پہلے، پانی پینے سے پہلے وغیرہ۔

اور یاد رکھنا کہ برے اور ناجائز کام سے پہلے بسم اللہ نہیں پڑھنی چاہیے۔ فقہائے کرام رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص شراب پینے سے پہلے کہے ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ﴾ تو ایسا شخص کافر و مرتد ہو گیا اور اس کا نکاح ٹوٹ گیا۔ تو قرآنِ کریم کے آداب میں سے پہلا ادب ہے تعوذ پڑھنا اور دوسرا ادب ہے تسمیہ پڑھنا۔

③ اور قرآنِ کریم کے ادب میں سے یہ بھی ہے کہ بے وضو ہاتھ نہیں لگانا چاہیے۔ البتہ بغیر وضو کے زبانی پڑھ سکتا ہے۔ اس میں کسی کا کوئی اختلاف نہیں ہے۔ حیض کی حالت میں عورت قرآنِ کریم نہیں پڑھ سکتی اور مرد جنابت کی حالت میں نہیں پڑھ سکتا۔

حدیث پاک میں آتا ہے کہ ((لَا تَقْرَءُ الْحَائِضُ وَالْجُنُبُ شَیْئًا مِّنَ الْقُرْاٰنِ)) حائضہ اور جنبی قرآن میں سے کچھ نہ پڑھے البتہ اس حالت میں ذکر کر سکتے ہیں۔ ((سُبْحَانَ اللّٰهِ، اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ، اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ)) پڑھ سکتے ہیں۔ بشرطیکہ وہ وظیفے قرآن سے نہ ہوں۔

④ قرآنِ کریم کا جتنا ادب واحترام کیا جائے کم ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اس کو پست جگہ پر نہ رکھا جائے۔

⑤ اس کی طرف پیٹھ نہ کی جائے۔ قرآن سے بلند ہو کر نہ بیٹھا جائے۔

⑥ ایسے مدرسہ میں جہاں طلبہ کی تعداد زیادہ ہو اور جگہ کم ہو تو پڑھنے والے آگے پیچھے بیٹھ کر پڑھ سکتے ہیں، ایسی صورت میں اگر پیٹھ ہو جائے تو کوئی حرج نہیں کیونکہ مجبوری ہے۔

⑦ قرآن مجید کا پڑھنا اور سمجھنا کارِ ثواب ہے۔ اور یہ بھی یاد رکھنا کہ قرآن کو دیکھنا بھی ثواب ہے۔ ہاتھ لگانا بھی ثواب ہے۔

⑧ اس کے ورقوں کا پلٹنا بھی ثواب ہے۔ قرآن کریم میں تو ثواب کی گٹھڑیاں ہیں مگر ہم حاصل کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

⑨ جو لوگ قرآن کے ترجمہ میں شریک نہیں ہیں ویسے سننے کے لیے بیٹھ جاتے ہیں ان کو چاہیے کہ دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر نہ بیٹھیں۔ بعض لوگ اپنی سہولت کے لئے ایسا کرتے ہیں۔

⑩ اس طرح بچوں کو بھی درمیان میں نہ بیٹھنے دیں۔ وہ بے چارے کیا سمجھیں گے۔ اور آپ حضرات قرآن کریم کو سامنے رکھو اور غور سے سمجھو اس سے بڑی عبادت اور کوئی نہیں ہے۔

قرآنِ کریم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر اتارے جانے سے پہلے لوحِ محفوظ میں تھا اللہ تعالیٰ کے حکم سے رمضان المبارک کے مہینہ میں لیلۃ القدر کی رات کو سارے کا سارا قرآن کریم ایک دفعہ آسمانِ دنیا پر بیت العزت کے مقام پر اور اس کو بیت العظمت بھی کہتے ہیں اتارا گیا۔ ﴿اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةِ الْقَدْرِ ①﴾ میں اسی کا ذکر ہے۔ پھر بیت العزت اور بیت العظمت کے مقام سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر تیئس (۲۳) سال میں آہستہ آہستہ نازل ہوا۔

﴿ اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَۚ ﴾ سے لے کر ﴿ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْؕ ﴾ تک کی پانچ آیتیں غارِ حرام میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئیں۔ اور آخری آیت ﴿ اَلْیَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِیْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْكُمْ نِعْمَتِیْ وَ رَضِیْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًاؕ ﴾ ہجرت کے دسویں سال حجۃ الوداع کے موقع پر جمعہ کے دن عرفات کے میدان میں نازل ہوئی۔

تقریباً چھیاسی سورتیں مکہ مکرمہ میں نازل ہوئیں اور باقی سورتیں مدینہ منورہ میں نازل ہوئیں۔ قرآنِ کریم کے یہ بڑے بڑے آداب میں نے آپ کے سامنے بیان کئے ہیں۔

اصولِ تفسیر

قرآنِ کریم کی تفسیر کا قاعدہ یہ ہے کہ سب سے پہلے قرآن کریم کی تفسیر قرآن کریم سے ہوگی اور آپ حضرات کے علم میں ہے کہ جب کوئی مشکل آیت کریمہ آجاتی ہے تو میں آپ سے کہتا ہوں کہ فلاں صفحہ کی فلاں آیت کریمہ نکالو اور اس کے لیے ایک اصطلاح اور قاعدہ بھی سمجھ لیں۔ پہلے پارے کا آخری رکوع نکالو تاکہ یہ قاعدہ آسانی سے سمجھ آجائے۔

"عین" کا استعمال اور معنی

دیکھو! جہاں آخری رکوع ختم ہوتا ہے کنارے پر "ع" کی علامت ہے تو "ع" کا معنی جز اور حصہ ہے اس "ع" کے اوپر سولہ کا ہندسہ ہے اور اس کے پیٹ میں بارہ کا ہندسہ ہے اوپر والا ہندسہ سورۃ کے رکوع بتاتا ہے اور نیچے والا ہندسہ پارے کے رکوع بتاتا ہے کہ یہاں تک اتنے رکوع ہوگئے ہیں اور پیٹ والا ہندسہ یہ بتاتا ہے کہ اس رکوع میں اتنی آیتیں ہیں۔ لہٰذا اس "ع" کا اوپر والا سولہ کا ہندسہ بتارہا ہے کہ یہاں تک سورۃ کے سولہ رکوع ہوگئے ہیں۔ اور نیچے والا ہندسہ بتارہا ہے پارے کے سولہ رکوع ہیں اور پیٹ (درمیان) والا ہندسہ بتارہا ہے کہ اس رکوع میں بارہ آیتیں ہیں۔ بہرحال قرآن کریم کی تفسیر......

① ..... پہلے نمبر پر قرآن کریم سے ہوگی۔

② ..... دوسرے نمبر پر حدیث پاک سے ہوگی۔ کیونکہ جس ذات پر قرآن نازل ہوا ہے اس سے بہتر قرآن کریم کو کوئی نہیں سمجھ سکتا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تفسیر سب پر مقدم ہوگی۔

③ ..... تیسرے نمبر پر قرآن کریم کی تفسیر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ہوگی۔ خصوصاً حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے کیونکہ وہ تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سب سے بڑے مفسر قرآن تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو تمام اُمت سے دو امتیازی خوبیاں عطا فرمائی ہیں۔

(۱) ..... ایک تو وہ قرآن پاک کے پہلے نمبر کے مفسر ہیں۔ بخاری شریف میں روایت آتی ہے وہ خود فرماتے ہیں مجھے رب کی قسم ہے جس کے قبضہ میں میری جان ہے اگر مجھے معلوم ہو کہ میرے سے زیادہ کوئی قرآن کریم کو جاننے والا ہے اور میری اُونٹنی وہاں تک مجھے لے جاسکتی ہو تو میں ضرور جا کر اس سے حاصل کروں۔

(۲) ...... اور دوسری اور سب سے بڑی صفت ان کی یہ ہے کہ وہ اَفْقَهُ الْاُمَّة ہیں۔ تمام اُمت میں سب سے بڑے فقیہ تھے۔ امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ ان کے شاگرد کے شاگرد ہیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے شاگرد ہیں ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ اور ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد ہیں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ۔ کیونکہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے ایسے کامران اساتذہ سے فقہ حاصل کی ہے اور ان سے قرآن وسنت کو سمجھا ہے اس لئے تفسیر قرآن اور فقہ میں ان کا مقام بہت بلند ہے۔

تفسیر میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے بعد نمبر ہے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا۔ جن کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی تھی کہ "اے پروردگار! ان کو قرآن کریم کا ماہر بنا دے۔" ان کے بعد پھر باقی صحابہ رضی اللہ عنہم ہیں۔ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بعد تابعین کا درجہ اور مقام اور ان کے بعد تبع تابعین اور ان کے بعد درجہ بہ درجہ سلف صالحین کا مقام ہے۔

یہ بات پختہ اور یقینی ہے کہ ہم ان پر اعتماد کیے بغیر از خود قرآن وحدیث نہیں سمجھ سکتے یہ حضرات ہمارے دین کا سرمایہ ہیں۔

قرآن کریم کی طرح حدیث پاک ہم ان کے بغیر نہیں سمجھ سکتے۔ حدیث کی سند محدثین کرام رحمہم اللہ سے پوچھیں گے اور اس کا معنی اور مفہوم فقہاء کرام رحمہم اللہ سے پوچھیں گے تو قرآن کریم کی تفسیر اس ترتیب سے ہوگی جو میں نے بیان کیا ہے اور امید ہے کہ درس سننے والوں کی حاضری پہلے سے زیادہ ہوگی ان شاء اللہ تعالیٰ اور تمہاری ذمہ داری ہے کہ جو ساتھی نہیں آئے ان کو لے کر آنا اور عورتیں بھی اپنی سہیلیوں کو ساتھ لے کر آیا کریں تاکہ ان کو بھی قرآن کریم کی سمجھ آئے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اچھی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ

وَّعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ کَمَا صَلَّیْتَ

عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرَاھِیْمَ

اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ ۝

اَللّٰھُمَّ بَارِکْ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی

اٰلِ مُحَمَّدٍ کَمَا بَارَکْتَ عَلٰی

اِبْرَاھِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرَاھِیْمَ

اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ ۝

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

روزانہ درسِ قرآن پاک

تفسیر

سُوۡرَۃُ الۡفَاتِحَۃِ مَکِّیَّۃٌ

پارہ ⇐ الٓـمّٓ ①

آیاتُھَا ۷ (۱) سُوْرَۃُ الْفَاتِحَۃِ مَکِّیَّۃٌ (۵) رُکُوْعَاتُہَا ۱

﴿ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ ﴾ میں پناہ حاصل کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کی ﴿ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ﴾ شیطان مردود سے۔

﴿ بِسْمِ اللّٰهِ ﴾ شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے ﴿ الرَّحْمٰنِ ﴾ جو بے حد مہربان ہے

﴿ الرَّحِیْمِ ﴾ نہایت رحم والا ہے۔

﴿ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ ﴾ تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں۔ ﴿ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴾ جو پالنے والا ہے تمام جہانوں کا۔ ﴿ الرَّحْمٰنِ ﴾ جو بے حد مہربان ہے۔ ﴿ الرَّحِیْمِ ﴾ نہایت رحم کرنے والا ہے۔ ﴿ مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ ﴾ جو مالک ہے جزا اور بدلے کے دن کا۔ ﴿ اِیَّاكَ نَعْبُدُ ﴾ ہم خاص تیری ہی عبادت کرتے ہیں۔ ﴿ وَ اِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ ﴾ اور خاص تجھ ہی سے مدد طلب کرتے ہیں۔ ﴿ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ ﴾ چلا ہم کو سیدھے راستے پر۔ ﴿ صِرَاطَ الَّذِیْنَ ﴾ راستہ ان لوگوں کا۔ ﴿ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ ﴾ جن پر تو نے انعام کیا۔ ﴿ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ ﴾ ان لوگوں کا راستہ نہ دکھا جن پر تیرا غضب ہوا۔ ﴿ وَ لَا الضَّآلِّیْنَ ﴾ اور نہ گمراہوں کا۔ ﴿ اٰمِیْنَ ﴾ رب تعالیٰ ایسا ہی کرے۔

فضائل

اس سورۃ کا نام سورۃ الفاتحہ ہے۔ فتح کا ایک معنی کھولنا بھی ہے۔ چوں کہ یہ سورۃ قرآن کریم کو کھولنے والی ہے، اس سے قرآنِ کریم کی ابتداء ہوتی ہے اس لیے اس کو فاتحہ کہتے ہیں۔

جس طرح کسی شے کا عنوان ہوتا ہے یہ سورۃ قرآن کریم کا عنوان ہے۔ اور اس کا نام سوال بھی ہے کہ اس میں سوال کرنے کا طریقہ سمجھایا گیا ہے۔

کسی سے سوال کرنے اور مانگنے کا طریقہ یہ ہے کہ سائل جس سے مانگتا ہے پہلے اس کی تعریف کرتا ہے کہ تم بڑے ہمدرد ہو، خیر خواہ ہو اور سخی ہو۔ پھر اپنا تعلق بتاتا ہے میں تمہارا شہر دار یا محلہ دار ہوں اور تمہارے زیر سایہ ہوں۔ پھر اپنی کمزوری اور عاجزی کا اظہار کرتا ہے اور پھر اپنا سوال پیش کرتا ہے کہ یہ میری ضرورت ہے جو تمہارے سے مانگنے آیا ہوں۔ اس سورۃ میں بھی پہلے اللہ تعالیٰ کی تعریف ہے۔ ﴿ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۙ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۙ مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ ؕ ﴾ تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں جو پالنے والا ہے تمام جہانوں کا بے حد مہربان ہے نہایت رحم کرنے والا ہے جو مالک ہے جزا اور بدلے کے دن کا۔

پھر اپنا تعلق بتایا: ﴿اِیَّاكَ نَعۡبُدُ وَ اِیَّاكَ نَسۡتَعِیۡنُ﴾ ہم خاص تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور خاص تجھ ہی سے مدد طلب کرتے ہیں۔ اور آگے سوال ہے: ﴿اِهۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِیۡمَ﴾ چلا ہم کو سیدھے راستے پر۔

اس سورۃ کا نام شافیہ بھی ہے۔ یعنی شفا دینے والی۔ حقیقتاً تو شفا دینے والی ذات اللہ تعالیٰ کی ہے۔ مگر اس میں اللہ تعالیٰ نے برکت رکھی ہے جس کی وجہ سے روحانی اور جسمانی بیماریوں سے شفا ملتی ہے۔

بخاری شریف صفحہ ۳۰۴ میں روایت آتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک محاذ پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت کو روانہ فرمایا کامیابی کے بعد جب واپس ہوئے رات ایک چھوٹے سے قصبے میں ہوئی وہاں رات گزارنے کا ارادہ کیا لیکن وہاں کے لوگوں نے ان کی مہمانی سے انکار کیا کہ ہم صابیوں کو یہاں نہیں رہنے دیں گے۔ جس طرح آج کل اہلِ حق کو وہابی کہتے ہیں اسوقت اہل حق کو صابی کہتے تھے۔ کہنے لگے کہ ہم نے صابیوں کو یہاں نہیں رہنے دینا۔

اس طرح سمجھو جس طرح ہمارے ساتھی تبلیغی جماعت والے بعض قصبات میں جاتے ہیں تو وہ لوگ ان کے بستر ے اٹھا کر باہر پھینک دیتے ہیں اور ان کو ہاتھوں اور کانوں سے پکڑ کر باہر نکال دیتے ہیں کہ لوگ ان کی باتیں سن کر متاثر ہوں گے اور ہمارے ریوڑ سے نکل جائیں گے۔ ورنہ یہ لوگ ان سے کچھ مانگتے تو نہیں ہیں۔ اپنا کھانا اور اپنا پینا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو زیادہ سے زیادہ کام کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

بہر حال انھوں نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو قصبے سے باہر نکال دیا چونکہ اندھیرا تھا انھوں نے قصبے کے قریب ہی ڈیرہ لگالیا کہ رات گزار لیں اور صبح کو چلیں گے اتفاق ایسا ہوا کہ قصبے کے بڑے سردار کو زہریلے قسم کے موذی جانور نے ڈنگ مارا۔ روایت میں ہے کہ: ((فَسَعَوۡا لَهٗ بِكُلِّ شَیۡءٍ)) انہوں نے ہر طرح کی کوشش کی یعنی وہاں جتنے چھومنتر اور دم کرنے والے تھے کسی کا بس نہ چلا۔ مجبور ہو کر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے پاس آئے کہ ہمارے سردار کو کوئی زہریلی چیز لڑ گئی ہے کیا تم میں کوئی دم کرنے والا ہے؟ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ہاں دم کریں گے مگر تیس بکریاں لیں گے۔ تیس اس لیے کہا کہ یہ آدمی تیس تھے ہر ایک کو ایک، ایک آجائے گی۔

چنانچہ ان کے ساتھ گئے اور سورۃ فاتحہ پڑھ کر دم کیا ((كَاَنَّمَا نَشِطَ مِنۡ عِقَالٍ)) گویا کہ اس کو گرہ سے کھول دیا ہے۔ یعنی اس کو اس طرح محسوس ہوا کہ کبھی تکلیف ہوئی ہی نہیں ہے۔ فرمایا شرط پوری کرو کہ تیس بکریاں ہمارے حوالے کرو۔ چنانچہ تیس بکریاں گن کر ان سے لیں۔ مگر تقسیم نہ کیں کہ مدینہ طیبہ میں جا کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کریں گے اگر ہمارے لیے جائز ہوں گی تو تقسیم کریں گے ورنہ مالکوں کو واپس کر دیں گے۔

مدینہ طیبہ پہنچ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((اِنَّ اَحَقَّ مَا اَخَذۡتُمۡ عَلَیۡهِ اَجۡرًا كِتَابُ اللّٰهِ)) بیشک جن چیزوں پر تم اجر لیتے ہو ان میں اللہ تعالیٰ کی کتاب زیادہ حق رکھتی ہے کہ تم اس پر اجر لو۔ اور فرمایا کہ اس مزدوری میں سے میرا بھی حصہ نکالو۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمانا حرص اور لالچ نہ تھا بلکہ صرف ان کا وہم دُور کرنا مقصود تھا کہ یہ تم نے کوئی گناہ نہیں کیا اگر اس میں کسی قسم کا شبہ ہوتا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم یہ نہ فرماتے کہ مجھے بھی حصہ دو۔

اس روایت کے پیش نظر تمام فقہاء کرام رحمہم اللہ کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اگر کوئی تعویذ گنڈے اور دم کرنے پر اجرت لینا چاہے تو لے سکتا ہے۔ کوئی گناہ نہیں ہے۔ تو اس سورۃ کو شافیہ اس لیے کہتے ہیں کہ اس میں اللہ تعالیٰ نے شفا رکھی ہے۔

﴿ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ﴾ کا معنی ہے کہ شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان اور نہایت رحم کرنے والا ہے۔ یہاں چونکہ کتاب کو شروع کرنا ہے اس لیے شروع کا فعل نکالتے ہیں ورنہ جس کام کے لیے پڑھو گے وہی فعل نکالیں گے مثلاً: کھانا کھانا ہے تو وہاں اُکُلُ کا فعل نکالیں گے اور ترجمہ ہوگا کہ میں کھانا کھاتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان اور نہایت رحم کرنے والا ہے۔ اور اگر کچھ پینا ہے تو أَشْرَبُ کا فعل نکالیں گے کہ میں پیتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے۔ اور پڑھنے کے وقت أَقْرَءُ نکالیں گے کہ میں پڑھتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان اور نہایت رحم کرنے والا ہے۔

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ رحمٰن اسے کہتے ہیں جو بغیر مانگنے اور سوال کرنے کے دے اور رحیم اسے کہتے ہیں جو مانگنے اور سوال کرنے کے بعد دے۔ تو اللہ تعالیٰ رحمٰن ہے کہ ہمیں جو کچھ ملا ہے وجود ملا ہے، کان ملے ہیں، آنکھیں ملی ہیں، ناک ملا ہے، دل، دماغ ملا ہے، زبان ملی ہے، سب کچھ اس نے بغیر مانگنے کے دیا ہے اور کتنی چیزیں ہیں جو اس نے بن مانگے عطا فرمائی ہیں۔ کیونکہ جب اس نے عطا کی ہیں ہمیں اس وقت سوجھ بوجھ ہی نہیں تھی کہ مانگتے اور مانگنے پر بھی وہی دیتا ہے کہ رحیم بھی ہے اس کے سوا کوئی نہیں دے سکتا۔

فرمایا: ﴿ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ ﴾ تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں۔ ایک ہے حمد اور ایک ہے مدح۔ حمد ایسی تعریف کو کہتے ہیں جو کسی کے ذاتی افعال پر کی جائے ذاتی اوصاف پر کی جائے۔ مدح عام ہے کسی کی خوبی ذاتی ہو یا غیر ذاتی ہو۔ اس پر جو تعریف کی جائے تو اس کو مدح کہتے ہیں۔

لہٰذا حمد صرف رب تعالیٰ کے لئے ہے کہ اس کی تمام خوبیاں اور اوصاف ذاتی ہیں مستعار اور مانگی ہوئی نہیں ہیں۔ اور "تمام" کا معنی الف لام کا ہے۔

﴿ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۙ﴾ جو پالنے والا ہے تمام جہانوں کا۔ رب کا معنیٰ ہے پالنے والا، تربیت کرنے والا۔ اگر رب کا مفہوم ہی سمجھ لے تو شرک کے قریب نہیں جا سکتا کیونکہ تربیت کے لیے رہائش کی ضرورت خوراک کی ضرورت، پانی کی ضرورت، ہوا کی ضرورت، حفاظت کی ضرورت اور جتنی بھی چیزیں تربیت کے لیے ضروری ہیں وہ سب رب تعالیٰ کے پاس اور اسی کے اختیار میں ہیں۔ تو کوئی اور اس کا شریک اور حصے دار کس طرح بن گیا؟ اور اس کے سوا کسی اور کے پاس حاجت روائی کے لیے جانے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ اور تربیت کرنے والا صرف رب تعالیٰ ہے۔

عَالَمِیْن جمع ہے عالم کی اور عالم کے معنی ہیں جہان اور جمع کا صیغہ اس لیے لائے ہیں کہ عالم میں کئی عالم ہیں۔

انسانوں کا عالم ہے، حیوانوں کا عالم ہے، پرندوں کا عالم ہے، حشرات الارض کا عالم ہے، تو تمام عالموں کا پالنے والا صرف ایک اللہ تعالیٰ ہے۔

﴿ الرَّحْمٰنِ ﴾ بے حد مہربان ﴿ الرَّحِيْمِ ﴾ نہایت رحم کرنے والا ہے۔

﴿ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝ ﴾ جو مالک ہے جزا اور بدلے کے دن کا۔

دِیْن کا معنی بدلا اور جزا ہے۔ آج بھی حقیقی مالک تو وہی ہے مگر عارضی طور پر بندوں کو بھی مالک بنایا ہے۔ اور تیری میری کہتے ہیں۔ کہ ادھر تیری حکومت ہے اور ادھر میری حکومت ہے۔ فلاں چیز تیری ہے اور فلاں چیز میری ہے۔ تیرا اقتدار ہے اور میرا اقتدار ہے۔ مگر قیامت کے دن جب تمام کائنات جمع ہوگی رب تعالیٰ کی طرف سے اعلان ہوگا: ﴿ لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ ؟ ﴾ بتاؤ آج کس کا ملک اور شاہی ہے؟ دُنیا میں تم بادشاہ اور ڈکٹیٹر بنے ہوئے تھے اور کہتے تھے کہ میرا ملک اور میری شاہی ہے۔ اس وقت سب کی زبان سے نکلے گا ﴿ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ﴾ (المومن:۱۶) آج اللہ واحد، قہار کی شاہی ہے۔ وہاں میری، تیری کرنے والا کوئی نہیں ہوگا۔

﴿ اِيَّاكَ نَعْبُدُ ﴾ اے پروردگار! ہم صرف تیری ہی عبادت کرتے ہیں۔ قاعدے کے مطابق تو نَعْبُدُكَ ہونا چاہیے تھا کہ نَعْبُدُ پہلے اور "کاف" ضمیر بعد میں ہونی چاہیے تھی کہ ہم تیری عبادت کرتے ہیں مگر ضمیر کو فعل فاعل پر مقدم کر دیا تاکہ حصر پیدا ہو جائے۔ اب معنی ہوگا کہ ہم صرف تیری ہی عبادت کرتے ہیں۔ زبانی عبادت بھی اور بدنی عبادت بھی اور مالی عبادت بھی صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ہے۔ اور التحیات میں بھی ہم اس بات کا اقرار کرتے ہیں۔

اَلتَّحِيَّاتُ لِلّٰهِ زبانی عبادتیں اللہ تعالیٰ کی ہیں وَالصَّلَوٰتُ اور بدنی عبادتیں بھی صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں وَالطَّيِّبٰتُ اور مالی عبادتیں بھی صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں۔ ہر طرح کی عبادت اللہ تعالیٰ کے لیے ہے۔ اس کے سوا معبود کوئی نہیں ہے۔

﴿ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۝ ﴾ اور خاص تجھ ہی سے مدد طلب کرتے ہیں۔

استعانت کی مختلف صورتیں

استعانت کا مسئلہ اچھی طرح سمجھ لیں استعانت کی دو قسمیں ہیں:

①...... ایک ظاہری اور اسباب کے تحت استعانت ہے کہ مثلاً: بیمار آدمی حکیم اور ڈاکٹر سے مدد لیتا ہے۔ غریب امیر سے مدد لیتا ہے۔ کمزور آدمی کوئی وزنی کام خود نہیں کر سکتا طاقتور سے بدنی مدد لیتا ہے کہ میرا ہاتھ بٹاؤ یہ ظاہری اور اسباب کے تحت استعانت ہے۔ اس کے جائز ہونے میں قطعاً کوئی اختلاف نہیں ہے۔

اسی استعانت کے متعلق اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتے ہیں۔ ﴿ وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ﴾ "نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کرو۔" ﴿ وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ﴾ (المائدہ:۲) "اور گناہ اور زیادتی کے کاموں میں

ایک دوسرے کی مدد نہ کرو۔" تو اسباب کے تحت جو مدد اور معاونت ہے یہ جائز ہے۔

②...... دوسری استعانت ہے مَافَوْقَ الْاَسْبَابْ اسباب سے بالاتر کسی سے مدد طلب کرنا یہ صرف اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے۔ مثلاً: میں کہوں کہ میرے گھٹنوں میں درد ہے اس کو دُور کر دے یہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں کر سکتا۔ ہاں یہ کہوں کہ مجھے درد کے لئے کوئی گولی دے دو، پھکی دے دو، یہ اسباب کے تحت ہے یہ جائز ہے۔

آنحضرت ﷺ کا فرمان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کوئی ایسی بیماری نہیں پیدا فرمائی جس کا علاج نہ ہو سوائے دو بیماریوں کے، ایک بڑھاپا اور دوسری موت۔ تو ماتحت الاسباب استعانت اور ہے، اور مافوق الاسباب استعانت اور ہے۔ دونوں میں گڑبڑ نہ کرنا۔

ایک شخص یہاں کھڑا ہے اور کہتا ہے اے شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ میری مدد کر یہ مافوق الاسباب استعانت ہے۔ اس طرح کہنے میں ان کو حاضر و ناظر اور عالم الغیب ماننا پڑے گا اور متصرف فی الامور سمجھنا پڑے گا اور یہی کفر کی بنیاد ہے۔ تمام فقہاء کرام رحمہم اللہ کا اس مسئلے میں اتفاق ہے کہ "مَنْ قَالَ اَرْوَاحُ الْمَشَائِخِ حَاضِرَۃٌ تَعْلَمُ یَکْفُرُ" شامی، عالمگیری، البحر الرائق اور بزازیہ میں ہے کہ جو آدمی یہ عقیدہ رکھے کہ مشائخ کی ارواح حاضر ہیں اور ہمارے حالات کو جانتی ہیں وہ پکا کافر ہے کیونکہ یہ مافوق الاسباب استعانت ہے۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی سے جائز نہیں ہے۔

﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ﴾ سے لے کر ﴿مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ؕ﴾ تک اللہ تعالیٰ کی تعریف تھی اور ﴿اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ؕ﴾ میں اپنا تعلق بتایا کہ ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد طلب کرتے ہیں، مانگتے کیا ہیں؟ آگے اس کا ذکر ہے۔

صراطِ مستقیم

فرمایا: ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۙ﴾ چلا ہم کو سیدھے راستے پر ﴿صِرَاطَ الَّذِيْنَ﴾ راستہ ان لوگوں کا ﴿اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۙ﴾ جن پر تو نے انعام کیا۔ کل میں نے عرض کیا تھا کہ قرآن کریم کی بہترین تفسیر وہ ہے جو خود قرآن کریم سے ہو تو ﴿اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۙ﴾ کی تفسیر خود قرآن کریم نے کی ہے کہ جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام کیا ہے وہ یہ لوگ ہیں۔

انعام یافتہ قومیں

فرمایا: ﴿فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ﴾ جس نے اطاعت کی اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی اطاعت کی وہ ان لوگوں کے ساتھ ہو گا جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام کیا ہے۔ ﴿مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَ الصِّدِّيْقِيْنَ وَ الشُّهَدَآءِ وَ الصّٰلِحِيْنَ﴾ (النساء: ۶۹) وہ نبی ہیں، صدیق ہیں، شہداء ہیں اور صالحین ہیں۔ ان چاروں پر اللہ تعالیٰ کا انعام ہوا ہے۔

①...... پہلے درجے میں اللہ تعالیٰ کے نبی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جو انعام اپنے پیغمبروں پر کیا ہے وہ اور کسی پر نہیں کیا۔

②...... دوسرے نمبر پر صدیق ہیں جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے پیغمبروں کی تصدیق کی ہے۔
③...... تیسرے نمبر پر شہداء ہیں جو اللہ تعالیٰ کے راستہ میں جہاد کرتے ہوئے کافروں کے ساتھ لڑتے ہوئے شہید ہوئے
④...... چوتھے نمبر پر صالحین ہیں۔ کہ وہ نہ تو پیغمبر ہیں نہ صدیق ہیں، نہ شہید ہیں۔ بلکہ ایمان لا کر نیکیاں کر کے اخلاق حسنہ کے ساتھ نیکوں کی صف میں شامل ہو گئے ہیں۔

یہ چار گروہ ہیں جن پر اللہ تعالیٰ کا انعام ہوا ہے۔ یہ صراطِ مستقیم پر چلنے والے ہیں۔ اور صراطِ مستقیم کیا ہے؟ اس کی تفسیر بھی اللہ تعالیٰ نے خود قرآن کریم میں فرمائی ہے۔ آٹھواں پارہ چھٹا رکوع نکال کر دیکھ لیں۔

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ○

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

﴿قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَیْكُمْ اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَیْــٴًـا وَّ بِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا ۚ وَ لَا تَقْتُلُوْۤا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ ؕ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَ اِیَّاهُمْ ۚ وَ لَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَ مَا بَطَنَ ۚ وَ لَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ؕ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝ وَ لَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْیَتِیْمِ اِلَّا بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ حَتّٰى یَبْلُغَ اَشُدَّهٗ ۚ وَ اَوْفُوا الْكَیْلَ وَ الْمِیْزَانَ بِالْقِسْطِ ۚ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ۚ وَ اِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَ لَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى ۚ وَ بِعَهْدِ اللّٰهِ اَوْفُوْا ؕ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ۝ وَ اَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ۚ وَ لَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِیْلِهٖ ؕ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝﴾

”اے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم)! آپ کہہ دیں آؤ میں پڑھ کر سناؤں تمہیں وہ چیزیں جو حرام فرمائی ہیں تمہارے پروردگار نے تم پر وہ یہ ہیں کہ تم شریک نہ ٹھہراؤ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی چیز کو اور والدین کے ساتھ احسان کرو اور قتل نہ کرو اپنی اولاد کو غربت کی وجہ سے ہم تمہیں بھی روزی دیتے ہیں اور انھیں بھی اور نہ قریب جاؤ بے حیائی کی باتوں کے جو ظاہری ہوں ان میں سے اور جو پوشیدہ ہوں ان میں سے اور نہ قتل کرو اس جان کو جس کو اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے۔ مگر حق کے ساتھ ان باتوں کا اللہ تعالیٰ نے تاکیدی حکم دیا ہے تم کو تاکہ تم سمجھ جاؤ۔ اور نہ قریب جاؤ یتیم کے مال کے مگر اس طریقے سے جو بہتر ہو یہاں تک کہ وہ پہنچ جائے اپنی قوت کو اور پورا کرو ماپ اور تول کو انصاف کے ساتھ ہم نہیں تکلیف دیتے کسی نفس کو مگر اس کی طاقت کے مطابق اور جب تم بات کرو تو انصاف کے ساتھ کرو اگرچہ قریبی رشتہ ہی کیوں نہ ہوں۔ اور اللہ تعالیٰ کے عہد کو پورا کرو۔ یہ وہ چیز ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے تمہیں تاکیدی حکم دیا ہے تاکہ تم نصیحت حاصل کرو اور بیشک یہ میرا سیدھا راستہ ہے۔ پس اس پر تم چلو۔ اور نہ پیروی کرو تم اور راستوں کی پس وہ تم کو جدا کر دیں گے اللہ تعالیٰ کے راستہ سے، اس چیز کا اللہ تعالیٰ تمہیں تاکیدی حکم دیتا ہے تاکہ تم بچ جاؤ۔“

تو اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے صراطِ مستقیم کی وضاحت فرمائی ہے۔ اور اصول بیان فرمائے ہیں اور اس پر چلنے کا حکم

دیا ہے۔

مغضوب علیہم

آگے فرمایا: ﴿غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ﴾ ان لوگوں کا راستہ نہ دکھا جن پر تیرا غضب ہوا۔ ﴿وَلَا الضَّآلِّيْنَ ۝﴾ اور نہ گمراہوں کا۔ ترمذی شریف ج ۲ ص ۱۲۴ مسند احمد ج ۴ ص ۳۷۸ میں روایت ہے آنحضرت ﷺ نے فرمایا مَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ یہودی ہیں اور ضَآلِّيْنَ نصاریٰ ہیں۔

یہودی حقیقت کو جانتے اور سمجھتے تھے پھر ایمان نہیں لائے۔ قرآن کریم میں ارشاد ربانی ہے ﴿يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ﴾ (البقرہ:۱۴۶) "وہ اس پیغمبر کو اس طرح پہچانتے ہیں جس طرح بیٹوں کو پہچانتے ہیں۔" مگر ضد کی وجہ سے مانتے نہیں تھے۔ گمراہی کے دو ہی طریقے ہیں:

① ...... ایک یہ کہ لاعلمی میں مبتلا ہونے کی وجہ سے حق کو نہ حاصل کر سکے۔

② ...... دوسرا یہ کہ جانتے اور سمجھتے ہوئے بھی انکار کرے۔

یہودی اللہ تعالیٰ کے پیغمبر کو پہچاننے اور قرآن کریم کو حق جاننے کے باوجود محض ضد کی وجہ سے انکار کرتے تھے اور نصاریٰ کے پاس اس وقت اتنا علم نہیں تھا جتنا یہود کے پاس تھا۔ تو نصاریٰ لاعلمی میں مبتلا ہونے کی وجہ سے گمراہ ہوئے۔ اور یہود کے مرد تو در کنار ان کی عورتیں بھی عالم تھیں۔ اور آنحضرت ﷺ اور قرآن کریم کے حق ہونے کے متعلق معلومات رکھتی تھیں۔

حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کے قبول اسلام کا واقعہ

حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کی پھوپھی توراۃ کی بڑی ماہر تھیں اور بتایا کرتی تھیں کہ اس طرح ایک پیغمبر نے آنا ہے اور اس کے یہ اوصاف اور خوبیاں ہوں گی۔ اور وہ جب مدینہ منورہ ہجرت کر کے آئیں گے تو ان کے ساتھیوں نے سفید لباس پہنا ہوا ہوگا۔

چنانچہ آنحضرت ﷺ جب مدینہ طیبہ تشریف لے گئے تو حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کھجوریں اتارنے کے لئے کھجور کے درخت پر چڑھے ہوئے تھے اور ان کی پھوپھی نیچے بیٹھی ہوئی تھی۔ فرماتے ہیں کہ میرے ہاتھ میں کھجور کا خوشہ تھا میں نے مکہ مکرمہ کی طرف سے کچھ آدمیوں کو آتے ہوئے دیکھا میں نے پھوپھی کو آواز دی کہ یہ آدمی مکہ کی طرف سے آرہے ہیں اور سفید لباس پہنے ہوئے ہیں۔

پھوپھی نے کہا کہ یہ وہی پیغمبر اور ان کے ساتھی ہیں جنہوں نے آنا تھا۔ حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کھجور کے خوشے ہاتھ میں پکڑے ہوئے تھے خوشی خوشی آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، خوشی کی وجہ سے خوشے بھی نہ رکھ سکے۔ آنحضرت ﷺ کے چہرہ مبارک کو دیکھا تو کہنے لگے ((اِنَّ الْوَجْهَ لَيْسَ بِوَجْهِ كَذَّابٍ))۔ "بیشک یہ جھوٹے کا چہرہ نہیں

ہے۔" اور اسی مجلس میں مسلمان ہو گئے۔

مدینہ طیبہ پہنچنے پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا پہلا خطبہ مبارکہ

جب یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں تشریف لائے اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہ بیان فرما رہے تھے کہ لوگو!

❀...... اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ۔ اور

❀...... ((أَفْشُوا السَّلَامَ)). اور سلام کو عام کرو، اکرام مومن ملحوظ رکھو، ایک دوسرے کی قدر کرو۔

❀...... ((أَطْعِمُوا الطَّعَامَ)). غریبوں کو کھانا کھلاؤ۔

❀...... ((وَلَيِّنُوا الْكَلَامَ)). اور نرم گفتگو کرو۔

❀...... ((صَلُّوا بِاللَّيْلِ وَالنَّاسُ نِيَامٌ)). لوگ جب سوئے ہوئے ہوں تم اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو۔ یہ پہلا درس تھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا۔

مسلمان ہونے کے بعد واپس پھوپھی کو بتایا کہ میں مسلمان ہو گیا ہوں۔ تو پھوپھی نے کہا کہ ابھی اپنے ایمان کا اعلان نہ کرنا ورنہ یہودی تجھے قتل کر دیں گے۔

تو یہود دیدہ دانستہ حق کے راستے کو چھوڑ کر گمراہ ہوئے یہ ﴿مَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ﴾ ہیں۔ لہٰذا اے پروردگار! جن پر تیرا غضب ہوا ان کے راستے پر نہ چلا اور ﴿وَلَا الضَّآلِّيْنَ﴾ اور نہ ان کے راستہ پر چلا جو غلط فہمی میں مبتلا ہو کر گمراہ ہوئے۔ یعنی نصاریٰ۔

"آمین" اور اس کا معنی

﴿اٰمِيْنَ﴾ اٰمِيْنَ کا معنی ہے اے اللہ! ہماری دعا قبول فرما۔ اٰمِيْنَ کا ذکر حدیث پاک میں آتا ہے۔ اور قرآن کریم میں اس لیے نہیں لکھی گئی کہ کوئی یہ نہ سمجھ لے کہ یہ قرآن پاک کا حصہ ہے۔ اتنی احتیاط کی گئی ہے۔ یہ سورۃ فاتحہ کا خلاصہ میں نے بیان کر دیا ہے۔ (اللہ پاک سمجھ عطا فرمائے۔ آمین)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

روزانہ درسِ قرآن پاک

تفسیر

سُوۡرَۃُ الۡبَقَرَۃِ مَدَنِیَّۃٌ

پارہ ⇐ الٓمّٓ (۱)، سَیَقُوۡلُ (۲)، تِلۡكَ الرُّسُلُ (۳)

آیاتُہا ۲۸۶　②　سُورَۃُ البَقَرَۃِ مَدَنِیَّۃٌ　(۸۷)　رُکُوعَاتُہا ۴۰

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

﴿الٓمّٓ ۚ① ذٰلِکَ الۡکِتٰبُ﴾ یہ کتاب ہے ﴿لَا رَیۡبَ ۚۖ فِیۡہِ ۚۛ﴾ اس میں کوئی شک نہیں ﴿ھُدًی﴾ ہدایت ہے ﴿لِّلۡمُتَّقِیۡنَ ۙ②﴾ پرہیزگاروں کے لیے ﴿الَّذِیۡنَ﴾ پرہیزگار وہ لوگ ہیں ﴿یُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡغَیۡبِ﴾ جو ایمان لاتے ہیں بن دیکھے ﴿وَ یُقِیۡمُوۡنَ الصَّلٰوۃَ﴾ اور قائم کرتے ہیں نماز کو ﴿وَ مِمَّا﴾ اور اس چیز سے ﴿رَزَقۡنٰھُمۡ﴾ جو ہم نے ان کو رزق دیا ہے ﴿یُنۡفِقُوۡنَ ۙ③﴾ خرچ کرتے ہیں ﴿وَ الَّذِیۡنَ﴾ اور وہ لوگ ہیں ﴿یُؤۡمِنُوۡنَ﴾ جو ایمان لاتے ہیں ﴿بِمَاۤ﴾ اس چیز پر ﴿اُنۡزِلَ اِلَیۡکَ﴾ جو نازل کی گئی آپ کی طرف ﴿وَ مَاۤ﴾ اور اس چیز پر ﴿اُنۡزِلَ مِنۡ قَبۡلِکَ ۚ﴾ جو نازل کی گئی آپ سے پہلے ﴿وَ بِالۡاٰخِرَۃِ ھُمۡ یُوۡقِنُوۡنَ ؕ④﴾ اور وہ آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔

وجہ تسمیہ

اس سورۃ کا نام سورۃ البقرہ ہے اور قرآن کریم کی ترتیب کے لحاظ سے اس کا دوسرا نمبر ہے۔ اوپر دیکھو یہاں سورۃ البقرہ لکھا ہوا ہے اس سے پہلے دو کا ہندسہ ہے۔ یہ بتا رہا ہے کہ اس سورۃ کا دوسرا نمبر ہے اور سورۃ الفاتحہ پہلی سورۃ ہے۔

اس سورۃ کا نام بقرہ ہے۔ بقرہ گائے کو بھی کہتے ہیں اور بیل کو بھی کہتے ہیں۔ یعنی نر اور مادہ دونوں پر بقرہ کا لفظ بولا جاتا ہے۔ اس سورۃ کا نام بقرہ اس لیے رکھا گیا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں عامیل نامی ایک شخص کو اس کے بھتیجوں یا چچازاد بھائیوں نے اس کی جائیداد پر قبضہ کرنے کی خاطر قتل کر دیا تھا۔ ان کا خیال یہ تھا کہ فیصلہ تو گواہوں پر ہوتا ہے اور موقع کا گواہ تو کوئی نہیں ہے لہٰذا بات آئی گئی ہو جائے گی۔ چنانچہ قتل کرنے کے بعد یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس گئے کہ ہمارے چچا کو کسی نے قتل کر دیا ہے ہماری دادرسی کی جائے اور معلوم کیا جائے کہ قاتل کون ہے؟

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا اللہ تعالیٰ کا حکم ہے ﴿فَاذۡبَحُوۡا بَقَرَۃً﴾ "پس تم گائے کو ذبح کرو" اور اس کا ایک حصہ مثلاً: دل اس مردے کو مارو وہ زندہ ہو کر خود بتادے گا کہ میرا قاتل کون ہے۔ چنانچہ انہوں نے کافی لیت ولعل کے بعد گائے کو ذبح کیا تھا جب اس کا ایک حصہ مردے کو مارا گیا تو اس نے بتایا کہ میرے قاتل فلاں ہیں۔ تو چونکہ اس سورۃ میں اس بقرہ کا ذکر ہے اس لیے اس سورۃ کا نام بقرہ رکھا گیا ہے۔ یعنی وہ سورۃ جس میں گائے کے ذبح کرنے کا ذکر ہے۔

اگرچہ اس سورۃ میں اور بھی کئی واقعات ہیں مگر اس واقعہ کی مناسبت سے اس کا نام بقرہ رکھا گیا ہے۔ یہ سورۃ قرآن کریم کی تمام سورتوں میں سے سب سے بڑی سورۃ ہے۔ اور مدینہ طیبہ میں نازل ہوئی ہے اور لفظ مَدَنِیَّۃ کے بعد ستاسی کا ہندسہ لکھا ہوا ہے جو یہ بتا رہا ہے کہ نازل ہونے کے اعتبار سے اس سورۃ کا ستاسیواں نمبر ہے۔ اس کے چالیس رکوع اور دو سو چھیاسی

آیات ہیں۔

﴿الٓمّٓ﴾ الف، لام، میم، مستقل آیت کریمہ ہے اور اس میں تین حرف ہیں۔ اور آنحضرت ﷺ کا فرمان ہے کہ جس نے قرآن کریم کا ایک حرف پڑھا اس کو دس نیکیاں ملیں گی (اور قرآن کریم سننے والے کو بھی ہر ہر حرف کے بدلے دس دس نیکیاں ملتی ہیں)۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا ایک حرف کے بدلے دس نیکیاں ملیں گی۔

پھر فرمایا میں نہیں کہتا کہ ﴿الٓمّٓ﴾ ایک حرف ہے۔ بلکہ الف ایک حرف، لام ایک حرف اور میم الگ حرف ہے۔ گویا ﴿الٓمّٓ﴾ پڑھنے والا تیس نیکیوں کا حقدار ہے۔ اسی طرح سننے والا بھی تیس نیکیوں کا حق دار ہے۔

حروفِ مقطعات کا معنی؟

﴿الٓمّٓ﴾ حروفِ مقطعات ہیں۔ یہ حروفِ مقطعات قرآن مجید کی اُنتیس [۲۹] سورتوں کے شروع میں آتے ہیں۔ یہاں ﴿الٓمّٓ﴾ ہے۔ کہیں ﴿الٓر﴾ ہے، کسی جگہ ﴿یٰسٓ﴾ ہے اور کہیں ﴿طٰہٰ﴾ ہے اور کہیں ﴿حٰمٓ﴾ ہے۔ مقطع کا مفہوم آپ اس طرح سمجھیں کہ کسی لفظ کو اختصار کے ساتھ لکھنے اور بولنے کے لیے اس سے ایک حرف الگ کر لیں اور وہ حرف لکھ کر یا بول کر وہ لفظ مراد لیں۔ جیسے:

① ...... مردم شماری کا نمبر لکھتے ہوئے تو اس طرح لکھ دیتے ہیں...... (م۔ش نمبر ۱۰۰) مردم سے "م" لے لی اور شماری سے "ش" لے لیا۔ تو م، ش نمبر ۱۰۰ سے مراد مردم شماری نمبر ۱۰۰ ہے۔

② ...... یا جس طرح نوائے وقت کا مشہور کالم نویس تھا محمد شفیع مرحوم تو لفظ محمد سے میم لے لی شفیع سے شین لے لی محمد شفیع کا مخفف م، ش بنا۔ چنانچہ م، ش کی ڈائری مشہور تھی۔

③ ...... یا جس طرح ڈپٹی کمشنر کا مخفف ڈی سی ہے۔ اور اسسٹنٹ کمشنر کا مخفف اے سی ہے۔ اسی طرح یہ حروف مقطعات بھی مخفف ہیں۔ پھر یہ کس سے مخفف ہیں؟ اور ان کا مخفف کیا ہے؟

① ...... تو اس کے متعلق اکثر تو فرماتے ہیں کہ: اَللّٰہُ اَعْلَمُ بِمُرَادِہٖ بِذٰلِكَ ان کی مراد کو اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے۔ ہمیں صرف ان کے پڑھنے اور سننے کا ثواب ہوگا۔ ان کی حقیقت اور مراد کو ہم نہیں جانتے۔

② ...... اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ: هِيَ مِنْ اَسْمَاءِ اللّٰهِ تَعَالٰى. یہ اللہ تعالیٰ کے نام ہیں۔ پھر ان کے قول کی تشریح میں اختلاف ہے کہ آیا بعینہٖ "الم، حم" اللہ تعالیٰ کے نام ہیں یا یہ حروف ناموں کے مخفف ہیں۔

① ...... تو ایک گروہ کہتا ہے کہ بعینہٖ یہی اللہ تعالیٰ کے نام ہیں۔ ان پر اعتراض ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ننانوے ناموں میں تو یہ نہیں آتے؟ تو اس کا جواب امام فخر الدین رازی رحمۃ اللہ علیہ نے تفسیر کبیر میں اور حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے تفسیر ابن کثیر میں اور قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ نے تفسیر مظہری میں یہ دیا ہے کہ ننانوے نام تو اللہ تعالیٰ کے مشہور ہیں اور غیر مشہور تو شمار سے باہر ہیں۔ البتہ جو بذریعہ وحی نازل ہوئے ہیں ان کی تعداد خمسۃ الآف پانچ ہزار ہے۔ جو پہلی کتابوں اور صحیفوں میں

نازل ہوئے ہیں۔

۲......دوسرا گروہ کہتا ہے کہ یہ حروف بعینہٖ نام نہیں ہیں بلکہ ناموں کے مخفف ہیں مثلاً: الف مخفف ہے اللہ سے اور لام مخفف ہے لطیف کا۔ جو اللہ تعالیٰ کی صفتوں میں سے ایک صفت ہے۔ ذاتی نام تو اللہ جل جلالہٗ ہے باقی سب صفاتی نام ہیں۔ جیسے رحمٰن ہے، رحیم ہے، جبار ہے، وکیل ہے۔

عملیات کا علم جاننے والے بتاتے ہیں کہ جس مرد یا عورت کی شادی میں رکاوٹ ہو تو وہ یا رحیم یا کریم یا لطیف کا وظیفہ کرے رکاوٹ دور ہو جائے گی۔ (وظیفے کا طریقہ یہ ہے کہ جس نے وظیفہ کرنا ہے وہ اپنے نام اور اپنی والدہ کے نام کے عدد نکالے اس عدد کے برابر ان تینوں لفظوں کو کسی ایک نماز کے ساتھ اکتالیس دن پڑھے ان شاء اللہ تعالیٰ مسئلہ حل ہو جائے گا۔ نواز بلوچ)۔

اور اگر آپس میں عداوت کو دور کرنا ہو تو یا رحیم یا کریم یا ودود کا وظیفہ کرے یہ بھی اللہ تعالیٰ کے صفاتی نام ہیں اور ودود کا معنٰی ہے محبت کرنے والا۔ (اس وظیفے کی ترکیب بھی وہی ہے جو میں نے اوپر ذکر کی ہے۔ نواز بلوچ)۔

اور اگر رزق کی تنگی ہو تو یا رحیم، یا کریم، یا رزاق ہر نماز کے ساتھ تین مرتبہ پڑھتا رہے۔ اللہ تعالیٰ کے تمام اسماء میں برکت ہے۔ اور ہر نام کی الگ الگ خاصیت ہے۔ تو الف سے مراد اللہ تعالیٰ ہے اور لام سے مراد لطیف ہے اور میم سے مراد مالک ہے۔ مالک بھی اللہ تعالیٰ کا نام ہے۔

﴿مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝﴾ جزا کے دن کا مالک ہے۔ اور میم سے مراد مقتدر بھی ہو سکتا ہے اور مقیت بھی ہو سکتا ہے یہ بھی اللہ تعالیٰ کے نام ہیں۔

۳......اور تیسری بات ان حروف مقطعات کے متعلق قاضی بیضاوی صاحب رحمۃ اللہ علیہ یہ فرماتے ہیں کہ اُنتیس سورتوں کی ابتداء میں جو حروف مقطعات ہیں سِرٌّ بَيْنَ اللهِ تَعَالٰى وَبَيْنَ رَسُوْلِهٖ ﷺ۔ یہ اللہ تعالیٰ اور رسول ﷺ کے درمیان راز ہیں۔ ان کے علاوہ ان کا مطلب کوئی نہیں جانتا۔ اور ان کا یہ مفہوم بھی بیان کیا ہے کہ الف سے مراد اٰلَاءُ اللهِ ہے۔ اٰلَاءٌ، اِلْيٌ یا اِلْوٌ کی جمع ہے اٰلَاءٌ کا معنٰی نعمتیں ہیں۔ قرآن پاک میں آتا ہے: ﴿فَبِاَيِّ اٰلَاۗءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝﴾ "تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔"

اور لام سے مراد لطف اللہ ہے۔ اور میم سے مراد مُلْكُ اللهِ ہے۔ معنٰی بنے گا نعمتیں بھی اللہ تعالیٰ کی، مہربانی بھی اللہ تعالیٰ کی اور ملک بھی اللہ تعالیٰ کا۔ یہ ان حروف کی مختلف تعبیریں بیان کی گئی ہیں۔ صحیح مفہوم اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔

﴿ذٰلِكَ الْكِتٰبُ﴾ یہ کتاب جو ہمارے سامنے موجود ہے ﴿لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ﴾ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے اور منبع رشد و ہدایت ہے۔ اور اس کی ہر بات حقیقت پر مبنی ہے۔ اس پر بہ ظاہر یہ سوال ہوتا ہے کہ شک کرنے والوں نے تو قرآن کریم پر شک کیا۔ چنانچہ خود قرآن کریم میں موجود ہے۔ نکالو اسی پارے کا تیسرا رکوع اس کی دوسری آیت

دیکھو۔(ایسا میں اس لیے کرتا ہوں تاکہ تم صرف سنو ہی نہیں بلکہ خود دیکھو کہ تمہیں کچھ شد بدھ حاصل ہو جائے)۔

﴿وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ﴾ (البقرۃ:۲۳)

"اور اگر ہو تم شک میں اس چیز کے بارے میں جو ہم نے اپنے بندے پر نازل فرمائی ہے تو لاؤ تم اس جیسی کوئی ایک سورت۔"

تو اس سے معلوم ہوا کہ شک کرنے والوں نے قرآن کریم پر شک کیا ہے۔اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ﴿لَا رَيْبَ فِيْهِ﴾ اس میں کوئی شک نہیں ہے۔

قرآنِ کریم میں شک کا مطلب

اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن کریم میں تو کوئی شک نہیں ہے یہ ان کے ذہنوں میں شک تھا۔تو یہ الگ الگ چیزیں ہیں آپس میں کوئی تضاد نہیں ہے۔اس کی مثال تم اس طرح سمجھو کہ جیسے شہد ہے کہ اس کے میٹھے ہونے میں تو کوئی شک نہیں ہے لیکن صفراوی مزاج والے آدمی کو بخار ہو تو اسے شہد کڑوا لگتا ہے۔شہد تو کڑوا نہیں ہے اس کا مزاج کڑوا ہے۔اسی طرح قرآن کریم میں تو کوئی شک نہیں ہے ان کے ذہنوں میں شک ہے۔

یا اس طرح سمجھو کہ بعض آدمی بھینگے ہوتے ہیں۔ان کو ایک کی بجائے دو چیزیں نظر آتی ہیں چیز تو ایک ہوتی ہے مگر اس کی آنکھوں میں خلل ہوتا ہے۔جیسے: کیمل پور (اٹک) میں غلام جیلانی برق بھینگا تھا۔اس نے دو قرآن کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے اس بھینگے کو ایک قرآن دو نظر آتے تھے۔اسی طرح اس نے دو اسلام نامی کتاب بھی لکھی ہے۔اس کا جواب میں نے صرف ایک اسلام نامی کتاب لکھ کر دیا ہے۔اور یہ میں نے ملتان جیل میں لکھی تھی۔تو اس بھینگے کو ایک کی بجائے دو اسلام نظر آتے تھے۔اور اس کی کتاب دو قرآن کا جواب قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے دیا تھا۔لہٰذا قرآن کریم میں تو کوئی شک نہیں ہے۔ ان کے ذہنوں میں شک تھا۔

﴿هُدًى﴾ یہ تو نری ہدایت ہے۔﴿لِّلْمُتَّقِيْنَ﴾ پرہیز گاروں کے لیے۔اس پر بھی بظاہر اعتراض ہوتا ہے کہ جو پہلے ہی پرہیز گار ہیں ان کے لیے ہدایت ہونا کیا کمال ہے؟ کمال یہ تو تھا کہ نافرمانوں اور مجرموں کے لیے یہ کتاب ہدایت ہوتی۔

اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ قرآن کریم ہدایت تو تمام انسانوں کے لیے ہے جیسا کہ دوسرے پارہ میں ہے ﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ﴾ اور سورۃ فرقان میں ہے ﴿تَبٰرَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا﴾ "بابرکت ہے وہ ذات جس نے فرقان نازل فرمایا اپنے بندے پر تاکہ تمام جہانوں کے لئے نذیر بنے۔" مگر چونکہ فائدہ اس سے پرہیز گار اٹھاتے ہیں دوسرے لوگ فائدہ نہیں اٹھاتے اس لیے ان کے لیے ہدایت نتیجے کے اعتبار سے ہے کہ متقی اس کو قبول کرنے والے ہیں آگے کون لوگ ہیں؟

مؤمنین کی صفات

①......متقیوں کی پہلی صفت

فرمایا ﴿اَلَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ﴾ پرہیز گار وہ لوگ ہیں جو ایمان لاتے ہیں بن دیکھے۔ ہم نے اللہ تعالیٰ کو نہیں دیکھا اس کی قدرت کی نشانیاں دیکھی ہیں۔ ہمارا ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ واجب الوجود ذات ہے جو تمام صفات وکمالات کو جامع ہے اور سارا جہان اس کے تصرف اور قبضے میں ہے۔ اس کی نہ ابتداء ہے نہ انتہا ہے، نہ اس کا باپ ہے، نہ ماں ہے، نہ وہ کھاتا ہے، نہ پیتا ہے، نہ وہ بیمار ہوتا ہے، نہ اس کو موت آئے گی، وہ تمام کمزوریوں اور عیبوں سے پاک اور مبرا ہے۔

جس طرح ہم نے اللہ تعالیٰ کو نہیں دیکھا مگر اس پر ہمارا ایمان ہے اسی طرح ہم نے پیغمبروں کو بھی نہیں دیکھا مگر ان پر بھی ہمارا ایمان ہے۔ سب سے پہلے پیغمبر آدم علیہ السلام اور سب سے آخری پیغمبر حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ ان کے درمیان بھی جتنے پیغمبر تشریف لائے ہیں ان سب پر ہمارا ایمان ہے کہ وہ اپنے اپنے زمانے میں برحق پیغمبر تھے۔

اسی طرح ہم نے فرشتوں کو بھی نہیں دیکھا اور دعا کرو کہ جلدی جلدی نظر بھی نہ آئیں کیونکہ موت کے وقت فرشتے ہر ایک کو نظر آتے ہیں۔ مگر ہمارا ایمان ہے کہ فرشتے موجود ہیں۔

اسی طرح جنت اور دوزخ پر بن دیکھے ہمارا ایمان ہے۔ پل صراط اور میدانِ محشر کو بن دیکھے مانتے ہیں، قبر کی راحت اور تکلیف کو نہیں دیکھا مگر اس پر ایمان ہے۔ اللہ تعالیٰ قبر کی تکلیف سے سب کو محفوظ فرمائے۔

تو متقیوں کی پہلی صفت ایمان بالغیب ہے یعنی عقیدے کا درست ہونا۔

②......متقیوں کی دوسری صفت

﴿وَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ﴾ اور وہ قائم کرتے ہیں نماز کو۔ قائم کرنے کا معنیٰ ہے کہ نماز کو تمام شرائط اور واجبات کے ساتھ ادا کرتے ہیں۔ جو لوگ رکوع، سجود، قومہ، جلسہ اطمینان کے ساتھ ادا نہیں کرتے ان کی نماز کامل نہیں ہوتی۔ ایسے ہی ٹکریں مارتے ہیں۔

اسی طرح جو آدمی بغیر مجبوری کے جماعت کے ساتھ نماز نہیں پڑھتا اکیلے پڑھ لیتا ہے۔ اس کی بھی کامل نماز نہیں ہوتی۔ اور جو لوگ مسجد کے قریب رہتے ہیں وہ اگر مسجد میں نماز نہ پڑھیں تو ان کی نماز بھی نہیں ہوگی۔

حدیث پاک میں آتا ہے: ((لَا صَلٰوةَ لِجَارِ الْمَسْجِدِ اِلَّا فِی الْمَسْجِدِ)). مسجد کے پڑوسی کی نماز صرف مسجد میں ہی ہوتی ہے۔ ہاں کوئی بڑھاپے کی وجہ سے گھٹنوں اور ٹخنوں سے رہ گیا ہے یا بیمار ہے یا بارش کی وجہ سے مسجد میں نہیں آسکتا یا سفر پر ہے یا اندھیرا ہے یا اور کوئی ایسی وجہ ہے تو اس کو گھر میں نماز پڑھنے پر بھی پوری نماز کا ثواب ملے گا۔

③......متقیوں کی تیسری صفت

﴿ وَ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ یُنْفِقُوْنَ ۝ ﴾ اور اس چیز سے جو ہم نے ان کو رزق دیا ہے خرچ کرتے ہیں۔ اکثر حضرات تو فرماتے ہیں کہ چیز سے مراد مال ہے یعنی ہم نے ان کو جو مال دیا ہے اس سے خرچ کرتے ہیں زکوٰۃ ادا کرتے ہیں عشر نکالتے ہیں، فطرانہ ادا کرتے ہیں اور نفلی صدقات بھی کرتے رہتے ہیں۔ بخاری شریف میں روایت ہے:

((اِنَّ فِی الْمَالِ حَقًّا سِوَی الزَّکٰوۃِ)). "بے شک مال میں زکوٰۃ کے علاوہ بھی حق ہے۔"

بعض لوگ بڑے کنجوس ہوتے ہیں زکوٰۃ کے مال کے علاوہ مال خرچ کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے رشتہ داریاں بھی زکوٰۃ کے ساتھ نبھاتے ہیں۔ مثلاً: ان کے عزیزوں، رشتہ داروں کی شادیاں ہوں تو آکر مسئلہ پوچھتے ہیں کہ ہمارے عزیز کے بچہ بچی کی شادی ہے وہاں ہماری زکوٰۃ لگ سکتی ہے؟ بھائی! ٹھیک ہے اگر وہ مستحق ہے تو اس کو زکوٰۃ لگ جائے گی مگر زکوٰۃ کے علاوہ دوسرا مال بھی تو تمہارے پاس موجود ہے وہ کیوں نہیں دیتے؟ زکوٰۃ پر کیوں ٹرخاتے ہو؟

امام رازی رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر

امام فخر الدین رازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ﴿ وَ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ یُنْفِقُوْنَ ۝ ﴾ سے مراد صرف مال ہی نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ نے جو بھی نعمت اور قوت عطا فرمائی ہے، علم ہے، عقل ہے، بدنی طاقت ہے اس کو اللہ تعالیٰ کے راستہ میں خرچ کرتے ہیں۔ کسی کو اللہ تعالیٰ نے علم عطا فرمایا ہے وہ اس کو خرچ کرتے ہیں کہ دوسروں کو تعلیم دیتے ہیں۔

اور مسئلہ یہ ہے کہ اگر تمہارے پاس شریعت کا ایک مسئلہ بھی ہے تو اس کو دوسروں تک پہنچانا تمہارے فریضہ میں داخل ہے۔ اگر کسی کو اللہ تعالیٰ نے عقل عطا فرمائی ہے تو وہ دوسروں کو اچھا مشورہ دے ان کی راہنمائی کرے کسی کو رب تعالیٰ نے قوتِ بدنی عطا فرمائی ہے تو وہ کمزوروں کی بدنی مدد کرے کہ ان کے کام آئے، ان کا ہاتھ بٹائے۔

④......متقیوں کی چوتھی صفت

﴿ وَ الَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِمَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْكَ ﴾ اور وہ لوگ ہیں جو ایمان لاتے ہیں اس چیز پر جو نازل کی گئی آپ کی طرف۔ قرآن کریم اور حدیث شریف پر ایمان لاتے ہیں۔ حدیث بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کی گئی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((اِنِّیْ اُوْتِیْتُ الْقُرْاٰنَ وَمِثْلَهٗ مَعَهٗ)).

"کان کھول کر سن لو! مجھے اللہ تعالیٰ نے قرآن بھی دیا ہے اور حدیثیں بھی عطا کی ہیں۔"

قرآن اور حدیث میں فرق یہ ہے کہ قرآنِ کریم کے الفاظ وہ ہیں جو لوحِ محفوظ سے نازل ہوئے ہیں اور حدیث کے الفاظ وہ ہیں جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تلفظ فرمائے ہیں۔ اور مفہوم قرآن وحدیث دونوں کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ قرآن کریم

کے الفاظ بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے اور مفہوم بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے اور حدیث میں مفہوم اللہ تعالیٰ کی طرف سے اور اس کی تعبیر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے الفاظ میں فرماتے تھے۔

جبرئیل علیہ السلام جو حکم آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک پہنچاتے آپ اس کا ترجمہ اپنی زبان میں کر دیتے تو قرآن بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور حدیث بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ لہٰذا جس طرح قرآن کریم کا منکر کافر ہے اسی طرح مجموعی حیثیت سے احادیث کا منکر بھی پکا کافر ہے۔

⑤......متقیوں کی پانچویں صفت

﴿ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ ﴾ اور اس چیز پر جو نازل کی گئی آپ سے پہلے۔ جتنی بھی آسمانی کتابیں اور صحیفے ہیں ان سب پر ہمارا ایمان ہے اور ایمان مفصل میں ہم پڑھتے ہیں:

((اٰمَنْتُ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ)).

"میں ایمان لایا اللہ تعالیٰ پر اور اس کے فرشتوں پر اور اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر۔"

یہاں یہ بات بھی سمجھ لیں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ متقی وہ لوگ ہیں جو ایمان لاتے ہیں اس چیز پر جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل کی گئی اور اس پر ایمان لاتے ہیں جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پہلے نازل کی گئی اگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد کسی نے آنا ہوتا تو فرماتے اور ایمان لاتے ہیں اس پر جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد نازل کی جائے گی مگر یہ نہیں فرمایا کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد نازل ہونے والی کوئی چیز تھی ہی نہیں اس لیے ((مِنْ بَعْدِكَ)) نہیں فرمایا۔ اگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد نبوت ہوتی اور وحی آنی ہوتی تو یقیناً اللہ تعالیٰ اس کے متعلق بھی فرماتے۔

⑥......متقیوں کی چھٹی صفت

﴿ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ۝ ﴾ اور وہ آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔ کہ قیامت حق ہے اور مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونا ہے اور یاد رکھنا! قیامت دور نہیں ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے:

((مَنْ مَّاتَ فَقَدْ قَامَتْ قِيَامَتُهٗ)). "جو شخص مرتا ہے پس تحقیق اس کی قیامت قائم ہو جاتی ہے۔"

بس آنکھیں بند ہونے کی دیر ہے۔ جنت دوزخ سامنے آجائے گی بلکہ آنکھیں بند ہونے سے پہلے دُنیا کی زندگی کے آخری لمحات میں ہی فرشتے نظر آنے لگ جاتے ہیں۔ مرنے والے کے علاوہ دوسرے لوگوں کو نظر نہیں آتے۔ کیونکہ ایمان بالغیب ہے۔ اور مرنے والے کو جان نکالنے والا فرشتہ اور اس کے ساتھ جو اس کے معاون ہوتے ہیں، نظر آتے ہیں۔ نیک ہے تو جنت کا لباس اور خوشبوئیں لے کر آتے ہیں اور اگر بد ہے تو جہنم کے ٹاٹ اور بدبوئیں لے کر آتے ہیں۔ اس لیے قبر کو نہ بھولو، جزا سزا کو نہ بھولو، آخرت کو نہ بھولو۔

جوانی میں عبادت

نوجوانو یاد رکھو! عبادت تو عبادت ہے، نماز تو نماز ہی ہے چاہے نوجوان پڑھے یا بوڑھا مگر نوجوان کی عبادت اور نماز کا لطف ہی اور ہے۔ حدیث پاک میں آتا ہے کہ قیامت والے دن اللہ تعالیٰ کے عرش کے سائے کے نیچے جن لوگوں کو جگہ ملے گی ان میں ایک وہ شَابٌّ نوجوان ہوگا نَشَأَ فِيْ عِبَادَةِ اللّٰهِ تَعَالٰى جس کی جوانی اللہ تعالیٰ کی عبادت میں گزری ہوگی۔

لہٰذا جوانی کی حالت میں عبادت کا بڑا درجہ ہے۔ میں جو کچھ کہتا ہوں اس کو صرف سنو ہی نہیں بلکہ اس پر عمل بھی کرو۔ اللہ تعالیٰ سب کو اعمالِ صالحہ کی توفیق عطا فرمائے، آمین یا رب العالمین۔

﴿أُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى﴾ یہی لوگ ہدایت پر ہیں۔ ﴿مِّنْ رَّبِّهِمْ﴾ اپنے پروردگار کی طرف سے۔ ﴿وَ أُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝﴾ اور یہی لوگ ہیں فلاح پانے والے۔ ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا﴾ بے شک وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا۔ ﴿سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ﴾ برابر ہے ان پر۔ ﴿ءَاَنْذَرْتَهُمْ﴾ کہ آپ ان کو ڈرائیں۔ ﴿اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ﴾ یا نہ ڈرائیں۔ ﴿لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝﴾ وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ ﴿خَتَمَ اللّٰهُ﴾ مہر لگا دی اللہ تعالیٰ نے۔ ﴿عَلٰى قُلُوْبِهِمْ﴾ ان کے دلوں پر۔ ﴿وَ عَلٰى سَمْعِهِمْ﴾ اور ان کے کانوں پر۔ ﴿وَ عَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ﴾ اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے۔ ﴿وَّ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝﴾ اور ان کے لیے عذاب ہے بڑا۔

ربط کی اہمیت

کل کے درس میں آپ نے سنا کہ قرآن کریم اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوا اور اس میں کوئی شک نہیں ہے۔ اور پرہیز گاروں کے لیے ہدایت ہے۔ پھر پرہیز گاروں کے اوصاف بیان فرمائے کہ پرہیز گار وہ لوگ ہیں:

① ﴿الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ﴾ جو بن دیکھے اللہ تعالیٰ پر اعتماد کرتے ہیں اس کے پیغمبر پر ایمان لاتے ہیں اس کی کتابوں کو مانتے ہیں۔

② اور ان کی دوسری خوبی یہ ہے کہ نماز قائم کرتے ہیں۔ نماز ایسی عبادت ہے کہ جس پر اسلام کی عمارت کھڑی ہے۔ اگر نماز کو اسلام سے نکال دیا جائے تو اسلام کی عمارت کھڑی نہیں ہوسکتی۔ اس لیے حدیث پاک میں آتا ہے: ((اَلصَّلٰوةُ عِمَادُ الدِّيْنِ))۔ "نماز دین کا ستون ہے۔" ستون کے بغیر عمارت کھڑی نہیں ہوسکتی۔

③ اور تیسری صفت بیان فرمائی کہ ہم نے جو ان کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ مال ہے علم ہے قوتِ بدنی ہے مشورے کی صلاحیت ہے۔

④ چوتھی صفت بیان فرمائی کہ جو کچھ آپ ﷺ پر نازل ہوا ہے، قرآن وسنت میں اس پر ایمان لاتے ہیں۔

⑤ اور پانچویں صفت بیان فرمائی کہ آپ سے پہلے جو کچھ نازل ہوا ہے۔ توراۃ، انجیل، زبور اور صحیفے اس پر بھی ایمان لاتے ہیں۔

⑥ اور چھٹی صفت یہ بیان فرمائی کہ آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔

آگے اس کا نتیجہ بیان فرمایا:

﴿أُولَٰئِكَ عَلَىٰ هُدًى مِّن رَّبِّهِمْ﴾ یہی لوگ ہدایت پر ہیں اپنے پروردگار کی طرف سے ﴿وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۝﴾ اور یہی لوگ ہیں فلاح پانے والے۔ یہاں ایک بات اور سمجھ لیں۔ وہ یہ کہ آیا قرآن کریم آپس میں مربوط ہے یا نہیں؟ اس طرح کہ سورتوں کا سورتوں کے ساتھ ربط، رکوعوں کا رکوعوں کے ساتھ ربط، آیتوں کا آیتوں کے ساتھ آپس میں ربط اور جوڑ ہے یا نہیں؟ تو اس سلسلہ میں مفسرین کرام رحمہم اللہ کے دو گروہ ہیں۔

①...... ایک گروہ کا نظریہ ہے کہ کوئی ربط نہیں ہے۔ یہ شاہی فرمان ہے، بادشاہ اپنے ایک وزیر کو حکم دیتا ہے کہ تو نے یہ کام کرنا ہے دوسرے وزیر کو حکم دیتا ہے کہ تو نے وہ کام کرنا ہے۔ باورچی کو اس کے متعلق حکم دیتا ہے۔ دھوبی کو اس کے متعلقہ حکم دیتا ہے کہ تو نے کپڑے دھونے ہیں، ان کو استری کرنی ہے۔ کسی کو بوٹ پالش کرنے کا حکم دیتا ہے۔ یعنی ہر ایک کے حال کے مطابق حکم دے گا۔ ان کے درمیان ربط کا ہونا ضروری نہیں ہے۔ بادشاہ کے احکام ہیں بس ٹھیک ہیں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ہر ایک کے حال کے مطابق احکام جاری فرمائے ہیں ان میں ربط تلاش کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ بس شاہی فرمان ہے، اس کو مانو اور اس پر عمل کرو۔

②...... اور مفسرین کرام رحمہم اللہ کا دوسرا گروہ کہتا ہے کہ بے شک قرآن کریم شاہی فرمان ہے مگر شاہی فرمان ہونے کے باوجود اس میں ربط موجود ہے۔ اور قرآن کریم کی تفسیر میں جو خاص مشکل چیزیں ہیں ان میں ایک "ربط" بھی ہے۔

جو حضرات ربط کے قائل ہیں ان میں امام فخر الدین رازی رحمہ اللہ علیہ، علامہ ابو السعود محمد بن محمد عمادی رحمہ اللہ علیہ، مولانا عبد الحق حقانی رحمہ اللہ علیہ، مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ علیہ اور ہمارے پیر و مرشد مولانا حسین علی صاحب رحمہ اللہ علیہ (واں بھچراں والے) کے علاوہ کئی دیگر بزرگ شامل ہیں۔ یہ حضرات فرماتے ہیں کہ سورہ فاتحہ اور سورۃ بقرہ میں یہ ربط ہے کہ سورۃ فاتحہ میں صراط مستقیم کا مطالبہ تھا۔ اور سورۃ بقرہ میں اس کی منظوری ہے کہ تم نے جو ہدایت مانگی تھی وہ میں نے اس کتاب کی شکل میں تمہیں دے دی ہے۔ ﴿ذَٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ ۛ فِيهِ ۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ ۝﴾ اس کتاب میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے اور یہ پرہیزگاروں کے لئے ہدایت ہے۔

جب بھی کوئی مصلح پروگرام لے کر لوگوں کے پاس آیا ہے تو اس کا واسطہ تین قسم کے لوگوں کے ساتھ پڑا ہے۔

①...... ایک وہ جنہوں نے اس کو دل اور زبان سے مانا اور یقین کیا یعنی انہوں نے اس کو ظاہراً اور باطناً تسلیم کیا ﴿أُولَٰئِكَ عَلَىٰ هُدًى مِّن رَّبِّهِمْ ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۝﴾ تک اس گروہ کا ذکر تھا۔ یہ مومن متقی کہلاتے ہیں۔

②...... اور دوسرا گروہ وہ ہوتا ہے جو نہ دل سے مانتا اور تسلیم کرتا ہے اور نہ زبان سے یہ کافر جابر کہلاتا ہے۔ اگلی دو آیتوں میں اس گروہ کا ذکر ہے۔

③...... اور تیسرا گروہ ان لوگوں کا ہوتا ہے جو زبان سے مانتے ہیں مگر دل سے تسلیم نہیں کرتے۔ یہ منافق کہلاتے ہیں۔ اگلے سارے رکوع میں یعنی ﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ﴾ سے لے کر ﴿اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ﴾ تک ان کا ذکر ہے۔ اور ایسے لوگوں سے چونکہ زیادہ خطرہ ہوتا ہے کہ یہ اندر سے کچھ اور باہر سے کچھ ہوتے ہیں، لوٹے کی طرح پھرتے رہتے ہیں اس لیے ان کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا۔ ان دو آیتوں میں جابر کافروں کا ذکر ہے۔ جو نہ دل سے مانتے ہیں اور نہ زبان سے اقرار کرتے ہیں۔ یعنی انھوں نے قرآن کریم کو اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ دل سے مانا اور نہ زبان سے اقرار کیا۔

منکرین کا انجام

فرمایا: ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا﴾ بے شک وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا ﴿سَوَآءٌ عَلَیْهِمْ﴾ برابر ہے ان پر ﴿ءَاَنْذَرْتَهُمْ﴾ کیا آپ ان کو ڈرائیں ﴿اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ﴾ یا نہ ڈرائیں ﴿لَا یُؤْمِنُوْنَ ۝﴾ وہ ایمان نہیں لائیں گے۔

اس آیتِ کریمہ پر دو اشکال وارد ہوتے ہیں۔

①...... ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ کفار کو آپ ڈرائیں یا نہ ڈرائیں وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ تو جب ان کے حق میں ڈرانا اور نہ ڈرانا برابر ہے تو ان کو ایمان کی دعوت دینا اور تبلیغ کرنے کا کیا فائدہ ہے؟ اور اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذمہ ایسا مہمل کام کیوں لگایا ہے؟

اس کے جواب میں قاضی بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ اور علامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ﴿سَوَآءٌ عَلَیْهِمْ﴾ فرمایا ہے ﴿سَوَآءٌ عَلَیْكَ﴾ نہیں فرمایا۔ یعنی ان کافروں کے لیے برابر ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تبلیغ کرنا، نہ کرنا برابر ہے۔ بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دعوت اور تبلیغ کا ثواب ملے گا کوئی مانے یا نہ مانے۔ اور اب بھی یہی مسئلہ ہے کہ جو مبلغ حق کی تبلیغ کرتا ہے اس کو بیان کرنے کا ثواب ملے گا اگر کوئی خوش قسمت مان لے تو نور علیٰ نور اور اگر کوئی نہ بھی مانے تو اس کے ثواب میں کوئی کمی نہیں آئے گی۔

②...... دوسرا اشکال یہ وارد ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿لَا یُؤْمِنُوْنَ ۝﴾ وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ حالانکہ بہت سارے کافر ایمان لائے۔ دیکھو! صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پہلے کافر مشرک ہی تو تھے اس کے جواب میں مفسرین کرام رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ اس کا مصداق وہ کافر ہیں کہ جن کے متعلق اللہ تعالیٰ کے علم میں تھا کہ ان کی استعداد خراب ہے اور ان کا خاتمہ کفر پر ہونے والا ہے۔ جیسے ابوجہل، ابولہب، عتبہ، شیبہ، عاص بن وائل اور ولید بن مغیرہ وغیرہ جن کا خاتمہ کفر پر ہی ہوا۔ اور جن کی قسمت میں ایمان تھا یعنی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، وہ اس میں داخل نہیں ہیں۔

دلوں پر مہر کا مطلب

اگلی آیت کریمہ کو ذرا غور اور توجہ کے ساتھ سمجھیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ﴾ مہر لگا دی

اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر ﴿وَ عَلٰى سَمْعِهِمْ﴾ اور ان کے کانوں پر ﴿وَ عَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ﴾ اور ان کی آنکھوں پر پردے ہیں۔

یہاں پر یہ اشکال پیدا ہوتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر مہر لگادی کانوں میں ڈاٹے چڑھادیے اور آنکھوں پر پردے ڈال دیے یعنی ان کی ہدایت کے سارے راستے بند کردیے تو اس کے بعد اگر وہ ایمان نہ لائیں تو ان کا کیا قصور ہے؟ وہ رب تعالیٰ سے زور آور تو نہیں ہیں کہ خود پردے اٹھالیں، ڈاٹے نکال لیں اور دلائل کو دیکھ سن کر ایمان لے آئیں۔ رب، رب ہے اس سے زیادہ طاقت ور کون ہے۔ اور کافر بھی رب کو رب مانتے تھے اور مشرک بھی رب تعالیٰ کے وجود کے قائل تھے بلکہ ظاہر طور پر اگر دیکھا جائے تو نام کے مسلمانوں سے مشرکوں کو رب تعالیٰ سے عقیدت زیادہ تھی۔ اور یہ قرآن کریم سے ثابت ہے۔

شرک کا وسیلہ

چنانچہ آٹھویں پارے میں اللہ تعالیٰ نے مشرکوں کا دستور بتایا ہے فرمایا ﴿وَ جَعَلُوْا لِلّٰهِ مِمَّا ذَرَاَ مِنَ الْحَرْثِ وَ الْاَنْعَامِ نَصِيْبًا﴾ اور بناتے ہیں اللہ تعالیٰ کے لیے اس کی پیدا کی ہوئی کھیتی سے اور مویشیوں سے ایک حصہ ﴿فَقَالُوْا﴾ پھر کہتے ہیں ﴿هٰذَا لِلّٰهِ﴾ یہ حصہ اللہ تعالیٰ کا ہے ﴿بِزَعْمِهِمْ﴾ اپنے خیال کے مطابق ﴿وَ هٰذَا لِشُرَكَآئِنَا﴾ اور یہ ہمارے شریکوں کا ہے۔ تو مشرک پہلے رب تعالیٰ کا حصہ نکالتے تھے پھر خود ساختہ معبودوں کا حصہ نکالتے تھے۔ جب کہ یہ نام کے مسلمان جن کو دین کی حقیقت کا علم نہیں ہے یہ صرف بزرگوں کے پیچھے پھرتے رہتے ہیں، انہیں کا دھواں دھکاتے رہتے ہیں پھر تھک ہار کے رب تعالیٰ کی طرف آتے ہیں۔

اور سورۃ یونس میں آتا ہے کہ مشرک کہتے تھے ﴿هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ﴾ یہ اللہ تعالیٰ کے پاس ہماری سفارش کرنے والے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی ذات بہت بلند ہے اور ہم بڑے گھٹیا اور حقیر ہیں۔ اللہ تعالیٰ تک ہماری رسائی نہیں ہے۔ یہ ہماری سفارش کرتے ہیں۔ کہتے تھے کہ اس طرح سمجھو کہ صدر مملکت کو رعیت کا ہر آدمی تو بغیر واسطہ کے نہیں مل سکتا بلکہ ڈی، سی، کمشنر، وزیر اعلیٰ وغیرہ کا واسطہ تلاش کرے گا۔ جن کے ذریعے سے وہاں تک پہنچے گا۔ اسی طرح ہم ان کے ذریعے خدا تک پہنچتے ہیں۔

اور سورۃ زمر میں ہے کہ وہ کہتے تھے ﴿مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى﴾ ہم ان کی عبادت صرف اس لیے کرتے ہیں کہ یہ ہمیں اللہ تعالیٰ کے قریب کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کے لیے یہ ہماری سیڑھیاں ہیں۔ ہماری ان کے آگے اور ان کی خدا کے آگے۔ مشرک ان کو رب نہیں مانتے تھے بلکہ رب تعالیٰ تک پہنچنے کے لیے سیڑھیاں بناتے تھے۔

اللہ تعالیٰ نے سورۃ نحل میں فرمایا ﴿فَلَا تَضْرِبُوْا لِلّٰهِ الْاَمْثَالَ﴾ پس تم خدا کے لیے ایسی مثالیں نہ بیان کرو ﴿اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ وَ اَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ۝﴾ بے شک اللہ تعالیٰ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کو تمہارے حالات اور ضروریات کا علم ہے۔ اس کو کسی کے ذریعہ سے بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اور تمہارے صدر وغیرہ کچھ نہیں جانتے۔ بلکہ وہ تو پہلے ملاقاتیوں

کی تسلی کرے گا کہ کہیں کوئی مجھے گولی مارنے کے لیے تو نہیں آ رہا، پھر ملاقات کی اجازت دے گا۔

لہٰذا اللہ تعالیٰ کے لیے ایسی مثال بھی دیتے تھے کہ مکان کی چھت پر چڑھنے کے لیے سیڑھیوں کی ضرورت ہوتی ہے اُڑ کر تو کوئی نہیں جا سکتا۔ تو یہ بزرگ اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کے لیے ہماری سیڑھیاں ہیں۔ اس کا جواب اللہ تعالیٰ نے اس طرح دیا کہ فرمایا ﴿وَ نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ﴾ ہم تو اس کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہیں۔ تو یہاں کون سی سیڑھی لگاؤ گے؟ اس ساری گفتگو سے آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ مشرک رب تعالیٰ کا منکر نہیں ہوتا بلکہ بہ ظاہر بڑا اعقیدت مند ہوتا ہے۔ اور رب تعالیٰ کو بڑا سمجھتا ہے۔

تو جب رب تعالیٰ نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی، کانوں پر مہر لگا دی، آنکھوں پر پردے ڈال دیے تو وہ ان کو ہٹا کر کیسے ایمان لا سکتے ہیں؟ تو وہ ایمان نہ لائیں تو ان کا کیا قصور ہے؟ ایمان لانے کے راستے بھی بند کر دیے جائیں اور ان کو کہا جائے کہ ایمان لاؤ۔ یہ تو اس طرح ہے جس طرح فارسی زبان کا شاعر کہتا ہے۔

درمیان قعر دریا تحت بندم کردہٴ
باز میگوئی کہ دامن تر مکن ہوشیار باش

کہ کسی شخص کے ہاتھ پاؤں باندھ کر پانی میں پھینک دیا جائے اور اسے کہا جائے کہ تَر نہ ہونا۔ بھائی! وہ پانی سے تر نہ ہوگا تو اور کیا ہوگا۔ تو جب رب تعالیٰ نے مہریں لگا کر ان کے راستے بند کر دیے تو اب وہ اگر ایمان نہ لائیں تو ان کا کیا گناہ ہے؟

اسی طرح سورۃ مدثر میں آتا ہے ﴿يُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ يَّشَآءُ وَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ﴾ اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔ تو ہدایت اور گمراہی تو اللہ تعالیٰ کی مرضی سے ہے تو پھر گمراہوں کا کیا قصور ہے؟ اس کا جواب سمجھنے سے پہلے ایک اصول سمجھ لیں وہ یہ کہ قرآن کریم میں ایک جگہ اجمال ہوتا ہے تو دوسری جگہ اس کی تفصیل ہوتی ہے۔ قرآن پاک نے کسی مسئلے میں اشتباہ نہیں رہنے دیا بلکہ دوسری جگہ اس کی وضاحت کر دی ہے کوئی نہ سمجھے تو اس کی مرضی ہے۔

اس اشکال کا جواب سمجھنے کے لیے آپ سورۃ حٰم سجدہ نکالیں۔ یہ پہلی آیات تو میں تبرک کے طور پر پڑھتا ہوں۔

﴿حٰمٓ ۚ تَنْزِيْلٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۚ﴾ یہ رحمٰن اور رحیم کی طرف سے اُتارا گیا ہے ﴿كِتٰبٌ فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ﴾ یہ قرآن کریم ایسی کتاب ہے جس کی آیات تفصیل کے ساتھ بیان کی گئی ہیں ﴿قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا﴾ قرآن عربی زبان میں ہے ﴿لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۙ﴾ اُس قوم کے لیے جو جانتی ہے کہ یہ قرآن ہے ﴿بَشِيْرًا وَّ نَذِيْرًا ۚ﴾ یہ خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا ہے۔ لیکن قرآن کریم کے ساتھ قوم نے کیا کیا؟ فرمایا: ﴿فَاَعْرَضَ اَكْثَرُهُمْ﴾ پس ان کی اکثریت نے اعراض کیا۔ اس جملے کو نہ بھولنا کہ ان کی اکثریت نے قرآن کریم سے اعراض کیا، اس سے چہرہ پھیر لیا۔ ﴿فَهُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ﴾ پس وہ سنتے نہیں ہیں یعنی مانتے نہیں ہیں اور کہتے کیا ہیں؟ ﴿وَ قَالُوْا﴾ اور انھوں نے کہا ﴿قُلُوْبُنَا فِيْۤ اَكِنَّةٍ﴾ اَكِنَّةٌ، كِنَانٌ کی جمع ہے اور کنان کا معنٰی ہے پردہ اور غلاف۔ معنٰی ہوگا ہمارے دل غلافوں میں ہیں۔

﴿مِمَّا تَدْعُوْنَآ اِلَیْهِ﴾ اس چیز سے جس کی طرف تم ہمیں دعوت دیتے ہو یعنی ہم نے اپنے دلوں کو پردوں میں سنبھال رکھا ہے تمہاری دعوت کا ہمارے اوپر کوئی اثر نہیں ہے۔ ﴿وَ فِیْٓ اٰذَانِنَا وَقْرٌ﴾ اور ہمارے کانوں میں ڈاٹے ہیں، ہم نے کانوں میں ڈاٹے چڑھائے ہوئے ہیں۔ ﴿وَّ مِنْۢ بَیْنِنَا وَ بَیْنِكَ حِجَابٌ﴾ اور ہمارے اور تیرے درمیان پردہ ہے ہم نے اپنی آنکھوں کے آگے پردہ لٹکایا ہوا ہے ہم ان نگاہوں سے تجھے دیکھنے کے لئے تیار نہیں ہیں جن نگاہوں سے تجھے ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما دیکھتے ہیں۔ ﴿فَاعْمَلْ﴾ پس تو اپنا کام کر ﴿اِنَّنَا عٰمِلُوْنَ ۝﴾ ہم اپنا کام کرنے والے ہیں۔

اب دیکھو! جن لوگوں نے اپنے کسب، اختیار اور ارادے سے اپنے دلوں پر غلاف چڑھا لیے، کانوں میں ڈاٹے ٹھونک لیے، اپنی آنکھوں پر پردے لٹکائے اور اپنے لیے ہدایت کے تمام راستے بند کر لیے تو اللہ تعالیٰ نے بھی ان کے ساتھ ویسا ہی عمل کیا۔ کیونکہ قانونِ خداوندی ہے: ﴿نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى﴾ جدھر کوئی جانا چاہتا ہے ہم اس کو ادھر ہی بھیج دیتے ہیں۔ تو جب انہوں نے پردے لٹکا لیے تو اللہ تعالیٰ نے کہا ٹھیک ہے تم اس پر راضی ہو تو ﴿خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ﴾ مہر لگا دی اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر ﴿وَ عَلٰى سَمْعِهِمْ﴾ اور ان کے کانوں پر ﴿وَ عَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ﴾ اور ان کی آنکھوں پر پردے ہیں۔ جو انہوں نے پسند کیا اللہ تعالیٰ نے ویسا کر دیا۔ اللہ تعالیٰ کسی پر جبر نہیں کرتا۔ اللہ تعالیٰ نے پیدا کرنے کے بعد اختیار دیا ہے۔

﴿فَمَنْ شَآءَ فَلْیُؤْمِنْ وَّ مَنْ شَآءَ فَلْیَكْفُرْ﴾ پس جس کا جی چاہے ایمان لائے اور جس کا جی چاہے کفر اختیار کرے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تو دونوں راستے دکھا دیئے۔ فرمایا ﴿وَهَدَیْنٰهُ النَّجْدَیْنِ ۝﴾ اور ہم نے اس کو دکھا دیئے دونوں راستے، خیر کا بھی اور شر کا بھی۔

اسی طرح قرآن کریم کی اس آیت کریمہ ﴿یُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ یَّشَآءُ وَ یَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ﴾ گمراہ کرتا ہے اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے اور ہدایت دیتا ہے جس کو چاہتا ہے کی تفصیل بھی متعدد مقامات پر موجود ہے کہ اللہ تعالیٰ کس کو ہدایت دیتا ہے اور کس کو گمراہ کرتا ہے۔ تیرہواں پارہ سورۃ رعد میں ارشادِ ربانی ہے: ﴿وَ یَهْدِیْٓ اِلَیْهِ مَنْ اَنَابَ ۝﴾ اور اپنی طرف کا راستہ اسے دکھاتا ہے جو اس کی طرف رجوع کرتا ہے۔ تو ہدایت اس کو نصیب ہوتی ہے جو رب تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہے۔ اور گمراہ کس کو کرتا ہے؟

فرمایا: ﴿فَلَمَّا زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ﴾ (الصف: ۵) پس جب ان لوگوں نے کجی اختیار کی تو اللہ تعالیٰ نے بھی ان کے دل ٹیڑھے کر دیے۔ تو اللہ تعالیٰ نے جبراً کسی کو گمراہ نہیں کیا۔ ان آیات کو یاد کرو اور سمجھو تاکہ کوئی تمہیں دھوکہ نہ دے سکے کہ بندے کو کوئی اختیار نہیں ہے، یہ تو مجبور ہیں۔ یہ بات بالکل غلط ہے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے بندے کو اختیار دیا ہے ﴿فَمَنْ شَآءَ فَلْیُؤْمِنْ وَّ مَنْ شَآءَ فَلْیَكْفُرْ﴾ ''پس جس کا جی چاہے ایمان لائے اور جس کا جی چاہے کفر اختیار کرے۔''

معتزلہ اور جبریہ کے عقائد باطلہ :

جبر اور اختیار کے متعلق دو فرقے ہیں ان کے نظریات بھی سمجھ لیں۔

❀......ایک فرقہ ہے معتزلہ۔ معتزلہ یہ کہتے ہیں کہ تقدیر کوئی چیز نہیں ہے کیونکہ اگر ہم تقدیر مانتے ہیں تو ہمیں کس نیکی کا صلہ ملے گا؟ کیونکہ جو لکھا ہے وہی کرتے ہیں اس میں ہمارا کیا اختیار ہے؟ لہٰذا انہوں نے سرے سے تقدیر کا انکار کر دیا۔

❀......اور دوسرا فرقہ ہے جبریہ وہ کہتے ہیں کہ ہم رب تعالیٰ کے ہاتھ میں کٹھ پتلی ہیں ہم کچھ نہیں کر سکتے رب تعالیٰ ہی ہم سے سب کچھ کرواتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم مجبورِ محض ہیں۔

لیکن اہلِ حق اہل السنۃ والجماعت کا نظریہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بندے کو مجبورِ محض بھی نہیں بنایا اور ہر چیز کا اختیار بھی نہیں دیا اور جتنا اختیار دیا ہے اس سے اتنا ہی پوچھا جائے گا۔ (کتنا اختیار دیا ہے اس کو اس طرح سمجھیں کہ ایک ٹانگ اٹھانے کا اختیار دیا ہے بہ یک وقت دونوں ٹانگوں کو اٹھانے کا اختیار نہیں دیا۔ اگر ایسا کرے گا تو گر جائے گا۔ بلوچ)۔

اب ایک سوال تھا سا مشکل ہے وہ یہ کہ دنیا میں جو کچھ ہونے والا ہے یا ہو رہا ہے سب کچھ پہلے سے تقدیر میں لکھا ہوا ہے اور اس لکھے ہوئے کو ہم بدل نہیں سکتے تو پھر ہم مجبورِ محض ہوئے۔ یہ بات اسی طرح ہے کہ سب کچھ پہلے سے تقدیر میں لکھا ہوا ہے اس بات کو اچھی طرح سمجھ لیں۔

علماءِ متکلمین نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ﴿بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ○﴾ ہے وہ ہر چیز کو جانتا ہے اور ﴿عَلِيمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ○﴾ ہے وہ دلوں کے رازوں کو جانتا ہے۔ اسے علم تھا کہ کس نے اپنی مرضی سے ایمان لانا ہے اور کس نے اپنی مرضی سے کفر اختیار کرنا ہے، کس نے نیکی کرنی ہے اور کس نے بدی کرنی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے علم سے سب کچھ لکھ دیا ہے کہ یہ کچھ ہوگا اور کریں گے اپنی مرضی سے اس طرح نہیں لکھا فلاں کو اس طرح کرنا پڑے گا۔ جو انہوں نے کرنا تھا وہ لکھا ہوا ہے۔ لہٰذا آدمی مختار ہے ایمان لانے میں اور کفر اختیار کرنے میں، مجبور نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ نے دونوں گروہوں کا نتیجہ بھی بیان فرما دیا کہ جو متقی ہیں ﴿وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ○﴾ یہی فلاح پانے والے ہیں۔ اور جو کافر ہیں ﴿وَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ○﴾ اور ان کے لئے بہت بڑا عذاب ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کفر سے بھی اور اس کے نتائج سے بھی ہر مسلمان کو محفوظ فرمائے۔ اور اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو ہر طرح کے عذاب سے بچائے اور محفوظ فرمائے۔ آمین!

﴿وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ﴾ اور لوگوں میں سے بعض وہ ہیں جو کہتے ہیں۔ ﴿اٰمَنَّا بِاللّٰهِ﴾ ہم ایمان لائے اللہ تعالیٰ پر۔ ﴿وَ بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ﴾ اور آخرت کے دن پر۔ ﴿وَ مَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ ○﴾ اور نہیں ہیں وہ ایمان لانے والے۔ ﴿يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ﴾ دھوکہ دیتے ہیں اللہ تعالیٰ کو۔ ﴿وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ اور ان لوگوں کو جو ایمان لائے۔ ﴿وَ مَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّاۤ اَنْفُسَهُمْ﴾ اور وہ نہیں دھوکہ دیتے مگر اپنی جانوں کو۔ ﴿وَ مَا يَشْعُرُوْنَ ○﴾ اور وہ شعور نہیں رکھتے۔ ﴿فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ﴾ ان کے دلوں میں بیماری ہے۔ ﴿فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا﴾ پس زیادہ کر دیا

اللہ تعالیٰ نے ان کی بیماری کو۔ ﴿وَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌۢ﴾ اور ان کے لئے عذاب ہوگا دردناک۔ ﴿بِمَا كَانُوْا یَكْذِبُوْنَ۝۱۰﴾ اس وجہ سے کہ وہ جھوٹ بولتے ہیں۔ ﴿وَ اِذَا قِیْلَ لَهُمْ﴾ اور جس وقت کہا جاتا ہے ان کو۔ ﴿لَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ﴾ نہ فساد مچاؤ زمین میں۔ ﴿قَالُوْۤا﴾ کہتے ہیں۔ ﴿اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ۝۱۱﴾ پختہ بات ہے ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں۔ ﴿اَلَاۤ اِنَّهُمْ﴾ خبردار بے شک وہ۔ ﴿هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ﴾ وہی ہیں فساد کرنے والے۔ ﴿وَ لٰكِنْ لَّا یَشْعُرُوْنَ۝۱۲﴾ اور لیکن ان کو شعور نہیں ہے۔ ﴿وَ اِذَا قِیْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا﴾ اور جس وقت کہا جاتا ہے ان کو ایمان لاؤ۔ ﴿كَمَاۤ اٰمَنَ النَّاسُ﴾ جیسے ایمان لائے ہیں لوگ۔ ﴿قَالُوْۤا﴾ کہتے ہیں۔ ﴿اَنُؤْمِنُ﴾ کیا ہم ایمان لائیں۔ ﴿كَمَاۤ اٰمَنَ السُّفَهَآءُؕ﴾ جیسا کہ ایمان لائے ہیں بے وقوف۔ ﴿اَلَاۤ﴾ خبردار!۔ ﴿اِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَآءُ﴾ بے شک یہی ہیں بے وقوف۔ ﴿وَ لٰكِنْ لَّا یَعْلَمُوْنَ۝۱۳﴾ اور لیکن وہ جانتے نہیں ہیں۔ ﴿وَ اِذَا لَقُوا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا﴾ اور جس وقت ملاقات کرتے ہیں ایمان والوں سے۔ ﴿قَالُوْۤا اٰمَنَّاۚ﴾ کہتے ہیں ہم بھی مؤمن ہیں۔ ﴿وَ اِذَا خَلَوْا اِلٰى شَیٰطِیْنِهِمْۙ﴾ اور جس وقت جاتے ہیں اپنے شیطانوں کی طرف۔ ﴿قَالُوْۤا اِنَّا مَعَكُمْ﴾ کہتے ہیں بے شک ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ ﴿اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ۝۱۴﴾ پختہ بات ہے ہم تو مومنوں سے مذاق کرتے ہیں۔ ﴿اَللّٰهُ یَسْتَهْزِئُ بِهِمْ﴾ اللہ تعالیٰ ان کو استہزاء کا بدلہ دے گا۔ ﴿وَ یَمُدُّهُمْ﴾ اور ان کو مہلت دیتا ہے۔ ﴿فِیْ طُغْیَانِهِمْ﴾ اپنی سرکشی میں۔ ﴿یَعْمَهُوْنَ۝۱۵﴾ وہ سرگرداں اور حیراں پھرتے ہیں۔

ربط

سورۃ فاتحہ میں اللہ تعالیٰ سے ہدایت کا سوال کیا تھا ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَۙ۝۵﴾ جو اللہ تعالیٰ نے قبول فرمالیا اور ہدایت عطا کردی اور فرمایا ﴿ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَیْبَ ۛۚ فِیْهِ ۛۚ هُدًى لِّلْمُتَّقِیْنَۙ۝۲﴾ اس کتاب میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے اور یہ پرہیزگاروں کے لیے ہدایت ہے۔ ہدایت نامے کو قبول کرنے اور نہ کرنے کے بارے میں تین گروہ ہیں۔

① ...... ایک وہ جو دل سے تسلیم کرتے ہیں اور زبان سے اقرار کرتے ہیں ﴿وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۝۵﴾ تک ان کا ذکر تھا۔

② ...... دوسرا گروہ وہ ہے جو نہ تو زبان سے اقرار کرتا ہے اور نہ دل سے تسلیم کرتا ہے۔ ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا﴾ سے لے کر ﴿وَّ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ۠۝۷﴾ تک ان کا ذکر تھا۔

③ ...... اور تیسرا گروہ وہ جو زبان سے اقرار کرتا ہے مگر دل سے تسلیم نہیں کرتا جس کو شریعت کی اصطلاح میں منافق کہتے ہیں۔ ﴿وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ یَّقُوْلُ﴾ سے لے کر ﴿اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ۠۝۲۰﴾ تک ان کا ذکر ہے۔

منافقین کے دو طبقے

فقہاء کرام، محدثین عظام اور مفسرین کرام رحمۃ اللہ علیہم فرماتے ہیں کہ نفاق کی دو قسمیں ہیں:

① ایک نفاق اعتقادی ہے۔ ② اور دوسرا نفاق عملی ہے۔

❀...... اعتقادی منافق وہ ہوتا ہے جو دل سے بالکل تسلیم نہیں کرتا یعنی اس کے دل میں بالکل ایمان نہیں ہوتا۔ لوگوں کو دھوکہ دینے کے لیے کہتا ہے کہ میں مومن ہوں۔ یہ منافق کافر اور مشرک سے بھی بدتر اور خطرناک ہوتا ہے۔ اس لیے اس کی سزا بھی سب سے زیادہ سخت ہوگی۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ﴿اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ فِی الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ۚ﴾ بے شک منافق دوزخ کے سب سے نچلے طبقے میں ہوں گے جو سب سے زیادہ سزا والا طبقہ ہے۔

❀...... دوسرا نفاق عملی ہے۔ عملی منافق اسے کہتے ہیں کہ اس کے دل میں ایمان موجود ہوتا ہے مگر عمل منافقوں والے کرتا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عملی نفاق کی چار علامتیں بیان فرمائی ہیں جس شخص میں ایک علامت ہوگی وہ ایک درجے کا منافق ہوگا۔ جس میں دو علامتیں ہوں گی وہ دوم درجے کا منافق ہوگا۔ جس میں تین علامتیں پائی گئیں وہ تین درجوں کا منافق ہوگا۔ اور جس میں چاروں علامتیں پائی گئیں ((كَانَ مُنَافِقًا خَالِصًا)) "وہ پکا منافق ہے۔" ہمیں خالی الذہن ہو کر ٹھنڈے دل سے سوچنا چاہیے کہ کہیں ان میں سے کوئی علامت ہمارے اندر تو نہیں ہے۔ اگر ہے تو بہت بری بات ہے۔ وہ علامتیں کیا ہیں؟

منافقین کی نشانیاں

①......فرمایا: ((اِذَا حَدَّثَ كَذَبَ))۔ "جب بات کرتا ہے تو جھوٹ بولتا ہے۔" یہ منافق کی پہلی علامت ہے۔ جھوٹ کسے کہتے ہیں؟ ہر وہ بات جو واقعہ کے خلاف ہو شریعت اسے جھوٹ کہتی ہے۔ اب ہمیں اپنے گریبانوں میں جھانک کر دیکھنا چاہیے کہ ہم نے کبھی زندگی میں جھوٹ تو نہیں بولا اگر بولا ہے تو ہمیں اپنے آپ کو ایک درجے کا منافق سمجھنا چاہیے۔ کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان بالکل حق اور سچ ہے۔

ابوداؤد شریف میں روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک جگہ تشریف لے جا رہے تھے کہ حضرت اسماء بنت یزید رضی اللہ عنہا بڑے بلند پائے کی صحابیہ ہیں۔ ان کا بچہ بچوں میں کھیل رہا تھا ان کو اپنے بچے سے کوئی کام تھا اس کو بلایا وہ نہ آیا۔ بچوں کو کھیل پیارا ہوتا ہے۔ بار بار بلانے کے باوجود جب نہ آیا تو انہوں نے کہا کہ آؤ میں تمہیں کوئی چیز دوں گی۔ یہ بچے کو لالچ دیا تو وہ بچہ آ گیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہو گئے کہ بچے کو کوئی چیز دیتی ہے کہ نہیں؟

پھر فرمایا مائی! اس کو کوئی چیز دے تاکہ تو جھوٹ سے نکل جائے۔ اگر نہیں دے گی تو یہ تیرا جھوٹ ہوگا۔ یہ مسئلہ اچھی طرح یاد رکھنا چاہیے۔ خصوصاً عورتوں کو کہ یہ بچوں کو لالچ دیتی ہیں مگر دیتی کچھ بھی نہیں ہیں۔ اور یہ جھوٹ ہے۔ اور چیز بھی وہ ہو جس سے بچہ مطمئن ہو ریت مٹی نہ ہو، اس طرح جھوٹ سے نہیں نکلو گے۔

اور ہماری حالت تو یہ ہے کہ جھوٹ بول بول کر جھوٹ سے نفرت ہی ختم ہوگئی ہے اور ہیں ہم پکے مومن۔ ہونٹوں کے پاس فرشتے ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے۔ ان کے ذمہ ڈیوٹیاں ہیں۔ کوئی درود شریف پہنچانے پر مقرر ہے، کوئی سبحان اللہ، الحمد للہ پہنچانے والا ہے۔ مگر جھوٹ کی اتنی بدبو ہوتی ہے کہ جب کوئی آدمی جھوٹ بولتا ہے تو فرشتے ایک میل دور بھاگ جاتے ہیں۔ لہٰذا جھوٹ سے بچنا چاہیے۔

②...... منافق کی دوسری نشانی، فرمایا: ((اِذَا وَعَدَ خَلَفَ)) "جب وعدہ کرتا ہے تو خلاف ورزی کرتا ہے۔"
((وَ اِذَا عَاهَدَ غَدَرَ)) "اور جب وہ معاہدہ کرتا ہے تو غداری کرتا ہے۔"

وعدہ اور معاہدہ میں فرق ہے کہ جب کسی سے انفرادی طور پر وعدہ ہو تو وعدہ کہلاتا ہے۔ اور جماعتی شکل میں یا قومی شکل میں یا حکومتی سطح پر کسی سے کوئی بات طے کی جائے تو اس کو معاہدہ کہتے ہیں۔

وعدے اور معاہدے کی خلاف ورزی کرنا یہ بھی منافق کی علامت ہے۔ آج اس وقت دنیا میں جتنی بھی حکومتیں ہیں ساری اس مد میں ہیں الا ماشاء اللہ کہ ان کا ظاہر کچھ اور باطن کچھ ہے۔ حالانکہ قرآن کریم میں آتا ہے: ﴿اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْـُٔوْلًا ۝۳۴﴾ (الاسراء) "وعدے کے بارے میں سوال ہوگا" لہٰذا وعدہ کسی سے کرو تو سوچ سمجھ کر کرو کہ میں اس کو پورا بھی کرسکوں گا کہ نہیں اگر پورا نہیں کرسکتے تو وعدہ کرو ہی نہ اور اگر کسی سے وعدہ کرلیا ہے تو اسے پورا کرو البتہ ایک صورت یہ بھی ہے کہ جس وقت وعدہ کیا تھا اس وقت نیت اور ارادہ اس کو پورا کرنے کا تھا مگر بعد میں کوئی عارضہ پیش آگیا ہے تو وہ الگ بات ہے۔

③...... منافق کی تیسری نشانی ہے ((اِذَا اُؤْتُمِنَ خَانَ)) "جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو خیانت کرتا ہے۔" پھر امانت کی کئی قسمیں ہیں۔ علم بھی امانت ہے اور علمی خیانت یہ ہے کہ لوگوں کو صحیح بات نہیں بتاتا غلط باتیں بتاتا ہے۔ مشورہ بھی امانت ہے اور مشورے میں خیانت یہ ہے کہ جب کوئی شخص تمہارے سے مشورہ طلب کرتا ہے تو تم اسے صحیح مشورہ نہیں دیتے غلط رائے دیتے ہو جب کوئی مشورہ طلب کرے تو اسے صحیح رائے دو۔

بات بھی امانت ہوتی ہے۔ حدیث پاک میں آتا ہے کہ جب کوئی آدمی مجلس میں ادھر ادھر دیکھ کر بات کرے تو سمجھ جاؤ کہ یہ بات اس کی امانت ہے۔ اس مجلس کی بات باہر کسی سے نہیں کرنی۔ مال بھی امانت ہے۔ اور مالی خیانت یہ ہے کہ اس میں سے کچھ خرچ کرے یا اس کو تبدیل کرے۔

فقہائے کرام رحمہم اللہ نے لکھا ہے کہ اگر کسی نے درہم یا دینار کا تھیلا کسی کے پاس امانت رکھا ہے، درہم چاندی کے سکے کو کہتے ہیں اور دینار سونے کے سکے کو کہتے ہیں اور پہلے زمانے میں لوگ یہ تھیلوں میں رکھتے تھے تو اگر وہ تھیلا کسی کے پاس امانت رکھا ہے اور اس کا منہ جس دھاگے سے بندھا ہوا ہے اور وہ دھاگا میلا ہوگیا ہے تو یہ شخص اس دھاگے کو بدلنے کا مجاز نہیں ہے۔ رقم کو چھیڑنا تو درکنار اگر اس دھاگے کو بدلے گا تو یہ بھی خیانت ہے۔

④...... منافق کی چوتھی نشانی یہ ہے کہ ((اِذَا خَاصَمَ فَجَرَ)) "جب کسی سے جھگڑا کرتا ہے تو گالیاں دیتا ہے۔"

یاد رکھنا! آج کے معاشرے میں ہم نے تو منافق کو بھی پیچھے چھوڑ دیا ہے کیونکہ وہ تو جب لڑتا ہے تو گالیاں دیتا ہے اور ہم تو ہنسی مذاق میں گالیاں دیتے ہیں۔ جس طرح پہلے نیک لوگوں کی زبان سے سبحان اللہ! نکلتا تھا اس طرح ہماری زبان سے گالیاں نکلتی ہیں۔ چھوٹوں کو، بڑوں کو یہاں تک کہ گدھوں اور مرغیوں کو گالیاں دیتے ہیں۔

تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے منافق کی یہ چار نشانیاں بیان فرمائی ہیں اگر کسی بدبخت میں یہ چاروں علامتیں پائی جاتی ہیں تو وہ پکا منافق ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں بھی منافق کی کچھ علامتیں بیان فرمائی ہیں، فرمایا:

﴿وَ اِذَا قَامُوْٓا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى﴾ جب نماز کے لیے کھڑے ہوتے ہیں تو سستی کرتے ہیں۔ لہٰذا اگر کوئی شخص نماز کے لیے کھڑا ہونے میں سستی کرتا ہے تو سمجھ لینا چاہیے کہ اس میں نفاق کی علامت ہے۔ اور یہ بھی فرمایا کہ:

﴿وَ لَا يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ اِلَّا قَلِيْلًا﴾ منافق اللہ تعالیٰ کا ذکر بہت کم کرتے ہیں۔ ناولوں کے پیچھے پڑے رہیں گے، کھیلوں میں مشغول رہیں گے یعنی اور سارے کام ہوں گے مگر اللہ تعالیٰ کے ذکر کے لیے وقت نہیں ہوتا۔ یہ منافق کی موٹی موٹی علامتیں ہیں۔ چار حدیث شریف میں اور یہ حدیث بخاری شریف اور مسلم شریف کی ہے۔ اور دو علامتیں قرآن کریم میں بیان کی گئی ہیں۔ اپنے اپنے گریبانوں میں جھانک کر دیکھ لو اللہ تعالیٰ کرے کہ ہم میں سے کسی میں یہ علامتیں نہ ہوں۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ﴿وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ﴾، مِنْ تبعیضیہ ہے۔ معنیٰ ہوگا اور لوگوں میں سے بعض وہ ہیں جو کہتے ہیں ﴿اٰمَنَّا بِاللّٰهِ﴾ ہم ایمان لائے اللہ تعالیٰ پر ﴿وَ بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ﴾ اور آخرت کے دن پر۔ رب تعالیٰ فرماتے ہیں ﴿وَ مَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ﴾ حالانکہ وہ ایمان لانے والے نہیں ہیں۔ کیونکہ وہ صرف زبانی، زبانی کہتے ہیں کہ ہم مومن ہیں۔ دل سے انہوں نے تسلیم نہیں کیا۔ ﴿يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ﴾ وہ دھوکہ دیتے ہیں اللہ تعالیٰ کو۔

سوال اب سوال یہ ہے کہ دھوکہ تو اس کو دیا جا سکتا ہے جس کو علم نہ ہو اور رب تعالیٰ سے تو کوئی چیز مخفی نہیں ہے۔ تو یہ رب تعالیٰ کو کس طرح دھوکہ دے سکتے ہیں؟

جواب مفسرین کرام رحمہم اللہ فرماتے ہیں: ((صَنْعُهُمْ كَصَنْعِ خَادِعٍ)). ان کا یہ معاملہ اس طرح ہے جس طرح دھوکے بازوں کا ہوتا ہے۔ یعنی وہ اللہ تعالیٰ سے ایسا معاملہ کرتے ہیں جو دغا بازی کا ہوتا ہے۔ ورنہ حقیقتاً اللہ تعالیٰ کو دھوکا کون دے سکتا ہے؟

﴿وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ اور ایمان والوں کو دھوکہ دیتے ہیں۔ ﴿اٰمَنَّا﴾ کہہ کر کہ ہم بھی مومن ہیں۔ ﴿وَ مَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ﴾ اور وہ نہیں دھوکہ دیتے مگر اپنی جانوں کو۔ کیونکہ اس کا وبال ان کی جانوں پر ہی پڑے گا ﴿وَ مَا يَشْعُرُوْنَ﴾ اور وہ شعور نہیں رکھتے۔

ایک ہوتا ہے علم اور ایک ہوتا ہے شعور۔ علم تو عقل والی مخلوق کے ساتھ خاص ہے جیسے انسان جنات ہیں فرشتے ہیں۔ اور شعور کا معنیٰ ہے اپنے اوپر آنے والے حالات، کا احساس و ادراک کرنا۔ جیسا کہ حیوانوں کو گرمی سردی کا احساس ہوتا ہے۔ بھوک

پیاس کو محسوس کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے منافقوں کے متعلق فرمایا کہ وہ شعور نہیں رکھتے۔ یعنی یہ منافق ایسے ہیں کہ ان کو حیوانوں جیسا شعور بھی نہیں ہے کہ اپنے نقصان کا اتنا بھی شعور و احساس کرلیں جتنا کہ حیوان کو ہوتا ہے۔

فرمایا ﴿فِیۡ قُلُوۡبِهِمۡ مَّرَضٌ﴾ ان کے دلوں میں منافقت کی بیماری ہے۔ جوں جوں دن گزرتے ہیں نیک لوگ نیکیاں کمارہے ہیں اور اعمالِ صالحہ میں آگے بڑھ رہے ہیں۔

اور منافق ﴿فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا﴾ پس زیادہ کردیا اللہ تعالیٰ نے ان کی بیماری کو ان کا نفاق دن بدن بڑھتا جا رہا ہے۔ ﴿وَ لَهُمۡ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ﴾ اور ان کے لیے عذاب ہوگا دردناک۔ سب سے زیادہ سخت عذاب منافقوں کے لیے ہے۔

﴿بِمَا کَانُوۡا یَکۡذِبُوۡنَ ۝۱۰﴾ اس وجہ سے کہ وہ جھوٹ بولتے ہیں۔ جھوٹ اس طرح کہ زبانی، زبانی کہتے ہیں کہ ہم اللہ تعالیٰ پر بھی ایمان لائے اور آخرت کے دن پر بھی اور دل سے نہیں مانتے۔ تو اس سے بڑا جھوٹ کیا ہوگا کہ زبان کسی طرف اور دل کسی طرف۔

﴿وَ اِذَا قِیۡلَ لَهُمۡ﴾ اور جس وقت کہا جاتا ہے ان کو ﴿لَا تُفۡسِدُوۡا فِی الۡاَرۡضِ﴾ نہ فساد مچاؤ زمین میں۔ کیونکہ جھوٹ بولنا، وعدہ خلافی کرنا، خیانت کرنا فساد فی الارض ہے۔

پاکستان اور منافقت کا نتیجہ

آج بدقسمتی سے دنیا میں جتنے بھی ملک ہیں مسلم یا غیر مسلم پاکستان ان تمام ملکوں میں سے بددیانتی میں نمایاں ہے۔ اخبارات میں تجزیہ شائع ہوا ہے کہ تمام بددیانت ملکوں میں پاکستان دوسرے نمبر پر ہے۔ یہاں بڑے چھوٹے سب بددیانت ہیں۔ بڑے بددیانتی کرتے ہیں بڑوں کو دیکھ کر چھوٹے بھی بددیانتی کرتے ہیں۔ بلکہ وہ اور تیز ہوجاتے ہیں۔ اگر بڑے احتیاط کریں اور دیانت داری سے کام لیں تو چھوٹوں کو جرأت نہیں ہوسکتی۔

تو جب ان سے کہا جاتا ہے کہ زمین میں فساد نہ مچاؤ تو ﴿قَالُوۡۤا﴾ کہتے ہیں ﴿اِنَّمَا نَحۡنُ مُصۡلِحُوۡنَ ۝۱۱﴾ پختہ بات ہے ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں۔ جس طرح آج کل کے لیڈر کرتے فساد ہیں اور اس کو نام امن کا دیتے ہیں۔ بھائی امن کے نام سے تو کچھ نہیں بنے گا دنیا تو حقیقت کو دیکھتی ہے۔ افسوس! آج دنیا فساد سے بھری پڑی ہے۔ اخبارات دیکھو تو سو میں سے ایک بات اچھی ہوگی اور ننانوے باتیں بری ہوں گی۔ یعنی قتل، اغوا، ڈاکے، بدمعاشیاں، بدکرداریاں، فراڈ اور وہ بھی معمولی قسم کے نہیں بلکہ اربوں، کھربوں کے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ کی پناہ۔

یہ سب کچھ اس ملک میں ہو رہا ہے جو ﴿لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ﴾ کے لیے حاصل کیا گیا تھا۔ جس مقصد کے لیے اس کو حاصل کیا گیا اگر اس کے مطابق چلتا تو آج اس کا یہ حشر نہ ہوتا۔ اور نہ ہی بنگال ہم سے کبھی جدا ہوتا۔ وہ لوگ بڑے دین دار ہیں۔ پاکستانی سو سال تک بھی اتنے دین دار نہیں ہوسکتے۔ وہ محض ہماری بددیانتیوں اور خیانتوں کو دیکھ کر ہم سے جدا ہوئے ہیں۔

پاکستان ہمیں مفت میں تو نہیں ملا اس کے پیچھے مسلمانوں کی بڑی قربانیاں ہیں۔ اور علماء کرام کی شہادتیں ہیں۔ تحریک مجاہدین، ۱۸۵۷ء کی تحریک اور تحریکِ ریشمی رومال ہے۔ جنہوں نے انگریز کو ہندوستان چھوڑنے پر مجبور کیا۔ مگر بہ ظاہر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ مسلم لیگ کی تحریک کے نتیجے میں بلاشرکت غیرے پاکستان معرضِ وجود میں آیا ہے اور یہ مسلم لیگ کا کارنامہ ہے۔

اَلبتہ یہ بات حقیقت ہے کہ پاکستان میں بلاشرکت غیرے کئی سال مسلم لیگ کی با اختیار حکومت رہی ہے۔ ان سالوں میں اگر وہ کسی درخت کے پتے پر بھی اسلامی قانون کے نافذ ہونے کا حکم لکھ دیتے تو اسلامی قانون نافذ ہو جاتا کیونکہ ان کے لیے کسی قسم کی کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ نہ ان کے سامنے کوئی سر اٹھا سکتا تھا، نہ ہی کوئی جماعت نمایاں تھی۔ مگر یہ لوگ اسلام کے لیے مخلص نہیں تھے اور ان کے دل صاف نہیں تھے سوائے چند حضرات کے، کہ وہ مخلص تھے کہ پاکستان میں اسلامی قانون نافذ ہو۔ اگر تمام حضرات مخلص ہوتے تو آج ہمیں یہ حالات نہ دیکھنے پڑتے۔

تو خیر فرمایا ﴿لَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ﴾ نہ فساد مچاؤ زمین میں ﴿قَالُوْٓا﴾ کہتے ہیں ﴿اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ ۝۱۱﴾ پختہ بات ہے ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں۔

رب تعالیٰ فرماتے ہیں ﴿اَلَآ﴾ خبردار ﴿اِنَّھُمْ ھُمُ الْمُفْسِدُوْنَ﴾ بے شک وہی ہیں فساد کرنے والے ﴿وَلٰکِنْ لَّا یَشْعُرُوْنَ ۝۱۲﴾ اور لیکن ان کو شعور نہیں ہے ﴿وَ اِذَا قِیْلَ لَھُمْ اٰمِنُوْا﴾ اور جس وقت کہا جاتا ہے ان کو کہ سچا ایمان لے آؤ ﴿کَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ﴾ جیسے ایمان لائے ہیں لوگ ﴿قَالُوْٓا﴾ کہتے ہیں ﴿اَنُؤْمِنُ﴾ کیا ہم ایمان لائیں ﴿کَمَآ اٰمَنَ السُّفَھَآءُ ؕ﴾ جیسا کہ ایمان لائے ہیں بے وقوف۔

منافق لوگ سچے، مخلص اور دیانت دار مومنوں کو بے وقوف کہتے تھے۔ کہتے تھے کہ یہ کوئی عقل مندی ہے کہ جس طرح وہ ان کو کہتا ہے بے سوچے سمجھے اسی طرح کرتے چلے جاتے ہیں۔ گھر، بار سب کچھ اس کے کہنے پر قربان کر دیا ہے۔ اگر عقل مند ہوتے تو کوٹھیاں بناتے، دولت اکٹھی کرتے اور تجارت بڑھاتے۔ انہوں نے تو پہلا بھی سب کچھ داؤ پر لگا دیا ہے۔ پہلے کتنے آسودہ حال تھے اور ایمان لانے کے بعد اب ان کا کیا حال ہے؟ یہ بے وقوف ہیں ہم ان بے وقوفوں جیسا کام کیوں کریں؟

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿اَلَآ اِنَّھُمْ ھُمُ السُّفَھَآءُ﴾ خبردار! بے شک یہی ہیں بے وقوف ﴿وَلٰکِنْ لَّا یَعْلَمُوْنَ ۝۱۳﴾ اور لیکن وہ جانتے نہیں ہیں ﴿وَ اِذَا لَقُوا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا﴾ اور جس وقت ملاقات کرتے ہیں ایمان والوں سے تو ان کو دھوکہ دینے کے لیے ﴿قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚ﴾ کہتے ہیں ہم بھی مؤمن ہیں۔

جس طرح آج کل ووٹ مانگنے والے منتیں سماجتیں کرتے ہیں۔ ہاتھ پاؤں چومتے ہیں۔ پوری ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں اور ممبر بن جانے کے بعد کبھی شکل بھی نہیں دکھاتے۔ پھر کہتے ہیں کہ ہم کون اور تم کون؟ یقین جانو! جتنے منافق پاکستان میں ہیں شاید دنیا کے کسی اور خطے میں ہوں۔

﴿وَ اِذَا خَلَوْا اِلٰی شَیٰطِیْنِھِمْ ۙ﴾ اور جب یہ اپنے لیڈروں کے پاس جاتے ہیں، اپنے سرداروں، راجوں، چوہدریوں،

خانوں اور وڈیروں کے پاس جاتے ہیں تو ﴿ قَالُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ ﴾ کہتے ہیں بے شک ہم تمھارے ساتھ ہیں۔ باقی تم نے سنا ہوگا کہ ہم نے مومنوں کو کہا کہ ہم بھی مومن ہیں تو یقین جانو!

مومنوں سے استہزاء

﴿ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ ۝ ﴾ پختہ بات ہے ہم تو مومنوں سے مذاق کرتے ہیں، دل لگی کرتے ہیں، ہم کہاں مومن ہیں؟ وڈیرے جب کان کھینچتے ہیں تو ان کو اس طرح مطمئن کرتے ہیں۔

اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ﴿ اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ ﴾ اللہ تعالیٰ ان کو استہزاء کا بدلہ دے گا ﴿ وَ يَمُدُّهُمْ ﴾ اور ان کو مہلت دیتا ہے ﴿ فِيْ طُغْيَانِهِمْ ﴾ اپنی سرکشی میں ﴿ يَعْمَهُوْنَ ۝ ﴾ وہ سرگرداں اور حیران پھرتے ہیں۔ جتنا دھوکہ دے سکتے ہیں دے لیں، جو حرام کما اور کھا سکتے ہیں کرلیں۔ رسی ڈھیلی چھوڑ دی ہے۔ احادیث میں آتا ہے:

((اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى لَيُمْلِيْ ظَالِمًا حَتّٰى اِذَا اَخَذَهٗ لَمْ يُفْلِتْهُ)).

"بے شک اللہ تعالیٰ ظالم کی رسی ڈھیلی چھوڑ دیتا ہے یہاں تک کہ جب اس کو سختی سے پکڑتا ہے تو چھوڑتا نہیں ہے۔"

آگے منافقوں کی بدکاریوں اور بدمعاشیوں کا ذکر ہوگا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

﴿ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ ﴾ یہ وہی لوگ ہیں۔ ﴿ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ ﴾ جنہوں نے خریدا گمراہی کو۔ ﴿ بِالْهُدٰى ﴾ ہدایت کے بدلے میں۔ ﴿ فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ ﴾ پس نفع مند نہ ہوئی تجارت ان کی۔ ﴿ وَ مَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ ۝ ﴾ اور نہ ہوئے وہ ہدایت پانے والے۔ ﴿ مَثَلُهُمْ ﴾ مثال ان کی۔ ﴿ كَمَثَلِ الَّذِي ﴾ اس شخص کی طرح ہے۔ ﴿ اسْتَوْقَدَ نَارًا ﴾ اس نے آگ جلائی۔ ﴿ فَلَمَّآ اَضَآءَتْ ﴾ پس جب روشن کردیا اس آگ نے۔ ﴿ مَا حَوْلَهٗ ﴾ اس جلانے والے کے اردگرد کو۔ ﴿ ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ ﴾ لے گیا اللہ تعالیٰ ان کی روشنی کو۔ ﴿ وَ تَرَكَهُمْ فِيْ ظُلُمٰتٍ ﴾ اور چھوڑ دیا ان کو اندھیروں میں۔ ﴿ لَّا يُبْصِرُوْنَ ۝ ﴾ وہ نہیں دیکھ سکتے۔ ﴿ صُمٌّۢ ﴾ بہرے ہیں۔ ﴿ بُكْمٌ ﴾ گونگے ہیں۔ ﴿ عُمْيٌ ﴾ اندھے ہیں۔ ﴿ فَهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ ۝ ﴾ وہ نہیں لوٹتے۔ ﴿ اَوْ كَصَيِّبٍ ﴾ یا ان کی مثال ہے بارش کی طرح۔ ﴿ مِّنَ السَّمَآءِ ﴾ جو آسمان کی طرف سے نازل ہوئی ہے۔ ﴿ فِيْهِ ظُلُمٰتٌ ﴾ اس میں اندھیرے ہیں۔ ﴿ وَّ رَعْدٌ ﴾ اور کڑک ہے۔ ﴿ وَّ بَرْقٌ ﴾ اور بجلی ہے۔ ﴿ يَجْعَلُوْنَ اَصَابِعَهُمْ ﴾ کرتے ہیں اپنی انگلیاں۔ ﴿ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ ﴾ اپنے کانوں میں۔ ﴿ مِّنَ الصَّوَاعِقِ ﴾ بجلی کی وجہ سے۔ ﴿ حَذَرَ الْمَوْتِ ﴾ موت سے ڈرتے ہوئے۔ ﴿ وَ اللّٰهُ مُحِيْطٌ ﴾ اور اللہ تعالیٰ گھیرنے والا ہے۔ ﴿ بِالْكٰفِرِيْنَ ۝ ﴾

کافروں کو۔ ﴿يَكَادُ الْبَرْقُ﴾ قریب ہے کہ بجلی۔ ﴿يَخْطَفُ اَبْصَارَهُمْ﴾ اچک لے ان کی آنکھوں کو۔ ﴿كُلَّمَآ اَضَآءَ لَهُمْ﴾ جب کبھی روشنی ہوتی ہے ان کے لیے۔ ﴿مَّشَوْا فِيْهِ﴾ اس میں چل پڑتے ہیں۔ ﴿وَ اِذَآ اَظْلَمَ عَلَيْهِمْ﴾ اور جب اندھیرا چھا جاتا ہے ان پر۔ ﴿قَامُوْا﴾ تو ٹھہر جاتے ہیں۔ ﴿وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ﴾ اور اگر اللہ تعالیٰ چاہے۔ ﴿لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ﴾ البتہ لے جائے ان کے کانوں کو۔ ﴿وَ اَبْصَارِهِمْ﴾ اور ان کی آنکھوں کو۔ ﴿اِنَّ اللّٰهَ﴾ بے شک اللہ تعالیٰ۔ ﴿عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ﴾ ہر چیز پر قادر ہے۔

منافقین کا مقاطعہ

منافقوں کا ذکر چلا آرہا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ﴿اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ﴾ یہ وہی لوگ ہیں ﴿اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ﴾ جنہوں نے خریدا گمراہی کو ﴿بِالْهُدٰى﴾ ہدایت کے بدلے میں۔ یعنی ہدایت دی اور اس کے بدلے میں گمراہی لے لی۔ اب یہاں پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ تو پہلے کافر تھے ان کے پاس تو ہدایت نہیں تھی تو انہوں نے ہدایت دے کر گمراہی کیسے خرید لی؟

مفسرین کرام رحمہم اللہ اس کے دو جواب نقل کرتے ہیں۔

① ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ نے ہر بچے میں پیدائشی طور پر صحیح فطرت رکھی ہے۔ بخاری شریف کی روایت میں آتا ہے ((كُلُّ مَوْلُوْدٍ يُوْلَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ)) ہر پیدا ہونے والا بچہ صحیح فطرت پر پیدا ہوتا ہے۔ ((فَاَبَوَاهُ يُهَوِّدَانِهٖ اَوْ يُنَصِّرَانِهٖ اَوْ يُمَجِّسَانِهٖ)) پھر اس کے ماں باپ اس کو یہودی بنا دیتے ہیں یا عیسائی بنا دیتے ہیں یا اس کو مجوسی بنا دیتے ہیں۔ اگر بچے کو اسی فطرت پر چھوڑا جائے جس پر وہ پیدا ہوا ہے تو بالغ ہونے کے بعد اگر اس کے سامنے اسلام پیش کیا جائے تو وہ فوراً قبول کرے گا۔ فطرت صحیحہ اس کو قبول کرنے پر آمادہ کرے گی۔

② ﴿فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا﴾ (الروم: ۳۰) اللہ تعالیٰ کی فطرۃ جس پر پیدا کیا لوگوں کو۔ یعنی ان میں حق قبول کرنے کی صلاحیت اور استعداد رکھی لیکن ماحول کی وجہ سے لوگوں نے اس فطرتِ سلیمہ یعنی حق کو قبول کرنے کی صلاحیت اور استعداد کو خراب کر لیا۔ تو اب مطلب یہ بنے گا کہ ان منافقین نے وہ صلاحیت اور استعداد دے دی اور اس کے بدلے میں گمراہی خرید لی۔

کفار کے نابالغ بچے

یہاں ایک سوال اور پیدا ہوتا ہے وہ یہ کہ کافروں اور مشرکوں کے وہ بچے جو چھوٹی عمر میں فوت ہو جاتے ہیں وہ جنتی ہیں یا دوزخی؟ اس سلسلے میں فقہاء کرام رحمہم اللہ کے تین اقوال نقل کیے گئے ہیں۔

① یہ کہ وہ اپنے ماں باپ کے تابع ہو کر دوزخ میں جائیں گے۔ یہ حضرات اس روایت سے استدلال کرتے ہیں جو

باب الجہاد میں آتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا کہ ہم کافروں کے خلاف جہاد کرتے ہوئے لڑ رہے ہوتے ہیں کہ ان کے بچے بھی آجاتے ہیں رات کے وقت افراتفری میں چھوٹے بڑے کی تمیز نہیں ہوتی تو اس دوران میں جو بچے مرجاتے ہیں ان کا کیا بنے گا؟

اس موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ان کو قصداً نہ مارو ضمنی طور پر مارے گئے تو ((هُمْ تَبَعٌ لِاٰبَآئِهِمْ)) وہ اپنے ماں باپ کے تابع ہو کر دوزخ میں جائیں گے۔

محققین حضرات اس روایت کا مفہوم بیان فرماتے ہیں کہ روایت جہاد کے موقع کی ہے کہ مارنا تو تم نے بڑوں کو تھا اتفاقاً اس موقعہ پر جو چھوٹے قتل ہو گئے ہیں ان کی وجہ سے تم پر کوئی گرفت نہیں ہوگی۔ کیونکہ لڑائی کے دوران ایسا ہو جاتا ہے۔ لہٰذا وہ اپنے ماں باپ کے تابع ہیں۔

② فقہاء کرام رحمہم اللہ کا دوسرا گروہ کہتا ہے کہ کافروں اور مشرکوں کے بچے جنتی ہیں۔ کیوں کہ جب تک بچہ بالغ نہ ہو جائے وہ مکلف نہیں ہوتا یعنی اس پر شریعت کے احکام لاگو نہیں ہوتے۔ حدیث پاک میں آتا ہے کہ ((رُفِعَ الْقَلَمُ عَنْ ثَلَاثٍ)) تین قسم کے آدمیوں سے قلم اٹھالی گئی ہے۔ ان میں ((اَلصَّبِيُّ حَتّٰى يَحْتَلِمَ)) بچہ جب تک بالغ نہ ہو جائے اس پر شریعت کے احکام لاگو نہیں ہوتے۔ جب اس پر شرعی احکام ہی لاگو نہیں ہوتے تو اللہ تعالیٰ کی رحمت سے بعید ہے کہ وہ اس کو دوزخ میں پھینکے۔

پھر طبرانی شریف جو حدیث کی کتاب ہے اس میں روایت آتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا کہ حضرت! کافروں کے جو چھوٹے بچے فوت ہو جاتے ہیں ان کے متعلق کیا حکم ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((اَطْفَالُ الْمُشْرِكِيْنَ خَدَمُ اَهْلِ الْجَنَّةِ)). مشرکوں کے بچے جنتیوں کے خادم ہوں گے۔

مودودی صاحب مرحوم کا غلط مؤقف

اور مودودی صاحب مرحوم سے حوروں کے متعلق پوچھا گیا کہ وہ کون ہیں؟ تو انہوں نے فتویٰ دیا کہ حوریں کافروں کی وہ لڑکیاں ہیں جو بالغ ہونے سے پہلے فوت ہو گئی ہیں۔ یہ بات انہوں نے قرآن پاک کی تفسیر میں لکھی ہے حالاں کہ یہ بات بالکل غلط ہے۔ کیوں کہ حوروں کے متعلق حدیث پاک میں آتا ہے:

﴿ خُلِقْتُ مِنَ الْمِسْكِ ﴾ حوریں کستوری سے پیدا کی گئی ہیں۔ لہٰذا جو علماء مسائل میں مودودی صاحب کی تردید کرتے ہیں وہ غلط نہیں کرتے بلکہ صحیح کرتے ہیں۔ قاضی حسین احمد بڑا ہوشیار آدمی ہے وہ کہتا ہے کہ ہم نے اپنے منشور میں لکھوا دیا ہے کہ ہم مودودی صاحب کے غلط مسائل کی تردید کرتے ہیں ویسے ہم سیاسی طور پر ان کی اتباع کرتے ہیں۔ یہ اس نے بڑی جرأت کی بات کی ہے۔ اس نے منشور بدل دیا ہے۔ اور اس بات کی وجہ سے اب عوام ان کے ساتھ مل گئی ہے بہر حال حوروں کا

مادہ مٹی نہیں ہے وہ جنت ہی کی مخلوق ہیں۔

③ فقہاءِ کرام رحمہم اللہ کا تیسرا گروہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے، اللہ تعالیٰ جس طرح چاہیں گے فیصلہ فرمائیں گے۔ بخاری شریف میں روایت آتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ کافروں کے بچے جو چھوٹی عمر میں فوت ہو جاتے ہیں ان کے متعلق کیا حکم ہے؟ جنتی ہیں یا دوزخی ہیں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((اَللّٰہُ اَعْلَمُ بِمَا کَانُوْا عَامِلِیْنَ)) اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے کہ انہوں نے بڑے ہو کر کیا کرنا تھا۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا فرمان

اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ہم ان کو نہ تو قطعی طور پر جنتی کہتے ہیں اور نہ قطعی طور پر دوزخی کہتے ہیں۔ ان کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہے۔ بہرحال بات یہ ہو رہی تھی کہ کافروں کے پاس تو ہدایت تھی ہی نہیں تو انہوں نے ہدایت کے بدلے میں گمراہی کس طرح خرید لی؟ تو مفسرین کرام رحمہم اللہ نے اس کے درج ذیل جوابات دیئے ہیں۔

①......اس کا ایک جواب تو یہ دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو فطرت سلیمہ اسلام کے قبول کرنے کی صلاحیت اور استعداد عطا ہوئی تھی اس کے بدلے میں انہوں نے گمراہی خرید لی۔

②......دوسرا جواب یہ دیا ہے کہ اس جہان کی حیثیت منڈی اور دوکان کی ہے کہ دوکان میں ایک نمبر کی چیزیں بھی ہوتی ہیں اور دو نمبر چیزیں بھی ہوتی ہیں۔ مہنگی چیزیں بھی ہوتی ہیں اور سستی چیزیں بھی ہوتی ہیں۔ تو ان بے وقوفوں نے ایک نمبر چیز ہدایت کو خریدنے کی بجائے دو نمبر کی چیز گمراہی خرید لی کیونکہ دنیا میں ہدایت بھی ملتی ہے گمراہی بھی ملتی ہے۔ اس طرح انہوں نے ہدایت کے بدلے میں گمراہی خریدی۔ ایسا نہیں ہے کہ پہلے ان کے پاس ہدایت تھی وہ دے کر اس کے بدلے گمراہی لے لی۔

﴿فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ﴾ پس نفع مند نہ ہوئی تجارت ان کی۔ کیوں کہ تجارت تو ہوتی ہے فائدے کے لیے اور انہوں نے اچھی چیز کے بدلے بری چیز لے لی یہ تو بڑے خسارے کا سودا ہوا ہے۔

﴿وَ مَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ ⑯﴾ اور نہ ہوئے وہ ہدایت پانے والے۔ آگے اللہ تعالیٰ نے دو مثالوں کے ذریعہ ان کی حالت کو بیان فرمایا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿مَثَلُهُمْ﴾ مثال ان کی ﴿كَمَثَلِ الَّذِی﴾ اس شخص کی طرح ہے جس نے اندھیرے اور تاریکی میں ﴿اسْتَوْقَدَ نَارًا ۚ﴾ آگ جلائی تا کہ اس کی روشنی سے فائدہ حاصل کرے ﴿فَلَمَّآ اَضَآءَتْ مَا حَوْلَهٗ﴾ پس جب روشن کر دیا اس آگ نے اس جلانے والے کے اردگرد کو اور وہ خوش ہو گیا کہ روشنی ہو گئی ہے تو اچانک آندھی اور طوفان آیا اس نے آگ بجھا دی۔ ﴿ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ﴾ لے گیا اللہ تعالیٰ ان کی روشنی کو۔ نہ وہ آگے کے رہے نہ پیچھے کے۔ ﴿وَ تَرَكَهُمْ فِیْ ظُلُمٰتٍ﴾

اور چھوڑ دیا ان کو اندھیروں میں ﴿لَّا یُبۡصِرُوۡنَ﴾ وہ نہیں دیکھ سکتے۔

منافقین کی پہلی مثال

یہ مثال ان پر اس طرح فٹ آتی ہے کہ یہ منافق کفر، شرک کے اندھیروں میں پھنسے ہوئے تھے تو جس طرح اندھیرے میں پھنسا ہوا آدمی آگ جلاتا ہے کہ اس کی روشنی سے فائدہ اٹھائے اسی طرح انہوں نے کلمہ پڑھا تا کہ اس سے فائدہ اٹھائیں۔ چنانچہ اس سے ان کو مالِ غنیمت ملا، زکاتیں ملیں، صدقات اور خیراتیں حاصل ہوئیں۔ مسلمانوں کی سختی سے بچے۔ زبانی کلمہ پڑھنے سے ان کو یہ کچھ حاصل ہوا۔ مگر کتنی دیر تک؟ صرف سانس نکلنے کے وقت تک۔ اس روشنی نے نہ تو ان کا ساتھ قبر میں دیا نہ حشر میں ساتھ دے گی۔ اگر وہ کلمہ اخلاص کے ساتھ پڑھتے تو ہمیشہ کے لیے ساتھ دیتا۔ اب جب اللہ تعالیٰ نے ان کی جان نکال لی تو اندھیرے میں رہ گئے۔

بہرے، گونگے، اندھے کا معنیٰ

﴿صُمٌّۢ﴾ بہرے ہیں ﴿بُکۡمٌ﴾ گونگے ہیں ﴿عُمۡیٌ﴾ اندھے ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ دنیا میں جتنے کافر اور منافق ہیں وہ نہ تو سنتے ہیں نہ بولتے ہیں اور نہ دیکھ سکتے ہیں۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ وہ حق بات سننے سے بہرے ہیں، حق بات کہنے سے گونگے ہیں، حق کے نشانات دیکھنے سے اندھے ہیں۔ جیسا کہ ہمارے حکمران ہیں کہ ساری باتیں سنتے ہیں مگر مظلوم کی فریاد نہیں سنتے۔ لمبی لمبی تقریریں کریں گے کہ سننے والا کہے گا کہ ان سے زیادہ مخلص کوئی نہیں ہے لیکن حق کی بات زبان سے نہیں نکلے گی۔ حق کے معاملے میں گونگے ہیں۔

زمین، آسمان، چاند، سورج، ستارے، پہاڑ، دریا سب ان کو نظر آتے ہیں مگر کمزوروں پر ظلم ہوتا ان کو نظر نہیں آتا۔ غریب اور مظلوم عوام کی غربت اور بے بسی ان کو نظر نہیں آتی۔ لوگوں کی تکلیفوں اور پریشانیوں کو نہیں دیکھ سکتے۔ اس سلسلے میں اندھے ہیں۔

آج سے تقریباً ساٹھ سال پہلے کی بات ہے جامع مسجد شیرانوالہ باغ میں، میں پڑھتا تھا۔ حضرت مولانا عبدالقدیر صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہمارے استاد تھے۔ گکھڑ میں بھی میرے پاس کئی دفعہ تشریف لائے ہیں۔ کچھ عرصہ ہوا ہے فوت ہو گئے ہیں اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔ مشکوٰۃ شریف کے سبق کے دوران ایک حدیث آئی کہ ایک وقت ایسا آئے گا کہ لوگوں پر ایسے لوگ حکمرانی کریں گے جو ﴿صُمٌّۢ بُکۡمٌ عُمۡیٌ﴾ بہرے، گونگے، اندھے ہوں گے۔ ہم نے استاذِ محترم سے پوچھا کہ حضرت! اس وقت آنکھوں والے، کانوں والے اور بولنے والے نہیں ہوں گے؟ کہ لوگ اندھوں، بہروں، گونگوں کو اپنا بادشاہ بنائیں گے۔

بخاری شریف میں حدیث کے الفاظ ہیں کہ قیامت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی یہ بھی ہے کہ ((اَنۡ تَرٰی صُمًّا بُکۡمًا عُمۡیًا مُلُوۡكَ الۡاَرۡضِ)). یہ کہ تو دیکھے گا بہرے، گونگے، اور اندھے زمین کے بادشاہ ہیں۔

حضرت کا تکیہ کلام ہوتا تھا "میاں" فرمایا میاں آنکھیں ہوں گی، کان بھی ہوں گے اور زبانیں بھی ہوں گی مگر حق کو سنیں گے نہیں، حق بولیں گے نہیں، حق کے نشانات دیکھیں گے نہیں۔ آنحضرت ﷺ کی ایک ایک بات حق بن کر سامنے آرہی ہے۔ تو معنیٰ ہوگا ﴿صُمٌّ﴾ وہ حق بات سننے سے بہرے ہوں گے ﴿بُكْمٌ﴾ حق بولنے سے گونگے ہوں گے ﴿عُمْيٌ﴾ صحیح بات کو دیکھنے سے اندھے ہوں گے۔ ﴿فَهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ ۝۱۸﴾ وہ نہیں لوٹتے۔

منافقین کی دوسری مثال

﴿اَوْ كَصَيِّبٍ﴾ یا ان کی مثال ہے بارش کی طرح ﴿مِّنَ السَّمَآءِ﴾ جو آسمان کی طرف سے نازل ہوتی ہے ﴿فِيْهِ ظُلُمٰتٌ﴾ اس میں اندھیرے ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ جب بارش ہوتی ہے تو اس وقت اندھیرا سا چھا جاتا ہے۔ ﴿وَّ رَعْدٌ﴾ اور کڑک ہے ﴿وَّ بَرْقٌ ۚ﴾ اور بجلی ہے۔ بات سمجھنا! اللہ تعالیٰ کی طرف سے روحانی بارش نازل ہوئی قرآن پاک کی شکل میں۔ اس میں کفر پر جو وعیدیں ہیں اور عذاب کا ذکر ہے اس کو تشبیہ دی ہے ﴿رَعْدٌ﴾ کڑک کے ساتھ اور قرآن کریم میں جو حقانیت کے دلائل ہیں ان کو ﴿بَرْقٌ﴾ چمک کے ساتھ تشبیہ دی ہے۔

یعنی جب قرآن کریم نازل ہوا ہے ہر طرف کفر کی تاریکی چھائی ہوئی تھی تو قرآن کریم نے کفر شرک پر وعید سنائی اور قرآن کریم میں بڑے واضح دلائل ہیں جن سے حق اور باطل میں تمیز ہوسکتی ہے۔ لیکن جب دلائل کی بجلی چمکتی ہے تو یہ منافق ﴿يَجْعَلُوْنَ اَصَابِعَهُمْ﴾ کرتے ہیں یعنی ڈالتے ہیں اپنی انگلیاں ﴿فِيْٓ اٰذَانِهِمْ﴾ اپنے کانوں میں ﴿مِّنَ الصَّوَاعِقِ﴾ بجلی کی وجہ سے۔ کیونکہ جب بجلی گرتی ہے تو اس سے آدمی بھی مرجاتے ہیں اور جانور بھی۔ اور بھی بڑا نقصان ہوتا ہے۔ تو یہ قرآن کریم کے دلائل کو بجلی سمجھتے ہیں۔ ﴿حَذَرَ الْمَوْتِ ؕ﴾ موت کے ڈر سے ایسا کرتے ہیں۔ ان میں طاقت نہیں ہے کہ قرآن کریم کی آیتیں سنیں۔ اس لیے کانوں میں انگلیاں دے لیتے ہیں۔ اور ساتویں پارے میں آتا ہے: ﴿وَ هُمْ يَنْهَوْنَ عَنْهُ وَ يَنْئَوْنَ عَنْهُ ۚ﴾ اور وہ کافر قرآن پاک کو سننے سے منع کرتے ہیں۔ اور وہ خود قرآن کریم سے دور بھاگتے ہیں۔ اور کہتے ہیں ﴿لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ﴾ نہ سنو اس قرآن کو اور جب قرآن کی تلاوت ہو رہی ہو تو ﴿وَ الْغَوْا فِيْهِ﴾ شور مچاؤ۔ تاکہ کوئی اور بھی نہ سن سکے۔ ﴿وَ اللّٰهُ مُحِيْطٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ ۝۱۹﴾ اور اللہ تعالیٰ گھیرنے والا ہے کافروں کو۔ قدرت کے لحاظ سے بھی اور علم کے اعتبار سے بھی۔

﴿يَكَادُ الْبَرْقُ﴾ قریب ہے کہ وہ بجلی ﴿يَخْطَفُ اَبْصَارَهُمْ ؕ﴾ اچک لے ان کی آنکھوں کو۔ وہ بجلی اتنی تیز ہے کہ ان کی آنکھوں کی روشنی کو ختم کردے۔ حکماء نے لکھا ہے کہ جب بجلی چمکے اس کی طرف نہ دیکھو۔ اور اطباء نے بھی لکھا ہے کہ اس کی لہ اتنی تیز ہوتی ہے کہ اس کی طرف دیکھنے سے بینائی ختم ہوجاتی ہے۔ اسی طرح سورج گرہن ہو تو اس وقت سورج کی طرف دیکھنے سے بھی بینائی ختم ہوجاتی ہے۔ نظامِ قدرت بڑا عجیب ہے۔

فرمایا ﴿كُلَّمَآ اَضَاۗءَ لَهُمْ﴾ جب کبھی روشنی ہوتی ہے ان کے لیے، بجلی کے چمکنے سے۔ ﴿مَّشَوْا فِيْهِ﴾ اس میں چل پڑتے ہیں ﴿وَ اِذَاۤ اَظْلَمَ عَلَيْهِمْ﴾ اور جب اندھیرا چھا جاتا ہے ان پر ﴿قَامُوْا﴾ تو ٹھہر جاتے ہیں۔ اور بعض حضرات نے اس کا یہ مطلب بھی بیان کیا ہے کہ ان منافقوں کو جب مالِ غنیمت میں سے یا صدقہ، خیرات اور مال زکوٰۃ میں سے کچھ مل جاتا ہے تو اس کی چمک سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ساتھ چل پڑتے ہیں۔ اور کہتے ہیں ہم تمہارے ساتھ ہیں اور جب کچھ نہیں ملتا تو اندھیرا چھا جاتا ہے تو ٹھہر جاتے ہیں اور کافروں کو کہتے ہیں ﴿اِنَّا مَعَكُمْ﴾ ہم تمہارے ساتھ ہیں۔

﴿وَ لَوْ شَاۗءَ اللّٰهُ﴾ اور اگر اللہ تعالیٰ چاہے ﴿لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ﴾ البتہ لے جائے ان کے کانوں کو ﴿وَ اَبْصَارِهِمْ﴾ اور ان کی آنکھوں کو ﴿اِنَّ اللّٰهَ﴾ بے شک اللہ تعالیٰ ﴿عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ﴾ ہر چیز پر قادر ہے۔

پنڈت دیانند سرسوتی کا اعتراض

یہاں ایک بات ذہن نشین کر لیں۔ وہ یہ کہ قرآن کریم جب سے نازل ہوا ہے بد باطن لوگ اس پر اعتراض کرتے آئے ہیں اور اپنے منہ کی کھاتے آئے ہیں۔ اعتراض کرنے والوں میں سے ایک بہت بڑا خبیث پنڈت دیانند سرسوتی گزرا ہے۔ یہ آریا سماج کا لیڈر تھا۔ اس نے ایک کتاب لکھی ہے "ستیارتھ پرکاش" اس کے چودھویں باب میں قرآن پاک پر اعتراضات کیے ہیں۔ اور بڑی گندی زبان استعمال کی ہے۔

قرآن کریم کے نازل کرنے والے یعنی رب تعالیٰ کو اس نے بے ایمان، جاہل اور بدو کہا ہے، العیاذ باللہ۔ اور اپنے آپ کو محقق کہتا ہے۔ اور اس کا انداز یہ ہے کہ پہلے قرآن کریم کی آیت کا ترجمہ نقل کرتا ہے۔ پھر آگے لکھتا ہے کہ محقق کہتا ہے۔

چنانچہ اس نے اس آیت کریمہ پر بھی اعتراض کیا ہے۔ لکھتا ہے "اے مسلمانو! تم قرآن میں پڑھتے ہو کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے مجھے یہ بتاؤ کہ اللہ تعالیٰ چوری اور زنا پر بھی قادر ہے؟ تو ہمارے اور اللہ کے درمیان کیا فرق ہوا؟ اور اگر قادر نہیں ہے تو پھر تمہارا قرآن سچا نہیں ہے۔"

مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کا جواب

اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے قاسم العلوم والخیرات حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کو انہوں نے اس دور میں بہت ساری کتابیں لکھی ہیں۔ ان میں سے ایک کتاب ''انتصار الاسلام'' ہے جس میں انہوں نے اس کے اعتراضات کے جوابات دیے ہیں۔

اس اعتراض کا حضرت نے جو جواب دیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت فرماتے ہیں پنڈت جی! چوری کی تعریف یہ ہے کہ آپ غیر کی ملک میں ہاتھ ڈالیں۔ اپنی ملک میں سے کسی چیز کے لینے کو چوری نہیں کہتے۔ پہلے کسی چیز کے متعلق یہ ثابت کرو کہ وہ اللہ تعالیٰ کی ملک نہیں ہے اور فلاں کی ملک ہے، پھر چوری کی بحث آئے گی۔ جب دنیا کی تمام چیزیں اللہ تعالیٰ کی مِلک ہیں

توان میں چوری کا سوال کس طرح پیدا ہو گیا؟

اور رہی بات زنا کی تو زنا کے لیے زنانہ مردانہ آلات کی ضرورت ہے۔ پہلے رب تعالیٰ کے لیے وہ آلات ثابت کرو پھر زنا کی بات ہو گی۔ رب تعالیٰ کی ذات ان تمام چیزوں سے پاک ہے۔ رب تعالیٰ تمام اوصاف سے متصف ہے اور اس کی وہ صفتیں ہماری طرح نہیں ہیں۔

ارشادِ ربانی ہے ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ﴾ اس کے مثل کوئی شے نہیں ہے۔ اس کے کان ہمارے کانوں کی طرح نہیں ہیں۔ اس کی زبان ہماری زبان کی طرح نہیں ہے۔ اس کے ہاتھ ہمارے ہاتھوں کی طرح نہیں ہیں۔ اس کے پاؤں ہمارے پاؤں کی طرح نہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ جسمانیات سے پاک ہے۔ اور پنڈت جی! اس بات کو تم بھی مانتے ہو لہٰذا تمہارا یہ سوال کرنا حماقت ہے۔ اور بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے اور جو چاہتا ہے کرتا ہے۔

﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ﴾ اے لوگو! ﴿اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ﴾ عبادت کرو اپنے رب کی ﴿الَّذِيْ خَلَقَكُمْ﴾ جس نے تم کو پیدا کیا ہے ﴿وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ﴾ اور ان لوگوں کو جو تم سے پہلے ہوئے ﴿لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ﴾ تاکہ تم بچ جاؤ ﴿الَّذِيْ﴾ وہ ذات ﴿جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا﴾ جس نے بنایا تمہارے لیے زمین کو بچھونا ﴿وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً﴾ اور آسمان کو بنایا چھت ﴿وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً﴾ اور اس نے اتارا آسمان کی طرف سے پانی ﴿فَاَخْرَجَ بِهٖ﴾ پھر اس نے نکالے اس پانی کے ذریعے ﴿مِنَ الثَّمَرٰتِ﴾ پھل ﴿رِزْقًا لَّكُمْ﴾ تمھارے لیے روزی ﴿فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا﴾ پس نہ بناؤ اللہ تعالیٰ کے لئے شریک ﴿وَّاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ﴾ اور تم جانتے ہو ﴿وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ﴾ اور اگر ہو تم شک میں ﴿مِّمَّا﴾ اس چیز کے بارے میں ﴿نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا﴾ جو اُتاری ہم نے اپنے بندے پر ﴿فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ﴾ پس لاؤ تم کوئی سورت اس جیسی ﴿وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ﴾ اور بلالو اپنے امدادیوں کو ﴿مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ اللہ تعالیٰ سے نیچے نیچے ﴿اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ﴾ اگر ہو تم سچے ﴿فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا﴾ پس اگر تم نہ کر سکو ﴿وَلَنْ تَفْعَلُوْا﴾ اور ہرگز نہ کر سکو گے ﴿فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْ﴾ پھر ڈرو تم اس آگ سے ﴿وَقُوْدُهَا﴾ جس کا ایندھن ہوں گے ﴿النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ﴾ لوگ اور پتھر ﴿اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ﴾ تیار کی گئی ہے کافروں کے لیے ﴿وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ اور آپ خوشخبری سنا دیں ان لوگوں کو جو ایمان لائے ﴿وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ﴾ اور عمل کیے اچھے ﴿اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ﴾ بے شک ان کے لیے ایسے باغات ہوں گے ﴿تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ﴾ کہ بہتی ہوں گی ان کے نیچے نہریں ﴿كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا﴾ جب بھی ان کو دیا جائے ان جنتوں میں ﴿مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا﴾ پھلوں سے رزق ﴿قَالُوْا هٰذَا الَّذِيْ﴾ کہیں

گے یہ تو وہی ہے ﴿رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ﴾ جو اس سے پہلے ہمیں روزی دی گئی ﴿وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا﴾ اور وہ اس میں دیئے جائیں گے ایک دوسرے سے ملتا جلتا ﴿وَلَهُمْ فِيْهَآ﴾ اور ان کے لئے ہوں گے ان جنتوں میں ﴿اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ﴾ جوڑے پاکیزہ ﴿وَّهُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ﴾ اور وہ ان جنتوں میں ہمیشہ رہیں گے۔

ربط

سورۃ فاتحہ میں ہدایت کا مطالبہ تھا اور سورۃ بقرہ کے شروع میں اس ہدایت نامے کے ملنے کی بشارت تھی ﴿ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ﴾ کہ جو ہدایت تم مانگتے ہو وہ اللہ تعالیٰ نے اس کتاب کی شکل میں تمہیں دے دی ہے۔ پھر اس ہدایت کے متعلق تین گروہوں کا ذکر ہوا۔

①...... ایک وہ جو ظاہراً باطناً ماننے والے ہیں۔

②...... دوسرے وہ جو نہ دل سے مانتے ہیں اور نہ زبان سے اقرار کرتے ہیں۔

③...... اور تیسرے منافق جو زبان سے تو مانتے ہیں مگر دل سے تسلیم نہیں کرتے۔

قرآن کریم کی بنیادی دعوت

اب یہ بتلایا جا رہا ہے کہ وہ ہدایت نامہ جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمہیں ملا ہے وہ کہتا کیا ہے؟ اور یہ بات بھی ذہن نشین کر لیں کہ اصل الاصول عقیدے تین ہیں۔

①...... توحید ②...... رسالت ③...... قیامت

باقی جتنے عقیدے ہیں وہ ان تین کی طرف لوٹتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس رکوع میں ان تینوں بنیادی عقیدوں کا ذکر فرمایا ہے۔

﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا﴾ میں توحید کا ذکر ہے۔ ﴿وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ﴾ میں رسالت کا ذکر ہے۔ اور ﴿كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا﴾ میں قیامت کا ذکر ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ﴾ اے انسانو! آنحضرت ﷺ کی بعثت تو جنوں اور انسانوں سب کے لیے ہے۔ اور خطاب صرف انسانوں کو اس لیے کیا کہ اللہ تعالیٰ نے زمین کی خلافت انسانوں کے سپرد فرمائی ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام کے زمین پر نزول کے بعد زمین پر خلیفہ انسان ہی ہے۔ اور جنات انسانوں کے تابع ہیں۔ اور خطاب اصل کو ہی ہوتا ہے۔ اس لیے فرمایا ﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ﴾ اے انسانو! اور یہ خطاب تمام انسانوں کو ہے کالے گورے اور عربی، عجمی کی تخصیص کے بغیر۔

﴿اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ﴾ عبادت کرو اپنے پروردگار کی ﴿الَّذِيْ خَلَقَكُمْ﴾ جس نے تم کو پیدا کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی صفت خلق اتنی واضح ہے کہ جو پکے سکہ بند مشرک تھے وہ بھی مانتے تھے کہ ہر چیز کا خالق اللہ تعالیٰ ہے۔ قرآن پاک میں آتا ہے ﴿وَلَئِنْ

﴿سَاَلْتَهُمْ﴾ اور اگر آپ ان سے سوال کریں ﴿مَنْ خَلَقَهُمْ﴾ ان کو کس نے پیدا کیا ہے؟ ﴿لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ﴾ تو وہ ضرور کہیں گے کہ اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے۔

تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ عبادت اس کی کرو جس نے تمہیں پیدا کیا ہے اور صرف تمہیں ہی نہیں پیدا کیا بلکہ ﴿وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ﴾ اور ان لوگوں کو جو تم سے پہلے ہوئے۔ اللہ تعالیٰ ہر ایک کا خالق ہے۔ پہلوں کا بھی اور پچھلوں کا بھی قیامت تک سب کا خالق اللہ تعالیٰ ہے اور عبادت کا حکم اس لیے دیا ہے کہ ﴿لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ﴾ تاکہ تم بچ جاؤ۔ اللہ تعالیٰ کی گرفت اور عذاب سے۔ اللہ تعالیٰ اگرچہ نظر نہیں آتا مگر اس کی قدرت کی دلیلیں اتنی واضح ہیں کہ کوئی اندھا بھی انکار نہیں کر سکتا البتہ ضد کا کوئی علاج نہیں ہے۔

وجودِ باری تعالیٰ پر دلائل

حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے اس مقام پر تین واقعات نقل فرمائے ہیں۔

امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا استدلال

①...... پہلا واقعہ امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا ہے اس علاقے میں کچھ لوگ دہریے تھے جن کا نظریہ تھا کہ یہ نظام خود بہ خود چل رہا ہے اس کا چلانے والا کوئی نہیں ہے۔ یعنی وہ خدا تعالیٰ کے وجود کے منکر تھے۔ یہ لوگ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس آئے اور کہنے لگے کہ ہم رب تعالیٰ کو نہیں مانتے آپ ہمیں رب تعالیٰ کے وجود پر کوئی دلیل دیں کہ رب کہاں ہے اور اس کی صورت کیا ہے؟ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ میں ایک فکر میں ہوں (اور یاد رکھنا کہ بات سمجھانے کے لیے کوئی کہانی بیان کی جائے تو وہ جائز ہے)۔

فرمایا کہ میں ایک فکر میں ہوں کہ میرے سامنے ایک درخت تھا میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ گر گیا اور خود بہ خود اس کے پھٹے اور تختیاں بن گئیں اور خود بہ خود وہ آپس میں جڑ گئیں اور کشتی تیار ہو کر دریا میں آگئی اور لوگوں کو ایک کنارے سے دوسرے کنارے لے جاتی اور کرایہ بھی خود ہی وصول کرتی کوئی اس کا ملاح نہیں اور مسافروں کو اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر پہنچا رہی ہے۔

امام صاحب نے جب یہ بات فرمائی تو وہ دہریے ملحد اور بے دین ٹھاہ ٹھاہ کر کے ہنسنے لگے اور کہنے لگے کہ ہم نے تو آپ کی بہت تعریف سنی تھی کہ بڑے صاحبِ علم اور بصیرت والے ہیں اور امام اعظم ہیں۔ مگر آپ نے جو گفتگو کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ سے بڑا کوئی بے وقوف نہیں ہے۔ بھلا یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ درخت خود بہ خود کٹے اور خود بہ خود اس کے تختے بن کے جڑنے لگ جائیں اور خود بہ خود ان میں میخیں لگ جائیں اور وہ خود بہ خود کشتی بن کر دریا میں چلی جائے اور خود بہ خود مسافروں کو اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر پہنچانے لگ جائے اور کرایہ بھی خود ہی وصول کرے یہ بھی کوئی کرنے والی بات ہے۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ایک کشتی کا بغیر بنانے والے کے خود بہ خود بن جانا اور بغیر چلانے والے کے چلنا تمہاری سمجھ

میں نہیں آتا۔

او ظالمو! یہ آسمان اور زمین اور پہاڑ بغیر کسی بنانے والے کے خود بہ خود کس طرح بن گئے۔ ایک کشتی کا بغیر ملاح کے چلنا تو تمہاری سمجھ میں نہیں آتا تو یہ سارا کارخانہ کائنات خود بخود کس طرح چل رہا ہے بغیر کسی چلانے والے کے۔

حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ فَاَسْلَمُوْا عَلٰی یَدَیْہِ پس وہ تمام کے تمام امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھ پر مسلمان ہوگئے۔ یہ دیکھو! میرے سامنے تپائی پڑی ہے اس کو کسی نے بنایا ہے تو بنی ہے خود بہ خود تو نہیں بن گئی۔ مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ؎

ہیچ چیزے خود بہ خود چیزے نہ شد
ہیچ آہن خود بہ خود تیغے نہ شد

کوئی چیز خود بہ خود چیز نہیں بن سکتی اور کوئی لوہا خود بہ خود تلوار نہیں بن سکتا۔ بلکہ بنانے والا بناتا ہے تو بنتی ہے۔ یہ مثنوی کا شعر ہے۔ پہلے زمانے میں مرد عورتیں گھروں میں مثنوی پڑھتے تھے اور اب ناولوں نے لوگوں کے دماغ خراب کر دیے ہیں۔ پھر مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ؎

مولوی ہرگز نہ شد مولائے روم
تا غلامِ شمس تبریزی نہ شد

میں ویسے ہی تو مولوی نہیں بن گیا شمس تبریز رحمۃ اللہ علیہ کی جوتیاں سیدھی کی ہیں ان کی خدمت کی ہے تو مجھے علم حاصل ہوا ہے۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا استدلال

②......دوسرا واقعہ حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا نقل فرمایا ہے کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے سوال کیا کہ اللہ تعالیٰ کے وجود پر تمہارے پاس کیا دلیل ہے فرمایا کہ یہ شہتوت کا درخت ہے کہ اس کے پتے کو ریشم والے کیڑے کھاتے ہیں تو ان کے جسموں سے ریشم کے دھاگے نکلتے ہیں اگر شہد کی مکھیاں کھاتی ہیں تو شہد بنتا ہے اور انہیں پتوں کو اگر گائیں اور بکریاں کھائیں تو گوبر اور مینگنیاں بنتی ہیں اور اگر ہرنی کھائے تو کستوری بنتی ہے۔ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ پتے وہی ہیں باقی سب اللہ تعالیٰ کی قدرت کے مظاہر ہیں۔

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کا استدلال

③......اور تیسرا واقعہ حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کا نقل فرمایا ہے کہ ان سے کسی نے سوال کیا کہ اللہ تعالیٰ کے وجود پر تمہارے پاس کیا دلیل ہے؟ فرمایا ایک قلعہ ہے جس کا نہ تو کوئی دروازہ ہے اور نہ کھڑکی ہے اوپر سے چاندی کی طرح

سفید ہے اور اندر سے سونے کی طرح ہے پس اچانک اس کی دیواریں پھٹ جاتی ہیں اور اس میں سے ایک خوبصورت پیاری آواز والا حیوان نکل آتا ہے جو دیکھتا بھی ہے اور سنتا بھی ہے۔ قلعہ سے مراد انڈہ ہے اور اس سے چوزہ نکل آتا ہے جو بڑا خوبصورت اور پیاری آواز والا ہوتا ہے جس ذات نے بند قلعے سے جس میں نہ خوراک کا راستہ اور نہ ہوا یہ بچہ پیدا فرمایا ہے وہی اللہ تعالیٰ تمام کائنات کا بنانے والا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ کے وجود کو بڑی آسانی سے سمجھ سکتے ہیں۔

ہر گیاہ کہ از زمین روید
وحدہٗ لاشریک لہٗ گوید

جو گھاس زمین سے پیدا ہوتا ہے وہ زبانِ حال سے کہہ رہا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ وحدہٗ لاشریک لہٗ ہے۔ کیونکہ گھاس یا کوئی بھی پودا زمین سے اُگتا ہے تو پہلے اس کی ایک کونپل نکلتی ہے جو اللہ تعالیٰ کے وحدہٗ لاشریک لہ ہونے پر دلالت کرتی ہے پھر شاخیں اور ٹہنیاں نکلتی ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ عبادت اس کی کرو جس نے تمہیں اور تم سے پہلے سب کو پیدا فرمایا ہے تاکہ تم اس کے عذاب سے بچ جاؤ۔

﴿الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا﴾ اللہ تعالیٰ وہ ذات ہے جس نے بنایا تمہارے لیے زمین کو بچھونا ﴿وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً﴾ اور آسمان کو چھت۔ اور تم اسی زمین میں رہ رہے ہو اور اسی چھت کے نیچے چلتے پھرتے ہو۔

﴿وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً﴾ اور اس نے اتارا آسمان کی طرف سے پانی بارش کی صورت میں ﴿فَاَخْرَجَ بِهٖ﴾ پھر اس نے نکالے اس پانی کے ذریعے ﴿مِنَ الثَّمَرٰتِ﴾ پھل ﴿رِزْقًا لَّكُمْ﴾ تمہارے لیے روزی۔ بہ راہِ راست بھی پھل کھاتے ہو اور پھلوں کو فروخت کر کے اناج خرید کر بھی کھاتے ہو اور دیگر اپنی ضروریات بھی پوری کرتے ہو۔ یہ تمام انتظام کرنے والا کون ہے زمین، آسمان کس نے بنائے؟ بارش کس نے برسائی؟ اور اس کے ذریعے سے پھل کس نے زمین سے نکالے؟ روزی کا انتظام کس نے کیا؟

جب یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ نے کیا ہے تو ﴿فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا﴾ پس نہ بناؤ تم اللہ تعالیٰ کے لیے شریک ﴿وَّاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ﴾ حالانکہ تم جانتے ہو کہ خالق وہی ہے پھر شریک کیوں بناتے ہو؟

آگے رسالت کے مسئلہ کا بیان ہے۔ کافر، مشرک لوگ کبھی تو آنحضرت ﷺ کو ساحر اور کبھی مجنون کہتے تھے، (معاذ اللہ تعالیٰ)۔ اور کبھی کہتے کہ ﴿اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ﴾ پہلے لوگوں کے قصے کہانیاں ہمیں سناتا ہے۔ بے شک قرآن کریم میں آدم علیہ السلام، نوح علیہ السلام اور دیگر انبیاء کرام علیہم السلام کے واقعات ہیں مگر ان واقعات سے محض دماغی عیاشی نہیں ہے بلکہ ان کے اندر ایک حقیقت ہے جس سے عبرت اور سبق حاصل ہوتا ہے۔

اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے ﴿فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ؀﴾ (الاعراف) پس آپ ﷺ واقعات بیان کریں تاکہ یہ لوگ غور وفکر کریں۔ اور کبھی کہتے کہ یہ مفتری ہے یعنی قرآن خود بنا کے ہمیں سنا دیتا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ

کا کلام نہیں ہے۔

مقابلہ کے لیے قرآن کا چیلنج

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ﴿وَ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ﴾ اور اگر ہو تم شک میں ﴿مِّمَّا﴾ اس چیز کے بارے میں ﴿نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا﴾ جو اتاری ہم نے اپنے بندے (حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم) پر ﴿فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ﴾، سُوْرَةٍ میں تنوین قلت کے لیے ہے معنیٰ ہوگا پس لاؤ تم کوئی چھوٹی سی سورت۔ ﴿مِّنْ مِّثْلِهٖ﴾ اس قرآن جیسی۔

قرآن پاک میں تین سورتیں تمام سورتوں سے چھوٹی ہیں: ①......سورۃ العصر ②......سورۃ الکوثر ③......سورۃ النصر اور قرآن کریم کی کوئی سورت تین آیتوں سے کم نہیں ہے۔ اسی لیے فقہاء کرام رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ نماز کی ایک رکعت میں کم از کم تین آیتیں پڑھنی چاہئیں۔ یا ایک آیت اتنی لمبی ہو کہ جو تین آیتوں کے برابر ہو تو پھر بھی صحیح ہے۔ مطلب یہ ہے کہ سورۃ فاتحہ کے بعد اگر ایک آیت بھی اتنی بڑی پڑھ لیں کہ جو کم از کم تین آیتوں کے برابر ہو تو نماز صحیح ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان کو چیلنج دیا اگر تمہیں اس چیز کے بارے میں شک ہے جو ہم نے اپنے بندے یعنی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کیا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا کلام نہیں ہے تو تم اس قرآن کے مثل کوئی چھوٹی سی سورت ہی لے آؤ۔ یہ ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے آخری چیلنج تھا۔ پہلے یہ چیلنج دیا کہ:

﴿قُلْ لَّىِٕنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَ الْجِنُّ عَلٰۤى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَ لَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا ۝۸۸﴾ (بنی اسرائیل: ۸۸)

یعنی انسان اور تمام جن مل کر بھی اس قرآن کی مثل لانا چاہیں تو نہیں لا سکتے اگرچہ یہ ایک دوسرے کے مددگار بھی بن جائیں۔ گویا ساری مخلوق عاجز ہے۔ اس بات سے کہ قرآن جیسا کوئی کلام پیش کر سکیں۔

پھر چیلنج دیا کہ اگر سارے قرآن کی مثل نہیں لا سکتے تو تمہیں مزید چھوٹ دے دیتے ہیں۔ وہ اس طرح کہ قرآن کریم کی کل ایک سو چودہ سورتیں ہیں ایک سو چار سورتیں تمہیں معاف ہیں ﴿فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ﴾ (ہود: ۱۳) پس اس جیسی دس سورتیں ہی بنا کر لے آؤ۔ معلوم ہو جائے گا کہ یہ اللہ تعالیٰ کا کلام نہیں ہے بلکہ انسان بھی اس جیسا کلام پیش کر سکتا ہے۔ مگر کوئی بھی اس چیلنج کا جواب نہ دے سکا۔ پھر آخر میں یہ چیلنج دیا کہ اس قرآن جیسی کوئی چھوٹی سی سورۃ ہی لے آؤ اور پہلے تو انسانوں اور جنوں کو چیلنج تھا اور اب فرمایا:

﴿وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ شُهَدَآءَ، شَهِيْدٌ کی جمع ہے اور یہاں شہید کے معنیٰ مددگار کے ہیں۔ معنیٰ ہوگا اور بلالو اپنے امدادیوں کو اللہ تعالیٰ سے نیچے نیچے۔ چاہے انسان ہوں چاہے جنات ہوں، چاہے فرشتے ہوں۔

﴿اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ﴾ اگر ہو تم سچے ﴿فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا﴾ پس اگر تم نہ کر سکو۔ یہ درمیان میں جملہ معترضہ ہے ﴿وَلَنْ

﴿تَفْعَلُوْا﴾ اور ہرگز نہ کرسکو گے۔ پندرہویں صدی شروع ہے آج تک کوئی ماں کا لال قرآن پاک جیسی ایک سورت بھی نہ لا سکا۔ حالانکہ سحبان وائل جیسے بڑے بڑے فصیح اور بلیغ اس دنیا میں آئے ہیں۔

فصیح عرب سحبان وائل قرآن کے سامنے مہر بہ لب

سحبان وائل تمام فصحاء کا سردار سمجھا جاتا تھا۔ اور وہ اتنا فصیح تھا کہ اس نے بالغ ہونے کے بعد ساری زندگی مکرر جملہ نہیں بولا۔ یعنی اپنے مطلب کی ادائیگی کے لیے اس نے جو جملہ ایک دفعہ بولا ہے دوبارہ اسے زبان پر نہیں لایا۔ اگر وہ بات دوبارہ بیان کی ہے تو دوسرے جملہ کے ساتھ بیان کی ہے۔ مگر اس کو بھی قرآن جیسی سورۃ لانے کی ہمت نہیں ہوئی۔ نہ آج تک کوئی لا سکا نہ قیامت تک کوئی لا سکے گا۔

﴿فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِیْ﴾ پھر ڈرو تم اس آگ سے ﴿وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ﴾ جس کا ایندھن ہوں گے لوگ اور پتھر۔ یعنی جس طرح اس میں انسان جلیں گے اسی طرح پتھر بھی جلیں گے اور وہ آگ دنیا کی آگ سے انہتر گنا تیز ہوگی۔

﴿اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِیْنَ﴾ تیار کی گئی ہے کافروں کے لیے، منکروں کے لیے۔ یہ تو کافروں کا انجام ہوگا۔ اب ماننے والوں کا انجام بھی سن لو تا کہ دونوں باتیں سامنے آ جائیں۔

مومنوں کو بشارت

فرمایا ﴿وَبَشِّرِ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا﴾ اور آپ خوشخبری سنا دیں ان لوگوں کو جو ایمان لائے ﴿وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ﴾ اور عمل کیے اچھے۔ کس چیز کی خوشخبری؟ فرمایا ﴿اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ﴾ بے شک ان کے لیے ایسے باغات ہوں گے ﴿تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ﴾ کہ بہتی ہوں گی ان کے نیچے نہریں ﴿كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا﴾ جب بھی ان کو دیا جائے ان جنتوں میں پھلوں سے رزق ﴿قَالُوْا هٰذَا الَّذِیْ﴾ وہ کہیں گے یہ تو وہی ہے ﴿رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ﴾ جو اس سے پہلے ہمیں روزی دی گئی تھی ﴿وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا﴾ اور وہ اس میں دیئے جائیں گے ایک دوسرے سے ملتا جلتا۔

مثلاً: تیسرے دن جو پھل ملے گا اس کی شکل وصورت وہی ہوگی جو داخل ہونے کے بعد دوسرے دن ملا تھا مگر ذائقہ الگ الگ ہوگا اور لذت روز بہ روز بڑھتی جائے گی۔ پہلے دن کے پھل کا جو ذائقہ ہوگا دوسرے دن کا اس سے زیادہ ہوگا تیسرے دن کا اس سے زیادہ ہوگا اسی طرح روز بہ روز بڑھتا جائے گا۔

جس طرح کافروں کے متعلق فرمایا ﴿فَذُوْقُوْا فَلَنْ نَّزِیْدَكُمْ اِلَّا عَذَابًا﴾ پس چکھو تم ہرگز نہیں بڑھائیں گے تمہارے لیے مگر عذاب ہی۔ یعنی ان کے عذاب میں روز بہ روز اضافہ ہوتا جائے گا۔ اور مومنوں کے لیے مزید کیا ہوگا؟

فرمایا ﴿وَلَهُمْ فِیْهَاۤ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ﴾ اور ان کے لیے ہوں گے ان جنتوں میں جوڑے پاکیزہ۔ ایمان والوں کو وہاں حوریں بھی ملیں گی اور دنیا والی عورتیں بھی ملیں گی اور ان کا درجہ حوروں سے زیادہ ہوگا۔

دُنیا کی عورتوں اور حوروں کا مکالمہ

حدیث پاک میں آتا ہے کہ دنیا والی عورتوں کو حوریں کہیں گی کہ ہم جنت کی مخلوق ہیں، کوئی کستوری سے پیدا ہوئی ہو گی، کوئی عنبر سے، کوئی کافور سے، کوئی زعفران سے اور تم خاکی مخلوق ہو۔ مگر تمہارا درجہ اور حسن ہمارے سے زیادہ ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟

یہ عورتیں جواب دیں گی ((لِصَلٰوتِنَا وَصِيَامِنَا)) ہم نمازیں پڑھتی تھیں اور روزے رکھتی تھیں۔ اس وجہ سے ہمیں یہ مقام ملا ہے تم تو یہاں مفت میں کھاتی پیتی ہو۔ دنیا والی عورتون کو نمازوں اور روزوں کی برکت سے اور دین کے سلسلے میں مشقتیں برداشت کرنے کی وجہ سے حوروں پر سرداری ملے گی۔ اور ان کا حسن و جمال حوروں کے حسن و جمال کو مات کر دے گا مگر شرط یہ ہے کہ مومن ہوں۔ کیونکہ آخرت کی کامیابی کے لیے ایمان شرط ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل اور مہربانی سے عورتوں کو سہولت عطا فرمائی ہے کہ وہ اپنے گھر میں ہی نماز پڑھیں۔

عورتوں کو بطورِ خاص نصیحت

وہ عورت بڑی خوش قسمت ہے جس کا خاوند نماز روزے کا پابند ہے۔ اور یہ اس کی خدمت کرتی ہے روٹی پکا کر دیتی ہے۔ کپڑے دھو کر استری کر کے دیتی ہے۔ خاوند کے گھر مال، عزت کی حفاظت کرتی ہے۔ تو یہ خاوند کے ثواب میں برابر کی شریک ہے۔ یعنی جتنی وہ نیکیاں کرتا ہے جتنا ثواب اس کو ملے گا اس کو بھی اتنا ثواب ملے گا۔ وہ مسجد میں جا کر جماعت کے ساتھ نماز پڑھے گا اس کو گھر میں بیٹھے ہوئے اس کے برابر ثواب ملے گا۔

اور بیبیو اور بیٹیو! یہ مسئلہ یاد رکھنا کہ نفلی روزوں اور نفلی نمازوں سے گھر کے کام کاج کا ثواب زیادہ ہے۔ مگر آج کل عورتیں کم کوس ہیں۔ گھروں میں مشینیں آ گئی ہیں سارا کام مشینوں سے لیتی ہیں۔ ہاتھ پاؤں نہیں ہلاتیں۔ اس وجہ سے صحت پر بھی برا اثر پڑھتا ہے۔ ہاتھ پاؤں حرکت نہیں کریں گے تو جسم میں ضعف اور کمزوری آئے گی۔ بیماریاں حملہ کریں گی۔ تجربہ شاہد ہے کہ بوڑھی عورتیں آج کل کی نوجوان عورتوں سے زیادہ طاقت ور ہیں۔ اور بوڑھے نوجوانوں سے زیادہ طاقت اور ہمت رکھتے ہیں۔ کیونکہ انہوں نے اپنے بدن کو حرکت دی ہے اور ہاتھ پاؤں کے ساتھ کام کئے ہیں۔ اور ہاتھ اور پاؤں کے ساتھ کام کرنے میں اللہ تعالیٰ نے صحت رکھی ہے اور اجر و ثواب بھی رکھا ہے۔ لیکن آج کل کے تمام کام مشینوں کے ذریعے سرانجام دیتے ہیں۔ لہٰذا وہ صحت اور طاقت نہیں ہے۔

تو خیر فرمایا کہ ایمان والوں کو جنتوں میں جوڑے ملیں گے عورتوں کو خاوند اور مردوں کو پاکیزہ بیویاں ملیں گی ﴿وَهُمْ فِيهَا خٰلِدُوْنَ﴾ اور وہ ان جنتوں میں ہمیشہ رہیں گے۔ اور ان کے انعامات میں اضافہ ہوتا رہے گا۔

﴿إِنَّ اللَّهَ﴾ بے شک اللہ تعالیٰ ﴿لَا يَسْتَحْيِ﴾ نہیں شرماتا ﴿أَنْ يَضْرِبَ﴾ یہ کہ بیان کرے ﴿مَثَلًا مَّا﴾ کوئی مثال ﴿بَعُوضَةً فَمَا فَوْقَهَا﴾ مچھر کی ہو یا اس سے بڑی ﴿فَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا﴾ پس بہر حال وہ لوگ جو ایمان لائے ﴿فَيَعْلَمُونَ﴾ پس وہ جانتے ہیں ﴿أَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَبِّهِمْ﴾ کہ یہ مثال حق ہے ان کے رب کی طرف سے ﴿وَأَمَّا الَّذِينَ كَفَرُوا﴾ اور بہر حال وہ لوگ جو کافر ہیں ﴿فَيَقُولُونَ﴾ پس وہ کہتے ہیں ﴿مَاذَا أَرَادَ اللَّهُ بِهَٰذَا مَثَلًا﴾ کیا ارادہ کیا اللہ تعالیٰ نے اس مثال کے ساتھ ﴿يُضِلُّ بِهِ كَثِيرًا﴾ اللہ تعالیٰ گمراہ کرتا ہے اس کے ذریعے بہتوں کو ﴿وَيَهْدِي بِهِ كَثِيرًا﴾ اور ہدایت دیتا ہے اس کے ذریعے بہتوں کو ﴿وَمَا يُضِلُّ بِهِ﴾ اور نہیں گمراہ کرتا اس کے ذریعے ﴿إِلَّا الْفَاسِقِينَ﴾ مگر نافرمانوں کو ﴿الَّذِينَ يَنْقُضُونَ عَهْدَ اللَّهِ﴾ نافرمان وہ ہیں جو توڑتے ہیں اللہ تعالیٰ کے عہد کو ﴿مِنْ بَعْدِ مِيثَاقِهِ﴾ اس کو مضبوط کرنے کے بعد ﴿وَيَقْطَعُونَ﴾ اور توڑتے ہیں ﴿مَا أَمَرَ اللَّهُ بِهِ﴾ اس چیز کو جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے ﴿أَنْ يُوصَلَ﴾ یہ کہ اس کو جوڑا جائے ﴿وَيُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ﴾ اور فساد مچاتے ہیں زمین میں ﴿أُولَٰئِكَ هُمُ الْخَاسِرُونَ﴾ اور یہی لوگ ہیں نقصان اُٹھانے والے ﴿كَيْفَ تَكْفُرُونَ بِاللَّهِ﴾ کیسے تم انکار کرتے ہو اللہ تعالیٰ کا ﴿وَكُنْتُمْ أَمْوَاتًا﴾ حالانکہ تم بے جان تھے ﴿فَأَحْيَاكُمْ﴾ پس اللہ تعالیٰ نے تم کو زندہ کیا ﴿ثُمَّ يُمِيتُكُمْ﴾ پھر تمہیں مارے گا ﴿ثُمَّ يُحْيِيكُمْ﴾ پھر تمہیں زندہ کرے گا ﴿ثُمَّ إِلَيْهِ تُرْجَعُونَ﴾ پھر تم اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے ﴿هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُمْ﴾ اللہ تعالیٰ وہی ہے جس نے پیدا کیا تمہارے لیے ﴿مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا﴾ جو کچھ زمین میں ہے سارا ﴿ثُمَّ اسْتَوَىٰ إِلَى السَّمَاءِ﴾ پھر اس نے ارادہ کیا آسمان کی طرف ﴿فَسَوَّاهُنَّ﴾ پس برابر کر دیا اُن کو ﴿سَبْعَ سَمَاوَاتٍ﴾ سات آسمان ﴿وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ﴾ اور وہ ہر چیز کو جانتا ہے۔

ربط:

اس سے پہلے درس میں میں نے بتایا تھا کہ اس رکوع میں اللہ تعالیٰ نے تین چیزیں بیان فرمائی ہیں۔ توحید، رسالت اور معاد کا اللہ تعالیٰ نے چیلنج دیا کہ اگر تمہیں شک ہے اس قرآن کے بارے میں جو ہم نے اپنے بندے حضرت محمد ﷺ پر نازل فرمایا ہے۔ تو قرآن کریم کی ایک سو چودہ سورتوں میں سے کسی ایک چھوٹی سی سورت کے مثل کوئی سورت لے آؤ۔

﴿فَإِنْ لَمْ تَفْعَلُوا﴾ پس اگر تم لوگ عربی اور فصیح و بلیغ ہونے کے باوجود سب مل کر بھی نہ لا سکو ﴿وَلَنْ تَفْعَلُوا﴾ اور تم ہرگز نہ لا سکو گے تو بچو تم اس آگ سے جس کا ایندھن لوگ اور پتھر ہیں۔

قرآنِ کریم پر مشرکین کا اعتراض

مشرکین مقابلہ کرنے سے تو عاجز آ گئے مگر دنیا کی عادت ہے کہ خاموش کوئی نہیں رہتا۔ جب ان سے کچھ نہ بن پڑا تو قرآن پاک پر اعتراض اور شوشے چھوڑنے شروع کر دیے۔ کہنے لگے کہ تم قرآن کی بڑی تعریف کرتے ہو کہ یہ بڑی عظیم کتاب ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے تو پھر اس میں مکھی، مچھر، مکڑی، کتے اور خنزیر کا ذکر کیوں آتا ہے؟ کیونکہ قرآن پاک میں مختلف مقامات پر موقع محل کی مناسبت سے اللہ تعالیٰ نے ان چیزوں کا ذکر فرمایا ہے۔

قرآنِ کریم کی عام فہم مثالیں

مثلاً: اللہ تعالیٰ نے حرام چیزوں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا: ﴿حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِيْرِ﴾ [المائدہ: ۳] "حرام کر دیا گیا تم پر مردار اور خون اور خنزیر کا گوشت۔" اور غیر اللہ کی بے بسی کو ذکر کرتے ہوئے سورۃ الحج میں فرمایا: ﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ﴾ اے لوگو! ﴿ضُرِبَ مَثَلٌ﴾ ایک مثال بیان کی جاتی ہے ﴿فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ﴾ اس کو غور سے سنو ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ بے شک جس کو تم اللہ تعالیٰ کے سوا حاجت روا، مشکل کشا، فریاد رس سمجھ کر پکارتے ہو ﴿لَنْ يَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّلَوِ اجْتَمَعُوْا لَهٗ﴾ وہ ہرگز نہیں بنا سکتے ایک مکھی اگرچہ سارے جمع ہو جائیں۔

اور اسی طرح شرک کی تردید کرتے ہوئے بیسویں پارے کے آخر میں فرمایا:

﴿مَثَلُ الَّذِيْنَ﴾ مثال ان لوگوں کی ﴿اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْلِيَآءَ﴾ جنہوں نے بنائے اللہ تعالیٰ کے سوا کارساز ﴿كَمَثَلِ الْعَنْكَبُوْتِ﴾ مکڑی کی طرح ہے ﴿اِتَّخَذَتْ بَيْتًا﴾ جس نے بنایا اپنا گھر ﴿وَاِنَّ اَوْهَنَ الْبُيُوْتِ لَبَيْتُ الْعَنْكَبُوْتِ﴾ اور بے شک تمام گھروں سے کمزور البتہ مکڑی کا گھر ہے۔ یہ مکڑی کا جالا نہ اس کو گرمی سے بچا سکتا ہے نہ سردی سے اور معمولی سا تنکا لگنے سے ٹوٹ جاتا ہے۔

غرضیکہ تمام گھروں میں کمزور ترین گھر مکڑی کا جالا ہے۔ مکڑی سے کوئی پوچھے کہ اتنا بڑا مکان کوٹھی مضبوط قلعہ تیرے لیے کافی نہیں ہے کہ اس کی چھت کے نیچے یہ جالا بناتی ہے۔ یہی حال ہے مشرکوں کا کہ اللہ تعالیٰ قادرِ مطلق پر اس کو یقین نہیں آتا اس سے نیچے نیچے چھوٹے چھوٹے کارساز، حاجت روا، مشکل کشا، دستگیر بناتے ہیں۔ جو نہ ان کا کچھ بنا سکتے ہیں نہ بگاڑ سکتے ہیں۔

پھر یہ جو مکڑی جالا بناتی ہے اس کا میٹریل باہر سے نہیں لاتی بلکہ اس کا میٹریل اس کے پیٹ سے لعاب کی شکل میں باہر نکلتا ہے۔ ایسے ہی مشرک کے پاس اپنے شرکیہ عقیدے پر خارج سے کوئی دلیل نہیں ہوتی۔ نہ قرآن کریم سے، نہ سنتِ رسول سے، نہ اعمالِ صحابہ سے، نہ بزرگوں کے اقوال سے، بلکہ جو کچھ نکلتا ہے اندر سے ہی نکلتا ہے۔

﴿كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ﴾ (سورۃ الکہف) بڑی سخت بات ہے جو ان کے مونہوں سے نکلتی ہے۔ ظالم مشرک

اپنے شرک پر ساری دلیلیں اپنے پیٹ سے ہی نکالتا ہے۔ اسی طرح قرآن کریم میں کتے کا بھی ذکر آتا ہے۔ تو مشرکوں نے اعتراض کیا ہے کہ جب قرآن کریم اللہ تعالیٰ کا کلام ہے تو اس میں ان چیزوں کا ذکر کیوں ہے؟ اللہ تعالیٰ اس کا جواب دیتے ہیں۔

فرمایا ﴿إِنَّ اللَّهَ﴾ بے شک اللہ تعالیٰ ﴿لَا يَسْتَحْيِي﴾ نہیں شرماتا ﴿أَنْ يَضْرِبَ﴾ یہ کہ بیان کرے ﴿مَثَلًا مَا﴾ کوئی مثال، جو تمہیں سمجھانے کے لئے ہو ﴿بَعُوضَةً فَمَا فَوْقَهَا﴾ (فرض کرو) مچھر کی ہو یا اس سے بڑی ہو۔ باریک ہونے میں اس سے بڑی ہو یا موٹا ہونے میں اس سے بڑی ہو۔ مثالیں تو سمجھانے کے لیے ہوتی ہیں۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں یہودیوں کے پیروں اور مولویوں نے دین کا نقشہ بگاڑ دیا تھا۔ جس طرح آج کل اہلِ بدعت نے صحیح دین اسلام کا نقشہ بگاڑ دیا ہے۔ یہودی اس طرح کرتے تھے کہ چھوٹی باتوں کی طرف توجہ دیتے تھے لیکن بڑی باتوں کی پرواہ نہیں کرتے تھے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ان کو سمجھانے کے لیے فرمایا کہ: ''تم مچھروں کو چھانتے ہو اور اونٹوں کو نگلتے ہو۔'' یعنی چھوٹی باتوں کا خیال کرتے ہو اور بڑی باتوں کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتے۔

لطیفہ

ایسا ہی ایک واقعہ ''المستطرف فی کل فن مستظرف'' نامی کتاب میں لکھا ہوا ہے۔ اس کتاب میں وعظ و نصیحت کی باتیں بھی ہیں اور ہنسی مذاق کی باتیں بھی ہیں۔

واقعہ یہ لکھا ہے کہ ایک آدمی نے کنواری عورت کے ساتھ بدکاری کی جس سے وہ حاملہ ہوگئی۔ اس بدکار نے اپنے ساتھیوں سے مشورہ کیا کہ ولادت ہو جائے گی اور میری بدنامی ہوگی لہٰذا مجھے کیا کرنا چاہیے۔ اس کو مشورہ دیا گیا کہ کسی دائی سے مل کر اسقاط حمل کر دے۔ کہنے لگا کہ حمل گرانا تو مکروہ ہے۔ اس نے اتنا خیال نہ کیا کہ حمل گرانا مکروہ ہے اور کیا بدکاری جائز ہے؟ یہی حال تھا یہودیوں کا کہ چھوٹی چیزوں کا خیال کرتے تھے اور بڑی چیزوں کی پرواہ نہیں کرتے تھے۔ تو مثالیں سمجھانے کے لیے ہوتی ہیں۔

﴿فَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا﴾ پس بہرحال وہ لوگ جو ایمان لائے ﴿فَيَعْلَمُونَ﴾ پس وہ جانتے ہیں ﴿أَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَبِّهِمْ﴾ کہ یہ مثال حق ہے ان کے رب کی طرف سے ﴿وَأَمَّا الَّذِينَ كَفَرُوا﴾ اور بہرحال وہ لوگ جو کافر ہیں ﴿فَيَقُولُونَ﴾ پس وہ کہتے ہیں ﴿مَاذَا أَرَادَ اللَّهُ بِهَٰذَا مَثَلًا﴾ کیا ارادہ کیا اللہ تعالیٰ نے اس مثال کے ساتھ کہ کہیں مکڑی کا ذکر کیا، کہیں مکھی کا۔ ان کے دماغ ٹیڑھے تھے اس لیے اس طرح کے اعتراض کرتے تھے۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ﴿يُضِلُّ بِهِ كَثِيرًا﴾ اللہ تعالیٰ گمراہ کرتا ہے اس کے ذریعے بہتوں کو۔ جن کے دماغ صاف نہیں، ضدی ہیں۔ اور ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں ﴿وَيَهْدِي بِهِ كَثِيرًا﴾ اور ہدایت دیتا ہے اس کے ذریعے بہتوں کو۔ جو سمجھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے سمجھانے کے لیے مثالیں دی ہیں ﴿وَمَا يُضِلُّ بِهِ إِلَّا الْفَاسِقِينَ﴾ اور نہیں گمراہ کرتا ان مثالوں کے ذریعے مگر نافرمانوں کو۔ جو حق کو نہیں مانتے اور فاسق و فاجر ہیں۔ آگے فاسقین کی صفات کے ساتھ ان کی وضاحت فرمائی ہے۔

فاسقین کی علامات

① فاسقین کی پہلی صفت

﴿الَّذِیْنَ یَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ﴾ فاسق، فاجر اور نافرمان وہ ہیں جو توڑتے ہیں اللہ تعالیٰ کے عہد کو ﴿مِنْۢ بَعْدِ مِیْثَاقِهٖ﴾ اس کو مضبوط کرنے کے بعد۔ اس عہد سے کون سا عہد مراد ہے؟ تو مفسرین کرام رحمۃ اللہ علیہم کے درج ذیل مختلف اقوال ہیں۔

❀...... مفسرین کرام رحمۃ اللہ علیہم کا ایک طبقہ کہتا ہے کہ اس سے وہ عہد مراد ہے جو اللہ تعالیٰ نے عالم ارواح میں تمام انسانوں سے لیا تھا۔ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر آخری انسان تک جو بھی اللہ تعالیٰ کے علم میں پیدا ہونے والے تھے چیونٹیوں کی مانند سب کو ظاہر فرمایا اور ان کو عقل اور شعور دیا۔ پھر ان سے پوچھا ﴿اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ﴾ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ ﴿قَالُوْا بَلٰى﴾ [الاعراف: ۱۷۲] سب نے کہا کیوں نہیں تو ہمارا رب ہے۔ بعض ملحدوں نے یہ اعتراض کیا ہے کہ اگر ہم نے یہ عہد کیا ہوتا تو ہمیں یاد ہوتا۔ ہمیں تو یہ عہد یاد نہیں ہے؟

حضرت علی رضی اللہ عنہ اور سہیل بن عبداللہ رحمۃ اللہ علیہ کو "قولِ الست" کا یاد ہونا

اس کا جواب یہ ہے کہ جن کے حافظے کمزور ہیں ان کو تو یاد نہیں ہے اور جن کے حافظے مضبوط ہیں ان کو یاد ہے۔ چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مجھے الست والا عہد یاد ہے۔ اسی طرح حضرت سہیل بن عبداللہ رحمۃ اللہ علیہ اولیاء میں سے گزرے ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ وہ عہد مجھے بھی یاد ہے۔ اور کئی بزرگ ہیں جو فرماتے ہیں کہ الست والا عہد ہمیں یاد ہے۔

رہی ہماری تمہاری بات تو ہمارے حافظے کا حال تو یہ ہے کہ ہمیں تو یہ بھی یاد نہیں ہے کہ روٹی کا لفظ ہمیں کس نے بتایا، پانی کا لفظ ہمیں کس نے بتایا، ماں نے بتایا، باپ نے بتایا، بھائی نے بتایا۔ آخر کسی کے بتانے سے ہی ہمیں معلوم ہوا ہے کہ یہ روٹی ہے اور یہ پانی ہے۔ اسی طرح ہاتھ ہے، آنکھ ہے، ناک ہے، پاؤں ہے کوئی بتا سکتا ہے کہ یہ ہمیں کس نے سکھائے ہیں۔ اور کس وقت بتائے ہیں۔ رات کے وقت بتائے ہیں، دن کے وقت بتائے ہیں، کس جگہ بتائے ہیں۔ آخر کسی کے بتانے سے ہی معلوم ہوئے ہیں۔ لہٰذا اگر وہ عہد یاد نہیں ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ عہد لیا ہی نہیں گیا۔ بلکہ عالمِ ارواح میں وہ عہد لیا گیا ہے۔ تو بعض حضرات فرماتے ہیں کہ "عہد" سے وہ عہد مراد ہے۔

❀...... مفسرین کرام رحمۃ اللہ علیہم کا دوسرا گروہ فرماتا ہے کہ اس عہد سے کلمے والا عہد مراد ہے۔ کہ ہم جب کلمہ طیبہ پڑھتے ہیں ﴿لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ﴾ تو اس میں اللہ تعالیٰ سے وعدہ کرتے ہیں کہ ہم اللہ تعالیٰ کی ذات کے سوا کسی کو معبود نہیں مانیں گے اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں۔ ہم ان کے نقشِ قدم پر چلیں گے۔ باقی کتنے لوگ ہیں جو اس عہد کو قائم رکھتے ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نقشِ قدم پر چلتے ہیں۔ اور کتنے عہد کو توڑنے والے ہیں یہ سب کے سامنے ہے۔

عیاں را چہ بیاں

”کھلی چیز کے لیے دلیل کی ضرورت نہیں ہوتی۔تو یہ عہد مراد ہے کہ وہ اس عہد کو توڑتے ہیں۔“

اور اسی طرح جب ہم ایمان مجمل اور ایمان مفصل پڑھتے ہیں تو اس میں بھی عہد کرتے ہیں ((وَقَبِلْتُ جَمِيْعَ اَحْكَامِهٖ)) اور میں نے اللہ تعالیٰ کے تمام احکام کو قبول کیا۔اس پر بھی غور کرلو اور اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھو کہ ہم نے کتنے احکام مانے ہیں اور کتنے توڑے ہیں۔الست والے عہد پر کتنے قائم ہیں۔اور کلمے والے عہد پر کس قدر قائم ہیں۔اور ((قَبِلْتُ جَمِيْعَ اَحْكَامِهٖ)) والے عہد پر کتنا عمل کر رہے ہیں؟غور کرلو کیونکہ عہد توڑنے والوں کو اللہ تعالیٰ نے فاسقون فرمایا ہے۔

② فاسقین کی دوسری صفت

﴿وَ يَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ﴾ اور توڑتے ہیں اس چیز کو جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے ﴿اَنْ يُّوْصَلَ﴾ یہ کہ اس کو جوڑا جائے۔اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ اپنا تعلق میرے ساتھ جوڑو،میرے پیغمبروں کے ساتھ تعلق جوڑو، میری کتابوں کے ساتھ تعلق جوڑو،اپنے رشتہ داروں کے ساتھ تعلق جوڑو اور صلہ رحمی کرو۔یہ نہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق جوڑتے ہیں، نہ اس کے پیغمبروں کے ساتھ،نہ اس کی کتابوں کے ساتھ،نہ رشتہ داروں کے ساتھ اور صلہ رحمی کی بجائے قطع رحمی کرتے ہیں۔

③ فاسقین کی تیسری صفت

﴿وَ يُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ﴾ اور فساد مچاتے ہیں زمین میں۔خلافِ شریعت کام کرتے ہیں، جھوٹ بولتے ہیں، چوریاں کرتے ہیں،قتل،زنا اور جوا کھیلتے ہیں۔یہ تمام چیزیں فساد فی الارض ہیں۔اور ناپ تول میں کمی کرنا اور ملاوٹ کرنا بھی فساد فی الارض ہے۔ملاوٹ کا تو یہ حال ہے کہ نمک،مرچ،ہلدی،دودھ،گھی تک کوئی چیز خالص نہیں ملتی۔دنیا میں فساد ہی فساد ہے۔اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟

فرمایا:﴿اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ﴾ اور یہی لوگ ہیں نقصان اٹھانے والے۔یہاں تک توحید،رسالت اور قرآن کریم پر اعتراض کا جواب دیا گیا۔آگے معاد کا بیان ہے۔

فرمایا﴿كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ﴾ کیسے تم انکار کرتے ہو اللہ تعالیٰ کا۔یعنی اس کی قدرت اور اس کے احکامات کا ﴿وَ كُنْتُمْ اَمْوَاتًا﴾ حالاں کہ تم بے جان تھے۔رحم مادر میں تخلیق انسان کی کیفیت یہ ہے کہ چالیس دن تک نطفہ ہی رہتا ہے۔پھر خون کا لوتھڑا بن جاتا ہے۔پھر لوتھڑا گوشت کا ٹکڑا بن جاتا ہے۔پھر گوشت کا ٹکڑا ہڈیاں بن جاتا ہے۔پھر ہڈیوں پر گوشت چڑھ جاتا ہے۔جب انسانی شکل بن گئی تو چار ماہ بعد اس میں روح ڈالی جاتی ہے۔اب اس میں جان آگئی۔اور اس نے ماں کے پیٹ میں نقل و حرکت شروع کر دی۔

اللہ تعالیٰ نے اس کی خوراک کا انتظام اس طرح کیا کہ حیض والی نالی کا اس کی ناف کے ساتھ ناڑو لگا دیا۔ماں کے بدن

کے ساتھ اس کو جوڑ دیا اس کے ذریعے سے اس کو خوراک ملتی ہے۔جان پڑنے کے بعد پانچ ماہ تک ماں کے پیٹ میں رہتا ہے، پلتا ہے، سانس بھی لیتا ہے، خوراک بھی مل رہی ہے۔

خدا کی قدرت دیکھو! نہ کوئی کھڑکی ہے، نہ دروازہ ہے، نہ گرمی سردی سے بچنے کا انتظام ہے۔مگر وہ پل رہا ہے، موٹا بھی ہو رہا ہے اور اس قابل ہو جاتا ہے کہ پیدائش کے بعد آواز بھی نکالتا ہے۔جبکہ دنیا میں حالت یہ ہے کہ گرمی میں چھوٹے سے کمرے کی کھڑکیاں، روشن دان، دروازے بند کر دیں تو انسان کے لیے سانس لینا دشوار ہو جاتا ہے، دم نکلتا ہے۔لیکن اللہ تعالیٰ کی قدرت دیکھو! کہ اس نے کس طرح انتظام فرمایا ہے کہ وہ ماں کے چھوٹے سے پیٹ میں سانس بھی لے رہا ہے، خوراک بھی مل رہی ہے۔اس سے اللہ تعالیٰ کی قدرت کو سمجھو وہ قادرِ مطلق ہے وہ سب کچھ کر سکتا ہے۔

فرمایا ﴿فَاَحْيَاكُمْ ۚ﴾ پس اللہ تعالیٰ نے تمھیں زندہ کیا۔کہ ماں کے پیٹ میں جان ڈالی ﴿ثُمَّ يُمِيتُكُمْ﴾ پھر تمہیں مارے گا ﴿ثُمَّ يُحْيِيكُمْ﴾ پھر وہ تمہیں قبر میں زندہ کرے گا۔

قبر میں زندگی

امام رازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس زندگی سے مراد قبر کی زندگی ہے۔انسان جب فوت ہوتا ہے تو اس کی روح نکل جاتی ہے پھر جب قبر میں دفن کر دیا جاتا ہے تو ((تُعَادُ رُوْحُهُ فِي جَسَدِهِ)) اس کی روح اس کے جسم میں ڈالی جاتی ہے فرشتے آجاتے ہیں اور اس سے پوچھتے ہیں: ((مَنْ رَبُّكَ)) تیرا رب کون ہے؟ ((مَنْ نَبِيُّكَ)) تیرا نبی کون ہے؟ ((مَادِيْنُكَ)) تو کس دین پر تھا؟ وہ سوالوں کو سمجھتا بھی ہے اور جواب بھی دیتا ہے۔اس کے بعد اگر نیک ہے تو اس کو قبر میں جو راحت اور آرام ملتا ہے اس کو وہ سمجھتا بھی ہے اور محسوس بھی کرتا ہے اور اگر بد ہے تو اس کو جو سزا ملتی ہے اس کو وہ سمجھتا بھی ہے اور محسوس بھی کرتا ہے۔

﴿ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝۲۸﴾ پھر تم اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔قیامت قائم کی جائے گی۔تمام کے تمام رب تعالیٰ کے سامنے پیش ہوں گے رتی رتی کا حساب ہوگا۔دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا۔اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے اپنی چند نعمتوں کا ذکر فرمایا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی ذات وہ ہے کہ جس نے تمھیں پیدا کیا، تمہارے پہلوں کو پیدا کیا اس نے تمہارے لیے زمین کو بچھونا اور آسمان کو چھت بنایا، آسمان کی طرف سے بارش نازل فرمائی۔اور اس کے ذریعے پھل پھول پیدا فرمائے۔

کوئی چیز بے فائدہ نہیں

آگے دیگر انعامات کا ذکر ہے۔فرمایا ﴿هُوَ الَّذِىْ خَلَقَ لَكُمْ﴾ اللہ تعالیٰ وہی ہے جس نے پیدا کیا تمہارے فائدے کے لیے ﴿مَّا فِى الْاَرْضِ جَمِيْعًا﴾ جو کچھ زمین میں ہے سارا۔زمین میں جو کچھ ہے انسان کے فائدے کے لیے ہے۔

فائدہ کی مختلف صورتیں

بعض ملحدین اعتراض کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ بتاؤ سانپ کے پیدا کرنے میں انسان کو کیا فائدہ ہے؟ اس کا جواب

یہ ہے کہ سانپ کے فوائد تو بہت ہیں۔ میں آپ کو سمجھانے کے لئے صرف ایک فائدہ بتاتا ہوں۔

دیکھو! عذابِ قبر کے بارے میں آتا ہے کہ بروں کے پیچھے ننانوے اژدھے لگے ہوں گے۔ وہ اتنے زہریلے ہوں گے کہ اگر ایک دفعہ سانس لیں تو دنیا میں کوئی چیز ہری نہ رہے۔ توان کا ڈنگ کتنا زہریلا ہوگا۔ اب اگر دنیا میں سانپ نہ ہوتا تو یہ بات کس طرح سمجھ آتی اور انسان عبرت کس طرح حاصل کرتا؟

حالت یہ ہے کہ مجمع میں اگر چھوٹا سا سانپ نظر آجائے تو مجمع بدحواس ہو کر بکھر جاتا ہے۔ اور قبر میں اتنے زہریلے سانپ ہوں گے وہ ڈنگ ماریں گے اور آدمی بھاگ بھی نہیں سکے گا۔ تو یہ فائدہ ہے کہ نہیں کہ اس سے عبرت حاصل ہوتی ہے۔ فائدے کا معنیٰ صرف یہ نہیں ہے کہ آدمی پیٹ میں ڈالے۔ بلکہ عبرت حاصل کرنا بھی فائدے میں شامل ہے۔

﴿ثُمَّ اسْتَوٰٓی اِلَی السَّمَآءِ﴾ پھر اس نے ارادہ کیا آسمان کی طرف۔ زمین کی طرح آسمان بھی آٹے کے پیڑے کی طرح گول تھا۔

﴿فَسَوّٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ﴾ پس برابر کر دیا ان کو سات آسمان اپنی قدرت سے۔ یہ تمام چیزیں زمین، آسمان اللہ تعالیٰ نے تمہارے فائدے کے لیے بنائے ہیں۔

﴿وَ هُوَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ﴾ اور وہ ہر چیز کو بخوبی جانتا ہے۔ کوئی چیز اس کے علم اور قدرت سے باہر نہیں ہے۔

﴿وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ﴾ اور جب فرمایا تیرے رب نے ﴿لِلْمَلٰٓئِكَةِ﴾ فرشتوں کو ﴿اِنِّیْ جَاعِلٌ﴾ بے شک میں بنانے والا ہوں ﴿فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً﴾ زمین میں نائب ﴿قَالُوْٓا﴾ کہا فرشتوں نے ﴿اَتَجْعَلُ فِیْهَا﴾ کیا تو بناتا ہے اس زمین میں ﴿مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا﴾ اس کو جو فساد مچائے گا زمین میں ﴿وَیَسْفِكُ الدِّمَآءَ﴾ اور بہائے گا خون ﴿وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ﴾ اور ہم فرشتے تیری پاکی بیان کرتے ہیں تیری حمد کے ساتھ ﴿وَنُقَدِّسُ لَكَ﴾ اور ہم تیری پاکیزگی کا اقرار کرتے ہیں ﴿قَالَ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ﴾ فرمایا اللہ تعالیٰ نے بے شک میں جانتا ہوں ﴿مَا لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ جو تم نہیں جانتے ﴿وَعَلَّمَ اٰدَمَ﴾ اور تعلیم دی آدم علیہ السلام کو ﴿الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا﴾ سب ناموں کی ﴿ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَی الْمَلٰٓئِكَةِ﴾ پھر ان کو پیش کیا فرشتوں پر ﴿فَقَالَ اَنْۢبِـُٔوْنِیْ﴾ پھر فرمایا اللہ تعالیٰ نے مجھے خبر دو ﴿بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ﴾ ان چیزوں کے ناموں کی ﴿اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ﴾ اگر تم سچے ہو ﴿قَالُوْا سُبْحٰنَكَ﴾ کہا فرشتوں نے تیری ذات پاک ہے ﴿لَا عِلْمَ لَنَآ﴾ ہمیں کوئی علم نہیں ہے ﴿اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا﴾ مگر وہ جو تو نے ہمیں سکھایا ہے ﴿اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِیْمُ الْحَكِیْمُ﴾ بے شک تو ہی ہے علم والا اور حکمت والا ﴿قَالَ یٰٓاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ﴾ فرمایا اللہ تعالیٰ نے اے آدم! خبر دے

ان کو ﴿بِاَسْمَآىِٕهِمْ﴾ ان چیزوں کے ناموں کی ﴿فَلَمَّاۤ اَنْۢبَاَهُمْ﴾ پس جب خبر دی آدم علیہ السلام نے ان کو ﴿بِاَسْمَآىِٕهِمْ﴾ ان چیزوں کے ناموں کی ﴿قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ﴾ فرمایا اللہ تعالیٰ نے کیا میں نے تمھیں نہیں کہا تھا ﴿اِنِّیْۤ اَعْلَمُ﴾ بے شک میں جانتا ہوں ﴿غَیْبَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ﴾ آسمانوں اور زمین کے غیبوں کو ﴿وَ اَعْلَمُ﴾ اور میں جانتا ہوں ﴿مَا تُبْدُوْنَ﴾ اس چیز کو جس کو تم ظاہر کرتے ہو ﴿وَ مَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ﴾ اور اس چیز کو جس کو تم چھپاتے ہو ﴿وَ اِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓىِٕكَةِ﴾ اور جب کہا ہم نے فرشتوں کو ﴿اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ﴾ سجدہ کرو تم آدم علیہ السلام کو ﴿فَسَجَدُوْۤا﴾ پس انھوں نے سجدہ کیا ﴿اِلَّاۤ اِبْلِیْسَ﴾ مگر ابلیس نے ﴿اَبٰى وَ اسْتَكْبَرَ﴾ اس نے انکار کر دیا اور تکبر کیا ﴿وَ كَانَ مِنَ الْكٰفِرِیْنَ﴾ اور تھا وہ کافروں میں سے۔

ربط

ان آیات کا پچھلی آیات کے ساتھ کیا ربط ہے؟ اس کے متعلق علماء کرام فرماتے ہیں کہ نعمتیں دو قسم کی ہیں:

①...... ایک ظاہری اور حسی کہ نظر آتی ہیں اور محسوس ہوتی ہیں۔ جیسے آسمان، زمین، انسان کا وجود، خوراک اور لباس ہے کہ یہ نظر بھی آتی ہیں اور محسوس بھی ہوتی ہیں۔

②...... دوسری نعمتیں باطنی اور معنوی ہیں جو نہ تو نظر آتی ہیں اور نہ محسوس ہوتی ہیں جیسے علم، اخلاقِ حسنہ وغیرہ ہیں۔ کہ جو نہ تو نظر آتے ہیں اور نہ محسوس ہوتے ہیں۔ کیونکہ اخلاقِ حسنہ کا پتہ تو معاملہ کرنے کے بعد چلے گا۔ ویسے نہیں معلوم ہو سکتا۔

خلافتِ ارضی

تو پہلے ظاہری اور حسی نعمتوں کا ذکر تھا کہ اللہ تعالیٰ نے تمھیں پیدا کیا، آسمانوں اور زمینوں کو پیدا فرمایا اور اب باطنی اور معنوی نعمتوں کا ذکر ہے کہ اے انسانو! تم اس بزرگ کی نسل سے ہو جس کو اللہ تعالیٰ نے علم کی دولت سے نوازا جس کی بدولت وہ فرشتوں سے آگے نکل گیا اور مسجود الملائکہ بنا۔ اور انسانوں کی توجہ اس طرف بھی کرائی ہے کہ تم شیطان کے نقش قدم پر چلتے ہو اس نے جو تمھارے ساتھ کیا تھا وہ بھی سن لو۔ اور اس کے نقش قدم پر چلنا چھوڑ دو اور اپنی اصل کو نہ بھولو۔

﴿وَ اِذْ قَالَ رَبُّكَ﴾ اور جب فرمایا تیرے رب نے ﴿لِلْمَلٰٓىِٕكَةِ﴾ فرشتوں کو۔ مَلٰئِکَۃٌ، اُلُوْکَۃٌ سے مشتق ہے۔ اور اُلُوْکَۃٌ کا معنٰی ہے پیغام پہنچانا۔ اور فرشتوں کے ذمہ بھی مختلف ڈیوٹیاں لگی ہوئی ہیں۔ کوئی وحی لاتا ہے کوئی رحمت کا پیغام پہنچاتا ہے۔ کوئی نیکوں کے لیے رحمت کی دعائیں کر رہا ہے۔ کوئی مجرموں پر لعنتیں پہنچا رہا ہے۔ کوئی احکامات پہنچانے کی ذمہ داری پوری کر رہا ہے۔ اس لیے ان کو ملائکہ کہا جاتا ہے۔ اور فرشتوں کی تخلیق نور سے ہوئی ہے۔

فرشتوں کے "نور" سے مراد

چنانچہ مسلم شریف میں روایت ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((خُلِقَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ مِنْ نُّوْرٍ)). فرشتے نور سے پیدا کیے گئے ہیں لیکن یہ نور وہ نہیں ہے جو اللہ تعالیٰ کی صفت ہے ﴿اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ اللہ تعالیٰ آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔

اللہ تعالیٰ کے صفاتی ناموں میں سے ایک نام نور بھی ہے۔ یہ صفت اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے اس سے کوئی چیز نہیں نکلی۔ فرشتے جس نور سے پیدا کیے گئے ہیں وہ مخلوق ہے۔ جس طرح مٹی مخلوق ہے اس سے اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا۔ آگ مخلوق ہے جو جنات کی اصل ہے۔

اسی طرح نور بھی مخلوق ہے اس سے اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو پیدا فرمایا ہے۔ وہ نہ کھاتے ہیں نہ پیتے ہیں اور نہ ان میں جنسی خواہشات ہیں۔ وہ ہر وقت اللہ تعالیٰ کی عبادت میں لگے رہتے ہیں۔ اور ان کی اعلیٰ ترین عبادت ہے سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ۔ تو فرشتوں کو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً﴾ بے شک میں بنانے والا ہوں زمین میں نائب۔ خلیفہ کا معنیٰ ہے نائب۔ اللہ تعالیٰ کی نیابت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام اللہ تعالیٰ سے وصول کر کے اس کی مخلوق پر نافذ کرے۔ مخلوق کو پہنچائے تاکہ وہ اس پر عمل کریں۔

فرشتوں کا اشکال

﴿قَالُوْٓا﴾ فرشتوں نے ﴿اَتَجْعَلُ فِیْهَا﴾ کیا تو بناتا ہے اس زمین میں ﴿مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا﴾ اس کو جو فساد مچائے گا زمین میں ﴿وَیَسْفِكُ الدِّمَآءَ﴾ اور بہائے گا خون ﴿وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ﴾ اور ہم فرشتے تیری پاکی بیان کرتے ہیں تیری حمد کے ساتھ ﴿سُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ﴾ پڑھتے رہتے ہیں۔

﴿وَنُقَدِّسُ لَكَ﴾ اور ہم تیری پاکیزگی کا اقرار کرتے ہیں کہ تو تمام عیبوں اور کمزوریوں سے پاک اور صاف ہے۔ اس سے فرشتوں کا مدعا یہ تھا کہ اے پروردگار! کسی اور مخلوق کو جو خلیفہ بنانا چاہتا ہے ہمیں بنادے ہم ہر وقت تیری تسبیح اور تقدیس میں لگے ہوئے ہیں۔

انسان کی فضیلت

﴿قَالَ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ﴾ فرمایا اللہ تعالیٰ نے بے شک میں جانتا ہوں ﴿مَا لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ جو تم نہیں جانتے۔ تمہارے ذہن میں صرف فرمانبرداری اور اطاعت ہے کہ جس کو تو نے پیدا کرنا ہے اس نے بھی تیری فرمانبرداری اور اطاعت کرنی ہے اور وہ ہم کر رہے ہیں لہٰذا اس کو بنانے کی کیا ضرورت ہے؟

ٹھیک ہے تم فرمانبردار ہو اور رہو گے کیونکہ تمہارے خمیر میں خواہشات نہیں ہیں۔ میں ایک ایسی مخلوق بنانا چاہتا ہوں

جس میں ہر طرح کی خواہشات بھی ہوں گی لیکن اس میں ایسی قابلیت اور صلاحیت ہوگی کہ وہ ان تمام خواہشات کو دبا کر میری خوش نودی حاصل کرنے کے لیے فرماں بردار رہے گی۔ اس بات کو تم نہیں جانتے میں جانتا ہوں۔ اور اس وجہ سے انسان کو فرشتوں پر فضیلت حاصل ہے کہ فرشتے لمبی راتوں میں بھی ساری رات ﴿سُبْحَانَ اللّٰہِ وَ بِحَمْدِہٖ﴾ پڑھتے رہتے ہیں۔ کوئی قیام میں پڑھ رہا ہے، کوئی رکوع میں اور کوئی سجدے میں۔ نہ ان کو وضو کی ضرورت ہے کیونکہ ان کا وضو ٹوٹتا ہی نہیں ہے، نہ ان کو نیند کی حاجت ہے۔ اور انسان کے ساتھ یہ ساری حاجتیں اور ضرورتیں لگی ہوئی ہیں۔ پھر وہ فرماں بردار ہے۔ اس لیے اس کی عبادت کا درجہ فرشتوں کی عبادت سے زیادہ ہے۔

مسلم شریف میں حدیث ہے حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے عشاء کی نماز جماعت کے ساتھ پڑھی اور پھر فجر کی نماز جماعت کے ساتھ پڑھی تو یوں سمجھو کہ اس نے ساری رات عبادت میں گزاری ہے۔ یعنی عشاء کی نماز جماعت کے ساتھ پڑھ کر سو گیا اور صبح کو اٹھ کر فجر کی نماز جماعت کے ساتھ پڑھی۔ تو اس کا سونا بھی عبادت شمار ہوگا۔ کیونکہ یہ گرمی، سردی کی پرواہ کیے بغیر اٹھتا ہے، وضو کرتا ہے پھر چل کر مسجد میں جاتا ہے۔ اور فرشتوں کو نہ گرمی کی تکلیف اور نہ سردی کا احساس، نہ چلنے سے تھکاوٹ۔ اس لیے انسان کی پانچ منٹ کی عبادت فرشتوں کی ساری رات کی عبادت سے افضل ہے۔ اگرچہ مقدار میں تھوڑی ہے۔

فرشتوں کے اشکال کی وجہ؟

اور فرشتوں نے یہ بھی کہا کہ یہ زمین میں فساد مچائے گا اور خون ریزی کرے گا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس چیز کا فرشتوں کو کس طرح پتہ چل گیا؟ غیب کا علم تو اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو نہیں ہے۔ تو انہوں نے قبل از وقت یہ بات کس طرح کر دی؟ اس سلسلے میں مفسرین کرام رحمۃ اللہ علیہم نے بہت ساری باتیں بیان فرمائی ہیں۔ ان میں سے ایک بات یہ بھی فرمائی ہے کہ:

①...... آدم علیہ السلام کی تخلیق سے دو ہزار سال پہلے زمین میں جنات کی حکومت تھی اور وہ قتل و غارت اور فساد وغیرہ سب کچھ کرتے تھے۔ تو ان پر قیاس کرتے ہوئے کہ جو ان کی جگہ آ رہے ہیں یہ بھی وہی کچھ کریں گے گویا کہ فرشتوں نے ایک نوع کا دوسری نوع پر قیاس کیا ((قَاسَ اَحَدَ النَّوْعَیْنِ عَلَی الْاٰخَرِ)). انھوں نے ایک نوع کا دوسری نوع پر قیاس کیا۔

②...... اور اس کے جواب میں دوسری بات یہ فرمائی ہے کہ لفظ خلیفہ سے انہوں نے یہ سمجھا کہ حاکم اور خلیفہ کی ضرورت وہاں پڑتی ہے جہاں جھگڑا ہو، فتنہ فساد ہو اور جہاں جھگڑا، فساد نہ ہو وہاں خلیفے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ چنانچہ ساری جنت میں ایک بھی تھانے دار نہیں ہوگا۔

③...... اور تیسری بات یہ فرمائی ہے کہ فرشتوں نے لوحِ محفوظ میں دیکھا تھا۔ کیوں کہ جب سے دنیا بنی ہے اس وقت سے لے کر قیامت تک جو کچھ ہونے والا ہے لوحِ محفوظ میں اللہ تعالیٰ نے سب کچھ لکھ دیا ہے کہ فلاں یہ کرے گا، فلاں یہ کرے

گا، فلاں یہ کرے گا۔ تو اس کے ذریعے فرشتوں کو معلوم ہوا کہ آنے والی مخلوق یہ کچھ کرے گی۔ ملائکۃ المقربین نے لوحِ محفوظ کو دیکھا تھا اور جو کچھ اللہ تعالیٰ نے لکھا تھا اور فرشتوں نے پڑھا تھا وہ سب کچھ ہو رہا ہے۔

اس وقت فتنے عروج پر ہیں اور جوں جوں قیامت قریب آئے گی فتنے زیادہ ہوں گے۔ کیوں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیش گوئی ہے کہ جوں جوں قیامت قریب آئے گی فتنے زیادہ ہوں گے لوگ اتنے پریشان ہو جائیں گے کہ آدمی قبر کو دیکھ کر کہے گا کاش! یہ میری قبر ہوتی۔ یعنی میں مر چکا ہوتا اور فتنوں سے محفوظ ہو جاتا۔

اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے جو لفظ نکلا ہے وہ کبھی خطا نہیں جا سکتا۔ جوں جوں قیامت قریب ہوگی روز بہ روز فتنوں میں اضافہ ہوگا۔ کمی کی توقع نہیں ہے۔ کمی تب ہوگی جب امام مہدی علیہ السلام تشریف لائیں گے اور ان کی پٹائی کریں گے بدمعاش ختم ہوں گے اور اللہ والے گوشوں سے باہر نکل آئیں گے۔ تو فرشتوں نے کہا اے پروردگار! تو ایسے کو بنانا چاہتا ہے جو زمین میں فساد مچائے گا اور خون ریزی کرے گا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا بے شک میں وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔ بے شک ان میں ایسے بھی ہوں گے۔ مگر بے شمار ان میں نیک بھی ہوں گے۔

انقلابِ روس اور استقامت دین

پہلے زمانے تو خیر کے تھے ہر طرف نیک لوگ تھے مگر اس زمانے میں بھی زمین کے ہر کونے میں نیک لوگ موجود ہیں۔ اور انھوں نے مظالم کو برداشت کر کے بھی ایمان بچایا ہے اور اسلام کا تحفظ کیا ہے۔

روسی انقلاب کو ہی دیکھ لو کہ انھوں نے اسلام پر پابندی لگا دی ستر سال تک روسی مظالم نے لوگوں کے ذہن مسخ کیے حکومت سے منظوری لیے بغیر نومولود بچے کا نام کوئی نہیں رکھ سکتا تھا۔ کہ کوئی مسلمانوں والا نام نہ رکھ دے کہ بڑا ہو کر اس کو معلوم ہو جائے کہ ہم مسلمان ہیں۔ اس حد تک پابندیاں تھیں۔ اس کے باوجود وہاں لوگوں نے تہہ خانوں میں چھپ کر اپنے بچوں کو دین سکھایا اور ایمان کا تحفظ کیا۔ الحمد للہ! اس وقت بھی ان علاقوں میں مسلمان موجود ہیں۔

حضرت آدم علیہ السلام اور فرشتوں کا امتحان

﴿وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا﴾ اور تعلیم دی آدم علیہ السلام کو سب ناموں کی ﴿ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ﴾ پھر ان کو پیش کیا فرشتوں پر ﴿فَقَالَ اَنْۢبِـُٔوْنِیْ﴾ پھر فرمایا اللہ تعالیٰ نے مجھے خبر دو ﴿بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ﴾ ان چیزوں کے ناموں کی ﴿اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ﴾ اگر تم سچے ہو کہ ہم خلافت کے حق دار ہیں۔

﴿قَالُوْا سُبْحٰنَكَ﴾ کہا فرشتوں نے تیری ذات پاک ہے ﴿لَا عِلْمَ لَنَآ﴾ ہمیں کوئی علم نہیں ہے ﴿اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا﴾ مگر وہ جو تو نے ہمیں سکھایا ہے ﴿اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِیْمُ الْحَكِیْمُ﴾ بے شک تو ہی ہے علم والا اور حکمت والا۔

﴿قَالَ یٰٓاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ﴾ فرمایا اللہ تعالیٰ نے اے آدم! خبر دے ان کو ﴿بِاَسْمَآىِٕهِمْ﴾ ان چیزوں کے ناموں کی

﴿فَلَمَّآ اَنۡۢبَاَهُمۡ﴾ پس جب خبر دی آدم علیہ السلام نے ان کو ﴿بِاَسۡمَآىِٕهِمۡ﴾ ان چیزوں کے ناموں کی ﴿قَالَ اَلَمۡ اَقُلۡ لَّكُمۡ﴾ فرمایا اللہ تعالیٰ نے کیا میں نے تمھیں نہیں کہا تھا ﴿اِنِّیۡۤ اَعۡلَمُ﴾ بے شک میں جانتا ہوں ﴿غَیۡبَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ﴾ آسمانوں اور زمین کے غیبوں کو ﴿لَا یَعۡزُبُ عَنۡهُ مِثۡقَالُ ذَرَّةٍ﴾ [سبا:۳] اس سے ایک ذرہ بھی پوشیدہ نہیں ہے۔

﴿وَاَعۡلَمُ﴾ اور میں جانتا ہوں ﴿مَا تُبۡدُوۡنَ﴾ اس چیز کو جس کو تم ظاہر کرتے ہو ﴿وَمَا كُنۡتُمۡ تَكۡتُمُوۡنَ﴾ اور اس چیز کو جس کو تم چھپاتے ہو۔ ظاہر تو یہ کرتے تھے کہ اے پروردگار! ہم تیری تسبیح پڑھتے ہیں، تیری پاکیزگی کا اظہار کرتے ہیں۔ اور چھپاتے تھے کہ ہمیں خلافت ملنی چاہیے۔

آدم علیہ السلام کی برتری کی وجہ بمعہ امثلہ

اب یہاں پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ رب تعالیٰ نے تعلیم تو دی آدم علیہ السلام کو اور امتحان میں فرشتے بھی مبتلا کیے گئے۔ بہ ظاہر یہ بات انصاف کے خلاف معلوم ہوتی ہے۔ یا تو فرشتوں کو بھی تعلیم دی جاتی پھر امتحان لیا جاتا۔

① مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے بیان القرآن میں اس کا بڑا مختصر جواب دیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کی موجودگی میں آدم علیہ السلام کو ان چیزوں کے نام بتائے۔ مثلاً آدم علیہ السلام کو سمجھایا کہ یہ دَہی ہے، یہ ہانڈی ہے، اس کو چمچہ کہتے ہیں، یہ نمک ہے، اس کو ہلدی کہتے ہیں، یہ مرچ ہے وغیرہ، وغیرہ۔ تو جب آدم علیہ السلام کو نام بتائے فرشتے وہاں موجود تھے مگر وہ سمجھ نہ سکے۔ کیونکہ یہ چیزیں اُن کی ضرورت کی نہیں تھیں۔ اور آدم سمجھ گئے کیونکہ یہ چیزیں ان کی ضرورت کی تھیں۔

② پھر حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس کو اس طرح سمجھو کہ جیسے کوئی استاد اقلیدس (جیومیٹری) پڑھائے اور کہے کہ ایک زاویہ قائمہ ہوتا ہے اور ایک زاویہ حادہ ہوتا ہے، ایک شکل خماسی ہوتی ہے اور ایک مربع ہوتی ہے، ایک مثلث ہوتی ہے اور ایک مسدس ہوتی ہے۔ یہ وہی سمجھیں گے جن کو اس سے کچھ نسبت ہوگی۔ وہاں بیٹھے ہوئے عوام بے چارے کیا سمجھیں گے کہ زاویہ کیا ہوتا ہے؟ اور مثلث کیا ہوتی ہے؟ اور مربع کیا ہوتا ہے؟ اسی طرح فرشتے بھی نہ سمجھ سکے، کیوں کہ ان کا ان چیزوں کے ساتھ کوئی تعلق نہیں تھا۔

③ یا اس طرح سمجھو کہ جس آدمی کو پشتو کے ساتھ تعلق نہ ہو وہ عبدالرحمٰن بابا کے شعر کو نہیں سمجھ سکتا۔ صوبہ سرحد میں ایک بہت بڑے بزرگ گزرے ہیں عبدالرحمٰن بابا۔ یہ بڑے اونچے درجے کے اشعار بولتے تھے۔ ان کا دیوان بھی پشتو زبان میں بڑا مشہور ہے۔ وہ فرماتے ہیں: ؎

مار چہ سور ے لہ ورشی ہلہ سم شی
تو پگور ڈڈے تہ سم شولے رحمانا ھہ

اب جن کو پشتو کے ساتھ تعلق ہے اور پشتو جانتے ہیں وہ تو سمجھ گئے ہوں گے اور جن کو تعلق نہیں وہ نہیں سمجھ سکے۔ بابا جی

فرماتے ہیں کہ سانپ جب بل میں داخل ہوتا ہے تو بالکل سیدھا ہو کر داخل ہوتا ہے۔اے عبدالرحمٰن! تو مرنے کے قریب ہو گیا ہے، قبر کے قریب ہو گیا ہے اور تیرے بل نہیں نکلے جو دنیا سے عشق اور محبت کے بل تیرے بدن میں ہیں۔تو انھوں نے تصوف کی بہت بلند بات فرمائی ہے۔اور یاد رکھنا! جو صحیح تصوف ہے اس کے بغیر بھی مسلمان کو چارہ نہیں ہے۔نفس کا تزکیہ کرنا اور اخلاق حسنہ کو اخذ کرنا بڑی چیز ہے۔مگر آج کے دور میں اس کو سمجھنا خاصا مشکل ہے۔

فرشتوں کو سجدہ کا حکم

﴿وَ اِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓىِٕكَةِ﴾ اور جب کہا ہم نے فرشتوں کو ﴿اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ﴾ سجدہ کرو تم آدم علیہ السلام کو ﴿فَسَجَدُوْٓا﴾ پس انھوں نے سجدہ کیا ﴿اِلَّآ اِبْلِیْسَ﴾ مگر ابلیس نے ﴿اَبٰى وَ اسْتَكْبَرَ﴾ اس نے انکار کر دیا اور تکبر کیا ﴿وَ كَانَ مِنَ الْكٰفِرِیْنَ﴾ اور تھا وہ کافروں میں سے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سجدہ کرنے کا حکم تو فرشتوں کو دیا تھا۔اور ابلیس تو جنات میں سے تھا ﴿كَانَ مِنَ الْجِنِّ﴾ تو اس کے متعلق کیوں فرمایا کہ اس نے انکار کر دیا اور تکبر کیا؟ تو جب اس کو حکم ہی نہیں تھا تو اس نے انکار کس طرح کیا؟ تو یاد رکھنا! قرآن کریم میں ایک جگہ اجمال ہوتا ہے اور دوسری جگہ اس کی تفصیل ہوتی ہے۔

ابلیس کا انکار و تکبر

یہاں تو صرف فرشتوں کو سجدے کا حکم ہے اور سورہ اعراف کے دوسرے رکوع میں آتا ہے کہ ﴿قَالَ مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ﴾ فرمایا (اے ابلیس!) تجھے کس نے منع کیا سجدہ کرنے سے جب میں نے تجھے حکم دیا۔تو اس سے معلوم ہو گیا کہ ابلیس کو بھی سجدہ کرنے کا حکم تھا۔مگر اس نے انکار کر دیا اور فرشتوں نے اللہ تعالیٰ کے حکم پر عمل کیا۔

اور ﴿فَسَجَدَ الْمَلٰٓىِٕكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ﴾ [سورۃ ص] پس تمام فرشتوں نے اکٹھے سجدہ کیا جس طرح جماعت میں امام کے پیچھے سارے مقتدی اکٹھے رکوع سجود کرتے ہیں۔کیوں کہ ﴿اَجْمَعُوْنَ﴾ کا لفظ ہے جو کہ یہ بتا رہا ہے کہ سب نے اکٹھا سجدہ کیا اور کیا بھی تمام فرشتوں نے ایسا نہیں ہے کہ بعضوں نے کیا ہو اور بعضوں نے نہ کیا ہو۔کیوں کہ ﴿كُلُّهُمْ﴾ کا لفظ بتا رہا ہے کہ کوئی فرشتہ اس حکم سے خارج نہیں ہے۔تو تمام فرشتوں نے سجدہ کیا اور ابلیس نے نہ کیا۔اور جب اللہ تعالیٰ نے کہا تو نے سجدہ کیوں نہیں کیا؟

①......تو کہنے لگا کہ ﴿اَنَا خَیْرٌ مِّنْهُ ۖ خَلَقْتَنِیْ مِنْ نَّارٍ وَّ خَلَقْتَهٗ مِنْ طِیْنٍ﴾ [سورۃ ص] میں اس سے بہتر ہوں مجھے تو نے آگ سے پیدا کیا ہے آگ میں شعلہ اور بلندی ہے۔اور اس کو تو نے مٹی سے پیدا کیا ہے جو پاؤں کے نیچے کچلی جاتی ہے اس کو میں کیوں سجدہ کروں۔اور دوسرے مقام پر ہے کہنے لگا:

②......﴿ءَاَسْجُدُ لِمَنْ خَلَقْتَ طِیْنًا﴾ [بنی اسرائیل] کیا میں اس کو سجدہ کروں جس کو تو نے مٹی سے پیدا کیا ہے۔اس سے یہ بھی

معلوم ہوگیا کہ سب سے پہلے بشر کو حقیر سمجھنے والا ابلیس ہے۔ پندرہویں پارے میں ہے، کہنے لگا:

③...... ﴿ اَرَءَیْتَكَ هٰذَا الَّذِیْ كَرَّمْتَ ﴾ یہ وہ ہے جس کو تو نے میرے اوپر فضیلت دی ہے۔ رب تعالیٰ کے ساتھ طعن بازی کی ہے۔ جیسے عورتیں لڑتی ہیں تو طعنے دیتی ہیں۔ اور بشر کی تعریف اور تعظیم سب سے پہلے فرشتوں نے کی ہے۔ بشر کا مقام بہت بلند ہے۔

لہٰذا اے انسانو! تم مسجود الملائکہ کی نسل سے ہو۔ اور حضرت آدم علیہ السلام کو فرشتوں پر جو فضیلت حاصل ہوئی تو علم کی وجہ سے ہوئی۔ تو اللہ تعالیٰ نے تمہیں معنوی اور روحانی فضیلت عطا فرمائی ہے۔ اس کو یاد رکھو اور اعمالِ صالحہ کرو۔ واللہ الموفق.

﴿ وَ قُلْنَا یٰۤاٰدَمُ ﴾ اور کہا ہم نے اے آدم! ﴿ اسْكُنْ اَنْتَ ﴾ رہ تو ﴿ وَ زَوْجُكَ الْجَنَّةَ ﴾ اور تیری بیوی جنت میں ﴿ وَ كُلَا مِنْهَا ﴾ اور کھاؤ تم دونوں اس جنت سے ﴿ رَغَدًا ﴾ وسعت اور کشادگی سے ﴿ حَیْثُ شِئْتُمَا ﴾ جس جگہ سے چاہو ﴿ وَ لَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ ﴾ اور قریب نہ جانا اس درخت کے ﴿ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِیْنَ ﴾ پس ہو جاؤ گے ناانصافوں میں سے ﴿ فَاَزَلَّهُمَا الشَّیْطٰنُ عَنْهَا ﴾ پس پھسلایا ان دونوں کو شیطان نے اس درخت سے ﴿ فَاَخْرَجَهُمَا ﴾ پس نکالا ان دونوں کو ﴿ مِمَّا كَانَا فِیْهِ ﴾ ان خوشیوں سے جن کے اندر وہ تھے ﴿ وَ قُلْنَا اهْبِطُوْا ﴾ اور کہا ہم نے اُترو تم ﴿ بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ﴾ بعض تمہارے دوسرے بعض کے لیے دشمن ہوں گے ﴿ وَ لَكُمْ فِی الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ ﴾ اور تمھارے لیے زمین میں ٹھکانا ہے ﴿ وَّ مَتَاعٌ اِلٰى حِیْنٍ ﴾ اور فائدہ ہے ایک مدت تک ﴿ فَتَلَقّٰۤى اٰدَمُ ﴾ پس حاصل کیے آدم علیہ السلام نے ﴿ مِنْ رَّبِّهٖ ﴾ اپنے رب سے ﴿ كَلِمٰتٍ ﴾ چند کلمات ﴿ فَتَابَ عَلَیْهِ ﴾ پس اللہ تعالیٰ نے رجوع کیا ان پر ﴿ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ ﴾ بے شک وہی ہے توبہ قبول کرنے والا مہربان ﴿ قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِیْعًا ﴾ کہا ہم نے اترو تم یہاں سے سارے ﴿ فَاِمَّا یَاْتِیَنَّكُمْ ﴾ پس اگر آئے تمھارے پاس ﴿ مِّنِّیْ هُدًى ﴾ میری طرف سے ہدایت ﴿ فَمَنْ تَبِعَ هُدَایَ ﴾ پس جس نے پیروی کی میری ہدایت کی ﴿ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ ﴾ پس اُن پر نہ خوف ہوگا ﴿ وَ لَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ﴾ اور نہ وہ غم کریں گے ﴿ وَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا ﴾ اور جنھوں نے کفر کیا ﴿ وَ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَاۤ ﴾ اور جھٹلایا ہماری آیتوں کو ﴿ اُولٰٓىٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ﴾ وہ دوزخ والے ہیں ﴿ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ﴾ اس دوزخ میں وہ ہمیشہ رہا کریں گے۔

ربط

پچھلے سبق میں آپ نے سنا کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام اور فرشتوں کا امتحان لیا اس علمی امتحان میں آدم علیہ السلام کامیاب

ہو گئے اور فرشتے کامیاب نہ ہو سکے۔ تو اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم علیہ السلام کو سجدہ کرو۔ فرشتوں نے بغیر کسی قیل وقال کے آدم علیہ السلام کو سجدہ کیا اور ابلیس لعین نے سجدہ کرنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ میں اپنے سے گھٹیا اور پسماندہ کو سجدہ کیوں کروں؟ میں اس سے بہتر ہوں۔

سلطان محمود غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کا سبق آموز واقعہ

مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ ایک حکایت بیان کر کے فرماتے ہیں کہ کاش! ابلیس سلطان محمود غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کے غلام ایاز سے ہی سبق سیکھ لیتا۔ مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ بڑے عجیب قسم کے بزرگ تھے انہوں نے مثنوی شریف میں کہانیوں کی شکل میں توحید وسنت اخلاص تصوف بہت کچھ سمجھایا ہے اور سلطان محمود غزنوی رحمۃ اللہ علیہ خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے زمرہ میں تو نہیں آتا جس طرح سلطان صلاح الدین ایوبی، سلطان بایزید یلدرم (ترکی) اور سلطان الپ ارسلان سلجوقی رحمۃ اللہ علیہ خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم میں سے نہیں تھے مگر بڑے نیک اور مجاہد قسم کے بادشاہ گزرے ہیں۔ سلطان صلاح الدین ایوبی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے دور میں یورپ والوں کو لگام ڈال رکھی تھی۔

سلطان محمود غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کے دورِ حکومت میں ایک نوعمر لڑکا جس کا نام ایاز تھا اور یہ بہت ذہین اور سمجھ دار تھا کو مجلس میں اپنے ساتھ بٹھاتے تھے۔ اور وزیروں کو، مشیروں کو یہ بات ناگوار گزرتی تھی انہوں نے کہا کہ حضرت یہ چھوٹا سا بچہ آپ کے پاس بیٹھا رہتا ہے۔ کسی بڑے آدمی کو اپنے پاس بٹھایا کریں اس وقت تو غزنوی رحمۃ اللہ علیہ خاموش رہے۔

مگر جب انہوں نے ہندوستان پر حملہ کیا اور سومنات کا مندر گرایا اور ہندوستان کے قیمتی ہیرے اور جواہرات افغانستان پہنچے ان میں ایک بڑا قیمتی ہیرا تھا اپنے غلام کو حکم دیا کہ ایک پتھر اور ہتھوڑا لا کر میرے سامنے رکھ دو۔ غلام نے پتھر اور ہتھوڑا لا کر رکھ دیا جب مجلس جم گئی تو سلطان محمود غزنوی رحمۃ اللہ علیہ نے جیب سے وہ قیمتی ہیرا نکالا اور ایک وزیر کو کہا کہ اس کو پتھر پر رکھ کر توڑ دو اس نے کہا بہت قیمتی ہیرا ہے اس کو نہیں توڑنا چاہیے اور نہ توڑا۔ دوسرے وزیر کو کہا اس نے بھی نہ توڑا۔ تیسرے کو کہا اس نے بھی نہ توڑا۔

الغرض! وزیروں، مشیروں میں سے جب کسی نے ہیرے کو نہ توڑا تو سلطان محمود غزنوی رحمۃ اللہ علیہ نے ایاز کو کہا لو بیٹے! تم اس ہیرے کو توڑ دو۔ ایاز نے ہیرے کو پتھر پر رکھ کر ہتھوڑے سے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔

سلطان محمود غزنوی رحمۃ اللہ علیہ نے ایاز کو کہا بیٹا! یہ بڑا قیمتی ہیرا تھا سب مشیروں، وزیروں نے توڑنے سے انکار کر دیا اور تو نے اس کو کیوں توڑ دیا ہے؟ ایاز نے کہا بے شک ہیرا قیمتی تھا مگر میرے آقا کا حکم اس سے زیادہ قیمتی تھا۔

مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ واقعہ نقل کر کے فرماتے ہیں کہ کاش! کہ ابلیس ایاز سے ہی سبق سیکھ لیتا ایک منٹ کے لیے مان لیتے ہیں کہ تو بہتر ہے۔ اگرچہ یہ بات حقیقت کے خلاف ہے کیونکہ آگ سے خاک بہتر ہے۔ مگر یہ تو دیکھتا کہ تجھے حکم کون دے

رہا ہے؟ مگر یہ ساری باتیں سمجھ سے تعلق رکھتی ہیں۔

جنت سے مراد ؟

﴿وَ قُلْنَا يٰۤاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ﴾ اور کہا ہم نے اے آدم! رہ تو ﴿وَ زَوْجُكَ الْجَنَّةَ﴾ اور تیری بیوی (حوا علیہا السلام) جنت میں۔ جنت سے مراد اصل جنت ہی ہے نہ کہ ملک اُردن کا باغ۔ جیسا کہ بعض ملحدوں نے کہا ہے کہ اُردن میں ایک باغ تھا اس میں ان کو بھیج دیا۔ یہ سب خرافات ہیں۔ بلکہ وہی جنت ہے جس میں حساب کے بعد مومنوں نے داخل ہونا ہے اور وہ آسمانوں کی طرف ہے۔ جس کے مقابلہ میں دوزخ ہے جس میں کافروں اور مشرکوں نے داخل ہونا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے یہی سمجھی ہے۔

﴿وَ كُلَا مِنْهَا رَغَدًا﴾ اور کھاؤ تم دونوں اس جنت سے وسعت اور کشادگی سے ﴿حَيْثُ شِئْتُمَا﴾ جس جگہ سے چاہو۔ اور جو چاہو کھاؤ، پیو کوئی پابندی نہیں ہے مگر ﴿وَ لَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ﴾ اور قریب نہ جانا اس درخت کے۔ کیوں کہ اگر تم نے اس درخت کا پھل کھایا تو ﴿فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ﴾ پس ہو جاؤ گے نا انصافوں میں سے۔

شجر ممنوعہ کون سا تھا؟

یہ کس چیز کا درخت تھا تفسیروں میں مختلف اقوال منقول ہیں:

①...... انگور اور کھجور کا ذکر بھی ہے۔

②...... بادام اور املوک کا ذکر بھی ہے۔

③...... لیکن اکثر حضرات فرماتے ہیں کہ گندم کا درخت تھا۔

اب سوال یہ ہے کہ گندم کا تو درخت نہیں ہوتا بلکہ پودہ ہوتا ہے۔ تو بات یہ ہے کہ جنت کا معاملہ الگ ہے۔ دنیا میں جو پودے ہیں وہ جنت میں درخت ہوں گے ان کو اس درخت سے کھانے پر ابلیس نے اکسایا تھا۔

قرآن کریم میں ہے ﴿وَ قَاسَمَهُمَاۤ اِنِّيْ لَكُمَا لَمِنَ النّٰصِحِيْنَ﴾ (الاعراف: ۲۱) ابلیس لعین نے دونوں کے سامنے قسم اٹھائی کہ میں تمہارا بڑا خیر خواہ ہوں اور تمہاری بھلائی کی بات تم سے کر رہا ہوں۔ وہ یہ کہ اس درخت سے تمہیں اللہ تعالیٰ نے اس لیے منع فرمایا ہے اگر تم اس درخت سے کھا لو گے تو ہمیشہ ہمیشہ جنت میں رہو گے۔ الٹی گنگا چلائی۔

حضرت آدم علیہ السلام نے خیال فرمایا کہ ہے تو ابلیس مگر رب تعالیٰ کی قسم اٹھا کر تو جھوٹ نہیں بولتا ہوگا۔ پھر حضرت حوا علیہا السلام نے بھی اکسایا۔ بخاری شریف میں حدیث آتی ہے کہ ''اگر حوا علیہا السلام خیانت نہ کرتیں تو کوئی عورت خیانت نہ کرتی''۔ بہر حال دنیا میں آنا مقدر تھا۔

﴿فَلَمَّا ذَاقَا الشَّجَرَةَ﴾ پس جب انہوں نے اس درخت کے پھل کو چکھا ﴿بَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا﴾ کھل گئے ستر ان کے

﴿وَ طَفِقَا یَخْصِفٰنِ عَلَیْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ﴾ (سورۃ الاعراف) وہ لگے اپنے اوپر جوڑنے بہشت کے پتے۔ کھانا تو دور کی بات ہے دونوں نے چکھا ہی تھا کہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو حکم دیا کہ ان دونوں کے کپڑے اتار دو۔ دونوں ننگ دھڑنگ ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ کی شان کہ درخت بھی بگڑ گئے۔ ستر پوشی کے لیے پتے پتے کے لیے جس درخت کے قریب جاتے اس کی ٹہنیاں اوپر ہو جاتیں۔ بالآخر انجیر کے درخت نے قربانی دی کہ پتے توڑنے دیے۔ اب انہوں نے پتوں کے ساتھ پتے جوڑ کر آگے پیچھے رکھ کر ستر ڈھانپا۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا ﴿اَلَمْ اَنْهَكُمَا عَنْ تِلْكُمَا الشَّجَرَةِ﴾ میں نے تمہیں اس درخت کے قریب جانے سے منع نہیں کیا تھا ﴿وَ اَقُلْ لَّكُمَآ اِنَّ الشَّیْطٰنَ لَكُمَا عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ﴾ اور تمھیں کہہ نہیں دیا تھا کہ شیطان تمہارا کھلا دشمن ہے۔

حضرت آدم علیہ السلام کا اعتراف وتوبہ

حضرت آدم علیہ السلام نے رب تعالیٰ کے سامنے کوئی حجت بازی نہیں کی۔ حالانکہ اگر منطق لڑاتے تو کہہ سکتے تھے کہ اے پروردگار! ابلیس سے پوچھو اس نے جھوٹی قسمیں کھا کر کیوں دھوکہ دیا ہے؟ اصل مجرم تو وہ ہے اور بھی بہت کچھ کہہ سکتے تھے مگر آدم علیہ السلام نے سوچا کہ تمام چکر کاٹنے کے بعد بھی عاجزی کا اقرار کرنا ہے۔ تو شروع سے ہی تسلیم کرو۔ قیل وقال کی کیا ضرورت ہے؟ اس سے انسان کی شرافت کا پتہ چلتا ہے۔

﴿قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا وَ اِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَ تَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ ۝﴾ (الاعراف: ۲۳) دونوں نے کہا اے ہمارے پروردگار! ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے۔ تو ہمیں معاف کر دے تو اگر ہمیں معاف نہیں کرے گا تو ہم کس سے معافی مانگیں گے تو اگر ہم پر رحم نہیں کرے گا تو ہم خسارے میں ہوں گے۔ یہی انسان کی شرافت ہے کہ رب تعالیٰ کے حکم کے سامنے اکڑتا نہیں ہے۔ اب رہی یہ بات کہ آدم علیہ السلام سے یہ خطاء کیوں ہوئی کہ اس درخت کا پھل کھا لیا؟

① ...... امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ بڑے مفسر ہیں وہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا ﴿وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ﴾ اس درخت کے قریب نہ جانا۔ تو جس درخت کی طرف اشارہ کر کے اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا انہوں نے وہ مخصوص درخت سمجھا اور اس کے قریب نہیں گئے۔ اس نوع کے دوسرے درخت سے کھا لیا یہ غلطی ہو گئی۔

② ...... دوسری وجہ یہ بیان فرماتے ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام نے اس نہی کو نہی تحریمی نہیں سمجھا بلکہ نہی تنزیہی سمجھا اور نہی تنزیہی کا مطلب یہ ہے کہ اس سے بچنا بہتر ہے اگر کر لو تو گناہ نہیں ہے۔

③ ...... تیسری وجہ یہ بیان فرماتے ہیں کہ شیطان کی قسم سے مغالطہ ہوا کہ یہ جو قسم اٹھا کر کہہ رہا ہے کہ تم کھا لو۔ شاید کہ اللہ تعالیٰ نے پہلا حکم اٹھا لیا ہے اور ابلیس کو اس حکم کے منسوخ ہونے کا علم ہو گیا ہے۔

بہرحال کچھ بھی ہوا ہو یہ مقدر تھا کہ آدم اور حوا علیہما السلام نے زمین پر اترنا تھا۔ سو اُتار دیے گئے۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ﴿فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا﴾ پس پھسلایا ان دونوں کو شیطان نے اس درخت سے۔ نتیجہ یہ نکلا ﴿فَاَخْرَجَهُمَا﴾ پس نکالا ان دونوں کو ﴿مِمَّا كَانَا فِيْهِ﴾ ان خوشیوں سے جن میں وہ تھے ﴿وَ قُلْنَا اهْبِطُوْا﴾ اور کہا ہم نے اتر جاؤ تم ﴿بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ﴾ بعض تمہارے دوسرے بعض کے لیے دشمن ہوں گے۔ یعنی تمہاری نسل میں ایک دوسرے کی دشمنی چلے گی۔ یہ بات سمجھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ آج دنیا میں انسان ایک دوسرے کی کتنی گردنیں کاٹ رہے ہیں شمار سے باہر ہیں۔

حضرت آدم وحوا علیہما السلام کے اُترنے کی جگہیں

کہتے ہیں کہ آدم علیہ السلام کو سری لنکا کے جزیرہ سراندیپ میں اتارا گیا اور حوا علیہا السلام کو سرزمین عرب میں دونوں ایک دوسرے کو تلاش کرتے رہے یہاں تک کہ عرفات کے میدان میں دونوں کی ملاقات ہوگئی۔

”عرفات“ کا معنٰی

”عرفات“ کو عرفات اسی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ کیوں کہ عرفات کا معنٰی ہے ”شناخت کی جگہ“۔ حضرت آدم اور حوا علیہما السلام نے ایک دوسرے کی اس جگہ شناخت کی تھی۔

فرمایا: ﴿وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ﴾ اور تمھارے لیے زمین میں ٹھکانا ہے۔ یعنی ٹھہرنے کی جگہ ہے ﴿وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ﴾ اور فائدہ اٹھانا ہے ایک مدت تک۔ ایک عرصہ تک زمین میں رہو۔ پھر دنیا سے جانا ہے۔

﴿فَتَلَقّٰٓى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ﴾ حاصل کیے آدم علیہ السلام نے اپنے رب سے چند کلمات۔ وہ کلمات یہ ہیں ﴿قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا ۫ وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ﴾ یہ آٹھویں پارے میں موجود ہیں۔

﴿فَتَابَ عَلَيْهِ﴾ پس اللہ تعالیٰ نے رجوع کیا ان پر۔ یعنی ان کی توبہ قبول فرمائی۔ ﴿اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ﴾ بے شک وہی ہے توبہ قبول کرنے والا مہربان۔ ﴿قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا﴾ کہا ہم نے اُترو تم یہاں سے سارے۔ یعنی آدم وحوا علیہما السلام اور ان کے ضمن میں جو ان کی اولاد ہے وہ تمام کے تمام۔ سب کو خطاب ہے۔

﴿فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى﴾ پس اگر آئے تمہارے پاس میری طرف سے ہدایت۔ ﴿اِمَّا﴾ اصل میں ﴿اِنْ مَا﴾ ہے۔ ”اِنْ“ شرطیہ ہے۔ اگر ہدایت آئے۔ یہ اس واسطے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ پیغمبر بھیجنے اور کتابیں نازل کرنے پر مجبور نہیں تھا۔ اگر نہ بھیجتا تو اس سے کون پوچھ سکتا ہے؟ اگر ضرورت ہوئی تو تمہاری طرف پیغمبروں اور کتابوں کی شکل میں ہدایت بھیجوں گا۔

خوف/حزن میں فرق

﴿فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ﴾ پس جس نے پیروی کی میری ہدایت کی ﴿فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ﴾ پس ان پر نہ خوف ہوگا اور نہ وہ غم کریں گے۔ آئندہ کسی شے کا خدشہ ہو تو اس کو خوف کہتے ہیں۔ اور گزشتہ کسی چیز پر افسوس ہو تو اس کو غم کہتے ہیں۔ جنت میں داخل ہونے کے بعد نہ تو آئندہ کسی قسم کا خوف ہوگا اور نہ گزشتہ زندگی پر کسی قسم کی پریشانی ہوگی کیونکہ نیکیاں کر کے گئے

ہوں گے۔

(سوال) یہاں پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ قیامت والے دن تو اتنا ہول ناک منظر ہوگا کہ سب کے طوطے اُڑے ہوں گے۔ یہاں تک کہ انبیاء کرام علیہم السلام بھی رَبِّ سَلِّمْ رَبِّ سَلِّمْ کہہ رہے ہوں گے۔ اے رب سلامتی فرما، اے رب سلامتی فرما۔ تو پھر ﴿لَا خَوْفٌ﴾ کا مطلب کیا ہوگا؟

(جواب) اس کے جواب میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ خوف دو طرح کا ہوتا ہے۔

① ..... کبھی تو خوف کا باعث ڈرنے والے میں پایا جاتا ہے جیسے مجرم بادشاہی جو بادشاہ سے ڈرتا ہے۔ اس خوف کا سبب جرم ہے جو مجرم کی طرف رجوع کرتا ہے۔

② ..... اور کبھی خوف کا سبب مخوف عنہ یعنی جس سے ڈرتے ہیں اس میں کوئی امر ہوتا ہے۔ مثلاً: کوئی شخص صاحب جاہ وجلال بادشاہ کے سامنے ہو تو اس کے خوف زدہ ہونے کی یہ وجہ نہیں کہ اس نے بادشاہ کا کوئی جرم کیا ہے بلکہ اس کا قہر وجلالِ سلطانی اور ہیبت خوف کا سبب ہے۔

آیت کریمہ میں پہلی قسم کی نفی ہوتی ہے جو خوف کسی جرم کی وجہ سے ہو۔ یہ خوف ان پر نہیں ہوگا اور نیک لوگوں پر جو خوف ہوگا وہ اللہ تعالیٰ کے جلال اور عظمت کا ہوگا۔ ﴿لَا يَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْأَكْبَرُ﴾ (الانبیاء:۱۰۳) اور لوگوں پر اعمال کی وجہ سے جو گھبراہٹ ہوگی نیک لوگوں پر وہ نہیں ہوگی۔

﴿وَالَّذِينَ كَفَرُوا﴾ اور جنہوں نے کفر کیا ﴿وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا﴾ اور جھٹلایا ہماری آیتوں کو ﴿أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ﴾ وہ دوزخ والے ہیں ﴿هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ﴾ اس دوزخ میں وہ ہمیشہ رہا کریں گے اور جلیں گے۔ نکلنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

﴿يَا بَنِي إِسْرَائِيلَ﴾ اے بنی اسرائیل! ﴿اذْكُرُوا نِعْمَتِيَ﴾ یاد کرو میری نعمتوں کو ﴿الَّتِي أَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ﴾ جو میں نے تم پر انعام کیں ﴿وَأَوْفُوا بِعَهْدِي﴾ اور پورا کرو میرے عہد کو ﴿أُوفِ بِعَهْدِكُمْ﴾ میں پورا کروں گا تمہارے عہد کو ﴿وَإِيَّايَ فَارْهَبُونِ﴾ اور خاص مجھ ہی سے ڈرو ﴿وَآمِنُوا بِمَا أَنْزَلْتُ﴾ اور ایمان لاؤ اس چیز پر جو میں نے نازل کی ہے ﴿مُصَدِّقًا لِمَا مَعَكُمْ﴾ جو تصدیق کرنے والی ہے اس چیز کی جو تمہارے پاس ہے ﴿وَلَا تَكُونُوا أَوَّلَ كَافِرٍ بِهِ﴾ اور نہ ہو جاؤ تم پہلے منکر اس کے ﴿وَلَا تَشْتَرُوا بِآيَاتِي﴾ اور نہ خریدو میری آیتوں کے بدلے ﴿ثَمَنًا قَلِيلًا﴾ تھوڑی قیمت ﴿وَإِيَّايَ فَاتَّقُونِ﴾ اور خاص مجھ ہی سے ڈرو ﴿وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ﴾ اور خلط ملط نہ کرو حق کو باطل کے ساتھ ﴿وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ﴾ اور نہ چھپاؤ تم حق کو ﴿وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ﴾ اور حالانکہ تم جانتے ہو ﴿وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ﴾ اور قائم کرو تم نماز کو اور ادا کرو تم زکوٰۃ ﴿وَارْكَعُوا مَعَ الرَّاكِعِينَ﴾ اور رکوع کرو تم

رکوع کرنے والوں کے ساتھ ﴿اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ﴾ کیا تم حکم دیتے ہو لوگوں کو نیکی کا ﴿وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ﴾ اور بھول جاتے ہو اپنی جانوں کو ﴿وَ اَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ﴾ حالانکہ تم کتاب پڑھتے ہو ﴿اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ﴾ کیا پس تم سمجھتے نہیں ہو ﴿وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ﴾ اور مدد طلب کرو صبر اور نماز کے ساتھ ﴿وَ اِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ﴾ اور بے شک یہ نماز البتہ بھاری ہے ﴿اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ﴾ مگر ان لوگوں پر جو عاجزی کرنے والے ہیں ﴿الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ﴾ وہ لوگ جو یقین رکھتے ہیں ﴿اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ﴾ بے شک وہ ملاقات کرنے والے ہیں اپنے رب سے ﴿وَ اَنَّهُمْ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ﴾ اور بے شک وہ اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔

ربط

ان آیات کا پچھلی آیات کے ساتھ ربط یہ بیان فرماتے ہیں کہ پہلے نعمت عامہ برعامہ کا ذکر تھا یعنی نعمتیں بھی عام اور تھیں بھی عام مخلوق پر۔ اور اب نعمت خاصہ برخاصہ کا ذکر ہے یعنی نعمتیں بھی خاص اور جس قوم پر ہوئی ہیں وہ بھی خاص ہے۔ یعنی بنی اسرائیل۔ ان نعمتوں کی تفصیل آگے کئی رکوعوں تک بیان ہوگی۔

”اسرائیل“ کا معنیٰ

”اسرائیل“ حضرت یعقوب علیہ السلام کا لقب تھا۔ اسراء کا معنیٰ ہے عبد اور ایل کا معنیٰ ہے اللہ۔ مکمل معنیٰ بنے گا ”عبداللہ“۔

اللہ تعالیٰ نے ان کو بارہ بیٹے عطا فرمائے تھے بیٹی کوئی نہیں تھی۔ ان بارہ بیٹوں میں سے صرف حضرت یوسف علیہ السلام پیغمبر تھے باقی بھائی جمہور کے نزدیک پیغمبر نہیں تھے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد در اولاد کو بنی اسرائیل کہتے ہیں۔

بنی اسرائیل پر انعامات

بنی اسرائیل میں اللہ تعالیٰ نے تقریباً چار ہزار پیغمبر مبعوث فرمائے۔ ان کے آخری پیغمبر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تھے۔ جن کا ذکر قرآن کریم نے اس طرح کیا ہے ﴿وَ رَسُوْلًا اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ﴾ (آل عمران: ۴۹) حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بنی اسرائیل کی طرف رسول بنا کر بھیجا گیا۔ اور چار مشہور آسمانی کتابوں تورات، زبور، انجیل اور قرآن مجید میں سے تین پہلی ان کو دی گئیں۔ اور مشہور اس لیے فرمایا کہ ان کے علاوہ اور کتابیں اور صحیفے بھی ہیں مگر وہ مشہور نہیں ہیں۔

تورات حضرت موسیٰ علیہ السلام کو عطا ہوئی۔ زبور حضرت داؤد علیہ السلام کو، انجیل حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو۔ ان میں ایسے پیغمبر بھی تھے جن کو نبوت کے ساتھ ساتھ بادشاہت بھی ملی۔ جیسے حضرت یوسف علیہ السلام آخری دور میں مصر کے بادشاہ بھی تھے۔ اور پیغمبر بھی تھے۔ حضرت داؤد علیہ السلام پیغمبر بھی تھے بادشاہ بھی تھے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام پیغمبر بھی تھے بادشاہ بھی تھے۔ ان کو اللہ تعالیٰ نے ظاہری باطنی نعمتیں عطا فرمائی تھیں۔ اور عام بنی اسرائیلیوں پر جو انعامات ہوئے ان کا ذکر اگلے دو رکوعوں میں آئے گا۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ﴿یٰبَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ﴾ اے اسرائیل علیہ السلام کی اولاد! ﴿اذْكُرُوْا نِعْمَتِیَ﴾ یاد کرو میری نعمتوں کو ﴿الَّتِیْۤ اَنْعَمْتُ عَلَیْكُمْ﴾ جو میں نے تم پر انعام کیں۔ یاد کرنے کا مطلب ہے کہ ان کا شکر ادا کرو۔ ﴿وَ اَوْفُوْا بِعَهْدِیْۤ﴾ اور پورا کرو میرے عہد کو جو تم نے میرے ساتھ کیا ہے۔ ﴿اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ﴾ میں پورا کروں گا تمہارے وعدے کو جو میں نے تمہارے ساتھ کیا ہے۔ یہاں پر اجمال ہے اور چھٹے پارے کے ساتویں رکوع میں اس کی تفصیل ہے کہ انہوں نے رب تعالیٰ کے ساتھ وعدہ کیا تھا اور رب تعالیٰ نے ان کے ساتھ کیا وعدہ کیا تھا۔

بنی اسرائیل کا میثاق

﴿وَ لَقَدْ اَخَذَ اللّٰهُ مِیْثَاقَ بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ﴾ اور البتہ تحقیق پختہ عہد لیا اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے۔ آگے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ﴿اِنِّیْ مَعَكُمْ﴾ میں تمہارے ساتھ ہوں ﴿لَىٕنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ﴾ اگر تم نے قائم کی نماز ﴿وَ اٰتَیْتُمُ الزَّكٰوةَ﴾ اور تم زکوٰۃ دیتے رہے ﴿وَ اٰمَنْتُمْ بِرُسُلِیْ﴾ اور میرے رسولوں پر ایمان لاتے رہے ﴿وَ عَزَّرْتُمُوْهُمْ﴾ اور تم ان کی عزت اور قدر کرتے رہے ﴿وَ اَقْرَضْتُمُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا﴾ اور تم اللہ تعالیٰ کو قرضِ حسنہ دیتے رہے یعنی اللہ تعالیٰ کے راستہ میں خرچ کرتے رہے۔ یہ کام بنی اسرائیلیوں کے ذمہ تھے وہ پورا کرتے رہیں۔

﴿اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ﴾ اور میں نے جو تمہارے ساتھ وعدہ کیا ہے اے بنی اسرائیلیو! وہ میں پورا کروں گا وہ وعدہ کیا ہے؟ فرمایا ﴿لَاُكَفِّرَنَّ عَنْكُمْ سَیِّاٰتِكُمْ﴾ البتہ میں ضرور مٹا دوں گا تمہاری خطائیں ﴿لَاُدْخِلَنَّكُمْ﴾ اور میں تمہیں ضرور داخل کروں گا ﴿جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ﴾ ان باغوں میں جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ یہ اس معاہدے کی تفصیل ہے۔

فرمایا ﴿وَ اِیَّایَ فَارْهَبُوْنِ، فَارْهَبُوْنِ﴾ اصل میں ﴿فَارْهَبُوْنِیْ﴾ تھا۔ یا کو تخفیف کے طور پر حذف کر دیا گیا۔ معنٰی بنے گا اور خاص مجھ ہی سے تم ڈرو۔

﴿وَ اٰمِنُوْا بِمَاۤ اَنْزَلْتُ﴾ اور ایمان لاؤ اس چیز پر جو میں نے نازل کی ہے۔ یعنی قرآن کریم ﴿مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ﴾ اور یہ قرآن کریم تصدیق کرتا ہے ان چیزوں کی جو تمہارے پاس ہیں۔ توراۃ، انجیل، زبور جو اصل آسمانی کتابیں تھیں۔

﴿وَ لَا تَكُوْنُوْۤا اَوَّلَ كَافِرٍۭ بِهٖ﴾ اور نہ ہو جاؤ تم پہلے منکر اس کے۔ اے بنی اسرائیل! اگر تم انکار کرو گے تو تمہاری طرف دیکھ کر دوسرے بھی انکار کریں گے۔ تو ان کا وبال بھی تمہارے اوپر پڑے گا۔

لوگوں کے سامنے اچھی چیز کا پیش کرنا

حدیث پاک میں آتا ہے: ((مَنْ سَنَّ سُنَّةً حَسَنَةً)) جس کسی نے اچھی چیز لوگوں کے سامنے پیش کی کسی سنت کو زندہ کیا اور اس کو دیکھ کر اور لوگوں نے بھی عمل کیا تو ان لوگوں کے برابر اس کو بھی اجر ملے گا۔ اور ان کے اجر میں بھی کوئی کمی نہیں آئے گی۔ اور جس نے کوئی برا طریقہ رائج کیا۔ اس پر جتنے لوگ چلیں گے۔ جتنا گناہ ان کو ہوگا اس رائج کرنے والے کو بھی ان

سب کے برابر گناہ ہوگا۔اوران کے گناہ میں بھی کوئی کمی نہیں ہوگی۔

اس ضابطے کے مطابق یہ امت جتنی نیکیاں کررہی ہے وہ تمام کی تمام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نامہ اعمال میں درج ہورہی ہیں۔اور جولوگ نیکیاں نہیں کرتے نماز نہیں پڑھتے روزے نہیں رکھتے، وہ یہ نہ سمجھیں کہ ہم صرف اپنا نقصان کررہے ہیں بلکہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی نقصان کررہے ہیں۔اور عام مسلمانوں کو جو دعائیں پہنچنی تھیں وہ نہیں پہنچ رہیں تو ان کا بھی حق مار رہے ہیں۔

امام تاج الدین سبکی رحمۃ اللہ علیہ کا قول

امام تاج الدین سبکی رحمۃ اللہ علیہ ساتویں یا آٹھویں صدی کے بڑے بزرگ اور بڑے عالم تھے۔طالب علموں کو سبق پڑھا رہے تھے بڑا مجمع تھا۔فرمانے لگے اگر میں قاضی اور جج ہوتا اور کوئی شخص میرے پاس آکر مقدمہ درج کراتا کہ فلاں آدمی نے نماز نہ پڑھ کر میرا حق مارا ہے تو میں مقدمہ درج کر کے اس کے خلاف کارروائی کرتا کہ واقعی اس نے اس کا حق مارا ہے۔

طالب علموں نے کہا حضرت! نماز تو اللہ تعالیٰ کا حق ہے اس میں بندے کا حق کیسے آگیا؟ فرمایا بخاری شریف اور مسلم شریف میں حدیث آتی ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جب دعا کرتے تھے تو اس طرح کہتے تھے:

اَلسَّلَامُ عَلَى اللهِ اَلسَّلَامُ عَلٰى جِبرِيل اَلسَّلَامُ عَلٰى ميكائيل اَلسَّلَامُ عَلٰى عِزْرَائيل ... اِلٰى آخِرِهٖ۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((لَا تَقُوْلُوْا اَلسَّلَامُ عَلَى اللهِ)) نہ کہو ((اَلسَّلَامُ عَلَى اللهِ)) کیوں کہ اللہ تعالیٰ تو خود سلام ہے۔ سلامتی کی دعا تو اس کو دی جاتی ہے جس کو کوئی خطرہ اور خدشہ ہو۔اس لیے کہ السلام علیکم کا معنیٰ ہے اللہ تعالیٰ تجھے سلامتی میں رکھے۔ تو اللہ تعالیٰ کو تو کوئی خطرہ نہیں ہے کہ تم اس کے لیے سلامتی کی دعا کرتے ہو۔

اور فرشتوں کا نام لے، لے کر کتنوں پر سلام بھیجو گے اور پھر کتنے فرشتوں کے نام تمھیں آتے ہیں؟ پھر اس کے بعد پیغمبر ہیں۔تو کتنے پیغمبروں کا نام لے کر سلام بھیجو گے؟ لہٰذا تم اس طرح کہو ((اَلسَّلَامُ عَلَيْنَا وَعَلٰى عِبَادِ اللهِ الصَّالِحِيْنَ)) کہ ہم پر سلامتی ہو تو اس جملے میں انبیاء علیہم السلام، صلحا، جن، فرشتے تمام آجائیں گے اور یہ دعا ((اَصَابَ كُلَّ عَبْدٍ صَالِحٍ لِّلّٰهِ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ)) اللہ تعالیٰ کے ہر نیک بندے کو پہنچتی ہے۔چاہے وہ آسمانوں میں ہو یا زمین میں، شرق میں ہو یا غرب میں، شمال میں ہو یا جنوب میں۔

لہٰذا جو بندہ نماز نہیں پڑھتا وہ سب کا حق مارتا ہے کہ وہ اس دعا سے محروم ہو گئے۔تو علامہ سبکی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں فیصلہ کرتا کہ واقعی اس نے اس کا حق مارا ہے کہ اس کو دعا سے محروم رکھا ہے۔یا اس طرح سمجھو کہ جو شخص نماز نہیں پڑھتا اس نے درود شریف اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰى اٰلِ مُحَمَّدٍ بھی نہیں پڑھا۔ اٰلِ محمد سے مراد تمام مومن ہیں تو اس نے تمام مومنوں کا حق مارا ہے۔لہٰذا بے نماز صرف رب تعالیٰ کا ہی حق نہیں مارتا بلکہ مخلوق کا بھی حق مارتا ہے۔

دُنیا کی حیثیت

﴿وَ لَا تَشْتَرُوْا بِاٰیٰتِیْ ثَمَنًا قَلِیْلًا﴾ اور نہ خرید و میری آیتوں کے بدلے تھوڑی قیمت۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ زیادہ قیمت کے بدلے بیچنا جائز ہے۔ کیونکہ دنیا اور جو کچھ دنیا میں ہے اللہ تعالیٰ کے ہاں سب قلیل ہے۔

چنانچہ ترمذی شریف میں روایت آتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی فرمایا کہ دنیا اور جو کچھ دنیا میں ہے اس کی قیمت اللہ تعالیٰ کے ہاں مچھر کے پر کے برابر بھی ہوتی تو اللہ تعالیٰ کافر کو ایک گھونٹ پانی کا بھی نہ دیتا۔ ہمارے نزدیک تو سونے، چاندی، ڈالرز اور پونڈز کی قیمت ہے اللہ تعالیٰ کے نزدیک مچھر کے پر کے برابر بھی اس کی حیثیت نہیں ہے۔ لہٰذا ساری دنیا بھی قرآن کریم کی ایک آیت کے مقابلہ میں ہیچ ہے۔ یوں سمجھو کہ ''قٓ'' ایک آیت ہے ساری دُنیا کے خزانے جمع ہو کر ''قٓ یا حٰمٓ'' کی قیمت نہیں بن سکتے۔ فرمایا ﴿وَ اِیَّایَ فَاتَّقُوْنِ﴾ اور خاص مجھ ہی سے ڈرو۔

کتمانِ حق کی مختلف صورتیں

﴿وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ﴾ اور خلط ملط نہ کرو حق کو باطل کے ساتھ ﴿وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ﴾ یہاں لَا مقدر ہے، اصل میں ہے ﴿وَلَا تَكْتُمُوا الْحَقَّ﴾ اور نہ چھپاؤ تم حق کو۔ حق کے مٹنے کی دو ہی صورتیں ہوتی ہیں۔

①...... ایک یہ کہ حق کو بیان نہ کیا جائے اور ظاہر بات ہے کہ جب حق کو بیان نہیں کیا جائے گا تو آنے والی نسلوں کو کیا پتہ چلے گا کہ حق کیا ہے؟ اور باطل کیا ہے؟

②...... اور دوسرا یہ ہے کہ حق کو ملغوبہ بنا دیا جائے کہ حق اور باطل کو اس طرح خلط ملط کر دیا جائے کہ پتہ ہی نہ چلے کہ حق کیا ہے اور باطل کیا ہے؟ اسی لیے بدعت کا بہت سخت گناہ ہے کہ بدعت سے دین خلط ملط ہو جاتا ہے کتنا سخت گناہ ہے۔

بدعت کی نحوست

ایک آدمی مسجد میں بیٹھ کر سو بوتلیں شراب کی پیئے تو اس کا کتنا گناہ ہے۔ ویسے تو ایک بوتل کا بڑا گناہ ہے۔ سمجھانے کے لیے کہہ رہا ہوں کہ سو بوتلیں شراب کی پیئے تو کتنا گناہ ہوگا ایک بدعت کا گناہ اس سے بھی زیادہ ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ گناہ سے دین کا نقشہ نہیں بدلتا۔ گناہ کرنے والا بھی گناہ کو گناہ سمجھتا ہے اس سے توبہ بھی کر سکتا ہے۔ دین نہیں سمجھتا۔ اور بدعت سے دین کا نقشہ بدل جاتا ہے۔ بدعتی، بدعت کو دین سمجھ کر کرتا ہے اور ثواب سمجھتا ہے اس لیے اس کو توبہ نصیب نہیں ہوتی۔ اور جن لوگوں نے دین کو بھلایا ہوا ہے بدعات ان کا دین ہیں۔ اگر تم بدعات کا رد کرو تو وہ کہتے ہیں کہ انہوں نے ہمارے دین کی مخالفت کی ہے۔ اس لیے سو گناہ کبیرہ ایک طرف اور ایک بدعت ایک طرف ہو تو بدعت کا گناہ زیادہ ہے۔ کیونکہ اس سے دین کا نقشہ بدل جاتا ہے۔ اور بدعتی، بدعت کو ثواب سمجھ کر کرتا ہے۔ اسی لیے اس کو توبہ کی توفیق نہیں ہوتی۔ کیونکہ وہ اس کو کارِ ثواب سمجھتا ہے۔ اور ثواب کے کام سے کیوں توبہ کرے۔

مثلاً: ابھی آپ نے صبح کی نماز پڑھی ہے اور درس سن رہے ہو۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو کہ اس نے توفیق عطا فرمائی ہے۔ اب تم یہ نہیں کہو گے کہ اے پروردگار! یہ جو میں نے نماز پڑھی ہے اس سے میری توبہ اور یہ جو میں نے قرآن سنا ہے اس سے میری توبہ۔ بلکہ شکر ادا کرو گے کہ الحمد للہ! تیرا شکر ہے کہ تو نے مجھے نماز کی توفیق عطا فرمائی ہے۔ اور بدعتی جب بدعت کو دین سمجھ کر کرے گا تو اس سے توبہ کب کرے گا؟

بدعتی سے توبہ کا سلب ہو جانا

چنانچہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت میں آتا ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰی قَدْ حَجَبَ التَّوْبَةَ عَنْ كُلِّ صَاحِبِ بِدْعَةٍ)) بے شک اللہ تعالیٰ نے بدعت کرنے والے پر توبہ کا دروازہ بند کر دیا ہے۔ بدعت کی اتنی نحوست ہوتی ہے کہ دل میں توبہ کی صلاحیت باقی ہی نہیں رہتی۔ جس طرح غالی کافروں میں ایمان کی صلاحیت باقی نہیں رہتی۔

رسومِ باطلہ ''تحفۃ الہند'' کی روشنی میں

مولانا عبید اللہ نومسلم (مرحوم) پہلے پنڈت تھے اور لدھیانہ کے رہنے والے تھے۔ بڑے پڑھے لکھے آدمی تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو ایمان کی توفیق عطا فرمائی۔ مسلمان ہو گئے۔ انہوں نے کتاب لکھی ''تحفۃ الہند'' ہندوؤں کے لیے تحفہ۔ یہ کتاب بڑی نایاب تھی۔ اب گوجرانوالا کے ساتھیوں نے ہمت کر کے چھپوائی ہے۔ اس کو لے کر ضرور پڑھو۔ اس میں انہوں نے ثابت کیا ہے کہ تیجہ، ساتواں، دسواں، برسی منانا، عرس لگانا، یہ تمام ہندوؤں کی رسمیں ہیں جو ہمارے اندر آ گئی ہیں۔

مسلمان آئے ہندوستان میں اسلام پھیلا۔ ہندو، سکھ مسلمان ہوئے مگر ان کی جو رسمیں تھیں ان کو نہیں چھوڑا وہ ابھی تک ساتھ چلی آ رہی ہیں۔ مولانا عبید اللہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ کے ایمان لانے کا سبب یہی کتاب بنی، ان کا پہلا نام بوٹا سنگھ تھا۔

اور عورتوں کو بھی سمجھاؤ اور ان کا ذہن صاف کرو۔ بدعات کا ایک سبب یہ بھی ہیں۔ جب تک ان کا ذہن صاف نہیں ہوگا بدعات ختم نہیں ہوں گی۔ تم حاجی بن جاؤ، نمازی بن جاؤ، عورتوں کے ذہن صاف نہیں ہیں تو بدعتیں ختم نہیں ہوں گی۔ اور جن گھروں میں عورتیں سمجھ دار ہیں الحمد للہ! وہاں بدعتیں اولاً تو ہوتی ہی نہیں اور اگر ہوتی بھی ہیں تو بہت کم۔ بدعت کی دین میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا ارشاد

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کوفے کے گورنر تھے کسی نے آ کر اطلاع دی کہ حضرت فلاں مسجد میں لوگ اکٹھے ہو کر بلند آواز سے درود شریف پڑھتے ہیں۔ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا ((اَوَيَفْعَلُوْنَ ذٰلِكَ)) کیا ایسی کارروائی یہاں ہو رہی ہے؟ لوگوں نے کہا ہاں حضرت ہو رہی ہے۔ فرمایا کل جس وقت یہ کارروائی ہو مجھے آ کر اطلاع دینا چنانچہ اطلاع دی گئی۔ حضرت کا ہلکا پھلکا چھوٹا سا قد تھا، نقاب پوشی کی تا کہ کوئی پہچان نہ لے۔ بڑے تیز چلتے تھے۔ وہاں پہنچ کر منہ سے کپڑا اتارا اور

فرمایا: ((مَنْ عَرَفَنِیْ عَرَفَنِیْ)) جو مجھے پہچانتا ہے وہ تو پہچانتا ہی ہے ((وَمَنْ لَّمْ یَعْرِفْنِیْ فَاَنَا ابْنُ مَسْعُوْدٍ)) اور جو نہیں پہچانتا تو میں عبداللہ بن مسعود کوفے کا گورنر ہوں۔

اوظالمو! ابھی تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مٹی کے برتن نہیں ٹوٹے، ابھی تک آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کپڑے میلے نہیں ہوئے اور اَتَیْتُمْ بِبِدْعَۃٍ ظَلْمَاءِ یہ تم مسجد میں اکٹھے ہو کر بلند آواز سے درود شریف پڑھتے ہو بدعتیں کرتے ہو۔ مَا اَرَاکُمْ اِلَّا مُبْتَدِعِیْنَ میں نہیں دیکھتا تمہیں مگر یہ کہ تم سارے کے سارے بدعتی ہو۔ فَاَخْرَجَهُمْ مِنَ الْمَسْجِدِ پس ایک ایک کو پکڑ کر مسجد سے باہر نکال دیا۔ اس سے اندازہ لگاؤ کہ بدعت کتنی قبیح ہے۔ یہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اَفْقَهُ الْاُمَّۃِ ہیں۔

تمام امت میں سب سے بڑے فقیہ، تمام امت میں سب سے بڑے مفسر قرآن۔ جن کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((رَضِیْتُ لَکُمْ مَا رَضِیَ لَکُمْ اِبْنُ اُمِّ عَبْدٍ)) جس چیز کو تمہارے لیے ابن مسعود پسند کرے میں بھی اس پر راضی ہوں ((وَمَا اَسْخَطَ لَکُمْ اِبْنُ اُمِّ عَبْدٍ فَقَدْ سَخَطْتُ لَکُمْ)) اور جو چیز تمہارے لیے ابن مسعود رضی اللہ عنہ ناپسند کرے میں بھی پسند نہیں کرتا۔ لیکن کتنے افسوس کی بات ہے کہ جو بدعات نہ کرے وہ وہابی ہے اور جو بدعات کرے وہ سنی ہے۔ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْمِ۔ تو فرمایا کہ حق کو نہ چھپاؤ ﴿وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ﴾ اور حالانکہ تم جانتے ہو ﴿وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ﴾ اور قائم کرو تم نماز کو اور ادا کرو تم زکوٰۃ ﴿وَارْکَعُوْا مَعَ الرّٰکِعِیْنَ﴾ اور رکوع کرو تم رکوع کرنے والوں کے ساتھ۔ یعنی جماعت کے ساتھ نماز پڑھو۔

﴿اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ﴾ کیا تم حکم دیتے ہو لوگوں کو نیکی کا ﴿وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَکُمْ﴾ اور بھول جاتے ہو اپنی جانوں کو۔ آج ہمارے وعظ و تبلیغ میں اسی وجہ سے اثر نہیں ہے کہ ہم کہتے زیادہ ہیں اور کرتے کم ہیں۔ اور پہلے لوگوں کے وعظ اور تبلیغ اس لیے مؤثر ہوتے تھے کہ وہ جو کچھ کہتے تھے پہلے کر کے دکھاتے تھے۔ ﴿وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْکِتٰبَ﴾ حالانکہ تم کتاب پڑھتے ہو ﴿اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ﴾ کیا پس تم (اتنی موٹی باتیں بھی) نہیں سمجھتے۔

استعانت کا غلط مفہوم

﴿وَاسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوۃِ﴾ اور مدد طلب کرو صبر اور نماز کے ساتھ۔ صبر اور نماز مدد طلب کرنے کا ذریعہ ہیں۔ صبر اور نماز سے مدد نہیں مانگنی بلکہ مدد اللہ تعالیٰ سے مانگنی ہے۔ جس کا سبق سورۃ فاتحہ میں دیا گیا ہے ﴿اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ﴾ ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں۔ بات اچھی طرح سمجھ لو غلط قسم کے لوگ بڑا دھوکہ دیتے ہیں۔

چنانچہ ایک بدعتی مولوی صاحب تقریر کر رہے تھے کہنے لگے دیکھو سنو! یہ وہابی کہتے ہیں کہ غیر اللہ سے مدد نہ مانگو۔ میں غیر اللہ سے مدد مانگنا قرآن سے ثابت کرتا ہوں۔ دیکھو! قرآن کہتا ہے ﴿وَاسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوۃِ﴾ مدد مانگو صبر سے اور مدد مانگو نماز سے۔ کیا صبر اور نماز غیر اللہ نہیں ہیں؟ تو غیر اللہ سے مدد مانگنا قرآن سے ثابت ہے۔ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰهِ

الْعَلِیِّ الْعَظِیْمِ۔

کیسادھوکہ دے رہاتھاکہ "حرفِ با" جوصبر پر داخل ہے اور نماز پر داخل ہے اس کوحلوا سمجھ کر کھا گیا۔ کیونکہ "با" کا معنٰی سبب اور ذریعہ ہے۔ اور معنٰی یہ ہے کہ مدد طلب کرو صبر اور نماز کے ذریعہ سے۔ اور مانگنی کس سے ہے؟ اللہ تعالیٰ سے۔

فرمایا ﴿وَ اِنَّهَا لَكَبِیْرَةٌ﴾ اور بے شک یہ نماز البتہ بھاری ہے ﴿اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِیْنَ﴾ مگران لوگوں پر جو عاجزی کرنے والے ہیں۔ جو رب تعالیٰ سے ڈرتے ہیں ان پر بھاری نہیں ہے۔

﴿الَّذِیْنَ یَظُنُّوْنَ﴾ عاجزی کرنے والے وہ ہیں جو یقین رکھتے ہیں ﴿اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ﴾ بے شک وہ ملاقات کرنے والے ہیں اپنے رب سے ﴿وَ اَنَّهُمْ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ﴾ اور بے شک وہ اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔ ایسے مومنوں پر نماز کوئی بھاری نہیں ہے۔

﴿یٰبَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ﴾ اے بنی اسرائیل ﴿اذْكُرُوْا نِعْمَتِیَ﴾ یاد کرو میری نعمتوں کو ﴿الَّتِیْۤ اَنْعَمْتُ عَلَیْكُمْ﴾ وہ (نعمتیں) جو میں نے تم پر انعام کیں ﴿وَ اَنِّیْ فَضَّلْتُكُمْ﴾ اور بے شک میں نے تمھیں فضیلت دی ﴿عَلَى الْعٰلَمِیْنَ﴾ جہان والوں پر ﴿وَ اتَّقُوْا یَوْمًا﴾ اور ڈرو اس دن سے ﴿لَّا تَجْزِیْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ﴾ نہیں کفایت کرے گا کوئی نفس کسی نفس سے ﴿شَیْــٴًـا﴾ کچھ بھی ﴿وَّ لَا یُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ﴾ اور نہ قبول کی جائے گی اس کی طرف سے سفارش ﴿وَّ لَا یُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ﴾ اور نہ لیا جائے گا اس کی طرف سے جرمانہ ﴿وَّ لَا هُمْ یُنْصَرُوْنَ﴾ اور نہ ان کی مدد کی جائے گی ﴿وَ اِذْ نَجَّیْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ﴾ اور جب ہم نے تم کو نجات دی فرعونیوں سے ﴿یَسُوْمُوْنَكُمْ﴾ جو چکھاتے تھے تمھیں ﴿سُوْٓءَ الْعَذَابِ﴾ برا عذاب ﴿یُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ﴾ ذبح کرتے تھے تمھارے بیٹوں کو ﴿وَ یَسْتَحْیُوْنَ نِسَآءَكُمْ﴾ اور زندہ چھوڑتے تھے تمھاری عورتوں کو ﴿وَ فِیْ ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ﴾ اور اس میں امتحان تھا ﴿مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِیْمٌ﴾ تمھارے رب کی طرف سے بڑا ﴿وَ اِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ﴾ اور جس وقت پھاڑا ہم نے تمھارے لیے سمندر کو ﴿فَاَنْجَیْنٰكُمْ﴾ پس ہم نے تمھیں نجات دی ﴿وَ اَغْرَقْنَاۤ اٰلَ فِرْعَوْنَ﴾ اور غرق کیا ہم نے فرعونیوں کو ﴿وَ اَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ﴾ اور تم دیکھ رہے تھے ﴿وَ اِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰۤى﴾ اور جس وقت ہم نے وعدہ کیا موسیٰ علیہ السلام سے ﴿اَرْبَعِیْنَ لَیْلَةً﴾ چالیس راتوں کا ﴿ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ﴾ پھر بنا لیا تم نے بچھڑے کو معبود ﴿مِنْۢ بَعْدِهٖ﴾ اس کے بعد ﴿وَ اَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ﴾ اور تم ظالم تھے ﴿ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ﴾ پھر ہم نے معاف کیا تم کو ﴿مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ﴾ اس کے بعد ﴿لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ﴾ تاکہ تم شکریہ ادا کرو ﴿وَ اِذْ اٰتَیْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ﴾ اور جب دی ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب

﴿وَالْفُرْقَانَ﴾ اور حق اور باطل کے درمیان فرق کرنے والی چیز ﴿لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ﴾ تاکہ تم ہدایت حاصل کرو۔

ربط

اس سے پہلے رکوع میں ﴿يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ﴾ کے ذکر میں، میں نے کہا تھا کہ یہ اجمال ہے اور آگے تفصیل آئے گی۔ یہاں سے ان نعمتوں کی تفصیل شروع ہو رہی ہے۔ کچھ اس رکوع میں اور کچھ اگلے رکوع میں۔

بنی اسرائیل کی فضیلت

پہلے بیان ہو چکا ہے کہ اسرائیل حضرت یعقوب علیہ السلام کا لقب تھا اور یہ عبرانی زبان کا لفظ ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ﴿يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ﴾ اے بنی اسرائیل ﴿اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ﴾ یاد کرو میری نعمتوں کو ﴿الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ﴾ وہ نعمتیں جو میں نے تم پر انعام کیں ﴿وَاَنِّيْ فَضَّلْتُكُمْ﴾ اور بے شک میں نے تمہیں فضیلت دی ﴿عَلَى الْعٰلَمِيْنَ﴾ جہان والوں پر۔ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو ظاہری نعمتیں بھی عطاء فرمائیں اور باطنی نعمتوں سے بھی مالا مال فرمایا۔

باطنی نعمتیں یہ کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد میں عیسیٰ علیہ السلام تک تقریباً چار ہزار پیغمبر مبعوث فرمائے۔ کسی قوم میں ایک پیغمبر آجائے تو ان کا سر فخر سے آسمان کے ساتھ جا لگتا ہے۔ اور جس قوم میں چار ہزار پیغمبر آئیں ان کے لیے یہ کتنے فخر کی بات ہے۔ پھر تین مشہور آسمانی کتابیں بھی اللہ تعالیٰ نے ان کو عطاء فرمائیں۔ تورات حضرت موسیٰ علیہ السلام، زبور حضرت داؤد علیہ السلام اور انجیل حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو۔

اور ظاہری نعمتیں یہ کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو بادشاہت بھی عطاء فرمائی۔ حضرت یوسف علیہ السلام یعقوب علیہ السلام کے حقیقی بیٹے تھے۔ پھر داؤد علیہ السلام خلیفۃ اللہ فی الارض ہوئے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے سلیمان علیہ السلام کو حکومت عطا فرمائی۔ ان کے علاوہ اور کئی نیک بادشاہ ان میں گزرے ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میری نعمتوں کو یاد کرو اور میری ان نعمتوں کا شکریہ ادا کرو۔

﴿وَاتَّقُوْا يَوْمًا﴾ اور ڈرو اس دن سے (مراد قیامت کا دن ہے)۔ ﴿لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ﴾ نہیں کفایت کرے گا کوئی نفس کسی نفس کی طرف سے کچھ بھی ﴿وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ﴾ اور نہ قبول کی جائے گی اس کی طرف سے سفارش ﴿وَّلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ﴾ اور نہ لیا جائے گا اس کی طرف سے جرمانہ ﴿وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ﴾ اور نہ ان کی مدد کی جائے گی۔ دیکھو! عادتاً جو آدمی گرفتار ہوتا ہے اسے عقلی طور پر چھڑانے کے چار طریقے ہیں۔

مجرم چھڑانے کے چار طریقے

①......ایک یہ کہ اس کا کوئی شخص ضامن بن جائے کہ یہ بھاگے گا نہیں میں اس کو عدالت میں پیش کروں گا یا جو کچھ اس کے ذمہ ہے رقم وغیرہ اس کی ضمانت دے کر چھڑا لے۔

②......دوسرا طریقہ یہ ہے کہ سفارش کے ذریعے چھڑا لیا جاتا ہے۔

③......تیسرا طریقہ یہ ہے کہ جرمانہ دے کر چھڑا لیا جاتا ہے۔

④......چوتھا طریقہ یہ ہے کہ ہلہ بول کر تھانے سے چھڑا لیا جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ قیامت والے دن ان میں سے کوئی طریقہ بھی کام نہیں آئے گا۔ نہ تو کوئی نفس کسی نفس کی طرف سے کفایت یعنی ضمانت دے سکے گا، نہ سفارش قبول کی جائے گی اور نہ جرمانہ لیا جائے گا اور نہ ہلہ بول کر کوئی چھڑا سکے گا۔

آگے ان انعامات کا ذکر ہے جو بنی اسرائیل پر مختلف اوقات اور مختلف زمانوں میں ہوئے۔

﴿وَاِذْ نَجَّيْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ﴾ اور جب ہم نے تم کو نجات دی فرعونیوں سے ﴿يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ﴾ جو چکھاتے تھے تمہیں برا عذاب ﴿يُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ﴾ ذبح کرتے تھے تمہارے بیٹوں کو ﴿وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ﴾ اور زندہ چھوڑتے تھے تمہاری عورتوں کو۔

"فرعون" کا معنیٰ اور منصب

"فرعون" عبرانی زبان کا لفظ ہے اس کا معنیٰ "بادشاہ اور صدر" ہے۔ اس وقت کے بادشاہ کا لقب فرعون ہوتا تھا۔ بہت سارے ایسے صدر اور فرعون گزرے ہیں نام ان کے مختلف تھے۔ یوسف علیہ السلام کے زمانے کے فرعون کا نام تھا "ریان بن ولید رحمۃ اللہ علیہ" یہ بڑا نیک آدمی تھا۔ اس نے اپنی مرضی اور خوشی سے حکومت چھوڑ دی تھی۔ حالانکہ حکومت چھوڑنا آسان بات نہیں ہے۔

آپ دیکھتے ہیں کہ جس کو کرسی سے اتار دیا جائے وہ کس طرح تڑپتا ہے اور مارا مارا پھرتا ہے جس طرح مچھلی کو پانی سے باہر پھینک دیا جائے تو وہ تڑپتی ہے۔ یہی حال معزول حکمرانوں کا ہوتا ہے۔ مگر اس اللہ کے بندے نے بہ خوشی و رضا تاج شاہی یوسف علیہ السلام کے سر پر رکھ دیا۔ اور موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں جو فرعون تھا اس کا نام تھا مصعب بن ولید۔ یہ بڑا ہوشیار اور چالاک آدمی تھا آج کل لیڈروں کی طرح کہ سب کچھ کر کے بھی بے گناہ ثابت ہوتے ہیں۔

فرعون کو نجومیوں نے بتایا کہ دو تین سالوں میں بنی اسرائیل میں ایک بچہ پیدا ہوگا جو تیری حکومت کے زوال کا باعث بنے گا وہ نجومی کبھی درست بات بھی کرتے تھے۔

چنانچہ فرعون نے عورتوں کا ایک الگ محکمہ قائم کیا اور ان کو ذمہ داری سونپی کہ بنی اسرائیل کی حاملہ عورتوں کی نگرانی کریں۔ بنی اسرائیل اس وقت کافی تعداد میں تھے۔ حاملہ عورتوں کی نگرانی سخت کر دی جاتی اگر بچی پیدا ہوتی تو اس کو کچھ نہیں کہتے تھے اگر بچہ ہوتا تو حکم ہوتا کہ اس کو قتل کر دو۔

①......شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ تفسیر عزیزی میں لکھتے ہیں۔ "بارہ ہزار بچے اس ظالم حکمران کے قانون سے ذبح ہوئے"۔

②...... علامہ بونی رحمۃ اللہ علیہ بڑے اولیاء اللہ میں سے ہوئے ہیں انہوں نے عملیات کے موضوع پر عربی زبان میں ایک کتاب لکھی ہے اس کا نام ہے شمس المعارف۔ یہ چار جلدوں میں ہے اور عملیات کی سب سے بڑی کتاب ہے۔ ان کی تحقیق کے مطابق ''ستر ہزار بچے قتل ہوئے''۔ لیکن بارہ ہزار تعداد بھی کوئی کم نہیں ہے۔ اور نوے ہزار ماؤں نے دیدہ دانستہ حمل گرادیئے کہ بچہ ہمارے سامنے ذبح ہوگا تو ہم سے گوارہ نہ ہوسکے گا۔

③...... اکبر الہ آبادی مرحوم بڑے طنز نگار شاعر تھے۔ طنز کے طور پر وہ بڑی بات سمجھا دیتے تھے۔ وہ کہتے ہیں ؎

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا
افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

مطلب یہ ہے کہ فرعون بچوں کو قتل کر کے بدنام ہوگیا کالج بنا کر ان کے ذہن بگاڑ دیتا کوئی پریشانی نہ اٹھانی پڑتی۔ کیونکہ کالج میں آسانی سے ذہن مسخ کئے جاتے ہیں۔ انگریز نے کالج کے ذریعے ہی مسلمان نسل کے ذہن بگاڑے ہیں۔

معاف رکھنا! حالات تمہارے سامنے ہیں۔ چند انگریزی خوانوں کو نکال کر کہ جنہوں نے انگریزی تعلیم کے ساتھ ساتھ دینی تعلیم کی طرف بھی توجہ دی ہے یہ تو مستثنیٰ ہیں اور جنہوں نے صرف انگریزی تعلیم حاصل کی ان کے ذہن صاف نہیں ہیں۔ وہ وہی بات کرتے ہیں جو انگریز کہتا ہے۔

خدائی تدبیر

بہر حال فرعون نے اپنی حکومت بچانے کے لیے بڑے بچے ذبح کروائے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت ظاہر فرمائی۔ جس کی تفصیل سولہویں پارہ میں ہے کہ جس بچے سے خطرہ تھا وہ اللہ تعالیٰ نے فرعون کے گھر پال کر دکھایا۔

حکایت مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ

مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ فرعون کی اس کارروائی کو مثال کے ذریعے سے سمجھاتے ہیں فرماتے ہیں: ''ایک آدمی بڑا مالدار تھا۔ اس کے پاس سونا، چاندی، جواہرات اور بڑے قیمتی ہیرے تھے۔ اور مکان اس کا قلعہ نما تھا۔ ڈاکوؤں نے مشورہ کیا کہ اس کے لوٹنے کا کیا طریقہ ہوسکتا ہے کہ نہ تو دروازے توڑ سکتے ہیں اور نہ ہی دیوار پھلانگ کر اندر جا سکتے ہیں۔ طے یہ پایا کہ دن کو جب دروازہ کھلا ہو ایک ہلکا پھلکا سا آدمی اندر چلا جائے اور کسی حصے میں پلنگ وغیرہ کے نیچے چھپ جائے۔ رات کو فلاں وقت اندر سے کنڈی کھول دے ہم اندر داخل ہو جائیں گے۔

چنانچہ ایک پھرتیلے جسم کا چور اندر داخل ہوا اور کہیں چھپ گیا رات کو اس نے اٹھ کر باہر والے دروازے کی کنڈی کھول دی صاحب خانہ کو کنڈی کھلنے کی آواز آئی اس نے محسوس کیا کہ گھر میں کوئی ہے وہ جلدی سے اٹھا اور کنڈی لگا دی۔ حالانکہ چور اندر ہی تھا مگر اس نے سمجھا کہ نکل گیا ہے''۔

در بہ بست و دزد اندر خانہ بود
حیلہ فرعون زیں افسانہ بود

"دروازہ بند کردیا حالانکہ چور اندر ہے اسی لیے فرعون کی تدبیر ایک کہانی بن گئی کامیاب نہ ہوسکی۔"

اے ظالم! تو نے بارہ ہزار بچے ذبح کروائے اور جس نے تیرا بیڑا اغرق کرنا ہے وہ تیرے گھر میں پرورش پا رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کہا میں تیرے گھر پال کر دکھاؤں گا۔ مکمل تیس سال تک موسیٰ علیہ السلام فرعون کے گھر پلتے رہے۔ بچوں کو ذبح کرتا اور عورتوں کو زندہ چھوڑتا۔

فرمایا: ﴿وَفِیْ ذٰلِکُمْ بَلَآءٌ﴾ اور اس میں امتحان تھا ﴿مِّنْ رَّبِّکُمْ عَظِیْمٌ﴾ تمہارے رب کی طرف سے بڑا۔

بنی اسرائیل کی نجات

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ تم اپنے بھائی ہارون علیہ السلام اور ان ساتھیوں کو جو ہزاروں کی تعداد میں مرد عورتیں اور بچے تھے لے کر یہاں سے ہجرت کر کے چلے جاؤ۔ اور فلسطین میں جا کر رہو۔ بنی اسرائیلی جتنا سامان اٹھا سکتے تھے وہ لے لیا اور رات کو یہاں سے نکل گئے۔ اتنی مخلوق جب اکٹھی نکلتی ہے تو شور تو ہوتا ہے فرعون اور اس کے وزیر اعظم ہامان کو جب پتہ چلا تو انہوں نے ہنگامی حالات کا اعلان کر دیا۔ فرعون اپنی فوج لے کر ان کے تعاقب میں نکل پڑا۔ بنی اسرائیلی سحری کے وقت دریا قلزم کے قریب پہنچے جو خاصا گہرا تھا۔ پیچھے فرعون کی فوجیں بھی ڈھول بجاتی، گانے گاتی، اچھلتی کودتی پہنچ گئیں۔ بنی اسرائیلی فرعون کی فوجوں کو دیکھ کر پریشان ہو گئے۔ اور موسیٰ علیہ السلام کو کہا کہ اب ہم کیا کریں گے پیچھے فرعون ہے اور آگے دریا ہے؟

موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: ﴿اِنَّ مَعِیَ رَبِّیْ سَیَهْدِیْنِ ﴾ (الشعراء) بے شک میرے ساتھ میرا رب ہے وہ میری راہنمائی فرمائے گا۔ اور حفاظت فرمائے گا۔ چنانچہ رب تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ تو اپنی لاٹھی دریا میں مار۔ جب موسیٰ علیہ السلام نے لاٹھی دریا پر ماری تو رب تعالیٰ نے بارہ راستے بنا دیے۔

﴿فَکَانَ کُلُّ فِرْقٍ کَالطَّوْدِ الْعَظِیْمِ ﴾ (الشعراء) وہ پانی اس طرح کھڑا ہو گیا جس طرح دیواریں ہوتی ہیں۔ راستے بالکل خشک ہو گئے۔ بلکہ بعض تفسیروں میں آتا ہے کہ پانی کی دیواروں میں کھڑکیاں لگا دی گئیں۔ تا کہ ایک دوسرے کو دیکھتے جائیں کہ وہ بھی جا رہے ہیں۔ رب تعالیٰ کی قدرت سے کچھ بھی بعید نہیں ہے۔ وہ سب کچھ کر سکتا ہے موسیٰ علیہ السلام اور ان کے ساتھی دریا پار کر کے دوسرے کنارے پر پہنچ گئے۔

فرعون کی غرقابی

فرعون بھی اپنی فوج کے ساتھ پہنچ گیا اور اپنے وزیر اعظم ہامان کو کہا کہ تو فوج کے آگے چل اور میں پیچھے رہوں گا۔ اور

دریا میں داخل ہو جاؤ۔ اور ان کا تعاقب کرو۔ جب وہ تمام کے تمام دریا میں داخل ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے دریا کو حکم دیا کہ تو جاری ہو جا۔ سارے جہنم رسید ہوئے۔ اور فرعون جب غرق ہونے لگا تو اس نے بڑا واویلا کیا اور کہا: ﴿اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِيْٓ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْٓا اِسْرَآءِيْلَ﴾ [سورۃ یونس] میں ایمان لایا کہ بے شک اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے ہیں۔

جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿آٰلْـٰٔنَ وَقَدْ عَصَيْتَ قَبْلُ﴾ اب ایمان لاتا ہے حالانکہ پہلے تو انکار کرتا تھا اور اکڑتا تھا۔ اب یہ کریں گے کہ ﴿فَالْيَوْمَ نُنَجِّيْكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُوْنَ لِمَنْ خَلْفَكَ اٰيَةً﴾ آج ہم تیرا وجود دریا سے نکال کر باہر پھینک دیں گے تا کہ پچھلے لوگ دیکھیں کہ یہ تھا جو کہتا تھا ﴿اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى﴾ میں تمہارا رَبُّ الاعلیٰ یعنی ''سب سے بڑا رب'' ہوں۔ اب ناک سے پانی بہہ رہا ہے اور بھی جہاں جہاں سے بہتا تھا بہہ رہا ہے۔

آج تک اس کی لاش مصر کے عجائب گھر میں پڑی ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی کئی فرعونوں کی لاشیں پڑی ہیں۔ اس واقعہ کو اللہ تعالیٰ بیان فرماتے ہیں: ﴿وَ اِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ﴾ اور جس وقت پھاڑا ہم نے تمہارے لیے سمندر کو ﴿فَاَنْجَيْنٰكُمْ﴾ پس ہم نے تمہیں نجات دی ﴿وَاَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ﴾ اور غرق کیا ہم نے فرعونیوں کو ﴿وَ اَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ﴾ اور تم یہ سارا نقشہ دیکھ رہے تھے۔

صحرائے سینا

دریا پار کر کے موسیٰ علیہ السلام قوم کو لے کر جب وادی تیہ میں پہنچے جس کو آج کل کے جغرافیے میں ''وادی سینائی'' کہتے ہیں۔ اس کی لمبائی چھتیس میل اور چوڑائی چوبیس میل ہے۔ اور سطح سمندر سے تقریباً پانچ ہزار فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔

اس پر ۱۹۶۷ء کی جنگ میں یہودیوں نے قبضہ کر لیا تھا پھر مصر نے جنگ لڑ کر اس کا کچھ حصہ حاصل کیا۔ لیکن وہ حصہ جس میں تیل ہے اور فوجی اہمیت کا حامل ہے وہ آج تک اسرائیل کے قبضہ میں ہے۔ بہر حال حضرت موسیٰ علیہ السلام جب وادی تیہ میں پہنچے تو قوم نے کہا اے موسیٰ! کوئی قوم آئین کے بغیر وقت پاس نہیں کر سکتی۔ اور ضابطے اور قانون کے بغیر دنیا میں امن قائم نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ سے کوئی کتاب لا کر دو تا کہ ہم اس کے مطابق وقت گزاریں۔ چنانچہ موسیٰ علیہ السلام کوہِ طور پر تشریف لے گئے۔ پہلے تیس راتیں، پھر بڑھا کر چالیس راتیں کر دی گئیں۔ چالیس راتوں کے اعتکاف کے بعد موسیٰ علیہ السلام کو کتاب دے دی گئی۔ لیکن اس دوران پیچھے قوم میں ایک واقعہ پیش آ گیا۔

سامری کی کارستانی

ہوا اس طرح کہ موسیٰ علیہ السلام کی قوم میں ایک آدمی تھا جس کا نام ''موسیٰ بن ظفر'' تھا۔ یہ قبیلہ سامرہ سے تعلق رکھتا تھا اور سامرہ قبیلہ بھی حضرت یعقوب علیہ السلام کی نسل سے تھا۔ یہ آدمی منافق تھا۔ اس نے سونے چاندی کا ایک بچھڑا بنایا اور حضرت جبریل علیہ السلام کے گھوڑے کے قدموں کی مٹی جو اس نے اٹھائی ہوئی تھی وہ مٹی اس بچھڑے میں ڈالی تو اس بچھڑے نے ٹیں ٹیں کی

آواز نکالنی شروع کردی۔ سامری نے لوگوں کو کہا کہ بچھڑے کے اندر جو ٹیں کر رہا ہے یہ رب ہے۔ بے وقوف لوگوں نے اس کی پوجا شروع کردی۔ قرآن کریم میں ہے کہ موسیٰ علیہ السلام جب واپس تشریف لائے تو حضرت ہارون علیہ السلام سے غصے ہوئے ان کی ڈاڑھی پکڑی سر کے بال پکڑے اور کہا کہ تم نے لوگوں کی اصلاح کیوں نہیں کی؟ انھوں نے کہا ﴿ابْنَ أُمَّ﴾ اے میری ماں کے بیٹے! میری داڑھی اور سر کے بال نہ پکڑو میں نے قوم کو یہاں تک سمجھایا کہ ﴿كَادُوا يَقْتُلُونَنِي﴾ [الاعراف:۱۵۰] قریب تھا کہ مجھے قتل کر دیتے۔ اس کا ذکر ہے۔

موسیٰ علیہ السلام طور پر

فرمایا ﴿وَإِذْ وٰعَدْنَا مُوسٰى﴾ اور جس وقت ہم نے وعدہ کیا موسیٰ علیہ السلام سے ﴿أَرْبَعِينَ لَيْلَةً﴾ چالیس راتوں کا۔ پہلے تیس راتوں کا وعدہ تھا پھر دس کا اضافہ ہوا۔ ﴿فَتَمَّ مِيقَاتُ رَبِّهِ أَرْبَعِينَ لَيْلَةً﴾ [الاعراف:۱۴۲] پس چالیس راتیں پوری کیں۔ روزانہ ایک تختی ملتی تھی۔ اور یہ تختیاں تیس راتوں کے بعد ملنا شروع ہوئیں۔ کل دس تختیاں تھیں۔ پھر تم نے کیا کیا۔

فرمایا ﴿ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ﴾ پھر بنا لیا تم نے بچھڑے کو معبود ﴿مِنْ بَعْدِهٖ﴾ ان کے جانے کے بعد ﴿وَأَنْتُمْ ظٰلِمُونَ﴾ اور تم ظالم تھے۔ کہ جس رب کی تم نے اتنی نعمتیں دیکھیں اس کو چھوڑ کر صرف بچھڑے کی ٹیں، ٹیں کے پیچھے لگ گئے۔ لوگ شعبدہ بازی اور کرشمے دیکھ کر پیچھے لگ جاتے ہیں اور کچھ سوچتے سمجھتے نہیں ہیں۔

"دجال" اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئی

چنانچہ جب دجال آئے گا اور وہ رب ہونے کا دعویٰ کرے گا۔ لوگ اسے کہیں گے کہ اگر تو رب ہے تو بارش برسا کیونکہ بارش نہیں ہو رہی تو وہ مسمریزم اور جادو کے ذریعے مصنوعی بادل اکٹھے کرے گا اور بارش برسائے گا۔ لوگ کہیں گے واقعی یہ سچا رب ہے۔ کچھ لوگ اس کو کہیں گے ہم بڑے غریب ہیں بھوکے ہیں ہمیں مال چاہیے۔ وہ زمین پر، پاؤں مارے گا زمین سے سونا، چاندی نکل آئے گا۔ لوگ اس کے پیچھے چل پڑیں گے۔ دنیا داروں کو اور کیا چاہیے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں تمھیں ایک علامت بتاتا ہوں کہ دجال أَعْوَرُ یعنی کانا ہوگا وَإِنَّ رَبَّكُمْ لَيْسَ بِأَعْوَرَ اور بے شک تمھارا رب کانا نہیں ہے۔

تو بنی اسرائیل نے بچھڑے کو معبود بنا لیا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ﴿ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ﴾ پھر ہم نے معاف کیا تم کو ﴿مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ﴾ اس کے بعد ﴿لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ﴾ تاکہ تم شکریہ ادا کرو ﴿وَإِذْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتٰبَ﴾ اور جب دی ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب تورات، جس کا تمام آسمانی کتابوں میں قرآنِ کریم کے بعد بہت بلند مقام ہے اور بڑی جامع کتاب ہے۔

﴿وَالْفُرْقَانَ﴾ اور معجزے دیے جن کے ذریعے حق اور باطل کے درمیان فرق ہوتا تھا۔ بہت سارے معجزے تھے۔ ان میں سے ایک وہ عصا مبارک بھی تھا کہ جب اس کو پھینکتے تھے تو وہ اژدھا بن جاتا تھا اور مقابلے میں آنے والے جادوگروں کے سارے سانپوں کو نگل جاتا تھا۔ پھر جب اس کو ہاتھ لگاتے تھے وہ عصا ہو جاتا تھا۔ ﴿فَوَقَعَ الْحَقُّ وَبَطَلَ مَا كَانُوْا

یَعْمَلُوْنَ ﴾ [الاعراف:۱۱۸] اللہ تعالیٰ نے ان معجزات کے ذریعے حق کو ظاہر کیا اور ان کی کارروائی کو باطل کیا۔ ﴿ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴾ تاکہ تم ہدایت حاصل کرو۔

﴿ وَ اِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ ﴾ اور جب کہا موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے ﴿ يٰقَوْمِ ﴾ اے میری قوم! ﴿ اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ ﴾ بے شک تم نے ظلم کیا اپنی جانوں پر ﴿ بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ ﴾ بہ وجہ بنا لینے بچھڑے کو معبود ﴿ فَتُوْبُوْۤا اِلٰى بَارِئِكُمْ ﴾ پس توبہ کرو اپنے پیدا کرنے والے کی طرف ﴿ فَاقْتُلُوْۤا اَنْفُسَكُمْ ﴾ پس قتل کرو تم اپنی جانوں کو ﴿ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ ﴾ یہ بہتر ہے تمہارے حق میں ﴿ عِنْدَ بَارِئِكُمْ ﴾ تمہارے پیدا کرنے والے کے ہاں ﴿ فَتَابَ عَلَيْكُمْ ﴾ پس اللہ تعالیٰ نے تمہاری طرف رجوع کیا ﴿ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴾ بے شک وہ توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے ﴿ وَ اِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى ﴾ اور جب کہا تم نے اے موسیٰ (علیہ السلام)! ﴿ لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ ﴾ ہم ہرگز تیری تصدیق نہیں کریں گے ﴿ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً ﴾ یہاں تک کہ ہم دیکھ لیں اللہ تعالیٰ کو کھلے طور پر ﴿ فَاَخَذَتْكُمُ الصّٰعِقَةُ ﴾ پس پکڑ لیا تمہیں بجلی نے ﴿ وَ اَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ﴾ اور تم دیکھ رہے تھے ﴿ ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ ﴾ پھر ہم نے تمہیں زندہ کیا ﴿ مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ ﴾ تمہارے مرنے کے بعد ﴿ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴾ تاکہ تم شکر ادا کرو ﴿ وَ ظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ ﴾ اور سایہ کیا ہم نے تم پر بادلوں کا ﴿ وَ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَ السَّلْوٰى ﴾ اور نازل کی ہم نے تم پر کھیر اور بٹیرے ﴿ كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ ﴾ کھاؤ ان پاکیزہ چیزوں سے جو ہم نے تمہیں رزق دیا ﴿ وَ مَا ظَلَمُوْنَا ﴾ اور انہوں نے ہم پر کوئی زیادتی نہیں کی ﴿ وَ لٰكِنْ كَانُوْۤا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴾ اور لیکن وہ اپنی جانوں پر ظلم کرتے تھے ﴿ وَ اِذْ قُلْنَا ﴾ اور جب کہا ہم نے ﴿ ادْخُلُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ ﴾ داخل ہو جاؤ اس بستی میں ﴿ فَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا ﴾ پس کھاؤ اس میں سے جہاں سے چاہو کشادہ ﴿ وَّ ادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا ﴾ اور داخل ہو جاؤ دروازے سے سجدہ کرتے ہوئے ﴿ وَّ قُوْلُوْا حِطَّةٌ ﴾ اور کہو تم ﴿ حِطَّةٌ ﴾ یعنی ہمارے گناہ گرا دے ﴿ نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطٰيٰكُمْ ﴾ معاف کر دیں گے ہم تمہاری خطائیں ﴿ وَ سَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ ﴾ اور ہم زیادہ دیں گے نیکی کرنے والوں کو ﴿ فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا قَوْلًا ﴾ پس تبدیل کر لیا ان لوگوں نے جنہوں نے ظلم کیا بات کو ﴿ غَيْرَ الَّذِيْ قِيْلَ لَهُمْ ﴾ سوائے اس کے جو ان کو کہی گئی تھی ﴿ فَاَنْزَلْنَا عَلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ﴾ پس نازل کیا ہم نے ان لوگوں پر جنہوں نے ظلم کیا ﴿ رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ ﴾ عذاب آسمان کی طرف سے ﴿ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ﴾ اس لیے کہ وہ نافرمانی کرتے تھے۔

ربط

حضرت موسیٰ عَلَیْہِ السَّلَام کی قوم کا ذکر چلا آ رہا ہے۔ حضرت موسیٰ عَلَیْہِ السَّلَام کوہِ طور سے توراۃ لے کر جب واپس تشریف لائے اور دیکھا کہ قوم نے بچھڑے کو معبود بنالیا ہے۔ اور اس کی پرستش کر رہے ہیں۔ پہلے تو حضرت ہارون عَلَیْہِ السَّلَام پر ناراض ہوئے کہ تم نے ان کو اطلاع کیوں نہیں کی اور تمہارے ہوتے ہوئے یہ کیوں گمراہ ہوئے ہیں؟ جب پوری طرح مطمئن ہو گئے کہ ہارون عَلَیْہِ السَّلَام نے اپنی ذمہ داری پوری طرح ادا کی ہے اور اس میں کسی قسم کی کوئی کوتاہی نہیں کی تو پھر قوم کی طرف متوجہ ہوئے۔ اس کا ذکر ہے۔

بچھڑے کی پوجا، توبہ اور قتل

﴿وَاِذْ قَالَ مُوْسٰی لِقَوْمِهٖ﴾ اور جب کہا موسیٰ عَلَیْہِ السَّلَام نے اپنی قوم سے ﴿يٰقَوْمِ﴾ اے میری قوم! ﴿اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ﴾ بے شک تم نے ظلم کیا اپنی جانوں پر۔ کیوں کہ اس کارروائی کا وبال تمہاری جانوں پر پڑے گا ﴿بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ﴾ جو تم نے بچھڑے کو معبود بنا کر ظلم کا ارتکاب کیا ہے۔ اگر تم اپنی آخرت سنوارنا چاہتے ہو تو ﴿فَتُوْبُوْٓا اِلٰى بَارِىِٕكُمْ﴾ تو، توبہ کرو اپنے پیدا کرنے والے کی طرف ﴿فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ﴾ پس قتل کرو تم اپنی جانوں کو۔ (اس کی مختلف تفاسیر درج ذیل ہیں)

①...... اس کی ایک تفسیر تو اس طرح بیان کی گئی ہے کہ ہر مجرم کو حکم تھا کہ وہ اپنے آپ کو خود قتل کرے۔

②...... اور دوسری تفسیر یہ نقل کی گئی ہے کہ جن لوگوں نے بچھڑے کی پوجا نہیں کی تھی وہ ان کو قتل کریں جنہوں نے پوجا کی۔ اور طریقہ یہ ہوگا کہ اگر ایک بھائی نے پوجا کی ہے اور دوسرے نے نہیں کی تو جس نے پوجا نہیں کی وہ اس کو قتل کرے جس نے پوجا کی ہے۔ اگر باپ نے پوجا کی ہے اور بیٹے نے نہیں کی تو بیٹے کو حکم تھا کہ باپ کو قتل کر۔ اور اگر بیٹے نے پوجا کی ہے اور باپ نے نہیں کی تو باپ کو حکم تھا کہ بیٹے کو قتل کر۔ تو اس طرح انہوں نے اپنی جانوں کو قتل کیا۔

اس زمانے میں مرتد کی توبہ قتل کے بغیر قبول نہیں ہوتی تھی۔ یہ تو آنحضرت صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے اس امت کو سہولت دی، نرمی فرمائی کہ مرتد کو تین دن کی مہلت ہے اگر توبہ کرے تو فبہا چھوڑ دیا جائے گا اگر توبہ نہیں کرتا اور کفر پر مُصر رہتا ہے تو تین دن کے بعد قتل کر دیا جائے گا۔

فرمایا اس طرح توبہ کرنا ﴿ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ﴾ یہ بہتر ہے تمہارے حق میں ﴿عِنْدَ بَارِىِٕكُمْ﴾ تمہارے پیدا کرنے والے کے ہاں۔ چنانچہ اسی طرح ہوا کہ انہوں نے گردنیں کٹوا کر اپنی آخرت بنالی ﴿فَتَابَ عَلَيْكُمْ﴾ پس اللہ تعالیٰ نے تمہاری طرف رجوع کیا ﴿اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ﴾ بے شک وہ توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے۔

بنی اسرائیل کا توراۃ پر ردِّ عمل

آگے ایک اور واقعہ کا بیان ہے۔ موسیٰ عَلَیْہِ السَّلَام توراۃ لے کر قوم کے پاس آئے اور بچوں، بوڑھوں، جوانوں اور عورتوں کو

اکٹھا کیا۔ تمام کے تمام اکٹھے ہوگئے۔ بڑا مجمع تھا۔ موسیٰ علیہ السلام نے ان کو بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے یہ ضابطہ حیات عطا کیا ہے۔ قوم نے کہا کہ ہمیں پڑھ کر سنائیے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ساری توراۃ پڑھ کر ان کو سنادی۔ تو قوم نے کہا کہ یہ کتاب بہت سخت ہے اور اس کے احکام بہت مشکل ہیں۔ ہم اس پر عمل نہیں کر سکتے۔ اس کو تم واپس اللہ تعالیٰ کے پاس لے جاؤ اور اس کے بدلے کوئی آسان کتاب لاؤ یا اس میں ترامیم کرادو۔

موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ تم نے شریعت سے آزاد زندگی گزاری ہے۔ اور آزاد زندگی گزارنے والے پر جب کچھ پابندیاں لگتی ہیں تو اس کو خاصی مشکل ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ایسا کوئی حکم نہیں دیا جو تمہاری طاقت سے باہر ہو۔ ان احکامات پر جب عمل شروع کروگے تو آسان ہوجائیں گے۔ مشکل اس لیے نظر آرہے ہیں کہ پہلے تم نے یہ کیے نہیں ہیں۔

اس کی مثال اس طرح سمجھو کہ جو حضرات نماز پڑھتے ہیں ان کو نماز پڑھنے میں کوئی دقت نہیں ہوتی۔ اور جو بے نماز ہیں ان کے لیے نماز پڑھنا پہاڑ اٹھانے کے برابر ہے۔ کیونکہ انہوں نے کبھی پڑھی نہیں ہے۔ بہر حال موسیٰ علیہ السلام نے ان کو سمجھایا مگر وہ کہنے لگے کہ اللہ تعالیٰ سے درخواست کرنے میں تو کوئی حرج نہیں ہے؟

اور یہ بات بھی انہوں نے کہی کہ ہمارے پاس کیا ثبوت ہے کہ واقعی یہ کتاب اللہ تعالیٰ نے آپ کو دی ہے یا آپ خود بنا کر لائے ہیں۔ تو موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کے ستر آدمی منتخب فرمائے۔ جو کہ سردار تھے کہ تم میرے ساتھ کوہِ طور پر چلو تا کہ تمہیں معلوم ہوجائے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے اور میں تمہارے سامنے درخواست کروں گا کہ اے پروردگا! میری قوم کہتی ہے کہ یہ کتاب بہت مشکل ہے لہٰذا اس میں ان کی خواہش کے مطابق ترمیم کردیں۔

بنی اسرائیل کے نمائندے طور پر

چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ستر آدمی ساتھ لے کر کوہِ طور پر تشریف لے گئے اور اللہ تعالیٰ سے درخواست کی کہ اے پروردگار! تو قادرِ مطلق ہے جو چاہے کرسکتا ہے مشکل حکم بھی دے سکتا ہے اور آسان حکم بھی دے سکتا ہے۔ میری قوم کا مطالبہ ہے کہ اس کتاب کے بدلے ہمیں کوئی آسان کتاب مل جائے یا اس میں کچھ ترمیم ہوجائے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں نے ایسا کوئی حکم نہیں دیا جو تمہاری طاقت سے باہر ہو۔ لہٰذا اس پر عمل کرو اور اگر بمقتضائے بشریت تم سے کوئی غلطی ہوگئی تو میں تمہیں معاف کردوں گا۔

اللہ تعالیٰ کو دیکھنے کا مطالبہ

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ان کی قوم کے جو سردار گئے تھے یہ باتیں سننے کے بعد کہنے لگے کہ آواز تو آرہی ہے مگر ہمیں کیا معلوم کہ رب بول رہا ہے یا جن بول رہا ہے یا کوئی فرشتہ بول رہا ہے۔ لہٰذا ہم تو ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ جب تک رب تعالیٰ کو آنکھوں سے دیکھ نہ لیں۔ اس کا ذکر ہے۔

فرمایا ﴿وَ اِذْ قُلْتُمْ یٰمُوْسٰی﴾ اور جب کہا تم نے اے موسیٰ (علیہ السلام)! ﴿لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ﴾ ہم ہرگز تیری تصدیق نہیں کریں گے ﴿حَتّٰی نَرَی اللّٰهَ جَهْرَةً﴾ یہاں تک کہ ہم دیکھ لیں اللہ تعالیٰ کو کھلے طور پر ﴿فَاَخَذَتْكُمُ الصّٰعِقَةُ﴾ پس پکڑ لیا تمہیں بجلی نے ﴿وَ اَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ﴾ اور تم دیکھ رہے تھے۔ ان کی گستاخی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان پر بجلی گرادی۔ ستر کے ستر مارے گئے۔ نویں پارے میں آتا ہے موسیٰ علیہ السلام نے کہا پروردگار!

﴿اَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ السُّفَهَآءُ مِنَّا﴾ کیا ہمیں ہلاک کردے گا اس کام کی وجہ سے جو کیا ہمارے احمقوں نے۔ یا اللہ! یہ سب تو بے وقوف تھے ان کو تو میں لایا تھا اپنی تائید کے لیے اب جب میں اکیلا واپس جاؤں گا تو میں قوم کو کیا جواب دوں گا؟ ﴿اِنْ هِیَ اِلَّا فِتْنَتُكَ﴾ یہ سب تیری آزمائش ہے۔ یا اللہ! تو مارنے پر بھی قادر ہے اور زندہ کرنے پر بھی قادر ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے وہ ستر کے ستر باوجود اس گستاخی کے زندہ فرمادیے۔

موت اور پھر زندگی

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ﴾ پھر ہم نے تمہیں زندہ کیا ﴿مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ﴾ تمہارے مرنے کے بعد ﴿لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ﴾ تاکہ تم شکر ادا کرو۔ یہ لوگ جب واپس قوم کے پاس آئے تو کہنے لگے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا کہ عمل ہو سکے تو کرلینا اور نہ ہو سکے تو نہ کرنا میں معاف کردوں گا۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے تو کہا تھا کہ اگر بہ تقاضائے بشریت کوئی غلطی ہوئی تو میں معاف کردوں گا۔

﴿یُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ﴾ کا ذکر آتا ہے۔ کہ وہ اللہ تعالیٰ کے کلام کو بدل دیتے تھے وہ اس طرح بدلتے تھے مگر ان کی تمام تر گستاخیوں کے باوجود اللہ تعالیٰ نے ان کو انعامات سے نوازا۔ آگے ان انعامات کا ذکر ہے۔

بادلوں کا سایہ

فرمایا ﴿وَ ظَلَّلْنَا عَلَیْكُمُ الْغَمَامَ﴾ اور سایہ کیا ہم نے تم پر بادلوں کا۔ بنی اسرائیل جب بحر قلزم عبور کر کے وادی تیہ میں پہنچے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم آیا کہ اے بنی اسرائیل! تم قابض قوم عمالقہ جو عملیق نامی ایک شخص کی نسل سے تھے، بڑے قد آور، موٹے تازے صحت منداور جنگجو تھے، ان سے جہاد کرو تاکہ شام اور فلسطین کی زمین تمہارے قبضے میں دے دی جائے۔ بڑا طویل قصہ ہے چھٹے پارے میں اس کی تفصیل آئے گی۔

انکار جہاد اور اس کا انجام

ان لوگوں نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا ﴿اِنَّ فِیْهَا قَوْمًا جَبَّارِیْنَ﴾ بے شک اس سرزمین میں ایک زبردست، جبار قوم ہے ﴿وَ اِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَا حَتّٰی یَخْرُجُوْا مِنْهَا﴾ اور بے شک ہم ہرگز داخل نہیں ہوں گے اس میں جب تک کہ وہ یہاں سے نکل نہ جائیں ﴿فَاِنْ یَّخْرُجُوْا مِنْهَا فَاِنَّا دٰخِلُوْنَ﴾ [المائدہ: ۲۲] پس اگر وہ وہاں سے نکل جائیں تو ہم (فاتحانہ انداز میں) داخل ہوں گے۔

اور انہوں نے موسیٰ علیہ السلام کو یہ بھی کہا کہ ﴿فَاذْهَبْ اَنْتَ وَ رَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ﴾ [المائدہ:۲۴] تو جا اور تیرا رب پس تم دونوں جا کے لڑو ہم تو یہیں بیٹھے رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے چالیس سال تک اس میدان سے نکلنا ان پر حرام کر دیا اور یہ ہزاروں کی تعداد میں تھے بوڑھے، بچے، جوان، مرد، عورتیں سب ان میں شامل تھے۔ اور چالیس سال وہاں رہنا تھا۔

میدان ایسا تھا کہ اس میں کوئی قابل ذکر سایہ دار درخت نہیں تھا کوئی معمولی قسم کا درخت ہو تو ہو۔ اور دھوپ وہاں شدید پڑتی تھی۔ مکان بھی وہاں نہیں بنا سکتے تھے اور باہر سے کوئی چیز لا کر سائے کا انتظام بھی نہیں کر سکتے تھے۔ کیونکہ وہاں سے باہر جانے کی اجازت نہیں تھی۔ اللہ تعالیٰ کی مدد شاملِ حال ہوئی۔ اور بادلوں کے ذریعے ان کے لیے سائے کا انتظام فرمایا جونہی سورج چڑھتا سایہ ہو جاتا سورج غروب ہوتا سایہ ختم ہو جاتا قوم کے جرم دیکھو اور اللہ تعالیٰ کی رحمت دیکھو۔ اسی لیے آتا ہے:

﴿وَرَحْمَتِیْ وَسِعَتْ كُلَّ شَیْءٍ﴾ [الاعراف:۱۵۶] اور میری رحمت ہر شے پر وسیع ہے۔ ایک دو دن کی بات نہیں پورے چالیس سال ان پر سایہ رہا۔ وہاں خوراک کی بھی ضرورت تھی کیونکہ انسان عالمِ اسباب میں اس کے بغیر بھی زندہ نہیں رہ سکتا اللہ تعالیٰ نے خوراک کا بھی انتظام کیا۔ اس کا ذکر ہے۔

من وسلویٰ کا نزول

﴿وَاَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى﴾ اور نازل کی ہم نے تم پر کھیر اور بٹیرے۔ کیسے؟

①...... تفسیر کی کتابوں میں اس کی ایک شکل یہ لکھی ہے کہ عین موقع پر ان کے سامنے ایک رکابی (پلیٹ) میں کھیر اور ایک رکابی (پلیٹ) میں بھنے ہوئے بٹیر آ جاتے تھے۔ جتنا جی چاہے اتنا کھا لیں اور اللہ تعالیٰ کی قدرت سے کوئی شئ بعید نہیں ہے عموماً کھانے دو طرح کے ہوتے ہیں نمکین اور میٹھے۔ اللہ تعالیٰ نے دونوں قسم کے کھانوں کا انتظام فرمایا۔

②...... اور بعض مفسرین کرام رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ تیار ہو کے نہیں آتے تھے بلکہ چھوٹی چھوٹی جھاڑیاں تھیں جن کے پتے چوڑے تھے رات کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی چیز برستی تھی جس کی تہہ ان پتوں پر جم جاتی تھی یہ تھی وہ کھیر جو ان کو بطور خوراک کے ملتی تھی۔ یہ اعضاء کے لیے بڑی طاقت بخش تھی۔ اس کو اس طرح سمجھو کہ جس طرح پہاڑی علاقوں میں برف باری ہوتی ہے تو اس کی تہہ جم جاتی ہے اور بٹیر بھی انہیں جھاڑیوں میں ہوتے تھے۔ جن کو یہ آسانی سے پکڑ کر کھاتے تھے۔ اور پانی کا ذکر اگلے رکوع میں آ رہا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان پر ''من وسلویٰ'' نازل کیا۔

اور فرمایا ﴿كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ﴾ کھاؤ ان پاکیزہ چیزوں سے جو ہم نے تمہیں رزق دیا ہے ﴿وَمَا ظَلَمُوْنَا﴾ اور انہوں نے ہم پر کوئی زیادتی نہیں کی ﴿وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ﴾ اور لیکن وہ اپنی جانوں پر ظلم کرتے تھے۔ کہ انہوں نے ''من وسلویٰ'' کے بدلے پیاز، لہسن اور دالیں مانگیں۔ رب تعالیٰ نے فرمایا کیا تم بدلتے ہو عمدہ چیزوں کے بدلے گھٹیا؟ کہنے لگے ہمیں گھٹیا ہی چاہیے۔

حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام کی وفات اور جائے مدفن

آگے بنی اسرائیل کے ایک اور واقعہ کا ذکر ہے اور یہ واقعہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام کی وفات کے بعد پیش آیا۔ حضرت ہارون علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام سے تین سال پہلے فوت ہوئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کا جب وقت آیا تو انہوں نے پروردگار سے دعا کی کہ اے پروردگار! مجھے وادی تیہ (وادئ سینائی) سے بیت المقدس کی طرف جانے کی اجازت دی جائے تاکہ میری موت بیت المقدس کے قریب آئے۔ اور میں ان مجرموں میں نہ رہوں۔ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی دعا قبول فرمائی اور یہ بیت المقدس کی طرف چل پڑے۔ ایک سرخ رنگ کا ٹیلا تھا جب وہاں پہنچے تو روح قبض کی گئی۔ اور وہیں ان کی قبر بنی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضرت یوشع بن نون علیہ السلام کو نبی بنایا۔ یہ یوشع بن نون علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خادم تھے اور تفسیروں میں مذکور ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام سے ملاقات کے سفر میں موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ تھے۔ اور مچھلی انہی کے پاس تھی جو بھول کر راستے میں چھوڑ گئے تھے۔

وادیٔ تیہ میں چالیس سال کا عرصہ ختم ہوا، نئی پود (نیو جنریشن) جوان ہو چکی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت یوشع بن نون علیہ السلام کے ذریعہ ان کو حکم دیا کہ تم اس شہر بیت المقدس اور اس کو ایلیاء بھی کہتے ہیں۔ پہلے یہ بیت المقدس وادی تیہ سے کچھ مسافت پر تھا۔ مگر اب ساتھ مل گیا ہے۔ جیسا کہ گوجرانوالا اور راہوالی تقریباً آپس میں مل ہی گئے ہیں۔

بنی اسرائیل کو بستی میں داخل ہونے کے احکام

تو اللہ تعالیٰ نے حضرت یوشع بن نون علیہ السلام کے ذریعے ان کو حکم دیا کہ تم اس شہر بیت المقدس میں داخل ہو جاؤ اس کا ذکر ہے۔

فرمایا ﴿وَ اِذْ قُلْنَا﴾ اور جب کہا ہم نے ﴿ادْخُلُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ﴾ داخل ہو جاؤ اس بستی میں یعنی بیت المقدس یا ایلیاء میں ﴿فَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا﴾ پس کھاؤ اس میں سے جہاں سے چاہو کشادہ ﴿وَّادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا﴾ اور داخل ہو جاؤ دروازے سے سجدہ کرتے ہوئے۔ پہلے زمانے میں شہر کے ارد گرد ایک دیوار ہوتی تھی اس کو سُوْرُ الْبَلَدْ کہتے تھے۔

اس میں مختلف دروازے ہوتے تھے لوگ ان دروازوں کے ذریعے شہر میں داخل ہوتے تھے جس طرح شہر گوجرانوالا میں بھی مختلف دروازے ہیں، لاہوری، سیالکوٹی، کھیالی، گرجاکھی۔ اسی طرح اس شہر کے بھی دروازے تھے تو اس شہر کا جو اہم مقام تھا فرمایا اس دروازے سے تم داخل ہو جاؤ۔ اور داخل ہوتے وقت تم نے دو کام کرنے ہیں ایک یہ کہ سجدہ کرتے ہوئے داخل ہونا ہے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا ہے کہ تو نے ہمیں طاقتور قوم پر غلبہ عطا فرمایا ہے۔

اور دوسرا کام: ﴿وَّ قُوْلُوْا حِطَّةٌ﴾ اور کہو تم حِطَّةٌ یعنی ہمارے گناہ معاف کر دے۔ حَطَّ يَحُطُّ کا معنیٰ ہے گرانا اور حِطَّةٌ

کا مکمل جملہ بنے گا مَسْئَلَتُنَا حِطَّةٌ ہمارا سوال یہ ہے کہ اے پروردگار! ہمارے گناہ معاف فرما دے۔

﴿نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطٰيٰكُمْ﴾ معاف کر دیں گے ہم تمہاری خطائیں ﴿وَسَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ﴾ اور ہم زیادہ دیں گے نیکی کرنے والوں کو ﴿فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا قَوْلًا﴾ پس تبدیل کر لیا ان لوگوں نے جنہوں نے ظلم کیا بات کو ﴿غَيْرَ الَّذِيْ قِيْلَ لَهُمْ﴾ سوائے اس کے جو ان کو کہی گئی تھی۔

بنی اسرائیل کی حیلہ سازی

ان کو تو کہا گیا تھا حِطَّةٌ کہنا مگر انہوں نے حِطَّةٌ کی بجائے حِنْطَةٌ کہنا شروع کر دیا۔ کہ ہمیں گندم چاہیے۔

اور یہ الفاظ بھی مفسرین نے لکھے ہیں کہ انہوں نے کہا حَبَّةٌ فِيْ شَعْرَةٍ ہمیں وہ دانے چاہئیں جو خوشوں میں ہوں اور پہلے حکم کی مخالفت اس طرح کی کہ بجائے سجدہ کرنے کے چوتڑ گھسیٹتے ہوئے داخل ہوئے۔ جس طرح چھوٹے بچے گھسیٹیاں کرتے ہیں۔ مطلب یہ کہ انہوں نے قول بھی بدل دیا اور فعل بھی بدل دیا۔ پھر کیا ہوا؟

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ﴿فَاَنْزَلْنَا عَلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا﴾ پس نازل کیا ہم نے ان لوگوں پر جنہوں نے ظلم کیا ﴿رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ﴾ عذاب آسمان کی طرف سے۔ وہ عذاب طاعون کی شکل میں نازل ہوا تین چار گھنٹوں میں ستر ہزار کے قریب آدمی مر گئے۔ اس قوم پر اللہ تعالیٰ نے بڑے انعامات نازل کیے مگر انہوں نے نافرمانیاں بہت کیں۔

یہودی ''من حیث القوم'' سب سے زیادہ ذہین قوم

دُنیا میں جتنی قومیں ہیں افراد کے لحاظ سے نہیں بلکہ مِنْ حَيْثُ الْقَوْم یہودی سب سے زیادہ ذہین ہیں۔ ہائیڈروجن بم اور کلاشنکوف کے موجد یہی ہیں۔ قوموں کی تباہی کے اسباب انہوں نے ہی پیدا کیے ہیں۔ اور جتنے ذہین ہیں اتنے ہی ضدی ہیں۔ اپنی بات پر اَڑ جاتے ہیں اور اس کے مقابلے میں صحیح بات بھی ماننے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ آنحضرت ﷺ کو ﴿يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ﴾ [البقرہ:۱۴۶] اس طرح پہچانتے تھے جس طرح اپنی اولاد کو پہچانتے ہیں۔ مگر اس کے باوجود ضد پر اڑے رہے، قبول نہیں کیا۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان پر آسمان کی طرف سے عذاب نازل فرمایا۔

﴿بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ﴾ اس لیے کہ وہ نافرمانی کرتے تھے۔

﴿وَاِذِ اسْتَسْقٰى مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ﴾ اور جس وقت پانی طلب کیا موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کے لیے ﴿فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ﴾ پس کہا ہم نے مار اپنی لاٹھی پتھر پر ﴿فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ﴾ پس پھوٹ پڑے اس سے ﴿اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا﴾ بارہ چشمے ﴿قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ﴾ تحقیق جان لیا ہر گروہ نے ﴿مَّشْرَبَهُمْ﴾ اپنے پینے کی جگہ کو

﴿كُلُوْا وَاشْرَبُوْا مِنْ رِّزْقِ اللّٰهِ﴾ کھاؤ اور پیو اللہ تعالیٰ کے رزق سے ﴿وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ﴾ اور نہ پھرو زمین میں فساد مچاتے ہوئے ﴿وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى﴾ اور جب کہا تم نے اے موسیٰ (علیہ السلام) ﴿لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰى طَعَامٍ وَّاحِدٍ﴾ ہم ہرگز صبر نہیں کریں گے ایک کھانے پر ﴿فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ﴾ پس دعا کر ہمارے لیے اپنے پروردگار سے ﴿يُخْرِجْ لَنَا﴾ نکالے ہمارے لیے ﴿مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ﴾ اس چیز سے جو اُگاتی ہے زمین ﴿مِنْۢ بَقْلِهَا﴾ اپنی ترکاریوں سے ﴿وَقِثَّآئِهَا﴾ اپنی ککڑیوں سے (یعنی تریں) ﴿وَفُوْمِهَا﴾ اور اپنے لہسن یعنی تھوم سے ﴿وَعَدَسِهَا﴾ اور اپنے مسور سے ﴿وَبَصَلِهَا﴾ اور اپنے پیاز سے ﴿قَالَ اَتَسْتَبْدِلُوْنَ﴾ فرمایا کیا تم بدلے میں لیتے ہو ﴿الَّذِيْ هُوَ اَدْنٰى﴾ اس چیز کو جو گھٹیا ہے ﴿بِالَّذِيْ هُوَ خَيْرٌ﴾ اس چیز کے ساتھ جو بہتر ہے ﴿اِهْبِطُوْا مِصْرًا﴾ اُتر جاؤ کسی شہر میں ﴿فَاِنَّ لَكُمْ مَّا سَاَلْتُمْ﴾ پس بے شک تمہارے لیے وہی کچھ ہوگا جو تم نے مانگا ﴿وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ﴾ اور مسلط کر دی گئی ان پر ذلت اور مسکینی ﴿وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ﴾ اور لوٹے وہ اللہ تعالیٰ کا غضب لے کر ﴿ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ﴾ یہ اس وجہ سے ہوا کہ بے شک وہ ﴿كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ﴾ تھے انکار کرتے اللہ تعالیٰ کی آیتوں کے ﴿وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ﴾ اور قتل کرتے تھے پیغمبروں کو ﴿بِغَيْرِ الْحَقِّ﴾ ناحق ﴿ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا﴾ یہ اس لیے کہ انہوں نے نافرمانی کی ﴿وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ﴾ اور وہ حد سے آگے نکل جاتے تھے۔

ربط

اس سے پہلے رکوع میں یہ بات بیان ہوئی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب اپنی قوم کو لے کر وادی تیہ میں پہنچے جس کو آج کل کے جغرافیہ میں وادیٔ سینائی کہتے ہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم ہوا کہ تم عمالقہ قوم کے ساتھ جہاد کرو۔ جو اس وقت شام، کنعان، فلسطین میں آباد تھی۔ اس زمانے میں شام، کنعان، فلسطین ایک علاقہ تھا اور لبنان، اردن اس میں شامل تھے۔ اور اس علاقے کو شام بھی کہتے تھے۔ کنعان بھی اور فلسطین بھی کہتے تھے اور وادیٔ تیہ وغیرہ سب اس میں شامل تھے۔

عربوں کے خلاف فرنگی سازش

خبیث انگریز نے ۱۹۱۷ء میں اپنے مفاد کی خاطر اس علاقے کو مختلف ملکوں میں تقسیم کر دیا۔ اور مسلمان حکمرانوں کے ایک دوسرے کے خلاف ایسے ذہن بنا دیے کہ وہ مسلمان ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے دست و گریبان ہیں اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ شام اسرائیل کے ساتھ تو مل سکتا ہے مگر مصر وغیرہ کے ساتھ نہیں۔ لبنان کا بھی یہی حال ہے کہ یہود کے ساتھ تو مل سکتا ہے مگر شام کے ساتھ ملنے کو تیار نہیں ہے۔ سعودیہ امریکہ کے ساتھ تو مل سکتا ہے مگر عراق کے ساتھ مل بیٹھنے کو تیار نہیں

ہے۔ یہ تمام خباثتیں انگریز اور اس کے بین الاقوامی حواریوں کی ہیں۔

بہر حال موسیٰ علیہ السلام نے جب ان کو جہاد کا حکم سنایا تو انہوں نے جہاد کرنے سے انکار کر دیا اور اللہ تعالیٰ نے ان پر چالیس سال کے لیے اس میدان سے نکلنا حرام کر دیا اور بنی اسرائیلی خاصی تعداد میں تھے ان کے لیے سائے کا انتظام کرنا، کھانے پینے کا انتظام کرنا تھا کیونکہ جان دار مخلوق اس کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ بلکہ پانی کے بغیر تو نباتات بھی نہیں رہ سکتے۔ تو پہلے سائے اور کھانے کے انتظام کا ذکر تھا اب اس آیت کریمہ میں پانی کا ذکر ہے۔

پانی کے چشمے

فرمایا ﴿وَ اِذِ اسۡتَسۡقٰی مُوۡسٰی لِقَوۡمِهٖ﴾ اور جس وقت پانی طلب کیا موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کے لیے۔ سُقْیٰ کے معنیٰ ہیں پانی اِسۡتَسۡقٰی باب استفعال ہے اس کی خاصیت ہے ''طلب ماخذ'' یعنی اس میں مصدر کے طلب کے معنیٰ پائے جاتے ہیں۔ تو ﴿وَ اِذِ اسۡتَسۡقٰی مُوۡسٰی﴾ کے معنیٰ ہیں ''جب موسیٰ علیہ السلام نے پانی طلب کیا'' ﴿لِقَوۡمِهٖ﴾ اپنی قوم کے لیے۔ کیونکہ ان کو پینے کے لیے، نہانے کے لیے اور دیگر ضروریات کے لیے پانی چاہیے تھا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ﴿فَقُلۡنَا اضۡرِبۡ بِّعَصَاكَ الۡحَجَرَ﴾ پس کہا ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو مار اپنی لاٹھی پتھر پر۔ اب سوال یہ ہے کہ جس پتھر پر موسیٰ علیہ السلام نے لاٹھی ماری تھی وہ کوئی خاص پتھر تھا یا عام پتھر تھا۔ دونوں باتیں تفسیروں میں منقول ہیں جو کہ مندرجہ ذیل ہیں:

①...... یہ عام پتھر تھا جو وہیں پڑا ہوا تھا اس پر لاٹھی ماری۔

②...... یہ کہ عام پتھر نہیں تھا بلکہ وہ پتھر تھا جو موسیٰ علیہ السلام کے کپڑے لے کر بھاگا تھا۔

موسیٰ علیہ السلام کا تنہا غسل اور پتھر کا کپڑوں سمیت بھاگ جانا

وہ قصہ بخاری شریف کی روایت کے مطابق اس طرح ہے کہ: ''موسیٰ علیہ السلام تنہائی میں غسل کرتے تھے کہ ان پر کسی کی نگاہ نہ پڑے۔ اور دوسرے لوگ اکٹھے نہاتے تھے تو ایک دوسرے کو کہنے لگے کہ موسیٰ علیہ السلام علیحدگی میں نہاتے ہیں۔ لگتا ہے ان کے بدن میں کوئی بیماری ہے۔ موسیٰ علیہ السلام سے انہوں نے پوچھا تو انہوں نے فرمایا کہ الحمد للہ! مجھے کوئی تکلیف نہیں ہے۔ لیکن لوگوں میں مشہور ہو گیا کہ موسیٰ علیہ السلام کو ''اُدْرَہ'' کی بیماری ہے۔ یعنی ان کے خصیتین پھولے ہوئے ہیں۔ دنیا کا دستور ہے کہ بُری بات بڑی جلدی مشہور ہو جاتی ہے۔ تو عام لوگ یہ باتیں کرنے لگ گئے اللہ تعالیٰ کو اس کی صفائی منظور ہوئی۔

ایک دن موسیٰ علیہ السلام کپڑے اُتار کر تنہائی میں غسل کرنے لگے۔ فارغ ہو کر جب کپڑوں کی طرف آئے تو پتھر جس پر کپڑے رکھے تھے بھاگ پڑا۔ پتھر آگے، آگے اور موسیٰ علیہ السلام ثَوۡبِیۡ حَجَرُ کی آواز لگاتے ہوئے پتھر کے پیچھے پیچھے کہ اے پتھر میرے کپڑے دے دے۔ مگر پتھر کو تو رب تعالیٰ کا حکم تھا وہ وہاں جا کر رُکا جہاں لوگوں کا مجمع تھا سب نے موسیٰ علیہ السلام کو

آنکھوں سے دیکھا کہ ان کے بدن میں تو کوئی تکلیف نہیں ہے"۔
بہر حال اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ پتھر پر اپنی لاٹھی مارو۔
چنانچہ موسیٰ علیہ السلام نے پتھر پر لاٹھی ماری ﴿فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا﴾ پس پھوٹ پڑے اس سے بارہ چشمے۔ چونکہ بنی اسرائیل کے بارہ خاندان تھے اور ان کی آپس میں نوک جھونک ہوتی رہتی تھی اور یہ کوئی عجیب بات نہیں ہے کیونکہ گھر میں چند افراد ہوتے ہیں ان میں بھی بات ہو جاتی ہے۔ اور یہ تو بارہ خاندان تھے اور تھے بھی سخت مزاج۔ تو ان میں جھگڑے کا ہو جانا قدرتی امر تھا۔ تو انتظامی امور کی وجہ سے ان کو بارہ خاندانوں میں تقسیم کیا تھا۔ لہٰذا ہر ایک کے لیے الگ چشمہ جاری کیا گیا۔ کہ مثلاً: یہ یوسفیوں کا ہے، یہ روبیلیوں کا ہے، یہ بن لاویوں کا ہے یہ بن یامینیوں کا ہے تاکہ آپس میں لڑیں نہ۔
اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ﴿قَدْ عَلِمَ كُلُّ أُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ﴾ تحقیق جان لیا ہر گروہ نے اپنے پینے کی جگہ کو۔ رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿كُلُوْا وَاشْرَبُوْا مِنْ رِّزْقِ اللّٰهِ﴾ من وسلویٰ کھاؤ اور پانی پیو اللہ تعالیٰ کے رزق سے ﴿وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ﴾ اور نہ پھرو زمین میں فساد مچاتے ہوئے۔ ایک دوسرے کی دل آزاری نہ کرو انسانوں میں یہ مادہ بہت پایا جاتا ہے۔ اِلَّا مَا شَاءَ اللّٰهِ

دال سبزی کا مطالبہ

عرصہ دراز تک وہ من وسلویٰ کھاتے رہے پھر اکٹھے ہو کر موسیٰ علیہ السلام کے پاس آئے اور مطالبہ کیا کہ ہماری خوراک بدل دو۔ اس کا ذکر ہے: ﴿وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى﴾ اور جب کہا تم نے موسیٰ علیہ السلام سے (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کے یہودیوں کو یہ بات یاد دلائی جا رہی ہے کہ تمہارے بڑوں نے یہ کہا تھا)۔
﴿لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰى طَعَامٍ وَّاحِدٍ﴾ ہم ہرگز صبر نہیں کریں گے ایک ہی قسم کے کھانے پر یہ کیا ہوا کہ صبح کو بھی من سلویٰ اور شام کو بھی من سلویٰ۔ ﴿فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ﴾ پس دعا کر ہمارے لیے اپنے پروردگار سے ﴿يُخْرِجْ لَنَا﴾ نکالے ہمارے لیے ﴿مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ﴾ اس چیز سے جو اُگاتی ہے زمین ﴿مِنْۢ بَقْلِهَا﴾ اپنی ترکاریوں سے۔ "بقل" ہر قسم کی سبزی کو کہتے ہیں۔ ساگ، مولی، گاجر، آلو وغیرہ سب پر بقل کا لفظ بولا جاتا ہے۔ اور سبزی فروش کو بَقَّالَہ کہتے ہیں۔

"قِثَّاءٌ" کی تحقیق :

﴿وَقِثَّآئِهَا﴾ اپنی ککڑیوں سے (یعنی تریں)۔ قِثَّاءٌ عربی زبان میں کھیرے کو بھی کہتے ہیں اور تر کو بھی، جو لمبی ہوتی ہے۔ اور دونوں کی تاثیر ٹھنڈی ہوتی ہے۔ حدیث پاک میں آتا ہے کہ کسی نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں تر پیش کی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جلدی سے کھجوریں لاؤ۔ کھجوریں لائی گئیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تر اور کھجوریں ملا کر کھائیں۔ تاکہ اعتدال پیدا ہو جائے۔

’’فُوْم‘‘ کی تحقیق

﴿وَفُوْمِهَا﴾ اور اپنے لہسن یعنی تھوم سے۔ ’’فُوْم‘‘ گندم کو بھی کہتے ہیں اور لہسن کو بھی۔ ’’فوم‘‘ کے دونوں معنیٰ ہیں۔ تو کہا کہ ہمارے لیے لہسن پیدا فرما۔ پہلے حکیم بھی کہتے تھے اور آج کل ڈاکٹر بھی کہتے ہیں کہ تھوم ’’لہسن‘‘ دل کی بیماریوں کے لیے بہت مفید ہے۔ حکیم تھوم کا سیر ابنا کر دل کی بیماریوں کے لیے استعمال کراتے تھے۔ تھوم کچا بھی کھایا جاتا ہے اور پکا کر بھی۔ لیکن کچا تھوم کھا کر فوراً مسجد میں نہیں آنا چاہیے۔ اسی طرح کچی مولی اور دیگر بو والی چیزیں کھا کر مسجد میں نہیں آنا چاہیے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے کھانا رکھا گیا۔ اس کے ساتھ سلاد بھی۔ آج کل کی طرح پہلے بھی کھانے کے ساتھ سلاد رکھتے تھے۔ سلاد میں تھوم تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سلاد نہ کھایا۔ دوسرے حضرات نے بھی نہ کھایا۔ (ثوم عربی میں تھوم کو کہتے ہیں) آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا گیا حضرت! کیا تھوم حرام ہے؟ فرمایا جس چیز کو اللہ تعالیٰ نے حلال کیا ہے میں اس کو حرام نہیں کر سکتا۔ حضرت! پھر آپ نے کھایا کیوں نہیں؟ فرمایا میں نے اس لیے نہیں کھایا کہ اس سے بُو آتی ہے اِنِّیْ اُنَاجِیْ مَنْ لَّا تُنَاجُوْنَ میں ان (فرشتوں) کے ساتھ ہم کلام ہوتا ہوں جن کے ساتھ تم ہم کلام نہیں ہو سکتے۔

البتہ فرشتے جب جان نکالنے کے لیے آتے ہیں تو اس وقت ہر آدمی سے جس کی جان نکالتے ہیں ہم کلام ہوتے ہیں۔ نیک آدمی کو کہتے ہیں اُخْرُجِیْ طَيِّبَةً ’’اے پاکیزہ روح! نکل آ۔‘‘ وہ آسانی سے نکل آتی ہے۔ اور بُرے سے کہتے ہیں یَاَیُّهَا النَّفْسُ الْخَبِيْثَةُ ’’اے ناپاک روح! جلدی نکل رب تجھ سے ناراض ہے۔ اب تیری مرمت ہوگی۔‘‘

تو بہر حال تھوم سے چوں کہ بو آتی ہے اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نہ کھایا۔ اور یہ بھی فرمایا کہ فَلَا يَقْرَبَنَّ مَسَاجِدَنَا جس نے تھوم کھایا وہ ہماری مسجدوں کے قریب نہ آئے۔ کیونکہ عام جگہوں کی بہ نسبت مسجد میں فرشتے زیادہ ہوتے ہیں۔ اور فرشتوں کو پیاز، تھوم اور مولی وغیرہ کی بو سے سخت نفرت آتی ہے۔ اور اس سے سگریٹ اور حقے کی بو کا اندازہ خود لگا لو جو کافی دور سے آجاتی ہے کہ وہ پی کر مسجد میں آنا کیسا ہے؟

حقہ پینے کی وجہ سے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خواب میں پیٹھ کے پیچھے بیٹھنا

شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے زمانے میں ایک نیک آدمی تھا اس کو تبخیر کی بیماری لگ گئی معدے میں گیس پیدا ہو جاتا تھا۔ حکیم کے پاس گیا اس نے کہا کہ تم حقہ پیا کرو۔ اس نے حقہ پینا شروع کر دیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خواب میں تشریف لائے اور اس بزرگ کی پیٹھ کے پیچھے تشریف فرما ہوئے۔ وہ جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف منہ کرتا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پیٹھ کے پیچھے ہو جاتے، وہ بڑا پریشان ہوا۔

شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ اپنے دور میں خوابوں کی تعبیر کے بڑے ماہر تھے صبح کو ان کے پاس گیا اور اپنا خواب سنایا۔ شاہ صاحب نے فرمایا کہ تو حقہ پیتا ہوگا؟ کہنے لگا جی ہاں! حقہ تو پیتا ہوں۔ فرمایا آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حقے سے نفرت ہے۔ اس لیے

سامنے نہیں بیٹھے۔

"عَدَس" کی تحقیق

﴿وَ عَدَسِهَا﴾ اور اپنے مسور سے۔ عَدَس کا لفظ اصل تو مسور کی دال پر بولا جاتا ہے مگر آج کل تمام کے تمام عربی ہر قسم کی دال کو عَدَس کہتے ہیں۔ چاہے چنے کی ہو یا مونگ، ماش کی۔

﴿وَ بَصَلِهَا﴾ اور اپنے پیاز سے۔ یعنی ہمیں پیاز چاہئیں یوں معلوم ہوتا ہے کہ سارے آرائیں اکٹھے تھے۔

ناقدری کی سزا

﴿قَالَ اَتَسْتَبْدِلُوْنَ﴾ فرمایا کیا تم بدلے میں لیتے ہو ﴿الَّذِیْ هُوَ اَدْنٰی﴾ اس چیز کو جو گھٹیا ہے ﴿بِالَّذِیْ هُوَ خَیْرٌ﴾ اس چیز کے ساتھ جو بہتر ہے۔ کہاں کھیر اور بٹیر اور کہاں لہسن، پیاز اور دال؟ اور پھر وہ بغیر مشقت کے۔ اور یہ چیزیں تمہیں خود بیجنی پڑیں گی اور نکالنی پڑیں گی۔

ہاں اگر تم لینا ہی چاہتے ہو تو ﴿اِهْبِطُوْا مِصْرًا﴾ اُتر جاؤ کسی شہر میں۔ وادیٔ تیہ چونکہ بلندی پر تھی اور باقی شہر نیچے تھے۔ س لیے فرمایا کہ اتر جاؤ کسی شہر میں وہاں سے ان چیزوں کے بیج لاؤ اور کاشت کرو اور جس دن تم نے بیج ہاتھ میں پکڑا تمہارا آسمانی راشن بند ہو جائے گا۔ علامہ زمخشری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ "قنسرین" نامی شہر ان کے قریب تھا۔ وہاں سے جا کر یہ تمام چیزوں کے بیج لائے۔

فرمایا ﴿فَاِنَّ لَكُمْ مَّا سَاَلْتُمْ﴾ پس بے شک تمہارے لیے وہی کچھ ہوگا جو تم نے مانگا ﴿وَ ضُرِبَتْ عَلَیْهِمُ الذِّلَّةُ وَ الْمَسْكَنَةُ﴾ اور مسلط کر دی گئی ان پر ذلت اور مسکینی۔ پہلے من سلویٰ کھاتے تھے اب جاؤ گرد وغبار کھاؤ۔

﴿وَ بَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ﴾ اور لوٹے وہ اللہ تعالیٰ کا غضب لے کر۔ اپنا نقصان بھی کیا اور رب تعالیٰ کی ناراضگی بھی مول لی۔ یہ غضب کیوں ہوا؟

فرمایا ﴿ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا یَكْفُرُوْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ﴾ یہ اس وجہ سے ہوا کہ وہ بے شک تھے انکار کرتے اللہ تعالیٰ کی آیتوں کا۔ اللہ تعالیٰ کے احکامات آتے انکار کر دیتے۔ اللہ تعالیٰ کے دو جلیل القدر پیغمبر موسیٰ اور ہارون علیہما السلام ان کے پاس آئے مگر انہوں نے ان کی باتوں پر کوئی توجہ نہ دی۔ اگرچہ ماننے والے بھی تھے مگر اکثر نافرمان تھے۔ اور حکم اکثریت پر لگتا ہے۔ عربی زبان کا مقولہ ہے:

لِلْاَكْثَرِ حُكْمُ الْكُلِّ　　"اکثریت پر کل کا حکم ہوتا ہے۔"

بنی اسرائیل کے ہاتھ سے قتل انبیاء

﴿وَ یَقْتُلُوْنَ النَّبِیّٖنَ بِغَیْرِ الْحَقِّ﴾ اور قتل کرتے تھے پیغمبروں کو ناحق۔ اسی مضمون کی آیت تیسرے پارے میں آتی

ہے: ﴿وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۙ وَّيَقْتُلُوْنَ الَّذِيْنَ يَاْمُرُوْنَ بِالْقِسْطِ مِنَ النَّاسِ﴾ [آل عمران:۲۱] "اور وہ قتل کرتے تھے انبیاء علیہم السلام کو ناحق اور ان کو بھی قتل کرتے تھے جو لوگوں کو انصاف کا حکم دیتے ہیں۔"

اس آیت کی تشریح میں مفسرین کرام رحمۃ اللہ علیہم حضرت ابو عبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ کی روایت نقل کرتے ہیں کہ "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک علاقے میں مختلف قومیں آباد تھیں۔ جن کی تعداد تینتالیس تھی۔ اور ہر قوم کی طرف اللہ تعالیٰ نے الگ الگ پیغمبر بھیجا تھا۔ ان قوموں نے آپس میں مشورہ کیا کہ یہ پیغمبر ہمیں ہر وقت تنگ کرتے رہتے ہیں لہٰذا ان پیغمبروں کا صفایا کر دینا چاہیے۔

چنانچہ سورج طلوع ہونے کے بعد تقریباً گیارہ بجے تک انہوں نے تینتالیس پیغمبر اور ایک سو ستر ان کے صحابیوں اور حواریوں کو شہید کیا۔ یہ تو صرف ایک دن کی کارروائی تھی ان کے علاوہ حضرت یحییٰ علیہ السلام کو شہید کیا۔ حضرت شعیا علیہ السلام، حضرت زکریا علیہ السلام کو شہید کیا۔

حضرت یحییٰ علیہ السلام کی شہادت کا واقعہ

حضرت یحییٰ علیہ السلام کو اس وجہ سے شہید کیا گیا کہ اس علاقہ کا جو حاکم تھا اس کی ایک بڑی خوبصورت بھانجی تھی۔ اس نے اپنی بھانجی کے ساتھ نکاح کرنا چاہا۔ باوجود یہ کہ اس کے نکاح میں اور عورتیں اور لونڈیاں بھی تھیں۔ اور بھانجی کے ساتھ نکاح ان کی شریعت میں بھی ناجائز تھا۔

اس بات کا جب حضرت یحییٰ علیہ السلام کو علم ہوا تو اپنا فریضہ ادا کرنے کے لیے اس کے پاس گئے۔ اور کہا کہ میں اللہ تعالیٰ کا پیغمبر ہونے کی حیثیت سے تجھے مسئلہ بتانے کے لیے آیا ہوں۔ تاکہ اتمامِ حجت ہو جائے۔ وہ یہ کہ بھانجی کے ساتھ نکاح جائز نہیں ہے۔ تیرے پاس اور عورتوں کے علاوہ لونڈیاں بھی ہیں۔ اور تو بادشاہ ہے ان کے علاوہ اور عورتوں کے ساتھ بھی جہاں چاہے نکاح کر سکتا ہے۔ لہٰذا یہ ناجائز کام نہ کر۔

وہ کہنے لگا کہ بادشاہی تیری ہے یا میری؟ فرمایا ظاہر بات ہے کہ بادشاہی تو تیری ہی ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ کا حکم سنانا میرا فریضہ ہے۔ میں تو اپنا فرض ادا کرنے کے لیے آیا ہوں۔ کہنے لگا یہ کون ہوتا ہے میری مجلس میں آ کر مجھے یہ کہنے والا کہ تو اس طرح کر اور اس طرح نہ کر۔ ظالم نے حضرت یحییٰ علیہ السلام کو شہید کر دیا۔ یہ قتل ناحق تھا۔

قتل حق کی تین صورتیں

اور قتل حق کی تین صورتیں ہیں:

① ...... یہ کہ کوئی آدمی مرتد ہو جائے دین سے پھر جائے تو اس کو تین دن کی مہلت دے دی جائے گی کہ توبہ کر لے اگر اس نے تین دن تک توبہ نہ کی تو اس کے بعد اس کو قتل کر دیا جائے گا۔ اور پیغمبر تو معصوم ہوتے ہیں ان کے مرتد ہونے کا تو سوال ہی

پیدا نہیں ہوتا۔

②......دوسری صورت یہ ہے کہ شادی شدہ مرد یا عورت زنا کرے تو اس کو رجم کیا جائے گا جس کو انگریزی تعلیم یافتہ ظالم حکمران وحشیانہ سزائیں کہتے ہیں حالانکہ جو اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے اور آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے وہ حق ہے اور یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی پکڑ سے غافل ہیں۔

آنحضرت ﷺ کا فرمان مبارک ہے: ((اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى لَيُمْلِیْ الظَّالِمَ حَتّٰى اِذَا اَخَذَهٗ لَمْ يُفْلِتْهُ)) بے شک اللہ تعالیٰ ظالم کو مہلت دیتا ہے یہاں تک کہ جب پکڑتا ہے تو حرکت نہیں کرنے دیتا۔ اب یہ کہنے والے ظالم حکمران تڑپ رہے ہیں۔ اوظالمو! اپنے دور میں جو تم نے ظلم کیے تھے وہ تو یاد کرو۔

③......تیسری صورت یہ ہے کہ کوئی کسی کو ناحق قتل کر دے اور اس کو اس کے قصاص میں قتل کیا جائے۔

اسلام میں ان تین صورتوں کے علاوہ کسی کو قتل کرنا جائز نہیں ہے۔ اور پیغمبروں کے متعلق ان تینوں باتوں کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ان ظالموں نے پیغمبروں کو ناحق قتل کیا۔ کیوں قتل کیا؟

فرمایا ﴿ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّ كَانُوْا يَعْتَدُوْنَ﴾ یہ اس لیے کہ انہوں نے نافرمانی کی اور وہ حد سے آگے نکل جاتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کی مقرر کی ہوئی حدوں سے تجاوز کر جاتے تھے اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کو سزائیں دیں۔ جن کا ذکر آگے آئے گا۔ [ان شاء اللہ تعالیٰ]

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ بے شک وہ لوگ جو ایمان لائے ﴿وَالَّذِيْنَ هَادُوْا﴾ اور وہ لوگ جو یہودی ہیں ﴿وَالنَّصٰرٰى﴾ اور جو نصرانی ہیں ﴿وَالصّٰبِـِٕيْنَ﴾ اور جو صابی ہیں ﴿مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ﴾ جو شخص بھی ایمان لایا اللہ تعالیٰ پر ﴿وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ﴾ اور آخرت کے دن پر ﴿وَعَمِلَ صَالِحًا﴾ اور اس نے عمل کیا اچھا ﴿فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ﴾ پس ان کے لیے اجر ہے ان کے رب کے پاس ﴿وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ﴾ اور نہ ان پر خوف ہوگا ﴿وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ﴾ اور نہ وہ غمگین ہوں گے ﴿وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ﴾ اور جب لیا ہم نے تم سے پختہ عہد ﴿وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ﴾ اور بلند کیا ہم نے تمہارے اوپر طور پہاڑ کو ﴿خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ﴾ پکڑو اس چیز کو جو ہم نے تمہیں دی ہے قوت کے ساتھ ﴿وَّاذْكُرُوْا مَا فِيْهِ﴾ اور یاد کرو جو اس میں ہے ﴿لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ﴾ تاکہ تم بچ جاؤ ﴿ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ﴾ پھر تم پھر گئے ﴿مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ﴾ اس کے بعد ﴿فَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ﴾ پس اگر نہ ہوتا اللہ تعالیٰ کا فضل تم پر ﴿وَرَحْمَتُهٗ﴾ اور اس کی رحمت ﴿لَكُنْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ﴾ البتہ تم ہو جاتے نقصان اٹھانے والوں میں سے ﴿وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ﴾ اور البتہ تحقیق تم جانتے ہو ﴿الَّذِيْنَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ﴾ ان لوگوں کو جنھوں نے تجاوز کیا تم میں سے

﴿فِی السَّبْتِ﴾ ہفتے کے دن ﴿فَقُلْنَا لَهُمْ﴾ پس کہا ہم نے ان کو ﴿كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِئِيْنَ﴾ ہوجاؤ بندر ذلیل ﴿فَجَعَلْنٰهَا نَكَالًا﴾ پس بنایا ہم نے اس واقعہ کو عبرت ﴿لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا﴾ ان لوگوں کے لیے جو اس سے پہلے تھے ﴿وَمَا خَلْفَهَا﴾ اور جو پیچھے آنے والے ہیں ﴿وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ﴾ اور نصیحت پرہیز گاروں کے لیے۔

ربط

اس سے پہلے یہودیوں کا ذکر تھا جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دین پر چلنے والے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو بے شمار نعمتوں سے نوازا مگر انہوں نے بے قدری کی۔ آگے وہ فرقے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں تھے ان میں سے بعض کا ذکر ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ بے شک وہ لوگ جو ایمان کا دعویٰ کرتے ہیں۔ مشرکین عرب اپنی نسبت ابراہیم علیہ السلام کی طرف کر کے اپنے آپ کو مؤمن کہتے تھے کہ ہم ابراہیمی ہیں اور حضرت ابراہیم علیہ السلام مومن تھے۔ لہٰذا ہم بھی مؤمن ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مومن ہونے میں تو شک شبہ کی گنجائش نہیں ہے مگر ان کا صرف دعویٰ ہی دعویٰ تھا۔

یہود کی وجہ تسمیہ

﴿وَالَّذِيْنَ هَادُوْا﴾ اور وہ لوگ جو یہودی ہیں۔ یہودیوں کو یہودی کیوں کہتے ہیں؟ مفسرین کرام رحمہم اللہ نے اس سلسلے میں مختلف باتیں بیان کی ہیں۔

①...... ایک یہ کہ هَادَ، يَهُوْدُ کے معنیٰ ہیں رجوع کرنا تو وہ لوگ جو بچھڑے کی پوجا کرنے کی وجہ سے قتل کر دیے گئے وہ تو قتل ہو گئے جو بچ گئے انہوں نے کہا تھا اِنَّا هُدْنَا اِلَيْكَ اے پروردگار! ہم نے تیری طرف رجوع کیا۔ چونکہ ان کے بڑوں نے ''هُدْنَا'' کا لفظ بولا تھا اس وجہ سے ان کو یہودی کہا جاتا ہے۔

②...... دوسری وجہ یہ بیان فرمائی ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے بڑے بیٹے کا نام یہودا تھا تو اس کی طرف نسبت کی وجہ سے ان کو یہودی کہا جاتا ہے۔

③...... علامہ خازن رحمۃ اللہ علیہ نے یہ وجہ بھی لکھی ہے کہ یہ لوگ جب توراۃ پڑھتے تھے تو حرکت کرتے تھے۔ جس طرح قرآن کریم حفظ کرنے والے بچے آگے پیچھے ہلتے اور حرکت کرتے ہیں۔ اور تَهَوَّدَ کا معنیٰ حرکت کرنا بھی آتا ہے۔ تو اس وجہ سے ان کو یہودی کہا جاتا ہے کہ وہ لوگ جو توراۃ پڑھتے وقت حرکت کرتے ہیں، جھومتے ہیں۔

نصاریٰ کی وجہ تسمیہ

﴿وَالنَّصٰرٰى﴾ اور جو نصرانی ہیں۔

①...... نصٰریٰ، نصران کی جمع ہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام جس محلے میں پیدا ہوئے تھے اس کا نام تھا ''ناصرہ'' اس کی طرف

نسبت کی وجہ سے عیسیٰ علیہ السلام کو ناصری کہا جاتا ہے۔ چنانچہ تاریخ کی کتابوں میں آتا ہے عیسیٰ ناصری نے کہا۔ جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مکی اور مدنی کہا جاتا ہے۔ مکی تو اس وجہ سے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیدائش مکہ مکرمہ میں ہوئی اور مدنی اس وجہ سے کہ مدینہ منورہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دارالہجرت ہے اور دس سال وہاں گزارنے کے بعد وہیں پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وصال ہوا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وہیں مدفون ہیں۔ تو عیسیٰ علیہ السلام کو محلہ ناصرہ کی طرف نسبت کی وجہ سے ناصری کہا جاتا ہے۔ اور ان کے ماننے والوں کو ''نصرانی'' کہا جاتا ہے۔

②...... اور نصاریٰ کہنے کی دوسری وجہ یہ بیان فرمائی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ایک موقع پر فرمایا تھا کہ اللہ تعالیٰ کے راستہ پر چلنے میں اور جو کچھ اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے میں بیان کرتا ہوں اور لوگ مجھے تکلیف پہنچانے کے درپئے ہیں ﴿مَنْ اَنْصَارِیْۤ اِلَی اللّٰهِ﴾ کون میری مدد کرے گا؟ اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے۔ ﴿قَالَ الْحَوَارِیُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ﴾ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مخلص ساتھیوں نے کہا ہم ہیں اللہ تعالیٰ کے دین کے لیے تمہاری مدد کرنے والے۔ نصرت کے معنیٰ مدد کرنا ہے۔ چونکہ انصار کا لفظ استعمال ہوا ہے اس وجہ سے ان کو نصاریٰ کہا جاتا ہے۔

''صابئین'' کا گروہ

﴿وَالصّٰبِـِٕیْنَ﴾ اور جو صابی ہیں۔ ''صباء'' کا لفظی معنیٰ ہے ایک دین سے دوسرے دین کی طرف پھر جانا۔ اسی وجہ سے مشرکین مکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھیوں کو ''صابی'' کہتے تھے۔ جس طرح آج کل حق والوں کو لوگ ''وہابی'' کہتے ہیں۔ کہ یہ لوگ آبائی دین سے پھر کر دوسرے دین کی طرف چلے گئے ہیں۔ حالانکہ یہ صرف ان کا وہم تھا پیغمبر تو پیدائشی طور پر موحد ہوتا ہے۔ اور شرک کے قریب تک نہیں جاتا۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کو تبلیغ کا حکم اس وقت ہوتا ہے۔ جب ان کو نبوت عطا کی جاتی ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو چالیس سال کی عمر میں تاجِ نبوۃ پہنایا گیا۔ اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تبلیغ شروع کی مگر وہ لوگ سمجھتے تھے کہ یہ پہلے ہمارے ساتھ تھے اور اب پھر گئے ہیں۔ تو یہ ''صابی'' کون لوگ تھے تفسیروں میں ان کے متعلق بہت کچھ لکھا گیا ہے ان میں سے ایک وجہ یہاں لکھی جاتی ہے:

①...... ''صابی'' ایک فرقہ تھا جو حضرت داوٗد علیہ السلام کو نبی مانتے تھے اور زبور پر ایمان رکھتے تھے، نماز روزے کے قائل تھے اور قیامت کو بھی مانتے تھے اور بھی دین کی بہت ساری صحیح باتوں کو مانتے تھے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ ستاروں کی بھی پوجا کرتے تھے۔ یعنی شرک کی بیماری ان کو لگ گئی تھی۔

جس طرح عرب صدیوں تک حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کے سچے دین پر چلتے رہے۔ مگر بعد میں شرک میں مبتلاء ہو گئے۔

عرب میں شرک کی ابتداء

پہلا بدبخت انسان جس نے عرب میں شرک پھیلایا وہ ''عمرو بن لحی بن قمعہ'' تھا۔ اس سے قبل سارے لوگ موحد ہوتے تھے۔ اور یہ شخص اخلاق میں اتنا گرا ہوا تھا کہ بخاری شریف کی روایت کے مطابق بیت اللہ شریف کے طواف کے دوران کسی کے کندھے پر عمدہ چادر دیکھتا تو کنڈی کے ذریعہ وہ اٹھا لیتا تھا جس طرح مچھلی پکڑنے کی کنڈی ہوتی ہے اس طرح اس نے کنڈی بنائی ہوئی تھی۔ اور کسی لکڑی کے ساتھ جوڑی ہوئی تھی۔ لوگ اپنے شوق میں طواف کرتے اور یہ آرام سے چادر اڑا لیتا تھا اور اپنے پیچھے ایک تھیلا رکھا ہوا تھا اس میں ڈال لیتا تھا۔

اس وقت عمرہ کرنے والے آدمی تو بہت کم ہوتے تھے۔ اگر کوئی دیکھ لیتا تو معذرت کر لیتا کہ اتفاقاً کنڈی اٹک گئی ہے جو اتنا اخلاق سے گرا ہوا اور فاجر ہو کہ طواف کرتے وقت لوگوں کے کپڑے اتار لے اس پر اعتماد کرنے کا کیا معنیٰ ہے؟ اور اس کے ایجاد کردہ دین کو کیا اختیار کرنا ہے۔ مگر لوگ تو انتہائی بدکردار کے پیچھے بھی لگ جاتے ہیں۔ اور وہ اس چیز کو دلیل بنا لیتے ہیں کہ اتنے لوگ ہمارے ساتھ ہیں اگر جھوٹے ہوتے تو اتنے لوگ ہمارے ساتھ کیوں ہوتے؟

جیسا کہ گوجرانوالا میں ایک آدمی نے ''مہدی'' ہونے کا دعویٰ کیا۔ اس کے متعلق اخبارات میں بھی آیا تھا کچھ بے وقوف لوگ اس کے اردگرد بھی جمع ہو گئے تو کیا یہ اس کے ''مہدی'' ہونے کی دلیل ہے۔ آپ کپڑے پہن کر بازار سے گزرو تو آپ کے آس پاس لوگ جمع نہیں ہوں گے اور اگر کپڑے اتار دو تو کتنا بڑا مجمع تمہارے اردگرد جمع ہو جائے گا۔ اور نعرے مفت میں لگیں گے۔

تو ''صابیوں'' کی بات ہو رہی تھی کہ وہ لوگ حضرت داؤد علیہ السلام کو مانتے تھے زبور پر ایمان رکھتے تھے، نماز روزے کے قائل تھے مگر اس کے ساتھ ساتھ ستاروں کی بھی پوجا کرتے تھے۔

ایمان باللہ کی جامعیت

ان فرقوں کو بیان کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ﴿مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ﴾ جو شخص بھی ایمان لایا اللہ تعالیٰ پر اور آخرت کے دن پر۔ رب تعالیٰ پر سچے دل سے ایمان لائے کہ اس کے پیغمبروں پر ایمان لائے، اس کی کتابوں کو بھی مانے اور فرشتوں کا قائل ہو۔ قیامت کو مانے، جنت، دوزخ کا قائل ہو۔ ایک آدمی کہتا ہے میں اللہ تعالیٰ کو مانتا ہوں مگر پیغمبروں اور کتابوں اور فرشتوں کا قائل نہیں ہوں۔ جنت دوزخ کو نہیں مانتا، حشر نشر کا قائل نہیں ہوں۔ تو یہ تو رب تعالیٰ کو ماننے والا نہیں ہے۔

رب تعالیٰ کا ماننا تو یہ ہے کہ جو اس نے کہا ہے اس کو بھی مانے اور آخرت کو ماننے کا مطلب یہ ہے کہ قیامت کو مانتے ہیں کہ وہ آنے والی ہے اور صرف بات ہی کافی نہیں ہے کہ ایمان لایا اللہ تعالیٰ پر بلکہ ﴿وَعَمِلَ صَالِحًا﴾ اور اس نے عمل کیا اچھا۔

یعنی ایمان کے ساتھ، ساتھ اعمال بھی اچھے کرے۔ کیونکہ اچھے برے عمل کا اثر ہوتا ہے۔ اور اس کا دیکھنے والوں پر بھی اثر پڑتا ہے۔ اور لوگ ان چیزوں کو محسوس کرتے ہیں۔ آدمی خود محسوس کرے یا نہ کرے؟ خصوصاً وہ حضرات جو وعظ و تبلیغ کرتے ہیں حق بیان کرتے ہیں ان کو خاص خیال کرنا چاہیے۔ کیونکہ ایک آدمی دوسروں کو حق بتاتا ہے، نیکی کی تبلیغ کرتا ہے اور خود عمل نہیں کرتا۔

①...... تو ایک تو اس کا روحانی طور پر اثر کم ہوتا ہے کہ لوگ اس کی بات سے متاثر نہیں ہوتے۔

②...... اور دوسرا یہ کہ لوگ متنفر ہوتے ہیں۔ لہٰذا ہر آدمی کو اپنے گریبان میں جھانکنا چاہیے اور اپنی اصلاح کرنی چاہیے۔

خصوصاً ''داعی الی اللہ'' جو دوسروں کو اللہ تعالیٰ کی دعوت دیتا ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ پہلے وہ اپنی اصلاح کرے۔

ٹی، وی دیکھنے کے بارے میں

سوال: ایک جگہ کسی نے سوال کیا کہ ہمارے امام صاحب ٹی، وی دیکھتے ہیں اور گفتگو میں فحش گوئی سے بھی کام لیتے ہیں ایسے آدمی کی امامت کا کیا حکم ہے؟

جواب: میں نے کہا ٹی، وی دیکھنے والے کے پیچھے نماز مکروہ ہوتی ہے اور فحش گوئی کرنے والے کے پیچھے بھی نماز مکروہ ہے۔ اور اگر ایسا آدمی سچے دل سے توبہ کرے تو اس کا گناہ بھی مٹ جائے گا اور کراہت بھی ختم ہو جائے گی ہر آدمی کو اپنے اعمال کی اصلاح کرنی چاہیے۔ خصوصاً درس دینے والوں کو اس بات کا اہتمام کرنا چاہیے کیونکہ میں سناسنا کے بوڑھا ہو گیا ہوں اور تم سن، سن کے بوڑھے ہو گئے ہو اگر اثر نہ ہوا تو کچھ بھی نہ ہوا۔

فرمایا ﴿فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ﴾ پس ان کے لیے اجر ہے ان کے رب کے پاس ﴿وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ﴾ اور نہ ان پر خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

پہلے بھی بنی اسرائیل کے واقعات کا ذکر تھا آگے بھی انہی کا واقعہ بیان فرماتے ہیں کہ بنی اسرائیل نے وادئ سینائی میں پہنچ کر موسیٰ علیہ السلام سے مطالبہ کیا کہ پہلے ہم فرعون کے غلام تھے اور اب ہم آزاد قوم ہیں۔ ہمارے لیے کوئی قانون اور دستور ہونا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو توراۃ عطا فرمائی تو انہوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ اس کے احکام تو بہت مشکل ہیں ہم ان پر عمل نہیں کر سکتے اس وقت اللہ تعالیٰ نے ان سے عہد لیا اس کا ذکر ہے۔

فرمایا ﴿وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ﴾ اور جب ہم نے تم سے پختہ عہد لیا۔ ﴿وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ﴾ اور بلند کیا ہم نے تمہارے اوپر طور پہاڑ کو، حکم ہوا ﴿خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ﴾ پکڑو اس چیز کو جو ہم نے تمہیں دی ہے یعنی توراۃ، قوت کے ساتھ ﴿وَّاذْكُرُوْا مَا فِيْهِ﴾ اور یاد کرو جو اس میں ہے اور اس پر عمل بھی کرو۔ ﴿لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ﴾ تاکہ تم بچ جاؤ رب تعالیٰ کی گرفت سے اور آخرت کے عذاب سے۔

سوال: اب یہاں پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ دین میں جبر نہیں ہے کوئی مانتا ہے مانے، نہیں مانتا نہ مانے۔ چنانچہ قرآنِ کریم میں رب تعالیٰ کا ارشاد ہے ﴿لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ﴾ دین میں زبردستی نہیں ہے اور ان سے جبراً تورات منوائی جارہی ہے۔ طور پہاڑ کو

اٹھا کر ان کے سروں پر رکھ کر سائبان کی طرح کہ اگر نہیں مانو گے تو یہ پہاڑ تمہارے سروں پر گرا دیا جائے گا۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے: ﴿وَاِذْ نَتَقْنَا الْجَبَلَ فَوْقَهُمْ كَاَنَّهٗ ظُلَّةٌ﴾ [الاعراف:۱۷۱] اور ہم نے پہاڑ اکھیڑ کر ان کے سروں پر معلق کر دیا گویا کہ سائبان ہے۔ اس طرح منوانا تو جبر ہے؟

جواب: یہ ﴿لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ﴾ کی مد میں نہیں آتا کیونکہ ان کو جبراً اسلام میں داخل نہیں کیا جا رہا بلکہ وہ اسلام لا چکے ہیں اور حالت اسلام میں انہوں نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ عہد کیا تھا کہ ہمیں کتاب دو ہم اس پر عمل کریں گے۔ مگر اس عہد پر وہ قائم نہ رہے۔ چنانچہ چھٹے پارے میں آتا ہے: ﴿فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ لَعَنّٰهُمْ﴾ [المائدہ:۱۳] بوجہ ان کے عہد کو توڑنے کے ہم نے ان پر لعنت کی چونکہ انہوں نے عہد کو توڑا اس لئے ان کے ساتھ یہ کارروائی کی گئی۔

مرتد کی سزا

اس کو آپ اس طرح سمجھیں کہ کسی کافر کو اسلام لانے پر مجبور نہیں کیا جائے گا کہ اس کو کہا جائے کہ تو اسلام قبول کر، ورنہ تجھے قتل کر دیں گے۔ ہاں اگر کوئی شخص مسلمان ہونے کے بعد مرتد ہو جائے تو اس کو ضابطے کے مطابق قتل کیا جائے گا۔ اور اب اس کو قتل اس لئے کیا جائے گا کہ اس نے اسلام قبول کر کے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے ساتھ جو عہد کیا تھا ((لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ)) اس کو توڑ دیا ہے۔ تو ان پر جبر عہد توڑنے کی وجہ سے ہوا۔

﴿ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ﴾ پھر، پھر گئے تم ﴿مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ﴾ اس کے بعد کہ تورات پر تم نے پورا عمل نہ کیا ﴿فَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ﴾ پس اگر نہ ہوتا اللہ تعالیٰ کا فضل تم پر ﴿وَرَحْمَتُهٗ﴾ اور اس کی رحمت ﴿لَكُنْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ﴾ البتہ تم ہو جاتے نقصان اٹھانے والوں میں سے۔ لیکن اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے تم پر اپنی رحمت کا دامن پھیلائے رکھا، تمہیں صحت دی، رزق دیا، اولاد دی، مال اور دولت سے نوازا۔

بنی اسرائیل پر ہفتے والے دن شکار پر پابندی

آگے بنی اسرائیل کے ایک اور واقعہ کا ذکر ہے۔ حضرت داوٗد علیہ السلام کا زمانہ تھا بحر قلزم کے کنارے ''ایلہ'' نامی ایک شہر آباد تھا جس کو آج کل ''ایلات'' کہتے ہیں۔ اور یہودیوں کی بندرگاہ ہے۔ بحر قلزم میں مچھلیاں بہت تھیں۔ اور ان کا پیشہ مچھلیوں کی تجارت تھا۔ مچھلیاں پکڑ کر کھاتے بھی اور دور دراز تک سپلائی بھی کرتے۔ ان پر ہفتے والے دن شکار کھیلنے پر پابندی تھی کہ باقی چھ دن مچھلیاں پکڑ سکتے ہیں اور ہفتے والے دن کے چوبیس گھنٹے، اس طرح سمجھو کہ جمعہ والے دن غروب آفتاب سے لے کر اگلے دن غروب آفتاب تک مچھلیاں پکڑنی جائز نہیں تھیں۔ اسلامی تاریخ غروب آفتاب کے ساتھ بدلتی ہے اور انگریزی تاریخ رات بارہ بج کر ایک منٹ پر بدلتی ہے۔

بہر حال ان پر ہفتے والے دن شکار کرنے پر پابندی تھی جس طرح ہمارے لیے جمعہ والے دن پہلی اذان سے لے کر

امام کے سلام پھیرنے تک پابندی ہے کہ اس دوران ہر وہ کام جس کا تعلق نماز جمعہ سے نہ ہو حرام ہے جیسے سودا سلف خریدنا، بیچنا، لکھنا، پڑھنا، کھانا، پینا سب حرام ہے۔

سوال: اب سوال یہ ہے کہ کہیں اذان پہلے ہو جاتی ہے اور کہیں بعد میں ہوتی ہے۔ اس کا کیا حکم ہے؟

جواب: تو اس کا جواب یہ ہے کہ ان کے محلے کی اذان مراد ہوگی۔ جس محلے میں وہ رہتے ہیں اور اس مسجد کی اذان مراد ہوگی جس میں وہ جمعہ پڑھتے ہیں۔ اور دوسرا سوال یہ ہے کہ......

سوال: نمازِ جمعہ کے ساتھ کن کاموں کا تعلق ہے؟

جواب: اس کا جواب یہ ہے کہ اذان کے بعد وضوء کر سکتا ہے غسل کر سکتا ہے، مسواک کر سکتا ہے، خوشبو لگا سکتا ہے، خطیب، امام ہے تو جمعہ کے متعلق عنوان کا مطالعہ کر سکتا ہے۔ حوالے دیکھ سکتا ہے۔ قرآن کریم کی کوئی آیت کریمہ دیکھنی ہے یا حدیث پاک دیکھنی ہے تو دیکھ سکتا ہے کیونکہ ان سب کا تعلق جمعہ کے ساتھ ہے اور جن چیزوں کا تعلق نماز کے ساتھ نہیں ہے اچھی طرح سمجھ لو کہ وہ اذان اوّل سے لے کر امام کے سلام پھیرنے تک حرام ہیں۔

مگر اچھے بھلے لوگ خرید و فروخت کرتے رہتے ہیں اور حلال کو حرام کر کے کھاتے ہیں۔ پھر ہمارے لئے تو ڈیڑھ دو گھنٹوں کا وقت ہے اور ان کے لئے چوبیس گھنٹے تھے کہ ان میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کے سوا اور کوئی کام جائز نہیں تھا۔

شکار کرنے یا نہ کرنے کے بارے میں تین گروہ

وہاں کے لوگ تین حصوں میں تقسیم ہو گئے۔

①...... ایک گروہ نے ہفتے والے دن مچھلیوں کا شکار شروع کر دیا۔

②...... دوسرا گروہ، وہ تھا جنہوں نے ان کو ایک آدھ مرتبہ منع کیا جب دیکھا کہ یہ لوگ باز آنے کے لیے تیار نہیں ہیں تو خاموش ہو کر بیٹھ گئے۔

③...... تیسرا گروہ، وہ تھا جو آخر دم تک ان کو تاہی کرنے والوں کو سمجھاتا رہا۔

پھر جو شکار کرتے تھے اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے مزید آزمائش کر دی کہ ہفتے والے دن مچھلیاں باقی دنوں کی نسبت زیادہ ہوتی تھیں۔ یہ دیکھ کر برداشت نہیں کرتے تھے اور وہ حیلے بہانے کے ساتھ شکار کھیلتے تھے کہ بحر قلزم سے چھوٹے چھوٹے راجباہ نکالے اور ان کے ذریعہ پانی تالابوں کو لگاتے، جدھر پانی جاتا مچھلیاں بھی ساتھ جاتیں۔ پھر پیچھے سے پانی بند کر دیتے اور پھر پورا ہفتہ پکڑتے رہتے۔ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے حکم کا حلیہ بگاڑ دیا۔

شکلوں کا مسخ ہو جانا

جب ان سے کہا جاتا کہ یہ کام نہ کرو شریعت کی خلاف ورزی ہے تو کہتے کہ ہم ہفتے والے دن تو شکار نہیں کھیلتے بھائی!

شکار کسے کہتے ہیں؟ جب ایک چیز کی آزادی ختم ہوگئی تو وہ شکار ہوگئی۔ چونکہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے حکم میں چالاکی کی تو اللہ تعالیٰ نے نوجوانوں کو بندروں کی شکل میں مسخ کر دیا اور بوڑھوں کو خنزیروں کی شکل میں بدل دیا کیونکہ وہ ان کو روکتے نہیں تھے۔ بندر اور خنزیر بننے کے بعد وہ ایک دوسرے کو پہچانتے تھے اور روتے تھے مگر اب کیا ہوسکتا تھا؟ یہ تین دن تک زندہ رہے۔ تین دن کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان سب کو ہلاک کر دیا۔ یہ جو آج بندر اور خنزیر موجود ہیں یہ ان لوگوں کی نسل نہیں ہے۔ یہ مستقل حیوانوں کی نسل ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ﴿وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ﴾ اور البتہ تحقیق تم جانتے ہو ﴿الَّذِيْنَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ﴾ ان لوگوں کو جنھوں نے تجاوز کیا تم میں سے ﴿فِي السَّبْتِ﴾ ہفتے کے دن ﴿فَقُلْنَا لَهُمْ﴾ پس کہا ہم نے ان کو ﴿كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِـِٕيْنَ﴾ ہو جاؤ بندر ذلیل۔ یہاں پر ''بندروں'' کا ذکر ہے اور دوسرے مقام پر خنزیروں کا بھی ذکر ہے۔

﴿فَجَعَلْنٰهَا نَكَالًا﴾ پس بنایا ہم نے اس واقعہ کو عبرت ﴿لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا﴾ ان لوگوں کے لیے جو اس سے پہلے تھے ﴿وَمَا خَلْفَهَا﴾ اور جو پیچھے آنے والے تھے۔ جس طرح آج کل کوئی واقعہ ہو تو وہ مشرق، مغرب والوں کے لئے شمال، جنوب والوں کے لیے عبرت ہوتا ہے۔

گانے بجانے کا وبال بصورت مسخ اشکال

بخاری شریف، ترمذی شریف اور ابوداؤد شریف میں حدیث آتی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ قیامت کے قریب میری اُمت میں بھی کچھ لوگ بندر اور خنزیر بنائے جائیں گے۔ آپ ﷺ سے سوال کیا گیا کہ حضرت! وہ کلمہ نہیں پڑھتے ہوں گے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ: ((يُصَلُّوْنَ وَ يَصُوْمُوْنَ وَ يَحُجُّوْنَ)) نماز بھی پڑھتے ہوں گے، روزے بھی رکھتے ہوں گے اور حج بھی کرتے ہوں گے مگر گانے بجانے کے بڑے دل دادہ ہوں گے۔ پہلے صرف ریڈیو ہوتا تھا اب ٹی، وی / وی، سی، آر / کیبل آ گئے۔ نہ جانے اور کتنی چیزیں بنائی جائیں گی۔ جن کے ذریعے گانے بجانے کا شوق پورا کیا جائے گا؟

ایسے لوگ رات کو گانے بجانے کی مجلس میں بیٹھے ہوں گے انسانوں کی شکل میں اور صبح کو بندر اور خنزیر کی شکل میں تبدیل کر دیئے جائیں گے۔ نہ نمازیں بچا سکیں گی، نہ روزے۔ تو ایسی نمازوں اور روزوں کا کیا فائدہ کہ برے کام نہ چھوڑیں۔ صرف نماز پڑھ کر خوش نہ ہوں۔ بلکہ ان کو بچانے کا بھی سوچیں۔ ان کو ضائع نہ کریں۔

اور مسئلہ یہ ہے کہ ٹی، وی / وی، سی، آر دیکھنا حرام ہے اگر کوئی شخص ان کو حرام سمجھتے ہوئے دیکھتا ہے تو گنہگار ہے اور اگر ان کو حلال سمجھ کر دیکھے گا تو اس کا نکاح ٹوٹ جائے گا۔ کیونکہ حرام کو حلال سمجھنا بڑا سخت گناہ ہے۔ مغربی قوموں نے ماحول ایسا بنا دیا ہے کہ ہم ان چیزوں کو گناہ سمجھتے ہی نہیں۔

حفاظتِ اعمال

بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہم تو نہیں دیکھتے مگر اولاد کے مجبور کرنے پر ان کو لا کر دیا ہے۔ تو اس طرح تم معذور تو

نہیں ہو سکتے۔ (حاشا وکلا)۔ کیونکہ تم گھر کے سربراہ ہو اور بااختیار ہو۔ کیوں لاکر دیا ہے؟ اکڑ جاؤ، انکار کر دو۔ تم نے جب خود لاکر دیا ہے تم گناہ میں شریک ہو۔ اللہ تعالیٰ ہمیں سچے دل سے توبہ کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور ہماری زبانوں اور نگاہوں کی حفاظت فرمائے۔

﴿وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ﴾ اور یہ واقعہ نصیحت ہے پرہیزگاروں کے لیے۔ لیکن ایسے واقعات سے نصیحت اور عبرت وہی حاصل کرتا ہے کہ جس میں انسانیت کا مادہ ہو۔ رب تعالیٰ ہمیں انسان بنائے اور گناہوں سے ہماری حفاظت فرمائے اور خود بھی نماز، روزہ، حج، عمرہ، کلمہ کو بچاؤ اور ٹی، وی دیکھ کر سب کچھ برباد نہ کرو۔

﴿وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖٓ﴾ اور جب کہا موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے ﴿اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ﴾ بے شک اللہ تعالیٰ تمھیں حکم دیتا ہے ﴿اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً﴾ کہ تم ایک گائے ذبح کرو ﴿قَالُوْٓا اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا﴾ کہنے لگے کیا بناتا ہے تو ہمیں ٹھٹھا کیا ہوا ﴿قَالَ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ﴾ فرمایا میں پناہ میں آتا ہوں اللہ تعالیٰ کی ﴿اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ﴾ اس بات سے کہ ہو جاؤں میں جاہلوں سے ﴿قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ﴾ کہنے لگے دعا کر اپنے پروردگار سے ہمارے لیے ﴿يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ﴾ بیان کرے وہ ہمارے لیے کہ وہ گائے کیسی ہو؟ ﴿قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ﴾ فرمایا (موسیٰ علیہ السلام نے) بے شک اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ﴿اِنَّهَا بَقَرَةٌ﴾ بے شک وہ گائے ﴿لَّا فَارِضٌ وَّلَا بِكْرٌ﴾ نہ بوڑھی ہو اور نہ بالکل نوعمر ہو ﴿عَوَانٌۢ بَيْنَ ذٰلِكَ﴾ اس کے درمیان میں ہو ﴿فَافْعَلُوْا مَا تُؤْمَرُوْنَ﴾ پس کرو تم جس کا تمھیں حکم دیا جاتا ہے ﴿قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ﴾ کہنے لگے دعا کر ہمارے لیے اپنے پروردگار سے ﴿يُبَيِّنْ لَّنَا مَا لَوْنُهَا﴾ بیان کرے ہمارے لیے اس گائے کا رنگ کیا ہے؟ ﴿قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ﴾ فرمایا بے شک وہ کہتا ہے ﴿اِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَآءُ﴾ بے شک وہ گائے ہے زرد رنگ کی ﴿فَاقِعٌ لَّوْنُهَا﴾ خالص ہے رنگ اس کا ﴿تَسُرُّ النّٰظِرِيْنَ﴾ خوش کرتی ہے دیکھنے والوں کو ﴿قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ﴾ کہنے لگے دعا کر ہمارے لیے اپنے پروردگار سے ﴿يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ﴾ بیان کرے ہمارے لیے کہ وہ گائے کیسی ہے؟ ﴿اِنَّ الْبَقَرَ تَشٰبَهَ عَلَيْنَا﴾ بے شک گائے مشتبہ ہوگئی ہے ہم پر ﴿وَاِنَّآ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ﴾ اور بے شک ہم اگر اللہ تعالیٰ نے چاہا تو ﴿لَمُهْتَدُوْنَ﴾ ہدایت پانے والے ہوں گے ﴿قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ﴾ فرمایا موسیٰ علیہ السلام نے بے شک اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ﴿اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا ذَلُوْلٌ﴾ بے شک وہ گائے ایسی ہو جو نہ تابع کی ہوئی ہو ﴿تُثِيْرُ الْاَرْضَ﴾ کہ اس نے ہل چلایا ہو زمین میں ﴿وَلَا تَسْقِي الْحَرْثَ﴾ اور نہ اس نے پانی پلایا ہو کھیتی کو ﴿مُسَلَّمَةٌ لَّا شِيَةَ فِيْهَا﴾ ان چیزوں سے محفوظ ہو اس میں داغ نہ ہو ﴿قَالُوا الْـٰٔنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ﴾ کہنے لگے اب لایا

ہے توحق ﴿فَذَبَحُوْهَا﴾ پس انھوں نے گائے کو ذبح کیا ﴿وَمَا كَادُوْا يَفْعَلُوْنَ﴾ اور وہ ایسا کرنے کے قریب نہیں تھے۔

ربط

بنی اسرائیلیوں کی کوتاہیاں، ان کے عیب اوران کے جرائم کا ذکر اُوپر چلا آرہا ہے۔

بنی اسرائیل میں واقعہ قتل

یہ واقعہ بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں پیش آیا۔ایک شخص تھا جس کا نام تھا عامیل بروزن قابیل۔ یہ بڑا مال دار آدمی تھااور ایک روایت کے مطابق تھا بھی لاولد یعنی بے اولاد تھا۔

ایک تفسیری روایت میں آتا ہے کہ اس کے چچازاد بھائی بڑے غریب تھے انھوں نے اس کو کہا کہ ہم بھوکے رہتے ہیں اور تیرے بھائی ہیں تیرے پاس اتنا مال ہے اور کھانے والا بھی کوئی نہیں ہے۔ لہٰذا ہماری امداد کرلوگ کہتے ہیں اور عموماً دیکھنے میں بھی ایسا ہی آیا ہے کہ لاولد آدمی بڑا بخیل ہوتا ہے۔ کہنے لگا مجھ سے کیوں مانگتے ہو؟ کماؤ اور کھاؤ۔

انھوں نے کہا کہ ہم فارغ تو نہیں رہتے۔ مگر ہماری قسمت کہ کبھی کام مل جاتا ہے اور کبھی نہیں ملتا۔ اور جو ملتا ہے اس سے ہماری ضروریات پوری نہیں ہوتیں اور تیرے پاس اتنی دولت ہے جو شمار میں بھی نہیں آتی۔ اس سے ہماری مدد کر مگر اس نے کوئی بات نہ سنی۔ تو انھوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ ہمارے سوا اس کا کوئی اور وارث تو ہے نہیں ہم اس کے چچازاد ہی وارث ہیں لہٰذا اس کو راستہ سے ہٹاؤ، اس سے جان چھڑاؤ اور مال پر قبضہ کرو۔ چنانچہ انھوں نے اس کو قتل کر دیا اور قتل کرنے کے بعد موسیٰ علیہ السلام کے پاس آئے کہ ہمارے چچازاد کو کسی نے قتل کر دیا ہے اس کی تحقیق کرو۔

اور ایک روایت میں ہے کہ وہ ان کا چچا تھا۔ اور یہ اس کے بھتیجے تھے۔ بہر حال ان کا خیال تھا کہ موقع کا گواہ تو ہے کوئی نہیں کیونکہ ہمیں قتل کرتے ہوئے کسی نے دیکھا نہیں ہے۔ اور ضابطہ یہ ہے کہ اَلْبَيِّنَةُ عَلَى الْمُدَّعِىْ وَالْيَمِيْنُ عَلٰى مَنْ اَنْكَرَ مدعی کے ذمہ گواہ ہوتے ہیں اگر اس کے پاس گواہ نہ ہوں تو منکر پر قسم آتی ہے۔ اور ہم خود مدعی ہم پر تو کسی نے شبہ کرنا نہیں اور ہم نے بھی کسی پر شبہے کا اظہار نہیں کرنا اور اگر ہمیں قسم کا کہا گیا تو قسم اُٹھانی کون سی مشکل ہے؟ اُٹھالیں گے اس طرح معاملہ رفع دفع ہوجائے گا۔ اور اس کا مال ہم سمیٹ لیں گے مگر ان کا خیال باطل ثابت ہوا اور موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا حکم سن لو اس کا ذکر ہے۔

قاتلوں کی حیلہ سازی

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ﴿وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖٓ﴾ اور جب کہا موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے۔ قوم سے مراد وہ آدمی ہیں

جو قتل کر کے خود مدعی بن گئے تھے۔ ان کو کہا ﴿اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ﴾ بے شک اللہ تعالیٰ تمھیں حکم دیتا ہے ﴿اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً﴾ کہ تم ایک گائے ذبح کرو۔ عربی زبان میں "بقرہ" گائے کو بھی کہتے ہیں اور بیل کو بھی۔ اس لیے بعض مفسرین نے بیل کا ترجمہ کیا ہے جیسے حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے، کیونکہ آگے ہل چلانے کا ذکر آرہا ہے، کنویں پر جوتنے کا ذکر آرہا ہے اور عموماً یہ کام بیل سے لیے جاتے ہیں اور بعض علاقوں میں یہ کام گائے سے بھی لیتے ہیں اس لیے دونوں ترجمے صحیح ہیں۔

بہرحال جب موسیٰ علیہ السلام نے گائے یا بیل کے ذبح کرنے کا فرمایا تو ﴿قَالُوْٓا اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا﴾ کہنے لگے کیا بناتا ہے تو ہمیں ٹھٹھا کیا ہوا۔ ہمارے ساتھ مسخرہ کرتے ہو کہ ایک تو ہمارے گھر آدمی مرا پڑا ہے اور دوسرا ہمیں کہتے ہو کہ گائے ذبح کرو۔

﴿قَالَ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ﴾ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا میں پناہ میں آتا ہوں اللہ تعالیٰ کی ﴿اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ﴾ اس بات سے کہ ہو جاؤں میں جاہلوں میں سے۔ کیوں کہ محض مسخرہ اور مذاق جاہلوں کا کام ہے۔ ہاں اگر ظرافت کے طور پر ہو اور اس میں خلاف واقعہ بھی کوئی بات نہ ہو تو اس کا مسئلہ جدا ہے یعنی ایسا مذاق جائز ہے۔ لیکن اگر خلاف واقعہ ہو اور دوسرے کی دل آزاری مقصود ہو تو گناہ ہے۔ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایسا مذاق جھگڑے کا باعث بن جاتا ہے اور نوبت قتل تک جا پہنچتی ہے۔ تو موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ میں جاہلوں میں سے نہیں ہوں کہ تمھارے ساتھ مذاق کروں۔ لہٰذا تم اس گائے کو ذبح کرو اور اس کے بعض حصے کو میت کے بدن پر مارو بس وہ زندہ ہو کر تمھیں بتا دے گا کہ میرا قاتل کون ہے۔ اب رہا یہ سوال کہ گائے کا کون سا حصہ میت کے ساتھ لگایا گیا؟

☆...... بعض نے کہا ہے کہ "زبان" تھی۔

☆...... بعض نے کہا ہے کہ "دل" تھا۔

☆...... بعض نے کہا ہے کہ "جگر" تھا۔

☆...... اور بعض نے "دُم" لکھی ہے۔

بہرحال اس حصے کی تعیین کا ذکر قرآن کریم میں نہیں ہے۔ کیوں کہ بِبَعْضِهَا کے لفظ ہیں۔ چوں کہ ان کے دل صاف نہیں تھے کج بحثی میں پڑ گئے۔ ان کا خیال تھا کہ اس طرح معاملہ ٹل جائے گا۔

بلاضرورت سوالات

﴿قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ﴾ کہنے لگے دعا کر اپنے پروردگار سے ہمارے لیے ﴿يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ﴾ بیان کرے وہ ہمارے لیے کہ وہ گائے کیسی ہو؟ ﴿قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ﴾ فرمایا موسیٰ علیہ السلام نے بے شک اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ﴿اِنَّهَا بَقَرَةٌ﴾ بے شک وہ گائے ﴿لَّا فَارِضٌ وَّلَا بِكْرٌ﴾ نہ بوڑھی ہو اور نہ بالکل نوعمر ہو ﴿عَوَانٌ بَيْنَ ذٰلِكَ﴾ اس کے درمیان میں ہو، ادھیڑ عمر کی۔

حدیث پاک میں آتا ہے کہ وہ کوئی بھی گائے ذبح کر دیتے تو کفایت کر جاتی مگر ((فَلَمَّا شَدَّدُوْا عَلٰى اَنْفُسِهِمْ

شَدَّدَ اللهُ)) پس انھوں نے جب اپنی جانوں پر سختی سے کام لیا تو اللہ تعالیٰ نے بھی ان پر سخت پابندی لگادی۔ جیسا کہ آگے آرہا ہے۔

توحکم ہوا ﴿فَافْعَلُوْا مَا تُؤْمَرُوْنَ﴾ پس کرو تم جس کا تمھیں حکم دیا جاتا ہے ﴿قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ﴾ کہنے لگے دعا کر ہمارے لیے اپنے پروردگار سے ﴿يُبَيِّنْ لَّنَا مَا لَوْنُهَا﴾ بیان کر ہمارے لیے اس گائے کا رنگ کیا ہے؟ تا کہ ہم تعیین کرسکیں ﴿قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ﴾ فرمایا بے شک وہ کہتا ہے ﴿اِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَآءُ﴾ بے شک وہ گائے ہے زرد رنگ کی ﴿فَاقِعٌ لَّوْنُهَا﴾ خالص ہے رنگ اس کا ﴿تَسُرُّ النّٰظِرِيْنَ﴾ خوش کرتی ہے وہ گائے دیکھنے والوں کو۔ بڑی صحت منداور خوب صورت ہے۔

نظر کا لگ جانا حق ہے؟

جس طرح انسانوں میں خوب صورت ہوتے ہیں اسی طرح جانوروں میں بھی خوب صورت ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے نظر بھی لگ جاتی ہے نظر کا لگ جانا بھی حق ہے۔ حدیث پاک میں آتا ہے کہ ((اَلْعَيْنُ حَقٌّ)) نظر کا لگ جانا حق ہے۔ نظر لگنے کا مفہوم یہ ہے کہ انسان جب کسی شے کی صحت اور خوب صورتی پر تعجب کا اظہار کرتا ہے کہ اتنی صحت مند ہے، اتنی خوب صورت ہے تو اللہ تعالیٰ فوراً اس میں عیب پیدا کردیتے ہیں کہ اس کا کمال بھی میرے اختیار میں اور اس کا زوال بھی میرے اختیار میں ہے اس میں بندے کا کوئی دخل اور اختیار نہیں ہے۔ سوائے تعجب کے اظہار کرنے کے۔

حدیث پاک میں آتا ہے حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نظر کا دم ہے: ((مَا شَآءَ اللهُ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللهِ)) اگر کسی کو شبہ ہو کہ میری نظر لگ گئی ہے تو وہ پڑھے اور جس کو نظر لگ گئی ہے پڑھ کر اس کو دم کرے۔ باقی دم میں اثر اللہ تعالیٰ نے رکھنا ہے۔ اور عموماً بغیر محنت اور مشقت کے تعویذات اور دم کا اثر کم ہوتا ہے۔ ہاں آدمی نماز، روزے کا پابند ہو اور تین روزے نفلی رکھے مسلسل پھر دم کرے تو اللہ تعالیٰ اس کے دم میں اثر رکھے گا اور دم اس لیے کہ اس کا بھی لوگوں کو فائدہ ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی مخلوق کو فائدہ پہنچانا بھی نیکی ہے۔ مگر کوئی عمل اور تعویذ اور اس کا طریقہ کار شرع کے خلاف نہ ہو۔

بہر حال جب ان کو رنگ بتایا گیا تو ﴿قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ﴾ کہنے لگے دعا کر ہمارے لیے اپنے پروردگار سے ﴿يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ﴾ بیان کرے ہمارے لیے کہ وہ گائے کیسی ہے؟ ﴿اِنَّ الْبَقَرَ تَشٰبَهَ عَلَيْنَا﴾ بے شک گائے مشتبہ ہوگئی ہے ہم پر۔ کہ زرد رنگ کی بھی گائیں بہت ہیں اور اُدھیڑ عمر کی بھی بہت ہیں اور وضاحت فرمادیں ﴿وَاِنَّآ اِنْ شَآءَ اللهُ لَمُهْتَدُوْنَ﴾ اور بے شک ہم اگر اللہ تعالیٰ نے چاہا تو ہدایت پانے والے ہوں گے۔

﴿قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ﴾ فرمایا موسیٰ علیہ السلام نے بے شک اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ﴿اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا ذَلُوْلٌ﴾ بے شک وہ گائے ایسی ہو جو نہ تابع کی ہوئی ہو عمل میں ﴿تُثِيْرُ الْاَرْضَ﴾ اس نے ہل چلایا ہو زمین میں ﴿وَلَا تَسْقِي الْحَرْثَ﴾ اور نہ اس نے پانی پلایا ہو کھیتی کو۔ یعنی وہ کنویں پر نہ جوتی گئی ہو۔

گائے ذبح کرنے کا حکم

ان دو لفظوں کی وجہ سے کہ ”اس نے نہ ہل چلایا ہو اور نہ اس کے ذریعے کھیتی کو سیراب کیا گیا ہو“ سے حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ ”بقرہ“ کا ترجمہ ”بیل“ سے کرتے ہیں کہ عموماً یہ دونوں کام بیل سے لیے جاتے ہیں اور میں نے پہلے بتایا ہے کہ ”بقرہ“ کا اطلاق گائے اور بیل دونوں پر کیا جاتا ہے۔

اور کیمل پور (موجودہ اٹک) کے علاقہ میں بعض لوگ گائے کے ذریعہ بھی ہل چلاتے ہیں کہ ان کی تھوڑی زمینیں ہوتی ہیں اور بیل بہت مہنگے ہیں اس لیے وہ لوگ گائے سے دودھ بھی حاصل کرتے ہیں اور ہل بھی چلاتے ہیں اور بعض دفعہ کنویں پر بھی جوت لیتے ہیں۔ تو فرمایا کہ نہ تو اس کے ذریعے ہل چلایا گیا ہو اور نہ کنویں پر جوتی گئی ہو۔

﴿مُسَلَّمَةٌ لَّا شِيَةَ فِيهَا﴾ ان چیزوں سے محفوظ ہو اس میں داغ نہ ہو۔ مفسرین کرام رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ انھوں نے ایسی گائے تلاش کی وہ ایک نوجوان کے پاس تھی۔ جو اَلْبَارُّ بِأُمِّهٖ اپنی والدہ کی بڑی خدمت کرنے والا تھا اور اس کا باپ فوت ہو گیا تھا۔

کہتے ہیں کہ اس زمانے میں عموماً گائے، بیل کی قیمت تین دینار ہوتی تھی۔ مگر اس نوجوان سے بات کی گئی کہ ہمیں اس گائے کی ضرورت ہے تو اس نے کہا کہ میرے پاس صرف گائے ہی ہے میں یہ دینے کے لیے تیار نہیں ہوں جب انھوں نے مجبور کیا تو نوجوان نے کہا کہ اس قیمت پر دیتا ہوں کہ اس کو ذبح کر کے چمڑا اُتار کر چمڑے میں جتنا سونا آئے مجھے دے دو اور یہ لے لو۔ وہ مجبور تھے انھوں نے گائے لے لی اور اس کا چمڑا سونے سے بھر کر اس کو دیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے اخراجات کا انتظام کر دیا اور ان کا بھی کام چل گیا۔

چیز مہنگی بیچنے کا شرعی حکم

اگر کوئی آدمی اپنی ذاتی چیز کو مہنگا بیچنا چاہے تو بیچ سکتا ہے بشرطیکہ حکومت کی طرف سے کوئی پابندی نہ ہو۔ مثال کے طور پر یہ میرا کمبل ہے اس کی قیمت تو دو سو روپیہ ہے۔ اگر کوئی میرے سے خریدنا چاہے اور میں کہوں کہ دو سو کا نہیں دوں گا اڑھائی سو کا دوں گا اگر لینے والا راضی ہے تو لے، لے یہ جائز ہے۔

ہاں! یہ بات بھی ذہن میں بٹھالیں کہ ایک چیز کی جو قیمت منڈی میں ہے اس کے مطابق چلنا چاہیے۔ یعنی منڈی کی قیمت سے ملتی جلتی قیمت لینی چاہیے۔ منڈی کے بھاؤ سے نکلنا بری بات ہے۔ یہ اصول ہے اگر حکومت نے ایک چیز کا بھاؤ مقرر کر دیا ہے تو پھر بات جدا ہے۔ اور اسلامی حکومت کے احکامات سے اعراض کرنا منع ہے۔ آج کل کی حکومتوں کے حکم سے نکلنا اگرچہ حرام تو نہیں مگر قانون کی مخالفت کرنا بری بات ہے۔ اور لوگوں کو لوٹنا شروع کر دے یہ بھی صحیح نہیں ہے۔

﴿قَالُوا الْـٰٔنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ﴾ کہنے لگے اب لایا ہے تو اے موسیٰ علیہ السلام حق۔ ان کا اپنے پیغمبر کو طرزِ خطاب دیکھو! کیا

انھوں نے جو کچھ پہلے فرمایا تھا وہ حق نہیں تھا وہ بھی حق تھا اور اس وقت وہ جو بھی گائے ذبح کر دیتے کفایت ہو جاتی۔

مسئلہ ❀ آدمی عبادت میں اپنے اُوپر تشدد نہ کرے فرض تو رب تعالیٰ کی طرف سے مقرر ہیں ان میں تو کمی بیشی نہیں ہو سکتی اور نفلی عبادت آسانی کے ساتھ جتنی ہو سکے اتنی کرے۔ مثلاً: نفل ہیں یا قرآن کریم کی تلاوت ہے اتنی کرے جتنا نفس برداشت کرتا۔ تھوڑی کرے روزانہ یہ بہتر ہے اس سے کہ ایک دن بہت زیادہ کرے اور دوسرے دن بالکل نہ کرے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ:

((اَحَبُّ الْاَعْمَالِ اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ اَدْوَمُهَا)).

"آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ عمل زیادہ پسند تھا جو ہمیشہ ہوتا رہے بے شک تھوڑا ہو۔"

﴿فَذَبَحُوْهَا﴾ پس انھوں نے گائے کو ذبح کیا ﴿وَمَا كَادُوْا يَفْعَلُوْنَ﴾ اور وہ ایسا کرنے کے قریب نہیں تھے۔ کیوں کہ ان کا مقصد تو یہ تھا کہ بات آئی گئی ہو جائے اور قتل ہم پر نہ پڑے۔

چنانچہ گائے کا ایک حصہ جب مقتول کو مارا گیا اس نے اُٹھ کر بتادیا کہ میرے قاتل یہی ہیں۔ تو ان کو قصاص میں قتل کر دیا گیا اور وراثت سے محروم ہو گئے۔

قاتل وراثت سے محروم ہو جاتا ہے

قاتل وراثت سے محروم ہو جاتا ہے۔ مثلاً: کسی آدمی نے باپ کو قتل کر دیا یا بھائی کو قتل کر دیا تو ان کو وراثت نہیں ملے گی۔ شریعت نے اس صورت میں قاتل کو وراثت سے محروم رکھا ہے۔ آج کل تم اخبارات میں پڑھتے رہتے ہو کہ زمین کی وجہ سے باپ کو قتل کر دیا یا بھائی کو قتل کر دیا۔ از روئے شرع یہ ان کے وارث نہیں بن سکتے۔

﴿وَاِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا﴾ اور جب تم نے قتل کیا ایک نفس کو ﴿فَادّٰرَءْتُمْ فِيْهَا﴾ پس اس قتل کو تم ایک دوسرے پر ڈالنے لگے ﴿وَاللّٰهُ مُخْرِجٌ﴾ اور اللہ تعالیٰ ظاہر کرنے والا ہے ﴿مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ﴾ جس کو تم چھپاتے ہو ﴿فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا﴾ پس کہا ہم نے مارو اس مردہ کو گائے کے بعض حصے کے ساتھ ﴿كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى﴾ اسی طرح زندہ کرے گا اللہ تعالیٰ مردوں کو ﴿وَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ﴾ اور دکھاتا ہے اللہ تعالیٰ تمھیں اپنی قدرت کی نشانیاں ﴿لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ﴾ تاکہ تم سمجھ جاؤ ﴿ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ﴾ پھر سخت ہو گئے دل تمھارے ﴿مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ﴾ اس کے بعد ﴿فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ﴾ پس وہ دل پتھروں کی طرح ہیں ﴿اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً﴾ یا ان سے بھی زیادہ سخت ہیں ﴿وَاِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ﴾ اور بے شک بعض پتھروں میں سے ﴿لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ﴾ البتہ وہ ہیں جن سے پھوٹتی ہیں نہریں

﴿وَ اِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ﴾ اور بے شک ان پتھروں میں سے بعض ایسے ہیں البتہ جو پھٹ جاتے ہیں ﴿فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَآءُ﴾ پس نکلتا ہے اس پتھر سے پانی ﴿وَ اِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ﴾ اور بے شک ان پتھروں میں سے بعض ایسے ہیں جو گر پڑتے ہیں ﴿مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ﴾ اللہ تعالیٰ کے خوف سے ﴿وَ مَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ﴾ اور نہیں ہے اللہ تعالیٰ غافل اس کارروائی سے جو تم کرتے ہو ﴿اَفَتَطْمَعُوْنَ﴾ کیا تم طمع رکھتے ہو ﴿اَنْ يُّؤْمِنُوْا لَكُمْ﴾ کہ وہ تمھاری تصدیق کریں گے ﴿وَ قَدْ كَانَ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ﴾ اور تحقیق تھا ایک گروہ ان میں سے ﴿يَسْمَعُوْنَ كَلٰمَ اللّٰهِ﴾ سنتا تھا وہ اللہ تعالیٰ کے کلام کو ﴿ثُمَّ يُحَرِّفُوْنَهٗ﴾ پھر وہ اس کو بدل دیتا تھا ﴿مِنْۢ بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ﴾ بعد اس کے کہ اس کو انھوں نے سمجھ لیا تھا ﴿وَ هُمْ يَعْلَمُوْنَ﴾ اور وہ جانتے بھی تھے ﴿وَ اِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ اور جب وہ ملتے ہیں ان لوگوں سے جو ایمان لائے ﴿قَالُوْۤا اٰمَنَّا﴾ کہتے ہیں ہم بھی ایمان لائے ﴿وَ اِذَا خَلَا بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ﴾ اور جب الگ ہوتے ہیں ان میں سے بعض بعض کے پاس ﴿قَالُوْۤا اَتُحَدِّثُوْنَهُمْ﴾ کہتے ہیں کیا تم بیان کرتے ہو ان کے سامنے ﴿بِمَا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ﴾ وہ چیز جو ظاہر کی اللہ تعالیٰ نے تم پر ﴿لِيُحَآجُّوْكُمْ بِهٖ﴾ تاکہ وہ جھگڑا کریں اس کے ذریعے ﴿عِنْدَ رَبِّكُمْ﴾ تمھارے رب کے ہاں ﴿اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ﴾ کیا تم عقل نہیں رکھتے ﴿اَوَ لَا يَعْلَمُوْنَ﴾ کیا وہ نہیں جانتے ﴿اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ﴾ بے شک اللہ تعالیٰ جانتا ہے ﴿مَا يُسِرُّوْنَ﴾ جس چیز کو وہ چھپاتے ہیں ﴿وَ مَا يُعْلِنُوْنَ﴾ اور جس چیز کو وہ ظاہر کرتے ہیں۔

ربط

گزشتہ رکوع میں آپ نے پڑھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں کچھ لوگوں نے اپنے عزیز چچا یا چچازاد بھائی کو قتل کیا اور موسیٰ علیہ السلام کے پاس گئے کہ ہمارے چچا کو کسی نے قتل کر دیا ہے ہمیں معلوم نہیں کہ کس نے قتل کیا ہے؟ لہٰذا آپ تحقیق کریں کہ قاتل کون ہے؟ اور مقصد ان کا یہ تھا کہ بات آئی گئی ہو جائے اسی لیے گائے کے متعلق کج بحثی میں پڑ گئے تھے۔ اس کے متعلق ارشاد ہے:

﴿وَ اِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا﴾ اور جب تم نے قتل کیا ایک نفس کو۔ قتل ناحق بڑے گناہوں میں سے ایک ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے ہاں یہ کتنا بڑا جرم ہے؟ اس کا اندازہ آپ حضرات اس سے لگائیں کہ حدیث پاک میں آتا ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((لَزَوَالُ الدُّنْيَا أَهْوَنُ عَلَى اللّٰهِ تَعَالٰى مِنْ قَتْلِ رَجُلٍ مُؤْمِنٍ)).

"ساری دنیا کا تباہ ہو جانا اللہ تعالیٰ کے ہاں آسان ہے بہ نسبت ایک مومن آدمی کے ناحق قتل ہونے سے جو اللہ اللہ کرتا تھا۔"

اب تو قتل کی کوئی حیثیت ہی نہیں رہی اور آدمی کسی جگہ بھی محفوظ نہیں ہے۔ نہ گھر میں نہ سکول میں نہ کالج میں بلکہ ہسپتال میں قتل کر جاتے ہیں۔ اور جوں جوں قیامت قریب آئے گی یہی کچھ ہوگا۔ مسجدوں اور مدرسوں میں قتل کر دیتے ہیں۔ حالاں کہ مسجد سے بڑی امن والی جگہ اور کوئی نہیں ہے۔ اور مسجد ایسی جگہ ہے کہ جہاں دشمن سے بھی تعرض نہیں کیا جاتا۔

نجران کے عیسائی مدینۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم میں

چنانچہ ۹ ھ میں نجران کے عیسائیوں کا وفد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہم غریب آدمی ہیں ہمارے پاس ایسی جگہ نہیں ہے کہ جہاں ساٹھ/ ۶۰ آدمیوں کو اکٹھا ٹھہرا سکیں۔ مختلف ساتھیوں پر دو، دو تین، تین آدمی تقسیم کر دیتے ہیں۔ ان کے بڑوں نے کہا کہ نہیں ہم تو اکٹھے رہیں گے۔ ان کا خیال تھا کہ مسلمان تبلیغ کرنے والی قوم ہے کہیں ہمارے ساتھیوں کو ورغلا کر مسلمان نہ بنا ڈالیں۔

لہٰذا یہ بھیڑیں ہمارے ساتھ ہی رہیں تو بہتر ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا پھر اکٹھے تو مسجد میں رہ سکتے ہیں۔ اور تو کوئی ایسی جگہ نہیں ہے جہاں ساٹھ آدمیوں کو اکٹھا ٹھہرا سکیں۔ کہنے لگے ہم مسجد میں ہی رہیں گے۔ مگر ہم نے اپنی طرز پر نمازیں بھی پڑھنی ہیں، فرمایا پڑھتے رہو۔

بعض صحابہ آئے جن کو حقیقت حال سے آگاہی نہیں تھی انہوں نے جب دیکھا کہ بیت المقدس کی طرف چہرہ کر کے نماز پڑھ رہے ہیں تو انہوں نے کہا یہ کیا کرتے ہو؟ ان کے افعال پر اعتراض کیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کرنے دو جو کچھ کرتے ہیں ان کا مذہب ہے۔ اس سے اندازہ لگاؤ کہ عیسائیوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے مسجد نبوی (زَادَاللهُ تَعَالٰى شَرَفًا وَّ كَرَامَةً) میں اپنے مذہب کے مطابق شمال کی طرف چہرہ کر کے نماز پڑھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ نہیں فرمایا۔ کتنا حوصلہ اور بردباری ہے مگر آج مسجدیں بھی محفوظ نہیں ہیں۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ﴿وَاِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا﴾ اور جب تم نے قتل کیا ایک نفس کو ﴿فَادّٰرَءْتُمْ فِيْهَا﴾ پس اس قتل کو تم ایک دوسرے پر ڈالنے لگے۔ ایک نے کہا اس نے قتل کیا ہے دوسرے نے کہا اس نے قتل کیا ہے۔ اس کو عربی میں ''تدارء'' کہتے ہیں۔ ﴿وَاللّٰهُ مُخْرِجٌ﴾ اور اللہ تعالیٰ ظاہر کرنے والا ہے ﴿مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ﴾ جس کو تم چھپاتے تھے۔ قاتلوں کا ارادہ تھا کہ قتل ظاہر نہ ہو اور ہم پکڑے نہ جائیں۔

﴿فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا﴾ پس کہا ہم نے مارو اس مردہ کو گائے کے بعض حصے کے ساتھ۔ یہ کون سا حصہ تھا؟ تفسیروں میں زبان، دل، جگر، اور دم کا ذکر بھی آتا ہے۔ بہر حال وہ حصہ ساتھ لگانے کے ساتھ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا جس طرح بٹن دبانے سے بلب جل جاتا ہے۔ مخلوق خدا جمع تھی اس سے پوچھا گیا کہ تجھے کس نے قتل کیا ہے؟۔ اس نے بتایا کہ میرے قاتل فلاں، فلاں ہیں۔ چنانچہ ان قاتلوں کو قصاص میں قتل کیا گیا اور وراثت سے محروم ہو گئے۔

﴿كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى﴾ اسی طرح زندہ کرے گا اللہ تعالیٰ مردوں کو جس طرح اس کو زندہ کیا ہے مرنے کے بعد۔ اور یہ ''اِحیاء'' موسیٰ علیہ السلام کا دوسرا واقعہ ہے۔ ستر آدمیوں کو موسیٰ علیہ السلام کوہِ طور پر لے گئے ان کو مارنے کے بعد دوبارہ زندہ کرنے کا واقعہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔

﴿وَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ﴾ اور دکھاتا ہے اللہ تعالیٰ تمہیں اپنی قدرت کی نشانیاں ﴿لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ﴾ تاکہ تم سمجھ جاؤ ﴿ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ﴾ پھر سخت ہو گئے دل تمہارے ﴿مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ﴾ اس کے بعد کہ کتنی اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانیاں دیکھ چکے تھے۔ مثلاً: منّ وسلویٰ کا نازل ہونا، بادلوں کا سایہ، پتھر سے چشموں کا جاری ہونا، دریا میں (فرعونیوں کا) غرق ہو جانا اور مردوں کا زندہ ہونا اتنی نشانیاں دیکھنے کے باوجود ان کے دل نرم ہونے کی بجائے سخت ہو گئے۔ کیسے سخت ہوئے؟

فرمایا ﴿فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ﴾ پس وہ دل پتھروں کی طرح ہیں ﴿اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً﴾ یا ان سے بھی زیادہ سخت ہیں۔ مثلاً: پتھر سے لوہا زیادہ سخت ہے۔ اور کچھ چیزیں ایسی ہیں جو گھستی نہیں ہیں۔ جیسے کہ ہیرا، کہ ٹوٹ جائے گا مگر گھسے گا نہیں۔ لوہا، تانبا، سونا، گھس جاتے ہیں ہیرا چونکہ گھستا نہیں ہے۔ اس لیے بعض گھڑیوں کی جولیں ہیرے کی ہوتی ہیں۔

سوال: اب سوال یہ ہے کہ ہیرے کو آدمی استعمال کر سکتا ہے یا نہیں؟

جواب: ہیرے کو آدمی استعمال کر سکتا ہے اور مرد کے لیے چار ماشے چاندی کی انگوٹھی جائز ہے۔ زیور کے طور پر استعمال کر سکتا ہے۔ زیور کے علاوہ چاندی کا استعمال جائز نہیں ہے۔ مثلاً: گھڑی یا گھڑی کا چین یا جیبی گھڑی کی زنجیر یا بازو اور گلے کی زنجیر یہ سب ناجائز اور حرام ہیں۔ اور سونا کسی صورت میں بھی جائز نہیں ہے۔ البتہ سونے چاندی کا دانت لگوا سکتا ہے۔ اگر ناک کٹوا بیٹھے تو وہ بھی سونے چاندی کی لگوا سکتا ہے۔

سونے کا دانت اور ناک

چنانچہ آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں لڑائی کے دوران ایک شخص کی دشمنوں نے ناک کاٹ دی اب وہ بڑا بُرا لگتا تھا تو اس نے چاندی کی ناک بنوا کر لگوائی۔ کہ چلو اصلی کی جگہ مصنوعی ہی سہی کچھ نظر تو آئے گا چند دنوں کے بعد اس سے بُو آنی شروع ہو گئی۔ آنحضرت ﷺ کے پاس آیا اور کہا کہ حضرت! میں نے چاندی کی ناک لگوائی تھی مگر اس سے بو آنے لگ گئی ہے۔

آپ ﷺ نے فرمایا کہ سونے کی لگوا لے۔ اور سونے کی یہ خاصیت ہے کہ اس سے بو نہیں آتی۔ اور عورتوں کو اجازت ہے کہ وہ سونا چاندی زیور کے طور پر استعمال کر سکتی ہیں۔ البتہ زیور کے علاوہ کسی اور شکل میں استعمال نہیں کر سکتیں۔ مثلاً: سونے چاندی کا ''سرمچو'' استعمال نہیں کر سکتیں، سونے چاندی کے برتنوں میں عورت کھا پی بھی نہیں سکتی۔ ''کروشیا'' جس سے عورتیں کڑھائی کرتی ہیں وہ بھی سونے چاندی کا جائز نہیں ہے۔ صرف زیور کی حد تک اجازت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جو حدیں مقرر فرمائی ہیں ان کا خیال رکھنا چاہیے۔

پتھر میں خشیت الٰہی

تو فرمایا کہ ان کے دل پتھر کی طرح سخت ہوگئے ہیں یا اس سے بھی زیادہ سخت ہیں۔ کیونکہ ﴿وَاِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ﴾ اور بے شک بعض پتھروں میں سے ﴿لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ﴾ البتہ وہ ہیں جن سے پھوٹتی ہیں نہریں۔ دنیا میں بہت سارے ایسے مقامات ہیں جہاں پتھروں سے چشمے بہہ رہے ہیں اور اتنی مقدار میں کہ آگے ان سے نہریں دریا بن جاتے ہیں۔ یہ بھی پڑھ چکے ہو کہ موسیٰ علیہ السلام نے پتھر پر لاٹھی ماری تو اس سے بارہ چشمے پھوٹ پڑے۔

﴿وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ﴾ اور بے شک ان پتھروں میں سے بعض ایسے ہیں البتہ جو پھٹ جاتے ہیں ﴿فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَآءُ﴾ پس نکلتا ہے اس پتھر سے پانی تھوڑی مقدار میں ﴿وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ﴾ اور بے شک ان پتھروں میں سے بعض ایسے ہیں جو گر پڑتے ہیں ﴿مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ﴾ اللہ تعالیٰ کے خوف سے۔

پہاڑوں میں کئی دفعہ دیکھنے میں آیا ہے کہ پتھر خود بخود گر پڑتے ہیں بہ ظاہر ان کو گرانے والا کوئی نہیں ہوتا۔ وہ رب تعالیٰ کے خوف سے گر پڑتے ہیں۔ ہر چیز میں اللہ تعالیٰ کی کبریائی کا خوف ہے اور ہر چیز اللہ تعالیٰ کی حمد کی تسبیح کرتی ہے۔

ہر چیز کا حمد الٰہی بیان کرنا

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ﴿وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ﴾ ہر چیز اللہ تعالیٰ کی حمد کی تسبیح کرتی ہے درخت، ان کے پتے، ریت کے ذرات، پانی کا ایک ایک قطرہ اللہ تعالیٰ کی حمد بیان کرتا ہے ﴿وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ﴾ [بنی اسرائیل: ۴۴] اور لیکن تم ان کی تسبیح کو سمجھ نہیں سکتے۔ کوئی زبان حال سے اور کوئی زبان قال سے اللہ تعالیٰ کی حمد کی تسبیح پڑھتے ہیں۔

حجر کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام کرنا

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تاج نبوت پہنائے جانے سے پہلے مکہ مکرمہ میں ایک پتھر کے پاس سے گزرے تھے وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام کہتا تھا ((اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ)) اللہ تعالیٰ نے اس پتھر میں یہ شعور رکھا تھا کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہچانتا تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ نے تین قسم کے پتھر بیان فرمائے ہیں:

☆...... ایک وہ ہیں کہ ان سے نہریں جاری ہوتی ہیں۔

☆...... دوسرے وہ ہیں کہ ان سے تھوڑی مقدار میں پانی نکلتا ہے۔

☆...... تیسرے وہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے خوف سے نیچے گر پڑتے ہیں۔

اسی طرح بعض دل ایسے ہوتے ہیں کہ ان کے ذریعے اللہ تعالیٰ اپنی معرفت اور اپنے احکامات کو دور دور تک پہنچاتا ہے اور بعض دل ایسے ہوتے ہیں کہ ان میں علم تھوڑی مقدار میں ہوتا ہے۔ لیکن جتنا بھی ہوتا ہے اس سے وہ فائدہ پہنچاتے ہیں اور کچھ دل ایسے ہوتے ہیں کہ وہ نافرمانی کے بلند مقام سے نیچے گر پڑتے ہیں۔ یعنی ان کی اپنی اصلاح ہوتی ہے اگرچہ

دوسروں کو فائدہ نہ پہنچا سکیں۔ مگر ان کے دل ایسے سخت ہیں کہ نہ تو دوسروں کو فائدہ پہنچا سکتے ہیں اور نہ ہی نافرمانی کی بلڈنگ سے نیچے گرتے ہیں۔

﴿وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ﴾ اور نہیں ہے اللہ تعالیٰ غافل اس کارروائی سے جو تم کرتے ہو۔ تمہاری نیکی بدی ہر چیز اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے۔ یہاں تک یہودیوں کی خرابی کا ذکر تھا آگے اللہ تعالیٰ مومنوں کو خطاب فرماتے ہیں ﴿اَفَتَطْمَعُوْنَ﴾ کیا تم طمع رکھتے ہو ﴿اَنْ يُّؤْمِنُوْا لَكُمْ﴾ اس بات کا کہ وہ تمہاری تصدیق کریں گے۔ جبکہ ان کے بڑے اتنی نشانیاں دیکھ کر بھی راہِ راست پر نہ آئے۔

حکم الٰہی میں تحریف

﴿وَقَدْ كَانَ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ﴾ اور تحقیق تھا ایک گروہ ان میں سے ﴿يَسْمَعُوْنَ كَلٰمَ اللّٰهِ﴾ سنتا تھا وہ اللہ تعالیٰ کے کلام کو ﴿ثُمَّ يُحَرِّفُوْنَهٗ﴾ پھر وہ اس کو بدل دیتا تھا ﴿مِنْۢ بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ﴾ بعد اس کے کہ اس کو انہوں نے سمجھ لیا تھا ﴿وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ﴾ اور وہ جانتے بھی تھے۔ انہوں نے کس طرح بدلا؟ اس کی مختلف تفسیریں ہیں۔

① اس کی ایک تفسیر تو یہ ہے کہ تورات ان کی زبان میں تھی اس کو پڑھا اور سمجھا مگر اس کی تفسیر اپنی مرضی سے کرتے اور اپنی خواہشات کو تورات سے ثابت کرتے تھے۔ جس طرح آج کل اہلِ بدعت حضرات کرتے ہیں کہ قرآنی آیات کی غلط تشریح کر کے ان سے اپنا عقیدہ اور عمل ثابت کرتے ہیں۔ تو اس طرح وہ تحریف کرتے تھے۔

② تحریف اور بدلنے کی دوسری تفسیر اس طرح کرتے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام نے جب توراۃ اپنی برادری کو لا دی اور انہیں پڑھ کر سنائی تو انہوں نے کہا کہ یہ تو بہت مشکل کتاب ہے۔ ہم تو اس پر عمل نہیں کر سکتے اور یہ بھی معلوم نہیں ہے کہ یہ کتاب اللہ تعالیٰ نے دی ہے یا آپ خود لکھ کر لائے ہیں۔ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی برادری کے ستر آدمیوں کا انتخاب کیا کہ تم میرے ساتھ کوہِ طور پر چلو تاکہ تمہیں یقین ہو جائے کہ یہ کتاب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ تمہیں خود آواز دے کر کہیں گے کہ یہ میری کتاب ہے۔

جب یہ آدمی کوہِ طور پر گئے تو اللہ تعالیٰ نے کہا کہ یہ میری کتاب ہے اور تمہیں مشکل اس سے لئے نظر آ رہی ہے کہ تم نے آزاد زندگی گزاری ہے اور اب پابندیاں لگی ہیں جب تم اس پر عمل کرو گے مشکل نہیں رہے گی۔ اور اس کے باوجود اگر بشری تقاضے سے کوئی غلطی ہوئی تو میں معاف کر دوں گا۔ لیکن یہ لوگ جب واپس قوم کے پاس آئے تو کہنے لگے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ یہ کتاب میری ہے اگر تم اس پر عمل نہیں بھی کرو گے تو میں تمہیں معاف کر دوں گا۔ اب دیکھو کتنا بڑا فرق ہے اس طرح کلام اللہ کو سن کر بدل ڈالا۔

﴿وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ اور جب وہ ملتے ہیں ان لوگوں سے جو ایمان لائے ﴿قَالُوْٓا اٰمَنَّا﴾ کہتے ہیں ہم بھی ایمان

لائے ﴿وَ اِذَا خَلَا بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ﴾ اور جب الگ ہوتے ہیں ان میں سے بعض، بعض کے پاس۔ یعنی چھوٹے جاتے ہیں اپنے رئیسوں اور مذہبی سرداروں کے پاس اور وہ ان کی بے عزتی کرتے ہیں اور......

﴿قَالُوْٓا اَتُحَدِّثُوْنَهُمْ﴾ کہتے ہیں کیا تم بیان کرتے ہو ان کے سامنے ﴿بِمَا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ﴾ وہ چیز جو ظاہر کی اللہ تعالیٰ نے تم پر کہ اسلام سچا مذہب ہے اور ہم اس پر ایمان لائے ہیں۔ کیونکہ اس کی سچائی کا پہلی کتابوں میں ذکر ہے تو یہ لوگ تمہارے اس اقرار کو قیامت والے دن تمہارے خلاف حجت کے طور پر پیش کریں گے۔

﴿لِيُحَآجُّوْكُمْ بِهٖ عِنْدَ رَبِّكُمْ﴾ تاکہ وہ جھگڑا کریں اس کے ذریعے تمہارے رب کے ہاں۔ اے نادانو! ان کے سامنے ایسی باتیں نہ کہا کرو اور ﴿اٰمَنَّا﴾ بھی نہ کہا کرو۔ ﴿اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ﴾ کیا تم عقل نہیں رکھتے کہ دشمن کے سامنے، اقرار کرتے ہو کہ اسلام سچا مذہب ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ﴿اَوَ لَا يَعْلَمُوْنَ﴾ کیا وہ نہیں جانتے کہ ﴿اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ﴾ بے شک اللہ تعالیٰ جانتا ہے ﴿مَا يُسِرُّوْنَ﴾ جس چیز کو وہ چھپاتے ہیں ﴿وَمَا يُعْلِنُوْنَ﴾ اور جس چیز کو وہ ظاہر کرتے ہیں۔ انسانوں سے تو چھپا سکتے ہیں مگر اس ذات سے کس طرح چھپا سکتے ہیں جو ظاہر باطن کو جانتی ہے اور رب تعالیٰ کو معلوم نہیں ہے کہ میں نے آخری پیغمبر ﷺ کی صداقت اور اسلام کی صداقت ان کو بتائی ہے اور ان کی کتابوں میں ان کی صداقت کی نشانیاں ذکر کی ہیں۔ تو یہ اگر آج ان کو ظاہر نہیں کریں گے تو اللہ تعالیٰ سے چھپ جائیں گے؟۔

اللہ تعالیٰ قرآنِ کریم میں فرماتے ہیں:

﴿يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ﴾ یہ آخری پیغمبر کو اس طرح پہچانتے ہیں جس طرح اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ جو یہودیوں کے بڑے عالم تھے جب وہ مسلمان ہوئے تو انہوں نے اس بات کا اقرار کیا اور کہا کہ ہم آنحضرت ﷺ کو شکل و صورت اور نشانیوں سے اپنی اولاد کی طرح پہچانتے ہیں۔

ابوجہل اور نبی اکرم ﷺ کا معجزہ

"خصائص الکبریٰ" امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ہے جس میں انہوں نے آنحضرت ﷺ کے معجزات احادیث اور تاریخ کے حوالے سے بیان فرمائے ہیں اس میں وہ بیان فرماتے ہیں کہ:

''ابوجہل جس کا نام عمرو بن ہشام تھا اور بڑا سخت اور تلخ مزاج آدمی تھا اپنے ہاتھ میں موٹے موٹے کنکر پکڑ کر لایا۔ آنحضرت ﷺ اپنے ساتھیوں کی مجلس میں تشریف فرما تھے۔ کہنے لگا کہ ان کو وعظ و تبلیغ بعد میں کرنا پہلے میرے ساتھ بات کرو۔ وہ یہ کہ تو جو نبی ہونے کا دعوے دار ہے اور آسمانوں کی خبریں دیتا ہے زمین کی باتیں بیان کرتا ہے، جنت و دوزخ کے حالات بیان کرتا ہے۔ بتا میری مٹھی میں کیا چیز ہے؟ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ چچا جی! اگر یہ مٹھی والی چیز خود بول کر بتا

دے تو پھر ٹھیک ہے؟ کہنے لگا پھر تو بڑی بات ہے۔ چنانچہ ان کنکریوں نے پڑھنا شروع کیا: سُبْحَانَ اللهِ، سُبْحَانَ اللهِ، سُبْحَانَ اللهِ۔

اور بعض روایتوں میں آتا ہے کہ کنکریوں نے پڑھنا شروع کیا: لَا اِلٰهَ اِلَّا اللهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللهِ۔ تو ابوجہل نے کنکریاں دُور پھینک دیں اور کہنے لگا کہ تم بھی اس کی طرف دار ہو گئی ہو۔" تو اس ضد کا دُنیا میں کوئی علاج نہیں ہے۔

اسی طرح یہودی، عیسائی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جانتے، پہچانتے تھے کہ یہ وہی آخری پیغمبر ہیں جنہوں نے آنا تھا۔ مگر ضد کی وجہ سے مانتے نہیں تھے۔ اللہ رب العزت ضد سے بچائے۔ [آمین]

﴿وَمِنْهُمْ اُمِّيُّوْنَ﴾ اور ان میں سے بعض اَن پڑھ ہیں ﴿لَا يَعْلَمُوْنَ الْكِتٰبَ﴾ جو نہیں جانتے کتاب کو ﴿اِلَّآ اَمَانِيَّ﴾ مگر چند جھوٹی آرزوئیں ﴿وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ﴾ اور نہیں ہیں وہ مگر گمان کرتے ﴿فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ﴾ پس خرابی ہے ان لوگوں کے لیے ﴿يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ﴾ جو لکھتے ہیں کتاب ﴿بِاَيْدِيْهِمْ﴾ اپنے ہاتھوں سے ﴿ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ﴾ پھر کہتے ہیں ﴿هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللهِ﴾ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے ﴿لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا﴾ تا کہ خریدیں اس کے ذریعے قیمت تھوڑی ﴿فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا﴾ پس خرابی ہے ان کے لیے اس چیز سے ﴿كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ﴾ جو لکھی ہے ان کے ہاتھوں نے ﴿وَوَيْلٌ لَّهُمْ﴾ اور ہلاکت ہے ان کے لیے ﴿مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ﴾ اس کمائی سے جو وہ کماتے ہیں ﴿وَقَالُوْا﴾ اور کہتے ہیں ﴿لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ﴾ ہرگز نہیں چھوئے گی ہم کو آگ ﴿اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً﴾ مگر گنتی کے چند دن ﴿قُلْ﴾ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرما دیں ﴿اَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللهِ عَهْدًا﴾ کیا تم نے پکڑ لیا ہے اللہ تعالیٰ کے پاس کوئی عہد ﴿فَلَنْ يُّخْلِفَ اللهُ عَهْدَهٗ﴾ پس ہرگز نہیں خلاف کرے گا اللہ تعالیٰ اپنے عہد کا ﴿اَمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللهِ﴾ یا کہتے ہو تم اللہ تعالیٰ پر ﴿مَا لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ جو کچھ تم نہیں جانتے ﴿بَلٰى﴾ کیوں نہیں (چھوئے گی آگ) ﴿مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً﴾ جس نے کمائی برائی ﴿وَّاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓئَتُهٗ﴾ اور گھیر لیا اس کو اس کی برائی نے ﴿فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ﴾ وہی لوگ دوزخ والے ہیں ﴿هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ﴾ وہ ہمیشہ رہیں گے اس میں ﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ اور وہ لوگ جو ایمان لائے ﴿وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ﴾ اور عمل کیے اچھے ﴿اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ﴾ وہی لوگ جنتی ہیں ﴿هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ﴾ وہ اس جنت میں ہمیشہ رہیں گے۔

ربط ؟

پہلے ان کا ذکر تھا جو تعلیم یافتہ تھے اور اب اَن پڑھوں کا ذکر ہے کہ دین دشمنی میں سب برابر ہیں۔

اَن پڑھ یہودی

فرمایا ﴿وَمِنۡهُمۡ اُمِّیُّوۡنَ﴾ اوران میں سے بعض ان پڑھ ہیں ﴿لَا یَعۡلَمُوۡنَ الۡکِتٰبَ﴾ جونہیں جانتے کتاب کو ﴿اِلَّاۤ اَمَانِیَّ﴾ مگر چند جھوٹی آرزوئیں ﴿وَاِنۡ هُمۡ اِلَّا یَظُنُّوۡنَ﴾ اور نہیں ہیں وہ مگر گمان کرتے۔ جیسا کہ اکثر جاہل سینہ بہ سینہ نقل ہونے والی عجیب، عجیب کہانیاں سناتے رہتے ہیں۔ کتاب کا علم کچھ بھی نہیں ہوتا۔

﴿فَوَیۡلٌ لِّلَّذِیۡنَ﴾ پس خرابی ہے ان لوگوں کے لیے ﴿یَکۡتُبُوۡنَ الۡکِتٰبَ﴾ جو لکھتے ہیں کتاب ﴿بِاَیۡدِیۡهِمۡ﴾ اپنے ہاتھوں سے ﴿ثُمَّ یَقُوۡلُوۡنَ﴾ پھر کہتے ہیں ﴿هٰذَا مِنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ﴾ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ اس دور میں پریس تو ہوتا نہیں تھا کچھ آیات تو، توراۃ کی ہوتی تھی اور کچھ اپنی طرف سے ہاتھوں سے لکھ کر کہتے یہ توراۃ ہے۔ اور ہم تمہیں سستی دے رہے ہیں۔ لوگ خریدتے تھے۔

تیسرے پارے میں آئے گا ﴿وَمَا هُوَ مِنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ﴾ جوانھوں نے اپنے ہاتھوں سے لکھا ہے یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہیں ہے۔ یہ ایسا کیوں کرتے تھے؟ ﴿لِیَشۡتَرُوۡا بِهٖ ثَمَنًا قَلِیۡلًا﴾ تاکہ خریدیں اس کے ذریعے قیمت تھوڑی۔

چونکہ اس میں انہوں نے آسان مسئلے لکھے ہوتے تھے اس لیے لوگ شوق سے خریدتے تھے جس طرح آج کل کہانیوں والی کتابیں عام لوگ لیتے اور ٹھوس کتابیں جن میں عقائد اور اعمال کا بیان ہوتا ہے وہ نہیں لیتے۔

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے نام پر جھوٹے قصے

یا جس طرح روافض نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا قصہ اور حضرت امام جعفر رحمۃ اللہ علیہ کا قصہ چھپوایا ہوا ہے اور رافضی عورتیں ان کو عورتوں میں تقسیم کرتی ہیں، پھیلاتی ہیں اور اس طرح وہ عورتوں کی ذہن سازی کرتی ہیں۔ اور اس میں یہ بھی لکھا ہوا ہے کہ یہ چیزیں پکاؤ اور کھاؤ اور کسی کو نہ بتاؤ۔ یہ سب خرافات ہیں اور بزرگوں کے ذمے لگائی ہوئی ہیں۔ اسلام کے ساتھ ان چیزوں کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ بزرگوں کے ساتھ عقیدت بڑی بات ہے۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تم ان کے ذمے غلط باتیں لگاؤ۔

"ویل" کی تعریف

"ویل" جہنم کے ایک نچلے طبقے کا نام بھی ہے۔ جب آدمی کو جہنم میں پھینکا جائے گا تو گلتا سڑتا ستر سال کے بعد نیچے گرے گا یہ حال ہوگا ایسے لوگوں کا۔

﴿فَوَیۡلٌ لَّهُمۡ مِّمَّا کَتَبَتۡ اَیۡدِیۡهِمۡ﴾ پس خرابی ہے ان کے لئے اس چیز سے جولکھی ہے ان کے ہاتھوں نے ﴿وَوَیۡلٌ لَّهُمۡ﴾ اور ہلاکت ہے ان کے لیے ﴿مِّمَّا یَکۡسِبُوۡنَ﴾ اس کمائی سے جو وہ کماتے ہیں۔ تورات میں تحریف کرکے اور اپنی طرف سے قصے کہانیاں شامل کرکے لوگوں کے آگے فروخت کرتے اور رقم بٹورتے۔

دوزخ اور یہود ونصاریٰ

اور یہ سب کچھ کرتے ہوئے بھی کہتے: ﴿وَقَالُوْا﴾ اور کہتے ہیں ﴿لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ﴾ ہرگز نہیں چھوئے گی ہم کو آگ ﴿اِلَّآ اَیَّامًا مَّعْدُوْدَةً﴾ مگر گنتی کے چند دن۔ وہ گنتی کے چند دن کتنے ہیں؟ اس کے بارے میں مختلف اقوال ہیں۔

①...... یہودیوں کا ایک اعتقاد یہ ہے کہ دنیا کی عمر سات ہزار سال ہے کچھ حدیثیں بھی بیان کی گئی ہیں کہ دنیا کی عمر سات ہزار سال ہے مگر محدثین کرام رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ بَاطِلٌ لَا اَصْلَ لَهَا ان کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ اور ہر ہزار سال کے بدلے ایک دن یہودی دوزخ میں رہیں گے گویا کہ سات دن دوزخ میں رہیں گے پھر جنت میں چلے جائیں گے۔

②...... دوسرا نظریہ یہ ہے کہ جتنے دن موسیٰ علیہ السلام کوہِ طور پر اعتکاف بیٹھے تھے اور ہمارے بڑوں نے بچھڑے کی پوجا کی تھی یعنی چالیس دن، ہم بھی چالیس دن دوزخ میں رہیں گے۔ پھر دوزخ سے نکل کر جنت میں چلے جائیں گے۔

بھائی! بڑی عجیب منطق ہے کہ پوجا تو کریں تمہارے بڑے اور دوزخ میں سزا تم بھگتو۔ یہ کیا نظریہ ہوا کہ کرے کوئی اور بھرے کوئی۔

اللہ تعالیٰ نے اسی نظریے کا رد کرتے ہوئے فرمایا کہ ﴿لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی﴾ کوئی کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔ اور جس طرح یہودی کہتے ہیں کہ ہم بڑوں کی وجہ سے چالیس دن دوزخ میں رہیں گے اس کے برعکس عیسائیوں نے یہ نظریہ بنایا ہوا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہمارے منجی ہیں۔ اس طرح کہ وہ سولی پر لٹک کر ہمارے گناہوں کا کفارہ ہو گئے ہیں۔

ارے بے ایمانو! گناہ کرو تم دو ہزار سال بعد اور وہ تمہارے گناہوں کی وجہ سے سولی پر لٹکیں دو ہزار سال پہلے۔ بڑی عجیب منطق ہے؟ اس کے متعلق اللہ تعالیٰ کا بڑا واضح حکم موجود ہے۔

فرمایا: ﴿یَوْمًا لَّا یَجْزِیْ وَالِدٌ عَنْ وَّلَدِهٖ وَلَا مَوْلُوْدٌ هُوَ جَازٍ عَنْ وَّالِدِهٖ شَیْئًا﴾ [لقمان: ۳۳] نہیں کفایت کرے گا باپ بیٹے کی طرف سے اور نہ بیٹا باپ کی طرف سے۔ ہر ایک نے اپنے کیے کا پھل کھانا ہے۔ انہی غلط نظریات کی وجہ سے وہ کہتے تھے۔

﴿قَالُوْا لَنْ یَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰی﴾ اور وہ کہتے ہیں کہ ہرگز جنت میں داخل نہیں ہوں گے مگر وہ جو یہودی ہیں یا عیسائی ہیں۔ یہودی کہتے تھے جنت ہماری اور عیسائی کہتے تھے جنت ہماری جاگیر ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ﴿قُلْ﴾ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرما دیں ﴿اَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا﴾ کیا تم نے پکڑ لیا ہے اللہ تعالیٰ کے پاس کوئی عہد، کہ سات دن یا چالیس دن دوزخ میں رہنے کے بعد تم جنت میں چلے جاؤ گے۔

﴿فَلَنْ یُّخْلِفَ اللّٰهُ عَهْدَهٗ﴾ پس ہرگز نہیں خلاف کرے گا اللہ تعالیٰ اپنے عہد کا ﴿اَمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ﴾ یا کہتے ہو تم اللہ تعالیٰ پر ﴿مَا لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ جو کچھ تم نہیں جانتے ﴿بَلٰی﴾ کیوں نہیں چھوئے گی آگ ﴿مَنْ كَسَبَ سَیِّئَةً﴾ جس نے کمائی برائی۔

اور اس سے بڑی برائی کیا ہو سکتی ہے کہ ﴿قَالَتِ الْیَهُوْدُ عُزَیْرُ ابْنُ اللّٰهِ﴾ یہودیوں نے کہا عزیر اللہ تعالیٰ کے بیٹے ہیں ﴿وَ قَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِیْحُ ابْنُ اللّٰهِ﴾ اور عیسائیوں نے کہا کہ عیسیٰ اللہ تعالیٰ کے بیٹے ہیں۔ او ظالمو! اس سے بڑا گناہ اور کیا ہوگا کہ تم نے بندوں کو خدا کا بیٹا بنا دیا اور خدائی میں شریک بنا دیا۔

اور اے یہودیو! تم تو عیسیٰ علیہ السلام کو حلال زادہ ماننے کے لیے تیار نہیں ہو ﴿عَلٰى مَرْیَمَ بُهْتَانًا عَظِیْمًا﴾ حضرت مریم علیہا السلام پر بہتانِ عظیم باندھا، معاذ اللہ تعالیٰ۔ ان باتوں کے ہوتے ہوئے تم دوزخ میں نہیں جاؤ گے کیوں نہیں چھوئے گی آگ تمھیں؟

﴿مَنْ كَسَبَ سَیِّئَةً﴾ جس نے کمائی برائی ﴿وَّ اَحَاطَتْ بِهٖ خَطِیْٓـَٔتُهٗ﴾ اور گھیر لیا اس کو اس کی برائی نے، دل کو بھی اور ظاہر کو بھی ﴿فَاُولٰٓىٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ﴾ وہی لوگ دوزخ والے ہیں ﴿هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ﴾ وہ ہمیشہ رہیں گے اس میں۔

اصحابِ جنت

بہ خلاف اس کے ﴿وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا﴾ اور وہ لوگ جو ایمان لائے اور خالی ایمان ہی نہیں لائے؟ بلکہ ﴿وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ﴾ اور عمل کیے اچھے ﴿اُولٰٓىٕكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ﴾ وہی لوگ جنتی ہیں ﴿هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ﴾ وہ اس جنت میں ہمیشہ رہیں گے۔ ان کو جنت سے کبھی نکالا نہیں جائے گا۔

﴿وَ اِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَ﴾ اور جب لیا ہم نے عہد ﴿بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ﴾ بنی اسرائیل سے ﴿لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ﴾ کہ نہیں عبادت کرنی تم نے سوائے اللہ تعالیٰ کے ﴿وَ بِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا﴾ اور والدین کے ساتھ اچھا سلوک کرنا ﴿وَّ ذِی الْقُرْبٰى﴾ اور قریبی رشتہ داروں سے ﴿وَ الْیَتٰمٰى﴾ اور یتیموں کے ساتھ اچھا سلوک کرنا ﴿وَ الْمَسٰكِیْنِ﴾ اور مسکینوں کے ساتھ ﴿وَ قُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا﴾ اور کہو لوگوں کو اچھی بات ﴿وَّ اَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ﴾ اور نماز کو قائم کرو ﴿وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ﴾ اور زکوٰۃ دیتے رہو ﴿ثُمَّ تَوَلَّیْتُمْ﴾ پھر تم پھر گئے ﴿اِلَّا قَلِیْلًا مِّنْكُمْ﴾ مگر تھوڑے تم میں سے ﴿وَ اَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ﴾ اور تم اعراض کرنے والے ہو ﴿وَ اِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَكُمْ﴾ اور جب ہم نے تم سے پختہ عہد لیا ﴿لَا تَسْفِكُوْنَ دِمَآءَكُمْ﴾ نہیں بہاؤ گے تم اپنے خون ﴿وَ لَا تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَكُمْ﴾ اور نہیں نکالو گے تم اپنی جانوں کو ﴿مِّنْ دِیَارِكُمْ﴾ اپنے گھروں سے ﴿ثُمَّ اَقْرَرْتُمْ﴾ پھر تم نے اقرار کیا ﴿وَ اَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ﴾ اور تم اس پر گواہی دیتے ہو ﴿ثُمَّ اَنْتُمْ هٰۤؤُلَآءِ﴾ پھر تم یہی تو ہو ﴿تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَكُمْ﴾ قتل کرتے ہو اپنی جانوں کو ﴿وَ تُخْرِجُوْنَ فَرِیْقًا مِّنْكُمْ مِّنْ دِیَارِهِمْ﴾ اور نکالتے ہو ایک گروہ کو اپنے میں سے ان کے گھروں سے ﴿تَظٰهَرُوْنَ عَلَیْهِمْ﴾ چڑھائی کرتے ہو تم ان پر ﴿بِالْاِثْمِ وَ الْعُدْوَانِ﴾ گناہ اور زیادتی کے ساتھ ﴿وَ اِنْ یَّاْتُوْكُمْ اُسٰرٰى﴾ اور اگر آئیں

تمہارے پاس قیدی بن کر ﴿تُفٰدُوْهُمْ﴾ فدیہ دے کر ان کو چھڑا لیتے ہو ﴿وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ﴾ حالانکہ حرام تھا تم پر ﴿اِخْرَاجُهُمْ﴾ ان کو گھروں سے نکالنا ﴿اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ﴾ کیا تم ایمان لاتے ہو کتاب کے بعض حصے پر ﴿وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ﴾ اور انکار کرتے ہو بعض حصے کا ﴿فَمَا جَزَآءُ﴾ پس نہیں ہے بدلا ﴿مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ﴾ جو کرتا ہے یہ کارروائی تم میں سے ﴿اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا﴾ مگر رسوائی دنیا کی زندگی میں ﴿وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ﴾ اور قیامت کے دن لوٹائے جائیں گے ﴿اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ﴾ سخت عذاب کی طرف ﴿وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ﴾ اور اللہ تعالیٰ غافل نہیں ہے ﴿عَمَّا تَعْمَلُوْنَ﴾ اس کارروائی سے جو تم کرتے ہو ﴿اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ﴾ وہ، وہ لوگ ہیں ﴿اشْتَرَوُا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ﴾ جنہوں نے خرید ادنیا کی زندگی کو آخرت کے بدلے میں ﴿فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ﴾ پس نہیں ہلکا کیا جائے گا ان سے عذاب ﴿وَلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ﴾ اور نہ ان کی مدد کی جائے گی۔

ربط

پہلے سے بنی اسرائیل کی زیادتیوں اور خرابیوں کا ذکر چلا آرہا ہے۔ اس رکوع میں بھی ان کی زیادتیوں کا ذکر ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ﴾ اور جب لیا ہم نے عہد بنی اسرائیل سے۔ نزول قرآن کے زمانے میں جو بنی اسرائیلی موجود تھے ان کو ان کے بڑوں کے کارنامے سنا کر شرمندہ کیا جا رہا ہے کہ تمہارے بڑوں نے بھی حق کو نہیں مانا تھا اور تم بھی نہیں مانتے۔

عبادت صرف اللہ تعالیٰ کی

عہد یہ تھا ﴿لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ﴾ کہ نہیں عبادت کرنی تم نے سوائے اللہ تعالیٰ کے۔ عبادت صرف اللہ تعالیٰ کا حق ہے، یہ اسلام کا بنیادی مسئلہ ہے۔ اور جتنے بھی پیغمبر تشریف لائے ہیں انہوں نے پہلا سبق یہی دیا:

﴿يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ﴾ اے میری قوم! عبادت اللہ تعالیٰ کی کرو۔ اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں ہے۔ کوئی حاجت روا نہیں ہے۔ کوئی مشکل کشا نہیں ہے، کوئی فریادرس نہیں ہے، کوئی دستگیر نہیں ہے، نہ کوئی پیر نہ کوئی مولوی۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ اس میں بتوں کی نفی ہے یہ بات بالکل غلط ہے کیونکہ مولویوں اور پیروں کو بھی رب بنایا گیا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک کے دسویں پارے میں ہے:

﴿اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ [توبہ:۳۱] انہوں نے اپنے مولویوں اور پیروں کو رب بنا لیا ﴿وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ﴾ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو انہوں نے رب بنا لیا۔ یہ جو کچھ کہتے تھے مانتے تھے اور ان کے سامنے جھکتے تھے

تو کیا مولوی اور پیر بت تھے۔ اور کیا عیسیٰ بت تھے؟ معاذ اللہ تعالیٰ۔ انہوں نے ان کی عبادت شروع کر دی، سجدے بھی کرتے تھے اور ان کے سامنے جھکتے بھی تھے اور کہتے تھے کہ ہم ان کی تعظیم کرتے ہیں۔ عبادت تو نہیں کرتے تو ایک تو یہ حکم تھا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی عبادت نہیں کرنی۔

والدین سے حسنِ سلوک

اور دوسرا حکم تھا ﴿وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا﴾ اور والدین کے ساتھ اچھا سلوک کرنا۔

اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی عبادت نہیں کرنی اور والدین کے ساتھ حسن سلوک کرنا ہے یہ ایسے حکم ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک زمانے تک یہی حکم رہے ہیں۔ والدین کے ساتھ اچھا سلوک کرنا ہے اور ان کی ہر وہ بات ماننی ہے جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے خلاف نہ ہو۔

چنانچہ شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ اس کے متعلق ایک فقہی ضابطہ بیان فرماتے ہیں کہ ماں باپ اگر ایسے حکم کو چھوڑنے کا حکم دیں جو فرض اور واجب ہے تو پھر ان کی بات نہیں ماننی؟ مثلاً: کہیں کہ نماز نہ پڑھو، یا روزہ نہ رکھو، عورتوں کو شریعت نے پردے کا حکم دیا ہے اور وہ کہیں کہ پردہ نہ کرو یا لڑکوں کو کہیں کہ ڈاڑھی منڈھواؤ۔ یہ تمام چیزیں فرض یا واجب کے درجے میں آتی ہیں۔ مختصر یہ کہ والدین کسی فرض یا واجب کے چھوڑنے کا نہیں کہتے تو پھر ان کی بات ماننی ضروری ہے، ورنہ نہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: ((لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوْقٍ فِيْ مَعْصِيَةِ الْخَالِقِ)). رب تعالیٰ کی نافرمانی میں مخلوق کی اطاعت جائز نہیں ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں فرمایا ہے ﴿وَإِنْ جَاهَدَاكَ عَلَىٰ أَنْ تُشْرِكَ بِيْ﴾ [لقمان:۱۵] اور اگر تجھے ماں باپ مجبور کریں میرے ساتھ شرک کرنے پر ﴿مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ﴾ جس کا تجھے علم نہیں ہے ﴿فَلَا تُطِعْهُمَا﴾ تو ان کی بات بالکل نہیں ماننی۔ البتہ وہ احکام جو سنت مؤکدہ ہیں جیسے نماز جماعت کے ساتھ پڑھنا سنت مؤکدہ ہے۔

اور اگر کوئی آدمی تین نمازیں بغیر کسی عذر کے جماعت کے ساتھ نہ پڑھے تو وہ فاسق ہو جاتا ہے۔ اور شریعت میں اس کی گواہی غیر مقبول ہے۔ اگر والدین ایسے حکم کے متعلق ایک آدھ مرتبہ کہیں نہ کر، تو مان لو۔ اور اگر عادت بنالیں اور کہیں کہ جماعت کے ساتھ نماز نہ پڑھا کر تو پھر ان کی بات نہیں ماننی۔

اور وہ احکام جو مستحب ہیں اگر والدین ان کو چھوڑنے کا حکم دیں تو والدین کی بات پر عمل کرے اور ان کو چھوڑ دے۔ مثلاً: کہیں کہ نفلی نماز نہ پڑھ، نفلی روزہ نہ رکھ، اور ہماری خدمت کر، تو مستحب پر والدین کی خدمت مقدم ہے۔

بعض احکام الٰہی کا ماننا اور بعض کا انکار کرنا

﴿وَذِي الْقُرْبَىٰ﴾ اور قریبی رشتہ داروں کے ساتھ اچھا سلوک کرنا۔ بول چال میں لین دین میں ان کا پورا پورا خیال رکھنا۔

﴿وَالْیَتٰمٰی﴾ اور یتیموں کے ساتھ اچھا سلوک کرنا۔ یہ تمہارے فرائض میں داخل ہے کہ اپنے محلہ یا شہر یا قصبے میں یتیموں کو تلاش کرواور ان کی ضرورتوں کا انتظام کرواور ان کو پورا کرو۔ یتیموں کا تمہارے پاس آنا ضروری نہیں ہے۔

﴿وَالْمَسٰکِیْنِ﴾ اور مسکینوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنا۔ ان کا خیال رکھنا، مسکین اسے کہتے ہیں جو صاحب نصاب نہیں ہوتا۔ تھوڑی بہت آمدن ہوتی ہے مگر اخراجات آمدن سے زیادہ ہوتے ہیں۔ اور اخراجات سے مراد جائز ضروریات ہیں نہ کہ آج کل کی عیاشیاں اور آسانیاں۔

﴿وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا﴾ اور کہو لوگوں کو اچھی بات۔ کسی کو چڑانے والی بات نہ کرو، ٹیڑھی اور ضد کی بات نہ کرو۔ شرافت اور ادب کو ملحوظ رکھ کر بات کرو۔ کیوں کہ بہت سارے جھگڑوں کی بنیاد غلط گفتگو ہوتی ہے۔ مثلاً: آدمی کسی سے فحش مذاق کرتا ہے وہ برداشت نہیں کرتا اور جھگڑا شروع ہو جاتا ہے۔ لہٰذا زبان کو محتاط رکھنے کا بڑا حکم ہے۔

﴿وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ﴾ اور نماز کو قائم کرو۔ ان پر صرف دو نمازیں فرض تھیں۔ ﴿وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ﴾ اور زکوٰۃ دیتے رہو۔ ان پر زکوٰۃ کا حکم بہ نسبت ہمارے سخت تھا۔ ہم پر زکوٰۃ چالیسواں حصہ ہے اور ان پر چوتھا حصہ فرض تھا۔ یعنی چار سو میں سے ان کو ایک سو دینا پڑتا تھا اور چار ہزار میں سے ایک ہزار دینا پڑتا تھا۔ اور ہمیں سو میں سے اڑھائی روپے اور ہزار میں سے پچیس روپے دینے کا حکم ہے۔ بڑی سہولت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے ان کاموں کا پختہ عہد لیا تھا۔

﴿ثُمَّ تَوَلَّیْتُمْ﴾ پھر تم پھر گئے ﴿اِلَّا قَلِیْلًا مِّنْکُمْ﴾ مگر تھوڑے تم میں سے۔ جنہوں نے احکامات کی پابندی کی اکثریت بالکل ان سے غافل ہوگئی۔ جس طرح آج کل دیکھ لو کہ کتنے لوگ ہیں۔ نمازیں پڑھنے والے اچھی بات کرنے والے یتیموں، مسکینوں کا خیال رکھنے والے۔

عیاں را چہ بیاں؟

جو چیز واضح ہو اس کو بیان کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ اور اس زمانے کے بنی اسرائیل! ﴿وَاَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ﴾ اور تم بھی ان چیزوں سے اعراض کرنے والے ہو۔ آگے بھی بنی اسرائیل کی عہد شکنی کا ذکر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان سے یہ تین وعدے بھی لیے تھے۔

①...... پہلا وعدہ

پہلا وعدہ یہ لیا کہ کسی کو ناحق قتل نہ کرنا، جس طرح آج کل چھوٹی چھوٹی اور معمولی باتوں پر قتل ہوتے ہیں۔ مثلاً: الیکشن پر قتل، لین دین پر قتل، رشتے ناطے پر قتل، اس وقت بھی اسی طرح ہوتے تھے۔ پہلا وعدہ یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَاِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَکُمْ﴾ اور جب ہم نے تم سے پختہ عہد لیا کہ اے بنی اسرائیلیو! ﴿لَا تَسْفِکُوْنَ دِمَآءَکُمْ﴾ نہیں بہاؤ گے تم اپنے خون۔ برادری، رشتہ داروں کو قتل کرنا اپنا ہی خون بہانا ہے۔ حقوق العباد میں سب سے بڑا گناہ قتل ناحق ہے۔ اسی لیے

قیامت والے دن بندوں کے حقوق میں سے سب سے پہلے قتل کا مقدمہ دائر ہوگا۔ اور حقوق اللہ میں سے سب سے پہلے نماز کا سوال ہوگا۔ لہٰذا اس چیز کو سامنے رکھ کر اپنی اصلاح کرو۔ تاکہ اللہ تعالیٰ کے سامنے سرخرو ہو جائیں۔ دنیا میں تو لوگ داؤ وغیرہ لگا کر جھوٹ بول کر، عدالتوں سے بچ جاتے ہیں۔ مگر اس سچی عدالت میں کوئی کسی کو نہ تو دھوکہ دے سکے گا اور نہ ہی وہاں جھوٹ چلے گا۔ اگر وہاں کوئی جھوٹ بولے گا تو اللہ تعالیٰ فرمائیں گے:

﴿اُنْظُرْ كَيْفَ كَذَبُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ﴾ [الانعام: ۲۴] دیکھو! کیسے اپنی جانوں پر جھوٹ بول رہے ہیں؟ اصل واقعہ اس طرح ہے کہ مشرک جب اللہ تعالیٰ کی عدالت میں لائے جائیں گے اور رب تعالیٰ ان سے کہیں گے کہ جب میں نے تمہیں شرک سے منع کیا تھا پھر تم نے شرک کیوں کیا؟ تو وہ قسم اٹھا کر کہیں گے:

﴿وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ ۝﴾ [الانعام: ۲۳] اللہ تعالیٰ کی قسم جو ہمارا رب ہے ہم نے تو کوئی شرک نہیں کیا۔ اس وقت اللہ تعالیٰ فرمائیں گے ﴿اُنْظُرْ كَيْفَ كَذَبُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ﴾ دیکھو ان کو کیسے جھوٹ بولتے ہیں اپنی جانوں پر۔

②...... دوسرا وعدہ

﴿وَلَا تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ﴾ اور نہیں نکالو گے تم اپنی جانوں کو اپنے گھروں سے۔ وہ اس طرح کرتے تھے ان میں سے جو طاقتور تھے وہ کمزوروں کو ان کے بنے بنائے مکانوں سے نکال دیتے اور ان پر قبضہ کر کے خود داخل ہو جاتے۔

فلسطینیوں پر یہودیوں کے مظالم

اور ان کا یہ طریقہ کار آج تک چلا آ رہا ہے کہ فلسطینیوں کو ان کے گھروں سے نکال دیا ہے اور یہودی ان کے گھروں میں رہ رہے ہیں۔ اور بیس ہزار سے زیادہ فلسطینی کیمپوں میں گزارہ کر رہے ہیں، پھر کہتے ہیں کہ ہمارے وجود کو تسلیم کرو۔ ان کے وجود کو تسلیم کرنے کا مطلب یہ ہے کہ انہوں نے فلسطینیوں کے مکانوں پر ان کے باغوں پر ان کی زمینوں پر جو قبضہ کیا ہے اس کو تم جائز قرار دو کہ انہوں نے صحیح کیا ہے۔

بھائی! ہم کس طرح تسلیم کریں؟ زمینیں ان کی ہیں، باغات ان کے ہیں، مکان فلسطینی بے چاروں نے محنت مشقت کر کے دکھ، سکھ برداشت کر کے بنائے ہیں اور یہودیو! تم ان کے مالک بن کر بیٹھ گئے ہو۔ وہ بے چارے چیختے ہیں ان کا کوئی پرسانِ حال ہی نہیں ہے ان کی چیخ و پکار کوئی سننے کے لئے تیار ہی نہیں ہے۔

بلکہ بعض بے غیرت حکومتوں نے اسرائیل کو اس ظلم کے باوجود تسلیم بھی کر لیا ہے کہ تم نے جو کچھ کیا ہے ٹھیک کیا ہے۔ کتنا ظلم ہے ان پر۔ پھر ان بے چاروں کو ملازمتیں دینے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ ان کو کہتے ہیں کہ تم مزدوری کرو، سڑکیں بناؤ، باغوں میں کام کرو، سب گھٹیا کام ان سے لیتے ہیں۔ اور معاوضہ بھی کم دیتے ہیں۔ آخر وہ بھی انسان ہیں ان کے ساتھ بھی پیٹ لگا ہوا ہے۔ تو خیر! یہودیوں کو حکم تھا کہ تم اپنی برادری کو ان کے گھروں سے نہیں نکالو گے فرمایا:

﴿ثُمَّ اَقْرَرْتُمْ﴾ پھر تم نے اقرار کیا ﴿وَ اَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ﴾ اور (اس وقت کے اسرائیلیو!) تم اس پر گواہی دیتے ہو کہ ہاں ہمارے بڑوں سے اللہ تعالیٰ نے یہ وعدہ لیا تھا۔

اس کے باوجود ﴿ثُمَّ اَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَكُمْ﴾ پھر تم یہی تو ہو قتل کرتے ہو اپنی جانوں کو ﴿وَتُخْرِجُوْنَ فَرِيْقًا مِّنْكُمْ مِّنْ دِيَارِهِمْ﴾ اور نکالتے ہو ایک گروہ کو اپنے میں سے ان کے گھروں سے۔ قتل نہ کرنے کا وعدہ بھی تم نے پورا نہ کیا اور گھروں سے نکالنے کا وعدہ بھی تم نے پورا نہ کیا۔

﴿تَظٰهَرُوْنَ عَلَيْهِمْ﴾ چڑھائی کرتے ہو تم ان پر ﴿بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ﴾ گناہ اور زیادتی کے ساتھ۔ رب تعالیٰ کے حکم کو توڑنے کو "اثم" کہتے ہیں اور بندے کے حق کو ضائع کرنے کو "عدوان" کہتے ہیں۔ رب تعالیٰ نے حکم دیا کہ تم قتل نہ کرو، انہوں نے قتل کر کے رب تعالیٰ کا حکم توڑا۔ "اثم" کا ارتکاب کیا۔ اور بندوں کو قتل کیا اور ان کو گھروں سے نکال کر "عدوان" کا ارتکاب کیا۔

③......تیسرا وعدہ

﴿وَاِنْ يَّاْتُوْكُمْ اُسٰرٰى﴾ اور اگر آئیں تمہارے پاس قیدی بن کر ﴿تُفٰدُوْهُمْ﴾ فدیہ دے کر ان کو چھڑا لیتے ہو۔ مدینہ طیبہ میں دو بڑے قبیلے "اوس اور خزرج" جو اکثر آپس میں دست و گریبان رہتے تھے۔ یہودیوں کا قبیلہ بنو قریظہ اوس کا حامی تھا اور بنو نضیر قبیلہ خزرج کے طرفدار تھے۔ ان کی آپس میں اکثر جنگیں ہوتی رہتی تھیں۔ جب ایک قبیلہ دوسرے پر غالب آجاتا تو ان کو قتل بھی کرتے۔ گھروں سے بھی نکالتے اور قیدی بھی بنا لیتے۔ اب ان کی برادری کے لوگ جب قیدی بن جاتے وہ ان سے اپنی زمینوں اور باغوں میں کام کرواتے اور وقت پر صحیح معنیٰ میں روٹی بھی نہیں دیتے تھے۔ تو پھر یہ چندہ اکٹھا کر کے ان کو رہا کراتے۔ کیونکہ ان کو حکم تھا کہ اگر تمہارے آدمی گرفتار ہو جائیں تو انہیں رہا کراؤ، ان کی مالی امداد کرو۔ تو اس حکم پر تو عمل کرتے ہو ﴿وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ﴾ حالانکہ حرام تھا تم پر ان کو گھروں سے نکالنا۔ اس حکم پر عمل نہیں کرتے پہلے دشمنوں کے ساتھ مل کر ان کو گھروں سے نکال دیتے ہو، قیدی بنوا دیتے ہو۔ اور پھر ان کو رہا کرانے کے لئے چندہ اکٹھا کرنا شروع کر دیتے ہو۔

یہودی چندہ اکٹھا کرنے کے بارے میں بڑے مشہور تھے، چندہ اکٹھا کرتے کچھ قیدیوں پر خرچ کرتے، باقی خود ہڑپ کر جاتے۔ اور عموماً چندوں کا یہی حال ہوتا ہے۔ چاہے چندہ جلسوں کے لئے ہو یا مجاہدوں کے لئے ہو یا اور کسی کام کے لیے ہو۔ بے شک سو میں سے دو چار دیانت دار بھی ہوتے ہیں مگر بڑی مشکل سے۔ باقی سب نے کھانے، پینے کا ذریعہ بنایا ہوا ہے۔

اور یاد رکھنا! تمہارے پاس جب تک مجاہدین کا کوئی با اعتماد آدمی نہ آئے کسی کو چندہ نہ دینا کئی لڑکوں نے اور جماعتوں نے اس کو پیشہ بنایا ہوا ہے۔ اور انہوں نے با قاعدہ رسیدیں بھی چھپوائی ہوئی ہیں۔ اور ہزاروں، لاکھوں روپے اکٹھے کر کے کھا جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو سمجھ عطا فرمائے۔ تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تم قیدیوں کو فدیہ دے کر چھڑا لیتے ہو۔ حالانکہ

حرام تھا تم پر ان کو گھروں سے نکالنا۔

دُنیا کی زندگی میں رسوائی

﴿اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ﴾ کیا تم ایمان لاتے ہو کتاب کے بعض حصے پر ﴿وَ تَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ﴾ اور انکار کرتے ہو بعض حصے کا ﴿فَمَا جَزَآءُ﴾ پس نہیں ہے بدلا ﴿مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ﴾ جو کرتا ہے یہ کارروائی تم میں سے ﴿اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا﴾ مگر رسوائی دنیا کی زندگی میں۔ دنیا کی زندگی میں یہودیوں کے لیے رسوائی کی ایک صورت اس طرح ہوگی کہ تمہیں مسلمانوں کی حکمرانی ماننی پڑے گی اور جزیہ دینا پڑے گا۔

آخرت کا عذاب

﴿وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ﴾ اور قیامت کے دن ﴿يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ﴾ لوٹائے جائیں گے سخت عذاب کی طرف۔ جہنم میں بھی طبقات ہیں۔

①......سب سے کم درجے کا عذاب سب سے اوپر والے طبقے میں ہوگا۔ جس میں کلمہ پڑھنے والے گنہگاروں کو ڈالا جائے گا۔ لیکن اس کی آگ بھی دنیا کی آگ سے انہتر گنا تیز ہوگی اللہ تعالیٰ اس ہلکے عذاب سے بھی بچائے۔

②......اور اس سے نیچے والے طبقے میں نصاریٰ ہوں گے

③......اور اس سے نیچے والے طبقے میں یہودی ہوں گے۔

④......اور منافقین سب سے نیچے والے طبقے میں ہوں گے۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ﴾ [النساء:۱۴۵] بے شک منافق دوزخ کے سب سے نیچے والے درجے میں ہوں گے۔ کیونکہ منافقت کا فتنہ سب سے زیادہ ہے۔

﴿وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ﴾ اور اللہ تعالیٰ غافل نہیں ہے اس کارروائی سے جو تم کرتے ہو ﴿اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ﴾ وہ، وہ لوگ ہیں ﴿اشْتَرَوُا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ﴾ جنہوں نے خریدا دنیا کی زندگی کو آخرت کے بدلے میں۔ اخبارات میں آپ روزانہ پڑھتے ہیں کہ جو وزیر اور افسر اور دوسرے لوگ گھپلے کرتے ہیں یہ لوگ دنیا کو آخرت پر ترجیح دینے والے ہیں۔

فرمایا ﴿فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ﴾ پس نہیں ہلکا کیا جائے گا ان سے عذاب۔ بلکہ روز بہ روز عذاب میں اضافہ ہوگا ﴿فَذُوْقُوْا فَلَنْ نَّزِيْدَكُمْ اِلَّا عَذَابًا﴾ [سورۃ النبا] ''پس چکھو تم پس ہرگز نہیں زیادہ کریں گے تمہارے لئے مگر عذاب کو۔''

﴿وَلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ﴾ اور نہ ان کی مدد کی جائے گی۔

﴿وَ لَقَدْ اٰتَیْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ﴾ اور البتہ تحقیق دی ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب ﴿وَ قَفَّیْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ بِالرُّسُلِ﴾ اور بھیجے ہم نے لگاتار ان کے بعد کئی رسول ﴿وَ اٰتَیْنَا عِیْسَى ابْنَ مَرْیَمَ﴾ اور دیں ہم نے مریم کے بیٹے عیسیٰ علیہ السلام کو ﴿الْبَیِّنٰتِ﴾ واضح دلیلیں ﴿وَ اَیَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ﴾ اور ہم نے تائید کی اس کی پاکیزہ روح کے ساتھ ﴿اَفَكُلَّمَا جَآءَكُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا﴾ کیا جب بھی کوئی رسول لایا تمہارے پاس وہ چیز ﴿لَا تَهْوٰۤى اَنْفُسُكُمُ﴾ جسے تمہارے نفس نہیں چاہتے تھے ﴿اسْتَكْبَرْتُمْ﴾ تو تم نے تکبر کیا ﴿فَفَرِیْقًا كَذَّبْتُمْ﴾ پس پیغمبروں کے ایک فریق کو تم نے جھٹلایا ﴿وَ فَرِیْقًا تَقْتُلُوْنَ﴾ اور ایک فریق کو تم نے قتل کیا ﴿وَ قَالُوْا قُلُوْبُنَا غُلْفٌ﴾ اور کہا انھوں نے ہمارے دل غلافوں میں ہیں ﴿بَلْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ﴾ بلکہ اللہ تعالیٰ نے ان پر لعنت فرمائی ان کے کفر کی وجہ سے ﴿فَقَلِیْلًا مَّا یُؤْمِنُوْنَ﴾ پس بہت تھوڑے ہیں جو ایمان لاتے ہیں ﴿وَ لَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ﴾ اور جب آئی ان کے پاس کتاب ﴿مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ﴾ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ﴿مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ﴾ تصدیق کرنے والی ہے ان کتابوں کی جو ان کے پاس ہیں ﴿وَ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ﴾ اور تھے وہ اس سے پہلے ﴿یَسْتَفْتِحُوْنَ﴾ فتح کے لیے توسل حاصل کرتے تھے ﴿عَلَى الَّذِیْنَ كَفَرُوْا﴾ ان لوگوں کے خلاف جو کافر ہیں ﴿فَلَمَّا جَآءَهُمْ﴾ پس جب آگئی ان کے پاس ﴿مَّا عَرَفُوْا﴾ وہ ذات جس کو انہوں نے پہچان لیا ﴿كَفَرُوْا بِهٖ﴾ تو اس کا انکار کر گئے ﴿فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِیْنَ﴾ پس اللہ تعالیٰ کی لعنت ہے کافروں پر ﴿بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهٖۤ اَنْفُسَهُمْ﴾ بُری ہے وہ چیز جو انہوں نے خریدی اپنی جانوں کے لیے ﴿اَنْ یَّكْفُرُوْا﴾ یہ کفر کرتے ہیں ﴿بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ﴾ ان چیزوں کا جو اللہ تعالیٰ نے نازل فرمائیں ﴿بَغْیًا﴾ سرکشی کرتے ہوئے ﴿اَنْ یُّنَزِّلَ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ﴾ یہ کہ نازل کرتا ہے اللہ تعالیٰ اپنا فضل ﴿عَلٰى مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ﴾ جس پر چاہتا ہے اپنے بندوں میں سے ﴿فَبَآءُوْ بِغَضَبٍ عَلٰى غَضَبٍ﴾ پس لوٹے وہ غضب پر غضب لے کر ﴿وَ لِلْكٰفِرِیْنَ عَذَابٌ مُّهِیْنٌ﴾ اور کافروں کے لیے عذاب ہے رسوا کرنے والا۔

ربط :

اس سے پہلے بنی اسرائیل کے جرائم اور ان کی نافرمانیوں کا ذکر تھا کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی کتابوں کو جھٹلایا قیامت کا انکار کیا۔ اللہ تعالیٰ کے پیغمبروں کو جھٹلایا، یہاں تک کہ پیغمبروں کو شہید بھی کیا تو ذہن میں یہ سوال آتا ہے کہ کیا ان کو سمجھایا نہیں گیا؟ ان کی راہنمائی نہیں کی گئی کہ وہ ایسی حرکتیں کرتے رہے؟

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ﴿وَ لَقَدْ اٰتَیْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ﴾ اور البتہ تحقیق دی ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب۔ تورات کا آسمانی

کتابوں میں قرآن کریم کے بعد بہت بلند مقام ہے اور بڑی جامع مانع کتاب ہے۔

﴿وَقَفَّيْنَا مِنْ بَعْدِهٖ بِالرُّسُلِ﴾ اور بھیجے ہم نے لگا تار ان کے بعد کئی رسول۔ قَفَّا کا لغوی معنیٰ "گُدِّی" ہے۔ اور پچھلی جانب جہاں سر ختم ہوتا ہے وہ گدی ہے جب آدمی پیچھے پیچھے کھڑے ہوں تو پچھلے آدمی کی نگاہ اگلے آدمی کی گدی پر پڑتی ہے۔ مراد یہ ہے کہ ہم نے موسیٰ علیہ السلام کے پیچھے لگا تار پیغمبر بھیجے ان کو کتاب بھی دی اور بنی اسرائیل کے آخری پیغمبر عیسیٰ علیہ السلام ہیں۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ﴿وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ﴾ اور دیں ہم نے مریم کے بیٹے عیسیٰ (علیہما السلام) کو واضح دلیلیں۔

لفظ "عیسیٰ اور مریم" کا معنیٰ

"عیسیٰ" عربی زبان کا لفظ ہے اور عبرانی زبان میں اس کی اصل "عَيْشُوْ یا یَسُوْع" تھا۔ جس کا معنیٰ "مبارک اور سردار" ہے۔ اور مریم کا معنیٰ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ "عابدہ" کرتے ہیں۔ عبادت کرنے والی۔ حضرت مریم علیہا السلام کو یہ شرف حاصل ہے کہ قرآن کریم میں ان کے سوا کسی عورت کا نام نہیں آیا۔ نہ پہلی امتوں میں سے اور نہ اس امت میں سے اور ان کا نام تیس مرتبہ آیا ہے۔ گویا کہ اوسطاً فی پارہ ایک دفعہ ان کا نام آیا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نسبت ان کی والدہ کی طرف کی اور عیسیٰ بن مریم علیہما السلام فرمایا یہ اس بات کی دلیل ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام بغیر باپ کے پیدا ہوئے ہیں۔ اگر ان کا باپ ہوتا تو اس کی طرف نسبت ہوتی۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ضابطہ بیان فرمایا ہے ﴿اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآئِهِمْ﴾ باپ کی طرف نسبت کر کے پکارو۔

مرزا قادیانی کی خرافات

مرزا غلام احمد قادیانی ملعون نے جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق غلیظ زبان استعمال کی تو علماءِ کرام نے اس کے خلاف آواز بلند کی تو شیطان نے اپنی کتاب "کشتی نوح" میں پہلے تو مولویوں کو خاصی گالیاں دیں کہ یہ مولوی بڑے بدذات ہیں یہ لوگوں کو میرے متعلق کہتے ہیں کہ میں عیسیٰ علیہ السلام کی تعظیم نہیں کرتا۔ میرے سے زیادہ تعظیم کرنے والا کون ہے؟

میں تو عیسیٰ علیہ السلام کی بھی تعظیم کرتا ہوں اور ان کے چھ بہن بھائیوں کی بھی تعظیم کرتا ہوں اور ان کے باپ یوسف نجار کی بھی تعظیم کرتا ہوں یہ ہے اس کی تعظیم۔ معاذ اللہ تعالیٰ۔ اور اس نے اپنی کتاب "تریاق القلوب" میں لکھا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تین نانیاں اور تین دادیاں زنا کار اور کسبی عورتیں تھیں لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ۔ یہ ہے اس کی تعظیم، بڑا خبیث آدمی تھا۔ بھائی! جب از روئے قرآن ان کا باپ ہی نہیں ہے تو دادیاں کہاں سے آگئیں؟ بہر حال اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو واضح دلیلیں دے کر مبعوث فرمایا۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ﴿وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ﴾ اور ہم نے تائید کی اس کی پاکیزہ روح یعنی جبرائیل امین علیہ السلام کے ساتھ تا کہ ان کو کوئی تکلیف نہ پہنچائے۔ جبرائیل علیہ السلام کی تائید کی ضرورت اس لئے پڑی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جب

بنی اسرائیل کی اصلاح کا کام شروع کیا اور ان کو بتایا کہ یہ، یہ چیزیں تم نے بگاڑ دی ہیں اور اس سے دین کا نقشہ بگڑ گیا ہے تو چھوٹے بڑے سب کے سب ان کے مخالف ہو گئے۔ کیا مولوی یا پیر یا عوام اور کیا خواص سب نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے لڑنا شروع کر دیا۔

جس طرح آج کل اہلِ بدعت نے دین کا نقشہ بگاڑ کر رکھ دیا ہے۔ اور عوام کا ایسا ذہن بنا دیا ہے کہ اگر بدعات کی تردید کرو تو لڑنے مرنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ ان کے ذہنوں کو بدلنا خاصا مشکل کام ہے۔ اور بدعات کی تردید سے زیادہ ان کو چھوڑنا مشکل ہے۔ تمہیں درس سنتے ہوئے پچپن سال ہو گئے ہیں مگر بدعات کو چھوڑنے کے لیے تم بھی تیار نہیں ہو۔ بدعات کو چھوڑنے والا بہت بڑا مجاہد ہے۔

﴿اَفَكُلَّمَا جَآءَكُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا﴾ کیا جب بھی کوئی رسول لایا تمہارے پاس وہ چیز ﴿لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُكُمُ﴾ جسے تمہارے نفس نہیں چاہتے تھے ﴿اسْتَكْبَرْتُمْ﴾ تو تم نے تکبر کیا ﴿فَفَرِيْقًا كَذَّبْتُمْ﴾ پس پیغمبروں کے ایک فریق کو تم نے اے ظالمو جھٹلایا ﴿وَفَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ﴾ اور ایک فریق کو تم نے قتل کیا۔ جیسے شعیا، زکریا، یحییٰ علیہم السلام اور ان کے علاوہ اور بہت سارے پیغمبروں کو تم نے شہید کیا۔ جب بھی کسی پیغمبر نے ان کی مرضی کے خلاف بات کی اس کو انہوں نے شہید کر ڈالا۔

حضرت یحییٰ علیہ السلام اور فریضہ رسالت

حضرت یحییٰ علیہ السلام کے زمانے میں حاکم وقت اپنی بھانجی کے ساتھ نکاح کرنا چاہتا تھا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ یحییٰ علیہ السلام اپنا فریضہ ادا کرنے کے لیے اس کے پاس تشریف لے گئے۔ اور فرمایا کہ میرے پاس اس طرح کی بات پہنچی ہے اس لیے میں تحقیق کرنے کے لیے آیا ہوں۔ کیا تم اپنی بھانجی کے ساتھ نکاح کرنا چاہتے ہو؟ اس نے کہا کہ تو کون ہوتا ہے اس طرح کی باتیں کرنے والا؟

فرمایا "میں اللہ تعالیٰ کا پیغمبر ہوں اور یہ بات میرے فریضہ میں داخل ہے کہ میں ناجائز کام کو روکوں میں اپنا فریضہ ادا کرنے کے لیے آیا ہوں لہٰذا اگر واقعی کوئی بات ہے تو باز آجا، تیرے لیے اور عورتوں اور لونڈیوں کی کمی نہیں ہے"۔ اس نے حضرت یحییٰ علیہ السلام کے اس بیان کو اپنی توہین سمجھا اور انہیں قتل کرا دیا۔

اور جب انہیں حق کی دعوت دی گئی تو ﴿وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا غُلْفٌ﴾ اور کہا انہوں نے ہمارے دل غلافوں میں ہیں۔ غُلْف، اَغْلُفٌ کی جمع ہے جس کے معنیٰ ہیں "غلاف"۔ جو قرآن شریف اور دیگر کتابوں پر چڑھایا جاتا ہے۔ تاکہ ان پر گرد و غبار نہ پڑے، مکھی نہ بیٹھے، دھواں نہ لگے، بے حرمتی نہ ہو۔ تو انہوں نے کہا کہ ہمارے دلوں میں اللہ تعالیٰ کی معرفت ہے، علم ہے اور بڑی پاکیزہ چیزیں ہیں ان پر ہم نے غلاف چڑھائے ہوئے ہیں تاکہ تمہاری گرد و غبار اور دھوئیں کی مانند باتیں ہمارے دلوں تک نہ پہنچیں۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ﴿بَلْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ﴾ یہ بات نہیں ہے کہ ان کے دل بڑے صاف ہیں اور ان کے عقیدے اور نظریات درست ہیں اور تمہاری باتیں گرد و غبار والی ہیں۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے ان پر لعنت فرمائی ان کے کفر کی وجہ سے ﴿فَقَلِيْلًا مَّا يُؤْمِنُوْنَ﴾ پس بہت تھوڑے ہیں جو ایمان لاتے ہیں۔ باوجود اس کے کہ تقریباً سارے یہودی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جانتے تھے کہ واقعی یہ سچا پیغمبر ہے۔ ﴿يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ﴾ اس طرح پہچانتے ہیں جس طرح اپنی اولاد کو پہچانتے ہیں۔

حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ قبولِ اسلام سے پہلے اور بعد میں یہودیوں کی نظر میں

حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ جب مسلمان ہوئے تو بڑا عجیب واقعہ ہوا۔ بخاری شریف میں ہے کہ وہ جب کلمہ پڑھ کر بیٹھے تو دیکھا کہ اور یہودی بھی آ رہے ہیں تو پردے کی اوٹ میں ہو گئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ حضرت! یہودی آ رہے ہیں پہلے ان سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم میرے متعلق پوچھیں کہ میں کون ہوں؟ پھر ان کو اسلام کی دعوت دیں۔

چنانچہ جب وہ آ گئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((كَيْفَ فِيْكُمُ ابْنُ سَلَامٍ ؟)) "عبداللہ بن سلام تم میں کیسا آدمی ہے؟" کہنے لگے:

☆...... خَيْرُنَا وَابْنُ خَيْرِنَا ہم میں سے بہتر ہے اور بہتر کا بیٹا ہے۔

☆...... اَعْلَمُنَا وَ ابْنُ اَعْلَمِنَا سب سے بڑا عالم ہے اور سب سے بڑے عالم کا بیٹا ہے۔

☆...... سَيِّدُنَا وَ ابْنُ سَيِّدِنَا ہمارا سردار ہے اور ہمارے سردار کا بیٹا ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر وہ اسلام قبول کر لے تو تمہارا کیا رویہ ہوگا؟ تم کیا کرو گے؟ کہنے لگے ((اَعَاذَهُ اللّٰهُ مِنَ الْاِسْلَامِ)) اللہ تعالیٰ اسے اسلام سے پناہ میں رکھے۔ یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ پردے سے باہر آ گئے اور ڈٹ کر کہا: ((اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَ رَسُوْلُهٗ)) وہ یہودی جنہوں نے ان کی اتنی تعریف کی تھی کہنے لگے ((شَرُّنَا وَ ابْنُ شَرِّنَا)) ہم میں سے بڑا شرارتی ہے اور بڑے شرارتی کا بیٹا ہے۔ اندازہ لگاؤ وہی آدمی ہیں، وہی زبانیں ہیں پہلے کیا کہا اور اب کیا کہہ رہے ہیں؟ مگر ضد کا کوئی علاج نہیں ہے۔ جانتے پہچانتے ہوئے بھی ایمان نہیں لائے۔ سوائے عبداللہ بن سلام اور پانچ سات اور کے [رضی اللہ عنہم]۔

قرآنِ کریم اور پہلی کتابیں

﴿وَ لَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ﴾ اور جب آئی ان کے پاس کتاب اللہ تعالیٰ کی طرف سے یعنی قرآنِ کریم ﴿مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ﴾ تصدیق کرنے والی ہے ان کتابوں کی جو ان کے پاس ہیں۔ تو قرآن کریم کو نہ ماننے سے ان کتابوں کا بھی انکار ہے جن کا یہ مُصَدِّق ہے۔ ہاں اگر قرآنِ کریم ان کتابوں کے خلاف ہوتا تو پھر وہ کہہ سکتے تھے کہ ہماری کتابوں میں کچھ اور

ہے اور قرآنِ کریم کچھ اور کہتا ہے؟ لہٰذا ہم نہیں مانتے؟ مگر یہ تو ان کا مصدق ہے۔

﴿وَ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ﴾ اور تھے وہ اس سے پہلے ﴿یَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِیْنَ كَفَرُوْا﴾ فتح کے لیے توسل حاصل کرتے تھے ان لوگوں کے خلاف جو کافر ہیں۔ اس آیت کریمہ کی دو تفسیریں تمام تفسیروں میں نقل کی گئی ہیں۔

①......ایک یہ کہ فتح کے معنیٰ کھولنے کے ہیں تو اس لحاظ سے معنیٰ یہ ہوگا کہ بنی اسرائیل کفار پر اس بات کو کھولتے تھے یعنی بیان کرتے تھے کہ آخری نبی آنے والے ہیں۔

②......اور دوسری تفسیر یہ ہے کہ فتح کا معنیٰ ''کامیابی'' بھی ہے۔ تو یہودی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آمد سے پہلے کافروں کے مقابلے میں فتح اور کامرانی کے لیے دعا کرتے تھے اور کہتے تھے۔ ''اے پروردگار! نبی آخر الزمان کے وسیلے سے ہمیں ہمارے دشمنوں پر فتح عطاء فرما''۔ اب وسیلہ تو اسی کا دیں گے جس کے ساتھ کچھ تعظیم کا تعلق ہوگا؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعظیم کرتے تھے۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وسیلے سے دعائیں کرتے تھے۔

﴿فَلَمَّا جَآءَهُمْ﴾ پس جب آگئی ان کے پاس ﴿مَّا عَرَفُوْا﴾ وہ ذات جس کو انہوں نے پہچان لیا ﴿كَفَرُوْا بِهٖ﴾ تو اس کا انکار کر گئے ﴿فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِیْنَ﴾ پس اللہ تعالیٰ کی لعنت ہے کافروں پر۔

وسیلہ کا شرعی مفہوم اور حکم

یہاں وسیلے کا مسئلہ بھی سمجھ لیں۔ وہ یہ کہ اگر کوئی شخص اس طرح دعا کرے کہ اے پروردگار! آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وسیلے سے میرا یہ کام کر دے یا یوں کہے کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے طفیل سے میرا یہ کام کر دے یا یوں کہے کہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی برکت سے میرا یہ کام کر دے یا یوں کہے کہ سیدنا شیخ عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی حرمت سے میرا یہ کام کر دے۔ وسیلہ، طفیل، صدقہ، حرمت، جاہ اور حق سب کا ایک ہی معنیٰ ہے۔ اپنی لغت، زبان اور عرف کے اعتبار سے الفاظ مختلف ہیں۔ تو اس میں تفصیل ہے:

①......اگر توسل کرنے والا یہ سمجھتا ہے کہ جس کا میں وسیلہ دے رہا ہوں وہ میرے پاس حاضر و ناظر ہے اور عالم الغیب ہے اور تمام کاموں میں اس کو تصرف حاصل ہے اور وہ میرا کام کرا سکتا ہے۔ تو ایسے وسیلے کے کفر اور شرک ہونے میں کوئی شک نہیں ہے؟ ایسا توسل کرنے والا کافر اور مشرک ہے۔

②......اور اگر توسل کرنے والا جس کا وسیلہ دے کر دعا کر رہا ہے اس کو عالم الغیب، حاضر و ناظر نہیں سمجھتا اور اس کو مُتَصَرِّفْ فِی الْاُمُوْر بھی نہیں سمجھتا، حاضر و ناظر، عالم الغیب، مختارِ کل صرف رب تعالیٰ کو سمجھتا ہے اور اس کا یہ نظریہ بھی نہیں ہے کہ وہ رب تعالیٰ سے جبراً کام کرا سکتا ہے۔ اور محض ان کے ساتھ اور تعلق کا واسطہ دے کر دعا کرتا ہے تو جائز ہے۔

مثلاً: یوں کہتا ہے کہ اے پروردگار! میرا تیرے پیغمبر پر ایمان ہے اور میں ان سے محبت کرتا ہوں یا اولیاء کی محبت کا

واسطہ دے کر کہ میں تیرے ولیوں سے محبت کرتا ہوا یہ میرا ان سے محبت کرنا ایک نیک عمل ہے اور اس نیک عمل کی وجہ سے میں توسل کرتا ہوں۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے وسیلے سے دعا کرنے کا مطلب یہ ہے کہ چونکہ میں تیرے پیغمبر پر ایمان رکھتا ہوں اور ان سے محبت کرتا ہوں اس کی وجہ سے میں تجھ سے سوال کرتا ہوں۔ تو یہ وسیلہ جائز ہے۔ اور اس کا کوئی بھی منکر نہیں ہے۔ اور یہ وسیلہ اسی آیت کریمہ سے ثابت ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهٖ اَنْفُسَهُمْ﴾ بُری ہے وہ چیز جو انہوں نے خریدی اپنی جانوں کے لیے۔ اپنی جانوں کے لیے انہوں نے کفر خرید کر برا سودا کیا۔ کس چیز کا کفر کیا؟

﴿اَنْ يَّكْفُرُوْا بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ﴾ یہ کفر کرتے ہیں ان چیزوں کا جو اللہ تعالیٰ نے نازل فرمائیں ﴿بَغْيًا﴾ سرکشی کرتے ہوئے ﴿اَنْ يُّنَزِّلَ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ﴾ یہ کہ نازل کرتا ہے اللہ تعالیٰ اپنا فضل ﴿عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ﴾ جس پر چاہتا ہے اپنے بندوں میں سے۔ اس پر کسی کا زور اور اختیار نہیں چلتا۔ اور دوسرے مقام پر فرمایا: ﴿وَاللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ﴾ اور اللہ تعالیٰ اپنی رحمت کے ساتھ خاص کرتا ہے جس کو چاہتا ہے۔

ان کے کفر اور انکار کا نتیجہ یہ ہوا کہ ﴿فَبَآءُوْ بِغَضَبٍ عَلٰى غَضَبٍ﴾ پس لوٹے وہ غضب پر غضب لے کر۔ ایک غضب پہلے پیغمبروں کی نافرمانی کا اور دوسرا غضب آخری پیغمبر کے انکار کرنے کا ﴿وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ﴾ اور کافروں کے لیے عذاب رسوا کرنے والا۔

﴿وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ﴾ اور جب ان سے کہا جاتا ہے ﴿اٰمِنُوْا﴾ ایمان لاؤ ﴿بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ﴾ اس چیز پر جو اللہ تعالیٰ نے نازل فرمائی ہے ﴿قَالُوْا﴾ کہتے ہیں ﴿نُؤْمِنُ﴾ ہم ایمان رکھتے ہیں ﴿بِمَاۤ اُنْزِلَ عَلَيْنَا﴾ اس چیز پر جو ہماری طرف نازل کی گئی ﴿وَيَكْفُرُوْنَ بِمَا وَرَآءَهٗ﴾ اور انکار کرتے ہیں اس کے علاوہ کا ﴿وَهُوَ الْحَقُّ﴾ حالانکہ وہ حق ہے ﴿مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ﴾ تصدیق کرنے والی ہے اس کی جو ان کے پاس ہے ﴿قُلْ﴾ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم فرمادیں ﴿فَلِمَ تَقْتُلُوْنَ اَنْۢبِيَآءَ اللّٰهِ﴾ پس تم کیوں قتل کرتے رہے اللہ تعالیٰ کے پیغمبروں کو ﴿مِنْ قَبْلُ﴾ اس سے پہلے ﴿اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ﴾ اگر تم مومن ہو ﴿وَلَقَدْ جَآءَكُمْ مُّوْسٰى﴾ اور البتہ تحقیق لائے تمہارے پاس موسیٰ علیہ السلام ﴿بِالْبَيِّنٰتِ﴾ واضح دلیلیں ﴿ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ﴾ پھر تم نے بنالیا بچھڑے کو معبود ﴿مِنْ بَعْدِهٖ﴾ اس کے جانے کے بعد ﴿وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ﴾ اور تم ظالم تھے ﴿وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ﴾ اور جب ہم نے تم سے پختہ عہد لیا ﴿وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ﴾ اور بلند کیا ہم نے تمہارے اوپر طور پہاڑ کو ﴿خُذُوْا مَاۤ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ﴾ پکڑو اس کو جو ہم نے تمہیں

دیا ہے مضبوطی کے ساتھ ﴿وَّ اسْمَعُوْا﴾ اور سنو ﴿قَالُوْا سَمِعْنَا وَ عَصَیْنَا﴾ انہوں نے کہا ہم نے سن لیا اور ہم نے مانا نہیں ﴿وَ اُشْرِبُوْا فِیْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ﴾ اور پلا دی گئی ان کے دلوں میں بچھڑے کی محبت ﴿بِكُفْرِهِمْ﴾ ان کے کفر کی وجہ سے ﴿قُلْ بِئْسَمَا﴾ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرما دیں بری ہے وہ چیز ﴿یَاْمُرُكُمْ بِهٖۤ اِیْمَانُكُمْ﴾ جس کے لیے حکم کرتا ہے تمہیں تمہارا ایمان ﴿اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ﴾ اگر ہو تم مومن ﴿قُلْ﴾ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرما دیں ﴿اِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ﴾ اگر ہے تمہارے لیے آخرت کا گھر ﴿عِنْدَ اللّٰهِ خَالِصَةً﴾ اللہ تعالیٰ کے ہاں خالص ﴿مِّنْ دُوْنِ النَّاسِ﴾ دوسرے لوگوں کے سوا ﴿فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ﴾ پس تم موت کی تمنا کرو ﴿اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ﴾ اگر تم سچے ہو ﴿وَ لَنْ یَّتَمَنَّوْهُ اَبَدًا﴾ اور وہ اس موت کی تمنا ہرگز نہیں کریں گے ﴿بِمَا قَدَّمَتْ اَیْدِیْهِمْ﴾ اس وجہ سے کہ جو ان کے ہاتھوں نے آگے بھیجا ہے ﴿وَ اللّٰهُ عَلِیْمٌۢ بِالظّٰلِمِیْنَ﴾ اور اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے ظلم کرنے والوں کو ﴿وَ لَتَجِدَنَّهُمْ﴾ اور البتہ آپ ضرور پائیں گے ان لوگوں کو ﴿اَحْرَصَ النَّاسِ﴾ سب لوگوں سے زیادہ حریص ﴿عَلٰى حَیٰوةٍ﴾ زندگی پر ﴿وَ مِنَ الَّذِیْنَ اَشْرَكُوْا﴾ اور ان سے بھی زیادہ حریص جنہوں نے شرک کیا ﴿یَوَدُّ اَحَدُهُمْ﴾ ان میں سے ہر ایک پسند کرتا ہے ﴿لَوْ یُعَمَّرُ اَلْفَ سَنَةٍ﴾ کاش کہ اس کو ہزار سال عمر دے دی جائے ﴿وَ مَا هُوَ﴾ حالانکہ نہیں ہے وہ عمر ﴿بِمُزَحْزِحِهٖ مِنَ الْعَذَابِ﴾ دور کرنے والی اس کو عذاب سے ﴿اَنْ یُّعَمَّرَ﴾ یہ کہ اگر اس کو عمر دے دی جائے ﴿وَ اللّٰهُ بَصِیْرٌۢ بِمَا یَعْمَلُوْنَ﴾ اور اللہ تعالیٰ دیکھ رہا ہے جو کچھ وہ کرتے ہیں۔

ربط

بنی اسرائیل اور یہودیوں کی برائیوں اور تخریب کاریوں کا ذکر چلا آ رہا ہے۔

اسی سلسلے میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ﴿وَ اِذَا قِیْلَ لَهُمْ﴾ اور جب ان یہودیوں سے کہا جاتا ہے ﴿اٰمِنُوْا بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ﴾ ایمان لاؤ اس چیز پر جو اللہ تعالیٰ نے نازل فرمائی ہے۔ یعنی قرآن پاک پر اور آخری پیغمبر کا تشریف لانا بھی تمہارے علم میں ہے اور تم بخوبی جانتے ہو کہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہی پیغمبر ہیں جنہوں نے آنا تھا۔ اور تم اس بات کو بھی جانتے ہو کہ ان پر اللہ تعالیٰ کا کلام نازل ہوگا۔ لہٰذا جب تم ان تمام علامتوں اور نشانیوں سے واقف اور آگاہ ہو تو اب اس کتاب قرآنِ کریم پر ایمان لاؤ۔

اس کے جواب میں ﴿قَالُوْا﴾ یہودیوں نے کہا ﴿نُؤْمِنُ﴾ ہم ایمان رکھتے ہیں ﴿بِمَاۤ اُنْزِلَ عَلَیْنَا﴾ اس چیز پر جو ہماری طرف نازل کی گئی۔ ہم تو توراۃ پر ایمان لانے کے پابند ہیں۔ ﴿وَ یَكْفُرُوْنَ بِمَا وَرَآءَهٗ﴾ اور انکار کرتے ہیں اس کے علاوہ کا کہ تورات کے علاوہ کسی اور چیز پر ایمان لانے کا اللہ تعالیٰ نے ہمیں پابند نہیں کیا۔

توراۃ وانجیل کی تصدیق

اللہ تعالیٰ نے ان کو اس کے دو جواب دیئے ہیں: ①...... ایک تحقیقی ②...... دوسرا الزامی۔

تحقیقی جواب یہ ہے۔ فرمایا:

①...... ﴿وَهُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ﴾ حالانکہ وہ حق ہے تصدیق کرنے والی ہے اس کی جو ان کے پاس ہے۔ ایک تو یہ کہ قرآنِ کریم حق ہے اور اس میں تمام مسائل حق پر مبنی ہیں۔ تو کیا حق پر ایمان لانا ان کے فریضہ میں داخل نہیں ہے؟

②...... اور دوسری بات یہ ہے کہ قرآنِ کریم ان کی کتابوں توراۃ، انجیل، زبور کا مصدِّق ہے۔ ان کی تصدیق کرتا ہے کہ ان کتابوں میں جو عقائد اور نظریات بیان کئے گئے ہیں، صحیح ہیں۔ اور مصدِّق کو ماننا اور تسلیم کرنا دراصل مصدَّق جس کی وہ تصدیق کر رہا ہے کو ماننا اور تسلیم کرنا ہے۔ تو مصدِّق کا انکار کرنا مصدَّق کا انکار کرنا ہے۔

کیونکہ قرآنِ کریم اگر عقائد اور نظریات ان کتابوں سے مختلف بیان کرتا تو وہ کہہ سکتے تھے کہ ہماری کتابوں میں عقائد اور نظریات اور ہیں اور اس کتاب میں عقائد اور نظریات اور ہیں۔ اس لیے ہم اس کا انکار کرتے ہیں اور یہ بات تو ہے نہیں؟ لہٰذا ان کا یہ دعویٰ کہ ہم اپنی کتاب کو مانتے ہیں، صحیح نہیں ہے۔ بلکہ فقط زبانی دعویٰ ہی ہے۔ بلکہ ان کا توراۃ پر ایمان لانے کا دعویٰ بھی جھوٹا ہے۔ آگے تین شقوں میں ان کو الزامی جواب دیا گیا ہے۔

پہلی شق

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿قُلْ﴾ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کہہ دیں ﴿فَلِمَ تَقْتُلُوْنَ اَنْۢبِيَآءَ اللّٰهِ مِنْ قَبْلُ﴾ پس تم کیوں قتل کرتے رہے اللہ تعالیٰ کے پیغمبروں کو اس سے پہلے؟ ﴿اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ﴾ اگر تم مومن ہو۔

توراۃ کو مانتے ہو تو کیا ظالمو! توراۃ میں لکھا ہوا تھا کہ اللہ تعالیٰ کے پیغمبروں کو قتل کرو۔ یہ موجودہ یہودیوں کو ان کے بڑوں کے کارنامے سنا کر شرمندہ کیا جا رہا ہے۔ کیونکہ قاتل تو ان کے بڑے تھے۔ اگر توراۃ کو مانتے ہوتے تو پیغمبروں کو قتل نہ کرتے۔ لہٰذا تمہارا توراۃ کو ماننے کا دعویٰ کرنا غلط ہے۔

دوسری شق

﴿وَلَقَدْ جَآءَكُمْ مُّوْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ﴾ اور البتہ تحقیق لائے تمہارے پاس موسیٰ علیہ السلام واضح دلیلیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے دریا کو پھاڑ کر راستے بنائے دشمن کو ان کے سامنے غرق کیا۔ وادی تیہ میں بادلوں کے ذریعے سائے کا انتظام فرمایا۔ کھانے کے لئے کھیر اور بٹیرے نازل فرمائے۔ پینے کے لئے پتھر سے پانی کے بارہ چشمے جاری فرمائے۔ اور بے شمار نشانیاں لے کر موسیٰ علیہ السلام ان کے پاس آئے۔

﴿ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ﴾ پھر تم نے بنالیا بچھڑے کو معبود ان کے جانے کے بعد۔ یہ ہے تمہارا ایمان کہ جو آڑ بنا

کر قرآنِ مجید کو ماننے سے انکار کرتے ہو کہ ہمیں تو حکم ہے کہ ہم صرف اس پر ایمان لائیں۔ جو ہماری طرف اتارا گیا ہے۔ تو کیا موسیٰ علیہ السلام نے تمہیں غیر اللہ کی عبادت سے منع نہیں کیا تھا۔ اگر تم ان کی بات مانتے تو بچھڑے کی پوجا نہ کرتے۔

بچھڑے کے متعلق پہلے بھی بیان ہوا ہے اور اس کی تفصیل سولہویں پارے میں آئے گی۔ یہ بنی اسرائیلی جب مصر سے آئے تھے تو ان کی عورتیں قبطی عورتوں سے (فرعونیوں کی قوم قبطی تھی) زیور مانگ کر لائی تھیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کو ان زیورات سے منع فرما دیا کہ ان کا استعمال کرنا تمہارے لیے جائز نہیں ہے۔ کیونکہ پہلی شریعتوں میں مالِ غنیمت کو استعمال کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ ہماری شریعت میں مالِ غنیمت کو استعمال کرنے کی اجازت دی گئی ہے۔

''سامری'' اور مکر و فریب

تو انہوں نے وہ زیورات جنگل میں پھینک دیے۔ بنو اسرائیل کی ایک شاخ تھی ''قبیلہ بنو سامرہ'' اس خاندان کا ایک آدمی تھا ''موسیٰ بن ظفر سامری'' اس نے وہ زیورات اٹھا لیے اور ان کو ڈھال کر بچھڑا بنا دیا۔ اور حضرت جبرئیل علیہ السلام کے گھوڑے کے پاؤں کی مٹی بھی اس کے پاس تھی۔ وہ اس طرح کہ حضرت جبرائیل علیہ السلام کا گھوڑا جب پاؤں اٹھاتا تھا تو وہاں ہریالی ہو جاتی تھی۔ اس نے محسوس کیا کہ اس میں کوئی کرشمہ ہے تو اس نے وہ مٹی اٹھا کر اپنے پاس رکھی ہوئی تھی۔

بچھڑا بنا کر وہ مٹی اس میں ڈالی تو بچھڑے سے ٹیں، ٹیں کی آواز آنے لگی۔ اس نے لوگوں کو کہا کہ یہ جو ٹیں، ٹیں کی آواز آرہی ہے یہی تمہارا رب ہے جو اس کے اندر بول رہا ہے۔ اسی وجہ سے موسیٰ علیہ السلام کو آنے میں دیر ہو گئی ہے کیونکہ رب تو یہاں ٹیں، ٹیں کر رہا ہے۔ اور وہ کوہِ طور پر بیٹھے انتظار کر رہے ہیں۔

ان میں ایسے بے وقوف بھی تھے جنہوں نے بچھڑے کو رب مان کر اس کی پوجا شروع کر دی۔ کوئی اس کے سامنے رکوع میں ہے، کوئی سجدہ کر رہا ہے، کوئی عطر لگا رہا ہے اور کوئی اس پر چادر چڑھا رہا ہے۔ کوئی کچھ کر رہا ہے اور کوئی کچھ کر رہا ہے۔ تو اس طرح انہوں نے (سب نے نہیں کچھ نے) بچھڑے کو معبود بنا لیا۔ موسیٰ علیہ السلام کے کوہِ طور پر جانے کے بعد۔

فرمایا ﴿وَ اَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ﴾ اور تم ظالم تھے۔ کہ بچھڑے کو معبود بنا لیا۔ اور وہ بچھڑا ان زیورات سے بنایا گیا تھا۔ جن کا استعمال تمہارے لئے جائز نہیں تھا تو ان سے رب تیار کرنا کس طرح جائز ہو گیا؟

تیسری شق

کہ بنی اسرائیلی جب وادی تیہ (وادیٔ سینائی) میں پہنچے تو انہوں نے موسیٰ علیہ السلام سے مطالبہ کیا کہ ہمارے لیے کوئی قانون اور ضابطہ حیات ہونا چاہیے۔ کیونکہ کوئی قوم آئین کے بغیر نہیں چل سکتی۔ پہلے ہم فرعون کے غلام تھے ان کا آئین ہم پر نافذ تھا۔ اب چونکہ ہم آزاد قوم ہیں لہٰذا اب ہمارے لیے اپنا قانون ہونا چاہیے۔ اس مطالبے پر اللہ تعالیٰ نے ان کو توراۃ عطا فرمائی اور یہ لوگ توراۃ کو سن کر کہنے لگے کہ اس کے احکامات تو بہت سخت ہیں اس پر ہم عمل نہیں کر سکتے۔ تو تمہارا یہ کہنا کہ ہم تو اس

کو مانتے ہیں جو ہماری طرف نازل کی گئی ہے۔ کس طرح درست ہے؟

رفع طور:

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ﴿وَاِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَكُمْ﴾ اور جب ہم نے تم سے پختہ عہد لیا ﴿وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ﴾ اور بلند کیا ہم نے تمہارے اوپر طور پہاڑ کو۔ اللہ تعالیٰ نے طور پہاڑ کو اکھیڑ کر ان کے سروں پر اس طرح کھڑا کر دیا جس طرح یہ مسجد کی چھت ہمارے سروں پر ہے۔

اور کہا ہم نے ﴿خُذُوْا مَاۤ اٰتَیْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ﴾ پکڑو اس کو جو ہم نے تمہیں دیا ہے مضبوطی کے ساتھ ﴿وَّاسْمَعُوْا﴾ اور سنو ﴿قَالُوْا سَمِعْنَا وَعَصَیْنَا﴾ انہوں نے کہا ہم نے سن لیا اور ہم نے مانا نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ کتاب ہم نے سن لی ہے مگر اس پر عمل نہیں کریں گے تو کیا تمہارا ایمان تمہیں یہ سبق دیتا ہے کہ وعدہ کر کے بگڑ جاؤ؟

﴿وَاُشْرِبُوْا فِیْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ﴾ اور پلا دی گئی ان کے دلوں میں بچھڑے کی محبت ﴿بِكُفْرِهِمْ﴾ ان کے کفر کی وجہ سے ﴿قُلْ بِئْسَمَا یَاْمُرُكُمْ بِهٖۤ اِیْمَانُكُمْ﴾ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرما دیں بری ہے وہ چیز جس کے لیے حکم کرتا ہے تمہیں تمہارا ایمان ﴿اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ﴾ اگر تم مومن ہو۔ کیا تمہارا ایمان تمہیں بچھڑے کی پوجا کا حکم دیتا ہے۔ اور تمہارا ایمان یہ ہے کہ وعدہ کر کے توڑ دو تم کس منہ سے کہتے ہو کہ ہم اس کو مانتے ہیں۔ جو ہمارے اوپر نازل کی گئی ہے۔ پھر یہ سب کچھ کرنے کے باوجود کہتے تھے کہ آخرت کا گھر جنت تو صرف ہمارا ہے۔

چنانچہ اسی پارے میں آگے آئے گا ﴿قَالُوْا لَنْ یَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰی﴾ یہودیوں نے کہا کہ جنت میں ہمارے سوا کوئی نہیں داخل ہو سکتا اور عیسائیوں نے کہا کہ جنت میں ہمارے سوا کوئی نہیں داخل ہو سکتا اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿قُلْ﴾ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرما دیں ﴿اِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ﴾ اگر ہے تمہارے لیے آخرت کا گھر ﴿عِنْدَ اللّٰهِ خَالِصَةً﴾ اللہ تعالیٰ کے ہاں خالص تمہارے ہی لیے ﴿مِّنْ دُوْنِ النَّاسِ﴾ دوسرے لوگوں کے سوا ﴿فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ﴾ پس تم موت کی تمنا کرو ﴿اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ﴾ اگر تم سچے ہو۔ کیوں کہ تمہارے اور اللہ کے درمیان صرف موت ہی حائل ہے۔ لہٰذا جلدی موت کی تمنا کرو اور اللہ تعالیٰ سے مانگو کہ یا اللہ! ہمیں جلدی موت دے تاکہ ہم جنت میں چلے جائیں۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ﴿وَلَنْ یَّتَمَنَّوْهُ اَبَدًا﴾ اور وہ اس موت کی تمنا ہرگز نہیں کریں گے (کبھی بھی)۔ ﴿بِمَا قَدَّمَتْ اَیْدِیْهِمْ﴾ اس وجہ سے کہ جو ان کے ہاتھوں نے آگے بھیجا ہے۔ ان کو اپنے کرتوتوں کا علم ہے۔ لہٰذا یہ موت کی تمنا کبھی بھی نہیں کریں گے۔ اور جن لوگوں نے آخرت کی تیاری کی ہوتی تھی ان کے متعلق اس مقام پر تفسیروں میں بڑے عجیب و غریب واقعات نقل کیے گئے ہیں۔

موت سے مؤمنین کی محبت کے واقعات

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا واقعہ

①......حضرت علی رضی اللہ عنہ کا مشہور واقعہ ہے کہ تیروں کی بارش ہورہی تھی نماز کا وقت ہوگیا باوضو تھے گھوڑے سے چھلانگ لگادی اوراپنی چادر بچھا کر نماز شروع کردی ان کے بڑے بیٹے حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے کہا ابا جی تیروں کی بارش ہورہی ہے اورآپ نے نماز شروع کردی ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

لَا يُبَالِیْ اَبُوْكَ عَلَى الْمَوْتِ سَقَطَ اَمْ سَقَطَ عَلَيْهِ الْمَوْتُ.

"بیٹا تیرے باپ کوکوئی پرواہ نہیں ہے کہ وہ موت پر گرے گا یا موت اس پر گرے۔ یہ حضرات تو موت کوتلاش کر رہے تھے موت اپنا کام کرے گی اور ہم اپنا کام کریں گے۔"

حضرت حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ کا واقعہ

②......حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ اس طرح زخمی ہوئے کہ نیزہ بدن کے ایک طرف سے لگا اور دوسری طرف نکل گیا اور خون کے فوارے پھوٹ پڑے۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے کہا: فُزْتُ بِرَبِّ الْكَعْبَةِ کعبہ کے رب کی قسم! میں کامیاب ہوگیا ہوں۔ ساتھیو! مجھے مبارک دو۔ ساتھیوں نے کہا حضرت آپ کے بچنے کی کوئی امید نہیں ہے۔ فرمایا کہ میں تو موت سے خوش ہورہا ہوں اَلْاٰنَ اُلَاقِیْ الْاَحِبَّةَ مُحَمَّدًا وَحِزْبَهٗ اب میری ملاقات ہوگی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اور دوسرے ساتھیوں سے۔

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی موت سے محبت

③...... حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ ایران کے ایک محاذ پر ایرانیوں کے خلاف لڑرہے تھے۔ رستم بن فرخ زار ایرانیوں کا بڑا قابل جرنیل تھا۔ اس نے دھمکی آمیز خط لکھا کہ دیکھو! انسانی ہمدردی کا جذبہ رکھتے ہوئے میں تمہیں یہ خط لکھ رہا ہوں۔ انسانی ہمدردی کی وجہ سے تمہیں کہتا ہوں کہ تم واپس اپنے گھروں کو چلے جاؤ۔ یہ جو تمہارے ساتھ جوشیلے نوجوان ہیں ان کو نہ مرواؤ۔ کسی کی ماں روئے گی کسی کی بیوی روئے گی، کسی کے بچے یتیم ہوں گے، موت کے منہ میں نہ آؤ۔ اور اپنی بھیڑ، بکریاں، اونٹ جاکے چراؤ۔

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے جواب لکھا، فرمایا یاد رکھو! فَاِنَّ مَعِیَ قَوْمٌ بے شک میرے ساتھ ایسی قوم ہے يُحِبُّوْنَ الْمَوْتَ وہ موت کو اس طرح پسند کرتے ہیں كَمَا يُحِبُّوْنَ الْاَعَاجِمُ الْخَمْرَ جس طرح (تم) عجمی لوگ شراب کو پسند کرتے ہو۔ ان کو موت سے ڈرانے کی ضرورت نہیں ہے اور نہ ہی یہ موت سے ڈرتے ہیں۔

فنا فی اللہ کی تہہ میں بقا کا راز مضمر ہے
جسے مرنا نہیں آتا اسے جینا نہیں آتا

شہادت کی موت کو یہ لوگ حیات سمجھتے ہیں۔ رستم دھمکی دے کر چلا گیا اس کے بعد دوسرا جرنیل آیا ''بامان ارمنی''۔

☆...... اس نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ سے کہا کہ تمہارے پاس کتنے فوجی ہیں؟

❁...... سچے لوگ تھے جھوٹ بولنے کی عادت نہیں تھی فرمایا میرے ساتھ صرف سات سو فوجی ہیں۔

☆...... اس نے کہا میرے پاس تیرہ ہزار سے زائد فوجی ہیں۔ لہٰذا تم موت کے منہ میں نہ آؤ۔ یہاں سے واپس چلے جاؤ۔

❁...... حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اَوَاعِظٌ اَنْتَ اَمْ مُقَاتِلٌ. تو ہمیں نصیحت کرنے کے لئے آیا ہے یا لڑنے کے لئے؟

☆...... کہنے لگا لڑنے کے لیے آیا ہوں مگر یہ بتاؤ کہ تمہارے لیے پیچھے سے کمک (مدد) کہاں سے آئے گی؟ کیونکہ میرے پاس تیرہ ہزار فوج ہے اور پیچھے سے مزید فوج بھی آسکتی ہے۔

❁...... حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اَمَّا فِی الْاَرْضِ فَلَا زمین سے تو ہمارے لیے کمک نہیں آئے گی بلکہ آسمان سے مدد آئے گی۔

چنانچہ جنگ ہوئی سات سو نے تیرہ ہزار کو شکست فاش دی۔ کافروں کا ہزار آدمی مارا گیا۔ اور ادھر صرف سات مسلمان شہید ہوئے۔ جو جنت کا طالب ہوتا ہے وہ موت سے نہیں ڈرتا۔ تو فرمایا یہ یہودی کبھی موت کی تمنا نہیں کریں گے۔

﴿وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ﴾ اور اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے ظلم کرنے والوں کو۔ یہ موت کی تمنا تو کیا کریں گے بلکہ ﴿وَلَتَجِدَنَّهُمْ﴾ اور البتہ آپ ضرور پائیں گے ان لوگوں کو ﴿اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰى حَيٰوةٍ﴾ سب لوگوں سے زیادہ حریص زندگی پر۔ ﴿وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا﴾ اور ان سے بھی زیادہ حریص جنہوں نے شرک کیا۔ اور مشرکوں میں سے ایسے بھی تھے جو قیامت کے منکر تھے۔ عیسائی اور یہودی قیامت کے قائل تھے مگر ان کو اپنے ایمان کا پتہ تھا کہ اس کے نتیجے میں ہمیں وہاں جو کچھ ملنا ہے لہٰذا وہ کہتے تھے کہ اسی دنیا میں کھا، پی لو اور جو کچھ کرنا ہے یہیں کرلو۔

اس لیے کہ ﴿يَوَدُّ اَحَدُهُمْ﴾ ان میں سے ہر ایک پسند کرتا ہے ﴿لَوْ يُعَمَّرُ اَلْفَ سَنَةٍ﴾ کاش کہ اس کو ہزار سال عمر دے دی جائے ﴿وَمَا هُوَ بِمُزَحْزِحِهٖ مِنَ الْعَذَابِ﴾ حالاں کہ نہیں ہے وہ عمر دور کرنے والی اس کو عذاب سے ﴿اَنْ يُّعَمَّرَ﴾ یہ کہ اگر اس کو عمر دے دی جائے۔ یعنی اگر ان کو ہزار سال عمر دے دی جائے تو کیا یہ عذاب سے بچ جائیں گے۔

ابلیس لعین کتنے ہزار سال سے زندہ ہے؟ تو کیا جب وہ مرے گا عذابِ الٰہی سے بچ جائے گا۔ اور یہ بھی اپنی شرارتوں سے باز نہیں آتے ان کی زبانیں حق کے خلاف بڑی تیز ہیں اور ان کے اعمال بہت بُرے ہیں۔ لہٰذا ان کو ہزار سال عمر کا مل جانا عذاب سے نہیں بچا سکتا۔

﴿وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ﴾ اور اللہ تعالیٰ دیکھ رہا ہے جو کچھ وہ کرتے ہیں اس کے مطابق ان کو بدلا دے گا۔

﴿قُلْ﴾ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرما دیں ﴿مَنْ كَانَ عَدُوًّا﴾ جو شخص دشمن ہے ﴿لِّجِبْرِيْلَ﴾ جبرئیل علیہ السلام کا ﴿فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ﴾ پس بے شک اُسی نے نازل کیا اس قرآن کریم کو ﴿عَلٰى قَلْبِكَ﴾ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے دل پر ﴿بِاِذْنِ اللّٰهِ﴾ اللہ تعالیٰ کے حکم سے ﴿مُصَدِّقًا﴾ قرآن کریم تصدیق کرنے والا ہے ﴿لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ﴾ اُن کتابوں کی جو اُس سے پہلے نازل ہوئی ہیں ﴿وَهُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ﴾ اور ہدایت اور خوش خبری ہے ایمان والوں کے لیے ﴿مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ﴾ جو شخص دشمن ہے اللہ تعالیٰ کا ﴿وَمَلٰٓئِكَتِهٖ﴾ اور اس کے فرشتوں کا ﴿وَرُسُلِهٖ﴾ اور اس کے رسولوں کا ﴿وَجِبْرِيْلَ وَمِيْكٰلَ﴾ اور جبرئیل اور میکائیل (علیہما السلام) کا ﴿فَاِنَّ اللّٰهَ﴾ پس بے شک اللہ تعالیٰ ﴿عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ﴾ دشمن ہے کافروں کا ﴿وَلَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ﴾ اور البتہ تحقیق ہم نے نازل کیں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف ﴿اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ﴾ صاف صاف آیتیں ﴿وَمَا يَكْفُرُ بِهَآ﴾ اور نہیں انکار کرتے ان آیتوں کا ﴿اِلَّا الْفٰسِقُوْنَ﴾ مگر نافرمان لوگ ﴿اَوَكُلَّمَا عٰهَدُوْا﴾ اور جب کبھی وعدہ کیا انھوں نے ﴿عَهْدًا﴾ وعدہ کرنا ﴿نَّبَذَهٗ﴾ پھینک دیا اس کو ﴿فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ﴾ ان میں سے ایک فریق نے ﴿بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ﴾ بلکہ ان میں سے اکثر ایمان نہیں لاتے ﴿وَلَمَّا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ﴾ اور جب آیا ان کے پاس رسول ﴿مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ﴾ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ﴿مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ﴾ تصدیق کرنے والا ہے اس چیز کی جو ان کے پاس ہے ﴿نَبَذَ فَرِيْقٌ مِّنَ الَّذِيْنَ﴾ پھینک دیا ایک گروہ نے ان میں سے ﴿اُوْتُوا الْكِتٰبَ﴾ جن کو اللہ تعالیٰ کی کتاب دی گئی ﴿كِتٰبَ اللّٰهِ﴾ اللہ تعالیٰ کی کتاب کو ﴿وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ﴾ اپنی پشتوں کے پیچھے ﴿كَاَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ﴾ گویا کہ وہ جانتے ہی نہیں۔

شانِ نزول، فدک کا باغ

ان آیات کا شانِ نزول اس طرح بیان فرماتے ہیں کہ مدینہ طیبہ کے قریب تین دن کی مسافت پر ایک مقام تھا جس کا نام تھا "فدک" یہاں پر کھجوروں کے باغ بھی تھے۔ رافضیوں نے جس باغ فدک کی رَٹ آج تک لگائی ہوئی ہے کہ وہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے غصب کر کے اہلِ بیت کا حق مارا ہے۔ وہ باغ اسی علاقہ "فدک" میں تھا اسی وجہ سے اس کو "باغ فدک" کہتے ہیں۔

اصل حقیقت یہ ہے کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ملکیت نہ تھا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کے مالک نہیں تھے بلکہ وہ مال وقف تھا

اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کے متولی تھے۔ اس کی آمدنی سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے گھر کا خرچہ بھی چلاتے تھے اور اصحاب صفہ (رضی اللہ عنہم) آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مدرسہ کے جو طالب علم تھے ان پر بھی خرچ کرتے تھے اور مساکین اور ضرورتمندوں پر بھی خرچ کرتے تھے۔ اور مہمانوں کی خدمت بھی اس سے کرتے تھے۔ تو وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ملکیت نہیں تھا کہ وراثت میں حضرت فاطمہ اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما کو ملتا۔ بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ملکیت بھی ہوتا تو ان کو نہیں مل سکتا تھا۔ کیونکہ پیغمبر کے مال میں وراثت نہیں چلتی۔ کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے:

نَحْنُ مَعْشَرَ الْاَنْبِيَاءِ لَا نُوْرِثُ وَ لَا نُوْرَثُ مَا تَرَكْنَهُ صَدَقَةٌ.

''ہم انبیاء علیہم السلام کی جماعت کا کوئی وارث نہیں ہوتا۔ اور نہ ہم کسی کے وارث ہوتے ہیں ہم جو کچھ چھوڑتے ہیں وہ صدقہ، خیرات ہوتا ہے۔''

بلاوجہ حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمر فاروق اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہم پر اعتراض کرتے ہیں۔

پھر دوسری بات یہ ہے کہ اگر ان حضرات نے یہ باغ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو نہ دے کر اہلِ بیت کا حق مارا ہے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بھی تو ان کو یہ حق نہیں دیا۔ کیونکہ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ خلیفہ ہوئے اور تقریباً چار سال خلیفہ رہے۔ ان کو اختیار تھا۔ اگرچہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا تو فوت ہو چکی تھیں مگر ان کی اولاد تو موجود تھی۔ یہ باغ ان کی اولاد کے حوالے کر دیتے۔ مگر انہوں نے اولاد کو نہ دیا۔ تو پھر جس طرح اصحاب ثلاثہ رضی اللہ عنہم نہ دے کر ظالم ٹھہرے حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی اس ظلم میں برابر کے شریک ہیں۔ (معاذ اللہ تعالیٰ)

لیکن اصل بات یہ ہے کہ رافضیوں کا نظریہ بالکل غلط اور بے سروپا ہے تو خیر یہ فدک کا مقام بڑا مشہور تھا اور اس کی شہرت کی وجہ یہ تھی کہ عرب کے علاقہ میں یہودیوں کا سب سے بڑا عالم جس کا نام عبداللہ بن صوریا تھا وہ اس علاقہ میں رہتا تھا۔ ایک آنکھ سے کانا تھا اور بڑا شریر قسم کا آدمی تھا۔ چونکہ اپنے مذہب کا بڑا پیشوا تھا اور لوگ دور دراز سے اس کو ملنے کے لیے آتے تھے یہ لوگوں کو الٹی سیدھی باتیں پڑھا سکھا کر بھیجتا کہ جا کر نبی سے یہ سوال کرو۔ اور ابوبکر رضی اللہ عنہ سے یہ سوال کرو۔ عمر رضی اللہ عنہ سے یہ سوال کرو۔

فدک میں یہودیوں کا ''بیت المدارس'' کے نام پر ایک کالج تھا۔ ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کالج میں تشریف لے گئے کہ ان میں سے جو لوگ خود میرے پاس نہیں آتے اور ہیں بھی تعلیم یافتہ ان لوگوں میں اپنا پروگرام پیش کروں تاکہ حجت تمام ہو جائے۔ اور کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ ہمارے علم میں نہیں تھا اتفاق کی بات ہے کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لے گئے۔ ابن صوریا بھی کالج میں تھا۔ سوال وجواب شروع ہوئے۔ ہر بات میں وہ لاجواب ہوا۔

آخر میں کہنے لگا اچھا بتاؤ کہ تمہاری طرف وحی کون سا فرشتہ لاتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ''جبرئیل علیہ السلام'' کہنے لگا یہ تو ہمارا دشمن ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس ہماری چغلیاں کھاتا ہے۔ کہ ان کے بڑوں کے کیے ہوئے کرتوت بذریعہ وحی

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بتا دیتا ہے۔ اگر جبرئیل علیہ السلام کی جگہ میکائیل علیہ السلام ہوتے جن کے ذمہ بارشوں کا نظام ہے تو پھر ہم آپ پر ایمان لے آتے اس پر یہ آیات نازل ہوئیں۔

''جبرئیل'' کا معنیٰ

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ﴿قُلْ﴾ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرمادیں ﴿مَنْ كَانَ عَدُوًّا﴾ جو شخص دشمن ہے جبرئیل (علیہ السلام) کا۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ '' جِبْر'' جیم کے کسرہ کے ساتھ بھی پڑھ سکتے ہیں۔ اور ''جَبْر'' جیم کے فتحہ کے ساتھ بھی پڑھ سکتے ہیں۔ ''جِبْر'' کا معنیٰ عبرانی زبان میں ''بندہ'' ہے۔ اور ''اِیْل'' کا معنیٰ ''اللہ'' ہے۔ تو ''جبریل'' کا معنیٰ ''عبداللہ'' ہوا۔ میکائیل کا معنیٰ بھی عبداللہ ہے۔ کیونکہ ''میك'' کا معنیٰ ''عبد'' اور ''ایل'' کا معنیٰ ''اللہ'' ہے۔ اسی طرح اسرافیل کا معنیٰ بھی ''عبداللہ'' ہے۔ یہ تینوں معانی امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب التفسیر میں بیان فرمائے ہیں۔ اور عزرائیل (علیہ السلام) کا نام کسی حدیث کی کتاب میں نہیں آیا۔ قرآنِ کریم میں ''ملک الموت'' کا لفظ آیا ہے۔

البتہ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ بڑے محدث ہیں انہوں نے فتح الباری میں بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے اور تابعین رحمہم اللہ سے عزرائیل نام نقل فرمایا ہے۔ تو تینوں کی مناسبت سے معلوم ہوتا ہے کہ ''عزرائیل'' کا معنیٰ بھی ''عبداللہ'' ہی ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت جبرئیل علیہ السلام کو دیکھنا

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جبرئیل علیہ السلام کو اصلی شکل میں دو دفعہ دیکھا ہے۔

(۱)......ایک دفعہ زمین پر۔ (۲)...... اور دوسری مرتبہ معراج کی رات آسمانوں پر۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے دیکھا ان کے چھ سو پر تھے اور انہوں نے سارے افق کو گھیرا ہوا تھا۔ ان دو مرتبہ کے علاوہ جب بھی حضرت جبرئیل علیہ السلام تشریف لائے ہیں یا تو حضرت دحیہ بن خلیفہ کلبی رضی اللہ عنہ کی شکل میں یا پھر کسی دیہاتی کی شکل میں تشریف لاتے تھے۔

یہود کی حضرت جبرئیل علیہ السلام سے دشمنی

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ﴿مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ﴾ جو شخص دشمن ہے جبرئیل (علیہ السلام) کا ﴿فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ﴾ پس بے شک اسی نے نازل کیا ہے اس قرآن کریم کو ﴿عَلٰى قَلْبِكَ﴾ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دل پر ﴿بِاِذْنِ اللّٰهِ﴾ اللہ تعالیٰ کے حکم سے۔ اس کے ساتھ کسی کی دشمنی کا کیا جواز ہے؟ وہ تو کلامِ الٰہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب پر اللہ تعالیٰ کے حکم سے نازل کرتا ہے۔ وہ تو اللہ تعالیٰ کا حکم بجا لاتا ہے۔ خواہ وہ حکم آپ کی موافقت میں جائے یا مخالفت میں۔ اس میں اس کا کیا قصور ہے؟ وہ تو سفیر محض ہے، سفیر سے کیا دشمنی دنیا میں بھی کسی کے قاصد اور سفیر کے ساتھ لڑنا نادانی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اس وقت بھی بین الاقوامی قانون یہی تھا کہ سفیروں کو کچھ نہ کہا جائے۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے

پاس ''ثمامہ بن اثال'' اور ''عبداللہ بن نواحہ'' آئے۔

- آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دریافت فرمایا کہ تم کون ہو؟ اور کہاں سے آئے ہو؟
- کہنے لگے ہم ''یمامہ'' سے آئے ہیں۔ ''یمامہ'' عرب کے ایک مشہور قبیلہ کا نام ہے۔ وہاں کے ایک بڑے رئیس مسیلمہ کذاب خبیث نے نبوت کا دعویٰ کیا تھا۔ تو کہنے لگے کہ ہم ''یمامہ'' سے آئے ہیں ہمیں ہمارے نبی ''مسیلمہ'' نے بھیجا ہے۔ اس کا پیغام آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پہنچانے کے لیے آئے ہیں۔

اس نے کہا ہے کہ تم میرے ساتھ صلح کرلو اس طرح کہ شہری علاقے کے تم نبی اور دیہاتی علاقوں کا میں نبی ہوں یا تم مجھے لکھ دو کہ تمہاری وفات کے بعد میں نبی ہوں گا اور تمہارا خلیفہ ہوں گا۔

- آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سے پوچھا کہ وہ حقیقتاً سچ، مچ نبوۃ کا دعویٰ کرتا ہے اور تم اس کے ماننے والے ہو؟
- کہنے لگے: ہاں!
- ابوداؤد شریف کی روایت ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: لَوْ لَا اَنَّ الرُّسُلَ لَا تُقْتَلُ لَقَتَلْتُکُمَا. اگر بین الاقوامی طور پر یہ قانون نہ ہوتا کہ قاصدوں اور سفیروں کو قتل نہیں کیا جاتا میں تمہیں قتل کر دیتا اس قول کی وجہ سے کہ تم مسیلمہ کو نبی مانتے ہو۔ کیونکہ ختم نبوۃ کا منکر قاعدے کے مطابق واجب القتل ہے۔

منکر ختم نبوۃ کی سزا

وقت گزر گیا حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کوفے کے گورنر مقرر ہوئے۔ ایک دن کوفے کے چوک میں تشریف لائے۔ ایک آدمی کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے کھڑے ہو گئے۔ حالانکہ کھڑے ہونے کا نہ ہی معمول تھا اور نہ ہی عادت تھی اور نہ ہی اس طرح غور سے دیکھتے تھے۔ اچھی طرح قریب سے جا کر دیکھا اور فرمایا:

☆...... بھائی جی! آپ کا نام کیا ہے؟

☆...... اس نے بتایا کہ میرا نام ''عبداللہ بن نواحہ'' ہے۔

☆...... فرمایا تم آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دور میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے؟

☆...... کہنے لگا، ہاں! میں تھا اور میرے ساتھ ایک اور ساتھی تھا ہم اپنے نبی مسیلمہ (کذاب) کا پیغام لے کر آئے تھے۔

☆ .... فرمایا: اب بھی تو مسیلمہ کو نبی مانتا ہے؟

☆...... کہنے لگا، ہاں! اب بھی اس کو نبی مانتا ہوں۔

☆...... حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے اپنے کارندوں کو حکم دیا خُذُوْهُ اس کو پکڑو۔ چنانچہ اس کو گرفتار کر لیا گیا۔ فرمایا: اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تجھے اس لیے چھوڑ دیا تھا کہ تو قاصد اور سفیر تھا۔ آج تو قاصد نہیں ہے۔ اپنے اس گندے

عقیدے سے توبہ کرلے ورنہ میں تیرا سر قلم کرادوں گا۔

☆...... اس نے کہا کہ عقیدہ تو کوئی نہیں چھوڑتا۔ (جس طرح آج کل قادیانی ڈٹے ہوئے ہیں)۔

☆...... حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے اس کے سامنے کارندوں کو حکم دیا کہ سولی گاڑھ دو۔ حالانکہ نہ تو اس کو ہتھکڑیاں لگی ہوئی تھیں اور نہ ہی اس نے بیڑیاں پہنی ہوئی تھیں۔ چوراہے پر اس کو سولی پر لٹکا دیا گیا کہ جو شخص ختم نبوت کا منکر ہو اس کی یہ سزا ہے۔

لیکن نوجوانو یاد رکھنا! یہ سزا دینا حکومت کی ذمہ داری ہے۔ شریعت عوام کو اجازت نہیں دیتی کہ جو کافر ہو، مرتد ہو اس کو قتل کردو اور چور کے ہاتھ کاٹ دو۔ زانی (اگر شادی شدہ ہے تو اس کو) سنگسار کردو۔ اور اگر غیر شادی شدہ ہے تو کوڑے مارو۔ اور شرابی کو کوڑے مارو۔ عوام اس کی مجاز نہیں ہے اگر از خود کوئی ایسا کرے گا تو گنہگار ہوگا۔ کسی غلط فہمی میں نہ رہنا۔ تو جبرئیل علیہ السلام تو سفیر ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دل پر قرآن اتارتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے حکم سے۔

﴿مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ﴾ قرآنِ کریم تصدیق کرنے والا ہے ان کتابوں کی جو اس سے پہلے نازل ہوئی ہیں ﴿وَ هُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ﴾ اور نری ہدایت اور خوش خبری ہے ایمان والوں کے لیے۔ ماننے والوں کو رب تعالیٰ کی رضا اور جنت کی خوش خبری سناتا ہے۔

فرمایا ﴿مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ﴾ جو شخص دشمن ہے اللہ تعالیٰ کا ﴿وَمَلٰٓئِكَتِهٖ﴾ اور اس کے فرشتوں کا ﴿وَرُسُلِهٖ﴾ اور اس کے رسولوں کا ﴿وَجِبْرِيْلَ وَمِيْكٰلَ﴾ اور جبرئیل اور میکائیل (علیہما السلام) کا۔ ان دونوں فرشتوں کا ذکر خصوصیت کے ساتھ اس لیے کیا حالانکہ ملائکہ میں یہ بھی شامل ہیں کیونکہ ابن صوریا نے ان کے نام لیے تھے۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ﴿فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ﴾ پس بے شک اللہ تعالیٰ دشمن ہے کافروں کا۔ جو اللہ تعالیٰ کے احکام کا انکار کرتے ہیں اور اس کے رسولوں کا انکار کرتے ہیں۔ اس کے فرشتوں کا انکار کرتے ہیں۔ جبرئیل اور میکائیل علیہما السلام کے ساتھ دشمنی رکھتے ہیں۔

اولیاء اللہ کی توہین پر اللہ تعالیٰ کا اعلانِ جنگ

حدیث قدسی ہے اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتے ہیں: ((مَنْ عَادٰى وَلِيًّا فَقَدْ بَارَزْتُهٗ بِالْحَرْبِ)). ''جو شخص میرے دوست کے ساتھ دشمنی کرے گا میرا اس کو جنگ کا الٹی میٹم ہے۔''

یاد رکھنا! کوئی آدمی اللہ والوں کے ساتھ عداوت کرکے سکون میں نہیں رہا۔

''بہاری'' اور مولانا سید حسین احمد مدنی رحمہ اللہ

بہاریوں کی ذلت تمہارے سامنے ہے کہ در بدر ذلیل وخوار ہو رہے ہیں۔ نہ بنگلہ دیش ان کو قبول کرنے کے لئے تیار

ہے اور نہ پاکستان۔ ان بہاریوں نے اللہ تعالیٰ کے ولی ''مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ'' کی توہین کی تھی۔ واقعہ اس طرح ہوا کہ صوبہ بہار میں ایک مقام تھا ''بہاگل پور'' حضرت شیخ العرب والعجم مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ تقریر کرنے کے لئے وہاں تشریف لے گئے۔ اس وقت لیگ اور کانگرس کا بڑا زور تھا۔ ان بہاریوں نے حضرت کو اسٹیشن پر روک لیا اور کہا کہ ہم تمہاری تقریر نہیں سنتے۔

حضرت نے فرمایا ٹھیک ہے نہ سنو، مگر مجھے اپنے دوستوں کو تو ملنے دو۔ یہ لوگ بدتمیزی پر اتر آئے اور وہیں اسٹیشن پر حضرت کی ڈاڑھی میں شراب ڈالی تھی۔ اختلافِ رائے ہوتا رہتا ہے، رائے کے ساتھ اختلاف کرو مگر توہین کا کیا مطلب ہے؟ اس اللہ والے کی ناقدری کا نتیجہ بھگت رہے ہیں اور ذلیل وخوار ہوتے پھر رہے ہیں۔

قیامِ پاکستان اور بزرگوں کی پیش گوئی، تجاویز

دیکھو! بات آئی گئی ہوگئی۔ تو یہ بھی سمجھ لو کہ اصولی طور پر حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ ملک کی تقسیم کے قائل نہیں تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ اس سے بہت سی خرابیاں پیدا ہوں گی۔ اور حقیقت ہے کہ دس سال بعد تمہیں اقرار کرنا پڑا کہ ان حضرات نے جن خرابیوں کی نشاندہی کی تھی وہ اسی طرح سچ ثابت ہوئی ہیں۔

بہرحال حضرت تقسیم ہند کے قائل نہیں تھے۔ مگر جب پاکستان بننے کا فیصلہ ہوگیا حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم نے ''رفیع قدوائی'' کو اپنا نمائندہ بنا کر بھیجا ''محمد اسماعیل نواب آف چتاری'' کے پاس یہ اس وقت ہندوستان میں مسلم لیگ کا بہت بڑا لیڈر تھا اور صوبے کا امیر تھا۔ پیغام یہ بھیجا تھا کہ بھائی! تم مقدمہ جیت گئے اور ہم ہار گئے۔ مگر ہماری ایک بات تم مان لو اور فیصلہ کرنے والوں تک یہ بات پہنچاؤ۔ کیوں کہ ہماری وہاں تک رسائی نہیں ہے۔ آپ چونکہ صوبے کے امیر ہیں لہٰذا ہماری یہ بات وہاں تک پہنچا دو۔ وہ یہ کہ پاکستان کے لیے دہلی تک کا رقبہ لے لینا اور بنگال نہ لینا۔ یہ بنگالی تمہارے ساتھ تیس سال بھی نہیں رہیں گے۔ انہوں نے یہ بات سہارن پور میں خطبے کے دوران بھی کہی تھی میں خود اس خطبے میں موجود تھا ان کی تقریر کانوں سے سنی تھی۔

جو بزرگوں نے کہا تھا وہ حقیقت ثابت ہوا ان کا وہ خطبہ پاکستان میں طبع نہیں ہوسکتا یہاں پابندی ہے۔ اور انہوں نے یہ بھی فرمایا تھا کہ ''ہندوستان میں مسلمانوں کی خیر نہیں اور پاکستان میں اسلام کی خیر نہیں ہوگی''۔ خیر بات دور چلی گئی۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ﴿وَلَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ﴾ اور البتہ تحقیق ہم نے نازل کیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف صاف صاف آیتیں ﴿وَمَا يَكْفُرُ بِهَآ اِلَّا الْفٰسِقُوْنَ﴾ اور نہیں انکار کرتے ان آیتوں کا مگر نافرمان لوگ ﴿اَوَكُلَّمَا عٰهَدُوْا﴾ اور جب بھی وعدہ کیا انہوں نے ﴿عَهْدًا نَّبَذَهٗ﴾ وعدہ کرنا۔ پھینک دیا اس کو ﴿فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ﴾ ان میں سے ایک فریق نے ﴿بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ﴾ بلکہ ان میں سے اکثر ایمان نہیں لاتے ﴿وَلَمَّا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ﴾ اور جب آیا ان کے پاس رسول اللہ تعالیٰ کی طرف سے یعنی حضرت محمد (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) ﴿مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ﴾ تصدیق کرنے والا ہے اس چیز کی جو ان کے

پاس ہے۔ توراۃ، زبور، انجیل اور دیگر صحیفے۔

﴿نَبَذَ فَرِيقٌ مِّنَ الَّذِينَ﴾ پھینک دیا ایک گروہ نے ان میں سے ﴿أُوتُوا الْكِتٰبَ﴾ جن کو اللہ تعالیٰ کی کتاب دی گئی ﴿كِتٰبَ اللّٰهِ﴾ اللہ تعالیٰ کی کتاب کو ﴿وَرَآءَ ظُهُورِهِمْ﴾ اپنی پشتوں کے پیچھے۔ یعنی انہوں نے اللہ تعالیٰ کی کتاب توراۃ سے روگردانی کی اگر یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی کتاب کو کسی درجے میں بھی تسلیم کرتے تو خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آتے۔ کیوں کہ ان کی کتابوں میں آخری پیغمبر کا ذکر موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿الرَّسُولَ النَّبِيَّ الْأُمِّيَّ الَّذِي يَجِدُونَهُ مَكْتُوبًا عِندَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْإِنجِيلِ﴾ (الاعراف:۱۵۷)

''جو رسول نبی اُمی ہے جس کو وہ لکھا ہوا پاتے ہیں توراۃ اور انجیل میں۔''

آج بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کی بشارتیں ان کی کتابوں میں موجود ہیں۔ باوجود یہ کہ پادریوں نے بڑی تحریفات کی ہیں بلکہ جن کتابوں میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر مبارک صراحت کے ساتھ موجود ہے ان کو ماننے کے لیے ہی تیار نہیں ہیں کہ یہ ہماری کتابیں ہیں۔

''انجیل برنباس'' اور عیسائی

چنانچہ انجیل ''برنباس'' جس کا اردو نسخہ میرے پاس بھی موجود ہے۔ اس کے متعلق کہتے ہیں کہ یہ ہماری کتاب نہیں ہے۔ بھائی! یہ تمہاری کتاب کیوں نہیں ہے؟ ''برنباس'' تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے صحابی ہیں۔ یہ ان کی مرتب کی ہوئی ہے اس لیے اس کا نام ''انجیل برنباس'' ہے۔ اور ''متی، لوقا، مرقس اور یوحنا'' تو تابعی ہیں۔ تابعین کی جمع کی ہوئی اناجیل منظور اور صحابی کی جمع کی ہوئی انجیل نامنظور۔ یہ کیا بات ہوئی؟

نامنظور کرنے کی اصل وجہ یہ ہے کہ اس میں صاف اور صریح الفاظ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا فرمان موجود ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں کہ ''لوگ مجھے رب کا بیٹا اور شریک بنائیں گے اور مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللّٰهِ آ کر میری صفائی دیں گے۔ بس ان الفاظ کی وجہ سے کہتے ہیں کہ یہ ہماری کتاب نہیں ہے۔ کیونکہ اس سے عیسائیت پر ضرب کاری لگتی ہے اور انجیل برنباس میں دو جگہوں پر صاف لفظ ہیں مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللّٰهِ۔ تو فرمایا انھوں نے اللہ تعالیٰ کی کتاب کو پس پشت ڈال دیا۔

﴿كَأَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُونَ﴾ گویا کہ وہ جانتے ہی نہیں۔ حالاں کہ وہ جانتے ہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کی کتابیں ہیں اور ان میں یہ تمام باتیں لکھی ہوئی ہیں۔

﴿وَاتَّبَعُوا﴾ اور ان لوگوں نے پیروی کی ﴿مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِينُ﴾ اس چیز کی جو پڑھتے تھے جنات ﴿عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ﴾ سلیمان علیہ السلام کے عہد حکومت میں ﴿وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ﴾ اور نہیں کفر کیا سلیمان علیہ السلام نے ﴿وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِينَ﴾

کَفَرُوْا ﴾ اور لیکن جنات اور شیطانوں نے کفر اختیار کیا ﴿ یُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ ﴾ وہ سکھاتے تھے لوگوں کو جادو ﴿ وَمَاۤ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَیْنِ ﴾ اور وہ چیز جو اتاری گئی دو فرشتوں پر ﴿ بِبَابِلَ ﴾ بابل (شہر میں) ﴿ هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ ﴾ ہاروت اور ماروت (علیہما السلام) پر ﴿ وَمَا یُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ ﴾ اور وہ دونوں کسی کو نہیں سکھاتے تھے ﴿ حَتّٰى یَقُوْلَاۤ ﴾ یہاں تک کہ وہ دونوں کہتے تھے ﴿ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ ﴾ بے شک ہم آزمائش ہیں ﴿ فَلَا تَكْفُرْ ﴾ پس تو کفر اختیار نہ کر ﴿ فَیَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا ﴾ پس سیکھتے تھے لوگ ان دونوں سے ﴿ مَا یُفَرِّقُوْنَ بِهٖ ﴾ تفریق کرتے تھے اس کے ذریعے ﴿ بَیْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهٖ ﴾ مرد اور عورت کے درمیان ﴿ وَمَا هُمْ بِضَآرِّیْنَ بِهٖ ﴾ اور وہ نہیں نقصان پہنچا سکتے جادو کے ذریعے ﴿ مِنْ اَحَدٍ ﴾ کسی کو ﴿ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ﴾ مگر اللہ تعالیٰ کے حکم سے ﴿ وَیَتَعَلَّمُوْنَ ﴾ اور سیکھتے ہیں ﴿ مَا یَضُرُّهُمْ ﴾ وہ چیز جو ان کو نقصان پہنچاتی ہے ﴿ وَلَا یَنْفَعُهُمْ ﴾ اور ان کو نفع نہیں دیتی ﴿ وَلَقَدْ عَلِمُوْا ﴾ اور البتہ تحقیق وہ جانتے ہیں ﴿ لَمَنِ اشْتَرٰىهُ ﴾ البتہ وہ شخص جس نے جادو کو حاصل کیا ﴿ مَا لَهٗ فِی الْاٰخِرَةِ ﴾ نہیں ہے اس کے لیے آخرت میں ﴿ مِنْ خَلَاقٍ ﴾ کچھ حصہ ﴿ وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖۤ اَنْفُسَهُمْ ﴾ اور البتہ بُری ہے وہ چیز جس کے بدلے انھوں نے اپنی جانوں کو بیچا ہے ﴿ لَوْ كَانُوْا یَعْلَمُوْنَ ﴾ کاش کہ وہ جانتے ﴿ وَلَوْ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا ﴾ اور اگر بے شک وہ لوگ ایمان لے آتے ﴿ وَاتَّقَوْا ﴾ اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ﴿ لَمَثُوْبَةٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ خَیْرٌ ﴾ البتہ بدلہ ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے بہتر ﴿ لَوْ كَانُوْا یَعْلَمُوْنَ ﴾ کاش کہ وہ لوگ جانتے۔

جادو کی شرعی حیثیت

دُنیا میں جتنی چیزیں ہیں ان میں بعض کا تعلق تو اسباب کے ساتھ ہے کہ وہ اسباب کے ذریعے معرضِ وجود میں آتی ہیں۔ مثلاً: چھری کے ذریعہ گلا کاٹنے سے آدمی مرجاتا ہے۔ سینے میں گولی لگنے سے آدمی مرجاتا ہے۔ بعض دوائیں مفید ہوتی ہیں کہ ان کے کھانے سے اللہ تعالیٰ شفا دیتا ہے اور زہر کا کھانا موت کا سبب ہے۔ غرضیکہ بہت سی چیزیں ہیں کہ جن کا تعلق اسباب کے ساتھ ہے۔

جادو بھی اسی قسم سے ہے کہ جس کا تعلق اسباب کے ساتھ ہے اور کچھ چیزیں ایسی ہیں جو اسباب سے بالاتر ہوتی ہیں۔ ظاہری طور پر ان کا اسباب کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ صرف رب تعالیٰ کا حکم ہوتا ہے اور وہ ہوجاتی ہیں۔

معجزہ اور جادو میں فرق

جیسے معجزہ اور کرامت۔ معجزہ اللہ تعالیٰ کے پیغمبر کے ہاتھ پر ظاہر ہوتا ہے اور کرامت ولی کے ہاتھ پر ظاہر ہوتی ہے۔ معجزہ

پیغمبر کا ذاتی فعل نہیں ہوتا۔ اور کرامت ولی کا ذاتی فعل نہیں ہوتا۔ اور اگر ذاتی فعل ہو تو جب چاہیں کر لیں حالانکہ ایسا نہیں ہے۔

اسی طرح اگر ذاتی فعل ہے تو اس سے ڈرنے کی کیا ضرورت ہے؟ مثلاً: حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے جب نبوت عطا فرمائی تو ''ید بیضاء'' اور ''عصا مبارک'' والا معجزہ بھی عطا فرمایا۔ اور موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ اپنی لاٹھی پھینک دو۔ موسیٰ علیہ السلام نے جب لاٹھی پھینکی تو وہ سانپ بن گئی۔ رات کا وقت تھا مگر وہاں اللہ تعالیٰ کے نور کی روشنی تھی۔ جب لاٹھی سانپ بن گئی تو موسیٰ علیہ السلام نے کیا، کیا؟

﴿وَلّٰى مُدْبِرًا وَّلَمْ يُعَقِّبْ﴾ پیٹھ پھیر کر بھاگے اور پیچھے پلٹ کر نہ دیکھا کہ یہ سانپ ہے اس سے بچنا چاہیے۔ اس سے یہ مسئلہ بھی سمجھ آ گیا کہ موذی چیز سے بچنا ایمان کے خلاف نہیں ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کے پیغمبروں سے زیادہ مضبوط ایمان کس کا ہوسکتا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿اَقْبِلْ وَلَا تَخَفْ﴾ اے موسیٰ علیہ السلام! آپ اس کی طرف متوجہ ہوں اور ڈریں نہ، خوف نہ کریں۔ ﴿خُذْهَا﴾ اس کو پکڑ لیں ﴿سَنُعِيْدُهَا سِيْرَتَهَا الْاُوْلٰى﴾ ہم اس کو پہلی حالت میں بدل دیں گے۔ یہ بھی لاٹھی بن جائے گی اگر موسیٰ علیہ السلام کا اختیاری فعل ہوتا تو ڈر کر بھاگتے کیوں؟ تو جس طرح معجزہ نبی کا ذاتی فعل نہیں ہوتا اسی طرح کرامت ولی کا ذاتی فعل نہیں ہوتا۔

چنانچہ تیسرے پارے میں آتا ہے کہ حضرت مریم علیہا السلام بچی تھیں اور حضرت زکریا علیہ السلام کی کفالت میں تھیں۔ حضرت زکریا علیہ السلام کے مکان پر چوبارہ تھا اس کو جالیاں لگی ہوئی تھیں بڑا ہوادار تھا۔ یہ اسی چوبارہ میں رہتی تھیں۔ حضرت زکریا علیہ السلام جب کہیں تشریف لے جاتے تو تالا لگا کر جاتے تھے وہ اندر کھیلتی رہتی تھیں۔

اور جب واپس آتے ﴿كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ﴾ [آل عمران: ۳۷] جب بھی حضرت زکریا علیہ السلام ان کے پاس واپس آتے تو ان کے پاس بے موسم کے پھل دیکھتے اور پوچھتے ﴿اَنّٰى لَكِ هٰذَا؟﴾ یہ تجھے کہاں سے ملے ہیں؟ ﴿قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ﴾ وہ فرماتیں یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں۔ یہ ان کی کرامت تھی کیونکہ دروازہ بند ہے، تالا لگا ہوا ہے مگر بھیجنے والا اللہ تعالیٰ ہے۔ ان کا ذاتی فعل نہیں تھا۔ تو معجزے اور کرامت کا اسباب کے ساتھ تعلق نہیں ہوتا اور جادو کا اسباب کے ساتھ تعلق ہوتا ہے۔

اس مقام پر شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے جادو کی تیرہ قسمیں بیان فرمائی ہیں اور وہ تمام کی تمام ناجائز اور حرام ہیں۔ شیطانوں سے مدد لی جاتی ہے جو کہ غیر اللہ سے استعانت ہے وغیرہ، وغیرہ سب حرام ہیں۔ بلکہ اگر کوئی جائز کام دوسروں کو بلاوجہ نقصان پہنچانے کے لئے ہو تو وہ بھی جادو کی قسم ہے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام پر جادو کا الزام ؟

یہودیوں اور عیسائیوں کے مولوی اور پیر جادو کرتے تھے اور اس کے ذریعے جب کرتب کرتے، عوام کو کہتے کہ یہ ہماری

کرامت ہے۔عوام بڑے سطحی ذہن کے لوگ ہوتے ہیں۔عجیب وغریب قسم کی چیزیں دیکھتے ہیں تو کہتے ہیں کہ واقعی یہ "پہنچے ہوئے ہیں"۔انہوں نے بے حساب عوام کے ذہن بگاڑ دیئے تھے۔

پھر اس جادو کی کڑی حضرت سلیمان علیہ السلام کے ساتھ ملاتے کہ یہ ان سے نقل ہوتا ہوا چلا آرہا ہے۔حالانکہ وہ تو معصوم پیغمبر تھے۔وہ ایسا برا کام کب کر سکتے تھے۔چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس بات کی تردید فرمائی ہے۔

ارشادِ ربانی ہے ﴿وَاتَّبَعُوْا﴾ اور ان لوگوں نے پیروی کی ﴿مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ﴾ اس چیز کی جو پڑھتے تھے جنات ﴿عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ﴾ سلیمان علیہ السلام کے عہد حکومت میں۔جب حضرت سلیمان علیہ السلام بادشاہ تھے اللہ تعالیٰ نے ان کو انسانوں،جنوں،جانوروں اور پرندوں پر بادشاہی کا حق عطا فرمایا تھا اور وہ جانوروں اور پرندوں کی بولیاں بھی جانتے تھے۔اور اس زمانے میں جنات،انسانوں کو نظر آتے تھے اور جادو کرتے تھے تو یہودیوں کے مولویوں اور پیروں نے اس جادو کی پیروی کی ہے جو جنات پڑھتے تھے اور یہ تو کفر ہے۔

﴿وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ﴾ اور نہیں کفر کیا سلیمانؑ علیہ السلام نے ﴿وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا﴾ اور لیکن جنات اور شیاطین نے کفر اختیار کیا ﴿يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ﴾ وہ سکھاتے تھے لوگوں کو جادو۔اور جادو کفر ہے حضرت سلیمان علیہ السلام نے جادو نہ سیکھا نہ سکھایا۔یہ چیزیں جنات اور شیاطین سے نقل ہوتی آرہی ہیں۔کرامت اور معجزے کا بھی ان کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔

اور جس آدمی سے کوئی عجیب وغریب چیز ظاہر ہو اس کو ولی نہ سمجھ لینا اور اگر عجیب وغریب چیز کا ظاہر ہونا ولایت کی دلیل ہے تو پھر دجال تو رَئِیْسُ الْاَوْلِیَاء ہوگا۔کہ اس جیسی عجیب وغریب حرکتیں کون کر سکتا ہے؟ وہ بارش برسنے کا حکم دے گا،بادل اکٹھے ہوں گے اور بارش برسانی شروع کر دیں گے۔زمین پر پاؤں مارے گا زمین سونا،چاندی اگل دے گی۔اور چیزوں کو اپنے پیچھے چلنے کا اشارہ کرے گا ساری چیزیں اس کے پیچھے چل پڑیں گی۔

لہٰذا کسی سے عجیب وغریب چیزوں کا ظاہر ہونا اس کے ولی ہونے کی دلیل نہیں ہے۔بلکہ دیکھیں گے کہ مومن ہے یا کافر؟ اگر مومن ہے تو پھر دیکھیں گے کہ شریعت کا پابند ہے یا نہیں؟ اگر شریعت کا پابند نہیں ہے تو پھر ولی نہیں ہے اگر شریعت کا پابند ہے اور اس کے ہاتھ پر کوئی چیز خلافِ عادت ظاہر ہوئی ہے تو وہ کرامت ہوگی۔

ہاروت و ماروت علیہما السلام کا قصہ

﴿وَمَا اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ﴾ اور وہ چیز جو اتاری گئی دو فرشتوں پر بابل شہر میں ﴿هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ﴾ ہاروت اور ماروت علیہما السلام (پر)۔بابل ملک عراق کا ایک بہت بڑا شہر تھا اور اس کی خاصی آبادی تھی۔بابل شہر میں جادو کا بڑا زور تھا جس طرح آج کل کراچی ٹھگوں سے بھرا پڑا ہے۔لوگوں سے فراڈ کر کے پیسے بٹورتے ہیں اور لوگ بے وقوف ہیں دیتے ہیں اور صرف کراچی ہی نہیں اور بہت سی جگہیں ہیں،گکھڑ بھی خالی نہیں ہے۔

یاد رکھنا! جادو کرنا اور کرانا قطعاً جائز نہیں ہے جائز طریقے سے جن میں شرعی قباحت نہ ہو دم اور تعویذات کرنے میں

کوئی حرج نہیں ہے۔میرے پاس بھی مرد،عورتیں تعویذ لینے کے لیے آتے ہیں۔تعویذ لینے کے بعد عورتیں فیس پوچھتی ہیں میں کہتاہوں کہ میں نے کبھی کسی سے کچھ مانگانہیں ہے اگر کوئی خوشی کے ساتھ کچھ دے جائے تو رد بھی نہیں کرتا۔بڑی حیران ہوتی ہیں کہ فلاں مولوی صاحب نے تو ہم سے پانچ سو روپیہ مانگاہے۔اور فلاں نے تین سو مانگا ہے۔ میں کہتاہوں کہ ہمارے بزرگوں نے ہمیں یہی سبق دیا ہے۔الحمدللہ!نصف صدی سے زیادہ عرصہ ہوگیا ہے ہم اسی پر عمل کررہے ہیں۔

بہرحال بابل شہر میں جادو کا بڑا زور تھا یہودیوں کے مولوی اور پیر کرتے تھے اور اس کو اپنی کرامتوں کا نام دیتے تھے کہ یہ ہماری کرامتیں ہیں۔اللہ تعالیٰ نے جادو اور کرامت میں فرق بتانے کے لیے دو فرشتوں ہاروت اور ماروت کو نازل فرمایا۔ وہ فرشتے مجمع لگالیتے تھے اور لوگوں کو کہتے کہ بھائی یہ تمہارے مولوی اور پیر جو کام کررہے ہیں یہ جادو ہے ان کے قریب نہ جاؤ۔ یہ کرامتیں نہیں ہیں۔لوگ کہتے کہ تم تو جادو جانتے نہیں ہو لہٰذا تم کس طرح کہتے ہو کہ یہ جادو ہے۔وہ کہتے کہ رب تعالیٰ نے ہمیں جادو کا علم دیا ہے۔اور بتا بھی سکتے ہیں مگر وہ کفر ہے۔اس لیے تم جادو نہ سیکھو اور اگر تم اصرار کرو گے تو ہم تمہیں سکھا بھی دیں گے۔ مگر ہم آزمائش اور امتحان ہیں۔تمہاری آزمائش کے لیے بھیجے گئے ہیں۔

﴿وَمَا يُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ﴾ اور وہ دونوں کسی کو نہیں سکھاتے تھے ﴿حَتّٰى يَقُوْلَآ﴾ یہاں تک کہ وہ دونوں کہتے تھے ﴿اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ﴾ بے شک ہم آزمائش ہیں ﴿فَلَا تَكْفُرْ﴾ پس تو کفر اختیار نہ کر۔مگر اس کے باوجود لوگ ان سے سیکھتے تھے اور انہوں نے لوگوں کو کچھ چیزیں بتائیں جو منتقل ہوتی آرہی ہیں۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ﴿فَيَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا﴾ پس سیکھتے تھے لوگ ان دونوں سے ﴿مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهٖ﴾ تفریق کرتے تھے اس کے ذریعے مرد اور عورت کے درمیان۔

امام رازی رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر

اس آیت کی تفسیر میں امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ ”جادو کا یہ اثر ہے کہ بندے کا گدھا اور گدھے کا بندہ بن جائے“۔اور ان فرشتوں کے متعلق عجیب قسم کی کہانیاں تفسیروں میں موجود ہیں۔جن کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔

مثال کے طور پر ایک کہانی یہ بھی لکھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان میں انسانی خواہشات رکھیں۔ان فرشتوں کی نگاہ ایک عورت پر پڑگئی یہ اس کے پیچھے لگ گئے اور اس عورت سے نفسانی خواہش کی تکمیل کے لئے درخواست کی۔اس عورت نے خواہش کی تکمیل کے لئے یہ شرط لگائی کہ مجھے اسم اعظم سکھادو۔ جسے تم پڑھ کر آسمانوں پر چلے جاتے ہو اور واپس آجاتے ہو۔ فرشتوں نے اس عورت کو اسم اعظم سکھادیا پھر اس عورت نے کہا کہ میرے ساتھ یہ لڑکا ہے اس کو قتل کردو ورنہ یہ راز فاش کردے گا۔

فرشتوں نے ایسا کرنے سے معذرت کی۔تو عورت نے کہا اچھا یہ شراب پی لو، بڑی لذیذ ہے۔فرشتوں نے شراب پی

لی۔ اور نشے میں آکر انہوں نے لڑکے کو قتل کر دیا اور زنا کے بھی مرتکب ہوئے۔ اور عورت اسم اعظم پڑھ کر اوپر چلی گئی اور زہرہ ستارہ بن گئی اور ان کو سزا کے طور پر بابل شہر کے ایک کنویں میں الٹا لٹکا دیا گیا تا کہ یہ سزا بھگتیں۔ حاشا وکلا۔ قطعاً کوئی ایسی بات نہیں ہے۔ یہ یہودیوں کی گھڑی ہوئی کہانیاں اور خرافات ہیں۔ وہ اللہ تعالیٰ کے فرشتے تھے اور آزمائش کے طور پر آئے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو لوگوں کا ذہن صاف کرنے کے لیے بھیجا تھا۔

اس کو تم اس طرح سمجھو کہ رشوت خوروں کو پکڑنے کے لیے "اینٹی کرپشن" والے نوٹوں پر دستخط کر کے دیتے ہیں کہ یہ نوٹ تم رشوت کے طور پر دو جب وہ دے دیتے ہیں تو چھاپہ مار کر پکڑ لیتے ہیں۔ تو یہ رشوت جو دی گئی ہے یہ بدکاروں کو پکڑنے کا ذریعہ ہے۔ اسی طرح ان کی برائی کو واضح کرنے کے لیے فرشتے بھیجے گئے تھے ایسا نہیں ہے کہ وہ انسان بن گئے تھے اور ان میں انسانی خواہشات پیدا ہو گئی تھیں۔ اور پھر وہ گناہ میں مبتلا ہو گئے۔ معاذ اللہ تعالیٰ۔

☆ **فرشتوں کی صفت ہے:**

﴿لَا یَعْصُوْنَ اللّٰہَ مَاۤ اَمَرَھُمْ﴾ [التحریم:۶] "رب تعالیٰ ان کو جو حکم دیتا ہے وہ اس کی نافرمانی نہیں کرتے۔"

فرمایا ﴿وَمَا ھُمْ بِضَآرِّیْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ﴾ اور وہ نہیں نقصان پہنچا سکتے جادو کے ذریعے کسی کو ﴿اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ﴾ مگر اللہ تعالیٰ کے حکم سے۔ اللہ تعالیٰ کا حکم نہ ہو تو جادو بھی کچھ اثر نہیں کر سکتا۔ ہر چیز میں مؤثر حقیقی اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔

دیکھو! آگ کا کام ہے جلانا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ کے الاؤ میں ڈالا گیا وہ آپ علیہ السلام کے بدن کا ایک بال بھی نہ جلا سکی۔ کیوں کہ جلانے کا نہیں بلکہ گل وگلزار ہونے کا حکم تھا۔ ٹھنڈی اور سلامتی والی ہو جانے کا حکم تھا۔ اسی طرح ہو گئی۔

زہر کے اندر اللہ تعالیٰ نے مارنے کا اثر رکھا ہے۔ مگر حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے چلو بھر کر پھانک لیا ان کو کچھ بھی نہ ہوا۔ الٹا ان کا نزلہ، زکام ختم ہو گیا۔ اور وہ پہلے سے بھی زیادہ صحت مند ہو گئے۔ حالانکہ وہ اتنی تیز تھی کہ اگر اللہ تعالیٰ اس میں اثر رکھتے تو ایک ذرّے سے مر جاتے۔ تو اللہ تعالیٰ کی مرضی کے بغیر کوئی کسی کو نقصان نہیں پہنچا سکتا۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿وَیَتَعَلَّمُوْنَ﴾ اور سیکھتے ہیں ﴿مَا یَضُرُّھُمْ﴾ وہ چیز جو ان کو نقصان پہنچاتی ہے۔ دوسرے نقصان کے علاوہ جادو سیکھنے سے آدمی کافر ہو جاتا ہے۔ کفر سے بڑا کیا نقصان ہو سکتا ہے؟ ﴿وَلَا یَنْفَعُھُمْ﴾ اور ان کو نفع نہیں دیتی چلو مالی طور پر کچھ نفع ہو بھی گیا تو اس کا کیا فائدہ کافر بن کر حاصل کیا؟۔

فرمایا: ﴿وَلَقَدْ عَلِمُوْا﴾ اور البتہ تحقیق وہ جانتے ہیں ﴿لَمَنِ اشْتَرٰىهُ﴾ البتہ وہ شخص جس نے جادو کو حاصل کیا ﴿مَا لَهٗ فِی الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ﴾ نہیں ہے اس کے لیے آخرت میں کچھ حصہ ﴿وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖۤ اَنْفُسَھُمْ﴾ اور البتہ بری ہے وہ چیز جس کے بدلے انہوں نے اپنی جانوں کو بیچا ہے ﴿لَوْ کَانُوْا یَعْلَمُوْنَ﴾ کاش کہ وہ جانتے۔ کہ دنیا کے تھوڑے سے فائدے کے بدلے کافر بن گئے، ایمان ضائع ہو گیا، آخرت برباد ہو گئی۔

﴿وَلَوْ اَنَّھُمْ اٰمَنُوْا﴾ اور اگر بے شک وہ لوگ ایمان لے آتے ﴿وَاتَّقَوْا﴾ اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے اور کفر شرک سے

بچتے ﴿لَمَثُوْبَةٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ خَيْرٌ﴾ البتہ بدلا ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے بہتر ﴿لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ﴾ کاش کہ وہ لوگ جانتے اور آخرت کے نقصان سے بچتے۔

"فال" نکلوانے کا حکم

مسئلہ ایک دفعہ پھر سمجھ لیں کہ دوسروں کو تکلیف پہنچانے کے لیے جتنے عمل کیے جاتے ہیں یہ بھی جادو کی ایک قسم ہے۔ ان کو جائز سمجھ کر کرانے والا بھی کافر اور کرنے والا بھی کافر اور اس کے ذریعے جو کمائی ہے وہ بھی حرام ہے۔ اور یہی حکم ہے "فال" والوں کا۔ حدیث پاک میں آتا ہے کہ جس نے فال نکلوائی ((فَقَدْ كَفَرَ بِمَآ اُنْزِلَ عَلٰى مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ)). "پس اس نے انکار کر دیا اس کا جو کچھ نازل کیا گیا محمد ﷺ پر۔"

اسی طرح شریعت کی رو سے وہ کافر ہو گیا۔ اس کا نکاح ٹوٹ گیا۔ تجدید ایمان اور تجدید نکاح نہ کیا تو اس کے بعد جو بچے پیدا ہوں گے وہ حرامی ہوں گے۔ اور عموماً عورتیں اس میں زیادہ مبتلا ہیں آپ کا فرض ہے کہ ان کی اصلاح کریں۔ اللہ پاک ہمیں احکامِ شرعیہ پر کماحقہ عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائیں۔ [آمین]

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو ﴿لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا﴾ تم رَاعِنَا نہ کہو ﴿وَقُوْلُوا انْظُرْنَا﴾ اور اُنْظُرْنَا کہو ﴿وَاسْمَعُوْا﴾ اور سنو ﴿وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ اَلِيْمٌ﴾ اور کافروں کے لیے دردناک عذاب ہے ﴿مَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا﴾ نہیں پسند کرتے وہ لوگ جو کافر ہیں ﴿مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ﴾ اہل کتاب میں سے ﴿وَلَا الْمُشْرِكِيْنَ﴾ اور نہ مشرکوں میں سے ﴿اَنْ يُّنَزَّلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ خَيْرٍ﴾ یہ کہ اُتاری جائے تم پر کوئی بھلائی ﴿مِّنْ رَّبِّكُمْ﴾ تمھارے رب کی طرف سے ﴿وَاللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ﴾ اور اللہ تعالیٰ خاص کرتا ہے اپنی رحمت کے ساتھ جس کو چاہتا ہے ﴿وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ﴾ اور اللہ تعالیٰ بڑے فضل والا ہے ﴿مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ﴾ جو منسوخ کرتے ہیں ہم کسی آیت کو ﴿اَوْ نُنْسِهَا﴾ یا ہم اُس کو مٹا دیتے ہیں ﴿نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ﴾ تو ہم اس سے بہتر لے آتے ہیں ﴿اَوْ مِثْلِهَا﴾ یا اس جیسی ﴿اَلَمْ تَعْلَمْ﴾ کیا آپ نہیں جانتے؟ ﴿اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ﴾ کہ بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے ﴿اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ﴾ کیا آپ نہیں جانتے کہ بے شک اللہ تعالیٰ ﴿لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ ہی کے لیے ہے ملک آسمانوں کا اور زمین کا ﴿وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ اور نہیں ہے تمھارے لیے اللہ تعالیٰ کے سوا ﴿مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ﴾ کوئی حمایتی اور نہ مددگار ﴿اَمْ تُرِيْدُوْنَ﴾ کیا تم ارادہ کرتے ہو ﴿اَنْ تَسْـَٔلُوْا رَسُوْلَكُمْ﴾ کہ

سوال کرو تم اپنے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے ﴿ كَمَا سُئِلَ مُوسٰى مِنْ قَبْلُ ﴾ جس طرح سوال کیا گیا موسیٰ علیہ السلام سے اس سے پہلے ﴿ وَ مَنْ يَّتَبَدَّلِ الْكُفْرَ ﴾ اور جو شخص تبدیل کرے گا کفر کو ﴿ بِالْاِيْمَانِ ﴾ ایمان کے ساتھ ﴿ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ ﴾ پس تحقیق وہ سیدھے راستے سے گمراہ ہو گیا۔

ربط

ان آیات کا ماقبل کے ساتھ ربط واضح ہے کہ یہود و نصاریٰ کی شرارتوں کا ذکر چلا آ رہا ہے۔ ان آیات میں بھی ان کی ایک شرارت کا ذکر ہے کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ایمان والوں کو پریشان کرتے رہتے تھے۔ اس طرح کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں ہر طرح کے لوگ آتے تھے ان میں شہری بھی ہوتے تھے اور دیہاتی بھی، تعلیم یافتہ بھی اور اَن پڑھ بھی، ذہین، غبی اور متوسط ذہن کے لوگ بھی ہوتے تھے اور ہر مجلس میں ہر طرح کے آدمی موجود ہوتے ہیں۔

سب کو اللہ تعالیٰ نے ایک جیسا پیدا نہیں فرمایا۔ کچھ ایسے ہوتے ہیں کہ کلام کے شروع ہوتے ہی سمجھ جاتے ہیں کہ متکلم کیا کہنا چاہتا ہے؟ اور بعضے کلام ختم ہونے کے بعد سمجھتے ہیں اور ایسے بھی ہوتے ہیں کہ سارا بیان ختم ہونے کے بعد بھی ان کے پلے کچھ نہیں پڑتا۔

یہودیوں کی لفظی تحریف

چونکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مجلس میں ہر طرح کے آدمی ہوتے تھے تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے درخواست کی اور کہا رَاعِنَا حضرت! ہماری رعایت فرمانا کہ بیان ایسے طریقے سے ہو کہ دیہاتی بھی سمجھ لیں اور شہری بھی، پڑھے لکھے بھی اور اَن پڑھ بھی، ذہین بھی اور درمیانے ذہن کے بھی۔ لفظ بھی صحیح تھا رَاعِنَا اور مراد بھی صحیح تھی۔

مگر یہودی اس لفظ سے غلط مراد لیتے تھے کہ ان کی لغت میں رَاعِنَا، رَعُوْنَتٌ سے احمق اور جاہل کے معنیٰ میں استعمال ہوتا تھا۔ وہ رَاعِنَا بولتے اور آپس میں ہنستے کہ ہم نے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو احمق اور جاہل کہا ہے، معاذ اللہ تعالیٰ۔ اور اس طرح بھی شرارت کرتے تھے کہ رَاعِنَا کے لفظ کو ذرا کھینچ کر رَاعِيْنَا بولتے تھے یعنی ''ہمارا چرواہا''۔ معاذ اللہ تعالیٰ۔

صحیح الفاظ کی غلط تعبیر

اسی طرح یہودی جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آتے تو جلدی سے کہتے اَلسَّامُ علیکم اس کا معنیٰ ہے ''تم پر موت واقع ہو'' اور اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ کا معنیٰ ہے ''تم پر رب تعالیٰ کی طرف سے سلامتی ہو''۔

اس طرح چالاکی سے یہ حرکت بھی کرتے تھے کہ ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے کمرے میں موجود تھے اور ایک کونے پر پردہ لٹکا ہوا ہوتا تھا جب کوئی آدمی آتا تو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پردے کے پیچھے چلی جاتیں کیونکہ ایک ہی کمرہ تھا۔ ایک

آدمی نے دروازہ کھٹکھٹایا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کو اندر آنے کی اجازت دی۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پردے کے پیچھے چلی گئیں۔

☆...... اس آدمی نے کہا اَلسَّامُ علیکُم۔

☆...... انہوں نے اندر سے کہا عَلَيْكَ السَّامُ وَ اللَّعْنَةُ تیرے اوپر موت اور لعنت پڑے۔ خیر اس یہودی نے جو بات کرنی تھی کر کے چلا گیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا عائشہ! تو بڑے غصے میں تھی، کیا بات تھی؟ کہنے لگیں حضرت! اَلَمْ تَسْمَعْ مَا قَالَ آپ نے سنا نہیں جو اس نے کہا یعنی اَلسَّامُ عَلَيْكَ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا اَلَمْ تَسْمَعِيْ مَا قُلْتُ لَهٗ کیا تو نے نہیں سنا جو میں نے اس کو کہا ہے؟ یعنی عَلَيْكَ تجھ پر پڑے۔ بس اتنا جواب کافی تھا۔

تو یہ خبیث لفظوں میں ہیرا پھیری کرتے تھے اور رَاعِنَا کے جملہ سے چونکہ توہین کا پہلو نکلتا تھا لہٰذا اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں کو اس جملے کے استعمال کرنے سے منع فرمایا۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ﴿يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو ﴿لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا﴾ تم رَاعِنَا نہ کہو۔ اگرچہ لفظ بھی صحیح ہے اور معنیٰ بھی صحیح ہے اور تمہاری مراد بھی صحیح ہے لیکن یہودی اس سے غلط فائدہ اٹھاتے ہیں اس لیے یہ لفظ استعمال نہ کرو۔

﴿وَقُوْلُوا انْظُرْنَا﴾ اور اُنظُرْنَا کہو۔ کہ حضرت! ہماری طرف نظر شفقت فرماؤ۔ اس سے اتنی بات سمجھ آگئی کہ اگر جملہ صحیح ہو اور اس سے مراد غلط ہو تو اس کا بولنا صحیح نہیں ہے۔ لہٰذا اگر کوئی شخص اَلصَّلٰوةُ وَ السَّلَامُ عَلَيْكَ يَا رَسُوْلَ اللهِ اس عقیدے اور نظریے کے ساتھ پڑھتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم "حاضر و ناظر" ہیں تو ناجائز ہے۔ اور اگر کوئی صحیح العقیدہ ہے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو "حاضر و ناظر" نہیں سمجھتا تو اس کے لیے یہ پڑھنا جائز اور درست ہے۔

حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد

قاسم العلوم والخیرات حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے سوال کیا کہ حضرت! اَلصَّلٰوةُ وَ السَّلَامُ عَلَيْكَ يَا رَسُوْلَ اللهِ کے الفاظ کے ساتھ درود شریف پڑھا جا سکتا ہے یا نہیں؟ حضرت نے فرمایا کہ یہ درود شریف کے مختصر الفاظ ہیں لیکن پڑھنے والا یہ سمجھے کہ میرے اس درود شریف کو فرشتے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک پہنچاتے ہیں اور اگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حاضر و ناظر سمجھ کر پڑھے گا تو کفر ہوگا۔

آج کل اکثریت کے ذہن چونکہ خراب ہیں اور وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حاضر و ناظر سمجھ کر اَلصَّلٰوةُ وَ السَّلَامُ عَلَيْكَ يَا رَسُوْلَ اللهِ پڑھتے ہیں لہٰذا صحیح العقیدہ ہونے کے باوجود ان الفاظ سے گریز کرنا چاہیے تاکہ کسی باطل فرقے کی تائید نہ ہو اور اس کی دلیل یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تم رَاعِنَا نہ کہو بلکہ اُنظُرْنَا کہو۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ ﴿وَ اسْمَعُوْا﴾ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بات کو غور سے سنو۔ ﴿وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ اَلِيْمٌ﴾ اور کافروں کے لیے دردناک عذاب ہے۔

آگے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جن لوگوں کو تمہارے ساتھ عداوت ہے وہ کسی خیر اور بھلائی کو تمہارے لیے پسند نہیں کرتے۔

فرمایا: ﴿مَا یَوَدُّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا﴾ نہیں پسند کرتے وہ لوگ جو کافر ہیں ﴿مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ﴾ اہلِ کتاب میں سے یہودی ہوں یا عیسائی ﴿وَلَا الْمُشْرِكِیْنَ﴾ اور نہ مشرکوں میں سے ﴿اَنْ یُّنَزَّلَ عَلَیْكُمْ مِّنْ خَیْرٍ﴾ یہ کہ اتاری جائے تم پر کوئی بھلائی ﴿مِّنْ رَّبِّكُمْ﴾ تمہارے رب کی طرف سے۔

نبوۃ کسبی نہیں :

وہ کہتے ہیں کہ ان کو نبوۃ ملی ہے ہمیں کیوں نہیں ملی؟ ان کو کتاب ملی ہے ہمیں کیوں نہیں ملی؟ فرشتہ ان کے پاس کیوں آتا ہے ہمارے پاس کیوں نہیں آتا؟ اللہ تعالیٰ نے اس کا مختصر جواب دیا۔

فرمایا ﴿وَاللّٰهُ یَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ یَّشَآءُ﴾ اور اللہ تعالیٰ خاص کرتا ہے اپنی رحمت کے ساتھ جس کو چاہتا ہے۔ اپنی مرضی سے نبوت کسی کو نہیں مل سکتی۔ وہ حکیم و خبیر اور علیم ہے۔ وہ ہر شے کو جانتا ہے اور ہر چیز سے باخبر ہے اور اپنی حکمت کے مطابق کام کرتا ہے۔ سب سے پہلے حضرت آدم علیہ السلام کو پیغمبر بنایا۔ اور آخری پیغمبر حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بنایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہر اعتبار سے ”خاتم النبیین“ ہیں۔ زمانے کے اعتبار سے، مرتبہ کے اعتبار سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی سے بڑا کوئی نہیں ہوسکتا اور نہ ہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی پیغمبر بن کر آسکتا ہے۔

قادیانیوں کا عقیدہ باطل اور غلط ہے جیسا کہ مرزا قادیانی کے لڑکے بشیر الدین محمود نے لکھا ہے کہ: ”اگر کوئی شخص چاہے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے درجے کو پہنچ سکتا ہے بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے آگے بھی نکل سکتا ہے“ مَعَاذَ اللّٰهِ تَعَالٰی، ثُمَّ مَعَاذَ اللّٰهِ تَعَالٰی، ثُمَّ مَعَاذَ اللّٰهِ تَعَالٰی۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ نبوت ایسی چیز ہے کہ بندہ محنت کر کے اس کو حاصل کرسکتا ہے۔ حالانکہ نبوۃ صرف رب تعالیٰ کا فضل ہے۔ جس کو رب تعالیٰ نے چاہا اس کو عطا فرمائی۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم فرمادی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی کو نبوت ملنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ﴿وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِیْمِ﴾ اور اللہ تعالیٰ بڑے فضل والا ہے۔

مسائل نسخ :

آگے اللہ تعالیٰ نے ”نسخ“ کا مسئلہ بیان فرمایا ہے۔ ”نسخ“ کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک حکم نازل فرمایا پھر کچھ عرصہ کے بعد بندوں کی نسبت سے اس کو ختم کر کے اس کی جگہ دوسرا حکم نازل فرما دیا۔ اس پر یہود و نصاریٰ اور مشرکین اعتراض کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کے حکموں میں یہ تبدیلی کیوں آتی ہے؟ ایسا تو وہ کرتا ہے جس کو علم نہ ہو۔

”نسخ“ پر دیانند سرسوتی کا اعتراض :

نسخ کے مسئلہ پر ”آریہ سماج“ کے لیڈر ”دیانند سرسوتی“ نے بھی اعتراض کیا ہے۔ یہ بڑا منطقی، منہ پھٹ اور بے حیا

قسم کا آدمی تھا۔اس نے کہا کہ دیکھو جی! تم مسلمان کہتے ہو کہ احکام میں نسخ بھی ہوتا ہے۔کل رب تعالیٰ کا حکم وہ تھا اور آج یہ ہے تو کیا رب تعالیٰ کو معلوم نہیں ہوتا کہ کل میں نے کیا کرنا ہے اور آج میں نے کیا کرنا ہے؟

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے جوابات

اس زندیق کے سوالوں کے جوابات بانی دارالعلوم دیوبند، قاسم العلوم والخیرات حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب ''انتصارالاسلام'' میں چند شقوں میں دیے ہیں۔

پہلی شق

①...... ''نسخ'' کے مسئلہ پر حضرت کے جواب کی ایک شق یہ ہے کہ جس طرح انسان کی جسمانی بیماریاں ہیں اسی طرح روحانی بیماریاں بھی ہیں۔جسمانی بیماریوں کے معالج، ڈاکٹر اور ماہر حکیم مریض کے لیئے پہلے ایک نسخہ تجویز کرتے ہیں، پھر کچھ مدت کے بعد بدل دیتے ہیں اس کی بیماری کے حساب سے نسخہ کا بدلنا حکمت کا تقاضا ہے نہ کہ ان کی نالائقی کی دلیل ہے۔

پہلے بیمار کے لیے وہ دوائی مفید تھی اور اب یہ ہے اور جس طرح دوا بدلتے ہیں اسی طرح غذا بھی بدلتے ہیں۔انتہائی کمزور مریض کو ہلکی پھلکی غذا کھچڑی، دلیہ، شوربا اور یخنی استعمال کرنے کا حکم دیتے ہیں۔اور جوں جوں روبصحت ہوتا ہے تو سخت غذا کھانے کی اجازت دے دیتے ہیں۔اب اگر کوئی حکیم یا ڈاکٹر پر اعتراض کرے کہ یہ بڑا نالائق اور بے وقوف ہے کہ کل ایک نسخہ تجویز کیا۔آج دوسرا تجویز کر دیا ہے کل کہتا تھا یہ کھاؤ اور آج کہتا ہے یہ کھاؤ۔تو یہ اعتراض کرنے والا بے وقوف اور نالائق سمجھا جائے گا۔

یہی حال روحانی بیماریوں کا ہے جن کا معالج پروردگار ہے۔اس حکیم علی الاطلاق نے روحانی بیماریوں کے مطابق احکام میں تبدیلیاں فرمائیں۔مثلاً: پہلے مسلمان کم تھے اور ظاہر بات ہے کہ جنسی خواہشات ان میں بھی تھیں نسل انسانی چلانے کے لیے۔لہٰذا اس وقت اللہ تعالیٰ نے مسلمان مرد کا کافر عورت کے ساتھ اور کافر مرد کا مسلمان عورت کے ساتھ نکاح جائز رکھا۔ بعد میں جب اسلام عامۃ الناس میں پھیل گیا اور طرفین سے مسلمان مرد، عورتوں کے رشتے ملنے لگے تو ہجرت کے تیسرے سال اللہ تعالیٰ نے وہ حکم بدل دیا اور کافر و مشرک کے ساتھ رشتہ کرنے سے منع فرما دیا۔

فرمایا ﴿وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ﴾ مشرک عورتوں کے ساتھ نکاح نہیں کر سکتے ﴿وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ﴾ اور مشرکوں کو اپنی بیٹیاں اور بہنیں بھی نکاح میں نہیں دے سکتے۔مکہ مکرمہ میں روزے نہیں تھے اور نہ ہی جہاد کرنے کا حکم تھا۔کیونکہ مکی زندگی بڑی صبر آزما تھی۔جن کو پہلے ہی کھانا نہیں ملتا اور بھوکے رہ کر گزارہ کرتے تھے۔اس لیے جو مسلمان ہو جاتا تھا اس کو تو بڑی سختیاں برداشت کرنی پڑتی تھیں۔گھر والے روٹی تک بند کر دیتے تھے۔ان کو روزے کا کیا حکم دینا ہے وہ تو پہلے ہی بھوکے ہیں۔

حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ اور استقامت دین

حضرت عبداللہ ''ذوالبجادین'' ایک نوجوان صحابی تھے اپنے چچا کے گھر پرورش پا رہے تھے جب انہوں نے کلمہ پڑھا تو چچا نے سختی کی تاکہ کلمہ چھوڑ دے۔ جب اس نے کلمہ چھوڑنے سے انکار کیا تو اس کی روٹی بند کردی اور اس کو تکلیفیں دیں، پھر بھی نہ مانا اور کلمہ چھوڑنے سے انکار کردیا تو اس کو کہا کہ ہمارے کپڑے اتار دے۔ چنانچہ اس کے کپڑے اتروا لیے۔ قریب ہی ایک گرا ہوا مکان تھا بے چارے ننگ دھڑنگ اس کے اندر بیٹھ گئے۔

دِن چڑھا تو ایک آدمی بوری لے کر جا رہا تھا گھاس لینے کے لیے۔ اس کو آواز دی اور کہا اللہ کے بندے اندر نہ آنا کیونکہ میں ننگا ہوں اگر تیرے پاس تن پوشی کے لیے کوئی چیز ہے تو میری طرف پھینک دے۔ اس نے سمجھا کہ پتہ نہیں کوئی جن بھوت بول رہا ہے، ڈر گیا۔ تھوڑی دیر بعد جب خوف کم ہوا تو اس نے کہا کہ میرے پاس تو یہ بوری ہے۔ فرمایا بوری ہی پھینک دے اس نے بوری پھینک دی۔ انہوں نے بوری کے اندر سوراخ کر کے پہنی۔ جس طرح مُردوں کو کفنی پہناتے ہیں اسی وجہ سے ان کا نام ''ذوالبجاد'' پڑ گیا۔ ''ذوالبجاد'' کا معنیٰ ''پرانے کمبل والا'' ہے۔

دوسری شق

②...... احکام بدلنے کو آپ اس طرح بھی سمجھ سکتے ہیں کہ موسم کے ساتھ لباس بدل جاتا ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ سردیوں میں آدمی کیسے گرم کپڑے پہنتا ہے اگر وہی کپڑے گرمیوں میں پہنے تو اس کا حشر ہو جائے۔ تو جس طرح جسمانی بیماریوں کے لیے دوا بدلتے ہیں موسم کے تغیر سے لباس بدلتے ہیں اسی طرح روحانی علاج بھی بدلتا ہے۔

تیسری شق

پہلے ایک مسلمان کا دس کے ساتھ مقابلہ کرنا ضروری تھا کیونکہ مسلمان تھوڑے تھے جب مسلمان زیادہ ہو گئے تو فرمایا اب ایک مسلمان دو کافروں کا مقابلہ کرے۔ تو مخالفوں نے چونکہ نسخ پر اعتراضات کیے تھے تو اللہ تعالیٰ نے جواب دیا۔

فرمایا ﴿مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ﴾ جو منسوخ کرتے ہیں ہم کسی آیت کو۔ مثلاً: پہلے کافر کے ساتھ نکاح جائز تھا پھر منع کر دیا، پہلے ایک کا مقابلہ دس کے ساتھ تھا پھر دو کے ساتھ کر دیا پہلے شراب حلال تھی پھر حرام کر دی گئی۔ اسی طرح اور کئی مسائل ہیں۔

﴿اَوْ نُنْسِهَا﴾ یا ہم اس کو بھلا دیں یہ بھی نسخ کی ایک قسم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہی حکم ختم کرنا ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نہیں ختم کر سکتے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ﴿سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰٓى﴾ ہم آپ کو پڑھائیں گے پس آپ بھولیں گے نہیں ﴿اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ﴾ مگر جو اللہ تعالیٰ چاہے۔ جس حکم کو اللہ تعالیٰ منسوخ کرنا چاہے وہ آپ کے ذہن سے نکال دیتا ہے۔ تو فرمایا کہ ہم کسی حکم کو منسوخ کر دیں یا بھلا دیں ﴿نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ﴾ تو ہم اس سے بہتر لے آتے ہیں جیسے دس کے ساتھ مقابلے کی بجائے دو کے ساتھ مقابلے کا حکم بہتر ہے۔

﴿اَوْ مِثْلِهَا﴾ یا اس جیسی یعنی جو حکم منسوخ ہوا ہے اسی جیسا دوسرا حکم دے دیتے ہیں سولہ سترہ مہینے مسلمان مسجد اقصیٰ کی طرف چہرہ کر کے نماز پڑھتے رہے اور مسجد اقصیٰ کی طرف چہرہ کر کے نماز پڑھنے کا حکم اس لیے تھا کہ پہلی کتابوں میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعریف نبی القبلتین کے لقب سے آئی ہے یعنی دو قبلوں والا نبی کہ وہ بیت اللہ کی طرف چہرہ کر کے بھی نماز پڑھے گا اور مسجد اقصیٰ کی طرف بھی۔ تو پہلے مسجد اقصیٰ کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھنے کا حکم تھا پھر کعبۃ اللہ کی طرف تو یہ دونوں حکم برابر ہیں۔

④...... ''نسخ'' کے مسئلہ پر اعتراض کا جواب حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اس طرح دیتے ہیں کہ ''پنڈت جی! کچھ احکام تشریعی ہیں اور کچھ احکام تکوینی ہیں۔ تکوینی کا مطلب ہے کلمہ کن سے ہو جانے والے کہ جن میں احکام شرع کا تعلق نہیں ہوتا۔ مثلاً: کسی کو اللہ تعالیٰ بیٹا دیتا ہے یا بیٹی دیتا ہے پھر چند دنوں کے بعد واپس لے لیتا ہے یعنی مار دیتا ہے۔ اس پر کوئی اعتراض نہیں کرتا کہ اے پروردگار! جب لینا ہی تھا تو دیا کیوں؟

☆...... اسی طرح ایک آدمی کو مالدار بنانے کے بعد غریب بنا دیتا ہے، تندرست کو بیمار کر دیتا ہے۔ اس پر کوئی اعتراض نہیں کرتا کہ اے پروردگار! اگر غریب بنانا تھا تو مال دار ہی کیوں بنایا؟ بیمار کرنا تھا تو صحت کیوں دی؟ فرمایا: پنڈت جی! جس طرح اللہ تعالیٰ کے ان احکامات میں تغیر کے تم بھی قائل ہو اور اللہ تعالیٰ کے علم اور اس کے دانا ہونے پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کے تشریعی احکام میں بھی تبدیلی پر بھی کوئی اعتراض نہیں ہے اور نہ ہونا چاہیے''۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ﴿اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ﴾ کیا آپ نہیں جانتے کہ بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے؟ جو چاہے، جس طرح چاہے کر سکتا ہے کسی کو امیر بنائے، غریب بنائے، بادشاہ بنائے، گدا بنائے، عزت دے، ذلت دے، سب کچھ کر سکتا ہے۔

امریکہ اور شاہِ ایران

جو بڑی عمر کے بزرگ حضرات بیٹھے ہیں وہ اس بات کو جانتے ہیں کہ رضا شاہ پہلوی ایران کا بادشاہ تھا اور وہ ایشیا میں امریکہ کے مفادات کا چوکی دار تھا۔ امریکہ کے حقوق کی حفاظت اس کے ذمہ تھی۔ اور اس نے یہ ذمہ داری پوری طرح نبھائی اور حفاظت کا حق ادا کیا جس طرح حفاظت کرنی چاہیے تھی مگر کچھ حالات ایسے پیدا ہوئے کہ وہ امریکہ کی ناراضگی کا سبب بن گئے اور وہ اقتدار سے محروم ہو گیا۔ اس کو شہنشاہِ ایران کہا جاتا تھا۔ اس کے دورِ اقتدار میں ایک پاکستانی اخبار نے خبر شائع کی اور لکھا کہ ''شاہِ ایران نے یہ اعلان کیا ہے''۔ اس پر ایران کے سفارت کاروں نے اس اخبار کو نوٹس بھیجا کہ تم نے ہمارے بادشاہ کو شاہِ ایران لکھ کر اس کی توہین کی ہے۔ وہ شاہِ ایران نہیں ہے بلکہ شہنشاہِ ایران ہے۔ یا تو معذرت کرو یا پھر مقدمے کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ خیر! اخبارات نے معذرت کر لی۔ پھر وہ وقت بھی آیا کہ جب جہاز میں بیٹھ کر ایران سے بھاگا تو کوئی ملک اس کے جہاز کو اترنے کی اجازت نہیں دیتا تھا جب وہ اترنے کی اجازت مانگتا تو یہ کہہ کر جواب دے دیتے کہ ہم بین الاقوامی

طور پر مجبور ہیں۔ بالآخر مصر نے دِل مضبوط کیا کہ:

ہر چہ باد آباد

کہا کہ جو ہوتا ہے ہو جائے تم آ جاؤ یہ رب تعالیٰ کے کام ہیں وہ جو چاہے کر سکتا ہے اور یاد رکھنا! ہمارے پاکستان میں دو سفارت خانے انتہائی اپنے ملک کا پرچار کرتے ہیں۔ اور اپنے مسلک کا تحفظ کرتے ہیں ایک ایران کا اور دوسرا امریکہ کا، یہ بہت تیز ہیں۔ پاکستان میں جتنی ان کی چلتی ہے اتنی اور کسی کی نہیں چلتی۔ بات وہاں پر ختم ہو جاتی ہے جہاں امریکہ ختم کر دے اور یہ ان کی بات مانتے ہیں کہ یہ مشکل وقت میں ہمارے کام آئیں گے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ کیا آپ نہیں جانتے کہ بے شک اللہ تعالیٰ کے لیے ہی ہے ملک آسمانوں کا اور زمین کا ﴿وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ﴾ اور نہیں ہے تمہارے لیے اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی حمایتی کہ زبان سے حمایت کرے اور نہ کوئی مددگار ہے کہ رب تعالیٰ کی گرفت سے بچانے کے لیے عملی طور پر میدان میں آئے۔

بے جا سوالات کا مرض

﴿اَمْ تُرِيْدُوْنَ﴾ کیا تم ارادہ کرتے ہو ﴿اَنْ تَسْـَٔلُوْا رَسُوْلَكُمْ﴾ کہ سوال کرو تم اپنے رسول ﷺ سے ﴿كَمَا سُئِلَ مُوْسٰى مِنْ قَبْلُ﴾ جس طرح سوال کیا گیا موسیٰ علیہ السلام سے اس سے پہلے اور کہا کہ ﴿لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً﴾ ہم ہرگز نہیں ایمان لائیں گے آپ پر یہاں تک کہ ہم دیکھ لیں اللہ تعالیٰ کو سامنے آنکھوں سے۔ اسی طرح کے لایعنی سوالات مشرکین نے بھی کیے تھے کہ ﴿وَلَنْ نُّؤْمِنَ﴾ ہم ہرگز نہیں ایمان لائیں گے آپ پر یہاں تک کہ آپ ہمارے مطالبے پورے کریں۔

پھر انہوں نے اپنے مطالبے پیش کیے۔ ان میں سے ایک مطالبہ یہ بھی تھا ﴿اَوْ تَاْتِيَ بِاللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ قَبِيْلًا﴾ [بنی اسرائیل:۹۲] کہ آپ ﷺ رب تعالیٰ کو ہمارے سامنے لا کر کھڑا کریں اور اس کے پیچھے فرشتوں کی لائن لگی ہوئی ہو اور اللہ تعالیٰ کہے کہ یہ میرا پیغمبر ہے اور فرشتے اس کی تائید کریں کہ اللہ تعالیٰ ٹھیک فرما رہے ہیں۔ تو پھر ہم مانیں گے تو فرمایا تم اس طرح لایعنی سوالات کرتے ہو جس طرح کہ موسیٰ علیہ السلام سے کیے گئے تھے۔

﴿وَمَنْ يَّتَبَدَّلِ الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ﴾ اور جو شخص تبدیل کرے گا کفر کو ایمان کے ساتھ کہ ایمان کے بدلے کفر حاصل کرے گا ﴿فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ﴾ پس تحقیق وہ سیدھے راستے سے گمراہ ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ گمراہی سے بھی اور گمراہ کرنے والوں سے بھی بچائے اور محفوظ رکھے۔ آمین

﴿وَدَّ كَثِيْرٌ﴾ پسند کیا بہت سے لوگوں نے ﴿مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ﴾ اہلِ کتاب میں سے ﴿لَوْ يَرُدُّوْنَكُمْ﴾ اس بات کو کہ وہ لوٹا دیں تمہیں ﴿مِّنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِكُمْ كُفَّارًا﴾ تمہارے مومن ہونے کے بعد کفر کی طرف ﴿حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ﴾ اپنے نفسوں میں حسد کرتے ہوئے ﴿مِّنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ﴾ بعد اس کے کہ ظاہر ہو چکا ہے ﴿لَهُمُ الْحَقُّ﴾ ان کے لیے حق ﴿فَاعْفُوْا﴾ پس معاف کردو ﴿وَاصْفَحُوْا﴾ اور درگزر کرو ﴿حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ﴾ یہاں تک کہ لائے اللہ تعالیٰ اپنا حکم ﴿اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ﴾ بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے ﴿وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ﴾ اور قائم کرو نماز ﴿وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ﴾ اور زکوٰۃ دیتے رہو ﴿وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ﴾ اور جو کچھ بھیجو گے تم آگے اپنی جانوں کے لیے ﴿مِّنْ خَيْرٍ﴾ کوئی بھی نیکی ﴿تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ﴾ پاؤ گے تم اس کو اللہ تعالیٰ کے پاس ﴿اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ﴾ بے شک اللہ تعالیٰ جو تم عمل کرتے ہو دیکھ رہا ہے ﴿وَقَالُوْا﴾ اور کہا انہوں نے ﴿لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ﴾ ہرگز نہیں داخل ہوگا جنت میں ﴿اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى﴾ مگر وہ جو یہودی ہو یا نصرانی ﴿تِلْكَ اَمَانِيُّهُمْ﴾ یہ ان کی خواہشات ہیں ﴿قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ﴾ آپ ﷺ فرما دیں لاؤ تم اپنی دلیل ﴿اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ﴾ اگر ہو تم سچے ﴿بَلٰى﴾ کیوں نہیں؟ (داخل ہوگا جنت میں) ﴿مَنْ اَسْلَمَ﴾ جو مسلمان ہوا (اور جھکا دیا) ﴿وَجْهَهٗ لِلّٰهِ﴾ اپنا چہرہ اللہ تعالیٰ کے سامنے ﴿وَهُوَ مُحْسِنٌ﴾ اور وہ نیک کام کرنے والا ہو ﴿فَلَهٗٓ اَجْرُهٗ﴾ پس اس کے لئے اس کا اجر ہے ﴿عِنْدَ رَبِّهٖ﴾ اس کے رب کے ہاں ﴿وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ﴾ اور نہ خوف ہوگا ان پر ﴿وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ﴾ اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

اہلِ کتاب کے مصداق

اہلِ کتاب سے مراد وہ لوگ ہیں جو کسی آسمانی کتاب کو مانتے ہیں جیسے یہود تورات کو ماننے کا دعویٰ کرتے ہیں۔نصاریٰ انجیل کو ماننے کا دعویٰ کرتے ہیں اور صابی زبور کو ماننے کے مدعی ہیں اگرچہ محض ان کا دعویٰ ہی دعویٰ ہے۔اپنی کتابوں پر چلنے اور عمل کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں کیونکہ اگر اپنی کتابوں پر عمل کریں تو آخری پیغمبر پر ایمان لے آئیں کہ ان کی کتابوں تورات، انجیل، زبور میں آپ ﷺ کی آمد کی بشارت موجود ہے۔

اور جس طرح یہود و نصاریٰ اور صابی آسمانی کتابوں کو ماننے کے دعویدار تھے اسی طرح مشرکینِ مکہ دینِ ابراہیمی پر چلنے کے دعویدار تھے اور اپنے آپ کو ابراہیمی کہتے تھے۔آنحضرت ﷺ کے سر مبارک پر جب تاجِ نبوت رکھا گیا اور آپ ﷺ نے ان کو توحید کی دعوت دی تو کہنے لگے ہم تو ابراہیمی ہیں حالانکہ ان ظالموں نے وہ گھر جس کو حضرت ابراہیم اور حضرت

اسماعیل علیہما السلام نے صرف اللہ تعالیٰ کی رضا اور عبادت کے لیے بنایا تھا اس کی بیرونی دیواروں پر تین سو ساٹھ بت نصب کیے ہوئے تھے جن میں حضرت ابراہیم، حضرت اسماعیل، حضرت عیسیٰ، حضرت مریم علیہم السلام کا بت بھی نصب تھا۔

دیکھو اس وقت کے متولی بڑے رمز شناس تھے ان کو معلوم تھا کہ یہاں یہودی بھی رہتے ہیں، عیسائی بھی رہتے ہیں اور دیگر قومیں بھی آباد ہیں لہٰذا ہر قوم کی نسبت سے الگ الگ بت رکھے ہوئے تھے اور سال کے دن چونکہ تین سو ساٹھ ہیں اس لیے بتوں کی تعداد بھی دنوں کے برابر تھی تا کہ کوئی دِن چڑھاوے سے خالی نہ جائے اور ہمارا کام چلتا رہے۔ تو کیا ابراہیم علیہ السلام بتوں کی پوجا کرتے تھے اور انہوں نے یہ تعلیم دی تھی؟ حضرت ابراہیم علیہ السلام تو موحد تھے اور جو دین انہوں نے پیش کیا تھا وہ توحید والا تھا اور اس کے برعکس تم شرک میں ڈوبے ہوئے ہو اور اپنے آپ کو ابراہیمی کہتے ہو بلکہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت اسی لیے کرتے تھے کہ یہ ابراہیم علیہ السلام کے دین کا مخالف ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا دین

حالاں کہ حقیقت یہ تھی کہ ﴿اِنَّ اَوْلَى النَّاسِ بِاِبْرٰهِيْمَ لَلَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ وَهٰذَا النَّبِيُّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ (آل عمران: ۶۸)۔ ابراہیم علیہ السلام سے قرب رکھنے والے تو وہ لوگ ہیں جو ان کی پیروی کرتے ہیں اور یہ پیغمبر ہے آخر الزمان اور وہ لوگ جو ایمان لائے تو یہ تمام کے تمام مدعی تھے اور اپنے آپ کو ابراہیمی کہتے تھے حالاں کہ یہودیوں، عیسائیوں اور مشرکین میں سے کوئی بھی حقیقتاً ابراہیمی نہیں تھا اور اپنی کتابوں کو ماننے کا بھی محض دعویٰ ہی دعویٰ تھا اور چاہتے یہ تھے کہ یہ مسلمان بھی پھر کافر ہو جائیں جس طرح پہلے کافر تھے۔ اسی کا ذکر ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ﴿وَدَّ كَثِيْرٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ﴾ پسند کیا بہت سے لوگوں نے اہلِ کتاب میں سے۔ یہ کثیر کا لفظ اس لیے فرمایا کہ یہود و نصاریٰ میں سے کچھ بڑے نیک دِل تھے اور وہ مسلمان ہو چکے تھے۔ جیسے: حضرت عبداللہ بن سلام، حضرت ثعلبہ رضی اللہ عنہ یہ پہلے یہودی تھے اور تمیم داری اور مشہور سخی حاتم طائی کے بیٹے حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہما یہ پہلے عیسائی تھے اور ان جیسے کچھ اور حضرات لیکن اکثریت دوسری طرف ہی رہی۔

حسد کی تعریف/ انجام اور بچاؤ کے طریقے

اس لیے فرمایا کہ اہلِ کتاب کی اکثریت چاہتی ہے ﴿لَوْ يَرُدُّوْنَكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِكُمْ كُفَّارًا﴾ اس بات کو کہ وہ لوٹا دیں تمہیں تمہارے مومن ہونے کے بعد کفر کی طرف یعنی مسلمانوں کے دلوں میں ایسے شبہات پیدا کرتے ہیں اور منصوبے بناتے ہیں کہ وہ ایمان چھوڑ کر کافر ہو جائیں جیسے پہلے کافر تھے اس طرح کیوں کرتے ہیں؟

فرمایا: ﴿حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ﴾ اپنے نفسوں میں حسد کرتے ہوئے کہ یہ فضیلت ان کو کیوں ملی ہے؟ ﴿مِّنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ﴾ بعد اس کے کہ ظاہر ہو چکا ہے ان کے لیے حق کہ وہ پیغمبر آخر الزمان جنھوں نے آنا تھا یہ وہی ہیں کیونکہ ان کی

کتابوں میں آخری پیغمبر کی نشانیاں تحریر تھیں اور تمام کی تمام حضرت محمد رسول اللہ ﷺ میں موجود تھیں اور یہ ان ساری باتوں کو سمجھتے اور جانتے تھے مگر ضد کی وجہ سے مانتے نہیں تھے جس کا دنیا میں کوئی علاج نہیں ہے۔

ابوجہل بھی ضد کی وجہ سے ایمان نہیں لایا ورنہ آپ ﷺ کی نبوۃ کی نشانیاں اس پر بھی واضح تھیں۔ تاریخ اور سیرت کی کتابوں میں یہ موجود ہے کہ آنحضرت ﷺ مسجد حرام میں تشریف فرما تھے اور آپ ﷺ کی مجلس میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے علاوہ کچھ اور لوگ بھی موجود تھے۔ ابوجہل آیا اور اس نے کنکریوں کی مٹھی بھری ہوئی تھی کہنے لگا اگر آپ (ﷺ) نبی ہیں تو بتائیں میری مٹھی میں کیا ہے؟

آنحضرت ﷺ نے فرمایا چچا جی! اگر مٹھی والی چیز خود بول پڑے تو کیا ہوگا؟ چنانچہ مٹھی میں پکڑی ہوئی کنکریوں نے سُبْحَانَ اللّٰهِ پڑھنا شروع کر دیا اور ایک روایت میں ہے کہ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ پڑھنا شروع کر دیا۔ ابوجہل نے کنکریاں پھینک دیں اور ان سے کہا کہ تم بھی اس کی طرف دار ہوگئی ہو؟ اب بتاؤ ایسی ضد کا بھی دنیا میں کوئی علاج ہے؟

تو حق یہود و نصاریٰ پر واضح تھا بس ضد تھی اور حسد تھا کہ یہ نعمت ان کو کیوں ملی ہے؟ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے دنیا میں جہاں اور چیزوں سے پناہ مانگنے کا سبق دیا ہے وہاں یہ بھی فرمایا ہے:

﴿وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ﴾ پروردگار! حسد کرنے والے کے حسد سے ہمیں بچا۔ حسد اتنی بُری چیز ہے کہ اس سے بچنے کی تلقین اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں فرمائی ہے۔

اور ابوداؤد شریف میں روایت آتی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ((اِنَّ الْحَسَدَ يَاْكُلُ الْحَسَنَاتِ كَمَا تَاْكُلُ النَّارُ الْحَطَبَ)). ''حسد نیکیوں کو اس طرح کھا جاتا ہے جس طرح آگ لکڑیوں کو کھا جاتی ہے۔''

حسد کی مختلف شکلیں ہیں جو کہ مندرجہ ذیل ہیں۔

①...... حسد کسے کہتے ہیں؟ حسد کہتے ہیں کسی کی خوبی اور کمال کو دیکھ کر کُڑھنا کہ یہ خوبی اور کمال اس کو کیوں ملا ہے؟ مجھے کیوں نہیں ملا۔ مثلاً: کسی کو اللہ تعالیٰ نے حُسن عطا کیا ہے، علم دیا ہے یا کوئی اور ہنر عطا فرمایا ہے تو حاسد آدمی دل میں کڑھتا ہے کہ یہ اس کو کیوں ملا ہے؟ حسد کا تعلق زبان سے نہیں بلکہ دِل کے ساتھ ہے اور یہ بڑا گناہ ہے بلکہ یہ ایسا گناہ ہے کہ حسد کرنے والے کی نیکیاں اس کو مل جاتی ہے جس کے ساتھ یہ حسد کر رہا ہے اور اس کے گناہ حسد کرنے والے کو مل جاتے ہیں۔

②......اور حسد کی دوسری شکل یہ ہے کہ دوسرے کی نعمت کی زوال کی تمنا کرے کہ مجھے نہیں ملی نہ سہی اللہ کرے اس کے پاس بھی نہ رہے اور یہ بھی یاد رکھنا کہ وسوسے پر کوئی گرفت نہیں ہے۔

وسوسہ اور اس کی تعریف

وسوسہ کہتے ہیں کسی چیز کا خیال خود بخود دِل میں آ جانا بغیر قصد اور ارادے کے اور نہ ہی اس خیال پر راضی ہے اور اگر

وسوسہ نماز میں بھی آجائے تو نماز پر کوئی زَد نہیں پڑتی البتہ اگر نماز میں آجائے تو اس کو فوراً نکالنے کی کوشش کرے اور وسوسہ ایسی چیز ہے کہ اس سے کوئی آدمی بھی خالی نہیں ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول مبارک

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ جیسی شخصیت کا قول بخاری شریف میں موجود ہے، فرمایا: ((اِنِّی لَاُجَهِّزُ جَيْشِيْ وَ اَنَا فِي الصَّلٰوةِ)). بسا اوقات میں اپنے لشکر کی تیاری میں رہتا ہوں کہ اس لشکر کو اِدھر بھیجوں اور اس لشکر کو اُدھر بھیجوں اور میں نماز میں ہوتا ہوں یعنی یہ خیال مجھے نماز میں آتا رہتا ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز میں سونے کے ٹکڑے کا یاد آنا

ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عصر کی نماز پڑھائی اور فوراً حجرۂ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا میں تشریف لے گئے لوگ اپنی اپنی جگہ بیٹھے رہے اور حیرانگی سے ایک دوسرے سے پوچھنے لگے کہ معلوم ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم فوراً کیوں تشریف لے گئے ہیں؟ کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا کہ سلام پھیرنے کے بعد چہرہ مبارک مقتدیوں کی طرف کر کے بیٹھتے اور تسبیحات پڑھتے اور فرضوں کے بعد اجتماعی دعا بھی ثابت ہے۔ البتہ سنتوں اور نفلوں کے بعد اجتماعی دعا ثابت نہیں ہے نہ تراویح کے بعد ثابت ہے۔ ہاں ختمِ قرآن کے وقت سنت ہے کہ سب مل کر دعا کریں۔ چونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول نہیں تھا اس طرح جلدی سے تشریف لے جانے کا۔ اس لیے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو تعجب ہوا۔ یہ حضرات ابھی آپس میں باتیں کر رہے تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم واپس تشریف لائے اور مصلے پر بیٹھ گئے اور فرمایا: ''تم نے میرے جلدی جانے پر تعجب کیا ہے؟ فرمایا: ((تَذَكَّرْتُ وَاَنَا فِي الصَّلٰوةِ)) مجھے نماز میں یاد آیا کہ میرے گھر میں ایک سونے کا ٹکڑا پڑا ہے جو غریبوں میں تقسیم کرنا ہے اور وقت تھوڑا رہ گیا ہے، یعنی سورج غروب ہونے والا ہے۔ اس لیے میں فوراً گیا اور گھر والوں کو کہا کہ یہ فوراً فلاں، فلاں مسکین کو بھیج دو۔ ایسا نہ ہو کہ یہ ٹکڑا رات کو ہمارے گھر پڑا رہے اور رب تعالیٰ مجھ سے سوال کریں کہ غریبوں کو ان کا حق آپ نے بروقت کیوں نہ دیا؟''

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث پر باب قائم کیا ہے اَلتَّفَكُّرُ فِي الصَّلٰوةِ مقصد یہ ہے کہ نماز میں ہر آدمی کو خیال آتا ہے خیال آجانے پر کوئی گرفت نہیں ہے۔ اور اس سے نماز میں کوئی خلل واقع نہیں ہوتا۔ البتہ قصداً خیال نہ لائے اور کوشش یہی کرے کہ خیال نہ آئے۔ تو فرمایا کہ یہ حسد کرتے ہوئے چاہتے ہیں کہ تمہیں دوبارہ کافر بنا دیں۔

﴿فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا﴾ پس معاف کر دو اور درگزر کرو ﴿فَاعْفُوْا﴾ کا معنٰی ہے کہ تم ان کو سزا نہ دو اور ﴿اصْفَحُوْا﴾ کا معنٰی ہے ان کی ملامت نہ کرو۔ اس لیے کہ انھوں نے وہی کرنا ہے جو ان کے دِل میں ہے۔ عربی کا مشہور مقولہ ہے:

كُلُّ اِنَاءٍ يَتَرَشَّحُ بِمَا فِيْهِ. ''ہر برتن سے وہی نکلتا ہے جو اس میں ہوتا ہے۔''

پانی ہے تو پانی ہی نکلے گا۔ دودھ ہے تو دودھ ہی نکلے گا۔

اسی طرح ان کے دلوں میں تمہارے خلاف بغض اور حسد بھرا ہوا ہے جس کی وجہ سے تمہارے خلاف منصوبے بناتے ہیں، تم اپنا وقت ضائع نہ کرو۔ ﴿حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ﴾ یہاں تک کہ لائے اللہ تعالیٰ اپنا حکم۔ یعنی اللہ تعالیٰ تمہیں ان کے خلاف لڑنے کا حکم دے ﴿اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ﴾ بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔ تم ان کی طرف توجہ دینے کی بجائے اہم کاموں کی طرف متوجہ ہو۔

﴿اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ﴾ اور قائم کرو نماز ﴿وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ﴾ اور زکوٰۃ دیتے رہو ﴿وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ﴾ اور جو کچھ بھیجو گے تم آگے ﴿مِّنْ خَيْرٍ﴾ کوئی بھی نیکی ﴿تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ﴾ پاؤ گے تم اس کو اللہ تعالیٰ کے پاس۔ اللہ تعالیٰ تمہیں ہر نیکی کا اجر عطا فرمائے گا۔

قبولیت اعمال کی شرائط

مگر نیکی کی قبولیت کے لیے تین بنیادی شرائط ہیں:

①...... پہلی شرط یہ ہے کہ عقیدہ صحیح ہو کیونکہ ایمان کے بغیر کسی نیکی کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔

②...... دوسری شرط یہ ہے کہ نیکی ریاء اور دکھلاوے کے طور پر نہ ہو۔ اگر دکھاوے کے طور پر ہوگی تو بجائے ثواب کے گناہ ہوگا چاہے نماز ہی کیوں نہ ہو؟

③...... اور تیسری شرط یہ ہے کہ سنت کے مطابق ہو۔ اگر سنت کے مطابق نہیں ہے تو گناہ ہوگا۔ ثواب نہیں ملے گا چاہے نماز ہی کیوں نہ ہو۔ مثلاً: کوئی شخص سورج کے طلوع ہوتے وقت یا غروب کے وقت یا زوال کے وقت نماز پڑھے گا تو اس کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے سزا ملے گی، جزا نہیں ملے گی۔ حالانکہ اس نے نماز ہی پڑھی ہے۔ کیوں سزا ملے گی؟ اس لیے کہ خلاف سنت پڑھ رہا ہے۔

اسی طرح بخاری شریف میں روایت ہے حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((مَنْ صَامَ يَوْمَ الشَّكِّ فَقَدْ عَصٰى اَبَا الْقَاسِمِ ﷺ)).

"شک کے دن جس نے روزہ رکھا اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کی۔"

یعنی رمضان المبارک کا چاند نظر آنے کے متعلق تردد ہے، یقین نہیں ہے کہ چاند نظر آ گیا ہے تو اس دن روزہ رکھنے والا گنہگار ہوگا۔

رمضان المبارک میں تلاوت کا ثواب

اور عزیزو! یہ بات بھی سمجھ لو اور ذہن نشین کر لو کہ ہر نیکی کا اجر عام مہینوں میں دس گنا ملتا ہے اور رمضان المبارک کے مہینہ میں ہر نیکی ستر گنا بڑھ جاتی ہے۔ رمضان المبارک کے علاوہ دوسرے مہینوں میں "سبحان اللہ" کہو تو دس نیکیاں ملیں گی۔ اسی طرح رمضان کے علاوہ میں ﴿الٓمّٓ﴾ پڑھنے سے تیس نیکیاں ملتی ہیں کیونکہ ایک حرف کے بدلے دس نیکیاں ہیں، پڑھنے کی بھی

اور سننے کی بھی۔ اور رمضان شریف میں ﴿الٓمّٓ﴾ پڑھنے اور سننے کی دوسو دس نیکیاں ملتی ہیں۔ اندازہ لگاؤ کتنا اجر وثواب ہے۔

آٹھ تراویح کی بدعت

پھر کچھ لوگ آٹھ تراویح پڑھ کر چلے جاتے ہیں۔ یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ آٹھ تراویح قطعاً نہیں ہیں۔ تراویح بیس رکعت ہیں اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دور سے لے کر آج تک اُمت کا معمول بیس رکعت تراویح ہی ہے۔ یہ آٹھ پر اصرار کی بدعت چند سالوں سے چلی ہے۔ لہٰذا تم بیس رکعات اہتمام کے ساتھ پڑھو اور نیکی ضائع نہ کرو۔ جو بھی نیکی کرو گے اللہ تعالیٰ کے ہاں اجر پاؤ گے۔

﴿ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴾

"بے شک اللہ تعالیٰ جو تم عمل کرتے ہو دیکھ رہا ہے۔"

جنت میں کون جائے گا؟

یہود ونصاریٰ کا ایک اور بے بنیاد دعویٰ سنو!

﴿وَقَالُوْا﴾ اور کہا انہوں نے ﴿لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى﴾ ہرگز نہیں داخل ہوگا جنت میں مگر وہ جو یہودی ہو یا نصرانی۔ یہودیوں نے کہا کہ جنت میں صرف یہودی داخل ہوں گے اور نصاریٰ نے کہا کہ جنت میں صرف نصاریٰ داخل ہوں گے۔

اللہ تعالیٰ نے ان کا رد کرتے ہوئے فرمایا ﴿تِلْكَ اَمَانِيُّهُمْ﴾ یہ ان کی خواہشات ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے یہودیت سچا مذہب تھا۔ اس دور اور زمانے میں جو یہودی صحیح معنیٰ میں اپنے مذہب پر تھے وہ جنت کے حق دار تھے۔ اسی طرح عیسائیت اپنے دور اور زمانے میں سچا مذہب تھا۔ جو عیسائی صحیح معنیٰ میں اپنے مذہب پر تھے وہ جنت کے حق دار تھے۔ اور جو صابی اپنے دور میں داؤد علیہ السلام کو مانتے تھے اور زبور پر عمل کرتے تھے وہ جنت کے حق دار تھے۔ لیکن حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت ملنے کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے جتنے بھی دین تھے سب منسوخ ہوگئے اور قرآنِ کریم کے نزول کے بعد پہلی تمام کتابیں منسوخ ہوگئیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مبعوث ہونے اور نزولِ قرآن کے بعد نجات صرف آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کرنے اور قرآنِ کریم پر عمل کرنے میں ہے۔ اب اگر کوئی یہودی یا عیسائی اپنے اصل عقیدہ ہی پر کیوں نہ ہو نجات نہیں ملے گی۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ﴾ "اور جس شخص نے اسلام کے علاوہ کوئی اور دین تلاش کیا پس وہ ہرگز نہیں قبول کیا جائے گا اس سے۔" ﴿اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ﴾ "بے شک دین اللہ تعالیٰ کے ہاں مفید صرف اسلام ہے۔" اب فائدہ صرف اسلام میں اور لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ میں ہے۔

آگے فرمایا کہ اگر تم اس دعوے میں سچے ہو کہ جنت میں صرف یہودی یا عیسائی ہی جائیں گے تو ﴿قُلْ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ﴾ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرمادیں لاؤ تم اپنی دلیل ﴿إِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ﴾ اگر ہو تم سچے۔ اے یہودیو! تم اس پر دلیل لاؤ کہ جنت میں صرف یہودی جائیں گے اور اے عیسائیو! تم اس پر دلیل لاؤ کہ جنت میں صرف عیسائی ہی جائیں گے۔ فرمایا: تمہارے دعوے سے کیا بنتا ہے؟

﴿بَلٰى﴾ کیوں نہیں جنت میں جائیں گے؟ ﴿مَنْ أَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ﴾ جو مسلمان ہوا اور اپنا چہرہ اس نے اللہ تعالیٰ کے سامنے جھکا دیا ﴿وَهُوَ مُحْسِنٌ﴾ اور وہ نیک کام کرنے والا ہو۔ اب جو مسلمان نیکی کرنے والے ہیں وہ جنت میں جائیں گے اور اس میں نہ کسی یہودی کا دخل ہوگا اور نہ کسی عیسائی کا۔

﴿فَلَهٗ أَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ﴾ پس اس کے لیے اس کا اجر ہے اس کے رب کے ہاں ﴿وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ﴾ اور نہ خوف ہوگا ان پر ﴿وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ﴾ اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

خوف کہتے ہیں آئندہ کسی چیز کا خطرہ ہونا اور غم گزشتہ کسی شے پر افسوس ہو۔ تو یہ جب جنت میں داخل ہوں گے تو آئندہ بیماری کا، قتل کا، ڈاکے کا، مرنے کا، جنت سے نکلنے کا کوئی خوف نہیں ہوگا۔ اور دنیا میں چونکہ صحیح اعمال کر کے آئے ہیں اس لیے یہ غم نہیں ہوگا کہ کاش! ہم فلاں نیکی کر لیتے۔ الحمد للہ! انھوں نے خوب نیکیاں کیں اور جنت میں داخل ہو گئے۔

﴿وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ﴾ اور کہا یہود نے ﴿لَيْسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَيْءٍ﴾ نہیں ہیں نصاریٰ کسی چیز پر ﴿وَّقَالَتِ النَّصٰرٰى﴾ اور کہا نصاریٰ نے ﴿لَيْسَتِ الْيَهُوْدُ عَلٰى شَيْءٍ﴾ نہیں ہیں یہودی کسی چیز پر ﴿وَّهُمْ يَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ﴾ حالاں کہ وہ کتاب پڑھتے ہیں ﴿كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ﴾ اسی طرح کہا ان لوگوں نے ﴿لَا يَعْلَمُوْنَ﴾ جو علم نہیں رکھتے ﴿مِثْلَ قَوْلِهِمْ﴾ ان کی بات کی طرح ﴿فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ﴾ پس اللہ تعالیٰ فیصلہ کرے گا ان کے درمیان ﴿يَوْمَ الْقِيٰمَةِ﴾ قیامت کے دن ﴿فِيْمَا﴾ ان چیزوں میں ﴿كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ﴾ جن میں وہ اختلاف کرتے تھے ﴿وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ﴾ اور اس شخص سے بڑھ کر کون ظالم ہو سکتا ہے؟ ﴿مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ﴾ جو روکتا ہے اللہ تعالیٰ کی مسجدوں سے ﴿أَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ﴾ کہ ذکر کیا جائے ان میں اللہ تعالیٰ کے نام کا ﴿وَسَعٰى فِيْ خَرَابِهَا﴾ اور کوشش کرتا ہے اللہ تعالیٰ کے گھروں کو برباد کرنے کی ﴿أُولٰٓئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ﴾ وہ لوگ ہیں نہیں تھا ان کو حق ﴿أَنْ يَّدْخُلُوْهَآ﴾ یہ کہ داخل ہوتے (ان مسجدوں میں) ﴿إِلَّا خَآئِفِيْنَ﴾ مگر خوف کرتے ہوئے ﴿لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ﴾ ان کے لیے دنیا میں رسوائی ہے ﴿وَّلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ﴾ اور ان کے لیے آخرت میں ﴿عَذَابٌ عَظِيْمٌ﴾ عذاب ہے بڑا ﴿وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ

﴿وَالْمَغْرِبُ﴾ اور اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہے مشرق اور مغرب ﴿فَاَیْنَمَا تُوَلُّوْا﴾ پس جس طرف تم چہرہ پھیرو ﴿فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ﴾ پس اُسی طرف اللہ تعالیٰ کی رضا ہے ﴿اِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ﴾ بے شک اللہ تعالیٰ وسعت والا سب کچھ جاننے والا ہے ﴿وَقَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا﴾ اور کہا اُنھوں نے بنالی اللہ تعالیٰ نے اولاد ﴿سُبْحٰنَهٗ﴾ پاک ہے اس کی ذات ﴿بَلْ لَّهٗ﴾ بلکہ اُسی کے لیے ﴿مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ جو کچھ ہے آسمانوں میں اور زمین میں ﴿كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ﴾ سب اُسی کے فرماں بردار ہیں ﴿بَدِیْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ بغیر نمونے کے پیدا کرنے والا ہے آسمانوں اور زمین کو ﴿وَاِذَا قَضٰۤى اَمْرًا﴾ اور جب وہ فیصلہ کرتا ہے کسی معاملے کا ﴿فَاِنَّمَا﴾ پس پختہ بات ہے ﴿یَقُوْلُ لَهٗ﴾ کہتا ہے اس کو ﴿كُنْ﴾ ہو جا ﴿فَیَكُوْنُ﴾ پس وہ ہو جاتا ہے۔

ربط

ان آیات کا پچھلی آیات سے ربط یہ ہے کہ پچھلی آیات میں تھا کہ یہودیوں نے کہا تھا کہ جنت میں صرف یہودی جائیں گے اور نصاریٰ نے کہا تھا کہ جنت میں صرف نصاریٰ جائیں گے اور آج کی آیات میں ان کے ایک دوسرے پر مذہبی طعن کا ذکر ہے کہ انہوں نے ضد میں آ کر ایک دوسرے کے مذہب کو کالعدم قرار دیا۔

جیسا کہ آج کل کے لیڈر ایک دوسرے کو جھوٹا کہتے ہیں۔ایک جماعت والے دوسروں کو جھوٹا کہتے ہیں اور وہ ان کو جھوٹا کہتے ہیں ہم کہتے ہیں دونوں سچے ہیں۔اسی طرح انہوں نے ضد میں آ کر ایک دوسرے کے مذہب کو کالعدم قرار دیا۔ حالانکہ اصل کے اعتبار سے یہودیوں کا مذہب بھی سچا تھا اور عیسائیوں کا مذہب بھی سچا تھا۔

یہودیوں کو یہودی کیوں کہا جاتا ہے؟ اور نصاریٰ کو نصاریٰ کیوں کہا جاتا ہے؟ اس کے متعلق پہلے بیان ہو چکا ہے۔لہٰذا دوہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔

یہود و نصاریٰ کی محاذ آرائی

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿وَقَالَتِ الْیَهُوْدُ لَیْسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَیْءٍ﴾ اور کہا یہود نے نہیں ہیں نصاریٰ کسی چیز پر۔یعنی ان کا مذہب بالکل جھوٹا ہے۔اب نصاریٰ کی باری آئی۔ ﴿وَّقَالَتِ النَّصٰرٰى لَیْسَتِ الْیَهُوْدُ عَلٰى شَیْءٍ﴾ اور کہا نصاریٰ نے نہیں ہیں یہودی کسی چیز پر۔یعنی ان کا مذہب بالکل جھوٹا ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿وَّهُمْ یَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ﴾ حالانکہ وہ کتاب پڑھتے ہیں۔یعنی توراۃ اور انجیل کی تلاوت کرتے ہیں دونوں آسمانی کتابیں ہیں۔توراۃ بھی سچی کتاب تھی اور انجیل بھی سچی کتاب تھی اور اس وقت انہی پر عمل کرنے میں کامیابی تھی۔یہ مذہب اس وقت منسوخ ہوئے جب حضرت محمد رسول اللہ ﷺ تشریف لائے۔

اس کی مثال تم اس طرح سمجھو کہ جب چاند اور ستارے جگمگا رہے ہوتے ہیں لوگ ان کی روشنی سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور جب سورج طلوع ہو جائے تو پھر نہ چاند کی ضرورت، نہ ستاروں کی۔ پہلے انبیاء کرام علیہم السلام چاند ستاروں کی مانند تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سورج کی مانند ہیں۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لے آئے، سورج طلوع ہو گیا تو اب چاند تاروں کی ضرورت نہیں رہی۔ تو انہوں نے ایک دوسرے کے مذہب کو ضد اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے جھوٹا کہا۔

جاہل مشرکین کا عقیدہ

فرمایا ﴿ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴾ اسی طرح کہا ان لوگوں نے جو علم نہیں رکھتے ﴿ مِثْلَ قَوْلِهِمْ ﴾ ان کی بات کی طرح۔ یہ اَن پڑھ علم سے محروم عرب کے مشرک تھے انہوں نے کہا کہ ہم سچے ہیں ہمارے علاوہ سب جھوٹے ہیں۔ حالانکہ وہ سر سے لے کر پاؤں تک شرک میں ڈوبے ہوئے تھے اور اللہ تعالیٰ کا وہ گھر جو حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام نے صرف اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے بنایا تھا اس کی بیرونی دیواروں پر انہوں نے تین سو ساٹھ بت نصب کیے ہوئے تھے جن میں حضرت ابراہیم، حضرت اسماعیل، حضرت عیسیٰ اور حضرت مریم علیہم السلام کے بت بھی شامل تھے۔

بدکار جوڑے کی پوجا

اور بڑے غضب کی بات یہ تھی کہ ان بتوں میں ''اِساف اور نائلہ'' کے بت بھی شامل تھے۔ ''اساف'' مرد تھا اور ''نائلہ'' عورت تھی۔ ان کے آپس میں برے تعلقات تھے ان کو خواہش پوری کرنے کے لئے اور کوئی جگہ نہ ملی۔ اس زمانے میں لوگ تھوڑے ہوتے تھے رات کو جب لوگ اپنے گھروں میں چلے گئے تو انہوں نے کعبۃ اللہ کے اندر بدکاری کی اللہ تعالیٰ نے ان کو پتھر بنا دیا، شکلیں تو وہی رہیں مگر پتھر میں تبدیل ہو گئے۔

لوگوں نے ان کو عبرت کے لیے وہیں کھڑا کر دیا کہ لوگ اس سے سبق حاصل کریں کہ کعبۃ اللہ میں برائی کا یہ انجام ہے۔ مگر کچھ عرصہ گزرنے کے بعد لوگوں نے ان کی پوجا شروع کر دی کہ اب یہ ان کے نزدیک محترم ہو گئے اور مشرکین مکہ کے ہاں سب سے زیادہ محترم مجسمہ ''ہُبل'' کا تھا یہ انہوں نے حضرت ہابیل رحمۃ اللہ علیہ کے نام پر بنایا ہوا تھا جو حضرت آدم علیہ السلام کے مظلوم شہید بیٹے تھے تو ان ظالموں نے اللہ تعالیٰ کے گھر کو شرک کے ساتھ بھرا ہوا تھا اور اس کے باوجود وہ کہتے تھے کہ ہم سچے ہیں اور باقی سب جھوٹے ہیں۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿ فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ ﴾ پس اللہ تعالیٰ فیصلہ کرے گا ان کے درمیان ﴿ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ﴾ قیامت کے دن ﴿ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴾ ان چیزوں میں جن میں وہ اختلاف کرتے تھے۔ یہ فیصلہ عملی طور پر ہوگا کہ سچے جنت میں اور جھوٹے دوزخ میں۔ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا۔ ورنہ دلائل کے اعتبار سے فیصلہ ہو چکا ہے کہ حق کیا ہے اور باطل کیا ہے؟ اور یہ لوگ باطل پر ہونے کے باوجود اس قدر عنادی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق کو عبادت کرنے سے روکتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ﴾ اور اس شخص سے بڑھ کر کون ظالم ہوسکتا ہے جو روکتا ہے اللہ تعالیٰ کی مسجدوں سے؟ ﴿اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ﴾ کہ ذکر کیا جائے ان میں اللہ تعالیٰ کے نام کا ﴿وَسَعٰى فِيْ خَرَابِهَا﴾ اور کوشش کرتا ہے اللہ تعالیٰ کے گھروں کو برباد کرنے کی ﴿اُولٰٓئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ﴾ وہ لوگ ہیں نہیں تھا ان کو حق ﴿اَنْ يَّدْخُلُوْهَآ﴾ یہ کہ داخل ہوتے (ان مسجدوں میں) ﴿اِلَّا خَآئِفِيْنَ﴾ مگر خوف کرتے ہوئے۔ ان آیات کے مختلف مطالب بیان فرمائے گئے ہیں۔

مسلمانوں کو عمرہ سے روکنا:

①...... ان کا ایک مطلب تو یہ بیان فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ ہجرت کے چھٹے سال ذوالقعدہ کے مہینے میں تقریباً پندرہ سو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ عمرہ کرنے کے لیے روانہ ہوئے اس وقت ابھی حج فرض نہیں ہوا تھا۔ حج ۹ ہجری میں فرض ہوا ہے۔ آنحضرت ﷺ بمعہ ساتھیوں کے جب مکہ مکرمہ کے قریب حدیبیہ کے مقام پر پہنچے جس کا آج کل نام شمیسہ ہے اور مکہ مکرمہ کے حدود میں آ گیا ہے۔ تو مشرکین مکہ نے مزاحمت کی اور کہا کہ ہم تمہیں مکہ مکرمہ میں داخل نہیں ہونے دیں گے باوجود اس کے کہ ان کو یقین تھا کہ یہ حضرات عمرہ کرنے کے لیے آرہے ہیں۔ لڑنے کے لیے نہیں آئے۔ کئی دنوں تک بحث ہوتی رہی سفیر آتے جاتے رہے مگر انھوں نے عمرہ نہ کرنے دیا۔ پھر اگلے سال ۷ھ میں آپ ﷺ نے عمرۃ القضاء کیا۔ تو ان مشرکین مکہ سے بڑا ظالم کون ہے کہ جنھوں نے اللہ تعالیٰ کی مسجد سے روک دیا چونکہ اُوپر مشرکین کا ذکر تھا اس لیے یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے۔

شاہِ روم کا مسجد اقصیٰ پر حملہ اور نمازیوں کا قتل عام:

②...... اور یہ مطلب بھی بیان کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کی ولادت باسعادت سے پہلے روم کا ایک بادشاہ تھا جس کا نام "طیطس" بھی لکھتے ہیں اور "طیطاؤس" بھی لکھتے ہیں عیسائیوں نے اس کے ساتھ مل کر مسجد اقصیٰ پر حملہ کیا اور جتنے یہودی نمازی تھے ان سب کو قتل کر دیا اور مسجد اقصیٰ کے آس پاس کے علاقوں میں بھی اس نے بڑا طوفان کھڑا کیا اور اتنی قتل و غارت کی کہ تاریخ بتاتی ہے کہ گلیوں میں اتنا خون تھا کہ گھوڑوں کے گھٹنے اس میں ڈوبے ہوئے تھے تو اس نے لوگوں کو اللہ تعالیٰ کے گھر میں ذکر کرنے سے روکا اور قتل کیا۔ اس سے بڑا کون ظالم ہوسکتا ہے۔ چونکہ اُوپر نصاریٰ کا بھی ذکر ہے، لہٰذا یہ مطلب بھی بن سکتا ہے۔

بہرحال اللہ تعالیٰ کے گھر سے روکنے والے سے بڑا ظالم کون ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے گھروں میں اللہ تعالیٰ کا نام لینے سے روکے۔ حالانکہ روکنے کی بجائے ان کو تو چاہیے تھا کہ اللہ تعالیٰ کے گھر میں ڈرتے ہوئے اور خوف کھاتے ہوئے داخل ہوتے اُلٹا یہ روکتے ہیں۔

﴿لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ﴾ ان کے لیے دنیا میں رسوائی ہے ﴿وَّلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ﴾ اور ان کے لیے آخرت میں عذاب ہے بڑا۔

مسجد میں بلند آواز سے ذکر کرنا

یہاں ایک بات سمجھ لیں کہ بعض اہلِ بدعت نے ﴿یُذْکَرَ فِیْهَا اسْمُهٗ﴾ کا مطلب یہ سمجھا ہے کہ مسجدوں میں بلند آواز سے ذکر کیا جائے۔ لہٰذا اس سے روکنے والے ظالم ہیں۔ بھائی! آیت کریمہ میں تو صرف ذکر اللہ کا بیان ہے، یہ بلند آواز سے ذکر کرنا کس لفظ کا ترجمہ ہے۔

ایک ہے نفس ذکر اور ایک ہے شور ڈالنا۔ دونوں چیزوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ نفسِ ذکر میں تو کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اور بلند آواز سے ذکر کرنا کہ جس سے نمازی کو یا تلاوت کرنے والے کو یا سوئے ہوئے کو تکلیف پہنچے۔ یا قرآن کریم کی تلاوت کرنے میں خلل واقع ہو تو حرام ہے۔ مسجدوں میں بلند آواز سے ذکر کرنے کے متعلق فقہائے کرام رحمہم اللہ نے تصریح فرمائی ہے:

رَفْعُ الصَّوْتِ فِی الْمَسَاجِدِ وَ لَوْ بِالذِّکْرِ حَرَامٌ. مسجدوں میں آواز بلند کرنا اگرچہ ذکر کے لیے ہو حرام ہے۔
گیارہویں صدی کے مجدد ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ مرقات شرح مشکوٰۃ میں لکھتے ہیں: رَفْعُ الصَّوْتِ فِی الْمَسَاجِدِ وَلَوْ بِالذِّکْرِ حَرَامٌ مسجد میں بلند آواز سے ذکر کرنا حرام ہے۔ نفس ذکر سے کوئی نہیں منع کرتا۔

حدیث پاک میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ذکر ہر وقت اس طرح کرو کہ دیکھنے والے کہیں دیوانہ ہو گیا ہے۔ بات تو ہے بلند آواز سے ذکر کرنے کے بارے میں۔ چنانچہ قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ تفسیر مظہری میں لکھتے ہیں کہ مسجد میں اگر ایک بھی نمازی ہو تو بلند آواز سے قرآن کریم پڑھنا لَا یَجُوْزُ جائز نہیں ہے۔ اور مسجد میں شور ڈالنا مسجد کے آداب کے بھی خلاف ہے۔ مسجد کے ادب کو ملحوظ رکھنا بھی ضروری ہے۔

مسجد کے چند آداب

ایک موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف فرما تھے ایک شخص آیا اس نے نماز پڑھنے کے بعد ان الفاظ کے ساتھ دعا کی۔
((اَللّٰهُمَّ ارْحَمْنِیْ وَ مُحَمَّدًا صَلَّی اللهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ وَ لَا تَرْحَمْ مَعَنَا اَحَدًا)).
" اے اللہ! مجھ پر رحمت نازل کر اور محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اور کسی پر نازل نہ کرنا۔"

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کو بلایا اور فرمایا: لَقَدْ تَحَجَّرْتَ وَاسِعًا تو نے اللہ تعالیٰ کی رحمت کو تنگ کر دیا ہے اللہ تعالیٰ کی رحمت تو وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ. ہر شی پر وسیع ہے۔

یہ باتیں کر رہے تھے کہ اس نے مسجد میں کھڑے ہو کر پیشاب کرنا شروع کر دیا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اسے روکنے کے لیے دوڑے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے منع فرما دیا کہ اس کو کوئی تکلیف نہ ہو۔ یا اس لیے منع فرمایا کہ تم روکو گے وہ دوڑے گا گندگی پھیلے گی ساری مسجد پلید ہو گی جب وہ فارغ ہو گیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے بلا کر فرمایا کہ یہ مسجدیں نماز کے لیے ہیں۔ قرآن پاک

کی تلاوت کے لیے ہیں، اللہ تعالیٰ کے ذکر کے لیے ہیں۔ اس کارروائی کے لیے نہیں ہیں جو تو نے کی ہے۔ تو مسجد کا ادب واحترام بڑی چیز ہے۔

①...... مصنف عبدالرزاق میں حدیث آتی ہے: جَنِّبُوْا مَسَاجِدَ كُمْ مَجَانِيْنَكُمْ مسجدوں میں پاگلوں کو نہ داخل ہونے دو کیوں کہ وہ پیشاب کر دیں، تھوک دیں گے اور کوئی ایسی حرکت کر دیں گے جو خلافِ ادب ہوگی۔ اسی طرح صِبْيَانَكُمْ کے الفاظ بھی آئے ہیں۔ کہ چھوٹے بچے جن کو تمیز نہیں ہے ان کو بھی مسجد میں نہ آنے دو کوئی ایسی حرکت نہ کر دیں جس سے مسجد کی بے حرمتی ہو۔ اسی لیے مسجد میں دوڑنا حرام ہے۔ یہاں تک کہ اگر امام رکوع میں چلا گیا ہے اور کوئی شخص جماعت میں شامل ہونا چاہتا ہے تو حدیث پاک میں آتا ہے کہ:

②...... لَا تَأْتُوْهَا وَاَنْتُمْ تَسْعَوْنَ دوڑ کر تم نماز میں شریک نہ ہو۔ عَلَيْكُمْ بِالسَّكِيْنَةِ آہستہ چل کر آؤ۔ فَمَا اَدْرَكْتُمْ فَصَلُّوْا وَمَا فَاتَكُمْ فَاقْضُوْا جو رکعتیں امام کے ساتھ مل جائیں وہ پڑھ لو اور جو تم سے رہ گئی ہیں ان کو بعد میں پڑھ لو۔ کیوں کہ تیز دوڑنے سے مسجد کی بے حرمتی ہوگی اور یہ بڑا گناہ ہے۔

قبلہ کی تبدیلی

پہلے آپ ﴿مَانَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ﴾ کی تفسیر میں پڑھ چکے ہیں کہ کچھ احکام منسوخ بھی ہیں، انھی احکام میں سے تحویل قبلہ کا مسئلہ بھی ہے۔ آنحضرت ﷺ جب مدینہ طیبہ تشریف لے گئے تو آپ ﷺ نے تقریباً سولہ سترہ مہینے مسجد اقصیٰ کی طرف چہرہ کر کے نمازیں پڑھیں۔ مسجد نبوی سے تقریباً ایک میل دور قبیلہ بنوسلمہ جو مشہور قبیلہ تھا کی مسجد میں آپ ﷺ ظہر کی نماز پڑھا رہے تھے جس کو آج کل مسجد قبلتین کہا جاتا ہے۔ عین نماز کی حالت میں تحویل قبلہ کا حکم نازل ہوا دو رکعتیں آپ ﷺ پڑھا چکے تھے دوسری دو رکعتیں آپ ﷺ نے کعبۃ اللہ کی طرف چہرہ مبارک کر کے پڑھائیں۔ یہودیوں کو اعتراض کا موقع مل گیا کہنے لگے اس کا بھی کوئی اعتبار ہے جس کا قبلہ بدلتا رہتا ہے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ﴾ اور اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہے مشرق اور مغرب۔ ہم تو رب تعالیٰ کے حکم کے پابند ہیں۔ ﴿فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا﴾ پس جس طرف تم چہرہ پھیرو ﴿فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ﴾ پس اسی طرف اللہ تعالیٰ کی رضا ہے ﴿اِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ﴾ بے شک اللہ تعالیٰ وسعت والا سب کچھ جاننے والا ہے۔ پہلے تین فرقوں کا ذکر ہوا ہے یہود، نصاریٰ اور مشرکین کا۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ﴿وَقَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا﴾ اور کہا انھوں نے بنا لی اللہ تعالیٰ نے اولاد۔ ﴿وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُ ابْنُ اللّٰهِ﴾ اور کہا یہود نے عزیر اللہ تعالیٰ کے بیٹے ہیں ﴿وَقَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيْحُ ابْنُ اللّٰهِ﴾ [التوبہ: ۳۰] اور عیسائیوں نے کہا عیسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے بیٹے ہیں اور مشرکوں نے کہا: ﴿وَيَجْعَلُوْنَ لِلّٰهِ الْبَنٰتِ﴾ [النحل: ۵۷] اور بنائی انہوں نے اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ﴿سُبْحٰنَهٗ﴾ پاک ہے اس کی ذات۔ بیٹوں سے اور بیٹیوں سے بیوی سے ماں سے اور ہر اس چیز سے جو اس کی شان کے لائق نہیں ہے ﴿بَلْ لَّهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ بلکہ اسی کے لیے ہے جو کچھ ہے آسمانوں میں اور زمین میں ﴿كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ﴾ سب اسی کے فرمانبردار ہیں۔ فرشتے بھی، حضرت عزیر علیہ السلام، حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی۔

"بدعت" اور "ایجاد" کا فرق

اور اس کی صفت ہے ﴿بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ بغیر نمونے کے پیدا کرنے والا ہے آسمانوں کو اور زمین کو۔ بدعت کا لفظ بھی اسی باب سے ہے۔ بدعت کا معنیٰ ہے "نو ایجاد" اگر یہ دین میں ہو یعنی من گھڑت چیز کو دین سمجھا جائے تو اس کا بڑا گناہ ہے۔

بخاری شریف کی روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((مَنْ اَحْدَثَ فِيْ اَمْرِنَا هٰذَا مَا لَيْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ)) کہ جس نے دین میں کوئی نئی چیز بنائی تو وہ مردود ہوگی۔ اس کا بڑا گناہ ہے۔ باقی رہا دنیاوی طور پر کسی چیز کا نو ایجاد ہونا تو وہ شرعی بدعت نہیں ہے۔ وہ لغوی طور پر بدعت ہوگی۔ بعض جاہل قسم کے لوگ کہتے ہیں کہ دیکھو جی! تم ہمیں بدعتی کہتے ہو؟ کیا تمہاری مسجدوں میں پنکھے نہیں لگے ہوئے، تم لاؤڈ سپیکر پر تقریر نہیں کرتے تم نے گھڑیاں نہیں پہن رکھیں، ٹونٹیوں سے وضو نہیں کرتے، تم گاڑیوں اور جہازوں پر سوار نہیں ہوتے۔ یہ تمام چیزیں "نو ایجاد" اور "بدعت" نہیں ہیں؟ یہ جاہلانہ اعتراض ہے۔ اس لیے کہ ان چیزوں کو دین کوئی بھی نہیں سمجھتا شرعی بدعت وہ ہے جس کو دین سمجھ کر کیا جائے۔ کیوں کہ الفاظ ہیں: ((مَنْ اَحْدَثَ فِيْ اَمْرِنَا هٰذَا مَا لَيْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ)) جس نے کوئی نئی چیز گھڑی ہمارے اس دین کے معاملے میں یعنی اس کو دین سمجھا جائے اور اسے ثواب کی امید پر کیا جائے ان چیزوں کو کوئی بھی دین سمجھ کر استعمال نہیں کرتا۔ بلکہ یہ چیزیں وقتی ضرورت ہیں ہاں اگر کوئی شخص دین سمجھ کر گھڑی پہنتا ہے یا دین سمجھ کر عینک پہنتا ہے تو یہ بدعت ہوگی۔ بدعت لغوی اور بدعت شرعی کا فرق اچھی طرح سمجھ لو۔

اور یاد رکھنا! ایک شرعی بدعت کا گناہ سو کبیرہ گناہوں سے زیادہ ہے اس کو تم اس طرح سمجھو کہ مسجد کے محراب میں سو بوتلیں شراب پینے کا اتنا گناہ نہیں جتنا دین میں ایک بدعت کا گناہ ہے۔ اس لیے کہ گناہِ کبیرہ سے دین کا نقشہ نہیں بدلتا اس کو کرنے والا گناہ ہی سمجھتا ہے اور بدعت سے دین کا نقشہ بدل جاتا ہے اور نقشوں پر حکومتوں کی لڑائیاں ہوتی ہیں کہ یہ حصہ میرا ہے اور یہ حصہ تیرا ہے۔ بدعت کو لوگ معمولی سمجھتے ہیں۔ حالاں کہ شرک کے بعد بدعت بہت بری چیز ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى قَدْ حَجَبَ التَّوْبَةَ عَلٰى كُلِّ صَاحِبِ بِدْعَةٍ بدعتی کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے توبہ کی توفیق نصیب نہیں ہوتی۔ بدعت سے دل سیاہ ہو جاتا ہے۔ لہٰذا بدعت سے بچو۔

اللہ تعالیٰ کی شان یہ ہے کہ ﴿وَاِذَا قَضٰٓى اَمْرًا﴾ اور جب وہ فیصلہ کرتا ہے کسی معاملے کا ﴿فَاِنَّمَا﴾ پس پختہ بات ہے ﴿يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ﴾ کہتا ہے اس کو ہو جا ﴿فَيَكُوْنُ﴾ پس وہ ہو جاتا ہے۔ وہ کسی چیز کے بنانے میں بیٹی بیٹے کا محتاج نہیں ہے اور نہ ہی اس کو ساز و سامان کی ضرورت ہے۔ کلمہ کن سے اس کے ارادے کے مطابق چیز ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ صحیح عقیدہ سمجھنے کی

توفیق عطا فرمائے اور گندے عقیدوں سے محفوظ رکھے۔

﴿وَ قَالَ الَّذِیْنَ﴾ اور کہا ان لوگوں نے ﴿لَا یَعْلَمُوْنَ﴾ جو نہیں جانتے ﴿لَوْ لَا یُكَلِّمُنَا اللّٰهُ﴾ کیوں نہیں کلام کرتا اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ﴿اَوْ تَاْتِیْنَاۤ اٰیَةٌ﴾ یا کیوں نہیں آئی ہمارے پاس کوئی نشانی ﴿كَذٰلِكَ قَالَ﴾ اسی طرح کہا ﴿الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ﴾ ان لوگوں نے جو ان سے پہلے تھے ﴿مِّثْلَ قَوْلِهِمْ﴾ ان کی بات کی طرح ﴿تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ﴾ ان کے دل ایک دوسرے کے مشابہ ہیں ﴿قَدْ بَیَّنَّا الْاٰیٰتِ﴾ تحقیق ہم نے بیان کر دیں نشانیاں ﴿لِقَوْمٍ یُّوْقِنُوْنَ﴾ اس قوم کے لیے جو یقین رکھتی ہے ﴿اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ﴾ بے شک بھیجا ہم نے آپ کو حق کے ساتھ ﴿بَشِیْرًا وَّ نَذِیْرًا﴾ خوش خبری دینے والا اور ڈرانے والا ﴿وَّ لَا تُسْــٴَـلُ﴾ اور آپ سے سوال نہیں کیا جائے گا ﴿عَنْ اَصْحٰبِ الْجَحِیْمِ﴾ بھڑکتی ہوئی آگ میں داخل ہونے والوں کے بارے میں ﴿وَ لَنْ تَرْضٰى عَنْكَ﴾ اور ہرگز راضی نہیں ہوں گے آپ سے ﴿الْیَهُوْدُ وَ لَا النَّصٰرٰى﴾ یہودی اور نہ عیسائی ﴿حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ﴾ یہاں تک کہ آپ پیروی کریں ان کی ملت کی ﴿قُلْ اِنَّ﴾ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کہہ دیں بے شک ﴿هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى﴾ اللہ تعالیٰ کی ہدایت ہی ہدایت ہے ﴿وَ لَىٕنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ﴾ اور البتہ اگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پیروی کی ان کی خواہشات کی ﴿بَعْدَ الَّذِیْ جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ﴾ بعد اس کے کہ آچکا آپ کے پاس علم ﴿مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ﴾ نہیں ہوگا آپ کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ﴿مِنْ وَّلِیٍّ وَّ لَا نَصِیْرٍ﴾ کوئی حمایتی اور نہ کوئی مددگار ﴿اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ﴾ وہ لوگ جن کو دی ہم نے کتاب ﴿یَتْلُوْنَهٗ﴾ وہ اس کی تلاوت کرتے ہیں ﴿حَقَّ تِلَاوَتِهٖ﴾ جیسا کہ اس کی تلاوت کرنے کا حق ہے ﴿اُولٰٓىٕكَ یُؤْمِنُوْنَ بِهٖ﴾ وہی لوگ اس پر ایمان لاتے ہیں ﴿وَ مَنْ یَّكْفُرْ بِهٖ﴾ اور جو لوگ اس کا انکار کرتے ہیں ﴿فَاُولٰٓىٕكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ﴾ پس وہی لوگ نقصان اُٹھانے والے ہیں۔

ربط

ان آیات کا پچھلی آیات کے ساتھ ربط یہ ہے کہ پہلی آیات میں بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر یہود و نصاریٰ اور مشرکین کے بے جا اعتراضات کا ذکر تھا اور ان آیات میں بھی بے جا اعتراض کا ذکر ہے۔

کفار کا بے جا مطالبہ

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے قول کے مطابق رافع نامی یہودی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ اگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں تو اللہ تعالیٰ سے کہیں کہ وہ ہمارے ساتھ کلام کرے اور ہمیں کہے کہ میں نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو رسول بنا کر بھیجا ہے یا کوئی کھلی نشانی ظاہر کرے جو آپ کی نبوت پر دلالت کرے تا کہ ہمیں معلوم ہو جائے کہ آپ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھیجے گئے ہیں۔

اور بعض روایات میں آتا ہے کہ عیسائیوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ مطالبہ کیا تھا کہ اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ کلام کر کے یا کوئی نشانی ظاہر کر کے بتائے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں۔ اور علامہ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ اور علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ بات عرب کے بعض لوگوں نے کی تھی۔ بہر حال ان میں سے کسی نے بھی کی ہو اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں کو بے علم اور جاہل قرار دیا ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ﴿وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ﴾ اور کہا ان لوگوں نے جو نہیں جانتے۔ جن کو اللہ تعالیٰ کی پہچان نہیں اور رسالت کی حقیقت کا علم نہیں رکھتے اور بصیرت سے محروم کر دیے گئے ہیں، کیا کہا؟

﴿لَوْ لَا يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ﴾ کیوں نہیں کلام کرتا اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ؟ ﴿اَوْ تَاْتِيْنَآ اٰيَةٌ﴾ یا کیوں نہیں آئی ہمارے پاس کوئی نشانی؟ جس کے بعد ہمیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت میں کوئی شک وشبہ نہ رہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوۃ ہم پر واضح ہو جائے یہ ان کا مطالبہ انتہائی لاعلمی اور جہالت کی دلیل ہے کیوں کہ اللہ تعالیٰ کا مخلوق کے ساتھ ہم کلام ہو کر کہنا کہ یہ میرا پیغمبر ہے، اس پر ایمان لاؤ یہ اس کی حکمت کے خلاف ہے۔

کیوں کہ اس طرح پیغمبر کی ذات میں اللہ تعالیٰ نے جو صفات اور کمالات رکھے ہیں ان کا لحاظ ختم ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ تو یہ چاہتے ہیں کہ میں نے جو خوبیاں اور کمال پیغمبر کی ذات میں رکھے ہیں ان کو دیکھو اور پیغمبر کی تعلیمات کو سامنے رکھ کر اس پر ایمان لاؤ اور اس کی اتباع کرو اور اگر اللہ تعالیٰ خود آواز دے کر کہہ دیں تو یہ ساری ختم ہو جاتی ہیں۔ ﴿اَوْ تَاْتِيْنَآ اٰيَةٌ﴾ اور انھوں نے یہ بھی کہا "یا کیوں نہیں آتی ہمارے پاس کوئی نشانی؟"

آیت کا ایک معنیٰ حسی ہے اور ایک معنیٰ معنوی ہے۔ آیت کا حسی معنیٰ معجزہ ہے کہ خرقِ عادت کے طور پر اطلاق قرآن کریم یا دیگر آسمانی کتابوں پر ہوتا ہے۔ اگر حسی معنیٰ کے لحاظ سے آیت کا مطلب لیا جائے تو یہ مفہوم ہوگا کہ ہمارے سامنے ہماری مرضی کے مطابق کوئی معجزہ ظاہر کیوں نہیں کرتے؟

جیسا کہ پندرہویں پارے میں آئے گا کہ مشرکین نے کہا تھا ﴿لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْۢبُوْعًا﴾ "ہم آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) پر ہرگز ایمان نہیں لائیں گے یہاں تک کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) ہمارے لیے زمین سے چشمے جاری کریں یا آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے لیے سونے کا محل ہونا چاہیے یا آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) ہمارے سامنے آسمانوں پر چڑھ جائیں اور وہاں سے ایسی کتاب لے کر آئیں ﴿نَّقْرَؤُهٗ﴾ جس کو ہم پڑھیں۔" اس قسم کے لایعنی سوالات اور مطالبات کرتے تھے ورنہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کی صداقت کو ظاہر کرنے کے لیے بے شمار معجزات ان کے ہاتھ مبارک پر ظاہر فرمائے۔ اور اگر آیت کا مطلب معنوی

لحاظ سے لیا جائے تو پھر مفہوم یہ ہوگا کہ آپ (ﷺ) پر کتاب نازل ہوسکتی ہے تو ہم پر آیت یعنی کتاب نازل کیوں نہیں ہوتی؟ اور ایسا کہنا بھی انتہائی جہالت ہے۔

کیوں کہ اللہ تعالیٰ اپنی آیات کے نزول کے لیے اپنے بندوں میں سے نبیوں اور رسولوں کا انتخاب خود کرتا ہے کہ کون اس کے لائق ہے۔ ﴿اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ﴾ [الانعام: ۱۲۴] ''اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے کہ کس موقع پر وہ اپنے پیغام کو رکھتا ہے۔'' یعنی اس کو معلوم ہے کہ اس نے کس کو اپنی جانب سے رسول بنا کر بھیجنا ہے۔ اگر ہر ایک پر اللہ تعالیٰ آیات نازل کرے تو نبوت اور رسالت کا مقصد ہی باقی نہیں رہتا۔ لہٰذا ایسا مطالبہ کرنے والے بالکل بے علم اور جاہل ہیں۔ چوں کہ اس قسم کے لایعنی سوالات سے آنحضرت ﷺ اور آپ کے اصحاب رضی اللہ عنہم کو پریشانی ہوتی تھی تو اللہ تعالیٰ نے مطمئن فرمایا اور کہا کہ یہ معاملہ صرف آپ سے نہیں ہو رہا بلکہ ایسی جاہلانہ باتیں پہلے لوگوں نے بھی کی ہیں۔

کفار کی باہمی مشابہت

ارشادِ ربانی ہے ﴿كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّثْلَ قَوْلِهِمْ﴾ اسی طرح کہا ان لوگوں نے جو ان سے پہلے تھے ان کی بات کی طرح۔ جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کی قوم میں سے بعض لوگوں نے کہا تھا ﴿لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً﴾ ہم آپ ﷺ پر ہرگز ایمان نہیں لائیں گے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کو سامنے دیکھ لیں۔

فرمایا: ﴿تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ﴾ ان کے دل ایک دوسرے کے مشابہ ہو گئے ہیں۔ جس طرح ان کے دلوں میں پیغمبر خدا اور حق کے خلاف جذبات اور شیطانی وسوسے تھے اسی طرح ان کی بھی وہی حالت ہے۔

فرمایا ﴿قَدْ بَيَّنَّا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ﴾ تحقیق ہم نے بیان کر دیں نشانیاں اس قوم کے لیے جو یقین رکھتی ہے۔ نشانیاں تو سب کے لیے ہیں مگر ان سے سبق وہی حاصل کرتے ہیں جو یقین کرنے والے ہیں یہ اسی طرح ہے جس طرح قرآنِ کریم کے متعلق فرمایا کہ ﴿هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ﴾ ہدایت ہے پرہیزگاروں کے لیے قرآن پاک ہدایت تو سب کے لیے ہے مگر اس سے فائدہ متقین نے اُٹھایا۔

فرمایا ﴿اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ﴾ بے شک بھیجا ہم نے آپ کو حق کے ساتھ ﴿بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا﴾ خوش خبری دینے والا اور ڈرانے والا۔ جو ایمان لائیں اور عمل اچھے کریں ان کو اللہ تعالیٰ کی رضا اور جنت کی خوش خبری سنا دے اور نافرمانوں اور فاسقوں کو اللہ تعالیٰ کے عذاب اور جہنم سے ڈرا دے۔

ہدایت دینا صرف خدا کا کام ہے

﴿وَلَا تُسْئَلُ عَنْ اَصْحٰبِ الْجَحِيْمِ﴾ اور آپ سے سوال نہیں کیا جائے گا بھڑکتی ہوئی آگ میں داخل ہونے والوں کے بارے میں کہ یہ جہنم میں کیوں گئے ہیں؟ یہ سوال تو تب ہوتا کہ آپ ﷺ نے تبلیغ نہ کی ہوتی اور اللہ تعالیٰ کے احکام ان تک نہ

پہنچائے ہوتے۔ آپ ﷺ نے تو اپنی ذمہ داری پوری کر دی اور آپ کے ذمہ اتنا ہی تھا۔ ہدایت دینا آپ ﷺ کے اختیار میں نہیں تھا۔ اب اللہ تعالیٰ خود ان سے نمٹ لے گا کہ میں نے تمھاری طرف پیغمبر بھیجا تھا جس نے تمھیں میرا پیغام دیا تھا؟ میرا پیغام سن کر تم نے کیا جواب دیا تھا؟

پیغمبر حق تبلیغ ادا کر کے اپنے عہدہ سے بری ہو گئے۔ ہدایت دینا ان کے اختیار میں نہیں ہے۔ اگر ہدایت دینا نبی کے اختیار میں ہوتا تو حضرت آدم علیہ السلام اپنے بیٹے قابیل کو اور حضرت نوح علیہ السلام اپنے بیٹے کنعان کو اور حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے باپ آذر کو ہدایت سے نوازتے اور آنحضرت ﷺ طبعی محبت کے باوجود اپنے چچا ابوطالب کو گمراہی میں نہ رہنے دیتے بلکہ اس کو ایمان کی دولت سے مالا مال کر دیتے۔

یہود و نصاریٰ کی پیروی ؟

فرمایا ﴿وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ﴾ اور ہر گز راضی نہیں ہوں گے آپ سے ﴿الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى﴾ اور ہر گز راضی نہیں ہوں گے آپ سے یہودی اور نہ عیسائی ﴿حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ﴾ یہاں تک کہ آپ پیروی کریں ان کی ملت کی۔ یعنی یہود و نصاریٰ جو آپ ﷺ سے معجزات کا تقاضا کرتے ہیں۔ اس سے ان کی نیت یہ نہیں ہے کہ وہ معجزات دیکھ کر ایمان لے آئیں گے بلکہ وہ صرف آپ ﷺ کو پریشان کرنے کے لیے ایسا کرتے ہیں۔ وہ آپ پر کسی صورت میں بھی راضی نہیں ہوں گے مگر یہ کہ آپ ان کے دین کی پیروی کریں۔

﴿قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى﴾ آپ (ﷺ) کہہ دیں بے شک اللہ تعالیٰ کی ہدایت ہی ہدایت ہے ﴿وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ الَّذِیْ جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ﴾ اور البتہ اگر آپ (ﷺ) نے پیروی کی ان کی خواہشات کی بعد اس کے کہ آ چکا آپ کے پاس علم ﴿مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِیٍّ وَّلَا نَصِیْرٍ﴾ نہیں ہوگا آپ کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی حمایتی اور نہ کوئی مددگار۔

دیکھو! ﴿وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ﴾ "اور اگر آپ نے اتباع کی۔" اس میں خطاب تو آنحضرت ﷺ کو کیا گیا ہے مگر سمجھانا اُمت کو مقصود ہے۔ کیوں کہ پیغمبر کے متعلق تو تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ وہ گمراہ لوگوں کی پیروی کرے گا البتہ اُمت کے افراد سے اس کا امکان اور خوف ہے۔ اس لیے اُمت کو سمجھایا گیا ہے کہ اگر تم علم ہو جانے کے بعد یہود و نصاریٰ کی خواہشات پر چلو گے تو اللہ تعالیٰ کی گرفت ہوگی اور تمھارا حمایتی اور مددگار بھی کوئی نہیں ہوگا۔

یہود و نصاریٰ کی نقالی پر آنحضرت ﷺ کا فرمان مبارک ؟

اور آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ "ایک وقت آئے گا کہ تم یہود و نصاریٰ کے نقش قدم پر چلو گے حتیٰ کہ وہ اگر کسی سوراخ میں گھسیں گے تو تم بھی اس سوراخ میں گھسنے کی کوشش کرو گے۔" آج کے معاشرے پر نظر کی جائے تو آنحضرت ﷺ کا فرمان

دکھائی دے رہا ہے۔ یہود ونصاریٰ جو فیشن ایجاد کرتے ہیں مسلمان اس کی نقالی کو فخر سمجھتے ہیں اور تہذیب جدید کا نام دے کر اس کو اپناتے ہیں۔ حالاں کہ ان کا مقصود مسلمانوں کو اپنی تہذیب اور اخلاق سے دور کرنا ہے۔ لہٰذا ان کی خواہشات کی پیروی نہ کرو اور اللہ تعالیٰ کی گرفت سے بچ جاؤ۔

تلاوتِ کلام پاک کے آداب

فرمایا: ﴿اَلَّذِیۡنَ اٰتَیۡنٰهُمُ الۡكِتٰبَ یَتۡلُوۡنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ﴾ وہ لوگ جن کو دی ہم نے کتاب وہ اس کی تلاوت کرتے ہیں جیسا کہ اس کی تلاوت کرنے کا حق ہے۔ تلاوت کا حق یہ ہے کہ اس کے احکامات کو تسلیم کیا جائے اور ان پر عمل کیا جائے اور اس کی منع کردہ باتوں سے بچا جائے۔ اگر اس کے احکامات کو ماننا ہی نہیں ہے اور اس کی منع کی ہوئی چیزوں سے باز ہی نہیں آنا تو اس کی تلاوت کا کیا فائدہ؟

جیسا کہ بعض عیسائی اور یہودی بھی قرآن کریم کی تلاوت کرتے ہیں اور بعض جگہوں میں عیسائی ٹیچر قرآن کریم پڑھاتے ہیں مگر نہ مانتے ہیں اور نہ ہی اس پر عمل کرتے ہیں۔ تو اس سے ان کو کیا فائدہ ہوگا؟ اسی طرح اہلِ کتاب توراۃ، انجیل اور زبور کے ماننے کا دعویٰ کرتے ہیں اور پڑھتے بھی ہیں اور اپنی کتابوں میں حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نشانیاں بھی پڑھتے ہیں اور اس کا علم ہونے کے باوجود آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان نہیں لاتے تو ایسے لوگوں نے تلاوت کا حق ادا نہیں کیا۔

تلاوت کا حق ادا کرنے والوں میں حضرت عبداللہ بن سلام، حضرت ثعلبہ، حضرت عدی بن حاتم، حضرت تمیم داری اور حضرت کعب بن احبار رضی اللہ عنہم ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لائے۔ اور قرآنِ کریم کی تلاوت کا حق اس وقت ادا ہوگا جب اس کا مفہوم سمجھ کر اس پر عمل کیا جائے گا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے: ((رُبَّ قَارِئٍ لِلْقُرْاٰنِ وَالْقُرْاٰنُ یَلْعَنُهٗ))۔ "بہت سے قرآن پڑھتے ہیں مگر قرآن ان پر لعنت کرتا ہے۔" مثلاً: ایک آدمی قرآن کریم کی یہ آیت پڑھتا ہے ﴿اَقِیۡمُوا الصَّلٰوةَ﴾ اور نماز نہیں پڑھتا ﴿اٰتُوا الزَّكٰوةَ﴾ پڑھتا ہے اور صاحبِ نصاب ہونے کے باوجود زکوٰۃ سے بھاگتا ہے۔ تو یہ تلاوت کر رہا ہے اور قرآن کریم اس پر لعنت کر رہا ہے کیوں کہ جو پڑھ رہا ہے اس پر عمل نہیں کر رہا۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی کتاب کی تلاوت کا حق یہ ہے کہ اس کے حلال کردہ احکام کو حلال اور حرام کردہ احکام کو حرام سمجھا جائے۔ اور جس طرح اللہ تعالیٰ نے نازل کیا ہے اسی طرح پڑھے کلمات کو ان کی جگہ سے نہ بدلے اور خواہ مخواہ ان کی تاویل بھی نہ کرے۔

فرمایا ﴿اُولٰٓئِكَ یُؤۡمِنُوۡنَ بِهٖ﴾ وہی لوگ اس پر ایمان لاتے ہیں جو اس کی تلاوت کا حق ادا کرتے ہیں ﴿وَمَنۡ یَّكۡفُرۡ بِهٖ﴾ اور جو لوگ اس کا انکار کرتے ہیں ﴿فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الۡخٰسِرُوۡنَ﴾ پس وہی لوگ نقصان اُٹھانے والے ہیں یعنی اہلِ کتاب میں

سے جس نے قرآنِ کریم کا انکار کیا اس نے اپنی کتاب کا بھی انکار کیا اور اس انکار کا وبال بھی انہی پر پڑے گا کہ جہنم کا ایندھن بنیں گے۔ اللہ تعالیٰ پر یا اللہ تعالیٰ کے نبی پر اس کا کیا اثر ہے؟

﴿یٰبَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ﴾ اے اسرائیل (علیہ السلام) کی اولاد ﴿اذْكُرُوْا نِعْمَتِیَ﴾ یاد کرو میری نعمتوں کو ﴿الَّتِیْۤ اَنْعَمْتُ عَلَیْكُمْ﴾ جو میں نے تم پر کیں ﴿وَ اَنِّیْ فَضَّلْتُكُمْ﴾ اور میں نے تمھیں فضیلت بخشی ﴿عَلَى الْعٰلَمِیْنَ﴾ جہان والوں پر ﴿وَاتَّقُوْا یَوْمًا﴾ اور ڈرو اُس دن سے ﴿لَّا تَجْزِیْ نَفْسٌ﴾ نہیں کفایت کرے گا کوئی نفس ﴿عَنْ نَّفْسٍ﴾ کسی نفس کی طرف سے ﴿شَیْــٴًـا﴾ کچھ بھی ﴿وَّ لَا یُقْبَلُ مِنْهَا﴾ اور نہ قبول کیا جائے گا اُس سے ﴿عَدْلٌ﴾ بدلہ ﴿وَّ لَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ﴾ اور نہ نفع دے گا اس کو سفارش کرنا ﴿وَّ لَا هُمْ یُنْصَرُوْنَ﴾ اور نہ اُن کی مدد کی جائے گی ﴿وَ اِذِ ابْتَلٰۤى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ﴾ اور جب آزمایا ابراہیم (علیہ السلام) کو اس کے رب نے ﴿بِكَلِمٰتٍ﴾ چند باتوں کے ساتھ ﴿فَاَتَمَّهُنَّ﴾ پس اُنھوں نے ان باتوں کو پورا کر دیا ﴿قَالَ﴾ فرمایا (پروردگار نے) ﴿اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا﴾ بے شک میں بنانے والا ہوں تمھیں لوگوں کے لیے پیشوا ﴿قَالَ﴾ کہا ابراہیم (علیہ السلام) نے ﴿وَ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ﴾ اور میری اولاد میں سے بھی ﴿قَالَ لَا یَنَالُ عَهْدِی الظّٰلِمِیْنَ﴾ فرمایا (اللہ تعالیٰ نے) نہیں پہنچے گا میرا عہد ظالموں کو ﴿وَ اِذْ جَعَلْنَا الْبَیْتَ﴾ اور جب بنایا ہم نے بیت اللہ کو ﴿مَثَابَةً لِّلنَّاسِ﴾ لوٹنے کی جگہ لوگوں کے لیے ﴿وَ اَمْنًا﴾ اور امن کی جگہ ﴿وَ اتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى﴾ اور بناؤ تم ابراہیم علیہ السلام کے کھڑے ہونے کی جگہ کو نماز کی جگہ ﴿وَ عَهِدْنَاۤ﴾ اور ہم نے تاکید کی ﴿اِلٰۤى اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِیْلَ﴾ ابراہیم اور اسماعیل (علیہما السلام) کو ﴿اَنْ طَهِّرَا بَیْتِیَ﴾ کہ پاک رکھو تم دونوں میرے گھر کو ﴿لِلطَّآىٕفِیْنَ﴾ طواف کرنے والوں کے لیے ﴿وَ الْعٰكِفِیْنَ﴾ اور اعتکاف بیٹھنے والوں کے لیے ﴿وَ الرُّكَّعِ السُّجُوْدِ﴾ اور رکوع اور سجدہ کرنے والوں کے لیے۔

بنی اسرائیل کون تھے؟

اسرائیل حضرت یعقوب علیہ السلام کا لقب جس کا معنیٰ ''عبد اللہ'' ہے اور اس کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے۔

تو ﴿یٰبَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ﴾ کا معنیٰ ہوگا ''یعقوب علیہ السلام کی اولاد''۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارہ بیٹے تھے، بیٹی کوئی نہیں تھی ان میں سے ایک حضرت یوسف علیہ السلام بھی تھے جو اللہ تعالیٰ کے پیغمبر تھے۔ ہر بیٹے کی آگے نسل چلی اور وہ مستقل خاندان بنا اور اپنے باپ کی طرف نسبت سے مشہور ہوا۔ کوئی یوسفی کہلائے، کوئی بنیامینی، کوئی روبینی اور کوئی یہودی کہلائے۔ تو یہ بنی اسرائیل

فرعون سے نجات حاصل کرنے کے بعد جب وادی تیہ میں پہنچے (جس کا آج کل نام وادی سینائی ہے۔ اور اس کا وہ حصہ جو فوجی اہمیت کا حامل ہے یہودیوں کے قبضہ میں ہے اور باقی مصر کے پاس ہے)۔

بنی اسرائیل جب اس میدان میں پہنچے تو تفصیلاً پہلے بیان ہو چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے کھانے پینے کا انتظام فرمایا من وسلویٰ کے ساتھ۔ سائے کا انتظام فرمایا بادلوں کے ساتھ۔ اور پانی کا انتظام فرمایا پتھر سے چشمے جاری فرما کر۔ اس کے علاوہ ان پر اور بڑے انعام فرمائے۔ (اسی طرح ''نعمتی'' میں ''نعمت'' کا ترجمہ جمع والا کیا گیا ہے اور ''نعمت'' مصدر ہے اور مصدر کا اطلاق مفرد، جمع سب پر ہوتا ہے)۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ﴿یٰبَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ﴾ اے اسرائیل (علیہ السلام) کی اولاد ﴿اذۡکُرُوۡا نِعۡمَتِیَ﴾ یاد کرو میری نعمتوں کو ﴿الَّتِیۡۤ اَنۡعَمۡتُ عَلَیۡکُمۡ﴾ جو میں نے تم پر کیں۔ نعمتوں کو یاد کرانے کا مطلب ہے کہ ان کی قدر کرو اور ان کا شکریہ ادا کرو۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے ﴿لَئِنۡ شَکَرۡتُمۡ لَاَزِیۡدَنَّکُمۡ﴾ ''اگر تم میری نعمتوں کا شکریہ ادا کرو گے تو میں تمہیں ضرور زیادہ دوں گا ﴿وَلَئِنۡ کَفَرۡتُمۡ اِنَّ عَذَابِیۡ لَشَدِیۡدٌ﴾ [ابراہیم: ۷] اور اگر تم ناشکری کرو گے بے شک میرا عذاب بڑا سخت ہے۔'' لہٰذا اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکریہ ادا کرو۔

﴿وَاَنِّیۡ فَضَّلۡتُکُمۡ عَلَی الۡعٰلَمِیۡنَ﴾ اور میں نے تمہیں فضیلت بخشی جہان والوں پر۔ اس وقت دنیا میں جتنے لوگ موجود تھے بنی اسرائیل کو ان سب پر فوقیت اور فضیلت حاصل تھی ظاہری اعتبار سے بھی اور باطنی اعتبار سے بھی ظاہری اعتبار سے۔ اس طرح کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو بادشاہی عطا فرمائی۔ حضرت یوسف علیہ السلام بادشاہ بنے حضرت داؤد علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے خلافت عطا فرمائی اور سلیمان علیہ السلام کو بے مثال بادشاہی عطا فرمائی۔ اور ان کی نسل میں اور کئی بادشاہ ہوئے اور باطنی اعتبار سے اس طرح کہ اس کو رسالت عطا فرمائی۔ حضرت یعقوب علیہ السلام سے لے کر عیسیٰ علیہ السلام تک تقریباً چار ہزار پیغمبر بنی اسرائیل میں آئے ہیں۔ اگر ایک پیغمبر کسی قوم میں آجائے تو اس قوم کا سر فخر سے بلند ہو جاتا ہے، آسمان سے جا لگتا ہے چہ جائے کہ کسی قوم میں چار ہزار پیغمبر آئیں۔

پھر چار بڑی مشہور کتابوں میں سے تین کتابیں بھی رب تعالیٰ نے ان کو دیں۔ توراۃ موسیٰ علیہ السلام کو، زبور داؤد علیہ السلام کو، انجیل عیسیٰ علیہ السلام کو۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان کو ظاہری اور باطنی ہر طرح کی نعمتوں سے مالا مال فرمایا۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا لازم ہے۔

روزِ قیامت کی نفسا نفسی

فرمایا ﴿وَاتَّقُوۡا یَوۡمًا﴾ اور ڈرو قیامت کے دن سے ﴿لَّا تَجۡزِیۡ نَفۡسٌ﴾ نہیں کفایت کرے گا کوئی نفس ﴿عَنۡ نَّفۡسٍ شَیۡئًا﴾ کسی نفس کی طرف سے کچھ بھی۔ ﴿لَّا یَجۡزِیۡ وَالِدٌ عَنۡ وَّلَدِہٖ ۫ وَلَا مَوۡلُوۡدٌ ہُوَ جَازٍ عَنۡ وَّالِدِہٖ شَیۡئًا﴾ [لقمان: ۳۳] نہ باپ

بیٹے کے کام آئے اور نہ بیٹا باپ کے کام آئے گا اور تیسویں پارے میں آتا ہے ﴿یَوۡمَ یَفِرُّ الۡمَرۡءُ مِنۡ اَخِیۡهِ ۙ﴿۳۴﴾ وَ اُمِّهٖ وَ اَبِیۡهِ ۙ﴿۳۵﴾ وَ صَاحِبَتِهٖ وَ بَنِیۡهِ ﴿ؕ۳۶﴾﴾ ''اس دن آدمی اپنے بھائی سے دور بھاگے گا اور اپنے ماں، باپ سے اور اپنی بیوی اور بیٹوں سے بھاگے گا۔'' اس سے اندازہ لگالو کہ کوئی کسی کے کیا کام آئے گا؟

محشر والے دن یہ حال ہوگا کہ ایک آدمی کی نیکیاں اور بدیاں برابر ہوں گی۔ مثلاً: نیکیاں بھی پچاس اور بدیاں بھی پچاس۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ اے بندے! تیرا نیکی اور بدی والا پلہ برابر ہے۔ اس طرح کر کہ تو ایک نیکی تلاش کر کے لاتا کہ تیرا نیکیوں والا پلہ بھاری ہوجائے وہ بڑا خوش ہوجائے گا کہ ایک نیکی کا لانا کون سا مشکل ہے؟ اپنے لنگوٹیے یاروں کے پاس جائے گا جو ہر وقت اس کے ساتھ ٹہلتے اور چلتے پھرتے تھے اور اس کے بغیر کھانا نہیں کھاتے تھے، وہ ایک نیکی دینے سے انکار کردیں گے۔ پھر اپنے بھائی کے پاس جائے گا کہ یہ دنیا میں میرا بازو تھا۔ بھائی بھی انکار کردے گا پھر باپ کے پاس جائے گا وہ بھی انکار کردے گا۔ غرض یہ کہ جب سارے عزیز و اقارب انکار کردیں گے۔ تو پھر آخر میں ماں کے پاس جائے گا اور کہے گا:

اَتَعۡرِفِیۡنِیۡ کیا تو مجھے پہچانتی ہے کہ میں کون ہوں؟ وہ کہے گی کہ ہاں میں نے تجھے پیٹ میں اٹھایا اور مشقت کے ساتھ تجھے جنا پھر تیری پرورش کی تو میرا بیٹا ہے۔ وہ کہے گا اے میری ماں! مجھے ایک نیکی دے دے تاکہ میرا نیکیوں والا پلہ بھاری ہوجائے وہ کہے گی اِلَیۡكَ عَنِّیۡ مجھ سے دور ہوجا۔ میں نیکی تجھے دے کر خود کیا کروں گی؟ اس سے اندازہ لگالو یوم محشر کا۔

اس لیے اللہ تعالیٰ نے صاف لفظوں میں فرمادیا ہے کہ ﴿لَا تَجۡزِیۡ نَفۡسٌ﴾ نہیں کفایت کرے گا کوئی نفس ﴿عَنۡ نَّفۡسٍ شَیۡـًٔا﴾ کسی نفس کی طرف سے کچھ بھی ﴿وَّ لَا یُقۡبَلُ مِنۡهَا عَدۡلٌ﴾ اور نہ قبول کیا جائے گا اس سے بدلہ، جرمانہ اور فدیہ ﴿وَّ لَا تَنۡفَعُهَا شَفَاعَةٌ﴾ اور نہ نفع دے گا اس کو سفارش کرنا۔ قیامت والے دن کافر، مشرک نفس کو شفاعت بھی فائدہ نہیں دے گی۔

﴿وَّ لَا هُمۡ یُنۡصَرُوۡنَ﴾ اور نہ ان کی مدد کی جائے گی۔ دیکھو! اگر کوئی آدمی جیل یا تھانے میں گرفتار ہوجائے تو اس کو رہا کرانے کے عقلی طور پر چار ہی طریقے ہیں۔

①...... ضمانت دے کر رہا کرالیا جاتا ہے کہ اس کو چھوڑ دو ہم اس کے ضامن ہیں کہ یہ عدالت کے طلب کرنے پر حاضر ہوجائے گا۔

②...... دوسری صورت یہ ہوتی ہے کہ واقعی اس نے جرم کیا ہے تم جرمانہ لے کر اس کو چھوڑ دو۔

③...... تیسری صورت یہ ہوتی ہے کہ بااثر آدمی سفارش کر کے رہا کرلیتا ہے۔

④...... چوتھی صورت یہ ہوتی ہے کہ حملہ کر کے زبردستی رہا کرالیا جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ قیامت والے دن نہ تو کوئی کسی کی ضمانت دے گا اور نہ فدیہ اور جرمانہ وصول کیا جائے گا اور نہ ہی نافرمانوں کے لیے سفارش۔ اس کے متعلق یاد رکھنا! کہ سفارش کی جو نفی کی گئی ہے یہ کافر اور مشرک سے سفارش کی نفی ہے۔ باقی گنہگار مومنوں کے لیے سفارش اپنی جگہ برحق ہے اور مومنوں سے جو غلطیاں ہوئی ہوں گی تو ان کے لیے سفارش قرآن کریم

سے بھی ثابت ہے اور احادیث اور اجماع امت سے بھی ثابت ہے۔ اللہ تعالیٰ کے پیغمبر بھی سفارش کریں گے۔ فرشتے بھی سفارش کریں گے۔ حافظ قرآن بھی سفارش کریں گے۔

حفاظ، شہدا اور نابالغ بچوں کی سفارش

حدیث پاک میں آتا ہے کہ ایک حافظ قرآن کی سفارش سے اس کی برادری کے دس مجرموں کو چھٹکارا ملے گا۔ گویا کہ حافظ قرآن صرف اپنے لیے نہیں پڑھ رہا بلکہ دوسروں کے لیے بھی پڑھ رہا ہے بشرطیکہ صحیح معنیٰ میں حافظ قرآن ہو۔ اسی طرح شہید بھی سفارش کریں گے۔ اور چھوٹے بچے جو نابالغی میں فوت ہو گئے ہیں، لڑکے یا لڑکیاں وہ بھی سفارش کریں گے۔ بشرطیکہ ماں، باپ نے ان کی موت پر بین نہ کیا ہو۔ اگر بین کریں گے تو پھر ان کی سفارش سے محروم ہو جائیں گے۔ ہاں اگر بین کیا پھر سچے دل سے توبہ کر لی تو رب تعالیٰ معاف کر دے گا۔ اور نمازی اور روزے دار آپس میں ایک دوسرے کی سفارش کریں گے۔ بہر حال اہل توحید کی اہلِ توحید کے لیے سفارش برحق ہے۔ اور کافر اور مشرک کے لیے کوئی سفارش نہیں ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شخصیت چوں کہ بہت بڑی تھی۔ اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد ان کا درجہ ہے۔ یہ کوئی معمولی عہدہ نہیں ہے۔ اسی وجہ سے ہر ایک ان کو اپنی طرف کھینچتا تھا۔ اور اپنی نسبت ان کے ساتھ جوڑتا تھا۔ یہودیوں کا دعویٰ تھا کہ ابراہیم علیہ السلام ہمارے مسلک پر تھے نصاریٰ کا دعویٰ تھا کہ ابراہیم علیہ السلام ہمارے تھے۔ اور عرب کے مشرک کہتے تھے کہ ابراہیم علیہ السلام ہمارے تھے، معاذ اللہ تعالیٰ۔ ان آیات میں اللہ تعالیٰ ابراہیم علیہ السلام کے کارنامے بیان کر کے بتاتے ہیں کہ ابراہیم علیہ السلام کون تھے؟ اور انہوں نے کیا کام کیے تھے اور تم کیا کر رہے ہو اور ان کا تعلق کن کے ساتھ تھا؟ آگے دونوں رکوعوں تک یہی بیان چلے گا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا امتحان

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ﴿وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ﴾ اور جب آزمایا ابراہیم علیہ السلام کو اس کے رب نے ﴿بِكَلِمٰتٍ﴾ چند باتوں میں، چند کاموں میں ﴿فَاَتَمَّهُنَّ﴾ پس ابراہیم علیہ السلام نے ان باتوں کو پورا کر دیا۔

ایک اشکال

یہاں پر ایک اشکال پیدا ہوتا ہے کہ امتحان تو وہ لیتا ہے جسے کسی کی قابلیت اور اہلیت کا علم نہ ہو اور اللہ تعالیٰ تو علیم کل ہے اس کے امتحان لینے کا کیا مطلب ہے؟

جواب: اس کے دو جوابات ہیں:

①...... ایک جواب یہ ہے کہ ایک امتحان تو ہوتا ہے کسی کی قابلیت اور اہلیت کو معلوم کرنے کے لیے جو عام طور پر لیا جاتا ہے تا کہ معلوم ہو جائے کہ اس طالب نے یہ پڑھا ہے یا نہیں فلاں کتاب اس کو یاد ہے یا نہیں؟ اور اس میں کتنی قابلیت رکھتا ہے؟

تو یہ امتحان ہوتا ہے معلومات حاصل کرنے کے لیے۔ رب تعالیٰ کے امتحان لینے کا یہ معنیٰ نہیں ہے کیونکہ اس کو تو سب کچھ معلوم ہے۔

② ...... اور دوسرا معنیٰ امتحان کا یہ ہے کہ امتحان لینے والے کو تو اس کی قابلیت اور اہلیت کا علم ہوتا ہے مگر دوسرے لوگ اس سے ناواقف ہوتے ہیں لہٰذا امتحان کی ضرورت محسوس ہوتی ہے تاکہ دوسروں پر اس کی خوبیاں واضح کر دی جائیں کہ اس میں کیا، کیا خوبیاں ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے امتحان کی یہی غرض و غایت تھی کہ جس ہستی کو میں نے اپنا خلیل منتخب کیا ہے۔ اور اتنا بلند مقام عطا کیا ہے۔ ان میں یہ، یہ خوبیاں ہیں۔

مثال کے طور پر ہمیں معلوم ہے کہ ہمارا فلاں شاگرد قابل ہے۔ اور وہ ہمارے سوالات کے جوابات جانتا ہے۔ اب مجمع میں ہم اس سے سوال کرتے ہیں کہ برخوردار اس کا جواب دے؟ اب ہمارا اس سے سوال کرنا اس غرض سے نہیں ہے کہ ہم اس کی قابلیت معلوم کرنا چاہتے ہیں بلکہ غرض یہ ہے کہ مجلس والے اس فضیلت کو تسلیم کر لیں کہ کس طرح صحیح، صحیح جواب دے رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف جب امتحان لینے کی نسبت ہوگی تو اسی معنیٰ میں ہوگی کہ مخلوق کو اس کی قدر و منزلت کا علم ہو جائے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد کا نام آذر تھا۔ جیسا کہ قرآن پاک میں اس کا ذکر موجود ہے:

﴿وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ لِاَبِيْهِ اٰزَرَ﴾ [الانعام: ۷۴] اور جب کہا ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ آذر کو اور تارخ آذر کا لقب تھا۔ اس وقت کلدانیوں کی حکومت تھی اور نمرود بن کنعان بڑا ظالم، جابر اور مشرک بادشاہ اس کا دارالحکومت شہر کوثیٰ بروزن ''طوبیٰ'' تھا۔ آج کے جغرافیہ میں اس کا نام ''اُور'' (UR) ہے جو چھوٹا سا قصبہ معلوم ہوتا ہے ملک عراق میں۔ اس ملک میں بے شمار بت خانے تھے اور ان کو سرکاری سرپرستی حاصل تھی اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد آذر اس حکومت کے وزیر مذہبی امور تھے وہ بت اور بت خانے بناتے تھے اور جس بت خانے میں بتوں کی کمی ہوتی تھی پوری کرتے تھے۔

اللہ تعالیٰ نے بت گر کے گھر بت شکن پیدا فرمایا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بچپن سے ہی بتوں سے نفرت تھی جس کی وجہ سے ہر وقت باپ کے ساتھ تلخی رہتی تھی۔ لیکن کبھی بے ادبی سے پیش نہیں آئے۔ جب بھی بلایا ہے یَا اَبَتِ "اے ابا جی!" کہہ کر بلایا ہے۔ انداز نرم اور پیارا ہوتا تھا مگر کفر شرک کی تردید ڈٹ کر کرتے تھے۔ جس گھر میں جھگڑا اور آپس میں ضد بازی ہو تو بڑا امتحان ہوتا ہے۔ اور زندگی دوبھر ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ گھریلو جھگڑے سے بچائے اور جس گھر میں کوئی اختلاف نہیں ہے وہ جنت کا ٹکڑا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی آزمائشیں

بہر حال حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مختلف امتحان ہوئے ہیں۔ ان میں سے

① پہلا امتحان باپ کے ساتھ مقابلہ تھا۔

②...... دوسرا امتحان پوری برادری کے ساتھ مقابلہ۔

③...... تیسرا امتحان پورے ملک کے ساتھ مقابلہ۔

④...... اور چوتھا امتحان نمرود بن کنعان جیسے ظالم اور جابر بادشاہ کے ساتھ مقابلہ تھا۔

⑤...... ان کے علاوہ جب اللہ تعالیٰ نے عراق سے ہجرت کرنے کا حکم دیا راستے میں امتحان۔

عراق میں یہ تین بزرگ ہی مسلمان تھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام، ان کے بھتیجے حضرت لوط علیہ السلام، اور اہلیہ علیہا السلام حضرت سارا جو ان کے چچا کی بیٹی تھیں۔ یہ تینوں حضرات عراق سے ہجرت کر کے شام تشریف لے گئے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام اور بدکردار بادشاہ

راستے میں ایک ظالم بدکردار بادشاہ تھا اس علاقہ سے جو خوب صورت عورت گزرتی اسے بے آبرو کیے بغیر نہیں چھوڑتا تھا اور اگر اس عورت کے ساتھ خاوند ہوتا تو اسے قتل کرا دیتا تھا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام جب اس علاقہ سے گزرنے لگے تو بادشاہ کے کسی ملازم نے ان سے سوال کیا کہ تمہارے ساتھ جو عورت ہے وہ تمہاری کیا لگتی ہے؟ فرمایا میری بیوی ہے۔ نوکر نے کہا کہ یہاں تم اس کو بیوی نہ کہنا ورنہ کسی مصیبت میں پڑ جاؤ گے اگر تم نے بیوی کہا تو بادشاہ پہلے تمہیں قتل کرے گا پھر اگلی کارروائی ہوگی۔ شریف آدمی معلوم ہوتے ہو اور پردیسی مسافر نظر آرہے ہو اس لیے ہم نے تمہیں بتا دیا ہے۔ اگر بادشاہ تمہیں بلا کر پوچھے تو بیوی نہ کہنا بلکہ کہنا کہ میری بہن ہے۔ اس کے علاوہ ہم کچھ نہیں کر سکتے کیوں کہ ہم ملازم ہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت سارا علیہا السلام کو سمجھا دیا کہ اگر بادشاہ تجھے پوچھے کہ تیرے ساتھ کون ہے؟ تو کہہ دینا کہ میرا بھائی ہے۔ اس لیے کہ "أَنْتِ أُخْتِيْ فِيْ دِيْنِ اللهِ" اللہ تعالیٰ کے دین میں تو میری بہن ہے۔ تو دینی بھائی مراد لینا۔ چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بادشاہ کے سامنے پیش کیا گیا تو بادشاہ نے پوچھا کہ یہ عورت کون ہے؟ فرمایا میری بہن ہے۔ پھر اس بادشاہ نے غلط ارادہ کیا تو گھٹنوں تک زمین میں دھنس گیا۔ پھر لگا منت سماجت کرنے اور غلط ارادے سے توبہ کی تو اللہ تعالیٰ نے زمین سے نکالا۔ مجبور ہو کر اپنی لونڈی "ہاجرہ" ان کو دے کر جان چھڑائی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت ہاجرہ سے نکاح کر لیا اور ان کے بطن سے حضرت اسماعیل علیہ السلام پیدا ہوئے۔

⑥...... اس کے بعد پھر یہ امتحان ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ان کو مکہ مکرمہ میں چھوڑ کر واپس آجاؤ۔ جہاں نہ کوئی سبزہ، نہ کوئی انسان اور نہ کوئی مکان۔ جواں سال عورت اور دودھ پیتا بچہ مکہ مکرمہ میں چھوڑ کر واپس چلے گئے۔

⑦...... پھر وہ بچہ جب چلنے پھرنے کے قابل ہوا جو تقریباً تیرہ سال کی عمر کا ہوتا ہے تو رب تعالیٰ نے فرمایا کہ اس کو ذبح کر دو۔ اللہ تعالیٰ نے قدم قدم پر امتحان لیا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام ہر امتحان میں کامیاب ہوئے۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ﴿وَ اِذِ ابْتَلٰۤى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ﴾ اور جب آزمایا ابراہیم علیہ السلام کو اس کے رب نے ﴿بِكَلِمٰتٍ﴾ چند باتوں میں، چند کاموں میں ﴿فَاَتَمَّهُنَّ﴾ پس ابراہیم علیہ السلام نے ان باتوں کو پورا کر دیا۔ ﴿قَالَ﴾ فرمایا پروردگار نے ﴿اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا﴾ بے شک میں بنانے والا ہوں تمہیں لوگوں کے لیے پیشوا ﴿قَالَ﴾ کہا ابراہیم علیہ السلام نے ﴿وَ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ﴾ اور میری اولاد میں سے بھی ﴿قَالَ لَا یَنَالُ عَهْدِی الظّٰلِمِیْنَ﴾ فرمایا اللہ تعالیٰ نے نہیں پہنچے گا میرا عہد ظالموں کو۔ یہ دینی امامت کا عہدہ بہت بلند ہے اور آپ کی اولاد میں کافر، مشرک بھی ہوں گے۔ لہٰذا یہ وعدہ ساری اولاد کے لیے نہیں ہے۔

قبلہ رُخ ہونے کا حکم

﴿وَ اِذْ جَعَلْنَا الْبَیْتَ﴾ اور جب بنایا ہم نے بیت اللہ کو ﴿مَثَابَةً لِّلنَّاسِ﴾ لوٹنے کی جگہ لوگوں کے لیے ﴿وَ اَمْنًا﴾ اور امن کی جگہ۔ کعبۃ اللہ کے متعلق تفصیل تو آگے آئے گی۔ ابھی صرف اس قدر سمجھیں کہ تمام لوگوں کو نماز کی حالت میں کعبۃ اللہ کی طرف چہرہ کرنا ہے چاہے وہ کسی بھی سمت میں ہوں۔ ہم کعبۃ اللہ سے مشرق کی جانب رہتے ہیں اس لیے ہم مغرب کی طرف چہرہ کرتے ہیں۔ اور جو لوگ مغرب کی جانب رہتے ہیں وہ مشرق کی طرف چہرہ کرتے ہیں اور جو حضرات شمال کی طرف رہتے ہیں وہ جنوب کی طرف چہرہ کرتے ہیں اور جو جنوب کی طرف رہتے ہیں وہ شمال کی طرف چہرہ کرتے ہیں اگر نمازی کو کعبۃ اللہ سامنے نظر آرہا ہو تو پھر عین کعبہ کی طرف رخ کرنا فرض ہے۔ ایسی حالت میں جہت اور سمت کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ اور اگر کعبہ سامنے نظر نہیں آتا تو پھر کعبہ کی سمت اور جہت ہی کافی ہے اور تھوڑا بہت فرق بھی ہو تو ڈر نہیں ہے۔

یہ ہماری مسجدیں کعبہ سے ڈگری دو ڈگری پھری ہوئی ہیں اور یہ ہماری مسجد بھی کعبہ سے تقریباً ڈیڑھ ڈگری پھری ہوئی ہے۔ لیکن اگر کوئی مسجد پانچ ڈگری تک بھی پھری ہوئی ہو تو نماز میں کوئی خلل نہیں پڑتا۔ البتہ جو نئی مسجدیں بنائی جائیں تو کوشش کرنی چاہیے کہ ان کا رخ اور سمت صحیح کعبہ کی طرف ہونی چاہیے اور وہ قبلہ نما کے ذریعہ معلوم ہو جاتا ہے۔

بیت اللہ کی تعمیر

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ﴿وَ اتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى﴾ اور بناؤ تم ابراہیم علیہ السلام کے کھڑے ہونے کی جگہ کو نماز کی جگہ۔ مقامِ ابراہیم سے مراد وہ پتھر ہے جس پر کھڑے ہو کر حضرت ابراہیم علیہ السلام کعبۃ اللہ کی چنائی کرتے تھے۔ اور یہ گو (لفٹ) کا کام دیتا تھا۔ اس پتھر پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاؤں کے نشان آج بھی موجود ہیں اور بیت اللہ کے قریب شیشے کے خول میں محفوظ ہے۔ اور اس سے پہلے یہ سطح زمین پر نصب تھا۔ مخلوق کی کثرت کی وجہ سے اب اسے تھوڑا سا دُور رکھ دیا گیا ہے۔

اس پتھر کو اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ارادے کے تابع کر دیا تھا۔ جب وہ دائیں بائیں ہونے کا ارادہ کرتے تو یہ دائیں بائیں ہو جاتا اور جب اوپر نیچے آنے جانے کا ارادہ فرماتے تو وہ اوپر نیچے ہو جاتا کعبۃ اللہ کی تعمیر حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام دونوں باپ بیٹے نے مل کر کی۔ اس میں کوئی تیسرا آدمی شامل نہیں تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے

راج (مستری) کا کام کیا اور حضرت اسماعیل علیہ السلام نے مزدور کا۔

مقامِ ابراہیم علیہ السلام کے دو نفل

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے اپنی خواہش کا اظہار کیا کہ حضرت! مقامِ ابراہیم کی جگہ ہم نماز نہ پڑھیں؟ (یعنی جی چاہتا ہے کہ یہاں دو نفل پڑھیں)۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خواہش کے مطابق حکم نازل فرمایا کہ مقام ابراہیم کو تم نماز پڑھنے کی جگہ بنالو۔ اکیس مقامات ایسے ہیں جن کے متعلق احکام اللہ تعالیٰ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خواہش کے مطابق نازل فرمائے ہیں۔

مسئلہ ❁ مسئلہ یہ ہے کہ جب آدمی طواف کے سات چکر پورے کرلے تو مقام ابراہیم کے پاس دو رکعتیں پڑھنی ہیں۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ﴿وَعَهِدْنَآ إِلَىٰٓ إِبْرٰهِـمَ وَإِسْمٰعِيلَ﴾ اور ہم نے تاکید کی ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام کو ﴿أَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ﴾ کہ پاک رکھو تم دونوں میرے گھر کو ظاہری اور باطنی نجاستوں سے۔ باطنی نجاست شرک ہے۔

قرآن پاک میں آتا ہے ﴿إِنَّمَا الْمُشْرِكُونَ نَجَسٌ﴾ پختہ بات ہے کہ مشرک پلید ہیں۔ ظاہری طور پر یہ کتنے صاف نظر آئیں کہ بدن اور کپڑے صاف ہوں لیکن دل میں نجاست ہوتی ہے اور دل پاک نہیں ہوسکتا چاہے سات سمندروں میں غسل کرلے جب تک کہ تہہ دل سے کلمہ طیبہ نہیں پڑھے گا لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔

توفرمایا کہ میرے گھر کو پاک رکھو۔ کن کے لیے؟ ﴿لِلطَّآئِفِينَ﴾ طواف کرنے والوں کے لیے ﴿وَالْعٰكِفِينَ﴾ اور اعتکاف بیٹھنے والوں کے لیے ﴿وَالرُّكَّعِ السُّجُودِ﴾ اور رکوع وسجود کرنے والوں کے لیے۔ رُکَّع، رَاکِعٌ کی جمع ہے اور سُجُود، ساجِدٌ کی جمع ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے دونوں بزرگوں کو حکم دیا کعبۃ اللہ کو پاک رکھنے کا اور پھر یہی حکم قیامت تک آنے والے لوگوں کے لیے ہے کہ اللہ تعالیٰ کے گھر کو ہر قسم کی نجاست سے پاک رکھیں۔

﴿وَإِذْ قَالَ إِبْرٰهِـمُ﴾ اور جب کہا ابراہیم (علیہ السلام) نے ﴿رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا﴾ اے میرے رب! بنادے اس کو ﴿بَلَدًا اٰمِنًا﴾ شہر امن والا ﴿وَّارْزُقْ أَهْلَهُ﴾ اور رزق دے اس کے باشندوں کو ﴿مِنَ الثَّمَرٰتِ﴾ پھلوں سے ﴿مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ﴾ جو کوئی ان میں سے ایمان لائے ﴿بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ﴾ اللہ تعالیٰ اور آخرت کے دن پر ﴿قَالَ وَمَنْ كَفَرَ﴾ فرمایا (اللہ تعالیٰ نے) اور جس نے کفر کیا ﴿فَأُمَتِّعُهُ قَلِيلًا﴾ پس اس کو بھی فائدہ پہنچاؤں گا تھوڑا سا ﴿ثُمَّ أَضْطَرُّهُ﴾ پھر میں اس کو مجبور کردوں گا ﴿إِلَىٰ عَذَابِ النَّارِ﴾ دوزخ کے عذاب کی طرف ﴿وَبِئْسَ الْمَصِيرُ﴾ اور وہ بہت بُرا ٹھکانا ہے ﴿وَإِذْ يَرْفَعُ إِبْرٰهِـمُ﴾ اور جب اُٹھا رہے تھے ابراہیم (علیہ السلام) ﴿الْقَوَاعِدَ مِنَ

﴿الْبَیْتِ﴾ بیت اللہ کی دیواریں ﴿وَ اِسْمٰعِیْلُ﴾ اور اسماعیل (علیہ السلام) بھی ﴿رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا﴾ اے ہمارے پروردگار! قبول فرما ہم سے ﴿اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ﴾ بے شک تو ہی ہے سننے والا جاننے والا ﴿رَبَّنَا وَ اجْعَلْنَا مُسْلِمَیْنِ لَكَ﴾ اے ہمارے رب! اور بنا دے ہم دونوں کو فرماں بردار اپنا ﴿وَ مِنْ ذُرِّیَّتِنَاۤ﴾ اور ہماری اولاد میں سے بھی ﴿اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ﴾ ایک امت جو فرماں بردار ہو تیری ﴿وَ اَرِنَا مَنَاسِكَنَا﴾ اور دکھا ہم کو ہمارے احکام ﴿وَ تُبْ عَلَیْنَا﴾ اور ہمارے اوپر رجوع فرما ﴿اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ﴾ بے شک تو ہی ہے رجوع فرمانے والا، مہربان ﴿رَبَّنَا﴾ اے ہمارے رب! ﴿وَ ابْعَثْ فِیْهِمْ﴾ اور بھیج ان میں ﴿رَسُوْلًا مِّنْهُمْ﴾ ایک رسول ان ہی میں سے ﴿یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِكَ﴾ جو تلاوت کرے ان پر تیری آیتیں ﴿وَ یُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ﴾ اور تعلیم دے ان کو کتاب کی ﴿وَ الْحِكْمَةَ﴾ اور دانائی کی ﴿وَ یُزَكِّیْهِمْ﴾ اور ان کو پاک کرے ﴿اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ﴾ بے شک تو ہی ہے زبردست، حکمت والا۔

ربط:

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ حضرت ہاجرہ اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کو مکہ مکرمہ پہنچا دو۔ چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت ہاجرہ اور شیر خوار حضرت اسماعیل علیہ السلام کو مکہ مکرمہ پہنچا دیا اور جہاں کعبۃ اللہ ہے اس کے سامنے ایک درخت تھا اس کے نیچے بٹھا دیا۔ پانی کا ایک مشکیزہ اور تھوڑی سی کھجوریں بھی ان کو دے دیں اور ان کو پہلے یہ پروگرام بھی نہیں بتایا تھا کہ میں نے تمہیں وہاں پہنچا کر واپس آ جانا ہے۔ جب واپس جانے لگے تو فرمایا کہ:

❀ تم ماں بیٹے نے یہیں رہنا ہے۔

☆...... حضرت ہاجرہ علیہا السلام نے سوال کیا کہ آپ کہاں جا رہے ہیں؟

❀ فرمایا میں واپس شام جا رہا ہوں۔

☆...... کہنے لگیں: اِلٰی مَنْ تَتْرُكُنَا یَا اِبْرَاهِیْمَ؟ "اے ابراہیم! ہمیں کس کے پاس چھوڑ کے جا رہے ہو؟" اس وقت وہاں نہ کوئی مکان تھا اور نہ کوئی انسان تھا حضرت ابراہیم علیہ السلام آگے آگے جا رہے ہیں اور حضرت ہاجرہ پیچھے پیچھے چل رہی ہیں اور پوچھتی ہیں کہ ہمیں کس کے حوالے کر کے جا رہے ہو؟ جب جواب نہ ملا تو پھر خود ہی کہا......

☆...... آللّٰهُ اَمَرَكَ بِهٰذَا کیا آپ کو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے ہمیں یہاں چھوڑنے کا؟

❀ فرمایا ہاں!

☆...... کہنے لگیں: اِذًا لَّا یُضَیِّعُنَا "تب وہ ہمیں ضائع نہیں کرے گا؟" فِیْ اَمَانِ اللّٰهِ "اللہ تعالیٰ کی امان میں رہو۔"

حضرت ابراہیم علیہ السلام تشریف لے گئے۔ چند دنوں میں وہ کھجوریں اور پانی جو ان کے پاس تھا ختم ہو گیا۔ بھوک، پیاس نے ستایا تو صفا پہاڑی پر چڑھ کر اِدھر اُدھر دیکھا کوئی انسان نظر نہ آیا تو صفا اور مروہ کے درمیان جہاں پر سعی ہوتی ہے گہرائی تھی اور بارش کا پانی یہاں سے گزرتا تھا اور اب اوپر چھت ڈال دی گئی ہے اور پانی اب بھی وہیں نیچے سے گزرتا ہے۔ کیونکہ متبادل راستہ نہیں ہے۔ تو یہاں سے دوڑ کر مروہ پر چڑھیں اِدھر اُدھر دیکھا وہاں بھی کوئی آدمی نظر نہ آیا اس طرح سات چکر لگائے۔ عجیب حالت تھی دوڑ کر اسماعیل علیہ السلام کے پاس آتیں کہ بچہ زندہ بھی ہے یا نہیں؟ حضرت اسماعیل علیہ السلام ایڑیاں رگڑ رہے تھے غیبی آواز آئی پریشان نہ ہو۔

☆...... فرمایا غیبی آواز دینے والے کچھ ہماری مدد بھی کر؟

زم زم کا چشمہ

❀ اتنے میں حضرت جبرائیل علیہ السلام تشریف لائے جہاں حضرت اسماعیل علیہ السلام ایڑیاں رگڑ رہے تھے وہاں پاؤں مارا تو اللہ تعالیٰ نے آبِ زم زم کا چشمہ جاری فرما دیا۔ حضرت ہاجرہ علیہا السلام نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو پانی پلایا۔ مشکیزہ بھرا اور وہاں گڑھا بنا دیا تاکہ پانی جمع رہے۔

مکہ مکرمہ کی آبادی

قبیلہ بنو جرہم وہاں سے گزرتا رہتا تھا مگر پانی نہ ہونے کی وجہ سے وہاں ٹھہرتا نہیں تھا۔ اس دفعہ گزرے تو پانی کو دیکھ کر قریب ہوئے۔ اور دیکھا کہ وہاں پر ایک عورت اور بچہ بھی ہے۔ ان سے پوچھا کہ اگر ہمیں یہاں رہنے کی اجازت دے دو تو ہم بھی یہاں ٹھہر جائیں۔ انہوں نے رہنے کی اجازت دے دی۔ یہ کافی بڑا قافلہ تھا ان میں بچے، بوڑھے، جوان اور عورتیں شامل تھیں۔

بخاری شریف میں آتا ہے کہ ((تَعَلَّمَ الْعَرَبِيَّةَ إِسْمَاعِيلُ)). "حضرت اسماعیل علیہ السلام نے عربی انہی سے سیکھی۔" اس سے پہلے ان کی کون سی زبان تھی؟ تعین نہیں کر سکتے کہ عراق کی کُردی زبان تھی یا اس سے ملتی جلتی کوئی اور زبان تھی۔ بہر حال حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب ماں بیٹے کو وہاں چھوڑا تو دعا کی۔ اس کا ذکر ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ﴿وَإِذْ قَالَ إِبْرٰهِمُ﴾ اور جب کہا ابراہیم علیہ السلام نے ﴿رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا﴾ اے میرے رب! بنا دے اس کو ﴿بَلَدًا اٰمِنًا﴾ شہر امن والا ﴿وَّارْزُقْ أَهْلَهٗ﴾ اور رزق دے اس کے باشندوں کو ﴿مِنَ الثَّمَرٰتِ﴾ پھلوں سے (لیکن کن کو؟) ﴿مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ﴾ جو کوئی ان میں سے ایمان لائے ﴿بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ﴾ اللہ تعالیٰ اور آخرت کے دن پر۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی امامت

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے رزق کے ساتھ ایمان والوں کی تخصیص کیوں فرمائی؟ وجہ اس کی یہ ہے کہ گزشتہ درس میں یہ بیان ہو چکا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿إِنِّيْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ إِمَامًا﴾ بے شک میں تجھے لوگوں کا امام اور پیشوا بنانے والا ہوں

توحضرت ابراہیم علیہ السلام نے سوال کیا کہ ﴿وَمِنْ ذُرِّيَّتِي﴾ اور میری اولاد میں سے بھی پیشوا بنانا۔ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا: ﴿لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ﴾ کہ امامت کا عہدہ ظالموں کو نہیں پہنچتا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے خیال میں یہ بات آئی کہ جس طرح امامت کا عہدہ ظالموں کو نہیں مل سکتا ہوسکتا ہے رزق بھی ظالموں کو نہ ملے۔ اس لیے ایمان کی تخصیص کی۔ مگر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ رزق کا معاملہ جدا ہی ہے۔

﴿قَالَ وَمَنْ كَفَرَ﴾ فرمایا اللہ تعالیٰ نے اور جس نے کفر کیا اس کو بھی رزق دوں گا بلکہ رزق مسلمانوں کی نسبت زیادہ مل سکتا ہے ﴿فَأُمَتِّعُهُ قَلِيْلًا﴾ پس اس کو بھی فائدہ پہنچاؤں گا تھوڑا سا یعنی چند دن کیونکہ وہ دنیا میں کتنی دیر زندہ رہے گا۔ آخر مرنا ہے تو دنیا میں جتنا بھی فائدہ مل جائے قلیل ہے۔

دنیا کی زندگی کے بارے میں حضرت نوح علیہ السلام کا فرمان مبارک

حضرت نوح علیہ السلام کی عمر مبارک بقول حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے چودہ سو سال تھی۔ ساڑھے نو سو سال تو قوم کو تبلیغ کی نبوت ملنے سے پہلے بھی کچھ عمر تھی۔ اور طوفان نوح کے بعد کئی سو سال تک زندہ رہے جب وفات کا وقت آیا تو کسی نے پوچھا حضرت آپ دنیا میں بڑی دیر رہے ہیں دنیا کو کس طرح دیکھا؟ حضرت نوح علیہ السلام نے فرمایا کہ ''اس طرح سمجھو کہ ایک مکان ہے جس کے دو دروازے ہیں ایک سے داخل ہوا ہوں اور دوسرے سے نکل آیا ہوں''۔

چودہ سو سال کی عمر کو انھوں نے کس طرح معمولی سمجھا؟ مگر ہم اس کو بہت کچھ سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ موت میں ابھی بڑی دیر ہے۔ غفلت کے پردے پڑے ہوئے ہیں۔ نہ نیکی کی طرف دھیان ہے اور نہ توبہ کی طرف۔ حالانکہ دنیا کی زندگی بہت قلیل ہے۔ تو فرمایا کہ کافروں کو تھوڑا سا فائدہ پہنچاؤں گا۔

﴿ثُمَّ أَضْطَرُّهُ إِلٰى عَذَابِ النَّارِ﴾ پھر میں اس کو مجبور کر دوں گا دوزخ کے عذاب کی طرف ﴿وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ﴾ اور وہ بہت برا ٹھکانا ہے۔ اور یہ بات آپ حضرات کئی مرتبہ پڑھ چکے ہیں کہ نہ جنت دور ہے اور نہ دوزخ۔ بس آنکھیں بند ہونے کی دیر ہے۔ دفن ہونے سے پہلے فرشتے بھی نظر آنے لگ جائیں گے اور جنت اور دوزخ بھی نظر آئے گی۔ آگے اللہ تعالیٰ بیت اللہ کی تعمیر کا ذکر فرماتے ہیں۔

فرمایا ﴿وَإِذْ يَرْفَعُ إِبْرٰهِمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ﴾ اور جب اٹھا رہے تھے ابراہیم علیہ السلام بیت اللہ کی دیواریں ﴿وَإِسْمٰعِيْلُ﴾ اور اسماعیل علیہ السلام بھی۔ اینٹ یا پتھر رکھ کر اس کے اوپر گارا یا سیمنٹ لگا کر اوپر دوسری اینٹ یا پتھر جوڑا جاتا ہے اور دیوار بلند ہوجاتی ہے۔ اس کو ''قاعدہ'' کہتے ہیں۔ جس کو ہم لوگ رڈے سے تعبیر کرتے ہیں۔ تو جس وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام رڈے لگا کر بیت اللہ کی دیواروں کو اٹھا رہے تھے۔ اور اسماعیل علیہ السلام انہیں گارا یا پتھر دے رہے تھے اس وقت دونوں نے دعا کی:

﴿رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا﴾ اے ہمارے پروردگار! قبول فرما ہم سے اس خدمت کو۔

''کعبہ'' کا معنیٰ

''کعبہ'' کا معنیٰ ہے ''اَلْمَكَانُ الْمُرْتَفِعُ الْمُرَبَّعُ'' چار کونے والی اونچی جگہ حضرت نوح علیہ السلام کے طوفان کے بعد اس کا نشان مٹ گیا تھا۔ حضرت جبرائیل علیہ السلام نے لکیر کھینچ کر بتایا کہ یہ جگہ کعبۃ اللہ کی ہے۔ کعبۃ اللہ چوالیس مربع فٹ ہے یعنی ہر طرف سے چوالیس، چوالیس فٹ ہے۔ اور پچاس فٹ بلند ہے۔

مفسرین کرام رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہ السلام نے کعبۃ اللہ کی تعمیر یکم ذوالقعدہ کو شروع فرمائی اور پچیس ذوالقعدہ کو مکمل کردی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے راج (مستری) کا کام کیا اور حضرت اسماعیل علیہ السلام نے مزدور کا۔ قریبی پہاڑ سے پتھر لا کے دیتے تھے اور ابراہیم علیہ السلام جوڑتے تھے۔

اب کعبۃ اللہ حجر اور حطیم کی طرف سے گیارہ فٹ باہر نکال دیا گیا ہے۔ لہٰذا اس طرف سے تینتیس/ ۳۳ فٹ باقی رہ گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہوئی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اعلانِ نبوت سے پانچ سال پہلے کی بات ہے جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عمر مبارک پینتیس/ ۳۵ سال تھی۔ کعبۃ اللہ کو کچھ نقصان پہنچا تو اس دور کے لوگوں نے کعبۃ اللہ کو شہید کر کے دوبارہ تعمیر کرنے کا پروگرام بنایا۔

بیت اللہ کی دوبارہ تعمیر

''وہب بن عابد مخزومی'' جو اس وقت کعبۃ اللہ کے متولی تھے، نے اعلان کیا کہ ہمیں چندہ دو مگر ہم چوری، رشوت، سود و رکسی قسم کی حرام کی کمائی نہیں لیں گے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا گھر بنانا ہے۔ چنانچہ اتنی رقم اکٹھی نہ ہوسکی کہ مکمل عمارت تعمیر ہوسکتی۔ اس لیے اتنا حصہ چھوڑ دیا گیا اور رب تعالیٰ کی حکمتیں بھی ہوتی ہیں۔

بظاہر یہ حکمت معلوم ہوتی ہے کہ ہر آدمی کا جی چاہتا ہے کہ میں کعبۃ اللہ کے اندر داخل ہوں مگر ہر آدمی کے لیے دروازہ کون کھولتا ہے؟ تو اللہ تعالیٰ نے کمزوروں کے لیے وہ حصہ باہر نکلوا دیا کہ کمزور لوگ بھی کعبۃ اللہ کے اندر داخل ہوسکیں۔ اور ان لوگوں کی آرزو بھی پوری ہوجائے اور یاد رکھنا جس شخص نے حجر اور حطیم میں نماز پڑھی اس نے کعبہ کے اندر نماز پڑھی ہے۔

﴿اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ﴾ بے شک تو ہی ہے سننے والا جاننے والا۔ ﴿رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ﴾ بنادے ہم دونوں کو فرمانبردار اپنا ﴿وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ﴾ اور ہماری اولاد میں سے بھی ﴿اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ﴾ ایک امت جو فرمانبردار ہو تیری۔ اس دعا کے نتیجے میں ہمارا نام مسلمان ہے۔ قرآن کریم میں آتا ہے: ﴿هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ﴾ ابراہیم علیہ السلام نے ہی تمہارا نام مسلمان رکھوایا ہے۔ [الحج:۷۸]۔

﴿وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا﴾ اور دکھا ہم کو ہمارے احکام۔ یعنی ہمیں حج کے احکام بتادے کہ ہم نے کہاں ٹھہرنا ہے اور کیا کرنا

ہے؟ ﴿وَتُبْ عَلَيْنَا﴾ اور ہمارے اوپر رجوع فرما ﴿اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ﴾ بے شک تو ہی ہے رجوع فرمانے والا، مہربان۔ اور ﴿رَبَّنَا﴾ اے ہمارے رب! ﴿وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ﴾ اور بھیج ان میں ایک رسول ان ہی میں سے۔ چونکہ حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام دونوں نے مل کر دعا کی تھی اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دونوں کی نسل سے ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علاوہ دونوں کی نسل سے اور کوئی نہیں ہے۔

بعثت محمدی کے تین ظاہری اسباب

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ میرے دنیا میں آنے کے ظاہری سبب تین ہیں:

① ...... دَعْوَةُ اَبِيْ اِبْرَاهِيْمَ "حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا۔" جو انہوں نے ان الفاظ کے ساتھ کی تھی ﴿رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ﴾۔

② ...... دوم: وَبُشْرٰى عِيْسٰى حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے شاگردوں اور حواریوں کو میرے آنے کی بشارت سنائی تھی۔ قرآنِ کریم میں آتا ہے: ﴿وَمُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِي اسْمُهٗٓ اَحْمَدُ﴾ [الصف:٦] "اور خوش خبری دینے والا ہوں ایک رسول کی جو میرے بعد آئے گا اور اس کا نام احمد ہوگا۔"

بخاری شریف اور مسلم شریف کی روایت میں آتا ہے کہ ((اَنَا مُحَمَّدٌ وَ اَنَا اَحْمَدُ)) میں محمد بھی ہوں اور میں احمد بھی ہوں۔ یعنی میرا نام "محمد" بھی ہے اور "احمد" بھی ہے (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)۔ ((وَاَنَا الْحَاشِرُ الَّذِيْ يُحْشَرُ النَّاسُ عَلٰى قَدَمَيَّ)) میرا نام "حاشر" بھی ہے جس کے قدموں میں یعنی جھنڈے کے نیچے سارے لوگ جمع ہوں گے قیامت والے دن۔ ((وَ اَنَا الْعَاقِبُ الَّذِيْ لَا نَبِيَّ بَعْدِيْ)) اور میرا نام "عاقب" بھی ہے۔ "عاقب" کے معنیٰ "آخری" کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔

③ ...... تیسرا ظاہری سبب فرمایا "میری والدہ ماجدہ نے میری ولادت سے پہلے خواب دیکھا تھا کہ ان کے بدن سے ایک روشنی نکلی ہے جس سے شام کے محل روشن ہوگئے"۔ تو یہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دنیا میں تشریف لانے کے اسباب ہیں۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چار فرائض منصبی

اور ان میں سے ایک سبب حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا ہے۔ دعا میں یہ بھی مانگا:

① ...... ﴿يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ﴾ وہ تلاوت کرے ان پر تیری آیتیں یعنی ان کو پڑھ کر سنائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اول مخاطب چونکہ عربی تھے اور عربی ان کی مادری زبان تھی اس لیے قرآن کریم کے اکثر مضامین تو وہ محض سننے سے ہی سمجھ جاتے تھے۔

② ...... ﴿وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ﴾ اور تعلیم دے ان کو کتاب کی۔ قرآنِ کریم کی وہ آیات جن کو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم صرف سننے سے نہیں سمجھ سکتے تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کی تفسیر کر دیتے کہ اس کا یہ مطلب اور مفہوم ہے۔ مثلاً: پانچویں پارے میں آیت آتی ہے:

﴿مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ﴾ جو شخص برے عمل کرے گا اس کا بدلہ دیا جائے گا اس کی سزا پائے گا۔ یہ آیت کریمہ جب نازل ہوئی تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کہا حضرت! ہم میں سے کون سا آدمی ہے جس سے کوئی نہ کوئی برائی نہ ہو؟ معصوم تو صرف پیغمبر ہیں۔ ان کے بغیر کوئی معصوم تو نہیں ہے؟ لہٰذا چھوٹی بڑی غلطی انسان سے ہو ہی جاتی ہے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے یہ سمجھا کہ بدلہ قبر، برزخ اور آخرت میں ہوگا کہ جس کے نتیجے میں دوزخ جانا پڑے گا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ یہ مطلب نہیں ہے بلکہ ﴿يُّجْزَ بِهٖ﴾ کا مطلب ہے کہ مومن کو دنیا میں جو تکلیفیں آتی ہیں وہ اس کے گناہ کا کفارہ بن جاتی ہیں۔ مثلاً: بخار ہے، گرمی، سردی ہے، سردرد ہے، کمر درد ہے، گھٹنے کا درد ہے، پیٹ درد ہے، کوئی تکلیف ہو یہ گناہ کا کفارہ بن جاتی ہے۔ چلتے چلتے جیب سے رقم گر گئی یہ بھی گناہ کا کفارہ ہو گئی۔ حتیٰ کہ کانٹے کا چبھ جانا اور چیونٹی کا کاٹنا یہ بھی گناہ کا کفارہ ہے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تعلیم بھی دی اور قرآن کریم کا پڑھانا اور سمجھانا بڑا کام ہے۔

ابن ماجہ جو صحاح ستہ کی کتاب ہے اس میں روایت ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص قرآنِ کریم کی ایک آیت سیکھے گا (بغیر ترجمہ کے) اس کو سو نفل پڑھنے والے سے زیادہ ثواب ملے گا اور جو شخص ایک آیت کریمہ ترجمہ کے ساتھ سیکھے گا اس کو ہزار نفل پڑھنے والے سے زیادہ ثواب ملے گا۔ اور یاد رکھنا! قرآنِ کریم پڑھنا اور اس کا ترجمہ سیکھنا مردوں، عورتوں سب کے لئے ضروری ہے۔ پہلے تو خیر اس کے لئے کافی دقت ہوتی تھی اور اب الحمدللہ! ہر جگہ اس کا انتظام ہے صرف ہمارے ہاں (گکھڑ میں) عورتوں کی تعلیم کے پانچ چھ مدرسے ہیں۔ جہاں عورتیں ہی پڑھاتی ہیں۔ اور الحمدللہ! ان شاخوں میں وہ بچیاں پڑھاتی ہیں جنھوں نے براہِ راست سالہا سال مجھ سے پڑھا ہے۔ اب تو پڑھنے والیوں کی ضرورت ہے۔

③......آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا تیسرا کام ﴿وَالْحِكْمَةَ﴾ اور دانائی کی تعلیم دے یعنی حدیث کی۔ حدیث کے الفاظ بھی آپ نے بیان فرمائے اور معانی بھی سکھائے۔ ایک موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ انسان کے بدن میں تین سو ساٹھ جوڑ ہیں اور ہر، ہر جوڑ پر صدقہ لازم ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بڑے حیران ہوئے اور عرض کیا۔ حضرت! "مَنْ يُّطِيْقُ ذٰلِكَ" کس کو اس کی طاقت ہے کہ روزانہ تین سو ساٹھ صدقے کرے؟

صدقہ کا شرعی مفہوم

فرمایا "تم نے صدقے کا معنیٰ روپیہ دینا ہی سمجھا ہے۔ صرف یہ معنیٰ نہیں ہے بلکہ ایک دفعہ الحمدللہ کہا صدقہ ادا ہو گیا۔ "سبحان اللہ" کہا صدقہ ادا ہو گیا ہے۔ "اللہ اکبر" کہا، صدقہ ادا ہو گیا۔ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہا صدقہ ادا ہو گیا۔ "وعلیکم السلام" کہا صدقہ ادا ہو گیا۔ بلکہ ایک دوسرے کو ملتے وقت خندہ پیشانی سے پیش آنا یہ بھی صدقہ ہے۔ راستہ پر اینٹ پتھر پڑا ہوا جو لوگوں کے لیے تکلیف کا باعث ہے اس کو راستے سے ہٹا دینا بھی صدقہ ہے۔ ناواقف کو راستہ بتا دینا یا اس کو منزل تک پہنچا دینا بھی صدقہ ہے۔

نفلی نماز کی جماعت بدعت ہے!

ایک دفعہ درود شریف پڑھنے سے دس نیکیاں بھی ملتی ہیں اور ایک صدقہ بھی ادا ہو گیا۔ اور اگر یہ چاہتے ہو کہ تین سو ساٹھ صدقے ایک ہی کام میں آجائیں تو وہ بھی ہے کہ چاشت کی نماز پڑھو۔ چاشت کی دو رکعت پڑھو۔ اس میں تین سو ساٹھ صدقے ہیں۔ اور نماز چاشت کے لیے مسجد میں جانا بھی ضروری نہیں ہے۔ گھر میں پڑھ لو، دفتر میں، کارخانے میں، اپنی زمین میں جہاں کہیں بھی پڑھ سکتے ہو اور یہ اکیلے پڑھنی ہے۔ جماعت کے ساتھ نہیں کیونکہ نفلی نماز کے لئے جماعت کا اہتمام کرنا بڑا گناہ ہے۔ یہ بات تمام فقہاء کرام رحمہم اللہ نے لکھی ہے۔

اور حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ نفلی نماز میں اگر ایک دو آدمی ساتھ مل جائیں تو کراہت نہیں ہے اور اگر تیسرا ساتھ مل گیا تو مکروہ تنزیہی ہے اور چوتھا ساتھ مل گیا تو مکروہ تحریمی ہے یعنی حرام ہے۔ مردوں کے متعلق یہ حکم ہے۔

اور اب عورتوں نے یہ بدعت شروع کی ہے کہ صلوٰۃ التسبیح کے لیے اہتمام کرتی ہیں اور اس کے لیے باقاعدہ مسجدوں میں اعلان ہوتے ہیں یہ تمام بدعت ہیں۔ اور بدعت کا گناہ تو ہوتا ہے۔ ثواب نہیں ہوتا۔ کیونکہ بدعت سے دین کا نقشہ بگڑ جاتا ہے۔ اپنی جگہ تہجد پڑھو، اشراق پڑھو، صلوٰۃ التسبیح پڑھو، بڑی سعادت کی بات ہے۔ مگر اس کے لیے اہتمام کرنا بدعت ہے۔ اللہ تعالیٰ بدعت سے محفوظ فرمائے۔ تو خیر! صدقے کے متعلق بیان کر رہا تھا کہ صدقہ ضروری نہیں کہ رقم اور جنس کی صورت میں ہی ہو سکتا ہے بلکہ اللہ، اللہ کرنے میں بھی صدقہ ہے۔ اور ایک اور بات بھی سمجھ لیں کہ جاہلوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ صدقہ ''کالی سری'' کا نام ہے کہ ''کالی سری'' دینے سے سب بلائیں ٹل جاتی ہیں۔ یہ بالکل غلط بات ہے۔

صدقے کا مفہوم ہے، غریب کی ضرورت پوری کرنا، غریب کو ضرورت ہے کپڑے کی تم ''کالی سری'' اس کی جھولی میں ڈالتے ہو۔ وہ اس کا کیا کرے گا۔ اس کو جوتے کی ضرورت ہے۔ اس کے بچے پڑھتے ہیں ان کو کتابوں کی ضرورت ہے۔ تو یہ ضرورت ''کالی سری'' تو پوری نہیں کرے گی۔ لہٰذا جو اس کی ضرورت ہے وہ اس کو دو، چاول کی اس کو ضرورت ہے وہ اس کو دو۔ کپڑے کی ضرورت ہے تو کپڑا لا کر دو، بلکہ بہتر یہ ہے کہ نقد رقم دے دو اس کی جو ضرورت ہے وہ پوری کرے گا۔

④..... آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا چوتھا کام تھا ''تزکیۂ نفس'' فرمایا ﴿وَیُزَکِّیۡهِمۡ﴾ اور ان کو پاک کرے۔ حقیقتاً تزکیہ یعنی دلوں کی صفائی تو رب کرتا ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کا ذریعہ تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاقِ حسنہ اور تعلیم و تربیت سے لوگوں کے دل صاف ہو جاتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہوتے ہوئے وظائف کرنے کی ضرورت نہیں تھی مگر اب زنگ اتارنے کے لیے وظائف کرنے پڑتے ہیں۔ پیر کامل اپنے مریدوں کو اگر کوئی وظیفہ بتائے گا اور وہ توجہ کے ساتھ پڑھے گا تو یقیناً اثر ہوگا۔

﴿اِنَّکَ اَنۡتَ الۡعَزِیۡزُ الۡحَکِیۡمُ﴾ ''بے شک تو ہی ہے زبردست، حکمت والا۔''

یہ تھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا جو اللہ تعالیٰ نے قبول فرمائی۔

﴿وَمَنْ یَّرْغَبُ﴾ اور کون اعراض کرتا ہے ﴿عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ﴾ ابراہیم علیہ السلام کی ملت اور طریقے سے ﴿اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ﴾ مگر وہ شخص جس نے اپنے آپ کو بے وقوف بنالیا ﴿وَلَقَدِ اصْطَفَیْنٰهُ فِی الدُّنْیَا﴾ اور البتہ تحقیق ہم نے چن لیا ابراہیم علیہ السلام کو دنیا میں ﴿وَاِنَّهٗ فِی الْاٰخِرَةِ﴾ اور بے شک وہ آخرت میں ﴿لَمِنَ الصّٰلِحِیْنَ﴾ البتہ نیکوکاروں سے ہوگا ﴿اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗۤ﴾ جب فرمایا اس کو اس کے رب نے ﴿اَسْلِمْ﴾ جھک جا (میرے سامنے) ﴿قَالَ﴾ فرمایا (ابراہیم علیہ السلام نے) ﴿اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ﴾ جھک گیا میں رب العالمین کے سامنے ﴿وَوَصّٰى بِهَاۤ اِبْرٰهٖمُ﴾ اور وصیت کی (اس ملت پر قائم رہنے کی) ابراہیم علیہ السلام نے ﴿بَنِیْهِ﴾ اپنے بیٹوں کو ﴿وَیَعْقُوْبُ﴾ اور یعقوب (علیہ السلام نے بھی) ﴿یٰبَنِیَّ﴾ اے میرے بیٹو! ﴿اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى﴾ بے شک اللہ تعالیٰ نے چن لیا ہے ﴿لَكُمُ الدِّیْنَ﴾ تمھارے لیے دین ﴿فَلَا تَمُوْتُنَّ﴾ پس تم ہرگز نہ مرنا ﴿اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ﴾ مگر اس حالت میں کہ تم مسلمان ہو ﴿اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ﴾ کیا تم حاضر تھے ﴿اِذْ حَضَرَ یَعْقُوْبَ الْمَوْتُ﴾ جب حاضر ہوئی یعقوب (علیہ السلام) کے پاس موت ﴿اِذْ قَالَ لِبَنِیْهِ﴾ جب کہا انھوں نے اپنے بیٹوں سے ﴿مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْۢ بَعْدِیْ﴾ کس کی تم عبادت کرو گے میرے بعد؟ ﴿قَالُوْا﴾ کہا انھوں نے ﴿نَعْبُدُ اِلٰهَكَ﴾ ہم عبادت کریں گے تیرے معبود کی ﴿وَاِلٰهَ اٰبَآىِٕكَ﴾ اور تیرے باپ، دادا کے معبود کی ﴿اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِیْلَ وَاِسْحٰقَ﴾ جو ابراہیم اور اسماعیل اور اسحاق (علیہ السلام) تھے ﴿اِلٰهًا وَّاحِدًا﴾ جو ایک ہی الٰہ ہے ﴿وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ﴾ اور ہم اسی کے فرماں بردار ہیں ﴿تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ﴾ یہ ایک گروہ تھا تحقیق وہ گزر گیا ﴿لَهَا مَا كَسَبَتْ﴾ اس کے لیے ہے جو اس نے کمایا ﴿وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ﴾ اور تمھارے لیے ہے جو تم نے کمایا ﴿وَلَا تُسْـَٔلُوْنَ﴾ اور تم سے سوال نہیں کیا جائے گا ﴿عَمَّا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ﴾ ان چیزوں کے بارے میں جو وہ کرتے تھے ﴿وَقَالُوْا﴾ اور کہا انھوں نے ﴿كُوْنُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى﴾ ہو جاؤ تم یہودی یا نصرانی ﴿تَهْتَدُوْا﴾ ہدایت پا جاؤ گے ﴿قُلْ﴾ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کہہ دیں ﴿بَلْ مِلَّةَ اِبْرٰهٖمَ حَنِیْفًا﴾ بلکہ ہم ملت ابراہیمی کی پیروی کریں گے جو ایک طرف ہونے والے تھے ﴿وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ﴾ اور نہیں تھے وہ شرک کرنے والوں میں سے۔

ربط

اس سے پہلے رکوع میں کعبۃ اللہ کی تعمیر کا ذکر تھا کہ کعبۃ اللہ کو حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہ السلام نے مل کر تعمیر کیا اور پچیس دن میں مکمل کر دیا۔ بعض مفسرین کرام رحمہم اللہ نے لکھا ہے کہ کعبۃ اللہ کا درجہ زمین کے تمام ٹکڑوں سے بلند ہے۔

سوائے زمین کے اس ٹکڑے کے کہ جہاں آنحضرت ﷺ مدفون ہیں کہ اس کا درجہ کعبۃ اللہ، عرش، کرسی، حتیٰ کہ لوح سے بھی بلند ہے۔ تو کعبۃ اللہ کی تعمیر اور ابراہیم علیہ السلام کے کارناموں کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جو شخص ان کے طریقہ سے چہرہ پھیرے گا وہ بے وقوف آدمی ہے۔

ملت ابراہیمی کی پیروی

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ﴿وَمَنْ يَّرْغَبُ﴾ اور کون اعراض کرتا ہے ﴿عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ﴾ ابراہیم علیہ السلام کی ملت اور طریقے سے ﴿اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ﴾ مگر وہ شخص جس نے اپنے آپ کو بے وقوف بنا لیا۔ ظاہر بات ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کی ملت اس مذہب کا نام تھا جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کیا گیا تھا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس پر عمل کیا اور اس کو اپنایا تو اس مذہب سے وہی شخص اعراض کرے گا، چہرہ پھیرے گا جو بے وقوف ہوگا۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ﴿وَلَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا﴾ اور البتہ تحقیق ہم نے چن لیا ابراہیم (علیہ السلام) کو دنیا میں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے بہت بلند مقام اور فضیلت عطاء فرمائی ہے۔ البتہ متعدد دلائل سے ثابت ہے کہ حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کو فضیلت کلی یعنی تمام کائنات پر فضیلت حاصل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو کمالات آنحضرت ﷺ کو عطاء فرمائے ہیں وہ اور کسی کو نہیں عطا فرمائے۔ خصوصاً آپ ﷺ کا خاتم النبیین ہونا بہت بلند مقام ہے۔ آپ ﷺ کی فضیلت کلی کی وہ دلیلیں نہ ہوتیں تو یہ آیت کریمہ اور اس قسم کی دوسری آیات بتاتی ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا درجہ سب سے بلند ہے۔ مگر آپ ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے اتنے کمالات عطا فرمائے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی پیغمبر کو نہیں عطا فرمائے۔ لہٰذا آنحضرت ﷺ کا مقام تمام مخلوقات سے بلند ہے۔ اور آپ ﷺ کے بعد مخلوق میں سب سے بلند مقام ابراہیم کا ہے۔

جن علماء کرام نے عقائد پر کتابیں لکھی ہیں وہ لکھتے ہیں کہ ”حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام کا درجہ ہے وہ بڑے رتبے اور شان والے پیغمبر تھے“۔ تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کا درجہ حضور ﷺ کے بعد سب سے بلند ہے۔

پیغمبر فرشتوں سے افضل ہیں

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ﴿وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ﴾ اور بے شک وہ آخرت میں البتہ نیکوکاروں میں سے ہوگا۔ پیغمبر سے بڑھ کر صالح کون ہو سکتا ہے؟ پھر وہ پیغمبر جو پیدائش سے لے کر وفات تک امتحانوں میں ہی رہا ہو جس کی تفصیل قرآنِ کریم میں موجود ہے۔ اور یہ بھی یاد رکھنا! کہ پیغمبروں کا درجہ اور مقام فرشتوں سے بلند ہے۔ اگرچہ فرشتے نوری مخلوق ہیں اور معصوم عن الخطاء ہیں اور پیغمبر انسان، بشر اور آدمی تھے لیکن اللہ تعالیٰ نے نبوت اور رسالت کا منصب اتنا بلند رکھا ہے کہ فرشتوں کا درجہ اور مقام پیغمبروں سے کم ہے اور اسی لیے انسان مجموعی لحاظ سے اشرف المخلوقات ہے کہ انسانوں میں اللہ تعالیٰ کے رسول آئے ہیں ان کی وجہ سے انسان کا پلہ بھاری ہو گیا ہے اور مجموعی لحاظ سے فرشتے انسان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔

فرمایا ﴿اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗۤ اَسْلِمْ﴾ جب فرمایا اس کو اس کے رب نے جھک جا میرے سامنے ﴿قَالَ﴾ تو ابراہیم علیہ السلام نے بغیر کسی قیل وقال کے کہا ﴿اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ﴾ جھک گیا میں رب العالمین کے سامنے، فرمانبردار ہوگیا رب العالمین کا جو سارے جہانوں کا پالنے والا ہے۔

(۱)...... پہلا حکم یہ تھا کہ باپ کا ادب واحترام ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے اس کو تبلیغ کرو اور توحید کی دعوت دو اسی لیے ابراہیم علیہ السلام نے جب بھی باپ سے بات کی تو یَآ اَبَتِ، یَآ اَبَتِ، یَآ اَبَتِ. اے میرے ابا جی! اے میرے ابا جی! کہہ کر بڑے اچھے اور پیارے انداز میں تبلیغ کی۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی کہ باپ بت بنانے والا اور بیٹا بت گرانے والا۔ باپ بت گر اور بیٹا بت شکن۔ پھر آخر دم تک سمجھانے میں کوئی کمی نہیں کی اور ادب واحترام بھی ملحوظ رکھا۔

(۲)...... پھر دوسرا حکم اللہ تعالیٰ نے یہ دیا کہ دوسرے لوگوں کو بھی تبلیغ کر اور واضح طریقہ سے شرک کی تردید کر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ساری قوم کے علاوہ وقت کے ظالم اور جابر بادشاہ نمرود بن کنعان جو بت پرستوں کا پیر ومرشد تھا کو بھی تبلیغ کی اور اس کے سامنے کلمہ حق بیان کیا۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ساری قوم کی مخالفت مول لی۔ بادشاہ کی مخالفت اور باپ کی مخالفت برداشت کی اور نبوت ملنے کے بعد اسّی / ۸۰ سال تبلیغ کرتے رہے، ہمت نہیں ہاری۔ آپ علیہ السلام کو پتھر مارے گئے، گالیاں دی گئیں، قید کیا گیا، آگ میں ڈالا گیا اور بہت کچھ ہوا مگر ﴿اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ﴾ میں فرمانبردار ہوگیا رب العالمین کے سامنے۔

(۳)...... پھر رب تعالیٰ کی طرف سے حکم آیا کہ ہجرت کر کے شام چلے جاؤ۔ پورے ملک عراق میں صرف تین موحد تھے:

(۱) ابراہیم علیہ السلام۔ (۲) ان کی اہلیہ حضرت سارا علیہا السلام۔ (۳) اور بھتیجے حضرت لوط بن حاران بن آزر۔

کوئی چوتھا آدمی ساتھ نہیں ملا۔ دورانِ سفر آزمائشیں آئیں پھر حضرت ہاجرہ علیہا السلام کے ساتھ نکاح ہوا حضرت اسماعیل علیہ السلام پیدا ہوئے۔ تو حکم ہوا کہ بیوی کو بتائے بغیر ان کو ساتھ لے جاؤ اور مکہ مکرمہ چھوڑ کے واپس آجاؤ۔ دمشق سے مکہ مکرمہ انگریزی میلوں کے حساب سے تقریباً پندرہ سو میل کا فاصلہ ہے سڑکیں نہیں، آمد ورفت کے ذرائع نہیں، جنگلات سے گزرنا ہے۔ دشوار گزار سفر کر کے جب مکہ مکرمہ پہنچے تو رب تعالیٰ نے فرمایا:

''یہ جو درخت کھڑا ہے اس کے نیچے ان کو بٹھا کر واپس چلے جاؤ''۔

دیکھو! کتنا بڑا امتحان ہے کہ جواں سال بیوی، دودھ پیتا بچہ، اور وہاں چھوڑنا ہے کہ جہاں نہ آبادی، نہ کوئی مکان، نہ کوئی انسان، نہ کھانے کا انتظام، نہ پینے کا صرف رب کا حکم ہے اور مانتے چلے جارہے ہیں۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام کی قربانی اور شیطان کو کنکریاں مارنا ؟

پھر وہی بچہ جب کام کاج کی عمر کو پہنچتا ہے تو رب تعالیٰ حکم دیتے ہیں کہ اس کو ذبح کردو۔ کوئی قیل وقال نہیں کی کہ ''اے

پروردگار! ایک ہی تو بچہ ہے اس کو بھی ذبح کردوں رب تعالیٰ کے حکم پر عمل کرنے کے لئے تیار ہیں"۔ ابلیس لعین نے بڑے حیلے بہانے کیے، پھسلانے کی کوشش کی۔ مگر اس کو پتھر مارے کہ تو دور ہو جا یہ حاجی حضرات جمرات کی رمی کرتے ہیں۔ جمرہ عقبیٰ، جمرہ اُولیٰ اور جمرہ ثانیہ شیطانوں کو مارتے ہیں۔ یہ وہی جگہیں ہیں جہاں شیطان حضرت ابراہیم علیہ السلام کو پھسلانے کے لیے آیا تھا۔ اور انہوں نے اس کو پتھر مارے تھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام جب حضرت اسماعیل علیہ السلام کو ذبح کرنے کے لیے منیٰ کی طرف لے جارہے تھے تو شیطان بڑا بزرگ بن کر آیا اور کہنے لگا:

✿...... حضرت! اس کو لے کر کہاں جارہے ہو؟

✿...... فرمایا میں اس بچے کو رب تعالیٰ کی رضا کے لیے ذبح کرنے کے لیے لے جارہا ہوں۔

✿...... کہنے لگا تمہارے کتنے بچے ہیں؟

✿...... فرمایا: یہی ایک ہے۔

✿...... تو کہنے لگا اس کو ذبح کرنا گوارا کرلو گے؟

✿...... فرمایا رب تعالیٰ کا حکم ہے۔

✿...... کہنے لگا رب تعالیٰ کا حکم سر آنکھوں پر مگر اس کا مطلب سمجھنا چاہیے۔ اس میں کوئی اور قسم کا اشارہ ہوگا۔ یعنی ذبح کرنا مقصود نہیں ہوگا کچھ اور مراد ہوگی۔

✿...... حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ اکبر کہہ کر شیطان کو سات کنکر مارے مگر وہ تو شیطان خبیث تھا آگے جا کر پھر سامنے آگیا اور کہنے لگا کہ:

✿...... رب تعالیٰ کے حکم میں تو کوئی قیل وقال نہیں ہے مگر سوچو اس کا مفہوم کوئی اور ہوگا؟

✿...... پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس کو اللہ اکبر کہہ کر سات کنکر مارے کہ اللہ تعالیٰ سب سے بڑا ہے اس کا حکم ماننا ہے تو باز آجا۔

✿...... پھر تیسری مرتبہ سامنے آکر کھڑا ہوگیا اور وہی بات دوہرائی۔

✿...... پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ اکبر کہہ کر سات کنکریاں ماریں۔

یہ رمی جمار حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سنت ہے اور حکماً واجب ہے۔ اگر کسی سے رہ جائے تو قربانی دینی پڑتی ہے۔ اگر کوئی معذور ہے، بہت بوڑھا ہے یا وہاں جا کر بیمار ہوگیا ہے کہ خود رمی نہیں کرسکتا تو اس کو نائب بنانے کی اجازت ہے مگر وہ نائب پہلے اپنی رمی کرے گا اور پھر اس کی طرف سے رمی کرے گا۔

انبیاء علیہم السلام اور علم غیب

اے نوجوانو! یہاں ایک اور بات بھی سمجھ لو کہ غلط کار لوگ کہتے ہیں کہ پیغمبر سب کچھ جانتے ہیں۔ اگر پیغمبر سب کچھ

جانتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام جب بیٹے کو ذبح کرنے کے لیے لے جارہے تھے تو ان کو معلوم تھا کہ اسماعیل علیہ السلام کی قربانی نہیں ہوگی اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کو بھی علم تھا کہ میں نے ذبح نہیں ہونا پھر تو معاف کرنا یہ ایک ڈرامہ ہی تھا۔ (معاذ اللہ تعالیٰ)۔ اور باپ بیٹے نے ایک کھیل کھیلنا تھا جس کی حقیقت کچھ نہیں تھی۔ معاذ اللہ تعالیٰ۔ تو پھر قربانی کا نتیجہ تو کوئی نہ ہوا۔ حالانکہ یہ حقیقت ہے کہ باپ حقیقتاً قربانی کرنے کے لیے جارہا تھا اور بیٹا حقیقتاً قربان ہونے کے لیے جارہا تھا اور اسی وجہ سے باپ بیٹے کی عظمت دنیا والوں پر نمایاں ہوئی۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے باقی بیٹے

﴿وَوَصّٰى بِهَآ اِبْرٰهٖمُ﴾ "ھَا" ضمیر "مِلَّتْ" کی طرف لوٹ رہی ہے۔ معنیٰ ہوگا اور وصیت کی ابراہیم علیہ السلام نے اس ملت پر قائم رہنے کی ﴿بَنِيْهِ﴾ اپنے بیٹوں کو۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پانچ بیٹوں کا ذکر ملتا ہے دو کا قرآنِ کریم میں حضرت اسماعیل اور حضرت اسحاق علیہ السلام اور تین کا ذکر تاریخ اور توراۃ میں آتا ہے۔ حضرت مدین، حضرت مدائن اور حضرت قیدار علیہم السلام چونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بیٹی کوئی نہیں تھی اس لیے بیٹوں کو نصیحت فرمائی کہ اسلام نہ چھوڑنا۔

﴿وَيَعْقُوْبُ﴾ اور یعقوب علیہ السلام نے بھی اپنے بیٹوں کو وصیت فرمائی کہ اسلام پر قائم رہنا۔ حضرت یعقوب علیہ السلام حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پوتے تھے ان کو اللہ تعالیٰ نے بارہ بیٹے عطا فرمائے تھے، بیٹی ان کی بھی نہیں تھی اس لیے انہوں نے بھی اپنے بیٹوں کو نصیحت فرمائی: ﴿يٰبَنِيَّ﴾ اے میرے بیٹو! ﴿اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّيْنَ﴾ بے شک اللہ تعالیٰ نے چن لیا ہے تمہارے لیے دین ﴿فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ﴾ پس تم ہرگز نہ مرنا مگر اس حالت میں کہ تم مسلمان ہو۔ یعنی اسلام پر قائم رہنا۔

نیکی کا اختیار اور توفیق

پہلے لوگوں کی یہی وصیتیں ہوتی تھیں کہ اسلام پر قائم رہنا، اعمال اچھے کرنا، آخرت کا فکر کرنا اپنے ارادے کو درست رکھنا۔ کیونکہ نیکی، بدی میں ارادے کا دخل ہے تم جیسا ارادہ کرو گے اللہ تعالیٰ ویسی توفیق عطا فرمائیں گے۔ بندہ مختار ہے مجبور نہیں ہے۔ مثلاً: تم نے اپنے گھر سے مسجد میں آنے کا ارادہ کیا اللہ تعالیٰ نے توفیق دے دی اور تم آگئے۔ جو نہیں آئے ان کو اللہ تعالیٰ نے جبراً تو نہیں روکا کہ تم مسجد میں نہیں آسکتے انہوں نے آنے کا ارادہ نہیں کیا وہ اس وقت گھروں میں سوئے ہوئے ہیں۔ اور ایسے بدبخت بھی ہوں گے جنہوں نے اٹھ کر سحری بھی نہیں کھائی ہوگی اور روزے بھی نہیں رکھے ہوں گے۔ ان کی نیت وہ تھی لہٰذا وہ اپنی نیت پوری کررہے ہیں۔ انسان نیکی بدی کرنے میں مختار ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ﴿فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ﴾ ''پس جس کا جی چاہے ایمان لائے اور جس کا جی چاہے کفر اختیار کرے۔'' اور دوسرے مقام پر آتا ہے ﴿وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ﴾ ''اور ہم نے اس کو دونوں راستے دکھا دیے۔'' تو

رب تعالیٰ نے نیکی، بدی کے دونوں راستے دکھا دیے ہیں پھر جس راہ پر کوئی چلے گا ﴿نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى﴾ ''پھر پھیر دیں گے ہم اس کو اس طرف جس طرف وہ پھرے گا۔'' یعنی جس راہ کا کوئی ارادہ کرے گا اللہ تعالیٰ اس کو اس کی توفیق دے دیں گے۔ مطلب یہ ہے کہ بندے کو ارادے کا اختیار دیا ہے، مجبور محض نہیں ہے۔

حضرت یعقوب علیہ السلام کی وصیت

تو یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹوں کو وصیت فرمائی کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے دین کو چنا ہے۔ پس تم اسلام پر قائم رہنا انہوں نے تو اسلام پر قائم رہنے کی وصیت فرمائی تھی برخلاف اس کے یہودی یہ دعویٰ کرتے تھے کہ یعقوب علیہ السلام جب دنیا سے رخصت ہو رہے تھے تو انہوں نے اپنی اولاد کو وصیت کی تھی کہ یہودیت یعنی یہودی مذہب نہ چھوڑنا اور ان کا یہ پروپیگنڈہ صدیوں سے چلا آ رہا تھا۔ اس کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ﴾ کیا تم حاضر تھے ﴿اِذْ حَضَرَ يَعْقُوْبَ الْمَوْتُ﴾ جب حاضر ہوئی یعقوب علیہ السلام کے پاس موت؟ یعنی تم جو یہ دعویٰ کرتے ہو کہ انہوں نے یہودیت کی وصیت فرمائی تھی تو کیا جب ان کو موت آئی تھی اس وقت تم موجود تھے جو تمہیں معلوم ہے کہ انہوں نے یہ وصیت فرمائی تھی۔ اور تمہاری یہودیت تو یہ ہے کہ ﴿اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ [التوبہ: ۳۱] انہوں نے بنا لیا اپنے مولویوں اور پیروں کو رب تعالیٰ کے سوا۔ تو انہوں نے مولویوں اور پیروں کو رب بنانے کی وصیت کی تھی؟ (معاذ اللہ تعالیٰ)۔ اب تم سنو کہ انہوں نے کیا وصیت فرمائی تھی جب موت حاضر ہوئی۔

فرمایا اللہ تعالیٰ نے ﴿اِذْ قَالَ لِبَنِيْهِ﴾ جب کہا انہوں (یعقوب علیہ السلام) نے اپنے بیٹوں سے ﴿مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْۢ بَعْدِيْ﴾ کس کی تم عبادت کرو گے میرے بعد؟ ﴿قَالُوْا﴾ کہا انہوں بیٹوں نے ﴿نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَاِلٰهَ اٰبَآئِكَ﴾ ہم عبادت کریں گے تیرے معبود کی اور تیرے باپ، دادا کے معبود کی ﴿اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ﴾ جو ابراہیم اور اسماعیل اور اسحاق (علیہم السلام) تھے، ان کے الٰہ کی عبادت کریں گے ﴿اِلٰهًا وَّاحِدًا﴾ جو ایک ہی الٰہ ہے۔

تو یعقوب علیہ السلام نے تو مرتے وقت توحید کی وصیت فرمائی تھی اور ظالمو! تم نے اپنے مولویوں اور پیروں کو رب بنا لیا ہے۔ تمہاری اس یہودیت کے ساتھ ان کا کیا تعلق ہے؟ اور یعقوب علیہ السلام کے بیٹوں نے یہ بھی کہا: ﴿وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ﴾ اور ہم اسی کے فرمانبردار ہیں۔ یعنی ہم مسلمان ہی مریں گے اور اسلام پر ہی قائم رہیں گے اور تم کہتے ہو کہ یہودیت کی وصیت کی تھی۔

فرمایا ﴿تِلْكَ اُمَّةٌ﴾ یہ ایک گروہ تھا حضرت ابراہیم، حضرت اسماعیل اور حضرت اسحاق علیہم السلام کا کہ ﴿قَدْ خَلَتْ﴾ تحقیق وہ گزر گیا، دنیا سے چلا گیا ﴿لَهَا مَا كَسَبَتْ﴾ اس کے لیے ہے جو اس نے کمایا ﴿وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ﴾ اور تمہارے لیے ہے جو تم نے کمایا ﴿وَلَا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ﴾ اور تم سے سوال نہیں کیا جائے گا جو وہ کرتے تھے۔

اور چونکہ ابراہیم علیہ السلام کی شخصیت بین الاقوامی طور پر مسلم تھی اس لیے یہودی کہتے تھے کہ وہ یہودی تھے لہٰذا تم یہودی بن جاؤ اور عیسائی کہتے تھے وہ عیسائی تھے لہٰذا تم عیسائی بن جاؤ اور مشرک کہتے تھے وہ ہمارے تھے ہر ایک فرقہ ان کو اپنے ساتھ

جوڑنے کی کوشش کرتا تھا اللہ تعالیٰ نے سب کی تردید فرمائی ہے۔

فرمایا اللہ تعالیٰ نے ﴿وَ قَالُوْا﴾ اور کہا انہوں نے ﴿كُوْنُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰی﴾ ہو جاؤ تم یہودی یا نصرانی ﴿تَهْتَدُوْا﴾ ہدایت پا جاؤ گے۔ اور قرآن کریم بڑی واضح کتاب ہے اس کے تیسرے پارے کے پندرہویں رکوع میں ہے:

﴿یٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ﴾ ''اے اہل کتاب! یہودیو اور نصرانیو! ﴿لِمَ تُحَآجُّوْنَ فِیْۤ اِبْرٰهِیْمَ﴾ تم کیوں جھگڑا کرتے ہو ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں؟ کہ تم کہتے ہو کہ یہودی تھے یا نصرانی تھے ﴿وَمَاۤ اُنْزِلَتِ التَّوْرٰىةُ وَ الْاِنْجِیْلُ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِهٖ﴾ حالانکہ نہیں اتاری گئی توراۃ اور انجیل مگر ان کے بعد۔'' اور تورات کا مذہب یہودی تھا اور انجیل کا مذہب نصرانیت تھا اور توراۃ ابراہیم علیہ السلام سے تقریباً ڈیڑھ ہزار سال بعد نازل ہوئی ہے اور انجیل تقریباً ساڑھے تین ہزار سال بعد نازل ہوئی ہے تو وہ یہودی عیسائی کس طرح بن گئے؟ بڑی عجیب منطق ہے کہ کتاب اور شریعت بعد میں نازل ہوئی اور ان کو ماننے والا پہلے آ کے چلا گیا۔

اللہ تعالیٰ کی ذات میں جھگڑا

﴿اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ﴾ کیا تم اتنی موٹی بات بھی نہیں سمجھتے؟ ﴿هٰۤاَنْتُمْ هٰۤؤُلَآءِ حَاجَجْتُمْ فِیْمَا لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ﴾ خبردار! تم نے جھگڑا کیا اس چیز میں جس کا تمہیں تھوڑا بہت کچھ علم بھی ہے ﴿فَلِمَ تُحَآجُّوْنَ فِیْمَا لَیْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ﴾ پس کیوں جھگڑا کرتے ہو اس چیز میں جس کے بارے میں تمہیں علم نہیں ہے؟ ﴿وَاللّٰهُ یَعْلَمُ﴾ اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے ﴿وَ اَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ اور تم نہیں جانتے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام موحد اور مسلم تھے

جو جانتا ہے وہ کہہ رہا ہے ﴿مَا كَانَ اِبْرٰهِیْمُ یَهُوْدِیًّا وَّ لَا نَصْرَانِیًّا﴾ ابراہیم (علیہ السلام) نہ یہودی تھے اور نہ عیسائی ﴿وَّ لٰكِنْ كَانَ حَنِیْفًا مُّسْلِمًا﴾ اور لیکن تھے وہ حنیف یعنی ہر طرف سے ہٹ کر ایک طرف لگنے والے مسلمان اور موحد۔ اور مشرکو تم بھی سن لو ﴿وَ مَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ﴾ اور نہیں تھے وہ شرک کرنے والوں میں سے۔ اب بتاؤ کہ تم کس طرح کہتے ہو کہ یہودی ہو جاؤ یا نصرانی ہو جاؤ تو ہدایت پا جاؤ گے؟

﴿قُلْ﴾ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کہہ دیں ﴿بَلْ مِلَّةَ اِبْرٰهٖمَ حَنِیْفًا﴾ بلکہ ہم ملت ابراہیمی کی پیروی کریں گے جو ایک طرف ہونے والے تھے، موحد تھے، نہ یہودی تھے، نہ عیسائی تھے اور نہ مشرک تھے۔

﴿وَ مَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ﴾ اور نہیں تھے وہ شرک کرنے والوں میں سے۔ وہ موحد تھے اور اللہ تعالیٰ نے ان کو بڑا بلند مقام عطا فرمایا تھا ہم تو ان کی ملت کی اتباع کریں گے۔

﴿قُوْلُوْٓا﴾ اور (اے مومنو!) کہہ دو ﴿اٰمَنَّا بِاللّٰهِ﴾ ایمان لائے ہم اللہ تعالیٰ پر ﴿وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا﴾ اور اس چیز پر جو نازل کی گئی ہماری طرف ﴿وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ﴾ اور اس پر جو نازل کی گئی ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب (علیہم السلام) اور ان کی اولاد در اولاد کی طرف ﴿وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى﴾ اور اس چیز پر (بھی ایمان لائے) جو دی گئی موسیٰ اور عیسیٰ (علیہما السلام) کو ﴿وَمَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ﴾ اور (اس چیز پر بھی) جو دی گئی پیغمبروں کو ﴿مِنْ رَّبِّهِمْ﴾ ان کے رب کی طرف سے ﴿لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ﴾ نہیں فرق کرتے ہم ان پیغمبروں میں سے کسی ایک کے درمیان ﴿وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ﴾ اور ہم اسی کے فرمان بردار ہیں ﴿فَاِنْ اٰمَنُوْا﴾ پس اگر یہ لوگ ایمان لے آئیں ﴿بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ﴾ جیسا کہ تم ایمان لائے ہو اس کے ساتھ ﴿فَقَدِ اهْتَدَوْا﴾ پس تحقیق یہ ہدایت پا جائیں گے ﴿وَاِنْ تَوَلَّوْا﴾ اور اگر انہوں نے روگردانی کی ﴿فَاِنَّمَا هُمْ فِيْ شِقَاقٍ﴾ پس پختہ بات ہے وہ ضد اور مخالفت میں ہیں ﴿فَسَيَكْفِيْكَهُمُ اللّٰهُ﴾ پس عن قریب اللہ تعالیٰ کفایت کرے گا آپ کے لیے ان سے ﴿وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ﴾ اور وہی سننے والا، جاننے والا ہے ﴿صِبْغَةَ اللّٰهِ﴾ اللہ تعالیٰ کا رنگ (اختیار کرو) ﴿وَمَنْ اَحْسَنُ﴾ اور کون بہتر ہے ﴿مِنَ اللّٰهِ﴾ اللہ تعالیٰ سے ﴿صِبْغَةً﴾ رنگ (کے لحاظ سے) ﴿وَّنَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ﴾ اور ہم اسی (اللہ تعالیٰ) کی عبادت کرنے والے ہیں ﴿قُلْ﴾ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) فرما دیں ﴿اَتُحَآجُّوْنَنَا فِي اللّٰهِ﴾ کیا تم ہمارے ساتھ جھگڑا کرتے ہو اللہ تعالیٰ کے بارے میں؟ ﴿وَهُوَ رَبُّنَا﴾ حالانکہ وہی ہمارا رب ہے ﴿وَرَبُّكُمْ﴾ اور تمہارا بھی رب ہے ﴿وَلَنَآ اَعْمَالُنَا﴾ اور ہمارے لیے ہمارے اعمال ہیں ﴿وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ﴾ اور تمہارے لیے تمہارے اعمال ہیں ﴿وَنَحْنُ لَهٗ مُخْلِصُوْنَ﴾ اور ہم تو خالص اسی کے ہیں ﴿اَمْ تَقُوْلُوْنَ﴾ کیا تم کہتے ہو؟ ﴿اِنَّ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطَ﴾ کہ بے شک ابراہیم اور اسماعیل اور اسحاق اور یعقوب (علیہم السلام) اور ان کی اولاد در اولاد ﴿كَانُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى﴾ یہودی تھے یا نصرانی۔ ﴿قُلْ﴾ آپ فرما دیں ﴿ءَاَنْتُمْ اَعْلَمُ اَمِ اللّٰهُ﴾ کیا تم زیادہ جانتے ہو یا اللہ تعالیٰ (زیادہ جانتا ہے) ﴿وَمَنْ اَظْلَمُ﴾ اور اس سے بڑا کون ظالم ہے ﴿مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً﴾ جس نے چھپائی گواہی ﴿عِنْدَهٗ مِنَ اللّٰهِ﴾ جو اس کے پاس ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ﴿وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ﴾ اور نہیں ہے اللہ تعالیٰ غافل ﴿عَمَّا تَعْمَلُوْنَ﴾ ان کاموں سے جو تم کرتے ہو ﴿تِلْكَ اُمَّةٌ﴾ یہ ایک گروہ تھا ﴿قَدْ خَلَتْ﴾ تحقیق وہ گزر گیا ﴿لَهَا مَا كَسَبَتْ﴾ ان کے لیے ہے جو انہوں نے کمایا ﴿وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ﴾ اور تمہارے لیے ہے جو تم نے کمایا ﴿وَلَا تُسْـَٔلُوْنَ﴾ اور تم سے نہیں پوچھا جائے گا ﴿عَمَّا

﴿كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ﴾ ان کاموں کے بارے میں جو وہ کرتے تھے۔

ربط

یہودی مسلمانوں کو کہتے تھے یہودی ہو جاؤ کہ نجات یہودیت میں ہے اور عیسائی کہتے تھے کہ عیسائی ہو جاؤ کہ نجات عیسائیت میں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو کہا تم کہو کہ ہم سب کو مانتے ہیں جو موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوا اور جو عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوا اور جو دوسرے انبیاء علیہم السلام پر نازل ہوا سب کو مانتے ہیں کہ وہ اپنے اپنے زمانے میں برحق تھا لیکن آخری پیغمبر حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تشریف لانے کے بعد پہلے تمام پیغمبروں کی شریعتیں منسوخ ہو گئی ہیں۔ اب ہدایت اور نجات صرف آخری پیغمبر کی اتباع میں ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:

﴿قُوْلُوْٓا﴾ اور (اے مومنو!) کہہ دو ﴿اٰمَنَّا بِاللّٰهِ﴾ ایمان لائے ہم اللہ تعالیٰ پر ﴿وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا﴾ اور اس چیز پر جو نازل کی گئی ہماری طرف ﴿وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ﴾ اور اس پر جو نازل کی گئی ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب علیہم السلام اور ان کی اولاد در اولاد کی طرف۔

”سبط“ کا معنی

”سبط“ کا معنی ہے ”اولاد کی اولاد اور آگے ان کی اولاد“ یعنی یعقوب علیہ السلام کے بیٹے یوسف علیہ السلام پیغمبر ہوئے پھر آگے ان کی نسل میں اور جتنے پیغمبر تشریف لائے ان پر جو کچھ نازل ہوا ہم سب کو مانتے ہیں۔

﴿وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى﴾ اور اس چیز پر (بھی ایمان لائے) جو دی گئی موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام کو یعنی ان پر جو کچھ نازل ہوا تورات، انجیل، معجزات اور دیگر صحیفے ہم سب کو مانتے ہیں۔ یہاں تک تو مشہور و مخصوص پیغمبروں کا ذکر تھا آگے تعمیم فرمادی۔

ارشاد ہے: ﴿وَمَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ﴾ اور (اس چیز پر بھی ہمارا ایمان ہے) جو دی گئی پیغمبروں کو ان کے رب کی طرف سے صحیفے اور کتابیں۔

انبیاء علیہم السلام کی باہمی فضیلت

اور ہم تو اتنے وسیع الصدر ہیں کہ ﴿لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ﴾ نہیں فرق کرتے ہم ان پیغمبروں میں سے کسی ایک کے درمیان ایمان لانے میں کہ ہمارا سب پر ایمان ہے کہ وہ اپنے، اپنے زمانے میں اللہ تعالیٰ کے برحق پیغمبر تھے البتہ درجے اور مرتبے کے اعتبار سے ان میں کمی بیشی ہے۔ تیسرے پارے میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ﴾ یہ پیغمبروں کا گروہ ہے ہم نے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے۔ اور اسی طرح پندرہویں پارے میں آتا ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:

﴿وَ لَقَدْ فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِیّٖنَ عَلٰی بَعْضٍ وَّ اٰتَیْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا﴾ اور البتہ تحقیق ہم نے بعض پیغمبروں کو بعض پر فضیلت دی اور داؤد علیہ السلام کو ہم نے زبور عطا کی۔ تو پیغمبروں کے درجات میں کمی بیشی ہے۔ سب سے بلند اور اعلیٰ درجہ ہے حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی قدر کے بعد درجہ اور مقام ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بعد درجہ ہے موسیٰ علیہ السلام کا تو درجات میں تو فرق ہے۔ ان پر ایمان لانے میں ہم تفریق نہیں کرتے جس طرح یہودی کہتے تھے ﴿نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّ نَكْفُرُ بِبَعْضٍ﴾ بعض کو ہم مانتے ہیں۔ مثلاً: موسیٰ علیہ السلام کو اور بعض کا ہم انکار کرتے ہیں جیسے: عیسیٰ علیہ السلام اور یہ بات آپ پہلے پڑھ چکے ہو کہ یہودی عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں کہتے تھے کہ ہم اس کو نبی کیا مانیں گے یہ تو حلال زادہ ہی نہیں ہے، معاذ اللہ تعالیٰ۔ تو یہ تفریق ہم نہیں کرتے۔

﴿وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ﴾ اور ہم اسی کے فرمان بردار ہیں۔ ہم نے اپنی گردنیں رب تعالیٰ کے حکم کے سامنے جھکا دی ہیں۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم معیارِ ایمان ہیں

اس سے پہلے تین گروہوں کا ذکر تھا۔ ① یہود ② نصاریٰ ③ اور ضمناً مشرکین کا۔

کہ یہ سارے مسلمانوں کو اپنے، اپنے مذہب کی دعوت دیتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو فرمایا کہ ہم تو قاعدے کے مطابق سب کو مانتے ہیں اور تم نہیں مانتے۔ پس تم ان سے کہو کہ اگر یہ لوگ تمہاری طرح ایمان لائیں گے تو ہدایت یافتہ ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَاۤ اٰمَنْتُمْ بِهٖ﴾ پس اگر یہ لوگ ایمان لے آئیں جیسا کہ تم ایمان لائے ہو اس کے ساتھ ﴿فَقَدِ اهْتَدَوْا﴾ پس تحقیق یہ ہدایت پا جائیں گے۔ اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ایمان کو معیار قرار دیا ہے۔ کہ یہود و نصاریٰ اور مشرکین تمہارے جیسا یعنی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جیسا ایمان لائیں گے تو ہدایت حاصل ہوگی۔

﴿وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا هُمْ فِیْ شِقَاقٍ﴾ اور اگر انہوں نے روگردانی کی پس پختہ بات ہے وہ ضد، مخالفت اور بدبختی ہے۔ اور جو حضرات دوسروں کے لیے معیار ہیں وہ ثقہ، عادل، متقی، پرہیزگار ہیں۔ اور ان پر جرح و اعتراض جائز نہیں ہے۔

①...... چنانچہ حضرت ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ ''مرقات شرح مشکوٰۃ'' میں فرماتے ہیں کہ قرآن کریم اور سنت اور معتمد لوگوں کے اجماع کے ظاہری الفاظ اور عبارتیں اس پر دلالت کرتی ہیں کہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تمام کے تمام عادل اور ثقہ ہیں۔

②...... امام ابن اثیر رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب ''اسد الغابہ'' میں لکھتے ہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سب کے سب عادل اور ثقہ ہیں۔ ان پر جرح نہیں کی جا سکتی اس لیے کہ اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی تعدیل اور پاک دامنی بیان فرمائی ہے اور جو حضرات عادل، ثقہ، ایمان اور عمل میں معیار ہیں ان کی اتباع واجب ہے۔

③...... چنانچہ امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب ''اقامۃ الدلیل'' میں لکھتے ہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اجماع واجب الاتباع ہے۔

⑤......اور علامہ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ ''فتح الباری شرح صحیح بخاری'' میں لکھتے ہیں کہ ''اہلِ سنت والجماعت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اجماع حجت ہے۔''

⑤......اور مشہور غیر مقلد عالم مولانا حافظ محمد عبداللہ روپڑی رحمۃ اللہ علیہ ''ضمیمہ رسالہ اہلِ حدیث'' میں لکھتے ہیں کہ اقوال صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے استدلال کرنا ٹھیٹھ (خالص) اسلام میں داخل ہے''۔ یہ تو اہلِ حق کی عبارتیں ہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم عادل اور ثقہ ہیں اور راہِ حق کی دلیل ہیں۔

اور حدیث پاک میں آتا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مذہبی اعتبار سے یہودیوں کے اکہتر فرقے بنے اور نصاریٰ کے تھوڑے سے وقت میں بہتر فرقے بنے اور میری امت میں تہتر فرقے بنیں گے۔ یہ امت کسی سے پیچھے رہنے والی نہیں ہے۔

فرمایا: كُلُّهُمْ فِي النَّارِ اِلَّا مِلَّةً وَّاحِدَةً. ان تہتر فرقوں میں سے ایک فرقہ ہوگا جس کو اوّل تا آخر دوزخ سے نجات ملے گی باقی بہتر فرقے دوزخ میں جائیں گے۔ یہ روایت ابوداؤد، ترمذی اور مشکوٰۃ وغیرہ میں صحیح سند کے ساتھ کئی صحابہ رضی اللہ عنہم سے مروی ہے۔ البتہ دوزخ میں جانے کی تفصیل ہے۔ کیونکہ ان بہتر میں سے وہ بھی ہوں گے جن کا افتراق کفر اور شرک کی حد تک پہنچا ہوا ہوگا۔ ایسے لوگ تو ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے اور انھیں دوزخ سے نکلنا کبھی نصیب نہیں ہوگا۔ اور ان میں سے ایسے بھی ہوں گے کہ جن کا افتراق کفر و شرک تک نہیں پہنچا ہوگا بلکہ بدعت اور معصیت تک محدود ہوگا۔ ایسے لوگ دوزخ میں جائیں گے مگر کسی نہ کسی وقت ان کو رہائی مل جائے گی۔ اور جو اوّل تا آخر دوزخ کے عذاب سے محفوظ رہے گا وہ صرف ایک فرقہ ہوگا۔

قَالُوْا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا وَمَنْ هِيَ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ؟ اے اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم)! وہ کون سا فرقہ ہوگا جو اوّل تا آخر دوزخ سے بچا رہے گا یعنی اس کی پہچان کیا ہوگی؟

قَالَ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مَا اَنَا عَلَيْهِ وَاَصْحَابِيْ جو میرے طریقے پر ہوگا اور میرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے طریقے پر ہوگا۔ یعنی میرے راستے پر چلنے والا ہوگا اور میرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے راستے پر چلنے والا ہوگا مَا اَنَا عَلَيْهِ سے مراد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے۔ وَاَصْحَابِيْ سے مراد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی جماعت ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت پر چلنے والے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی جماعت کے طریقے پر چلنے والے اور اسی حدیث کے پیش نظر اہلِ سنت والجماعت کا لفظ بولا جاتا ہے۔ تو اہلِ سنت والجماعت وہ ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے پر چلنے والے ہیں اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی جماعت کے طریقہ پر چلنے والے ہیں۔

''اہلِ سنت'' کا مطلب

چنانچہ شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب ''غنیۃ الطالبین'' میں فرماتے ہیں اور دیگر کتابوں میں بھی موجود ہے کہ: ''اہلِ سنت وہ ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ پر چلیں اور والجماعت، وہ ہیں جو صحابہ کرام صلی اللہ علیہ وسلم کی جماعت کے نقش قدم پر چلیں۔ تو اہلِ سنت والجماعت وہ ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت پر اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے طریقے پر چلتے ہیں۔

اب تم فیصلہ خود کرلو کہ آج کل جو لوگ اپنے آپ کو ''سنی'' کہلواتے ہیں جو کام وہ کررہے ہیں کیا وہ کام آنحضرت ﷺ نے کیے ہیں، یا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کیے ہیں؟ حاشا وکلا۔ یہ کام نہ آنحضرت ﷺ نے کیے ہیں اور نہ ہی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کیے اور ان کا کہیں تصور بھی نہیں ملتا۔ لہٰذا ان لوگوں کا اہلِ سنت والجماعت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ اہلِ بدعت اور اہلِ ھویٰ ہیں اور خواہ مخواہ اپنے ساتھ یہ لفظ چسپاں کرلیا ہے۔

اور یہ بدعات، تیجا، ساتا، دسواں اور چالیسواں اور عرس اور برسی اور قبروں پر چراغاں کرنا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے زمانہ میں نہیں تھا حالانکہ اس وقت لوگ مرتے بھی تھے، شہید بھی ہوتے تھے اور آنحضرت ﷺ کے ساتھ محبت بھی ان کو سب سے زیادہ تھی اگر یہ کام آنحضرت ﷺ نے کیے ہوتے تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ضرور کرتے اور آخرت کی فکر بھی ان کو زیادہ تھی لہٰذا یہ تمام کی تمام خرافات ہیں۔ قرآن اور سنت کے ساتھ ان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ ان کے کرنے سے گناہ ہوتا ہے، ثواب نہیں۔

''عید میلاد'' اور اس کے تین بانی

①......اور عید میلاد کا جلوس تو کچھ عرصہ پہلے شروع ہوا ہے میری عمر کے جو بوڑھے ہیں وہ جانتے ہیں کہ عید میلاد کا جلوس ہمارے سامنے شروع ہوا ہے اور میرے اس درس کے دینے تک اس کا بانی شیخ عنایت اللہ قادری زندہ ہے یہ پہلے ہندو تھا اور ''رام لیلیٰ'' کا جلوس نکالا کرتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اسلام کی توفیق عطا فرمائی مسلمان ہونے کے بعد اس نے ''عید میلاد'' کا جلوس نکالنا شروع کردیا۔ کبھی لاہور جاؤ تو کشمیری بازار میں جاکر دیکھو اس کے مکان پر لکھا ہوا ہے ''شیخ عنایت اللہ قادری بانی جلوس عید میلاد النبی ﷺ''۔ (اب ۴ ذوالقعدہ ۱۴۲۲ھ ۲۱ جنوری ۲۰۰۲ء کو وہ فوت ہوگیا ہے۔)

②...... اور دو آدمی اس کے ساتھ اور تھے ایک ''مولوی عبدالمجید'' جو ''پٹی'' کا رہنے والا تھا اس کا ایک رسالہ بھی نکلتا تھا ''ایمان''۔

③......اور تیسرا ''عبدالقادر'' تھا جس کا بیٹا ''شجاع'' لاہور کا میئر بھی رہ چکا ہے۔ ان تینوں آدمیوں نے عید میلاد کا جلوس شروع کیا جس کو آج کل لوگ دین بنائے پھرتے ہیں۔ یہ کام تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے تصور میں بھی نہیں تھے۔ تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ایمان کو اللہ تعالیٰ نے معیار قرار دیا ہے۔

فرمایا: ﴿فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللّٰهُ﴾ پس عنقریب اللہ تعالیٰ کفایت کرے گا آپ کے لیے ان سے۔ دوسری جگہ فرمایا ﴿اَلَيْسَ اللّٰهُ بِكَافٍ عَبْدَهٗ﴾ [الزمر:۳۶] کیا اللہ تعالیٰ اپنے بندے کے لیے کافی نہیں ہے؟ ﴿وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ﴾ اور وہی سننے والا، جاننے والا ہے۔

توحید کا رنگ

یہودیوں اور عیسائیوں کے کچھ بانی ہوتے تھے ''رنگ دار''۔ ان کے ہاں جب بچہ پیدا ہوتا تھا اس چشمے میں اس کو

غسل دیتے تھے اور کہتے تھے کہ اب اس پر یہودیت کا رنگ چڑھ گیا ہے اور عیسائیت کا رنگ چڑھ گیا ہے۔

اس کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ﴿صِبْغَةَ اللّٰهِ﴾ اللہ تعالیٰ کا رنگ (اختیار کرو) کیونکہ اصل رنگ تو اللہ تعالیٰ کا ہے۔ ﴿وَ مَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً﴾ اور کون بہتر ہے اللہ تعالیٰ سے رنگ کے لحاظ سے۔ یعنی توحید والے رنگ سے بہتر رنگ کون سا ہے؟ جس کو توحید سمجھ آ گئی اور وہ موحد بن گیا، ایمان کی دولت حاصل ہوگئی اور دین کے ساتھ اس کا تعلق ہو گیا تو یہ حقیقی رنگ میں رنگا گیا کیونکہ اصل رنگ تو یہ ہے۔ ظاہری طور پر بدن رنگنے سے اور کپڑے رنگنے سے کیا فائدہ ہوگا؟ اصل رنگ تو یہ ہے کہ دل توحید و سنت والے عقیدے سے رنگا ہوا ہو تو کامیابی ہے۔

﴿وَّ نَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ﴾ اور ہم اسی (اللہ تعالیٰ) کی عبادت کرنے والے ہیں اور تم جس کی چاہو عبادت کرو۔ ﴿قُلْ﴾ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرما دیں ﴿اَتُحَآجُّوْنَنَا فِي اللّٰهِ﴾ کیا تم ہمارے ساتھ جھگڑا کرتے ہو اللہ تعالیٰ کے بارے میں؟ اس کی توحید کے متعلق ﴿وَهُوَ رَبُّنَا وَ رَبُّكُمْ﴾ حالانکہ وہی ہمارا رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے۔ ہمیں بھی وہی پالتا ہے اور تمہیں بھی وہی پالنے والا ہے۔

﴿وَلَنَآ اَعْمَالُنَا﴾ اور ہمارے لیے ہمارے اعمال ہیں ﴿وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ﴾ اور تمہارے لیے تمہارے اعمال ہیں ﴿وَنَحْنُ لَهٗ مُخْلِصُوْنَ﴾ اور ہم تو خالص اسی کے ہیں۔ ہم منافق اور دورنگے نہیں ہیں ہم تو خالص رب تعالیٰ کے حضور جھکنے والے ہیں۔

پہلے یہ بات گزر چکی ہے کہ یہودی کہتے تھے کہ ابراہیم علیہ السلام یہودی تھے اور عیسائی کہتے تھے کہ ابراہیم علیہ السلام عیسائی تھے اور مشرکوں کا دعویٰ تھا کہ وہ ہمارے تھے اللہ تعالیٰ نے ان سب کا رد فرمایا ہے۔

﴿اَمْ تَقُوْلُوْنَ﴾ کیا تم کہتے ہو؟ ﴿اِنَّ اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطَ﴾ کہ بے شک ابراہیم اور اسماعیل اور اسحاق اور یعقوب (علیہم السلام) اور ان کی اولاد در اولاد ﴿كَانُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى﴾ یہودی تھے یا نصرانی ﴿قُلْ﴾ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرما دیں، تم یہ کہتے ہو، بتاؤ ﴿ءَاَنْتُمْ اَعْلَمُ اَمِ اللّٰهُ﴾ کیا تم زیادہ جانتے ہو یا اللہ تعالیٰ زیادہ جانتا ہے۔ رب تعالیٰ نے تو اپنا فیصلہ سنا دیا ہے جس کا تیسرے پارے میں ذکر ہے:

﴿مَا كَانَ اِبْرٰهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّ لَا نَصْرَانِيًّا وَّلٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا وَ مَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ﴾ ابراہیم (علیہ السلام) نہ یہودی تھے، نہ نصرانی تھے اور نہ مشرکین میں سے تھے اور لیکن وہ ایک طرف ہو کر رہنے والے مسلمان تھے۔ یہ تمہارے خالی دعوے ہی دعوے ہیں جن کا حقیقت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔ اور تمہیں بھی معلوم ہے کہ وہ یہودی اور عیسائی نہیں تھے اور نہ ہی وہ مشرک تھے اس کے باوجود تم اس بات کو چھپاتے ہو۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ﴿وَ مَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً﴾ اور اس سے بڑا کون ظالم ہے جس نے چھپائی گواہی ﴿عِنْدَهٗ مِنَ اللّٰهِ﴾ جو اس کے پاس ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ﴿وَ مَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ﴾ اور نہیں ہے اللہ تعالیٰ غافل ﴿عَمَّا تَعْمَلُوْنَ﴾ ان

کاموں سے جو تم کرتے ہو۔ اس کا پھل تمہیں ملے گا۔

فرمایا ﴿تِلْكَ اُمَّةٌ﴾ یہ ایک گروہ تھا ان بزرگوں کا جن کا اوپر ذکر ہوا ہے۔ حضرت ابراہیم، حضرت اسماعیل، حضرت اسحاق، حضرت یعقوب اور حضرت موسیٰ علیہم السلام ﴿قَدْ خَلَتْ﴾ تحقیق وہ گزر گیا یہ حضرات دنیا سے رخصت ہو گئے ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے علاوہ باقی تو وفات پا گئے ہیں اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام زندہ آسمانوں پر اٹھا لیے گئے ہیں اور ان کی حیات قطعی دلائل کے ساتھ ثابت ہے۔ ان کی حیات کا منکر پکا کافر ہے اور اس کے کفر میں جو شک کرے وہ بھی کافر ہے۔

اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام قیامت سے پہلے آسمان سے نازل ہوں گے اور ان کا یہ نازل ہونا قیامت کی بڑی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے اور وہ نازل ہونے کے بعد چالیس سال تک زمین پر رہیں گے اور دنیا کو عدل و انصاف سے بھر دیں گے۔ یہودیت اور عیسائیت کا صفایا کر دیں گے صرف اسلام ہی اسلام رہے گا۔ حج و عمرہ بھی کریں گے پھر ان کی وفات ہوگی اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے روضہ اقدس میں ان کو دفن کیا جائے گا یہ سب قطعی چیزیں ہیں۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ﴿لَهَا مَا كَسَبَتْ﴾ ان کے لیے ہے جو انہوں نے کمایا ﴿وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ﴾ اور تمہارے لیے ہے جو تم نے کمایا ﴿وَلَا تُسْــَٔلُوْنَ﴾ اور تم سے نہیں پوچھا جائے گا ﴿عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ﴾ ان کاموں کے بارے میں جو وہ کرتے تھے وہ اپنے اعمال کے ذمہ دار ہیں اور تم اپنے اعمال کے ذمہ دار ہو ہر ایک کا نتیجہ اس کے اعمال کے مطابق مرتب ہوگا۔

فہرست عنوات

ذخیرۃ الجنان فی فہم القرآن

(حصہ دوم)

قصِیدَہ مَدحِیَّہ

فِی الشَّیْخِ الْاُسْتَاذِ مَوْلَانَا مُحَمَّدْ سَرْفَرَازْ خَانْ صَفْدَرْ رحمہ اللہ
قَالَ بفمہ الشیخ محمد عیسیٰ الکورمانی رحمہ اللہ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وَ لِلّٰہِ حَمْدٌ وَّافِیًا وَّ مَوَافِیًا قَبْلَ الثَّنَاء ❖ وَالسَّلَامُ عَلَی الرَّسُوْلِ وَعَلٰی صَحْبِہِ الْبَرَرَۃِ التُّقٰی

فَاِنَّ الشَّیْخَ مُحَمَّدْ سَرْفَرَازْ صَفْدَرَ الْمَوْلٰی
کَانَ قَدْ اَحْیَ الْعِلْمَ وَالدَّرْسَ وَالْفَضْلَ وَالسُّنَّۃَ ؕ

"ہمارے شیخ استاذ محی السنہ حضرت مولانا محمد سرفراز خان صاحب صفدر رحمۃ اللہ علیہ نے علم، تدریس، بزرگی اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو حیات نو بخشی۔"

فَوَاللہ مَارَاَیْتُہٗ وَلَعَلَّ مَارَاٰی ھُوَ فِیْ عَصْرِہٖ مِثْلَہٗ ؕ
فِیْ جُھْدٍ لِدِیْنِ اللہ قَطُّ وَفِی الْمَشَقَّۃِ وَالْمِحْنَہ ؕ

"اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ نہ میں نے اور شاید کہ نہ آپ نے زمانہ میں اپنے جیسا دیکھا ہو کہ اللہ تعالیٰ کے دین میں جیسی کوشش، مشقت اور محنت آپ نے برداشت کی ہے۔"

وَ قَدْ اَبْلٰی نَفْسَہٗ وَاَھْلَہٗ وَمَالَہٗ وَحَیَاتَہٗ ؕ
لِخِدْمَۃِ الْمِلَّۃِ الْحَنِیْفِیَّۃِ السَّمْحَۃِ الْبَیْضَاءِ

"شیخ نے اپنے آپ کو، اہل وعیال، مال اور زندگی سب کچھ ملت حنفیہ جو کہ آسان اور واضح ہے، کے لیے داؤ پر لگا دیا۔"

وَمِنْ صَنْعَۃِ الشَّیْخِ اَنَّہٗ شَدَّرَدًّا عَلٰی اَھْلِ الْھَوٰی
یَعْنِی الْغُلَاۃَ فِی الدِّیْنِ مِمَّنْ مَضٰی کَانَ اَوْ حَدَثَا

"اور شیخ کا خاص عمل یہ ہے کہ انہوں نے گمراہ فرقوں پر سخت رد کیا یعنی ان لوگوں پر جنہوں نے دین میں غلو سے کام لیا کچھ تو اس دنیا سے چلے گئے اور کچھ ابھی باقی ہیں۔"

فَمَا اَتَوْا بِجَوَابٍ صَحِیْحٍ وَّقَدْمَاتَ اَکْثَرُھُمْ
بِالْحَسْرَۃِ وَالْوَیْلِ وَالْبُغْضِ وَالشَّنَئَا

"یہ لوگ شیخ کے رد کا کوئی صحیح جواب نہ دے سکے ان میں سے اکثر حسرت وافسوس وبغض اور کینہ لے کر دنیا سے رخصت ہو گئے۔"

فَيَالَهٗ مِنْ شَانٍ لَقَدْ فَاقَ اَهْلَ الْعَصْرِ اٰخِرَهُمْ
فِقْهًا حَدِيْثًا وَّ اَثَرًا لِسَلَفٍ كَانَ اَوْ عَمَلاً

"میرے شیخ کی کیا شان ہے کہ وہ اپنے سب زمانہ والوں پر علم فقہ، علم حدیث، سلف صالحین کے آثار ہوں یا اعمال ہوں فوقیت رکھتے ہیں۔"

وَفِيْ عِلْمٍ وَفِيْ حِلْمٍ وَفِيْ خُلُقٍ وَفِيْ حُسْنٍ
وَفِيْ اَدَبٍ وَفِيْ قِرًى لِضَيْفٍ وَفِيْ صِلَةٍ لِاَرْحَامَا

"وسعت علم، بردباری، حسن خلق، جمال صورت، شرعی اخلاق، مہمان نوازی اور صلہ رحمی۔"

وَجَرَتْ وَفُوْدُ الْعِلْمِ مِنْ كُلِّ شَرْقٍ وَّغَرْبٍ بِحَضْرَتِهٖ
لِتَفْسِيْرِ الْقُرْاٰنِ الَّذِيْ كَرَامَةُ الشَّيْخِ فِيْهِ قَدْ ظَهَرَا

"اہل علم کے قافلے مشرق اور مغرب سے آپ کی خدمت میں جوق در جوق آنا شروع ہوئے قرآن کی تفسیر کے لیے جس میں شیخ کی ایک کرامت ظاہر ہوئی ہے۔"

مِنْ ضَبْطِ اٰثَارٍ وَّحِفْظِ اَقْوَالٍ وَّصِحَّةِ اَخْبَارٍ مَعَ الدَّلِيْلِ لَهَا
فَلَمْ يُرَ وَلَمْ يُسْمَعْ بِهٰذَا الطَّرِيْقِ فِيْ اَوَائِلِ الَّذِيْنَ مَضٰى

"یعنی مضبوط آثار اور محفوظ اقوال اور صحیح احادیث کو مسلسل باحوالہ بیان کرنا کہ اوائل میں اس قسم کا نرالہ انداز دیکھنے اور سننے میں نہیں آیا۔"

وَ اِنَّهٗ لَمْ يَزَلْ بِعِلْمِ رِجَالِ الْحَدِيْثِ مِيْزَانًا لِسَبْقَتِهٖ
فَلْيَنْظُرْ كَمَالُ الصِّدْقِ لِيْ فِيْمَا تَعَرَّضَ مِنْ مَبْحَثٍ اَوْ تَقَدَّمَا

"آپ رجال حدیث کے علم میں سبقت علمی کے باعث ایک معیار ہیں اور اس بات کی تصدیق کے لیے چاہیے کہ ان ابحاث کا مطالعہ کیا جائے جس میں آپ نے کسی پر مناقضہ کیا ہو یا از سرنو بحث کی ہو۔"

وَ مَاذَا يَقُوْلُ مُحَمَّدُ عِيْسَى الَّذِيْ هُوَ مِنْ اَدْنٰى تَلَامِذِهٖ
فِيْ شَيْخٍ عَالِمٍ كَبِيْرٍ نِالَّذِيْ لِاِسْنَادِهٖ اسْتَجَازَهُ الْعُلَمَاءُ

"علم میں ایک ادنیٰ شاگرد محمد عیسیٰ اپنے شیخ کے بارے میں کیا کہہ سکتا ہے؟ ایسے شیخ جن سے بڑے علماء نے حدیث کی اجازت لی ہو۔"

اہلِ علم سے گزارش

بندۂ ناچیز امام المحدثین مجدد وقت شیخ الاسلام حضرت العلام مولانا محمد سرفراز خان صفدر رحمہ اللہ تعالیٰ کا شاگرد بھی ہے اور مرید بھی۔ اور محترم لقمان اللہ میر صاحب حضرت اقدس کے مخلص مرید اور خاص خدام میں سے ہیں۔

ہم وقتاً فوقتاً حضرت اقدس کی ملاقات کے لیے جایا کرتے خصوصاً جب حضرت شیخ اقدس کو زیادہ تکلیف ہوتی تو علاج معالجہ کے سلسلے کے لیے اکثر جانا ہوتا۔ جانے سے پہلے ٹیلیفون پر رابطہ کر کے اکٹھے ہو جاتے۔ ایک دفعہ جاتے ہوئے میر صاحب نے کہا کہ حضرت نے ویسے تو کافی کتابیں لکھی ہیں اور ہر باطل کا رد کیا ہے مگر قرآن پاک کی تفسیر نہیں لکھی تو کیا حضرت اقدس جو صبح بعد نمازِ فجر درس قرآن ارشاد فرماتے ہیں وہ کسی نے محفوظ نہیں کیا کہ اسے کیسٹ سے کتابی شکل سے منظر عام پر لایا جائے تاکہ عوام الناس اس سے مستفید ہوں اور اس سلسلے میں جتنے بھی اخراجات ہونگے وہ میں برداشت کرونگا اور میرا مقصد صرف رضائے الٰہی ہے، شاید یہ میرے اور میرے خاندان کی نجات کا سبب بن جائے۔ یہ فضیلت اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے مقدر فرمائی تھی۔

اس سے تقریباً ایک سال قبل میر صاحب کی اہلیہ کو خواب آیا تھا کہ ہم حضرت شیخ اقدس کے گھر گئے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ حضرت کیلوں کے چھلکے لے کر باہر آرہے ہیں۔ میں نے عرض کیا حضرت مجھے دے دیں میں باہر پھینک دیتی ہوں۔ حضرت نے وہ مجھے دے دیے اور میں نے باہر پھینک دیے۔

چوں کہ حضرت خواب کی تعبیر کے بھی امام ہیں۔ میں نے مذکورہ بالا خواب حضرت سے بیان کیا اور تعبیر پوچھنے پر حضرت نے فرمایا کہ میرا یہ جو علمی فیض ہے اس سے تم بھی فائدہ حاصل کرو گے چنانچہ وہ خواب کی تعبیر تفسیر قرآن "ذخیرۃ الجنان" کی شکل میں سامنے آئی۔

میر صاحب کے سوال کے جواب میں مَیں نے کہا اس سلسلے میں مجھے کچھ معلوم نہیں حضرت اقدس سے پوچھ لیتے ہیں چنانچہ جب گکھڑ حضرت کے پاس پہنچ کر بات ہوئی تو حضرت نے فرمایا کہ درس دو تین مرتبہ ریکارڈ ہو چکا ہے اور محمد سرور منہاس کے پاس موجود ہے ان سے رابطہ کرلیں۔ اور یہ بھی فرمایا کہ گکھڑ والوں کے اصرار پر میں یہ درسِ قرآن پنجابی زبان میں دیتا رہا ہوں اس کو اُردو زبان میں منتقل کرنا انتہائی مشکل اور اہم مسئلہ ہے۔

اس سے دو دن پہلے میرے پاس میرا ایک شاگرد آیا تھا اس نے مجھے کہا کہ میں ملازمت کرتا ہوں تنخواہ سے اخراجات پورے نہیں ہو پاتے، دورانِ گفتگو اس نے یہ بھی کہا کہ میں نے ایم۔ اے پنجابی بھی کیا ہے۔ اس کی یہ بات مجھے اس وقت یاد

آ گئی۔ میں نے حضرت سے عرض کی کہ میرا ایک شاگرد ہے اس نے پنجابی میں ایم۔اے کیا ہے اور کام کی تلاش میں ہے، میں اس سے بات کرتا ہوں۔

حضرت نے فرمایا اگر ایسا ہو جائے تو بہت اچھا ہے۔ ہم حضرت کے پاس سے اٹھ کر محمد سرور منہاس صاحب کے پاس گئے اور ان کے سامنے اپنی خواہش رکھی انھوں نے کیسٹیں دینے پر آمادگی ظاہر کر دی۔ کچھ کیسٹیں ریکارڈ کرانے کے بعد اپنے شاگرد ایم۔اے پنجابی کو بلایا اور اس کے سامنے یہ کام رکھا اُس نے کہا کہ میں یہ کام کر دوں گا، میں نے اسے تجرباتی طور پر ایک عدد کیسٹ دی کہ یہ لکھ کر لاؤ پھر بات کریں گے۔ دینی علوم سے ناواقفی اس کے لیے سدّ راہ بن گئی۔ وہ قرآنی آیات، احادیث مبارکہ اور عربی عبارت سمجھنے سے قاصر تھا۔ تو میں نے فیصلہ کیا کہ یہ کام خود ہی کرنے کا ہے میں نے خود ایک کیسٹ سنی اور اُردو میں منتقل کر کے حضرت اقدس کی خدمت میں پیش کی۔ حضرت نے اس میں مختلف مقامات میں سے پڑھ کر اظہارِ اطمینان فرمایا اس اجازت پر پوری تن دہی سے متوکل علی اللہ ہو کر کام شروع کر دیا۔

میں بنیادی طور پر دنیاوی تعلیم کے لحاظ سے صرف پرائمری پاس ہوں، باقی سارا فیض علمائے ربانیین سے دورانِ تعلیم حاصل ہوا۔ اور میں اصل رہائشی بھی جھنگ کا ہوں وہاں کی پنجابی اور لاہور، گوجرانوالا کی پنجابی میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ لہٰذا جہاں دشواری ہوتی وہاں حضرت مولانا سعید احمد صاحب جلالپوری شہید رحمۃ اللہ علیہ سے رجوع کرتا یا زیادہ ہی الجھن پیدا ہو جاتی تو براہِ راست حضرت شیخؒ سے رابطہ کر کے تشفی کر لیتا لیکن حضرت کی وفات اور مولانا جلالپوری رحمۃ اللہ علیہ کی شہادت کے بعد اب کوئی ایسا آدمی نظر نہیں آتا جس کی طرف رجوع کروں۔ اب اگر کہیں محاورہ یا مشکل الفاظ پیش آئیں تو پروفیسر ڈاکٹر اعجاز سندھو صاحب سے رابطہ کر کے تسلی کر لیتا ہوں۔

اہل علم حضرات سے التماس ہے کہ اس بات کو بھی مدنظر رکھیں کہ یہ چونکہ عمومی درس ہوتا تھا اور یادداشت کی بنیاد پر مختلف روایات کا ذکر کیا جاتا تھا اس لیے ضروری نہیں ہے کہ جو روایت جس کتاب کے حوالہ سے بیان کی گئی ہے وہ پوری روایت اسی کتاب میں موجود ہو۔ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ روایت کا ایک حصہ ایک کتاب میں ہوتا ہے جس کا حوالہ دیا گیا ہے مگر باقی تفصیلات دوسری کتاب کی روایت بلکہ مختلف روایات میں ہوتی ہیں جیسا کہ حدیث نبویؐ کے اساتذہ اور طلبہ اس بات کو اچھی طرح سمجھتے ہیں اس لیے ان دروس میں بیان کی جانے والی روایات کا حوالہ تلاش کرتے وقت اس بات کو ملحوظ رکھا جائے۔

علاوہ ازیں کیسٹ سے تحریر کرنے سے لے کر مسودہ کے زیورِ طباعت سے آراستہ ہونے تک کے تمام مراحل میں اس مسودہ کو انتہائی ذمہ داری کے ساتھ میں بذاتِ خود اور دیگر تعاون کرنے والے احباب مطالعہ اور پروف ریڈنگ کے دوران غلطیوں کی نشاندہی کرتے ہیں اور حتی المقدور اغلاط کو دور کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ کمپوزنگ اور اغلاط کی نشاندہی کے بعد میں ایک مرتبہ دوبارہ مسودہ کو چیک کرتا ہوں تب جا کر انتہائی عرق ریزی کے بعد مسودہ اشاعت کے لیے بھیجا جاتا ہے۔ لیکن

بایں ہمہ ہم سارے انسان ہیں اور انسان نسیان اور خطا سے مرکب ہے غلطیاں ممکن ہیں۔ لہٰذا اہل علم سے گزارش ہے کہ تمام خامیوں اور کمزوریوں کی نسبت صرف میری طرف ہی کی جائے اور ان غلطیوں سے مطلع اور آگاہ کیا جائے تا کہ آئندہ ایڈیشن میں اصلاح ہو سکے۔

العارض

محمد نواز بلوچ

فارغ التحصیل مدرسہ نصرۃ العلوم وفاضل وفاق المدارس العربیہ، ملتان

نوٹ: اغلاط کی نشان دہی کے لیے درج ذیل نمبر پر رابطہ کریں: 0300 - 6450340

﴿سَيَقُوْلُ﴾ عن قریب کہیں گے ﴿السُّفَهَآءُ﴾ بے وقوف ﴿مِنَ النَّاسِ﴾ لوگوں میں سے ﴿مَا وَلّٰىهُمْ﴾ کس چیز نے مسلمانوں کو پھیر دیا ﴿عَنْ قِبْلَتِهِمُ﴾ ان کے قبلہ سے ﴿الَّتِيْ﴾ وہ قبلہ ﴿كَانُوْا عَلَيْهَا﴾ جس کی طرف وہ رخ کرتے تھے ﴿قُلْ﴾ آپ کہہ دیں ﴿لِلّٰهِ الْمَشْرِقُ﴾ اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہے مشرق ﴿وَالْمَغْرِبُ﴾ اور مغرب ﴿يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ﴾ ہدایت دیتا ہے جس کو چاہتا ہے ﴿اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ﴾ سیدھے راستے کی طرف ﴿وَكَذٰلِكَ﴾ اور اسی طرح ﴿جَعَلْنٰكُمْ﴾ ہم نے بنایا تمھیں ﴿اُمَّةً وَّسَطًا﴾ اُمت اعتدال والی ﴿لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ﴾ تاکہ ہو جاؤ تم گواہ لوگوں پر ﴿وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ﴾ اور ہو جائیں رسول صلی اللہ علیہ وسلم ﴿عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا﴾ تم پر گواہ ﴿وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ﴾ اور نہیں بنایا ہم نے قبلہ ﴿الَّتِيْ﴾ وہ قبلہ ﴿كُنْتَ عَلَيْهَآ﴾ جس پر آپ تھے ﴿اِلَّا لِنَعْلَمَ﴾ مگر تاکہ ہم ظاہر کر دیں ﴿مَنْ يَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ﴾ اس کو جو پیروی کرتا ہے رسول کی ﴿مِمَّنْ﴾ ان لوگوں میں سے ﴿يَّنْقَلِبُ﴾ جو پلٹ جاتے ہیں ﴿عَلٰى عَقِبَيْهِ﴾ اپنی ایڑیوں کے بل ﴿وَاِنْ كَانَتْ﴾ اور تحقیق کے ساتھ تھی ﴿لَكَبِيْرَةً﴾ البتہ بھاری چیز ﴿اِلَّا عَلَى الَّذِيْنَ﴾ مگر ان لوگوں پر ﴿هَدَى اللّٰهُ﴾ جن کو اللہ تعالیٰ نے ہدایت دی ﴿وَمَا كَانَ اللّٰهُ﴾ اور نہیں ہے اللہ تعالیٰ ﴿لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ﴾ تاکہ ضائع کر دے تمھاری عبادتوں اور تمھارے ایمان کو ﴿اِنَّ اللّٰهَ﴾ بے شک اللہ تعالیٰ ﴿بِالنَّاسِ﴾ لوگوں کے ساتھ ﴿لَرَءُوْفٌ﴾ البتہ شفقت کرنے والا ہے ﴿رَّحِيْمٌ﴾ مہربان ہے۔

تحویل قبلہ

جس دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی نازل ہوئی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت ملی اسی موقع پر جبرئیل علیہ السلام نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو وضو اور نماز کا طریقہ سمجھایا۔ شروع میں فجر اور عصر کی نمازیں نفلی تھیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو پڑھتے تھے۔ نبوت کے تقریباً دس سال گزرنے کے بعد گیارھویں سال آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو معراج پر لے جایا گیا اور معراج کی رات پانچ نمازیں فرض ہوئیں۔ جس دن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت ملی اسی دن سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جبرئیل علیہ السلام کے کہنے پر اللہ تبارک وتعالیٰ کی وحی کے مطابق نفلی نمازیں شروع کر دیں اور کعبۃ اللہ اس وقت قبلہ تھا۔

قبلہ کا لفظی معنیٰ ہے چہرہ پھیرنے کی جگہ۔ یعنی نماز کے لیے جس طرف انسان چہرہ پھیرے وہ قبلہ ہے۔ اصل عبادت تو رب تعالیٰ کی ہے قبلہ تو ایک جہت ہے قبلہ ہمارا مسجود الیہ نہیں ہے۔ ہم سجدہ قبلے کو نہیں کرتے بلکہ سجدہ تو رب کو کرتے ہیں قبلہ صرف ایک جہت اور سمت ہے جو اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمائی ہے۔

ہم لوگ جو قبلے سے مشرق کی طرف ہیں ہمارا چہرہ مغرب کی طرف ہوتا ہے۔ اور وہ لوگ جو قبلہ سے مغرب کی طرف رہتے ہیں ان کا چہرہ مشرق کی طرف ہوتا ہے۔ شمال والوں کا جنوب کی طرف اور جنوب والوں کا شمال کی طرف۔ گویا کہ تمام قوموں میں اتفاق اور اتحاد کا مرکز قبلہ کو بنایا کہ سب کا نماز میں چہرہ اس کی طرف ہونا چاہیے تا کہ قوم میں اتفاق اور اتحاد قائم رہے۔ جب تک کسی قوم کا پروگرام اور نصب العین ایک نہیں ہوگا اس وقت تک ان میں کبھی بھی اتفاق نہیں ہوسکتا۔ نصب العین اور پروگرام ہی ایک ایسی بڑی چیز ہے جس کے ذریعے سے قومیں آپس میں متفق ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جتنی سیاسی پارٹیاں ہیں ان میں سے اکثر کا کوئی پروگرام نہیں ہے بلکہ صرف اقتدار حاصل کرنا ہے اور اسی کے واسطے سارا زور صرف کرتی ہیں اور کامیابی حاصل کرنے کے بعد بھی قوم کے لیے کچھ نہیں کرتیں اس لیے کہ ان کا کوئی نصب العین ہی نہیں ہے۔

تو قبلے کے لفظی معنیٰ ہیں وہ جہت اور سمت جس کی طرف رُخ پھیرا جائے۔ نماز کی بنیادی شرطوں میں سے ایک شرط قبلہ کی طرف چہرہ کرنا بھی ہے۔ اگر کعبہ سامنے نظر آتا ہو تو وہاں عین کعبہ کی طرف رُخ کرنا ہے۔ اگر کعبہ سے چہرہ ذرا سا بھی ہٹا ہوا ہوگا تو نماز نہیں ہوگی اور جب کعبہ سامنے نظر نہ آئے تو کعبہ کی جہت اور سمت معتبر ہے۔ اس میں اگر تھوڑا بہت فرق رہ بھی گیا تو اللہ تعالیٰ معاف کر دے گا۔

آنحضرت ﷺ جب مکہ مکرمہ میں تھے تو چہرہ کعبہ کی طرف کیا کرتے تھے۔ عموماً آپ ﷺ نماز اس طرف منہ کر کے پڑھتے جس طرف حجر اسود ہے اور رکنِ یمانی ہے۔ اس رکنِ یمانی کے پاس آپ ﷺ کھڑے ہوتے تھے تو آپ ﷺ کا رُخ مبارک کعبہ کی طرف بھی ہوتا تھا اور مسجد اقصیٰ کی طرف بھی۔ کیوں کہ اُسی جانب بیت المقدس ہے۔ تو آپ ﷺ کبھی بیت اللہ کے دوسرے اطراف میں بھی نماز پڑھتے تھے لیکن زیادہ تر اسی جگہ پڑھتے۔

جب آپ ﷺ ہجرت فرما کر مدینہ طیبہ تشریف لے گئے تو اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے حکم ہوا کہ تم مسجد اقصیٰ کی طرف چہرہ کرو۔ اور اس کی وجہ یہ تھی کہ پہلی کتابوں میں آپ ﷺ کی جو صفات مذکور ہیں ان میں سے ایک یہ بھی تھی کہ آپ ﷺ نبی القبلتین ہوں گے کہ وہ دونوں قبلوں کے نبی ہوں گے۔ اگر آپ ﷺ کا قبلہ مسجد اقصیٰ نہ ہوتا تو یہودی اور عیسائی جو پہلی کتابوں سے واقف تھے کہہ سکتے تھے کہ یہ وہ نبی نہیں ہیں اگر وہ نبی ہوتے تو اس کی صفت نبی القبلتین موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے منہ بند کرنے کے لیے اور اتمامِ حجت کی خاطر حکم دیا کہ مسجد اقصیٰ کی جانب منہ کر کے نماز پڑھیں۔ تو آپ ﷺ نے سولہ یا سترہ مہینے مسجد اقصیٰ کی طرف رُخ کر کے نمازیں پڑھیں اور پڑھائیں۔

مسجد نبوی ﷺ سے مغرب کی طرف تھوڑے سے فاصلے پر قبیلہ بنوسلمہ کی مسجد تھی۔ ظہر کا وقت تھا آپ ﷺ نے ظہر کی دو رکعتیں پڑھائیں تو عین نماز کی حالت میں جبرئیل علیہ السلام اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی لائے کہ اب تمھارا قبلہ بجائے مسجد اقصیٰ کے کعبۃ اللہ ہے تو باقی دو رکعتیں آپ ﷺ نے کعبۃ اللہ کی طرف رُخ کر کے پڑھائیں۔ یعنی پہلی دو رکعتیں آپ ﷺ نے مسجد اقصیٰ کی طرف اور باقی دو رکعتیں کعبۃ اللہ کی طرف رُخ کر کے پڑھائیں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بہت سمجھ دار

تھے۔ جدھر آپ ﷺ پھرے وہ بھی اُدھر ہی پھر گئے۔ اس مسجد کو مسجد قبلتین کہتے ہیں۔ اس کی دیوار میں آج بھی محراب کا نشان پڑا ہوا ہے۔

تحویل قبلہ پر اعتراضات

جس وقت قبلے کی تبدیلی کا حکم ہوا تو یہود اور نصاریٰ اور مشرکین نے پراپیگنڈہ شروع کر دیا۔ مشرکین کہنے لگے کہ اس کو اب اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے۔ پہلے جب مکہ میں تھا تو کعبہ کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھتا تھا جب مدینہ طیبہ گیا تو یہود و نصاریٰ کو خوش کرنے کے لیے ان کے قبلے کی طرف پھر گیا اور اب اس کو پتا چل گیا ہے کہ ہم لوگ صحیح ہیں اس لیے پھر ہمارے قبلے کی طرف رُخ کر لیا ہے۔

اور یہود و نصاریٰ نے یوں پراپیگنڈہ کیا کہ اگر وہ قبلہ صحیح تھا تو پھر اس کو چھوڑا کیوں؟ اور اگر غلط تھا تو پھر اس کی طرف رُخ کر کے نمازیں کیوں پڑھیں؟ ان کے پراپیگنڈے سے پہلے اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

فرمایا ﴿سَيَقُوْلُ السُّفَهَآءُ﴾ عنقریب کہہ دیں گے بے وقوف ﴿مِنَ النَّاسِ﴾ لوگوں میں سے۔ اس لیے کہ جو رب تعالیٰ کے حکم اور ارشاد پر تنقید کریں وہ بے وقوف ہی ہو سکتے ہیں اور کون ہو سکتا ہے؟ وہ کہیں گے ﴿مَا وَلّٰىهُمْ﴾ کس چیز نے ان مسلمانوں کو پھیرا ﴿عَنْ قِبْلَتِهِمُ﴾ ان کے قبلہ سے ﴿الَّتِيْ﴾ وہ قبلہ ﴿كَانُوْا عَلَيْهَا﴾ جس کی طرف وہ رُخ کر کے نماز پڑھتے تھے۔ ان کو کس نے حکم دیا ہے کہ مسجد اقصیٰ سے رُخ ہٹا کر دوسری طرف پھر جائیں۔ فرمایا تم ان کو یہی جواب دو ﴿قُلْ﴾ آپ کہہ دیں ﴿لِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ﴾ اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہے مشرق اور مغرب۔ ہم تو رب تعالیٰ کے حکم کے پابند ہیں۔ رب تعالیٰ نے ہمیں حکم دیا تھا کعبۃ اللہ کی طرف رُخ کر کے نمازیں پڑھنے کا تو ہم اس کی طرف چہرہ کر کے نمازیں پڑھتے رہے۔ جب مدینہ طیبہ آئے تو ہمیں حکم ہوا کہ مسجد اقصیٰ کی طرف چہرہ کر کے نماز پڑھو۔ ہم نے چہرہ مسجد اقصیٰ کی طرف کر لیا۔ اب اس نے حکم دیا ہے کہ پھر چہرہ کعبۃ اللہ کی طرف کر لو تو ہم نے رب تعالیٰ کے حکم کی تعمیل کی۔ اور سب سے بڑی چیز تو رب تعالیٰ کے حکم کی تعمیل ہے اور ہم نے رب تعالیٰ کے حکم کی تعمیل کی ہے۔

﴿يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ﴾ اللہ تعالیٰ ہدایت دیتا ہے جس کو چاہتا ہے ﴿اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ﴾ صراط مستقیم کی۔ مگر ہدایت دیتا کس کو ہے؟ تو اس کا ذکر قرآن پاک کے دوسرے مقام پر ہے ﴿يَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ﴾ [الشوریٰ: ۱۳] جو رب تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہے رب تعالیٰ اس کو ہدایت دیتا ہے۔ زبردستی نہ تو کسی کو کافر بناتا ہے اور نہ کسی کو مسلمان ﴿فَلَمَّا زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ﴾ [الصف: ۵] پس جب وہ پھر گئے تو اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں کو پھیر دیا۔ جب کوئی غلط راستے پر چل پڑتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو اسی طرف چلا دیتے ہیں۔ اور ہدایت رب تعالیٰ اس کو دیتا ہے ﴿مَنْ اَنَابَ﴾ کے لفظ بھی قرآن پاک میں ہیں۔ جس نے رب تعالیٰ کی طرف رجوع کیا اور ﴿مَنْ يُّنِيْبُ﴾ کے لفظ بھی قرآن پاک میں ہیں کہ جو رب کی طرف رجوع کرتا ہے رب تعالیٰ اس کو ہدایت دیتا ہے۔

﴿وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ﴾ اور اسی طرح ہم نے بنایا تمھیں ﴿اُمَّةً وَّسَطًا﴾ اُمت اعتدال والی۔ جس طرح ہم نے تمھارا قبلہ سب سے بہتر قبلہ بنایا ہے اسی طرح ہم نے تمھیں تمام اُمتوں میں سے بہتر امت بنایا ہے۔ ﴿وَسَط﴾ کے معنیٰ اعتدال والی اُمت، عدالت والی امت ﴿لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ﴾ تا کہ تم لوگوں پر گواہ بن جاؤ ﴿وَ يَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا﴾ اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تم پر گواہ بن جائیں۔

رسول کے گواہ ہونے کا مطلب

بعض نادانوں نے اس آیت کریمہ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حاضر ناظر ہونے پر دلیل بنایا ہے۔ میں نے بڑی بسط سے اپنی کتاب "تبرید النواظر فی تحقیق الحاضر والناظر یعنی آنکھوں کی ٹھنڈک" میں جو کہ اُردو زبان میں ہے قرآن کریم واحادیث، فقہ اور تاریخ اسلامی کی روشنی میں ثابت کیا ہے کہ یہ عقیدہ رکھنا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یا اور کوئی پیغمبر یا ولی یا کوئی شہید ہر جگہ حاضر ناظر ہوتا ہے، یہ کفر ہے۔ آپ لوگ ایک دفعہ اس کتاب کو ضرور پڑھیں۔

تو اس آیت کی تفسیر سے ﴿شَهِيْدًا﴾ کا معنیٰ گواہ اور مفہوم حاضر ناظر کا نکالنا حاشا وکلّا بالکل غلط ہے۔ اس کی تشریح خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ فرمائی ہے بخاری شریف اور دیگر احادیث کی کتابوں میں یہ حدیث موجود ہے کہ قیامت کا دن ہوگا۔ اللہ تعالیٰ پیغمبروں کو اور ان کی اُمتوں کو فیصلے کے لیے اپنی عدالت میں طلب فرمائیں گے۔ مثلاً: اللہ تعالیٰ نوح علیہ السلام کے بارے میں فرشتوں سے فرمائیں گے کہ آواز دو کہ نوح علیہ السلام اور ان کی قوم آجائے۔ اللہ تعالیٰ کی سچی عدالت میں نوح علیہ السلام حاضر ہو جائیں گے اور ان کی قوم بھی حاضر ہوگی۔

اللہ تعالیٰ نوح علیہ السلام سے سوال کریں گے ﴿هَلْ بَلَّغْتَ قَوْمَكَ﴾ میں نے تجھے نبی بنا کر بھیجا تھا تو کیا تو نے قوم کو تبلیغ کی؟ تو حضرت نوح علیہ السلام مثلاً: فرمائیں گے کہ ہاں! میں نے تبلیغ کی ہے۔ اللہ تعالیٰ لوگوں سے سوال کریں گے کہ نوح علیہ السلام کہتے ہیں کہ میں نے تبلیغ کی ہے۔ تو کیا واقعی انھوں نے تمھیں تبلیغ کی ہے؟ وہ کہیں گے کہ یہ ہمارے پاس کب آئے؟ ہمیں تو انھوں نے کوئی تبلیغ نہیں کی۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے ﴿مَنْ يَّشْهَدُ لَكَ﴾ اے نوح علیہ السلام! آپ کا گواہ کون ہے؟ اور مسئلہ یہ ہے کہ جو شخص کسی چیز کا دعویٰ کرے اس کے ذمہ ہوتا ہے کہ گواہ پیش کرے۔ اور اگر مدعی گواہ پیش نہ کر سکے تو پھر مدعیٰ علیہ سے قسم لی جاتی ہے یہ ضابطہ ہے شریعت کا۔ ﴿اَلْبَيِّنَةُ عَلَى الْمُدَّعِيْ وَالْيَمِيْنُ عَلٰى مَنْ اَنْكَرَ﴾ "مدعی گواہ پیش کرے گا اور مدعیٰ علیہ سے قسم لی جائے گی۔"

جب رب تعالیٰ نوح علیہ السلام سے فرمائیں گے ﴿مَنْ يَّشْهَدُ لَكَ﴾ آپ کا گواہ کون ہے؟ تو نوح علیہ السلام فرمائیں گے ((محمد ﷺ وَ اُمَّتُهٗ)) "میرے گواہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت ہے۔" چنانچہ اللہ تعالیٰ کی عدالت میں اس امت کو پیش کیا جائے گا۔ اس امت سے سوال ہوگا کہ نوح علیہ السلام یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ میں نے تبلیغ کی ہے مگر قوم کہتی ہے کہ یہ ہمارے

پاس کوئی نہیں آیا۔ کیا تم گواہی دیتے ہو کہ نوح علیہ السلام نے تبلیغ کی ہے؟ یہ امت کہے گی کہ ہم گواہی دیتے ہیں۔ نوح علیہ السلام کی اُمت کے لوگ کہیں گے کہ ان کی گواہی غیر معتبر ہے اس لیے کہ یہ موقع کے گواہ ہی نہیں ہیں یہ تو ہم سے ہزار ہا سال بعد میں آئے تھے۔

مثلاً: اس وقت تک نوح علیہ السلام کو دنیا سے گئے تقریباً چھ ہزار [۶۰۰۰] سال گزر چکے ہیں۔ تو وہ لوگ کہیں گے کہ یہ تو موقع کے گواہ ہی نہیں ہیں یہ کس طرح گواہی دے سکتے ہیں؟ اللہ تبارک وتعالیٰ اس اُمت سے سوال کریں گے کہ دیکھو! یہ دوسرا فریق یہ کہتا ہے کہ یہ عینی گواہ نہیں ہیں۔ ان کی گواہی کا اعتبار نہیں ہونا چاہیے۔ تو اس وقت یہ امت کہے گی اے پروردگار! ان کی یہ بات ٹھیک ہے۔ لیکن اے پروردگار! اگر تو سچا ہے اور یقیناً سچا ہے اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اگر سچے ہیں اور یقیناً سچے ہیں تو پھر ہماری گواہی بھی سچی ہے۔ ہم نے تیری کتاب قرآن کریم میں پڑھا ہے ﴿لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَقَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ﴾ "البتہ تحقیق ہم نے نوح علیہ السلام کو ان کی قوم کی طرف بھیجا اور نوح نے قوم سے کہا کہ اے میری قوم اللہ تعالیٰ کے بغیر کسی عبادت نہ کرو معبود صرف رب تعالیٰ ہی ہے۔" پروردگار! تیری کتاب سچی ہے اور اس میں یہ بیان ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((بَلَّغَ نُوْحٌ قَوْمَهٗ)). "حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کو تبلیغ کی ہے۔"

فقہائے کرام نے ایک مستقل باب قائم کیا ہے: بَابُ الشَّهَادَةِ عَلَى التَّسَامُعِ بعض چیزیں ایسی ہوتی ہیں کہ آنکھوں سے نہیں دیکھی ہوتیں لیکن ثقہ اور معتبر لوگوں کے بیان کرنے کی وجہ سے اس پر شہادت درست ہے۔ مثلاً: فلاں فلاں کا بیٹا ہے۔ کسی کا نکاح ہو گیا، شہرت ہو گئی کہ فلاں کا نکاح ہو گیا ہے، کوئی مر گیا ہے تو اس کی موت کی خبر دی کہ فلاں مر گیا ہے اور یہ موقع پر موجود نہیں ہے نہ پیدائش کے موقع پر موجود تھا، نہ موت کے موقع پر موجود تھا اور نہ نکاح کے وقت موجود تھا لیکن ثقہ لوگوں کے بیان کی بنا پر شہادت دے سکتا ہے۔

گواہوں کا تزکیہ

مسئلہ یہ ہے کہ جب کوئی اہم مقدمہ ہو تو صرف گواہوں کی گواہی پر اس کا فیصلہ نہیں ہوتا وہاں ایک مستقل عنوان ہے: "تَزْكِيَةُ الشُّهَدَاءِ" گواہوں کی صفائی بھی جج اور قاضی لے گا۔ جب دو آدمی آ کر یہ گواہی دیں کہ فلاں فلاں کا قاتل ہے تو صرف ان کی گواہی پر دارومدار نہیں ہوگا بلکہ ان گواہوں کا تزکیہ بھی ہوگا وہ اس طرح کہ قاضی اور جج اپنے طور پر یہ تحقیق کرائے گا کہ ان گواہوں کی اس کے ساتھ کوئی دشمنی تو نہیں ہے۔ گواہ فاسق و فاجر تو نہیں ہیں۔ تو یہ گواہوں کے بارے میں جو تحقیق ہوگی اس کو کہتے ہیں تَزْكِيَةُ الشُّهَدَاءِ۔ جس وقت ظاہری اور اندرونی طور پر مکمل طریقے سے گواہوں کی صفائی ہو جائے گی تو پھر ان کی گواہی پر فیصلہ ہوگا ورنہ نہیں۔

اہم مسئلوں میں مثلاً: قتل کا مسئلہ ہے اور قطع ید کا مسئلہ ہے، رجم کا مسئلہ ہے، کوڑے لگانے کا مسئلہ ہے۔ اور آج

ہمارے دور میں تو شرعی گواہ کا پایا جانا بہت مشکل ہے۔ میرے خیال میں تو پچاس ہزار آدمیوں میں سے کوئی ایک آدمی شرعی گواہ نکل آئے تو بڑی غنیمت ہے۔ فرض نماز پڑھنا تو الگ بات ہے اگر کوئی شخص جماعت کی نماز میں بغیر کسی شرعی عذر کے مثلاً: بارش بھی نہیں، وہ آدمی لنگڑا لولا بھی نہیں اور جماعت کے ساتھ نماز نہیں پڑھتا اور اس طرح اس کی دو تین دفعہ نماز جماعت سے چھوٹ گئی تو اس کی گواہی مردود ہے۔ گلی محلے میں ننگے سر پھرتا ہے اس کی گواہی بھی مردود ہے۔ لوگوں کے سامنے بیٹھ کر پیشاب کرتا ہے تو اس کی گواہی بھی منظور نہیں ہے۔ جس نے ایک دفعہ جھوٹ بولا اس کی گواہی بھی منظور نہیں ہے۔ آج کے دور میں تو شرعی گواہ پائے ہی نہیں جاتے الا ماشاء اللہ۔

تو جس وقت گواہوں کا تزکیہ ہو جائے گا، پھر قاضی فیصلہ دے گا۔ تو جس وقت یہ امت پیغمبروں کے حق میں گواہی دے دے گی، نوح علیہ السلام کا نام تو میں نے صرف مثال کے طور پر بیان کیا ہے۔ کیوں کہ حدیث پاک میں ان کا نام صریحاً موجود ہے۔ ورنہ یہ اُمت تمام پیغمبروں کی گواہ ہوگی اور جب یہ اُمت گواہی دے دے گی تو اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی اُمت کی صفائی کی گواہی دیں گے کہ میری اُمت نے جو گواہی دی ہے وہ صحیح دی ہے (تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی اُمت کے حق میں صفائی کے گواہ ہوں گے جس کا آیت کریمہ میں ذکر ہے۔)

تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ﴿وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا﴾ اور اسی طرح ہم نے بنایا تمھیں امت اعتدال والی، عدالت والی، انصاف والی ﴿لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ﴾ تاکہ تم لوگوں پر گواہ ہو جاؤ۔ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک تمام اُمتوں کے بارے میں یہ اُمت گواہی دے گی ﴿وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا﴾ اور اللہ تعالیٰ کا پیغمبر تمھارے اُوپر گواہ ہو جائے گا کہ میری اُمت نے جو گواہی دی ہے وہ صحیح ہے۔ یہ بخاری شریف کی حدیث کا خلاصہ ہے جو میں نے آپ حضرات کے سامنے بیان کیا ہے۔ اس اُمت کا مرتبہ دیکھو کہ اس اُمت کی گواہی کے ساتھ پہلی اُمتوں کی قسمت کے فیصلے ہونے ہیں۔ اگر شَهِيْدًا کا معنیٰ یہ ہو کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حاضر و ناظر ہیں تو پھر تو ساری اُمت کو شَهِيْدًا کہا گیا ہے کہ وہ بھی حاضر و ناظر ہے۔ اس لیے یہ نظریہ بالکل باطل ہے کہ شَهِيْدًا کا معنیٰ حاضر و ناظر ہے۔

﴿وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ﴾ اور نہیں بنایا ہم نے وہ قبلہ ﴿الَّتِيْ كُنْتَ عَلَيْهَآ﴾ وہ جس پر آپ تھے جس کی طرف رُخ کر کے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھتے تھے ﴿اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ﴾ مگر تاکہ ہم ظاہر کر دیں اس کو جو پیروی کرتا ہے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ﴿مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ عَلٰى عَقِبَيْهِ﴾ ان لوگوں سے جو پلٹ جاتے ہیں اپنی ایڑیوں کے بل۔ اس موقع پر بعض کچے قسم کے لوگ مرتد بھی ہو گئے تھے۔ کہنے لگے کہ یہ بھی کوئی بات ہے آج ادھر چہرہ کرو اور کل اُدھر چہرہ کرو ہمارا پہلا مذہب ہی سچا ہے۔ تو فرمایا تاکہ اللہ تعالیٰ ان کو ظاہر کر دے جو پکے ہیں اور جو کچے ہیں ان کو بھی ظاہر کر دے۔

﴿وَاِنْ كَانَتْ﴾ اور بے شک یہ قبلہ کی طرف رُخ پھیرنا ﴿لَكَبِيْرَةً﴾ البتہ بھاری چیز ہے کیوں کہ ایک آدمی ایک کام کرتا رہے پھر اسے چھوڑنے کا کہا جائے تو اسے ناگوار معلوم ہوتا ہے ﴿اِلَّا عَلَى الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ﴾ مگر ان لوگوں پر جن کو

رب تعالیٰ نے ہدایت دی ہے۔ان کے لیے کوئی مشکل نہیں ہے۔وہ لوگ سب سے پہلے یہ بات دیکھتے ہیں کہ رب تعالیٰ کا حکم کیا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کیا فرمایا ہے اور کیا عمل کیا ہے۔ان کے سامنے اللہ اور اس کے رسول کا حکم سب سے مقدم ہوتا ہے۔

جس وقت قبلہ کی تبدیلی کا حکم دے دیا گیا تو وہ لوگ جنھوں نے تقریباً سولہ یا سترہ مہینے مسجد اقصیٰ کی طرف رُخ کر کے نمازیں پڑھی تھیں اور تبدیلی کے حکم سے پہلے فوت ہو گئے تھے تو بعض لوگوں کے دلوں میں خیال پیدا ہوا کہ ان کی نمازوں کا کیا بنے گا؟ کیوں جو زندہ ہیں وہ تو تدارک کر لیں گے اور جو مر گئے اُن کی نمازوں کا کیا بنے گا؟ کہیں اُن کی نمازیں ضائع تو نہیں ہو گئیں۔تو اللہ تعالیٰ نے اُن کا یہ شبہ دور فرما دیا اور فرمایا ﴿وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ﴾ اور نہیں ہے اللہ تعالیٰ کہ ضائع کر دے تمھاری عبادتیں اور تمھارے ایمان کو۔

اصل بات شریعت کا پابند ہونا ہے

ایمان وہی معتبر ہوگا جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات کے مطابق ہوگا۔اسی طرح عبادت بھی وہی صحیح ہوگی جو شریعت کے مطابق ہو۔جب تک مسجد اقصیٰ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کا حکم تھا تو وہی شرعی حکم تھا اور اسی کے مطابق نماز درست تھی، تو جن لوگوں نے اس حکم کی تعمیل کرتے ہوئے مسجد اقصیٰ کی جانب منہ کر کے نمازیں پڑھی ہیں انھوں نے کوئی جرم نہیں کیا بلکہ شرعی حکم ہی کو پورا کیا ہے، اس لیے یہ خیال کرنا کہ اُن کی نمازیں ضائع ہو گئیں یہ خیال درست نہیں ہے۔

اور اللہ تعالیٰ کی جانب سے احکام کی جو تبدیلی ہوتی ہے وہ اس لیے نہیں ہوتی کہ پہلے حکم پر عمل کی وجہ سے عمل یا ایمان کو ضائع کر دے بلکہ اس میں اس کی حکمت یہ ہوتی ہے کہ لوگوں کو آزمائے کہ کون قیل وقال کے بغیر حکم شرعی کو مانتا ہے اور کون انکار کرتا ہے۔جس نے پہلے حکم کو دل وجان سے مانا ہوگا وہ دوسرے حکم کو بھی دل وجان سے مان لے گا اور جس نے حکم ماننے سے انکار کیا تو ظاہر ہو گیا کہ یہ پختہ ایمان والا نہیں ہے۔تو احکامات کی تبدیلی میں یہ حکمت ہے کہ جس نے ایمان کی حالت میں شرعی حکم پر عمل کیا اُس کا وہ عمل ضائع نہیں ہوتا بلکہ اس کے عمل کی قدر کی جاتی ہے۔اس لیے کہ ﴿اِنَّ اللّٰهَ﴾ بے شک اللہ تعالیٰ ﴿بِالنَّاسِ﴾ لوگوں کے ساتھ ﴿لَرَءُوْفٌ﴾ البتہ شفقت کرنے والا ہے ﴿رَّحِيْمٌ﴾ مہربان ہے۔

﴿قَدْ نَرٰى﴾ تحقیق سے ہم دیکھتے ہیں ﴿تَقَلُّبَ وَجْهِكَ﴾ آپ کے چہرے کے پھرنے کو ﴿فِي السَّمَآءِ﴾ آسمان کی طرف ﴿فَلَنُوَلِّيَنَّكَ﴾ پس البتہ ضرور ہم آپ کو پھیر دیں گے ﴿قِبْلَةً﴾ اس قبلے کی طرف ﴿تَرْضٰىهَا﴾ جس کو آپ پسند کرتے ہیں ﴿فَوَلِّ وَجْهَكَ﴾ پس آپ پھیر دیں اپنا چہرہ ﴿شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ﴾ مسجد حرام کی طرف ﴿وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ﴾ اور جہاں کہیں تم ہو ﴿فَوَلُّوْا﴾ تو تم بھی پھیر لو ﴿وُجُوْهَكُمْ﴾ اپنے چہروں کو ﴿شَطْرَهٗ﴾ اسی مسجد حرام کی طرف ﴿وَاِنَّ الَّذِيْنَ﴾ اور بے شک وہ لوگ ﴿اُوْتُوا الْكِتٰبَ﴾ جن کو دی گئی کتاب ﴿لَيَعْلَمُوْنَ﴾

البتہ جانتے ہیں ﴿ اَنَّهُ الْحَقُّ ﴾ کہ بے شک یہ قبلے کی طرف منہ پھیرنا حق ہے ﴿ مِنْ رَّبِّهِمْ ﴾ ان کے رب کی طرف سے ﴿ وَمَا اللّٰهُ ﴾ اور نہیں ہے اللہ تعالیٰ ﴿ بِغَافِلٍ ﴾ غافل ﴿ عَمَّا ﴾ اس چیز سے ﴿ يَعْمَلُوْنَ ﴾ جو وہ کرتے ہیں ﴿ وَلَئِنْ ﴾ اور البتہ اگر ﴿ اَتَيْتَ الَّذِيْنَ ﴾ دیں آپ ان لوگوں کو ﴿ اُوْتُوا الْكِتٰبَ ﴾ جن کو دی گئی کتاب ﴿ بِكُلِّ اٰيَةٍ ﴾ ہر طرح کی نشانی ﴿ مَّا تَبِعُوْا قِبْلَتَكَ ﴾ وہ نہیں پیروی کریں گے آپ کے قبلے کی ﴿ وَمَا اَنْتَ ﴾ اور نہیں ہیں آپ ﴿ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ ﴾ ان کے قبلے کی پیروی کرنے والے ﴿ وَمَا بَعْضُهُمْ ﴾ اور نہیں ہیں ان کے بعض ﴿ بِتَابِعٍ قِبْلَةَ بَعْضٍ ﴾ پیروی کرنے والے بعض کے قبلہ کی ﴿ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ ﴾ اور اگر بالفرض آپ نے پیروی کی ﴿ اَهْوَآءَهُمْ ﴾ ان کی خواہشات کی ﴿ مِّنْ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ﴾ بعد اس کے کہ آپ کے پاس علم آچکا ہے ﴿ اِنَّكَ ﴾ بے شک آپ ﴿ اِذًا ﴾ اس وقت اگر ایسا کیا ﴿ لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴾ البتہ ناانصافوں میں سے ہوں گے ﴿ اَلَّذِيْنَ ﴾ وہ لوگ ﴿ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ ﴾ جن کو دی ہم نے کتاب ﴿ يَعْرِفُوْنَهٗ ﴾ پہچانتے ہیں اس کو ﴿ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ ﴾ جیسے پہچانتے ہیں اپنے بیٹوں کو ﴿ وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنْهُمْ ﴾ اور بے شک ایک گروہ ان میں سے ﴿ لَيَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ ﴾ البتہ چھپاتا ہے حق کو ﴿ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴾ حالانکہ وہ جانتے ہیں ﴿ اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ ﴾ حق آپ کے رب کی طرف سے ہے ﴿ فَلَا تَكُوْنَنَّ ﴾ پس آپ ہرگز نہ ہوں ﴿ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ﴾ شک کرنے والوں میں سے۔

ماقبل سے ربط

اس سے پہلے درس میں یہ بات قدرے تفصیل کے ساتھ بیان ہو چکی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب مکہ مکرمہ میں تھے تو کعبۃ اللہ کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھتے تھے۔ جس وقت ہجرت کر کے مدینہ طیبہ تشریف لے گئے تو اللہ تعالیٰ کا حکم ہوا کہ اب تم مسجد اقصیٰ کی طرف چہرہ کر کے نمازیں پڑھو۔ سولہ یا سترہ مہینے آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے مسجد اقصیٰ کی طرف چہرہ کر کے نمازیں پڑھیں۔

تحویل قبلہ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خواہش

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے دل سے اس کو پسند کرتے تھے کہ کعبۃ اللہ ہمارا قبلہ بن جائے اور اس کی ظاہری وجہ یہ تھی کہ مسجد اقصیٰ یہود و نصاریٰ کا قبلہ تھا اور ان کے بارے میں قرآن کریم نے واضح کیا کہ یہ لوگ جانتے ہوئے بھی حق کو نہیں مانتے۔ بڑے ضدی لوگ ہیں۔ ان سے تو ایمان لے آنے کی توقع بہت کم تھی۔

عرب کے جو مشرک تھے وہ کعبۃ اللہ کا احترام کرتے تھے اور ابراہیم علیہ السلام کی طرف اپنی نسبت کرتے تھے۔ اور جو کچھ

بھی کرتے تھے اپنی جہالت کی وجہ سے کرتے تھے۔ضد بھی ان میں تھی مگر ایسے لوگ کم تھے، اکثر جہالت کا شکار تھے۔مگر یہودی اور نصرانی جو کچھ کرتے تھے وہ ضد کی بنا پر کرتے تھے۔اس کو اس طرح سمجھو جیسے کہ آج کل عوام بے چارے اکثر جہالت کا شکار ہیں۔ان کو اللہ تعالیٰ کی ذات سے کوئی عداوت نہیں ہے، آنحضرت ﷺ کی ذات گرامی سے کوئی دشمنی نہیں ہے، اسلام کے ساتھ ان کو کوئی مخالفت نہیں ہے بلکہ وہ جو کچھ کرتے ہیں صرف جہالت کی بنا پر کرتے ہیں۔ان کے ذہن میں یہ بٹھا دیا گیا ہے کہ جو ہمارے عقیدے ہیں وہی عزت اور احترام والے ہیں اور جو عقیدے ان کے علاوہ ہیں وہ توہین والے ہیں۔مثال کے طور پر جاہلوں کا یہ عقیدہ ہے کہ آنحضرت ﷺ اور تمام پیغمبر اور تمام ولی اور بزرگ بھی ہر جگہ حاضر و ناظر ہوتے ہیں۔اس کو وہ ان کی عزت سمجھتے ہیں حالاں کہ اگر غور کیا جائے تو اس میں ان بزرگوں کی سخت توہین ہے۔توہین کیوں ہے کہ بھائی! ہمارے تمھارے جیسے گناہ گار تو ہر جگہ جانا پسند نہیں کرتے۔شراب خانے، جوئے خانے، چکلے اور دوسری بُری جگہوں میں جانا کوئی شریف آدمی پسند نہیں کرتا۔تو اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں کو وہاں موجود ماننا اس میں ان کی عزت ہے یا توہین ہے؟ کتنی واضح بات ہے مگر وہ نہیں سمجھتے۔

اسی طرح وہ سمجھتے ہیں کہ ان نیک بندوں کے لیے تمام چیزوں کا علم ثابت کریں گے تو اس میں ان کی عزت ہوگی حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اس میں بھی ان کی توہین ہے۔اور پہلے پارے میں تم پڑھ چکے ہو ﴿وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ﴾ کہ لوگوں نے حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرف جادو کی نسبت کی کہ وہ جادو کا علم جانتے تھے۔اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ﴾ سلیمان علیہ السلام نے کفر نہیں کیا۔نہ اُنھوں نے جادو پڑھا اور نہ سیکھا۔تو جن چیزوں کو اللہ تعالیٰ کفر فرمائے اور جو بُری چیزیں ہیں ان کے علم میں کون سی عزت کی بات ہے؟ عوام بے چارے یہ سمجھتے ہیں کہ ان کے لیے ساری چیزوں کا علم مانیں گے تو تب ان کی عزت ہوگی۔جیسے: جادو ہے یا بہت ساری شعبدہ بازی کی چیزیں ہیں، موسیقی کا علم ہے ان کے جاننے میں ان کی کون سی عزت ہے۔

درود شریف حضور ﷺ پر پہنچایا جاتا ہے:

اسی طرح جاہل یہ سمجھتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ براہِ راست خود ہمارا درود شریف وصول کرتے ہیں، جب بھی ہم پڑھتے ہیں تو آپ سنتے ہیں اس کو وہ آپ ﷺ کی تعظیم سمجھتے ہیں حالاں کہ حقیقت میں معاذ اللہ تعالیٰ اس میں بڑی توہین ہے۔

دیکھو! ہمارے خط آتے ہیں، پارسل آتے ہیں ڈاک خانے کے ذریعے تو تم اگر خود جا کر ڈاک خانے سے وصول کرو تو اس میں تمھاری عزت ہے یا ڈاکیا لاکر خود تمھارے گھر پہنچائے اس میں تمھاری عزت ہے؟ اسی طرح سمجھو کہ ہم تم جو درود شریف پڑھتے ہیں یہ اللہ تعالیٰ کے فرشتے جو اس کام کے لیے مقرر ہیں وہ لے جاتے ہیں۔آنحضرت ﷺ کو خود آکر وصول کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔اگر آپ ﷺ آکر خود وصول کریں تو اس میں آپ ﷺ کی عزت نہیں بلکہ توہین ہوگی۔یہ درود شریف پہنچانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے فرشتے مقرر فرمائے ہیں وہ پہنچاتے ہیں۔ اِنَّ لِلّٰهِ مَلٰٓئِكَةً سَيَّاحِيْنَ فِي الْاَرْضِ يُبَلِّغُوْنِيْ

مِنْ اُمَّتِیَ السَّلَامَ۔ یہ نسائی شریف کی صحیح روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کا ایک محکمہ قائم کیا ہے وہ تمھارے دور سے پڑھے ہوئے درود شریف مجھے پہنچاتے ہیں اور اگر میری قبر کے نزدیک آکر پڑھو گے تو میں خود سنوں گا۔

تو جاہل لوگوں کا یہ خیال ہے کہ آپ ﷺ خود آکر ہمارے درود شریف وصول کرتے ہیں۔ اس میں آپ ﷺ کی توہین ہے۔ عزت اسی میں ہے کہ ڈاکیے پہنچائیں۔ بات تو ساری سمجھ کی ہے۔ تو یہ بے چارے جو کچھ کرتے ہیں یہ جہالت کی وجہ سے کرتے ہیں ضد نہیں ہے۔ ان کے مولویوں نے ان کے ذہن بگاڑے ہیں۔

یہاں جو پُرانے بزرگ ہیں اُنھوں نے حافظ اللہ داد صاحب مرحوم کو دیکھا ہوگا۔ گجرات میں ایک مقام ہے ٹپیالا ساہیاں۔ وہاں کے رہنے والے تھے۔ پنجابی میں بہت اچھا وعظ فرماتے، کوٹ وارث گاؤں میں ایک جلسہ تھا، جلسے سے فارغ ہو کر وہ درمیان والے راستے سے گکھڑ آئے، اور وہ ضروری اور اہم کتابوں کی گٹھڑی بھی ساتھ رکھتے تھے، راستے میں کمہار گدھے لے کر گکھڑ آرہے تھے۔ حافظ صاحب مرحوم نے ان کو کہا کہ اگر تم اجازت دو تو میں تمھارے گدھے پر یہ کتابوں کی گٹھڑی بھی رکھ دوں۔ اُنھوں نے کہا کہ رکھ دو۔ اُنھوں نے حافظ صاحب سے پوچھا کہ تم نے کہاں جانا ہے؟ تو حافظ صاحب نے میرا نام لیا (یعنی شیخ الحدیث والتفسیر مولانا محمد سرفراز خان صفدر) کے پاس جانا ہے۔ وہ کمہار کہنے لگے کہ اس کے پاس نہ جاؤ وہ تو کلمے کا منکر ہے۔ حافظ صاحب نے کہا کہ نہیں بھائی وہ تو کلمہ پڑھتا ہے۔ پھر کہنے لگے کہ وہ معراج کا منکر ہے کہ وہ کہتا ہے کہ (معاذ اللہ تعالیٰ) آنحضرت ﷺ کو معراج نہیں ہوئی۔

تو حافظ صاحب کی کتابوں میں میرا رسالہ تھا "ضوء السراج فی تحقیق المعراج یعنی چراغ کی روشنی" انھی دنوں میں طبع ہوا تھا۔ حافظ صاحب نے وہ گٹھڑی سے نکال کر ان کو سنانا شروع کر دیا اور خاصا پڑھ کر سنایا اور کہا کہ معراج کو جتنا اس نے دلیلوں کے ساتھ ثابت کیا ہے اتنا اور کسی نے نہیں کیا۔ تو جب گکھڑ کے قریب آئے تو کہنے لگے کہ ہمیں تو کسی شے کا علم نہیں ہے ہمیں تو ہمارے مولوی کہتے ہیں کہ وہ معراج کا بھی منکر ہے اور کلمے کا بھی۔

تو ان مولویوں نے عوام کے اتنے ذہن بگاڑے ہوئے ہیں کہ وہ ان کو حق والوں کے نزدیک آنے ہی نہیں دیتے۔ جو شخص ہماری بات سُن لے تسلی کے ساتھ اور ضد نہ کرے تو ان شاء اللہ اسے حق ضرور سمجھ آجائے گا اور ضد کا تو دنیا میں کوئی علاج ہی نہیں ہے۔

تو یہ بیان ہو رہا تھا کہ آنحضرت ﷺ اس کو پسند کرتے تھے کہ کعبۃ اللہ قبلہ بن جائے کیوں کہ اکثریت عربوں کی ہے وہ جو کچھ کرتے ہیں جہالت کی وجہ سے کرتے ہیں لہٰذا ان کو سمجھانا آسان ہے اور یہودیوں اور عیسائیوں کو سمجھانا مشکل ہے۔ اس واسطے آپ ﷺ اس کو پسند کرتے تھے کہ میرا قبلہ کعبۃ اللہ بن جائے اور اس کے لیے وحی کے انتظار میں چہرہ بار بار آسمان کی طرف اُٹھاتے تھے۔

تو اس کا ذکر رب تعالیٰ فرماتے ہیں ﴿قَدْ نَرٰی﴾ تحقیق سے ہم دیکھتے ہیں ﴿تَقَلُّبَ وَجْهِكَ﴾ آپ کے چہرے کے

پھرنے کو ﴿فِي السَّمَآءِ﴾ آسمان کی طرف ﴿فَلَنُوَلِّيَنَّكَ﴾ پس البتہ ہم ضرور پھیر دیں گے آپ کو ﴿قِبْلَةً تَرْضٰىهَا﴾ اس قبلے کی طرف جس کو آپ پسند کرتے ہیں۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پسند کرنے کی دوسری وجہ یہ تھی کہ عرب کے لوگوں میں اکثریت ان لوگوں کی تھی جو قبلے کا احترام کرتے تھے۔ تو اس قبلے کو چھوڑ کر ان کو منوانا ذرا مشکل تھا۔ تو اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آرزو کے مطابق حکم نازل فرمایا ﴿فَوَلِّ وَجْهَكَ﴾ پس آپ پھیر دیں اپنا چہرہ ﴿شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ﴾ مسجد حرام کی طرف۔ اس کو کعبۃ اللہ بھی کہتے ہیں اور مسجد حرام بھی۔

پھر آگے اُمتیوں کو خطاب کیا ﴿وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ﴾ اور اے اُمتیو! جہاں کہیں تم ہو ﴿فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ﴾ اپنا رُخ کعبۃ اللہ کی طرف پھیر لو۔ ہم کعبہ سے مشرق کی طرف ہیں، ہم مغرب کی طرف چہرہ کریں گے۔ اور جو کعبہ سے مغرب کی طرف ہیں وہ مشرق کی طرف چہرہ کریں گے۔ اور جو کعبہ سے شمال کی طرف ہیں وہ جنوب کی طرف چہرہ کریں گے اور جو کعبہ سے جنوب کی طرف ہیں وہ شمال کی طرف چہرہ پھیریں گے۔

جب تک کعبۃ اللہ ہے دنیا قائم ہے

کعبۃ اللہ عین وسط میں ہے اور مکہ کا معنیٰ ہے ناف۔ بچہ جب ماں کے پیٹ میں ہوتا ہے اللہ تعالیٰ نے اس کی خوراک کا ذریعہ اس طرح بنایا ہے کہ جہاں ناف ہوتی ہے وہاں ایک نالی ہوتی ہے جو ماں کے جسم کے ساتھ جڑی ہوتی ہے اس میں سے خون اس بچے کے بدن میں جاتا ہے جس سے وہ پلتا اور پھلتا پھولتا ہے۔ اور جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو وہ ناڑو، رگ کاٹ دی جاتی ہے۔ اسی طرح رُوحانی خوراک کا مرکز مکہ مکرمہ ہے یہیں سے ہدایت کی کرنیں مشرق، مغرب، شمال اور جنوب کی طرف پھیلی ہوئی ہیں۔ جب تک مکہ مکرمہ موجود ہے دنیا قائم ہے۔

حدیث پاک میں آتا ہے کہ کالے رنگ کا بادشاہ ہوگا ٹیڑھی اور موٹی موٹی اس کی ٹانگیں ہوں گی، اس کے ساتھ اس کی فوج ہوگی۔ وہ آکر کعبۃ اللہ کی دیواروں کو ادھیڑنا شروع کرے گا تو اللہ تبارک وتعالیٰ اسرافیل علیہ السلام کو حکم دیں گے کہ بگل پھونک دو کہ اگر یہ کعبۃ اللہ کو نہیں رہنے دیتے تو دنیا کا نظام اب ختم ہے۔ کعبہ کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿قِيٰمًا لِّلنَّاسِ﴾ تو جب تک کعبہ موجود ہے دنیا بھی موجود ہے۔

تو فرمایا پھیر دو تم بھی اپنے چہروں کو مسجد حرام کی طرف ﴿وَاِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ﴾ اور بے شک وہ لوگ جن کو کتاب دی گئی یعنی یہود و نصاریٰ ﴿لَيَعْلَمُوْنَ﴾ البتہ جانتے ہیں ﴿اَنَّهُ الْحَقُّ﴾ کہ بے شک یہ قبلے کی طرف رُخ پھیرنا حق ہے کیوں کہ پہلی کتابوں میں اس کی تصریح تھی کہ نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم نبی القبلتین ہوں گے۔ پہلے ان کا قبلہ کعبہ ہوگا پھر مسجد اقصیٰ اور آخر میں ان کا قبلہ پھر کعبہ ہی ہوگا۔ اور یہ لوگ جانتے ہیں کہ کعبۃ اللہ کی طرف رُخ کرنا حق ہے اور ﴿مِنْ رَّبِّهِمْ﴾ ان کے رب کی طرف سے ہے ﴿وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ﴾ اور نہیں ہے اللہ تعالیٰ غافل اُن کاموں سے جو وہ کرتے ہیں۔ اور جو کچھ

کرتے ہیں ضد کی بنا پر کرتے ہیں لہٰذا ان سے توقع نہ رکھیں۔ ﴿وَلَئِنْ اَتَیْتَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ﴾ اور اگر آپ دیں ان لوگوں کو جن کو کتاب دی گئی یعنی یہود و نصاریٰ کو ﴿بِكُلِّ اٰیَةٍ﴾ ہر قسم کی نشانی آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو دکھائیں ﴿مَّا تَبِعُوْا قِبْلَتَكَ﴾ یہ لوگ آپ کے قبلے کی پیروی نہیں کریں گے۔ اس لیے کہ ضد اور ہٹ دھرمی کا تو دنیا میں کوئی علاج نہیں ہے ﴿وَمَاۤ اَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ﴾ اور آپ ان کے قبلے کی پیروی نہیں کر سکتے۔ کیوں کہ آپ تو ہمارے حکم کے پابند ہیں ﴿وَمَا بَعْضُهُمْ بِتَابِعٍ قِبْلَةَ بَعْضٍ﴾ اور ان میں سے بھی بعض بعض کے قبلے کی پیروی نہیں کرتے۔ ہر ایک کا الگ الگ قبلہ بنا ہوا ہے۔ یہود کا قبلہ مسجد اقصیٰ میں ایک چٹان صخرہ بیت المقدس، یہود کا وہ قبلہ تھا۔ اور اس چٹان سے مشرق کی طرف والا حصہ عیسائیوں کا قبلہ تھا وہ اپنے قبلے پر مُصر تھے اور یہ اپنے قبلے پر مُصِر تھے۔

وفد نصاریٰ کی آمد

ہجرت کے نویں (۹) سال نجران کے عیسائیوں کا وفد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا وہ ساٹھ آدمی تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مشورہ کیا کہ ساٹھ آدمیوں کا ایک جگہ اکٹھا ٹھہرانے کا تو ہمارے پاس انتظام نہیں ہے۔ آج کے دور جیسی کوٹھیاں تو نہیں تھیں کہ ہزاروں آدمی ان میں آجائیں، سادہ زمانہ تھا چھوٹے چھوٹے مکان ہوتے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس طرح کرو کہ دو، دو، تین، تین آدمی تقسیم کرلو۔ ان کو سہولت رہے گی اور تم بھی آرام میں رہو گے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وفد والوں کے سامنے یہ بات فرمائی کہ ہم غریب لوگ ہیں ہمارے پاس کوئی اتنا بڑا مکان نہیں ہے کہ ہم ساٹھ آدمیوں کا اکٹھا انتظام کرسکیں۔ اس لیے ہم دو، دو، تین، تین آدمی تقسیم کرکے تمھاری مہمانی کریں گے۔ وہ کہنے لگے کہ نہیں ایسا نہیں ہوگا بلکہ ہم تو اکٹھے رہنا پسند کریں گے۔ ان کے پادریوں نے یہ خیال کیا کہ یہ جو ہماری بھیڑیں ہیں یہ ہم سے جدا نہ ہوں تاکہ یہ مسلمانوں سے متاثر نہ ہوں ہمارا ہی اثر ان پر رہے۔

تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ پھر ہمارے پاس تو مسجد کے علاوہ کوئی ایسی جگہ نہیں ہے۔ کہنے لگے ہم مسجد ہی میں رہیں گے۔ چنانچہ ان ساٹھ عیسائیوں کا وفد مسجد میں ٹھہرایا گیا۔ وہ کہنے لگے کہ ہم نے اپنی نماز بھی پڑھنی ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا پڑھتے رہو۔ چنانچہ وہ مسجد نبوی میں اپنے قبلے کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھتے رہے اور دو تین دن اسی طرح رہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے فرمایا ان کو کچھ نہ کہو بلکہ وہ جو کچھ کرتے ہیں کرنے دو۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا اگر آپ ہر قسم کی نشانی ان کے سامنے پیش کریں یہ مکر رہے ﴿مَّا تَبِعُوْا قِبْلَتَكَ﴾ وہ آپ کے قبلے کی پیروی نہیں کریں گے ﴿وَمَاۤ اَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ﴾ اور نہ آپ ان کے قبلے کی پیروی کر سکتے ہیں اس واسطے کہ آپ ہمارے حکم کے پابند ہیں ﴿وَمَا بَعْضُهُمْ﴾ اور نہیں ہیں بعض ان کے ﴿بِتَابِعٍ قِبْلَةَ بَعْضٍ﴾ پیروی کرنے والے بعض کے قبلے کی ﴿وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ﴾۔ یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت کو سمجھایا جارہا ہے اور اگر بالفرض آپ نے پیروی کی ان کی

خواہشات کی ﴿مِنۡۢ بَعۡدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الۡعِلۡمِ﴾ بعد اس کے کہ آپ کے پاس علم آچکا ہے ﴿اِنَّكَ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيۡنَ﴾ بے شک اس وقت آپ کا شمار ظالموں میں ہوگا۔

ہمارے حضرت مولانا حسین علی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ فرمایا کرتے تھے: "گفتہ آید در حدیثِ دیگراں" بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ خطاب کسی کو ہوتا ہے اور سمجھانا کسی کو ہوتا ہے۔ یہ خطاب تو آپ ﷺ سے ہے لیکن سمجھایا گیا ہے آپ ﷺ کی اُمت کو کہ یہود و نصاریٰ اور باطل فرقوں کی پیروی نہ کرنا اگر ایسا کرو گے تو تمھارا شمار ظالموں میں ہوگا۔

﴿اَلَّذِيۡنَ اٰتَيۡنٰهُمُ الۡكِتٰبَ﴾ وہ لوگ جن کو ہم نے کتاب دی، یہودی اور عیسائی ﴿يَعۡرِفُوۡنَهٗ﴾ وہ اس نبی کو جانتے ہیں ﴿كَمَا يَعۡرِفُوۡنَ اَبۡنَآءَهُمۡ﴾ جیسے وہ اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں۔ اس آیت کریمہ کی تفسیر میں بہت سی تفسیروں حتیٰ کہ جلالین تک میں موجود ہے کہ عبداللہ بن سلام جو پہلے یہودی تھے پھر مسلمان ہوئے۔ اُنھوں نے یہ لفظ کہے کہ یہ شک تو ہوسکتا ہے کہ ہماری بیویوں نے کچھ خیانت کی ہو لیکن حضور پاک ﷺ کے بارے میں ہمیں کوئی شک نہیں ہے بلکہ آپ وہی پیغمبر ہیں جن کی صفات پہلی کتابوں میں بیان کی گئی ہیں۔

ایسے لوگ بھی تھے اور ان کے خلاف بھی تھے جن کا ذکر اس طرح ہوا ﴿وَاِنَّ فَرِيۡقًا مِّنۡهُمۡ﴾ اور بے شک ایک گروہ ان میں سے ﴿لَيَكۡتُمُوۡنَ الۡحَـقَّ﴾ البتہ حق کو چھپاتا ہے ﴿وَهُمۡ يَعۡلَمُوۡنَ﴾ حالاں کہ وہ جانتے ہیں۔ ساری نشانیاں ان کے سامنے ہیں وہ جانتے ہیں کہ وہی پیغمبر ہیں جنھوں نے آنا تھا مگر وہ ضد کا شکار ہوگئے اور ضد کا دنیا میں کوئی علاج نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ﴿اَلۡحَـقُّ مِنۡ رَّبِّكَ﴾ حق تیرے رب کی طرف سے ہے ﴿فَلَا تَكُوۡنَنَّ مِنَ الۡمُمۡتَرِيۡنَ﴾ پس ہرگز نہ ہوں آپ شک کرنے والوں میں سے۔ یعنی یہود و نصاریٰ کے نہ ماننے سے آپ تردد میں نہ پڑیں۔ یہاں بھی خطاب آپ ﷺ سے ہو اگر سمجھانا آپ ﷺ کی اُمت کو ہے۔

﴿وَلِكُلٍّ﴾ اور ہر اُمت کے واسطے ﴿وِّجۡهَةٌ﴾ ایک قبلہ تھا ﴿هُوَ مُوَلِّيۡهَا﴾ وہ اس کی طرف اپنا چہرہ پھیرتا تھا ﴿فَاسۡتَبِقُوا الۡخَيۡرٰتِ﴾ پس تم سبقت لے جاؤ نیکیوں میں ﴿اَيۡنَ مَا تَكُوۡنُوۡا﴾ جہاں بھی تم ہو گے ﴿يَاۡتِ بِكُمُ اللّٰهُ﴾ لے آئے گا تمھیں اللہ تعالیٰ ﴿جَمِيۡعًا﴾ سب کو ﴿اِنَّ اللّٰهَ﴾ بے شک اللہ تعالیٰ ﴿عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ قَدِيۡرٌ﴾ ہر چیز پر قادر ہے ﴿وَمِنۡ حَيۡثُ خَرَجۡتَ﴾ اور جس جگہ سے آپ نکلیں سفر میں ﴿فَوَلِّ وَجۡهَكَ﴾ پس آپ پھیریں اپنا چہرہ ﴿شَطۡرَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَـرَامِ﴾ مسجد حرام کی طرف ﴿وَاِنَّهٗ﴾ اور بے شک یہ چہرہ پھیرنا ﴿لَلۡحَـقُّ مِنۡ رَّبِّكَ﴾ البتہ حق ہے آپ کے رب کی طرف سے ﴿وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ﴾ اور نہیں ہے اللہ تعالیٰ بے خبر ﴿عَمَّا تَعۡمَلُوۡنَ﴾ اس کارروائی سے جو تم کرتے ہو ﴿وَمِنۡ حَيۡثُ خَرَجۡتَ﴾ اور جہاں سے بھی تم نکل کر جاؤ ﴿فَوَلِّ وَجۡهَكَ﴾ پس آپ پھیریں اپنا

چہرہ ﴿ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ﴾ مسجد حرام کی طرف ﴿ وَحَیْثُ مَا كُنْتُمْ ﴾ اور اے اُمتیو! جہاں کہیں بھی تم ہو ﴿ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ ﴾ پس پھیرو اپنے چہرے ﴿ شَطْرَهٗ ﴾ اس مسجد حرام کی طرف ﴿ لِئَلَّا یَكُوْنَ ﴾ تا کہ نہ ہو ﴿ لِلنَّاسِ ﴾ لوگوں کے واسطے ﴿ عَلَیْكُمْ ﴾ تمھارے اوپر ﴿ حُجَّةٌ ﴾ کوئی الزام ﴿ اِلَّا الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا ﴾ مگر وہ لوگ جو ظالم ہیں ﴿ مِنْهُمْ ﴾ ان میں سے ﴿ فَلَا تَخْشَوْهُمْ ﴾ پس تم ان سے نہ ڈرو ﴿ وَاخْشَوْنِیْ ﴾ اور مجھ سے ڈرو ﴿ وَلِاُتِمَّ نِعْمَتِیْ ﴾ اور تا کہ میں مکمل کروں اپنی نعمت ﴿ عَلَیْكُمْ ﴾ تم پر ﴿ وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴾ اور تا کہ تم ہدایت پا جاؤ ﴿ كَمَاۤ اَرْسَلْنَا فِیْكُمْ ﴾ جیسا کہ ہم نے بھیجا تم میں ﴿ رَسُوْلًا ﴾ رسول ﴿ مِّنْكُمْ ﴾ تم میں سے ﴿ یَتْلُوْا عَلَیْكُمْ ﴾ جو تلاوت کرتا ہے تم پر ﴿ اٰیٰتِنَا ﴾ ہماری آیتیں ﴿ وَیُزَكِّیْكُمْ ﴾ اور تمھیں پاک کرتا ہے ﴿ وَیُعَلِّمُكُمُ ﴾ اور وہ تمھیں تعلیم دیتا ہے ﴿ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ﴾ کتاب اور دانائی کی ﴿ وَیُعَلِّمُكُمْ ﴾ اور تمھیں تعلیم دیتا ہے ﴿ مَّا ﴾ اُن چیزوں کی ﴿ لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ﴾ جن کو تم نہیں جانتے تھے ﴿ فَاذْكُرُوْنِیْۤ ﴾ پس تم مجھے یاد کرو ﴿ اَذْكُرْكُمْ ﴾ میں تمھیں یاد کروں گا ﴿ وَاشْكُرُوْا لِیْ ﴾ اور میرا شکریہ ادا کرو ﴿ وَلَا تَكْفُرُوْنِ ﴾ اور میری ناشکری نہ کرو۔

پانچ نمازوں کی فرضیت

اس سے پہلے قبلے کا مسئلہ خاصی تفصیل کے ساتھ بیان ہو چکا ہے اور نماز کے صحیح ہونے کی شرائط میں سے ایک شرط استقبالِ قبلہ بھی ہے۔ یعنی نماز میں اپنا چہرہ قبلے کی طرف کریں، معراج کی رات پانچ نمازیں فرض ہوئیں، اُس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکہ مکرمہ میں تھے اور معراج کا واقعہ نبوت کے گیارھویں سال ہوا۔ اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم تین سال مکہ مکرمہ میں تشریف فرما ہوئے اور کعبۃ اللہ کی طرف چہرہ کر کے نماز پڑھتے تھے اور نفلی نماز اور وضو کا طریقہ تو ابتداء وحی سے شروع ہوا ہے۔

جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم غارِ حرا میں تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی ملی، اُسی دن جبرئیل علیہ السلام نے پَر مارا اور اس جبلِ نور کی چوٹی پر ایک پانی کا چشمہ جاری ہوا اس جگہ پر آج کل عربوں نے سفید چونا ڈالا ہے یہ علامت ہے کہ یہاں پر چشمہ تھا اگرچہ وہ بتاتے نہیں ہیں۔ تو وہاں سے پانی نکلا اور جبرئیل علیہ السلام نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو وضو کا طریقہ بتایا اور پھر نماز کا طریقہ بتایا۔ تو وضو اور نفلی نماز ابتداء وحی سے شروع ہوئی ہے اور پانچ نمازیں معراج کی رات فرض ہوئیں اس کے بعد جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت فرما کر مدینہ طیبہ تشریف لے گئے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم ہوا کہ تم نے نمازیں مسجد اقصیٰ کی طرف چہرہ کر کے پڑھنی ہیں۔

مسجد اقصیٰ کے متعلق یاد رکھنا کہ اس کی تعمیر حضرت یعقوب علیہ السلام نے نمازوں کے لیے کی تھی اور جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مسجد حرام کی تعمیر کی اس کے چالیس سال بعد یہ تعمیر حضرت یعقوب علیہ السلام نے کی تھی۔ چھوٹی سی جگہ تھی چھپر ڈال کر

وہاں نمازیں پڑھتے تھے۔تو اصل بانی مسجد اقصیٰ کے حضرت یعقوب علیہ السلام ہیں جن کا لقب اسرائیل ہے۔پھر جب حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانے میں لوگ زیادہ ہوئے تو اس میں توسیع کی گئی پھر جب حضرت سلیمان علیہ السلام کا دور آیا تو انھوں نے شاہی طور طریقہ کے ساتھ اسے وسیع کیا۔تو اصل بانی اس کے حضرت یعقوب علیہ السلام ہیں اور مسجد حرام کے چالیس سال بعد بنی جیسا کہ بخاری شریف کی روایت میں آتا ہے۔

جب مسجد اقصیٰ کی طرف چہرہ کر کے نماز پڑھنے کا حکم ہوا تو سولہ یا سترہ مہینے مسلسل آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد اقصیٰ کی طرف چہرہ کر کے نماز پڑھی لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم طبعی طور پر یہ چاہتے تھے کہ ہمارا قبلہ کعبۃ اللہ ہو اس واسطے کہ عرب کی اکثریت کعبۃ اللہ کا احترام کرتی تھی اور اپنے آپ کو ابراہیمی کہتے تھے۔ان لوگوں سے قبولِ اسلام کی توقع دوسروں کی نسبت کچھ زیادہ تھی کیوں کہ یہود و نصاریٰ ضدی لوگ تھے ان سے توقع بہت کم تھی۔تو اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز کے اندر ہی حکم دیا کہ تم کعبۃ اللہ کی طرف چہرہ پھیر لو۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ﴿وَلِكُلٍّ﴾ اور ہر اُمت کے واسطے ﴿وِّجْهَةٌ﴾ قبلہ تھا۔یہ بات بھی پہلے بیان ہو چکی ہے کہ یہود کا قبلہ مسجد اقصیٰ میں ایک صخرہ نامی چٹان تھی جو کافی بڑی تھی۔اور نصاریٰ کا قبلہ اس چٹان سے مشرق کی طرف والا حصہ تھا تو جس طرح ان کے یہ قبلے ہیں اسی طرح اب اللہ تعالیٰ نے تمھارے لیے یہ کعبۃ اللہ قبلہ مقرر فرما دیا ہے۔اور ہر اُمت کے واسطے اللہ تعالیٰ نے قبلہ مقرر کیا ہوا تھا ﴿هُوَ مُوَلِّيهَا﴾ وہ امت اس قبلہ کی طرف چہرہ کر کے نماز پڑھتی تھی ﴿فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ﴾ پس تم نیکی کے کاموں میں جلدی کرو۔نیکی کے کاموں میں تاخیر نہیں کرنی چاہیے۔جو بھی قولاً یا فعلاً نیکی کرنی ہو اس کو جلدی کرو۔زندگی کا کوئی اعتبار نہیں ہے خدا جانے کہ بعد میں زندگی ملے یا نہ ملے اور پھر دل کا بھی کوئی اعتبار نہیں کہ کس وقت خیر کی صلاحیت پیدا ہو۔لہٰذا نیکی میں تاخیر نہیں کرنی چاہیے۔

﴿اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا﴾ جہاں کہیں بھی تم ہو۔مشرق میں ہو یا مغرب میں ہو،شمال میں ہو یا جنوب میں،کسی بھی ملک میں ہو یاد رکھو!﴿يَاْتِ بِكُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا﴾ اللہ تعالیٰ تم سب کو قیامت والے دن میدانِ محشر میں اکٹھا کرے گا۔گویا تم اس بات کو ذہن میں رکھو کہ ایک ایسا وقت آئے گا جب ہم سب رب تعالیٰ کی عدالت میں پیش ہوں گے اور ہم سے نیکی اور بدی کا سوال ہوگا۔اور تم یہ نہ سمجھو کہ قیامت آنی مشکل ہے یا دوبارہ زندگی مشکل ہے جیسا کہ عرب کے مشرک دوبارہ زندہ ہونے کا انکار کرتے تھے اور کہتے تھے ﴿هَيْهَاتَ هَيْهَاتَ لِمَا تُوْعَدُوْنَ﴾ [المومنون:۳۶] "بہت دور ہے،بہت دور ہے وہ جس کا تم وعدہ کیے جاتے ہو۔" ﴿مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيْمٌ﴾ [یٰسین:۷۸] "بوسیدہ ہڈیوں کو کون زندہ کرے گا۔"

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یاد رکھو!اللہ تعالیٰ سب کو میدانِ محشر میں لے آئے گا ﴿اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ﴾ بے شک رب تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔جس رب نے تمھیں حقیر قطرے سے پیدا کر کے اچھا بھلا انسان بنایا وہی رب تعالیٰ تمھیں قیامت والے دن دوبارہ لائے گا۔

معذور کی نماز :

پہلے مسئلہ یہ تھا کہ جب بندہ مقیم ہو اس وقت بھی نماز کی حالت میں قبلے کی طرف چہرہ کرنا ہے اور جب مسافر ہو تو سفر میں بھی قبلے کی طرف رُخ کرنا ہے اور یہ مسئلہ میں کئی دفعہ بیان کر چکا ہوں کہ بعض اچھے بھلے بھی ریل گاڑی میں بیٹھ کر نماز پڑھتے ہیں کھڑے ہونے کی طاقت رکھنے والے کی نماز بیٹھ کر بالکل نہیں ہوتی۔ جس طرح نماز فرض ہے اسی طرح طاقت والے کے لیے قیام بھی فرض ہے۔ ہاں! اگر کوئی بوڑھا آدمی ہے تو اس کی بات الگ ہے، بیمار ہے تو اس کا معاملہ جُدا ہے۔ تندرست آدمی گاڑی میں بیٹھ کر نماز پڑھے تو نماز بالکل نہیں ہوتی۔ اسی طرح بعض لوگ جس طرف رُخ ہوتا ہے اُدھر ہی رُخ کر کے نماز پڑھ لیتے ہیں (گاڑی وغیرہ میں) اس سے بھی نماز ادا نہیں ہوگی، گاڑی میں بھی سفر میں بھی رُخ قبلے کی طرف کرنا ضروری ہے۔

کئی عورتیں قصبوں سے دَم کرانے اور تعویذوں کے لیے آتی ہیں، اُن میں سے جو نمازیں پڑھتی ہیں وہ گھر کی عورتوں کو کہتی ہیں کہ ہمیں مصلی (جائے نماز) دیں ہم نے نماز پڑھنی ہے اور پڑھتی بیٹھ کر ہیں۔ ان سے کون کہے کہ تم گاؤں سے سودا سلف یا تعویذ وغیرہ لینے کے لیے آگئی ہو مگر نماز بیٹھ کر کس طرح جائز ہوگی؟ قطعاً بری الذمہ نہیں ہوں گی۔ صرف وہ آدمی بیٹھ کر پڑھ سکتا ہے جس میں کھڑے ہونے کی بالکل طاقت نہیں خواہ مرد ہو یا عورت۔ تو قیام کرنا بھی فرض ہے اور قبلے کی طرف رُخ کرنا بھی اور اگر گاڑی قبلے سے دوسری طرف پھر جائے تو نمازی کو بھی اسی قبلے کی طرف پھرنا ہوگا۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ﴿ وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ ﴾ اے نبی کریم ﷺ! تم اپنے گھر سے نکل کر سفر پر جہاں کہیں بھی جاؤ ﴿ فَوَلِّ وَجْهَكَ ﴾ پس پھیرو اپنا چہرہ ﴿ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ﴾ مسجد حرام کی طرف ﴿ وَإِنَّهُ لَلْحَقُّ ﴾ اور بے شک مسجد حرام کی طرف چہرہ پھیرنا حق ہے ﴿ مِنْ رَّبِّكَ ﴾ تیرے رب کی طرف سے حکم ہے ﴿ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴾ اور اللہ تعالیٰ غافل نہیں ہے اس چیز سے جو تم کرتے ہو۔ نسخ کے مسائل میں سے پہلا مسئلہ یہی قبلے کا تھا۔ اس سے پہلے کوئی حکم منسوخ نہیں ہوا تھا۔ عموماً ایسا ہوتا ہے کہ جب کوئی نئی بات پہلی دفعہ ہوتی ہے تو اس پر بڑا تعجب ہوتا ہے پھر جب نسخ کے اور بھی کئی مسئلے آئے تو ذہنوں کی تشویش کا معاملہ ہلکا ہو گیا۔

چوں کہ یہ پہلا مسئلہ تھا اس واسطے رب تعالیٰ نے دوبارہ پھر تاکید فرمائی ﴿ وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ ﴾ اے نبی کریم ﷺ! جہاں کہیں بھی تم سفر میں جاؤ ﴿ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ﴾ سفر میں بھی اپنا چہرہ مسجد حرام کی طرف پھیرو۔ تو یہاں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ شاید قبلے کی طرف چہرہ پھیرنا آنحضرت ﷺ کی خصوصیت ہے۔ فرمایا نہیں! آپ ﷺ کی خصوصیت نہیں ہے ﴿ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ ﴾ جمع کا صیغہ ہے۔ اے اُمتیو! جہاں کہیں بھی تم ہو ﴿ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ ﴾ تم بھی اپنے چہرے پھیرو ﴿ شَطْرَهٗ ﴾ اسی کعبہ کی طرف۔ اب تم نے کعبہ کی طرف رُخ کیوں پھیرنا ہے؟ ﴿ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ ﴾ تاکہ لوگوں کے لیے تم پر کوئی الزام نہ ہو ﴿ إِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ ﴾ مگر وہ لوگ جو ان میں سے ظالم ہیں۔ وہ اپنی بات پر اَڑے رہیں گے۔

اور وہ الزام اس طرح دور ہوگا کہ مثال کے طور پر پہلی کتابوں میں آنحضرت ﷺ کی ایک علامت یہ لکھی تھی کہ وہ نبی القبلتین ہوں گے پہلے کعبۃ اللہ کی طرف چہرہ کر کے نماز پڑھیں گے پھر کچھ عرصہ مسجد اقصیٰ کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھیں گے پھر بالآخران کا قبلہ کعبۃ اللہ ہو جائے گا اور اگر آنحضرت ﷺ کعبۃ اللہ کی طرف رُخ نہ پھیرتے تو یہودی اور عیسائی کہہ سکتے تھے کہ یہ وہ نبی نہیں ہے۔ اس واسطے رب تعالیٰ نے حکم دیا کہ تم کعبہ کی طرف رُخ پھیرو تا کہ یہود و نصاریٰ کا تم پر کوئی الزام نہ رہے۔

اسی طرح مشرکین عرب کے لوگ زیادہ تر اپنے آپ کو ابراہیمی کہلاتے تھے اور کعبے کا بڑا احترام کرتے تھے۔ اگر تمھارا قبلہ کعبہ نہ ہوتا تو کہہ سکتے تھے کہ تم ابراہیمی نہیں ہو۔ کیوں کہ اگر تم ابراہیمی ہوتے تو تمھارا قبلہ تو کعبۃ اللہ ہونا چاہیے تھا۔ ان کا بھی الزام ختم ہو گیا ﴿اِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ﴾ ہاں مگر جو ظالم ہیں ان کے ہاتھ میں تو جب کوئی شوشہ آئے گا تو اس کو اُڑاتے پھریں گے۔ انھوں نے نہیں ماننا۔ جس میں کوئی دیانت اور انصاف ہے وہ تو صحیح بات سُن کر ایمان لاتا ہے ﴿فَلَا تَخْشَوْهُمْ﴾ پس تم نہ ڈروان لوگوں کے اعتراضات سے ﴿وَاخْشَوْنِيْ﴾ اور مجھ سے ڈرو۔

لوگوں نے تو پیغمبروں کو نہیں معاف کیا۔ عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں قرآن پاک میں مذکور ہے اور یہودی آج تک مُصر ہیں معاذ اللہ تعالیٰ کہ وہ حلال زادہ ہی نہیں ﴿وَقَوْلِهِمْ عَلٰى مَرْيَمَ بُهْتَانًا عَظِيْمًا﴾ [النساء:۱۵۶] "اُنھوں نے حضرت مریم علیہا السلام پر بہت بڑا بہتان باندھا۔" فرمایا تم ان کے اعتراضات سے نہ ڈرو ﴿وَاخْشَوْنِيْ﴾ اور مجھ سے ڈرو ﴿وَلِاُتِمَّ نِعْمَتِيْ عَلَيْكُمْ﴾ اور تا کہ میں مکمل کردوں اپنی نعمت تم پر۔ جس طرح میں نے تمھیں سب سے بہترین امت بنایا ہے اور سب سے بہترین کتاب تمھیں دی ہے اسی طرح قبلہ بھی تمھیں بہترین دے دوں اور تم بڑے خوش قسمت لوگ ہو کہ تمھیں آخری نبی کا امتی ہونا نصیب ہوا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دُعا

دیکھو! حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے پیغمبر، صاحب کتاب اور صاحب شریعت ہیں اور ہمارا عقیدہ ہے کہ وہ زندہ ہیں اور دوسرے آسمان پر موجود ہیں اور قیامت سے پہلے زمین پر نازل ہوں گے، دجال کو قتل کریں گے۔ یہود اور نصاریٰ سے لڑائی ہوگی۔ ان علاقوں میں اسلام کے سوا کوئی اور ملت باقی نہیں رہے گی۔ تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے رب تعالیٰ سے دعا کی کہ اے پروردگار! تو نے مجھے نبوت دی ہے تیرا شکر ہے، رسالت عطا فرمائی ہے تیرا احسان ہے، انجیل تو نے مجھے دی ہے یہ تیرا کرم ہے، اے پروردگار! میں ان کتابوں میں پڑھتا ہوں کہ ایک نبی آخر میں آئیں گے اور ان کی اُمت بہت افضل امت ہوگی۔ اے پروردگار! مجھے اس اُمت کا ایک فرد بنا کر ان اُمتیوں میں سے اُٹھا۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دعا قبول کی اور وہ اس اُمت میں آئیں گے اور چالیس سال تک زندہ رہیں گے۔ اور یہی پانچ نمازیں پڑھیں گے اور پڑھائیں گے جو ہم پڑھتے ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے تو اللہ تعالیٰ سے آخری نبی کا اُمتی ہونا

مانگ کر لیا اور ہمیں اللہ تعالیٰ نے مفت میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا امتی بنایا۔ اللہ تعالیٰ کا کتنا بڑا احسان ہے۔ اے پروردگار! ہمیں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا صحیح اُمتی بننے کی توفیق عطا فرما۔

﴿ وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴾ اور تاکہ تم ہدایت حاصل کرو ﴿ كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ ﴾ جیسے بھیجا ہم نے تم میں پیغمبر تم میں سے۔ یعنی سب سے افضل ترین پیغمبر تمھیں دیا، سب سے بہترین کتاب دی، سب سے اعلیٰ کعبہ دیا، سب امتوں میں سے ﴿ كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ ﴾ بہترین اُمت تمھیں بنایا۔ اور یہ تفصیل پہلے رکوع میں گزر چکی ہے کہ اس اُمت کی گواہی سے پہلی اُمتوں کی قسمت کا فیصلہ ہوگا ﴿ لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ ﴾ اتنا بلند مقام تمھیں عطا فرمایا۔ اور پیغمبر تم میں سے بھیجا یعنی وہ بھی بشر ہیں انسان ہیں، قریشی اور ہاشمی ہیں۔ تمام لوازماتِ بشریہ ان کے ساتھ ہیں اور چار کام آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دے کر بھیجا ﴿ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا ﴾ پہلا کام یہ ہے کہ تمھیں ہماری آیتیں پڑھ پڑھ کر سنائیں گے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی عربی تھے، قوم بھی عربی تھی، بیش تر مضامین وہ خود بہ خود سنتے ہی سمجھ جاتے تھے۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دوسرا کام ﴿ وَيُزَكِّيْكُمْ ﴾ اور وہ تمھیں پاک کرتا ہے ﴿ وَّلٰكِنَّ اللّٰهَ يُزَكِّيْ مَنْ يَّشَآءُ ﴾ حقیقتاً تزکیہ رب تعالیٰ کا کام ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس تزکیہ کا ذریعہ ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیم، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اخلاق حسنہ، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اعلیٰ کردار، یہ لوگوں کے دلوں کی صفائی کا ذریعہ بنا۔

مقصد بیعت

دلوں کی پاکیزگی بھی بہت ضروری ہے۔ یہ جو بزرگانِ دین میں پیری مریدی کا صحیح معنی میں سلسلہ تھا اس کا یہی مطلب ہوتا تھا کہ دل صاف ہو جائیں اور دل صاف ہو جائیں تو بہت کچھ حاصل ہو جاتا ہے۔ علامہ اقبال مرحوم فرماتے ہیں ؎

دل ہے مسلمان میرا نہ تیرا
تو بھی نمازی ، میں بھی نمازی

کہ خالی نمازی ہونے سے تو تزکیہ نہیں ہوتا، دل کی صفائی بڑی چیز ہے، دل غیر اللہ کی محبت سے پاک ہو جائے، حسد، بغض اور تکبر سے، اخلاق ذمیمہ سے پاک ہو جائے، آخرت کی فکر ہو، دنیا جائز طریقے سے کمائے، صرف دنیا میں پھنس نہ جائے کہ دنیا ہی دنیا رہ جائے اور آخرت کو بھول جائے۔ تو یہ دوسرا کام آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا تھا تزکیہ۔

بعض لوگ اس غلط فہمی کا شکار ہیں کہ یہ جو بعد کے بزرگانِ دین چلے کرتے رہے ہیں کئی کئی سال تک تو یہ چلے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ثابت نہیں ہیں بے شک ایسا ہی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مجلس میں جو شخص اخلاص کے ساتھ دو منٹ بیٹھتا تھا مثال کے طور پر تو اُسے اتنی دل کی صفائی حاصل ہو جاتی تھی کہ جو ساٹھ سال کے مجاہدے سے بھی حاصل نہیں ہو سکتی۔ اور بعد والوں کو مجاہدے کی ضرورت اس واسطے پیش آئی کہ اس زمانے میں دلوں کی صفائی نہیں تھی زنگ دُور کرنے کے لیے اُنھوں نے

وقت صرف کیا۔ شیشہ صاف ہو تو اس کو صاف کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی اور اگر شیشہ میلا کچیلا ہو تو اس کو صاف کیا جاتا ہے۔ ہمارے دلوں کے شیشے میلے ہیں ان کا تزکیہ چاہیے۔ بزرگانِ دین نے چلّے کاٹے، ریاضتیں کیں شرعی دائرے میں رہ کر اسی تزکیہ پر عمل کیا یہ بھی دین کا حصہ ہے۔

قرآنِ کریم پڑھنا پڑھانا جہادِ کبیر ہے

تیسرا کام ہے ﴿وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ﴾ اور وہ تمھیں اللہ تعالیٰ کی کتاب کی تعلیم دیتا ہے۔ بعض ایسی آیات تھیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی نہیں سمجھ سکتے تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان آیات کا مطلب سمجھاتے تھے۔ ابن ماجہ کی روایت تم سن چکے ہو کہ لفظی ترجمہ کے بغیر قرآن کریم کی ایک آیت حاصل کرنا سو رکعت نفل نماز سے زیادہ ثواب ہے، بہت بڑی عبادت ہے۔ قرآن کریم پڑھنا پڑھانا جہاد ہے۔ سورۃ الفرقان میں رب تعالیٰ فرماتے ہیں ﴿وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا﴾ قرآن پاک کی تعلیم دینا بڑا جہاد ہے۔ محض لڑنا ہی جہاد نہیں بے شک محاذوں پر لڑنا بھی جہاد ہے لیکن قرآن پاک نے جس کو جہادِ کبیر فرمایا ہے وہ قرآن پاک کی تعلیم ہے۔

تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم قرآن پاک کی تعلیم بھی دیتے تھے ﴿وَالْحِكْمَةَ﴾ اور حکمت سے مراد ہے سنت اور حدیث۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم حدیث کے الفاظ بھی لوگوں کو بتاتے تھے اور حدیث کے معنیٰ بھی بتاتے تھے۔ مثلاً: ایک موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس آدمی کے دل میں سرسوں کے دانے کے برابر تکبر ہوگا جنت میں نہیں جائے گا۔ یہ روایت ہے مسلم شریف کی۔

اگر تکبر کو حلال سمجھتا ہے تو کافر ہے بے شک نمازیں پڑھتا رہے، روزے رکھتا رہے۔ اور اگر حرام سمجھتا ہے تو پھر گناہ ہے۔ اس پر بھی دخولِ اوّل اس کو نصیب نہ ہوگا۔ تو لوگوں نے کہا کہ حضرت! ہم تو سارے ہی تکبر کرتے ہیں۔ ہر آدمی چاہتا ہے کہ میں نے سر کے بال رکھے ہوں، کنگھی پھیری ہو، تیل لگا ہو، ہمارے کپڑے اچھے اور صاف ہوں اور جوتا بھی اعلیٰ ہو۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ تکبر نہیں ہے۔ یہ تو تجمل ہے۔ شرعی دائرے میں رہ کر اچھا لباس پہننا رب کی نعمتوں کا شکر ہے یہ گناہ نہیں ہے۔ تکبر کیا ہے؟ غَمْطُ النَّاسِ وَ بَطَرُ الْحَقِّ "لوگوں کو حقیر سمجھنا اور حق کی بات کو ٹھکرانا۔"

تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث اور سنت کی بھی تعلیم دی۔ لفظوں کی بھی تعلیم دی اور معنیٰ کی بھی تعلیم دی ﴿وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ﴾ اور تمھیں اللہ تعالیٰ کا پیغمبر ان چیزوں کی تعلیم دیتا ہے جن کو تم نہیں جانتے تھے۔ یہ جتنے بھی دین کے مسائل آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتائے ہیں ان کو پہلے کون جانتا تھا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وجہ سے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت سے یہ سب کچھ حاصل ہوا ہے ﴿فَاذْكُرُوْنِيْ﴾ پس مجھے یاد کرو ﴿اَذْكُرْكُمْ﴾ میں تمھیں یاد کروں گا۔ اس کی یہ بھی تفسیر کرتے ہیں ﴿فَاذْكُرُوْنِيْ﴾ تم عبادت کے ذریعے مجھے یاد کرو میں تمھیں اس کا بدلہ اور جزا دوں گا۔

اور یہ معنیٰ بھی کرتے ہیں کہ ترمذی وغیرہ کی روایت میں اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتے ہیں: مَنْ ذَكَرَنِيْ فِيْ نَفْسِهٖ

ذَكَرْتُ فِيْ نَفْسِيْ." جس نے مجھے اکیلے یاد کیا میں اس کو اکیلا یاد کرتا ہوں اور جس نے مجلس میں میرا ذکر کیا میں اس مجلس سے بہتر مجلس میں اس کا ذکر کرتا ہوں۔" وہ بہتر مجلس اللہ تعالیٰ کے فرشتوں کی ہے۔اس میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میرے فلاں بندے نے مجلس میں میرا نام لیا ہے ﴿وَاشْكُرُوْالِيْ﴾ میری نعمتوں کا شکریہ ادا کرو ﴿وَلَا تَكْفُرُوْنِ﴾ اور میری ناشکری نہ کرو۔اللہ تعالیٰ کی بے شمار نعمتیں ہیں۔اللہ تعالیٰ ہمیں نعمتوں کی قدر کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور ناشکری سے بچائے اور محفوظ رکھے۔[آمین]

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ﴾ اے لوگو ﴿اٰمَنُوا﴾ جو ایمان لائے ہو ﴿اسْتَعِيْنُوْا﴾ مدد حاصل کرو ﴿بِالصَّبْرِ﴾ صبر کے ذریعے ﴿وَالصَّلٰوةِ﴾ اور نماز کے ذریعے ﴿اِنَّ اللّٰهَ﴾ بے شک اللہ تعالیٰ ﴿مَعَ الصّٰبِرِيْنَ﴾ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے ﴿وَلَا تَقُوْلُوْا﴾ اور نہ کہو تم ﴿لِمَنْ﴾ اُن کے بارے میں ﴿يُّقْتَلُ﴾ جو قتل کیے جاتے ہیں ﴿فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ اللہ کے راستے میں، نہ کہو تم ﴿اَمْوَاتٌ﴾ مُردے ﴿بَلْ اَحْيَآءٌ﴾ بلکہ وہ زندہ ہیں ﴿وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ﴾ اور لیکن تم شعور نہیں رکھتے ﴿وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ﴾ اور البتہ ہم ضرور تمھارا امتحان لیں گے ﴿بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ﴾ کسی نہ کسی چیز میں خوف سے ﴿وَالْجُوْعِ﴾ اور بھوک سے ﴿وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ﴾ اور مالوں کی کمی سے ﴿وَالْاَنْفُسِ﴾ اور جانوں کی کمی سے ﴿وَالثَّمَرٰتِ﴾ اور پھلوں کی کمی سے ﴿وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ﴾ اور آپ خوش خبری سنا دیں صبر کرنے والوں کو ﴿الَّذِيْنَ﴾ وہ لوگ ہیں ﴿اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ﴾ جب انھیں پہنچتی ہے کوئی مصیبت ﴿قَالُوْٓا﴾ کہتے ہیں ﴿اِنَّا لِلّٰهِ﴾ بے شک ہم اللہ تعالیٰ ہی کے مِلک ہیں ﴿وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ﴾ اور بے شک ہم اسی کی طرف رجوع کرنے والے ہیں ﴿اُولٰٓئِكَ﴾ وہی لوگ ہیں ﴿عَلَيْهِمْ﴾ ان پر ﴿صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ﴾ خصوصی رحمتیں ہیں ان کے رب کی طرف سے ﴿وَرَحْمَةٌ﴾ اور عمومی رحمت ﴿وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ﴾ اور وہی لوگ ہیں ہدایت پانے والے۔

صبر اور نماز سے مدد لینے کا مطلب

اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے اور خطاب فرمایا ہے ایمان والوں کو کہ ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا﴾ اے ایمان والو! ﴿اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ﴾ مدد حاصل کرو تم صبر اور نماز کے ذریعے۔

بعض جاہل قسم کے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ صبر سے مدد لینی ہے اور نماز سے مدد لینی ہے اور صبر بھی غیر اللہ اور نماز بھی غیر اللہ ہے تو اس سے ثابت ہوا کہ غیر اللہ سے مدد لینی جائز ہے۔ ولی بھی غیر اللہ ہیں، نبی بھی غیر اللہ ہیں۔سب سے مدد لینی جائز ہے۔لیکن یہ تفسیر قرآن پاک کی تحریف ہے۔اس لیے کہ صبر پر حرف با داخل ہے اور ﴿بِالصَّبْرِ﴾ کا معنیٰ ہے صبر کے ذریعے ﴿وَالصَّلٰوةِ﴾ اور نماز کے ذریعے تم نے مدد لینی ہے۔تو صبر اور نماز سے مدد نہیں لینی بلکہ ان کے ذریعے مدد مانگنی ہے اور مانگنی کس

سے ہے ﴿اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ﴾ "پروردگار ہم خاص تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور خاص تجھ ہی سے مدد طلب کرتے ہیں۔" اور دوسرے مقام پر آتا ہے ﴿وَاللّٰہُ الْمُسْتَعَانُ﴾ اللہ تعالیٰ ہی سے مدد طلب کی جاسکتی ہے۔ اور ہم وتروں میں یہ دُعا پڑھتے ہیں: اَللّٰھُمَّ اِنَّا نَسْتَعِیْنُكَ وَ نَسْتَغْفِرُكَ اے اللہ! ہم تجھ ہی سے مدد طلب کرتے ہیں۔

تو مدد صرف رب تعالیٰ سے ہے کیوں کہ مستعان صرف پروردگار ہے۔ ہاں! یہ عبادتیں ہیں صبر کرنا بھی عبادت ہے، نماز خود عبادت ہے۔ ان کے ذریعے تم رب تعالیٰ سے مدد مانگو۔ اور ہر نماز میں ہم اس بات کا اقرار کرتے ہیں ﴿اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ﴾ فرض نماز ہو یا وتر، واجب ہو یا سنت مؤکدہ ہو یا نفل ہو یا تہجد، اشراق، جمعہ یا عید، کوئی بھی نماز اس سے خالی نہیں ہے کہ جس میں رب تعالیٰ سے وعدہ نہ کرتے ہوں ﴿اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ﴾ اور ہمیں یہ ایسا سبق پڑھایا گیا ہے کہ اس کو تم نے کسی رکعت میں نہیں بھولنا۔ پھر اس کے بعد بھی اگر کوئی آدمی اِدھر اُدھر بھٹکتا پھرے تو پھر وہ معذور نہ ہوگا۔

﴿اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ﴾ بے شک اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ اور صبر کے مواقع میں سے اہم موقع موت کا ہے۔ اور خصوصاً جب کہ موت طبعی نہ ہو بلکہ قتل ہو تو صدمہ زیادہ ہوتا ہے۔ اس واسطے فرمایا ﴿وَ لَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ یُّقْتَلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اَمْوَاتٌ﴾ اور وہ لوگ جو اللہ تعالیٰ کے راستے میں قتل کیے جاتے ہیں ان کو تم مردہ نہ کہو ﴿بَلْ اَحْیَآءٌ﴾ بلکہ وہ زندہ ہیں ﴿وَّلٰکِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ﴾ اور لیکن تم ان کی زندگی کا شعور نہیں رکھتے۔ یعنی ان کی زندگی کو تم سمجھ نہیں سکتے۔

شہید اور عام آدمی کی حیات کا فرق

تو یہاں پر کچھ باتیں سمجھنے والی ہیں۔ وہ یہ کہ جو شخص کافر کی تلوار سے شہید ہوتا ہے اُس کا سر کاٹ کر الگ پھینک دیا جاتا ہے اور دھڑ الگ۔ اور شریعت بھی اس کا انکار نہیں کرتی۔ اور یہ بات بھی ظاہر ہے کہ جب سر دھڑ سے الگ ہو گیا تو روح بھی اس میں باقی نہ رہی۔ شہید کی اس موت کا تو انکار ہی نہیں ہے اور شہید کو قبر میں دفن بھی کیا جاتا ہے اس میں بھی کسی کا کوئی اختلاف نہیں ہے۔ حالانکہ اس جہان والی زندگی باقی ہو تو دفن نہیں کیا جاتا۔ اسی واسطے قیامت والے دن اللہ تعالیٰ ان بچیوں سے سوال کریں گے جو زندہ درگور کی گئیں کہ تمھیں کیوں قتل کیا گیا؟ جیسا کہ قرآن میں موجود ہے:

﴿وَ اِذَا الْمَوْءٗدَۃُ سُئِلَتْ ۞ بِاَیِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ ۞﴾

"اور جب زندہ درگور کی ہوئی سے پوچھا جائے گا کہ وہ کس گناہ کی وجہ سے قتل کی گئی۔"

تو کسی کو زندہ قبر میں دفن کرنا بڑا گناہ ہے جب کہ شہید کو دفن کیا جاتا ہے۔

اسی طرح اگر کوئی شخص اللہ تعالیٰ کے راستے میں شہید ہو جائے تو اس کا مال بھی شرعی وارثوں میں تقسیم ہوگا حالانکہ اگر کوئی آدمی زندہ ہو اور مدۃ العمر کی اُس کو قید ہو کہ اُس کا جنازہ جیل سے باہر آئے گا تو بھی اس کے مال کی وراثت تقسیم نہیں ہوگی اس واسطے کہ زندہ ہے۔

عدت کے بعض احکام

اسی طرح شہید کی بیوی عدت گزارنے کے بعد آگے نکاح کرسکتی ہے اور وہ عدت یہ ہے کہ اگر فوت ہونے والے آدمی کی بیوی حاملہ ہے تو اس کی عدت ہے وضع حمل۔ جب بچہ پیدا ہوگا اس کے بعد عدت ختم ہو جائے گی اور اگر حاملہ نہیں ہے تو پھر اس کو چار مہینے دس دن گزارنے پڑیں گے۔

اس عدت کے زمانے میں عورت اپنے گھر سے نہیں نکل سکتی۔ اور اگر مجبوری ہے تو دن کو جاسکتی ہے اور ضرورت پوری کر کے واپس آجائے۔ رات کسی جگہ نہیں رہ سکتی۔ دیکھو! قصبات کی جو عورتیں ہیں عدت تو انھوں نے بھی گزارنی ہے اور انھوں نے اپنے جانوروں کو پانی بھی پلانا ہے، کھیتوں سے ساگ وغیرہ بھی توڑنا ہے، گوبر بھی پھینکنا ہے۔ اور بعض ایسے قصبے ہیں کہ انھیں پانی دور سے لانا ہوتا ہے۔ بعض ایسی جگہیں ہیں کہ انھیں لکڑیاں لانا پڑتی ہیں۔ اب ایسی عورت جس کا کوئی کمانے والا نہیں اس کو شرعاً اجازت ہے کہ وہ اپنی ضرورت پوری کرے کیوں کہ وہ مجبور ہے۔ اور جو دور دراز نوکری کرتی ہیں ان کے لیے گنجائش نہیں ہے۔ ہاں! اگر اس کی روزی کا کوئی اور انتظام نہیں ہے تو پھر وہ عورت دن کو جاسکتی ہے رات کو کسی جگہ نہیں رہ سکتی۔ یہ بھی تب ہے کہ اس کے پاس کوئی اور صورت نہ ہو۔ اور اگر اس کے پاس عدت کے زمانے میں کھانے کا خرچہ ہے تو اس کے لیے گنجائش نہیں ہے۔

اسی طرح اگر کوئی عورت بیمار ہو جاتی ہے اور اس کو اتنی توفیق نہیں ہے کہ ڈاکٹر کو فیس دے کر اپنے گھر بلائے تو اس کو اجازت ہے کہ قریبی ڈاکٹر کے پاس علاج کے لیے جاسکتی ہے۔ اور یہ بات اصولی طور پر یاد رکھنا! کہ عدت گزارنے والی عورت رات کسی جگہ نہیں گزار سکتی۔ اور اگر مجبوری ہے کہ اس کا کوئی سودا سلف لانے والا نہیں ہے تو وہ اپنی سبزی وغیرہ بھی بازار سے لاسکتی ہے اور بول چال پر بھی کوئی پابندی نہیں ہے۔ ضرورت کے مطابق گفتگو کرسکتی ہے۔

(ایک آدمی نے سوال کیا کہ حضرت! عدت کے دوران ہسپتال میں داخل ہوسکتی ہے یا نہیں؟ فرمایا اگر کوئی اور صورت نہ ہو تو ہسپتال میں داخل ہوسکتی ہے کیوں کہ شریعت مجبوری کا لحاظ کرتی ہے۔)

تو بات یہ ہو رہی تھی کہ شہید کی بیوی کا عدت کے بعد نکاح بھی جائز ہے اور یہ سارے شرعی احکام ہیں۔ یہ ایں ہمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جو اللہ تعالیٰ کے راستے میں قتل کیے گئے ہیں ان کو مُردہ نہ کہو بلکہ وہ زندہ ہیں۔

عذابِ قبر روح اور جسم دونوں کو ہے

مسئلہ یہی ہے اور اس پر صحیح روایات متواتر موجود ہیں اور اہل حق اہل سنت والجماعت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ جس وقت انسان کو قبر میں دفن کیا جاتا ہے: تُعَادُ رُوْحُهٗ فِيْ جَسَدِهٖ. "اس کی روح کو اس کے جسم میں لوٹایا جاتا ہے۔" اور ظاہر بات ہے کہ جب روح کو جسم میں لوٹایا جائے گا تو زندگی آجائے گی۔ اسی زندگی کے بعد منکر نکیر کے سوالات ہوں گے، جوابات

ہوں گے۔اس کے بعد اگر نیک ہے تو قبر میں راحت بھی ہوگی اور اگر بد ہے تو عذاب بھی ہوگا۔ اور اگر جسم میں روح نہیں ہے تو خالی جسم کو عذاب وثواب کا کوئی معنیٰ نہیں ہے۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے دست مبارک کے ساتھ جو کتاب لکھی ہے اس کا نام ہے"الفقہ الاکبر" اس میں وہ فرماتے ہیں: وَ اِعَادَةُ الرُّوْحِ اِلَى الْجَسَدِ فِيْ قَبْرِهٖ حَقٌّ "قبر میں جسم کی طرف روح کا لوٹایا جانا بھی حق ہے۔" اور صحیح احادیث بھی یہی کہتی ہیں اور اہل حق کا مسلک بھی یہی ہے کہ قبر میں حیات ہے۔تو یہ زندگی جو ہے یہ قبر کی زندگی ہے۔

تو فرمایا جو اللہ کے راستے میں شہید ہو جاتے ہیں ﴿وَلَا تَقُوْلُوْا﴾ اور نہ کہو ان کے بارے میں ﴿لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ جو قتل کیے گئے اللہ کے راستے میں ﴿اَمْوَاتٌ﴾ مُردے ﴿بَلْ اَحْيَآءٌ﴾ بلکہ وہ زندہ ہیں ﴿وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ﴾ اور لیکن تمھیں شعور نہیں ہے۔فرض کرو آج اگر کوئی شخص کسی شہید کی قبر کو اکھیڑے تو شہید نہ تو اس سے بات کرے گا اور نہ اس میں کوئی حس وحرکت ہوگی اور کچھ بھی نظر نہیں آئے گا۔ وہ زندگی ہمارے شعور سے بالاتر ہے۔

اس بات کو سمجھانے کے لیے علم کلام والے کہتے ہیں کہ جیسے مریض سکتہ، سکتہ ایک بیماری ہوتی ہے اس میں بظاہر نبض چلتی نظر نہیں آتی اور آدمی سانس لیتا بھی نظر نہیں آتا لیکن ہوتا زندہ ہے۔تو سمجھانے کے لیے کہا کَمَرِيْضِ السَّكْتَةِ جیسے سکتے کا بیمار ہوتا ہے کہ روح اس کے اندر ہوتی ہے لیکن حکیم، ڈاکٹر حیران ہوتے ہیں کہ حس وحرکت نہیں ہے، سانس نہیں ہے، کچھ بھی نہیں ہے۔تو اسی طرح شہید کی حیات ہے کہ بہ ظاہر سمجھ نہیں آتی۔اور بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ حیات تو ہے مگر وہ روح کی ہے جسم کی نہیں ہے۔اور بعض کہتے ہیں کہ ایک جسد مثال ہوتا ہے اس کی حیات ہے۔ یہ دونوں قول مردود ہیں۔اس واسطے قرآن کو سمجھو۔

قرآن کہتا ہے ﴿وَلَا تَقُوْلُوْا﴾ اور نہ کہو تم ﴿لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ اُن کے بارے میں جو قتل کیے جاتے ہیں اللہ تعالیٰ کے راستے میں ﴿اَمْوَاتٌ﴾ مُردے ﴿بَلْ اَحْيَآءٌ﴾ بلکہ وہ زندہ ہیں۔تو قتل تو اس جسم کو کیا جاتا ہے روح کو تو نہیں۔اور قرآن کہتا ہے کہ جن کو قتل کیا جاتا ہے ان کو مردہ نہ کہو۔اور پھر قتل جسد مثال نہیں ہوتا بلکہ یہی جو ہمارا جسم ہے۔

جسدِ مثالی کا مطلب

اور جسد مثالی کا معنیٰ آپ اس طرح سمجھیں کہ جس طرح تم خواب میں کسی کو دیکھتے ہو اور خواب میں کوئی تمھیں رشتہ دار یا بے گانہ ملتا ہے۔ وہ نہ تو اس کا جسم ہوتا ہے اور نہ اس کی روح، بلکہ وہ جسد مثال ہوتا ہے جو رات کو تمھیں ملا ہے۔اور تم اس کے ساتھ لڑتے جھگڑتے بھی ہو اور پیار بھی کرتے ہو، سب کچھ کرتے ہو۔صبح کو تم اس کو کہو بھائی میں نے رات کو تیرے ساتھ یہ گفتگو کی ہے۔تو وہ کہے گا کہ میرے تو فرشتوں کو بھی پتا نہیں ہے۔اور قرآن بالکل واضح ہے ﴿وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ﴾ ان کے بارے میں مت کہو جو اللہ تعالیٰ کے راستہ میں قتل کیے گئے کہ وہ مردہ ہیں۔اور قتل جسد عنصری ہے یہی جسم

ہے اور زندہ بھی یہی جسم ہے ﴿بَلْ اَحْیَآءٌ﴾ بلکہ وہ زندہ ہیں۔

پھر عجیب بات ہے کہ روزے تو رکھے یہ جسم، نمازیں پڑھے یہ جسم، ٹھنڈے پانی سے وضو کرے یہ جسم، گرمی، سردی برداشت کرے یہ جسم اور ثواب سے محروم ہو جائے اور اس کی جگہ مثالی جسم کو ثواب ملتا رہے یہ کون سی عقل کی بات ہے؟ جرم تو کرے یہ جسم اور سزا بھگتے اس کا مثالی جسم۔ یہ کون سی منطق ہوئی؟ یہ عقل کے بھی خلاف ہے اور نقل کے بھی خلاف ہے۔

یاد رکھو! جزا و سزا اسی جسم کو ہوتی ہے چاہے ذرّہ ذرّہ ہو جائے۔ کتابوں میں تصریح ہے باقی باتوں کا پتا مرنے کے بعد چلے گا۔ پھر عجیب بات ہے کہ شہیدوں کو تو مُردہ نہ کہو اور پیغمبروں کو مردہ کہو، لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ۔ کہ شہید زندہ ہوں اور پیغمبر زندہ نہ ہوں۔ آج ایک ایسا فرقہ بھی چل نکلا ہے جو کہتے ہیں کہ پیغمبروں کی حیات کوئی نہیں ہے۔ میں نے اس مسئلے پر "تسکین الصدور" لکھی ہے۔ جس پر دورِ حاضر کے تمام جید علماء کے دستخط اور تقریظات ہیں۔ اس میں میں نے وضاحت کی ہے کہ بھئی! تم جو کہتے ہو کہ پیغمبروں کی حیات نہیں ہے تو ان پیغمبروں کو تو مستثنیٰ کرو جو شہید ہوئے ہیں۔

حضور ﷺ شہید ہیں

اور آنحضرت ﷺ بھی شہید ہیں، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ قسم اُٹھا کر فرماتے ہیں کہ میں دس مرتبہ قسم اُٹھا کر کہتا ہوں کہ آپ ﷺ شہید ہیں۔ کیوں شہید ہیں؟ اس کی تفصیل یہ ہے کہ خیبر میں زینب نامی عورت (یہودیہ) نے بکری کے گوشت میں زہر ڈال کر دیا تھا۔ آپ ﷺ کے ساتھ صحابی تھے بشر بن براء بن معرور رضی اللہ عنہ وہ فوراً تڑپ کے شہید ہو گئے۔ آپ ﷺ نے جب بوٹی منہ میں ڈالی تو لعاب اندر چلا گیا، بوٹی نے بول کر بتایا کہ حضرت! مجھے نہ کھانا میرے اندر زہر ہے۔ مگر وہ لعاب جو اندر چلا گیا تھا اس کے ساتھ اتنا تیز زہر تھا کہ اس سے آپ ﷺ کی رگیں کھچی جاتی تھیں۔

اور بخاری شریف میں باب ہے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جس موقع پر آپ ﷺ کا وصال ہوا تو آپ ﷺ نے فرمایا: "اے عائشہ! وہ زہر جو مجھے کھلایا گیا تھا اس کا اثر مجھے آج محسوس ہو رہا ہے۔ اس طرح محسوس ہوتا ہے کہ میری رگیں کٹی جا رہی ہیں۔" تو آپ ﷺ شہید ہیں۔ یاد رکھنا! قرآن پاک کو نہ چھوڑنا، احادیث کو نہ چھوڑنا اور جمہور کا ساتھ نہ چھوڑنا۔ لوگوں کی چرب زبانی پر نہ جانا۔

تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ﴿وَلَا تَقُوْلُوْا﴾ اور نہ کہو ﴿لِمَنْ یُّقْتَلُ﴾ ان کو جو قتل کیے جاتے ہیں ﴿فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ﴾ اللہ تعالیٰ کے راستے میں ﴿اَمْوَاتٌ﴾ مردہ ﴿بَلْ اَحْیَآءٌ﴾ بلکہ وہ زندہ ہیں ﴿وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ﴾ اور لیکن تم نہیں سمجھتے۔ ان کی زندگی تمھاری سمجھ سے بالاتر ہے ﴿وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ﴾ اور البتہ ہم ضرور تمھارا امتحان لیں گے ﴿بِشَیْءٍ﴾ کسی نہ کسی شے سے ﴿مِّنَ الْخَوْفِ﴾ کبھی دشمن کے حملے کا خوف ہوگا۔ کبھی کوئی اور خوف ہوگا ﴿وَالْجُوْعِ﴾ اور کبھی ہم تم پر مہنگائی مسلط کر دیں گے اور بھوک سے مرو گے ﴿وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ﴾ اور کبھی تمھارے مالوں میں کمی ہوگی ﴿وَالْاَنْفُسِ﴾ اور کبھی تمھاری جانوں میں کمی آئے گی

کہ تمھارے افراد میں سے کچھ مریں گے ﴿وَالثَّمَرٰتِ﴾ اور کبھی پھل کم ہوں گے۔ یہ امتحان ہوں گے کہ طرح طرح کی پریشانیاں تمھیں پیش آئیں گی ﴿وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ﴾ اور آپ صبر کرنے والوں کو خوش خبری سنا دیں۔ اور صبر کرنے والے کون ہیں؟ ﴿الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ﴾ وہ ہیں کہ جس وقت ان کو مصیبت پہنچتی ہے ﴿قَالُوْٓا﴾ کہتے ہیں ﴿اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ﴾

مثال کے طور پر جب کوئی شخص فوت ہو جائے تو اس کے بارے میں یہ خیال آتا ہے کہ یہ کیوں فوت ہوا ہے؟ ابھی تک تو یہ تندرست تھا، جوان تھا اور دوسرا خیال یہ آتا ہے کہ یہ ہم سے جدا ہو گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے پہلے خیال کا ازالہ تو اس طرح فرمایا کہ ﴿اِنَّا لِلّٰهِ﴾ ہم سارے اللہ کی ملکیت ہیں۔ رب جس طرح چاہے اپنی ملکیت میں تصرف کرے۔ اور دوسرا خیال تھا کہ ہم سے جدا ہو گیا تو فرمایا جدا نہیں ہوا ہم بھی وہیں جانے والے ہیں۔ دنوں، مہینوں یا سالوں کی جدائی ہو گی، جانا تو ہم نے بھی وہیں ہے۔ اسی لیے حدیث میں آتا ہے کہ قبرستان میں جاؤ تو کہو:

((اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ دَارَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِيْنَ اَنْتُمْ لَنَا سَلَفٌ وَّ نَحْنُ لَكُمْ بِالْاَثَرِ وَاِنَّا اِنْ شَآءَ اللهُ بِكُمْ لَاحِقُوْنَ يَغْفِرُ اللهُ لَنَا وَلَكُمْ)).

"اے قبروں میں رہنے والو تم پر رب کی سلامتی ہو تم ہمارے آگے آگے جا رہے ہو ہم تمھارے پیچھے پیچھے آ رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی بخشے اور تمھیں بھی۔"

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے مٹی کا دیا جلایا ہوا تھا تیز ہوا آئی تو بجھ گیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑھا ﴿اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ﴾ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے سنا ہوا تھا کہ جب کوئی مرتا ہے تو اس وقت یہ پڑھنا ہوتا ہے کہنے لگیں حضرت! یہ تو دیا بجھا ہے اور میں ابھی اس کو جلا دیتی ہوں۔ فرمایا عائشہ! كُلُّ مَا يَسُوْءُ الْمُؤْمِنَ "ہر وہ تکلیف وہ چیز جو مومن کو پیش آئے وہاں یہ پڑھنا چاہیے۔" اب یہ دیا جل رہا تھا یک دم بجھ گیا ہے ہمیں کوفت تو ہوئی ہے تو یہاں بھی ﴿اِنَّا لِلّٰهِ﴾ پڑھو۔ لہٰذا ﴿اِنَّا لِلّٰهِ﴾ ہر تکلیف کے موقع پر پڑھنا چاہیے۔ ٹھوکر لگے تو پڑھو، اگر آدمی گر جائے پھر پڑھو۔

﴿اُولٰٓئِكَ﴾ یہی لوگ ہیں ﴿عَلَيْهِمْ﴾ ان پر ﴿صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ﴾ رب تعالیٰ کی خصوصی رحمتیں ہیں ﴿وَرَحْمَةٌ﴾ اور عمومی رحمت بھی ان پر ہے ﴿وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ﴾ اور یہی لوگ ہیں ہدایت یافتہ۔ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی انھی ہدایت یافتہ لوگوں میں رکھے۔ [آمین]

﴿اِنَّ الصَّفَا﴾ بے شک صفا ﴿وَالْمَرْوَةَ﴾ اور مروہ ﴿مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ﴾ اللہ تعالیٰ کی قائم کردہ علامتوں میں سے ہیں ﴿فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ﴾ پس جس نے حج کیا بیت اللہ کا ﴿اَوِ اعْتَمَرَ﴾ یا عمرہ کیا ﴿فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ﴾ پس کوئی حرج نہیں ہے اس پر ﴿اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا﴾ یہ کہ چکر لگائے ان دونوں کا ﴿وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا﴾ اور جس نے دل کھول کر نیکی کی

﴿فَاِنَّ اللّٰہَ﴾ پس بے شک اللہ تعالیٰ ﴿شَاکِرٌ﴾ قدردان ہے ﴿عَلِیْمٌ﴾ جاننے والا ہے ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ﴾ بے شک وہ لوگ ﴿یَکْتُمُوْنَ﴾ جو چھپاتے ہیں ﴿مَآ﴾ اس چیز کو ﴿اَنْزَلْنَا﴾ جو ہم نے نازل کی ہے ﴿مِنَ الْبَیِّنٰتِ﴾ واضح دلیلیں ﴿وَالْھُدٰی﴾ اور ہدایت ﴿مِنْ بَعْدِ مَا بَیَّنّٰہُ﴾ بعد اس کے کہ ہم نے اس کو بیان کیا ﴿لِلنَّاسِ﴾ لوگوں کے لیے ﴿فِی الْکِتٰبِ﴾ کتاب میں ﴿اُولٰٓئِکَ﴾ وہ لوگ ہیں ﴿یَلْعَنُھُمُ اللّٰہُ﴾ اللہ تعالیٰ ان پر لعنت بھیجتا ہے ﴿وَیَلْعَنُھُمُ اللّٰعِنُوْنَ﴾ اور لعنت کرتے ہیں ان پر لعنت کرنے والے ﴿اِلَّا الَّذِیْنَ﴾ مگر وہ لوگ ﴿تَابُوْا﴾ جنھوں نے توبہ کی ﴿وَاَصْلَحُوْا﴾ اور اصلاح کر لی ﴿وَبَیَّنُوْا﴾ اور اُنھوں نے حق کو بیان کیا ﴿فَاُولٰٓئِکَ﴾ پس وہ لوگ ہیں ﴿اَتُوْبُ عَلَیْھِمْ﴾ میں ان پر رجوع کروں گا ﴿وَاَنَا التَّوَّابُ﴾ اور میں توبہ قبول کرنے والا ہوں ﴿الرَّحِیْمُ﴾ مہربان ہوں ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ﴾ بے شک وہ لوگ ﴿کَفَرُوْا﴾ جو کافر ہوئے ﴿وَمَاتُوْا﴾ اور مرے ﴿وَھُمْ کُفَّارٌ﴾ اس حالت میں کہ وہ کافر ہیں ﴿اُولٰٓئِکَ﴾ وہ لوگ ﴿عَلَیْھِمْ لَعْنَۃُ اللّٰہِ﴾ اُن پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہے ﴿وَالْمَلٰٓئِکَۃِ﴾ اور فرشتوں کی ﴿وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ﴾ اور تمام انسانوں کی ﴿خٰلِدِیْنَ فِیْھَا﴾ رہا کریں گے ہمیشہ اس لعنت میں ﴿لَا یُخَفَّفُ عَنْھُمُ الْعَذَابُ﴾ نہیں تخفیف کی جائے گی ان سے عذاب کی ﴿وَلَا ھُمْ یُنْظَرُوْنَ﴾ اور نہ ان کو مہلت دی جائے گی ﴿وَاِلٰھُکُمْ﴾ اور معبود تمھارا ﴿اِلٰہٌ وَّاحِدٌ﴾ ایک ہی معبود ہے ﴿لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ﴾ نہیں کوئی معبود مگر وہی ﴿الرَّحْمٰنُ﴾ بے حد رحم کرنے والا ﴿الرَّحِیْمُ﴾ نہایت مہربان ہے۔

اسلامی شعائر

اس سے پہلے ﴿یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ﴾ والے رکوع میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا میں اس کا بھی ذکر تھا ﴿وَاَرِنَا مَنَاسِکَنَا﴾ اے پروردگار! ہمیں حج اور عمرے کے افعال کی تعلیم فرما۔ اسی بارے میں ذکر آتا ہے ﴿اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَۃَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰہِ﴾ شَعَائر شعیرۃٌ کی جمع ہے اور شعیرۃٌ کے معنیٰ ہیں علامت اور نشانی۔ بہت ساری چیزیں ہیں جو شعائر اللہ میں داخل ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ شعائر اللہ میں پہلے نمبر پر قرآن کریم ہے، دوسرے نمبر پر آنحضرت ﷺ کی ذات گرامی ہے، تیسرے نمبر پر کعبۃ اللہ ہے اور چوتھے نمبر پر نماز ہے۔ یہ اسلام کی بڑی نشانیاں ہیں جن کا اُوپر ذکر ہوا ہے اور صفا بھی شعائر اللہ میں سے ہے اور المروۃ بھی ہے۔

آگے سترھویں پارے میں سورۂ حج کے اندر قربانی کے جانوروں کو بھی شعائر اللہ کہا گیا ہے کہ حاجی لوگ جن جانوروں کی قربانی کرتے ہیں۔ احرام کے بعد ان جانوروں کے گلے میں پٹے ڈال دیتے تھے اور یہ علامت ہوتی تھی کہ یہ حاجی کا جانور

ہے۔ اگر حاجی قضائے حاجت کے لیے یا سودا سلف کے لیے آگے پیچھے ہو جاتا تو لوگ اس کے جانور کی توہین نہیں کرتے تھے کیوں کہ سمجھتے تھے کہ جانور حاجی کا ہے اور شعائر اللہ میں سے ہے۔ صفا اور مروہ چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں ہیں اور اب حکومت نے ان کو تراش کر برابر کر دیا ہے، صفا کا تو کچھ حصہ ہے مگر مروہ بس نشانی رہ گئی ہے۔

زمانۂ جاہلیت میں ایسے لوگ بھی تھے جو عمرہ تو کرتے تھے مگر صفا مروہ کی سعی کرنے کو گناہ سمجھتے یہاں سعی نہیں کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی اصلاح فرمائی ﴿اِنَّ الصَّفَا﴾ بے شک صفا کی پہاڑی ﴿وَالْمَرْوَةَ﴾ اور مروہ کی پہاڑی ﴿مِنْ شَعَآىِٕرِ اللّٰهِ﴾ یہ دونوں اللہ تعالیٰ نے علامتیں مقرر فرمائی ہیں یعنی یہ دونوں اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ علامتوں میں سے ہیں ﴿فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ﴾ پس جس نے بیت اللہ کا حج کیا ﴿اَوِ اعْتَمَرَ﴾ یا عمرہ کیا ﴿فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ﴾ پس اس پر کوئی گناہ نہیں ہے کہ وہ صفا اور مروہ کے درمیان چکر لگائے۔ جنح کا لفظی معنیٰ ہے گناہ یعنی اس میں کوئی گناہ نہیں ہے بلکہ ثواب ہے۔

حج کے لفظی معنیٰ ہیں قصد اور ارادہ اور شرعی اصطلاح میں خاص حالت اور خاص مہینوں اور خاص دنوں میں قصد کرنا اور خاص جگہ کا قصد کرنا۔ خاص حالت کا مطلب ہے احرام کی حالت میں اور خاص دنوں اور خاص مہینوں سے مراد یکم شوال سے حج کے مہینے شروع ہو جاتے ہیں یعنی اگر کوئی شخص یکم شوال کو حج کا احرام باندھے گا تو صحیح ہے اور اگر رمضان شریف میں حج کا احرام باندھے تو یہ مکروہ ہے، تو حج کے مہینوں کا مطلب یہ ہے کہ یکم شوال سے حج کا احرام باندھا جا سکتا ہے۔ شوال ذی قعدہ اور ذوالحجہ کے دس دن حج کے مہینے ہیں۔

اور حج اس آدمی پر لازم ہے جس کو رب تعالیٰ نے مالی طور پر اتنی توفیق دی ہو کہ اس پر قرض بھی نہیں ہے اور آمد و رفت کے خرچہ کے ساتھ اہل خانہ کے لیے خرچہ بھی ہو اور آنے جانے کا راستہ بھی پُرامن ہو اور یہ شخص شرعی طور پر معذور بھی نہ ہو یعنی مفلوج، نابینا، لنگڑا یا بہت ضعیف العمر بھی نہ ہو تو اس کو خود حج کرنا پڑے گا۔ اور اگر معذور ہے تو اس کو نائب بنانا پڑے گا یعنی ان کا حج حجِ بدل ہوگا۔

حجِ بدل کے احکام

بخاری شریف میں روایت آتی ہے کہ حجۃ الوداع کے موقع پر ایک نوجوان عورت آنحضرت ﷺ کے سامنے آ کھڑی ہوئی اور کہنے لگی حضرت! بھیڑ زیادہ ہے اور میں مسئلہ دریافت کرنے پر مجبور ہوں کہ باپ بوڑھا ہے یہاں تک کہ لَا يَثْبُتُ عَلَى الرَّاحِلَةِ سواری پر بٹھاؤ تو سنبھل نہیں سکتا گر پڑتا ہے۔ یعنی پیدل چلنا تو درکنار سواری پر بٹھاؤ تو خود سنبھل نہیں سکتا۔ اتنا بوڑھا ہے لیکن مالی توفیق ہے حضرت! یہ فرمائیں کہ اَفَاَحُجُّ عَنْهُ کیا میں اس کی طرف سے حج کر سکتی ہوں؟ آپ ﷺ نے فرمایا ہاں کر سکتی ہو۔ تو معذور کی طرف سے دوسرا آدمی حج کر سکتا ہے اور ثواب دونوں کو ملے گا۔ لیکن حج بدل وہی شخص کر سکتا ہے کہ جس نے پہلے اپنا حج کیا ہو۔

حدیث میں آتا ہے کہ آنحضرت ﷺ طواف کررہے تھے تو ایک آدمی طواف کرتے ہوئے یہ تلبیہ پڑھتا تھا لَبَّيْكَ عَنْ شِبْرَمَةَ "اے پروردگار! میں شبرمہ کی طرف سے حاضر ہوا ہوں۔" آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ شبرمہ کون ہے؟ تو اس نے اپنا بھائی یا دوست بتایا کہ میں اس کی طرف سے آیا ہوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ کیا تو نے اپنا حج کیا ہوا ہے؟ وہ کہنے لگا کہ نہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ حَجِّ عَنْ نَفْسِكَ ثُمَّ حَجِّ عَنْ شِبْرَمَةَ "پہلے اپنا حج کر پھر شبرمہ کی طرف سے کرنا۔" حج بدل میں بڑی پابندیاں ہیں کہ جب آدمی احرام باندھ لے تو اس کے بعد احرام کھول نہیں سکتا جب تک عید کا دن نہ آجائے۔ سردی کے زمانے میں خاصا مشکل ہوتا ہے کیوں کہ سر پر کپڑا تو ڈال نہیں سکتا اور مچھر بھی کاٹتے ہیں۔ ایک دو مہینے اگر آدمی حجامت نہ کرائے تو حلیہ بدل جاتا ہے۔ تو حج بدل خاصا مشکل ہے۔

مجھے یاد ہے کہ ایک دفعہ میرا حج بدل تھا اور مجھے مسلسل چالیس دن تک احرام میں رہنا پڑا۔ اور سردی بھی تھی سر کو ٹھنڈک لگتی تھی۔ (حضرت شیخ صاحب نے ایک دن فرمایا کہ وہاں مجھے کسی واقف نے نہ پہچانا سوائے مولانا غلام غوث ہزاروی رحمہ اللہ کے) تو بہر حال اللہ تعالیٰ نے مہربانی فرمائی اور حج مکمل ہوگیا۔ تو معذور کی طرف سے دوسرا آدمی بھی حج کرسکتا ہے۔ اور مرد کی طرف سے مرد بھی جاسکتا ہے اور عورت بھی جاسکتی ہے۔ اور عورت کی طرف سے مرد بھی جاسکتا ہے اور عورت بھی جاسکتی ہے۔ (یہاں پر سامعین میں سے ایک نے سوال کیا کہ وہ تمتع کرسکتا ہے؟ تو حضرت نے جواب دیا کہ ہرگز نہیں! حج بدل میں تمتع نہیں کر سکتا۔ یعنی عمرے کا احرام نہیں باندھ سکتا۔) حج فرض ہے اور عمرے کے بارے میں اختلاف کرتے ہیں کہ آیا یہ واجب ہے یا سنت مؤکدہ ہے۔

عمرہ کی فضیلت

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ کی تحقیق یہ ہے کہ عمرہ سنّت ہے۔ ترمذی شریف کی روایت ہے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے کہ آنحضرت ﷺ سے سوال کیا گیا کہ اَعُمْرَةٌ وَاجِبَةٌ "کیا عمرہ واجب ہے؟" قَالَ لَا بَلْ هِيَ سُنَّةٌ "فرمایا واجب نہیں بلکہ سنت ہے۔" ساری عمر میں ایک دفعہ حج فرض ہے۔ اور اگر رب تعالیٰ توفیق دے تو نفلی حج آدمی جتنے چاہے کرے اور عمرے جتنے چاہے کرے اس کے لیے کوئی پابندی نہیں ہے۔ البتہ بہتر عمرہ رمضان شریف میں ہے۔ بخاری شریف کی روایت ہے:

آنحضرت ﷺ نے فرمایا: عُمْرَةٌ فِيْ رَمَضَانَ تَعْدِلُ حَجَّةً "رمضان المبارک میں عمرہ کرنے کا ثواب حج کے برابر ہوتا ہے۔" اور ایک روایت میں آتا ہے: عُمْرَةٌ فِيْ رَمَضَانَ تَعْدِلُ حَجَّةً مَّعِيْ یہ بھی بخاری شریف کی روایت ہے۔ فرمایا کہ جو رمضان میں عمرہ کرے گا اس کو ان حاجیوں کا ثواب ملے گا جنھوں نے میرے ساتھ حج کیا ہے۔

یہ فضیلت کی بات ہے ورنہ عمرہ سارا سال کرسکتا ہے سوائے پانچ دنوں کے کہ ان دنوں میں عمرہ مکروہ ہے۔ نویں،

دسویں، گیارھویں، بارھویں اور تیرھویں ذوالحجہ کو عمرہ مکروہ ہے۔ اور کراہت کی وجہ یہ ہے کہ عمرہ نام ہے کعبۃ اللہ کے طواف کا اور اس کے بعد صفا مروہ کرنے کا۔ یعنی احرام باندھنا اور کعبۃ اللہ کا طواف کرنا اور صفا مروہ کی سعی کرنا۔ اب اگر کوئی ان دنوں میں عمرہ کے لیے گیا تو یہ دن ہیں حج کے تو وہ بڑا نادان ہے کہ بڑی عبادت چھوڑ کر چھوٹی کو اختیار کرے کیوں کہ حج کا مقام تو بڑا ہے چاہے نفلی ہی کیوں نہ ہو۔ ہاں! اگر ان دنوں میں عمرہ کرے گا تو ہو جائے گا مگر مکروہ ہوگا۔

تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا ﴿اِنَّ الصَّفَا﴾ بے شک صفا ﴿وَالْمَرْوَةَ﴾ اور مروہ ﴿مِنْ شَعَآىِٕرِ اللّٰهِ﴾ اللہ تعالیٰ کی قائم کردہ علامتوں میں سے ہیں ﴿فَمَنْ حَجَّ الْبَیْتَ﴾ پس جس نے بیت اللہ کا حج کیا ﴿اَوِ اعْتَمَرَ﴾ یا عمرہ کیا۔ اور عمرے کا معنیٰ ہوتا ہے زیارت کرنا۔ تو کعبۃ اللہ کی زیارت شریعت کے بتائے ہوئے افعال کے ساتھ ہو ﴿فَلَا جُنَاحَ عَلَیْهِ﴾ تو اس پر کوئی حرج نہیں ہے ﴿اَنْ یَّطَّوَّفَ بِهِمَا﴾ یہ کہ چکر لگائے صفا اور مروہ کے درمیان۔ یہ ان لوگوں کی اصلاح ہوئی جو عمرے میں صفا مروہ نہیں کرتے تھے ﴿وَمَنْ تَطَوَّعَ خَیْرًا﴾ اور جس نے دل کھول کر نیکی کی ﴿فَاِنَّ اللّٰهَ شَاكِرٌ﴾ پس بے شک اللہ تعالیٰ قدردان ہے ﴿عَلِیْمٌ﴾ جانتا ہے۔

آگے اللہ تعالیٰ کتمان علم کا گناہ بیان فرماتے ہیں، پہلے یہود و نصاریٰ کا ذکر تھا ﴿اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ﴾ "وہ لوگ جن کو ہم نے کتاب دی ہے ﴿یَعْرِفُوْنَهٗ﴾ اس نبی کو اس طرح پہچانتے ہیں ﴿كَمَا﴾ جس طرح ﴿یَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ﴾ پہچانتے ہیں اپنے بیٹوں کو لیکن ﴿وَاِنَّ فَرِیْقًا مِّنْهُمْ لَیَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ﴾ ایک گروہ ان میں سے حق کو چھپاتا ہے۔" تو یہ جو حق کو چھپانے والے ہیں ان کی رب تعالیٰ تردید فرماتے ہیں:

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ﴾ بے شک وہ لوگ جو ﴿یَكْتُمُوْنَ﴾ جو چھپاتے ہیں ﴿مَاۤ اَنْزَلْنَا﴾ اس کو جو ہم نے نازل کیا ہے ﴿مِنَ الْبَیِّنٰتِ﴾ واضح دلیلیں اور واضح حکم نازل کیے ہیں ﴿وَالْهُدٰى﴾ اور ہدایت ہم نے نازل کی۔ تو جو لوگ ان کو چھپاتے ہیں ﴿مِنْۢ بَعْدِ مَا بَیَّنّٰهُ﴾ بعد اس کے کہ ہم نے ان کو بیان کیا ﴿لِلنَّاسِ﴾ لوگوں کے لیے ﴿فِی الْكِتٰبِ﴾ کتاب میں ﴿اُولٰٓىِٕكَ یَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ﴾ وہ لوگ ہیں جن پر رب بھی لعنت بھیجتا ہے ﴿وَیَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَ﴾ اور لعنت بھیجنے والے سارے لعنت بھیجتے ہیں۔

حق بات چھپانے کی مذمت

حق کی بات کو چھپانا بڑے گناہوں میں سے ہے خصوصاً وہ مسئلہ جو قرآن پاک میں ہو۔ کسی مصلحت کے پیشِ نظر یا کسی ڈر کے پیشِ نظر۔ اس کو نہ بیان کرنے والا اِن لوگوں میں شامل ہے۔ اور یاد رکھنا! یہ صرف مولویوں پر ہی گناہ نہیں بلکہ ہر آدمی اس میں شامل ہے۔ جو قرآن کا مسئلہ سمجھتا ہے صحیح معنیٰ میں اور جہاں بیان کرنا ہے وہاں بیان نہیں کرتا تو وہ بھی اس کی زد میں ہے۔ چاہے اس کو سارا قرآن نہیں آتا بلکہ ایک چیز اس کو آتی ہے اور صحیح طور پر آتی ہے۔ اور یہ جو موٹے موٹے مسئلے ہیں ان کو تو سارے مسلمان جانتے ہیں۔ تو گناہ گار صرف مولوی نہیں بلکہ عوام بھی اس کی زد میں ہیں۔ ہاں! اگر مسئلے کی حقیقت خود

نہیں سمجھتا یا یہ خیال کرتا ہے کہ میں اس کو اچھی طرح بیان نہیں کر سکوں گا تو اس کے لیے جائز ہے کہ وہ نہ بتائے۔

تو فرمایا بے شک وہ لوگ جو چھپاتے ہیں وہ چیز جو ہم نے نازل کی واضح دلیلوں میں سے اور واضح احکام اور ہدایت میں سے بعد اس کے کہ ہم نے اس کو لوگوں کے لیے بیان کیا ﴿فِی الْکِتٰبِ﴾ کتاب میں ﴿اُولٰٓئِکَ﴾ وہ لوگ ہیں ﴿یَلْعَنُھُمُ اللّٰہُ﴾ اللہ تعالیٰ ان پر لعنت بھیجتا ہے ﴿وَیَلْعَنُھُمُ اللّٰعِنُوْنَ﴾ اور لعنت بھیجنے والے بھی لعنت بھیجتے ہیں۔ اور وہ کون ہیں؟ ان کا ذکر آگے آرہا ہے۔ ہاں! ﴿اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا﴾ مگر وہ لوگ جنھوں نے پہلے حق چھپایا تھا پھر حق چھپانے سے توبہ کر گئے ﴿وَاَصْلَحُوْا﴾ اور اپنی اصلاح کر لی ﴿وَبَیَّنُوْا﴾ اور آگے حق بیان کرنا اُنھوں نے شروع کیا تو وہ گناہ جو توبہ سے معاف ہوتے ہیں ان میں سے ایک گناہ یہ بھی ہے کہ کسی نے مسئلہ بتایا ہی نہیں مگر اس نے بعد میں سچے دل سے توبہ کر لی اپنی بھی اصلاح کی ﴿وَبَیَّنُوْا﴾ اور اس مسئلے کو بیان بھی کیا تو اللہ تعالیٰ اس کو معاف کر دے گا تو یہ لوگ بچ جائیں گے ﴿فَاُولٰٓئِکَ اَتُوْبُ عَلَیْھِمْ﴾ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں یہ لوگ ہیں جن کی توبہ میں قبول کرتا ہوں ﴿وَاَنَا التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ﴾ اور میں توبہ قبول کرنے والا اور نہایت رحم کرنے والا ہوں ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا﴾ بے شک وہ لوگ جو کافر ہیں ﴿وَمَاتُوْا وَھُمْ کُفَّارٌ﴾ اور مرے اس حال میں کہ کافر ہیں ﴿اُولٰٓئِکَ عَلَیْھِمْ لَعْنَۃُ اللّٰہِ﴾ وہ لوگ ہیں جن پر رب کی لعنت ہے ﴿وَالْمَلٰٓئِکَۃِ﴾ اور فرشتوں کی بھی لعنت ہے ﴿وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ﴾ اور تمام انسانوں کی بھی لعنت ہے۔ جس کا کفر پر خاتمہ ہوا وہ انتہائی ملعون ہے۔

جس وقت کافر بدکار مر جاتا ہے زمین سکون لیتی ہے کہ الحمد للہ! ایک بلا ہم سے ٹل گئی ہے۔

ایک جنازہ جا رہا تھا آنحضرت ﷺ نے فرمایا: مُسْتَرِیْحٌ اَوْ مُسْتَرَاحٌ مِّنْہُ "یہ آرام پانے والا ہے یا اس سے لوگوں کو آرام مل گیا ہے۔" سوال کیا گیا حضرت! مستریح کون ہے؟ فرمایا مومن، کہ دنیا کی تکلیفوں سے اس کو راحت مل گئی اور اگر دوسری مد کا ہے تو یَسْتَرِیْحُ الْعِبَادُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَابُ "تو انسانوں، درختوں، جانوروں اور راستوں، سب کو اس سے پناہ اور راحت مل گئی۔" کیوں کہ بُرا آدمی جب چلتا ہے تو یہ سب چیزیں اس پر لعنت بھیجتی ہیں۔

﴿خٰلِدِیْنَ فِیْھَا﴾ اس لعنت میں ہمیشہ رہیں گے۔ اور لعنت کا محل دوزخ ہے ﴿لَا یُخَفَّفُ عَنْھُمُ الْعَذَابُ﴾ نہیں کم کیا جائے گا ان سے عذاب ﴿وَلَا ھُمْ یُنْظَرُوْنَ﴾ اور جب فیصلہ ہوگا کہ ان کو دوزخ میں ڈالو تو ایک لمحے کی بھی ان کو مہلت نہیں ملے گی۔ ایسا نہیں ہوگا کہ مثلاً: فیصلہ ہو بارہ بجے ان کو دوزخ میں ڈالو تو دو منٹ اُوپر گزر جائیں۔ ایک منٹ کی بھی مہلت نہیں ملے گی فوراً دوزخ میں ڈالا جائے گا۔

آگے رب تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ﴿وَاِلٰھُکُمْ اِلٰہٌ وَّاحِدٌ﴾ تمھارا معبود، مسجود، حاجت روا، مشکل کشا، فریادرس، دست گیر، صرف رب تعالیٰ ہے۔ کوئی حاکم نہیں بہ جز پروردگار کے۔ تمھارا صرف ایک ہی الٰہ ہے ﴿لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ﴾ اس کے سوا اور کوئی الٰہ نہیں ہے ﴿الرَّحْمٰنُ﴾ نہایت رحم کرنے والا ہے ﴿الرَّحِیْمُ﴾ مہربان ہے۔

حضرت شاہ عبد العزیز صاحب محدث دہلوی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ رحمٰن اسے کہتے ہیں جو بغیر مانگنے کے دے

اور رحیم اسے کہتے ہیں جو مانگنے پر دے۔ اب دیکھو! ہم جب چھوٹے بچے تھے تو ہمیں کیا معلوم کہ آنکھ کیا ہوتی ہے، پیر کیا ہے، کان کیا ہیں اور زبان کیا ہے؟ یہ ساری نعمتیں رب نے بغیر مانگے دی ہیں۔ اور رحیم وہ ہے جو مانگے سے دے اور اُسی سے مانگنا چاہیے۔ اکبر الٰہ آبادی مرحوم بڑے مؤحد تھے۔ لکھتے ہیں: ؏

اُسی سے مانگ جو کچھ مانگنا ہو، اے اکبرؔ
یہی وہ در ہے کہ ذلت نہیں سوال کے بعد

تو یہی دروازہ ہے اور کسی سے مانگنے کا فائدہ ہی کوئی نہیں ہے۔

﴿اِنَّ﴾ بے شک ﴿فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ﴾ آسمانوں کے پیدا کرنے میں ﴿وَالْاَرْضِ﴾ اور زمین کے پیدا کرنے میں ﴿وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ﴾ اور رات کے مختلف ہونے میں ﴿وَالنَّهَارِ﴾ اور دن کے مختلف ہونے میں ﴿وَالْفُلْكِ﴾ اور کشتیاں ﴿الَّتِیْ﴾ وہ ﴿تَجْرِیْ﴾ جو چلتی ہیں ﴿فِی الْبَحْرِ﴾ سمندر میں ﴿بِمَا﴾ وہ چیزیں لے کر ﴿یَنْفَعُ النَّاسَ﴾ جو لوگوں کو فائدہ دیتی ہیں ﴿وَمَا﴾ اور وہ چیز ﴿اَنْزَلَ اللّٰهُ﴾ جو نازل کی اللہ تعالیٰ نے ﴿مِنَ السَّمَآءِ﴾ آسمان سے ﴿مِنْ مَّآءٍ﴾ بارش ﴿فَاَحْیَا بِهِ الْاَرْضَ﴾ پس زندہ کیا اس کے ذریعے زمین کو ﴿بَعْدَ مَوْتِهَا﴾ اس کے مر جانے کے بعد ﴿وَ بَثَّ فِیْهَا﴾ اور بکھیرے اللہ تعالیٰ نے زمین میں ﴿مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ﴾ ہر قسم کے جانور ﴿وَّ تَصْرِیْفِ الرِّیٰحِ﴾ اور ہواؤں کے بدلنے میں ﴿وَالسَّحَابِ﴾ اور وہ بادل ﴿الْمُسَخَّرِ﴾ جو لٹکا ہوا ہے ﴿بَیْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ﴾ آسمان اور زمین کے درمیان ﴿لَاٰیٰتٍ﴾ ان ساری چیزوں میں البتہ نشانیاں ہیں ﴿لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ﴾ اس قوم کے لیے جو عقل سے کام لے ﴿وَمِنَ النَّاسِ﴾ اور لوگوں میں سے ﴿مَنْ﴾ وہ بھی ہیں ﴿یَّتَّخِذُ﴾ جو بناتے ہیں ﴿مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ اللہ تعالیٰ سے ورے ورے ﴿اَنْدَادًا﴾ شریک ﴿یُّحِبُّوْنَهُمْ﴾ ان کے ساتھ محبت کرتے ہیں ﴿كَحُبِّ اللّٰهِ﴾ جیسے اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت ہونی چاہیے ﴿وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا﴾ اور وہ لوگ جو مومن ہیں ﴿اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ﴾ وہ زیادہ سخت ہیں محبت میں اللہ تعالیٰ کے لیے ﴿وَلَوْ یَرَی الَّذِیْنَ﴾ اور اگر دیکھ لیں وہ لوگ ﴿ظَلَمُوْٓا﴾ جنھوں نے ظلم کیا ﴿اِذْ یَرَوْنَ الْعَذَابَ﴾ جب دیکھیں گے عذاب کو ﴿اَنَّ الْقُوَّةَ﴾ بے شک قوت ﴿لِلّٰهِ جَمِیْعًا﴾ ساری اللہ تعالیٰ کے واسطے ہے ﴿وَّاَنَّ اللّٰهَ﴾ اور بے شک اللہ تعالیٰ ﴿شَدِیْدُ الْعَذَابِ﴾ سخت سزا دینے والا ہے ﴿اِذْ تَبَرَّاَ الَّذِیْنَ﴾ جس وقت بے زاری کا اعلان کریں گے وہ لوگ ﴿اتُّبِعُوْا﴾ جن کی پیروی کی گئی ﴿مِنَ

﴿الَّذِيْنَ﴾ ان لوگوں سے ﴿اتَّبَعُوْا﴾ جنھوں نے پیروی کی ﴿وَرَاَوُا الْعَذَابَ﴾ اور دیکھ لیں گے وہ عذاب کو ﴿وَتَقَطَّعَتْ﴾ اور منقطع ہو جائیں گے ﴿بِهِمُ الْاَسْبَابُ﴾ اُن کے آپس کے تعلقات ﴿وَقَالَ الَّذِيْنَ﴾ اور کہیں گے وہ لوگ ﴿اتَّبَعُوْا﴾ جنھوں نے پیروی کی ﴿لَوْ﴾ کاش ﴿اَنَّ لَنَا﴾ بے شک ہو ہمارے واسطے ﴿كَرَّةً﴾ لوٹنا دنیا کی طرف ﴿فَنَتَبَرَّاَ مِنْهُمْ﴾ پس ہم ان سے بے زار ہو جائیں ﴿كَمَا تَبَرَّءُوْا مِنَّا﴾ جیسے یہ ہم سے بے زار ہوئے ہیں ﴿كَذٰلِكَ﴾ اسی طرح ﴿يُرِيْهِمُ اللّٰهُ﴾ اللہ تعالیٰ ان کو دکھائے گا ﴿اَعْمَالَهُمْ﴾ ان کے اعمال ﴿حَسَرٰتٍ عَلَيْهِمْ﴾ ان پر حسرتیں اور افسوس کی چیزیں ہوں گی ﴿وَمَا هُمْ﴾ اور نہیں ہوں گے وہ ﴿بِخٰرِجِيْنَ مِنَ النَّارِ﴾ نکل سکنے والے دوزخ سے۔

سات آسمان اور سات زمینیں

اس سے پہلی آیت میں ذکر تھا ﴿وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ﴾ معبود تمھارا ایک ہی ہے ﴿لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ﴾ اس کے علاوہ کوئی معبود نہیں ہے ﴿الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ﴾ وہی رحمٰن اور رحیم ہے۔ آگے بعض دلیلیں بیان فرماتے ہیں کہ رب تعالیٰ کی وحدانیت اور الوہیت کو سمجھنا کوئی مشکل نہیں ہے۔ مگر کوئی عقل سے کام لے تو بات بنے گی۔

﴿اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ بے شک آسمانوں کے پیدا کرنے میں اور زمین کے پیدا کرنے میں۔ تو سَمٰوٰتٍ فرمایا ہے۔ اور قرآن کریم میں ﴿سَبْعَ سَمٰوٰتٍ﴾ کا لفظ متعدد مقامات پر آتا ہے کہ سات آسمان ہیں۔ باقی تو ہمیں نظر نہیں آتے البتہ پہلا آسمان تو سب کو نظر آتا ہے۔ کتنا وسیع آسمان ہے لیکن اس آسمان کے نیچے کوئی ستون نہیں ہے، کوئی کھمبا اور دیوار نہیں ہے۔ یعنی کوئی سہارا نہیں ہے۔ لوگ چھوٹی چھوٹی عمارتیں بناتے ہیں ان کے نیچے دیکھو کتنے ستون اور دیواریں ہیں۔ اور اگر خدا کی قدرت کو سمجھنا چاہو تو آسمان کی بلندی اور اس کی وسعت اور اس کا بغیر ستونوں کے کھڑے ہونے سے بھی رب کی قدرت کو سمجھ سکتے ہو۔ قرآن کریم میں آسمانوں کے سات ہونے کا ذکر تو متعدد مقامات پر آتا ہے اور زمینوں کے سات ہونے کا ذکر صرف سورۂ طلاق کے اندر آیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم نے سات آسمان پیدا فرمائے ﴿وَّمِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ﴾ اور اتنی ہی ہم نے زمینیں پیدا کی ہیں۔ یعنی زمینیں بھی سات پیدا فرمائی ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ نے زمینیں بھی پیدا فرمائیں۔ اور ایک حدیث حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ان زمینوں میں بھی مخلوق ہے جس طرح اس زمین میں مخلوق ہے۔ اللہ تعالیٰ کے لشکر کو صرف اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے اور کوئی نہیں جان سکتا۔

زمین کی وسعت کو دیکھو، فراخی دیکھو، مختلف ممالک ہیں۔ حالانکہ یہ خشکی کے جو علاقے ہیں یہ صرف انتیس حصے ہیں اکہتر حصے پانی کے نیچے ہیں۔ اور ان انتیس حصوں میں ساری حکومتیں ہیں اور بعض حکومتیں اتنی وسیع ہیں کہ کئی گھنٹوں تک جہاز ان

میں چلتے ہیں پھر کہیں جا کر کنارے پر پہنچتے ہیں۔ خدا تعالیٰ کی قدرت کو سمجھنا چاہتے ہو تو زمین کی فراخی کو دیکھ لو۔

﴿وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ﴾ اور رات کے مختلف ہونے میں اور دن کے مختلف ہونے میں۔ رات تاریک ہے اور دن روشن ہے۔ کبھی رات بڑھ جاتی ہے اور کبھی دن بڑھ جاتا ہے، کبھی رات گھٹ جاتی ہے اور کبھی دن گھٹ جاتا ہے۔ یہ دن رات کے مشاہدے ہیں ان میں تم رب کی قدرت کو سمجھ سکتے ہو ﴿وَالْفُلْكِ الَّتِيْ﴾ اور کشتیاں ﴿تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ﴾ جو سمندر میں چلتی ہیں ﴿بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ﴾ وہ چیزیں لے کر جو لوگوں کو نفع دیتی ہیں۔ اس زمانے میں کشتیاں ہی ہوتی تھیں اور اب تو جہاز بھی ہیں۔ ایک علاقے کی چیزیں دوسرے تک، دوسرے کی تیسرے تک۔ یہ نفع والی چیزیں وہاں تک پہنچاتی ہیں حالانکہ ان میں بڑا وزن بھی ہوتا ہے لیکن پھر بھی پانی میں ڈوبتی نہیں۔ کیا یہ رب تعالیٰ کی قدرت تم نہیں دیکھتے کہ یہ کشتیاں کس کے حکم سے چلتی ہیں؟ پانی میں ان کو کس ذات نے سہارا دیا ہوا ہے؟

﴿وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ﴾ جو اللہ تعالیٰ نے آسمان کی طرف سے نازل کی ﴿مِنْ مَّآءٍ﴾ بارش ﴿فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ﴾ اس بارش کے ذریعے رب نے زمین کو زندہ کیا، سرسبز کیا ﴿بَعْدَ مَوْتِهَا﴾ مر چکنے کے بعد۔ زمین بالکل مُردہ تھی بارش نازل ہوتی ہے اس کے بعد زمین میں درخت پیدا ہوتے ہیں، سبزیاں پیدا ہوتی ہیں، گھاس پیدا ہوتی ہے، انسانوں کے لیے فصلیں پیدا ہوتی ہیں، پھل فروٹ پیدا ہوتے ہیں۔ یہ بارش کون نازل کرتا ہے، زمین سے کون اُگاتا ہے؟ ﴿وَبَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ﴾ اور اللہ تعالیٰ نے زمین میں بکھیر دیئے ہیں ہر طرح کے جانور۔ پھر جانوروں کی شکلیں دیکھو! کسی کی چار ٹانگیں ہیں، کسی کی دو، کسی کی زیادہ ہیں، کوئی زمین پر رینگتا ہے، کوئی چلتا ہے، کوئی اُڑتا ہے۔ یہ خدا کی قدرت تم نہیں دیکھتے۔

وحدانیت باری تعالیٰ کی دلیل

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے سوال کیا گیا رب تعالیٰ کی وحدانیت کی دلیل کیا ہے؟ تو سامنے کوئی شہتوت کا درخت تھا۔ فرمانے لگے بھائی! دور جانے کی ضرورت نہیں یہ توت کا درخت ہے اس کے پتوں کو ریشم کے کیڑے کھاتے ہیں تو ان کے پیٹ میں ریشم پیدا ہوتا ہے، اس کو ہرنیاں کھاتی ہیں تو کستوری پیدا ہوتی ہے، اس کو شہد کی مکھیاں کھاتی ہیں تو شہد پیدا ہوتا ہے، اس کو اونٹ اور بکریاں کھائیں تو مینگنیاں اور گوبر پیدا ہوتا ہے۔ چیز ایک ہی ہے شہتوت کے پتے، مگر آگے ان میں انقلابات پیدا کرنے والا رب تعالیٰ کے سوا کون ہے؟ تو سمجھنے کے لیے ایک ہی چیز کافی ہے اور نہ سمجھنے والے کے لیے سارے دلائل بے کار ہیں۔

تو فرمایا اللہ تعالیٰ نے بکھیرے ہیں ہر طرح کے جانور ﴿وَّتَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ﴾ اور ہواؤں کے پھیرنے میں۔ کبھی مشرق سے مغرب کی طرف چلتی ہیں اور کبھی مغرب سے مشرق کی طرف چلتی ہیں، کبھی گرم ہوتی ہیں اور کبھی سرد۔ یہ کون چلاتا ہے؟

آج سے کچھ سال پہلے نارنگ منڈی کے علاقہ میں ایک ہوا چلی تھی، مجھے وہاں ایک مدرسے کے افتتاح کے لیے جانے کا اتفاق ہوا تو ان لوگوں نے بتایا کہ یہ علاقہ بڑا مضبوط علاقہ تھا لینٹر پڑے ہوئے تھے، اس ہوا نے سارے لینٹر اُٹھا کر

پھینک دیئے مخصوص رقبے میں۔اور آج سے چند سال پہلے کوئٹہ کے علاقہ میں زلزلہ آیا کئی بستیاں تباہ ہو گئیں۔ ہر وقت رب تعالیٰ کے عذاب سے ڈرنا چاہیے۔مگر ہمارے اندر رب کا خوف نہیں رہا۔سب کچھ دیکھتے ہیں مگر ٹس سے مس نہیں ہوتے۔دل ہمارے ایسے سخت ہو چکے ہیں ﴿ كَالْحِجَارَةِ ﴾ پتھر کی طرح ہیں ﴿ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً ﴾ یا پتھر سے بھی زیادہ سخت ہیں۔

پہلے زمانے میں امام عبدالرحمٰن بن عمرو اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ہمارے محلے میں سے کوئی آدمی فوت ہو جاتا تھا تو کئی کئی دن تک ہمارے حلق سے روٹی نیچے نہیں اُترتی تھی، پانی نہیں اُترتا تھا، ہم غمگین ہوتے تھے کہ معلوم نہیں مرنے والے کے ساتھ کیا ہوا ہے؟ اور آج کل تو کوئی ماں باپ کو بھی دفن کرے تو اس پر بھی کوئی اثر نہیں ہوتا۔اس واسطے کہ ہم نے موت کو سمجھا ہے، نہ قبر کو سمجھا ہے اور نہ آخرت کو سمجھا ہے۔

تو فرمایا ﴿ وَّ تَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ ﴾ یہ جو ہوائیں چلائی ہیں ان کو کون چلاتا ہے اللہ تعالیٰ کی ذات کے بغیر ﴿ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ﴾ اور وہ بادل جو لٹکے ہوئے ہیں آسمان اور زمین کے درمیان۔

ایک دفعہ میں جہاز پر سوار ہوا اور وہ اس طرح ہوا کہ حج سے واپسی پر مجھے پاکستان کا ٹکٹ نہ مل سکا مجبوراً شام کا ٹکٹ لینا پڑا اور ہم جدہ سے دمشق چلے گئے۔راستہ میں بادل بہت گہرے تھے۔تو میں پوچھتا رہا کہ یہ پہاڑ کون سے ہیں؟ کہنے لگے یہ پہاڑ نہیں یہ تو بادل ہیں۔اور جہاز جب بادل سے اُوپر جاتا تھا تو بادل پہاڑ لگتے تھے۔

تو کس کے حکم سے ان میں بارش پیدا ہوتی ہے، کس کے حکم سے اولے بنتے ہیں؟ اگر رب تعالیٰ کی قدرت کو سمجھنا چاہو تو ایک ایک چیز میں رب تعالیٰ کی قدرت موجود ہے۔ان تمام چیزوں میں یعنی ﴿ اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ﴾ سے لے کر ﴿ لَاٰيٰتٍ ﴾ تک جو چیزیں بیان کی گئی ہے ان میں البتہ نشانیاں ہیں رب تعالیٰ کی قدرت کی مگر ﴿ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴾ اس قوم کے لیے جو عقل سے کام لے۔لیکن باوجود اس کے کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانیاں بڑی صاف اور واضح ہیں پھر بھی ﴿ وَمِنَ النَّاسِ ﴾ اور لوگوں میں سے بعض یہ مِنْ تَبْعِيْضِيَّه ہے۔وہ بھی ہیں ﴿ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا ﴾ جنھوں نے رب سے ورے ورے شریک بنائے ہوئے ہیں۔رب کی ذات کو چھوڑ کر نیچے اُنھوں نے سہارے بنائے ہوئے ہیں ﴿ يُّحِبُّوْنَهُمْ ﴾ ان کے ساتھ محبت کرتے ہیں ﴿ كَحُبِّ اللّٰهِ ﴾ جیسا کہ اللہ تعالیٰ سے محبت ہونی چاہیے۔

مشرک جتنے بھی ہیں کسی کی چاند کے ساتھ محبت ہے، کسی کی سورج کے ساتھ محبت ہے، کسی کی بزرگ کے ساتھ ہے، کسی کی بت کے ساتھ ہے۔یہ سارے اللہ تعالیٰ کی ذات سے نیچے ان کے ساتھ ایسی محبت کرتے ہیں جیسے رب کے ساتھ محبت کرنی چاہیے۔﴿ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا ﴾ اور وہ لوگ جو ایمان لائے ﴿ اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ﴾ ان کی سخت محبت ہے اللہ تعالیٰ کے ساتھ اور اللہ تعالیٰ کی ذاتِ گرامی کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت ایمان کا معیار ہے۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((لَا يُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰى اَكُوْنَ اَحَبَّ اِلَيْهِ مِنْ وَّالِدِهٖ وَ وَلَدِهٖ وَ النَّاسِ اَجْمَعِيْنَ)). بخاری شریف اور مسلم شریف کی حدیث ہے: "تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہوسکتا جب تک کہ اس کی محبت میرے ساتھ اپنے ماں باپ، اولاد اور تمام مخلوق سے بڑھ کر نہ ہو۔"

وہ اس طرح کہ ایک طرف ماں باپ کا حکم ہے، دوسری طرف آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے۔ اگر آنحضرت ﷺ کے قول و فعل کو چھوڑ کر ماں باپ کے طریقے پکڑے گا تو پھر ماں باپ کے ساتھ محبت ہوئی آنحضرت ﷺ کے ساتھ تو نہ ہوئی۔

بزرگانِ دین سے محبت

تو مومن کی محبت سب سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ کی ذات گرامی کی بعد آنحضرت ﷺ کے ساتھ ہے۔ پھر درجہ بہ درجہ پیغمبروں کے ساتھ، پھر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ، پھر تابعین، پھر تبع تابعین اور ائمہ دین، فقہائے کرام اور محدثین کے ساتھ ہے رحمۃ اللہ علیہم اور ان سے محبت اس واسطے ہے کہ یہ سارے رب تعالیٰ کے پیارے بندے ہیں اگر یہ دنیا میں نہ آتے یقین جانو! عالم اسباب میں ہم تک قرآن پہنچتا، نہ حدیث پہنچتی اور نہ ہی کلمہ پہنچتا ان حضرات نے بڑی بڑی قربانیاں دیں۔ ساری زندگیاں وقف کیں اور ہمارے واسطے یہ اسلام کا ذخیرہ چھوڑا۔

تو فرمایا لوگوں میں سے بعض وہ بھی ہیں ﴿مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا﴾ کہ اللہ تعالیٰ سے ورے ورے اُنھوں نے رب کے شریک بنائے ہوئے ہیں ﴿يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ﴾ ان کے ساتھ محبت کرتے ہیں جیسے رب کے ساتھ محبت کرنی چاہیے ﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا﴾ اور وہ لوگ جو ایمان لائے ہیں ﴿اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ﴾ ان کی زیادہ سخت محبت ہوتی ہے اللہ تعالیٰ کے ساتھ۔

فرمایا آج تو اپنے کفر و شرک پر بڑے مغرور اور بڑے نازاں ہیں ﴿وَلَوْ يَرَى الَّذِيْنَ﴾ اور اگر دیکھ لیں وہ لوگ ﴿ظَلَمُوْٓا﴾ جنھوں نے ظلم کیا ﴿اِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ﴾ جب دیکھیں گے عذاب کو ﴿اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا﴾ کہ بے شک ساری قوت اللہ تعالیٰ کے پاس ہے۔ اس وقت پتا چلے گا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا جو ان کے معبود ہیں وہ کیا کرتے ہیں اور اُنھوں نے کیا کیا ہے۔ جب قیامت کا دن آئے گا تو اس دن دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا۔ اس دن پتا چلے گا کہ ان ظالموں نے کیا کیا ہے ﴿وَّاَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعَذَابِ﴾ اور بے شک اللہ تعالیٰ سخت سزا دینے والا ہے ﴿اِذْ تَبَرَّاَ الَّذِيْنَ﴾ جس وقت بے زار ہوں گے وہ لوگ ﴿اتُّبِعُوْا﴾ جن کی پیروی کی گئی ﴿مِنَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا﴾ اُن سے جنھوں نے پیروی کی۔

قرآن پاک کے تیرھویں اور چوبیسویں پارے میں آتا ہے کہ یہ شرک کرنے والے سارے ان کے پاس جائیں گے جن کو انھوں نے رب کا شریک بنایا تھا جو وڈیرے تھے۔ اور ان کو جا کر کہیں گے کہ آج ہم پھنسے ہوئے ہیں ہمیں یہاں سے نکالنے کی کوشش کرو۔ وہ کہیں گے اِنَّا كُلٌّ فِيْهَآ "ہم بھی دوزخ میں ہیں ہم تمھیں کس طرح نکالیں" پھر سارے مل جل کر ابلیس کے پاس جائیں گے کہ سارے سبز باغ دکھاتا رہا ہے آج ہماری کوئی مدد کر۔ تو ابلیس کا جواب بڑا سخت ہوگا۔ وہ کہے گا: لَا تَلُوْمُوْنِيْ وَلُوْمُوْٓا اَنْفُسَكُمْ "مجھے کیوں ملامت کرتے ہو اپنے آپ کو ملامت کرو میرا کوئی تمھارے اُوپر زور نہ تھا اِلَّآ اَنْ دَعَوْتُكُمْ "میں نے تو صرف تمھیں دعوت دی تھی تم نے میری دعوت کیوں مانی؟" آج سارے میرے پاس آئے ہو اس طرح کہ گویا سب کو میں نے گمراہ کیا ہے۔ بلکہ آگے کہتا ہے اِنِّيْ كَفَرْتُ بِمَآ اَشْرَكْتُمُوْنِ "میرے کفر کے ذمہ دار بھی تم ہی ہو اس

واسطے کہ تم نے میری پوجا کی تو میں نے سمجھا کہ میں بھی کچھ ہوں اور اگر تم میری پوجا نہ کرتے تو میری ہمت پہلے ٹوٹ جاتی۔" کیسا جواب دیا۔

اللہ تعالیٰ نے عقل دی ہے۔آج ہمیں کوئی کھوٹا روپیہ دے تو ہم وہ لینے کے لیے تیار نہیں ہیں اور اگر کوئی آدمی عقیدہ گندہ پلے باندھ لے تو کیا اس میں معذور ہو جائے گا اور گندے عمل کرے تو کیا اس میں معذور ہوگا؟ ہرگز نہیں! اللہ تعالیٰ نے عقل بڑی چیز عطا فرمائی ہے۔تو فرمایا جنھوں نے پیروی کی ان سے وہ بے زار ہوں جن کی پیروی کی گئی ﴿وَرَاَوُا الْعَذَابَ﴾ اور وہ سارے عذاب کو دیکھ لیں گے ﴿وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْاَسْبَابُ﴾ اُن کے آپس کے سب تعلقات منقطع ہو جائیں گے۔نہ پیری مریدی رہے گی اور نہ وہاں پیشوا رہیں گے ﴿وَقَالَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا﴾ اور کہیں گے وہ لوگ جنھوں نے پیروی کی ﴿لَوْ﴾ کاش۔حرف ﴿لَوْ﴾ تمنی ہے۔﴿اَنَّ لَنَا كَرَّةً﴾ کاش کہ ہمارے واسطے لوٹنا ہو دنیا کی طرف تو ﴿فَنَتَبَرَّاَ مِنْهُمْ﴾ پس ہم ان سے بے زار ہو جائیں ﴿كَمَا تَبَرَّءُوْا مِنَّا﴾ جیسا کو یہ آج ہم سے بے زار ہوئے ہیں۔یعنی ہمیں دنیا میں جانا نصیب ہو جائے تو ہم وہاں جا کر ان کو کہیں کہ ہم تمھیں نہیں مانتے۔لیکن وہاں الزام ایک دوسرے پر ڈالنے سے عذاب تو نہیں ٹلے گا۔

فرمایا: ﴿كَذٰلِكَ يُرِيْهِمُ اللّٰهُ﴾ اسی طرح اللہ تعالیٰ ان کو بتائے گا ﴿اَعْمَالَهُمْ﴾ ان کے اعمال ﴿حَسَرٰتٍ عَلَيْهِمْ﴾ ان کے واسطے حسرت ہوں گے۔اُنھوں نے دنیا میں اپنے باطل معبودوں کو راضی کرنے کے لیے جو عمل کیے وہ سارے کے سارے ان کی ہلاکت اور خسارے کا ذریعہ بنیں گے ﴿وَمَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنَ النَّارِ﴾ اور نہ یہ عبادت کرنے والے اور نہ وہ جن کی عبادت کی گئی ہے یا اُنھوں نے اپنی عبادت کروائی ہے ان میں سے کوئی بھی دوزخ سے نہیں نکل سکے گا۔

ہاں! اللہ تعالیٰ کے وہ بندے جنھوں نے نہ شرک کیا اور نہ شرک کی ترغیب دلائی وہ ممتاز ہیں مثلاً: عیسیٰ علیہ السلام کی بھی پوجا تو ہوئی ہے، فرشتوں کی بھی ہوئی ہے، عزیر علیہ السلام کی ہوئی ہے۔اور وہ بزرگ جن کے ذریعے کلمہ اور دین پھیلا آج لوگ ان کی قبروں کا بھی طواف کرتے ہیں اور ان کی پوجا ہوتی ہے۔تو ان بے چاروں کا کیا قصور ہے؟ اگر ان کے بس میں ہوتا تو وہ قبروں سے نکل کر ان کے منہ توڑ دیتے کہ بے ایمانو! تم کیا کرتے ہو۔ہم نے تو کفر و شرک کو مٹایا تھا اور رسومات مٹائی تھیں اور تم ہماری قبروں کے ساتھ یہ حرکتیں کرتے ہو۔مگر اللہ تعالیٰ نے ان کو اگلے جہان پہنچایا ہے اِن کا کوئی گناہ نہیں ہے۔تو جو مجرم ہیں وہ کبھی آگ سے نہیں نکلیں گے۔

﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ﴾ اے انسانو! ﴿كُلُوْا﴾ کھاؤ ﴿مِمَّا﴾ ان چیزوں سے ﴿فِي الْاَرْضِ﴾ جو زمین میں ہیں ﴿حَلٰلًا﴾ حلال ہیں ﴿طَيِّبًا﴾ پاکیزہ ہیں ﴿وَّلَا تَتَّبِعُوْا﴾ اور نہ تم پیروی کرو ﴿خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ﴾ شیطان کے قدموں کی ﴿اِنَّهٗ﴾ بے شک وہ شیطان ﴿لَكُمْ﴾ تمھارے واسطے ﴿عَدُوٌّ﴾ دشمن ہے ﴿مُّبِيْنٌ﴾ کھلا ﴿اِنَّمَا﴾

پختہ بات ہے ﴿یَاْمُرُكُمْ﴾ شیطان تمھیں حکم دیتا ہے ﴿بِالسُّوْٓءِ﴾ بُرائی کا ﴿وَالْفَحْشَآءِ﴾ اور بے حیائی کا ﴿وَاَنْ﴾ اور اس بات کا ﴿تَقُوْلُوْا﴾ تم کہو ﴿عَلَى اللّٰهِ﴾ اللہ تعالیٰ پر ﴿مَالَا تَعْلَمُوْنَ﴾ جو کچھ تم نہیں جانتے ﴿وَاِذَا قِیْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا﴾ اور جس وقت ان کو کہا جاتا ہے پیروی کرو اس چیز کی ﴿مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ﴾ جو اللہ تعالیٰ نے نازل فرمائی ہے ﴿قَالُوْا﴾ کہتے ہیں ﴿بَلْ﴾ بلکہ ﴿نَتَّبِعُ﴾ ہم پیروی کریں گے ﴿مَآ﴾ اس چیز کی ﴿اَلْفَیْنَا عَلَیْهِ﴾ جس چیز پر ہم نے پایا ﴿اٰبَآءَنَا﴾ اپنے باپ دادوں کو ﴿اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ﴾ اور کیا اگرچہ تھے ان کے باپ دادے ﴿لَا یَعْقِلُوْنَ شَیْئًا﴾ نہیں جانتے تھے کسی چیز کو ﴿وَّلَا یَهْتَدُوْنَ﴾ اور نہیں تھے وہ ہدایت یافتہ ﴿وَمَثَلُ الَّذِیْنَ﴾ اور مثال ان لوگوں کی ﴿كَفَرُوْا﴾ جو کافر ہیں ﴿كَمَثَلِ الَّذِیْ﴾ جیسے مثال ہے اس شخص کی ﴿یَنْعِقُ﴾ جو چلا کر بلاتا ہے ﴿بِمَا﴾ ان جانوروں کو ﴿لَا یَسْمَعُ﴾ جو نہیں سنتے ﴿اِلَّا دُعَآءً﴾ مگر بلاوا ﴿وَّنِدَآءً﴾ اور پکار ﴿صُمٌّۢ﴾ وہ بہرے ہیں ﴿بُكْمٌ﴾ گونگے ہیں ﴿عُمْیٌ﴾ اندھے ہیں ﴿فَهُمْ لَا یَعْقِلُوْنَ﴾ پس وہ نہیں سمجھتے ﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا﴾ اے لوگو جو ایمان لائے ہو ﴿كُلُوْا﴾ کھاؤ ﴿مِنْ طَیِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ﴾ پاکیزہ ان چیزوں سے جو ہم نے تمھیں دیں ﴿وَاشْكُرُوْا لِلّٰهِ﴾ اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو ﴿اِنْ كُنْتُمْ اِیَّاهُ تَعْبُدُوْنَ﴾ اگر ہو تم خاص اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے۔

حلال وحرام کے خود ساختہ احکام

عرب کے مشرکوں نے اپنی مرضی سے بعض چیزوں کو حلال اور بعض کو حرام کرلیا تھا۔ ساتویں پارے میں اس کی تفصیل ان شاء اللہ تعالیٰ اگر زندگی رہی تو۔ مثلاً: بعض جانوروں کو مخصوص کرتے تھے کہ ان کا دودھ صرف وہ لوگ پئیں گے جو لات کے پجاری ہیں اور کسی کو ہاتھ بھی نہیں لگانے دیتے تھے، جب مادہ جانور کے پیٹ سے بچہ پیدا ہوتا تھا تو اگر وہ مُردہ پیدا ہوتا تو کہتے کہ اس کو عورتیں بھی کھا سکتی ہیں اور اگر زندہ پیدا ہوتا تو کہتے کہ یہ عورتوں کے لیے حرام ہے اور ہمارے لیے حلال ہے اور کئی چیزیں اُنھوں نے اپنی مرضی سے حلال اور حرام کی ہوئی تھیں۔ حالانکہ حلال کرنا اور حرام کرنا صرف رب تعالیٰ کا کام ہے مخلوق میں سے کسی کو کسی چیز کے حلال اور حرام کرنے کا اختیار نہیں ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر خدا کی مخلوق میں اور کوئی نہیں ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی جب اپنی گھریلو مصلحت کے واسطے صرف اپنی ذات کے لیے شہد حرام کیا تھا۔ امت کے واسطے نہیں اور بیویوں کے لیے بھی حرام نہیں کیا تھا بلکہ صرف اپنی ذات کے لیے کیا تھا تو اللہ تعالیٰ نے مکمل سورت نازل فرمائی، سورۃ التحریم ﴿یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ﴾ "اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم! کیوں آپ نے حرام کی وہ چیز جو رب تعالیٰ نے حلال فرمائی ہے۔" تو اُنھوں نے اپنی مرضی سے بعض چیزیں حلال

کی تھیں اور بعض چیزیں حرام کی تھیں۔

اللہ تعالیٰ تمام انسانوں کو خطاب کر کے فرماتے ہیں ﴿یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ﴾ اے انسانو! اور انسانوں کی تخصیص اس واسطے ہے کہ زمین کی خلافت انسانوں کے لیے ہے اور جنات ان کے تابع ہیں۔ اے انسانو! ﴿كُلُوْا﴾ کھاؤ ﴿مِمَّا فِی الْاَرْضِ﴾ وہ چیز جو زمین میں ہے۔ لیکن دو شرطیں ہیں ﴿حَلٰلًا﴾ کہ وہ حلال ہو اور اس سے مراد وہ چیز ہے جس کے کھانے کی رب تعالیٰ نے اجازت دی ﴿طَیِّبًا﴾ اور طیب ہو۔ طیب اُس کو کہتے ہیں کہ جس کے ساتھ کسی اور کا حق متعلق نہ ہو مثال کے طور پر گندم حلال ہے اور اگر کسی سے رشوت میں لی ہو یا غصب کی ہو یا چوری کی ہو تو وہ طیب نہیں ہے، کھا نہیں سکتا۔ بکری حلال ہے مگر کسی کی چوری کی بکری ذبح کر کے کھائے تو وہ طیب نہیں ہے۔ مرغی حلال ہے، انڈے حلال ہیں مگر کسی سے چھین کر نہ لی ہو۔ تو کھانے کے لیے دو شرطیں ہیں۔ ایک یہ کہ رب تعالیٰ نے اس کے کھانے کی اجازت دی ہو اور دوسرا یہ کہ غیر کا حق اس کے ساتھ وابستہ نہ ہو یا یوں کہہ لیں کہ حلال میں حق اللہ کو ملحوظ رکھے اور طیب میں حق العبد کو ملحوظ رکھے، اگر کسی غیر کا حق ہے تو وہ اسی طرح حرام ہے جس طرح خنزیر حرام ہے۔

﴿وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِ﴾ اور نہ پیروی کرو تم شیطان کے قدموں کی ﴿اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ﴾ بے شک وہ شیطان تمھارا کھلا دشمن ہے اور وہ اپنی دشمنی کسی منزل اور کسی مرحلہ پر بھی نہیں چھوڑتا۔

ایک مشہور کہاوت ہے اور بعض کہانیاں بھی ایسی ہوتی ہیں کہ ان سے عبرت حاصل ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی نیک بندہ تھا اور اس کی زندگی اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اطاعت میں گزرتی تھی، شیطان کے بہکاوے میں نہیں آتا تھا، دوپہر کا وقت تھا گرمی کا زمانہ تھا ایک دیوار کے سایہ کے نیچے جا کے لیٹا کہ میں تھوڑا سا آرام کرلوں۔ حدیث پاک میں آتا ہے: ((مِنْ دَاْبِ الصّٰلِحِیْنَ الْقَیْلُوْلَةُ)) راتیں چھوٹی اور دن لمبے ہوں تو نیک آدمیوں کی عادت ہے دوپہر کو تھوڑا سا سو جانا یہ رات کے جاگنے کے لیے تمہید ہے۔

تو وہ دیوار کے نیچے سو گیا تھوڑا سا وقت گزرا تو ایک آدمی نے آکر اس کا پاؤں ہلایا کہ بھائی اُٹھ جا دیوار گرنے والی ہے۔ وہ اُٹھا، تھوڑا سا دور گیا تو واقعتاً دیوار گر گئی۔ اس نے دریافت کیا کہ تو کون ہے جو میرے لیے رحمت کا فرشتہ ثابت ہوا ہے؟ اس نے کہا یہ نہ پوچھو کہ میں کون ہوں؟ تیری جان تو بچ گئی۔ اس نیک آدمی نے کہا کہ تو مجھے بتا تو سہی کہ تو کون ہے؟ کہنے لگا کہ میں ابلیس ہوں، اس نیک آدمی نے کہا: لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ! ابلیس کو میرے ساتھ کیا ہمدردی تھی میں نے تو اس کی کبھی بات نہیں سنی مگر میری جان تو بچ گئی۔ اس نے کہا کہ تو مجھے بتا کہ بات کیا ہے؟ ابلیس نے کہا تو اگر دیوار کے نیچے آکر مر جاتا تو شہید ہوتا، میں اپنے دشمن کو شہید کیوں ہونے دوں۔

حدیث پاک میں آتا ہے کہ اگر کوئی مکان کے نیچے آکر مر جائے اور وہ مومن ہو تو وہ شہید ہے۔ تو شیطان کی دشمنی دیکھو! اس کی جان بچائی مگر دشمنی کا پرنالہ اپنی جگہ رکھا۔ رب تعالیٰ نے سچ فرمایا ہے ﴿اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ﴾ پختہ بات ہے کہ شیطان

تمھارا دشمن ہے کھلا ﴿اِنَّمَا یَاْمُرُكُمْ﴾ پختہ بات ہے کہ وہ تمھیں حکم دیتا ہے ﴿بِالسُّوْٓءِ وَالْفَحْشَآءِ﴾ بُرائی کا اور بے حیائی کا۔

سُوء اور فحشاء کا معنیٰ

اور سُوء اور فحشاء کی ایک تفسیر یہ کرتے ہیں کہ جو گناہ زبان سے ہوتے ہیں وہ سُوء کہلاتے ہیں۔ جیسا کہ: جھوٹ، غیبت، گالی اور کسی کی دل آزاری کی بات۔ اور فحشاء وہ ہیں جو عمل کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں۔ جیسے: زنا کرنا، شراب پینا وغیرہ۔ تو شیطان تمھیں حکم دیتا ہے کہ تم زبان سے بھی گناہ کرو جھوٹ بولو، غیبت کرو، گالیاں دو اور عمل کے ساتھ بھی کہ زنا اور بدکاری کرو، لواطت کرو، شراب پیو۔

دوسری تفسیر یہ کرتے ہیں کہ سوء ایسے گناہ کو کہتے ہیں جو آدمی چھپ کر کرتا ہے۔ مثلاً: شراب پیتا ہے مگر چھپ کر اور فحشاء اسے کہتے ہیں جو لوگوں کے سامنے کرے۔ تو شیطان دونوں طرح کے گناہوں کا حکم کرتا ہے۔

﴿وَاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ﴾ اور تمھیں اس چیز کا حکم دیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ پر وہ باتیں کہو ﴿مَالَا تَعْلَمُوْنَ﴾ جو تم نہیں جانتے۔ ان کے اندر جو ذاتی خرابیاں ہوتی تھیں کہتے تھے کہ ان کا ہمیں رب تعالیٰ نے حکم دیا ہے حالانکہ رب تو بے حیائی اور بُرائی کا حکم نہیں دیتا۔ یہ تم شیطان کے قدم پر چلتے ہو اور اس کے کہنے پر لگے ہوئے ہو۔

آگے فرمایا ﴿وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ﴾ اور جس وقت ان سے کہا جاتا ہے ﴿اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ﴾ پیروی کرو اس چیز کی جو اللہ تعالیٰ نے نازل کی ہے تو ﴿قَالُوْا﴾ کہتے ہیں ﴿بَلْ﴾ بلکہ ﴿نَتَّبِعُ﴾ ہم پیروی کریں گے ﴿مَآ﴾ اس چیز کی ﴿اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا﴾ جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔ بعض سطحی قسم کے لوگوں نے اس آیت سے اور اس قسم کی دوسری آیتوں سے اس تقلید کا رد سمجھا ہے جس کو اہل اسلام کرتے ہیں حالانکہ یہ بالکل غلط استدلال ہے۔

تقلید کا مفہوم اور ترکِ تقلید کے نتائج

مسئلہ سمجھنا! اہل اسلام میں حنفی، مالکی، شافعی، حنبلی وغیرہ جو اپنے اماموں کی تقلید کرتے ہیں تو ان کی تقلید کا یہ مفہوم ہوتا ہے کہ کوئی مسئلہ قرآن پاک میں نہیں ملتا، حدیث شریف میں بھی نہیں ملتا، خلفائے راشدین سے بھی نہیں ملتا، اور ایسے بے شمار مسائل ہیں۔ تو ایسے مسئلے میں اماموں میں سے کسی کی بات کو اس انداز سے تسلیم کرو کہ یہ مجتہد کی بات ہے وہ معصوم نہیں کیوں مجتہد معصوم نہیں ہوتا اس کے اجتہاد میں غلطی بھی ہو سکتی ہے اور صحیح بھی ہو سکتا ہے اور معصوم صرف پیغمبر ہے اور ان کی بات قطعی ہوتی ہے غلطی کا احتمال نہیں ہوتا۔ اہل اسلام جو تقلید کرتے ہیں اس کا یہی مفہوم ہے۔

اور خود رب تعالیٰ قرآن پاک میں فرماتے ہیں ﴿وَّاتَّبِعْ سَبِيْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَيَّ﴾ [لقمان: ۱۵] "جس نے میرے راستے کی پیروی کی اس کے کہنے پر چلو۔" اس کی تقلید کرو۔ تو یہ تقلید جائز ہے اور اس کے بغیر چارہ نہیں ہے۔ جس مقام پر ایمان کا خطرہ ہو کہ میرا ایمان تقلید کے بغیر نہیں بچے گا تو وہاں پر تقلید واجب ہو گی اور اس سے نکلنے والا گناہ گار ہو گا۔ یہ جتنے فرقے گمراہ ہوئے

ہیں منکرِ حدیث وغیرہ۔تو یہ تقلید کو چھوڑ کر گمراہ ہوئے ہیں۔اوراس موضوع پر میری مفصل کتاب ہے" انکارِ حدیث کے نتائج" اس کا ضرور مطالعہ کرو۔

مرزا غلام احمد نے کہا:" کہ میں نے تقلید چھوڑی تو میرے اُوپر دروازے کھلے ہیں۔" غلام احمد پرویز، اسلم جیراج پوری، اسی طرح عبداللہ چکڑالوی، ان سب کے میں نے تفصیلاً حالات بتائے ہیں۔تو گمراہی کا پہلا دروازہ ترکِ تقلید ہے۔اہل ایمان کی تقلید تو یہ ہے کہ جس مسئلہ کی قرآن میں صراحت نہیں ہے، حدیث میں صراحت نہیں ہے، خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم سے نہیں ملتی، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے نہیں ملتی، تو اماموں میں سے کسی کی بات کو مان لو اور وہ بھی اس خیال سے کہ وہ معصوم نہیں ہیں۔معصوم صرف پیغمبر ہے اور پیغمبر کی بات قطعی ہوتی ہے اور اس میں غلطی کا احتمال نہیں ہوتا اور مجتہد کی بات غلط بھی ہو سکتی ہے اور صحیح بھی ہو سکتی ہے اور مجتہد کو غلطی میں بھی اجر ملتا ہے گناہ کوئی نہیں ہے۔تو اہل ایمان جو تقلید کرتے ہیں وہ اور ہے اور مشرکین اپنے آباؤ اجداد کی جو تقلید کرتے ہیں وہ اور ہے اور دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

جائز اور ناجائز تقلید

﴿وَ اِذَا قِیْلَ لَهُمُ﴾ اور جس وقت ان کو کہا جاتا ہے ﴿اتَّبِعُوْا﴾ پیروی کرو ﴿مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ﴾ اس چیز کی جو اللہ تعالیٰ نے نازل فرمائی ہے تو ﴿قَالُوْا﴾ کہتے ہیں ﴿بَلْ نَتَّبِعُ مَاۤ اَلْفَیْنَا عَلَیْهِ اٰبَآءَنَا﴾ بلکہ ہم پیروی کریں گے باپ دادا کی۔تو ایسی تقلید کے کفر شرک اور مذموم ہونے میں کیا شک ہے وہ دعوت دی جاتی ہے اللہ تعالیٰ کا حکم مانو تو وہ کہتے ہیں ﴿بَلْ﴾ حرفِ اضراب ہے، کہ بلکہ ہم باپ دادا کے راستے پر چلیں گے رب کی نازل کی ہوئی چیز کو ہم نہیں مانتے۔آگے آئے گا کہ جب ان سے کہا جاتا ہے اور اس چیز کی طرف آؤ جو اللہ تعالیٰ نے نازل فرمائی ہے اور آؤ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کی طرف۔تو کہتے ہیں کہ ہم اللہ کا حکم بھی نہیں مانتے ہم نے تو باپ دادا کا حکم ماننا ہے۔تو دونوں قسم کی تقلیدوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔جس تقلید کی اس مقام پر تردید ہوئی ہے اس کا اہل اسلام میں سے کوئی بھی قائل نہیں ہے کہ رب کے مقابلے میں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلے میں کسی کی تقلید ہو۔یہ ہرگز نہیں ہو سکتا، حاشا وکلا۔بلکہ اس میں سب سے زیادہ محتاط احناف ہیں۔حنفیوں کا یہ مسلک ہے کہ ضعیف حدیث جو موضوع اور من گھڑت نہ ہو تو وہ ضعیف حدیث بھی قیاس اور اجتہاد سے زیادہ مقدم ہے۔اس سلسلے میں" الکلام المفید فی اثبات التقلید" میری مفصل کتاب ہے۔جس میں جائز تقلید اور ناجائز تقلید کے متعلق علمی انداز میں مفصل بحث کی گئی ہے۔

پھر بعض جاہل قسم کے غیر مقلد کہتے ہیں کہ تم نے امام کو نبی کی گدی پر بٹھایا ہوا ہے۔حاشا وکلا بھئی! مقلد نبی کی گدی پر تو تب امام کو بٹھائے کہ نبی کی طرح امام کو معصوم سمجھے اور ایسا کوئی نہیں سمجھتا۔اور غیر معصوم کو معصوم کی گدی پر کوئی نہیں بٹھاتا۔البتہ ضد کا دنیا میں کوئی علاج نہیں ہے۔عام آدمی کا تقلید کو چھوڑنا گمراہی کا پھاٹک ہے۔اللہ تعالیٰ گمراہی سے ہر مسلمان کو محفوظ رکھے۔

آگے رب تعالیٰ فرماتے ہیں ﴿اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْئًا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ﴾ کیا اگرچہ ان کے باپ دادا نہیں جانتے کسی چیز کو اور ہدایت پر بھی نہیں تھے پھر بھی مانیں گے۔ یہ الفاظ خود بتا رہے ہیں کہ باپ دادا اگر ہدایت پر ہوں تو پھر تو ان کی مانو اور باپ دادا عقل سے کام لیں تو پھر ان کی مانو اور اگر باپ دادا عقل سے کام نہیں لیتے اور ہدایت یافتہ بھی نہیں تو ان کی تم بات مانتے ہو اور وہ بھی رب کے حکم کے مقابلہ میں ﴿مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ﴾ کے مقابلہ میں۔

آگے رب تعالیٰ فرماتے ہیں ﴿وَمَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا﴾ اور مثال ان لوگوں کی جو کافر ہیں ان کی مثال ایسی ہے ﴿كَمَثَلِ الَّذِيْ يَنْعِقُ﴾ ایک آدمی ہے اس کے پاس جانور کافی ہیں مثلاً: بھینسیں بھی ہیں اور سانڈھ بھی۔ ان کے علاوہ اور بھی جانور ہیں وہ ان کے سامنے بولتا جاتا ہے۔ کافروں کی مثال ایسی ہے جیسے اس شخص کی جو چلاّتا ہے ﴿بِمَا﴾ ان جانوروں کے سامنے ﴿لَا يَسْمَعُ﴾ جو نہیں سنتے ﴿اِلَّا دُعَآءً﴾ مگر پکار ﴿وَّنِدَآءً﴾ اور آواز اب اگر جانوروں کے سامنے تقریر کرو تو بغیر آواز کے ان کو کیا پتا کہ یہ کیا کہہ رہے ہیں۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہی حال ہے کافروں کا کہ کافروں میں کھڑے ہو کر رب کا پیغمبر آواز دے تو ایسے ہی ہے جیسے جانوروں میں کھڑا ہو کر آواز دے رہا ہے اور اپنی ذمہ داری پوری کر رہا ہے۔ مگر ان لوگوں کی حالت ایسی ہے کہ انھوں نے سمجھنا ہی نہیں ہے دلوں پر تالے لگائے ہوئے ہیں۔ خود کہتے ہیں ﴿لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ﴾ [حٰمٓ السجدة:٢٦] قرآن کو نہ سنو ﴿وَهُمْ يَنْهَوْنَ عَنْهُ وَيَنْئَوْنَ عَنْهُ﴾ [الانعام:٢٦] قرآن پاک جہاں سنایا جاتا ہے وہاں سے خود بھاگتے ہیں اور دوسروں کو منع کرتے ہیں۔

اب وہ لوگ جو کانوں میں اُنگلیاں دیتے ہیں ان کو کوئی کیا سمجھائے اور وہ کیا سمجھیں گے۔ تو ان کافروں کی مثال جانوروں کی سی ہے کہ ان کے سامنے اچھی معقول تقریر بھی کرو تو ان کو کوئی فائدہ نہیں ہے ﴿اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ﴾ [الاعراف:١٧٩] یہ جانوروں سے بھی آگے نکلے ہوئے ہیں ﴿صُمٌّ﴾ وہ حق سننے سے بہرے ہیں ﴿بُكْمٌ﴾ حق بولنے سے گونگے ہیں ﴿عُمْيٌ﴾ حق کی چیزیں دیکھنے سے اندھے ہیں ﴿فَهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ﴾ پس وہ عقل سے کام نہیں لیتے۔ اب کافر سارے بہرے تو نہیں ہوتے، نہ اندھے ہوتے ہیں اور نہ سارے گونگے ہوتے ہیں بلکہ وہ بے ایمان جب تقریریں کرتے ہیں تو آٹھ آٹھ گھنٹے بولتے ہیں مگر حق کی بات ایک بھی زبان سے نہیں نکلتی۔ دنیا کے سارے گانے سُن لیتے ہیں حق کی ایک بات بھی نہیں سنتے۔

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ اے ایمان والو! ﴿كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ﴾ کھاؤ پاکیزہ چیزیں جو رب تعالیٰ نے تمھیں رزق دیا ہے۔ پاکیزہ چیزوں کا چھوڑنا یہ شیطان کی پیروی کرنا ہے۔ ایک عورت میرے پاس آئی وہ بڑی وہمی تھی، تعویذ اس نے لیا اور کہنے لگی کہ میں کون سی چیز چھوڑوں، میں نے کہا بی بی! جو چیزیں رب تعالیٰ نے حلال فرمائی ہیں انہیں تو کھا سکتی ہے اور حرام چیزوں کے قریب نہ جا، کہنے لگی کوئی چیز آپ کہیں جو میں نہ کھاؤں، تو میں نے کہا کہ بس میرا مغز نہ کھا اور تیرے واسطے سب حلال چیزوں کا کھانا درست ہے۔

اب عوام کا یہ ذہن بنا ہوا ہے کہ تعویذ اس وقت اثر کرتا ہے جب کوئی نہ کوئی چیز چھوڑ دو یہ غلط کار لوگوں نے عوام کا ایسا ذہن بنایا ہوا ہے حالانکہ حلال چیزوں کا چھڑانا گناہ ہے جب کہ وہ وقتی طور پر کسی طبی حکمت اور مصلحت کی خاطر نہ ہو۔ اور اگر طبی مصلحت کے تحت ہے تو اس کا چھوڑنا، پرہیز کرنا جائز ہے۔ خواہ مخواہ کسی چیز کو چھوڑنا اور چھڑانا درست نہیں ہے۔ اگر طبیعت کے موافق نہیں ہے تو نہ کھاؤ۔

﴿وَاشْكُرُوْا لِلّٰهِ﴾ اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو ﴿اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ﴾ اگر تم خاص رب تعالیٰ کی عبادت کرتے ہو۔ تو رب کا شکریہ ادا کرو۔ کوئی حلال چیز خواہ مخواہ نہ چھوڑو اور حرام کے قریب نہ جاؤ۔

﴿اِنَّمَا﴾ پختہ بات ہے ﴿حَرَّمَ﴾ اللہ تعالیٰ نے حرام کیا ﴿عَلَيْكُمُ﴾ تم پر ﴿الْمَيْتَةَ﴾ مردار ﴿وَالدَّمَ﴾ اور خون ﴿وَلَحْمَ الْخِنْزِيْرِ﴾ اور خنزیر کا گوشت ﴿وَمَآ﴾ اور وہ چیز ﴿اُهِلَّ بِهٖ﴾ جس کو نامزد کیا گیا ﴿لِغَيْرِ اللّٰهِ﴾ غیر اللہ کے نام پر ﴿فَمَنِ اضْطُرَّ﴾ پس وہ شخص جو مجبور کیا گیا ﴿غَيْرَ بَاغٍ﴾ اس حال میں کہ وہ لذت تلاش کرنے والا نہیں ہے ﴿وَّلَا عَادٍ﴾ اور نہ تجاوز کرنے والا ہے ﴿فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ﴾ پس اس پر کوئی گناہ نہیں ہے ﴿اِنَّ اللّٰهَ﴾ بے شک اللہ تعالیٰ ﴿غَفُوْرٌ﴾ بخشنے والا ﴿رَّحِيْمٌ﴾ مہربان ہے ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ﴾ بے شک وہ لوگ ﴿يَكْتُمُوْنَ﴾ جو چھپاتے ہیں ﴿مَآ﴾ اس چیز کو ﴿اَنْزَلَ اللّٰهُ﴾ جو اللہ تعالیٰ نے نازل کی ﴿مِنَ الْكِتٰبِ﴾ کتاب میں ﴿وَيَشْتَرُوْنَ بِهٖ﴾ اور حاصل کرتے ہیں اس کے ذریعے ﴿ثَمَنًا قَلِيْلًا﴾ قیمت تھوڑی ﴿اُولٰٓئِكَ﴾ وہ لوگ ہیں ﴿مَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ﴾ نہیں کھاتے اپنے پیٹوں میں ﴿اِلَّا النَّارَ﴾ مگر آگ ﴿وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ﴾ اور نہیں کلام کرے گا اللہ تعالیٰ ان سے ﴿يَوْمَ الْقِيٰمَةِ﴾ قیامت والے دن ﴿وَلَا يُزَكِّيْهِمْ﴾ اور نہ ان کو گناہوں سے پاک صاف کرے گا ﴿وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ﴾ اور ان کے لیے عذاب ہوگا دردناک ﴿اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ﴾ وہ وہ لوگ ہیں ﴿اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ﴾ جنھوں نے خرید لی گمراہی ﴿بِالْهُدٰى﴾ ہدایت کے بدلے ﴿وَالْعَذَابَ بِالْمَغْفِرَةِ﴾ اور عذاب خرید لیا بخشش کے بدلے میں ﴿فَمَآ اَصْبَرَهُمْ﴾ پس کس چیز نے ان کو صبر والا کر دیا ﴿عَلَى النَّارِ﴾ دوزخ کی آگ پر ﴿ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ﴾ اس واسطے کہ اللہ نے ﴿نَزَّلَ الْكِتٰبَ﴾ اُتاری ہے کتاب ﴿بِالْحَقِّ﴾ حق کے ساتھ ﴿وَاِنَّ الَّذِيْنَ﴾ اور بے شک وہ لوگ ﴿اخْتَلَفُوْا فِي الْكِتٰبِ﴾ جنھوں نے اختلاف کیا ہے کتاب میں ﴿لَفِيْ شِقَاقٍ﴾ البتہ اختلاف میں مبتلا ہیں ﴿بَعِيْدٍ﴾ جو دور کا اختلاف ہے۔

آنحضرت ﷺ کو جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبوت اور رسالت ملی اس وقت عرب میں بہت ساری خرابیاں تھیں۔

یہاں سے تم اندازہ لگاؤ کہ وہ بیت اللہ جو حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام نے خالص اللہ تعالیٰ کے لیے بنایا تھا اس کے اندر اور باہر تین سو ساٹھ بت تھے جن کی عبادت ہوتی تھی۔قمری اعتبار سے سال کے تقریباً تین سو ساٹھ دن ہیں یہ ہر روز ایک نئے اِلٰہ کی عبادت کرتے تھے آج اس کی اور کل اُس کی۔کوئی بات ان لوگوں کی سیدھی نہیں تھی۔اپنی مرضی سے اُنھوں نے بعض چیزوں کو حلال اور بعض کو حرام بنا دیا تھا۔اللہ تعالیٰ نے ان کے باطل عقیدے کی تردید فرمائی ہے۔

مُردار کا حکم

اس مقام پر رب تعالیٰ فرماتے ہیں ﴿اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ﴾ پختہ بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تم پر مُردار کو حرام کیا۔ مَيْتَةَ اس جانور کو کہتے ہیں کہ اگرچہ فی نفسہٖ تو حلال ہے لیکن اس کو ذبح نہیں کیا جاسکا۔اس کو شریعت مَيْتَه کہتی ہے۔چاہے وہ بھینس ہو، گائے ہو، سانڈھ ہو، اُونٹ ہو، بکری ہو، مرغی ہو، کوئی شے ہو۔ مَيْتَه کا جو چمڑا ہے اس کو اُتارا جاسکتا ہے۔بخاری شریف میں روایت ہے کہ ایک بکری تھی موٹی تازی، اچانک مرگئی، مردار ہوگئی، اس کو لوگ کھینچ کر دور پھینکنے کے لیے لے جارہے تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا تو فرمایا: هَلَّا اَخَذْتُمْ اِهَابَهَا اس کا چمڑا تم نے کیوں نہیں اُتارا؟ کہنے لگے حضرت یہ مُردار ہے۔فرمایا وہ تو نظر آرہی ہے کہ مُردار ہے۔تمھیں شریعت نے چمڑا اُتار کر رنگنے کے بعد استعمال کی اجازت دی ہے۔

﴿وَالدَّمَ﴾ اور خون حرام ہے۔اس مقام پر خون کی تصریح نہیں ہے۔آٹھویں پارے میں آئے گا دَمًا مَّسْفُوْحًا وہ خون جو جانور کو ذبح کرتے وقت نکلتا ہے، حرام ہے۔اس کو اندرونی طور پر بھی اور بیرونی طور پر بھی استعمال کرنا درست نہیں ہے۔بعض جاہل قسم کے لوگ خرگوش کے اس خون کو جو ذبح کرتے وقت نکلتا ہے بچوں کی بیماری کے لیے استعمال کرتے ہیں وہ حرام ہے اور جو چیز قطعی حرام ہے اس کو استعمال کرنے کی اجازت نہیں ہے۔نہ بدن پر لگانے کی اجازت ہے اور نہ کھانے کی اجازت ہے۔﴿وَلَحْمَ الْخِنْزِيْرِ﴾ اور خنزیر کا گوشت۔گوشت کی تخصیص اس واسطے کہ اُوپر ذکر ہے ﴿كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ﴾ کھانے پینے کا ذکر ہے۔اور کھایا گوشت جاتا ہے چمڑا اور ہڈی نہیں کھائی جاتی، بال نہیں کھائے جاتے۔ورنہ خنزیر کے بارے میں دوسرے مقام پر ہے ﴿اِنَّهٗ رِجْسٌ﴾ خنزیر نجس العین ہے، پلید ہے۔اس کا چمڑا، اس کے بال، اس کی ہڈیاں، کسی شے کے استعمال کی اجازت نہیں ہے۔

﴿وَمَآ اُهِلَّ بِهٖ﴾ اور وہ چیز رب نے حرام فرمائی ہے کہ جس کو نامزد کیا گیا ہو ﴿لِغَيْرِ اللّٰهِ﴾ غیر اللہ کے تقرب کے لیے، غیر اللہ کی تعظیم کی خاطر جس کو متعین کر دیا گیا ہو۔

عقیقہ مستحب ہے

یہاں پر بات ذرا اچھی طرح سمجھنا۔بعض اہل بدعت شور ڈالتے ہیں اور بات کو صاف نہیں ہونے دیتے۔عقیقہ مستحب ہے اور وہ پیدائش کے بعد ساتویں دن ہے، نہ ہو سکے تو چودھویں دن، پھر بھی نہ ہو سکے تو اکیسویں دن۔یہ حدیث کے الفاظ

ہیں۔اور اگر کسی وجہ سے اکیسویں دن بھی نہ ہو سکے تو جس دن بچہ پیدا ہوا ہو اس دن سے ایک دن پہلے کر لے گویا کہ ساتواں دن ہوگا۔مثلاً: جمعہ کو پیدا ہوا ہو تو جمعرات کو کر لے اور اگر جمعرات کو پیدا ہوا ہو تو بدھ کو کر لے اور اگر بدھ کو پیدا ہوا ہو تو منگل کو کر لے تو ایک ہے عقیقے کا بکرا بکری (یعنی عقیقے کے لیے بکرا بھی ذبح کیا جا سکتا ہے اور بکری بھی) اگر لڑکا ہے تو اس کی طرف سے دو اور اگر لڑکی ہے تو ایک دینا ہے۔

حدیث پاک میں آتا ہے: ذُکْرَانًا کَانَ اَوْ اِنَاثًا کہ نر ہوں یا مادہ اس کا کوئی فرق نہیں ہے البتہ عقیقے کے لیے وہ جانور جائز ہے جس کی قربانی جائز ہے۔تو عقیقے کا مسئلہ خود شریعت نے بتایا ہے صاحب نصاب کے لیے جو صاحب نصاب نہیں ہے اس کے لیے کوئی عقیقہ نہیں ہے۔اور ہے بھی مستحب،فرض نہیں،واجب نہیں،سنت مؤکدہ نہیں ہے۔

ولیمہ سنت ہے

اسی طرح ولیمے پر بکرا،بکری ذبح کرنا یہ بھی خود شریعت نے بتایا ہے۔عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ عشرہ مبشرہ میں سے ایک جلیل القدر صحابی ہیں،اُنھوں نے شادی کی اور اُس وقت لوگ دولہے کے کپڑے پر رنگ لگا دیتے تھے اور اسلام نے اس کو منع کر دیا یہ غیر مسلموں کا فعل ہے۔جس طرح گڈیاں (پتنگیں) اُڑانا ہندوؤں کا فعل ہے مگر آج کل مسلمان اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں اور لاکھوں کروڑوں روپے ضائع کرتے ہیں۔اور اگر یہ پیسے کسی اچھی جگہ لگائیں تو کیسا اچھا ہو۔مگر یہ رسمیں ان کے رگ و ریشہ میں سرایت کر چکی ہیں اور ماں باپ بھی منع نہیں کرتے۔حالانکہ گرتے بھی ہیں،مرتے بھی ہیں،لنگڑے لولے بھی ہوتے ہیں مگر چھوڑتے پھر بھی نہیں صرف بچوں کے پیار کو سامنے رکھتے ہیں۔ایسے موقع پر تھپڑ مارو جو گڈی مانگے یا اس کو اُڑائے۔اس میں نرمی نہ کرو۔

تو خیر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ کے کپڑے پر رنگ دیکھا تو فرمایا کہ تو نے شادی کی ہے؟ نھوں نے کہا حضرت!ہاں۔فرمایا: اَوْلِمْ وَلَوْ بِشَاۃٍ "ولیمہ کر چاہے بکری ذبح کر کے کھلا دے۔" یہ بخاری شریف کی روایت ہے۔اور ولیمے کے بارے میں بعض فرماتے ہیں کہ سنتِ مؤکدہ ہے۔بعض کہتے ہیں کہ مستحب ہے مگر اپنی حیثیت کے مطابق۔

ایک موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کھجوریں اور ستو سامنے رکھ دیئے اور فرمایا کہ میں نے صفیہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ شادی کی ہے اور یہ ولیمہ ہے۔تو ولیمے کے لیے دیگیں چڑھانا کوئی ضروری نہیں ہیں۔چائے پلا دے ولیمہ ہو گیا،مٹھائی کھلا دے ولیمہ ہو گیا،زیادہ کر سکتا ہے تو زیادہ کر لے اور محتاط فتویٰ جو ہے وہ سنت ہے فرض واجب نہیں ہے نہ کرنے والا گناہ گار نہیں ہوتا۔اور قربانی بھی شریعت کا مسئلہ ہے اور اس میں یہ ہے کہ نامزد ہوگا کہ قربانی کا بکرا ہے اور یہ عقیقے کا بکرا ہے،یہ ولیمے کا بکرا ہے۔

غیر اللہ کے نام پر ذبح شدہ حرام ہے

اور اس مقام پر جس چیز کا ذکر ہے وہ یہ ہے کہ کوئی کسی بزرگ کے نام پر بکرا،چھترا کوئی شے بھی ہو متعین کر دیتا ہے کہ یہ

فلاں بزرگ کے واسطے ہے اور اس کی قبر پر چڑھاوا چڑھے گا اور وہاں کے مجاور کھائیں گے اور ایسا کرنے سے میرے کاروبار میں برکت ہوگی نہ کروں گا تو مجھے نقصان پہنچے گا۔ یہ ہے نامزد کرنے کا معنیٰ اور اس معنیٰ میں جو چیز بھی نامزد کی گئی وہ حرام ہے، حرام ہے۔

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ اپنی تفسیر عزیزی اور فتاویٰ عزیزی میں تصریح کرتے ہیں کہ اگر کوئی شخص غیر اللہ کے نام پر بکرا، چھترا، اُونٹ وغیرہ کوئی جانور نامزد کرتا ہے اور ذبح کرتے وقت کہتا ہے: بِسْمِ اللّٰهِ اَللّٰهُ اَكْبَر تو وہ جانور حلال نہیں ہوگا کیوں کہ غیر اللہ کے نام پر اُسے متعین کر دیا گیا ہے۔ تو بِسْمِ اللّٰهِ اَللّٰهُ اَكْبَر سے وہ حلال نہیں ہوگا۔ ایسے ہی حلال نہیں ہوتا جیسے کوئی شخص خنزیر پر پڑھے بِسْمِ اللّٰهِ اَللّٰهُ اَكْبَر تو خنزیر حلال نہیں ہوتا۔ یہ مسئلہ شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ اور بہت سارے فقہاء نے بیان فرمایا ہے۔ تفسیر کبیر امام فخر الدین رازی رحمۃ اللہ علیہ کی اور تفسیر نیشاپوری وغیرہ میں ہے کہ ایسا کرنے سے جانور تو حلال نہیں ہوگا البتہ بِسْمِ اللّٰهِ اَللّٰهُ اَكْبَر پڑھنے والا مرتد ہو جائے گا اور بیوی اس کے ہاتھ سے نکل جائے گی کیوں کہ نکاح ٹوٹ جائے گا۔ تو یہ کوئی چھوٹا مسئلہ نہیں ہے بڑا مسئلہ ہے۔

ہاں ایصالِ ثواب درست ہے۔ اور ایصالِ ثواب کا مسئلہ یہ ہے کہ کوئی آدمی کوئی جانور اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے ذبح کرتا ہے اور اس کا ثواب کسی کو پہنچاتا ہے تو اس میں کوئی کلام نہیں ہے یہ صحیح ہے۔ اور اس میں اپنے کام کا کوئی دخل نہیں ہوتا کہ اگر ایسا کروں گا تو یہ کام ہو جائے گا اور اگر نہ کیا تو یہ نقصان ہو جائے گا۔ اسی طرح دیکھو! جب کوئی باہر سے بادشاہ آتا ہے یا کوئی بڑا آدمی آتا ہے تو اس کو توپوں کی سلامی دیتے ہیں کہ جی! اکتیس توپوں کی سلامی ہے، اکیس کی سلامی ہوئی۔ پہلے زمانے میں اس طرح کرتے تھے کہ اگر کوئی بڑا آتا تو شہر سے باہر جا کر بہت سارے بکرے ذبح کرتے تھے اس کی آمد کی خوشی میں۔ فقہائے کرام رحمہم اللہ نے تصریح فرمائی لِقُدُوْمِ الْاَمِیْرِ کہ کوئی بڑا آدمی آئے اور اس کی تعظیم کے لیے بکرے چھترے ذبح کیے جائیں اور ان پر تکبیر پڑھی جائے بِسْمِ اللّٰهِ اَللّٰهُ اَكْبَرُ تو وہ جانور بھی حرام اور تکبیر پڑھنے والا مرتد ہو گیا اور بیوی پر طلاق واقع ہوگئی خود بہ خود اس واسطے کہ اس میں آنے والے کی تعظیم مقصود ہے۔

مہمانی ٹھیک ہے اس کے لیے جو چاہو ذبح کرو۔ مرغا ذبح کرو، بچھڑا ذبح کرو۔ ابراہیم علیہ السلام نے بچھڑا ذبح کیا تھا۔ وہ تو مہمان کی مہمانی ہے۔ ایک یہ ہے کہ اس کی تعظیم کی خاطر ذبح کیا جائے تو وہ حرام ہے۔ اور بکرا چھترا ہی نہیں شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ”کہ ماکولات ومشروبات وملبوسات ہمیں حکم دارند۔“ تمام کھانے اور پینے کی چیزیں دودھ، مٹھائی وغیرہ اور سب پہننے کی چیزیں یہی حکم رکھتی ہیں۔

لوگ عموماً گیارھویں دیتے ہیں اس کی خاصی تفصیل ہے۔ اور میں نے اپنی کتاب ”تنقید متین“ میں اس پر خاصی بحث کی ہے۔ اگر کوئی شخص اس ارادے سے گیارھویں پکا کر دیتا ہے کہ حضرت شیخ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ بزرگ ہیں اور ان کی بزرگی میں کوئی شک نہیں ہے یہ ان کو ثواب پہنچے اگر اس ارادے سے دیتا ہے تو پھر بدعت ہے اور بدعت اس واسطے ہے کہ اور بھی تو بزرگ

ہیں ان کو کیوں نہیں بھیجتا۔ پھر گیارھویں اپنے باپ کی کیوں نہیں کرتا، ماں کی کیوں نہیں کرتا جن کے روزے رہ گئے ہیں شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کو ہماری نیکیوں کی کیا ضرورت ہے۔ وہ تو اتنے امیر ہیں کہ اگر ان کی نیکیاں تقسیم کی جائیں تو کئی ضلعے بخشے جائیں۔ پھر گیارھویں کی تخصیص کیوں ہے؟ پھر پہلے یا بعد میں کیوں نہیں کرتے؟

تنقید متین اُنھوں نے پڑھی اور تم سے زیادہ میری کتابیں مخالف پڑھتے ہیں۔ تو اُنھوں نے اس طرح کیا کہ اب وہ لوگ گیارھویں کی جگہ بارھویں کر لیتے ہیں اور کہیں تیرھویں کر لیتے ہیں اور کسی جگہ چودھویں کر لیتے ہیں اور کسی جگہ پندرھویں کر لیتے ہیں۔ ہمیں ٹرخانے کے لیے کہ دیکھو! ہم نے تاریخ بدل دی ہے۔ تو پھر میں نے چوتھے ایڈیشن میں لکھا کہ ایسا تم نے ہمارے لیے نہیں کیا بلکہ اپنے پیٹ کے لیے کیا ہے۔ کیوں کہ گیارھویں تاریخ کی ساری جلیبیاں تو پیٹ میں نہیں آتیں اس واسطے کہیں گیارھویں کہیں بارھویں کہیں تیرھویں کہیں چودھویں رکھ کر کھانے کا سلسلہ لمبا کیا ہے ہمیں دھوکا نہیں دے سکتے۔

تو اگر یہ ایصالِ ثواب کے لیے ہے تو بدعت ہے ورنہ سارے بزرگوں کے لیے کرو اور روزانہ کرو۔ اور اگر مطلب یہ ہے کہ میں دوں گا تو میرے کاروبار میں برکت ہوگی اور میری تجارت ضرور چمکے گی، بچے ٹھیک رہیں گے، بیماری نہیں آئے گی، جانور ٹھیک رہیں گے اور اگر نہ دوں گا تو نقصان ہوگا۔ اگر اس ارادے سے کرتا ہے تو گیارھویں دینے والا پکا کافر ہے اور اس کی بیوی کو طلاق ہوگئی ہے۔ مسئلہ صاف ہے۔

تو غیر اللہ کے نام پر کوئی چیز دینی حرام ہے ﴿فَمَنِ اضْطُرَّ﴾ جو شخص مجبور کیا گیا ﴿غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ﴾ وہ لذت بھی نہیں تلاش کرتا اور تجاوز بھی نہیں کرتا ﴿فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ﴾ تو اس پر کوئی گناہ نہیں ہے۔ مثال کے طور پر کوئی ایسی جگہ ہے کہ بھوک کی وجہ سے جان نکلنے کا خطرہ ہے اور مردار اور خنزیر کے سوا کوئی چیز نہیں ہے تو اتنا کھالے کہ جس سے اس کی جان بچ جائے۔ مثلاً: ایک چھٹانگ سے اس کی جان بچ سکتی ہے تو چھ تولے نہیں کھا سکتا اور ذائقہ تلاش کرنے کے لیے نہیں کھا سکتا۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ ﴿غَيْرَ بَاغٍ﴾ کا ترجمہ اس طرح کرتے ہیں کہ وہ لذت تلاش کرنے کے لیے نہیں کھاتا ﴿وَّلَا عَادٍ﴾ اور ضرورت سے زیادہ نہیں کھاتا۔

امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اسلامی حکومت ہو صحیح معنیٰ میں، تو اس کا جو باغی ہے اگر وہ بھوکا ہے تو وہ نہیں کھا سکتا۔ ﴿عَادٍ﴾ کا معنیٰ جو گناہ کے سفر پر جارہا ہے۔ مثلاً: چوری، ڈاکے کے لیے جارہا ہے تو یہ سفر معصیت کے ہیں بھوکا ہونے کے باوجود نہیں کھا سکتا۔ پھر اگر مجبور ہے اور نہ کھائے اور مر جائے تو گناہ گار ہوگا۔ کیوں کہ رب تعالیٰ نے اجازت دی ہے اور اس نے رب کی اجازت کو قبول نہیں کیا۔

اسی طرح اگر کوئی ایسا مقام ہے کہ پیاس کی وجہ سے جان خطرے میں ہے اور شراب کے بغیر کوئی شے نہیں ہے تو ایسی حالت میں اس کے لیے پینا جائز ہے اگر نہ پیے گا تو گناہ گار مرے گا کیوں کہ مُضطر ہے اور اس پر کوئی گناہ نہیں ہے ﴿اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾ بے شک اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے۔

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ یَكْتُمُوْنَ﴾ بے شک وہ لوگ جو چھپاتے ہیں ﴿مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ الْكِتٰبِ﴾ وہ حکم جو اللہ تعالیٰ نے نازل کیے ہیں کتاب میں ﴿وَ یَشْتَرُوْنَ بِهٖ ثَمَنًا قَلِیْلًا﴾ اور حاصل کرتے ہیں ان کے بدلے قیمت تھوڑی ﴿اُولٰٓىٕكَ مَا یَاْكُلُوْنَ فِیْ بُطُوْنِهِمْ اِلَّا النَّارَ﴾ یہ لوگ نہیں کھاتے اپنے پیٹوں میں مگر دوزخ کی آگ۔ یہ غیر اللہ کے نام کے چڑھاوے کھانا اور مسائل کو چھپانا یہ بڑے گناہ کی بات ہے ﴿وَ لَا یُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ﴾ اور ان کے ساتھ اللہ تعالیٰ پیار اور محبت کی گفتگو نہیں کرے گا قیامت والے دن ﴿وَ لَا یُزَكِّیْهِمْ﴾ اور ان کو گناہوں سے پاک نہیں کرے گا ﴿وَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ﴾ اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے اور یہ اس واسطے کہ ﴿اُولٰٓىٕكَ الَّذِیْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى﴾ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے گمراہی خریدی ہدایت کے بدلے ﴿وَ الْعَذَابَ بِالْمَغْفِرَةِ﴾ اور عذاب خریدا بخشش کی جگہ۔

چاہیے تو یہ تھا کہ رب سے بخشش لیتے وہ کام کرتے جن پر رب راضی ہو کر بخش دے مگر اُنھوں نے وہ کام کیے جو دوزخ میں لے جائیں ﴿فَمَاۤ اَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ﴾ پس کس چیز نے ان کو صبر والا کر دیا دوزخ پر یعنی دوزخ والے سودے پر یہ کس طرح راضی ہو گئے۔ یہ دوزخ میں اس وجہ سے جائیں گے کہ ﴿ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ نَزَّلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ﴾ اس واسطے کہ بے شک اللہ تعالیٰ نے کتاب نازل کی حق کے ساتھ ﴿وَ اِنَّ الَّذِیْنَ اخْتَلَفُوْا فِی الْكِتٰبِ﴾ اور بے شک وہ لوگ جنھوں نے کتاب میں اختلاف کیا ﴿لَفِیْ شِقَاقٍۭ بَعِیْدٍ﴾ دور کے اختلاف میں مبتلا ہیں۔ اپنے پیٹ کے لیے اُنھوں نے دور کا اختلاف قرآن سے، حدیث سے اور فقہ اسلام سے پیدا کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ بچائے اور محفوظ رکھے۔

﴿لَیْسَ الْبِرَّ﴾ نہیں ہے نیکی یہی چیز ﴿اَنْ تُوَلُّوْا﴾ یہ کہ تم پھیرو ﴿وُجُوْهَكُمْ﴾ اپنے چہروں کو ﴿قِبَلَ الْمَشْرِقِ﴾ مشرق کی طرف ﴿وَ الْمَغْرِبِ﴾ اور مغرب کی طرف ﴿وَ لٰكِنَّ الْبِرَّ﴾ اور لیکن نیکی ﴿مَنْ﴾ اس شخص کی ہے ﴿اٰمَنَ بِاللّٰهِ﴾ جو ایمان لایا اللہ تعالیٰ پر ﴿وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ﴾ اور آخرت کے دن پر ﴿وَ الْمَلٰٓىٕكَةِ﴾ اور فرشتوں پر ﴿وَ الْكِتٰبِ﴾ اور کتابوں پر ﴿وَ النَّبِیّٖنَ﴾ اور پیغمبروں پر ﴿وَ اٰتَى الْمَالَ﴾ اور دیا اس نے مال ﴿عَلٰى حُبِّهٖ﴾ اس کی محبت کی وجہ سے ﴿ذَوِی الْقُرْبٰى﴾ قریبی رشتہ داروں کو ﴿وَ الْیَتٰمٰى﴾ اور یتیموں کو ﴿وَ الْمَسٰكِیْنَ﴾ اور مسکینوں کو ﴿وَ ابْنَ السَّبِیْلِ﴾ اور مسافروں کو ﴿وَ السَّآىٕلِیْنَ﴾ اور مانگنے والوں کو ﴿وَ فِی الرِّقَابِ﴾ اور گردنوں کے چھڑانے کے لیے ﴿وَ اَقَامَ الصَّلٰوةَ﴾ اور قائم کی اس نے نماز ﴿وَ اٰتَى الزَّكٰوةَ﴾ اور دی اس نے زکوٰۃ ﴿وَ الْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ﴾ اور پورا کرنے والے اپنے وعدوں کو ﴿اِذَا عٰهَدُوْا﴾ جس وقت وعدہ کر لیتے ہیں ﴿وَ الصّٰبِرِیْنَ﴾ اور صبر کرنے والے ﴿فِی الْبَاْسَآءِ﴾ مالی تنگی میں ﴿وَ الضَّرَّآءِ﴾ اور بدنی تنگی میں ﴿وَ حِیْنَ الْبَاْسِ﴾ اور میدان جنگ

میں ﴿اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ﴾ یہ وہ لوگ ہیں ﴿صَدَقُوْا﴾ جو سچے ہیں ﴿وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ﴾ اور یہی لوگ ہیں جو پرہیزگار ہیں۔

پہلے تحویل قبلہ کا مسئلہ تھا کہ آنحضرت ﷺ کی خواہش کے مطابق جب اللہ تعالیٰ نے بیت اللہ کو قبلہ بنا دیا تو منافقوں، مشرکوں نے اور یہودیوں نے اس کو بڑا اُچھالا اور خصوصاً یہود ونصاریٰ نے کہا اس کی کس بات کا ہم اعتبار کریں؟ کبھی اِس طرف چہرہ کر کے نماز پڑھتا ہے اور کبھی اُس طرف چہرہ کر کے نماز پڑھتا ہے۔ اور چوں کہ یہ پہلا مسئلہ تھا جو منسوخ ہوا اور جب کوئی نئی چیز آئے تو نرالی اور تعجب خیز ہوتی ہے۔ یہودیوں اور عیسائیوں نے اپنی دکانوں، گلیوں، بازاروں اور گھروں میں ہر جگہ اس مسئلے کو موضوع بحث بنایا تھا۔ جب بھی کوئی شخص آتا اسے کہتے کہ تجھے معلوم ہے کہ محمد ﷺ نے اس قبلے سے اس طرف چہرہ پھیر لیا ہے۔ اس مسئلہ پر ان کا سارا وقت صرف ہوتا تھا۔

نیکی کے اصل کام

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ﴿لَیْسَ الْبِرَّ﴾ نیکی اسی میں بند نہیں ہے ﴿اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ﴾ یہ کہ تم اپنے چہرے پھیرو ﴿قِبَلَ الْمَشْرِقِ﴾ مشرق کی طرف ﴿وَالْمَغْرِبِ﴾ اور مغرب کی طرف۔ بے شک قبلہ کی طرف رخ کرنا ایک نیکی کا فعل ہے مگر نیکی اس میں بند نہیں ہے۔ تم نے ہر وقت، ہر جگہ پر یہی مسئلہ چھیڑا ہوا ہے۔ نیکی کے اور بھی کام ہیں ذرا اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھو کہ وہ کام بھی تم کرتے ہو یا نہیں۔ فرمایا ﴿وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ﴾ اور لیکن نیکی اس شخص کی ہے جو اللہ تعالیٰ پر صحیح معنیٰ میں ایمان لایا ﴿وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ﴾ اور آخرت کے دن پر بھی ایمان لایا۔ یہودی اور عیسائی ویسے تو کہتے تھے کہ قیامت حق ہے مگر جب اس کی تفسیر کرتے تھے تو وہ بالکل انکار ہی ہوتا تھا۔

میں سمجھانے کے لیے عرض کرتا ہوں کہ جس طرح کوئی شخص کہے کہ میں نے صدرِ مملکت کو دیکھا ہے اور جب اس سے کہا جائے کہ صدر صاحب کا حلیہ کیا ہے، قد کیا ہے، شکل وصورت کیا ہے؟ تو کہتا ہے کہ اس کی چار ٹانگیں ہیں اور لمبی دُم ہے اور لمبی سی اس کی سونڈ ہے اور چوڑی چکلی اس کی پیٹھ ہے۔ یہ تو ہاتھی ہوا صدر تو نہ ہوا۔ اسی طرح سمجھو کہ کہتے تھے آخرت ہے مگر جب اس کی تفسیر بیان کرتے تھے تو وہ آخرت پر صادق نہ آتی تھی۔ یہودی کہتے تھے کہ جنت صرف ہماری جاگیر ہے۔ صرف ہم جنت میں جائیں گے اور کوئی نہیں جائے گا۔ اور عیسائی کہتے تھے کہ صرف ہم جائیں گے مگر روحانی ہوگی جس طرح ہم خواب دیکھتے ہیں۔ تو یہ جو آگے تفسیریں کرتے تھے یہ انکار کے مترادف تھیں۔

فرشتوں کی صفات

تو فرمایا اور لیکن نیکی اس شخص کی ہے ﴿مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ﴾ جو اللہ تعالیٰ پر ایمان لایا ﴿وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ﴾ اور آخرت کے دن پر ایمان لایا ﴿وَالْمَلٰٓئِكَةِ﴾ اور اللہ تعالیٰ کے فرشتوں پر ایمان لایا کہ فرشتے اللہ تعالیٰ کی ایک نوری مخلوق ہے اور بے شمار ہیں۔

ان کی تعداد کو صرف رب ہی جانتا ہے۔ قرآن پاک میں صرف چھ فرشتوں کے نام آئے ہیں جبرئیل علیہ السلام، میکائیل علیہ السلام، ہاروت علیہ السلام، ماروت علیہ السلام، رعد علیہ السلام اور مالک علیہ السلام۔ اور ہیں اس قدر کہ خدا کی پناہ! ہر ہر آدمی کے ساتھ چوبیس گھنٹوں میں چوبیس، پچیس پچیس فرشتے رہتے ہیں۔ ہمیں کچھ احساس نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ کی نورانی مخلوق ہے، نہ کھاتے ہیں، نہ پیتے ہیں، نہ تھکتے ہیں، نہ اُکتاتے ہیں۔ جو رب نے حکم دیا ہے اس کی تعمیل کرتے ہیں۔ ﴿وَالْكِتٰبِ﴾ کتاب میں الف لام جنس کا ہے اور جنس کتاب یعنی ساری کتابوں کو مانتے ہیں جو بھی اللہ تعالیٰ نے نازل فرمائیں۔

مشہور کتابیں چار ہیں۔ قرآن کریم جو ہمارے سامنے ہے۔ اس کے بعد تورات ہے، اس کے بعد زبور ہے پھر انجیل ہے۔ ان کے علاوہ کئی صحیفے اور کئی کتابیں ہیں جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئیں۔ اور اللہ تعالیٰ کا احسان ہے کہ جس طرح ہمیں اس نے اس چیز کا مکلف نہیں بنایا کہ ہم فرشتوں کی تعداد معلوم کریں یا ان کے نام ہمیں معلوم ہوں۔ ہماری لیے اتنی ہی بات کافی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے جتنے فرشتے ہیں ہمارا سب پر ایمان ہے۔ اسی طرح رب تعالیٰ کا احسان ہے کہ رب تعالیٰ نے ہمیں اس بات کا پابند نہیں فرمایا کہ ساری آسمانی کتابوں کی تفصیل ہمیں معلوم ہو کہ اتنی ہیں اور یہ یہ ان کے نام ہیں۔ اجمالی طور پر ہمارے ایمان کے لیے یہ کافی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جتنی کتابیں بھیجیں ہمارا سب پر ایمان ہے۔

اسی طرح ﴿وَالنَّبِيّٖنَ﴾ اللہ تعالیٰ کے پیغمبروں پر ایمان ہے۔ پیغمبر بے شمار گزرے ہیں صحیح تعداد ہمیں معلوم نہیں۔ اگر ان کی تعداد کا ذکر قرآن پاک میں ہوتا تو قطعی بات ہوتی خبر متواتر ہوتی تو پھر بھی قطعی بات ہوتی اور اگر کوئی حدیث صحیح ہوتی تو ظن غالب ہوتا۔ کوئی صحیح روایت ایسی نہیں ہے جس میں پیغمبروں کی تعداد کا ذکر ہو۔ ایک روایت میں ایک لاکھ چوبیس ہزار اور ایک روایت میں دو لاکھ چوبیس ہزار کا ذکر آتا ہے۔ لیکن دونوں روایتیں کمزور اور ضعیف ہیں اس قابل نہیں کہ ان پر اعتماد کیا جائے۔ اس واسطے اول تو پیغمبروں کی تعداد متعین نہیں کرنی چاہیے۔ ہوسکتا ہے زیادہ ہوں اور ہوسکتا ہے کم ہوں۔ اور اگر کبھی ایک لاکھ چوبیس ہزار کہے تو ساتھ یہ ضرور کہے کہ یا کم وبیش جتنے بھی رب نے بھیجے ہیں ہمارا سب پر ایمان ہے۔ پچیس پیغمبروں کے نام قرآن پاک میں آئے ہیں ان کے علاوہ قرآن پاک میں پیغمبروں کے نام نہیں ہیں۔ تو ہمارے ایمان کے واسطے بس اتنی بات کافی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سب پیغمبروں پر ہمارا ایمان ہے۔

﴿وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ﴾ اور وہ شخص جس نے مال دیا اس کی محبت میں۔ ہ کی ضمیر کس طرف جاتی ہے؟ یہ بھی کہتے ہیں کہ مال کی طرف جاتی ہے کہ باوجود اس کے کہ مال کی محبت ہے پھر بھی خرچ کرتا ہے۔ اور ہ ضمیر کا مرجع لفظ اللہ کو بھی بناتے ہیں اور معنیٰ کرتے ہیں وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّ اللّٰهِ کہ اللہ تعالیٰ کی محبت کے واسطے مال خرچ کرتا ہے۔ نام کے لیے، شہرت کے لیے، دونوں کے لیے تو ساری دنیا خرچ کرتی ہے اور بے حساب رقم خرچ کرتے ہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ کے ہاں معتبر وہ ہے ﴿وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ﴾ جو مال دیتا ہے رب کی محبت پر۔ اب سوال یہ ہے کہ دے کن لوگوں کو؟ تو فرمایا ﴿ذَوِي الْقُرْبٰى﴾ اپنے قریبی رشتہ داروں کو۔ مطلب یہ ہے اگر قریبی رشتہ دار زکوٰۃ کا مصرف ہیں، عشر کا مصرف ہیں، فطرانے کا مصرف ہیں تو ان پر خرچ کرے اور یہ

ظاہر کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہے کہ لو بھائی جی! یہ زکوٰۃ لو، بہن جی! یہ عشر لو۔

زکوٰۃ میں نیت شرط ہے

اللہ تعالیٰ نیتوں کو جانتا ہے بس یہ نیت کرلو یہ رقم زکوٰۃ کی ہے اور یہ مصرف ہے میں اس کو دیتا ہوں اگر تم اس کو انعام کے طریقے پر دو یا امداد کے طور پر تو بھی زکوٰۃ ادا ہو جائے گی مگر نیت شرط ہے کیوں کہ جس طرح نماز بغیر نیت کے ادا نہیں ہوتی، زکوٰۃ بھی بغیر نیت کے ادا نہیں ہوتی۔ دیکھو! جن لوگوں کی رقمیں بینکوں میں ہیں اور بینک کاٹ لیتے ہیں۔ اگر یہ نیت کرلیں کہ ہماری طرف سے اجازت ہے کہ یہ ہماری رقم سے زکوٰۃ کاٹ لیں تو زکوٰۃ ادا ہو جائے گی اور اگر نیت نہیں کی پھر زکوٰۃ ان کے ذمہ ہے ادا نہیں ہوگی۔ رہا مسئلہ یہ کہ وہ خرچ کس جگہ کرتے ہیں؟ تو یہ ان کی گور گردن پر ہے۔ اس چیز کا بندہ مکلّف نہیں ہے۔ کیوں کہ حکومت نے جو زکوٰۃ کمیٹیاں بنائی ہیں ان کی رقمیں کون سی صحیح جگہ پر خرچ ہوتی ہیں۔ اسی طرح ہسپتالوں میں بھی زکوٰۃ ہر آدمی پر خرچ نہیں ہو سکتی کیوں کہ اس کے خاص مصرف ہیں۔ بے احتیاطی سے اپنی گردن کو وزنی نہ بناؤ۔ ہسپتالوں کے مریضوں میں امیر بھی ہوتے ہیں، سید بھی ہوتے ہیں، غیر مسلم بھی ہوتے ہیں۔ بلکہ جو مستحق نہیں ہیں وہ آگے آگے ہوتے ہیں کہ میں مستحق ہوں۔ اس واسطے زکوٰۃ دیتے وقت بڑی احتیاط کرو کہ زکوٰۃ تمھاری ادا ہو اور تمھاری گردن پر رب کا قرض نہ رہے۔ قریبی رشتہ داروں کی اس کے علاوہ بھی مدد کرو۔ ضروری نہیں کہ ان کو زکوٰۃ پر ہی فارغ کرو۔

زکوٰۃ کے مصارف

﴿وَالْيَتٰمٰى﴾ اور وہ جو یتیم ہیں۔ اور یہ یتیم چاہے اپنی برادری کے ہوں یا محلے کے ہوں یا اپنے قصبے کے ہوں یا کسی اور جگہ کے ہوں۔ تو یہ یتیم بھی تمھاری مالی ہمدردی کے مستحق ہیں ﴿وَالْمَسٰكِيْنَ﴾ اور مسکین کو۔ مسکین اس کو کہتے ہیں کہ اس کے پاس کھانے پینے کے لیے ہے تو سہی مگر نصاب پورا نہیں ہوتا۔ نصاب ہے ساڑھے باون تولے چاندی یا اس کی مالیت وہ اس وقت تقریباً ساڑھے چار ہزار بنتی ہے۔ اس پر قرض بھی نہیں اور اتنا سامان اس کے گھر موجود ہے کہ اس کی قیمت اتنی ہو جاتی ہے یعنی چار ہزار، وہ چاہے نقد رقم نہیں، سامان ہی ہے، ضرورت سے زائد۔ تو جس آدمی کے پاس یہ ہے اس کو شریعت صاحبِ نصاب کہتی ہے۔ ایسے آدمی کو زکوٰۃ، فطرانہ، عشر، نذر، منت، قسم کا کفارہ یعنی واجب قسم کا کوئی بھی صدقہ دینا جائز نہیں ہے۔

کئی لوگ ایسے ہیں کہ وہ یہ نہیں دیکھتے کہ اس عورت کے پاس مال کتنا ہے؟ بس یہ کہتے ہیں کہ وہ بیوہ ہے۔ تو بھئی! صرف بیوہ ہونا تو مصرف نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے کہ وہ صاحبِ نصاب ہو۔ ساڑھے چار ہزار کیا چیز ہے؟ ایک پلنگ نہیں آتا۔ تو جس کے پاس ضرورت سے زیادہ ایک پلنگ ہے وہ صاحبِ نصاب ہے اور اس پر زکوٰۃ فطرانہ وغیرہ کوئی شے نہیں لگ سکتی۔ اسی طرح بعض لوگ کہتے ہیں یہ بچے یتیم ہوگئے ہیں۔ تو اگر ان بچوں کو باپ کی وراثت سے اتنا مل جاتا ہے کہ جس سے وہ صاحبِ نصاب بن جاتے ہیں تو ان کو بھی زکوٰۃ وغیرہ نہیں لگتی۔ یہ ان یتیموں کی بات ہو رہی ہے جو صاحبِ نصاب نہ ہوں۔ اور مسکین بھی اسے

ہے ہیں جو صاحب نصاب نہ ہو۔ حدیث میں آتا ہے:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم مسکین کس کو کہتے ہو؟ صحابہ کرام نے کہا وہ جو مانگتے پھرتے ہیں۔ فرمایا وہ مسکین نہیں ہیں۔ بلکہ مسکین وہ ہے کہ ہے تو مصرف مگر مانگتا نہیں ہے۔ لوگوں کے سامنے اپنی غربت کا واویلا نہیں کرتا اور عام لوگوں کو پتا بھی نہیں ہے کہ یہ امیر ہے یا غریب ہے۔ اس واسطے اپنی برادری میں جو نیک، دین دار، صحیح العقیدہ نمازی ہوں اور مصرف ہوں تو ان کو دو۔ بے نماز کو زکوٰۃ نہ دینا۔

حدیث میں آتا ہے: ((لَا يَأْكُلْ طَعَامَكَ اِلَّا تَقِيٌّ)) یاد رکھو! تمھارا کھانا وہ کھائے جو پرہیز گار ہے۔ غیر متقی کھائے گا تو رب کی نافرمانی کرے گا۔ اگر تم کسی نشئی کو زکوٰۃ دے دو محض اس واسطے کہ یہ میرا رشتہ دار ہے تو فرض ادا نہیں ہوگا وہ اور نشہ کرے گا سینما دیکھے گا، شراب پیے گا تو تمھاری حلال کی کمائی ان حرام کاموں پر خرچ ہوگی۔ لہٰذا سوچ سمجھ کر دو۔ ہر مانگنے والے کو زکوٰۃ نہ دو ﴿وَابْنَ السَّبِيْلِ﴾ اور مسافر۔ آج تو مسلمان قوم کے لیے یہ بھی بڑی مصیبت ہے کہ اچھے بھلے مانگتے پھرتے ہیں کہ جہاں چار آدمی دیکھے سوال کر دیا۔ حالانکہ اگر تم ان کی تلاشی لو تو جس سے مانگ رہا ہے اس سے زیادہ رقم اس کے پاس ہوگی بس عادت بن گئی ہے۔ ہاں! اگر اپنا دل مطمئن ہے کہ واقعی راستہ میں اس کی چوری ہوگئی یا اس کا خرچہ ختم ہوگیا یا یہ ساتھیوں سے بچھڑ گیا ہے تو اس کو تم دے سکتے ہو۔

مسئلہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے گھر میں امیر ہے لیکن سفر میں ایسی جگہ پر ہے کہ جہاں سے آسانی کے ساتھ اہل خانہ کو اطلاع نہیں پہنچ سکتی اور وہاں اس کے پاس خرچہ کم ہوگیا ہے تو اس کو بھی زکوٰۃ دینا جائز ہے۔ ہاں آج کل تو بڑی سہولت ہے ٹیلی فون جگہ جگہ لگے ہیں، تار گھر موجود ہیں۔ اگر اس پر کوئی اعتبار نہیں کرتا تو وہ یہ کہے کہ بھائی! اتنا دے دو کہ میں گھر والوں کو فون کرلوں، مجھے رقم مل جائے گی تو میں تمھیں دے دوں گا۔ اور بعض لوگوں نے تو مانگنے کو پیشہ بنا لیا ہے۔ پچھلے دنوں میں نے اخبار میں پڑھا اور تم نے بھی پڑھا ہوگا کہ ایک بھکاری نے ایک لاکھ پچاس ہزار روپے ملک بچاؤ سکیم میں دیا ہے۔ اور آگے وعدہ بھی کیا ہے کہ میں جو بھی کمائی کروں گا اس میں سے بھی حصہ دوں گا۔ تو ایسے کے پاس اور بھی تو ہوں گے تو ایسے لوگوں پر زکوٰتیں کس طرح لگے گی؟

﴿وَالسَّآىِٕلِيْنَ﴾ اور جو مانگتے ہیں اور تمھارا دل مطمئن ہے اور حالات وقرائن ایسے موجود ہیں کہ واقعی یہ پیشہ ور نہیں ہے تو اس کی مدد کر سکتے ہیں ﴿وَفِي الرِّقَابِ﴾ رِقَاب رَقَبَةٌ کی جمع ہے۔ اس کا معنیٰ ہے گردن۔ لیکن اس سے مراد غلام اور لونڈیاں ہیں۔ تو ایسی غلام اور لونڈیاں ہوتی تھیں لوگ ان کو رقم دیتے تھے کہ اپنے آقا کو دے کر آزادی حاصل کر لے۔ اس وقت شرعی طور پر غلام ہمارے علم میں نہیں باقی یہ جو غنڈہ قسم کے لوگ ہیں کہ یہاں سے عورت اغوا کی اور سندھ میں فروخت کر دی اور سندھ سے اغوا کی اور سرحد میں فروخت کر دی۔

اس وقت بنگال بڑا غریب ملک ہے وہاں تم کسی عورت کو کہو کہ تجھے روٹی پیٹ بھر کر ملے گی تو وہ بے چاری ساتھ چل

پڑتی ہے۔تو ایسی کئی عورتیں پاکستان میں لوگوں کے پاس ہیں اور لوگوں نے ان کی منڈی لگائی ہوئی ہے۔ بیچتے بھی ہیں اور بدمعاشی بھی کراتے ہیں۔اور یہ سب کچھ حکومت کے سامنے ہے مگر وہ ٹس سے مس نہیں ہوتی۔اسی طرح بچے اغوا ہوتے ہیں۔اور یاد رکھنا! بچہ مر جائے تو ماں باپ کے لیے صبر کرنا آسان ہوتا ہے اور اگر کوئی اُٹھا کر لے جائے تو ساری عمر کا روگ لگ جاتا ہے۔ اور یہ سب کچھ غریبوں کے ساتھ ہوتا ہے۔کیوں کہ بڑوں کے بچے تو کاروں میں آتے جاتے ہیں۔تو اس کے لیے بھی کوئی سخت قانون ہونا چاہیے اور پھر اس پر عمل بھی ہو۔اور ماحول اتنا بگڑ چکا ہے کہ اس کی اصلاح بہت مشکل ہے لیکن ہمت نہ ہارو۔

﴿وَ اَقَامَ الصَّلٰوۃَ﴾ اور نماز اُنھوں نے قائم کی ﴿وَاٰتَی الزَّکٰوۃَ﴾ اور اُنھوں نے زکوٰۃ ادا کی۔اب دیکھو! یہاں زکوٰۃ دینے کا ذکر الگ کیا ہے اور پہلے مال دینے کا ذکر الگ کیا ہے۔تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ زکوٰۃ کے علاوہ بھی مال میں غریبوں کا حق ہے۔اور حدیث پاک میں آتا ہے کہ مال میں زکوٰۃ کے علاوہ بھی لوگوں کے حقوق ہیں۔غریبوں، مسکینوں اور پڑوسیوں کا حق ہے، رشتہ داروں کا حق ہے۔سب کے حقوق ادا کرو۔﴿وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ﴾ اور وہ لوگ جو پورے کرتے ہیں اپنے وعدے ﴿اِذَا عٰهَدُوْا﴾ جب وہ وعدے کرتے ہیں۔اور جو جان بوجھ کر وعدہ کی خلاف ورزی کرتا ہے وہ منافق کہلاتا ہے ﴿وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ﴾ اور صبر کرنے والے ہیں مصیبتوں اور پریشانیوں میں۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ جو کہ ساری اُمت میں پہلے نمبر کے مفسرِ قرآن ہیں اور تمام اُمت میں اول نمبر کے فقیہ ہیں۔وہ ﴿الْبَاْسَآءِ﴾ کا ترجمہ کرتے ہیں ﴿اَلْفَقْرُ اور الضَّرَّآءِ﴾ کا معنیٰ کرتے ہیں اَلسُّقْمُ۔تو مفہوم بنے گا ﴿فِي الْبَاْسَآءِ﴾ جب مالی طور پر محتاج ہوں پھر بھی صبر کرتے ہیں ﴿وَالضَّرَّآءِ﴾ اور بدنی طور پر کسی بیماری میں مبتلا ہیں تو پھر بھی صبر کرتے ہیں ﴿وَحِيْنَ الْبَاْسِ﴾ اور میدان جنگ میں جب کافروں کے ساتھ لڑتے ہیں اس وقت بھی صبر کرتے ہیں صبر کا بڑا مقام ہے۔اور یہ جو مومنوں کو تکلیفیں آتی ہیں بشرطیکہ ہوں مومن، تو یہ ان کے گناہوں کا کفارہ ہیں۔ بلکہ بخاری شریف کی روایت ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((اِذَا اَرَادَ اللّٰهُ بِعَبْدٍ خَيْرًا يُّصِبْ مِنْهُ)) "جب اللہ تعالیٰ کسی بندے کے بارے میں خیر کا ارادہ فرماتے ہیں تو اس کو کسی نہ کسی مصیبت میں مبتلا کر دیتے ہیں۔" ان صبر کرنے والوں کے بارے میں فرمایا ﴿اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا﴾ یہ لوگ ہیں سچے۔تو تم صرف قبلے کے مسئلہ کو لے کر پروپیگنڈہ کرتے ہو یہ بھی دیکھو کہ یہ کام بھی کرتے ہو یا نہیں ﴿وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ﴾ اور اللہ تعالیٰ کے ہاں یہی لوگ متقی ہیں۔اللہ تعالیٰ ہم سب کو متقی بننے کی توفیق عطا فرمائے۔

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ اے وہ لوگو! جو ایمان لائے ہو ﴿كُتِبَ﴾ فرض کیا گیا، تحریر کیا گیا ﴿عَلَيْكُمُ﴾ تم پر ﴿الْقِصَاصُ﴾ قصاص ﴿فِي الْقَتْلٰى﴾ مقتولوں کے بارے میں ﴿اَلْحُرُّ﴾ آزاد ﴿بِالْحُرِّ﴾ آزاد کے بدلے ﴿وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ﴾ اور غلام کے بدلے غلام ﴿وَالْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى﴾ اور عورت، عورت کے بدلے ﴿فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ﴾

پس جس کو معاف کر دیا گیا ﴿مِنْ اَخِيْهِ﴾ اس کے بھائی کی طرف سے ﴿شَيْءٌ﴾ کچھ حصہ ﴿فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوْفِ﴾ پس پیچھا کرے اچھے طریق سے ﴿وَاَدَآءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ﴾ اور اس کو ادا کرے عمدگی کے ساتھ ﴿ذٰلِكَ تَخْفِيْفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ﴾ یہ تخفیف ہے تمھارے رب کی طرف سے ﴿وَرَحْمَةٌ﴾ اور مہربانی ہے ﴿فَمَنِ اعْتَدٰى﴾ پس جس نے تجاوز کیا ﴿بَعْدَ ذٰلِكَ﴾ اس کے بعد ﴿فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ﴾ پس اس کے واسطے عذاب ہے دردناک ﴿وَلَكُمْ﴾ اور تمھارے واسطے ﴿فِي الْقِصَاصِ﴾ قصاص میں ﴿حَيٰوةٌ يّٰۤاُولِي الْاَلْبَابِ﴾ زندگی ہے اے عقل مندو! ﴿لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ﴾ تاکہ تم بچ جاؤ ﴿كُتِبَ عَلَيْكُمْ﴾ لکھی گئی تم پر ﴿اِذَا حَضَرَ﴾ جس وقت حاضر ہو ﴿اَحَدَكُمُ﴾ تم میں سے کسی پر ﴿الْمَوْتُ﴾ موت ﴿اِنْ تَرَكَ خَيْرًا﴾ اگر چھوڑا اس نے مال ﴿الْوَصِيَّةُ﴾ وصیت لکھی گئی ﴿لِلْوَالِدَيْنِ﴾ ماں باپ کے واسطے وصیت کرے ﴿وَالْاَقْرَبِيْنَ﴾ اور قریبی رشتہ داروں کے لیے ﴿بِالْمَعْرُوْفِ﴾ اچھے طریقے کے ساتھ ﴿حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ﴾ یہ حق ہے متقیوں کے لیے ﴿فَمَنْ بَدَّلَهٗ﴾ پس جس نے بدل دیا اس وصیت کو ﴿بَعْدَ مَا سَمِعَهٗ﴾ بعد اس کے کہ اس نے اس کو سن لیا تھا ﴿فَاِنَّمَآ﴾ پس پختہ بات ہے ﴿اِثْمُهٗ﴾ اس کا گناہ ﴿عَلَى الَّذِيْنَ﴾ ان لوگوں پر ہے ﴿يُبَدِّلُوْنَهٗ﴾ جو اس کو بدلتے ہیں ﴿اِنَّ اللّٰهَ﴾ بے شک اللہ تعالیٰ ﴿سَمِيْعٌ﴾ سننے والا ہے ﴿عَلِيْمٌ﴾ جاننے والا ہے ﴿فَمَنْ خَافَ﴾ پس جس نے خوف کیا ﴿مِنْ مُّوْصٍ﴾ وصیت کرنے والے سے ﴿جَنَفًا﴾ کج روی کا ﴿اَوْ اِثْمًا﴾ یا گناہ کا ﴿فَاَصْلَحَ بَيْنَهُمْ﴾ پس اس نے اصلاح کی ان کے درمیان ﴿فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ﴾ پس اس پر کوئی گناہ نہیں ہے ﴿اِنَّ اللّٰهَ﴾ بے شک اللہ تعالیٰ ﴿غَفُوْرٌ﴾ بخشنے والا ہے ﴿رَّحِيْمٌ﴾ مہربان ہے۔

قصاص اور دیت کے احکام

ان آیات میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے دو حکم بیان فرمائے ہیں۔ ان میں سے ایک حکم باقی ہے اور دوسرا منسوخ ہے۔ جو حکم باقی ہے وہ ہے قتل کے متعلق اور اس کی ایک صورت یہ ہے کہ اگر کوئی کسی کو دیدہ دانستہ قتل کر دے تو مقتول کے وارثوں کو اللہ تعالیٰ نے معاف کرنے کا حق دیا ہے اور یہ حق وارثوں کے سوا کسی کو حاصل نہیں ہے، آج کل عموماً ایسا ہوتا ہے کہ ساری عدالتیں سزا کو بحال رکھیں تو پھر صدر کے پاس رحم کی اپیل ہوتی ہے اور وہ معاف کرتا ہے یہ بالکل اسلام کے خلاف ہے صدر کو معافی کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔

دوسری صورت یہ ہے کہ اگر دیت لینا چاہیں یعنی مالی بدلہ تو اس کی بھی اجازت ہے اور دیت کا مسئلہ پانچویں پارے

میں مذکور ہے۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اور خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے دور میں سو اُونٹ دیت ہوتی تھی اور اگر دینار کی شکل میں ادا کرتے تو ایک ہزار دینار تھا یہ اس وقت سو اُونٹ کی قیمت تھی اور اگر چاندی کی شکل میں ادا کرتے تو دس ہزار درہم۔ آج سے تقریباً چار پانچ سال پہلے پاکستان کی حکومت نے ایک ہزار دینار کی قیمت لگائی تو تقریباً ایک لاکھ پچھتر ہزار روپے اور اگر اس پر بھی راضی نہ ہوں تو پھر قصاص ہے قتل کے بدلے قتل۔ تو دیدہ دانستہ قتل کے تین حکم ہیں اور یہ تینوں قرآن پاک میں موجود ہیں۔اور اگر خَطَأً قتل ہو تو اس میں قصاص نہیں ہے صرف دیت ہے۔ بندوں کو دیت دینا پڑے گی اور رب تعالیٰ کا حق جو ضائع کیا ہے تو اس کے لیے دو ماہ روزے یا غلام آزاد کرنا پڑے گا اور اس کی تفصیل پانچویں پارے میں ہے۔آج کل عموماً جو بسوں یا ٹرکوں کے نیچے آتے ہیں یہ قتل خطا ہی کی صورت بنتی ہے کیوں کہ کسی کو کسی کے ساتھ دشمنی تو ہوتی نہیں۔

تو اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتے ہیں ﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا﴾ اے لوگو! جو ایمان لائے ہو ﴿كُتِبَ عَلَیْكُمُ الْقِصَاصُ﴾ فرض کیا گیا تم پر قصاص اور قصاص کا معنیٰ ہے بدلہ ﴿فِی الْقَتْلٰى﴾۔قَتْلٰی قتیل کی جمع ہے۔مقتولوں کے بارے میں کہ جس نے قتل کیا ہے اس کو قتل کیا جائے ﴿اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ﴾ آزاد آزاد کے بدلے ﴿وَ الْعَبْدُ بِالْعَبْدِ﴾ غلام غلام کے بدلے ﴿وَالْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى﴾ اور عورت، عورت کے بدلے۔زمانہ جاہلیت میں لوگوں کا یہ دستور تھا کہ اگر کوئی کمی اونچے خاندان کے آدمی کو قتل کر دیتا تھا تو ایک کے بدلے دو قتل کرتے تھے۔اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ غلط ہے جس نے قتل کیا ہے حُر ہے تو حُر کے بدلے ایک ہی آئے گا۔

اسی طرح بعض خاندان ایسے تھے کہ اگر ان کے غلاموں کو قتل کیا جاتا تو کہتے تھے کہ اگرچہ یہ ہمارا غلام ہے مگر ہماری ذات تو اونچی ہے نا اس واسطے ہم نے تمھارے دو غلام قتل کرنے ہیں۔اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ دو کا حق نہیں ہے، ایک غلام کے بدلے ایک غلام ہی قتل کیا جائے۔اسی طرح عورت کے بدلے عورت۔یہاں بھی اس طرح کرتے تھے کہ چوں کہ ہمارا خاندان بڑا اور اُونچا ہے اور تمھاری عورت نے ہماری عورت کو قتل کیا ہے لہٰذا ہم تمھاری دو عورتیں قتل کریں گے۔اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ بالکل غلط ہے کہ تم بے قصور کو ساتھ قتل کر دو کہ ایک کی جگہ دو قتل کرو۔

اب دیکھو! ایسا ہوتا ہے کہ بیٹا نادانی کرتا ہے باپ کو علم بھی نہیں ہوتا یا دوسرے بھائی کو علم بھی نہیں ہوتا کہ ہمارے بھائی نے کیا شرارت کی ہے تو اب اس بے گناہ کو قتل کرنے کا کیا معنیٰ ہے؟ ﴿فَمَنْ عُفِیَ لَهٗ مِنْ اَخِیْهِ شَیْءٌ﴾ پس جس کو معاف کر دیا گیا اس کے بھائی کی طرف سے کچھ بھی ﴿فَاتِّبَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ﴾ پس پیچھے پڑنا ہے عمدگی کے ساتھ مثال کے طور پر وارثوں نے کہا کہ ہم قصاص نہیں لینا چاہتے ہمیں تم دیت دے دو تو فرمایا کہ اگر معافی مل گئی قصاص سے تو پیچھے پڑنا ہے عمدگی کے ساتھ کہ یہ جو رقم تم نے لینی ہے تو لیتے وقت تم سختی نہ کرو اور ادا کرنے والا ﴿وَ اَدَآءٌ اِلَیْهِ بِاِحْسَانٍ﴾ وہ بھی عمدگی کے ساتھ ادا کرے ٹال مٹول نہ کرے وعدے کے مطابق ادا کر دے تا کہ بات آگے نہ بڑھے ﴿ذٰلِكَ تَخْفِیْفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ﴾ یہ تمھارے رب کی طرف سے تخفیف ہے ﴿وَ رَحْمَةٌ﴾ اور تمھارے واسطے اللہ تعالیٰ کی مہربانی ہے ﴿فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ﴾ پس جس نے تجاوز کیا اس کے

بعد ﴿فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِیْمٌ﴾ پس اس کے واسطے عذاب ہوگا دردناک اس واسطے کہ قاتل سے دیت بھی لے لی اور پھر اس کو قتل بھی کر دیا یہ اس کی زیادتی ہے۔ یا جس نے دیت اپنے ذمہ لی ہے وہ اس میں ان کو خوار کرتا ہے دیت نہیں دیتا ٹال مٹول کرتا ہے یہ بھی زیادتی ہے۔ تو جو بھی زیادتی کرے گا فرمایا اس کے واسطے دردناک عذاب ہے ﴿وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰاُولِي الْاَلْبَابِ﴾ اور تمھارے واسطے قصاص میں زندگی ہے اے عقل مندو! ﴿لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ﴾ تاکہ تم قتل سے بچو۔

اسلامی قوانین کے فوائد

اسلام کا ضابطہ یہ ہے کہ جس مقام پر جمعہ کی نماز ہوگی ایسی بستی میں ایک قاضی جو قتل تک کے فیصلے کرے مقرر کرنا پڑے گا تاکہ لوگوں کو دور دراز نہ جانا پڑے۔

نمبر ۲۔ شریعت میں کسی عرضی نویس کے پاس جانے کی ضرورت نہیں اگر خود لکھ سکتا ہے تو سادے کاغذ پر لکھ کر جج کے سامنے چلا جائے اور اگر لکھنا نہیں جانتا تو زبانی بیان کرے وکیل کی بھی ضرورت نہیں۔ اب عرضی نویس کے پاس جاؤ گے تو وہ کھال اُتاریں گے پھر تمھیں وکیل کرنا پڑے گا بچی ہوئی چمڑی وہ اُتارنے گا پھر کہیں جا کر جج کے پاس مقدمہ پیش ہوگا اور تاریخوں پر تاریخیں پڑیں گی۔

کل اخبار میں تھا کہ ایک آدمی کو گیارہ سال ہو گئے ہیں جیل میں پڑا ہوا ہے اور ابھی تک پیشی بھی نہیں ہوئی تو اس کی زندگی تو وہیں ختم ہو گئی یہ تو بعد میں معلوم ہوگا کہ مجرم ہے یا نہیں۔ تو اسلام میں نہ پکے کاغذ ہوں گے نہ عرضی نویس کی تحریر ضروری ہوگی نہ وکیل کی ضرورت ہوگی خود بہ خود جج کے پاس پہنچے گا وہ سنے گا اگر اس نے گواہ پیش کر دیئے اور وہ مطمئن ہو گیا تو ابھی مقتول کی لاش نہیں اُٹھے گی قاتل کا سر اُتار دیا جائے گا۔ تو اب جس آدمی کو معلوم ہو کہ میری گردن بھی اُتر جائے گی تو وہ قتل کا اقدام نہیں کرے گا۔ یہاں تو شیطان کی آنت سے لمبے مقدمے چلتے ہیں اور رشوتیں چلتی ہیں۔

تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ قصاص میں تمھارے واسطے زندگی ہے اے عقل مندو! ﴿لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ﴾ تاکہ تم بچ جاؤ۔ سعودیہ میں بھی اس وقت مکمل اسلام نافذ نہیں ہے اور اگر مکمل نافذ ہے تو وہ طالبان (افغانستان) کے علاقے میں ہے۔ اللہ کرے کہ وہ مزید کامیابیاں حاصل کریں لیکن یورپ کی دنیا یہ بد باطن لوگ ہاتھ دھو کر ان کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ کبھی کہتے ہیں کہ لڑکیوں کے سکول بند کر دیئے ہیں، کبھی کہتے ہیں کہ کالج بند کر دیئے ہیں۔ ان کو بدنام کرنے کا کوئی دقیقہ نہیں چھوڑا تاہم سعودیہ میں یہ ہے کہ قصاص لیا جاتا ہے۔

دوسرا حکم ہے مرنے والے کا وارثوں کے لیے اپنے مال میں وصیت کرنا اور یہ حکم پہلے تھا اب منسوخ ہو گیا ہے۔ اُس وقت وراثت کے احکام نافذ نہیں ہوئے تھے۔ چوتھا پارہ سورۃ النساء میں وراثت کے احکام ہیں کہ مرنے والے کے باپ کا یہ حق ہے، ماں کا یہ حق ہے، بیوی کا یہ حق ہے، بیٹے کا یہ حق ہے اور یہ حکم پہلے کا ہے اس وقت یہ حق نازل نہیں ہوئے

تھے۔ تو پہلے کیا حکم تھا؟

فرمایا ﴿كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ﴾ تم پر لکھا گیا ہے، فرض کیا گیا ہے کہ جس وقت تم میں سے کسی پر موت کا وقت آئے ﴿إِنْ تَرَكَ خَيْرًا﴾ خیر سے مراد مال ہے یعنی اگر اُس نے مال چھوڑا ہے تو ﴿الْوَصِيَّةُ﴾ تو لکھی گئی ہے وصیت۔ اور وصیت کس کے حق میں کرنی ہے؟ فرمایا ﴿لِلْوَالِدَيْنِ﴾ کہ میری ماں اس مال میں سے اتنا دے دینا اور باپ کو اتنا دے دینا ﴿وَالْأَقْرَبِينَ﴾ اور جتنے شرعی وارث ہیں چچے کو اتنا دے دینا، اور فلاں کو اتنا دے دینا۔ اور اب وراثت کا حکم نازل ہو چکا ہے اور رب نے خود متعین کر دیا ہے ﴿بِالْمَعْرُوفِ﴾ اچھے طریقے سے۔

وصیت کے بعض احکام

اور اب حکم یہ ہے کہ ﴿لَا وَصِيَّةَ لِلْوَارِثِ﴾ پہلے شرعی وارث کے حق میں آدمی وصیت کر سکتا تھا اب وصیت نہیں کر سکتا غیر وارث کو وصیت کر سکتا ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ مثال کے طور پر کسی کے پاس تین لاکھ روپیہ ہے تو تین لاکھ میں سے تیسرے حصے میں وصیت کر سکتا ہے وارثوں کی اجازت کے بغیر کیوں کہ شریعت نے اس کو اجازت دی ہے اپنی جائیداد میں سے تیسرے حصے کی وصیت کر سکتا ہے چاہے وہ منقولہ ہو یا غیر منقولہ۔ باقی جو دو حصے ہیں وہ وارثوں کے ہیں ان کی اجازت کے بغیر ان میں وصیت نہیں کر سکتا۔ وصیت یہ ہے کہ اتنا مال مسجد پر خرچ کر دینا، اتنا مدرسے پر خرچ کر دینا، اتنا فلاں غریب کو دے دینا جو بھی جائز قسم کی وصیت ہے ﴿حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ﴾ یہ پرہیز گاروں کے ذمہ اُس وقت لازم تھا ﴿فَمَنْ بَدَّلَهُ﴾ پس جس نے وصیت کو بدل دیا ﴿بَعْدَ مَا سَمِعَهُ﴾ بعد اس کے کہ اس نے اس کو سُن لی بات ﴿فَإِنَّمَا إِثْمُهُ﴾ پس پختہ بات ہے کہ اس کا گناہ ﴿عَلَى الَّذِينَ يُبَدِّلُونَهُ﴾ ان لوگوں پر ہے جنھوں نے اس کو بدل دیا۔ مثلاً: وصیت کرنے والے نے وصیت کی کہ یہ رقم تم نے مسجد یا دینی مدرسہ پر لگانی ہے لیکن پچھلوں نے مشورہ کیا کہ ہماری گلی بڑی خراب ہے اس پر لگا دو یا ہمارا راستہ بڑا خراب ہے اس پر لگا دو یا بیت الخلاء کی ضرورت ہے لوگوں کو بڑی تکلیف ہوتی ہے اس پر لگا دو اس کے مُجاز نہیں ہیں یعنی اس نے جو وصیت کی ہے اس کو بدلنے کے مجاز نہیں ہیں۔ مسجد کا کہا ہے تو مسجد میں لگاؤ، دینی مدرسہ کہا ہے تو دینی مدرسہ پر لگاؤ، قبرستان کے لیے وصیت کی ہے تو قبرستان میں لگاؤ، یتیم خانے کے لیے کہا ہے تو یتیم خانے میں لگاؤ۔ جو جائز کام اس نے کہے ہیں تم ان کو بدلنے کے مجاز نہیں ہو۔

اسی کا ذکر ہے ﴿فَمَنْ بَدَّلَهُ﴾ پس جس نے اس وصیت کو بدلا ﴿بَعْدَ مَا سَمِعَهُ﴾ بعد اس کے کہ اس نے سُن لی تھی ﴿فَإِنَّمَا إِثْمُهُ﴾ تو بے شک اس کا گناہ ﴿عَلَى الَّذِينَ يُبَدِّلُونَهُ﴾ اُن لوگوں کے ذمے ہے جنھوں نے اس کو بدلا ہے ﴿إِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ﴾ بے شک اللہ تعالیٰ سنتا ہے ﴿عَلِيمٌ﴾ اور تمھارے ارادوں کو بھی جانتا ہے ﴿فَمَنْ خَافَ مِنْ مُوصٍ جَنَفًا﴾ پس جس نے خوف کیا وصیت کرنے والے سے کج روی کا۔ مثلاً: جہالت کی وجہ سے تیسرے حصہ سے زائد میں وصیت کر گیا ﴿أَوْ إِثْمًا﴾ یا

گناہ کی وصیت کی جیسا کہ اوکاڑہ کے قریب ایک بوڑھے نے فوت ہونے سے پہلے وصیت کی کہ جب میں مرجاؤں تو میرے جنازے کے ساتھ کنجریاں بھی ناچیں گی، بھانڈ بھی گائیں گے، ڈھول باجے بھی ہوں گے اور اس کام کے واسطے اُس نے رقم بھی مختص کی اور یہ خبر باقاعدہ اخبارات میں آئی تھی۔ ایسے جاہل لوگ بھی موجود ہیں اگر ایسی ناجائز وصیت کو بدل دے تو اس بدلنے پر کوئی گناہ نہیں ہوگا۔

یا جس طرح فقہائے کرام فرماتے ہیں کہ اگر کوئی وصیت کرے کہ میرے مرنے کے بعد تم نے مولوی، قاری بلا کر قرآن پڑھانا ہے اور کچھ رقم مختص کر کے کہے کہ یہ اُن کو دینی ہے تو یہ وصیت باطل ہوگی کیوں کہ میت کے لیے اگر قرآن شریف اُجرت پر پڑھا جائے تو پڑھنے والا بھی گناہ گار اور پڑھانے والا بھی گناہ گار اور اس کا ثواب بھی باطل ہے۔ اس واسطے فرمایا ﴿فَاَصْلَحَ بَیْنَهُمْ﴾ پس وہ جس کی وصیت کی گئی ہے وہ اُن کے درمیان اصلاح کردے یعنی رقم کو اچھی جگہ پر خرچ کردے ﴿فَلَاۤ اِثْمَ عَلَیْهِ﴾ تو اس پر کوئی گناہ نہیں ہے ﴿اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ﴾ بے شک اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے۔

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا﴾ اے وہ لوگو! جو ایمان لائے ہو ﴿كُتِبَ عَلَیْكُمُ﴾ لکھے اور فرض کیے گئے تم پر ﴿الصِّیَامُ﴾ روزے ﴿كَمَا كُتِبَ﴾ جیسے لکھے گئے تھے ﴿عَلَى الَّذِیْنَ﴾ اُن لوگوں پر ﴿مِنْ قَبْلِكُمْ﴾ جو تم سے پہلے تھے ﴿لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ﴾ تاکہ تم پرہیزگار بن جاؤ ﴿اَیَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ﴾ دن ہیں گنتی کے ﴿فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِیْضًا﴾ پس جو شخص تم میں سے مریض ہو ﴿اَوْ عَلٰى سَفَرٍ﴾ یا سفر پر ہو ﴿فَعِدَّةٌ﴾ پس گنتی پوری کرے ﴿مِّنْ اَیَّامٍ اُخَرَ﴾ دوسرے دنوں سے ﴿وَعَلَى الَّذِیْنَ﴾ اور اُن لوگوں پر ﴿یُطِیْقُوْنَهٗ﴾ جو روزے کی طاقت نہیں رکھتے ﴿فِدْیَةٌ﴾ فدیہ ہے ﴿طَعَامُ مِسْكِیْنٍ﴾ ایک مسکین کی خوراک کا ﴿فَمَنْ تَطَوَّعَ﴾ پس جو شخص خوشی کے ساتھ کرے ﴿خَیْرًا﴾ نیکی ﴿فَهُوَ خَیْرٌ لَّهٗ﴾ پس وہ اس کے لیے بہتر ہے ﴿وَاَنْ تَصُوْمُوْا﴾ اور یہ کہ تم خود روزہ رکھو ﴿خَیْرٌ لَّكُمْ﴾ تمھارے واسطے بہتر ہے ﴿اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ﴾ اگر ہو تم جانتے ﴿شَهْرُ رَمَضَانَ﴾ مہینہ رمضان کا ﴿الَّذِیْۤ﴾ وہ ہے ﴿اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ﴾ جس میں نازل کیا گیا قرآن ﴿هُدًى﴾ جو ہدایت ہے ﴿لِّلنَّاسِ﴾ لوگوں کے لیے ﴿وَبَیِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى﴾ اور ہدایت کی واضح دلیلیں ہیں ﴿وَالْفُرْقَانِ﴾ اور حق اور باطل کے درمیان فیصلہ کرنے والا ہے ﴿فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ﴾ پس جو شخص تم میں سے اس مہینے میں گھر میں حاضر ہوا ﴿فَلْیَصُمْهُ﴾ پس اس کو روزے رکھنے چاہئیں ﴿وَمَنْ كَانَ مَرِیْضًا﴾ اور جو شخص بیمار ہے ﴿اَوْ عَلٰى سَفَرٍ﴾ یا سفر پر ہے ﴿فَعِدَّةٌ﴾ پس گنتی ہے ﴿مِّنْ اَیَّامٍ اُخَرَ﴾ دوسرے دنوں کی ﴿یُرِیْدُ اللّٰهُ﴾ ارادہ کرتا ہے اللہ تعالیٰ ﴿بِكُمُ﴾ تمھارے بارے میں ﴿الْیُسْرَ﴾

آسانی کا ﴿وَ لَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ﴾ اور نہیں ارادہ کرتا تمھارے بارے میں تنگی کا ﴿وَ لِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ﴾ اور تا کہ تم پوری کرو گنتی ﴿وَ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ﴾ اور تا کہ تم بڑائی بیان کرو اللہ تعالیٰ کی ﴿عَلٰى مَا﴾ اُن نعمتوں پر ﴿هَدٰىكُمْ﴾ جو رب نے تمھیں نصیب فرمائیں، ہدایت دی ﴿وَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ﴾ اور تا کہ تم شکر ادا کرو۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے مومنوں پر جو عبادات لازم فرمائی ہیں ان میں سے ایک روزہ بھی ہے۔ رمضان المبارک کے روزے ہر اس مسلمان مرد اور عورت پر لازم ہیں جو تندرست ہو اور گھر میں مقیم ہو۔ تو اللہ تعالیٰ مومنوں کو خطاب کر کے فرماتے ہیں ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ اے وہ لوگو! جو ایمان لائے ہو ﴿كُتِبَ عَلَيْكُمُ﴾ تحریر کیے گئے رب کی طرف سے فرض کیے گئے تم پر ﴿الصِّيَامُ﴾ روزے۔ روزہ فرض ہے اور جو شخص رمضان کے روزے کا انکار کرے وہ پکا کافر ہے اور روزے کو تسلیم کرتے ہوئے نہیں رکھتا تو گناہ گار ہے۔ اور اسی طرح تم پر روزے فرض کیے گئے ہیں ﴿كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ﴾ جیسے اُن لوگوں پر فرض کیے گئے جو تم سے پہلے تھے۔ تفصیل تو ہمیں معلوم نہیں ہے مگر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد واضح کرتا ہے کہ پہلے لوگوں پر بھی روزے تھے، کسی پر کم اور کسی پر زیادہ۔ یہ روزے تم پر کیوں فرض کیے گئے ﴿لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ﴾ تا کہ تم متقی، پرہیز گار بن جاؤ۔

روزے سے تقویٰ کیسے آئے گا؟

اب بندہ روزے سے کس طرح متقی بنے گا؟ اگر انسان انسان ہے تو تھوڑی سی توجہ سے آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔ رمضان کریم کے مہینے میں پَو پھٹنے کے بعد غروبِ آفتاب تک اس کے لیے پانی بھی حرام اور رزق بھی حرام اور بھی جائز چیزیں ساری حرام جب کہ صبح صادق سے پہلے بھی جائز تھیں، کھاتا تھا اور سورج کے غروب ہونے کے بعد بھی اس کے لیے جائز ہیں کھائے گا۔ اس دوران میں یہ چیزیں کیوں حرام ہیں؟ اس لیے کہ رب تعالیٰ کا حکم ہے تم پَو پھٹنے کے بعد غروبِ آفتاب تک نہیں کھا سکتے جو اس نکتے کو سمجھے گا تو وہ ضرور غور کرے گا کہ جس رب نے یہ چیزیں چند گھنٹوں کے لیے حرام فرمائی ہیں تو وہ چیزیں جو رب نے بارہ مہینے حرام فرمائی ہیں وہ میں کس طرح کر سکتا ہوں۔ یعنی جو چیزیں رب تعالیٰ نے بارہ مہینے حرام فرمائی ہیں وہ بھی تو مجھے ماننی پڑیں گی۔ اس بارے میں بخاری شریف میں حدیث ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ((مَنْ لَّمْ يَدَعْ قَوْلَ الزُّوْرِ وَ الْعَمَلَ بِهٖ فَلَيْسَ لِلّٰهِ حَاجَةٌ فِيْۤ اَنْ يَّدَعَ طَعَامَهٗ وَ شَرَابَهٗ))۔ "جس آدمی نے زبانی طور پر جھوٹ نہ چھوڑا اور نہ عملی طور پر جھوٹ چھوڑا تو رب تعالیٰ کو اس کے روزے کی کوئی ضرورت نہیں کہ کیوں اس نے کھانا پینا چھوڑا ہے۔" جو چیز حرام ہے مثلاً: جھوٹ، وہ تو بولے جا رہا ہے۔ اور عملی طور پر جو جھوٹ ہے وہ کیے جا رہا ہے تو کھانے پینے سے گریز کرتا ہے اس کا کیا فائدہ؟

جھوٹ جس طرح قولاً ہوتا ہے اسی طرح عملاً بھی ہوتا ہے مثال کے طور پر کسی کی ڈاڑھی سفید ہے، سر سفید ہے، مرد ہے یا عورت وہ اگر سفید رکھیں تو یہ بھی جائز ہے اور اگر وہ مہندی لگائیں تو یہ بھی سنت ہے اور اگر وہ خضاب لگائیں، ڈاڑھی اور سر کے بالوں کو کالا کریں تو یہ عملی جھوٹ ہے کیوں کہ بال تو سفید ہیں اور اس نے کالے کیے ہوئے ہیں۔ حدیث میں ہے جو کہ

نسائی شریف میں ہے کہ قیامت کے قریب کچھ لوگ ایسے پیدا ہوں گے کہ وہ بال کالے کریں گے فرمایا جنت کی خوش بو بھی نہیں سونگھ سکیں گے حالانکہ جنت کی خوشبو چالیس سال کی مسافت سے آئے گی۔ تو خضاب لگانا مرد کے لیے بھی اور عورت کے لیے بھی حرام ہے۔ اسی طرح فریب، مکر، یہ عملی جھوٹ ہیں۔

تو جس شخص نے روزے کی حقیقت سمجھی وہ یقیناً ان چیزوں کی حقیقت بھی سمجھے گا ﴿اَیَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ﴾ یہ روزے تمھارے واسطے گنتی کے دن ہیں اُنتیس یا تیس دن ہوں گے، نہ اٹھائیس کا مہینہ ہوتا ہے اور نہ اکتیس کا۔ ﴿فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِیْضًا﴾ پس جو شخص تم میں سے بیمار ہو مگر بیمار کیسا وہ بیمار کہ اس کا مزاج اور طبیعت خدا خوفی کو سامنے رکھتے ہوئے یہ فیصلہ کرے کہ میرے اُوپر جو بیماری کا حملہ ہوا ہے اس میں میں روزہ نہیں رکھ سکتا۔ خود انسان کا نفس بھی مفتی ہے بعض اوقات کچھ مقام ایسے ہوتے ہیں کہ آدمی پر اچانک حملہ ہوتا ہے اور وہاں سے ڈاکٹر اور حکیم دور ہوتے ہیں آدمی وہاں نہیں پہنچ سکتا تو خود شریعت نے اسے مفتی بنایا ہے کہ وہ خود فیصلہ کرے کہ یہ جو بیماری کا میرے اُوپر حملہ ہوا ہے اس کی وجہ سے میں روزہ نہیں رکھ سکتا اور قیامت کو سامنے رکھے کہ کل رب تعالیٰ کو جواب دینا ہے اور میں رب تعالیٰ کو کہہ سکوں گا کہ اے پروردگار! تو جانتا ہے کہ میرے اُوپر ایسی بیماری نے حملہ کیا تھا کہ میں روزہ نہیں رکھ سکتا تھا۔ اور یہ سمجھتا ہے کہ میرے اس عذر کو اللہ تعالیٰ قبول کرلے گا تو روزہ چھوڑ دے۔ یا ایسا بیمار ہو کہ جس کے بارے میں حکیم اور ڈاکٹر یہ کہیں کہ اس بیماری میں اس کے لیے روزہ صحیح نہیں ہے۔ اور حکماء اور ڈاکٹروں کے لیے تین شرطیں ہیں:

- پہلی شرط یہ ہے کہ حکیم اور ڈاکٹر مسلمان ہوں غیر مسلم ڈاکٹر اور حکیم کی بات شرعی طور پر حجت نہیں ہے۔
- دوسری شرط یہ ہے کہ حکیم اور ڈاکٹر خود نماز اور روزے کے پابند ہوں، فاسق کی بات شرعاً حجت نہیں ہے۔
- تیسری شرط یہ ہے کہ حکیم اور ڈاکٹر مستند ہوں۔ ایسا نہ ہو کہ باپ دادا کی شیشیاں اکٹھی کر کے حکیم، ڈاکٹر بن گیا ہو۔ پھر جو روزے چھوڑے گا ان کے بارے میں آگے ذکر آتا ہے کہ ان کی قضا کرنا پڑے گی اور یاد رکھنا! ہر بیمار روزہ نہیں چھوڑ سکتا آج اس زمانے میں کون سا آدمی ہے جو بالکل تندرست ہو۔ کھادوں والی خوراکیں ہیں۔ پھر ہر چیز میں ملاوٹ ہے کوئی چیز خالص نہیں ملتی۔ اور ہم ہیں بھی تن آسان کہ بدن سے کام نہیں لیتے۔ بدن حرکت بھی نہ کرے اور خوراک بھی کھادوں والی ہو تو بیمار تو ہونا ہے اور دوائی بھی خالص نہیں ملتی۔ تو ایسے دور میں بہت کم لوگ ہیں جو تندرست ہیں لہٰذا ہر بیمار روزہ نہیں چھوڑ سکتا صرف وہ روزہ چھوڑ سکتا ہے جس کو روزے کی وجہ سے تکلیف ہو مذکورہ شرطوں کے ساتھ۔

مسافر روزہ رکھ بھی سکتا ہے اور چھوڑ بھی سکتا ہے

﴿اَوْ عَلٰى سَفَرٍ﴾ یا بندہ سفر پر ہو۔ اور شرعی طور پر سفر اڑتالیس میل ہے۔ چاہے وہ سفر بس کا ہو، کار کا ہو یا گاڑی کا ہو، چاہے پیدل ہو۔ یک طرفہ سفر اڑتالیس میل۔ لیکن اگر سفر میں مسافر روزہ رکھ سکتا ہے تو بہتر ہے کیوں کہ اس کی اجازت ہے۔

ایسا نہیں ہے کہ مسافر کے لیے روزہ چھوڑنا فرض ہے لہٰذا رکھے تو نُوْرٌ عَلٰی نُوْر ہے کیوں کہ مسلمانوں کے ساتھ مطابقت بھی ہو جائے گی اور رمضان المبارک کی فضیلت بھی حاصل ہو جائے گی۔

نماز اور روزے کا تھوڑا سا فرق ہے وہ اس طرح کہ اگر یک طرفہ سفر اڑتالیس میل ہو تو مسافر کو چار رکعتوں والی نماز میں دو رکعتیں پڑھنا پڑتی ہیں اگر چار پڑھے گا تو گناہ گار ہوگا مثلاً: ظہر کی چار یا عصر کی چار پڑھے گا یا عشا کی چار پڑھے گا تو گناہ گار ہوگا اس واسطے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی سفر میں چار رکعت ثابت نہیں ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو ہی پڑھی ہیں۔ اور روزے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سفر میں رکھے بھی ہیں اور چھوڑے بھی ہیں۔

۸ ہجری رمضان المبارک میں فتح مکہ کا سفر تھا۔ قدید ایک مقام کا نام ہے۔ وہاں پہنچنے تک آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بھی روزے رکھے۔ حالانکہ مدینہ منورہ سے مکہ مکرمہ انگریزی میلوں کے حساب سے تین سو گیارہ میل ہے۔ پھر جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ گرمی بہت ہے اور بعض لوگ بے ہوش ہو کر گر گئے ہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ظہر کے بعد سب کے سامنے پیالے میں پانی لے کر پیا اور فرمایا کہ تم روزہ توڑ لو اور آج کے روزے کی قضا کر لینا۔ نماز کے بارے میں بھی یہ مسئلہ ہے کہ اگر امام مقیم ہے تو اس کے پیچھے چار رکعت پڑھنی ہے۔

﴿فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ﴾ اگر وہ سفر پر ہے تو اس کو دوسرے دنوں کی گنتی پوری کرنی پڑے گی۔ رمضان کریم کے بعد جب تندرست ہو جائے اور سفر سے واپس آ جائے تو جتنے روزے چھوڑے ہیں اتنے دن روزے رکھے اور جتنے روزے رہ گئے ہیں مسلسل بھی رکھ سکتا ہے اور الگ الگ کر کے بھی۔ دونوں صورتیں جائز ہیں۔

﴿وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ﴾ اور اُن لوگوں پر جو روزے کی طاقت نہیں رکھتے ﴿فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ﴾ ایک مسکین کی خوراک ہے۔ اگر کوئی آدمی یا عورت زیادہ بوڑھے ہیں، وہ روزہ نہیں رکھ سکتے۔ وہ ایک مسکین کو شام کے وقت اور سحری کے وقت کھانا کھلا دیں جیسا خود کھاتے ہیں اور اگر کچا راشن دینا چاہیں تو اتنا دیں کہ وہ ہر مسکین کی خوراک بن سکے کیوں کہ یہاں پر (گکھڑ میں) چیزوں کا بھاؤ کچھ ہے اور گوجرانوالا میں کچھ اور ہوگا اور لاہور میں کچھ اور ہوگا۔ بہر حال اتنا ہو کہ مسکین کی دو وقت کی خوراک ہو جائے۔ اسی طرح اگر کوئی ایسا بیمار ہے کہ اس کی بیماری سے شفا یابی عادتاً نہیں ہوتی مثلاً: ٹی، بی کے تیسرے، چوتھے مرحلے پر پہنچ چکا ہو تو وہ بھی روزہ چھوڑ سکتا ہے۔ اور جو بیمار تندرست ہو سکتا ہے وہ باقاعدہ قضا کرے گا اور اگر کسی نے اس ذہن سے روزے چھوڑے کہ میں تندرست نہیں ہو سکتا اور فدیہ بھی دے دیا پھر رب تعالیٰ نے اس کو تندرستی دے دی تو یہ روزے پھر بھی اسے قضا کرنا پڑیں گے اور جو فدیہ دیا ہے اس کا ثواب الگ ملے گا۔ کیوں کہ یہ فدیہ مشروط تھا کہ اس کو صحت نہیں ہوگی اور رب تعالیٰ نے اس کو صحت دے دی، لہٰذا روزے رکھنا پڑیں گے اور ہر بیمار روزہ نہیں چھوڑ سکتا۔

اور یہ مسئلہ تم کئی دفعہ سن چکے ہو کہ نماز، روزہ، عشر، زکوٰۃ وغیرہ ایسی چیزیں ہیں کہ کروڑ مرتبہ بھی توبہ کرنے سے یہ معاف نہیں ہوتیں جب تک حساب کر کے ان کی قضا نہ کرلو۔ ﴿فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا﴾ پس جس نے دل کھول کر نیکی کی کہ ایک کی جگہ

دو کو کھانا کھلایا ﴿فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ﴾ پس وہ اس کے لیے بہتر ہے۔ یا تھوڑی رقم کی جگہ زیادہ دے دی تا کہ فراخی سے وہ کھائے تو بہت اچھا ہے ﴿وَ اَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ﴾ اور یہ کہ تم خود روزہ رکھو یہی تمھارے حق میں بہتر ہے اگر طاقت ہو ﴿اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ﴾ اگر تم جانتے ہو۔

رمضان المبارک میں سارے قرآن کے نزول کا معنیٰ ؟

فرمایا ﴿شَهْرُ رَمَضَانَ﴾ رمضان کا مہینہ ﴿الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ﴾ وہ مبارک مہینہ ہے کہ اس میں قرآن کریم اُتارا گیا ہے۔ قرآن کریم رمضان کریم کی آخری راتوں میں سے جو طاق رات ہے اس میں لوح محفوظ سے آسمان دنیا پر ایک مقام ہے جس کا نام ہے بیت العزت اور بیت العظمت۔ یہاں تک اللہ تعالیٰ نے ایک رات میں مکمل قرآن پاک نازل فرمایا۔ یہاں پر نزول سے مراد یہ ہے۔ پھر اس بیت العزت اور بیت العظمت سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی پر تیئس سالوں میں نازل ہوتا رہا ہے۔ سب سے پہلے جبل نور کی چوٹی پر جس کو پہلے فاران کہتے تھے یعنی پہلی کتابوں میں جبلِ نور کا نام جبل فاران ہے اور اب اس کو جبل نور کہتے ہیں اس کی چوٹی پر غار حرا میں سورۂ اقرأ کی پہلی پانچ آیات نازل ہوئیں۔ اور قرآن پاک کی آخری وحی، ہجرت کا دسواں سال، ذوالحجہ کا مہینہ اور اس کی نو تاریخ، جمعہ کا دن اور عصر کا وقت تھا یہ آیت نازل ہوئی ﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَ رَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا﴾ اس کے بعد اور وحی تو نازل ہوتی رہی ہے لیکن قرآن کریم کا کوئی حصہ نازل نہیں ہوا۔

﴿هُدًى لِّلنَّاسِ﴾ یہ قرآن پاک لوگوں کے لیے ہدایت ہے مگر وہ شخص کہ جو خالی الذہن ہو اور اگر اور چیزوں سے دماغ بھرا ہوا ہو تو پھر مشکل ہے۔ اس کو تم اس طرح سمجھو کہ پیالہ خالی ہے اس میں تم ہیرے اور موتی ڈالو تو آئیں گے اور اگر پیالہ خشک گوبر سے بھرا ہوا ہو تو موتی نیچے گر جائیں گے۔ معاف کرنا ہمارے دل اس وقت گناہوں کے گوبر سے بھرے ہوئے ہیں اس واسطے صحیح بات ہمارے برتن میں نہیں آتی، نیچے گر جاتی ہے۔ اگر ہمارے برتن خالی ہوں تو پھر یہ موتی ضرور اس میں آسکتے ہیں۔ ﴿وَ بَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى﴾ اور ہدایت کی واضح دلیلیں ہیں ﴿وَ الْفُرْقَانِ﴾ اور یہ قرآن پاک حق و باطل کے درمیان فیصلہ کرنے والی کتاب ہے فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ ﴾ پس جو شخص تم میں سے اس مہینے میں گھر میں موجود ہو ﴿فَلْيَصُمْهُ﴾ اس کو روزہ رکھنا چاہیے ﴿وَ مَنْ كَانَ مَرِيْضًا﴾ اور جو بیمار ہے ﴿اَوْ عَلٰى سَفَرٍ﴾ یا سفر پر ہے ﴿فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ﴾ پس وہ گنتی پوری کرے دوسرے دنوں کی۔ جتنے روزے سفر میں یا بیماری میں چھوڑے ہیں اتنے اس کو رکھنے پڑیں گے۔ ﴿يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ﴾ اللہ تعالیٰ تمھارے بارے میں آسانی کا ارادہ فرماتے ہیں۔ دیکھو! یہ کتنی آسانی ہے کہ یہ نہیں فرمایا کہ چاہے بیمار ہو روزے رکھو چاہے مر جاؤ۔ اسی طرح سفر میں بھی اجازت دی ہے۔ اگر تنگی کا حکم دیتا تو فرماتا چاہے مر جا روزہ رکھ ﴿وَ لَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ﴾ اور تمھارے بارے میں رب تنگی کا ارادہ نہیں فرماتے۔ اللہ تعالیٰ نے کوئی ایسی عبادت لازم نہیں فرمائی کہ جس میں تم تنگی

محسوس کرو ﴿وَ لِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ﴾ یہ دوسرے دنوں میں روزہ قضا کرنے کا حکم اس واسطے ہے تا کہ تم روزوں کی گنتی پوری کرو۔ جتنے روزے تم نے بیماری یا سفر میں چھوڑے ہیں وہ رکھ لو تا کہ تمھارے روزے انتیس یا تیس پورے ہو جائیں ﴿وَ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ﴾ اور تا کہ تم اللہ تعالیٰ کی بڑائی بیان کرو ﴿عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ﴾ اُس چیز پر جو رب نے تمھیں ہدایت دی ہے۔

ہر وقت رب تعالیٰ کی حمد و ثنا ہونی چاہیے۔ حدیث پاک میں آتا ہے کہ چار کلمے بڑے بہترین ہیں: ﴿سُبْحَانَ اللّٰهِ وَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ وَ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَ اللّٰهُ اَكْبَرُ﴾ ہر وقت پڑھتے رہنا چاہیے وضو ہو یا نہ ہو۔ اور عورتیں ان دنوں میں بھی پڑھ سکتی ہیں جن دنوں میں ان کو نماز کی معافی ہے نماز نہیں پڑھ سکتیں مگر درود شریف پڑھ سکتی ہیں، رب تعالیٰ کا ذکر بھی کر سکتی ہیں ﴿وَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ﴾ اور تا کہ تم رب تعالیٰ کا شکر ادا کرو کہ اللہ تعالیٰ نے تمھاری ظاہری باطنی تکلیفیں دور فرمائی ہیں اور تمھیں ہدایت نصیب فرمائی ہے۔

﴿وَ اِذَا سَاَلَكَ﴾ اور جب پوچھتے ہیں آپ سے ﴿عِبَادِيْ﴾ میرے بندے ﴿عَنِّيْ﴾ میرے بارے میں ﴿فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ﴾ پس بے شک میں قریب ہوں ﴿اُجِيْبُ﴾ میں قبول کرتا ہوں ﴿دَعْوَةَ الدَّاعِ﴾ پکارنے والے کی پکار کو ﴿اِذَا دَعَانِ﴾ جب وہ مجھے پکارتا ہے ﴿فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ﴾ پس چاہیے کہ وہ میرا حکم مانیں ﴿وَ لْيُؤْمِنُوْا بِيْ﴾ اور ایمان لائیں مجھ پر ﴿لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ﴾ تا کہ وہ سیدھی راہ پر آ جائیں ﴿اُحِلَّ لَكُمْ﴾ حلال کر دیا گیا ہے تمھارے لیے ﴿لَيْلَةَ الصِّيَامِ﴾ روزوں کی راتوں میں ﴿الرَّفَثُ﴾ بے پردہ ہونا ﴿اِلٰى نِسَآئِكُمْ﴾ اپنی بیویوں کے ساتھ ﴿هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ﴾ وہ لباس ہیں تمھارا ﴿وَ اَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ﴾ اور تم لباس ہو ان کا ﴿عَلِمَ اللّٰهُ﴾ اللہ تعالیٰ جانتا ہے ﴿اَنَّكُمْ﴾ بے شک تم ﴿كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ﴾ خیانت کرتے ہو اپنی جانوں کے ساتھ ﴿فَتَابَ عَلَيْكُمْ﴾ پس رجوع فرمایا اللہ تعالیٰ نے تم پر ﴿وَ عَفَا عَنْكُمْ﴾ اور درگزر کر دیا تم سے ﴿فَالْـٰٔنَ بَاشِرُوْهُنَّ﴾ پس اب تم مباشرت کرو ان سے ﴿وَ ابْتَغُوْا﴾ اور تلاش کرو ﴿مَا﴾ اس چیز کو ﴿كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ﴾ جو لکھ دی ہے اللہ تعالیٰ نے تمھارے لیے ﴿وَ كُلُوْا وَ اشْرَبُوْا﴾ اور کھاؤ اور پیو ﴿حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ﴾ یہاں تک کہ نمایاں ہو جائے تمھارے لیے ﴿الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ﴾ سفید دھاگا ﴿مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ﴾ سیاہ دھاگے سے ﴿مِنَ الْفَجْرِ﴾ فجر سے ﴿ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ﴾ پھر پورا کرو تم روزے کو ﴿اِلَى الَّيْلِ﴾ رات تک ﴿وَ لَا تُبَاشِرُوْهُنَّ﴾ اور تم مباشرت نہ کرو ان عورتوں سے ﴿وَ اَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ﴾ جب ہو تم اعتکاف بیٹھنے والے ﴿فِي الْمَسٰجِدِ﴾ مساجد میں ﴿تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ﴾ یہ اللہ تعالیٰ کی حدیں ہیں ﴿فَلَا تَقْرَبُوْهَا﴾ پس تم ان کے قریب نہ جاؤ ﴿كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ﴾ اسی طرح کھول کھول کر

بیان کرتا ہے اللہ تعالیٰ ﴿اٰیٰتِهٖ﴾ اپنے احکام ﴿لِلنَّاسِ﴾ لوگوں کے واسطے ﴿لَعَلَّهُمْ یَتَّقُوْنَ﴾ تا کہ وہ پرہیز گار بن جائیں ﴿وَلَا تَاْكُلُوْٓا﴾ اور نہ کھاؤ تم ﴿اَمْوَالَكُمْ بَیْنَكُمْ﴾ ایک دوسرے کا مال آپس میں ﴿بِالْبَاطِلِ﴾ ناحق طریقے سے ﴿وَتُدْلُوْا بِهَآ﴾ اور نہ لے جاؤ تم وہ مال ﴿اِلَى الْحُكَّامِ﴾ حاکموں کے پاس ﴿لِتَاْكُلُوْا فَرِیْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ﴾ تا کہ کھاؤ تم کچھ حصہ لوگوں کے مالوں میں سے ﴿بِالْاِثْمِ﴾ ناحق طور پر ﴿وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ﴾ حالانکہ تم جانتے ہو۔

ماقبل سے ربط

اس سے پہلے ذکر تھا ﴿وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ﴾ ”اور تا کہ تم بڑائی بیان کرو اللہ تعالیٰ کی جس طرح اللہ تعالیٰ نے تمھیں طریقہ سکھلایا ہے۔“ اب یہاں اس بڑائی بیان کرنے کے آداب بتائے جار ہے ہیں کہ زور زور سے پکارنے کی ضرورت نہیں اس لیے کہ رب تعالیٰ قریب ہے اس کو خشوع اور عاجزی کے ساتھ آہستہ ہی پکارو۔

حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اپنی تفسیر میں اسی آیت کے ربط کے بارے میں لکھتے ہیں کہ اس سے پہلے بھی رمضان المبارک کے متعلق بعض احکام میں نرمی اور سہولت کا ذکر ہے اور اس کے بعد بھی انہی کا ذکر ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے حال پر توجہ اور مہربانی فرماتا ہے اسی مناسبت سے یہاں اللہ تعالیٰ کے قریب ہونے اور دعا کو قبول کرنے کا ذکر فرمایا۔

رمضان المبارک میں بندوں کے نیک اعمال اور دعاؤں کی طرف توجہ عام حالات کی بہ نسبت زیادہ ہوتی ہے اس لیے یہاں بتادیا کہ رب تعالیٰ قریب ہے اس کو جب بھی پکارو وہ تمھاری دعا کو سنتا اور قبول کرتا ہے۔

اللہ ذات وصفات ہر لحاظ سے قریب (ہر جگہ) ہے

اس آیت کے شانِ نزول کے بارے میں تفسیر ابن کثیر وغیرہ میں لکھا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک دیہاتی نے پوچھا أَقَرِيبٌ رَبُّنَا فَنُنَاجِيهِ ”کیا ہمارا رب قریب ہے کہ ہم اس کو آہستہ پکاریں أَمْ بَعِيدٌ فَنُنَادِيهِ یا دور ہے کہ ہم اس کو زور زور سے پکاریں۔“ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! خاموش رہے اور کوئی جواب نہ دیا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی ﴿وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ﴾ اور جب آپ سے میرے بندے میرے بارے میں پوچھیں تو آپ ان سے کہہ دیں کہ بے شک میں قریب ہوں۔

ایک روایت میں حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ بعض صحابہ رضی اللہ عنہم نے حضور علیہ السلام سے پوچھا: اَیْنَ رَبُّنَا ”ہمارا رب کہاں ہے؟“ تو یہ آیت نازل ہوئی: ﴿وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ﴾ اللہ تعالیٰ کو پکارنے اور دعا کرنے میں اصل یہ

ہے کہ آہستہ پکارا جائے اس لیے کہ قرآن کریم میں ہے: ﴿اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّ خُفْيَةً﴾ [الاعراف:۵۵] "تم اپنے رب کو عاجزی سے اور آہستہ آہستہ پکارو۔" ہاں جہاں شریعت نے بلند آواز سے پکارنے کا کہا ہے وہاں بلند آواز سے پکارا جائے گا جیسا کہ اذان اور اقامت میں اور ایام تشریق میں فرض نمازوں کے بعد تکبیرات تشریق اور مُحرِم کا تلبیہ کہنا وغیرہ۔ ہم نے اس مسئلہ کی تفصیل اپنی کتاب حکم الذکر بالجہر میں بیان کردی ہے اس کا مطالعہ کریں۔

﴿وَ اِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ﴾ اور جب آپ سے پوچھیں میرے بندے میرے بارے میں ﴿فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ﴾ پس بے شک میں قریب ہوں قریب کا معنیٰ یہ ہے کہ وہ اپنی ذات اور علم وقدرت کے لحاظ سے قریب ہے۔ جیسا کہ قرآن کریم میں سورۂ طلاق کے آخر میں ہے ﴿وَ اَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَحَاطَ بِكُلِّ شَيْءٍ عِلْمًا﴾ "بے شک اللہ تعالیٰ نے علم کے لحاظ سے ہر چیز کا احاطہ کر رکھا ہے۔" اور بخاری ومسلم وغیرہ کی روایت ہے حضرت ابوموسیٰ اشعری فرماتے ہیں کہ ایک غزوہ میں ہم رسول اللہ کے ساتھ تھے اور بلندی پر چڑھتے اور ڈھلوان میں اُترتے اور کسی وادی میں اُترتے وقت بلند آواز سے تکبیر کہتے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے قریب آئے اور فرمایا لوگو! اپنے آپ پر نرمی کرو فَاِنَّكُمْ لَا تَدْعُوْنَ اَصَمَّ وَّلَا غَائِبًا اس لیے تم کسی بہرے اور غیر موجود کو تو نہیں پکار رہے اِنَّمَا تَدْعُوْنَ سَمِيْعًا بَصِيْرًا بلکہ تم تو سمیع اور بصیر ذات کو پکار رہے ہو اِنَّ الَّذِيْ تَدْعُوْنَ اَقْرَبُ اِلٰى اَحَدِكُمْ مِنْ عُنُقِ رَاحِلَتِهٖ بے شک وہ ذات جس کو تم پکار رہے ہو وہ تو تمھاری سواری کی گردن سے بھی تمھارے زیادہ قریب ہے۔ اور قرآن کریم سورۃ قٓ میں ہے: ﴿وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ﴾ "کہ ہم انسان کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہیں۔" تو اللہ تعالیٰ ذات اور صفات ہر لحاظ سے قریب ہے۔

﴿اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ﴾ میں قبول کرتا ہوں پکارنے والے کی پکار کو جب وہ مجھے پکارتا ہے۔ دعا کی قبولیت کے لیے جن باتوں کا ہونا ضروری ہے اگر آدمی نے ان باتوں کو پورا کیا تو ایسے آدمی کی دعا رائیگاں نہیں جاتی۔

- ان میں سے ایک بات یہ ہے کہ آدمی حلال رزق کھائے اور حرام کے قریب بھی نہ جائے۔
- اور دوسری بات یہ ہے کہ آدمی گناہ اور قطع رحمی کی دعا نہ کرے۔
- اور تیسری بات یہ ہے کہ پوری توجہ کے ساتھ دعا کرے۔

یہ ترمذی شریف کی روایت ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا: ((اِنَّ اللّٰهَ لَا يَقْبَلُ دُعَآءً مِنْ قَلْبٍ لَاهٍ غَافِلٍ)) "بے شک اللہ تعالیٰ غافل اور لہو ولعب میں مشغول دل کی دعا قبول نہیں کرتا۔" اور دعا کے سلسلے میں اس بات کو ملحوظ رکھنا بھی ضروری ہے کہ آدمی جلد بازی کا مظاہرہ نہ کرے کہ یوں کہنا شروع کرے کہ میں اتنا عرصہ رب تعالیٰ سے دعا کرتا رہا وہ میری دعا قبول ہی نہیں کرتا اور پھر اس خیال سے دعا کرنا ہی چھوڑ دے۔ اور دعا کے قبول کرنے کا مطلب یہ ہے کہ بندے کی دعا رائیگاں نہیں جاتی بلکہ یا تو اللہ تعالیٰ اس کی آرزو کے مطابق اس کو دے دیتے ہیں یا اس کا نعم البدل اس کو مل جاتا ہے یا اس کی دعا آخرت کا ذخیرہ بن جاتی ہے۔

﴿فَلْيَسْتَجِيبُوا لِي﴾ پس چاہیے کہ وہ میرا حکم مانیں۔ اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ بندے اپنی دعاؤں کی قبولیت کی درخواست مجھ سے کریں اس لیے کہ ان کی دعاؤں کو قبول کرنے والا میرے سوا کون ہوسکتا ہے۔ اور ایک مطلب یہ ہے کہ جیسے میں ہر وقت ان بندوں کی دعا قبول کرتا ہوں تو بندوں کو بھی چاہیے کہ وہ میری عبادت کریں اور میرا حکم ماننے سے اعراض نہ کریں بلکہ وہ میرا حکم مانیں۔

﴿وَلْيُؤْمِنُوا بِي﴾ اور چاہیے کہ وہ مجھ پر ایمان لائیں ﴿لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُونَ﴾ تا کہ وہ سیدھی راہ پر آ جائیں۔ سیدھی راہ پر آدمی اس صورت میں آ سکتا ہے جب اللہ پر ایمان رکھے اور ہر مشکل میں اسی کو پکارے اور اسی کے احکام مان کر زندگی گزارے۔

روزہ کے بعض احکام

﴿أُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ إِلَىٰ نِسَآئِكُمْ﴾ حلال کر دیا گیا ہے تمھارے لیے روزوں کی راتوں میں اپنی بیویوں کے پاس جانا یعنی ان سے ہم بستری کرنا۔

اس رکوع کے شروع میں روزوں کے متعلق ذکر تھا پھر درمیان میں رمضان المبارک کی فضیلت اور اللہ تعالیٰ کی بڑائی بیان کرنے اور اس کا شکر ادا کرنے کا ذکر ہوا۔ اور پھر اللہ تعالیٰ سے متعلق عقیدہ بتلایا گیا کہ اللہ تعالیٰ قریب ہے اور ہر پکارنے والے کی پکار کو سنتا ہے اور قبول کرتا ہے۔ اب پھر اسی مضمون کو بیان کیا جارہا ہے جو رکوع کی ابتداء میں شروع کیا گیا تھا اور روزوں سے متعلق بعض اور احکام بیان کیے جارہے ہیں۔

ابتداء اسلام میں قانون یہ تھا کہ رمضان المبارک میں عشاء کی نماز کے بعد کھانا پینا اور بیوی سے ہم بستری کرنا منع تھا اسی طرح اگر کوئی شخص روزہ کے افطار کے وقت یا بعد میں سو گیا تو اس کے لیے بھی کھانا پینا اور بیوی کے پاس جانا منع تھا۔

مسند احمد میں روایت ہے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ لوگ جب تک سوتے نہیں تھے اس وقت تک کھاتے پیتے اور بیویوں سے ہم بستری کرتے تھے اور جب کوئی سو جاتا تو پھر یہ چیزیں اس کے لیے منع تھیں اسی دور میں انصار میں سے ایک آدمی حضرت حرمۃ بن قیس رضی اللہ عنہ جو کاشت کار تھے وہ کام کاج سے تھکے ماندے افطار کے وقت گھر آئے اور بیوی سے کہا کیا کچھ کھانے کو ہے؟ بیوی نے کہا تیار تو نہیں البتہ میں کچھ انتظام کرتی ہوں، جب بیوی کھانا تیار کر کے لائی تو دیکھا کہ ان کی آنکھ لگ گئی اور سو گئے، ان کو سویا ہوا دیکھ کر بیوی پریشان ہوگئی اور ان کو بغیر کچھ کھائے پیے اگلے دن کا روزہ رکھنا پڑا، جب آدھا دن گزرا تو کمزوری کی وجہ سے ان پر بے ہوشی طاری ہوگئی۔ اس کا ذکر حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کیا گیا تو پھر یہ آیت نازل ہوئی جس میں یہ حکم نازل ہوا کہ تم فجر طلوع ہونے تک کھا پی سکتے ہو۔

اور بخاری شریف میں حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب رمضان کے روزوں کا حکم ہوا تو سارا

رمضان بیویوں سے ہم بستری منع تھی مگر کچھ لوگ برداشت نہ کر سکے اور رات کو بیویوں کے پاس چلے گئے اور اپنے آپ سے خیانت کر بیٹھے تو پھر آیت کا یہ حصہ نازل ہوا: ﴿عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ﴾ اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ تم اپنی جانوں سے خیانت کرتے تھے مگر اللہ تعالیٰ نے تمھاری اس کارروائی کو معاف کر دیا اور تم پر رجوع فرمایا۔

﴿اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلٰى نِسَآئِكُمْ﴾ تمھارے لیے حلال کر دیا گیا ہے جماع کرنا اپنی عورتوں سے روزوں کی راتوں میں۔ ﴿الرَّفَثُ﴾ یہ کنایہ ہے جماع سے۔ ﴿هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَ اَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ﴾ وہ عورتیں تمھارے لیے لباس ہیں اور تم اُن کے لیے لباس ہو۔

میاں بیوی کے باہمی حقوق

عورت اور مرد کو ایک دوسرے کے لیے لباس قرار دیا کہ جس طرح لباس زینت کا باعث ہے اسی طرح یہ بھی ایک دوسرے کے لیے زینت کا باعث ہیں اور جس طرح لباس جسم کو چھپاتا ہے اسی طرح مرد وعورت بھی ایک دوسرے کے عیوب چھپاتے ہیں۔ اور جس طرح مرد لباس سے فائدہ اُٹھاتا ہے اور عورت لباس سے فائدہ اُٹھاتی ہے اور لباس اور جسم کے درمیان کوئی چیز حائل نہیں ہوتی اسی طرح میاں بیوی بھی آپس میں کسی حائل کے بغیر ایک دوسرے سے فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ اس لیے ان کو ایک دوسرے کے حق میں لباس کہا گیا ہے۔ اور اسی لیے منع کیا گیا کہ عورت اپنی سہیلیوں میں بیٹھ کر مرد کی راز کی باتیں بیان نہ کرے اور مرد کو بھی منع کیا گیا ہے کہ اپنے دوستوں میں اپنی بیوی کی راز کی باتیں ہرگز بیان نہ کرے۔

﴿عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَ عَفَا عَنْكُمْ﴾ اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ تم اپنے آپ کے ساتھ خیانت کرتے تھے پس اللہ تعالیٰ نے تم پر رجوع کیا اور تم سے درگزر کر دیا۔

رمضان المبارک میں رات کو اپنی بیویوں کے پاس جانے کی پابندی کے باوجود بعض لوگ برداشت نہ کر سکے اور بیویوں سے ہم بستری کر بیٹھے جن میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کے بارے میں روایات میں آتا ہے کہ یہ حضرات بھی تھے بے شک ان سے یہ لغزش ہوئی مگر جب اللہ تعالیٰ نے ان کو معاف کر دیا تو اب کوئی آدمی ان پر طعن کے طور پر ان کی غلطی کو بیان نہیں کر سکتا۔ ہاں اس قسم کے واقعات بیان کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم سے جہاں بھی غلطی ہوئی اور اس کا بیان قرآن کریم اور احادیث میں ہوا تو ساتھ ہی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو معاف کر دینے کا ذکر بھی ہوا ہے۔ اس لیے کوئی شخص بھی صحابہ رضی اللہ عنہم کی غلطیوں کو طعن کے طور پر بیان نہیں کر سکتا۔

﴿فَالْـٰٔنَ بَاشِرُوْهُنَّ وَ ابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ﴾ پس اب تم ان عورتوں سے مباشرت کر سکتے ہو اور تلاش کرو اس کو جو اللہ تعالیٰ نے تمھارے لیے لکھ دیا ہے۔ میاں بیوی کا مقصد ہم بستری سے صرف شہوت کا پورا کرنا ہی نہیں ہونا چاہیے بلکہ مقصد نسلِ انسانی کی بقاء اور اولاد ہونی چاہیے۔ ﴿وَ كُلُوْا وَ اشْرَبُوْا﴾ اور کھاؤ اور پیو ﴿حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ

﴿مِنَ الْفَجْرِ﴾ یہاں تک کہ ظاہر ہو جائے تمھارے لیے سفید دھاگا سیاہ دھاگے سے فجر سے یعنی فجر طلوع ہو جائے۔ ابتداء میں ﴿مِنَ الْفَجْرِ﴾ کا جملہ نازل نہیں ہوا تھا تو بخاری شریف وغیرہ کی روایات میں ہے کہ بعض حضرات نے اپنی ٹانگوں سے سفید اور کالا دھاگا باندھ رکھا تھا اور پھر رات کو دیکھتے رہتے کہ دونوں دھاگوں میں فرق ظاہر ہوتا ہے یا نہیں۔

قرآن فہمی کے لیے سنت سے رجوع ضروری ہے؟

حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی ﴿حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ﴾ تو میں نے اپنے سرہانے کے نیچے کالا اور سفید دھاگا رکھ لیا اور رات کو دیکھتا رہتا اور جب تک ان دونوں میں فرق نمایاں نہ ہوتا تو میں کھاتا پیتا رہتا، پھر میں نے اس کا ذکر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ تیرا سرہانا تو بڑا لمبا چوڑا ہے۔ ان دھاگوں سے مراد ظاہری دھاگے نہیں بلکہ کالے دھاگے سے مراد رات کی سیاہی اور سفید دھاگے سے مراد صبح کی سفیدی ہے۔ اور پھر ﴿مِنَ الْفَجْرِ﴾ کا جملہ نازل ہوا کہ رات کی تاریکی سے دن کی سفیدی واضح ہو جائے اور یہ صبح صادق کے طلوع کا وقت ہے۔ تو اب اس وقت تک کھانے پینے اور جماع کی اجازت ہے خواہ رمضان کا روزہ افطار کر کے آدمی سو جائے یا نہ سوئے ہر حال میں صبح صادق کے طلوع ہونے تک رمضان کی راتوں میں ان چیزوں کی اجازت ہے۔

آپ غور کریں کہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم عربی زبان کے ماہر تھے انھی کی زبان میں قرآن کریم نازل ہوا اور وہ براہِ راست حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے شاگرد تھے اس کے باوجود کئی مقامات میں وہ قرآنی آیات کا مفہوم از خود نہ سمجھ سکے جب تک کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کی وضاحت نہ فرمائی۔ تو آج کے دور میں غلام احمد پرویز اور اس جیسے دیگر ملحد لوگ کیسے دعویٰ کر سکتے ہیں کہ ہم احادیث کے بغیر ہی قرآن کریم کو سمجھ سکتے ہیں۔

﴿ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ﴾ پھر تم پورا کرو روزے کو رات تک۔ پہلے روزہ شروع ہونے کا وقت بتایا گیا کہ فجر طلوع ہونے تک کھا پی سکتے ہو اور جب فجر طلوع ہو جائے تو کھانا پینا منع ہے اس لیے کہ روزے کا وقت شروع ہو گیا۔ اب روزے کا آخر وقت بیان کیا جا رہا ہے کہ رات شروع ہوتے ہی روزے کا وقت ختم ہو جاتا ہے اور رات شروع ہوتی ہے جب سورج غروب ہو جائے۔

عورت گھر میں اعتکاف بیٹھے؟

﴿وَلَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَاَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ فِي الْمَسٰجِدِ﴾ اور تم ان عورتوں سے مباشرت نہ کرو جب کہ تم مساجد میں اعتکاف بیٹھے ہو۔ اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لیے نیت کے ساتھ مسجد میں ٹھہرنے کو اعتکاف کہتے ہیں، مرد حضرات مسجد میں اعتکاف بیٹھیں گے اور عورتوں کے لیے مسئلہ یہ ہے کہ اپنے گھر میں جگہ بنا کر اعتکاف بیٹھ سکتی ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مبارک دور میں حالات اچھے تھے۔ مردوں اور عورتوں میں اسلامی غیرت تھی اس لیے اس دور میں عورتیں مسجد میں اعتکاف بیٹھنے کی خواہش رکھتی تھیں اس لیے

بعض ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن نے مسجد میں خیمے لگائے مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرما دیا۔ (بخاری: جلد 1 صفحہ 273)

اور باجماعت نماز پڑھنے کے لیے مساجد میں جاتی تھیں اس کے باوجود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((وَ بُیُوْتُهُنَّ خَیْرٌ لَّهُنَّ)) کہ ان کے گھران کے حق میں زیادہ بہتر ہیں۔ بعد میں حالات درست نہ رہے، خواہشاتِ نفسانیہ کا غلبہ ہوگیا۔ مردوں اور عورتوں میں پہلے جیسی غیرت نہ رہی تو آج کے دور میں عورتوں کو گھر ہی میں اعتکاف کا کہا جائے گا۔ مساجد میں ان کا اعتکاف بیٹھنا فتنہ سے خالی نہیں ہے۔

مرد مساجد میں اعتکاف بیٹھتے ہیں مسجد کے اندر تو عورت سے جماع کیا ہی نہیں جا سکتا اور مسجد سے باہر معتکف صرف قضائے حاجت وغیرہ کے لیے ہی جا سکتا ہے اور حاجاتِ ضروریہ میں جماع شامل نہیں ہے اس لیے جماع کے لیے مسجد سے باہر بھی نہیں جا سکتا۔ اس لیے فرمایا کہ تم مسجد مین اعتکاف بیٹھے ہوئے ہو تو اپنی عورتوں سے ہم بستری نہیں کر سکتے نہ مسجد کے اندر اور نہ مسجد سے باہر۔ اعتکاف کی حالت میں عورتوں سے ہم بستری ممنوع ہے۔

﴿ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا ﴾ یہ اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ حدیں ہیں پس تم ان کے قریب نہ جاؤ۔ تفسیر بیضاوی وغیرہ میں ہے کہ منع کردہ احکام سے روکنے میں یہ کمال مبالغہ ہے کہ ان کے قریب بھی نہ جاؤ تا کہ غفلت سے کہیں ان حدوں کو توڑ ہی نہ دو۔ ﴿ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ﴾ اسی طرح کھول کھول کر بیان کرتا ہے اللہ تعالیٰ اپنی آیات کو لوگوں کے لیے تا کہ وہ پرہیزگار بن جائیں۔ جس طرح اللہ تعالیٰ نے یہ احکام بیان کیے ہیں اسی طرح اپنے دیگر احکام بھی صاف اور واضح طور پر بیان کرتا ہے تا کہ لوگ ان پر عمل کر کے پرہیزگار بن جائیں۔

رشوت ستانی کی مذمت

﴿ وَ لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ ﴾ اور نہ کھاؤ تم اپنے مال آپس میں باطل طریقے سے۔ پہلے اس کا ذکر تھا کہ اللہ تعالیٰ لوگوں کے لیے اپنی آیات کھول کھول کر بیان کرتا ہے تا کہ وہ پرہیزگار بن جائیں۔ تو پرہیزگار بننے کے لیے حرام سے بچنا بھی ضروری ہے اس لیے فرمایا کہ کسی بھی باطل اور ناجائز طریقہ سے ایک دوسرے کے مال نہ کھاؤ۔ چوری، ڈاکا، رشوت، خیانت اور سود وغیرہ سب باطل طریقے ہیں ان سے بچو۔

تفسیر ابن کثیر میں روایت ہے کہ حضرت سعد بن ابی وقاص نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ میرے لیے دعا کریں کہ میں مستجابُ الدعا بن جاؤں جب بھی اللہ تعالیٰ سے دعا کروں تو وہ میری دعا قبول کرے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر تم مستجاب الدعا بننا چاہتے ہو تو حرام کے قریب نہ جاؤ اس لیے کہ حرام کا ایک لقمہ کھانے سے آدمی چالیس دن دعا کی قبولیت سے محروم رہتا ہے۔

﴿ وَ تُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ ﴾ اور نہ لے جاؤ تم وہ مال حاکموں کے پاس تا کہ کھاؤ

تم لوگوں کے مال کا کچھ حصہ ناحق طور پر۔ عام طور پر دیکھنے میں آیا ہے اور اخبارات میں بھی اس قسم کی خبریں شائع ہوتی رہتی ہیں کہ ایک فریق نے ناجائز طور پر کسی کی جائیداد پر قبضہ کرنے کے لیے مقدمہ دائر کر دیا ہے اور وکیل کو فیس دے کر یا جج کو رشوت دے کر مقدمہ جیت لیا تو اس قسم کی حرکت سے منع فرمایا کہ ایسا مت کرو۔ ﴿بِالْاِثْمِ﴾ سے مراد ہے ناجائز طریقہ خواہ جھوٹی شہادت یا جھوٹی قسم کے طور پر ہو یا کسی اور طریقہ سے ﴿وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ﴾ حالانکہ تم جانتے ہو کہ تمھاری یہ کارروائی ظالمانہ ہے۔

اگر حاکم تمھاری اس غلط کارروائی میں شریک ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم رشوت خور حاکموں کو جانتے ہوئے بھی انھی کے پاس ایسے مقدمات لے کر جاتے ہو تا کہ لوگوں کے مال کا کچھ حصہ کھا لو۔ اور اگر حاکم تمھاری اس کارروائی میں شریک نہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم تو جانتے ہو کہ تم نے دعویٰ غلط اور ناجائز دائر کیا ہے اور حاکم تو بے خبر ہے اور اس نے تو ظاہر کے لحاظ سے فیصلہ دینا ہے اور تم جھوٹی شہادت یا جھوٹی قسم کے ساتھ اپنے دعویٰ کو حاکم کے سامنے ثابت کر دو تو اس ساری کارروائی کا وبال تم پر ہی پڑے گا اس لیے کہ تم جانتے ہو۔

﴿یَسْـَٔلُوْنَكَ﴾ سوال کرتے ہیں تجھ سے ﴿عَنِ الْاَهِلَّةِ﴾ چاندوں کے بارے میں ﴿قُلْ﴾ کہہ دے ﴿هِیَ﴾ یہ جو چاند ہیں ﴿مَوَاقِیْتُ لِلنَّاسِ﴾ لوگوں کے وقت پہچاننے کے لیے ہیں ﴿وَالْحَجِّ﴾ اور حج کے لیے ﴿وَلَیْسَ الْبِرُّ﴾ اور نہیں ہے نیکی ﴿بِاَنْ تَاْتُوا الْبُیُوْتَ﴾ یہ کہ تم آؤ گھروں میں ﴿مِنْ ظُهُوْرِهَا﴾ ان کے عقب سے نقب لگا کر ﴿وَلٰكِنَّ الْبِرَّ﴾ اور لیکن نیکی ﴿مَنِ اتَّقٰى﴾ اس شخص کی ہے جو ڈرتا رہا ﴿وَاْتُوا الْبُیُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا﴾ اور آؤ تم اپنے گھروں میں ان کے دروازوں سے ﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ﴾ اور اللہ تعالیٰ سے ڈرو ﴿لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ﴾ تا کہ تم فلاح پا جاؤ ﴿وَقَاتِلُوْا﴾ اور لڑو ﴿فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ﴾ اللہ تعالیٰ کے راستے میں ﴿الَّذِیْنَ﴾ ان لوگوں سے ﴿یُقَاتِلُوْنَكُمْ﴾ جو تمھارے ساتھ لڑتے ہیں ﴿وَلَا تَعْتَدُوْا﴾ اور تم تجاوز نہ کرو ﴿اِنَّ اللّٰهَ﴾ بے شک اللہ تعالیٰ ﴿لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ﴾ نہیں محبت کرتا تجاوز کرنے والوں سے ﴿وَاقْتُلُوْهُمْ﴾ اور قتل کرو تم ان کو ﴿حَیْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ﴾ جس جگہ تم ان کو پاؤ ﴿وَاَخْرِجُوْهُمْ﴾ اور نکالو تم ان کو ﴿مِّنْ حَیْثُ اَخْرَجُوْكُمْ﴾ جس جگہ سے اُنھوں نے تمھیں نکالا ہے ﴿وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ﴾ اور فتنہ زیادہ سخت ہے قتل سے ﴿وَلَا تُقٰتِلُوْهُمْ﴾ اور نہ لڑو تم ان سے ﴿عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ﴾ مسجد حرام کے پاس ﴿حَتّٰى یُقٰتِلُوْكُمْ فِیْهِ﴾ یہاں تک کہ وہ تم سے لڑیں اس میں ﴿فَاِنْ قٰتَلُوْكُمْ﴾ پس اگر وہ لڑیں تمھارے ساتھ ﴿فَاقْتُلُوْهُمْ﴾ پس تم ان کو قتل کرو ﴿كَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِیْنَ﴾ اسی طرح بدلہ ہے کافروں کا ﴿فَاِنِ انْتَهَوْا﴾ پس اگر وہ کفر اور شرک سے باز آجائیں ﴿فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ﴾ پس بے شک

اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے ﴿وَقٰتِلُوْهُمْ﴾ اور لڑو تم ان کے ساتھ ﴿حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ﴾ یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے ﴿وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ﴾ اور ہو جائے دین اللہ تعالیٰ کا ﴿فَاِنِ انْتَهَوْا﴾ پس اگر وہ باز آ جائیں ﴿فَلَا عُدْوَانَ﴾ پس نہیں ہے زیادتی ﴿اِلَّا عَلَى الظّٰلِمِيْنَ﴾ مگر ظالموں پر۔

نظامِ شمسی اور قمری ؟

دنیا میں دو قسم کے حساب چلتے ہیں۔ ایک شمسی اعتبار سے، دوسرا قمری اعتبار سے۔ جو حساب قمری اعتبار سے ہوتا ہے وہ جب نیا چاند نظر آتا مہینہ شروع ہو جاتا ہے اور جب چاند ختم ہو جاتا ہے مہینہ ختم ہو جاتا ہے آگے نیا مہینہ شروع ہو جاتا ہے۔ اور دوسرا شمسی اعتبار سے ہے جیسے: جنوری، فروری، مارچ وغیرہ لوگ اس سے حساب کرتے ہیں۔ اور ہندوؤں نے اپنے الگ مہینے بنائے ہوئے تھے، جیٹھ ہاڑ وغیرہ اور ان کا بھی تعلق سورج کے ساتھ ہے۔ چاند جب پہلی رات نظر آتا ہے تو پہلی رات کے چاند کو ہلال کہتے ہیں اور دوسرے دن کے چاند کو قمر کہتے ہیں اور جب تیرھویں، چودھویں، پندرھویں کا ہو تو اس کو بدر کہتے ہیں۔ ان تین راتوں کو چاند بڑا واضح ہوتا ہے اور اپنے عروج پر پہنچا ہوتا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے لوگوں نے سوال کیا کہ حضرت یہ بتاؤ کہ چاند کبھی چھوٹا ہوتا ہے کبھی بڑا ہوتا ہے، کبھی طلوع ہوتا ہے کبھی غروب ہوتا ہے۔ یہ کیا چیز ہے؟ تو اس کے بارے میں رب تعالیٰ فرماتے ہیں ﴿يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ﴾ اَھِلَّۃٌ ھِلَال کی جمع ہے۔ اور ھِلال کے معنیٰ ہیں چاند۔ یہ تم سے سوال کرتے ہیں ان چاندوں کے بارے میں کہ ہر مہینے چاند چڑھتا ہے کبھی بڑا کبھی چھوٹا ہوتا ہے یہ کیا قصہ ہے؟ ﴿قُلْ هِيَ مَوَاقِيْتُ﴾ مواقیت میقات کی جمع ہے اور میقات اس آلہ کو کہتے ہیں جس سے وقت کی شناخت ہو۔ یہ وقت کی شناخت کے آلات ہیں یعنی ان کے ذریعے سے وقت کی شناخت ہوتی ہے ﴿لِلنَّاسِ﴾ لوگوں کے واسطے۔ ان کے ذریعے لوگ عبادات کے اوقات پہچانتے ہیں۔ مثلاً: روزہ ہے وہ بھی اس سے وابستہ ہے اور حج کا ذکر تو صراحتاً موجود ہے ﴿وَالْحَجِّ﴾ اور حج بھی اس کے ساتھ وابستہ ہے۔ اسی طرح عورتوں کی جو عدت ہے وہ بھی چاند سے وابستہ ہے چاند کے حساب سے ہی لوگ اپنا لینا دینا کرتے ہیں۔

زکوٰۃ قمری حساب سے دینی چاہیے ؟

اسی طرح زکوٰۃ کی ادائیگی بھی چاند سے وابستہ ہے بارہا میں نے یہ مسئلہ عرض کیا ہے کہ تم اپنی زکوٰۃ کا حساب چاند کے سال کے ساتھ کرو کیوں کہ جو دوسرا حساب ہے اس لحاظ سے پینتیس چھتیس سالوں کے بعد چاند کا ایک سال بڑھ جاتا ہے۔ تو ستر بہتر سالوں میں چاند کے دو سال بڑھ جائیں گے اور شمسی کم ہو جائیں گے۔ کئی اللہ تعالیٰ کے نیک بندے معمر ایسے ہیں کہ ان کی عمر نوے نوے سال ہے اور وہ باقاعدہ زکوٰۃ نکالتے ہیں۔ پس اگر وہ چاند کے اعتبار سے حساب کریں گے تو سال ضائع نہیں

ہوگا ورنہ تقریباً چھتیس سال کے بعد چاند کے اعتبار سے ایک سال بڑھ جاتا ہے تو ایک سال کی زکوٰۃ رہ جائے گی لہٰذا زکوٰۃ چاند کے سال کے حساب سے دینی چاہیے۔

مثال کے طور پر یکم رمضان کو تمھارا سال ختم ہوتا ہے یا یکم شوال کو ختم ہوتا ہے تو ہر سال اس وقت ادا کر دیا کرو کیوں کہ اللہ تعالیٰ سب کو مال ایک ہی مہینے میں نہیں دیتا کسی کو کسی مہینے ملا، کسی کو کسی مہینے ملا۔ تو جس کو جس مہینے میں ملا ہے وہ اسی مہینے میں اگلے سال صاحبِ نصاب ہوگا اور اسی مہینے کے اعتبار سے زکوٰۃ نکالے گا۔ اس واسطے زکوٰۃ کے لیے شریعت نے کوئی مہینہ مقرر نہیں کیا۔ اس واسطے کہ مال کے ہاتھ لگنے کا کوئی وقت مقرر نہیں ہے۔ اس لیے مسئلہ یاد رکھو کہ جب اتنا مال تمھارے پاس آجائے کہ جس کی مالیت ساڑھے باون تولے چاندی بنتی ہو جو اس وقت تقریباً ساڑھے چار ہزار بنتی ہے اور اس شخص پر قرض بھی نہ ہو اور گھر کی ضرورتیں بھی پوری ہیں۔ اب یہ شخص صاحبِ نصاب ہوگیا اس کو چاہیے کہ وہ تاریخ نوٹ کرے کہ فلاں مہینے کی فلاں تاریخ کو میرے پاس ساڑھے باون تولے چاندی کی مالیت کی رقم ہوگئی ہے تو آئندہ سال اسی تاریخ کو سال مکمل ہوگا بس اسی وقت زکوٰۃ ادا کردے۔ تو زکوٰۃ ادا کرنے کے لیے کوئی مہینہ شریعت کی طرف سے مقرر نہیں ہے، نہ رمضان کا نہ رجب کا۔

تو فرمایا یہ آپ سے سوال کرتے ہیں ﴿عَنِ الْاَهِلَّةِ﴾ چاندوں کے بارے میں کہ یہ کبھی چھوٹا ہوتا ہے کبھی بڑا ہوتا ہے۔ یہ قصہ کیا ہے؟ یہ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ ﴿قُلْ هِيَ مَوَاقِيْتُ﴾ آپ فرمادیں کہ یہ وقت کی شناخت کے آلے ہیں ﴿لِلنَّاسِ﴾ لوگوں کے لیے۔ اور حج بھی اسی کے ساتھ وابستہ ہے کہ جب ذوالحجہ کا چاند ہو تو حج کے دن آگئے۔ نویں تاریخ کو عرفات میں پہنچنا ہے۔ دسویں، گیارھویں، بارھویں تاریخ کو رکن کا طواف کرنا ہے۔ طوافِ افاضہ، طوافِ زیارت کرنا ہے۔ تو یہ چیزیں چاند کے ساتھ وابستہ ہیں۔ باقی جو نظام شمسی ہے اس کی تاریخوں کا علم تو صرف ان کو یاد رہنا ہے جو پکے حسابی ہیں جن لوگوں نے گھڑیاں رکھی ہوتی ہیں ان سے وقت معلوم کرتے ہیں اور عام لوگ تو تاریخ کے لیے کیلنڈر اور ڈائریاں دیکھتے ہیں یا گھڑی پر دیکھتے ہیں کہ آج کیا تاریخ ہے؟ اور چاند کے اعتبار سے حساب تو ہر آدمی سمجھ سکتا ہے برابر ہے کہ پڑھا ہوا ہے یا ان پڑھ ہے۔

زمانہ جاہلیت کی ایک رسم

پھر فرمایا ﴿وَلَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا﴾ زمانہ جاہلیت میں لوگوں کا یہ دستور تھا کہ جب احرام باندھ کر گھر سے چل پڑے اور رقم بھول گئی یا کوئی ضروری چیز، کپڑا وغیرہ بھول گئے اور کچھ سفر کرنے کے بعد یاد آیا کہ فلاں ضروری چیز بھول آیا ہوں یاد آگئی اور لینے کے لیے واپس آتے اور احرام بھی باندھا ہوتا تو اب وہ گھر میں دروازے سے داخل نہیں ہوتے تھے کہتے کہ ہم نے احرام باندھنے کے بعد ابھی تک طواف نہیں کیا تو ان دروازوں سے ہم کس طرح داخل ہوں؟ تو پھر وہ اس طرح کرتے کہ چوروں کی طرح عقبی جانب سے دیوار توڑ کر داخل ہوتے تھے اور اپنا سامان لے لیتے اور چلے جاتے تھے۔

اب دیکھو! رب نے عقل دی ہے آدمی سوچے کہ اس کا فائدہ کیا ہے؟ بھئی! تم انسان ہو بھول گئے ہو تو دروازے سے

داخل ہوا پنی چیز اُٹھالو اور سفر پر روانہ ہو جاؤ یہ کیا مسئلہ ہے کہ میں نے احرام باندھا ہے اور ابھی تک طواف نہیں کیا لہٰذا دروازے سے اگر داخل ہوا تو گناہ گار ہو جاؤں گا اور اگر کوئی دروازے سے داخل ہوتا تو اس کو وہ بُرا سمجھتے تھے۔

چنانچہ اسی طرح کا ایک واقعہ پیش آیا کہ ایک صحابی کوئی چیز بھول گئے کچھ سفر کرنے کے بعد یاد آیا کہ میں تو بڑی اہم چیز گھر چھوڑ آیا ہوں اور تھے بھی قافلے کے ساتھ اس لیے جلدی جلدی آئے کہ قافلے سے رہ نہ جاؤں اور دروازے سے داخل ہوئے ، اپنا سامان لیا اور جلدی سے واپس چلے گئے قافلے کے ساتھ مل گئے محلے والوں نے شور ڈالا کہ دیکھو عقبی جانب سے نہیں آیا، دروازے سے آیا ہے اور دروازے سے نکل گیا ہے۔ تو اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿وَلَيْسَ الْبِرُّ﴾ اور نہیں ہے نیکی ﴿بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا﴾ یہ کہ تم گھر میں عقبی جانب سے سوراخ کر کے آؤ ﴿وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى﴾ لیکن نیکی ان کی ہے جو رب سے ڈرتے ہیں کیوں کہ نیکی رب تعالیٰ کے حکم ماننے میں ہے، رسم ورواج میں کوئی نیکی نہیں ہے ﴿وَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا﴾ اپنے گھروں میں دروازوں سے آؤ ﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ﴾ اور اللہ تعالیٰ سے ڈرو ﴿لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ﴾ تاکہ تم کامیابی اور فلاح پاؤ۔ اللہ تعالیٰ نے جو احکام دیئے ہیں ان پر عمل کرو جو کہ عین فطرت کے مطابق ہیں۔

تذکرہ صلح حدیبیہ اور لڑائی کی مشروط اجازت

آگے دوسرا مسئلہ ہے وہ یہ کہ ہجرت کے چھٹے سال آنحضرت ﷺ کے ساتھ تقریباً پندرہ سو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تھے، مکہ مکرمہ عمرہ کرنے کے لیے آئے اور آپ ﷺ نے چلنے سے پہلے ایک خواب بیان فرمایا تھا جس کا ذکر قرآن پاک میں آتا ہے، وہ خواب یہ تھا کہ آپ ﷺ نے دیکھا کہ آپ ﷺ مسجد حرام میں داخل ہوئے ہیں، بیت اللہ کا طواف اور صفا مروہ کی سعی کی ہے اور پھر کچھ لوگ سر منڈار ہے ہیں اور کچھ بال کتروار ہے ہیں، جب آنحضرت ﷺ نے اس خواب کا تذکرہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے کیا تو وہ بیت اللہ شریف کی محبت میں بے تاب ہو گئے اور اُنھوں نے یہی سمجھا کہ عن قریب بیت اللہ شریف کی زیارت نصیب ہوگی اور ہم اسی سال عمرہ کریں گے کیوں کہ حج ابھی فرض نہیں ہوا تھا۔ کیوں کہ یہ بات چھ ہجری کی ہے اور اس وقت عمرہ ہی کیا جاتا تھا۔ اس سے پہلے مسلمانوں کی مکہ والوں سے بدر، اُحد اور خندق کی لڑائیاں ہو چکی تھیں۔ بدر کی لڑائی ہجرت کے دوسرے سال اور اُحد کی لڑائی تیسرے سال اور خندق کی لڑائی ہجرت کے پانچویں سال پیش آئی اور اسی کو غزوۂ احزاب بھی کہا جاتا ہے۔ اس لیے کہ مشرکین نے کئی قبائل کو اکٹھا کر کے اپنی قوت جمع کر کے مدینہ طیبہ پر حملے کا پروگرام بنایا تھا۔

جب آنحضرت ﷺ اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ عمرہ کے لیے روانہ ہوئے اور حدیبیہ کے مقام پر پہنچے تو مشرکین نے وہاں مسلمانوں کو روک لیا اور کہا کہ ہم آپ لوگوں کو مکہ میں داخل نہیں ہونے دیں گے۔ حدیبیہ ایک کنواں تھا اور اسی کی وجہ سے وہاں کے گاؤں کا نام حدیبیہ مشہور ہو گیا اور یہ مکہ سے تقریباً آٹھ نو میل کے فاصلہ پر ہے، آنحضرت ﷺ اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ حدیبیہ کے مقام پر ٹھہرے اور وہاں سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو نمائندہ بنا کر بھیجا کہ مکہ والوں کو یقین دلائیں کہ ہم صرف عمرہ

کے لیے آئے ہیں لڑائی وغیرہ کا کوئی ارادہ نہیں ہے جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ مکہ پہنچے تو مشرکین نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو روک لیا اور یہ خبر مشہور کر دی کہ عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کر دیا گیا ہے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ خبر ملی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم سے جو وہاں موجود تھے درخت کے نیچے بیعت لی جس کو بیعتِ رضوان کہتے ہیں اور اس کا ذکر سورۃ الفتح میں موجود ہے۔

پھر بعد میں معلوم ہوا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل کی خبر غلط ہے اور وہاں کفار کی جانب سے سہیل بن عمرو نے صلح کی شرائط آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے طے کیں اور صلح ہو گئی۔ ان شرائط میں سے ایک شرط یہ تھی کہ اب مسلمان واپس چلے جائیں اور آئندہ سال عمرہ کے لیے آئیں اور صرف تین دن مکہ میں رہ سکیں گے اور مسلح ہو کر نہیں آئیں گے۔ مسلمانوں کو وقتی طور پر اس صلح کی وجہ سے پریشانی ہوئی مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو تسلی دی اور پھر اس صلح کی وجہ سے مسلمانوں کو بالآخر جو نتائج حاصل ہوئے وہ مسلمانوں کے حق میں بہت ہی بہتر تھے۔

جب صلح کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے واپسی کا حکم دیا تو بعض صحابہ کو اشکال ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تو خواب بیان فرمایا تھا کہ ہم نے طواف کیا ہے اور مکہ میں داخل ہوئے ہیں حالانکہ ہم تو مکہ میں داخل ہوئے بغیر ہی واپس جا رہے ہیں، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کیا میں نے یہ کہا تھا کہ ہم اسی سال مکہ میں داخل ہوں گے اور طواف کریں گے؟ تو صحابہ رضی اللہ عنہم نے کہا کہ اسی سال کے بارے میں تو نہیں فرمایا تھا۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ ضرور وہ دن آئے گا جب خواب پورا ہو گا اور ہم مکہ میں داخل ہو کر طواف کریں گے۔

جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم کو لے کر واپس تشریف لے گئے اور آئندہ سال عمرہ کی تیاری شروع کی تو بعض صحابہ رضی اللہ عنہم کو اشکال ہوا کہ ہو سکتا ہے اس دفعہ بھی مشرکین ہمیں مکہ میں داخل ہونے سے روکیں اور اپنے عہد کو پورا نہ کریں اور لڑائی پر آمادہ ہو جائیں تو ہم کیا کریں گے؟ اس لیے کہ ہم تو احرام کی حالت میں ہوں گے اور احرام کی حالت میں لڑائی ممنوع ہے اور پھر یہ اشہر الحرم، حرمت والے مہینوں میں سے ذوالقعدہ حرمت والا مہینہ ہے اور اس وقت حرمت والے مہینوں میں لڑائی منع تھی۔ اور پھر یہ بھی کہ مکہ مکرمہ حرم میں ہے اور حرم کے احاطہ میں لڑائی منع ہے اور کافر تو اس کی پروا نہیں کریں گے مگر ہم کیا کریں گے؟ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں:

﴿وَ قَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَكُمْ﴾ اور تم اللہ کے راستے میں ان سے لڑو جو تمھارے ساتھ لڑتے ہیں ﴿وَ لَا تَعْتَدُوْا﴾ اور تم زیادتی نہ کرو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر وہ تمھارے ساتھ نہیں لڑتے بلکہ معاہدہ کی پابندی کرتے ہیں تو تم زیادتی مت کرو۔ اسی طرح جو لوگ تمھارے ساتھ نہیں لڑتے بوڑھے، بچے، عورتیں اور وہ لوگ جو تمھارے سامنے اپنے اسلام کا اظہار کریں ان کو مت قتل کرو اس لیے کہ یہ تمھاری جانب سے زیادتی ہو گی ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ﴾ بے شک اللہ تعالیٰ حد سے تجاوز کرنے والوں اور زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

﴿وَ اقْتُلُوْهُمْ حَیْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ وَ اَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ حَیْثُ اَخْرَجُوْكُمْ﴾ اور تم جہاں بھی ان کو پاؤ ان کو قتل کرو اور ان کو وہاں

سے نکالو جہاں سے اُنھوں نے تمھیں نکالا ہے۔ اس میں مسلمانوں کے اشکال کو رفع کر دیا گیا کہ اگر کفار تمھارے ساتھ کیے گئے معاہدہ کی پابندی نہ کریں اور لڑائی پر آمادہ ہو جائیں تو تمھیں کوئی فکر نہیں کرنی چاہیے کہ حرم کا رقبہ ہے یا حرمت والا مہینہ ہے اور احرام کی حالت ہے بلکہ تمھیں اجازت ہے کہ ایسی حالت میں تم ان کو جہاں پاؤ قتل کرو خواہ حرم میں ہوں یا حرم سے باہر ہوں ہر حالت میں اجازت ہے۔ اور اُنھوں نے تمھیں مکہ سے نکالا ایسے حالات پیدا کر دیئے کہ تم ہجرت پر مجبور ہو گئے اس لیے تمھیں بھی اجازت ہے کہ ان کو وہاں سے نکالو جہاں سے اُنھوں نے تمھیں نکالا ہے۔

فتنہ سے مراد شرک

﴿وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ﴾ اور فتنہ تو قتل سے بھی زیادہ سخت ہے۔ تفسیر روح المعانی اور مظہری وغیرہ میں ہے کہ فتنہ سے مراد شرک ہے یعنی جب وہ حرم کے رقبہ میں بیت اللہ کے اردگرد شرک سے باز نہیں آتے تو ان کا جرم زیادہ ہے اور ان کو قتل کرنا تو اس کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں اس لیے تمھیں ان سے لڑنے میں کوئی تامل نہیں ہونا چاہیے۔

﴿وَلَا تُقٰتِلُوْهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰى يُقٰتِلُوْكُمْ فِيْهِ﴾ اور نہ لڑو تم ان کے ساتھ مسجد حرام کے پاس یہاں تک کہ وہ لڑیں تمھارے ساتھ اس میں۔

مومنوں کو منع کیا گیا کہ مسجد حرام کے پاس کفار سے لڑنے میں ابتدا نہ کرو البتہ اگر وہ حرم کے رقبہ کی پروا کیے بغیر تم سے لڑیں تو تم بھی ان کے ساتھ لڑ سکتے ہو ﴿فَاِنْ قٰتَلُوْكُمْ فَاقْتُلُوْهُمْ﴾ پس اگر وہ تمھارے ساتھ لڑیں تو تم بھی ان کے ساتھ لڑو ﴿كَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ﴾ اسی طرح ہے سزا کافروں کی اس لیے کہ کافر سزا کے بغیر باز آنے والے نہیں ہیں۔

﴿فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾ پس اگر وہ باز آ جائیں تو بے شک اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے۔ باز آنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ کفر و شرک سے توبہ کر لیں اور اپنے سابق گناہوں کی معافی مانگ لیں۔

﴿وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ﴾ اور ان کافروں سے لڑائی کرو یہاں تک کہ کوئی فتنہ باقی نہ رہے اور دین خالص اللہ ہی کے لیے ہو جائے۔ کفر و شرک، ظلم و زیادتی یہ فتنے ہیں ان کو مٹا کر دینِ اسلام کو بلند کرنا مسلمانوں کی ذمہ داری ہے۔ اس لیے فرمایا کہ تم کافروں سے اس وقت تک لڑتے رہو جب تک فتنہ ختم نہیں ہو جاتا اور دین خالص اللہ تعالیٰ کے لیے نہیں ہو جاتا۔

عدوان کا معنیٰ علامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک

﴿فَاِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَى الظّٰلِمِيْنَ﴾ پس اگر وہ باز آ جائیں تو کوئی زیادتی نہیں ہے مگر ظالموں پر، ﴿عُدْوَانَ﴾ کا معنیٰ علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے کیا ہے "قتل کی سزا"۔ تو اس لحاظ سے مطلب یہ ہوگا کہ اگر یہ لوگ کفر و شرک اور مسلمانوں سے لڑائی وغیرہ سے باز آ جائیں تو ان کو قتل کی سزا نہ دو اس لیے کہ قتل کی سزا تو ان لوگوں پر ہے جو ظالم ہیں اور اپنے کفر و شرک

اور دیگر بُرے عقائد پر ڈٹے ہوئے ہیں اور جب یہ لوگ ان باتوں سے باز آجائیں تو ظالم نہ رہے اس لیے ان کو جہاد کے ذریعہ سے قتل کی سزا بھی نہ دو۔

﴿اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ﴾ عزت والا مہینہ ﴿بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ﴾ عزت والے مہینہ کے بدلے ہے ﴿وَالْحُرُمٰتُ﴾ اور ساری عزت والی چیزیں ﴿قِصَاصٌ﴾ بدلے کی چیزیں ہیں ﴿فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ﴾ پس جو شخص زیادتی کرے تم پر ﴿فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ﴾ پس تم بھی اُس پر زیادتی کرو ﴿بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ﴾ جیسی کہ اُس نے زیادتی کی ہے تم پر ﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ﴾ اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو ﴿وَاعْلَمُوْٓا﴾ اور جان لو ﴿اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ﴾ کہ بے شک اللہ تعالیٰ پرہیز گاروں کے ساتھ ہے ﴿وَاَنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ اور تم خرچ کرو اللہ کے راستے میں ﴿وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ﴾ اور نہ ڈالو تم اپنے ہاتھوں کو ہلاکت میں ﴿وَاَحْسِنُوْا﴾ اور تم نیکی کرو ﴿اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ﴾ بے شک اللہ تعالیٰ پسند کرتا ہے نیکی کرنے والوں کو ﴿وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ﴾ اور تم پورا کرو حج اور عمرہ کو اللہ تعالیٰ کے لیے ﴿فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ﴾ پس اگر تم روک دیئے گئے ﴿فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ﴾ تو جو آسان ہو قربانی میں سے وہ کرو ﴿وَلَا تَحْلِقُوْا رُءُوْسَكُمْ﴾ اور نہ منڈاؤ تم اپنے سروں کو ﴿حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهٗ﴾ یہاں تک کہ پہنچ جائے قربانی کا جانور اپنے حلال ہونے کی جگہ کو ﴿فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا﴾ پس جو شخص تم میں سے بیمار ہو ﴿اَوْ بِهٖٓ اَذًى مِّنْ رَّاْسِهٖ﴾ یا اس کو تکلیف ہو اپنے سر میں ﴿فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ﴾ تو فدیہ لازم ہے روزوں سے ﴿اَوْ صَدَقَةٍ﴾ یا صدقہ ہے ﴿اَوْ نُسُكٍ﴾ یا قربانی ہے ﴿فَاِذَآ اَمِنْتُمْ﴾ پس جب تم امن پالو ﴿فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ اِلَى الْحَجِّ﴾ تو جس نے فائدہ اُٹھایا عمرہ کر کے حج کے ساتھ ﴿فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ﴾ تو جو آسان ہو قربانی میں سے وہ کرے ﴿فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ﴾ پس جو شخص قربانی کا جانور نہ پائے ﴿فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ فِي الْحَجِّ﴾ تو تین دنوں کے روزے لازم ہیں حج کے دنوں میں ﴿وَسَبْعَةٍ اِذَا رَجَعْتُمْ﴾ اور سات روزے جب تم واپس لوٹ آؤ ﴿تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ﴾ یہ دس ہو گئے پورے ﴿ذٰلِكَ﴾ یہ حکم ﴿لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ اَهْلُهٗ﴾ اس کے لیے ہے کہ نہ رہتے ہوں اس کے گھر والے ﴿حَاضِرِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ﴾ مسجد حرام کے قریب ﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ﴾ اور تم ڈرتے رہو اللہ تعالیٰ سے ﴿وَاعْلَمُوْٓا﴾ اور جان لو ﴿اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ﴾ کہ بے شک اللہ تعالیٰ سخت سزا دینے والا ہے۔

ربطِ آیات

اس سے پہلے جہاد کا حکم تھا ﴿وَ قَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ کہ اللہ کے راستے میں جہاد کرو۔ اب ان آیات میں بھی جہاد کا ذکر ہے۔

ہجرت کے چھٹے سال آنحضرت ﷺ تقریباً چودہ سو (۱۴۰۰) صحابہ کے ہمراہ عمرہ کے لیے تشریف لے گئے، مشرکین مکہ کو جب یہ معلوم ہوا تو اُنھوں نے آپ ﷺ کو مکہ میں داخل ہونے سے روک دیا، اس موقع پر آپ ﷺ حدیبیہ کے مقام پر پہنچ چکے تھے اور یہ حرمت والے مہینوں میں سے ذی قعدہ کا مہینہ تھا، مشرکینِ مکہ اس کے دعوے دار تھے کہ ہم حرمِ مکہ اور حرمت والے مہینوں کا احترام کرنے والے ہیں اور ان حرمت والے مہینوں ذوالقعدہ، ذوالحجہ، محرم اور رجب میں لڑائی کو جائز نہیں سمجھتے مگر اس دعویٰ کے باوجود اُنھوں نے آنحضرت ﷺ کو حرمت والے مہینہ میں مکہ میں داخل ہونے سے روک دیا اور اس کے لیے لڑنے مرنے پر تیار ہوگئے۔ آنحضرت ﷺ نے صورتِ حال کا جائزہ لے کر مشرکینِ مکہ کے ساتھ معاہدہ کیا اس کو صلح حدیبیہ کہا جاتا ہے۔ اس معاہدے کی شرائط میں سے ایک شرط یہ تھی کہ اب آپ ﷺ عمرہ کیے بغیر واپس چلے جائیں اور آئندہ سال آپ ﷺ آکر عمرہ کرلیں مگر تین دن سے زیادہ ٹھہرنے کی اجازت نہ ہوگی۔ معاہدہ مکمل ہونے کے بعد آنحضرت ﷺ نے صحابہ رضی اللہ عنہم کو واپسی کا حکم دیا اور اسی حدیبیہ کے مقام پر احرام کھولے اور ساتھ لائے گئے ہدی کے جانوروں کو ذبح کرنے کا حکم دیا اور واپس مدینہ منورہ تشریف لے آئے۔

پھر جب اگلے سال اسی چھوڑے جانے والے عمرہ کی قضاء کے لیے مکہ مکرمہ جانے کا آپ ﷺ نے ارادہ فرمایا تو بعض صحابہ کے دل میں یہ خیال آیا کہ ہوسکتا ہے کہ مشرکین اپنے کیے ہوئے معاہدہ کا لحاظ نہ رکھیں اور ہمیں مکہ مکرمہ میں داخل ہونے سے روک دیں تو ہم کیا کریں گے؟ اللہ تعالیٰ نے ان کو تسلی دی اور فرمایا کہ اگر مشرکین ان حرمت والے مہینوں میں تمھارے ساتھ لڑیں تو تمھیں بھی اپنے دفاع میں ان سے لڑنے کی اجازت ہے۔

حرمت کے مہینوں میں لڑائی

تفسیر کبیر اور مدارک وغیرہ میں مذکور ہے کہ حرمت والے مہینوں میں لڑائی کی پہلے اجازت نہیں تھی مگر بعد میں اس کی اجازت دے دی گئی اس لیے اب ان مہینوں میں بھی کافروں کے ساتھ لڑائی جائز ہے۔

فرمایا ﴿اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ﴾ عزت والا مہینہ عزت والے مہینہ کے بدلے ہے۔ یعنی اگر گزشتہ سال مشرکین نے عزت والے مہینے کا کچھ لحاظ نہیں رکھا اور نہ ہی اُنھوں نے تمھارے احرام اور حرمِ مکہ کا لحاظ رکھا اور تمھارے ساتھ لڑنے مرنے کے لیے تیار ہوگئے تو اس وقت ان سے درگزر کیا گیا مگر اب ایسا نہیں ہے بلکہ اگر وہ تمھارا راستہ روکیں تو ان کا مقابلہ کرو۔ اُنھوں نے حرمت والے مہینے کی پروا نہیں کی تو جب تم ان کا مقابلہ کروگے تو تمھیں بھی اس کارروائی پر کوئی گناہ نہیں

ہوگا۔اس لیے کہ گزشتہ سال کا عزت والا مہینہ اور اس سال کا عزت والا مہینہ عزت واحترام میں برابر ہیں۔حرمت والے مہینہ کی عزت کا خیال رکھنے کے ساتھ ساتھ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو یہ خیال بھی ہوا کہ احرام کی حالت ہوگی اور حرمِ مکہ ہوگا اور مشرکین کے ساتھ لڑائی کی صورت میں ان کی بے حرمتی بھی ہوگی تو فرمایا:﴿وَالْحُرُمٰتُ قِصَاصٌ﴾ کہ حرمت والی تمام چیزیں بدلے کی چیزیں ہیں کہ اگر کافر ان کی عزت کا لحاظ نہیں رکھتے تو بدلے میں تم بھی اس کی پروانہ کرو بلکہ ان کو سزا دینے کے لیے ان کا مقابلہ کرو۔

آگے فرمایا:﴿فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ﴾ پس حرم کے احاطہ میں حرمت والے مہینہ میں جب کہ تم احرام کی حالت میں ہو اس حال میں جو شخص تم پر زیادتی کرے اور تم سے لڑائی پر آمادہ ہو ﴿فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ﴾ تو تم بھی اُس پر اتنی ہی زیادتی کرو جتنی اُس نے تم پر کی ہے وَاتَّقُوا اللّٰهَ اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو کہ تم سے اس کے احکامات کی مخالفت نہ پائی جائے نہ تو تم احرام کی حالت میں اور حرمِ مکہ میں اور عزت والے مہینوں میں ان مشرکین سے لڑائی میں پہل کرو اور نہ ہی ان کو حد سے زیادہ سزا دو بلکہ اللہ سے ڈرتے رہو اور وہی کچھ کرو جو کرنے کی تمھیں اجازت ہے۔

﴿وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ﴾ اور جان لو کہ بے شک اللہ تعالیٰ پرہیز گاروں کے ساتھ ہے۔شرعی احکام کی پابندی کرنے والے ہی متقین ہوتے ہیں اور اللہ کی رضا انھی لوگوں کو نصیب ہوتی ہے اور اس کی مدد انھی کے شاملِ حال ہوتی ہے۔

- جہاد میں اخراجات بھی ہوتے ہیں بلکہ مال و دولت کے بغیر عالم اسباب میں جہاد ہو ہی نہیں سکتا اس لیے حکم دیا گیا ﴿وَاَنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ﴾ اور خرچ کرو تم اللہ کے راستے میں اور نہ ڈالو اپنے ہاتھوں کو ہلاکت میں۔

﴿وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ﴾ کا اصل مطلب

علامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ نے روح المعانی میں ذکر کیا ہے کہ ابو عمران نے کہا ہم قسطنطنیہ میں رومیوں کے خلاف لڑائی میں شریک تھے، اس وقت مسلمانوں میں سے ایک آدمی دشمنوں کی صف میں گھس گیا اور ان پر حملہ کر دیا تو اس صورتِ حال کو دیکھ کر کچھ لوگوں نے کہا کہ اس نے اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال دیا ہے۔

وہاں حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ بھی تھے وہ اُٹھے اور فرمایا کہ تم نے اس آیت کی جو تعبیر کی ہے وہ درست نہیں ہے بلکہ یہ آیت تو ہمارے بارے میں یعنی انصار کے بارے میں نازل ہوئی اور واقعہ یوں پیش آیا کہ ہم حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینہ منورہ میں تشریف لانے سے پہلے کھیتی باڑی کرنے والے اور باغات والے تھے پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے تشریف لانے کے بعد ہم زیادہ تر جہاد میں حرکت کرنے لگے اور کھیتی باڑی اور باغات کی جانب توجہ نہ رہی۔پھر جب اللہ تعالیٰ نے اسلام کو غلبہ عطا فرمایا اور اسلام کے مددگار بکثرت ہو گئے تو ہم میں سے بعض نے ایک دوسرے کو رازدارانہ انداز میں کہا کہ ہمارے اموال ضائع ہو گئے ہیں اور اب اللہ تعالیٰ نے اسلام کو غلبہ عطا فرما دیا ہے اور اس کے مددگار بکثرت ہو گئے ہیں اب جہاد ہمارے بغیر بھی ہوتا رہے گا اس لیے ہم اپنی کھیتی باڑی اور باغات کی جانب پوری توجہ دے کر ان کو ضائع ہونے سے بچائیں تو اللہ تعالیٰ نے

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر یہ آیت نازل فرمائی ﴿ وَلَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ ﴾ اور نہ ڈالو تم اپنے آپ کو ہلاکت میں یعنی جہاد اور اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرنا چھوڑ کر ہلاکت میں نہ پڑو۔

تفسیروں میں اس آیت کی دو تفسیریں کی گئی ہیں۔ ایک تفسیر یہ ہے کہ بِاَیْدِیْكُمْ بِاَنْفُسِكُمْ کے معنیٰ میں ہے۔ اس لحاظ سے معنیٰ یہ ہوگا کہ جہاد کو چھوڑ کر اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔ اس لیے کہ جب تم لڑائی کو چھوڑو گے تو کافر تم پر غالب آ جائیں گے اور وہ غالب آ کر تمھیں قتل کرنے سے بھی دریغ نہیں کریں گے۔ اسی طرح تفسیروں میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ اصل میں ہے: لَا تُلْقُوْا اَنْفُسَكُمْ بِاَیْدِیْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ کہ تم اپنے ہاتھوں اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو یعنی جہاد کو چھوڑ کر خود اپنے ہاتھوں اپنی ہلاکت کا سامان پیدا نہ کرو۔

دوسری تفسیر یہ کی گئی ہے کہ اللہ کے راستے میں خرچ کرتے رہو اگر نہیں کرو گے تو پھر ہلاکت میں پڑو گے اس لیے کہ جب اللہ کے راستے میں خرچ نہیں کرو گے تو عالم اسباب میں اسلحہ کہاں سے آئے گا اور مجاہدین کی خوراک وغیرہ کا انتظام کیسے ہوگا؟ جب یہ نہیں ہوگا تو جہاد نہیں کر سکو گے اور ہلاکت میں مبتلا ہو جاؤ گے۔

﴿ وَاَحْسِنُوْا ﴾ اور تم احسان کرو۔ احسان عبادات میں بھی کرو اور معاملات میں بھی۔ عبادات میں احسان یہ ہے کہ انتہائی خشوع اور عاجزی سے عبادات کرو جیسا کہ بخاری و مسلم وغیرہ کی روایت میں ہے۔ یہ روایت حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس انسانی شکل میں حضرت جبرئیل علیہ السلام آئے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اسلام، ایمان، احسان اور قیامت کے بارے میں سوالات کیے۔ اسی روایت میں ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے کہا اَخْبِرْنِیْ عَنِ الْاِحْسَانِ کہ آپ مجھے احسان کے بارے میں بتائیں کہ احسان کیا ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ((اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ فَاِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَاِنَّهٗ یَرَاكَ)) کہ تو اللہ تعالیٰ کی عبادت اس طرح خشوع اور عاجزی سے کر کہ تو اس کو دیکھ رہا ہے۔ پس اگر تو اس کو نہیں دیکھ رہا تو یقین کر لے کہ وہ تجھے ضرور دیکھ رہا ہے۔ اور معاملات میں احسان یہ ہے کہ ہر فرد کے ساتھ اس کی حیثیت کے مطابق اچھا سلوک کرو۔ مسلم شریف کی روایت میں ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

((اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى كَتَبَ الْاِحْسَانَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ فَاِذَا قَتَلْتُمْ فَاَحْسِنُوْا الْقِتْلَةَ وَاِذَا ذَبَحْتُمْ فَاَحْسِنُوا الذِّبْحَةَ وَلْیُحِدَّ اَحَدُكُمْ شَفْرَتَهٗ وَیُسْرِعْ ذَبِیْحَةَ)).

”بے شک اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کے معاملہ میں احسان کا حکم دیا ہے پس جب تم کسی کو قتل کرو تو قتل میں اچھا انداز اختیار کرو اور جب تم کسی جانور کو ذبح کرو تو ذبح بھی اچھی طرح کرو اور جانور کو ذبح کرنے سے پہلے اپنی چھری کو اچھی طرح تیز کرو اور اپنے ذبیحہ کو آرام پہنچاؤ۔“

اور یہاں اس آیت میں بھی اسی کا حکم دیا گیا ہے کہ قرابت داروں، مسکینوں، محتاجوں اور اللہ کے راستے میں جہاد کرنے والوں کے ساتھ اچھا سلوک کرو ﴿ اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ ﴾ ”بے شک اللہ تعالیٰ احسان کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔“

﴿ وَ اَتِمُّوا الْحَجَّ وَ الْعُمْرَةَ لِلّٰهِ ﴾ اور تم پورا کرو حج اور عمرہ کو اللہ تعالیٰ کے لیے۔ اس رکوع کی ابتداء میں ذکر تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے چاند کے بارے میں پوچھتے ہیں ﴿ قُلْ هِیَ مَوَاقِیْتُ لِلنَّاسِ وَ الْحَجِّ ﴾ تو آپ کہہ دیں کہ یہ اوقات ہیں لوگوں کے لیے اور حج کے لیے۔ اب یہاں سے حج اور عمرہ کے کچھ مسائل بیان کیے جا رہے ہیں۔ حج کے پانچ دن ۹، ۱۰، ۱۱، ۱۲ اور ۱۳ ذوالحجہ ہیں ان ایام میں عمرہ کرنا مکروہ ہے۔ اور ان پانچ دنوں کے علاوہ سارا سال عمرہ کرنا جائز ہے اور رمضان المبارک میں عمرہ کرنے کا ثواب زیادہ ہے۔

بخاری اور مسلم میں روایت ہے کہ رمضان المبارک میں عمرہ کرنا حج کے برابر ثواب رکھتا ہے۔ پانچ دنوں میں عمرہ کرنا مکروہ ہے اس لیے کہ جو شخص حج کے دنوں میں عمرہ کرے گا وہ افضل عمل یعنی حج کو چھوڑ کر ادنیٰ عمل یعنی عمرہ کو اختیار کرے گا تو یہ مکروہ ہے مگر عمرہ ہو جائے گا۔

اب اس آیت میں حکم دیا جا رہا ہے کہ اگر کسی نے حج یا عمرہ کا احرام باندھ لیا تو اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے اس کو پورا کرے ادھورا نہ چھوڑے اس لیے کہ احرام باندھنے کے ساتھ اس کا مکمل کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ ہاں اگر تمھیں روک دیا جائے تو پھر معاملہ جدا ہے کہ وقتی طور پر اس کو توڑ دو جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حدیبیہ میں عمرہ توڑ دیا تھا مگر اس کی قضا ضروری ہے جیسا کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قضا کی تھی۔ اس لیے آگے حکم دیا ﴿ فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَیْسَرَ مِنَ الْهَدْیِ ﴾ پس اگر تم روک دیے گئے تو قربانی کے جانوروں میں جو آسانی سے میسر ہو اس کی قربانی کرو۔ احصار کا مطلب یہ ہے کہ تم آگے سفر جاری نہ رکھ سکو بلکہ روک دیے جاؤ۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ فرماتے ہیں کہ احصار دشمن کے خوف سے بھی ہوتا ہے اور بیماری، لنگڑا پن اور نفقہ کے ختم ہو جانے کی صورت میں بھی ہو سکتا ہے۔ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ احصار صرف دشمن کے خوف کی وجہ سے ہو سکتا ہے یعنی دشمن روک دے آگے نہ جانے دے تو یہ احصار ہے اس کے علاوہ بیماری وغیرہ کی وجہ سے احصار نہیں ہوگا اور اُنھوں نے دلیل میں یہ فرمایا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دشمنوں نے روکا تھا اور اس کی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عمرہ کو توڑ دیا تھا۔ تو یہ احصار ہے۔ اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ تو ایک واقعہ ہے اس میں احصار کے اسباب میں سے ایک سبب کا ذکر ہے اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس کے علاوہ باقی اسباب کی وجہ سے احصار نہیں ہوتا۔

﴿ وَ لَا تَحْلِقُوْا رُءُوْسَكُمْ ﴾ اور نہ منڈاؤ تم اپنے سروں کو ﴿ حَتّٰی یَبْلُغَ الْهَدْیُ مَحِلَّهٗ ﴾ یہاں تک کہ پہنچ جائے وہ قربانی کا جانور اپنے حلال ہونے کی جگہ پر اور حلال ہونے کی جگہ حرم ہے۔ اس لیے کہ سورۃ الحج آیت نمبر ۳۳ میں ہے ﴿ ثُمَّ مَحِلُّهَاۤ اِلَى الْبَیْتِ الْعَتِیْقِ ﴾ "پھر ان کے حلال ہونے کی جگہ پرانا گھر ہے۔" قربانی حرم کے علاقے میں کرنی ہے۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جہاں احصار ہوا، روکا گیا ہے، وہی قربانی کا محل ہے۔ جہاں رکاوٹ واقع ہوئی ہے وہیں قربانی کر دے۔ وہ یہ دلیل دیتے ہیں کہ ۶ ھ میں جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو حدیبیہ کے مقام پر روکا گیا

تھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہیں قربانی کر کے احرام کھول دیا تھا۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حدیبیہ حرم کے ساتھ متصل ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قربانی حرم میں کی تھی لہٰذا قربانی حرم میں ہوگی۔ اس کی صورت یہ ہوگی کہ دوسرے جانے والے کے ہاتھ قربانی بھیج دی جائے گی اور اس سے طے کر لیا جائے گا کہ فلاں دن، فلاں وقت تو نے حدودِ حرم میں قربانی کرنی ہے پھر طے شدہ پروگرام کے مطابق جب سمجھے کہ قربانی ہوگئی ہے تو احرام سے نکل آئے (یہ اس زمانے کی بات ہے جب موجودہ مواصلاتی نظام نہیں تھا۔ اب نقد رقم دے دے گا وہیں سے خرید کر ذبح کر کے فون پر بتا دے گا کہ آپ کی قربانی ہوگئی ہے اور محصر احرام سے نکل آئے گا۔ از مرتب) اور احرام میں کچھ چیزیں ممنوع ہیں مثلاً: سلا ہوا کپڑا نہیں پہن سکتا، سر نہیں ڈھانپ سکتا، خوشبو نہیں لگا سکتا، بال اور ناخن نہیں کاٹ سکتا، بیوی کے پاس نہیں جا سکتا، شکار نہیں کھیل سکتا خشکی وغیرہ کا۔ لیکن اگر کوئی مجبوری ہو اور احرام سے نکلنے سے پہلے سر منڈانا پڑ جائے تو اس کے متعلق فرمایا ﴿فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا﴾ پس جو شخص تم میں سے بیمار ہو ﴿اَوْ بِهٖٓ اَذًى مِّنْ رَّاْسِهٖ﴾ یا اس کو تکلیف ہو اپنے سر میں کہ سر میں زخم آگیا ہے یا جوئیں اتنی زیادہ پڑ گئی ہیں کہ سر منڈوانے کی ضرورت پڑ گئی ﴿فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ﴾ تو فدیہ لازم ہے روزوں سے یا صدقہ ہے یا قربانی ہے۔ فدیہ میں ان چیزوں کا اختیار ہے جو آسان ہو اختیار کر لے چاہے تین دن روزے رکھے، چاہے تین صاع گندم چھ مسکینوں کو دے۔ ہر مسکین کو نصف صاع دے یا ایک بکری کی قربانی دے۔

حدیث پاک میں آتا ہے کہ حضرت کعب بن عمرہ ہانڈی کے نیچے آگ جلا رہے تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس سے گزرے، دیکھا جوئیں اس کے سر سے منہ پر گر رہی تھیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا یہ تجھے تکلیف پہنچا رہی ہیں؟ کہنے لگے ہاں! مگر میں احرام میں ہوں یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا حلق کرا لے اور چھ مسکینوں کو تین صاع صدقہ دے دے۔

فرمایا ﴿فَاِذَآ اَمِنْتُمْ﴾ پس جب تم امن پا لو ﴿فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ اِلَى الْحَجِّ﴾ پس جس نے فائدہ اُٹھایا عمرہ کر کے حج کے ساتھ یعنی پہلے عمرہ کیا پھر حج کیا ایک سفر میں۔ ﴿فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ﴾ تو جو آسان ہو قربانی میں سے وہ کرے۔ یہ دَمِ شکر ہے کہ ایک سفر میں عمرے کی سعادت بھی حاصل کی اور حج کی سعادت بھی حاصل کی۔ شکریے کے طور پر قربانی دے۔ اس کا گوشت خود بھی کھا سکتا ہے اور دوسروں کو بھی کھلا سکتا ہے۔ اگر قربانی دینے کی طاقت نہیں ہے یا ملی نہیں ہے تو فرمایا ﴿فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ﴾ پس جو شخص نہ پائے قربانی کا جانور ﴿فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ فِي الْحَجِّ﴾ تو تین دنوں کے روزے لازم ہیں حج کے دنوں میں سات، آٹھ، نو کو رکھے ﴿وَسَبْعَةٍ اِذَا رَجَعْتُمْ﴾ اور سات روزے جب تم واپس لوٹو گھر کو۔ حج کے دنوں کے ختم ہونے کے بعد اگر حرم میں ٹھہر گیا ہے تو وہاں بھی رکھ سکتا ہے واپسی پر راستے میں بھی رکھ سکتا ہے اور گھر آ کر بھی رکھ سکتا ہے۔

فرمایا ﴿تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ﴾ یہ دس ہو گئے پورے ﴿ذٰلِكَ﴾ یہ حج تمتع اور قربانی ﴿لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ اَهْلُهٗ حَاضِرِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ﴾ اس کے لیے ہے کہ نہ رہتے ہوں اس کے گھر والے مسجد حرام کے قریب یعنی مسجد حرام کے پاس رہنے والے نہ ہوں۔

حج تمتع اس آدمی کے لیے جائز ہے جو حدودِ حرم کا رہنے والا نہ ہو وہاں کے رہنے والوں کے لیے عمرہ کرنا کوئی مشکل نہیں ہے جب چاہیں حدودِ حرم سے باہر جا کر احرام باندھ کر مکہ مکرمہ آ کر عمرہ کرلیں۔

فرمایا ﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ﴾ اور تم ڈرتے رہو اللہ تعالیٰ سے کہ اس کی نافرمانی نہ کرو ﴿وَاعْلَمُوْٓا﴾ اور جان لو ﴿اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ﴾ کہ بے شک اللہ تعالیٰ سخت سزا دینے والا ہے اگر تم نافرمانی کرو گے۔ لہٰذا اس کے احکامات پر عمل کرو۔

﴿اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ﴾ حج کے مہینے ہیں معلوم ﴿فَمَنْ فَرَضَ﴾ پس جس نے لازم کرلیا ﴿فِيْهِنَّ﴾ ان مہینوں میں ﴿الْحَجَّ﴾ حج کو ﴿فَلَا رَفَثَ﴾ پس وہ فحش گوئی نہ کرے ﴿وَلَا فُسُوْقَ﴾ اور نہ کوئی نافرمانی کرے ﴿وَلَا جِدَالَ﴾ اور نہ جھگڑا کرے ﴿فِي الْحَجِّ﴾ دورانِ حج ﴿وَمَا تَفْعَلُوْا﴾ اور جو بھی تم کرو گے ﴿مِنْ خَيْرٍ﴾ بھلائی سے ﴿يَّعْلَمْهُ اللّٰهُ﴾ اس کو اللہ تعالیٰ جانتا ہے ﴿وَتَزَوَّدُوْا﴾ اور لے لو تم سفر خرچ ﴿فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى﴾ پس بہترین سفر خرچ ہے بچنا ﴿وَاتَّقُوْنِ﴾ اور مجھ سے ڈرو ﴿يٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ﴾ اے عقل مندو! ﴿لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ﴾ نہیں ہے تم پر کوئی گناہ ﴿اَنْ تَبْتَغُوْا﴾ یہ کہ تلاش کرو تم ﴿فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ﴾ اپنے رب کی طرف سے فضل ﴿فَاِذَآ اَفَضْتُمْ﴾ پس جس وقت تم لوٹو ﴿مِّنْ عَرَفٰتٍ﴾ عرفات سے ﴿فَاذْكُرُوا اللّٰهَ﴾ پس ذکر کرو تم اللہ کا ﴿عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ﴾ اُس گھاٹی کے پاس جو عزت والی ہے ﴿وَاذْكُرُوْهُ﴾ اور اللہ تعالیٰ کا ذکر کرو ﴿كَمَا هَدٰىكُمْ﴾ جیسے اُس نے تمھیں تعلیم فرمائی ہے ﴿وَاِنْ كُنْتُمْ﴾ اور بے شک تھے تم ﴿مِّنْ قَبْلِهٖ﴾ اس سے پہلے ﴿لَمِنَ الضَّآلِّيْنَ﴾ گمراہوں میں سے ﴿ثُمَّ اَفِيْضُوْا﴾ پھر واپس ہو ﴿مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ النَّاسُ﴾ اس جگہ سے جہاں سے لوٹتے ہیں لوگ ﴿وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ﴾ اور اللہ تعالیٰ سے معافی مانگو ﴿اِنَّ اللّٰهَ﴾ بے شک اللہ تعالیٰ ﴿غَفُوْرٌ﴾ بخشنے والا ﴿رَّحِيْمٌ﴾ مہربان ہے ﴿فَاِذَا قَضَيْتُمْ﴾ جس وقت تم ادا کرلو ﴿مَّنَاسِكَكُمْ﴾ اپنے حج کے افعال ﴿فَاذْكُرُوا اللّٰهَ﴾ پس ذکر کرو تم اللہ تعالیٰ کا ﴿كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ﴾ جیسے تم ذکر کرتے ہو اپنے باپ دادوں کا ﴿اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا﴾ یا اس سے بھی زیادہ ذکر ﴿فَمِنَ النَّاسِ﴾ پس لوگوں میں سے وہ بھی ہیں ﴿مَنْ يَّقُوْلُ﴾ جو کہتے ہیں ﴿رَبَّنَآ﴾ اے ہمارے رب ﴿اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا﴾ دے دے ہمیں دنیا میں ہی ﴿وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ﴾ اور نہیں ہے ان کے لیے آخرت میں کوئی حصہ ﴿وَمِنْهُمْ﴾ اور ان میں سے وہ بھی ہیں ﴿مَّنْ يَّقُوْلُ﴾ جو کہتے ہیں ﴿رَبَّنَآ﴾ اے ہمارے رب ﴿اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً﴾ دے ہمیں تو دنیا میں بھلائی ﴿وَّفِي الْاٰخِرَةِ﴾ اور آخرت میں بھی ﴿حَسَنَةً﴾ بھلائی ﴿وَّقِنَا﴾ اور بچا تو

ہمیں ﴿عَذَابَ النَّارِ﴾ دوزخ کے عذاب سے ﴿اُولٰٓئِكَ﴾ وہ لوگ ہیں ﴿لَهُمْ﴾ ان کے لیے ﴿نَصِيْبٌ﴾ حصہ ہوگا ﴿مِّمَّا كَسَبُوْا﴾ اس چیز سے جو اُنھوں نے کمائی ہے ﴿وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ﴾ اور اللہ تعالیٰ جلدی حساب لینے والا ہے۔

حج اور عمرہ کے احکام

اس سے پہلی آیات میں حج اور عمرے کا ذکر تھا ﴿وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ﴾ اور حج اور عمرہ مکمل کرو اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے۔ اور اب حکم ہے ﴿اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ﴾ کہ حج کے مہینے معلوم اور مقرر ہیں شوال اور ذوالقعدہ کا مہینہ اور ذوالحجہ کی تیرھویں تاریخ تک۔ یہ تقریباً اڑھائی مہینے ہیں جو حج کے مہینے ہیں۔ حج کے مہینے ہونے کا یہ معنیٰ ہے کہ عید الفطر کا چاند نظر آجانے کے بعد یکم شوال کو اگر کوئی شخص حج کا احرام باندھے تو اس کا یہ احرام باندھنا صحیح ہے اور اگر اس سے پہلے حج کا احرام باندھے تو وہ مکروہ ہے۔ اور احرام باندھنے کے بعد جو احکام حج ہیں وہ اس پر لازم ہو گئے ان پر اس کو عمل کرنا پڑے گا۔

﴿فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ﴾ پس جس نے ان مہینوں میں حج کو اپنے اُوپر لازم کر لیا یعنی احرام باندھ لیا تو اس کو ان چیزوں کی پابندی کرنا پڑے گی جن کا آگے ذکر ہے۔

① ﴿فَلَا رَفَثَ﴾ پس وہ فحش گوئی نہ کرے۔ رَفَثَ کے معنیٰ بے حجاب گفتگو کرنا جیسے بسا اوقات میاں بیوی آپس میں بے حجاب باتیں کرتے ہیں۔ تو احرام کی حالت میں ان باتوں کے کرنے کی بھی اجازت نہیں ہے اور رَفَث کے معنیٰ بیوی کے ساتھ ہم بستر ہونے کے بھی ہیں تو احرام کی حالت میں ہم بستری بھی نہیں کر سکتا۔

② ﴿وَلَا فُسُوْقَ﴾ اور کوئی نافرمانی بھی نہ کرے۔ جس طرح نماز میں تکبیر تحریمہ کہنے کے بعد کھا پی نہیں سکتا، بول نہیں سکتا، کسی کو سلام نہیں کر سکتا اور سلام کا جواب نہیں دے سکتا، چل پھر نہیں سکتا، اِدھر اُدھر دیکھ نہیں سکتا۔ اسی طرح حج میں احرام ہے کہ احرام باندھنے کے بعد اس پر پابندیاں لازم ہو جاتی ہیں۔ مثلاً: سر نہیں ڈھانپ سکتا، مونچھیں نہیں کٹوا سکتا، ناخن نہیں کٹوا سکتا، بدن کے بال دور نہیں کر سکتا، سِلا ہوا کپڑا نہیں پہن سکتا، خوشبو نہیں لگا سکتا، جوں نہیں مار سکتا، مچھر نہیں مار سکتا، شکار نہیں کھیل سکتا۔

فرمایا: ﴿وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ﴾ اور نہ جھگڑا کرے حج کے دوران میں۔ جھگڑنا ویسے بھی بُری چیز ہے مگر احرام باندھنے کے بعد زیادہ گناہ ہے۔ لیکن ہم نے آنکھوں سے دیکھا ہے کہ نادان قسم کے لوگ جب حجر اسود کے پاس جاتے ہیں (حجر اسود کو بوسہ دینے کا ہر ایک کو شوق ہوتا ہے) تو وہاں ایک دوسرے کو گھونسے مارتے ہیں، دھکے دیتے ہیں جب کہ ایسا کرنا سخت گناہ ہے۔ کیوں کہ حجر اسود کو بوسہ دینا بعض فقہاء کے نزدیک سنت ہے اور بعض کے نزدیک فقط مستحب ہے (اور مومن کے ساتھ لڑنا اور دھکے دینا حرام ہے) تو مستحب فعل کے لیے مُکا بازی ہوتی ہے جو سخت گناہ ہے یہ گناہ تو ہے ہی لیکن

احرام اور کعبۃ اللہ اور مسجد حرام کی وجہ سے زیادہ گناہ ہے۔

﴿وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ﴾ اور جو بھی تم اچھا کام کرو گے ﴿يَّعْلَمْهُ اللّٰهُ﴾ اللہ تعالیٰ اس کو جانتا ہے۔ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے نیکیاں بھی، بدیاں بھی، ارادے بھی۔ اور بخاری شریف کی روایت میں آتا ہے کہ یمن کے کچھ حاجی گھر سے حج کے لیے چلتے تھے مگر سفر خرچ ساتھ نہیں لے جاتے تھے اور کہتے ((نَحْنُ الْمُتَوَكِّلُوْنَ)) "ہم اللہ تعالیٰ کی ذات پر توکل کرنے والے ہیں۔" اب ظاہر بات ہے کہ انسان، انسان ہے اللہ تعالیٰ نے اس کے ساتھ پیٹ لگایا ہے، گرمی سردی بھی لگے گی، بھوک پیاس بھی لگے گی۔ تو گھر سے تو بڑے اخلاص کے ساتھ نکلتے تھے، پیسہ وغیرہ ساتھ نہیں لے جاتے تھے مگر جب بھوک لگتی تھی تو لوگوں کو تنگ کرتے تھے ان سے مانگتے تھے۔ تو رب تعالیٰ فرماتے ہیں ﴿وَتَزَوَّدُوْا﴾ اور جب تم حج کے لیے گھر سے جاؤ سفر خرچ لے کر جاؤ ﴿فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى﴾ پس بے شک بہترین سفر خرچ یہ ہے کہ لوگوں سے سوال کرنے سے بچو۔ تم جو راستے میں مانگتے پھرو گے خود بھی پریشان ہو گے اور دوسروں کو بھی پریشان کرو گے اس سے بہتر ہے کہ تم گھر سے خرچ لے کر جاؤ یہ کوئی نیکی نہیں ہے کہ گھر سے تو خالی ہاتھ چل پڑو اور راستے میں لوگوں کو تنگ کرو۔

حج کا شوق تمام مسلمانوں کے دلوں میں ہوتا ہے لیکن بعض لوگ حج کے واسطے لوگوں سے مانگتے ہیں کہ میں حج کرنا چاہتا ہوں میری امداد کرو تو اس سلسلے میں پہلی بات تو یہ ہے کہ جب رب نے تجھے پیسے نہیں دیئے اور حج تیرے اُوپر لازم نہیں ہے تو نہ خود مشقت میں پڑ اور نہ کسی کو مشقت میں ڈال یہ ایسے ہی ہے کہ کوئی دیوانہ یہ کہے کہ میں غریب ہوں اور زکوٰۃ نہیں دے سکتا تم میری امداد کرو تاکہ میں مال دار ہو جاؤں اور زکوٰۃ دیا کروں۔ بھائی! یہ تو کوئی مسئلہ نہیں ہے۔

اسی طرح کسی پر قربانی فرض نہیں، فطرانہ واجب نہیں اور وہ لوگوں سے مانگتا پھرے کہ میری امداد کرو تاکہ میں قربانی کرنے اور فطرانہ دینے کے قابل ہو جاؤں یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ ہاں! اگر اللہ تعالیٰ نے تجھے قربانی کرنے کی توفیق دی ہے تو قربانی کر اور فطرانہ دینے کی توفیق دی ہے تو فطرانہ دے اگر توفیق نہیں ہے تو اللہ اللہ کر اسی طرح حج کا مسئلہ ہے اور حج کا مسئلہ تھوڑا سا مشکل ہے غور سے سمجھیں۔

حج کی بعض مشکلات

وہ یہ کہ ایک غریب آدمی نے کسی سے حج کے لیے رقم مانگی (اور عموماً ایسے موقع پر لوگ زکوٰۃ دے دیتے ہیں۔) تو جب ایک آدمی نے پانچ ہزار دے دیئے زکوٰۃ میں سے پھر دوسرے نے دے دیئے زکوٰۃ میں سے پھر تیسرے نے دیئے زکوٰۃ میں سے تو اس صورت میں جس شخص نے پہلے پانچ ہزار دیئے اس کی زکوٰۃ ادا ہو گئی کیوں کہ اس وقت وہ مصرف تھا مستحق تھا۔ اب اس کے بعد دوسرے نمبر پر جس نے دیئے اور تیسرے نمبر پر جس نے دیئے تو اس کی زکوٰۃ ادا نہیں ہو گی کیوں کہ پہلے پانچ ہزار مل جانے کے بعد وہ صاحب نصاب ہو گیا ہے (اس لیے کہ آج کل ساڑھے باون تولے چاندی کی قیمت تقریباً پانچ ہزار بنتی ہے۔)

توجب دوسرے نے پیسے دیئے تو اس وقت وہ مصرف نہیں رہا کیوں کہ مسئلہ ہے کہ آدمی جس دن صاحبِ نصاب ہوجاتا ہے اسی دن سے وہ زکوٰۃ کا مصرف نہیں رہتا تو اب جو رقم زکوٰۃ کی دوسرے شخص نے دی پھر تیسرے شخص نے دی پھر چوتھے نے دی کسی کی بھی زکوٰۃ ادا نہ ہوئی کیوں جب پہلے شخص نے اسے پانچ ہزار روپے دیئے تو صاحبِ نصاب ہوگیا تو صاحبِ نصاب کو زکوٰۃ دینا بھی حرام ہے اور اس کو زکوٰۃ لینا بھی حرام ہے۔ اور دینے والا ذمے سے فارغ نہیں ہوگا یعنی زکوٰۃ اس کے ذمے رہے گی۔ بہت سارے لوگ شرم سے کام لیتے ہیں، دین کی باتوں میں کوئی شرم نہیں ہے۔ لہٰذا جس شخص نے کسی کو زکوٰۃ کی رقم دینی ہے اس کو صاف صاف کہہ دے کہ بھائی! یہ زکوٰۃ کی رقم ہے اگر تو خود مصرف ہے تو استعمال کرلے ورنہ کسی اور جگہ دے دے جہاں زکوٰۃ لگ سکتی ہے بات کو گول مول نہ رکھو۔ بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ جس کو زکوٰۃ دی جاتی ہے وہ زکوٰۃ کا مصرف نہیں ہوتا اور دینے والا بتاتا نہیں کہ یہ زکوٰۃ ہے اور لینے والا اس اعتماد پر کہ مجھے ساتھی نے امداد کے طور پر دی ہے استعمال کرلیتا ہے تو اس صورت میں دینے والے کی زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی۔ اس واسطے اگر کسی کو زکوٰۃ کی رقم دو تو صاف کہہ دو کہ یہ زکوٰۃ کی رقم ہے۔ تو اس طرح زکوٰۃ کے پیسے مانگ کر حج کرنا درست نہیں۔ ﴿وَاتَّقُوْنِ یٰٓاُولِی الْاَلْبَابِ﴾ اور مجھ سے ڈرو اے عقل مندو!

آگے اور مسئلہ ہے۔ زمانہ جاہلیت میں لوگ جب حج پر جاتے سودا بیچتے بھی تھے اور خریدتے بھی تھے، جب اسلام آیا اور حج کا حکم آیا تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو تشویش ہوئی کہ ہم نے تو صرف رب کی رضا کے لیے حج کرنا ہے تو اس میں خرید و فروخت کرنے سے ہمارے حج پر زد آئے گی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿لَیْسَ عَلَیْكُمْ جُنَاحٌ﴾ نہیں ہے تم پر کوئی گناہ ﴿اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ﴾ یہ کہ تلاش کرو تم اپنے رب کا فضل۔ مقصد تو حج کرنا ہے ضمنی طور پر اگر کوئی چیز بیچنا چاہو تو بیچ بھی سکتے ہو اور اگر کوئی چیز خریدنا چاہو تو خرید بھی سکتے ہو اور اگر کوئی شخص یہاں سے جاتا ہی اس لیے ہے کہ یہاں سے منشیات لے جا کر وہاں بیچوں گا یا کوئی اور سودا لے جاتا ہے کہ یہ وہاں جا کر فروخت کروں گا اور وہاں سے سونا لاؤں گا تو ایسے شخص کی نیت پہلے دن سے بُری ہے یہ بات اچھی نہیں ہے۔

﴿فَاِذَآ اَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفٰتٍ﴾ پس جب تم عرفات سے لوٹو۔ یاد رکھنا! حج کے افعال میں سے تین فرض ہیں:

① احرام باندھنا ② عرفات میں ٹھہرنا ③ طواف زیارت

عرفات میں (نویں تاریخ کو زوال آفتاب کے بعد سورج کے غروب ہونے تک) ٹھہرنا حج کا رکن ہے اگر کوئی وہاں پر نہ ٹھہرا تو حج نہیں ہوگا۔ عرفات کے میدان میں جتنا ہوسکے رب تعالیٰ کا ذکر کرے اور کھڑے ہوکر ذکر کرنا مستحب ہے۔ الحمد للہ! میں نے وہاں دس پارے کھڑے ہوکر پڑھے۔ ہاں! اگر کوئی ضعیف ہے بوڑھا ہے تو بیٹھ کر بھی ذکر کرسکتا ہے مگر اِدھر اُدھر کی باتیں کرکے وقت ضائع نہ کرے کیوں کہ وہ وقت بہت قیمتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ذکر کرے، دعا کرے، اپنے لیے، اپنے عزیز رشتہ داروں کے لیے دعا کرے، زندوں کے لیے اور جو مرگئے ہیں اُن کے لیے دعا کرے کیوں وہ جگہ اور وقت دعا کی قبولیت کا ہے۔ عرفات سے سورج غروب ہونے کے بعد لوٹنا ہے اور مغرب کی نماز عرفات میں نہیں پڑھنی۔ مغرب کی نماز مزدلفہ میں جا کر

پڑھنی ہے۔ تو فرمایا کہ جب تم عرفات سے لوٹو تو ﴿فَاذْكُرُوا اللّٰهَ﴾ پس اللہ تعالیٰ کا ذکر کرو ﴿عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ﴾ اُس گھاٹی کے پاس جو عزت والی ہے۔ اور اس گھاٹی پہاڑی کا نام ہے "جبل قزح" وہاں آج کل شہزادے نہیں سماتے وہاں ان کی کوٹھیاں بنی ہوئی ہیں۔

اور حدیث پاک میں آتا ہے: ((اَلْمُزْدَلِفَةُ كُلُّهَا مَوْقِفٌ اِلَّا وَادِيْ مُحَسِّرٍ)) مزدلفہ کا سارا علاقہ ٹھہرنے کی جگہ ہے وادیٔ محسر ایک مخصوص رقبہ ہے وہاں نہیں ٹھہرنا۔ حکومت نے اس کے اردگرد جنگلے لگائے ہیں اور شُرطے بھی کھڑے ہوتے ہیں۔ وہ تقریباً پانچ سو چالیس گز کا رقبہ ہے۔ خالی جگہ دیکھ کر کچھ نادان لوگ ادھر جاتے ہیں، پولیس والے پہلے سمجھاتے ہیں اور اگر نہ سمجھیں تو پھر دُرّے مارتے ہیں۔

یہ وہ جگہ ہے کہ جب ابرہہ ساٹھ ہزار کا لشکر لے کر آیا تھا تو ابابیلوں نے اس جگہ پر ان پر سنگ باری کی تھی، ابابیلوں نے مسور کے دانے کے برابر کنکر ایک ایک چونچ میں پکڑا ہوا تھا اور دو دو پنجوں میں اور اس جگہ پر ابرہہ کے لشکر پر برسائے تھے۔ اور یہ وادی مزدلفہ ہی کا حصہ ہے لیکن چونکہ اس مقام پر رب تعالیٰ کا عذاب نازل ہوا تھا اس لیے وہاں ٹھہرنا درست نہیں ہے۔

((اَلْعَرَفَةُ كُلُّهَا مَوْقِفٌ اِلَّا بَطْنَ عُرَنَةَ)) "عرفات سارے کا سارا ٹھہرنے کی جگہ ہے سوائے بطن عرنہ کے کہ وہاں نہیں ٹھہر سکتے۔" یہ جگہ عرفات میں ایک مسجد ہے جس کا نام ہے نمرہ جہاں ظہر اور عصر اکٹھی پڑھی جاتی ہیں۔ اس مسجد کی جو مغرب والی دیوار ہے اگر وہ گرے تو بطن عرنہ میں گرے گی یعنی اس دیوار کے متصل جو مقام ہے وہ بطن عرنہ ہے۔ یہ بطن عرنہ حرم میں شامل ہے باقی سارا عرفات حل ہے۔ جو اس بطن عرنہ میں ٹھہرے گا اس کا حج نہیں ہوگا۔ اور مزدلفہ میں قیام واجب ہے صبح کی نماز کے بعد تک وہاں سے سورج کے طلوع ہونے کے بعد چلنا ہے۔ اور یاد رکھنا! وہاں کے جو ڈرائیور ہوتے ہیں ان کو ریالوں سے غرض ہوتی ہے، بہت کم ایسے ہوتے ہیں جو یہ سوچیں کہ کسی کا حج خراب نہ ہو۔ وہ اپنی سہولت کے لیے وہاں سے پو پھٹنے کے بعد لے کر چل پڑتے ہیں کیوں کہ بعد میں رش ہو جاتا ہے اور ان کا وقت زیادہ لگتا ہے اس لیے ایسا نہیں کرنا کیوں کہ فجر کے بعد وہاں ٹھہرنا واجب ہے۔ اور منیٰ کی طرف طلوع آفتاب سے پہلے نہیں جانا۔ ہاں جو معذور ہیں یا بوڑھے ہیں انھیں اجازت ہے۔

بعض ڈرائیور اس طرح بھی کرتے ہیں کہ عرفات کے آخری کونے میں اُتار دیتے ہیں ایک دفعہ میرے ساتھ صوفی نذیر احمد صاحب تھے اللہ تعالیٰ اُنھیں غریق رحمت کرے اور حاجی اللہ دتہ مرحوم بھی تھے ان کے علاوہ اور بھی چند ساتھی تھے۔ رش چونکہ زیادہ تھا تو ڈرائیور نے ہمیں عرفات کے آخری کونے میں عرفات کے اندر ہی اتار دیا۔ ہم نے اس کو کہا کہ ہمیں جبل قزح بتا۔ کہنے لگا هٰنَا یہیں ہے۔ بڑا ضدی تھا۔ ہم نے اس کی خاصی منت کی کہ ہمارے ساتھ اس طرح نہ کر حج پر زد پڑتی ہے اور یہ تو عرفات ہے تو ہمیں مزدلفہ جا کر اُتار وہ نہ مانا اور چل پڑا کہ اب میں سحری کے وقت آؤں گا تو ہم نے وہاں نعرے لگائے کہ لِتَسْقُطْ سَوَّاقُ هٰذِهِ السَّيَّارَةِ اس گاڑی کا ڈرائیور مُردہ باد تو وہ گھبرایا اور پھر ہمیں جا کر مزدلفہ اُتارا۔

﴿وَاذْكُرُوْهُ﴾ اور تم اللہ تعالیٰ کا ذکر کرو ﴿كَمَا هَدٰىكُمْ﴾ جس طرح رب نے تمھیں ہدایت دی ہے ﴿وَاِنْ كُنْتُمْ﴾ اور اگر چہ تم ﴿مِّنْ قَبْلِهٖ﴾ اس سے پہلے ﴿لَمِنَ الضَّآلِّيْنَ﴾ گمراہوں میں سے تھے ﴿ثُمَّ اَفِيْضُوْا﴾ پھر لوٹو ﴿مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ النَّاسُ﴾ جس جگہ سے لوگ لوٹتے ہیں۔ یہ جو اہل مکہ تھے یہ عرفات میں نہیں جاتے تھے۔ یہ کہتے تھے نَحْنُ قَطِيْنُ اللّٰهِ ہم اللہ تعالیٰ کے گھر کے پڑوسی ہیں ہم حرم سے کیوں نکلیں۔ یہ بطن عرنہ سے ورے ورے ٹھہرتے تھے جو کہ حرم ہی کا حصہ ہے۔ اور عرفات حل میں ہے وہ حرم میں داخل نہیں ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان کو حکم دیا کہ جہاں دوسرے لوگ جاتے ہیں عرفات میں تم بھی جاؤ اور جہاں سے دوسرے لوگ لوٹتے ہیں تم بھی وہیں سے لوٹو اور جہاں تم ٹھہرتے ہو اس سے تو حج نہیں ہوگا کیوں عرفات میں ٹھہرنا حج کا رکن ہے۔ ﴿وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ﴾ اور اللہ تعالیٰ سے معافی مانگو ﴿اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾ بے شک اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے ﴿فَاِذَا قَضَيْتُمْ﴾ پس جب تم پورے کر چکو ﴿مَّنَاسِكَكُمْ﴾ اپنے افعالِ حج ﴿فَاذْكُرُوا اللّٰهَ﴾ پس تم اللہ تعالیٰ کا ذکر کرو ﴿كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ﴾ جیسے تم ذکر کرتے ہو اپنے باپ دادوں کا۔

زمانۂ جاہلیت میں اس طرح ہوتا تھا کہ یہ لوگ اپنے باپ دادوں کے گیت گاتے تھے کہ فلاں کا بیٹا ہوں میں فلاں کا بیٹا ہوں، میرا دادا ایسا تھا، ایسا تھا۔ تو فرمایا ان کا ذکر چھوڑو اور رب کا ذکر کرو ﴿اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا﴾ یا اس سے بھی زیادہ ذکر کرو اللہ تعالیٰ کا۔

﴿فَمِنَ النَّاسِ﴾ پس لوگوں میں سے وہ بھی ہیں ﴿مَنْ يَّقُوْلُ﴾ جو کہتے ہیں ﴿رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا﴾ اے رب ہمارے ہمیں جو کچھ دینا ہے دنیا ہی میں دے دے ﴿وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ﴾ ان کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے ﴿وَمِنْهُمْ مَّنْ﴾ اور ان میں سے وہ بھی ہیں ﴿يَّقُوْلُ﴾ جو کہتے ہیں ﴿رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً﴾ اے ہمارے پروردگار! دنیا میں بھی ہمیں راحت و آرام اور بھلائی دے اور آخرت میں بھی دے ﴿وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ﴾ اور بچا ہم کو آگ کے عذاب سے۔ یہ بڑی جامع مانع دعا ہے کہ دنیا کی چیزیں بھی اس میں آگئیں اور آخرت بھی آگئی ﴿اُولٰٓئِكَ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّمَّا كَسَبُوْا﴾ ان لوگوں کے لیے حصہ ہے وہ جو انھوں نے کمایا ہے ﴿وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ﴾ اور اللہ تعالیٰ جلد حساب لینے والا ہے۔ آنکھیں بند ہونے کی دیر ہے حساب شروع ہو جائے گا اور آنکھیں بند ہونے کا کیا پتا ہے کہ کسی کی آج ہو جائیں اور کسی کی کل ہو جائیں۔

﴿وَاذْكُرُوا اللّٰهَ﴾ اور ذکر کرو تم اللہ تعالیٰ کا ﴿فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ﴾ گنتی کے دنوں میں ﴿فَمَنْ تَعَجَّلَ﴾ پس جس شخص نے جلدی کی ﴿فِيْ يَوْمَيْنِ﴾ دو دنوں میں ﴿فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ﴾ پس اس پر ہرگز گناہ نہیں ہے ﴿وَمَنْ﴾ اور جس شخص نے ﴿تَاَخَّرَ﴾ تاخیر کی ﴿فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ﴾ تو اس پر بھی کوئی گناہ نہیں ہے ﴿لِمَنِ﴾ اس شخص کے لیے ﴿اتَّقٰى﴾ جو ڈر گیا ﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ﴾ اور ڈرو اللہ تعالیٰ سے ﴿وَاعْلَمُوْٓا﴾ اور جان لو ﴿اَنَّكُمْ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ﴾ بے شک تم اسی

کی طرف جمع کیے جاؤ گے ﴿وَمِنَ النَّاسِ﴾ اور لوگوں میں سے ﴿مَنْ﴾ وہ بھی ہے ﴿يُّعْجِبُكَ﴾ تعجب میں ڈالتی ہے تجھے ﴿قَوْلُهٗ﴾ بات اس کی ﴿فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا﴾ دنیا کی زندگی میں ﴿وَيُشْهِدُ اللّٰهَ﴾ اور وہ اللہ تعالیٰ کو گواہ بناتا ہے ﴿عَلٰى مَا فِيْ قَلْبِهٖ﴾ اس چیز پر جو اس کے دل میں ہے ﴿وَهُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ﴾ حالانکہ وہ سخت جھگڑالو ہے ﴿وَاِذَا تَوَلّٰى﴾ اور جب پیٹھ پھیرتا ہے ﴿سَعٰى فِي الْاَرْضِ﴾ کوشش کرتا ہے زمین میں ﴿لِيُفْسِدَ فِيْهَا﴾ تاکہ زمین میں فساد مچائے ﴿وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ﴾ اور تاکہ ہلاک کردے کھیتی کو ﴿وَالنَّسْلَ﴾ اور جانوروں کی نسل کو ﴿وَاللّٰهُ﴾ اور اللہ تعالیٰ ﴿لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ﴾ نہیں پسند کرتا فساد کو ﴿وَاِذَا﴾ اور جب ﴿قِيْلَ لَهٗ﴾ اس کو کہا جاتا ہے ﴿اتَّقِ اللّٰهَ﴾ ڈر اللہ تعالیٰ سے ﴿اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ﴾ اُبھارتی ہے غیرت اس کو ﴿بِالْاِثْمِ﴾ گناہ پر ﴿فَحَسْبُهٗ جَهَنَّمُ﴾ پس اس کے لیے کافی ہے دوزخ ﴿وَلَبِئْسَ الْمِهَادُ﴾ اور البتہ بُرا ہے وہ ٹھکانا ﴿وَمِنَ النَّاسِ﴾ اور لوگوں میں سے ﴿مَنْ﴾ وہ بھی ہیں ﴿يَّشْرِيْ نَفْسَهُ﴾ جو خریدتے ہیں اپنی جان کو ﴿ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ﴾ اللہ تعالیٰ کی رضا چاہتے ہوئے ﴿وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ﴾ اور اللہ تعالیٰ شفقت کرنے والا ہے بندوں پر ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا﴾ اے لوگو جو ایمان لائے ہو ﴿ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ﴾ داخل ہو جاؤ اسلام میں پورے کے پورے ﴿كَآفَّةً﴾ پورے کے پورے ﴿وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ﴾ اور نہ پیروی کرو تم شیطان کے قدموں کی ﴿اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ﴾ بے شک وہ تمھارا دشمن ہے کھلا ﴿فَاِنْ زَلَلْتُمْ﴾ پس اگر تم پھسل گئے ﴿مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْكُمُ الْبَيِّنٰتُ﴾ بعد اس کے کہ تمھارے پاس آ گئے واضح دلائل ﴿فَاعْلَمُوْٓا﴾ پس تم جان لو اَنَّ اللّٰهَ بے شک اللہ تعالیٰ ﴿عَزِيْزٌ﴾ غالب ہے ﴿حَكِيْمٌ﴾ حکمت والا ہے ﴿هَلْ يَنْظُرُوْنَ﴾ نہیں وہ انتظار کرتے ﴿اِلَّآ﴾ مگر ﴿اَنْ﴾ اس بات کا ﴿يَّاْتِيَهُمُ اللّٰهُ﴾ کہ آئے ان کے پاس اللہ تعالیٰ ﴿فِيْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ﴾ بادلوں کے سائے میں ﴿وَالْمَلٰٓئِكَةُ﴾ اور فرشتے آئیں ﴿وَقُضِيَ الْاَمْرُ﴾ اور معاملہ طے کیا جائے ﴿وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ﴾ اور اللہ تعالیٰ ہی کی طرف لوٹائے جاتے ہیں ... تمام۔

رمی جمار کے احکام

اس سے پہلے حج کے مسائل کا بیان ہے۔ افعالِ حج میں سے رمی جمار بھی ہے۔ جمار جمع ہے جَمْرَةٌ کی۔ وہ تین مینار جن کو عام طور پر شیطان کہا جاتا ہے ان کو کنکریاں مارنا بھی واجب ہے۔ اگر کوئی رمیٔ جمار نہیں کرے گا تو اُس کے حج میں خلل واقع ہوگا کیوں کہ واجب رہ گیا۔ عید والے دن صرف ایک جمرے کی رمی ہوتی ہے جس کو جمرہ عقبہ کہتے ہیں اور یہ رمی زوال سے پہلے ہوگی۔ اور عید والے دن دوسرا کام قربانی ہے، تیسرا کام سر پر اُسترا پھرانا ہے، چوتھا کام ہے طوافِ زیارت۔ اور

طوافِ زیارت فرض اور رکن ہے اور باقی چیزیں واجب ہیں۔ اور یہ مسئلہ بھی یاد رکھنا کہ جمرہ عقبہ کی رمی تک تلبیہ کہتے رہنا ہے جب پہلا کنکر مارے گا تو تلبیہ ختم ہو جائے گا۔

بِسْمِ اللّٰهِ اَللّٰهُ اَكْبَرُ کہہ کر سات کنکر مارنے ہیں اس پر لگ جائیں تو بہتر ہے اور اگر اس حلقے میں جو وہاں بنا ہوا ہے جا گریں پھر بھی صحیح ہے۔ رش کی وجہ سے شریعت نے یہ سہولت دی ہے۔ گیارھویں تاریخ کو تینوں شیطانوں کو کنکر مارنے ہیں جمرہ اولیٰ کو بھی، جمرہ وسطیٰ کو بھی اور اُخریٰ کو بھی اور یہ رمی زوال کے بعد کرنی ہے۔ اگر کوئی شخص زوال کے بعد غروبِ آفتاب تک نہ کر سکے تو وہ غروبِ آفتاب کے بعد بھی کر سکتا ہے لیکن اول وقت مستحب ہے۔ اگر کوئی شخص معذور ہے، لنگڑا ہے، لولا ہے، بیمار ہے، بوڑھا ہے اور خود رمی نہیں کر سکتا تو وہ اپنا نائب بھی بنا سکتا ہے۔ اور بارھویں تاریخ کو رمی کرنی ہے زوال کے بعد اور تیرھویں تاریخ کو بھی رمی مستحب ہے۔ اور اگر کوئی بارھویں تاریخ کو رمی کرنے کے بعد چلا جائے تو اُس کو بھی اجازت ہے۔

لیکن مسئلہ یاد رکھنا! اگر بارھویں تاریخ کو منیٰ ہی میں رہا اور سورج غروب ہو گیا تو پھر تیرھویں تاریخ کے لیے رہنا ضروری ہو گیا ہے اگر چلا گیا تو اس پر دم آئے گا۔ کیوں کہ تاریخ اسلامی مغرب سے شروع ہوتی ہے تو جب سورج غروب ہو گیا تو اب تیرھویں تاریخ شروع ہو گئی اور جمرات کی رمی کا وقت شروع ہو گیا اب اس کا جانا ٹھیک نہیں ہے۔ لیکن تیرھویں تاریخ کو کوئی شاذ و نادر ہی ٹھہرتا ہے۔ ایک دفعہ میں نے کوشش کی تھی میرے ساتھ کچھ ساتھی بھی تھے۔ بس ہم ہی وہاں تھے اور کوئی نہیں تھا اور تیرھویں تاریخ کی رمی زوال سے پہلے بھی ہو سکتی ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ﴿وَاذْكُرُوا اللّٰهَ﴾ اور تم اللہ تعالیٰ کا ذکر کرو۔ کنکریاں مارتے وقت جو کہو گے بسم اللہ اللہ اکبر، یہ بھی ذکر ہے ﴿فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ﴾ گنتی کے دنوں میں یعنی دسویں، گیارھویں، بارھویں تاریخ کو ﴿فَمَنْ تَعَجَّلَ فِيْ يَوْمَيْنِ﴾ پس جس نے جلدی کی دو دنوں میں۔ یعنی عید کے بعد گیارھویں کو بھی رمی کی اور بارھویں کو بھی رمی کی اور غروبِ آفتاب سے پہلے وہاں سے چل پڑا ﴿فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ﴾ پس اس پر بھی کوئی گناہ نہیں ہے ﴿وَمَنْ تَاَخَّرَ﴾ اور جس نے تاخیر کی یعنی تیرھویں تاریخ کو وہاں ٹھہرا ﴿فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ﴾ پس اس پر بھی کوئی گناہ نہیں ہے اور یہ سارے احکام ﴿لِمَنِ﴾ اس کے واسطے ہیں ﴿اتَّقٰى﴾ جو رب سے ڈرتا رہے ﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ﴾ اور اللہ تعالیٰ سے ہر وقت ڈرتے رہو ﴿وَاعْلَمُوْٓا﴾ اور جان لو تم ﴿اَنَّكُمْ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ﴾ کہ بے شک تم اسی رب کی طرف جمع کیے جاؤ گے۔ جانا تم نے رب کے پاس ہی ہے اور کوئی جگہ نہیں ہے۔ اس واسطے رب کی پیشی کے لیے تیاری کر لو کہ وہاں جا کر ہم نے کیا کہنا ہے۔

ایک فسادی منافق کا ذکر

اُوپر ذکر تھا کہ کچھ لوگ ایسے ہیں جو کہتے ہیں ﴿رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا﴾ "اے ہمارے رب ہمیں دنیا ہی میں دے دے ﴿وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ﴾ ان کے لیے آخرت میں کچھ حصہ نہیں ہے۔" اب ایسے ہی شخص کا ذکر ہے۔

اخنس ابن شریق ایک منافق تھا جو بڑی میٹھی باتیں کرتا تھا اور بڑا باتونی تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں آتا تو بڑے سلیقے کے ساتھ گفتگو کرتا تھا۔ کہتا تھا حضرت! ہمارے جیسا خوش قسمت بھی کوئی ہے کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) جیسی شخصیت خود ہمارے پاس آگئی ہے۔ حضرت! ہم جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں بیٹھتے ہیں تو خدا یاد آجاتا ہے اور جنت دوزخ سامنے نظر آتی ہے اور ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں اس طرح خوش ہوتے ہیں جیسے مچھلی پانی میں۔ اور حضرت! جب ہم آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی مجلس سے باہر ہوتے ہیں تو ہماری کیفیت ایسے ہوتی ہے جیسے مچھلی کو پانی سے نکال کر باہر پھینک دیں تو وہ تڑپتی رہتی ہے۔ حضرت خدا کی قسم! زندگی ہی آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ ہے۔ حضرت! آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ کر دل خوش ہو جاتا ہے۔ ایسی عجیب عجیب باتیں کرتا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہ سمجھتے تھے کہ عاشق ہی یہی ہے۔ اور جس وقت وہ خبیث آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس سے باہر جاتا تھا تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے جو فصلیں کاٹ کر گانٹھیں بنا کر رکھی ہوتی تھیں ان کو آگ لگا دیتا تھا اور ان کے جو جانور ہوتے تھے بکریاں، اونٹ، گھوڑے، ان کی ٹانگیں کاٹ دیتا تھا۔ کسی نے دیکھا اور اُس کو کہا کہ تو یہ کیا کرتا ہے؟ تو کہنے لگا تو کون ہوتا ہے روکنے والا؟ دیکھو! آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں کیا کیفیت ہے اور باہر جا کر کیسی حرکتیں ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو رب تعالیٰ فرماتے ہیں ﴿وَمِنَ النَّاسِ﴾ اور لوگوں میں سے ﴿مَنْ﴾ وہ بھی ہے ﴿يُّعْجِبُكَ﴾ کہ تعجب میں ڈالتی ہے تجھے ﴿قَوْلُهٗ﴾ بات اس کی ﴿فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا﴾ دنیا کی زندگی میں۔ بات جب کرتا ہے تو آپ بڑے خوش ہوتے ہیں ﴿وَيُشْهِدُ اللّٰهَ﴾ اور وہ اللہ تعالیٰ کو گواہ بناتا ہے ﴿عَلٰي مَا فِيْ قَلْبِهٖ﴾ اس چیز پر جو اس کے دل میں ہے۔ یعنی کہتا کہ خدا کی قسم جو کہتا ہوں دل سے کہتا ہوں کہ مجھے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے بڑی محبت ہے مگر حقیقت یہ ہے ﴿وَهُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ﴾ حالانکہ وہ سخت جھگڑالو ہے۔ ایسے ہی لوگوں کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

((اَبْغَضُ الرِّجَالِ اِلَى اللّٰهِ اَلَدُّ الْخِصَامِ)).

"اللہ تعالیٰ کے نزدیک مبغوض ترین وہ لوگ ہیں جو سخت جھگڑالو ہیں۔"

﴿وَاِذَا تَوَلّٰى﴾ اور جب یہاں سے پیٹھ پھیرتا ہے ﴿سَعٰى فِي الْاَرْضِ﴾ کوشش کرتا ہے زمین میں ﴿لِيُفْسِدَ فِيْهَا﴾ تاکہ زمین میں فساد مچائے۔ وہ اس طرح کہ جو غریب صحابہ تھے ان کو گھورتا اور گالیاں دیتا تھا ﴿وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ﴾ اور تاکہ لوگوں کے کھیت جلائے۔ وہ اس طرح کہ لوگوں نے کھیت سے فصل کاٹ کر اس کی گانٹھیں بنا کر اکٹھی کر کے رکھی ہوتی تھیں یہ اُن کو آگ لگا دیتا تھا ﴿وَالنَّسْلَ﴾ اور جانوروں کی نسل کو ختم کر دیتا تھا۔ وہ اس طرح کہ ان کو کونچیں کاٹ دیتا یعنی غائبانہ اس کی حرکتیں اور ہوتی تھیں۔ تو دیکھو! ایسے لوگ بھی تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جیسی بڑی زیرک اور ذہین شخصیت بھی ان کو نہیں پہچان سکی جب تک رب تعالیٰ نے آگاہ نہیں فرمایا۔ یہ ایسا آدمی تھا کہ جب وہ گفتگو کرتا تھا تو معلوم ہوتا تھا کہ بڑا فدائی اور شیدائی ہے لیکن پھر اللہ تعالیٰ نے اس کی حرکتیں بتائیں تو پھر معلوم ہوا کہ یہ کیسا آدمی ہے۔ ﴿وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ﴾ اور اللہ تعالیٰ فساد کو پسند نہیں کرتا۔ ﴿وَاِذَا قِيْلَ لَهُ﴾ اور جب اس کو کہا جاتا ہے ﴿اتَّقِ اللّٰهَ﴾ ڈر اللہ تعالیٰ سے ﴿اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ﴾ اُبھارتی ہے غیرت

اس کو گناہ پر ﴿فَحَسْبُهٗ جَهَنَّمُ﴾ پس اس کے لیے کافی ہے دوزخ ﴿وَلَبِئْسَ الْمِهَادُ﴾ اور البتہ بُرا ہے وہ ٹھکانا۔

حضرت صہیب رومی رضی اللہ عنہ کا ایثار

اور کل تم نے یہ بھی پڑھا ہے ﴿وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ﴾ اور ان میں سے وہ لوگ بھی ہیں جو کہتے ہیں ﴿رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً﴾ "اے رب ہمارے! ہمیں دنیا میں بھی بھلائی عطا فرما اور آخرت میں بھی بھلائی عطا فرما۔" تو اس طرح کے لوگوں میں سے ایک کا ذکر ہے۔

حضرت صہیب رضی اللہ عنہ جنھیں صہیب رومی بھی کہتے ہیں اصل میں وہ رومی نہیں تھے۔ عرب کا ایک قبیلہ تھا بنونمر یہ، اس قبیلے کے فرد تھے اور بڑے خوب صورت اور پیاری شکل والے چھوٹے بچے تھے کہ ظالم ان کو اُٹھا کر روم کے علاقے میں لے گئے تھے اور زندگی اُنھوں نے روم میں گزاری۔ جب واپس آئے تو صرف اتنا یاد تھا کہ میں بنونمر کا ایک فرد ہوں اور فلاں جگہ پر ہم بچے کھیلا کرتے تھے کیوں کہ کافی عرصہ کے بعد آئے کیوں کہ غلام بنا لیے گئے تھے تو غلام در غلام بنتے رہے اور بڑے غضب کے تیر انداز تھے اور ان کے تیر سو فیصد نشانے پر لگتے تھے۔

ہوا اس طرح کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب ہجرت فرمائی اور مدینہ منورہ تشریف لے گئے، دو چار دن کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی تشریف لے گئے تو اب ان کا دل مکہ میں نہیں لگتا تھا اور ساتھ جانے والا بھی اور کوئی نہ تھا تو یہ اکیلے ہجرت کے لیے روانہ ہو گئے اور ایک کافر ان کا مقروض تھا اس نے سوچا کہ اب موقع ہے کہ لوگوں کو اُکسا کر اس کا کام تمام کر دوں کیوں کہ اگر یہ زندہ رہا تو پھر کسی نہ کسی وقت مجھ سے رقم کا مطالبہ کر سکتا ہے اور وہ یہ بھی سمجھتا تھا کہ یہ غضب کا تیر انداز ہے۔

تو اس نے اس طرح کیا کہ محلے میں جا کر نوجوانوں کے جذبات اُبھارے اور کہنے لگا: او بے غیرتو! کیا تمھارا خون خشک ہو گیا ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تمھارے ہاتھوں سے نکل گئے۔ ابوبکر، عمر (رضی اللہ عنہما) بھی تمھارے ہاتھوں سے نکل گئے اور آج یہ صہیب بھی جا رہا ہے کیا اس کو بھی تم سنبھال نہیں سکتے تمھاری غیرت کدھر گئی۔ ایسے انداز سے ان کے جذبات اُبھارے کہ نوجوان ان کے پیچھے پڑ گئے۔ اور حضرت صہیب رضی اللہ عنہ تنہا سفر پر تھے اور مکہ مکرمہ سے کافی دُور ہو گئے تھے وہ بھی سمجھ گئے کہ یہ میرے پیچھے آ گئے ہیں۔ تو وہاں ایک بلند ٹیلا تھا اس پر انھوں نے پوزیشن سنبھال لی اور جو تیر ترکش میں تھے وہ نکال کر سامنے رکھ لیے اور ان سب کو کہا کہ بھائی! جس ارادے سے تم آئے ہو میں بھی سمجھتا ہوں اور یاد رکھو! مرتو میں بھی جاؤں گا لیکن یہ جتنے تیر میرے پاس ہیں یہ میں تم پر چلاؤں گا اور تمھاری کئی لاشیں یہاں سے جائیں گی اور جب تیر ختم ہو جائیں گے تو پھر میں تمھارے ساتھ تلوار اور نیزے کے ساتھ لڑوں گا اور یہ بھی تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میرا ایک تیر بھی خطا نہیں جاتا۔

آمدم برسرِ مطلب۔ وہ جوان آدمیوں کو اکٹھا کر کے لایا تھا کہنے لگا چل پھر اس طرح کرتے ہیں کہ تو نے جو مجھ سے قرض لینا ہے چھوڑ دے ہم تجھے چھوڑ دیتے ہیں اور مطلب بھی اتنا ہی تھا۔ حضرت صہیب رضی اللہ عنہ نے فرمایا جا میں نے اپنا قرض

تجھے معاف کیا اور جب حضرت صہیب رضی اللہ عنہ نے دیکھا کہ وہ واپس دور چلے گئے ہیں تو پھر اپنا سفر جاری رکھا۔

اللہ تعالیٰ ان کا ذکر فرماتے ہیں ﴿وَمِنَ النَّاسِ﴾ اور لوگوں میں سے وہ بھی ہیں ﴿مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ﴾ جو خریدتے ہیں اپنی جان کو ﴿ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ﴾ اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے لیے کافروں کو اپنی رقم دے کر اپنی جان خریدی ﴿وَاللّٰهُ رَءُوْفٌ بِالْعِبَادِ﴾ اور اللہ تعالیٰ بندوں پر بڑی شفقت کرنے والا ہے۔ آگے اور بات کا ذکر ہے۔

وہ یہ کہ حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ پہلے یہودی تھے پھر مسلمان ہوئے، ان کا ایک گروپ ہوتا تھا ابن یامین، حضرت ثعلبہ، حضرت اسد، حضرت اُسید رضی اللہ عنہم، یہ سارے پہلے یہودی تھے بعد میں مسلمان ہوئے۔ اُنھوں نے یہ مذہب بنایا ہوا تھا کہ ہمارے واسطے اُونٹ کا گوشت اور اُونٹنی کا دودھ حرام ہے اور حقیقت میں ایسا نہ تھا کیوں کہ رب تعالیٰ کی طرف سے کوئی ایسا حکم نہ تھا۔ جیسے اہل بدعت نے کئی چیزیں ازخود بنائی ہوئی ہیں جو کہ دین نہیں ہے مگر انھوں نے دین بنایا ہوا ہے تو انھوں نے بھی اسی طرح خانہ ساز باتیں بنائی ہوئی تھیں تو انھوں نے کہا اب ہم مسلمان ہو گئے ہیں لہٰذا اب ہمیں اُونٹ کا گوشت حلال سمجھنا چاہیے اور اُونٹنی کا دودھ بھی حلال ہے مگر کھانا ضروری نہیں ہے۔ تو اس طرح کریں گے کہ حلال سمجھیں گے مگر کھائیں گے، پئیں گے نہیں تاکہ پہلی شریعت بھی ہم سے نہ چھوٹے کیوں کہ کھانا پینا فرض تو نہیں ہے۔ یہاں کتنے آدمی ہوں گے جنھوں نے اُونٹ کا گوشت نہیں کھایا ہوگا اور دودھ نہیں پیا ہوگا تو ان کے اسلام میں تو کوئی فرق نہیں آیا۔ تو اُنھوں نے سوچا کہ اس طرح کرنے سے جامع بین الشریعتین ہو جائیں گے کہ عقیدتاً تو حلال سمجھیں گے اور عملاً نہیں کھائیں گے اس پر اللہ تعالیٰ نے تنبیہ فرمائی۔

اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا﴾ اے لوگو جو ایمان لائے ہو ﴿ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً﴾ اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ۔ ذہن بھی اسلامی، عمل بھی اسلامی، عقیدہ بھی اسلامی، نظریہ بھی اسلامی، شکل وصورت بھی اسلامی، یہ کیا ہوا آدھا تیتر آدھا بٹیر کلمہ اِدھر کا پڑھ لیا اور عمل اُدھر کا رکھتے ہو۔ مکمل اسلام میں داخل ہو جاؤ کہ اسلام کے ہوتے ہوئے کسی اور مذہب کی رعایت بھی جائز نہیں ہے ﴿وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ﴾ شیطان کے نقش قدم پر مت چلو ﴿اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ﴾ بے شک شیطان تمھارا کھلا دشمن ہے ﴿فَاِنْ زَلَلْتُمْ﴾ پس اگر تم پھسل گئے یعنی تم نے راستہ چھوڑ دیا ﴿مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْكُمُ الْبَيِّنٰتُ﴾ بعد اس کے کہ تمھارے پاس واضح دلیلیں آ گئیں ﴿فَاعْلَمُوْٓا﴾ پس تم جان لو ﴿اَنَّ اللّٰهَ﴾ بے شک اللہ تعالیٰ ﴿عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ﴾ غالب ہے یعنی اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر زورآور کوئی بھی نہیں ہے حکیم ہے یعنی حکمت والا ہے۔ اگر وہ فوری طور پر سزا نہیں دیتا تو یہ نہ سمجھو کہ چھوٹ گئے یہ اس کی حکمت ہے باقی اللہ تعالیٰ کی گرفت بڑی سخت ہے ﴿هَلْ يَنْظُرُوْنَ﴾ نہیں یہ انتظار کرتے ﴿اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيَهُمُ اللّٰهُ﴾ مگر کہ آئے اللہ تعالیٰ ان کے پاس ﴿فِيْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ﴾ بادلوں کے سائے میں ﴿وَالْمَلٰٓئِكَةُ﴾ اور فرشتے۔ قیامت کا دن ہوگا اور اللہ تعالیٰ کی ذات اور شان کے جو لائق ہے اس طرح آنا جو ہماری سمجھ میں نہیں آسکتا۔ اللہ رب العزت کی عدالت قائم ہوگی اور سب اللہ تعالیٰ کی

عدالت میں پیش ہوں گے اور سب اللہ تعالیٰ کو دیکھیں گے ﴿وُجُوۡهٌ يَّوۡمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ ۝ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ۝﴾ [سورۃ القیامہ] آنکھوں کے ساتھ رب نظر آئے گا اور اللہ تعالیٰ سوال کرے گا کہ:

اے انسانو! میں نے تمھیں انسان بنایا تھا قدرت اور طاقت عطا کی تھی تم نے کام کون سے کیے ہیں؟ رتی رتی کا حساب ہوگا۔ تو جو آنا رب تعالیٰ کی ذات کے لائق ہو اس طرح رب تعالیٰ ضرور آئے گا اس طرح لگے گا کہ بادلوں کے سائے ہیں اور فرشتوں کا ہجوم ہے ان کے درمیان رب تعالیٰ جلوہ افروز ہوں گے پھر سب سے حساب ہوگا ﴿وَقُضِيَ الۡاَمۡرُ﴾ اور معاملہ طے کیا جائے گا۔ کیا یہ اس کے منتظر ہیں کہ قیامت کی عدالت قائم ہو اور اللہ تعالیٰ فیصلہ فرمائیں۔ یاد رکھو! ﴿وَاِلَى اللّٰهِ تُرۡجَعُ الۡاُمُوۡرُ﴾ اور سب کام اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹائے جاتے ہیں۔ وہی خالق اور وہی مالک، وہی رازق، وہی سب کچھ کرنے والا ہے۔ اس کے سوا کسی کے پاس ایک رتی بھی نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ سمجھ عطا فرمائے۔

﴿سَلۡ بَنِىۡٓ اِسۡرَآءِيۡلَ﴾ سوال کر بنی اسرائیل سے ﴿كَمۡ اٰتَيۡنٰهُمۡ﴾ کتنی ہم نے دی ان کو ﴿مِّنۡ اٰيَةٍ﴾ اپنی قدرت کی نشانیاں ﴿بَيِّنَةٍ﴾ واضح ﴿وَمَنۡ يُّبَدِّلۡ﴾ اور جس نے بدل دی ﴿نِعۡمَةَ اللّٰهِ﴾ اللہ تعالیٰ کی نعمت ﴿مِنۡۢ بَعۡدِ مَا جَآءَتۡهُ﴾ بعد اس کے کہ اس کے پاس نعمت آگئی ﴿فَاِنَّ اللّٰهَ﴾ پس بے شک اللہ تعالیٰ ﴿شَدِيۡدُ الۡعِقَابِ﴾ سخت سزا دینے والا ہے ﴿زُيِّنَ لِلَّذِيۡنَ كَفَرُوا﴾ مزین کی گئی ان لوگوں کے لیے جو کافر ہیں ﴿الۡحَيٰوةُ الدُّنۡيَا﴾ دنیا کی زندگی ﴿وَيَسۡخَرُوۡنَ﴾ اور وہ مسخرہ کرتے ہیں ﴿مِنَ الَّذِيۡنَ﴾ ان لوگوں سے ﴿اٰمَنُوۡا﴾ جو ایمان لائے ﴿وَالَّذِيۡنَ اتَّقَوۡا﴾ حالانکہ وہ لوگ جو کفر اور شرک سے بچتے ہیں ﴿فَوۡقَهُمۡ﴾ ان کے اُوپر ہوں گے ﴿يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ﴾ قیامت والے دن ﴿وَاللّٰهُ يَرۡزُقُ مَنۡ يَّشَآءُ بِغَيۡرِ حِسَابٍ﴾ اور اللہ تعالیٰ رزق دیتا ہے جس کو چاہے بغیر حساب کے ﴿كَانَ النَّاسُ﴾ تھے لوگ ﴿اُمَّةً وَّاحِدَةً﴾ ایک ہی گروہ ﴿فَبَعَثَ اللّٰهُ﴾ پس بھیجے اللہ تعالیٰ نے ﴿النَّبِيّٖنَ﴾ انبیاء ﴿مُبَشِّرِيۡنَ﴾ خوش خبری سنانے والے ﴿وَمُنۡذِرِيۡنَ﴾ اور ڈرانے والے ﴿وَاَنۡزَلَ مَعَهُمُ الۡكِتٰبَ﴾ اور نازل فرمائی اللہ تعالیٰ نے ان پر کتاب ﴿بِالۡحَـقِّ﴾ حق کے ساتھ ﴿لِيَحۡكُمَ بَيۡنَ النَّاسِ﴾ تا کہ وہ کتابیں فیصلہ کریں لوگوں کے درمیان ﴿فِيۡمَا﴾ ان چیزوں میں ﴿اخۡتَلَفُوۡا فِيۡهِ﴾ جن کے حق ہونے میں لوگوں نے اختلاف کیا ﴿وَمَا اخۡتَلَفَ فِيۡهِ﴾ اور نہیں اختلاف کیا اس میں ﴿اِلَّا الَّذِيۡنَ اُوۡتُوۡهُ﴾ مگر اُن لوگوں نے جن کو دی گئی کتاب ﴿مِنۡۢ بَعۡدِ مَا جَآءَتۡهُمُ الۡبَيِّنٰتُ﴾ بعد اس کے کہ واضح دلیلیں ان کے پاس آگئیں ﴿بَغۡيًا﴾ سرکشی کرتے ہوئے ﴿بَيۡنَهُمۡ﴾ آپس میں ﴿فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا﴾ پس اللہ نے ہدایت دی ان لوگوں کو جو ایمان لائے ﴿لِمَا

اخْتَلَفُوْا فِيْهِ﴾ اس چیز میں جس میں انھوں نے اختلاف کیا تھا﴿مِنَ الْحَقِّ﴾ حق سے ﴿بِاِذْنِهٖ﴾ اللہ تعالیٰ نے اپنے حکم سے ﴿وَ اللّٰهُ یَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ﴾ اور اللہ تعالیٰ ہدایت دیتا ہے جس کو چاہے ﴿اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ﴾ سیدھے راستے کی طرف۔

بنی اسرائیل کا تذکرہ

حضرت یعقوب علیہ السلام کا لقب تھا اسرائیل اور یہ عبرانی زبان کا لفظ ہے۔ اِسراء کا معنیٰ عبد اور ایل کے معنیٰ اللہ تو اسرائیل کے لفظی معنیٰ ہیں عبداللہ، اللہ کا بندہ۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارہ بیٹے تھے بیٹی کوئی نہ تھی اُن بارہ بیٹوں میں سے ایک حضرت یوسف علیہ السلام تھے جو کہ پیغمبر تھے۔ اور ان کا مفصل واقعہ سورۃ یوسف میں مذکور ہے۔

اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل پر بڑے انعام فرمائے تھے لیکن انھوں نے رب تعالیٰ کی نعمتوں کی قدر نہیں کی۔ اور یہ بات آپ پہلے پارے میں پڑھ چکے ہیں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ تیہ کے میدان میں جس کو آج کے جغرافیہ میں وادئ سینائی کہتے ہیں۔ یہ میدان چھتیس میل لمبا ہے اور چوبیس میل چوڑا ہے اس وادئ سینائی میں جب پہنچے تو ان کو حکم ہوا کہ عمالقہ قوم کے ساتھ جہاد کرو اور چھٹے پارے میں مذکور ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام نے ان کو جہاد کا حکم دیا کہ جہاد کی تیاری کرو تو کہنے لگے ﴿فَاذْهَبْ اَنْتَ وَ رَبُّكَ فَقَاتِلَاۤ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ﴾ "اے موسیٰ علیہ السلام! تم جاؤ اور تمھارا رب جائے اور جا کے ان کے ساتھ لڑو ہم تو اس کے ساتھ لڑائی نہیں کر سکتے۔" دیکھو! کتنا گستاخانہ جواب ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان پر اس میدان سے نکلنا چالیس سال تک حرام کر دیا اور یہ لوگ ہزاروں کی تعداد میں تھے اور اس میدان میں ان کے لیے گرمی سے بچنے کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان پر بادل کا سایہ کیا﴿وَ ظَلَّلْنَا عَلَیْكُمُ الْغَمَامَ﴾ میں اسی کا ذکر ہے وہاں پر کھانے کے لیے کچھ نہ تھا اللہ تعالیٰ نے من اور سلویٰ کہ ایک تھال میں بھنے ہوئے بٹیرے اور ایک میں کھیر کہ کھاؤ مزے سے صبح بھی اور شام بھی۔

اور پانی کا کوئی انتظام نہ تھا تو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ اس پتھر پر ڈنڈا مارو اس سے چشمے نکلیں گے کافی بڑا پتھر تھا بارہ چشمے اس سے جاری ہوئے۔ اس وقت یہ چیزیں ہماری سمجھ میں نہیں آسکتیں مگر یہ انعام اللہ تعالیٰ نے ان پر کیے اور اس سے پہلے جب وہ ہجرت کر کے چلے تو فرعون کی فوجیں آپہنچیں، آگے بحرِ قلزم تھا جس سے نکلنے کے لیے ان کے پاس گزرنے کے لیے کوئی راستہ نہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے واسطے دریا پھاڑ دیا راستے خشک ہو گئے اور یہ سارے گزر گئے اور پانی اس طرح کھڑا ہو گیا کہ ﴿فَكَانَ كُلُّ فِرْقٍ كَالطَّوْدِ الْعَظِیْمِ﴾ جس طرح دیواریں کھڑی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے تقریباً چار ہزار پیغمبر بنی اسرائیل میں بھیجے اور تین مشہور آسمانی کتابیں اللہ تعالیٰ نے ان کو دیں ان کو اللہ تعالیٰ نے ظاہری نعمتیں بھی بہت عطا فرمائیں اور باطنی نعمتیں بھی مگر ان ظالموں نے کسی نعمت کی قدر نہیں کی ﴿یَقْتُلُوْنَ النَّبِیّٖنَ بِغَیْرِ حَقٍّ﴾ ایک دن میں انھوں نے سارے علاقے میں تینتالیس پیغمبر شہید کیے۔ اُنھوں نے یحییٰ علیہ السلام کو شہید کیا، حضرت زکریا علیہ السلام کو شہید کیا،

شعیا علیہ السلام کو شہید کیا۔

ایک مومن کے متعلق حدیث میں آتا ہے کہ دنیا کا فنا ہو جانا اللہ تعالیٰ کے نزدیک ایک مومن کے قتل ناحق سے آسان ہے تو پھر پیغمبر تو پیغمبر ہوتا ہے اس کے قتل کا کتنا بڑا گناہ ہوگا۔ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان پر عذاب نازل فرمایا اور عذاب کا ذکر بھی قرآن پاک میں موجود ہے۔ ان میں سے بعض پر رب تعالیٰ نے طاعون کی بیماری مسلط فرمائی اور چند گھنٹوں میں ستر ہزار کے لگ بھگ مر گئے اور بعض کو رب تعالیٰ نے بندر اور خنزیر بنایا ﴿وَ جَعَلَ مِنۡهُمُ الۡقِرَدَةَ وَ الۡخَنَازِیۡرَ﴾ ان پر طوفان کا عذاب آیا، ان پر اللہ تعالیٰ نے مینڈک مسلط فرمائے۔ اللہ تعالیٰ اس کا اجمالی طور پر ذکر فرماتے ہیں۔

﴿سَلۡ بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ﴾ تو سوال کر بنی اسرائیل سے ﴿کَمۡ اٰتَیۡنٰهُمۡ مِّنۡ اٰیَةٍۢ بَیِّنَةٍ﴾ کتنی دیں ہم نے ان کو قدرت کی نشانیاں لیکن ﴿وَ مَنۡ یُّبَدِّلۡ نِعۡمَةَ اللّٰهِ﴾ اور جو شخص اللہ کی نعمتوں کو بدل دے ﴿مِنۡۢ بَعۡدِ مَا جَآءَتۡهُ﴾ بعد اس کے کہ وہ نعمتیں اس کے پاس آچکیں ﴿فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِیۡدُ الۡعِقَابِ﴾ پس بے شک رب تعالیٰ سخت سزا دینے والا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو کیسی کیسی سزائیں دیں بندر بنایا، خنزیر بنایا، چہرے مسخ کیے۔ اور ایک قوم کو اللہ تعالیٰ نے چوہے بنایا اور وہ تین دن کے بعد مر گئے تھے ان میں سے کوئی بھی نہ بچا۔ تو جو شخص رب تعالیٰ کی نعمت کو بدل دے اللہ تعالیٰ اس کو سخت سے سخت سزا دیتے ہیں۔

آگے فرمایا ﴿زُیِّنَ لِلَّذِیۡنَ کَفَرُوا﴾ مزین کی گئی ان لوگوں کے واسطے جو کافر ہیں ﴿الۡحَیٰوةُ الدُّنۡیَا﴾ دنیا کی زندگی۔ کافروں کی نگاہ میں دنیا ہی دنیا ہے۔ دنیا کی ترقی اور عروج ان کے سامنے ہے اور بس۔ اور یہ کافر ﴿وَ یَسۡخَرُوۡنَ مِنَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا﴾ مسخرہ کرتے ہیں ان لوگوں سے جو ایمان لائے ان کے پھٹے پُرانے کپڑے دیکھ کر، ان کی غربت دیکھ کر ان کا مذاق اُڑاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

سن لو! ﴿وَ الَّذِیۡنَ اتَّقَوۡا﴾ اور وہ لوگ جو کفر و شرک سے بچے ﴿فَوۡقَهُمۡ﴾ ان کافروں کے اُوپر ہوں گے ﴿یَوۡمَ الۡقِیٰمَةِ﴾ قیامت والے دن۔ اُونچے اس لحاظ سے بھی کہ جنت کا جو محل وقوع ہے وہ اُوپر ہوگا اور دوزخ نیچے ہوگی اور درجے کے اعتبار سے تو کہاں مومن اور کہاں کافر۔ یہ آسمان اور زمین سے بھی بڑھ کر فرق ہے۔

آٹھویں پارے میں آتا ہے جس کا ترجمہ یہ ہے "بہشت والے دوزخیوں کو پکار کر کہیں گے ہم نے سچا پالیا جو وعدہ ہمارے پروردگار نے ہم سے کیا تھا۔ پس کیا جو وعدہ تمھارے رب نے تمھارے ساتھ کیا تھا تم نے بھی اُسے سچا پایا؟" یعنی دنیا میں تم ہمیں طعنے دیتے تھے اور کہتے تھے اے فاقے کاٹنے والو! کیا تم سچے ہو۔ کیا ہمارے سچے ہونے کا پتا چل گیا ہے اور اسی پارے میں یہ بھی آتا ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ کافر مومنوں کے آگے ہاتھ پھیلائیں گے کہ جنت کی جو نعمتیں تم کھاتے ہو اس میں سے کچھ ہمیں بھی دے دو۔ اس وقت مومن جواب دیں گے کہ ﴿اِنَّ اللّٰهَ حَرَّمَهُمَا عَلَی الۡکٰفِرِیۡنَ﴾ ہم یہ پانی اور رزق تمھیں دینے کے مجاز نہیں ہیں اس واسطے کہ رب نے یہ رزق اور پانی کافروں پر حرام کیا ہے۔

کثرتِ مال خدا کے راضی ہونے کی دلیل نہیں

تو اس وقت معلوم ہوگا کہ تم دنیا میں ان بھوکے ننگوں کے ساتھ کس طرح مذاق اُڑاتے رہے تو رزق کی زیادتی رب تعالیٰ کے ہاں مقبولیت کی دلیل نہیں ہے ﴿وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ﴾ اور اللہ تعالیٰ رزق دیتا ہے جس کو چاہتا ہے بغیر حساب کے۔ رزق کا زیادہ ملنا اگر اللہ کے ہاں مقبول ہونا ہے تو معاذ اللہ پھر یہ کہنا پڑے گا کہ قارون تو اللہ تعالیٰ کا بڑا پیارا تھا۔ جس کا ذکر قرآن شریف میں آتا ہے کہ اس کے پاس اتنے خزانے تھے کہ ان کی چابیوں کی اچھی خاصی جماعت اُٹھاتی تھی عصبہ کا لفظ دس سے لے کر چالیس تک بولا جاتا ہے۔ تو جس کے خزانوں کی چابیاں اچھی خاصی جماعت اُٹھاتی تھی اس کے خزانوں کا خود حساب لگالو۔

اسی طرح معاذ اللہ تعالیٰ ثم معاذ اللہ تعالیٰ، حدیثیں تم سنتے رہتے ہو کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کی روٹی بھی دو دن پیٹ بھر کر نہیں کھائی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دو دن مسلسل جو کی روٹی بھی پیٹ بھر کر نصیب نہیں ہوئی اور تین تین مہینے گزر جاتے کہ چولہے میں آگ نہیں جلتی تھی یعنی پکانے کے لیے کوئی چیز نہیں ہوتی تھی تو پھر معاذ اللہ تعالیٰ یہ کہنا پڑے گا کہ رب تعالیٰ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ناراض تھے کیوں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تو کچھ نہیں دیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا چھوٹا سا کمرہ تھا، ایک آدھ مرتبہ چراغ جلانے کا ذکر آتا ہے، باقی اس گھر میں چراغ بھی روشن نہیں ہوتا تھا کیوں کہ اتنی توفیق نہیں تھی، سحری کے وقت حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اس طرح لیٹی ہوتی تھیں جیسے سامنے جنازہ پڑا ہوتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم دیر تک قرآن کریم پڑھتے رہتے تھے، پھر جب رکوع کے بعد سجدہ میں جاتے تھے تو بخاری شریف کی روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی ٹانگوں کو دباتے تھے وہ اکٹھی کر لیتی تھیں پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم سجدہ کرتے تھے ورنہ سجدہ نہیں ہو سکتا تھا، رہنے کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ مکان تھا۔

تو فرمایا کہ ان کو سمجھ لینا چاہیے کہ قبولیت مال میں نہیں ﴿وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ﴾ اور اللہ رزق دیتا ہے جس کو چاہتا ہے بغیر حساب کے اور حساب کے معنیٰ عربی لغت میں مشقت کے بھی ہوتے ہیں۔ تو ایسے لوگ بھی ہیں جن کو رب بغیر مشقت کے وافر مقدار میں مال دے دیتا ہے اور حساب کا معنیٰ مطالبے کے بھی ہوتے ہیں۔ تو بعض لوگوں کو رب تعالیٰ بغیر مطالبے اور مانگنے کے دیتا ہے اور اتنا کہ وہ اس کو سنبھال نہیں سکتے اور بغیر حساب کے معنیٰ لاتعداد، بے شمار۔ تو رزق اللہ تعالیٰ ان کو لوگوں کو بھی دیتا ہے جن پر راضی ہوتا ہے اور ان کو بھی دے دیتا ہے جن پر ناراض ہوتا ہے۔

اور یہ حدیث آپ نے کئی مرتبہ سنی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ رزق ان کو بھی دے دیتا ہے جن سے راضی ہوتا ہے اور ان کو بھی دے دیتا ہے جن سے ناراض ہوتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ ایمان اور دین صرف ان کو دیتا ہے جن پر راضی ہوتا ہے۔ اس واسطے رزق کی کثرت اور قلت کے ساتھ مقبولیت اور مردودیت وابستہ نہیں ہے۔ اور یہ بھی آپ نے درس میں سنا کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے روایت کی کہ میں نے ستر اصحابِ صفہ جو اس وقت کے طالب علم ہوتے تھے فرمایا میں نے خود شمار

کیے۔ان کا حال یہ تھا کہ کسی کے پاس کرتہ (قمیص) نہ تھا اور کسی کے پاس چادر نہ تھی لمبا سا ٹاٹ اس نے پہن رکھا تھا اور جب بیٹھتے تھے تو ایک دوسرے کے پیچھے چھپ کر بیٹھتے تھے کہ ننگے نہ ہو جائیں۔اور آج وہ جنت کے وارث ہیں۔

عبداللہ بن اُبی کا جنازہ

اور اسی مدینہ طیبہ میں رہنے والا عبداللہ بن اُبی رئیس المنافقین جس کا جنازہ بھی آنحضرت ﷺ نے پڑھایا اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے آپ ﷺ کے پیچھے جنازہ پڑھا۔(اور ہمارا ایمان ہے کہ دنیا کے کروڑوں اولیاء کرام مل کر ایک صحابی کا درجہ حاصل نہیں کر سکتے۔)اور آپ ﷺ نے اپنا کرتہ (قمیص) مبارک بھی اپنے جسم مبارک سے اُتار کر اس کو بہ طور کفن پہنایا اور اپنا لعاب مبارک بھی اس کے جسم پر لگایا، اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتا ہے۔اس کے بارے میں رب تعالیٰ نے قرآن پاک میں فرمایا ﴿اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ﴾ [التوبہ:۸۰] ”اگر آپ ﷺ اس کے لیے ستر مرتبہ بھی استغفار کریں پھر بھی اللہ تعالیٰ اس کو ہرگز نہیں بخشے گا۔“

فرمایا ﴿كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً﴾ سارے لوگ ایک ہی جماعت تھے حضرت آدم علیہ السلام کی عمر تھی ہزار سال اور عقیدہ سب کا ایک ہی ہوتا تھا البتہ جرائم ہوتے تھے، قابیل نے ہابیل کو قتل کر دیا لیکن اسلام کے سوا اور کوئی مذہب نہ تھا، حضرت آدم علیہ السلام کے بعد ایک ہزار سال اور گزرے نوح علیہ السلام تک بھی سب لوگ ایک ہی عقیدے پر قائم تھے۔

سب سے پہلی قوم جو مشرک پیدا ہوئی وہ حضرت نوح علیہ السلام کی تھی۔تو فرمایا لوگ ایک ہی عقیدہ پر تھے پھر لوگوں نے اختلاف کیا اور کفر و شرک شروع کیا ﴿فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ﴾ پس اللہ تعالیٰ نے پیغمبر بھیجے ﴿مُبَشِّرِيْنَ﴾ نیکوں کو خوش خبری سنانے کے لیے کہ تم پر رب راضی ہوگا اور تم پر رب کی رحمتیں نازل ہوں گی اور مرنے کے بعد تمھاری زندگی بڑی سہل اور آسان ہوگی اور جنت میں داخل ہوگے ﴿وَمُنْذِرِيْنَ﴾ اور نافرمانوں کو ڈرانے والے کہ کفر و شرک چھوڑ دو ورنہ دنیا میں بھی رب تعالیٰ کا عذاب آ سکتا ہے اور عذاب قبر الگ ہے اور آخرت کا عذاب الگ ہے اور دوزخ کا عذاب دائمی ہے۔اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے تمام مسلمین اور مسلمات کو اس سے بچائے۔

﴿وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ﴾ اور اللہ تعالیٰ نے پیغمبروں پر کتابیں نازل فرمائیں، صحیفے نازل فرمائے، وحی نازل فرمائی ﴿بِالْحَقِّ﴾ حق کے ساتھ۔کیوں؟ ﴿لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ﴾ تاکہ وہ کتابیں فیصلہ کریں لوگوں کے درمیان ﴿فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ﴾ ان چیزوں میں جن میں لوگوں نے اختلاف کیا۔یعنی جب اختلاف شروع ہوا تو اللہ تعالیٰ نے پیغمبر بھیجے اُنھوں نے حق کو واضح کیا اور باطل کو بھی واضح کیا کہ یہ حق ہے، یہ باطل ہے اس کو اپناؤ اور اس کے نزدیک نہ جاؤ۔﴿وَمَا اخْتَلَفَ فِيْهِ﴾ اور نہیں اختلاف کیا اس میں ﴿اِلَّا الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ﴾ مگر اُن لوگوں نے جن کو کتابیں دی گئی تھیں ﴿مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ﴾ بعد اس کے کہ ان کے پاس واضح دلیلیں پہنچ گئی تھیں۔یعنی جن لوگوں نے اختلاف کیا تھا وہ غلط فہمی کا شکار نہ تھے بلکہ ضد تھی حق کے ساتھ عناد تھا۔

یہ اختلاف کیوں کیا؟ ﴿بَغْیًا بَیْنَهُمْ﴾ آپس میں سرکشی کرتے ہوئے اُنھوں نے حق کے ساتھ اختلاف کیا ﴿فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ پس اللہ تعالیٰ نے ہدایت دی ان لوگوں کو جنھوں نے ایمان قبول کیا ﴿لِمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ﴾ اس چیز میں ہدایت دی جس حق میں لوگوں نے اختلاف کیا تھا۔ تو اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں کو حق قبول کرنے کی توفیق عطا فرمائی ﴿بِاِذْنِهٖ﴾ اپنے حکم اور اپنی مہربانی سے ﴿وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ﴾ اور اللہ تعالیٰ ہدایت دیتا ہے جس کو چاہتا ہے ﴿اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ﴾ سیدھے راستے کی۔ اور ہدایت کا ضابطہ اس طرح بیان فرمایا ہے ﴿وَيَهْدِيْۤ اِلَيْهِ مَنْ اَنَابَ﴾[الرعد:۲۷] "جو شخص رب کی طرف رجوع کرتا ہے تو رب اس کو ہدایت دیتا ہے۔" ایک مقام پر ﴿مَنْ يُّنِيْبُ﴾ کے لفظ ہیں جو شخص رب تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہے، رب اس کو ہدایت دیتا ہے اور جو شخص رب تعالیٰ سے بے پروائی کرتا ہے، مستغنی ہے تو رب تعالیٰ کو اس کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کی ذات تو صمد ہے، بے نیاز ہے۔ محتاج تو ہم ہیں۔ رب تعالیٰ کسی کا محتاج نہیں ہے۔

﴿اَمْ حَسِبْتُمْ﴾ کیا تم خیال کرتے ہو ﴿اَنْ﴾ اس بات کا ﴿تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ﴾ کہ تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے ﴿وَلَمَّا يَاْتِكُمْ﴾ اور ابھی تک نہیں آئیں تمھارے پاس ﴿مَّثَلُ الَّذِيْنَ﴾ مثالیں ان لوگوں کی ﴿خَلَوْا﴾ جو گزر چکے ہیں ﴿مِنْ قَبْلِكُمْ﴾ تم سے پہلے ﴿مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ﴾ پہنچی ان کو مالی پریشانی ﴿وَالضَّرَّآءُ﴾ اور بدنی پریشانی ﴿وَزُلْزِلُوْا﴾ اور ان پر زلزلے کی سی کیفیت طاری کر دی گئی ﴿حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ﴾ یہاں تک کہ کہا اس وقت کے رسول نے ﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ﴾ اور اُن لوگوں نے جو ایمان لائے تھے اس کے ساتھ ﴿مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ﴾ کب آئے گی مدد اللہ تعالیٰ کی ﴿اَلَاۤ﴾ خبردار ﴿اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ﴾ بے شک اللہ تعالیٰ کی مدد قریب ہے ﴿يَسْــَٔلُوْنَكَ﴾ سوال کرتے ہیں آپ سے ﴿مَاذَا يُنْفِقُوْنَ﴾ کیا کچھ وہ خرچ کریں ﴿قُلْ﴾ کہہ دے ﴿مَاۤ اَنْفَقْتُمْ﴾ جو چیز تم خرچ کرو ﴿مِّنْ خَيْرٍ﴾ مال سے ﴿فَلِلْوَالِدَيْنِ﴾ پس ماں باپ کے لیے ﴿وَالْاَقْرَبِيْنَ﴾ اور قریبی رشتہ داروں کے لیے ﴿وَالْيَتٰمٰى﴾ اور یتیموں کے لیے ﴿وَالْمَسٰكِيْنِ﴾ اور مسکینوں کے لیے ﴿وَابْنِ السَّبِيْلِ﴾ اور مسافروں کے لیے ﴿وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ﴾ اور جو بھی تم کرو گے خیر اور بھلائی ﴿فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ﴾ پس بے شک اللہ تعالیٰ اس کو جاننے والا ہے ﴿كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ﴾ فرض کیا گیا تم پر دشمنوں کے ساتھ لڑنا ﴿وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ﴾ اور یہ لڑنا تمھیں ناپسند ہے ﴿وَعَسٰۤى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْــًٔا﴾ اور قریب ہے کہ تم کسی چیز کو ناپسند کرو ﴿وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ﴾ اور تمھارے لیے وہی بہتر ہو ﴿وَعَسٰۤى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْــًٔا﴾ اور قریب ہے کہ تم کسی چیز کو پسند کرو ﴿وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ﴾ اور تمھارے لیے وہی بُری ہو ﴿وَاللّٰهُ يَعْلَمُ﴾ اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے ﴿وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ اور تم نہیں جانتے۔

آنحضرت ﷺ نے جب مکہ مکرمہ میں اپنی نبوت کا اعلان کیا اور رب تعالیٰ کی توحید بیان فرمائی اور قیامت کے متعلق عقیدہ بتایا اور اچھے اخلاق کے ساتھ زندگی بسر کرنے کا سبق دیا تو اس سلسلے میں آپ ﷺ کی سخت مخالفت ہوئی، چند آدمیوں کے سوا کسی نے آپ ﷺ کا ساتھ نہ دیا اور جو آدمی مسلمان ہوئے ان کو بھی بڑی بڑی تکلیفیں پہنچائیں اور ان میں سے بعض شہید ہو گئے اور بعض کو ٹخنوں میں رسیاں باندھ کر گلیوں اور سڑکوں پر کھینچا گیا بعض کو گرم ریت پر لٹا کر ان کی چھاتی پر چڑھ جاتے، غرضیکہ طرح طرح کی تکلیفیں دیں۔

حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ کا قبولِ اسلام

حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ جب مسلمان ہوئے ان کا چچا بہت سخت آدمی تھا، اس نے کہا لڑکے کلمہ چھوڑ دے، کہنے لگے چچا جی! کلمہ چھوڑنے والی چیز نہیں کلمہ تو پڑھنے والی چیز ہے۔ چچا نے دیوار میں لمبی موٹی میخ ٹھونک کر ان کے ہاتھ پاؤں باندھ کر اس سے لٹکا دیا اور اس پر بھی تسلی نہ ہوئی تو اپنے نوکروں کو حکم دیا کہ خشک غلاظت اکٹھی کر کے لاؤ اور اس کا دھواں اس کی ناک میں دو ان کے ساتھ یہ بھی کیا گیا۔ ان کو ایمان سے برگشتہ کرنے کے لیے بہت کچھ کیا گیا لیکن یہ لوگ بڑے صبر، ہمت اور حوصلے والے تھے۔ شکر کرو کہ رب تعالیٰ نے ہمیں ایسی تکلیفوں میں مبتلا نہیں کیا ورنہ ہم میں سے کوئی ایک بھی کھڑا ہونے والا نہیں ہے۔

اسی طرح جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ مسلمان ہوئے تو ان کے چچا نے بھی صف میں لپیٹ کر سریئے کے ساتھ لٹکا دیا اور گھر کے افراد پر پابندی لگا دی کہ اسے کھانے پینے کے لیے کچھ نہ دیا جائے۔ مگر وہ بڑی ہمت والے لوگ تھے کوئی بھی ان میں سے نہ ڈگمگایا پھر ہجرت کوئی معمولی بات نہیں۔ اپنا گھر بار، کاروبار، برادری چھوڑنا اور پھر دشمنوں کے ہاتھ میں دے کر چلے جانا کوئی آسان بات نہیں ہے۔ پھر بدر میں جو تکلیفیں پیش آئیں، اس کے بعد اُحد میں جو تکلیفیں برداشت کرنا پڑیں، ستر آدمی شہید ہوئے اور بے شمار زخمی ہوئے۔ اس کے بعد پھر غزوہ خندق میں مسلمانوں کو تکلیفیں اُٹھانا پڑیں۔ ان تکلیفوں کو دیکھ کر بعض نئے مسلمان گھبرا جاتے تھے۔

اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿اَمْ حَسِبْتُمْ﴾ کیا تم خیال کرتے ہو ﴿اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ﴾ یہ کہ تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے ﴿وَلَمَّا يَاْتِكُمْ﴾ اور ابھی تک تمھارے پاس نہیں آئیں ﴿مَّثَلُ الَّذِيْنَ﴾ ان لوگوں کی مثالیں ﴿خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ﴾ جو تمھارے سے پہلے گزر چکے ہیں یعنی جو لوگ گزر چکے ہیں ان پر جس طرح کی تکلیفیں آئی تھیں اس طرح کی ابھی تک تمھارے اُوپر نہیں آئیں اور تکلیفیں برداشت کرنے کے بغیر جنت نہیں ملتی۔ وہ بڑی قیمتی ہے اور جو چیز اعلیٰ اور عمدہ ہوتی ہے اس کی قیمت بھی زیادہ ہوتی ہے۔

حضرت خباب بن ارت رضی اللہ عنہ کی آزمائش

بخاری شریف میں روایت ہے۔ حضرت خباب بن ارت رضی اللہ عنہ غلام تھے۔ ان کا آقا امیہ بن خلف بڑا ظالم اور سخت گیر

تھا۔ جب یہ مسلمان ہو گئے تو ان کو بھوکا پیاسا بھی رکھتا اور مارتا اور کہتا کلمہ چھوڑ دے لیکن انھوں نے کہا کہ کلمہ نہیں چھوڑ سکتا، جس طرح ہمارے ہاں کیکر کا درخت جو دیر تک جلتا رہتا ہے، اسی طرح عرب میں ایک درخت ہے جس کو غطاہ کہتے ہیں اس کے کوئلے جلا کر اور ان کا کرتہ اُتروا کر کمر کے بل لٹا دیتا اور چھاتی پر پاؤں رکھ کر کھڑا ہو جاتا تھا۔ دیکھو! آج ہم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے عمل تو دور کی بات ہے۔ حضرت خباب رضی اللہ عنہ کی کمر سے خون جاری ہو جاتا اور رطوبت نکلتی، اس سے کوئلے ٹھنڈے ہو جاتے، کمر میں گڑھے سے بن گئے تھے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کعبۃ اللہ کے سائے میں سر کے نیچے چادر رکھ کر لیٹے ہوئے تھے، خباب بن ارت رضی اللہ عنہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آئے اور اپنی کمر سے کرتہ اُٹھایا اور کہنے لگے حضرت! میرا ظالم آقا امیہ بن خلف مجھے کوئلوں پر لٹا کر میری چھاتی پر کھڑا ہو جاتا ہے اور مجھے پہلو بھی نہیں بدلنے دیتا۔ حضرت! دیکھیں میری پیٹھ پر کیسے زخم ہیں، گڑھے پڑے ہوئے ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اے خباب! تم میرے اُمتی ہو اور تم سے پہلے ایسے ایمان والے لوگ بھی گزرے ہیں کہ ان کو ناف تک زمین میں گاڑ کر اور سر پر آری رکھ کر ایک آدمی آگے اور ایک پیچھے کھڑا ہو جاتا اور کہتے کہ کلمہ چھوڑ دے ورنہ ہم تجھے چیر کر دو ٹکڑے کر دیں گے، وہ کہتے کلمہ نہیں چھوڑ نا۔ وہ ظالم آری چلا کر دو ٹکڑے کر دیتے تھے، ایک حصہ ایک طرف اور دوسرا حصہ دوسری طرف گر جاتا تھا۔ آج ہے کوئی اس کا تصور کرنے والا۔ اور فرمایا کہ ایسے بھی تھے کہ ظالموں نے لوہے کی کنگھیاں بنائی ہوئی تھیں اور کہتے تھے کلمہ چھوڑ دو۔ تو ان میں سے جو کلمے پر پختہ رہتے ان کے چمڑے اور گوشت کو ان لوہے کی کنگھیوں سے نوچ لیتے، ہڈیاں رہ جاتیں اور وہ تڑپ تڑپ کر مر جاتے مگر کلمہ نہیں چھوڑتے تھے۔

اسی طرح سورۃ البروج میں واقعہ بیان ہوا ہے۔ اس وقت کے ظالم بادشاہ نے آگ کا بھٹہ تیار کیا۔ ظالم بادشاہ اور اس کے وزیروں، مشیروں نے کناروں پر کرسیاں لگا لیں اور چاروں طرف اللہ کی مخلوق کھڑی ہے۔ ایک ایک آدمی کو آگے کر کے کہتے کہ کلمہ چھوڑ دو ورنہ آگ میں ڈال دیں گے، وہ کلمہ نہیں چھوڑتے تھے۔ سب کے سامنے آگ میں ڈال دیئے جاتے اور وہ جل جاتے، پھر دوسرے کو، پھر تیسرے کو مگر کوئی آدمی بھاگا نہیں۔

ایک عورت نے اپنا دودھ پیتا بچہ اپنی چھاتی کے ساتھ لگایا ہوا تھا، ان ظالموں نے بچہ چھین کر آگ میں پھینک دیا۔ ماں تھی، بے چاری کانپ اُٹھی اور کہا اس بچے کا کیا قصور کلمہ تو میں نے پڑھا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے اس بچے کو قوتِ گویائی عطا فرمائی، اس دودھ پیتے بچے نے آواز دی۔ اے میری ماں! تو حق پر ہے ڈرنا نہیں یہ ظاہری طور پر آگ نظر آتی ہے حقیقت میں یہ جنت کا راستہ ہے، اُس عورت کو بھی اُنھوں نے اُٹھا کر آگ میں پھینک دیا۔

یہ چیزیں اس وقت ہمارے تصور میں بھی نہیں آسکتیں مگر وہ بڑے پختہ اور مضبوط ایمان کے مالک تھے۔ ہمیں تو آج تھوڑی سی بھی تکلیف آجائے تو لوٹے بن جاتے ہیں یعنی لوٹے کی طرح پھر جاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کو علم ہے کہ ہم امتحان کے قابل ہی نہیں ہیں اس واسطے ہم پر زیادہ سختی نہیں آتی۔ اُن لوگوں پر سختیاں آئیں اور اُنھوں نے برداشت کیں، جان دے دی مگر

ایمان نہیں چھوڑا۔

عبداللہ بن حذافہ سہمی رضی اللہ عنہ کو قیصر روم کی پیشکش

حضرت عبداللہ بن حذافہ سہمی رضی اللہ عنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی ہیں، ہرقل روم کی فوجوں نے انہیں گرفتار کرلیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا دورِ خلافت تھا۔ کچھ اور ساتھی بھی گرفتار ہوئے۔ ایک ایک سے انٹرویو لے رہے تھے۔ ان کو ہرقل روم نے دیکھا کہ بڑا خوب صورت اور صحت مند نوجوان ہے قدوقامت بھی خوب ہے اور بات بھی بڑے سلیقے سے کرتا ہے۔ ہرقل نے ان کو کہا برخوردار، عزیز! میں روم کا بادشاہ ہوں، ہرقل میرا نام ہے، قیصر میرا لقب ہے۔ میں تجھے پیشکش کرتا ہوں کہ اُزَوِّجُكَ اِبْنَتِيْ وَاُشْرِكُكَ فِيْ مُلْكِيْ "میں تجھے اپنی لڑکی کا رشتہ دوں گا اور اپنے ملک میں تجھے بڑا عہدہ دے دوں گا، وزیر کہے یا وزیر خارجہ، جو بھی تو چاہے گا تَنَصَّرْتَ تو عیسائیت قبول کرلے۔"

عبداللہ بن حذافہ سہمی رضی اللہ عنہ نے کہا دوبارہ کہو تم نے کیا کہا اس نے پھر اپنی بات دہرائی۔ فرمایا تم تو ایک ملک کے بادشاہ ہو صرف روم کے۔ خدا کی قسم وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ اس ذات کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے اگر تم ساری دنیا کے بادشاہ ہوتے بلا شرکت غیرے اور پھر تم ساری دنیا کا بادشاہ مجھے بنا دیتے اور تاج میرے سر پر رکھ دیتے تو پھر بھی میرے دل میں ایمان چھوڑنے کا تصور بھی نہیں آسکتا۔

حبیب ابن زید انصاری رضی اللہ عنہ مسیلمہ کذاب کے مقابلے میں لڑتے لڑتے گرفتار ہو گئے۔ مسیلمہ کذاب نے ان سے انٹرویو لیا کہ تم ہمارے ساتھ کیوں لڑتے ہو۔ کہنے لگے اس واسطے کہ تو جھوٹا ہے، کذاب ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوت ختم ہے اور تو نبوت کا دعویٰ کرتا ہے۔ مسیلمہ نے کہا کہ تو اس طرح کر کہ مجھے نبی مان لے میں تجھے چھوڑ دوں گا ورنہ اُقَطِّعُكَ اَرْبًا اَرْبًا "میں تیرا ایک ایک جوڑ الگ الگ کر دوں گا۔"

حضرت حبیب ابن زید انصاری رضی اللہ عنہ نے کہا اَنْتَ وَذَاكَ جو تیرے دل میں آتا ہے کر میں نے اپنا کلمہ نہیں چھوڑنا۔ تو اس نے بازو کلائی سے کاٹا پھر کہنی سے کاٹا، پھر کندھوں سے کاٹا۔ ایک ایک عضو اس نے الگ کر دیا مگر انھوں نے ایمان نہیں چھوڑا۔

خبیب بن عدی انصاری رضی اللہ عنہ کو کافروں نے سولی پر چڑھانے کا ارادہ کیا۔ ابوسفیان اس وقت مسلمان نہیں ہوا تھا اور مکہ مکرمہ کی سرداری اس وقت اس کے پاس تھی۔ اس نے کہا برخوردار! میرے ساتھ سودا کرلے۔ وہ یہ کہ تو ایک لفظ کہہ دے تیری رہائی کا میں ذمہ لیتا ہوں۔ لفظ یہ کہہ کہ (نعوذ باللہ) آج میری جگہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو سولی پر چڑھایا جاتا تو کیا اچھا ہوتا۔ قرآن پاک کی رو سے، حدیث پاک کی رو سے، فقہ اسلامی کی رُو سے مُكْرَهٗ یعنی جس پر جبر کیا گیا ہو اس کو کلمۂ کفر کہنا جائز ہے۔ اُس وقت اگر وہ الفاظ جان بچانے کے لیے کہتے تو شرعاً ان کو اجازت تھی۔ حضرت خبیب رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ چچا جی! تم نے کیا کہا؟ حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ نے کفر کی حالت میں وہ الفاظ دہرائے کہ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ تو اتنا کہہ دے (نعوذ باللہ) کہ میری جگہ

محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو لٹکایا جائے تو کیا اچھا ہو۔

فرمایا چچا جی! یہ لفظ تو بڑے وزنی ہیں، خدا کی قسم! میں اپنی سولی کے بدلے اتنا بھی کہنے کے لیے تیار نہیں ہوں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاؤں میں کانٹا بھی چبھے۔ معاف کرنا! مسلمان تو وہ تھے ہم تو صرف نام کے مسلمان ہیں، موروثی مسلمان ہیں، پیدائشی مسلمان ہیں۔ ہم نے تو اسلام کی کوئی خدمت ہی نہیں کی اور نہ ہی محنت کر کے اسلام حاصل کیا ہے۔

تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ﴿اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ﴾ کیا تم خیال کرتے ہو کہ تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے ﴿وَلَمَّا يَاْتِكُمْ﴾ اور ابھی تک تمھارے پاس نہیں آئیں ﴿مَّثَلُ الَّذِيْنَ﴾ مثالیں ان لوگوں کی ﴿خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ﴾ جو تم سے پہلے گزرے ہیں ﴿مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ﴾ پہنچیں ان کو مالی پریشانیاں ﴿وَالضَّرَّآءُ﴾ اور بدنی پریشانیاں ﴿وَزُلْزِلُوْا﴾ اور ان پر ایسی زلزلے کی سی کیفیت طاری کر دی گئی کہ ﴿حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ﴾ یہاں تک کہ اس وقت کے جو رسول تھے انھوں نے بھی فرمایا ﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ﴾ اور اُن لوگوں نے بھی کہا جو ایمان لا چکے تھے ﴿مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ﴾ اللہ تعالیٰ کی مدد کب آئے گی۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اعلان ہوا ﴿اَلَآ﴾ خبردار! ثابت قدم رہنا ایمان نہ چھوڑنا ﴿اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ﴾ بے شک اللہ تعالیٰ کی مدد قریب ہے۔ گو اُنھوں نے جانیں قربان کر دیں مگر اس سے لوگوں میں اچھے تاثرات قائم ہوئے۔ اسلام پھیلا ہے، حق پھیلا ہے سمٹا نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ﴿يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ﴾ یہ آپ سے سوال کرتے ہیں کہ کیا کچھ خرچ کریں۔ حضرت عمرو ابن جموح رضی اللہ عنہ انصاری لنگڑے تھے، جب کھڑے ہوتے تو پھرکی کی طرح پھر جاتے تھے اور تھے بڑے مال دار۔ اُنھوں نے سوال کیا کہ حضرت! میرے پاس پیسے ہیں مجھے مصرف بتائیں کہ میں کہاں خرچ کروں؟

﴿قُلْ﴾ تو کہہ دے ﴿مَآ اَنْفَقْتُمْ﴾ جو بھی تم خرچ کرو گے ﴿مِّنْ خَيْرٍ﴾ مال ﴿فَلِلْوَالِدَيْنِ﴾ پس ماں باپ کے لیے، سب سے پہلے والدین کا حق ہے۔ لیکن یاد رکھنا! یہ زکوٰۃ کی بات نہیں ہو رہی۔ اور نفلی صدقہ بندہ اپنے والدین کو بھی دے سکتا ہے ﴿وَالْاَقْرَبِيْنَ﴾ اور قریبی رشتہ داروں کی مالی امداد کرو ﴿وَالْيَتٰمٰى﴾ یتیموں کی امداد کرو ﴿وَالْمَسٰكِيْنِ﴾ اور مسکینوں کی امداد کرو ﴿وَابْنِ السَّبِيْلِ﴾ اور مسافروں کی امداد کرو۔ یہ مصرف ہیں جتنا دینا چاہو وہ تمھاری صوابدید پر موقوف ہے۔ کوئی حد بندی نہیں ہے کہ تم اتنے پیسے دو یا فلاں چیز دو۔

سید کو زکوٰۃ دینے کا حکم ؟

البتہ یہ مسئلہ یاد رکھیں کہ والدین کو زکوٰۃ، فطرانہ، نذر و منت، قسم کا کفارہ، ظہار کا کفارہ، کسی قسم کی واجب چیز نہیں دی جا سکتی۔ اسی طرح دادے، دادی کو، پردادے کو، نانی، نانے کو، بیٹی کو، پوتے، پوتی کو، نواسے، نواسی کو، نیچے تک چلے جاؤ ان کو بھی زکوٰۃ نہیں لگتی۔

بعض لوگ بے تکی باتیں کرتے ہیں کہ اگر وہ بھوکے ہوں تو بندہ کیا کرے، زکوٰۃ نہ دے، خصوصاً جب سادات کا نمبر آتا ہے تو کہتے ہیں کہ تم یہ کہتے ہو کہ سید کو زکوٰۃ نہیں دینی تو اگر سید بادشاہ بھوکا مرتا ہو تو پھر بندہ کیا کرے؟

گزارش ہے یہ ایک وہمی بات ہے کیوں کہ شریعت نے تم سے چالیس روپے میں سے ایک روپیہ زکوٰۃ کا لیا ہے اور اُنتالیس روپے تمھارے پاس ہیں، تو سید بادشاہ کی اُن اُنتالیس میں سے امداد کرو نا یا اس کو تم نے حرام ہی کھلانا ہے۔ ساری رقم تو شریعت نے تم سے لی نہیں، چالیس میں سے ایک روپیہ لیا ہے۔ سو میں سے اڑھائی روپے لیے ہیں۔ دو سو میں سے پانچ روپے لیے ہیں۔ ایک ہزار میں سے پچیس روپے لیے ہیں تو ۹۷۵ تو تمھاری جیب میں ہیں ان میں سے سید بادشاہ کی خدمت کرو نا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا یہ زکوٰۃ وغیرہ ((لَا تَحِلُّ لِمُحَمَّدٍ ﷺ وَلَا لِاٰلِ مُحَمَّدٍ ﷺ)) "فرمایا یہ زکوٰۃ لوگوں کے مالوں کی میل کچیل ہے نہ میرے واسطے حلال ہے نہ میری آل کے واسطے۔" ہاں! اگر نفلی صدقہ دو تو اس کا تمھیں دوہرا ثواب ملے گا۔ ماں باپ کو دو ایک تو اس واسطے کہ غریب ہیں دوسرا اس واسطے کہ تمھارے ماں باپ ہیں۔ اسی طرح اگر کوئی اور عزیز رشتہ دار ہے، کمزور ہے اس کو دو تو ڈبل ثواب ملے گا یعنی بیس نیکیاں ملیں گی اس واسطے کہ تم صلہ رحمی کر رہے ہو۔ صدقے کا ثواب الگ اور صلہ رحمی کا الگ۔

﴿وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ﴾ اور جو بھی تم کرو گے مال سے ﴿فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ﴾ پس بے شک اللہ تعالیٰ اس کو بہ خوبی جانتا ہے۔

اس سے پہلے کافروں کے مظالم کا ذکر تھا آگے فرمایا تمھیں رب کی طرف سے حکم ہے ﴿كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ﴾ تم پر فرض کیا گیا اپنے دشمنوں کے ساتھ لڑنا۔ مشرکوں کے ساتھ، کافروں کے ساتھ لڑنا تم پر فرض ہے۔ اور یہ فرض کفایہ بھی ہے اور فرض عین بھی ہے۔ فرض کفایہ کا مطلب یہ ہے کہ کچھ لوگ بھی ادا کر دیں تو دوسرے سب لوگ گناہ سے بچ گئے۔ اور فرض عین کا مطلب ہے کہ ہر ایک پر لازم ہے جب تک وہ خود نہیں کرے گا جان نہیں چھوٹے گی۔ دوسرے ملک میں جا کر لڑنا یہ فرض کفایہ ہے۔ اگر کچھ مجاہد کافروں کے ساتھ لڑتے ہیں تو دوسروں کی گردن فارغ ہے۔ اور اگر ملک پر حملہ ہو گیا تو پھر سب پر فرض ہے کسی کو چھٹکارا نہیں ہے۔ خدانخواستہ پاکستان پر انڈیا حملہ کرتا ہے۔ اسرائیل کے ارادے ہیں پاکستان پر حملہ کرنے کے انڈیا کے ساتھ مل کر۔ اگر ایسا ہو گیا تو پھر پاکستان میں رہنے والے ہر مسلمان مرد عورت پر دفاع فرض ہے، فرض عین ہو گا

﴿وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ﴾ وہ تمھیں ناپسند ہے ﴿وَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا﴾ اور قریب ہے کہ تم کسی چیز کو ناپسند کرو ﴿وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ﴾ اور وہی تمھارے لیے بہتر ہو ﴿وَعَسٰٓى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْئًا﴾ اور ممکن ہے کہ تم کسی شے کو پسند کرو ﴿وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ﴾ اور وہی تمھارے لیے بُری ہو۔ اور دیکھو! طبعی طور پر تو انسان جہاد سے گریز کرتا ہے کہ جان دینی، مارنا، زخمی ہونا، تکلیفیں اُٹھانا آسان بات تو نہیں ہے لیکن جہاد کی برکات بڑی ہیں۔

جہادِ افغانستان کی اہمیت

دنیا میں دو ہی قوتیں سمجھی جاتی تھیں، ایک روس اور دوسری امریکہ، یہ دونوں بڑی ظالم اور طاغوتی قوتیں تھیں مگر اللہ تعالیٰ نے روس کو ابابیلوں سے مروا دیا۔

ابتدائی دور میں صرف مدارس کے طالب علم تھے، ہمارے نصرۃ العلوم سے فارغ شدہ تقریباً تیس طالبان شہید ہوئے۔ میرا نواسہ عمران عدیل جس کی عمر ساڑھے سترہ سال تھی وہ خوست کے مقام پر شہید ہوا، میرا بیٹا شاہدان محاذوں پر لڑتا رہا ہے۔

اب اس روس کی قوت منتشر ہو چکی ہے، ان شاء اللہ وہ وقت دور نہیں ہے کہ امریکہ کی طاقت بھی ٹکڑے ٹکڑے ہوگی۔ ظالم آخر کب تک ظلم کریں گے؟ رب کی گرفت بہت سخت ہے ﴿وَاللّٰہُ یَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔ اس واسطے جو رب نے فرمایا ہے وہی حق ہے اسی پر چلو، اس میں خیر اور اسی میں بھلائی ہے۔

﴿یَسْـَٔلُوْنَكَ﴾ سوال کرتے ہیں آپ سے ﴿عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ﴾ عزت والے مہینے کے بارے میں ﴿قِتَالٍ فِیْهِ﴾ کہ اس میں لڑنا کیسا ہے ﴿قُلْ﴾ کہہ دے ﴿قِتَالٌ فِیْهِ﴾ لڑائی اس مہینے میں ﴿كَبِیْرٌ﴾ بڑی ہے ﴿وَ صَدٌّ﴾ اور روکنا ﴿عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ﴾ اللہ تعالیٰ کے راستے سے ﴿وَ كُفْرٌۢ بِهٖ﴾ اور اللہ تعالیٰ کے حکموں کا انکار کرنا ﴿وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ﴾ اور مسجد حرام سے روکنا ﴿وَ اِخْرَاجُ اَهْلِهٖ مِنْهُ﴾ اور وہاں کے باشندوں کو نکالنا ﴿اَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ﴾ یہ اس سے بھی بہت بڑی چیز ہے اللہ تعالیٰ کے نزدیک ﴿وَالْفِتْنَةُ﴾ اور فتنہ ﴿اَكْبَرُ﴾ بہت بڑا ہے ﴿مِنَ الْقَتْلِ﴾ قتل سے ﴿وَ لَا یَزَالُوْنَ﴾ اور ہمیشہ رہیں گے وہ ﴿یُقَاتِلُوْنَكُمْ﴾ تمھارے ساتھ لڑتے ﴿حَتّٰى یَرُدُّوْكُمْ﴾ یہاں تک کہ وہ تمھیں لوٹا دیں ﴿عَنْ دِیْنِكُمْ﴾ تمھارے دین سے ﴿اِنِ اسْتَطَاعُوْا﴾ اگر وہ طاقت رکھیں ﴿وَ مَنْ یَّرْتَدِدْ﴾ اور جو شخص پھر گیا ﴿مِنْكُمْ﴾ تم میں سے ﴿عَنْ دِیْنِهٖ﴾ اپنے دین سے ﴿فَیَمُتْ﴾ پھر مر گیا ﴿وَ هُوَ كَافِرٌ﴾ اور وہ کفر پر مرا ﴿فَاُولٰٓىِٕكَ﴾ پس وہ لوگ ہیں ﴿حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ﴾ اکارت ہو گئے اعمال ان کے ﴿فِی الدُّنْیَا﴾ دنیا میں بھی ﴿وَالْاٰخِرَةِ﴾ اور آخرت میں بھی ﴿وَ اُولٰٓىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ﴾ اور وہ ہیں دوزخ والے ﴿هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ﴾ وہ ہمیشہ دوزخ میں رہا کریں گے ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا﴾ بے شک وہ لوگ جو ایمان لائے ﴿وَالَّذِیْنَ هَاجَرُوْا﴾ اور وہ جنھوں نے ہجرت کی ﴿وَ جٰهَدُوْا﴾ اور انھوں نے جہاد کیا ﴿فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ﴾ اللہ تعالیٰ کے راستے میں ﴿اُولٰٓىِٕكَ یَرْجُوْنَ رَحْمَتَ اللّٰهِ﴾ وہ امید رکھتے ہیں اللہ تعالیٰ کی رحمت کی ﴿وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ﴾ اور اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے۔

حرمت کے مہینے میں لڑائی

آنحضرت ﷺ کو ایک علاقے کے بارے میں خبر ملی کہ وہاں کے کفار آس پاس کے مسلمانوں کو اسلام سے پھیرنے کے لیے بڑا تشدد کر رہے ہیں۔ تو آنحضرت ﷺ اپنے پھوپھی زاد بھائی عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کو امیر لشکر بنایا اور تقریباً چار سو کے لگ بھگ مجاہدین کا ایک دستہ ان کے ماتحت روانہ کیا کہ تم نے فلاں محاذ پر پہنچنا ہے۔ وہاں پر جو مسلمان ہیں ان پر ظلم ہو رہا ہے تمھیں ان کا دفاع کرنا ہے۔ یہ جمادی الاخریٰ کا مہینہ تھا اور آخری تاریخیں تھیں اور اگلا مہینہ رجب کا تھا۔ رجب کے مہینے میں لڑائی منع ہوتی تھی اور یہ بات حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دور سے چلی آ رہی تھی۔ ذوالقعدہ، ذوالحجہ، محرم یہ تین مہینے اور چوتھا رجب تھا۔ ابتداء اسلام میں یہی مسئلہ تھا پھر جب سورہ توبہ نازل ہوئی تو یہ حکم منسوخ ہو گیا۔ تو اس بات پر دونوں گروہ متفق تھے کہ رجب میں لڑائی نہیں ہوگی۔

عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں نے حالات کا جائزہ لیا۔ جب اس بات کا کافروں کو علم ہوا تو ان کے جذبات مشتعل ہو گئے کہ یہ کون ہوتے ہیں ہمارے معاملات میں مداخلت کرنے والے اور ہم پر اپنا حکم نافذ کرنے والے تو انھوں نے لڑائی شروع کر دی۔ مسلمان دستے نے بھی اپنا دفاع کیا، ابن حضرمی کافروں کا سردار تھا وہ مسلمانوں کے ہاتھوں مارا گیا۔ اس سے کفار کے جذبات اور زیادہ بھڑک اُٹھے۔ مسلمانوں نے یہ سمجھا کہ یہ جمادی الاخریٰ کا آخری دن ہے اور تیسویں تاریخ ہے اس میں ہم لڑ رہے ہیں لیکن اتفاقاً وہ یکم رجب نکلی۔

تو کافروں کو اور تو کچھ نہ ملا اُنھوں نے یہ پروپیگنڈہ شروع کر دیا کہ دیکھو! مسلمانوں نے رجب کے مہینہ میں لڑائی کی ہے۔ اور یہ پروپیگنڈہ انھوں نے اتنا کیا کہ لوگوں کے جذبات بہت بھڑکا دیئے۔ مسلمان بھی اپنی جگہ نادم ہوئے کہ ہم نے تو یہ سمجھا تھا کہ جمادی الاُخریٰ کا آخری دن ہے لیکن چاند اُنتیس کا نکلا تیس کا نہ ہوا۔ تو اس سلسلے میں اُنھوں نے حضور ﷺ سے دریافت کیا کہ حضرت! اب ہماری کیا پوزیشن ہے کیا اس پر ہماری کوئی گرفت تو نہ ہوگی؟

اللہ تعالیٰ اس کا جواب دیتے ہیں ﴿یَسْـَٔلُوْنَكَ﴾ یہ تمھارے ساتھی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آپ سے سوال کرتے ہیں ﴿عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِیْهِ﴾ عزت والے مہینے میں لڑائی کا کیا حکم ہے؟ ﴿قُلْ﴾ آپ ان کو جواب دیں ﴿قِتَالٌ فِیْهِ كَبِیْرٌ﴾ کہ عزت والے مہینے میں لڑنا بہت بڑا گناہ ہے۔ لیکن تصویر کا دوسرا رُخ بھی دیکھو کہ ﴿وَصَدٌّ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ﴾ اللہ تعالیٰ کے راستے سے لوگوں کو روکنا، ایمان سے روکنا۔ یہ کافر مسلمانوں کو ایمان سے روکتے ہیں ﴿وَكُفْرٌۢ بِهٖ﴾ اور اللہ تعالیٰ کے احکام کا صریح انکار کرنا ﴿وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ﴾ اور مسجد حرام سے روکنا۔ کیوں کہ ان لوگوں نے مسجد حرام سے ذوالقعدہ کے مہینے میں روکا تھا حدیبیہ کے سلسلے میں ﴿وَاِخْرَاجُ اَهْلِهٖ مِنْهُ﴾ اور حرم کے لوگوں کو، مکہ کے رہنے والوں کو مکہ مکرمہ سے نکال دینا ﴿اَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ﴾ یہ چیزیں بھی اللہ تعالیٰ کے ہاں بہت بڑی ہیں۔ وہ فی نفسہ بہت بڑی ہیں۔

اب یہ لوگ ان مہینوں میں مومنوں کو اللہ تعالیٰ کے راستہ سے روکتے بھی ہیں اور اللہ تعالیٰ کے حکموں کا انکار بھی کرتے

ہیں۔اُنھی مہینوں میں اُنھوں نے مہاجرین کو ہجرت پر مجبور کیا۔یہ بھی تو سارے گناہ کے کام ہیں اور اگر یہ سارے کام ان مہینوں میں کر سکتے ہیں تو ان کو کیا حق ہے کہ یہ اعتراض کریں۔بے شک شہرِ حرام میں لڑائی بہت بڑی بات ہے لیکن اس کے مقابلے میں یہ کام ان سے کافی بڑے ہیں۔تو ان کو اپنی آنکھوں کا شہتیر نظر نہیں آتا اور دوسروں کی آنکھ کا تنکا ان کو نظر آتا ہے۔ان کو اپنی طرف بھی خیال کرنا چاہیے کہ اِنھی مہینوں میں ہم اللہ تعالیٰ کے راستہ سے لوگوں کو روکتے ہیں، اِنھی مہینوں میں ہم نے عمرہ نہیں کرنے دیا۔اُنھی مہینوں میں ہم نے لوگوں کو یہاں سے نکالا یہ اپنا گناہ کیوں نہیں دیکھتے۔اگر ان سے غلطی سے لڑائی ہوگئی ہے تو اس کو اتنا اُچھال رہے ہیں اور خود جان بوجھ کر سب کچھ کرتے ہیں۔

شرک قتل سے بڑا گناہ ہے

﴿وَالْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ﴾ خازن رحمہ اللہ تعالیٰ وغیرہ فرماتے ہیں کہ فتنے سے مراد شرک ہے۔شرک قتل سے بھی بڑا گناہ ہے اور یہ ان مہینوں میں شرک بھی کرتے ہیں ان کو یہ نظر نہیں آتا؟ دوسروں پر اعتراض کرتے ہیں کہ جی رجب کے مہینے میں آدمی قتل کر دیا۔

حدیث پاک میں آتا ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ((اَبْصَرُ النَّاسِ)) لوگوں میں زیادہ آنکھوں والا (دیکھنے والا) وہ ہے جو اپنے عیبوں کو دیکھے اور لوگوں کے عیبوں سے آنکھیں بند کر لے ((اَبْصَرُ النَّاسِ مَنْ نَظَرَ عُیُوْبَهٗ وَ غَمَضَ عُیُوْبَ غَیْرِهٖ)) "لوگوں میں سے زیادہ دیکھنے والا وہ آدمی ہے جو اپنے عیب دیکھے اور دوسروں کے عیبوں کی طرف نہ دیکھے۔" اور نادان احمق آدمی وہ ہے جو اپنے گناہ نہیں دیکھتا اور دوسرے کے گناہوں کی فہرست بنائے رکھتا ہے کہ فلاں میں یہ عیب ہے فلاں میں یہ عیب ہے۔

تو فرمایا ﴿وَالْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ﴾ فتنہ قتل سے بھی بہت بڑا گناہ ہے۔اس واسطے کہ اگر کوئی مسلمان دوسرے مسلمان کو قتل کرتا ہے تو یہ بہت بڑا گناہ ہے اور قتل کو حلال نہیں سمجھتا کیوں کہ اگر حلال سمجھے گا تو کافر ہو جائے گا اور کافر کا جہنم سے نکلنا محال ہے۔جذبات میں آکر کیا تو اس کے لیے سزا خلود فی النار نہیں ہے کبھی نہ کبھی نکل آئے گا۔لیکن جس شخص نے شرک کیا ہے وہ دوزخ سے کبھی بھی نہیں نکلے گا۔تو شرک کی سزا قتل سے کافی زیادہ ہے۔اور دوسرے حضرات فرماتے ہیں کہ فتنے سے عام فتنے مراد ہیں، چاہے زبانی طور پر فتنے ہوں یا عملی طور پر ہوں، فتنہ بہت بُری چیز ہے۔

حدیث پاک میں آتا ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((اَلْفِتْنَةُ نَائِمَةٌ لَّعَنَ اللّٰهُ مَنْ اَيْقَظَهَا)) فتنہ سویا ہوا ہوتا ہے اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو اس پر جس نے فتنہ کو جگایا۔فتنے کی بات کرنا، فتنے کا کام کرنا بہت سنگین جرم ہے لیکن بعض مزاج بعض طبیعتیں ایسی ہوتی ہیں کہ جب تک وہ کوئی فتنہ کی بات نہ کریں اُن کو تسلی نہیں ہوتی ﴿وَلَا يَزَالُوْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ﴾ اور یہ جو کافر ہیں یہ ہمیشہ تمھارے ساتھ لڑتے رہیں گے حتیٰ کہ ﴿حَتّٰى يَرُدُّوْكُمْ عَنْ دِيْنِكُمْ﴾ یہاں تک کہ تمھیں تمھارے دین سے پھیر دیں ﴿اِنِ

﴿اسْتَطَاعُوْا﴾ اگر ان میں طاقت ہو۔

مرتد بارے بعض اہم مسائل:

آگے فرمایا کہ مرتد کا مسئلہ بھی سُن لو ﴿وَمَنْ یَّرْتَدِدْ مِنْكُمْ﴾ اور جو تم میں سے مرتد ہو جائے۔ مسلمان ہونے کے بعد دین چھوڑ دے ﴿عَنْ دِیْنِهٖ﴾ اپنے دین سے پھر جائے ﴿فَیَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ﴾ اور مرے اس حال میں کہ وہ کافر ہو ﴿فَاُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ﴾ ان لوگوں کے اعمال دنیا میں بھی اکارت ہو گئے اور آخرت میں بھی۔ العیاذ باللہ اگر کوئی شخص مرتد ہو جائے تو ساتھ ہی نکاح ٹوٹ جاتا ہے۔ اس کے نکاح کو توڑنے کے لیے کسی جج یا قاضی کے فیصلے کی ضرورت نہیں ہے، نکاح خود بخود ٹوٹ گیا۔ پھر یہ جو مرتد ہوا ہے وراثت سے بھی محروم ہو گیا یعنی جس کا اس کو وارث بننا تھا اب نہیں بن سکے گا۔ اور اگر یہ اسی حالت میں مر گیا اس کو مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کرنے کی اجازت نہ ہوگی اور نہ ہی اس کا جنازہ ہوگا۔ تو اس سے اندازہ لگائیں کہ کتنا نقصان ہوا۔

اسی طرح یہ مسئلہ بھی سمجھ لیں کہ اگر کوئی مسلمان مرتد ہو کر یہودی یا عیسائی ہو گیا تو اس کے ہاتھ کا ذبیحہ بھی جائز نہیں ہے بخلاف اس کے جو پیدائشی یہودی یا عیسائی ہیں اگر وہ قاعدے کے مطابق ذبح کریں تو ان کے ہاتھ کا ذبیحہ جائز ہے۔ اسی طرح اگر اصل عیسائی یا یہودی عورت ہے تو قاعدے اور شرائط کے مطابق اس کے ساتھ نکاح جائز ہے لیکن اگر کوئی مسلمان عورت مرتد ہو کر عیسائی مذہب قبول کر لے تو اس سے نکاح جائز نہیں ہے کیوں کہ مرتد ہونے کے بعد دنیا کے سارے احکام اس سے اُٹھ گئے ہیں اور آخرت کا مسئلہ یہ ہے کہ اس نے جو نیکیاں اسلام کی حالت میں کی تھیں سب ضائع ہو گئیں ہیں۔

حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ یہ فرماتے ہیں اگر وہ مرتد سچے دل سے توبہ کرے تو اس نے جو نیکیاں اسلام کی حالت میں کی تھیں اُن کا ثواب اس کو نہیں ملے گا اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جب وہ مسلمان تھا اس وقت اس نے حج کیا تھا پھر مرتد ہو گیا العیاذ باللہ وہ حج تو باطل ہو گیا۔ اب اس نے سچے دل سے توبہ کی اور اس کے بعد وہ مال دار ہو گیا تو اُسے نئے سرے سے حج کرنا پڑے گا۔

بعض کلماتِ کفر:

تو یاد رکھنا! اگر منہ سے کلمۂ کفر نکل گیا تو آدمی مرتد ہو جاتا ہے اور مرتد ہونے کے لیے ضروری نہیں ہے کہ آدمی واضح طور پر کہے کہ میں عیسائی ہو گیا ہوں، یہودی ہو گیا ہوں یا میں سکھ بن گیا ہوں۔ فقہائے کرام رحمہم اللہ نے یہ تصریح فرمائی ہے کہ ایک آدمی کسی کو کہتا ہے کہ آؤ بھائی نماز پڑھ لیں۔ جواب میں وہ آدمی کہتا ہے کہ نماز میں کیا پڑا ہے؟ اتنے الفاظ کہنے سے وہ کافر ہو گیا، مرتد ہو گیا۔ پہلی نیکیاں سب برباد، نکاح ٹوٹ گیا۔ کسی کو کہا بھائی روزہ رکھ لیں۔ وہ کہے کہ روزہ میں کیا پڑا ہے؟ اتنے الفاظ کہنے سے وہ کافر اور مرتد ہو گیا پہلی نیکیاں سب برباد، نکاح ٹوٹ گیا، کسی کو کہا کہ بھائی ڈاڑھی رکھ لو۔ اس نے کہا کہ ڈاڑھی میں کیا رکھا

ہے؟ بڑے دیکھے ہیں ڈاڑھیوں والے، مرتد ہو گیا۔ یا یوں کہا کہ آ بھائی! قرآن کا فیصلہ تسلیم کر لے اور وہ کہے کہ قرآن وُران کیا ہوتا ہے۔ یہ الفاظ کہتے ہی وہ مرتد ہو گیا اور یہ ایسے الفاظ ہیں جو لوگ روزانہ بکتے رہتے ہیں۔

اس واسطے علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ یہ فرماتے ہیں کہ ہر مہینے اپنا نکاح تازہ پڑھنا چاہیے تاکہ آگے جو اولاد پیدا ہونی ہے وہ تو حرامی نہ ہو۔ ہر مہینے توبہ کر کے نئے سرے سے نکاح ہونا چاہیے۔ حضرت شامی رحمۃ اللہ علیہ کا زمانہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اتنا دور نہیں ہے۔ اُن کی تاریخ وفات دیکھ لیں جو آج سے تقریباً دو، تین سو سال پہلے تھا۔ اب ہمارا زمانہ توبہ توبہ کہاں نکل گیا ہے۔ چھوٹے چھوٹے بچے ایسی ایسی گالیاں نکالتے ہیں کہ آدمی دنگ رہ جاتا ہے کہ انھوں نے کہاں سے سنی ہیں۔ تو مرتد ہونے کے لیے ضروری نہیں کہ اس کے سر پر سینگ لگ جائیں، اچھا بھلا آدمی ہوتا ہے۔

﴿وَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ﴾ یہ ہیں دوزخ والے ﴿هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ﴾ وہ ہمیشہ ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے کبھی بھی دوزخ سے نکلنا نصیب نہیں ہوگا۔ یاد رکھنا! دوزخ کی زندگی اور جنت کی ہمیشہ کی زندگی آج ہم نہیں سمجھ سکتے۔ کیوں کہ ہم نے محدود زمانہ دیکھا اور سنا ہے۔ سو سال، ہزار سال، پندرہ سو سال وغیرہ۔ وہاں ایسا نہیں ہے وہ کبھی نہ ختم ہونے والی زندگی ہے۔ اور کبھی بھی نہ ختم ہونے والی زندگی ہماری سمجھ میں نہیں آتی۔ جنتی کے واسطے خوشیاں کبھی ختم نہیں ہوں گی اور دوزخیوں کے لیے تکلیفیں کبھی ختم نہ ہوں گی۔

تو ان مجاہدوں نے جہاد کیا تھا عبداللہ ابن جحش رضی اللہ عنہ کی قیادت میں تو ان کو اس بات کی تسلی تو ہوگئی کہ ان مہینوں میں لڑائی بھی بُری ہے اور یہ دوسری کارروائیاں بھی بُری ہیں۔ مسجد حرام سے روکنا، اسلام سے روکنا۔ لیکن ہم نے جو لڑائی لڑی ہے اس کا ہمیں کوئی ثواب بھی ملے گا یا نہیں؟ تو اللہ تعالیٰ نے ان کا وہم دور کیا کہ تمھیں اجر ملے گا۔

فرمایا ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ بے شک وہ لوگ جو ایمان لائے ﴿وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا﴾ اور وہ جنھوں نے رب تعالیٰ کی رضا کے لیے ہجرت کی ﴿وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ اللہ تعالیٰ کے راستے میں جہاد کیا ﴿اُولٰٓئِكَ يَرْجُوْنَ رَحْمَتَ اللّٰهِ﴾ وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کے اُمیدوار ہیں۔ ان کو اجر ملے گا کیوں کہ انھوں نے دیدہ دانستہ نہیں کیا۔ غلط فہمی کا شکار ہوئے۔ اُنھوں نے یہ سمجھا کہ یہ جمادی الاُخریٰ کا تیسواں دن ہے مگر تھی یکم رجب۔ تو اُنھوں نے قصداً ایسا نہیں کیا ان کو رب تعالیٰ جہاد کا اجر و ثواب عطا فرمائیں گے ﴿وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾ جو غلطی نادانستہ ہوتی ہے رب تعالیٰ اس کو معاف فرما دیتے ہیں۔ اور دیدہ دانستہ بھی کرے اور رب تعالیٰ سے سچے دل سے توبہ کرے وہ بھی رب معاف کر دیتا ہے۔

تو فرمایا یہ تمھاری غلطی واقعتاً غلطی تھی لیکن تھی نادانستہ تمھیں اجر بھی ملے گا۔ اللہ تعالیٰ تمھیں بخشے گا بھی اور کافروں کو اعتراض کا کوئی حق نہیں ہے۔ وہ ان مہینوں میں تمھارے کاموں سے بڑے بڑے کام کرتے ہیں۔ انھیں اپنے گریبان میں بھی منہ ڈال کر دیکھنا چاہیے کہ وہ کیا کرتے ہیں۔

﴿یَسْـَٔلُوْنَكَ﴾ یہ لوگ آپ سے سوال کرتے ہیں ﴿عَنِ الْخَمْرِ﴾ شراب کے بارے میں ﴿وَ الْمَیْسِرِ﴾ اور جوئے کے بارے میں ﴿قُلْ﴾ کہہ دو ﴿فِیْهِمَاۤ﴾ ان دونوں میں ﴿اِثْمٌ كَبِیْرٌ﴾ گناہ ہے بہت بڑا ﴿وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ﴾ اور کچھ منافع بھی لوگوں کے لیے ﴿وَ اِثْمُهُمَاۤ﴾ اور گناہ ان دونوں کا ﴿اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا﴾ بہت بڑا ہے ان کے منافع سے ﴿وَ یَسْـَٔلُوْنَكَ﴾ اور سوال کرتے ہیں آپ سے ﴿مَاذَا یُنْفِقُوْنَ﴾ کیا کچھ وہ خرچ کریں ﴿قُلِ﴾ کہہ دے ﴿الْعَفْوَ﴾ اپنی ضرورت سے بچا ہوا ﴿كَذٰلِكَ یُبَیِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰیٰتِ﴾ اسی طرح بیان کرتا ہے اللہ تعالیٰ تمھارے لیے اپنے احکام ﴿لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ﴾ تاکہ تم غور وفکر کرسکو ﴿فِی الدُّنْیَا﴾ دنیا کے معاملات میں ﴿وَ الْاٰخِرَةِ﴾ اور آخرت کے واسطے ﴿وَ یَسْـَٔلُوْنَكَ﴾ اور وہ لوگ آپ سے سوال کرتے ہیں ﴿عَنِ الْیَتٰمٰى﴾ یتیموں کے بارے میں ﴿قُلْ اِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَیْرٌ﴾ آپ کہہ دیں ان کی اصلاح بہت ہی بہتر ہے ﴿وَ اِنْ تُخَالِطُوْهُمْ﴾ اگر تم ان سے مل کر رہنا چاہو ﴿فَاِخْوَانُكُمْ﴾ پس تمھارے بھائی ہیں ﴿وَ اللّٰهُ یَعْلَمُ الْمُفْسِدَ﴾ اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے فسادی کو ﴿مِنَ الْمُصْلِحِ﴾ اصلاح کرنے والے سے ﴿وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ﴾ اور اگر اللہ تعالیٰ چاہتا ﴿لَاَعْنَتَكُمْ﴾ البتہ تمھیں مشقت میں مبتلا کر دیتا ﴿اِنَّ اللّٰهَ﴾ بے شک اللہ تعالیٰ ﴿عَزِیْزٌ﴾ غالب ہے ﴿حَكِیْمٌ﴾ حکمت والا ہے ﴿وَ لَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ﴾ اور نہ نکاح کرو تم شرک کرنے والی عورتوں سے ﴿حَتّٰى یُؤْمِنَّ﴾ یہاں تک کہ وہ ایمان لے آئیں ﴿وَ لَاَمَةٌ﴾ اور البتہ لونڈی ﴿مُّؤْمِنَةٌ﴾ مومن ﴿خَیْرٌ﴾ بہتر ہے ﴿مِّنْ مُّشْرِكَةٍ﴾ شرک کرنے والی عورت سے ﴿وَّ لَوْ اَعْجَبَتْكُمْ﴾ اور اگرچہ وہ تمھیں پسند آئے ﴿وَ لَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِیْنَ﴾ اور نہ نکاح کر کے دو اپنی بہنیں اور بیٹیاں مشرکوں کو ﴿حَتّٰى یُؤْمِنُوْا﴾ یہاں تک کہ وہ ایمان لے آئیں ﴿وَ لَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ﴾ اور البتہ مومن غلام ﴿خَیْرٌ﴾ بہتر ہے ﴿مِّنْ مُّشْرِكٍ﴾ مشرک سے ﴿وَّ لَوْ اَعْجَبَكُمْ﴾ اور اگرچہ وہ مشرک تمھیں بھلا لگے یعنی اچھا لگے ﴿اُولٰٓىِٕكَ یَدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ﴾ یہ لوگ دعوت دیتے ہیں آگ کی طرف ﴿وَ اللّٰهُ یَدْعُوْۤا﴾ اور اللہ تعالیٰ دعوت دیتا ہے ﴿اِلَى الْجَنَّةِ﴾ جنت کی طرف ﴿وَ الْمَغْفِرَةِ﴾ اور بخشش کی طرف ﴿بِاِذْنِهٖ﴾ اپنے حکم سے ﴿وَ یُبَیِّنُ اٰیٰتِهٖ﴾ اور بیان کرتا ہے اللہ تعالیٰ اپنی آیات ﴿لِلنَّاسِ﴾ لوگوں کے لیے ﴿لَعَلَّهُمْ یَتَذَكَّرُوْنَ﴾ تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو کچھ مسائل کے بارے میں اشکالات پیش آئے۔ آپس میں بحث وگفتگو کرتے تھے سب نے سوچا کہ آپس میں بحث وتمحیص کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی موجود ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کیوں نہ

معلوم کرلیں تاکہ آپ ﷺ جو فرمائیں اس پر عمل کریں۔

ایک مسئلہ یہ تھا کہ یہ جو شراب ہے یہ درست ہے یا نہیں۔ کیوں کہ اس وقت تک شراب حرام نہیں ہوئی تھی اور جوا بھی حرام نہیں ہوا تھا تو بحث یہ ہوئی کہ یہ بُری چیزیں ہیں یا اچھی۔ آیا ان کی اشاعت وترویج کرنی چاہیے یا ان کو بند کر دینا چاہیے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ یَسْئَلُوْنَكَ ﴾ یہ آپ سے سوال کرتے ہیں ﴿عَنِ الْخَمْرِ﴾ شراب کے بارے میں ﴿وَ الْمَیْسِرِ﴾ اور جوئے کے بارے میں ﴿قُلْ﴾ آپ ان کو کہہ دیں ﴿فِیْهِمَاۤ اِثْمٌ كَبِیْرٌ﴾ ان دونوں میں گناہ ہے بہت بڑا ﴿وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ﴾ اور تھوڑے سے فائدے بھی ہیں لوگوں کے لیے۔ فائدے یہ ہیں کہ مثال کے طور پر شراب پینے کے بعد انسان کو خوشی محسوس ہوتی ہے اور بعض بیماریوں کا علاج بھی ہے۔ اور جوئے میں فائدہ یہ ہے کہ بغیر محنت اور مشقت کے پیسے حاصل ہو جاتے ہیں۔ تو اگر اس پہلو کو دیکھو تو شراب کا کچھ نفع بھی نظر آتا ہے لیکن رب تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ﴿وَ اِثْمُهُمَاۤ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا﴾ اور ان دونوں کا گناہ ان کے فائدے سے بہت زیادہ ہے۔ لیکن ابھی تک حرام نہیں ہوئے تھے۔ یہ اُن کی حرمت کا الارم اور تمہید تھی۔

اس کا دوسرا حکم پانچویں پارے میں ہے۔ پھر ساتویں پارے میں حکم ہے جس سے شراب اور جوئے کو بالکل حرام فرما دیا۔

شراب کے فوائد ونقصانات

شیخ الرئیس ابن سینا جو یونانی حکماء کا بابا ہے اُس نے کتاب لکھی ہے جو قانون طب کی مستند کتاب ہے۔ اس میں اس نے چیزوں کے فوائد بیان کیے ہیں۔ مثلاً: یہ جو چنے ہم کھاتے ہیں ان کا فائدہ اس نے قانونچے میں بتایا ہے کہ وہ غذائیں جو پھیپھڑوں کو طاقت پہنچاتی ہیں ان میں سے سب سے زیادہ طاقت پہنچانے والی چیز چنے ہیں ((یُغْذِی الْلِیئَعَةَ مِنْ كُلِّ شَیْءٍ)) "تمام غذاؤں میں سے پھیپھڑوں کو زیادہ قوت پہنچانے والی چیز چنے ہیں۔" اسی طرح دودھ کے فائدے بیان کیے ہیں ((سَرِیْعُ الْاِسْتِحَالَةِ اِلَی الْخَلِطِ الْغَالِبِ)) "انسان کے بدن میں خلطیں ہوتی ہیں خون کی، صفراء کی، سودا کی، اسی طرح بلغم کی ہے تو دودھ کی خاصیت ہے کہ جو خلط غالب ہو یہ فوراً اس میں چلا جاتا ہے۔" کہ بلغمی مزاج ہے تو فوراً بلغم بن جائے گا اور اگر دموی مزاج ہے تو وہ فوراً خون بن جائے گا اور اگر صفراوی مزاج ہے تو دودھ فوراً صفراء بن جائے گا اور اگر سوداوی مزاج ہے تو دودھ فوراً سودا بن جائے گا۔ اس نے ہر ہر چیز پر باقاعدہ بحث کی ہے۔

تو وہ شراب کے بارے میں پہلے اس کے فائدے بیان کرتا ہے۔ مثلاً: اس نے شراب کے پچاس فائدے بیان کیے ہیں۔ ان کو پڑھ کر انسان کہتا ہے کہ بڑی مفید چیز ہے۔ پھر آگے اس کے نقصانات بیان کرتا ہے تو ایک سو پچاس (150)۔ تو یوں سمجھو کہ چوتھا حصہ نفع ہے اور تین حصے نقصان۔ تو وہ کون نادان ہے کہ ایک نفع حاصل کرنے کے لیے تین نقصان برداشت کرے۔

اسی طرح جوئے میں دوسرے کے خون کو چوسنے سے لڑائی تک نوبت آجاتی ہے۔اور یہاں تک کہ جوئے باز عورت تک ہار جاتے ہیں۔پھر وہ عورتیں کئی کئی دن تک دوسروں کے پاس رہتی ہیں، تو کتنی بڑی خرابی ہے۔

تو ان آیات میں خطرے کا الارم تھا پھر ساتویں پارے میں حکم ہے ﴿اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَیْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّیْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ﴾ [المائدہ:۹۰] ہجرت کے تیسرے سال ان سب چیزوں سے منع کر دیا گیا۔اور مسئلہ قرآن پاک میں مال کے خرچ کرنے کا بھی ہے ﴿اَنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ﴾ کہ اللہ کے راستہ میں خرچ کرو۔صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے سوال کیا کہ کیا خرچ کریں، پیسے دیں یا جنس دیں یا کپڑے دیں اللہ تعالیٰ کے راستہ میں یا کون سا مال خرچ کریں؟

انفاق فی سبیل اللہ کا مفہوم

﴿وَیَسْـَٔلُوْنَكَ﴾ اور یہ تم سے سوال کرتے ہیں ﴿مَاذَا یُنْفِقُوْنَ﴾ وہ کیا خرچ کریں۔﴿قُلِ﴾ کہہ دے ﴿الْعَفْوَ﴾ جو چیز تمھاری ضرورت سے زائد ہے اس میں سے خرچ کرو۔ضرورت کی چیز مثلاً: تمھارے بھی حق ہیں، تمھارے والدین کے بھی حقوق ہیں، اولاد کے بھی حقوق ہیں۔سب کچھ ضرورت مندوں کو دے کر خود مشقت میں پڑنا یہ بھی کوئی اچھی بات نہیں ہے۔

حدیث پاک میں آتا ہے کہ ایک غریب آدمی آیا۔پھٹے پرانے کپڑے خستہ حالت، اس نے کہا میں بڑا محتاج ہوں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ساتھیوں کو توجہ دلائی کہ اس کی امداد کرو۔ایک آدمی کے پاس سونے کا ٹکڑا تھا اس نے وہ چندے میں اسے دے دیا۔تھوڑا سا وقت گزرا تو ایک اور سائل آگیا اور اس کو علم نہ تھا کہ مجھ سے پہلے بھی کسی نے سوال کیا ہے۔اس حاجت مند نے بھی سوال کر دیا کہ حضرت میں بہت محتاج ہوں، مانگنا نہیں چاہیے مگر میں مجبور ہوں۔تو پہلا شخص جس کو سونے کا ٹکڑا ملا تھا وہ اُس نے اس کو دے دیا۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے ہاتھ سے پکڑ کر دور پھینک دیا۔فرمایا تیرے واسطے تو ہم نے مانگا ہے اور تو اب آگے سخی بنتا ہے۔پہلے اپنی ضرورت پوری کر اس کے بعد اوروں کو دو۔تو جب اپنی ضرورتیں پوری نہ ہوں تو ایسی حالت میں صدقہ خیرات کوئی معنیٰ نہیں رکھتا۔اس کے بچے کھائیں گے، بیوی کھائے گی یہ بھی صدقے کے حکم میں ہے۔اور اس کو صدقے کا ثواب ہے۔

یتیموں کے متعلق بعض احکام

تو فرمایا خرچ وہ چیز کرو ﴿الْعَفْوَ﴾ جو تمھاری ضرورت سے بچی ہوئی ہے ﴿كَذٰلِكَ یُبَیِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰیٰتِ﴾ اسی طرح اللہ تعالیٰ بیان کرتا ہے تمھارے واسطے اپنے احکام ﴿لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ﴾ تاکہ تم غور و فکر کرو ﴿فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ﴾ دنیا کے معاملات میں بھی اور آخرت کے معاملات میں بھی کہ اللہ تعالیٰ نے تمھاری ایسی راہنمائی فرمائی ہے کہ تمھاری دنیا بھی اور آخرت بھی سنور جائے۔وہ اس طرح کہ مثال کے طور پر کسی کا چچا، تایا فوت ہو جائے اور اس کی اولاد نابالغ ہے تو اب یہ چچا زاد بھائی ہیں شریعت نے ان کو پابند کیا ہے کہ ان کے چچیرے بھائیوں کی نگرانی تم نے کرنی ہے یا بھائی فوت ہو گیا اس کے بچے ہیں۔

ایسے سلسلے میں اُن کے پاس بعض دفعہ تھوڑا بہت مال بھی ہوتا تھا۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم تھا کہ تمھارے گھر میں جو عزیز رشتہ دار یتیم ہیں ان کے مال میں سے ان کی روٹی سالن علیحدہ پکاؤ اور اپنا کھانا الگ تیار کرو۔

عورتوں کو اس سلسلے میں خاصا اشکال تھا، پریشانی تھی۔ کیوں کہ ایک گھر میں ایک دو دن نہیں مسلسل ان کا آٹا گوندھنا، روٹی علیحدہ پکانی اور اپنا الگ گوندھنا، ان کی ہانڈی الگ تیار کرنی اور اپنی الگ تیار کرنی۔ یہ خاصا مسئلہ ہے کوئی آسان بات نہیں ہے۔ پھر گھر میں بچے ہیں ان کو بھی اس بات کی تمیز نہیں ہوتی کہ یہ روٹی کس کی ہے اور یہ سالن کس کا ہے؟ عورتیں باوجود اس کے کہ یتیموں کا سالن روٹی سنبھال کے رکھتی تھیں، پھر بھی اپنے بچے ان کی روٹیاں کھا جاتے تھے۔ پھر انسان کبھی زیادہ کھا جاتا ہے کبھی کم، کبھی طبیعت صحیح ہوتی ہے کبھی خراب۔ تو جب تھوڑا کھاتے باقی ضائع ہو جاتا۔ تو اس سلسلے میں اُنھوں نے سوال کیا کہ حضرت کپڑوں کا مسئلہ تو آسان ہے وہ کبھی دو ماہ کے بعد بنانے پڑتے ہیں کبھی چھ ماہ کے بعد اور تعلیم کا مسئلہ بھی آسان ہے کہ ہم ان کی کتابوں اور کاپیوں کا حساب الگ کر سکتے ہیں مگر حضرت یہ جو کھانے کا مسئلہ ہے اس کا الگ پکانا۔ عورتیں کہتی ہیں کہ یہ خاصا مشکل ہے کہ اپنا آٹا الگ رکھو، ان کا الگ رکھو۔ اپنا نمک مرچ الگ رکھو ان کا الگ رکھو، اپنا گھی الگ رکھو ان کا الگ رکھو۔ پھر اگر ان کی کوئی چیز بچ جائے تو اس کو محفوظ رکھو۔

تو فرمایا ﴿وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْيَتٰمٰى﴾ یہ تم سے یتیموں کے بارے میں سوال کرتے ہیں کہ حضرت ان کا کھانا الگ تیار کرنا عورتیں کہتی ہیں کہ یہ خاصا مشکل ہے ﴿قُلْ﴾ کہہ دے ﴿اِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَيْرٌ﴾ ان یتیموں کی خیر خواہی بہت بہتر ہے کہ ان کی کوئی چیز ضائع نہ ہو ﴿وَاِنْ تُخَالِطُوْهُمْ﴾ اور اگر تم کھانے پینے میں ان کو ساتھ ملا لو ﴿فَاِخْوَانُكُمْ﴾ پس وہ تمھارے بھائی ہیں۔ یعنی اب تمھیں اجازت ہے۔ وہ اس طرح کہ مثال کے طور پر یتیم بچہ آٹھ سال کا ہے۔ تو اس کے آٹے میں سے جتنا تم اپنے آٹھ سال کے بچے کے واسطے آٹا استعمال کرتے ہو اور اس عمر کے بچے کے واسطے جتنا سالن کا خرچہ کرتے ہو اس یتیم کے مال میں سے اتنا خرچہ لے لو۔ پھر اس میں جو کمی بیشی ہو گی وہ تمھیں اللہ تعالیٰ معاف فرمائے گا۔ نیت بُری نہ ہو کیوں کہ ((اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ))۔ "اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے۔" نیت تمھاری مالِ یتیم کو کھانے کی نہ ہو۔

تو جب یہ حکم آ گیا تو عورتیں بڑی خوش ہوئیں کہ ہمارا مسئلہ حل ہو گیا ہے۔ کیوں کہ پہلے خاصی دقت تھی۔ لیکن رب تعالیٰ نے فرمایا کہ اس کو بھی یاد رکھیں ﴿وَاللّٰهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ﴾ اللہ تعالیٰ تم میں سے فساد کرنے والے کو اور اصلاح کرنے والے کو بہ خوبی جانتا ہے۔ کہ تم حیلے بہانے سے یتیم کا مال کھانا چاہتے ہو یا اس کے مال کی اصلاح کرتے ہو معاملہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہے۔ صرف یتیم کو سامنے نہ رکھو بلکہ رب تعالیٰ کو حاضر ناظر سمجھو، عالم الغیب سمجھو اور ﴿عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ﴾ سمجھو۔ اس طرح نہ کرنا کہ اب تمھیں شرکت کی اجازت مل گئی ہے تو پاؤ آٹا اپنا ڈال لیا اور کلوان کا ملا لیا۔ اسی طرح اپنی سبزی برائے نام لے آئے اور باقی اس کا مال کھا گئے۔ ایک چمچ اپنا گھی ڈالا اور اس کے گھی میں سے ایک چھٹانک ڈال لیا۔ ﴿وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ﴾ اور اگر اللہ تعالیٰ چاہتا ﴿لَاَعْنَتَكُمْ﴾ البتہ تمھیں مشقت میں ڈال دیتا، وہ اس طرح کہ پہلا حکم ہی برقرار رہتا ﴿اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ﴾

حَكِيْمٌ﴾ بے شک اللہ تعالیٰ غالب ہے اور حکمت والا ہے۔

اور مسئلہ۔ ﴿وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ﴾ اور نہ نکاح کرو تم شرک کرنے والی عورتوں سے ﴿حَتّٰى يُؤْمِنَّ﴾ یہاں تک کہ وہ ایمان لے آئیں۔ چھٹے پارے میں یہود و نصاریٰ کی عورتوں کے ساتھ نکاح کی اجازت دی گئی ہے ان شرائط کے ساتھ کہ جن کا لحاظ ضروری ہے، لیکن پسندیدہ نہیں ہے۔

نکاح کے چند اصول

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نکاح کے اصول بیان فرمائے ہیں۔ فرمایا عورت میں چار خوبیوں کو دیکھا جاتا ہے لِحُسْنِهَا اس کا حسن و جمال بھی دیکھو کوئی حرج نہیں ہے وَلِحَسَبِهَا اس کے خاندان کو بھی دیکھو وَلِمَالِهَا مال بھی دیکھو کوئی حرج نہیں وَلِدِيْنِهَا اور دین کو بھی ملحوظ رکھو فَاظْفَرْ بِذَاتِ الدِّيْنِ لیکن ساری شقوں سے زیادہ دین کو ترجیح دو۔ کیوں کہ دین دار ہوگی تو اولاد پر بڑا گہرا اثر ہوگا۔ ہم نے بہت ساری ایسی صورتیں دیکھی ہیں کہ مائیں بے دین ہیں تو اولاد بھی بے دین ہے، مائیں نیک ہیں تو اولاد بھی نیک ہے کیوں کہ اولاد پر زیادہ اثر ماں کا ہوتا ہے۔ ماں پہلا مدرسہ ہے بچوں کے لیے۔

تو فرمایا مشرک عورتوں سے نکاح نہ کرو یہاں تک کہ وہ ایمان لے آئیں ﴿وَلَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ﴾ اور البتہ لونڈی مومنہ ﴿خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ﴾ بہتر ہے مشرک عورت سے ﴿وَّلَوْ اَعْجَبَتْكُمْ﴾ اگرچہ مشرک عورت جو آزاد ہے تمھیں بڑی اچھی لگے۔ اس زمانے میں غلاموں کو اس طرح حقیر سمجھتے تھے جس طرح آج کل لوگ کمی کو سمجھتے ہیں۔ کیوں کہ ظاہر بات ہے کہ اونچے خاندان کا آدمی کسی کمی کی لڑکی سے حتی الوسع نکاح کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ اور فرمایا ﴿وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ﴾ اور اپنی بیٹیاں اور بہنیں تم نکاح کر کے نہ دو مشرکوں کو ﴿حَتّٰى يُؤْمِنُوْا﴾ حتی کہ وہ ایمان لے آئیں۔ لیکن آج تو بڑا فتنے کا دور ہے کئی باطل فرقے ہیں۔ مثلاً: قادیانی ہیں، منکرینِ حدیث ہیں، رافضی ہیں، بہائی ہیں، ذکری ہیں، شرک میں ڈوبے ہوئے لوگ ہیں۔ ان چیزوں کو سوچنے والے کے رشتے میں بڑا فرق ہے۔ مگر آج تو صرف یہ دیکھتے ہیں کہ لڑکا خوب صورت ہو، تعلیم یافتہ ہو، بزنس مین ہو، کار، کوٹھی، بنگلا ہو اور ہو بھی اس کا اپنا اور اُلٹی مانگ نکلی ہوئی ہو بس! بچی کا ہاتھ اُس کے ہاتھ میں پکڑا دیتے ہیں۔ اس کی فکر نہیں کہ اس کا ایمان رہے گا یا نہ رہے گا۔ یاد رکھو! رشتہ کرتے وقت سب سے پہلے یہ دیکھو کہ اس کا عقیدہ بھی صحیح ہے یا نہیں۔ اس کی وجہ سے ہماری بچی کا ایمان بھی رہے گا یا نہیں رہے گا۔ آخرت بنے گی یا خراب ہوگی۔

حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ کی لڑکی جوان ہوگئی، عزیز رشتہ داروں نے ایک لڑکا تلاش کیا خوب صورت، تعلیم یافتہ، اچھے گھر کا اور آ کر حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ کو بتایا کہ ہم نے تمھاری بچی کے لیے رشتہ تلاش کیا ہے اور وہ فلاں آدمی ہے۔ حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نے وہاں رشتہ نہیں کرنا۔ انھوں نے کہا حضرت! لڑکے میں کوئی عیب ہے۔ فرمایا نہیں۔ کیا بے دین ہے؟ فرمایا نہیں۔ مال نہیں؟ فرمایا وہ بھی ہے، گھر بھی ہے، سب ضرورتیں پوری ہیں مگر ان کے گھر میں لونڈیاں کام کرتی ہیں۔ تو

میری بچی کو ساس اور خسر کی خدمت کا موقع نہیں ملے گا جس سے جنت ہاتھ سے نکل جائے گی۔

آج تو عورتیں کام کے بارے میں کہتی ہیں کہ ہم پر مصیبت پڑ گئی ہے۔ بس ہمیں تم ٹرے میں کھانا رکھ کر دو ہم کھا لیں گی۔ یاد رکھو! یہ جو گھر کے کام ہیں عورتوں کے لیے یہ جنت ہیں۔ غرضیکہ حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ نے اُنھیں بچی نہ دی۔ آج ہمارا دور ہے۔ ہم نے کہنا ہے کہ بچی نے چولھے کے پاس نہیں بیٹھنا، اس نے روٹی نہیں پکانی، کپڑے نہیں دھونے، جھاڑو نہیں پھیرنی۔ فلاں فلاں کام نہیں کرے گی، برتن صاف نہیں کرے گی وغیرہ۔ ہاں کپڑوں پر اِستری پھیر دے گی۔

فرمایا ﴿وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ﴾ اور البتہ مومن غلام ﴿خَيْرٌ مِّن مُّشْرِكٍ﴾ بہتر ہے مشرک سے ﴿وَّلَوْ اَعْجَبَكُمْ﴾ اگرچہ وہ مشرک تمھیں شکل وصورت کے اعتبار سے، مال کے لحاظ سے، تعلیم کے لحاظ سے بہت اچھا لگے۔ کیوں؟ اس واسطے کہ ﴿اُولٰٓئِكَ يَدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ﴾ یہ لوگ جو شرک کرنے والے ہیں تمھیں آگ یعنی دوزخ کی دعوت دیتے ہیں ﴿وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلَى الْجَنَّةِ﴾ اور اللہ تعالیٰ تمھیں جنت کی دعوت دیتا ہے ﴿وَالْمَغْفِرَةِ﴾ اور بخشش کی۔

محمد علی جناح (مرحوم) نے ایک عورت کے ساتھ نکاح کیا تھا جس کا نام رتن بائی تھا، وہ پارسی مذہب سے تھی، اور خسر کا نام تھا ڈنشا پٹیٹ۔ بعد میں اُنھوں نے کوشش کی اور وہ کامیاب ہو گئے کہ بیوی مسلمان ہو گئی لیکن ان کی لڑکی پارسی عقیدے پر ہے اور بمبئی میں مقیم تھی، آج کل وہ امریکہ میں ہے۔ معلوم نہیں کہ زندہ ہے یا مر گئی ہے، باپ نے پورا زور لگایا لیکن وہ ایمان نہ لائی کیوں کہ ماں کے ابتدائی دور کا اس پر اثر تھا۔ اسی طرح ڈاکٹر عبدالستار جس کو ڈاکٹر خان کہتے ہیں عبدالغفار خان کا بھائی۔ اس نے انگریز عورت (میم) کے ساتھ نکاح کیا تھا، باوجود اس کے کہ اس کو سب نے منع کیا کہ تیری پہلی بیوی موجود ہے، اگر دوسری بیوی کرنا چاہتا ہے تو تجھے یہاں رشتے مل سکتے ہیں کیوں کہ تیرا خاندان اُونچا ہے۔ لیکن اس پر عشق کا بھوت سوار تھا۔ نکاح کے بعد اس میم سے لڑکی پیدا ہوئی۔ اُس لڑکی نے پھر سکھ کے ساتھ نکاح کیا۔ نہ اُس کو ولی خان روک سکا، نہ عبدالغنی اور نہ عبدالغفار خان روک سکا۔

اس لیے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تم مشرکوں کے ساتھ نکاح کرو گے تو وہ تمھیں دوزخ کی دعوت دیں گے۔ اللہ تعالیٰ تمھیں جنت کی طرف دعوت دیتا ہے ﴿وَالْمَغْفِرَةِ﴾ اور مغفرت کی دعوت دیتا ہے ﴿بِاِذْنِهٖ﴾ اپنے حکم سے ﴿وَيُبَيِّنُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ﴾ اور بیان کرتا ہے اللہ تعالیٰ اپنی آیات لوگوں کے لیے ﴿لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ﴾ تاکہ لوگ نصیحت حاصل کریں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں نصیحت حاصل کرنے والوں میں سے بنائے۔ اپنی اور اپنی اولاد کی نگرانی کی توفیق فرمائے۔

﴿وَيَسْئَلُوْنَكَ﴾ اور سوال کرتے ہیں آپ سے ﴿عَنِ الْمَحِيْضِ﴾ حیض کے بارے میں ﴿قُلْ﴾ کہہ دے ﴿هُوَ اَذًى﴾ وہ ایک گندی چیز ہے ﴿فَاعْتَزِلُوا النِّسَآءَ﴾ پس الگ رہو عورتوں سے ﴿فِي الْمَحِيْضِ﴾ حیض کے دنوں میں ﴿وَلَا تَقْرَبُوْهُنَّ﴾ اور تم ان کے قریب مت جاؤ ہم بستری کے لیے ﴿حَتّٰى يَطْهُرْنَ﴾ یہاں تک کہ وہ پاک ہو جائیں ﴿فَاِذَا تَطَهَّرْنَ﴾ پس جس وقت وہ پاک ہو جائیں ﴿فَاْتُوْهُنَّ﴾ پھر تم ان کے پاس جاؤ ﴿مِنْ حَيْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ﴾ جس جگہ سے اللہ تعالیٰ نے تمھیں اجازت دی ہے ﴿اِنَّ اللّٰهَ﴾ بے شک اللہ تعالیٰ ﴿يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ﴾ محبت کرتا ہے توبہ کرنے والوں سے ﴿وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ﴾ اور محبت رکھتا ہے پاک باز لوگوں سے ﴿نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ﴾ تمھاری بیویاں تمھاری کھیتی ہیں ﴿فَاْتُوْا حَرْثَكُمْ﴾ پس جاؤ تم اپنی اپنی کھیتی میں ﴿اَنّٰى شِئْتُمْ﴾ جس طرح تم چاہو ﴿وَقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ﴾ اور آگے بھیجو اپنی جانوں کے لیے ﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ﴾ اور ڈرو اللہ تعالیٰ سے ﴿وَاعْلَمُوْٓا﴾ اور تم جان لو ﴿اَنَّكُمْ مُّلٰقُوْهُ﴾ بے شک تم اللہ کو ملنے والے ہو ﴿وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ اور خوش خبری سنا دے تو مومنوں کو ﴿وَلَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ﴾ اور نہ بناؤ تم اللہ تعالیٰ کو ﴿عُرْضَةً﴾ نشانہ ﴿لِّاَيْمَانِكُمْ﴾ اپنی قسموں کا ﴿اَنْ تَبَرُّوْا﴾ یہ کہ تم نیکی نہیں کرو گے ﴿وَتَتَّقُوْا﴾ اور تم پرہیز گاری نہیں کرو گے ﴿وَتُصْلِحُوْا بَيْنَ النَّاسِ﴾ اور یہ کہ تم صلح نہیں کرو گے لوگوں کے درمیان ﴿وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ﴾ اور اللہ تعالیٰ سننے والا، جاننے والا ہے ﴿لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ﴾ نہیں مؤاخذہ کرے گا اللہ تعالیٰ تمھارا ﴿بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ﴾ تمھاری لغو قسم کی قسموں میں ﴿وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ﴾ اور لیکن تمھارا مؤاخذہ کرے گا ﴿بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ﴾ ان قسموں میں جو تمھارے دلوں نے پورے ارادے کے ساتھ اُٹھائی ہیں ﴿وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ﴾ اور اللہ تعالیٰ بخشنے والا، تحمل کرنے والا ہے۔

پہلے رکوع میں اس بات کا ذکر ہوا تھا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بعض مسائل میں اشکالات پیش آئے۔ ان میں سے ایک شراب اور جوئے کے بارے میں تھا جس کا جواب ان کو ملا۔ ایک یہ تھا کہ ہم کون سی چیز رب تعالیٰ کے راستے میں خرچ کریں؟ اس کا جواب ملا۔ پھر یتیموں کے بارے میں سوال کیا کہ ہم یتیموں کے ساتھ کس طرح پیش آئیں؟ اس کا جواب ملا۔ اسی طرح یہ سوال بھی پیش آیا۔

ماہواری کے بعض احکام:

دیکھو! اللہ تعالیٰ نے نسل انسانی کی افزائش کے لیے مرد بھی پیدا فرمائے اور عورتیں بھی۔ عورتوں کی وضع قطع اور ساخت جدا ہے اور مردوں کی جدا ہے۔ وہ بچے جو عورتوں کے پیٹ میں ہوتے ہیں ان کی خوراک کا انتظام اللہ تعالیٰ نے پیدائشی طور پر کر

دیا۔جس وقت بچی جوان ہوتی ہے اور ماہواری شروع ہو جاتی ہے اور ہر مہینے ماہواری آتی ہے۔جب شادی ہوتی ہے اور حمل قرار پاتا ہے تو یہ ماہواری والا خون اس بچے کی خوراک بن جاتا ہے۔اس خون سے بچہ پھلتا پھولتا ہے۔جب تک بچہ ماں کے پیٹ میں رہتا ہے تقریباً نو ماہ تک عورت کو حیض نہیں آتا۔اس واسطے کہ وہ زائد خون جو نکلتا تھا وہ بچے کی خوراک بن گیا۔جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو رب تعالیٰ اسی خون کو بچے کی خوراک کے لیے دودھ میں تبدیل کر دیتے ہیں۔مدتِ رضاعت میں بہت کم عورتوں کو ایام ماہواری آتے ہیں۔رب تعالیٰ کی قدرت دیکھو کہ ہے وہ گندہ خون مگر رب تعالیٰ نے پیٹ میں بچے کی خوراک بنائی ہے،اور پیدا ہونے کے بعد بھی کم وبیش دو سال تک وہ اس کی خوراک ہے،اور یہ خون اگر اپنے وقت پر آتا رہے تو عورتیں صحت مند رہتی ہیں کیوں کہ قدرت نے ان کی صحت اس میں رکھی ہے۔اگر اس میں گڑبڑ ہو جائے تو رحم کا نظام بگڑ جاتا ہے۔

زمانۂ جاہلیت میں یہود کے ہاں رواج تھا جب کسی عورت کو ماہواری شروع ہو جاتی تو اس کو الگ کمرے میں بند کر دیتے۔نہ اس کے ہاتھ سے روٹی پکڑتے،نہ پانی،نہ اس سے کپڑے دھلواتے،نہ اس کو جھاڑو پھیرنے دیتے،نہ اس کے سامنے آتے،نہ اس کو کسی کے سامنے آنے دیتے۔اس طرح کہ جیسے کوئی نکمی چیز ہوتی ہے اس کو اس طرح بناتے دیتے۔حالانکہ ہے تو وہ بھی انسان اور یہ تو اس کے اختیار میں نہیں ہے یہ تو رب نے نظام بنایا ہے۔اور جو عرب کے مشرک تھے وہ ان دنوں میں بھی ہم بستری سے باز نہیں آتے تھے۔حالانکہ ماہواری کے دوران ہم بستری مرد کے لیے اور عورت کے لیے بھی بہت سی بیماریوں کا پیش خیمہ ہے۔مثلاً:آتشک،سوزاک وغیرہ وغیرہ۔اور عورتوں کے رحم میں کمزوری ہو جاتی ہے اور بچے سوکھنے شروع ہو جاتے ہیں جس کو سُوکھا مسان کہتے ہیں اور پرچھاواں بھی اس کی ایک قسم ہے۔

رب تعالیٰ نے جو نظام بنایا ہے اس میں اگر تھوڑا سا بھی تغیر ہو جائے تو نظام نہیں چلتا۔تو ان دنوں میں عورت کے پاس جانا عورت اور مرد دونوں کی صحت کے لیے سخت مُضر ہے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم شروع شروع میں تو شرماتے رہے کہ یہ باتیں ہم کیسے پوچھیں۔لیکن پھر مجبوراً ان کو پوچھنا پڑا کہ حضرت!ہم دیکھتے ہیں کہ یہود کے گھروں میں جب کوئی عورت ایامِ ماہواری میں مبتلا ہو جاتی ہے تو اس کو ہر طرح سے الگ کر دیا جاتا ہے۔اور مشرکین کو ہم دیکھتے ہیں کہ ان دنوں میں بھی ہم بستری سے باز نہیں آتے۔حضرت!ارشاد فرمائیں کہ ہم نے کیا کرنا ہے؟

تو فرمایا ﴿وَ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ﴾ اُنھوں نے حیض کے بارے میں تم سے سوال کیا ہے ﴿قُلْ﴾ کہہ دو ﴿هُوَ اَذًى﴾ وہ گندہ خون ہے ﴿فَاعْتَزِلُوا النِّسَآءَ فِي الْمَحِيْضِ﴾ عورتوں سے ہم بستری کے سلسلہ میں الگ رہو ﴿وَ لَا تَقْرَبُوْهُنَّ﴾ ان دنوں میں ہم بستری کے لیے ان کے قریب نہ جاؤ ﴿حَتّٰى يَطْهُرْنَ﴾ یہاں تک کہ وہ پاک ہو جائیں ﴿فَاِذَا تَطَهَّرْنَ﴾ پس جس وقت وہ پاک ہو جائیں ﴿فَاْتُوْهُنَّ﴾ پس ان کے پاس جاؤ ﴿مِنْ حَيْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ﴾ جہاں سے تمھیں اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے۔ اس کے علاوہ اور کسی چیز پر پابندی نہیں ہے۔مثلاً:وہ عورت روٹی بھی پکا سکتی ہے اور اس کو تم کھا سکتے ہو اور پانی بھی دے سکتی ہے جسے تم پی سکتے ہو۔کپڑے بھی دھو سکتی ہے،گھر میں پھر سکتی ہے،میاں بیوی اکٹھے لیٹ سکتے ہیں صرف ہم بستری جائز نہیں ہے۔

ایک موقع پر آنحضرت ﷺ نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو فرمایا کہ مجھے یہ مصلیٰ پکڑا دو میں نے نماز پڑھنی ہے، حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے کہا کہ حضرت میں ایامِ ماہواری میں مبتلا ہوں۔ تو اس کے جواب میں آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ماہواری تیرے ہاتھ کے ساتھ تو نہیں ہے۔ ہاتھ سے پکڑا سکتی ہو۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ آنحضرت ﷺ مسجد میں معتکف ہوتے اور مسجد کی دیوار اور اس حجرے کی دیوار جس میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا رہتی تھیں، مشترکہ تھی اور اس میں کھڑکی لگی ہوئی تھی۔ آپ فرماتے میرا سر دھو دیں میں کہتی کہ میں ایامِ ماہواری میں ہوں۔ تو آپ ﷺ فرماتے کہ تو نے میرا سر ہاتھوں کے ساتھ دھونا ہے۔

فقہاء کی فضیلت

ایک مسئلہ پیش آیا۔ وہ اس طرح کہ ایک عورت تھی جو بغداد میں مردہ عورتوں کو غسل دیتی تھی۔ اور مسئلہ یہ ہے کہ مردہ مرد کو مرد غسل دے اور مردہ عورت کو عورت غسل دے۔ اگر کوئی اُجرت لے کر غسل دے تو اس کی بھی فقہائے کرام نے اجازت دی ہے۔ لیکن اگر بغیر اُجرت کے کوئی غسل دے تو اس کا بڑا ثواب ہے۔

صرف دو حدیثیں میرے پیشِ نظر ہیں۔ (حالانکہ مجھے پڑھاتے ہوئے ساٹھ سال سے زیادہ عرصہ ہو گیا ہے۔) گناہِ کبیرہ معاف نہیں ہوتے جو رب تعالیٰ کے حق ہیں سوائے دو چیزوں کے۔ ایک یہ کہ جو شخص مسلمان مردے کو ثواب سمجھ کر غسل دے تو اُس کے چالیس کبیرہ گناہ معاف ہو جائیں گے۔ دوسرا صلوٰۃ التسبیح کے ساتھ کبیرہ گناہ معاف ہو جائیں گے۔ اس کے سوا اور کوئی روایت میرے سامنے نہیں ہے کہ اور کسی نیکی سے کبیرہ گناہ معاف ہو جائیں۔ فرض نماز سے بھی معاف نہیں ہوتے، روزوں سے بھی معاف نہیں ہوتے، حج سے بھی معاف نہیں ہوتے، عمرے سے بھی معاف نہیں ہوتے۔ ہاں توبہ سے معاف ہوں گے یا حق ادا کرنے سے معاف ہوں گے۔

تو بات ہو رہی تھی کہ ایک عورت آئی جو مردہ عورتوں کو غسل دیتی تھی۔ اس کو ایامِ ماہواری شروع ہو گئے۔ محدثین کا ایک گروہ تھا وہ احادیث کا تکرار کر رہے تھے اور بڑے بڑے چوٹی کے محدث تھے۔ یہ عورت ان کے پاس گئی اور کہنے لگی کہ شرع میں کوئی شرم نہیں ہے میں نے آپ سے یہ مسئلہ دریافت کرنا ہے۔ وہ یہ کہ میں مُردہ کو حیض کی حالت میں غسل دے سکتی ہوں یا نہیں۔ وہ ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے کہ اس پر صریح روایت تو ہے نہیں۔

دیکھو! یہ جو بعض نادان لوگ یہ رٹ لگاتے ہیں کہ ساری تصریح قرآن پاک میں ہے اور ہر چیز کی تصریح حدیث میں موجود ہے۔ یہ کہنے والے بالکل نادان ہیں۔ ہاں اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اصول قرآن میں ہیں اور اصول حدیث میں ہیں۔ باقی ساری جزئیات اور فروع یعنی تمام مسائل نہ قرآن میں ہیں اور نہ حدیث میں۔ ان کی روشنی میں وہ مسائل فقہ اسلامی سے سمجھے جائیں گے۔ تو وہ بڑے چوٹی کے محدث تھے۔ یحییٰ ابن معین، امام بخاری کے استاد ہیں اور بڑے چوٹی کے محدث تھے

مگر سوچنے لگ گئے کہ کیا جواب دیں، اچانک امام اسلم جو بڑے چوٹی کے فقیہ تھے سامنے نظر آ گئے۔ تو ان محدثین نے کہا کہ یہ مسئلہ اس آدمی سے پوچھ۔ تو اُس عورت نے ان سے مسئلہ دریافت کیا تو اُنھوں نے فرمایا کہ تو حیض کی حالت میں مردہ عورت کو غسل دے سکتی ہے۔ محدثین نے کہا کہ اس پر تمھارے پاس کیا دلیل ہے؟ فرمایا دلیل یہ ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ ایام میں ہوتی تھیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا سر مبارک دھوتی تھیں۔ پھر محدثین نے اس کی سندیں بیان کرنا شروع کیں۔ تو عورت نے کہا کہ اب سندیں بیان کرنے کا کیا فائدہ؟ میرا مسئلہ حل ہو گیا ہے۔ تو عورت اس حالت میں سارے کام کر سکتی ہے۔ البتہ مسجد میں داخل نہیں ہو سکتی اور قرآن شریف زبانی بھی نہیں پڑھ سکتی۔ ترمذی وغیرہ کی روایت ہے کہ ((لَا تَقْرَءُ الْحَائِضُ وَ لَا الْجُنُبُ شَيْئًا مِّنَ الْقُرْاٰنِ)) کہ حیض والی عورت اور جنبی آدمی قرآن نہیں پڑھ سکتے۔ اسی طرح کعبۃ اللہ کا طواف نہیں کر سکتے۔ روزہ نہیں رکھ سکتی، نماز نہیں پڑھ سکتی۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ﴾ بے شک اللہ تعالیٰ محبت کرتا ہے توبہ کرنے والوں سے ﴿وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ﴾ اور محبت کرتا ہے پاک باز لوگوں سے ﴿نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ﴾ تمھاری منکوحہ تمھاری کھیتی ہیں ﴿فَاْتُوْا حَرْثَكُمْ اَنّٰى شِئْتُمْ﴾ پس جاؤ تم اپنی کھیتی میں جس طرح چاہو ﴿وَقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ﴾ اور آگے بھیجو اپنی جانوں کے لیے یعنی صرف لذت ہی مقصد نہ ہو بلکہ یہ نیت رکھو کہ اللہ تعالیٰ تمھیں کوئی نیک اولاد دے کہ وہ دین کی خادم بنے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم راضی ہوں۔ کیوں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ((تَزَوَّجُوا الْوَلُوْدَ الْوَدُوْدَ فَاِنِّیْ مُكَاثِرٌ بِكُمُ الْاُمَمَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ)) "ایسے خاندان کی عورتوں سے نکاح کرو جن کے ہاں بچے زیادہ پیدا ہوتے ہیں اور محبت کرنے والیاں ہوں کیوں کہ قیامت والے دن میں اپنی امت کی کثرت پر فخر کروں گا کہ میری امت زیادہ ہے۔"

﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ﴾ اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو ﴿وَاعْلَمُوْٓا﴾ اور جان لو تم کہ ﴿اَنَّكُمْ مُّلٰقُوْهُ﴾ بے شک تم اللہ تعالیٰ سے ملنے والے ہو۔ آنکھ بند ہونے کے بعد تمھاری رب تعالیٰ سے ملاقات ہونے والی ہے جو کرو گے سو بھرو گے ﴿وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ اور ہمارے حکموں کو جو مانتے ہیں ان کو خوش خبری سنا دو کہ رب تعالیٰ ان سے راضی ہے۔

قسم کے احکام:

آگے اور مسئلہ ہے۔ کچھ لوگ ایسے تھے جو قسم اُٹھاتے تھے مثلاً: کسی سے ناراض ہوئے تو قسم اُٹھالی کہ اللہ کی قسم میں فلاں سے نہیں بولوں گا، میں اس کے گھر نہیں جاؤں گا، میں اُس سے کھانا نہیں کھاؤں گا۔ اس طرح کی قسمیں لوگ اس وقت بھی اُٹھاتے تھے اور آج کل بھی اُٹھاتے ہیں۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے حکم دیا ﴿وَلَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ﴾ اور نہ بناؤ تم اللہ تعالیٰ کی ذات کو ﴿عُرْضَةً﴾ حیلہ بہانہ ﴿لِّاَيْمَانِكُمْ﴾ اپنی قسموں کا۔ وہ اس طرح کہ رب تعالیٰ کے نام کی قسم اُٹھا کر یہ آڑ بناؤ کہ میں رب کی قسم کھا بیٹھا ہوں لہٰذا اب

میں یہ کام نہیں کروں گا۔اب رہا یہ مسئلہ کہ کس چیز کے بارے میں قسم نہ کھاؤ۔تو فرمایا ﴿اَنْ تَبَرُّوْا﴾ یہ کہ تم نیکی نہیں کرو گے ﴿وَ تَتَّقُوْا﴾ اور یہ کہ تم تقویٰ اختیار نہیں کرو گے ﴿وَتُصْلِحُوْا بَيْنَ النَّاسِ﴾ اور یہ کہ تم لوگوں کے درمیان صلح نہیں کراؤ گے۔اب مثال کے طور پر کوئی شخص یہ قسم اُٹھاتا ہے کہ خدا کی قسم میں نماز نہیں پڑھوں گا، خدا کی قسم میں روزہ نہیں رکھوں گا، خدا کی قسم میں مسجد میں نہیں جاؤں گا، اللہ کی قسم میں نیکی نہیں کروں گا، اللہ کی قسم میں اپنے باپ سے نہیں بولوں گا۔ یہ قسمیں اس کی صحیح نہیں ہیں۔ اس کو ان قسموں کا کفارہ ادا کرنا پڑے گا۔ان قسموں پر اس کا اصرار بالکل جائز نہیں ہے۔وہ اس طرح بہانہ نہ بنائے کہ میں چوں کہ قسم اُٹھا بیٹھا ہوں اس واسطے میں مجبور ہوں، معذور ہوں۔نیکی سے رُکنے کے لیے قسم صحیح نہیں ہے۔یہ قسم توڑنی پڑے گی اور کفارہ دینا پڑے گا۔اور کفارے کا ذکر یہاں نہیں ہوا اس کا بیان ساتویں پارے میں ہے۔

قسم کا کفارہ یہ ہے کہ دس مسکینوں کو لباس پہنادے اور لباس ایسا کہ جس میں نماز جائز ہو۔یعنی چادر یا شلوار اور کرتا اور ٹوپی۔بس یہ تین کپڑے کافی ہیں۔ یا دس مسکینوں کو دو وقت کا پیٹ بھر کر کھانا کھلا دے۔ یہاں یہ بات یاد رکھنا کہ ان دس مسکینوں کے لیے کچھ پابندیاں ہیں:

① یہ سارے مسلمان ہوں ان میں کوئی کافر نہ ہو۔ایک تو کھلے کافر ہیں ان کو تو ساری دنیا جانتی ہے۔دوسرے وہ کافر ہیں جو شریعت کی رو سے تو کافر ہیں مگر وہ اپنے آپ کو کافر نہیں کہتے۔جیسے قادیانی کافر ہیں، بابی اور بہائی کافر ہیں، رافضی کافر ہیں، شرک کرنے والے کافر ہیں۔بڑے فتنے ہیں اور جوں جوں قیامت قریب آئے گی فتنے بڑھیں گے۔

کل ہی میرے پاس ایک رسالہ آیا، عربی لغت میں کینیڈا سے شائع ہوا ہے۔معلوم نہیں اُن کو میرے نام کا کیسے پتا چل گیا۔اس میں یہ لکھا ہے کہ دنیا میں جتنے مذاہب ہیں ان میں سے سچا مذہب صرف بہائی ہے۔مرزا محمد حسین بہاءُ اللہ، اللہ کا پیغمبر تھا تم اس کو مانو، معاذ اللہ تعالیٰ۔ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ.

یہ بہائی کراچی میں موجود ہیں، کوئٹہ میں موجود ہیں۔ بڑے بڑے شہروں میں موجود ہیں۔ یہاں تو علماء چیختے چلاتے رہتے ہیں اور باطل فرقوں کی نشان دہی کرتے رہتے ہیں اس واسطے لوگ کچھ نہ کچھ آگاہ ہیں۔اور یہ فرقے بڑے مدہم طریقے سے چلتے ہیں۔پہلے قطعاً نہیں بتاتے کہ ہمارا فلاں فرقے سے تعلق ہے۔پہلے تمھارے دوست بھائی بنیں گے پھر کچھ عرصہ کے بعد تمھارے عقیدے بگاڑیں گے۔

② دوسری شرط یہ ہے کہ ان مساکین میں سے کوئی سید نہ ہو۔کیوں کہ قسم کے کفارے کا، عشر کا، زکوٰۃ کا، فطرانے کا، نذر و منت کا سید مصرف نہیں ہے۔

سید میں کون کون آتے ہیں؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی، حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی اور حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کی، حضرت عقیل رضی اللہ عنہ کی اولاد اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حارث کی اولاد۔اگرچہ حارث خود مسلمان نہیں ہوئے مگر اولاد مسلمان تھی۔ان پانچ بزرگ ہستیوں کی اولاد کو شریعت سادات کہتی ہے۔اور وہ مساکین صاحبِ نصاب نہ ہو، اور یہ بات کئی مرتبہ آپ لوگ سن چکے ہیں کہ

جس کے گھر میں ضرورت سے زائد اتنا سامان ہے جس کی قیمت اس وقت ساڑھے چار ہزار بنتی ہے وہ صاحبِ نصاب ہے۔

③ دو وقت کا کھانا کھلانا ہے۔ مسکین جو کھانا صبح کھائیں وہی شام کو کھائیں۔

④ ان دس مسکینوں میں نابالغ بچہ کوئی نہ ہو۔

⑤ ان میں سے کوئی بیمار نہ ہو۔

⑥ ان میں کوئی اتنا بوڑھا نہ ہو جو کھا پی نہ سکے۔

یا ایک غلام یا لونڈی آزاد کرنا ہے۔ اس دور میں غلام تو موجود نہیں ہیں، اگر ہو تو وہ آزاد کر دیں ﴿فَمَنْ لَّمْ یَجِدْ فَصِیَامُ ثَلٰثَةِ اَیَّامٍ﴾ اور جس کو یہ توفیق نہ ہو وہ تین دن کے روزے رکھے۔ اگر مذکورہ تین چیزوں میں سے کسی پر قدرت نہیں رکھتا تو پھر تین روزے رکھے۔ ﴿وَاللّٰهُ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ﴾ اور اللہ تعالیٰ سنتا بھی ہے، جانتا بھی ہے۔

قسم کی اقسام

﴿لَا یُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِیْٓ اَیْمَانِكُمْ﴾ "نہیں مؤاخذہ فرمائیں گے اللہ تعالیٰ تمھارا لغو قسم کی قسموں میں۔"

قسمیں تین قسم کی ہوتی ہیں:

- ایک یہ بے ساختہ غیر اختیاری طور پر زبان سے نکل جائے۔ تو ایسی قسم کا نہ گناہ ہے نہ کفارہ۔ اس کو یمین لغو کہتے ہیں۔ اسی طرح گزشتہ کسی چیز پر قسم اُٹھائی اور قسم اُٹھاتے وقت اپنے آپ کو سچا سمجھ رہا ہے۔ مثلاً: کسی کام کے بارے میں قسم اُٹھاتا ہے کہ وہ کام میں نے نہیں کیا حالانکہ وہ کام کیا ہوتا ہے مگر اس وقت بھول گیا ہے اس کو بھی یمین لغو کہتے ہیں۔
- دوسری یمین غموس ہے۔ وہ یہ کہ گزشتہ کسی چیز کے بارے میں دیدہ دانستہ قسم اُٹھاتا ہے کہ میں نے وہ کام نہیں کیا۔ حالانکہ کر چکا ہے۔ تو اس میں کفارہ نہیں ہے مگر قسم اُٹھانے والا گناہ گار ہوتا ہے۔ آخرت میں قابلِ مؤاخذہ ہے۔
- تیسری قسم ہے منعقدہ۔ وہ یہ کہ کوئی شخص آنے والے زمانہ کے لیے قسم اُٹھاتا ہے کہ میں فلاں کام کروں گا یا فلاں کام نہیں کروں گا پھر اس کے خلاف کرتا ہے تو اس پر کفارہ آئے گا جیسا کہ پہلے بیان ہوا ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتے ہیں ﴿لَا یُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ﴾ نہیں پکڑے گا تمھیں اللہ تعالیٰ ﴿بِاللَّغْوِ فِیْٓ اَیْمَانِكُمْ﴾ تمہاری لغو قسم کی قسموں پر ﴿وَلٰكِنْ یُّؤَاخِذُكُمْ﴾ اور لیکن اللہ تعالیٰ تمھارا مؤاخذہ کرے گا ﴿بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ﴾ ان قسموں میں کہ جن پر دل نے گرہ لگائی ہے وہ قسمیں جو ارادۃً اُٹھائی ہیں ﴿وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِیْمٌ﴾ اور اللہ تعالیٰ بخشنے والا بھی ہے اور تحمل کرنے والا بھی ہے۔ اگر فوراً سزا نہیں دیتا تو یہ نہ سمجھو کہ بچ گئے ہو۔

﴿لِلَّذِيْنَ﴾ ان لوگوں کے لیے ﴿يُؤْلُوْنَ﴾ جو قسم اُٹھاتے ہیں ﴿مِنْ نِّسَآىِٕهِمْ﴾ اپنی بیویوں کے بارے میں ﴿تَرَبُّصُ﴾ انتظار کرنا ہے ﴿اَرْبَعَةِ اَشْهُرٍ﴾ چار ماہ کا ﴿فَاِنْ فَآءُوْ﴾ پس اگر وہ لوٹ آئیں ﴿فَاِنَّ اللّٰهَ﴾ پس بے شک اللہ تعالیٰ ﴿غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾ بخشنے والا مہربان ہے ﴿وَاِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ﴾ اور اگر وہ ارادہ کرلیں طلاق کا ﴿فَاِنَّ اللّٰهَ﴾ پس بے شک اللہ تعالیٰ ﴿سَمِيْعٌ﴾ سننے والا عَلِیْمٌ جاننے والا ہے ﴿وَالْمُطَلَّقٰتُ﴾ اور وہ عورتیں جن کو طلاق دی گئی ﴿يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ﴾ روکے رکھیں اپنی جانوں کو ﴿ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ﴾ تین حیض ﴿وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ﴾ اور نہیں حلال ان کے لیے ﴿اَنْ يَّكْتُمْنَ﴾ یہ کہ چھپائیں مَا اس چیز کو ﴿خَلَقَ اللّٰهُ﴾ جو پیدا کی ہے اللہ تعالیٰ نے ﴿فِيْٓ اَرْحَامِهِنَّ﴾ ان کے رحموں میں ﴿اِنْ كُنَّ﴾ اگر ہیں وہ ﴿يُؤْمِنَّ بِاللّٰهِ﴾ ایمان لانے والی اللہ تعالیٰ پر ﴿وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ﴾ اور آخرت کے دن پر ﴿وَبُعُوْلَتُهُنَّ﴾ اور ان کے شوہر ﴿اَحَقُّ﴾ زیادہ حق دار ہیں ﴿بِرَدِّهِنَّ﴾ ان کو لوٹانے کے ﴿فِيْ ذٰلِكَ﴾ عدت کے اندر ﴿اِنْ اَرَادُوْٓا اِصْلَاحًا﴾ اگر ارادہ کریں وہ اصلاح کرنے کا ﴿وَلَهُنَّ﴾ اور اُن عورتوں کے لیے بھی حق ہیں ﴿مِثْلُ الَّذِيْ﴾ ان حقوق کے مثل ﴿عَلَيْهِنَّ﴾ جو ان عورتوں کے ذمہ ہیں مردوں کے لیے ﴿بِالْمَعْرُوْفِ﴾ عمدگی کے ساتھ ﴿وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ﴾ اور مردوں کے لیے عورتوں پر درجہ ہے ﴿وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ﴾ اور اللہ تعالیٰ غالب ہے حکمت والا ہے۔

دین کا ایک حصہ اللہ تعالیٰ کے حقوق کے ساتھ متعلق ہے۔ جیسے: نمازیں، روزے ہیں۔ حج، زکوٰۃ، قربانی اور عشر، فطرانہ وغیرہ اور دین کا ایک حصہ حقوق العباد کے ساتھ تعلق رکھتا ہے۔ مثلاً: نکاح، طلاق ہے، خرید و فروخت ہے۔ آپس میں زندگی کس طرح بسر کرنا ہے؟ اس کے متعلق جو قانون ہے یہ بھی دین کا حصہ ہے۔ تو اس سلسلہ میں قسموں کا ذکر تھا کہ اگر بے ساختہ غیر اختیاری طور پر قسم زبان سے نکل جائے تو اس پر اللہ تعالیٰ مؤاخذہ نہیں فرمائیں گے اور اگر قصداً قسم اُٹھائے گا تو اُس پر گرفت ہوگی۔ اب ان آیات میں ایک قسم کی قسم کا ذکر ہے۔

ایلاء کا حکم ؟

﴿لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ﴾ يُؤْلُوْنَ اِيْلَاء سے ہے اور اس کا مجرد ہے اِلْيَةٌ اور اِلْيَةٌ کا معنیٰ ہے قسم۔ لیکن شریعت کی اصطلاح میں اِيْلَاء کہتے ہیں کہ کوئی شخص اپنی بیوی سے ناراض ہو کر یہ قسم اُٹھا لے کہ میں تیرے نزدیک نہیں آؤں گا۔ تو اس کے لیے رب تعالیٰ نے ضابطہ بیان فرمایا ہے کہ اگر کوئی شخص قسم اُٹھاتا ہے اور کہتا ہے کہ اللہ کی قسم ہے میں چار مہینے تیرے قریب نہیں آؤں گا۔ اگر یہ شخص چار ماہ کے اندر اندر اپنی بیوی کے پاس چلا گیا تو اس کو قسم کا کفارہ ادا کرنا پڑے گا اور اِيْلَاء کا حکم ختم ہو جائے گا اور اگر چار ماہ تک بیوی کے پاس نہ گیا تو قسم پوری ہوگئی کفارہ نہیں آئے گا البتہ ایک طلاق بائنہ واقع ہو جائے گی۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق یہ ہے کہ اس حالت میں اس عورت پر ایک طلاق بائنہ خود بہ خود واقع ہو جائے گی۔ اور بائنہ کا مطلب یہ ہے کہ بیوی الگ ہوگئی تجدید نکاح کے بغیر رجوع نہیں کر سکتا۔ اگر یہ اکٹھا رہنا چاہتے ہیں تو دوبارہ نکاح ہوگا۔ اور اگر چار ماہ سے کم قسم اُٹھائی ہے تو وہ شرعی ایلاء نہیں ہے۔ مثلاً: کوئی شخص ایک ماہ کی قسم اُٹھاتا ہے یا دو ماہ یا تین ماہ کی تو یہ مدت گزرنے کے بعد خود بہ خود طلاق واقع نہیں ہوگی۔

دوسری صورت یہ ہے کہ قسم اُٹھاتا ہے اور کہتا ہے کہ میں ساری زندگی تیرے قریب نہیں آؤں گا۔ یعنی چار ماہ کا ذکر نہیں کرتا تو بھی ایلاء ہو جائے گا۔ یا چار ماہ سے زیادہ کا ذکر کرتا ہے، پانچ ماہ یا سات ماہ یا دس ماہ وغیرہ کا تو بھی ایلاء ہو جائے گا۔

تو فرمایا ﴿لِلَّذِيْنَ﴾ ان لوگوں کے لیے ﴿يُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ﴾ جو قسم اُٹھاتے ہیں بیویوں کے پاس نہ جانے کی ﴿تَرَبُّصُ﴾ انتظار کرنا ہے ﴿اَرْبَعَةِ اَشْهُرٍ﴾ چار ماہ کا ﴿فَاِنْ فَآءُوْ﴾ پس اگر وہ چار ماہ کے دوران لوٹ آئیں ﴿فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾ پس بے شک اللہ تعالیٰ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔ نکاح برقرار رہے گا اور قسم کا کفارہ ادا کرنا پڑے گا ﴿وَاِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ﴾ اور اگر انھوں نے ارادہ کرلیا ہے طلاق کا تو چار ماہ گزرنے کے بعد ایک طلاق بائنہ ہو جائے گی ﴿فَاِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ﴾ پس بے شک اللہ تعالیٰ باتیں بھی سنتا ہے اور علیم ہے نیتوں کو بھی جانتا ہے۔

طلاق کے احکام

آگے طلاق کے حکم بتاتے ہیں۔ یہاں ایک بات یاد رکھیں کہ طلاق اچھی چیز نہیں ہے۔ چنانچہ حدیث پاک میں آتا ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((اِنَّ اَبْغَضَ الْمُبَاحَاتِ عِنْدَ اللّٰهِ الطَّلَاقُ)) وہ چیزیں جو جائز ہیں ان میں بُری چیز طلاق ہے کہ بے شک جائز چیزوں میں سے جس پر اللہ تعالیٰ زیادہ ناراض ہوتے ہیں وہ طلاق ہے۔

اسی طرح ابوداؤد شریف کی روایت ہے کہ جس عورت نے اشد ضرورت کے بغیر خاوند سے طلاق طلب کی اس پر جنت حرام ہے۔ دیکھو! گھروں میں ناراضگیاں ہوتی رہتی ہیں، نوک جھوک ہوتی رہتی ہے۔ تو ان چیزوں سے اُکتا کر طلاق کا مطالبہ کرنا سخت گناہ ہے۔ ہاں! اگر خاوند نامرد ہے یا اس کا نان نفقہ نہیں دیتا یا بلاوجہ اکثر مارتا رہتا ہے تو طلاق کا مطالبہ کر سکتی ہے۔ تو مجبوری کی حالت میں شریعت نے طلاق کی اجازت دی ہے جس کی تفصیل اگلے رکوع میں آئے گی۔ ان شاء اللہ اگر زندگی رہی تو بیان کریں گے۔

اگر کسی شخص نے صریح الفاظ کے ساتھ کہہ دیا کہ میں نے تجھے طلاق دی ہے تو یہ طلاقِ رجعی ہوگی۔ رجعی کا مطلب یہ ہے کہ وہ عدت کے دوران بیوی سے رجوع کر سکتا ہے۔ بغیر تجدید نکاح کے یا دو مرتبہ کہا کہ میں نے تجھے طلاق دے دی ہے تو یہ بھی طلاق رجعی ہے یعنی دورانِ عدت رجوع کر سکتا ہے اور اگر عدت گزر گئی تو یہی طلاقِ رجعی بائنہ ہو جائے گی اور نئے سرے سے نکاح کرنا پڑے گا، مہر بھی مقرر کرنا پڑے گا، دو شرعی گواہ ہوں گے۔ اور اگر تین طلاقیں دے دیں تو پھر اس کے بعد دھکے

شاہی ہے۔شرعی طور پر کوئی گنجائش نہیں ہے جس کی تفصیل اگلے رکوع میں آئے گی ان شاء اللہ تعالیٰ۔

تو فرمایا ﴿وَالْمُطَلَّقٰتُ﴾ اور وہ عورتیں جن کو طلاق ملی ہے ﴿یَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ﴾ وہ روکے رکھیں اپنی جانوں کو ﴿ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ﴾ تین حیض۔تو یہاں سے عدت کا مسئلہ بیان ہو رہا ہے اور اس کی کئی صورتیں ہیں:

ایک یہ ہے کہ وہ عورت جس کو طلاق ملی ہے اس کے پیٹ میں بچہ ہے۔یعنی جب اس کو طلاق ہوئی اس وقت وہ حاملہ تھی۔اس کی عدت ہے بچے کی پیدائش تک۔مثلاً: اس کو حاملہ ہوئے ایک ماہ گزرا اور طلاق ہوگئی (کیوں کہ حمل کی حالت میں بھی طلاق ہو جاتی ہے۔) اور یہ جو عوام میں مشہور ہے کہ حمل کی حالت میں طلاق نہیں ہوتی یہ بات بالکل غلط ہے۔تو اس کی عدت ہے وضع حمل۔اور بچہ چاہے چھ ماہ بعد پیدا ہو یا دس ماہ بعد۔کیوں کہ بعض بچے دس ماہ سے زائد عرصہ تک ماں کے پیٹ میں رہتے ہیں۔ایسی مثالیں بھی موجود ہیں کہ دو، دو سال، چار، چار سال بچے ماں کے پیٹ میں رہے ہیں۔

چنانچہ ضحاک ابن مزاحم رحمۃ اللہ علیہ یہ تابعی ہیں۔یہ چار سال ماں کے پیٹ میں رہے۔جب پیدا ہوئے تو ان کے سارے دانت نکلے ہوئے تھے۔اور جب پیدا ہوئے تو ٹھاہ ٹھاہ کر کے ہنسنا شروع کر دیا بجائے رونے کے تو گھر والوں نے نام ہی ضحاک رکھ دیا، ہنسنے والا۔مگر ایسی مثالیں نادر ہیں عموماً بچہ ماں کے پیٹ میں نو ماہ تک رہتا ہے۔اور اگر مطلقہ حاملہ نہیں ہے تو اس کی عدت تین حیض ہیں۔تین حیض گزرنے کے بعد اس کی عدت ختم ہوگی۔

یہاں یہ مسئلہ بھی سمجھ لیں کہ شریعت نے طلاق کا بہتر طریقہ یہ بتایا ہے کہ طلاق ان دنوں میں دی جائے کہ جن دنوں میں عورت پاک ہوتی ہے۔حیض کی حالت میں طلاق دینا اچھی بات نہیں ہے۔ہاں اگر کسی نے اس حالت میں دے دی تو ہو جائے گی۔اور اگر مطلقہ ایسی ہے کہ اس کو ماہواری نہیں آتی بڑھاپے کی وجہ سے یا صغرسنی کی وجہ سے کہ ابھی نابالغ تھی اور نکاح ہو گیا تھا اور اس کو طلاق مل گئی تو ان کی عدت ہے تین ماہ۔ان عدتوں کا ذکر قرآن پاک میں موجود ہے۔تین مہینوں والی عدت کا ذکر سورۃ الطلاق کے اندر ہے اور مطلقہ حاملہ کی عدت کا ذکر بھی سورۂ طلاق میں ہے۔اور یہاں اس کی عدت کا ذکر ہے جس کو حیض آتا ہے اور طلاق ہوئی ہے رخصتی کے بعد تو اس کی عدت ہے تین حیض۔اور اگر نکاح ہوا ہے رخصتی نہیں ہوئی یعنی میاں بیوی کا ملاپ نہیں ہوا تو اس کا حکم بائیسویں پارے میں ہے ﴿فَمَا لَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ تَعْتَدُّوْنَهَا﴾ [الاحزاب:۴۹] کہ اس عورت کی کوئی عدت نہیں ہے۔وہ طلاق کے دو منٹ بعد جہاں چاہے نکاح کر سکتی ہے۔

غلط عائلی قوانین کے خلاف علماء کی جدوجہد

صدر ایوب خان کے زمانے میں جب عائلی قوانین کے ذریعے کچھ چیزیں خلافِ شرع نافذ ہوئیں جو اب تک نافذ ہیں ان میں ایک شق یہ بھی تھی کہ مطلقہ غیر حاملہ کی عدت نوے دن ہے، تو ہم نے ملاقات کی کوشش کی، علماء کا وفد تیار ہوا کہ اس کو بتائیں کہ یہ جو تمہارا حکم ہے اس کی ایک شق قرآن کے خلاف ہے اور ایک شق اجماع کے خلاف ہے۔تو اسلامی ملک میں ایسا کام

کرنا جو قرآن اور اجماع امت کے خلاف ہو صحیح نہیں ہے۔لیکن اقتدار اقتدار ہوتا ہے اس کا نشہ بہت بُرا ہوتا ہے۔ایوب نے کہا میرے پاس وقت نہیں ہے۔دو دن کے بعد جاپان سے ناچنے والوں کا ایک طائفہ آیا تھا جس میں کچھ عورتیں اور کچھ مرد تھے،ان کو ایوب نے وقت دے دیا۔

مولانا غلام غوث ہزاروی رحمۃ اللہ علیہ بڑے جرأت مند آدمی تھے۔اُنھوں نے ایوب کو کھڑکا دیا کہ علماء کے لیے تو تیرے پاس وقت نہیں ہے اور ان ناچنے والوں کے لیے تیرے پاس وقت ہے۔تو اس وقت ایوب نے مُلّاں کا لفظ استعمال کیا حقارت سے۔تو مولانا ہزاروی رحمۃ اللہ علیہ نے مسٹر کرنٹا کا لفظ استعمال کیا جو کافی دیر تک چلتا رہا لیکن وقت نہ ملا۔پھر ہم نے دوسرا طریقہ اختیار کیا کہ اللہ تعالیٰ غریق رحمت فرمائے حاجی اللہ دتہ بٹ صاحب مرحوم،حاجی ملک اقبال صاحب مرحوم اور صوفی نذیر احمد صاحب مرحوم اور میر محمد شفیع صاحب اور ہم نے ایک وفد تیار کیا اس وقت چوہدری صلاح الدین صاحب(حامد ناصر چٹھہ کے والد)قومی اسمبلی کے ممبر تھے۔ہم وفد کی شکل میں ان کے پاس گئے اور ملاقات کی اور اُن کو کہا کہ دیکھو!ہماری براہِ راست ایوب خان تک رسائی نہیں ہوئی اور ایک غلط کام ہوا اور اس کی تردید کوئی نہ کرے تو ساری قوم گناہ گار ہوتی ہے۔اور آپ ہمارے حلقے کے قومی اسمبلی کے ممبر ہیں یہ ہماری بات وہاں تک پہنچا دیں تا کہ ہم بھی گناہ گار نہ ہوں اور ہماری پبلک بھی گناہ گار نہ ہو۔

کیوں کہ غلط چیز کی تردید فرض کفایہ ہے۔جس طرح تبلیغ فرض کفایہ ہے اگر کچھ لوگ تبلیغ کریں تو باقی لوگ گناہ سے بچ جائیں گے اور اگر کوئی بھی نہ کرے تو سارے گناہ گار ہوں گے۔اسی طرح اگر باطل چیز کی تردید نہ کی جائے تو سب گناہ گار ہوں گے۔

ہم نے ان کو سمجھایا کہ دیکھو!عائلی قوانین کی ایک شق یہ ہے کہ مطلقہ غیر حاملہ کی عدت نوے دن ہے اور قرآن پاک میں ایسی مطلقہ کا ذکر بھی ہے کہ جس کی عدت سرے سے ہے ہی نہیں۔مثلاً:ایک بچی کا نکاح ہوا اور رخصتی سے پہلے طلاق ہوگئی تو اس پر عدت نہیں ہے۔پھر ہم نے اس مسئلے سے بھی آگاہ کیا کہ فقہی مسئلہ ہے کہ بعض عورتوں کے حالات مختلف ہوتے ہیں کہ کسی کو حیض چھ ماہ بعد آتا ہے۔تو شرعی طور پر اس عورت کی عدت اٹھارہ ماہ بعد مکمل ہوگی جب کہ تمھارا قانون یہ کہتا ہے کہ اس کی عدت بھی نوے دن ہے۔پھر میں نے یہ سمجھایا کہ وہ عورتیں جن کو ہر ماہ حیض آتا ہے اور امکان کے درجے میں ان کی عدت نوے دن بن سکتی ہے یہ بھی ممکن نہیں کیوں کہ تین مہینے مسلسل تیس تیس دن کے ہوتے ہی نہیں۔لہٰذا یہ قانون قرآن اور فقہ کے بالکل خلاف ہے۔تو چودھری صلاح الدین مرحوم نے ہماری بات سمجھی سمجھ دار وکیل تھے۔ہماری گفتگو کو انھوں نے نوٹ کیا پھر معلوم نہیں کہ انھوں نے ہماری بات ایوب تک پہنچائی یا نہ پہنچائی۔یہ صاحب اقتدار لوگ جو من مانیاں کرتے ہیں خلاف شرع احکام جاری کرتے ہیں یہی تباہی کا سبب ہے۔

حدیث میں آتا ہے کہ ایک حد کے جاری کرنے سے اتنی برکت ہوتی ہے کہ چالیس دن وقفے وقفے سے بارش ہو ضرورت کے مطابق موسم میں تو اس بارش سے اتنی برکت نہیں ہوتی جتنی برکت ایک حد جاری کرنے سے ہوتی ہے۔اب ہم کس

طرف چل پڑے ہیں۔کوئی سود کو حلال کہہ رہا ہے، کوئی کچھ کہہ رہا ہے، کوئی کچھ کہہ رہا ہے۔

﴿ وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ ﴾ اور ان عورتوں کے لیے حلال نہیں ہے ﴿ أَنْ يَكْتُمْنَ ﴾ یہ کہ چھپائیں مَا اس چیز کو ﴿ خَلَقَ اللّٰهُ فِيْ أَرْحَامِهِنَّ ﴾ جو اللہ تعالیٰ نے پیدا فرمائی ہے ان کے رحموں میں۔یعنی اگر رحم میں بچہ ہے تو بتا دیں اور اگر حیض ہے تو وہ بتا دیں کیوں کہ اس مسئلے کا انحصار ان پر ہے ﴿ إِنْ كُنَّ يُؤْمِنَّ بِاللّٰهِ ﴾ اگر وہ اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتی ہیں ﴿ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ﴾ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتی ہیں۔اور اس کے لیے کوئی ڈھنڈورا پیٹنے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔گھر کے کسی فرد کو بتا دے کہ میں حاملہ ہوں یا حالتِ حیض میں ہوں تا کہ اس کی عدت کا تعین ہو سکے۔کیوں کہ عدت کے اندر نکاح کرنا حرام ہے۔اور اگر دورانِ عدت نکاح کیا گیا تو جو لوگ مجلسِ نکاح میں شریک ہوں گے اور انھیں معلوم بھی ہو کہ ابھی تک عدت ختم نہیں ہوتی تو ان سب شریک ہونے والوں کے نکاح خود بہ خود ٹوٹ جائیں گے۔اگر علم نہیں ہے اور دھوکے سے ایسا کرایا گیا ہے تو وہ مسئلہ جدا ہے۔اور اگر سب کو علم ہے کہ بچی کی عدت ابھی پوری نہیں ہوئی تو پھر نکاح پڑھانے والا بھی کافر اور مرتد اور اس میں جو شریک ہیں سب کافر اور مرتد ہو گئے، سب کے نکاح ٹوٹ گئے۔

﴿ وَبُعُوْلَتُهُنَّ ﴾۔ بُعُوْل بَعْلٌ کی جمع ہے اور بَعْلٌ کا معنیٰ ہے خاوند۔اور یہ عورتیں جن کو طلاق ملی ہے ان کے خاوند ﴿ أَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ ﴾ زیادہ حق دار ہیں ان کو لوٹانے کے ﴿ فِيْ ذٰلِكَ ﴾ عدت کے اندر۔اور اگر عدت کے دوران میں رجوع نہیں کیا اور تین حیض گزر گئے تو اب یہ رجوع نہیں کر سکتا اگرچہ ایک ہی طلاق کیوں نہ دی ہو۔اب وہ بائنہ ہو گئی ہے اور اب اس کو عورت کے روکنے کا بھی اختیار نہیں ہے۔ازسرِ نو نکاح کریں تو اکٹھے ہونے کی گنجائش ہے۔اور یہ مسئلہ بھی یاد رکھنا کہ یہ جو ایک یا دو طلاقیں دی ہیں اور رجوع کر لیا ہے۔یہ باقاعدہ حساب میں رہیں گی۔مثلاً: ایک طلاق دی ہے تو باقی اس کے پاس دو کا حق ہے، اور اگر دو طلاقیں دی ہیں تو اس کے پاس باقی صرف ایک طلاق کا حق ہے۔تو طلاقِ رجعی میں عدت کے دوران خاوند لوٹانے کے زیادہ حق دار ہیں مگر اس کے واسطے شرط ہے ﴿ إِنْ أَرَادُوْا إِصْلَاحًا ﴾ اگر یہ ارادہ کریں اصلاح کا کہ عورتوں کو واپس لوٹانے سے مقصود اصلاح ہو ان کو تنگ کرنا نہ ہو۔اگر تنگ کرنے کی نیت ہوگی تو رب تعالیٰ معاف نہیں کریں گے ﴿ وَلَهُنَّ ﴾ اور اُن عورتوں کے لیے بھی حق ہیں ﴿ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ﴾ ان حقوق کے مثل جو ان عورتوں کے اُوپر ہیں عمدگی کے ساتھ۔کچھ حق عورتوں کے ذمے ہیں کہ خاوند کا حق ہے کہ عورت اس کی اطاعت کرے اس کے حق کی حفاظت کرے، اپنی عزت و عصمت کو محفوظ رکھے، گھر کی حفاظت کرے، بچوں کی نگرانی کرے۔اور عورتوں کے حق خاوند کے ذمہ ہیں کہ وہ ان کو نان نفقہ مہیا کرے، رہائش کے لیے مکان دے، لباس دے اور اس کی بیماری اور تندرستی کا خرچہ برداشت کرے۔تو دستور کے مطابق عورتوں کا مردوں پر حق ہے اور مردوں کا عورتوں پر حق ہے۔

﴿ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ ﴾ اور درجہ میں مردوں کو عورتوں پر برتری حاصل ہے۔ایک درجے کی فضیلت حاصل ہے۔وہ اس طرح کہ مرد عورتوں پر نگران ہیں جیسا کہ سورۂ نساء میں بیان فرمایا کہ ﴿ اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ ﴾ [النسا: ۳۴] مرد

عورتوں کے محافظ ہیں۔اور یہ ایک فطری امر ہے جس سے انکار ممکن نہیں ہے۔اور پھر مردوں کی برتری کی دلیل بھی بیان فرمائی ﴿وَّ بِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ﴾ کہ مرد اپنی کمائی عورتوں پر خرچ کرتے ہیں، ان کے کفیل ہیں۔اور مشقت کے کام مرد کے سپرد کیے ہیں۔ عورت کا کام گھر کی ذمہ داریاں پوری کرنا ہے۔اسی طرح طلاق کا حق بھی اللہ تعالیٰ نے مرد کو دیا ہے۔فرمایا ﴿بِيَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ﴾ مرد کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ ہے۔تو نکاح کی گرہ جب مرد کے ہاتھ میں ہے تو اُس کو کھولنے کا اختیار بھی مرد کو حاصل ہے عورت کو حاصل نہیں ہے ﴿وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ﴾ اور اللہ تعالیٰ غالب ہے ﴿حَكِيْمٌ﴾ حکیم ہے۔جو اس نے حکمت پر مبنی احکام دیے ہیں وہ حق ہیں ان سے بھاگنا بے دینی ہے، اللہ تعالیٰ محفوظ فرمائے۔

﴿اَلطَّلَاقُ﴾ وہ طلاقیں جن کے بعد رجوع صحیح ہے ﴿مَرَّتٰنِ﴾ دو دفعہ ہیں ﴿فَاِمْسَاكٌ﴾ پس روکنا ہے بیوی کو ﴿بِمَعْرُوْفٍ﴾ اچھے طریقے سے ﴿اَوْ تَسْرِيْحٌ﴾ یا الگ کر دینا ہے ﴿بِاِحْسَانٍ﴾ عمدگی کے ساتھ ﴿وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ﴾ اور نہیں ہے حلال تمھارے لیے ﴿اَنْ تَاْخُذُوْا﴾ یہ کہ لو تم ﴿مِمَّآ﴾ وہ چیز ﴿اٰتَيْتُمُوْهُنَّ﴾ جو تم نے ان عورتوں کو دی ہے ﴿شَيْئًا﴾ کچھ بھی ﴿اِلَّآ اَنْ يَّخَافَآ﴾ مگر یہ کہ میاں بیوی دونوں خوف کھائیں ﴿اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ﴾ یہ کہ وہ دونوں اللہ تعالیٰ کی حدود کو قائم نہیں رکھ سکیں گے ﴿فَاِنْ خِفْتُمْ﴾ پس اگر تم خوف کرو (وارثو اور رشتہ دارو!) ﴿اَلَّا يُقِيْمَا﴾ یہ کہ وہ دونوں اللہ تعالیٰ کی حدود کو قائم نہیں رکھ سکیں گے ﴿حُدُوْدَ اللّٰهِ﴾ اللہ تعالیٰ کی حدود کو ﴿فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا﴾ پس کوئی گناہ نہیں ہے ان دونوں پر ﴿فِيْمَا افْتَدَتْ بِهٖ﴾ اس چیز کے بارے میں جو عورت نے فدیہ کے طور پر دی ﴿تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ﴾ یہ اللہ تعالیٰ کی حدیں ہیں ﴿فَلَا تَعْتَدُوْهَا﴾ پس تم حدود سے تجاوز نہ کرو ﴿وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ﴾ اور جس نے تجاوز کیا اللہ تعالیٰ کی حدود سے ﴿فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ﴾ پس وہی لوگ ظالم ہیں ﴿فَاِنْ طَلَّقَهَا﴾ پس اگر اس نے تیسری طلاق بھی دے دی ﴿فَلَا تَحِلُّ لَهٗ﴾ پس نہیں ہے حلال اس کے لیے ﴿مِنْۢ بَعْدُ﴾ اس کے بعد ﴿حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ﴾ یہاں تک کہ وہ عورت نکاح کرے کسی اور مرد کے ساتھ ﴿فَاِنْ طَلَّقَهَا﴾ پس اگر اس اور مرد نے بھی اسے طلاق دے دی ﴿فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ﴾ پس کوئی گناہ نہیں ہے ان پہلے دونوں پر ﴿اَنْ يَّتَرَاجَعَآ﴾ یہ کہ (نئے نکاح کے ساتھ) رجوع کریں ﴿اِنْ ظَنَّآ﴾ اگر وہ دونوں یقین کرتے ہیں کہ ﴿اَنْ يُّقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ﴾ یہ قائم رکھیں گے اللہ تعالیٰ کی حدود کو ﴿وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ﴾ اور یہ اللہ تعالیٰ کی حدیں ہیں ﴿يُبَيِّنُهَا﴾ بیان کرتا ہے ان کو ﴿لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ﴾ اس قوم کے لیے جو جانتی ہے ﴿وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ﴾ اور جس وقت تم طلاق دے دو عورتوں کو ﴿فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ﴾ پس وہ قریب پہنچیں اپنی عدت کو ﴿فَاَمْسِكُوْهُنَّ﴾ پس تم

ان کو روکو ﴿بِمَعْرُوْفٍ﴾ عمدگی کے ساتھ ﴿اَوْ سَرِّحُوْهُنَّ﴾ یا الگ کر دو ان کو ﴿بِمَعْرُوْفٍ﴾ عمدہ طریقے سے ﴿وَلَا تُمْسِكُوْهُنَّ﴾ اور نہ روکو تم ان کو ﴿ضِرَارًا﴾ تکلیف دینے کے لیے ﴿لِّتَعْتَدُوْا﴾ تاکہ تم تجاوز کرو ﴿وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ﴾ اور جس نے یہ کارروائی کی ﴿فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ﴾ پس تحقیق اس نے اپنی جان پر ظلم کیا ﴿وَلَا تَتَّخِذُوْٓا﴾ اور نہ بناؤ تم ﴿اٰيٰتِ اللّٰهِ﴾ اللہ تعالیٰ کی آیات کو ﴿هُزُوًا﴾ ہنسی (اور کھیل) ﴿وَّاذْكُرُوْا﴾ اور یاد کرو تم ﴿نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ﴾ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو جو تم پر ہوئیں ﴿وَمَآ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ﴾ اور جو اللہ تعالیٰ نے نازل فرمائی تم پر ﴿مِّنَ الْكِتٰبِ﴾ کتاب ﴿وَالْحِكْمَةِ﴾ اور سنت اور حدیث ﴿يَعِظُكُمْ بِهٖ﴾ اللہ تعالیٰ تمھیں اس کی نصیحت کرتا ہے ﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ﴾ اور اللہ تعالیٰ سے ڈرو ﴿وَاعْلَمُوْٓا﴾ اور تم جان لو ﴿اَنَّ اللّٰهَ﴾ بے شک اللہ تعالیٰ ﴿بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ﴾ ہر چیز کو جانتا ہے۔

طلاقوں کا مسئلہ چلا آ رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ﴿اَلطَّلَاقُ﴾ (تمام مفسرین کرام رحمہم اللہ فرماتے ہیں) کہ طلاقِ رجعی ﴿مَرَّتٰنِ﴾ دو دفعہ ہے۔ اگر کسی شخص نے اپنی بیوی کو صریح الفاظ میں یہ کہا کہ میں نے تجھے طلاق دے دی ہے۔ یہ ایک طلاق ہوگئی ہے اس کے بعد وہ رجوع کر سکتا ہے بغیر نکاح کے۔ عدت کے اندر میاں بیوی آپس میں مل جائیں تو اس طلاق کا اثر زائل ہو جاتا ہے۔ یا دو مرتبہ کہا کہ میں نے تجھے طلاق دے دی، میں نے تجھے طلاق دے دی۔ عدت ختم ہونے سے پہلے میاں بیوی آپس میں مل گئے تو ان طلاقوں کا اثر ختم ہوگیا۔ لیکن بات اچھی طرح یاد رکھنا کہ آئندہ اس کو صرف ایک طلاق کا حق ہے، گنتی میں یہ دو طلاقیں محفوظ رہیں گی۔ اور اگر عدت ختم ہوگئی تو عدت ختم ہونے کے بعد خود بہ خود علیحدگی ہو جائے گی۔ اب اگر یہ دوبارہ آپس میں نکاح کرنا چاہیں تو نکاح کی اجازت ہے۔ اور اگر وہ عورت کسی اور کے ساتھ نکاح کرنا چاہے تو کر سکتی ہے، آزاد ہے۔

تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ﴿اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ﴾ رجعی طلاقیں دو ہیں۔ ان دو کے بعد حق ہے ﴿فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ﴾ پس روکنا ہے عمدگی کے ساتھ کہ تم عورت کو روکو یعنی نکاح میں رکھو عمدگی سے ﴿اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ﴾ یا چھوڑ دو الگ کر دو عمدگی کے ساتھ۔ یعنی اگر تم نہیں رکھنا چاہتے تو اس کو عمدگی کے ساتھ الگ کر دو۔ درمیان میں خلع کا مسئلہ ہے اس کو میں بعد میں بیان کروں گا۔ اس کے بعد والی آیت سمجھ لو۔

فرمایا ﴿فَاِنْ طَلَّقَهَا﴾ پھر اگر اس نے طلاق دے دی اس عورت کو (تیسری) یعنی اگر خاوند نے دو طلاقوں کے بعد تیسری طلاق بھی دے دی ﴿فَلَا تَحِلُّ لَهٗ﴾ پس یہ عورت اس کے لیے حلال نہیں ہے ﴿مِنْۢ بَعْدُ﴾ ان تین طلاقوں کے بعد ﴿حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ﴾ یہاں تک کہ وہ عورت نکاح کرے اُس مرد کے علاوہ کسی اور مرد سے۔ تو حاصل یہ نکلا کہ ایک طلاق کے بعد، دو طلاقوں کے بعد دورانِ عدت رجوع کا حق تھا۔ اور عدت کے بعد نکاح کا حق۔ جب تیسری طلاق دے دی تو اب یہ سارے حق ختم ہو گئے۔ نہ تو اس کو رجوع کا حق ہے اور نہ ہی نکاح کر کے رکھ سکتا ہے۔

مسئلہ طلاقِ ثلاثہ

اور یہ بات اچھی طرح سمجھنا کہ قرآن بھی یہی حکم دیتا ہے اور احادیث بھی کثرت کے ساتھ ہیں جن سے یہی حکم واضح ہوتا ہے۔ اور چاروں ائمہ (یعنی امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ) بھی اس بات پر متفق ہیں اور سو فیصد محدثین بھی متفق ہیں یعنی امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ سے لے کر حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ تک تمام محدثین اس بات پر متفق ہیں کہ تین طلاقیں تین ہی ہیں۔ (اور وہ حضرات جو تقلید کے قائل نہیں ہیں غیر مقلد جو اپنے آپ کو اہل حدیث کہلواتے ہیں ان میں دو گروہ ہیں۔ ایک حافظ ابن حزم ظاہری رحمۃ اللہ علیہ اور روپڑی پارٹی ہے۔ یہ بھی تین کو تین ہی کہتے ہیں۔ اور دوسرا گروہ ثنائی پارٹی ہے۔ جن کا ان علاقوں میں زیادہ اثر و رسوخ ہے۔ وہ تین کو ایک کہتے ہیں۔)

اور امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے باب قائم کیا ہے: "باب مَنْ اَجَازَ الطَّلَاقَ الثَّلَاثَ" جو لوگ کہتے ہیں کہ تین طلاقیں اکٹھی بھی ہو جاتی ہیں۔ پھر آگے احادیث پیش کی ہیں۔ تو یہ حلال اور حرام کا مسئلہ ہے ضد کی بات نہیں ہے۔ اس واسطے اس کو اچھی طرح سمجھ لو۔ وہ لوگ جو تین کو ایک شمار کرتے ہیں ضد پر اڑے ہوئے ہیں۔ ضد کا دنیا میں کوئی علاج نہیں ہے۔ ہاں! اگر وہ ضد اور تعصب کو چھوڑ دیں تو بات کا سمجھنا کوئی مشکل نہیں ہے۔

فاتحہ خلف الامام کا مسئلہ

مثلاً: ایک حدیث آتی ہے ((لَا صَلٰوةَ لِمَنْ لَّمْ يَقْرَءْ بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ)) کہ جس شخص نے فاتحہ نہ پڑھی اس کی نماز نہیں ہے۔ یہ حدیث صحیح ہے لیکن دیکھنا یہ ہے کہ اس حدیث کا مصداق کون ہے؟ کس کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا؟ تو حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ یہ حدیث ((لِمَنْ يُّصَلِّيْ وَحْدَهٗ)) اس شخص کے لیے ہے جو اکیلا نماز پڑھتا ہے مقتدی اس کا مصداق نہیں ہے۔ یعنی یہ حکم مقتدی کے لیے نہیں ہے۔ اسی طرح حضرت جابر رضی اللہ عنہ (صحابی ہیں) فرماتے ہیں کہ یہ روایت اس شخص کے لیے ہے جو اکیلا نماز پڑھے۔ اور یہ روایت ترمذی شریف میں ہے اور اس روایت کے متعلق امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حدیث صحیح ہے مگر اس کا مصداق وہ شخص ہے جو اکیلا نماز پڑھتا ہے۔

اسی طرح امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے اُستاد اور محدثین کے استاد حضرت سفیان ابن عیینہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ حکم اس شخص کے لیے ہے جو اکیلا نماز پڑھتا ہے۔ یہ بات ابوداؤد شریف میں موجود ہے۔ اور مقتدی کا کیا فریضہ ہے؟ اس کا حکم مسلم شریف وغیرہ کی روایت میں موجود ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ((اِذَا قَرَءَ فَاَنْصِتُوْا)) کہ امام جب قرأت شروع کرے تو (تمھارا فریضہ ہے) تم نے خاموش رہنا ہے (قراءت تمھیں سنائی دے یا نہ دے) لیکن ضدی نہیں مانتے۔

اسی طرح طلاق کے بارے میں بھی ایک روایت مسلم شریف میں ہے اور روایت صحیح ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے عہد میں اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ایام خلافت کے ابتدائی دو سال میں

تین طلاقیں ایک ہی ہوتی تھیں۔ (مسلم ص ۴۷۷، ج ۱) لیکن اس حدیث کا مصداق کون ہے؟ چنانچہ امام نسائی نے نسائی شریف میں باب قائم کیا ہے طَلَاقُ الثَّلٰثِ الْمُتَفَرِّقَةِ قَبْلَ الدُّخُوْلِ بِالزَّوْجَةِ (صفحہ ۸۳، جلد ۲)

تین طلاقیں علیحدہ علیحدہ غیر مدخولہ بہا کو یعنی ایسی عورت کو جس کے ساتھ نکاح ہوا ہے لیکن میاں بیوی نے ہم بستری نہیں کی اور خاوند نے اسے طلاق دے دی اور کہا اَنْتِ طَالِقٌ، اَنْتِ طَالِقٌ، اَنْتِ طَالِقٌ تین طلاقیں دے دیں تو طلاق پہلی ہی ہوئی ہے دوسری کا محل ہی نہیں رہا۔

تو امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ نے باب قائم کیا ہے کہ یہ حدیث غیر مدخولہ بہا کے واسطے ہے۔ اسی طرح ابو داؤد شریف میں روایت ہے کہ تین طلاقیں ایک اس عورت کے بارے میں ہیں کہ جس کے ساتھ نکاح ہوا ہے اور خاوند نے ہم بستری نہیں کی اور یکے بعد دیگرے تین طلاقیں دے دیں تو پہلی ہوگئی، دوسری، تیسری کا محل ہی نہیں ہے۔ تو اس روایت کو تمام مطلقات پر فٹ کرانا تو صرف ضد ہے۔ تو دین کے سلسلے میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔ اس مسئلے پر میرا ایک مستقل رسالہ ہے "عُمْدَةُ الْاَثَاثِ فِيْ حُكْمِ الطَّلَقَاتِ الثَّلَاثِ" جس میں قرآن پاک، احادیث، فقہائے کرام رحمہم اللہ کے بڑے دلائل میں نے پیش کیے ہیں اور بڑی بحث کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ تین طلاقیں تین ہی ہوتی ہیں۔ اور الحمد للہ! اسی آیت کے تحت مفتیٔ اعظم پاکستان مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر معارف القرآن میں میرا نام لے کر میری کتاب کا حوالہ دیا ہے کہ اگر تمھیں اس مسئلہ میں علمی طور پر زیادہ ضرورت ہے تو اس کی کتاب دیکھو۔

تو حدیث صحیح ہے مگر اس کا مصداق وہ نہیں ہے جو غیر مقلد حضرات سمجھتے پھرتے ہیں۔ جس طرح قرآن پاک میں مومنوں سے خطاب ہے ﴿اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ﴾ "اے وہ لوگو! جو ایمان لائے ہو نماز قائم کرو اور زکوۃ ادا کرو۔" تو زکوۃ ہر آدمی تو دینے والا نہیں ہے۔ زکوۃ تو وہ دے گا جو صاحبِ نصاب ہوگا۔ تو اگر کوئی مسئلے کو سمجھنا چاہے تو اس کے لیے کوئی دقت نہیں ہے۔ البتہ ضد اور تعصب کا دنیا میں کوئی علاج نہیں ہے۔

تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ﴿فَاِنْ طَلَّقَهَا﴾ پس اگر اس نے طلاق دے دی اُس عورت کو تیسری بھی تو ﴿فَلَا تَحِلُّ لَهٗ﴾ پس وہ عورت اب اس کے لیے حلال نہیں ہے ﴿مِنْۢ بَعْدُ﴾ تیسری طلاق کے بعد۔ (سنت اور مستحب طریقہ تو یہ ہے کہ طلاق طہر میں دے کہ ایک طہر میں ایک طلاق اور دوسرے طہر میں دوسری طلاق اور تیسرے طہر میں تیسری طلاق۔ لیکن اگر کسی نے تین طلاقیں ایک مجلس میں دے دیں یا ایک کلمے کے ساتھ دے دیں تو بھی تین طلاقیں واقع ہوگئیں۔ ایک مجلس کا مطلب یہ ہے کہ ایک ہی جگہ بیٹھے ہوئے کہا کہ تجھے طلاق ہے، تجھے طلاق ہے، تجھے طلاق ہے۔ اور ایک کلمے کا مطلب یہ بھی ہے کہ کہے تجھے تین طلاقیں ہیں۔ تو دونوں صورتوں میں تین طلاقیں واقع ہو جاتی ہیں۔)

﴿حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ﴾ یہاں تک کہ وہ عورت کسی اور مرد کے ساتھ نکاح کرے ﴿فَاِنْ طَلَّقَهَا﴾ پس اگر اس دوسرے خاوند نے بھی طلاق دے دی ﴿فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ﴾ تو کوئی گناہ نہیں ہے ان دونوں پر یعنی اس عورت کا جو پہلا خاوند تھا

اس پر اور اس عورت پر کوئی گناہ نہیں ہے ﴿اَنْ یَّتَرَاجَعَآ﴾ یہ کہ یہ دونوں آپس میں رجوع کرلیں یعنی عدت گزرنے کے بعد نئے سرے سے نکاح کرلیں مگر شرط ہے کہ ﴿اِنْ ظَنَّآ اَنْ یُّقِیْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ﴾ اگر وہ دونوں یقین کریں کہ اللہ تعالیٰ کی حدوں کو قائم رکھ سکیں گے۔ چونکہ پہلے بھی اختلاف ہوا تھا اور نوبت طلاق تک پہنچ گئی تھی۔ اب اگر وہ نکاح کرنا چاہتے ہیں تو انھیں اس بات کو ملحوظ رکھنا پڑے گا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی حدود کو قائم رکھ سکیں گے۔

خلع کے مسائل

درمیان میں خلع کا مسئلہ بیان ہوا ہے جو اُوپر چھوڑ آئے ہیں۔ وہ کیا ہے؟ فرمایا ﴿وَلَا یَحِلُّ لَكُمْ﴾ اور (اے مردو!) تمھارے واسطے حلال نہیں ہے ﴿اَنْ تَاْخُذُوْا﴾ یہ کہ لوتم ﴿مِمَّآ﴾ اس چیز سے ﴿اٰتَیْتُمُوْهُنَّ﴾ جو تم نے ان عورتوں کو دیا ہے ﴿شَیْئًا﴾ کچھ بھی۔ یعنی مہر دیا ہے یا ہدیے کے طور پر کوئی چیز دی ہے تو طلاق کے بعد تم ان سے کچھ نہیں لے سکتے ﴿اِلَّآ اَنْ یَّخَافَآ﴾ مگر یہ کہ میاں بیوی خوف کریں ﴿اَلَّا یُقِیْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ﴾ یہ کہ وہ اللہ تعالیٰ کی حدود کو قائم نہیں رکھ سکیں گے۔ آپس میں ان کا مزاج نہیں ملتا یا کسی اور وجہ سے ان کا نباہ نہیں ہوسکتا ﴿فَاِنْ خِفْتُمْ﴾ پس اگر اے دونوں کے وارثو (اور رشتہ دارو!) تمھیں خوف ہو ﴿اَلَّا یُقِیْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ﴾ یہ کہ وہ اللہ تعالیٰ کی حدود کو قائم نہیں رکھ سکیں گے ﴿فَلَا جُنَاحَ عَلَیْهِمَا﴾ پس نہیں ہے گناہ ان دونوں پر ﴿فِیْمَا افْتَدَتْ بِهٖ﴾ اس چیز میں کہ عورت فدیہ (رقم) دے کر مرد سے طلاق لے لے۔

اب مسئلہ سمجھنا۔ اگر بیوی خاوند کا آپس میں نباہ نہیں ہوسکتا۔ مثلاً: مزاج نہیں ملتا کیوں کہ مزاج کا بھی بڑا اثر ہوتا ہے۔ اسی واسطے شریعت کفو کے اندر نکاح کرنے کو ترجیح دیتی ہے اور کفو کا معنیٰ ہے برادری۔ اور برادری میں مزاج اور ذہن ملتے جلتے ہوں گے تو گڑبڑ نہیں ہوگی اور غیر کفو میں مزاج نہ ملنے کی وجہ سے مشکل پیدا ہوگی۔ باقی نکاح غیر کفو میں بھی جائز ہے حرام نہیں ہے۔ تو اگر میاں بیوی کا مزاج نہیں ملتا یا کوئی اور ایسی وجہ ہے کہ نباہ نہیں ہوسکتا تو شریعت نے خلع کی اجازت دی ہے۔ البتہ اس میں تفصیل یہ ہے کہ اگر خرابی بیوی کی طرف سے ہے کہ وہ رہنا نہیں چاہتی اور خاوند رکھنا چاہتا ہے تو ایسے موقع پر خاوند عورت کو کہہ دے تو مجھے پیسے دے دے تو میں تجھے طلاق دے دیتا ہوں کیوں میرا شادی پر خرچہ ہوا ہے اور اگر بیوی رہنا چاہتی ہے اور شرارت خاوند کی طرف سے ہو تو ایسی صورت میں خلع کا مال حرام تو نہیں ہے مگر مکروہ ہے کہ شرارت بھی اسی کی ہے اور رقم بھی وہی ہتھیا لے پھر اس میں بھی اختلاف ہے کہ مرد نے جتنا مہر دیا ہے اتنے پر ہی خلع ہو یا حق مہر سے زیادہ رقم لے سکتا ہے۔

امام شافعی فرماتے ہیں کہ جتنا مہر دیا تھا اس سے زیادہ پر بھی خلع ہوسکتا ہے۔ امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں کہ مہر سے زیادہ رقم نہ لے کیوں کہ حضرت ثابت بن قیس صحابی ہیں یہ بڑے ذہین اور مقرر تھے، قد چھوٹا تھا اور رنگ سیاہ تھا۔ ان کی بیوی بڑی خوب صورت تھی۔ اس نے حضور ﷺ کو کہا کہ حضرت! میرا خاوند ویسے تو بڑا اچھا ہے خرچہ بھی دیتا ہے، اخلاق بھی اچھا ہے مگر میں جب دیکھتی ہوں تو مجھے کراہت آتی ہے جس سے میرے ایمان پر زد پڑے گی لہٰذا مجھے طلاق دلوا دیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا

کہ وہ باغ جو اس نے تجھے مہر میں دیا تھا واپس کر دے گی۔ تو حضرت ثابت کی بیوی نے کہا کہ حضرت! میں وہ باغ بھی دے دوں گی اور کچھ مزید بھی دے دوں گی۔ تو مسند احمد کی روایت میں ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((اَمَّا الزِّيَادَةُ فَلَا)) بہرحال زیادہ دینا درست نہیں ہے۔ اس حدیث کے پیشِ نظر امام ابوحنیفہ کا موقف یہ ہے کہ جو مہر دیا ہے اس سے زیادہ نہ لے۔

فرمایا ﴿تِلْكَ حُدُوْدُ اللهِ﴾ یہ اللہ تعالیٰ کی حدیں ہیں ﴿فَلَا تَعْتَدُوْهَا﴾ پس تم ان سے آگے نہ بڑھو ﴿وَ مَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللهِ﴾ اور جس نے اللہ تعالیٰ کی حدوں سے تجاوز کیا ﴿فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ﴾ پس یہی لوگ ظالم ہیں۔ یہ پہلے میں نے عرض کر دیا ہے۔ دو کے بعد اگر اس نے تیسری طلاق دے دی تو یہ بیوی اس خاوند کے لیے حلال نہیں ہے۔ یہاں تک کہ کسی اور مرد سے نکاح کرے اور نکاح کے بعد ہم بستری بھی شرط ہے۔ اگر صرف نکاح کر کے بغیر ہم بستری کے طلاق دے دی تو پہلے خاوند کے لیے حلال نہ ہوگی۔ اس پر بخاری اور مسلم کی روایات شاہد ہیں۔

﴿فَاِنْ طَلَّقَهَا﴾ پس اگر دوسرے خاوند نے طلاق دے دی ﴿فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ﴾ پس کوئی حرج نہیں ان پہلوں پر ﴿اَنْ يَّتَرَاجَعَآ﴾ یہ کہ نکاح کے لیے آپس میں رجوع کریں لیکن شرط یہ ہے کہ ﴿اِنْ ظَنَّآ اَنْ يُّقِيْمَا حُدُوْدَ اللهِ﴾ اگر ان کو یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حدوں کو قائم کریں گے ﴿وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللهِ﴾ اور یہ اللہ تعالیٰ کی حدیں ہیں ﴿يُبَيِّنُهَا لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ﴾ ان کو بیان کرتا ہے اس قوم کے لیے جو علم رکھتی ہے ﴿وَ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ﴾ اور جب تم طلاق دے دو عورتوں کو ﴿فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ﴾ پس قریب پہنچیں وہ اپنی عدت کو ﴿فَاَمْسِكُوْهُنَّ﴾ پس تم ان کو روکو۔ یعنی عدت ابھی ختم نہیں ہوئی تو دورانِ عدت تم انھیں روک بھی سکتے ہو ﴿بِمَعْرُوْفٍ﴾ عمدہ طریقے سے ﴿اَوْ سَرِّحُوْهُنَّ﴾ یا چھوڑ دو ان کو ﴿بِمَعْرُوْفٍ﴾ عمدہ طریقے سے ﴿وَلَا تُمْسِكُوْهُنَّ﴾ اور نہ روکو تم ان کو ﴿ضِرَارًا﴾ تکلیف دینے کے لیے یعنی ان کو اس واسطے نہ روکو کہ میں ان کو ماروں گا، پیٹوں گا اور تنگ کروں گا ﴿لِّتَعْتَدُوْا﴾ تاکہ تم تجاوز کرو اس واسطے نہ روکو ﴿وَ مَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ﴾ اور جس نے کی یہ کارروائی ﴿فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ﴾ پس تحقیق اس نے اپنی جان پر ظلم کیا۔

﴿وَلَا تَتَّخِذُوْٓا اٰيٰتِ اللهِ هُزُوًا﴾ اور نہ بناؤ اللہ تعالیٰ کی آیات کو ہنسی اور کھیل۔ جو حکم رب تعالیٰ نے دیا ہے وہ اٹل ہے ﴿وَ اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللهِ عَلَيْكُمْ﴾ اور یاد کرو اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو جو اُس نے تم پر کی ہیں، ظاہری نعمتیں بھی ہیں اور باطنی نعمتیں بھی، روحانی نعمتیں بھی اور جسمانی نعمتیں بھی ہیں۔ ان کو یاد کرو یعنی ان کا شکر ادا کرو۔ اور یہ نعمت بھی ہے ﴿وَ مَآ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ﴾ اور وہ جو اللہ تعالیٰ نے نازل فرمائی تم پر کتاب یعنی قرآن کریم۔ اور قرآن کریم کی قدر وہی کرے گا جو اس کو سمجھے گا اور جس نے قسم اُٹھانے کے لیے رکھا ہوا ہے وہ کیا سمجھے گا؟ یاد رکھو! قرآن پاک بہت بڑی دولت ہے۔ ﴿وَالْحِكْمَةِ﴾ اور حکمت نازل فرمائی۔ تو حکمت سے مراد ہے سنت اور حدیث۔

قرآن پاک کی تشریح حدیث ہے۔ حدیث کے بغیر تشریح کرنے پر بھی ہمارا ایمان نہیں ہے ﴿يَعِظُكُمْ بِهٖ﴾ اللہ تعالیٰ تمھیں اس کی نصیحت کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو یاد رکھو۔ قرآن کریم کو پڑھو، حدیث شریف پڑھو ﴿وَ اتَّقُوا اللهَ﴾ اور

اللہ تعالیٰ سے ڈرو ﴿وَاعْلَمُوْۤا﴾ اور تم جان لو ﴿اَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ﴾ اللہ تعالیٰ ہر چیز کو بخوبی جانتا ہے۔ تمھارا ظاہر، باطن، نیت، ارادہ سب اس کے علم میں ہے۔

﴿وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ﴾ اور جب تم طلاق دو عورتوں کو ﴿فَبَلَغْنَ﴾ پس وہ پہنچ جائیں ﴿اَجَلَهُنَّ﴾ اپنی عدت کو ﴿فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ﴾ پس نہ روکو تم ان کو ﴿اَنْ یَّنْكِحْنَ﴾ یہ کہ وہ نکاح کریں ﴿اَزْوَاجَهُنَّ﴾ اپنے خاوندوں سے ﴿اِذَا تَرَاضَوْا بَیْنَهُمْ﴾ جس وقت راضی ہو جائیں آپس میں ﴿بِالْمَعْرُوْفِ﴾ عمدگی کے ساتھ ﴿ذٰلِكَ﴾ اس چیز کی ﴿یُوْعَظُ بِهٖ﴾ نصیحت کی جاتی ہے ﴿مَنْ﴾ اس کو ﴿كَانَ مِنْكُمْ﴾ جو ہے تم میں سے ﴿یُؤْمِنُ بِاللّٰهِ﴾ ایمان لاتا ہے اللہ پر ﴿وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ﴾ اور آخرت کے دن پر ﴿ذٰلِكُمْ﴾ یہی چیز ﴿اَزْكٰى لَكُمْ﴾ بڑی پاکیزہ ہے (قلبی اعتبار سے) ﴿وَاَطْهَرُ﴾ اور زیادہ پاکیزہ ہے (بدن کے اعتبار سے) ﴿وَاللّٰهُ یَعْلَمُ﴾ اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے ﴿وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ اور تم نہیں جانتے ﴿وَالْوَالِدٰتُ﴾ اور مائیں ﴿یُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ﴾ دودھ پلائیں اپنی اولاد کو ﴿حَوْلَیْنِ كَامِلَیْنِ﴾ دو سال مکمل ﴿لِمَنْ اَرَادَ﴾ یہ اس کے لیے ہے جو ارادہ کرتا ہے ﴿اَنْ یُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ﴾ یہ کہ مکمل کرلے دودھ پلانے کی مدت کو ﴿وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ﴾ اور جس کی طرف بچے کی نسبت کی جاتی ہے (یعنی باپ پر) ﴿رِزْقُهُنَّ﴾ ان عورتوں کا رزق ہے ﴿وَكِسْوَتُهُنَّ﴾ اور ان کا لباس بھی ہے ﴿بِالْمَعْرُوْفِ﴾ اچھے طریقے کے ساتھ ﴿لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ﴾ نہیں تکلیف دی جائے گی کسی نفس کو ﴿اِلَّا وُسْعَهَا﴾ مگر اس کی طاقت کے مطابق ﴿لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌۢ بِوَلَدِهَا﴾ نہ نقصان پہنچایا جائے ماں کو اس کے بچے کی وجہ سے ﴿وَلَا مَوْلُوْدٌ لَّهٗ﴾ اور نہ باپ کو ﴿بِوَلَدِهٖ﴾ اس کے بچے کی وجہ سے ﴿وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ﴾ اور وارث پر بھی اتنا ہی خرچہ آئے گا ﴿فَاِنْ اَرَادَا﴾ پس اگر وہ دونوں ارادہ کرلیں ﴿فِصَالًا﴾ دودھ چھڑانے کا ﴿عَنْ تَرَاضٍ مِّنْهُمَا﴾ آپس کی مرضی سے ﴿وَتَشَاوُرٍ﴾ اور باہمی مشورہ سے ﴿فَلَا جُنَاحَ عَلَیْهِمَا﴾ پس کوئی حرج نہیں ہے ان دونوں پر ﴿وَاِنْ اَرَدْتُّمْ﴾ اور اگر تم ارادہ کرو ﴿اَنْ تَسْتَرْضِعُوْۤا اَوْلَادَكُمْ﴾ یہ کہ کسی اور سے اپنی اولاد کو دودھ پلواؤ ﴿فَلَا جُنَاحَ عَلَیْكُمْ﴾ پس کوئی گناہ نہیں ہے تم پر ﴿اِذَا سَلَّمْتُمْ﴾ جب دے دو تم ﴿مَّاۤ﴾ وہ چیز ﴿اٰتَیْتُمْ﴾ جو تم نے مقرر کی ہے ﴿بِالْمَعْرُوْفِ﴾ اچھے طریقے کے ساتھ ﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ﴾ اور اللہ تعالیٰ سے ڈرو ﴿وَاعْلَمُوْۤا﴾ اور تم جان لو ﴿اَنَّ اللّٰهَ﴾ بے شک اللہ تعالیٰ ﴿بِمَا تَعْمَلُوْنَ﴾ جو تم عمل کرتے ﴿هو بَصِیْرٌ﴾ دیکھ رہا ہے۔

حتی الوسع طلاق سے گریز کرنا چاہیے!

اس سے پہلے بھی طلاق اور عدت کا ذکر تھا۔ اسلام کی یہ خوبی ہے کہ انسانوں کو جو بھی ضرورتیں پیش آتی ہیں ان سب کو حل کیا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ کسی مقام پر اسلام کو ماننے والا پریشان ہو۔

انسانی زندگی میں نکاح اور طلاق بھی اہم مسائل ہیں۔ چوں کہ اللہ تعالیٰ نے نسل انسانی کو برقرار رکھنا ہے اس لیے مرد پیدا فرمائے، عورتیں پیدا فرمائیں۔ پھر جائز طریقے سے خواہشات کی تکمیل کا راستہ بھی بتلایا۔ ان کو حسن سلوک کا سبق دیا اور گھر کے معاملات کو درست رکھنے کا حکم دیا لیکن اگر مجبوری سے طلاق کی نوبت آئے تو طلاق کی بھی اجازت ہے۔

حدیث شریف میں آتا ہے: ((اِنَّ اَبْغَضَ الْمُبَاحَاتِ عِنْدَ اللّٰہِ الطَّلَاقُ)) "بے شک جائز چیزوں میں سے بُری چیز اللہ تعالیٰ کے ہاں طلاق ہے۔" یعنی ہے جائز مگر بہت بُری ہے۔ حتی الوسع طلاق کا نام نہیں لینا چاہیے۔ اور حدیث پہلے بیان ہو چکی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ جو عورت بغیر اشد مجبوری کے خاوند سے طلاق مانگتی ہے اس پر جنت حرام ہے۔ صرف مطالبے کی بات ہے یہ نہیں کہ ڈنڈے کے زور سے طلاق لے، بلکہ مطالبہ بھی حرام ہے۔ تو یہاں ایک واقعہ پیش آیا۔

حضرت معقل ابن یسار رضی اللہ عنہ ایک صحابی تھے۔ ان کے والدین فوت ہو چکے تھے۔ ان کی ہمشیرہ تھی۔ بعض تفسیروں میں اس کا نام جُمیلہ اور بعض میں جَمیلہ آیا ہے رضی اللہ عنہا۔ ابوالبدّاح رضی اللہ عنہ ایک صحابی تھے ان کے ساتھ اس کا نکاح ہوا۔ نکاح کے بعد اکٹھے زندگی گزارتے رہے ابھی اولاد نہیں ہوئی تھی اور گھریلو معاملات میں ہوتا ہے کبھی بگاڑ خاوند کی طرف سے ہوتا ہے کبھی عورت کی طرف سے اور کبھی دونوں کی طرف سے۔ دنیا میں کوئی ایسا گھر نہیں بتایا جا سکتا جس میں کچھ نہ کچھ بگاڑ نہ ہو۔ تو حضرت ابوالبدّاح رضی اللہ عنہ نے طیش اور غصے میں آ کر بیوی کو طلاق دے دی مگر طلاق رجعی تھی۔ (تفصیل پہلے بیان ہو چکی ہے کہ اگر ایک دفعہ خاوند بیوی کو کہے میں نے تجھے طلاق دے دی ہے یا دو مرتبہ کہے میں نے تجھے طلاق دے دی ہے تو ان دونوں صورتوں میں خاوند کو حق حاصل ہے کہ دورانِ عدت رجوع کر لے۔ اس سے طلاق کا اثر زائل ہو جاتا ہے اور اگر عدت ختم ہو گئی تو پھر نکاح ہوگا یعنی آپس میں پھر نکاح کر سکتے ہیں۔ اور اگر تین طلاقیں ہو جائیں تو پھر کوئی گنجائش نہیں ہے۔)

تو حضرت ابوالبدّاح رضی اللہ عنہ کی طلاق رجعی تھی اور عدت گزر گئی۔ عدت گزرنے کے بعد اور لوگوں نے بھی نکاح کے پیغام بھیجے اور پہلے خاوند نے بھی نکاح کا پیغام بھیجا کہ مجھ سے غلطی ہو گئی تھی میں دوبارہ نکاح کرنا چاہتا ہوں اور بیوی دلی طور پر راضی تھی پہلے خاوند کے پاس جانے کے لیے۔ لیکن ان کے بھائی معقل بن یسار رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں پہلے خاوند کے ساتھ نکاح نہیں کرنے دوں گا۔ اس لیے کہ اس نے طلاق کیوں دی؟ پھر چلو طلاق دے دی مگر عدت کے دوران میں اس نے نام ہی نہیں لیا۔ جب عدت ختم ہو گئی اور دوسرے لوگوں کے پیغامِ نکاح آنے لگے تو اب اس نے بھی نکاح کا پیغام بھیج دیا ہے۔ لہٰذا میں اس کے ساتھ نکاح نہیں ہونے دوں گا۔ کچھ برادری اور محلے کے لوگ بھی درمیان میں آئے کہ پہلے خاوند کے ساتھ نکاح کرنے دو۔ مگر معقل بن یسار رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں کسی قیمت پر وہاں نکاح نہیں ہونے دوں گا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے حکم نازل فرمایا:

﴿وَ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ﴾ اور جب وقت تم طلاق رجعی دو عورتوں کو ﴿فَبَلَغْنَ﴾ پھر وہ پہنچ چکیں ﴿اَجَلَهُنَّ﴾ اپنی عدت کو یعنی عدت بھی ختم ہو چکی ﴿فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ﴾ پس تم نہ روکو ان عورتوں کو ﴿اَنْ یَّنْكِحْنَ﴾ یہ کہ وہ نکاح کرلیں ﴿اَزْوَاجَهُنَّ﴾ اپنے پہلے خاوندوں سے ﴿اِذَا تَرَاضَوْا بَیْنَهُمْ﴾ جب وہ آپس میں راضی ہو جائیں ﴿بِالْمَعْرُوْفِ﴾ اچھے طریقے سے یعنی جو شریعت کے قاعدے کے مطابق ہے ﴿ذٰلِكَ یُوْعَظُ بِهٖ﴾ اس حکم کی نصیحت کی جاتی ہے ﴿مَنْ﴾ اس کو ﴿كَانَ مِنْكُمْ﴾ جو ہے تم میں سے ﴿یُؤْمِنُ بِاللّٰهِ﴾ ایمان رکھتا ہے اللہ تعالیٰ پر ﴿وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ﴾ اور آخرت پر۔ جب یہ ارشاد نازل ہوا تو حضرت معقل ابن یسار رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ رب تعالیٰ کا حکم سر آنکھوں پر اب میں رکاوٹ نہیں بنوں گا۔ فوراً ہمشیرہ کا نکاح پہلے خاوند سے کر دیا۔

(تجدید نکاح کا مطلب یہ ہے کہ نئے سرے سے نکاح ہوگا، مہر ہوگا، گواہ ہوں گے جو نکاح کے لیے شرائط ہیں وہ ساری پوری کرنی ہوں گی۔)

پھر وہ راضی اور خوشی کے ساتھ رہے۔ پھر اُن سے اولاد بھی ہوئی۔ فرمایا ﴿ذٰلِكُمْ اَزْكٰى لَكُمْ﴾ یہ چیز قلبی لحاظ سے بھی تمھارے لیے بڑی پاکیزہ ہے ﴿وَ اَطْهَرُ﴾ اور بدنی لحاظ سے بھی بڑی پاکیزہ ہے۔ عورت کوئی بکاؤ مال تو نہیں کہ آج اِس منڈی میں اور کل اُس منڈی میں۔ آج اِس کی بیوی اور کل اُس کی بیوی۔ یہ کوئی اچھی بات نہیں۔ عزت انسانی کا مسئلہ ہے۔ تو بدن بھی اس میں صاف رہے گا اور دل بھی صاف رہے گا۔ کیوں اگر عورت کا دل پہلے خاوند کی طرف مائل تھا اور رشتہ داروں نے نکاح نہیں کرنے دیا تو ہو سکتا ہے کہ کسی وقت اس سابقہ تعارف کی وجہ سے کوئی خرابی پیدا ہو جائے لہٰذا دل بھی پاک رہے گا اسی صورت میں ﴿وَاللّٰهُ یَعْلَمُ﴾ اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے ﴿وَ اَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ اور تم نہیں جانتے۔ لہٰذا اس کے احکام صحیح ہیں۔

رضاعت کے احکام

آگے اور مسئلہ ہے کہ جس وقت عورت نکاح میں ہو تو بچے کو دودھ پلانا اس کے ذمہ ہے اور بغیر کسی اشد مجبوری کے بچے کو دودھ پلانے سے انکار نہیں کر سکتی۔ اگر انکار کرے گی عند اللہ مجرم ہوگی اور گناہ گار ہوگی۔ کیوں کہ بچے کی خوراک رب تعالیٰ نے اس کے پستانوں میں رکھی ہے اس واسطے جب وہ نکاح میں ہے تو دودھ پلانے کا خرچہ خاوند سے نہیں لے سکتی۔ کیوں کہ اس عورت کو باقاعدہ رہائش بھی خاوند نے دی ہوئی ہے اور اس کو کھانے پینے کا خرچہ بھی ملتا ہے اور لباس بھی ملتا ہے اور اس کی بیماری اور تندرستی کا خرچہ بھی خاوند کے ذمہ ہے تو بچے کو دودھ پلانے کا خرچہ نہیں مانگ سکتی۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ﴿وَالْوَالِدٰتُ﴾ اور مائیں ﴿یُرْضِعْنَ﴾ دودھ پلائیں ﴿اَوْلَادَهُنَّ﴾ اپنی اولاد کو ﴿حَوْلَیْنِ﴾ دو سال ﴿كَامِلَیْنِ﴾ مکمل۔ لیکن یہ دو سال کس کے لیے ہیں ﴿لِمَنْ اَرَادَ اَنْ یُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ﴾ اس شخص کے لیے ہیں جو ارادہ کرے اس بات کا کہ وہ دودھ پلانے کی مدت پوری کرے۔ آگے آ رہا ہے اگر ماں باپ پہلے دودھ چھڑانا چاہیں تو اس کی بھی اجازت ہے۔ کیوں کہ بعض بچے بڑے صحت مند ہوتے ہیں کہ سال، سوا سال، ڈیڑھ سال گزرنے کے بعد وہ کھانا پینا شروع کر

دیتے ہیں۔ان کے لیے دوسال مکمل کرنے ضروری نہیں ہیں۔ اور اگر بچہ ماں کے دودھ کے بغیر کچھ نہیں پیتا تو دوسال آخری مدت ہے۔اس کے بعد ماں اس کو دودھ نہیں پلاسکتی۔بعض عورتیں پیار اور محبت کی وجہ سے دوسال کے بعد بھی دودھ پلاتی رہتی ہیں۔یہ سخت گناہ ہے۔کیوں کہ جو حکم رب تعالیٰ نے دیا ہے وہ اٹل ہے۔

﴿وَ عَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ﴾ اور اس شخص پر جس کی طرف بچے کی نسبت کی جاتی ہے یعنی بچے کا باپ۔اس کے ذمہ ہے ﴿رِزْقُهُنَّ﴾ ان کا کھانا ﴿وَ كِسْوَتُهُنَّ﴾ اور ان کا لباس بھی ان کے خاوندوں کے ذمہ ہے۔کون سا لباس ؟ تو فرمایا ﴿بِالْمَعْرُوْفِ﴾ جو قاعدے کے مطابق ہو۔وہ قاعدہ کیا ہے؟ فرمایا ﴿لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ اِلَّا وُسْعَهَا﴾ نہیں تکلیف دی جاسکتی کسی نفس کو مگر اس کی طاقت کے مطابق۔اگر خاوند امیر ہے تو عورت کا خرچہ امیرانہ ہوگا یعنی اس کا لباس وہ ہوگا جو امیر عورتیں پہنتی ہیں۔اگر خاوند درمیانے قسم کا ہے مالی اعتبار سے تو اس کے ذمہ خرچہ بھی درمیانے درجے کا ہوگا۔لباس بھی درمیانہ، رہائش بھی درمیانے درجہ کی۔اگر خاوند غریب ہے تو خاوند پر غربت کے اعتبار سے خرچہ ہوگا جو غریب لوگ کھاتے پیتے، پہنتے ہیں اور رہائش بھی اسی طرح کم ہوگی کہ جیسی رہائش میں غریب لوگ رہتے ہیں۔اور عقل کا تقاضا بھی یہی ہے۔کیوں کہ جب ایک آدمی غریب ہے تو وہ کہاں سے امیرانہ خرچہ لا کر دے۔

فرمایا ﴿لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌۢ بِوَلَدِهَا﴾ نہ تکلیف دی جائے والدہ کو اس کے بچے کی وجہ سے۔مثلاً: عورت بیمار ہے۔اس کو دودھ ہی نہیں اُترتا یا اس کا دودھ طبی اعتبار سے مضر ہے مگر خاوند کہتا ہے کہ دودھ تو نے ہی پلانا ہے۔تو ایسا کرنا جائز نہیں ہے۔وہ تو بیمار ہے لہٰذا بچے کی وجہ سے اُس کو تکلیف نہ دی جائے۔بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ عورتیں مختلف قسم کی چیزیں کھاتی ہیں اور دودھ بچے کے لیے نقصان دہ ہوتا ہے۔اور وہ بچہ خود دودھ نہیں پیتا۔اللہ تعالیٰ نے ایسی ہدایت دی اور رب تعالیٰ کا نظام ہے کہ بچہ پستان کو منہ لگا کر چھوڑ دیتا ہے۔ایسی صورت میں فوراً دودھ کا ٹیسٹ کرانا چاہیے۔اگر ماں کا دودھ بچے کے لیے نقصان دہ ہے تو دھکا شاہی نہ کرو۔عورت کی خوراک بدلو۔اس کا علاج کرو تا کہ دودھ کی خرابی دور ہو جائے۔

تو فرمایا کہ اگر عورت مجبور ہے اور دودھ نہیں پلاسکتی تو اس کو مجبور نہ کیا جائے ﴿وَلَا مَوْلُوْدٌ لَّهٗ بِوَلَدِهٖ﴾ اور نہ باپ کو تکلیف دی جائے بچے کی وجہ سے۔مثلاً: عورت صحت مند ہے، دودھ بھی اس کا وافر ہے مگر وہ کہتی ہے کہ میں نے دودھ نہیں پلانا کیوں کہ اگر میں دودھ پلاؤں گی تو میرے پستان ڈھیلے ہو جائیں گے اور میرے حسن و جمال میں کمی آجائے گی۔کیوں کہ ایسی عورتیں بھی ہیں۔تو اب وہ بے چارہ خاوند کیا کرے۔اس لیے اِس کی بھی اجازت نہیں ہے۔تو فرمایا خاوند کو بھی بچے کے دودھ کی وجہ سے مجبور نہ کیا جائے۔(طبی نقطہ نگاہ سے اگر صحت مند عورت بچے کو دودھ نہیں پلائے گی تو اس صورت میں اسے ٹی،بی اور کینسر ہوسکتا ہے۔)

یادرکھو! جو رب کے نظام کو بدلتا ہے تو ضرور کوئی نہ کوئی خرابی پیدا ہوتی ہے۔تو جب عورت صحت مند ہے تو کیوں دودھ نہیں پلاتی ؟ بے مقصد نخرے کر رہی ہے۔اللہ تعالیٰ نے جو اس کی چھاتی میں دودھ پیدا فرمایا ہے وہ نکلے گا تو تندرست رہے

گی۔ آج کل عورتوں کو چھاتی کا کینسر ہے اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے۔ رب تعالیٰ کا نظام جس طرح اس نے بنایا ہے اسی طرح رہنا چاہیے۔

﴿وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ﴾ اور وارث پر بھی اسی طرح خرچہ لازم ہے۔ مثال کے طور پر باپ فوت ہو چکا ہے تو بچے کے دودھ کا کیا سلسلہ ہوگا کہ عورت کے پاس خرچہ بھی کوئی نہیں ہے اور خاوند کچھ چھوڑ کر بھی نہیں گیا۔ اب وہ جو شرعی وارث ہیں خرچہ ان کے ذمہ ہوگا اس مرنے والے کا ایک بھائی اور ایک بہن ہے۔ وراثت میں بھائی کو دُہرا حصہ ملتا ہے اور بہن کو ایک تو حصے کے مطابق خرچہ بھائی کے ذمہ ہے یعنی جس کو تم چچا کہتے ہو اور ایک حصہ خرچہ اس کی پھوپھی کے ذمہ ہے۔ جس نسبت سے ان کو وراثت ملنی تھی اسی نسبت سے ان پر بچے کا خرچہ آئے گا۔ یہ نہیں سمجھا جائے گا کہ بچے کا خرچہ خود مانگتے پھریں گے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے اس کا خرچہ وارثوں کے ذمہ لگایا ہے۔

﴿فَاِنْ اَرَادَا﴾ پس اگر وہ میاں بیوی دونوں ارادہ کرلیں ﴿فِصَالًا﴾ دودھ چھڑانے کا دو سال سے پہلے ﴿عَنْ تَرَاضٍ مِّنْهُمَا﴾ آپس کی رضامندگی سے یعنی دونوں اس پر راضی ہوں ﴿وَتَشَاوُرٍ﴾ اور دونوں کا مشورہ بھی ہے کہ اس بچے کا دودھ اب چھڑا دینا چاہیے ﴿فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا﴾ تو ان دونوں پر کوئی گناہ نہیں ہے۔ دونوں کی رضا اور دونوں کا مشورہ اِس واسطے ضروری ہے کہ خدانخواستہ عورت نے اپنی مرضی سے دودھ چھڑا دیا خاوند کی مرضی کے بغیر اور بچہ بیمار ہو گیا تو خاوند لڑے گا کہ تو نے دودھ چھڑایا ہے اس لیے بچہ بیمار ہوا ہے۔ اسی طرح خاوند نے اگر دودھ چھڑانے پر مجبور کیا ہے اور عورت اس پر راضی نہیں تھی اور بچے کو کچھ ہو گیا تو عورت کا گلہ ہوگا اور لڑائی ہوگی اور جب دونوں کا مشورہ اور دونوں کی رضا ہوگی تو بچے کے لیے بھی اسی میں خیریت ہے تو پھر جھگڑا کس چیز کا؟ کیوں کہ جھگڑے کا کوئی بھی سبب ہو شریعت اس کو پسند نہیں کرتی۔

﴿وَاِنْ اَرَدْتُّمْ﴾ اور اگر تم ارادہ کرتے ہو ﴿اَنْ تَسْتَرْضِعُوْٓا اَوْلَادَكُمْ﴾ یہ کہ تم اپنی اولاد کو کسی اور سے دودھ پلواؤ ﴿فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ﴾ پس کوئی گناہ نہیں ہے تم پر اس میں بھی ﴿اِذَا سَلَّمْتُمْ مَّآ اٰتَيْتُمْ﴾ جب دے دو تم وہ اجرت جو تم نے طے کی ہے ﴿بِالْمَعْرُوْفِ﴾ عمدگی کے ساتھ۔ اس زمانے میں ایسا ہوتا تھا کہ صحت مند عورتیں بچوں کو لے جاتی تھیں اُن کو اُجرت دی جاتی تھی وہ بچوں کو دودھ پلاتی تھیں۔ آج بھی اگر کوئی ایسی صورت ہو کہ بچے کو کسی سے دودھ پلوایا جائے تو جائز ہے۔

خود آنحضرت ﷺ نے حلیمہ سعدیہ کا دودھ پیا۔ تو اگر تم یہ ارادہ کرتے ہو کہ اس بچے کی ماں کی صحت ٹھیک نہیں ہے دودھ اس کا صحیح نہیں ہے تو کسی اور عورت سے جو صحت مند ہے اس سے دودھ پلوانا چاہو تو اس کی اجازت ہے مگر جو اجرت تم نے طے کی ہے وہ دیانت داری اور دین داری کے ساتھ اس کو دے دو اور نہ لگاؤ کہ جتنی طے کی ہے اس سے کم دو۔ اس کی اجازت نہیں ہے ﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ﴾ اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو ہر معاملے میں ﴿وَاعْلَمُوْٓا﴾ اور جان لو تم ﴿اَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ﴾ بے شک اللہ تعالیٰ جو کچھ تم کرتے ہو دیکھ رہا ہے۔ تمہارے ظاہر کو، باطن کو، ہر حالت کو رب جانتا ہے معاملہ تمھارا رب کے ساتھ ہے۔

﴿وَالَّذِیْنَ﴾ اور وہ لوگ ﴿یُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ﴾ جو تم میں سے وفات پا جاتے ہیں ﴿وَیَذَرُوْنَ﴾ اور چھوڑ جاتے ہیں ﴿اَزْوَاجًا﴾ بیویاں ﴿یَّتَرَبَّصْنَ﴾ وہ روکے رکھیں ﴿بِاَنْفُسِهِنَّ﴾ اپنی جانوں کو ﴿اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا﴾ چار مہینے اور دس دن ﴿فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ﴾ پس جب وہ پوری کر چکیں اپنی عدت ﴿فَلَا جُنَاحَ عَلَیْكُمْ﴾ پس کوئی حرج نہیں ہے تم پر ﴿فِیْمَا فَعَلْنَ﴾ اس کارروائی کے بارے میں جو وہ کریں ﴿فِیْۤ اَنْفُسِهِنَّ﴾ اپنی جانوں کے بارے میں ﴿بِالْمَعْرُوْفِ﴾ عمدگی کے ساتھ ﴿وَاللّٰهُ﴾ اور اللہ تعالیٰ ﴿بِمَا تَعْمَلُوْنَ﴾ جو تم عمل کرتے ہو ﴿خَبِیْرٌ﴾ اس سے خبردار ہے ﴿وَلَا جُنَاحَ عَلَیْكُمْ﴾ اور کوئی گناہ نہیں ہے تم پر ﴿فِیْمَا﴾ اس چیز میں ﴿عَرَّضْتُمْ بِهٖ﴾ جو تم اشارہ کرو اس کے ساتھ ﴿مِنْ خِطْبَةِ النِّسَآءِ﴾ عورتوں کی منگنی کا ﴿اَوْ اَكْنَنْتُمْ﴾ یا تم مخفی رکھو ﴿فِیْۤ اَنْفُسِكُمْ﴾ اپنی جانوں میں یعنی دلوں میں ﴿عَلِمَ اللّٰهُ﴾ جانتا ہے اللہ تعالیٰ ﴿اَنَّكُمْ﴾ بے شک تم ﴿سَتَذْكُرُوْنَهُنَّ﴾ عن قریب تم ذکر کرو گے ان عورتوں کا ﴿وَلٰكِنْ لَّا تُوَاعِدُوْهُنَّ﴾ اور لیکن نہ وعدہ کرو تم ان کے ساتھ ﴿سِرًّا﴾ پوشیدہ ﴿اِلَّاۤ اَنْ تَقُوْلُوْا﴾ مگر یہ کہ کہو تم ﴿قَوْلًا مَّعْرُوْفًا﴾ بات بھلی ﴿وَلَا تَعْزِمُوْا﴾ اور نہ ارادہ کرو تم ﴿عُقْدَةَ النِّكَاحِ﴾ نکاح کی گرہ کا ﴿حَتّٰى یَبْلُغَ الْكِتٰبُ﴾ یہاں تک کہ پہنچ جائے تحریر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ﴿اَجَلَهٗ﴾ اپنی میعاد کو ﴿وَاعْلَمُوْۤا﴾ اور جان لو تم ﴿اَنَّ اللّٰهَ﴾ بے شک اللہ تعالیٰ ﴿یَعْلَمُ﴾ جانتا ہے ﴿مَا فِیْۤ اَنْفُسِكُمْ﴾ جو تمھارے دلوں میں ہے ﴿فَاحْذَرُوْهُ﴾ پس تم اللہ تعالیٰ کی مخالفت سے بچو ﴿وَاعْلَمُوْۤا﴾ اور تم جان لو ﴿اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِیْمٌ﴾ بے شک اللہ تعالیٰ بخشنے والا تحمل کرنے والا، بُردبار ہے۔

عدت کے مسائل

پہلے مطلقہ عورتوں کا ذکر تھا کہ اگر ان کو طلاق ملے تو ان کی کیا عدت ہے جس کی تفصیل تم سن چکے ہو۔ اور اب اس عورت کی عدت کا ذکر ہے کہ جس کا خاوند فوت ہو جائے۔ اگر خاوند کے فوت ہونے کے وقت عورت کے پیٹ میں بچہ ہے تو جب بچہ پیدا ہوگا اس کی عدت اس وقت ختم ہو جائے گی۔ فرض کرو خاوند کی وفات کے دو دن یا تین دن بعد بچہ پیدا ہوتا ہے تو اس عورت کی عدت ختم ہو جائے گی۔ یا اس کی وفات کے چھ یا سات، آٹھ ماہ بعد بچہ پیدا ہوتا ہے تو اس کی عدت اُسی وقت ختم ہو گی جب بچہ پیدا ہوگا۔ اور اگر اس کے پیٹ میں بچہ نہیں ہے تو اس کی عدت ہے چار مہینے دس دن اور یہ چار مہینے دس دن چاند کے اعتبار سے مکمل ہوں گے۔ تو ضابطہ یہ ہے کہ جس عورت کا خاوند فوت ہو جائے اگر حاملہ ہے تو اس کی عدت ہے وضع حمل یعنی بچے کی پیدائش۔ اور اگر حاملہ نہیں ہے تو پھر چار مہینے دس دن ہے۔

تو فرمایا ﴿وَالَّذِیْنَ یُتَوَفَّوْنَ﴾ اور وہ لوگ جو فوت ہو جاتے ہیں ﴿مِنْكُمْ﴾ تم میں سے ﴿وَیَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا﴾ اور چھوڑ جاتے ہیں عورتیں ﴿یَّتَرَبَّصْنَ﴾ روکے رکھیں وہ عورتیں ﴿بِاَنْفُسِهِنَّ﴾ اپنی جانوں کو ﴿اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا﴾ چار مہینے اور دس دن (جب کہ وہ حاملہ نہ ہوں۔)

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی فقاہت

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کوفے کے گورنر تھے۔ ان کے سامنے ایک مقدمہ پیش ہوا کہ ایک شخص نے ایک عورت کے ساتھ نکاح کیا ہے لیکن نکاح کے وقت مہر یاد نہیں رہا اور خاوند فوت ہو گیا۔ اور یاد رکھنا کہ نکاح مہر پر موقوف نہیں ہے، نکاح کی دو بنیادی شرطیں ہیں: ① شرعی طور پر دو گواہ ہوں۔ ② ایجاب و قبول ہو جائے۔
نکاح ہو جائے گا۔ باقی چیزیں موقوف علیہ نہیں ہیں۔ اگر اس وقت مہر مقرر نہیں ہوا تو بعد میں مہر مثلی یا جو آپس میں طے ہو جائے دینا پڑے گا۔ اور عورت کی رخصتی بھی نہیں ہوئی اور خاوند فوت ہو گیا ہے۔

حضرت! آپ سے تین شقوں کا سوال ہے:۔ پہلی شق یہ ہے کہ اس عورت کی عدت ہے یا نہیں؟

- دوسری شق یہ ہے کہ اس عورت کو خاوند کی جائیداد میں سے وراثت کا حصہ ملے گا یا نہیں ملے گا۔
- تیسری شق یہ ہے کہ اس عورت کے لیے مہر ہے یا نہیں؟ کیوں کہ نکاح کے وقت مہر مقرر نہیں ہوا تھا۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ مجھے اس مسئلے پر کوئی حدیث بھی یاد نہیں اور قرآن پاک میں بھی اس پر کوئی صریح حکم نہیں ہے لہٰذا مجھے کچھ مہلت دو، میں سوچوں گا۔ اُمت میں سب سے زیادہ فقیہ حضرت عبداللہ بن مسعود تھے۔ اور ساری اُمت میں سب سے بڑے مفسر بھی حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ہی تھے۔ وہ فرماتے ہیں مجھے مہلت دو۔ تو ان لوگوں نے کہا حضرت ٹھیک ہے آپ غور فرما لیں۔

چنانچہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کئی دن اس مسئلے پر غور کیا اور ان کو طلب فرمایا کہ فلاں دن آنا عدالت میں تمھیں مسئلے کا جواب اور فتویٰ ملے گا۔ لوگ اچھے خاصے اکٹھے ہو کر آ گئے۔ مسئلہ پیچیدہ تھا۔ حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میرے علم کے مطابق قرآن پاک میں بھی اس کا حکم نہیں ہے اور جو احادیث مجھے معلوم ہیں ان میں بھی اس کا صریح حکم نہیں ہے۔ میں نے اس سلسلے میں اجتہاد اور قیاس کیا ہے اور اپنے اجتہاد اور قیاس سے فیصلہ کرتا ہوں کہ اُس عورت کو مہر مثل ملے گا۔

مہر مثل کا مطلب یہ ہے کہ اس عورت کی ماں کا، خالاؤں کا، اس کی بہنوں کا یعنی ماں کی طرف سے جو رشتہ دار عورتیں تھیں ان کا جو مہر تھا اتنا ہی اُس عورت کو بھی ملے گا اور اس عورت کو خاوند کی وراثت بھی ملے گی کیوں کہ نکاح صحیح ہے اور عورت کو عدت بھی گزارنا پڑے گی، چار مہینے دس دن۔ تو حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے جب یہ مسئلہ سنایا تو وہاں حضرت معقل رضی اللہ عنہ موجود تھے جو کہ صحابی ہیں۔ انھوں نے کہا اے ابنِ مسعود! یہ فیصلہ تو نے اپنے اجتہاد اور قیاس سے کیا ہے؟ فرمایا ہاں۔ معقل رضی اللہ عنہ

نے فرمایا کہ میں نے اپنے کانوں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ان چیزوں کے جواب سنے ہیں۔ وہ اس طرح کہ ہماری برادری میں ایک عورت تھی بروع بنت واشق اس کا نام تھا۔ بعینہ یہ واقعہ اس کے ساتھ پیش آیا تھا کہ نکاح ہوا تھا اور مہر کا ذکر نہ کیا گیا اور بغیر ملاپ کے خاوند فوت ہو گیا۔ بروع بنت واشق کے رشتہ داروں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے مسئلہ پیش کیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اس عورت کو مہر مثل ملے گا اور اس عورت کو چار ماہ دس دن عدت گزارنا پڑے گی اور اس کو باقاعدہ وراثت کا حق بھی ملے گا۔

حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے حضرت معقل رضی اللہ عنہ سے سوال کیا کہ کیا یہ باتیں تو نے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنی ہیں؟ فرمایا ہاں۔ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بڑے خوش ہوئے اور فرمایا الحمدللہ! میرے سارے فتوے کی شقیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ثابت ہو گئیں، اگرچہ مجھے علم نہیں تھا اور میں نے قیاس سے جواب دیا تھا۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ وہ بزرگ ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کی فقاہت اور ان کی سمجھ پر اعتماد کرتے ہوئے فرمایا تھا: رَضِیْتُ لَکُمْ مَا رَضِیَ لَکُمُ ابْنُ اُمِّ عَبْدٍ "میں تمھارے لیے ہر اس مسئلے پر راضی ہوں جس مسئلے پر عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ راضی ہے وَسَخِطْتُ لَکُمْ مَّا سَخِطَ لَکُمُ ابْنُ اُمِّ عَبْدٍ اور میں تمھارے لیے اس چیز کو پسند نہیں کرتا جس کو عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ پسند نہیں کرتا۔" اتنا اعتماد تھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو۔ یہ کوفے میں رہتے تھے ان کے شاگرد ہیں ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ۔ جو اپنے دور کے چوٹی کے فقیہ تھے اور ان کے شاگرد ہیں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ۔ کامل استادوں کے کامل شاگرد۔ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ چار اماموں میں سے ایک امام ہیں۔ وہ فرماتے ہیں: اَلنَّاسُ عَیَالُ اَبِیْ حَنِیْفَةَ فِی الْفِقْهِ "تمام لوگ فقہ میں ابوحنیفہ کے خوشہ چیں ہیں۔"

تو مسئلہ یہ ثابت ہوا کہ نکاح ہو گیا اور رخصتی نہیں ہوئی یا خاوند فوت ہو جائے تو عورت کو عدت گزارنا پڑے گی۔ اب یہاں ہماری عقل کچھ نہیں کرتی۔ کیوں کہ اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث ہے۔ اور حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

وَعَلَیْهِ اِجْمَاعُ الْاُمَّةِ "اور اس پر امت کا اجماع اور اتفاق ہے۔" اب تم اس کے مقابلے میں دیکھو کہ قرآن کریم کے بائیسویں پارے میں مذکور ہے کہ اگر کسی مرد کا کسی عورت سے نکاح ہو جائے اور ان کا آپس میں ملاپ نہیں ہوا اور طلاق کی نوبت آ گئی ہے تو ﴿فَمَا لَکُمْ عَلَیْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ﴾ پس نہیں ہے تمھارے لیے ان پر کوئی عدت ﴿تَعْتَدُّوْنَهَا﴾ کہ تم ان عورتوں سے پورا کراؤ۔ یعنی اس عورت کی کوئی عدت نہیں ہے۔ یہ عورت طلاق کے دو منٹ بعد نکاح کرنا چاہے تو کر سکتی ہے۔ اور پہلی صورت میں ہے کہ عدت گزارنا پڑے گی۔ تو یہاں ہماری عقل قاصر ہے کیوں کہ عقل کا تقاضا یہ ہے کہ یا تو دونوں جگہ عدت ہونی چاہیے یا دونوں جگہ پر عدت نہیں ہونی چاہیے۔ یہ مسئلہ قرآن کا ہے اور وہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پاک زبان سے نکلا ہے۔ یہ حدیث صحیح ہے جو کہ ترمذی شریف اور ابوداؤد شریف میں موجود ہے اور ائمت کا اجماع ہے کسی کا کوئی اختلاف نہیں ہے۔

تو اللہ تعالیٰ نے یہاں موت کی صورت میں عدت بیان فرمائی کہ ﴿وَالَّذِیْنَ یُتَوَفَّوْنَ﴾ اور وہ لوگ جن کو وفات دی

جاتی ہے ﴿مِنْكُمْ﴾ تم میں سے ﴿وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا﴾ اور چھوڑ جاتے ہیں بیویاں ﴿يَّتَرَبَّصْنَ﴾ وہ عورتیں روکے رکھیں ﴿بِاَنْفُسِهِنَّ﴾ اپنی جانوں کو ﴿اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا﴾ چار مہینے دس دن ﴿فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ﴾ پس وہ عورتیں جس وقت اپنی عدت پوری کر چکیں ﴿فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ﴾ پس کوئی گناہ نہیں ہے تم پر ﴿فِيْمَا فَعَلْنَ فِيْۤ اَنْفُسِهِنَّ﴾ اس کارروائی کے بارے میں جو وہ عورتیں اپنے بارے میں کریں لیکن کریں ﴿بِالْمَعْرُوْفِ﴾ اچھے طریقے کے ساتھ یہ کہ خفیہ طریقہ نہ ہو بُرائی نہ ہو۔ اگر ایسا کریں تو تم پر فرض ہے کہ تم روکو۔ ہاں عدت ختم ہوگئی ہے اور وہ عورت اپنے نکاح کے لیے کہیں پیغام بھیجتی ہے، ہاتھ پاؤں مارتی ہے تو کوئی حرج نہیں ہے ﴿وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ﴾ اور اللہ تعالیٰ جو تم عمل کرتے ہو ان سب سے خبردار ہے ﴿وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ﴾ اور کوئی حرج نہیں ہے تم پر ﴿فِيْمَا عَرَّضْتُمْ بِهٖ﴾ اس کارروائی میں کہ تم اس کا اشارہ کرتے ہو ﴿مِنْ خِطْبَةِ النِّسَآءِ﴾ عورتوں کی منگنی کا ﴿اَوْ اَكْنَنْتُمْ فِيْۤ اَنْفُسِكُمْ﴾ یا تم مخفی رکھتے ہو دلوں میں۔

مسئلہ یہ ہے کہ اگر عورت عدت گزار رہی ہے تو دورانِ عدت صریح الفاظ میں اس کو نکاح کا پیغام دینا حرام ہے۔ مثلاً: کہے کہ جب تیری عدت ختم ہوگی تو میں تیرے ساتھ نکاح کرلوں گا۔ وہ عورت بھی عدت کے دوران میں صریح الفاظ میں نکاح کا پیغام نہیں دے سکتی۔ مثلاً: یہ نہیں کہہ سکتی کہ عدت کے بعد میں تیرے ساتھ نکاح کرلوں گی۔ یہ حرام ہے۔ ہاں اشارہ و کنایہ کر سکتے ہیں۔ مثلاً: کوئی شخص اس کے ساتھ نکاح کرنا چاہتا ہے تو یوں کہے کہ میں طلب گار ہوں کوئی نیک عورت مل جائے تو ان شاء اللہ نکاح کرلوں گا۔ یہ نہ کہے کہ میں نے تیرے ساتھ نکاح کرنا ہے۔ یا یوں کہے کہ اللہ تعالیٰ تیرا کوئی انتظام کردے گا اس کے خزانوں میں کوئی کمی نہیں ہے۔ یا دل میں مخفی رکھے کہ عدت ختم ہونے کے بعد میں اُس سے نکاح کرلوں گا۔ اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

﴿عَلِمَ اللّٰهُ﴾ رب جانتا ہے ﴿اَنَّكُمْ سَتَذْكُرُوْنَهُنَّ﴾ بے شک تم ان کا عنقریب ذکر کرو گے۔ اللہ تعالیٰ نے وضع ایسی بنائی ہے کہ مرد عورت کے بغیر نہیں رہ سکتا اور عورت مرد کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے نسلِ انسانی کا سلسلہ جاری رکھنا ہے اس واسطے اسباب پیدا فرمائے ہیں۔ اس واسطے شریعت نے سختی کے ساتھ حکم دیا ہے کہ جب لڑکا بالغ ہوجائے تو بلا کسی اشد مجبوری کے اس کی شادی میں تاخیر نہ کرو۔ اور جب لڑکی بالغ ہوجائے تو اس کی شادی میں تاخیر نہ کرو۔ اگر ان سے گناہ سرزد ہوجائے تو ماں باپ کی گردن پر ہوگا۔ اس پر صحیح حدیث ہے۔

پھر اللہ تعالیٰ نے وضع ایسی بنائی ہے کہ اگر کسی عورت کی دیر تک شادی نہ ہو تو رحم کا جو نظام ہے اس میں گڑبڑ ہوجاتی ہے تو عورت اولاد جننے کے قابل نہیں رہتی ﴿وَلٰكِنْ لَّا تُوَاعِدُوْهُنَّ﴾ اور لیکن تم ان سے وعدہ نہ کرو ﴿سِرًّا﴾ مخفی طریقے سے۔ یعنی وعدہ نہ کرو کہ تو عدت کے بعد میرے ساتھ نکاح کرنا میں تیرے ساتھ نکاح کروں گا ﴿اِلَّاۤ اَنْ تَقُوْلُوْا قَوْلًا مَّعْرُوْفًا﴾ مگر یہ کہ تم بات کہو معقول۔ وہ یہ کہ اشارہ کنایہ سے اس کو سمجھا دو ﴿وَلَا تَعْزِمُوْا عُقْدَةَ النِّكَاحِ﴾ اور نہ تم ارادہ کرو نکاح کی گرہ کا ﴿حَتّٰى يَبْلُغَ الْكِتٰبُ اَجَلَهٗ﴾ یہاں تک کہ پہنچ جائے کتاب اپنی مدت تک۔

دورانِ عدت نکاح حرام ہے

عدت کے اندر نکاح کرنا بڑا سنگین مسئلہ ہے۔ فقہائے کرام رحمہم اللہ تصریح فرماتے ہیں کہ اگر کسی عورت کی عدت ختم نہیں ہوئی چاہے طلاق کی عدت ہو یا وفات کی اور نکاح خواں کو علم ہو کہ اس کی عدت ابھی ختم نہیں ہوئی اور اس کا آگے کسی کے ساتھ نکاح پڑھا دیا تو نکاح خواں مرتد ہو گیا اور اس کا اپنا نکاح بھی خود بہ خود ٹوٹ گیا۔ اور جو گواہ اس مجلس میں موجود ہیں اور اگر ان کو بھی علم ہے کہ اس عورت کی عدت ابھی ختم نہیں ہوئی تو ان کا نکاح بھی ٹوٹ گیا اور وہ مرتد ہو گئے اور پہلی ساری نیکیاں برباد ہو گئیں۔ از سرِ نو کلمہ پڑھیں اور دوبارہ اپنے نکاح پڑھائیں۔

اور اس مجلس میں جتنے لوگ شریک ہیں اگر ان کو بھی علم ہے کہ اس عورت کی عدت ختم نہیں ہوئی اور اس کے باوجود اپنی رضا سے اس مجلس میں بیٹھے ہیں تو ان سب کے نکاح ٹوٹ گئے۔ اس واسطے کہ عدت کے دوران نکاح کرنا حرام ہے اور حرام کو حلال سمجھنا کفر ہے۔ ہاں اگر علم نہیں ہے تو پھر نکاح نہیں ٹوٹتا کیوں کہ ﴿لَا یُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا﴾ اللہ تعالیٰ کسی نفس کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔

بعض لوگ ایسے ہیں کہ عورت اغواء کی اور کہتے ہیں کہ نکاح پڑھا دو، نکاح خواں کے لیے بھی ضروری ہے کہ ایسے نکاح کا اقدام نہ کرے ﴿وَاعْلَمُوْٓا﴾ اور تم جان لو کہ ﴿اَنَّ اللّٰهَ یَعْلَمُ مَا فِیْٓ اَنْفُسِكُمْ﴾ بے شک اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو تمھارے دلوں میں ہے ﴿فَاحْذَرُوْهُ﴾ اور اللہ تعالیٰ کی مخالفت سے بچو، ڈرو رب تعالیٰ کی نافرمانی سے ﴿وَاعْلَمُوْٓا﴾ اور جان لو ﴿اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ﴾ بے شک اللہ تعالیٰ بخشنے والا بھی ہے جو گناہ کر کے معافی مانگے رب بخشے گا ﴿حَلِیْمٌ﴾ تحمل والا ہے کہ اگر فوری طور پر سزا نہیں دیتا اس لیے کہ بڑا حوصلے والا ہے۔ اس کے تحمل سے دھوکا نہ کھانا کہ ہم بچ گئے ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں ہماری زندگی کے احکام بتائے ہیں لہٰذا سب مسلمانوں کو سمجھنے چاہئیں اور ان پر عمل کرنا چاہیے۔

﴿لَا جُنَاحَ عَلَیْكُمْ﴾ نہیں ہے کوئی گناہ تم پر ﴿اِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ﴾ اگر طلاق دو تم عورتوں کو ﴿مَا لَمْ تَمَسُّوْهُنَّ﴾ اس زمانے میں جس میں تم نے ان کو ہاتھ بھی نہیں لگایا ﴿اَوْ تَفْرِضُوْا لَهُنَّ﴾ یا تم نے مقرر نہیں کیا ان کے لیے ﴿فَرِیْضَةً﴾ مہر ﴿وَّ مَتِّعُوْهُنَّ﴾ اور ان کو تم جوڑا دو ﴿عَلَى الْمُوْسِعِ﴾ قدرت والے پر ﴿قَدَرُهٗ﴾ اس کے اندازے کا جوڑا ہے ﴿وَ عَلَى الْمُقْتِرِ﴾ اور تنگ دست پر ﴿قَدَرُهٗ﴾ اس کے اندازے کا جوڑا ہے ﴿مَتَاعًا بِالْمَعْرُوْفِ﴾ یہ جوڑا ہے عمدگی کے ساتھ ﴿حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِیْنَ﴾ یہ حق ہے نیکوکاروں پر ﴿وَ اِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ﴾ اور اگر تم نے طلاق دی ان عورتوں کو ﴿مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ﴾ پہلے اس سے کہ تم ان کو ہاتھ لگاؤ ﴿وَ قَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ﴾ اور تحقیق تم مقرر کر چکے ہو ان کے لیے ﴿فَرِیْضَةً﴾ مہر ﴿فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ﴾ پس آدھا ہے وہ جو تم مقرر کر چکے ہو

﴿اِلَّاۤ اَنْ یَّعْفُوْنَ﴾ مگر یہ کہ وہ عورتیں معاف کردیں ﴿اَوْ یَعْفُوَا﴾ وہ معاف کردے ﴿الَّذِیْ بِیَدِهٖ﴾ جس کے ہاتھ میں ہے ﴿عُقْدَةُ النِّكَاحِ﴾ نکاح کی گرہ ﴿وَ اَنْ تَعْفُوْۤا﴾ اور یہ کہ اے مردو! تم معاف کرو ﴿اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى﴾ یہ تقویٰ کے زیادہ قریب ہے ﴿وَ لَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَیْنَكُمْ﴾ اور نہ بھولو تم فضل کو آپس میں ﴿اِنَّ اللّٰهَ﴾ بے شک اللہ تعالیٰ ﴿بِمَا تَعْمَلُوْنَ﴾ جو کچھ تم کرتے ہو ﴿بَصِیْرٌ﴾ دیکھتا ہے ﴿حٰفِظُوْا﴾ حفاظت کرو ﴿عَلَى الصَّلَوٰتِ﴾ نمازوں کی ﴿وَ الصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى﴾ خاص کر درمیانی نماز کی ﴿وَ قُوْمُوْا﴾ اور کھڑے ہو جاؤ ﴿لِلّٰهِ﴾ اللہ تعالیٰ کے سامنے ﴿قٰنِتِیْنَ﴾ عاجزی کرتے ہوئے ﴿فَاِنْ خِفْتُمْ﴾ پس اگر تم کو خوف ہے ﴿فَرِجَالًا﴾ تو کھڑے کھڑے تم پڑھ لو ﴿اَوْ رُكْبَانًا﴾ یا سواری پر ﴿فَاِذَاۤ اَمِنْتُمْ﴾ پس جب تم امن میں ہو جاؤ ﴿فَاذْكُرُوا اللّٰهَ﴾ پس تم یاد کرو اللہ تعالیٰ کو ﴿كَمَا عَلَّمَكُمْ﴾ جیسے تمھیں رب نے تعلیم دی ﴿مَّا﴾ ان چیزوں کی ﴿لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ﴾ جن کو تم پہلے نہیں جانتے تھے۔

۱ نکاح، طلاق، عدت اور مہر کے مسائل کا بیان چلا آرہا ہے۔ اب اس عورت کا ذکر ہے کہ جس کے ساتھ نکاح ہوا اور رخصتی سے پہلے طلاق ہوگئی اور نکاح کے وقت مہر بھی مقرر نہیں کیا گیا تو اس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے کہ ﴿لَا جُنَاحَ عَلَیْكُمْ﴾ نہیں ہے تم پر کوئی گناہ ﴿اِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ﴾ اگر تم طلاق دے دو عورتوں کو ﴿مَا لَمْ تَمَسُّوْهُنَّ﴾ اس زمانے میں جب کہ تم نے ان کو ہاتھ بھی نہیں لگایا ﴿اَوْ تَفْرِضُوْا لَهُنَّ فَرِیْضَةً﴾ یا تم نے ان کے لیے مہر مقرر نہیں کیا۔ یعنی ایسی عورت کہ تم نے اس کے ساتھ نکاح کیا اور رخصتی سے پہلے تم نے طلاق دے دی اور جب نکاح ہوا تھا اس وقت مہر بھی مقرر نہیں کیا تھا۔ کیوں کہ نکاح کے وقت اگر مہر کا ذکر نہ بھی کیا جائے تو نکاح منعقد ہو جائے گا اور مہر بعد میں طے کر لیا جاتا ہے۔ میاں بیوی خود طے کرلیں۔ اگر طے کرنے میں جھگڑا ہو جائے تو مہر مثلی ہوگا۔ کیوں کہ نکاح کے لیے مہر ضروری ہے۔ مگر ایسی عورت جس کے نکاح کے وقت مہر کا ذکر نہیں ہوا اور رخصتی سے پہلے طلاق ہوگئی تو اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اس کا حکم یہ ہے کہ ﴿وَّ مَتِّعُوْهُنَّ﴾ اور فائدہ پہنچاؤ تم ان کو اور وہ فائدہ پہنچانا یہ ہے کہ تم ان کو ایک جوڑا کپڑوں کا دے دو۔ اور اس کو متعۃ النکاح کہتے ہیں۔

متعہ حرام ہے

اور ایک متعہ ہے رافضیوں کا، شیعوں کا کہ کوئی مرد کسی عورت سے مقرر وقت کے لیے مثلاً: گھنٹہ دو گھنٹے، ایک دن، ایک سال۔ اور بغیر گواہوں کے معین رقم پر جو دونوں میں طے ہو جائے نکاح کرلے اس کو متعہ کہتے ہیں۔

(اصل بات یہ ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں نکاح کی ایک صورت یہ بھی رائج تھی کہ وقت مقررہ کے لیے نکاح ہوتا تھا اور وہ وقت ایک گھنٹہ بھی ہو سکتا تھا اور ایک سال کے لیے بھی، لیکن اسلام نے اسے ختم کر دیا۔ اور رافضیوں کے ہاں ابھی تک جاری

ہے اور اس کے بڑے بڑے فضائل بیان کرتے ہیں۔ منہج الصادقین میں ہے کہ جو آدمی ایک مرتبہ متعہ کرے اس کو حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کا درجہ اور جو دو مرتبہ متعہ کرے اس کو حضرت حسن رضی اللہ عنہ کا درجہ اور جو تین مرتبہ کرے اس کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کا درجہ اور جو چار مرتبہ متعہ کرے اُسے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا درجہ ملے گا۔ العیاذ باللہ ثم العیاذ باللہ ثم العیاذ باللہ۔ اگر زنا سے یہ درجے ملتے ہیں تو پھر کنجر تو سب سے بڑے نیک ہیں۔

پھر یہ خرافات بھی انھوں نے برہان المتعہ میں لکھی ہیں کہ امام جعفر صادق رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ جو شخص متعہ کرے پھر غسلِ جنابت کرے، پانی کے ہر قطرہ سے جو اس کے بدن سے گرے خدا تعالیٰ ستر ستر فرشتے پیدا کرتا ہے جو اس متعہ کرنے والے شخص کے لیے قیامت تک مغفرت مانگتے رہتے ہیں۔ (لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ)۔

اور ایک متعۃ الحج ہے جس کو تمتع کہتے ہیں کہ عمرے کا احرام باندھا اور عمرے سے فارغ ہونے کے بعد حج کا احرام باندھا اور حج کیا۔ اس میں ایک قربانی دینا پڑے گی۔ اور یہاں جس کا ذکر ہے وہ ہے متعۃ النکاح۔ وہ یہ ہے کہ جس عورت کو طلاق ملی ہے اس کو طلاق کے ساتھ ایک جوڑا کپڑے کا بھی دینا پڑے گا۔ اگر اس کا مہر مقرر شدہ ہے تو اس کو مہر بھی دینا پڑے گا اور ایک جوڑا بھی دینا پڑے گا اور یہ مستحب ہے۔ اور اگر مہر مقرر نہیں ہوا تو پھر جوڑا دینا واجب ہے۔ اور اس مقام پر ﴿مَتِّعُوْهُنَّ﴾ میں اسی کا ذکر ہے کہ تم طلاق کے بعد عورت کو ایک جوڑا دو۔ وہ جوڑا کیسا ہو؟ ﴿عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ﴾ وسعت والے پر اس کی حیثیت کے مطابق ﴿وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ﴾ اور فقیر اور تنگ دست پر اس کے اندازے کے مطابق۔ اور ظاہر بات ہے کہ گھروں میں عورتیں جو لباس پہنتی ہیں مال داروں کے گھروں میں امیرانہ لباس ہے اور درمیانے گھروں میں درمیانہ لباس ہے اور غریب گھروں میں غریبوں والا لباس ہے۔ تو جس کی جو حیثیت ہے اسی کے مطابق خوراک ہے اور اسی کے مطابق لباس ہے۔ لہٰذا امیر آدمی کو اپنی حیثیت کے مطابق ریشمی لباس جو عمدہ ہوتا ہے وہ دینا پڑے گا۔ اور غریب آدمی کو اپنی حیثیت کے مطابق یہ جوڑا دینا پڑے گا ﴿مَتَاعًا بِالْمَعْرُوْفِ﴾ یہ جوڑا خندہ پیشانی کے ساتھ دینا ہے، عمدگی کے ساتھ دینا ہے ماتھے پر بل نہ پڑیں ﴿حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ﴾ لازم ہے نیکوکاروں پر یعنی رب تعالیٰ نے یہ نیکوکاروں پر لازم کیا ہوا ہے۔

مہر کے بعض احکام

اور مسئلہ: ﴿وَاِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ﴾ اور اگر تم نے طلاق دی عورتوں کو ﴿مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ﴾ پہلے اس سے کہ تم ان کو ہاتھ لگاؤ ﴿وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيْضَةً﴾ اور تحقیق تم مقرر کر چکے ہو ان کے لیے مہر ﴿فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ﴾ پس آدھا مہر ہے جو تم نے مقرر کیا ہے۔ مثال کے طور پر نکاح ہو چکا ہے اور نکاح کے موقع پر ایک ہزار مہر مقرر ہوا ہے (اور طریقہ یہی رائج ہے اب بھی اور پہلے بھی اسی طرح کرتے تھے کہ مہر اسی وقت دے دیتے تھے۔) اور وہ عورت کے وارثوں اور متولیوں کو دے دیا اور انھوں نے منکوحہ کو دے دیا۔ ابھی رخصتی نہیں ہوئی مگر ایسی صورت پیش آگئی کہ طلاق کی نوبت آگئی تو اس نفس نکاح کے ساتھ آدھا مہر تو

عورت کا ہے اور آدھا اس کو واپس کرنا پڑے گا ﴿اِلَّآ اَنْ یَّعْفُوْنَ﴾ مگر وہ عورتیں آدھا بھی معاف کر دیں کیوں کہ یہ ان کا حق ہے ﴿اَوْ یَعْفُوَا الَّذِیْ بِیَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ﴾ یا معاف کر دے وہ شخص کہ اس کے ہاتھ میں ہے نکاح کی گرہ۔ یعنی ایک ہزار مہر دیا تھا لیکن رخصتی سے پہلے طلاق ہوگئی۔ اب پانچ سو اس نے لینا ہے کیوں کہ وہ اس کا حق ہے۔ مگر یہ کہتا ہے کہ معاف کرتا ہوں میں نہیں لیتا تو یہ بھی جائز ہے۔

آگے اللہ تعالیٰ مردوں کو خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں ﴿وَ اَنْ تَعْفُوْٓا﴾ اور یہ کہ تم معاف کر دو ﴿اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی﴾ یہ تقویٰ کے زیادہ قریب ہے ﴿وَ لَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَیْنَكُمْ﴾ اور نہ بھولو تم فضل کو آپس میں یعنی اس طلاق کی وجہ سے آپس میں مہربانی کو نہ بھولو۔ مطلب یہ ہے کہ طلاق عموماً جھگڑے کے بعد ہوتی ہے خوشی کے ساتھ کوئی طلاق نہیں دیتا۔ اور جب جھگڑا ہوتا ہے تو دلوں میں کینہ، بغض، حسد اور بڑا طیش آجاتا ہے تو رب تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تم اس طیش کے وقت بھی رب کے حکم کو نہ بھولو۔ مغلیہ خاندان کا آخری بادشاہ بہادر شاہ ظفرؔ شاعر بھی تھا۔ اس کا شعر ہے: ؏

ظفرؔ اُسے آدمی نہ جانیے گا ہو وہ کتنا ہی صاحبِ فہم و ذکاء
جسے عیش میں یادِ خدا نہ رہی جسے طیش میں خوفِ خدا نہ رہا

اس کو آدمی نہ سمجھو کہ جسے عیش میں خدا کی یاد بھول گئی اور طیش میں رب کے خوف سے بے نیاز ہوگیا۔ ہر حال میں رب سے ڈرو۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ﴾ بے شک اللہ تعالیٰ ﴿بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ﴾ جو عمل تم کرتے ہو دیکھتا ہے۔

نمازِ عصر کی خصوصی اہمیت

اس سے قبل نکاح، طلاق اور عدت کے مسائل تھے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ انھی چیزوں میں نہ اُلجھ جانا بلکہ نمازوں کا بھی خیال رکھنا ﴿حٰفِظُوْا عَلَی الصَّلَوٰتِ﴾ حفاظت کرو نمازوں کی۔ عموماً لوگ نکاح کے موقع پر نماز کی پروا نہیں کرتے۔ اسی طرح طلاق کے مسئلے پر اکٹھے ہوں تو نماز نہیں پڑھتے اور کئی مقامات میں نمازوں کی پروا نہیں کرتے۔ تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اپنے مسائل ہی میں نہ اُلجھے رہو میرے حقوق کا بھی خیال کرو۔ ﴿وَ الصَّلٰوةِ الْوُسْطٰی﴾ خاص طور پر درمیانی (وُسطٰی) نماز کی اور نماز وسطٰی عصر کی نماز ہے۔

غزوۂ خندق کے موقع پر اتنی زور کی لڑائی تھی، مصروفیت تھی کہ آنحضرت ﷺ ظہر کی نماز نہ پڑھ سکے، نہ عصر کی اور نہ شام کی۔ اس موقع پر آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

((مَلَاءَ اللّٰهُ بُیُوْتَهُمْ وَ قُبُوْرَهُمْ نَارًا شَغَلُوْنَا عَنِ الصَّلٰوةِ الصَّلٰوةِ الْوُسْطٰی)).

"اللہ تعالیٰ ان کافروں کی قبروں کو اور ان کے گھروں کو آگ کے شعلوں سے بھر دے اُنھوں نے ہماری نمازیں قضا کرا دی ہیں۔ خاص طور پر صلوٰۃ الوسطٰی، عصر کی نماز۔"

تمام نمازوں کا بڑا درجہ ہے لیکن عصر کی نماز کے بارے میں آتا ہے:
((مَنْ فَاتَتْهُ صَلٰوةُ الْعَصْرِ فَكَاَنَّمَا وُتِرَ اَهْلُهٗ وَمَالُهٗ اَوْ كَمَا قَالَ ﷺ)).
"کہ جس سے عصر کی نماز رہ گئی پس اس طرح سمجھو کہ اس کے گھر کے سارے افراد بھی مر گئے اور گھر کا مال بھی لوٹ لیا گیا ہو۔"

تو اس سے اندازہ لگاؤ کہ گھر کے افراد میں سے کوئی بھی زندہ نہ رہے تو کتنا صدمہ ہوتا ہے۔ جب کہ حال یہ ہے کہ اگر ایک مرد مر جائے تو لوگ صدمے کی وجہ سے بے ہوش ہو جاتے ہیں اور سارا گھر لوٹ لیا جائے تو اس کا کتنا صدمہ ہوتا ہے۔ تو عصر کی نماز فوت ہو جانے کا اتنا نقصان ہوتا ہے۔

﴿ وَ قُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ ﴾ اور کھڑے ہو جاؤ اللہ تعالیٰ کے سامنے عاجزی کرتے ہوئے۔ اور ظاہری عاجزی بھی ہونی چاہیے اور باطنی عاجزی بھی۔ ظاہری عاجزی یہ ہے کہ آدمی جب نماز میں کھڑا ہو تو نگاہ سجدے کے مقام پر رکھے اِدھر اُدھر نہ دیکھے۔ اور ہاتھ سُنت کے مطابق ناف کے نیچے باندھ کر کھڑا ہو اور ایسا نہ کرے کہ کبھی تو ڈاڑھی سے کھیلے اور کبھی کانوں میں اُنگلیاں ڈالے اور بلاضرورت کبھی کسی اور جگہ پر خارش کرتا رہے۔ ہاں اگر مجبور ہے تو مجبوری کا حکم الگ ہے۔ اور باطنی عاجزی یہ ہے کہ نماز میں پوری توجہ اللہ تعالیٰ کی طرف ہو۔ گویا کہ رب تعالیٰ کو آنکھوں کے ساتھ دیکھ رہا ہے۔ اور اگر یہ درجہ حاصل نہیں ہے تو پھر یہ سمجھے کہ مجھے رب تعالیٰ دیکھ رہا ہے۔

﴿ فَاِنْ خِفْتُمْ ﴾ پس اگر تمھیں خوف ہے ﴿ فَرِجَالًا ﴾ تو کھڑے کھڑے پڑھ لو۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ ﴿ فَرِجَالًا ﴾ کا ترجمہ کرتے ہیں پاؤں پر کھڑے کھڑے اور یہی معنیٰ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کیا ہے۔ یعنی اگر خطرہ ہے اور تم رکوع وسجود نہیں کر سکتے تو تم کھڑے کھڑے نماز پڑھ لو۔

اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ معنیٰ کرتے ہیں کہ دوڑتے ہوئے نماز پڑھ لو ﴿ اَوْ رُكْبَانًا ﴾ یا سواری پر۔ مثال کے طور پر دشمن پچھلی طرف سے دوڑتا ہوا آ رہا ہے تم آگے جنگی حکمت عملی کی وجہ سے دوڑے جا رہے ہو تو اشارے کے ساتھ نماز پڑھ لو یا شیر تمھارے پیچھے لگا ہوا ہے اور نماز کا وقت ہے کیوں کہ نماز کی کسی حالت میں بھی معافی نہیں ہے۔ تو تم دوڑتے ہوئے اشارے کے ساتھ نماز پڑھو۔ اسی طرح سمجھو کہ پانی کا سیلاب پیچھے آ رہا ہے تم بھاگے جا رہے ہو نماز کی معافی نہیں ہے اشاروں کے ساتھ پڑھ لو۔ یا تم اپنی سواری پر ہو تو سواری ہی پر پڑھ لو اور یاد رکھنا! آدمی اگر سولی پر لٹکا ہوا ہو اور ہاتھوں میں میخیں ٹھونکی ہوئی ہوں اور خون کے فوارے نکل رہے ہوں، نماز اس وقت بھی معاف نہیں ہے۔ اگرچہ وضو بھی نہ ہو، تیمم بھی نہ ہو پھر بھی پڑھنی ہے۔ اس نیت کے ساتھ کہ اگر بچ گیا تو دوبارہ پڑھ لوں گا۔ ہر حال میں نماز معاف نہیں ہے۔

اور یہ مسئلہ تم کئی دفعہ سن چکے ہو کہ اگر کسی عورت کے ہاں بچہ پیدا ہو رہا ہو اور ابھی سر باہر آیا ہو باقی جسم بچے کا اندر ہی ہو اس وقت بھی نماز عورت کو معاف نہیں ہے۔ فقہائے کرام رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ آگے گڑھا کھودے اور بچے کا سر گڑھے میں کر

کے نماز پڑھے۔ یا ہانڈی میں اس کا سر ڈال لے اور نماز پڑھے۔ وضو کر سکتی ہے تو فبہا ورنہ تیمم کر لے اور اس وقت عورت کو جو خون آتا ہے اس کو دَمِ استحاضہ کہتے ہیں اس میں نماز معاف نہیں اور نفاس کا خون اس وقت شروع ہوگا جب بچہ پیدا ہو جائے گا۔

عورت کی نماز

آج تو لوگوں نے نماز کو کچھ سمجھا ہی نہیں ہے۔ خاص کر وہ عورتیں جو نمازوں میں لا پروائی کرتی ہیں، ناک میں کوکے ڈالے ہوئے ہیں۔ ان سے پوچھو کہ جب وضو کرتی ہیں کوکے کو ہلا کر ناک کے سوراخ میں پانی ڈالتی ہیں۔ کیوں کہ یہ فرض ہے۔ اگر کوکے والے سوراخ میں پانی نہ ڈالا تو وضو نہیں ہوگا۔ اسی طرح کان میں کانٹا پہنتی ہیں تو غسل واجب میں کان کے سوراخ میں پانی ڈالنا ضروری ہے۔ اگر کان کے سوراخ میں پانی نہ ڈالا تو غسل نہ ہوگا۔ مگر جب ان سے پوچھا جاتا ہے غسل کرتے وقت ان میں پانی جاتا ہے یا نہیں؟ تو کہتی ہیں بابا جی! معلوم نہیں کہ جاتا ہے یا نہیں۔ تو اگر وضو میں ناک کے سوراخ میں اور غسل واجب میں کان کے سوراخ میں پانی نہ گیا وضو اور غسل نہ ہوگا اور نماز قطعاً نہ ہوگی۔

اسی طرح ناخن پالش لگی ہو تو وضو نہیں ہوتا، نماز بھی نہیں ہوتی۔ لمبے لمبے ناخن ہوں تو بھی نہ وضو نہ نماز۔ کیوں کہ ناخنوں کے نیچے میل جمع ہو جاتا ہے۔ جو اس جگہ کے دُھلنے کے لیے رکاوٹ بنتی ہے۔ اور اسی طرح یہ مسئلہ بھی سُن لیں کہ عورتوں کے بازو کہنیوں تک ننگے ہوتے ہیں۔ ایسے لباس میں عورت کی نماز نہیں ہوتی۔ کیوں کہ عورت کے بازو وکلائی تک ڈھانپنا فرض ہیں۔ اگر کلائی سے آگے ایک انگشت بھی بازو ننگا ہوا تو نماز نہیں ہوگی۔ پڑھی ہوئی نماز بھی اس کی گردن پر ہے۔ اس کا خاوند بھی گناہ گار، اس کا باپ بھی گناہ گار اور جتنے بھی بڑے ہیں سب گناہ گار۔ کیوں کہ ان کا فرض تھا اس کو سمجھانا۔ یقین جانو! ہم نے نمازوں کو سمجھا ہے اور نہ نمازوں کی شرائط کو سمجھا ہے۔ گھروں کی دیکھ بھال کرو۔ اور بہشتی زیور جیسی کتاب کو گھر میں رکھو اور نماز کے باب ان کو پڑھاؤ اور سمجھاؤ ورنہ گرفت ہوگی۔

﴿ فَاِذَآ اَمِنۡتُمۡ ﴾ پس جب تم امن میں ہو جاؤ ﴿ فَاذۡكُرُوا اللّٰهَ ﴾ پس تم اللہ تعالیٰ کا ذکر کرو ﴿ كَمَا عَلَّمَكُمۡ ﴾ جیسے تمھیں رب نے تعلیم دی ہے کہ اطمینان کے ساتھ رکوع و سجود کرو۔ تعلیم دی تمھیں ﴿ مَّا ﴾ ان چیزوں کی ﴿ لَمۡ تَكُوۡنُوۡا تَعۡلَمُوۡنَ ﴾ جن کو تم پہلے نہیں جانتے تھے۔ دعا ہے کہ رب تعالیٰ ہماری نمازوں کو صحیح معنوں میں نمازیں بنا دے اور ہمیں گھر کی نگرانی کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

﴿ وَالَّذِيۡنَ ﴾ اور وہ لوگ ﴿ يُتَوَفَّوۡنَ ﴾ جن کو وفات دی جاتی ہے ﴿ مِنۡكُمۡ ﴾ تم میں سے ﴿ وَيَذَرُوۡنَ ﴾ اور چھوڑ جاتے ہیں ﴿ اَزۡوَاجًا ﴾ بیویاں ﴿ وَّصِيَّةً ﴾ وہ وصیت کر جائیں ﴿ لِّاَزۡوَاجِهِمۡ ﴾ اپنی بیویوں کے حق میں ﴿ مَّتَاعًا ﴾ فائدہ ﴿ اِلَى الۡحَـوۡلِ ﴾ ایک سال تک ﴿ غَيۡرَ اِخۡرَاجٍ ﴾ کہ ان کو نہ نکالا جائے گھر سے ﴿ فَاِنۡ خَرَجۡنَ ﴾

پس اگر وہ نکلیں ﴿فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ﴾ تو کوئی گناہ نہیں ہے تم پر ﴿فِيْ مَا فَعَلْنَ﴾ اس کارروائی میں جو وہ کرتی ہیں ﴿فِيْ اَنْفُسِهِنَّ﴾ اپنی جانوں کے بارے میں ﴿مِنْ مَّعْرُوْفٍ﴾ اچھے طریقے سے ﴿وَاللّٰهُ﴾ اور اللہ تعالیٰ ﴿عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ﴾ غالب ہے حکمت والا ہے ﴿وَلِلْمُطَلَّقٰتِ﴾ اور ان عورتوں کے لیے جن کو طلاق دی گئی ہے ﴿مَتَاعٌ﴾ جوڑا ہے ﴿بِالْمَعْرُوْفِ﴾ اچھے طریقے کے ساتھ ﴿حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ﴾ یہ لازم ہے پرہیزگاروں پر ﴿كَذٰلِكَ﴾ اسی طرح ﴿يُبَيِّنُ اللّٰهُ﴾ بیان کرتا ہے اللہ تعالیٰ ﴿لَكُمْ﴾ تمھارے واسطے ﴿اٰيٰتِهٖ﴾ اپنی آیات ﴿لَعَلَّكُمْ﴾ تاکہ تم ﴿تَعْقِلُوْنَ﴾ سمجھو ﴿اَلَمْ تَرَ﴾ کیا تجھے علم نہیں ہے ﴿اِلَى الَّذِيْنَ﴾ ان لوگوں کا ﴿خَرَجُوْا﴾ جو نکلے ہیں ﴿مِنْ دِيَارِهِمْ﴾ اپنے گھروں سے ﴿وَهُمْ اُلُوْفٌ﴾ اور وہ ہزاروں کی تعداد میں تھے ﴿حَذَرَ الْمَوْتِ﴾ موت سے ڈرتے ہوئے ﴿فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ﴾ پس فرمایا اللہ تعالیٰ نے ان کو ﴿مُوْتُوْا﴾ مر جاؤ ﴿ثُمَّ اَحْيَاهُمْ﴾ پھر رب تعالیٰ نے ان کو زندہ کیا ﴿اِنَّ اللّٰهَ﴾ بے شک اللہ تعالیٰ ﴿لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ﴾ البتہ لوگوں پر فضل کرنے والا ہے ﴿وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ﴾ اور لیکن اکثر لوگ شکر ادا نہیں کرتے ﴿وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ اور لڑو اللہ تعالیٰ کے راستے میں ﴿وَاعْلَمُوْا﴾ اور تم جان لو ﴿اَنَّ اللّٰهَ﴾ بے شک اللہ تعالیٰ ﴿سَمِيْعٌ﴾ سننے والا ہے ﴿عَلِيْمٌ﴾ جاننے والا ہے ﴿مَنْ ذَا الَّذِيْ﴾ کون ہے وہ شخص ﴿يُقْرِضُ اللّٰهَ﴾ جو قرض دیتا ہے اللہ تعالیٰ کو ﴿قَرْضًا حَسَنًا﴾ قرض اچھا ﴿فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗ﴾ پس بڑھائے گا اللہ تعالیٰ اس کے لیے ﴿اَضْعَافًا كَثِيْرَةً﴾ کئی گنا زیادہ ﴿وَاللّٰهُ يَقْبِضُ﴾ اور اللہ تعالیٰ ہی رزق تنگ کرتا ہے ﴿وَيَبْصُۜطُ﴾ اور رزق کشادہ کرتا ہے ﴿وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ﴾ اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔

وفات کی عدت

﴿وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ﴾ اس آیت کریمہ کے بارے میں حضرات مفسرین کرام رحمہم اللہ علیہم نے دو تفسیریں بیان فرمائی ہیں۔

پہلی تفسیر یہ بیان فرماتے ہیں کہ نازل ہونے کے اعتبار سے یہ آیت پہلے ہے اور جو تم پڑھ چکے ہو کہ وفات کی عدت چار مہینے دس دن ہے وہ آیت بعد میں نازل ہوئی ہے۔ جوں جوں قرآن کریم کی آیات نازل ہوتی تھیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو حکم دیتے تھے کہ اس آیت کو فلاں آیت سے پہلے اور فلاں آیت کے بعد جوڑ دو۔ چوں کہ قرآن کریم اکٹھا نازل نہیں ہوا بلکہ تھوڑا تھوڑا نازل ہوتا رہا ہے تو پہلے عدت تھی ایک سال۔ یعنی اگر کسی عورت کا خاوند فوت ہو جاتا تھا تو شروع میں اس کی عدت ایک سال تھی۔ اس کے بعد پھر وہ آیت کریمہ نازل ہوئی جس میں حکم ہے کہ جس عورت کا خاوند فوت ہو جائے اور وہ

عورت حاملہ نہ ہوتو اس کی عدت ہے چار ماہ دس دن۔ تو اس تفسیر کی رو سے یہ آیت پہلے نازل ہوئی اور پڑھنے میں بعد میں ہے اور اب اس کا حکم منسوخ ہو چکا ہے۔

دوسری تفسیر یہ بیان فرماتے ہیں کہ یہ آیت منسوخ نہیں ہوئی البتہ اس میں الگ حکم بیان ہوا ہے۔ (اور یہ بات تم پہلے پڑھ چکے ہو کہ دورانِ عدت نکاح کا پیغام دینا حرام اور نکاح پڑھنا بھی حرام ہے، عدت چاہے طلاق کی ہو یا وفات کی ہو۔) اور اس آیت میں حکم یہ ہے کہ جو آدمی مر جائے وہ اپنے رشتہ داروں کو وصیت کر جائے کہ میری بیوی کو ایک سال تک گھر سے نہیں نکالنا۔ کیوں کہ ضروری تو نہیں کہ چار ماہ دس دن گزرنے کے فوراً بعد رشتہ مل جائے۔ اس واسطے ایک سال اس کو سوچنے سمجھنے کا موقع دو۔ ہمارے ہاں رواج کچھ اور ہے۔ اسلام اس رواج سے سختی کے ساتھ انکار کرتا ہے۔ وہ رواج یہ ہے کہ مثال کے طور پر کوئی عورت بیوہ ہو جائے کم عمری میں تو بہت کم ایسے مواقع ہیں کہ اس کا آگے رشتہ ہو جائے۔ حالانکہ اسلام یہ کہتا ہے کہ جس وقت کسی عورت کو طلاق مل جائے یا اس کا خاوند فوت ہو جائے اور عدت گزر جائے تو اس کو اس طرح گھر رہنا جائز نہیں ہے یہاں تک کہ اس کی آگے شادی ہو جائے۔ کیوں کہ انسان انسان ہے اور طرح طرح کی غلطیاں ہو سکتی ہیں۔ لہٰذا اسلام نے غلطی سے بچانے کے لیے حکم دیا ہے کہ نکاح کرلے۔ ہاں اگر کوئی عورت بہت بوڑھی ہے کہ وہ نکاح کی حد سے گزر گئی ہے تو اس کا مسئلہ جدا ہے۔

تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ﴿وَالَّذِيْنَ﴾ اور وہ مرد ﴿يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ﴾ جن کو وفات دی جاتی ہے تم میں سے ﴿وَيَذَرُوْنَ أَزْوَاجًا﴾ اور چھوڑ جاتے ہیں بیویاں ﴿وَّصِيَّةً لِّأَزْوَاجِهِمْ﴾ وہ اپنی بیویوں کے بارے میں وصیت کر جائیں ﴿مَّتَاعًا إِلَى الْحَوْلِ﴾ ان کو فائدہ پہنچایا جائے سال تک ﴿غَيْرَ إِخْرَاجٍ﴾ ایک سال تک ان کو گھر سے نہ نکالا جائے عدت ختم ہونے کے بعد ﴿فَإِنْ خَرَجْنَ﴾ پس اگر وہ اپنی مرضی سے نکل جائیں ﴿فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ﴾ پس کوئی گناہ نہیں ہے تم پر۔ یعنی عدت ختم ہونے کے بعد اگر وہ عورت کہیں اور جانا چاہتی ہے تو کوئی حرج نہیں ہے تم ان کو نہ روکو ﴿فِيْ مَا فَعَلْنَ فِيْ أَنْفُسِهِنَّ﴾ اس کارروائی کے بارے میں جو وہ عورتیں اپنی جان کے بارے میں کریں۔ یعنی اگر وہ کسی جگہ رشتے کا سلسلہ جوڑتی ہیں تو کوئی حرج نہیں ہے لیکن ﴿مِنْ مَّعْرُوْفٍ﴾ بھلائی سے قاعدے کے مطابق۔ مطلب یہ ہے کہ وہ جو تعلق جوڑیں وہ بھلائی کا ہو برائی کا نہ ہو۔ اور اگر غلط تعلق جوڑیں تو تمھیں حق ہے تم روک سکتے ہو۔ یہ اس واسطے کہ حدیث مبارک میں آتا ہے کہ جس نے تم میں سے کوئی برائی دیکھی۔ ہاتھ سے روکنے کی طاقت رکھتا ہے تو ہاتھ سے روکے اگر ہاتھ سے روکنے کی طاقت نہیں ہے تو پھر زبان سے روکے۔ اگر زبان سے روکنے کی بھی طاقت نہیں رکھتا تو پھر دل سے بُرا سمجھے۔ یہ تو عام قانون ہے اور اگر رشتہ داری ہو تو پھر بُرائی سے روکنا زیادہ اہم ہے۔

مثلاً: کسی کی بھابھی ہے یا کسی کی بہو بیٹی ہے اور وہ کسی کے ساتھ ناجائز تعلق بناتی ہے تو تمھیں حق پہنچتا ہے کہ اس کو روکو اس واسطے کہ اللہ تعالیٰ نے معروف کی قید لگائی ہے کہ عدت گزارنے کے بعد وہ کہیں اپنا تعلق جوڑنا چاہیں تو اجازت ہے کوئی گناہ نہیں ہے مگر وہ جائز، صحیح اور معقول طریقے سے ہو ﴿وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ﴾ اور اللہ تعالیٰ غالب بھی ہے حکمت والا بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ

تمھیں سزا دینے پر بھی قادر ہے اور اگر فوراً سزا نہیں دیتا تو اس واسطے کہ حکیم بھی ہے اور اس کے جتنے احکامات ہیں حکمت کے مطابق ہیں۔

﴿وَلِلْمُطَلَّقٰتِ﴾ اور ان عورتوں کے لیے جن کو طلاق دی گئی ہے ﴿مَتَاعٌ﴾ ایک جوڑا ہے ﴿بِالْمَعْرُوْفِ﴾ اچھے طریقے سے۔ پہلے یہ بات بیان ہو چکی ہے کہ جس عورت کو طلاق ملی اور اس کا مہر بھی مقرر تھا تو ایسی عورت کو ایک جوڑا دینا مستحب ہے۔ اور وہ عورت جس کا حق مہر مقرر نہیں ہوا اس کو ایک جوڑا دینا واجب ہے۔ اور کل کے درس میں یہ بھی بیان ہو چکا ہے کہ ﴿عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ﴾ وہ جوڑا امیر آدمی کے ذمے اس کی حیثیت کے مطابق ہے اور غریب آدمی کے ذمے اس کی حیثیت کے مطابق ہے ﴿حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ﴾ یہ پرہیزگاروں کے ذمے لازم ہے رب کی طرف سے ﴿كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ﴾ اسی طرح بیان کرتا ہے اللہ تعالیٰ تمھارے واسطے اپنی آیات ﴿لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ﴾ تاکہ تم مسائل سمجھ جاؤ۔

کل کے سبق میں تم نے یہ بھی پڑھا تھا ﴿فَاِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا اَوْ رُكْبَانًا﴾ پس اگر تمھیں دشمن کا خوف ہو دشمن تمھارے پیچھے دوڑا آ رہا ہے اور تم آگے آگے دوڑے جا رہے ہو، نماز کی معافی نہیں ہے، اشارے کے ساتھ نماز پڑھو۔ تو نماز اتنی اہم ہے کہ دشمن تمھارے پیچھے لگا ہوا ہے تو اس حالت میں بھی نماز معاف نہیں ہے۔ سوار ہو تب بھی، تم اشارے کے ساتھ نماز پڑھو۔

آگے اللہ تعالیٰ ایک واقعہ بیان فرماتے ہیں۔ ﴿اَلَمْ تَرَ﴾ کیا تجھے علم نہیں ہے تَرَ کے معنیٰ دل کے ساتھ جاننے کے بھی آتے ہیں۔ اس مقام پر تفاسیر میں تصریح ہے: اَلَمْ تَعْلَمْ يَا مُحَمَّدُ ﷺ بِاِعْلَامِهٖ اِيَّاكَ۔ "اے محمد ﷺ! کیا آپ نہیں جانتے جو ہم نے تجھے بتایا ہے واقعہ۔" یہاں پر آنکھوں سے دیکھنا مراد نہیں ہے دل سے جاننا مراد ہے۔ یعنی کیا ہمارے بتانے کے بعد تجھے اس کا علم نہیں ہے ﴿اِلَى الَّذِيْنَ﴾ ان لوگوں کے واقعہ کا ﴿خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ﴾ جو نکلے اپنے گھروں سے۔

اسرائیل کے قیام کا پس منظر

بنی اسرائیل مشہور خاندان تھا۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد کو کہتے ہیں۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے بارہ بیٹے عطا فرمائے تھے۔ ان بیٹوں کی آگے نسل چلی۔ ان بارہ بیٹوں میں سے ایک حضرت یوسف علیہ السلام ہیں۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک اس خاندان میں تقریباً چار ہزار پیغمبر تشریف لائے ہیں اور تین مشہور آسمانی کتابیں ان کو ملی ہیں۔ تورات حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ملی، زبور حضرت داؤد علیہ السلام کو ملی اور انجیل حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ملی ہے۔ یہ سب بنی اسرائیل کی طرف پیغمبر بنا کے بھیجے گئے۔ یہ واقعہ حضرت حزقیل علیہ السلام کا ہے۔ یہ بھی اللہ تعالیٰ کے پیغمبر تھے۔

یہاں پر یہ بات بھی سمجھ لیں کہ لبنان اور اُردن کے جس رقبے پر یہود نے قبضہ کیا ہے یہ سارا اس میں شامل تھا۔ اور ایشیائے کوچک کا کچھ حصہ جو اس وقت ترکوں کے پاس ہے۔ اسی طرح شام، کنعان وغیرہ یہ ارضِ مقدس کہلاتا تھا، یہ بڑا زرخیز علاقہ تھا۔ یہ پہلے ترکوں کے پاس تھا پانچ سو سال تک تنہا ترکوں نے سارے یورپ کو آگے لگایا ہوا تھا۔ حالانکہ اس وقت ان کی

تعداد بھی بہت کم تھی مگر ایمان قوی تھا۔ انگریزوں، فرانسیسیوں اور جرمن خبیثوں نے سوچا کہ جب تک مسلمان قوم کا ذہن نہ بگاڑا جائے اور ان کی آپس میں نفرت نہیں پھیلائی جائے گی اس وقت تک یہ ہمیں سکھ کا سانس نہیں لینے دیں گے۔ ان خبیثوں کی پالیسی سے یہ مسلمان سب علیحدہ علیحدہ اور ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔

آج حالت یہ ہے کہ اُردن، شام، لبنان کے اتنے ذہن بگاڑ دیئے گئے کہ وہ آپس میں نہیں مل سکتے، کافروں کے ساتھ مل سکتے ہیں۔ تو یہ سارا علاقہ شام کہلاتا تھا اور حضرت حزقیل علیہ السلام پیغمبر تھے۔ ان کے مقابلہ میں عمالقہ قوم تھی۔ عملیق ابن عاض ابن عاد بن شداد ابن ارم۔ یہ بڑے قد و قامت والے، لڑاکے اور سخت جان لوگ تھے۔ ان کے ساتھ لڑنے کے لیے حضرت حزقیل علیہ السلام نے فرمایا کہ تیاری کرو۔ قوم نے کہا کہ حضرت وہ بڑے زور آور لوگ ہیں ہمیں وہیں مار دیں گے۔ کئی ہزار لوگ تھے۔ قرآن پاک میں ﴿اُلُوْفٌ﴾ کے لفظ ہیں۔ تفسیروں میں چار ہزار کا ذکر بھی ہے، آٹھ ہزار کا ذکر بھی ہے، دس ہزار کا ذکر بھی ہے، بیس ہزار، چالیس ہزار، ستر ہزار تک کا ذکر ہے۔ تو جب حضرت حزقیل علیہ السلام نے ان کو جہاد کا فرمایا تو یہ گھروں سے نکل کر جنگلوں کی طرف بھاگ گئے۔ اللہ تعالیٰ نے ان پر موت مسلط فرما دی ہزاروں کی تعداد میں لوگ مر گئے اور مسلسل آٹھ دن مرے رہے۔ حضرت حزقیل علیہ السلام کی برکت سے پھر زندہ ہو گئے۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ بات سمجھائی کہ جہاد کرنے سے موت نہیں آتی اور بھاگنے سے آدمی موت سے نہیں بچ سکتا۔

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کا وقت وفات

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ شام کے ملک میں حمص نامی ایک شہر ہے وہاں ان کی قبر ہے۔ جس وقت وہ بیمار ہوئے اور ساتھی ان کی ملاقات کے لیے آئے تو وہ بہت روئے۔ ساتھی کہتے حضرت! ﴿كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ﴾ موت تو سب نے چکھنی ہے اس سے چارہ نہیں ہے آپ کیوں اتنے پریشان ہو؟ تو حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ موت سے نہیں ڈرتا اور مجھے معلوم ہے کہ موت آئے گی۔ مگر میں اپنی کمزور قسمت پر رو رہا ہوں۔ وہ یہ کہ میرے سر سے لے کر پاؤں تک کوئی عضو ایسا نہیں ہے کہ جس پر کافروں کا نیزہ، تیر، تلوار نہ لگی ہو لیکن میں شہادت کی موت سے محروم رہا ہوں ((اَمُوْتُ كَمَوْتِ الْحِمَارِ)) جس طرح گدھا اپنے کِلّے پر مرتا ہے میں اس طرح اپنی چارپائی پر مر رہا ہوں۔ تو دیکھو جس کو میدان میں موت نہیں آنی تھی اس کو سر سے پاؤں تک زخم آئے مگر موت نہیں آئی۔

بخاری شریف میں ایک روایت آتی ہے کہ مدعم نامی ایک غلام تھا، بڑا پھرتیلا، چست، چالاک، اس کی ڈیوٹی تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کجاوے پر سامان رکھنا، باندھنا، اُتارنا، خیبر کی لڑائی جب ختم ہوئی اور واپس آ رہے تھے راستے میں ایک باغ تھا وہاں پر انھوں نے پڑاؤ ڈالا۔ اچانک ان کو ایک تیر لگا اور مدعم فوت ہو گیا۔ لوگوں نے کہا ((هَنِيْئًا لَّهُ الشَّهَادَةُ)) اس کو شہادت مبارک ہو۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہرگز یہ شہید نہیں ہے ((كَلَّا وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ)) مجھے قسم ہے اس ذات کی

جس کے قبضے میں میری جان ہے۔اس نے غنیمت کے مال میں سے ایک کمبل چرایا تھا۔وہ آگ کے شعلے بن کر اس کو لپٹے گا۔

لوگوں نے کہا حضرت! غنیمت کے مال میں سے تقسیم سے پہلے ہم نے کچھ چیزیں لی ہیں۔فرمایا: ((شِرَاكٌ فِي النَّارِ أَوْ شِرَاكَيْنِ فِي النَّارِ)) اگر کسی نے ایک تسمہ جوتے کا لیا ہے تو وہ جہنم میں رہ جائے گا اور اگر کسی نے دو تسمے لیے ہیں تو وہ بھی دوزخ میں رہ جائے گا۔حالانکہ یہ وہ شخص تھا جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سواری کو اُٹھاتا، بٹھاتا، باندھتا، کجاوہ رکھتا، سامان رکھتا اور اُتارتا تھا۔اور یہاں تو کارخانے بھی غائب ہو جاتے ہیں، دکانیں غائب ہو جاتی ہیں، جائیدادیں غائب ہو جاتی ہیں اور ہم اس بات کو کچھ نہیں سمجھتے۔

یادرکھنا! حقوق العباد کا مسئلہ بہت اہم ہے۔اگر کسی نے ایک سوئی بھی کسی کی رکھ لی تو وہ بھی جنت میں جانے سے رکاوٹ بن جائے گی۔جب تک مالک کو مل نہیں جائے گی۔

بنی اسرائیل کا ایک واقعہ

تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿اَلَمْ تَرَ﴾ کیا تجھے علم نہیں ہے ﴿اِلَى الَّذِيْنَ﴾ ان لوگوں کے واقعہ کا ﴿خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ﴾ جو نکلے اپنے گھروں سے ﴿وَهُمْ اُلُوْفٌ﴾ اور وہ ہزاروں کی تعداد میں تھے۔اور نکلے ﴿حَذَرَ الْمَوْتِ﴾ موت کے ڈر سے ﴿فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوْتُوْا﴾ پس فرمایا اللہ تعالیٰ نے ان کو مر جاؤ (وہ مر گئے) ﴿ثُمَّ اَحْيَاهُمْ﴾ پھر رب تعالیٰ نے ان کو زندہ کیا ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ﴾ بے شک اللہ تعالیٰ البتہ مہربانی کرتا ہے لوگوں پر ﴿وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ﴾ اور لیکن اکثر لوگ شکر ادا نہیں کرتے۔اور فرمایا اے مجاہدو! ﴿وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ اور لڑو تم اللہ تعالیٰ کے راستے میں ﴿وَاعْلَمُوْا﴾ اور جان لو تم ﴿اَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ﴾ بے شک اللہ تعالیٰ سنتا بھی ہے اور تمام کارروائی کو جانتا بھی ہے۔

جہاد میں مال بھی خرچ کرنا پڑتا ہے کیوں کہ اسلحہ بغیر رقم کے تو نہیں ملتا، اور بعض مجاہد غریب ہوتے ہیں۔وہ سفر خرچ بھی یا نہیں کر سکتے۔اس واسطے رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿مَنْ ذَا الَّذِيْ﴾ کون ہے وہ شخص ﴿يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا﴾ جو اللہ تعالیٰ کو اچھا قرض دے یعنی جو وہ اللہ تعالیٰ کے رستے میں خرچ کرے گا۔یوں سمجھو کہ رب کو قرض دیا ہے اور قرض واپس ضرور آتا ہے لہٰذا جو خرچ کرو گے اس کا تمھیں بدلہ ضرور ملے گا ﴿فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗ اَضْعَافًا كَثِيْرَةً﴾ پس اللہ تعالیٰ اس کے لیے بڑھائے گا بڑھانا کئی گنا۔اللہ تعالیٰ کے راستے میں جو خرچ کیا جاتا ہے اس کا ادنیٰ ترین بدلہ ہے سات سو ﴿وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ﴾ اور اللہ تعالیٰ بڑھاتا ہے جس کے لیے چاہتا ہے۔

دیکھو! ایک آدمی گھر میں بیٹھا ہے اور کہتا ہے سبحان اللہ! تو اس کو دس نیکیاں ملتی ہیں۔اور ایک آدمی اللہ تعالیٰ کے راستے میں نکلا ہوا کہتا ہے سبحان اللہ! تو اس کو سات سو نیکیاں ملتی ہیں۔اسی طرح گھر سے نکلا راستے میں کوئی آدمی ملا اس نے کہا السلام علیکم! تو اس کو دس نیکیاں ملتی ہیں، وعلیکم السلام کہا تو دس نیکیاں ہیں۔لیکن اگر اللہ تعالیٰ کے راستے میں نکلا ہوا ہے اور کسی کو کہتا ہے

السلام علیکم! تو اس کو سات سونیکیاں ملتی ہیں اور کسی کو سلام کا جواب دیتا ہے وعلیکم السلام! تو ادنیٰ ترین سات سونیکیاں ہیں۔

﴿وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ﴾

یاد رکھنا! نیکی کی مدات تو بہت ہیں لیکن ہمارے اندر کمی ہے۔ رب کی رحمت بڑی وسیع ہے اور اس کے خزانوں میں کسی قسم کی کمی نہیں ہے ﴿وَاللّٰهُ يَقْبِضُ وَيَبْصُۜطُ﴾ اور اللہ تعالیٰ ہی رزق تنگ کرتا ہے اور کشادہ کرتا ہے۔ سب اسی کے اختیار میں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ اختیار کسی کو نہیں دیا نہ تو اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرنے سے مال گھٹتا ہے اور نہ ہاتھ کھینچ لینے سے مال بڑھ جائے گا ﴿وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ﴾ اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کو راضی کرلو تاکہ شرمندگی نہ ہو۔

﴿اَلَمْ تَرَ﴾ کیا آپ کو علم نہیں ہے ﴿اِلَى الْمَلَاِ﴾ اس جماعت کا ﴿مِنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ﴾ جو بنی اسرائیل میں سے تھے ﴿مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى﴾ موسیٰ علیہ السلام کے بعد ﴿اِذْ قَالُوْا﴾ جب کہا ان لوگوں نے ﴿لِنَبِيٍّ لَّهُمُ﴾ اپنے نبی کو ﴿ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا﴾ مقرر کر ہمارے واسطے کوئی جرنیل ﴿نُّقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ تاکہ لڑیں ہم اللہ تعالیٰ کے راستے میں ﴿قَالَ﴾ اللہ تعالیٰ کے نبی نے فرمایا ﴿هَلْ عَسَيْتُمْ﴾ تحقیق کے ساتھ تم سے امید ہے ﴿اِنْ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ﴾ اگر لکھ دیا جائے تم پر لڑنا ﴿اَلَّا تُقَاتِلُوْا﴾ یہ کہ تم نہیں لڑو گے ﴿قَالُوْا﴾ کہنے لگے ﴿وَمَا لَنَآ﴾ اور ہمیں کیا ہو گیا ہے ﴿اَلَّا نُقَاتِلَ﴾ یہ کہ ہم نہیں لڑیں گے ﴿فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ اللہ تعالیٰ کے راستے میں ﴿وَقَدْ اُخْرِجْنَا﴾ اور تحقیق ہم نکالے گئے ﴿مِنْ دِيَارِنَا﴾ اپنے گھروں سے ﴿وَاَبْنَآئِنَا﴾ اور اپنے بیٹوں سے ﴿فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ﴾ پس جب لکھا گیا ان پر لڑنا (جہاد) ﴿تَوَلَّوْا﴾ پھر گئے ﴿اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ﴾ مگر بہت تھوڑے ان میں سے ﴿وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ﴾ اور اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے ظالموں کو ﴿وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ﴾ اور کہا ان کو ان کے نبی نے ﴿اِنَّ اللّٰهَ﴾ بے شک اللہ تعالیٰ نے ﴿قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوْتَ﴾ تحقیق مقرر کیا ہے تمھارے واسطے طالوت کو ﴿مَلِكًا﴾ جرنیل ﴿قَالُوْٓا﴾ کہنے لگے ﴿اَنّٰى يَكُوْنُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا﴾ کس طرح ہوگا اس کے لیے اقتدار ہم پر ﴿وَنَحْنُ اَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ﴾ اور ہم زیادہ حق دار ہیں اقتدار کے اس سے ﴿وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ﴾ اور نہیں دیا گیا وہ وسعت مال سے ﴿قَالَ﴾ اللہ تعالیٰ کے نبی نے فرمایا ﴿اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىهُ﴾ بے شک اللہ تعالیٰ نے اُسے چن لیا ہے ﴿عَلَيْكُمْ﴾ تم پر ﴿وَزَادَهٗ﴾ اور اس کو زیادہ کیا ہے ﴿بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ﴾ علم کے پھیلاؤ میں ﴿وَالْجِسْمِ﴾ اور جسم میں ﴿وَاللّٰهُ يُؤْتِيْ مُلْكَهٗ﴾ اور اللہ تعالیٰ دیتا ہے اپنا ملک ﴿مَنْ يَّشَآءُ﴾ جس کو چاہتا ہے ﴿وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ﴾ اور اللہ تعالیٰ کشائش کرنے والا، جاننے والا ہے ﴿وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ﴾ اور کہا ان لوگوں کو ان کے پیغمبر نے

﴿ اِنَّ اٰيَةَ مُلۡكِهٖۤ ﴾ بے شک اس کے اقتدار کی نشانی ﴿ اَنۡ يَّاۡتِيَكُمُ التَّابُوۡتُ ﴾ یہ ہے کہ آئے گا تمھارے پاس صندوق ﴿ فِيۡهِ سَكِيۡنَةٌ ﴾ اس میں کچھ تسلی کی چیزیں ہوں گی ﴿ مِّنۡ رَّبِّكُمۡ ﴾ تمھارے رب کی طرف سے ﴿ وَبَقِيَّةٌ ﴾ اور کچھ باقی تبرکات ہوں گے ﴿ مِّمَّا تَرَكَ اٰلُ مُوۡسٰى ﴾ ان میں سے جو موسیٰ علیہ السلام کے خاندان نے چھوڑے ہیں ﴿ وَاٰلُ هٰرُوۡنَ ﴾ اور ہارون علیہ السلام کے خاندان نے چھوڑے ہیں ﴿ تَحۡمِلُهُ الۡمَلٰۤئِكَةُ ﴾ اس صندوق کو اُٹھائے ہوئے ہوں گے فرشتے ﴿ اِنَّ فِىۡ ذٰلِكَ ﴾ بے شک اس میں ﴿ لَاٰيَةً ﴾ نشانی ہوگی ﴿ لَّكُمۡ ﴾ تمھارے واسطے ﴿ اِنۡ كُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِيۡنَ ﴾ اگر ہو تم ایمان والے۔

حضرت طالوت رحمۃ اللہ علیہ کا جہاد

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد بنی اسرائیل کا خاندان مصر اور فلسطین کے درمیان بحرِ روم کے کنارے پر آباد تھا۔ وہ علاقہ خاصا زرخیز تھا اور یہ لوگ بھی محنتی تھے۔ مالی اعتبار سے ان لوگوں نے بڑا نام پیدا کیا۔ بنی اسرائیل کے مقابلے میں ایک عمالقہ قوم تھی وہ ان سے زیادہ طاقت ور تھی۔ قد کاٹھ کے اعتبار سے بھی اور مالی اعتبار سے بھی اور تعداد کے لحاظ سے بھی۔ وہ ان پر حملہ کر کے ان کو قتل بھی کرتے تھے مال بھی چھین لیتے اور ہزاروں کی تعداد میں نوجوان لڑکیوں کو بھی اُٹھا کر لے جاتے تھے۔ اس وقت پیغمبر تھے شمویل علیہ السلام اور ہمزہ کے ساتھ اِشْمویل بھی لکھتے ہیں۔ ان کی عمر مبارک خاصی تھی، بوڑھے اور کمزور تھے۔ بسا اوقات خود اُٹھ بیٹھ نہیں سکتے تھے۔ لوگوں نے کہا حضرت! یہ عمالقہ ہم پر حملہ کرتے ہیں، ہمیں گھروں سے نکال دیتے ہیں ہمارے بچے قتل کر دیتے ہیں، ہمارے بچے بچیاں اُٹھا کر لے جاتے ہیں یہ ظلم ہم کب تک برداشت کریں گے۔ آپ اللہ تعالیٰ سے جہاد کی اجازت لیں۔ کیوں کہ ان پر جہاد نہیں تھا۔ اور ہمارے لیے کوئی جرنیل منتخب کریں تا کہ ہم اس جرنیل کی سرکردگی میں عمالقہ قوم کے خلاف جہاد کریں۔

مسئلہ یہ ہے کہ پیغمبر کی موجودگی میں کسی اور کو قیادت کا حق نہیں ہوتا، مگر وہ اس بات کو سمجھتے تھے کہ حضرت شمویل علیہ السلام خاصے بوڑھے ہیں اور اس عمر میں وہ مجاہدین کی قیادت نہیں کر سکتے۔ اس واسطے انھوں نے کہا کہ رب تعالیٰ سے جہاد کی اجازت طلب کریں اور جرنیل بھی مقرر فرمائیں۔ اس کا ذکر رب تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ اَلَمۡ تَرَ ﴾ کیا آپ کو علم نہیں ہے ﴿ اِلَى الۡمَلَاِ ﴾ اس جماعت کا ﴿ مِنۡۢ بَنِىۡۤ اِسۡرَآءِيۡلَ ﴾ جو بنی اسرائیل میں سے تھی ﴿ مِنۡۢ بَعۡدِ مُوۡسٰى ﴾ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد کا زمانہ تھا ﴿ اِذۡ قَالُوۡا لِنَبِىٍّ لَّهُمُ ﴾ جس وقت ان لوگوں نے اپنے پیغمبر کو کہا ﴿ ابۡعَثۡ لَنَا مَلِكًا ﴾ مقرر کرو ہمارے واسطے کمانڈر، جرنیل ﴿ نُّقَاتِلۡ فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ ﴾ تا کہ لڑیں ہم اللہ تعالیٰ کے راستے میں اپنے دشمنوں کے ساتھ ﴿ قَالَ ﴾ حضرت شمویل علیہ السلام نے فرمایا ﴿ هَلۡ عَسَيۡتُمۡ ﴾ تحقیق کے ساتھ تم سے یہ بھی توقع ہے ﴿ اِنۡ كُتِبَ عَلَيۡكُمُ الۡقِتَالُ ﴾ اگر لکھا جائے یعنی فرض کیا جائے تم پر لڑنا یعنی جہاد کرنا ﴿ اَلَّا تُقَاتِلُوۡا ﴾ یہ کہ تم نہ لڑو۔ یعنی باتیں تو تم کرتے ہو لیکن ہو سکتا

ہے کہ تم پر جہاد فرض کیا جائے اور تم نہ لڑو۔ تو اس کے جواب میں ﴿قَالُوْا﴾ کہنے لگے ﴿وَمَا لَنَآ اَلَّا نُقَاتِلَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ﴾ اور ہمیں کیا ہو گیا ہے کہ ہم نہیں لڑیں گے اللہ تعالیٰ کے راستے میں ﴿وَقَدْ اُخْرِجْنَا مِنْ دِیَارِنَا﴾ اور تحقیق ہم اپنے گھروں سے نکالے گئے ہیں ﴿وَاَبْنَآئِنَا﴾ اور ہمارے بیٹوں سے ہمیں الگ کر دیا گیا ہے۔ یعنی کچھ مار دیئے اور کچھ بیگار لینے کے لیے ساتھ لے گئے۔

اور یہ بات تفسیروں میں ہے کہ تقریباً تیس ہزار لڑکیاں اُٹھا کر لے گئے۔ تو ہماری لڑائی کے ظاہری اسباب سارے موجود ہیں اس لیے ضرور لڑیں گے ﴿فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ﴾ پس جب ان پر لڑنا فرض کیا گیا یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے جہاد کا حکم آیا ﴿تَوَلَّوْا﴾ پھر گئے وہ جہاد سے ﴿اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ﴾ مگر بہت تھوڑے ان میں سے۔ وہ تھوڑے کتنے تھے؟ اس کا ذکر کل کے درس میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔ ﴿وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ بِالظّٰلِمِيْنَ﴾ اور اللہ تعالیٰ بہ خوبی جانتا ہے ظالموں کو۔ ﴿وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ﴾ اور اُن کو اُن کے پیغمبر اِشمویل علیہ السلام نے فرمایا کہ تمھارے لیے جہاد کی اجازت بھی ہوگئی ہے اور تمھاری خواہش کے مطابق تمھارا جرنیل بھی رب تعالیٰ نے مقرر کر دیا ہے ﴿اِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوْتَ مَلِكًا﴾ بے شک تمھارے لیے اللہ تعالیٰ نے طالوت کو جرنیل اور کمانڈر مقرر فرمایا ہے۔

یہ حضرت طالوت رحمۃ اللہ علیہ بڑے غریب خاندان کے آدمی تھے۔ مالی اعتبار سے کمزور تھے اور ان کا خاندان بھی غیر معروف تھا۔ اس لیے لوگوں نے کج بحثی شروع کی ﴿قَالُوْا﴾ کہنے لگے ﴿اَنّٰى يَكُوْنُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا﴾ اس کا اقتدار ہم پر کیسے ہوسکتا ہے؟ ﴿وَنَحْنُ اَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ﴾ اور ہم زیادہ حق دار ہیں اقتدار کے اس سے۔ کیوں کہ طالوت رحمۃ اللہ علیہ نہ تو زمانہ قریب میں پیغمبروں کی اولاد میں سے تھے کہ کسی پیغمبر کے بیٹے، پوتے، پڑپوتے ہوتے تو بھی لوگ یہ کہہ کر قبول کر لیتے کہ پیغمبر کی نسل سے ہے۔ نہ کسی بادشاہ کی نسل میں سے تھے کیوں کہ اگر کسی بادشاہ کی نسل میں سے ہوتے تو کہتے چلو بادشاہ کی نسل میں سے ہے ان کے باپ دادا بادشاہ ہوئے ہیں۔ اگر ان کی نسل میں سے کسی کو اقتدار ملتا ہے تو اچھی بات ہے۔ اور مالی طور پر بھی بڑے کمزور تھے۔ اُن کے بارے میں تفسیروں میں تین لفظ آتے ہیں۔ ایک یہ کہ كَانَ دَبَّاغًا رنگ ریز تھے۔ لوگوں کے کپڑے رنگتے تھے۔ تو عوام کی اصطلاح میں کمی ہوئے۔ اور یہ لفظ بھی آتا ہے كَانَ سَاقِيًا کہ مشک میں پانی بھر کر لوگوں کے گھروں میں پہنچاتے تھے، یعنی ماشکی تھے۔ تو دیکھو عوام کی نگاہ میں ماشکیوں کی قدر نہیں ہے۔ عوام کی بات کر رہا ہوں، رب کے ہاں کی بات نہیں کر رہا۔ اور یہ لفظ بھی آتا ہے كَانَ رَاعِيًا چرواہے تھے یعنی مزدوری پر لوگوں کی بھیڑ، بکریاں، اونٹ وغیرہ چراتے تھے۔ خلاصہ یہ کہ مزدور پیشہ تھے اور مزدور کو جو بھی مزدوری مل جائے کرتا ہے۔ کبھی کپڑے رنگ لیتے ہوں گے، کبھی لوگوں کے گھروں میں مشکوں سے پانی بھر کر مزدوری لیتے ہوں گے۔ اور یاد رکھنا! جائز قسم کی جو بھی مزدوری ہو شریعت نے اس پر کوئی پابندی نہیں لگائی۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بکریاں چرائیں

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک سفر پر تھے۔ (اور یہ جو ونٹر کے درخت کی مسواکیں ہوتی ہیں اس درخت کو جھنگ، بھکر، ملتان کی زبان میں جال کہتے ہیں اور یہ مسواک اس کی جڑ کی ہوتی ہے اور یہ درخت انہی علاقوں میں کافی ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ دانے لگتے ہیں (پھل) وہ شروع میں سرخ ہوتے ہیں پھر سیاہ ہوجاتے ہیں اور جب وہ کالے ہوجائیں تو بہت میٹھے اور لذیذ ہوتے ہیں۔) کچھ لوگ وہ پھل اُتار کے لائے سرخ دانے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم نے کالے کالے دانے کیوں نہیں چُنے ((فَاِنَّهٗ اَطْیَبُ)) اس لیے کہ جو کالے دانے ہوتے ہیں وہ بڑے لذیذ اور میٹھے ہوتے ہیں۔ کسی نے کہا حضرت یہ تجربہ تو ان کو ہوتا ہے جو اونٹ، بکریاں چراتے ہیں کیوں کہ ان کو ان درختوں کے ساتھ زیادہ واسطہ پڑتا ہے۔ تو کیا حضرت! آپ نے جانور بھی چرائے ہیں؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((كُنْتُ اَرْعٰى لِاَهْلِ مَكَّةَ عَلٰى قَرَارِيْطَ)) "میں مکے والوں کی بکریاں، بھیڑیں ٹکے ٹکے پر چراتا رہا۔" فی بکری مجھے دو پیسے ملتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُونٹ بھی چرائے ہیں۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((مَا مِنْ نَبِيٍّ اِلَّا وَقَدْ رَعَى الْغَنَمَ)) "کوئی نبی ایسا نہیں گزرا جس نے بکریاں نہ چرائی ہوں۔"

علمائے کرام بیان فرماتے ہیں کہ بکری اس وجہ سے فرمایا کہ اُونٹ بڑا جانور ہے وہ اگر مالک کی مرضی سے نہ چلے وہ اسے ڈنڈے مارے تو اس کا کچھ نہیں بگڑتا۔ اور یہ جو بھیڑ ہے جدھر ایک جائے گی سب اس کے پیچھے جائیں گی۔ اس وجہ سے بھیڑ چال کا مقولہ مشہور ہے۔ اور بکری ایک ایسا شرارتی جانور ہے کہ ایک اِدھر بھاگے گا دوسرا اُدھر بھاگے گا، تیسرا تیسری طرف بھاگے گا۔ چوں کہ وہ کمزور جانور ہوتا ہے اس لیے مارنے سے بھی نقصان ہوتا ہے، ٹانگ ٹوٹنے کا، سینگ ٹوٹنے کا۔ اللہ تعالیٰ پیغمبروں سے اس لیے پہلے بکریاں چرواتے ہیں کہ اُمتیوں کا حال بھی ایسا ہوگا کہ ایک کا منہ ایک طرف اور دوسرے کا دوسری طرف، تیسرے کا تیسری طرف، کوئی اِدھر بھاگے گا کوئی اُدھر کو بھاگے گا اور عجیب عجیب قسم کے سوالات ہوں گے۔

غیب کا علم صرف اللہ کے پاس ہے

ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما تھے اور دین کے بارے میں گفتگو ہو رہی تھی۔ ایک شخص آیا اور سوال کیا: اَيْنَ نَاقَتِي "میری اُونٹنی کہاں ہے؟" آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((لَا اَدْرِيْ اَيْنَ نَاقَتُكَ)) مجھے نہیں معلوم تیری اُونٹنی کہاں ہے؟ وہ عُرگُر کرتا ہوا باہر چلا گیا اور کہنے لگا ((يُخْبِرُنَا بِخَبَرِ السَّمَآءِ وَلَا يَدْرِيْ اَيْنَ نَاقَتِيْ)) ہمیں آسمان کی خبریں دیتا ہے اور یہ نہیں جانتا کہ میری اُونٹنی کہاں ہے؟ مطلب اس کا یہ تھا کہ ویسے ہی اس نے لوگوں کو (نعوذ باللہ) ٹھگی (دھوکا دے رکھا ہے) لگائی ہے اور کہتا ہے کہ آسمان سے وحی نازل ہوئی ہے تمھارے ساتھ یہ ہوگا، پھر یہ ہوگا اور یہ نہیں جانتا کہ میری اُونٹنی کہاں ہے۔

حضرت جبرئیل علیہ السلام وحی لے کر تشریف لائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حاضرین میں سے بعض کو فرمایا یہ آدمی جو سوال کرتا ہوا گیا ہے اس کو تلاش کر کے لاؤ (اس کا نام تھا ابن بُسیط، یہ منافق تھا) صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی تعمیل کو اپنے لیے

فخر سمجھتے تھے، فوراً گئے اور اُسے لے آئے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ((کَیْفَ قُلْتَ)) کہ تو نے کیا سوال کیا تھا؟ کہنے لگا میں نے سوال کیا تھا کہ میری اُونٹنی کہاں ہے؟ اور تم نے کہا مجھے معلوم نہیں کہ تیری اُونٹنی کہاں ہے؟ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ((وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِہٖ)) اس رب کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے مجھے کوئی علم نہیں تھا ((جَآءَنِیْ جِبْرِیْلُ فَاَخْبَرَ فِیْھَآ اٰنِفًا)) ابھی میرے پاس جبرئیل علیہ السلام آئے ہیں پس اُنھوں نے مجھے بتایا ہے کہ تیری اُونٹنی فلاں جگہ پر جھاڑیاں ہیں ان میں سے ایک ٹہنی کے ساتھ اس کے گلے کا پٹا اٹکا ہوا ہے۔ ٹہنی بھی مضبوط تھی اور پٹا بھی مضبوط تھا، یہ زور لگاتی رہی مگر نہ ٹہنی ٹوٹی اور نہ پٹا۔ (تو نے کیسا نادانی والا سوال کیا)۔

اسی طرح آنحضرت ﷺ تشریف فرما تھے۔ ایک نوجوان کہنے لگا مَا فِیْ بَطْنِ نَاقَتِیْ "میری اونٹنی کے پیٹ میں کیا ہے؟" آپ ﷺ خاموش رہے لیکن صحابہ میں سے ایک جذباتی صحابی تھے سلامہ ابن وقش رضی اللہ عنہ۔ وہ کہنے لگے آپ ﷺ سے سوال نہ کر میں تجھے بتاتا ہوں کہ تو نے اونٹنی کے ساتھ بدی کی ہے تیرا نطفہ اس میں ٹھہرا ہوا ہے۔ اب ذرا بات سمجھنا، بریلوی حضرات کہتے ہیں کہ دیکھو! یہ وہابی کہتے ہیں کہ پیغمبر پیٹ کی بات نہیں جانتے یہ تو آپ ﷺ کے صحابی جانتے ہیں۔ حالانکہ یہ کوئی جواب نہیں ہے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے سلامہ ابن وقش رضی اللہ عنہ کو ڈانٹا ((یَا سَلَامَۃَ بْنِ وَقْشٍ اَنَّ اللّٰہَ تَعَالٰی لَا یُحِبُّ التَّفَحُّشَ)) "بے شک اللہ تعالیٰ فحش گوئی کو پسند نہیں کرتا ((وَقَدْ تَفَحَّشْتَ بِرَجُلٍ)) تو نے اس آدمی کو جواب دینے میں فحش گوئی سے کام لیا ہے۔" صحابی کی یہ بات اس کا جواب نہیں تھا بلکہ تردید کرتے ہوئے طعنہ دیا۔

اس کو تم اس طرح سمجھو کہ کوئی آدمی مجھ سے سوال کرے کہ تم نے رات کو کیا کھایا؟ اور میں کہوں کہ میں نے تیرا سر کھایا ہے۔ اب یہ کوئی جواب تو نہیں ہے۔ جواب تو یہ ہے کہ میں نے جو رات کو کھایا ہے تیرا اس کے بارے میں بے موقع سوال کرنے کا مطلب کیا ہے۔ تو اس صحابی کا جواب اس رنگ میں تھا۔ اور یہ مسئلہ حق ہے کہ کوئی نہیں جانتا مَا فِی الْاَرْحَامِ کہ رحموں میں کیا ہے سوائے رب تعالیٰ کی ذات کے۔

آج کل نوجوان کہتے ہیں کہ جی الٹرا ساؤنڈ (کمپیوٹر) نکلا ہوا ہے اس کے ذریعہ پتا چل جاتا ہے کہ لڑکی ہے یا لڑکا۔ یہ کمپیوٹروں کا قصہ تو اخبارات میں پڑھتے ہوں گے کہ ایک آدمی بے چارے نے گھر فون لگوایا ہوا تھا اس کو ایک ماہ کا بل ایک لاکھ اٹھاسی ہزار آیا۔ اس نے کہا کہ کیا ہوا میں کارخانے دار بھی نہیں، دکان دار بھی نہیں، فون گھر میں لگا ہوا ہے۔ جب اس نے درخواست دی تو جواب ملا کہ یہ کمپیوٹر کی غلطی ہے۔ اصل بل اس کا ڈیڑھ سو یا دو سو نکلا۔ تو تم کمپیوٹر پر یقین کرتے ہو۔ اتنا کچا عقیدہ مسلمان کا نہیں ہونا چاہیے۔ کمپیوٹر کی بات کوئی صحیح ہوگی کوئی غلط ہوگی لیکن جو بات بذریعہ وحی ہوتی ہے وہ قطعی اور یقینی ہوتی ہے۔ تو بہرحال پیغمبروں نے بکریاں بھی چرائیں، بھیڑیں بھی اور اُونٹ بھی چرائے۔

تو بات ہو رہی تھی طالوت رحمہ اللہ کی ﴿ قَالُوْٓا ﴾ لوگوں نے کہا ﴿ اَنّٰی یَکُوْنُ لَہُ الْمُلْکُ عَلَیْنَا ﴾ ان کو ہم پر اقتدار کس طرح حاصل ہوگا؟ ﴿ وَنَحْنُ اَحَقُّ بِالْمُلْکِ مِنْہُ ﴾ اور ہم زیادہ حق دار ہیں اقتدار کے اس سے ﴿ وَلَمْ یُؤْتَ سَعَۃً مِّنَ الْمَالِ ﴾ اور اس کو

مالی وسعت بھی حاصل نہیں ہے، بے چارہ مزدور آدمی ہے۔

﴿قَالَ﴾ اللہ تعالیٰ کے پیغمبر شمویل علیہ السلام نے فرمایا ﴿اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىهُ عَلَيْكُمْ﴾ بے شک اللہ تعالیٰ نے اُسے منتخب فرمایا ہے تمھارے اُوپر ﴿وَزَادَهٗ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ﴾ اور زیادہ کیا اس کو اللہ تعالیٰ نے علم کے پھیلاؤ میں اور جسم کے پھیلاؤ میں۔ علم بھی اس وقت لوگوں میں سے اس کا زیادہ تھا اور جسم کے اعتبار سے بھی خوب پہلوان تھا۔ اور ظاہری بات ہے کہ لڑائی کے واسطے ایسا ہی آدمی چاہیے تاکہ دوسروں کو بھی معلوم ہو کہ میرے مقابلے میں کوئی کھڑا ہے۔ اور اگر ہو ہی چڑیا کے برابر تو دوسروں کی تو نظر بھی نہیں پڑتی ﴿وَاللّٰهُ يُؤْتِيْ مُلْكَهٗ مَنْ يَّشَآءُ﴾ اور اللہ تعالیٰ اپنا ملک دیتا ہے جس کو چاہتا ہے ﴿وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ﴾ اور اللہ تعالیٰ کشائش کرنے والا ہے، جاننے والا ہے۔

بنی اسرائیل کے تبرکات

﴿وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ﴾ اور فرمایا ان لوگوں کو ان کے پیغمبر شمویل علیہ السلام نے ﴿اِنَّ اٰيَةَ مُلْكِهٖ﴾ بے شک اس کے اقتدار کی نشانی بھی ہے ﴿اَنْ يَّاْتِيَكُمُ التَّابُوْتُ﴾ یہ ہے کہ آئے گا تمھارے پاس ایک صندوق ﴿فِيْهِ سَكِيْنَةٌ﴾ اس میں کچھ تسلی کی چیزیں ہوں گی ﴿مِّنْ رَّبِّكُمْ﴾ تمھارے رب کی طرف سے ﴿وَبَقِيَّةٌ﴾ اور کچھ باقی تبرکات ہوں گے ﴿مِّمَّا تَرَكَ اٰلُ مُوْسٰى وَاٰلُ هٰرُوْنَ﴾ ان میں سے جو چھوڑے ہیں موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام کے خاندان نے۔ وہ موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام کی پگڑیاں تھیں اور موسیٰ علیہ السلام کا جوتا تھا۔ اُس وقت تورات تختیوں پر لکھی ہوئی تھی۔ ایک تختی ٹوٹی ہوئی جس پر تورات کے کچھ الفاظ تھے وہ بھی تھی اور رومال تھا۔ غرضیکہ اس طرح کی کچھ چیزیں تھیں ﴿تَحْمِلُهُ الْمَلٰٓئِكَةُ﴾ اس صندوق کو فرشتے اُٹھا کر لائیں گے اور لوگوں کی موجودگی میں حضرت کے سامنے رکھیں گے۔

چنانچہ سب لوگوں نے آنکھوں سے دیکھا کہ اللہ تعالیٰ کے فرشتوں نے صندوق اُٹھایا ہوا ہے اور سب کی موجودگی میں طالوت رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے لا کے رکھ دیا۔ اب اس سے زیادہ تسلی کیا ہو سکتی تھی کہ ایک تو اللہ کے پیغمبر نے فرمایا کہ اس کو اللہ تعالیٰ نے تمھارا جرنیل مقرر فرمایا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ کے معصوم فرشتے کرامت کے طور پر صندوق اُٹھا کر لائے اور طالوت رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے رکھ دیا ﴿اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً﴾ بے شک اس میں ان کی صداقت کی نشانی ہوگی ﴿لَّكُمْ﴾ تمھارے واسطے ﴿اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ﴾ اگر ہو تم مومن۔

﴿فَلَمَّا﴾ پس جس وقت ﴿فَصَلَ طَالُوْتُ﴾ جدا ہوئے طالوت رحمۃ اللہ علیہ ﴿بِالْجُنُوْدِ﴾ لشکروں کو لے کر ﴿قَالَ﴾ فرمایا ﴿اِنَّ اللّٰهَ﴾ بے شک اللہ تعالیٰ ﴿مُبْتَلِيْكُمْ﴾ تمھارا امتحان لینے والا ہے ﴿بِنَهَرٍ﴾ ایک نہر پر ﴿فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ﴾ پس جس نے پانی پی لیا اس نہر کا ﴿فَلَيْسَ مِنِّيْ﴾ پس وہ میرے ساتھیوں میں سے نہیں ہے ﴿وَمَنْ لَّمْ

﴿يَطْعَمْهُ﴾ اور جس نے نہ چکھا اس کا پانی ﴿فَاِنَّهٗ مِنِّیْٓ﴾ پس بے شک وہ میرے ساتھ ہے ﴿اِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ﴾ مگر وہ شخص جس نے بھرا ﴿غُرْفَةًۢ﴾ ایک چلو ﴿بِيَدِهٖ﴾ صرف ایک ہاتھ سے ﴿فَشَرِبُوْا مِنْهُ﴾ پس پیا انھوں نے اس نہر کے پانی سے ﴿اِلَّا قَلِيْلًا﴾ مگر بہت تھوڑوں نے ﴿مِّنْهُمْ﴾ ان میں سے ﴿فَلَمَّا جَاوَزَهٗ﴾ پس جب پار کر گئے اس نہر کو ﴿هُوَ﴾ وہ طالوت رحمۃ اللہ علیہ ﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ﴾ اور وہ جو ایمان لائے تھے ان کے ساتھ ﴿قَالُوْا﴾ کہنے لگے ﴿لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ﴾ نہیں طاقت ہمارے لیے آج کے دن ﴿بِجَالُوْتَ﴾ جالوت کے مقابلہ میں ﴿وَجُنُوْدِهٖ﴾ اور اس کے لشکروں کے مقابلہ میں ﴿قَالَ الَّذِيْنَ﴾ کہا ان لوگوں نے ﴿يَظُنُّوْنَ﴾ جو یقین رکھتے تھے ﴿اَنَّهُمْ مُّلٰقُوا اللّٰهِ﴾ بے شک وہ اللہ تعالیٰ سے ملنے والے ہیں ﴿كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ﴾ کتنی ہی چھوٹی جماعتیں ﴿غَلَبَتْ﴾ غالب آجاتی ہیں ﴿فِئَةً كَثِيْرَةًۢ﴾ بہت ساری جماعتوں پر ﴿بِاِذْنِ اللّٰهِ﴾ اللہ تعالیٰ کے حکم کے ساتھ ﴿وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ﴾ اور اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے ﴿وَلَمَّا بَرَزُوْا﴾ اور جس وقت سامنے ہوئے ﴿لِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ﴾ جالوت اور اس کے لشکروں کے ﴿قَالُوْا﴾ کہا مومنوں نے ﴿رَبَّنَآ﴾ اے ہمارے پروردگار ﴿اَفْرِغْ عَلَيْنَا﴾ ڈال ہم پر ﴿صَبْرًا﴾ صبر ﴿وَّثَبِّتْ اَقْدَامَنَا﴾ اور ثابت رکھ ہمارے قدموں کو ﴿وَانْصُرْنَا﴾ اور ہماری مدد کر ﴿عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ﴾ کافر قوم کے مقابلہ میں ﴿فَهَزَمُوْهُمْ﴾ پس ان مومنوں نے شکست دی ان کافروں کو ﴿بِاِذْنِ اللّٰهِ﴾ اللہ تعالیٰ کے حکم سے ﴿وَقَتَلَ دَاوٗدُ﴾ اور قتل کیا داوٗد علیہ السلام نے ﴿جَالُوْتَ﴾ جالوت کو ﴿وَاٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ﴾ اور دیا اللہ تعالیٰ نے حضرت داوٗد علیہ السلام کو ملک ﴿وَالْحِكْمَةَ﴾ اور دانائی ﴿وَعَلَّمَهٗ﴾ اور اللہ تعالیٰ نے تعلیم دی ان کو ﴿مِمَّا يَشَآءُ﴾ ان چیزوں کی جو رب نے چاہا ﴿وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ﴾ اور اگر نہ ہوتا اللہ تعالیٰ کا ٹالنا لوگوں کو ﴿بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ﴾ بعض کو بعض کے ذریعے ﴿لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ﴾ تو البتہ خراب ہو جاتی زمین ﴿وَلٰكِنَّ اللّٰهَ﴾ اور لیکن اللہ تعالیٰ ﴿ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ﴾ مہربانی کرنے والا ہے جہان والوں پر ﴿تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ﴾ یہ اللہ تعالیٰ کی آیتیں ہیں ﴿نَتْلُوْهَا﴾ ہم تلاوت کرتے ہیں ﴿عَلَيْكَ﴾ تجھ پر ﴿بِالْحَقِّ﴾ حق کے ساتھ ﴿وَاِنَّكَ﴾ اور بے شک آپ صلی اللہ علیہ وسلم ﴿لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ﴾ اللہ تعالیٰ کے رسولوں میں سے ہیں۔

یہ بات پہلے گزر چکی ہے کہ حضرت اشمویل علیہ السلام پیغمبر تھے اور قوم نے عمالقہ قوم کی کارستانیوں سے تنگ آ کر ان سے درخواست کی کہ وہ اللہ تعالیٰ سے جہاد کی اجازت لیں اور ہمارے اوپر کوئی جرنیل بھی مقرر کریں کیوں کہ وہ خود خاصے بوڑھے اور

کمزور تھے۔ تفصیلاً بات کل کے سبق میں گزر چکی ہے کہ ان کو جہاد کی اجازت بھی مل گئی اور حضرت طالوت رحمۃ اللہ علیہ کو جرنیل مقرر کر دیا گیا۔ اور ان لوگوں نے خاصی قیل وقال کے بعد ان کو جرنیل تسلیم کر لیا تو حضرت طالوت رحمۃ اللہ علیہ نے اعلان فرمایا کہ جو تم میں سے جوان ہیں وہ تیاری کر لیں، کوئی بوڑھا، بچہ اور بیمار ہمارے ساتھ نہیں جائے گا۔ ان شاء اللہ ہم کل یا پرسوں یہاں سے چلیں گے یا جو بھی انھوں نے وقت دیا۔ عمالقہ قوم بیت المقدس میں آباد تھی اور بیت المقدس کا شہر صیہون نامی پہاڑ کے اوپر ہے۔ بڑا پرانا شہر ہے۔ مسجد اقصیٰ بھی اسی شہر میں ہے اور اس وقت اس پر یہود کا قبضہ ہے۔ جب چاہیں مسلمانوں کو جمعہ کی نماز ادا کرنے دیتے ہیں اور جب چاہیں روک دیتے ہیں اور بے غیرت مسلمان آج تک ان سے وہ قبلہ واگزار نہیں کرا سکے۔ حالانکہ مسلمان کروڑوں کی تعداد میں ہیں بلکہ ایک ارب سے زائد ہیں مگر ہیں بے غیرت۔ اللہ تعالیٰ مسلمان کو غیرت عطا فرمائے۔

مجاہدین کی آزمائش

﴿فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوْتُ﴾ پس جب جدا ہوئے یعنی روانہ ہوئے حضرت طالوت رحمۃ اللہ علیہ بیت المقدس کی طرف ﴿بِالْجُنُوْدِ﴾ اپنے لشکروں کو لے کر۔ اس مقام پر تفسیروں میں لکھا ہوا ہے کہ ستر ہزار نوجوان ان کے ساتھ چل پڑے۔ طالوت رحمۃ اللہ علیہ بڑے سمجھدار آدمی تھے۔ انھوں نے دیکھا کہ یہ تو اس طرح جا رہے ہیں کہ جس طرح انھوں نے کوئی میلہ دیکھنا ہے حالانکہ عمالقہ قوم جس کے ساتھ مقابلہ ہے وہ بڑی جنگجو ہے اور بڑی طاقت ور ہے۔ سارے تو لڑنے والے نہیں یہ تو تماشائی ہیں۔ لہٰذا ان کا امتحان لینا چاہیے اور جو امتحان میں کامیاب ہوں وہ جائیں اور جو ناکام ہوں وہ ہمارے ساتھ نہ جائیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کے پیغمبر حضرت اشمویل کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے حضرت طالوت رحمۃ اللہ علیہ کو ان کے امتحان کا طریقہ بتایا۔

﴿قَالَ﴾ کہا طالوت رحمۃ اللہ علیہ نے ﴿اِنَّ اللّٰهَ﴾ بے شک اللہ تعالیٰ ﴿مُبْتَلِيْكُمْ بِنَهَرٍ﴾ تمھارا امتحان لینے والا ہے ایک نہر سے۔ یہ نہر اُردن اور فلسطین کے درمیان تھی اور اب بھی ہے۔ اس کا پانی صاف ستھرا اور ٹھنڈا تھا اور گرمی کا موسم تھا ان لوگوں کو پیاس بھی بڑی لگی ہوئی تھی۔ تو جب اس نہر کے پاس پہنچے حضرت طالوت رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ﴿فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ﴾ پس جس نے اس نہر سے پانی پی لیا کافی مقدار میں ﴿فَلَيْسَ مِنِّيْ﴾ پس وہ میرے پیروکاروں میں سے نہیں ہے ﴿وَمَنْ لَّمْ يَطْعَمْهُ﴾ اور وہ جس نے نہ چکھا اس کا پانی ﴿فَاِنَّهٗ مِنِّيْٓ﴾ پس بے شک وہ میرے پیروکاروں میں سے ہے ﴿اِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ﴾ مگر جس نے لیا پانی کا ﴿غُرْفَةً﴾ چلّو ﴿بِيَدِهٖ﴾ اپنے ایک ہاتھ سے دونوں ہاتھوں سے نہیں۔ یعنی تمھیں صرف ایک چلّو پانی پینے کی اجازت ہے۔ اب اندازہ لگاؤ کہ سخت پیاس لگی ہو اور پانی بڑا صاف ستھرا اور ٹھنڈا ہو تو انسان کیا کرتا ہے؟ بس یہی ہوا کہ وہ دیوانوں کی طرح پانی پر ٹوٹ پڑے اور پی پی کر پیٹ ان کے مشکیں بن گئیں۔ صرف تین سو تیرہ آدمی ایسے تھے جنھوں نے صرف ایک چلّو پانی پیا۔ اللہ تعالیٰ کی شان اور قدرت کہ ایک چلّو سے ان کی پیاس بجھ گئی اور وہ مطمئن ہو گئے اور جو بھیڑیں تھیں ان سب کو چھٹی مل گئی کہ چلے جاؤ۔ حضرت طالوت رحمۃ اللہ علیہ سمیت تین سو تیرہ رہ گئے۔ تو فرمایا ﴿فَشَرِبُوْا مِنْهُ﴾ پس پیا انھوں نے پانی اس نہر سے

﴿اِلَّا قَلِیۡلًا مِّنۡهُمۡ﴾ مگر تھوڑے آدمیوں نے ان میں سے یعنی تین سو تیرہ آدمی امتحان میں کامیاب ہوئے۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ﴿فَلَمَّا جَاوَزَهٗ هُوَ﴾ پس جب عبور کیا طالوت رحمۃ اللہ علیہ نے اس نہر کو ﴿وَالَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا مَعَهٗ﴾ اور ان کے مومن ساتھیوں نے بھی۔ جب آگے دیکھا تو جالوت کا بڑا لشکر تھا۔ یہ عمالقہ قوم کا بڑا جرنیل تھا اور تفسیروں میں لکھا ہے مِائَۃُ اَلْفٍ کہ اس کے ساتھ ایک لاکھ کا لشکر تھا۔ اب ایک طرف تین سو تیرہ ہیں اور دوسری طرف ایک لاکھ ہیں اور ہیں بھی جنگجو اور کڑیل جوان۔ یہ جو تین سو تیرہ تھے ان کے دو گروہ بن گئے۔ ایک گروہ ان لوگوں کا تھا جو تھے تو کامل الایمان مگر ان کی نگاہ ظاہری اسباب پر بھی تھی۔ ہم تین سو تیرہ اور مقابلے میں ایک لاکھ کی فوج ہے۔

﴿قَالُوۡا﴾ تو کہنے لگے ﴿لَا طَاقَةَ لَنَا الۡيَوۡمَ بِجَالُوۡتَ وَجُنُوۡدِهٖ﴾ نہیں ہے طاقت آج کے دن ہمارے لیے جالوت اور اس کے لشکروں کے مقابلہ کی۔ اور ان میں ایک گروہ وہ تھا جو اکمل الایمان تھے کہ انھوں نے ظاہری اسباب پر توجہ ہی نہیں کی بلکہ نگاہ صرف رب پر رکھی ﴿قَالَ الَّذِيۡنَ يَظُنُّوۡنَ﴾ کہا ان لوگوں نے جو یقین رکھتے تھے ﴿اَنَّهُمۡ مُّلٰقُوا اللّٰهِ﴾ کہ بے شک وہ مرنے کے بعد رب کو ملنے والے ہیں یعنی جو رب پر پورا یقین رکھتے تھے ﴿كَمۡ مِّنۡ فِئَةٍ قَلِيۡلَةٍ غَلَبَتۡ فِئَةً كَثِيۡرَةًۢ بِاِذۡنِ اللّٰهِ﴾ کہ بہت دفعہ ایسا ہوا ہے کہ چھوٹی جماعتیں بڑی جماعتوں پر غالب آئی ہیں رب کے حکم کے ساتھ ﴿وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيۡنَ﴾ اور اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ اور واقعی ایسا ہی ہوا۔ چنانچہ آگے آ رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان تین سو تیرہ کو ایک لاکھ پر غلبہ عطا فرمایا۔

فتح کا مدار قلت و کثرت نہیں

اسی طرح بدر کے مقام پر تین سو تیرہ تھے، مقابلے میں ایک ہزار کافر تھے۔ اور ان تین سو تیرہ کے پاس چھ زرہیں، آٹھ تلواریں، دو گھوڑے اور ستر اُونٹ تھے۔ تو اللہ تعالیٰ نے تین سو تیرہ کو اس بے سروسامانی کے عالم میں فتح عطا فرمائی۔ اس کا ذکر ہے فرمایا: اے ایمان والو! ﴿وَلَقَدۡ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدۡرٍ وَّاَنۡتُمۡ اَذِلَّةٌ﴾ [آل عمران: ۱۲۳] "اور البتہ تحقیق مدد فرمائی تمھاری اللہ تعالیٰ نے بدر کے مقام پر حالانکہ تم کمزور تھے۔" ستر کافر مارے گئے اور ستر گرفتار ہوئے اور باقیوں کو بھاگتے ہوئے راستہ نہ ملا۔ اور مسلمان صرف چودہ شہید ہوئے۔ آٹھ انصار میں سے اور چھ مہاجرین میں سے۔ اللہ تعالیٰ نے غلبہ عطا فرمایا۔

اسی طرح موتہ کے مقام پر حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی قیادت میں اللہ تعالیٰ نے تین ہزار کو ایک لاکھ پر فتح عطا فرمائی اور قادسیہ کے مقام پر حضرت ابوعبیدہ ابن جراح رضی اللہ عنہ چیف کمانڈر تھے۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے اپنے کمانڈر سے اجازت طلب کی کہ یہ ساٹھ ہزار آدمی دندناتے پھر رہے ہیں آپ مجھے اجازت دیں میں ان کا ساٹھ آدمیوں کے ساتھ مقابلہ کرنا چاہتا ہوں۔ وہ متفکر ہوئے کہ نوجوان آدمی ہے اور جذبات میں ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ مجاہدین جو ہمارے پاس رب کی امانت ہیں ضائع نہ ہو جائیں لیکن ان کا جذبہ دیکھ کر حضرت ابوعبیدہ ابن جراح رضی اللہ عنہ نے اجازت دے دی۔ تاریخ بتاتی ہے: غَزَا بِسِتُّوْنَ

هُمْ سِتُّوْنَ اَلْفًا وَ مَعَ هٰذَا تَوَلَّوْا مُدْبِرِيْنَ کہ ساٹھ آدمیوں نے ساٹھ ہزار کا مقابلہ کیا اور ان کو شکست دی۔ فتح کے بعد جب دیکھا گیا تو ساٹھ ہزار میں سے دس ہزار کی لاشیں میدان میں پڑی تھیں اور ساٹھ میں سے صرف دس آدمی شہید ہوئے اور پچاس فاتح ہوئے۔

حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خط لکھا کہ مصر کا باقی سارا علاقہ فتح ہو گیا ہے لیکن قلعہ بولس فتح نہیں ہو رہا۔ مقوقس مصر کا بادشاہ اور بڑے بڑے جرنیل اور ماہرِ جنگ اس قلعہ میں ہیں اور ان کی فوج ہے اور میرے پاس صرف آٹھ ہزار فوج ہے اور قلعے کا محاصرہ کیے ہوئے دو ماہ گزر گئے ہیں لیکن فتح نہیں ہو رہا لہٰذا ہمارے لیے دعا بھی کریں اور مزید فوج بھی بھیجیں اور طریقہ بھی سمجھائیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خط پڑھا تو رو پڑے۔ لوگوں نے دریافت کیا کہ حضرت! خط کس محاذ سے آیا ہے؟ فرمایا مصر سے۔ ساتھیوں نے سمجھا کہ مصر میں سارے مجاہد شہید ہو گئے ہیں تبھی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ رو رہے ہیں۔ لیکن تحقیق کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس لیے روئے کہ آٹھ ہزار مسلمان فوجی ہیں اور محاصرہ کیے ہوئے ہیں، دو ماہ کا عرصہ گزر گیا ہے۔ آخر کیا وجہ ہے فتح کیوں نہیں ہو رہا؟ فرمایا میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ قَدْ تَرَكُوْا سُنَّةً مِّنْ سُنَنِ النَّبِيِّ ﷺ "تحقیق چھوڑ دی انھوں نے کوئی سنت حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنتوں میں سے۔" تو دیکھیے کتنے نباض تھے۔ فرمایا ہم دعا بھی کرتے ہیں اور چار ہزار مزید فوج بھی بھیجتے ہیں۔ آٹھ ہزار تو پہلے ہے اور چار ہزار یہ گویا اب تم بارہ ہزار ہو جاؤ گے اور میں نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا ہے کہ بارہ ہزار مومن ہوں تو وہ قلت کی وجہ سے شکست نہیں کھائیں گے بشرطیکہ کوئی اور وجہ نہ ہو۔ اور فرمایا کہ اس بات پر غور کرو کہ تم سے کون سی سنت رہ گئی ہے۔ معلوم ہوا کہ بعض ساتھیوں سے مسواک کی سنت رہ گئی ہے جس کی وجہ سے فتح میں رکاوٹ ہو گئی۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جو مزید چار ہزار فوج روانہ فرمائی ان کے نام تم بھی سن لو۔ اور یاد رکھنا! وہ صرف چار آدمی تھے۔ عبادہ بن صامت خزرجی، زبیر بن عوام، مقداد بن اسود اور خارجہ بن خزافہ رضی اللہ عنہم۔

فرمایا یہ چار ہزار ہیں۔ تو یاد رکھنا! مسلمان جب مسلمان ہوتا تھا تو ایک نہیں ہزار ہوتا تھا مگر آج کے مسلمان نے اپنے اسلام کے تقاضے چھوڑ دیئے ہیں اس لیے دنیا میں ذلیل ہو کر رہ گیا ہے۔ جب مسلمان صحیح معنیٰ میں مسلمان تھا اللہ تعالیٰ کی مدد شاملِ حال ہوتی تھی۔

اسی طرح حدیقۃ الموت کا واقعہ مشہور ہے۔ وہاں بھی کمانڈر حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ تھے مسیلمہ کذاب کے مقابلہ میں۔ وہاں حضرت ابو دجانہ رضی اللہ عنہ نے تن تنہا چالیس ہزار کا مقابلہ کیا۔ اگرچہ وہ شہید ہو گئے مگر قلعہ فتح ہو گیا۔ دور جانے کی ضرورت نہیں یہ ہمارے سامنے کی بات ہے۔ چونڈہ ضلع سیالکوٹ یہ دنیا میں ٹینکوں کی لڑائی کا دوسرا مقام ہے، پہلا مقام تھا عالمین، یہ غالباً جرمنی میں ہے۔ تو گویا ٹینکوں کی لڑائی کا دوسرا مقام چونڈہ ہے۔ اس محاذ پر کیپٹن ایس۔ اے زبیری تھا اور اس کے پاس ایک

سو(۱۰۰) جوان (سپاہی) تھے۔کیپٹن زبیری بڑا پکا مسلمان تھا۔اس کے پاس چھوٹے چھوٹے تین ٹینک تھے اور مقابلے میں تین ہزار سے زیادہ ٹینک تھے۔ اُس نے اپنے مرکز سے رابطہ کیا کہ میرے پاس صرف تین ٹینک اور ایک سو جوان ہیں اور مقابلے میں تین ہزار سے زائد ٹینک ہیں اور ہزاروں کی تعداد میں فوج ہے۔ لہٰذا میرے لیے کیا حکم ہے؟ مرکز نے کہا کہ اپنے جوانوں کو نہ مرواؤ واپس آجا۔کیپٹن زبیری نے کہا کہ میں نے قرآن پاک میں پڑھا ہے ﴿ كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةًۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ ﴾۔

پس تم چوبیس گھنٹے کی اجازت دے دو۔ چنانچہ سو آدمیوں نے چھ ہزار کا مقابلہ کیا۔ تین ٹینکوں سے ہندوؤں کے تین ہزار ٹینکوں کے پرخچے اُڑا دیئے اور غالب آئے۔ تو قلت اور کثرت کی کوئی حیثیت نہیں۔ اصل چیز ایمان ہے۔ یہی وجہ ہے ہندو نوے کروڑ عوام اور ہم چودہ کروڑ مگر وہ ڈرتے ہیں۔ اگر یہ ہمارے شرابی حکمران اللہ سے ڈریں اور اللہ ان کو ہدایت دے۔ اگر یہ انسان بن جائیں تو کوئی بات ہی نہیں، یوں ہوگا جیسے بھیڑوں پر بھیڑیا حملہ کرتا ہے۔

تو جب طالوت رحمۃ اللہ علیہ اپنا تین سو تیرہ کا لشکر لے کر جالوت کے مقابلہ میں آگئے اس کا ذکر ﴿ ہے وَلَمَّا بَرَزُوْا لِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ ﴾ جس بنی اسرائیل جالوت کے لشکر کے سامنے ہوئے، جالوت کا لشکر دیکھا وہ کثیر تعداد یعنی ایک لاکھ آدمی، تو اس وقت اللہ کے حضور گڑگڑا کر دعا کی، یعنی دعا کے لیے ہاتھ اُٹھائے ﴿ قَالُوْا ﴾ اور کہا ﴿ رَبَّنَآ ﴾ اے ہمارے رب ﴿ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا ﴾ ہم پر صبر ڈال دے ﴿ وَّثَبِّتْ اَقْدَامَنَا ﴾ اور ہمیں ثابت قدم رکھ ﴿ وَانْصُرْنَا ﴾ اور ہماری مدد فرما ﴿ عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴾ کافر قوم کے مقابلے میں۔

حضرت داؤد علیہ السلام اور جالوت کا مقابلہ

ادھر جالوت نے دیکھا کہ مقابلے میں معمولی سا لشکر ہے تو کہنے لگا میری ساری فوج کو لڑنے کی ضرورت نہیں۔ اس لشکر کے لیے تو میں اکیلا ہی کافی ہوں۔ اس زمانے میں جنگ کا طریقہ یہ ہوتا تھا کہ پہلے دونوں طرف سے ایک ایک آدمی لڑتا پھر گھمسان کی جنگ شروع ہوجاتی۔ تو جالوت خود میدان میں آیا اور مبارزت کی دعوت دی۔

حضرت طالوت رحمۃ اللہ علیہ کے لشکر میں حضرت داؤد علیہ السلام کے والد ایساع بن عوبد بھی شامل تھے۔ ان کے چھ بیٹے تھے۔ پانچ تو جنگ میں شریک تھے اور حضرت داؤد علیہ السلام کم سنی کی وجہ سے شریک نہیں تھے بلکہ اپنے بھائیوں کو سامان پہنچانے کے لیے وہاں پہنچے تھے۔ لشکر اسلام میں اللہ تعالیٰ کے پیغمبر حضرت اشمویل علیہ السلام بھی موجود تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو حکم دیا کہ جالوت کے مقابلے میں داؤد (علیہ السلام) کو نکالو۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کے پیغمبر نے حضرت داؤد علیہ السلام کے باپ کو بمع چھ بیٹوں کے طلب کیا اور فرمایا: داؤد جالوت کا مقابلہ کریں گے۔ اُنھوں نے اثبات میں جواب دیا۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ کے نبی نے حضرت داؤد علیہ السلام کو جالوت کے مقابلے میں نکالا۔ تو حضرت داؤد علیہ السلام جب آرہے

تھے راستے میں تین پتھر پڑے تھے وہ بولے کہ ہمیں اُٹھا لو ہم جالوت کو قتل کریں گے۔ تو وہی پتھر فلاخن پر رکھ کر مارے۔ جالوت کا صرف ماتھا کھلا تھا اور باقی تمام جسم لوہے میں بند تھا۔ تینوں پتھر ماتھے پر لگے اور پیچھے سے نکل گئے۔ جب یہ ہلاک ہوا تو اس کا لشکر بھاگا اور مسلمانوں کو فتح ہوئی۔ اس کا ذکر ہے:

﴿فَهَزَمُوْهُمْ بِاِذْنِ اللّٰهِ﴾ پس اہل ایمان نے ان کافروں کو شکست دی اللہ تعالیٰ کے حکم سے ﴿وَقَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوْتَ﴾ اور قتل کیا حضرت داوٗد علیہ السلام نے جالوت کو ﴿وَاٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ﴾ اور اللہ تعالیٰ نے داوٗد علیہ السلام کو سلطنت اور حکمت دی ﴿وَعَلَّمَهٗ مِمَّا يَشَآءُ﴾ اور ان کو سکھایا جو چاہا۔ آیت کے اگلے حصے میں اللہ تعالیٰ نے جہاد کا فلسفہ بیان فرمایا ہے:

﴿وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ﴾ اگر اللہ تعالیٰ بعض لوگوں کو بعض دوسروں کے ذریعے نہ ہٹاتے ﴿لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ﴾ البتہ زمین خراب ہو جاتی۔ یعنی جب کسی گروہ نے زمین پر بدامنی پھیلانے کی کوشش کی تو اللہ تعالیٰ نے اس کے مقابلے میں دوسری جماعت کو بھیج کر مفسدین کا خاتمہ کر دیا ﴿وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ﴾ اور لیکن اللہ تعالیٰ مہربانی کرنے والا ہے جہان والوں پر۔ یعنی جب وہ کسی ظالم کی بیخ کنی کرتا ہے تو یہ صحیح معنوں میں دنیا والوں پر اس کا فضل ہوتا ہے۔

آگے فرمایا: ﴿تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ﴾ یہ اللہ تعالیٰ کی آیتیں ہیں ہم تلاوت کرتے ہیں آپ پر حق کے ساتھ۔ یہ تمام واقعات بنی اسرائیل کے اور وہ قصہ بنی اسرائیل کا جو اُوپر گزرا یعنی ہزاروں کا نکلنا اور دفعتاً مرنا اور زندہ ہونا اور طالوت کا بادشاہ ہونا، یہ سب اللہ تعالیٰ کی آیتیں ہیں جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سنائی جاتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ وحی کے ذریعے آپ کو بتاتے ہیں وگرنہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کوئی تاریخ نہیں پڑھی اور نہ کسی تاریخ میں ایسے واقعات موجود ہیں۔ جو اس بات کی دلیل ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں۔ تو فرمایا: ﴿وَاِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ﴾ اور بے شک آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ تعالیٰ کے رسولوں میں سے ہیں۔ بلکہ خاتم النبیین ہیں اور نبوت کا سلسلہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ختم ہو گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ سمجھ کی توفیق عطا فرمائے۔

﴿تِلْكَ الرُّسُلُ﴾ یہ پیغمبر ہیں ﴿فَضَّلْنَا﴾ ہم نے فضیلت دی ﴿بَعْضَهُمْ﴾ ان میں سے بعض کو ﴿عَلٰى بَعْضٍ﴾ بعض پر ﴿مِنْهُمْ﴾ ان میں سے بعض وہ ہیں ﴿مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ﴾ جن سے اللہ تعالیٰ نے کلام کیا ﴿وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ﴾ اور بلند کیے رب تعالیٰ نے ان میں سے بعض کے درجات ﴿وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ﴾ اور دیے ہم نے عیسیٰ ابن مریم علیہما السلام کو ﴿الْبَيِّنٰتِ﴾ واضح نشانات ﴿وَاَيَّدْنٰهُ﴾ اور ہم نے تائید کی اُن کی ﴿بِرُوْحِ الْقُدُسِ﴾ پاکیزہ روح کے ساتھ ﴿وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ﴾ اور اگر اللہ تعالیٰ چاہتا ﴿مَا اقْتَتَلَ الَّذِيْنَ﴾ نہ لڑتے وہ لوگ ﴿مِنْ بَعْدِهِمْ﴾ جو ان کے بعد ہوئے ﴿مِّنْ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ﴾ بعد اس کے کہ ان کے پاس واضح دلیلیں پہنچ چکیں ﴿وَلٰكِنِ اخْتَلَفُوْا﴾ اور لیکن اُنھوں نے اختلاف کیا ﴿فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ﴾ پس بعضے ان میں سے وہ تھے جو ایمان لائے ﴿وَمِنْهُمْ مَّنْ كَفَرَ﴾ اور کچھ ان میں سے وہ تھے جنھوں نے کفر اختیار کیا ﴿وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ﴾ اور اگر اللہ تعالیٰ چاہتا ﴿مَا اقْتَتَلُوْا﴾ وہ نہ لڑ سکتے ﴿وَلٰكِنَّ اللّٰهَ﴾ اور لیکن اللہ تعالیٰ ﴿يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ﴾ کرتا ہے جو چاہتا ہے ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا﴾ اے وہ لوگو! جو ایمان لائے ہو ﴿اَنْفِقُوْا﴾ خرچ کرو ﴿مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ﴾ اس چیز میں سے جو ہم نے تمھیں رزق دیا ہے ﴿مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ﴾ پہلے اس سے کہ آئے وہ دن ﴿لَّا بَيْعٌ فِيْهِ﴾ جس میں خرید وفروخت نہیں ہوگی ﴿وَلَا خُلَّةٌ﴾ اور نہ دوستی ﴿وَّلَا شَفَاعَةٌ﴾ اور نہ سفارش ﴿وَالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ﴾ اور جو کافر ہیں وہی ظالم ہیں ﴿اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ﴾ اور اللہ تعالیٰ ہی معبودِ برحق ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں ﴿اَلْحَيُّ﴾ زندہ رہنے والا ہے ﴿الْقَيُّوْمُ﴾ قائم رکھنے والا ہے ﴿لَا تَاْخُذُهٗ﴾ نہیں پکڑتی اس کو ﴿سِنَةٌ﴾ اُونگھ ﴿وَّلَا نَوْمٌ﴾ اور نہ نیند ﴿لَهٗ﴾ اسی کا ہے ﴿مَا فِي السَّمٰوٰتِ﴾ جو کچھ ہے آسمانوں میں ﴿وَمَا فِي الْاَرْضِ﴾ اور جو کچھ زمین میں ہے ﴿مَنْ ذَا الَّذِيْ﴾ کون ہے وہ ذات ﴿يَشْفَعُ﴾ جو سفارش کرے ﴿عِنْدَهٗٓ﴾ اس کے ہاں ﴿اِلَّا بِاِذْنِهٖ﴾ مگر اس کی اجازت سے ﴿يَعْلَمُ﴾ جانتا ہے ﴿مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ﴾ جو ان کے آگے ہے ﴿وَمَا خَلْفَهُمْ﴾ اور جو ان کے پیچھے ہے ﴿وَلَا يُحِيْطُوْنَ﴾ اور نہیں احاطہ کر سکتے ﴿بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ﴾ اللہ تعالیٰ کے علم میں سے کسی چیز کا ﴿اِلَّا بِمَا شَآءَ﴾ مگر وہ جو رب چاہے ﴿وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ﴾ وسیع ہے کرسی اس کی آسمانوں ﴿وَالْاَرْضَ﴾ اور زمین پر ﴿وَلَا يَئُوْدُهٗ حِفْظُهُمَا﴾ اور نہیں تھکاتا رب تعالیٰ کو آسمانوں اور زمینوں کا حفاظت کرنا ﴿وَهُوَ الْعَلِيُّ﴾ اور وہ بلند ذات ہے ﴿الْعَظِيْمُ﴾ بڑی عظمت والا ہے۔

رسولوں کے درجات

اس سے پہلی آیت کے آخر میں یہ الفاظ تھے ﴿ وَ اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴾ "اور اے نبی کریم ﷺ! بے شک تو پیغمبروں میں سے ہے۔" تو مرسلین کا لفظ تھا اور اب اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿ تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ﴾ یہ جن رسولوں کا ذکر ہم نے کیا ہے ان رسولوں میں سے بعض کو ہم نے بعض پر فضیلت دی ہے۔ جتنے پیغمبر دنیا میں تشریف لائے ہیں سب برحق ہیں ہمیں تمام کی تعداد قطعی طور پر معلوم نہیں ہے۔ ہاں! پچیس پیغمبروں کے نام قرآن مجید میں آئے ہیں۔ باقی حضرات انبیاء کے نام نہیں ہیں۔ اُن کا ذکر الرُّسُلُ، الْمُرْسَلِيْنَ، مِنَ النَّبِيّٖنَ، اَنْۢبِيَآءَ کے الفاظ میں اجمالاً آیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ہم پر انعام اور احسان ہے کہ رب تعالیٰ نے ہمیں اس بات کا پابند نہیں کیا کہ سارے پیغمبروں کے نام اور اُن کی تعداد ہمیں معلوم ہونی چاہیے۔ ہمارے ایمان کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے جتنے پیغمبر تشریف لائے ہمارا سب پر ایمان ہے اٰمَنْتُ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ پہلے پیغمبر حضرت آدم علیہ السلام تھے۔ آخری پیغمبر جن کے بعد کسی کو نبوت نہیں ملی نہ ہی مل سکتی ہے۔ وہ حضرت محمد رسول اللہ ﷺ ہیں۔

تو فرمایا کہ یہ پیغمبر ہیں ﴿ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ﴾ ہم نے فضیلت دی بعض کو بعض پر ﴿ مِنْهُمْ ﴾ ان پیغمبروں میں سے وہ بھی ہیں ﴿ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ ﴾ جن سے اللہ تعالیٰ نے براہِ راست کلام کیا۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں چھٹے پارے میں آتا ہے: ﴿ وَ كَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا ﴾ [النساء:۱۶۴] "اور اللہ تعالیٰ نے موسیٰ کے ساتھ کلام کیا۔" اور معراج کی رات اللہ تعالیٰ نے جبرئیل علیہ السلام کی وساطت کے بغیر آنحضرت ﷺ کے ساتھ کلام فرمایا اور اس کلام میں اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو تین تحفے عطا فرمائے۔

❀ ایک تحفہ یہ تھا کہ پہلے نمازیں پچاس تھیں پھر گھٹا کر پانچ کر دی گئیں۔

❀ دوسرا تحفہ سورۂ بقرہ کی آخری آیات ﴿ اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ ﴾ سے لے کر آخر تک کی آیات اللہ تبارک وتعالیٰ نے براہِ راست آپ ﷺ کو عطا فرمائیں۔ جبرئیل علیہ السلام کی وساطت کے بغیر۔

❀ تیسرا تحفہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے ساتھ زبانی طور پر وعدہ فرمایا کہ میرا تیرے ساتھ وعدہ ہے کہ تیری اُمت میں سے وہ شخص ﴿ مَنْ مَّاتَ لَا يُشْرِكُ بِيْ شَيْئًا ﴾ جو مرا اس حال میں کہ اس نے میرے ساتھ کسی چیز کو شریک نہیں ٹھہرایا میں اس کو بخش دوں گا۔ یہ الگ بات ہے کہ پہلے ہی قدم پر بخش دے یا کچھ سزا دے کر بخش دے۔ یہ اس کی مرضی ہے۔ اور شرک کرنے والے کو نہیں بخشے گا۔

﴿ وَ رَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ ﴾ اور اللہ تعالیٰ نے ان پیغمبروں میں سے بعض کے درجے بلند فرمائے۔ اس ﴿ بَعْضَهُمْ ﴾ سے حضرت محمد ﷺ کی ذاتِ گرامی مراد ہے۔ تمام پیغمبروں کے امام، تمام پیغمبروں کے سردار اور اللہ تعالیٰ کی ساری مخلوق میں پہلے نمبر کی شخصیت حضرت محمد رسول اللہ ہیں۔ ہمارے جیسے گناہ گاروں پر رب تعالیٰ کا بے حد احسان ہے کہ اس نے ہمارے جیسے

گناہ گاروں کو آنحضرت ﷺ کا اُمتی بننے کا شرف عطا فرمایا اور دعا کرو ہمیں سچا اُمتی بنائے نام کا نہیں۔ ہمارا ظاہر بھی، باطن بھی، عقیدہ بھی، عمل بھی، اخلاق بھی اور کردار بھی اُمتیوں کی طرح ہو۔ ایسا نہ ہو آدھا تیتر آدھا بٹیر کہ کلمہ نبی کا اور فرماں برداری غیر کی۔

آپ ﷺ کا اُمتی بننے کے واسطے حضرت عیسیٰ علیہ السلام جیسے پیغمبر آرزو کرتے تھے کہ اے پروردگار! نبوت تو تو نے مجھے عطا کر دی ہے مجھے محمد رسول اللہ کے امتیوں میں سے اٹھا۔ اللہ تعالیٰ نے دعا قبول فرمائی۔ عیسیٰ علیہ السلام زندہ ہیں، نازل ہوں گے۔ آپ ﷺ کے امتیوں کی طرح سارے کام کریں گے۔ چالیس سال دنیا میں رہیں گے ﴿وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ﴾ اور ہم نے دیں عیسیٰ بن مریم علیہما السلام کو واضح دلیلیں جن کی تفصیل آگے اسی پارے میں آئے گی کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو کون کون سے معجزے عطا فرمائے۔

عیسیٰ کا لفظ اصل میں ایشوع تھا۔ یہ عبرانی لفظ ہے اس کے معنیٰ مبارک کے بھی ہیں اور سردار کے بھی ہیں اور مریم ان کی والدہ ماجدہ تھیں۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں مریم کا لفظی معنیٰ ہے عابدۃ عبادت کرنے والی۔ عورتوں میں اللہ تعالیٰ نے حضرت مریم علیہا السلام کو یہ خصوصیت عطا فرمائی کہ بغیر خاوند کے اللہ تعالیٰ نے بیٹا عطا فرمایا ﴿وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ﴾ روح القدس سے جبرئیل علیہ السلام مراد ہیں۔ معنیٰ ہے پاکیزہ روح۔ دراصل بنی اسرائیلیوں نے اپنی خواہشات کو اسلام میں داخل کر کے اسلام کا نقشہ بگاڑ دیا تھا۔ اس کو تم اس طرح سمجھو کہ جس طرح آج کل اہل بدعت نے دین کا نقشہ بگاڑ کر رکھ دیا ہے۔ بدعات ان کے نزدیک اسلام ہیں اور اہل سنت والجماعت کی علامتیں ہیں۔

تو جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اصلاح شروع فرمائی، مولوی، پیر، عوام سارے بگڑ گئے، مخالف ہو گئے۔ جس طرح آج تم کسی مقام پر بدعت کی تردید کرو تو بھڑوں کی طرح سارے تمھیں چمٹ جائیں گے۔ کیوں کہ برادری اور قوموں کے اعتبار سے جو بدعات ہیں وہ ان کا دین بنا ہوا ہے۔ آج تیجے، ساتویں، دسویں، عرس، میلاد کی تردید کرو تو نتیجہ تمھارے سامنے ہے کہ یہ لوگ کیا کہتے ہیں اور کرتے کیا ہیں۔ صرف وہ لوگ تمھارا ساتھ دیں گے جن کو رب تعالیٰ نے سمجھ عطا فرمائی ہے۔

بدعات کی نحوست

یاد رکھنا! بدعات دین کی مخالفت کا نام ہے۔ ان سے دین کا نقشہ بگڑ جاتا ہے۔ اور یہ بات میں کئی دفعہ عرض کر چکا ہوں کہ سو گناہ کبیرہ ایک طرف ہوں تو ان کا گناہ ہلکا ہے اور ایک بدعت کا گناہ زیادہ ہے۔ اس لیے کہ گناہ جتنے بھی ہیں ان سے دین کا نقشہ نہیں بدلتا کیوں کہ کوئی ان کو دین نہیں سمجھتا۔ اور بدعت کے ذریعے دین کا نقشہ بدل جاتا ہے۔ اس لیے کہ بدعت کو دین سمجھ کر اُس پر عمل کیا جاتا ہے۔ تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جب ان کے غلط کاموں کی تردید شروع فرمائی تو لوگ مخالف ہو گئے۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان کی حفاظت کے لیے جبرئیل علیہ السلام کو مقرر فرمایا۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام اکثر ان کے ساتھ رہتے تھے۔

یہ تفصیل توتم پہلے سن چکے ہو کہ طالوت رحمۃ اللہ علیہ کی جالوت کے ساتھ لڑائی ہوئی۔ تین سو تیرہ یہ تھے اور ایک لاکھ کا لشکر ان کا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو فتح عطا فرمائی۔ قتال اور جہاد کا ذکر تھا۔

تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ﴿وَلَوْشَآءَ اللّٰهُ﴾ اور اگر اللہ تعالیٰ چاہتے ﴿مَا اقْتَتَلَ﴾ نہ لڑتے ﴿الَّذِيْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ﴾ وہ لوگ جو ان پیغمبروں کے بعد آئے ﴿مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ﴾ بعد اس کے کہ ان کے پاس واضح دلیلیں آ چکی ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ چاہے تو سب کو ایمان پر مجبور کر سکتا تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے اختیار دیا ہے کہ مرضی سے ایمان لاؤ، مرضی سے کفر کرو۔ اس لیے ﴿وَلٰكِنِ اخْتَلَفُوْا﴾ اور لیکن لوگوں نے اختلاف کیا ﴿فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ﴾ تو بعضے ان میں سے وہ ہیں جو مرضی سے ایمان لائے ﴿وَمِنْهُمْ مَّنْ كَفَرَ﴾ اور ان میں سے وہ بھی ہیں جنھوں نے مرضی سے کفر اختیار کیا۔ یعنی اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو سب کو ایمان پر مجبور کر دیتا جیسے فرشتے سارے کے سارے معصوم ہیں۔ فرشتوں میں کوئی کافر نہیں ہے۔ نہ ہندو، نہ سکھ، نہ یہودی، نہ عیسائی۔ سارے کے سارے مومن ہیں تو وہ کر سکتا تھا کہ سارے کے سارے انسانوں کو اور سارے کے سارے جنات کو مومن بنا دیتا وہ قادر مطلق ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے ان کو اختیار دیا ہے ﴿فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ﴾ پس جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کفر کرے۔ ان کو اللہ تعالیٰ نے خیر اور شر کے راستے بتا دیئے ہیں، ایمان اور کفر کے راستے بتا دیئے ہیں۔ پیغمبر بھیجے ہیں، کتابیں نازل فرمائیں ہیں اور ہر دور میں حق کی آواز کانوں تک پہنچانے والے آدمی رب نے کھڑے کیے ہیں اور اتمامِ حجت کر دی ہے۔

اللہ کی راہ میں خرچ کرو

﴿وَلَوْشَآءَ اللّٰهُ﴾ اور اگر اللہ تعالیٰ چاہتا ﴿مَا اقْتَتَلُوْا﴾ وہ نہ لڑتے۔ وہ اس طرح کہ سب کو ایمان پر مجبور کر دیتا، وہ کر سکتا تھا ﴿وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ﴾ اور لیکن اللہ تعالیٰ کرتا ہے جو ارادہ کرتا ہے اور اس کا ارادہ یہ ہے کہ ﴿فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ﴾ پس جو چاہے اپنی مرضی سے ایمان لائے اور جو چاہے اپنی مرضی سے کفر کرے۔ اس سے پہلے رکوع میں جہاد کا ذکر تھا اور جہاد کے لیے مال خرچ کرنا بھی ضروری ہے کیوں کہ بغیر مال کے اسلحہ اور جہاز مہیا نہیں ہو سکتے اور اسی طرح بعض مجاہد ایسے ہوتے ہیں کہ وہ اپنی جان تو پیش کر سکتے ہیں مگر مال نہیں پیش کر سکتے ان کو مالی امداد کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔

تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا﴾ اے ایمان والو! ﴿اَنْفِقُوْا﴾ خرچ کرو ﴿مِمَّا﴾ اس مال سے ﴿رَزَقْنٰكُمْ﴾ جو ہم نے تمھیں دیا ہے۔ اگر تمھیں یہ گھمنڈ ہے کہ یہ مال تم نے حاصل کیا ہے تو یہ غلط ہے۔ رزق اللہ تعالیٰ نے دیا ہے تم نے ہاتھ پیر مارے ہیں۔ مگر دنیا میں بہت سارے لوگ ایسے ہیں کہ محنت بہت زیادہ کرتے ہیں اور پیسے تھوڑے ملتے ہیں۔ بعض ایسے بھی ہیں ان کی محنت تھوڑی ہوتی ہے مگر پیسے زیادہ ملتے ہیں۔ یہ کون دیتا ہے؟ تو اگر محنت پر موقوف ہوتا تو سب کچھ مزدور ہی لے جاتا اور جو پنکھے کے نیچے سکون سے بیٹھا ہے اس کو تنکا بھی نہ ملتا۔ تو رزق رب کے پاس ہے۔ ہاں اس نے یہ

بتایا ہے کہ حلال طریقہ سے کماؤ، حرام طریقے سے حاصل نہ کرو۔

حدیث پاک میں آتا ہے کہ اگر حرام کا ایک بھی لقمہ کھاؤ گے تو چالیس دن تک دعاؤں کی قبولیت سے محروم ہو جاؤ گے۔ تو فرمایا خرچ کرو اس مال میں سے جو ہم نے دیا ہے ﴿مِّنْ قَبْلِ﴾ پہلے اس سے ﴿اَنْ یَّاْتِیَ یَوْمٌ لَّا بَیْعٌ فِیْهِ﴾ کہ آئے وہ دن کہ جس میں خرید و فروخت نہیں ہوگی۔ وہ قیامت کا دن ہے۔ قرآن پاک میں رب تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں۔ فرض کرو یہ ساری زمین مشرق سے لے کر مغرب تک، شمال سے لے کر جنوب تک اور زمین کی سطح سے لے کر آسمان کی چھت تک سونا ہی سونا ہو جائے (اب تم اندازہ لگاؤ کہ سونا کتنا قیمتی ہے۔) تو فرمایا اگر بالفرض کسی کے پاس ہو اور اس وقت ایمان حاصل کرنے کے لیے وہ سارا سونا خرچ کر دے ﴿وَ مِثْلَهٗ مَعَهٗ﴾ اور اتنی ہی زمین اور ہو، اور وہ زمین بھی سونے سے بھری ہوئی ہو۔ اور مجرم اس بات کو پسند کرے کہ یہ دو زمینیں سونے کی بھری ہوئی اُس سے لے لی جائیں اور اُسے ایمان دے دیا جائے تو یہ سودا نہیں ہوگا۔

اور یہ سودا بھی نہیں ہوگا کہ مجرم کو کہا جائے گا کہ آج تیرے بدلے تیری ماں، تیرے باپ، تیری بیوی، تیرے بیٹے، تیرے بھائی، تیری بہن، تیرے دوست کو عزیز کو وَ فَصِيْلَتِهِ الَّتِيْ تُؤْوِيْهِ اور تیری ساری برادری کو وَ مَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا اور جو زمین میں ہیں سب کو تیرے بدلے میں دوزخ میں ڈال دیں اور تجھے دوزخ سے نکال دیں تو کیا تو اس سودے پر راضی ہے؟ يَوَدُّ الْمُجْرِمُ جرم پسند کرے گا کہے گا ہاں! اے پروردگار میری ماں، میرے باپ، میری اولاد، میرے بہن بھائیوں بلکہ سارے خاندان کو اور سب لوگوں کو دوزخ میں ڈال دے اور مجھے نکال دے۔ كَلَّا اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ سودا نہ ہوگا، ہرگز نہیں ہوگا صرف اس کو بتانا مقصد ہوگا کہ آج تو کیا کچھ کرنے کے لیے تیار ہے۔

دین داروں کی شفاعت

تو فرمایا وہ دن ہے کہ ﴿لَّا بَیْعٌ فِیْهِ﴾ کہ اس میں کوئی خرید و فروخت نہیں ہوگی ﴿وَلَا خُلَّةٌ﴾ اور نہ خالی دوستی کام آئے گی۔ ہاں! اتنی بات یاد رکھنا! یہ قرآن پاک سے ثابت ہے ﴿اَلْاَخِلَّآءُ یَوْمَىِٕذٍۭ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمُتَّقِیْنَ﴾ "دوست اس دن ایک دوسرے کے دشمن ہوں گے مگر پرہیزگار۔" یعنی مومنوں کی دوستی برقرار رہے گی، وہ کام آئے گی اور کافر کو کفر کی حالت میں کسی کی دوستی کام نہیں آ سکتی۔

بخاری شریف میں روایت ہے کہ ایک مجرم کو حکم ہوگا کہ اس کو دوزخ میں ڈال دو اس کے ساتھ جو نمازیں پڑھتے تھے، روزے رکھتے تھے۔ وہ دیکھیں گے کہ ہمارا وہ ساتھی جو ہمارے ساتھ نمازوں میں شرکت کرتا تھا، ہمارے ساتھ روزے رکھتا تھا وہ آج دوزخ میں جا رہا ہے۔ تو سارے پُرزور اپیل کریں گے کہ اے پروردگار! یہ تو ہمارے ساتھ نمازیں پڑھتا تھا، روزے رکھتا تھا۔

اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ اس کے گناہ زیادہ ہیں اس کو دوزخ میں بھیجتے ہیں اپنی سزا بھگت کے آجائے گا، تم جنت میں

چلے جاؤ یہ بھی کسی وقت تمھیں آملے گا۔ وہ کہیں گے اے پروردگار! ہم تو اس کے بغیر جنت میں نہیں جائیں گے۔ اس کو رب دوزخ میں ڈال دے گا۔ لیکن یہ پُرزور اپیل کریں گے، عاجزی کریں گے، منت کریں گے تو رب تعالیٰ فرمائیں گے تم دوزخ میں چلے جاؤ تمھارے لیے دوزخ جنت بنی ہوگی اپنے دوست کو بازو سے پکڑو اور جنت میں لے جاؤ۔ تو مومن کی دوستی کام آئے گی۔ اسی واسطے جماعت کی نماز کا بڑا اثر ہے جن کے ساتھ مل کر نمازیں پڑھیں، اُٹھے بیٹھے اگر خود اتنے اعمال نہیں کہ سیدھا جنت میں چلا جائے بلکہ کمی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کمی کو ان کی سفارش سے پورا فرمائیں گے۔

﴿وَّلَا شَفَاعَةٌ﴾ اور نہ سفارش ہوگی۔ کافر کے لیے کوئی سفارش نہ ہوگی۔ مومن کے لیے سفارش حق ہے، پیغمبروں کی سفارش ہوگی، فرشتوں کی شفاعت ہوگی، قرآن پاک کے حافظوں کی ہوگی، اولیاء اللہ کی ہوگی، چھوٹے بچے جو فوت ہو گئے ان کی شفاعت ہوگی، درجہ بہ درجہ سب کی شفاعت حق ہے۔ اور کافروں کے لیے نہیں ہوگی اس لیے فرمایا ﴿وَالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ﴾ اور جو کافر ہیں وہ ظالم ہیں ان کے لیے کوئی سفارش نہیں ہے۔

آیۃ الکرسی کی فضیلت

قرآن کریم سارا ہی اللہ تعالیٰ کا کلام ہے مگر سارے قرآن کریم میں سب سے زیادہ فضیلت والی یہ آیت الکرسی ہے ﴿اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ﴾ سے لے کر ﴿وَهُوَ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ﴾ تک۔ ایک آیت ہے اور یہ ہر مسلمان کو یاد ہونی چاہیے۔

بخاری شریف کی روایت ہے کہ جو شخص اس کو صبح پڑھے گا شام تک جنات اور شیطان کے شر سے محفوظ رہے گا اور جو شام کو پڑھے گا وہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کے ساتھ صبح تک جنات اور شیاطین سے محفوظ رہے گا۔ یہ خود بھی یاد کرو اور بچوں کو بھی یاد کراؤ، عورتوں کو بھی یاد کراؤ اور انھیں یہ سبق دو کہ صبح جس وقت اُٹھیں تو یہ آیت کریمہ پڑھیں۔ اور رات کو جب سوئیں یہ آیت کریمہ پڑھ کے سوئیں۔ اس آیت کریمہ سے زیادہ درجے والی اور کوئی آیت قرآن مجید میں نہیں ہے اور اس آیت کو آیۃ الکرسی کہتے ہیں۔

﴿اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ﴾ اللہ تعالیٰ ہی ہے اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے، کوئی حاجت روا، مشکل کشا، فریادرس اور دست گیر نہیں ہے ﴿اَلْحَیُّ﴾ ہمیشہ سے زندہ ہے اور اس پر موت نہیں آئے گی، نہ اس کی ابتداء، نہ انتہاء ﴿الْقَیُّوْمُ﴾ کے دو معنے کرتے ہیں۔ قائم رہنے والا کہ اس پر زوال نہیں ہے اور دوسرا معنیٰ قائم رکھنے والا بھی کرتے ہیں ((اَنْتَ قَیِّمُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ)) "اے پروردگار! تو آسمانوں اور زمینوں کو قائم رکھنے والا ہے۔" یعنی تیرے حکم سے یہ زمین اور آسمان کھڑے ہیں ﴿لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ﴾ نہیں پکڑتی اللہ تعالیٰ کو اُونگھ۔ نیند سے پہلے جو غنودگی سی آتی ہے اللہ تعالیٰ کو وہ بھی نہیں آتی ﴿وَّلَا نَوْمٌ﴾ اور نہ نیند ﴿لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ﴾ اسی کے واسطے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمینوں میں ہے۔ وہی خالق، وہی مالک، وہی متصرف، یہ سب کچھ اسی کے قبضہ میں ہے ﴿مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ﴾ کون ہے جو اللہ تعالیٰ کے ہاں سفارش کرے ﴿اِلَّا

بِاِذْنِهٖ﴾ مگر رب کے حکم کے ساتھ۔

قیامت والے دن جب ساری کائنات میدانِ محشر میں حساب کے انتظار میں ہوگی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سجدے میں گر پڑیں گے ایک ہفتے کی مقدار کا لمبا سجدہ ہوگا یا دو ہفتوں کی مقدار کا سجدہ ہوگا۔ اور بخاری شریف کی روایت ہے ((یُلْهِمُنِیْ بِمَحَامِدَ لَمْ تَحْضُرْ اِنِّي اَلْآنَ)) اللہ تعالیٰ مجھے ایسے ایسے کلمات سجدے میں القاء فرمائیں گے جو مجھے اس وقت معلوم نہیں ہیں۔ ان کلمات کے ساتھ رب تعالیٰ کی تسبیح بیان کروں گا۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے ((اِرْفَعْ رَاْسَكَ اِشْفَعْ تُشَفَّعْ)) اے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! سر اُٹھاؤ، سفارش کرو تمھاری سفارش قبول ہوگی۔ اس کا نام ہے شفاعۃ الکبریٰ۔ تمام کائنات کے لیے سفارش ہوگی کہ ان کا حساب جلدی ہو۔

تو اللہ تعالیٰ کی اجازت کے بغیر کوئی سفارش نہ کر سکے گا ﴿یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ﴾ جو انسانوں کے آگے ہے رب اس کو بھی جانتا ہے ﴿وَمَا خَلْفَهُمْ﴾ اور جو ان کے پیچھے ہے رب اس کو بھی جانتا ہے ﴿وَلَا یُحِیْطُوْنَ بِشَیْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖۤ﴾ اور نہیں احاطہ کر سکتے اللہ تعالیٰ کے علم میں سے کسی چیز کا ﴿اِلَّا بِمَا شَآءَ﴾ مگر جتنا رب تعالیٰ چاہے کسی کو دے۔ ہمارا ایمان ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے جتنا علم دیا ہے وہ اور کسی کو عطا نہیں کیا۔ لیکن باوجود کثیر علم حاصل ہونے کے عالم الغیب صرف رب ہے اور عالم الغیب کا معنیٰ یہ ہے کہ ایک رتی اور ایک ذرہ اس کے علم سے خارج نہ ہو اور وہ صرف رب ہے جس کی یہ صفت ہے۔ ہاں اخبار الغیب، انباء الغیب اللہ تعالیٰ کے پیغمبروں کو بتائی گئی ہیں اور سب سے زیادہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو عطا ہوئی ہیں تِلْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَیْبِ نُوْحِیْهَاۤ اِلَیْكَ "یہ سب غیب کی خبریں ہیں جو ہم آپ کی طرف وحی کرتے ہیں۔" کل غیب، یہ صرف رب کی صفت ہے اس میں اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔

فرمایا ﴿وَسِعَ كُرْسِیُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ﴾ وسیع ہے کرسی اس کی آسمانوں اور زمینوں پر۔ یہ سات آسمان ہیں ان کے اوپر کرسی ہے، اوپر عرش ہے۔ کرسی اور عرش کی نسبت دارقطنی کی روایت میں اس طرح آیا ہے جیسے ایک بڑا وسیع میدان ہو اور اس میں ایک ٹائر پڑا ہو بس وغیرہ کا۔ تو بتاؤ اس ٹائر کی کیا حیثیت ہے اس میدان میں۔ اسی طرح سات آسمان اور سات زمینیں اس کرسی کے مقابلے میں ایسے ہی ہیں جیسے وسیع میدان میں ٹائر پڑا ہو۔ اور پھر عرش اور کرسی کی نسبت فرمایا اس طرح سمجھو کہ عرش وہ میدان ہے اور کرسی اس کے مقابلے میں ایک ٹائر ہے جو پڑا ہے۔ جسم کے لحاظ سے عرش سے بڑا جسم کسی شے کا نہیں ہے اور درجے کے اعتبار سے حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بڑا کوئی نہیں ہے ﴿وَلَا یَـُٔوْدُهٗ حِفْظُهُمَا﴾ اللہ تعالیٰ کو زمین اور آسمانوں کی حفاظت نہیں تھکاتی۔ اس ذات کے سامنے ان کی حفاظت کرنا کوئی دشوار کام نہیں ہے ﴿وَهُوَ الْعَلِیُّ﴾ اور وہ بہت بلند ذات ہے ﴿الْعَظِیْمُ﴾ اور بہت بڑی ذات ہے۔ تو آج سے شوق کے ساتھ صبح کے وقت بھی آیۃ الکرسی پڑھو اور شام کو سوتے وقت پڑھو، عورتوں اور بچوں کو پڑھاؤ تاکہ تم جنات اور شیاطین کے شر سے محفوظ ہو جاؤ۔ یہ قلعہ ہے قلعہ۔

﴿لَآ اِکْرَاہَ﴾ نہیں ہے کوئی جبر اور زور ﴿فِی الدِّیْنِ﴾ دین کے بارے میں ﴿قَدْ﴾ تحقیق کے ساتھ ﴿تَّبَیَّنَ﴾ خوب واضح ہو چکی ہے ﴿الرُّشْدُ﴾ بھلائی اور نیکی ﴿مِنَ الْغَیِّ﴾ گمراہی سے ﴿فَمَنْ یَّکْفُرْ﴾ پس جس نے انکار کیا ﴿بِالطَّاغُوْتِ﴾ طاغوت کا ﴿وَیُؤْمِنْ بِاللّٰہِ﴾ اور ایمان لایا اللہ تعالیٰ پر ﴿فَقَدِ اسْتَمْسَکَ﴾ پس تحقیق کے ساتھ اس نے پکڑ لیا ﴿بِالْعُرْوَۃِ﴾ دستہ ﴿الْوُثْقٰی﴾ جو مضبوط کڑا یا رسی ہے ﴿لَا انْفِصَامَ لَھَا﴾ نہیں ہے اس کے واسطے ٹوٹنا، یعنی وہ ٹوٹے گا نہیں ﴿وَاللّٰہُ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ﴾ اور اللہ تعالیٰ سننے والا جاننے والا ہے ﴿اَللّٰہُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا﴾ اللہ تعالیٰ آقا اور سرپرست ہے ان لوگوں کا جو ایمان لائے ﴿یُخْرِجُھُمْ﴾ ان کو نکالتا ہے ﴿مِّنَ الظُّلُمٰتِ﴾ اندھیروں سے ﴿اِلَی النُّوْرِ﴾ روشنی کی طرف ﴿وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا﴾ اور وہ لوگ جو کافر ہیں ﴿اَوْلِیٰٓـئُھُمُ الطَّاغُوْتُ﴾ ان کے ساتھی ہیں طاغوت ﴿یُخْرِجُوْنَھُمْ﴾ ان کو نکالتے ہیں ﴿مِّنَ النُّوْرِ﴾ روشنی سے ﴿اِلَی الظُّلُمٰتِ﴾ اندھیروں کی طرف ﴿اُولٰٓـئِکَ﴾ وہ ﴿اَصْحٰبُ النَّارِ﴾ دوزخ والے ہیں ﴿ھُمْ فِیْھَا خٰلِدُوْنَ﴾ وہ ہمیشہ دوزخ میں رہا کریں گے ﴿اَلَمْ تَرَ﴾ کیا تجھے معلوم نہیں ﴿اِلَی الَّذِیْ﴾ اس شخص کا واقعہ ﴿حَآجَّ﴾ جس نے جھگڑا کیا ﴿اِبْرٰھٖمَ﴾ ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ ﴿فِیْ رَبِّہٖٓ﴾ اس کے رب کے بارے میں ﴿اَنْ﴾ اس لیے جھگڑا کیا ﴿اٰتٰہُ اللّٰہُ الْمُلْکَ﴾ کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو ملک دیا تھا ﴿اِذْ قَالَ اِبْرٰھٖمُ﴾ جب کہا ابراہیم علیہ السلام نے ﴿رَبِّیَ الَّذِیْ﴾ میرا رب وہ ہے ﴿یُحْیٖ﴾ جو زندہ کرتا ہے ﴿وَیُمِیْتُ﴾ اور مارتا ہے ﴿قَالَ﴾ اس شخص نے کہا ﴿اَنَا اُحْیٖ وَاُمِیْتُ﴾ میں بھی زندہ کرتا ہوں اور مارتا ہوں ﴿قَالَ اِبْرٰھٖمُ﴾ فرمایا ابراہیم علیہ السلام نے ﴿فَاِنَّ اللّٰہَ﴾ پس بے شک اللہ تعالیٰ ﴿یَاْتِیْ﴾ لے آتا ہے ﴿بِالشَّمْسِ﴾ سورج کو ﴿مِنَ الْمَشْرِقِ﴾ مشرق کی طرف سے ﴿فَاْتِ بِھَا﴾ پس تو لے آ اس کو ﴿مِنَ الْمَغْرِبِ﴾ مغرب کی طرف سے ﴿فَبُھِتَ الَّذِیْ﴾ پس حیران کر دیا گیا وہ شخص ﴿کَفَرَ﴾ جو کافر تھا ﴿وَاللّٰہُ﴾ اور اللہ تعالیٰ ﴿لَا یَھْدِی﴾ نہیں ہدایت دیتا ﴿الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ﴾ ظالم قوم کو۔

یہودِ مدینہ کی حالت

مدینہ منورہ میں مالی لحاظ سے اور علمی اور سیاسی لحاظ سے بھی یہود کا تسلط تھا۔ ابھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہجرت فرما کر مدینہ طیبہ تشریف نہیں لے گئے تھے۔ تو اس وقت مدینہ طیبہ میں یہود ہی کا اثر و رسوخ تھا۔ اور مشرکین کے دو خاندان تھے ایک اوس اور دوسرا خزرج اور یہ دونوں خاندان زمیندار تھے۔ ان کی زمینیں تھیں، باغات تھے یہود کے پاس بھی کافی زمینیں اور باغات تھے مگر تجارت پر ان کا غلبہ تھا۔ وہ لوگ جو غریب تھے ان میں سے ایسے بھی تھے جو اپنا خرچہ بھی پورا نہیں کر سکتے تھے انھوں نے

اپنے بچے یہود کے حوالے کر دیئے تھے کہ ان کا خرچہ بھی تم برداشت کرو اور ان کو تعلیم بھی تم نے دینی ہے۔ چونکہ وہ کھاتے پیتے لوگ تھے بچے بھی ان کے خوش رہتے۔

جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لے گئے، اسلام پھیلا وہ لوگ جن کے بچے یہودیوں کے قبضہ میں تھے اُنھیں فکر ہوئی کہ یہودیوں نے ہمارے بچوں پر یہودیت کا رنگ چڑھا دیا ہے اور ایک صحابی جن کا نام ابوالحصین تھا (صاد کے ساتھ) رضی اللہ عنہ۔ ان کے دولڑکے عیسائی بھی ہو گئے، بالغ تھے، تجارت کرتے تھے۔ اُنھوں نے اپنے بیٹوں پر سختی کی کہ میں مسلمان ہوں تم بھی مسلمان ہو جاؤ۔ اُنھوں نے کہا ہم نے نہیں ہونا۔ باپ نے خاصا زور لگایا، مارا پیٹا، بڑا کچھ کیا مگر وہ بڑے پکے تھے مسلمان نہ ہوئے۔

اسی طرح جب مدینہ طیبہ سے یہود کو جلاوطن کیا گیا خیبر کی طرف تو ان کے ہاں جو مسلمانوں کے بچے تھے وہ بھی ساتھ چلے گئے۔ ماں باپ نے خاصا زور لگایا کہ تم ہمارے بچے ہو۔ کہنے لگے نہیں ہم تمھارے نہیں ہیں اور وہ بچے بھی عاقل بالغ ہو چکے تھے۔ اس موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ حضرت! اب ہم کیا کریں؟ ہمارے بچے ہیں، کوئی یہودی ہے، کوئی عیسائی ہے اور ہم بڑا زور لگاتے ہیں مگر وہ ایمان کی طرف نہیں آتے۔ اس موقع پر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد نازل ہوا:

﴿ لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ﴾ کہ دین میں جبر کوئی نہیں ہے۔ تبلیغ ہے، ترغیب ہے، دین کی خوبیاں بیان کرو ان کے عقیدے کی خرابیاں بیان کرو مگر ڈنڈے کے زور پر کسی کو منوانا یہ صحیح نہیں ہے۔ تبلیغ کرو جن کے دل صاف ہوں گے یقیناً حق کو قبول کریں گے اور جو ضدی ہیں انھوں نے خدا کے پیغمبروں کی بھی باتیں نہیں مانیں۔ ان کا کوئی علاج نہیں ہے۔ اور جبر اس لیے نہیں ہے کہ ﴿ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ ﴾ تحقیق کے ساتھ واضح ہو چکی ہے بھلائی ﴿مِنَ الْغَيِّ ﴾ گمراہی سے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتابوں کے ذریعے، اپنے پیغمبروں کے ذریعے اور پیغمبروں کے نائبین کے ذریعے حق اور ہدایت کو خوب واضح کر دیا ہے اور یہ بھی بتا دیا ہے کہ یہ کفر ہے، گمراہی ہے، بدی ہے، یعنی نیکی اور بدی کی الگ الگ حقیقت بیان کر دی ہے۔

بعض لوگوں نے یہاں سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ جو مرتد ہے اس کو سزا نہیں دینی چاہیے۔ شرعی طور پر مسئلہ یہ ہے کہ جو شخص مرتد ہو جائے اس کو تین دن کی مہلت دی جائے گی کہ اپنے شکوک و شبہات پیش کرے۔ اگر ایک عالم حل نہیں کر سکے گا دوسرا کرے گا۔ دوسرا نہیں کر سکے گا تیسرا کرے گا۔ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ خدائی تعلیم ہو اور اس پر اعتراضات ہوں ان کے جوابات نہ ہوں۔ تین دن کے بعد بھی اگر وہ اپنے کفر پر ڈٹا رہا تو اس کو قتل کر دیا جائے گا۔ تو بعض لوگوں نے اس آیت کریمہ سے استدلال کیا ہے کہ ﴿لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ﴾ دین میں کوئی جبر نہیں ہے لہٰذا اس کو کیوں قتل کیا جاتا ہے اور اس کو کیوں اسلام پر مجبور کیا جا رہا ہے۔ لیکن ان نادانوں نے بات کو سمجھا نہیں۔

ابتداءً کسی کافر کو اسلام پر مجبور نہیں کیا جا سکتا کہ تو مسلمان ہو جا ورنہ تجھے قتل کر دیا جائے گا، لیکن جو مسلمان ہو جائے اور اس کے بعد پھر مرتد ہو جائے وہ باغی ہے اور باغی کا مسئلہ الگ ہے۔ آج کوئی بھی حکومت اپنے باغی کو معاف کرنے کے لیے تیار نہیں ہے تو جو شخص رب کا باغی ہو جائے اور حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا باغی ہو جائے اس کو کس طرح معاف کیا

جا سکتا ہے اور اس کو کس طرح نجات مل سکتی ہے۔

طاغوت کا معنیٰ

فرمایا ﴿فَمَنْ یَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ﴾ پس جس نے طاغوت کا انکار کیا ﴿وَیُؤْمِنْ بِاللّٰهِ﴾ اور اللہ تعالیٰ پر ایمان لایا۔ تو طاغوت کیا ہے؟ حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ طاغوت کا معنیٰ شیطان بھی کرتے ہیں۔ اور طاغوت کا معنیٰ جادو بھی ہے اور صنم یعنی بت بھی ہے۔ اور طاغوت کا معنیٰ ساحر جادوگر بھی ہے۔ اور طاغوت کاہن، فال نکالنے والے کو بھی کہتے ہیں۔ تو شیطان، بت، جادو اور جادوگر اور فال نکالنے والے یہ سب طاغوت ہیں۔ حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: كُلُّ مَا یُعْبَدُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ "اللہ تعالیٰ سے ورے ورے جس کی عبادت کی جاتی ہے۔ مثلاً: لات ہے، منات ہے، عُزّیٰ ہے، کوئی ہو وہ سب طاغوت ہیں۔" اور مومن کا فریضہ ہے طاغوت کا انکار کرنا۔ شیطان کی اطاعت کا بتوں کی عبادت کا انکار کرنا، جادوگروں کے جادوؤں کا انکار کرنا۔ اسی طرح فال نکالنے والوں کے پاس جانے سے انکار کرنا۔

﴿وَیُؤْمِنْ بِاللّٰهِ﴾ اور اللہ تعالیٰ پر ایمان لایا ﴿فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى﴾ پس تحقیق انھوں نے پکڑ لیا مضبوط کڑا یا دستہ۔ گاڑیوں کے سفر تم نے کیے ہوں گے۔ پائیدانوں کے قریب مضبوط دستے لگے ہوتے ہیں۔ جو شخص اس دستے کو پکڑ لے گا اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کے ساتھ وہ محفوظ رہے گا، گرے گا نہیں۔ اور جس دستے کو مومن نے پکڑ لیا وہ ایسا ہے ﴿لَا انْفِصَامَ لَهَا﴾ اس دستے کے لیے ٹوٹنا نہیں ہے۔ تو جس نے اس دستے کو پکڑ لیا مضبوطی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے وہ محفوظ رہے گا۔

امیر شریعت کا دلچسپ واقعہ

جو پرانے بزرگ ہیں اُنھوں نے امیر شریعت حضرت مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ کو دیکھا ہوگا اور ان کی تقریریں بھی سنی ہوں گی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو تقریر کا بہت بڑا ملکہ عطا فرمایا تھا۔ پانچ پانچ، چھ چھ، سات سات، آٹھ آٹھ گھنٹے تقریر فرماتے تھے۔ ہم نے ان کی تقریروں میں ہندوؤں اور سکھوں کو بھی روتے ہوئے دیکھا ہے۔ گوجرانوالا میں ان کی تقریر تھی، بہت بڑا مجمع تھا تو کسی نے رقعہ دیا کہ تم لوگوں کو ایمان کی دعوت دیتے ہو حالانکہ تم خود کافر ہو۔

اُن دنوں بریلویت کا زور تھا اور دیوبندیوں کو کھلے طور پر کافر کہتے تھے، اپنی مسجدوں میں داخل نہیں ہونے دیتے تھے۔ اگر کسی مسجد میں دیوبندی داخل ہوتا تو اُسے دھودیتے تھے اور کہتے تھے کہ ایک دیوبندی مسجد میں داخل ہو جائے تو وہ پلید ہو جاتی ہے اور اگر سو خنزیر داخل ہوں تو کچھ نہیں ہوتا۔

اب الحمد للہ! ملک میں وہ حالات نہیں ہیں۔ پہلے وہ اپنے جلسوں میں ان مسائل کا یعنی حاضر ناظر وغیرہ کا باقاعدہ عنوان رکھتے تھے۔ عالم الغیب کا عنوان رکھتے تھے، مختارِ کل کا عنوان رکھتے تھے۔ اب الحمد للہ! وہ قصے نہیں رہے۔ ہماری کتابوں نے خاصا اثر کیا ہے۔ اب یہ عنوان نہیں رکھتے۔ ہاں ضمنی طور پر اپنا عقیدہ بیان کرتے ہیں۔

امیر شریعت عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ کو کسی نے چٹ پکڑا دی کہ تم تو کافر ہو۔ حضرت امیر شریعت رحمۃ اللہ علیہ بڑے ذہین اور حاضر جواب تھے۔ یہاں جین والی کھوہی کے مقام پر جلسہ تھا۔ بہت بڑا مجمع تھا۔ اس مجمع میں حضرت نے جنت کی خوبیاں بیان فرمائیں کہ جنت میں یہ ملے گا، یہ ملے گا۔ ایک بابا جی کھڑے ہو کر کہنے لگے کہ حضرت شاہ جی! یہ بتائیں کہ جنت میں حقہ بھی ملے گا؟ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہاں! حقہ ملے گا لیکن آگ لینے کے لیے دوزخ میں جانا پڑے گا۔

تو حضرت نے رقعہ پڑھ کر سنایا اور فرمایا کہ میں کافر ہوں، کافر ہوں اور مجھے اپنے کفر پر فخر ہے۔ ہمارا اس وقت طالب علمی کا زمانہ تھا ہمیں بہت غصہ آیا کہ رقعہ والے نے بھی کہا ہے کہ تم کافر ہو اور حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی فرماتے ہیں کہ ہاں میں کافر ہوں اور مجھے اپنے کفر پر فخر ہے۔ پھر حضرت نے اعوذ باللہ پڑھا اور بسم اللہ پڑھی اور قرآن پاک پڑھنا شروع کیا اور قرآن شریف پڑھنے کا حضرت کا انداز نرالا ہوتا تھا۔ جی چاہتا کہ شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ پڑھتے رہیں اور آدمی سنتا رہے۔ تو حضرت نے یہ آیت پڑھی ﴿فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ﴾۔ فرمایا: میں کافر ہوں مگر طاغوت کا کافر ہوں، اللہ کا کافر نہیں ہوں اور میرے ہاتھ میں مضبوط دستہ ہے۔ پھر انگریز پر چڑھ گئے، بے اٹکے اور چھ سات گھنٹے انگریز کے خلاف تقریر کی۔ یہ اس وقت کے طاغوت تھے انھوں نے مسلمانوں پر بڑے مظالم ڈھائے تھے۔

﴿وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ﴾ اور اللہ تعالیٰ سنتا بھی ہے اور جانتا بھی ہے ﴿اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ﴾ اللہ تعالیٰ آقا ہے، مددگار ہے ان لوگوں کا ﴿اٰمَنُوْا﴾ جو ایمان لائے ﴿يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ﴾ اللہ تعالیٰ ان کو اندھیروں سے، کفر، شرک اور برائی کے اندھیروں سے نکالتا ہے ﴿اِلَى النُّوْرِ﴾ نور کی طرف۔ یعنی نورِ ایمان، نورِ توحید، نورِ اسلام اور نورِ حق کی طرف ﴿وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا﴾ اور وہ لوگ جو کافر ہیں ﴿اَوْلِيٰٓـئُـهُمُ الطَّاغُوْتُ﴾ ان کے ساتھی اور دوست طاغوت ہیں۔ وہ شیطان کا گروہ ہے۔ جادوگر، بت، شیطان یہ سب ان کے ساتھی ہیں ﴿يُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ﴾ وہ ان کو نکالتے ہیں روشنی سے اندھیروں کی طرف۔ ایمان سے کفر کی طرف لے جاتے ہیں وہ کفر کی تبلیغ کرتے ہیں، عقیدے بگاڑتے ہیں، اخلاق بگاڑتے ہیں ﴿اُولٰٓـئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ﴾ یہ لوگ دوزخ والے ہیں ﴿هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ﴾ وہ ہمیشہ ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے۔ آگے اللہ تعالیٰ ایک واقعہ بیان فرماتے ہیں:

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا نمرود سے مناظرہ

حضرت ابراہیم علیہ السلام جس دور میں پیدا ہوئے اس دور میں ایک قوم تھی عمالقہ، یہ عملیق کی نسل سے تھے۔ اس وقت ان کا اقتدار تھا۔ نمرود ابن کنعان یہ اس وقت بادشاہ تھا اور ملک عراق تھا۔ جس مقام پر حضرت ابراہیم علیہ السلام پیدا ہوئے وہ اس ملک کا دار الخلافہ تھا اور اس کا نام تھا کُوثیٰ بروزن طوبیٰ۔ آج کے جغرافیہ میں اس شہر کا نام ہے اُر۔ آج وہ چھوٹا سا قصبہ معلوم ہوتا ہے مگر اس زمانے میں وہ دار الخلافہ تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد جن کا نام آزر تھا وہ اس وقت وزیر مذہبی امور تھے۔ جس جگہ بت خانہ بنانا ہوتا تھا یا جہاں کہیں بت رکھنے ہوتے تھے یا کہیں مجاور رکھنے ہوتے تھے، یہ ان کی ذمہ داری تھی یعنی یہ محکمہ ان کے

سپر دتھا۔ مگر خدا تعالیٰ کی شان دیکھو کہ باپ بت بنانے والوں میں ہے اور بیٹا بت گرانے والوں میں ہے۔ وہ بت ساز ہے اور یہ بت شکن ہے۔ باپ کے ساتھ الگ مناظرہ ہو رہا ہے، قوم کے ساتھ الگ مناظرہ ہو رہا ہے، وقت کے بادشاہ کے ساتھ الگ مناظرہ ہو رہا ہے۔ اس وقت اس گفتگو کا ذکر ہے جو نمرود ابن کنعان کے ساتھ ہوئی۔

﴿ اَلَمْ تَرَ ﴾ کیا تجھے معلوم نہیں ہے ﴿ اِلَى الَّذِیْ ﴾ اس شخص کا واقعہ ﴿ حَآجَّ اِبْرٰهٖمَ ﴾ جس نے جھگڑا کیا ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ ﴿ فِیْ رَبِّهٖۤ ﴾ اس کے رب کے بارے میں یہ جھگڑا کرنے والا نمرود ابن کنعان جو اس وقت کا بادشاہ تھا۔ اور جھگڑا اس بات پر ہوا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس کو رب تعالیٰ کی توحید کی دعوت دی کہ تم رب تعالیٰ کی وحدانیت کے قائل ہو جاؤ۔ درمیان میں جملہ معترضہ ہے۔ ﴿ اَنْ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ ﴾ اس لیے اس نے جھگڑا کیا کہ رب تعالیٰ نے اس کو ملک دیا تھا۔ چاہیے تو یہ تھا کہ رب تعالیٰ کا شکر ادا کرتا نہ یہ کہ رب تعالیٰ کے بارے میں جھگڑا شروع کرتا۔

علامہ خازن رحمۃ اللہ علیہ بڑے چوٹی کے مفسر ہیں، ان کی تفسیر خازن مشہور ہے۔ اپنی تفسیر میں وہ لکھتے ہیں کہ ساری دنیا کے چار بادشاہ ہوئے ہیں۔ اِثْنَانِ كَافِرَانِ وَ اِثْنَانِ مُسْلِمَانِ، دو کافر تھے جن کا ساری دنیا پر اقتدار قائم ہوا۔ ایک نمرود ابن کنعان اور ایک بختِ نصر ایرانی، یہ مجوسی کافر تھا۔ اور دو مسلمان بادشاہ ہوئے ہیں جن کا ساری دنیا پر اقتدار قائم ہوا۔ ایک حضرت سلیمان علیہ السلام اور دوسرے ذوالقرنین رحمۃ اللہ علیہ۔ جن کا واقعہ قرآن پاک کے سولہویں پارے میں آتا ہے۔ اسکندر ابن فیلقوس اس کا نام تھا۔ ان کی جائے پیدائش مقدونیہ ہے جو یونان کے ملک میں ایک جگہ ہے۔ ان کا زمانہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ کے قریب قریب تھا۔ جو بڑے مومن اور موحد تھے۔

تو نمرود ابن کنعان بڑی عمر کا تھا۔ بعض تفسیروں میں لکھا ہے کہ اس کی عمر چار سو سال تھی۔ اور یہ کچھ بعید نہیں ہے اتنی عمر ہو سکتی ہے۔ لیکن تھا بڑا ضدی اور ہٹ دھرم۔ اس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ جھگڑا کیا تو ﴿ اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ ﴾ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا ﴿ رَبِّیَ الَّذِیْ یُحْیٖ وَ یُمِیْتُ ﴾ کہ میرا رب وہ ہے جو زندہ بھی کرتا ہے اور مارتا بھی ہے۔ ﴿ قَالَ ﴾ اس نمرود نے کہا ﴿ اَنَا اُحْیٖ وَ اُمِیْتُ ﴾ میں بھی زندہ کرتا ہوں اور مارتا ہوں۔ اس نے اس طرح کیا کہ ایک مجرم جس کو ماتحت عدالتوں نے موت کی سزا دی تھی اور اب صرف بادشاہ کے پاس رحم کی اپیل باقی تھی۔ وہ کہنے لگا کہ دیکھو جی عدالتیں اس کو موت کی سزا دے چکی ہیں۔ میں اس کو رہا کرتا ہوں لہٰذا میں نے مُردے کو زندہ کر دیا اور ایک بے چارہ بے گناہ سامنے آیا۔ اس کو پکڑ کر قتل کر دیا۔ کہنے لگا میں بھی زندہ کرتا ہوں اور مارتا ہوں۔

حالانکہ ﴿ اُحْیٖ وَ اُمِیْتُ ﴾ کا یہ مفہوم نہیں تھا۔ بلکہ مفہوم تو یہ تھا کہ ظاہری کوئی سبب نہ ہو پھر وہ مارتا ہے اور زندہ کرتا ہے۔ جس طرح اس نے سمجھا اس طرح تو گولی سے بھی آدمی مار دیتا ہے تو پھر معاذ اللہ یہ سارے خدا بن گئے۔ جیسے چور، ڈاکو، غنڈے یہ سب بدمعاش آدمیوں کو مارتے ہیں تو یہ سارے خدا بن گئے؟ موت و حیات کا مطلب یہ ہے کہ بغیر کسی ظاہری سبب کے مارنا بھی اللہ تعالیٰ کا کام ہے اور پیدا کرنا بھی اللہ تعالیٰ کا کام ہے۔ نمرود اسباب کی طرف چلا گیا۔ حضرت علیہ السلام ابراہیم بجائے

اس کے کہ اس کو موت وحیات کا معنیٰ سمجھانے میں الجھتے بلکہ اس سے واضح دلیل کی طرف منتقل ہو گئے۔

﴿قَالَ اِبْرٰهٖمُ﴾ فرمایا ابراہیم علیہ السلام نے ﴿فَاِنَّ اللّٰهَ يَاْتِيْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ﴾ پس بے شک اللہ تعالیٰ لاتا ہے سورج کو مشرق کی طرف سے اور مغرب کی طرف لے جاتا ہے۔ تو اگر خدائی کا دعویٰ کرتا ہے تو ﴿فَاْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ﴾ پس تو لا مغرب کی طرف سے۔ امام رازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ عُذر لنگ کا اس کو یہاں بھی موقع تھا کہ وہ کہہ سکتا تھا کہ یہ سورج جو مشرق کی طرف سے طلوع ہوتا ہے یہ تو روزانہ میں کرتا ہوں۔ اے ابراہیم! اگر تیرا کوئی رب ہے تو اس کو کہو کہ مغرب کی طرف سے لائے۔ لیکن وہ اگر ایسا کہتا تو اللہ تعالیٰ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تصدیق کے لیے سورج مغرب کی طرف سے طلوع کر کے دکھا دیتا۔

اور ایک وقت آئے گا کہ سورج مغرب کی طرف سے طلوع ہوگا۔ یہ قیامت کی نشانیوں میں سے ہے کہ مطلع بالکل صاف ہوگا لوگ دیکھیں گے کہ صبح صادق نہیں ہو رہی۔ بڑے حیران ہوں گے کہ بادل بھی نہیں دھند بھی نہیں سورج طلوع نہیں ہو رہا۔ اس دوران سورج مغرب کی طرف سے طلوع ہوگا اور اس وقت توبہ کا دروازہ بند ہو جائے گا۔ اس کے بعد توبہ کی کوئی حیثیت نہیں ہوگی اور اس کے بعد اگر کوئی ایمان لائے گا تو اس کی بھی کوئی حیثیت نہیں ہوگی۔ یہ سورج دوپہر تک آئے گا پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم ہوگا کہ تو پہلے کی طرح مشرق سے طلوع ہو کر اپنی تاخیر کو پورا کر لے۔ تو اللہ تعالیٰ کے حکم سے جتنا وقت درمیان میں گزرا ہوگا سورج اپنی تاخیر پوری کرے گا۔ اس کے بعد دنیا تقریباً ایک سو بیس سال رہے گی، پھر اسرافیل علیہ السلام صور پھونک دیں گے۔

﴿فَبُهِتَ الَّذِيْ كَفَرَ﴾ پس حیران ہو گیا وہ شخص جو کافر تھا۔ ہمارے حضرت مرحوم مولانا حسین علی رحمہ اللہ تعالیٰ۔ وہ ہمارے مرشد اور پیر ہیں اور حضرت گنگوہی رحمہ اللہ کے شاگرد ہیں، بہت بلند پایہ بزرگوں میں سے تھے۔ وہ اپنی میانوالوی بولی میں ترجمہ فرمایا کرتے تھے ﴿فَبُهِتَ الَّذِيْ كَفَرَ﴾ "پس کافر بھڑوی دا ہچّی تھی گیا۔"

﴿وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ﴾ اور اللہ تعالیٰ ہدایت نہیں دیتا ظالم قوم کو۔ جو قوم کفر و شرک پر ڈٹی ہوئی ہو تو اللہ تعالیٰ زبردستی کسی کو ہدایت نہیں دیتا۔

﴿اَوْ كَالَّذِيْ﴾ یا اس شخص کی طرح ہے ﴿مَرَّ﴾ جو گزرا ﴿عَلٰى قَرْيَةٍ﴾ ایک بستی کے پاس سے ﴿وَّهِيَ خَاوِيَةٌ﴾ اور وہ گری ہوئی تھی ﴿عَلٰى عُرُوْشِهَا﴾ اپنی چھتوں کے بل ﴿قَالَ﴾ کہا اس نے ﴿اَنّٰى﴾ کس طرح ﴿يُحْيٖ هٰذِهِ اللّٰهُ﴾ آباد کرے گا اس کو اللہ تعالیٰ ﴿بَعْدَ مَوْتِهَا﴾ اس کے تباہ ہو جانے کے بعد ﴿فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ﴾ پس اس کو اللہ نے موت میں رکھا ﴿مِائَةَ عَامٍ﴾ سو سال ﴿ثُمَّ بَعَثَهٗ﴾ پھر اس کو زندہ کیا ﴿قَالَ فرمایا﴾ ﴿كَمْ لَبِثْتَ﴾ کتنا عرصہ تم مرے رہے ہو ﴿قَالَ﴾ کہا اس نے ﴿لَبِثْتُ يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ﴾ مرا رہا میں ایک دن یا دن کا کچھ حصہ ﴿قَالَ﴾ فرمایا رب تعالیٰ نے ﴿بَلْ لَّبِثْتَ﴾ بلکہ تو مرا رہا ﴿مِائَةَ عَامٍ﴾ سو سال ﴿فَانْظُرْ اِلٰى طَعَامِكَ﴾ پس دیکھ تو اپنے کھانے

کی طرف ﴿وَشَرَابِكَ﴾ اور اپنے پینے کی چیز کی طرف ﴿لَمْ يَتَسَنَّهْ﴾ وہ متغیر نہیں ہوئی ﴿وَانْظُرْ اِلٰى حِمَارِكَ﴾ اور دیکھ اپنے گدھے کی طرف ﴿وَلِنَجْعَلَكَ اٰيَةً﴾ اور تاکہ بنائیں ہم تجھے نشانی ﴿لِّلنَّاسِ﴾ لوگوں کے لیے ﴿وَانْظُرْ اِلَى الْعِظَامِ﴾ اور دیکھ ہڈیوں کی طرف ﴿كَيْفَ نُنْشِزُهَا﴾ کیسے ہم ان کو جوڑتے ہیں ﴿ثُمَّ نَكْسُوْهَا لَحْمًا﴾ پھر ہم چڑھاتے ہیں ان ہڈیوں پر گوشت ﴿فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗ﴾ پس جب اچھی طرح واضح ہوئی حقیقت اس کے سامنے ﴿قَالَ﴾ کہا اس نے ﴿اَعْلَمُ﴾ میں جانتا ہوں ﴿اَنَّ اللّٰهَ﴾ بے شک اللہ تعالیٰ ﴿عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ﴾ ہر چیز پر قادر ہے ﴿وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ﴾ اور جس وقت فرمایا ابراہیم علیہ السلام نے ﴿رَبِّ اَرِنِيْ﴾ اے میرے رب! تو مجھے دِکھا ﴿كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتٰى﴾ کس طرح تو زندہ کرنے گا مُردوں کو ﴿قَالَ﴾ فرمایا اللہ تعالیٰ نے ﴿اَوَلَمْ تُؤْمِنْ﴾ کیا تو ایمان نہیں لایا ﴿قَالَ بَلٰى﴾ فرمایا ہاں ایمان لایا ہوں ﴿وَلٰكِنْ لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِيْ﴾ اور لیکن تاکہ میرا دل مطمئن ہوجائے ﴿قَالَ﴾ فرمایا رب تعالیٰ نے ﴿فَخُذْ﴾ پس پکڑ ﴿اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ﴾ چار پرندے ﴿فَصُرْهُنَّ اِلَيْكَ﴾ پس ان کو مانوس کرلے اپنے ساتھ ﴿ثُمَّ اجْعَلْ﴾ پھر رکھ تو ﴿عَلٰى كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ﴾ ہر پہاڑ پر ان میں سے ﴿جُزْءًا﴾ حصہ ﴿ثُمَّ ادْعُهُنَّ﴾ پھر تم ان کو بلاؤ ﴿يَاْتِيْنَكَ سَعْيًا﴾ آئیں گے تیرے پاس دوڑتے ہوئے ﴿وَاعْلَمْ﴾ اور تو جان لے ﴿اَنَّ اللّٰهَ﴾ بے شک اللہ تعالیٰ ﴿عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ﴾ غالب ہے حکمت والا ہے۔

اس سے پہلی آیات میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور نمرود ابن کنعان کا مکالمہ بیان فرمایا۔ اور آج کی آیات میں اللہ تعالیٰ نے دو واقعے بیان فرمائے ہیں۔

صہیونیت کا معنیٰ

پہلا واقعہ اس طرح ہے کہ ایک پہاڑ ہے جس کا نام ہے صِہیون۔ آج کل اخبارات میں اس کا تلفظ غلط تحریر کیا جاتا ہے صیہون لکھتے ہیں پہلے ی پھر ہا۔ قاموس وغیرہ میں تصریح ہے صِہیون یعنی پہلے ہا ہے پھر یا ہے، بروزن فِرْزَوْن۔ یہ پہاڑ سمندر کی سطح سے تقریباً پانچ ہزار فٹ کی بلندی پر ہے۔ جیسے ہمارے ہاں کوہ مری ہے۔ اس پہاڑ پر شہر تھا بیت المقدس۔ مُقدس اسم مفعول کے صیغے کے ساتھ بھی درست ہے اور مَقدِس بھی درست ہے۔ جیسا کہ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے تہذیب الاسماء واللغات میں تصریح فرمائی ہے۔

حضرت عزیر علیہ السلام کا واقعہ

یہ شہر بڑا مشہور اور مرکزی تھا اور کافی آبادی تھی۔ حضرت عزیر اپنے ایک سفر میں اس کے پاس سے گزرے۔ اس شہر کو

بُخت نَصَّر ایرانی نے جو بڑا ظالم اور جابر بادشاہ تھا حملہ کر کے تباہ و برباد کر دیا تھا۔ تفسیر ابوسعود وغیرہ میں ہے کہ چالیس ہزار علماء جو تورات کے حافظ تھے ان کو قتل کر دیا۔ یہ چونکہ مجوسی تھا اس واسطے تورات کو ختم کر دیا۔ قتل وغارت کے ساتھ مکان بھی گرا دیئے، بالکل کھنڈرات بن گئے اور حضرت عزیر علیہ السلام نے اس شہر کو بڑا آباد دیکھا تھا۔

(جیسے کوئٹہ پہلے بڑا اہم شہر ہوتا تھا۔ اکتیس مئی ۱۹۳۵ء میں جب وہاں زلزلہ آیا تو کوئٹہ تباہ ہو گیا۔ ہزاروں کی تعداد میں لوگ تباہ و برباد ہو گئے۔ مجھے باسٹھ سال بعد پھر کوئٹہ جانا پڑا۔ میں نے غرق ہونے سے پہلے کوئٹہ دیکھا تھا۔ اب جب کہ دیکھا تو وہ پہلے سے بھی زیادہ بارونق تھا۔)

اور اب حضرت عزیر علیہ السلام نے دیکھا تو بالکل تباہ و برباد اور کھنڈر بن چکا تھا۔ عزیر علیہ السلام اپنے گدھے پر سوار تھے اور کھانے کے لیے انجیر ان کے پاس تھی اور کچھ پھلوں سے نکلا ہوا جوس یعنی نبیذ بھی ان کے پاس تھی۔ جب وہاں سے گزرے اور شہر کی تباہی اور بربادی دیکھی تو حیران ہوئے اور تعجب کے ساتھ کہا کہ یہ شہر پھر آباد ہوگا؟ کیا اللہ تعالیٰ اس کو پھر آباد کرے گا اور کس طرح کرے گا؟ اللہ تعالیٰ نے حضرت عزیر علیہ السلام کو وفات دے دی۔ وہ سو سال مُردہ رہے اور اللہ تعالیٰ کی قدرت کہ ان کے پاس جو انجیر اور جوس تھا وہ سو سال تک خراب نہ ہوئے۔ حالانکہ تمام پھلوں میں جلدی خراب ہونے والا پھل انجیر ہے۔ اس کا ذکر قرآن پاک میں ہے ﴿وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ﴾ اللہ تعالیٰ نے تین (انجیر) میں بڑی خصوصیات رکھی ہیں۔ یہ معدے کو درست کرتا ہے، بواسیر کے لیے بڑا مفید ہے۔ خون کی اصلاح کے لیے بہت عمدہ ہے۔ گھٹنوں کے درد اور دیگر جسم کے دردوں کے لیے بڑا مفید ہے مگر زیادہ دیر رُہ نہیں سکتا۔ البتہ لوگ خشک کر کے رکھتے ہیں اور جوس بھی زیادہ دیر صحیح نہیں رہتا خراب ہو جاتا ہے۔ اور گدھا مرا ہوا اور اس کی ہڈیاں بکھری پڑی تھیں حالانکہ گدھا زیادہ دیر زندہ رہ سکتا ہے مگر یہ رب تعالیٰ کی قدرت تھی جو چیز جلد خراب ہونے والی تھی وہ محفوظ اور جو دیر تک رہ سکتی ہے اس کی ہڈیاں بکھری پڑی ہیں۔

سو سال کے بعد جب رب تعالیٰ نے ان کو اُٹھایا تو فرمایا کہ تم کتنا عرصہ ٹھہرے رہے ہو؟ تو فرمایا پروردگار! ایک دن یا دن کا کچھ حصہ۔ یعنی اگر وہی دن ہے تو دن کا کچھ حصہ ہے اور اگر دوسرا دن ہے تو پھر مکمل دن ہے۔ ﴿قَالَ﴾ رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿بَلْ لَّبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ﴾ تم ٹھہرے ہو موت کی حالت میں سو سال ﴿فَانْظُرْ﴾ دیکھو ﴿اِلٰى طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ﴾ اپنے انجیر کو اور جوس کو ﴿لَمْ يَتَسَنَّهْ﴾ ان میں کوئی تغیر پیدا نہیں ہوا ﴿وَانْظُرْ اِلٰى حِمَارِكَ﴾ اور اپنے گدھے کو۔ تیرے سامنے ہم اس کی بکھری ہوئی ہڈیوں کو جوڑیں گے اور ان پر گوشت چڑھائیں گے، چمڑا چڑھائیں گے تیرا گدھا بن جائے گا۔

سو سال کے بعد جب واپس گئے تو جس شہر میں آباد تھے اس کا حلیہ بھی بدلا ہوا تھا۔ ان کے پڑوس میں ایک عورت تھی وہ اس وقت جوان ہوتی تھی جس وقت حضرت عزیر علیہ السلام یہاں سے گئے تھے۔ اب وہ بوڑھی اور آنکھوں سے نابینا ہو گئی تھی۔ اور بے چاری کے گھٹنے، ٹخنے جُڑ (پتھرا) گئے تھے چل پھر نہیں سکتی تھی۔ اس بوڑھی کو بیٹھے دیکھا تو اس سے دریافت فرمایا اَيْنَ بَيْتُ عُزَيْرٍ کہ عزیر علیہ السلام کا گھر کہاں ہے؟ تو اس نے کہا تم کون ہو؟ فرمایا میں عزیر ہوں۔ اُس نے کہا کہ عزیز اس وقت کہاں سے

آ گئے وہ تو کہیں فوت ہو گئے ہوں گے۔ فرمایا نہیں میں عزیر ہوں۔ بوڑھی کہنے لگے وہ تو بڑے مقبول الدعا تھے۔ اگر واقعی تو عزیر ہے تو میرے واسطے دعا کر کہ میری آنکھیں درست ہو جائیں تا کہ میں تجھے بھی دیکھوں اور دوسری چیزوں کو بھی دیکھوں اور میں اپاہج ہوگئی ہوں اُٹھ نہیں سکتی دعا کر کہ رب تعالیٰ مجھے درست کر دے۔

حضرت عزیر علیہ السلام نے دعا کی تو اللہ تعالیٰ نے اس بوڑھی کی آنکھیں درست فرما دیں اور پاؤں بھی تندرست ہو گئے اور وہ چلنے پھرنے لگ گئی۔ وہ ان کو لے کر گئی کہ آؤ میں تمھیں تمھارا گھر دکھاتی ہوں۔ پہلے حضرت عزیر علیہ السلام کا گھر کنارے پر تھا مگر اب آبادی کے پھیل جانے کی وجہ سے درمیان میں آ گیا تھا۔ اس وقت حضرت عزیر علیہ السلام کا ایک بیٹا زندہ تھا۔ جس کی عمر ایک سو اٹھارہ سال تھی۔ پوتے پڑپوتے بھی بوڑھے ہو گئے تھے۔ اُس مائی نے دکھایا کہ یہ تمھارا گھر ہے۔ جب عزیر علیہ السلام اندر داخل ہونے لگے تو پوتے پڑپوتوں نے کہا کہ بابا کہاں جا رہے ہو؟ جواب دیا کہ میں اپنے گھر جا رہا ہوں۔ کہنے لگے واپس جا یہاں تیرا گھر کہاں سے آ گیا؟ اس بوڑھی نے کہا کہ تمھارا باپ ہے، دادا ہے۔

حضرت عزیر علیہ السلام کے بیٹے نے کہا کہ ہمیں باپ کی دو چیزیں یاد ہیں۔ ان کے بین الکتفین، دونوں کندھوں کے درمیان چاند کی طرح ایک نشان تھا اور دوسری چیز یہ ہے کہ وہ تورات کے حافظ تھے۔ چنانچہ ان کا کرتہ اُٹھایا گیا تو دونوں کندھوں کے درمیان چاند کا نشان موجود تھا۔ اور انھوں نے تورات کھول کر آپ علیہ السلام کے آگے رکھی کہ سنائیں۔ چنانچہ اُنھوں نے ساری تورات سنا دی تو سب کو یقین آ گیا کہ واقعی حضرت عزیر علیہ السلام ہیں۔ اُن کے ان معجزوں کو دیکھ کر یہود نے ان کو رب کا بیٹا بنا دیا۔ ﴿وَ قَالَتِ الْیَهُوْدُ عُزَیْرُ ابْنُ اللّٰهِ﴾ "اور کہا یہود نے کہ عزیر علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے بیٹے ہیں۔" وہ اللہ تعالیٰ کے صاحبِ معجزات پیغمبر تھے۔ یہ ان کا ذکر ہے۔

﴿اَوْ كَالَّذِیْ﴾ یا اس شخص کی مثال ﴿مَرَّ عَلٰی قَرْیَةٍ﴾ جو گزرا ایک بستی کے پاس سے۔ وہ بیت المقدس کی بستی تھی ﴿وَّ هِیَ خَاوِیَةٌ﴾ اور وہ بستی گری ہوئی تھی ﴿عَلٰی عُرُوْشِهَا﴾ اپنی چھتوں کے بل۔ وہ اس طرح کہ پہلے چھتیں گریں پھر ان کے اُوپر دیواریں گریں ﴿قَالَ﴾ فرمایا ﴿اَنّٰی﴾ کس طرح ﴿یُحْیٖ﴾ زندہ کرے گا آباد کرے گا ﴿هٰذِهِ اللّٰهُ﴾ اس شہر کو اللہ تعالیٰ ﴿بَعْدَ مَوْتِهَا﴾ اس کے مر چکنے کے بعد یعنی تباہ ہونے کے بعد ﴿فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ﴾ پس اللہ تعالیٰ نے اس کو مُردہ رکھا سو سال ﴿ثُمَّ بَعَثَهٗ﴾ پھر اللہ تعالیٰ نے ان کو اُٹھایا ﴿قَالَ﴾ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿كَمْ لَبِثْتَ﴾ کتنا دیر تو ٹھہرا رہا ﴿قَالَ﴾ فرمانے لگے ﴿لَبِثْتُ یَوْمًا﴾ ٹھہرا میں ایک دن ﴿اَوْ بَعْضَ یَوْمٍ﴾ یا دن کا کچھ حصہ ﴿قَالَ﴾ فرمایا اللہ تعالیٰ نے ﴿بَلْ لَّبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ﴾ بلکہ تم ٹھہرے ہو موت کی حالت میں سو سال ﴿فَانْظُرْ اِلٰی طَعَامِكَ﴾ پس دیکھ تو اپنے کھانے کی چیز کی طرف جو کہ انجیر کے دانے تھے ﴿وَ شَرَابِكَ﴾ اور اپنے پینے کی چیز کی طرف، جو کہ جوس تھا ﴿لَمْ یَتَسَنَّهْ﴾ نہ کھانا متغیر ہوا اور نہ جوس خراب ہوا ﴿وَ انْظُرْ اِلٰی حِمَارِكَ﴾ اور دیکھ اپنے گدھے کی طرف ﴿وَ لِنَجْعَلَكَ اٰیَةً﴾ اور تا کہ بنائیں ہم تجھے نشانی ﴿لِّلنَّاسِ﴾ لوگوں کے واسطے ﴿وَ انْظُرْ اِلَی الْعِظَامِ كَیْفَ نُنْشِزُهَا﴾ اور دیکھ ہڈیوں کی طرف کیسے ہم ان کو جوڑتے ہیں ﴿ثُمَّ نَكْسُوْهَا لَحْمًا﴾ پھر ہم

پہناتے ہیں ان ہڈیوں پر گوشت ﴿فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗ﴾ پس جب اچھی طرح واضح ہوئی حقیقت اس کے سامنے ﴿قَالَ﴾ کہا اس نے ﴿اَعْلَمُ﴾ میں جانتا ہوں ﴿اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ﴾ بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔

دوسرا واقعہ: ﴿وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ﴾ اور جب فرمایا ابراہیم علیہ السلام نے ﴿رَبِّ﴾ اے میرے رب ﴿اَرِنِیْ﴾ تو مجھے دکھا ﴿كَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰى﴾ تو کس طرح مُردوں کو زندہ کرے گا۔ یعنی مُردوں کو زندہ کرنے کی کیفیت کیا ہے؟ کَیْفَ کے لفظ ہیں ﴿قَالَ﴾ فرمایا ﴿اَوَلَمْ تُؤْمِنْ﴾ یا تو ایمان نہیں لایا کہ میں مُردوں کو زندہ کیا کرتا ہوں ﴿قَالَ بَلٰى﴾ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا اے پروردگار! میرا ایمان ہے کہ تو مردوں کو زندہ کرتا ہے ﴿وَلٰكِنْ﴾ اور لیکن (کیفیت دیکھ کر) ﴿لِّیَطْمَىِٕنَّ قَلْبِیْ﴾ تا کہ میرا دل مطمئن ہو جائے۔ نفسِ احیاءِ موتی کا تو مجھے یقین ہے لیکن کیفیت دیکھ کر مزید میں اطمینان اور تسلی حاصل کرنا چاہتا ہوں۔

﴿قَالَ﴾ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّیْرِ﴾ پس پکڑ لے تو چار پرندے ﴿فَصُرْهُنَّ اِلَیْكَ﴾ پس مانوس کر تو ان کو اپنے ساتھ۔ وہ چار پرندے کیا تھے؟

تفسیر بیضاوی، ابوالسعود، معالم التنزیل وغیرہ تفسیروں میں ہے کہ ایک مور تھا جس کو اپنے حسن پر بڑا گھمنڈ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی بڑی خوب صورت شکل بنائی ہے۔ پاؤں ذرا بدصورت سے ہوتے ہیں۔

❀...... دوسرا ان میں سے مرغا تھا۔ اور مرغے میں شہوت زیادہ ہوتی ہے۔

❀...... تیسرا ان میں سے غُراب (کوا) یہ خسیس الطبع ہوتا ہے۔ طبعی شرافت سے محروم ہوتا ہے۔

❀...... چوتھا کبوتر تھا اور کبوتر اپنی مراد حاصل کرنے میں جلدی کرتا ہے۔ اور انسان انھی چیزوں سے مرکب ہے۔ شہوت اللہ تعالیٰ نے اس میں رکھی ہے۔ اپنے حسن و جمال پر مغرور رہتا ہے۔ خسیس الطبع بھی ہے اِلَّا مَاشَآءَ اللّٰہُ، اللہ تعالیٰ کے نیک بندے بھی دنیا میں موجود ہیں لیکن اکثر خسیس الطبع ہیں۔ اور ہر آدمی اپنی مراد حاصل کرنے میں جلد بازی سے کام لیتا ہے۔ تو یہ چار جانور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے لیے اور اُن کو اپنے ساتھ مانوس کیا۔ اور جانور بھی آدمی کے ساتھ مانوس ہو جاتے ہیں۔ طوطا دیکھو، مَینا دیکھو، ان کو مانوس کرو تمھارے ساتھ بیٹھیں گے بلکہ تمھارے ہاتھ سے چیزیں چھین لیں گے۔

جب وہ مانوس ہو گئے جس وقت ان کو بلاتے وہ جانور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس پہنچ جاتے۔ تو فرمایا اب تو ان جانوروں کو ذبح کر اور ان کے سر اپنے پاس رکھ لے اور باقی جو گوشت ہے اس کا قیمہ بنا اور اس قیمے میں ہڈیاں، پَر، ٹانگیں، ہر چیز ملا دے اور سب کا اکٹھا قیمہ بنانا ہے اور پھر قریب قریب جو پہاڑ ہیں وہ قیمہ شدہ گوشت تھوڑا تھوڑا کر کے رکھ دے سروں کے بغیر۔ جب ابراہیم علیہ السلام نے رکھ دیا تو فرمایا اب تو ان کو بلا۔ مثلاً: پہلے مرغ کو آواز دے کہ اے مرغ! آ جا۔ چونکہ سب کا گوشت کاٹ کاٹ کر اکٹھا قیمہ بنایا تھا تو انھوں نے دیکھا کہ فضا میں مرغ کا گوشت دوسروں سے الگ ہو کر مرغ کے سر کے ساتھ جُڑ گیا۔ اور رب نے اس میں جان ڈال دی۔ وہ مرغا اسی طرح بولنے لگا جس طرح پہلے بولتا تھا۔

اسی طرح کوے کا گوشت بھی دوسروں سے الگ ہو کر اپنے سر کے ساتھ آملا۔ اسی طرح مور کا گوشت مور کے سر کے

ساتھ مل گیا اور وہ زندہ ہو گیا۔ تو چاروں پرندے جس طرح پہلے تھے اسی طرح ہو گئے۔ یہ ان تفسیروں کا خلاصہ ہے جو بیضاوی، معالم التنزیل، مدارک، ابوسعود وغیرہ میں ہے۔

تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّیْرِ﴾ اے ابراہیم علیہ السلام! پس تو پکڑ چار پرندے ﴿فَصُرْهُنَّ اِلَیْكَ﴾ پس تو ان کو اپنی طرف مانوس کر ﴿ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰى كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا﴾ پھر ذبح کر کے ان کو رکھ دے۔ آس پاس کی تمام پہاڑیوں پر ان کے ٹکڑے رکھ دے ﴿ثُمَّ ادْعُهُنَّ﴾ پھر تو ان کو بلا ﴿یَاْتِیْنَكَ سَعْیًا﴾ وہ زندہ ہو کر تیرے پاس دوڑتے ہوئے آئیں گے۔ تو رب تعالیٰ نے کیفیت بیان فرمائی اِحیاءِ موتیٰ کی۔ کیوں کہ نفس موتیٰ کے احیاء پر تو یقین تھا مگر اس کی کیفیت نہ دیکھی تھی کہ اجزاء کس طرح جڑتے ہیں اور ان میں جان کس طرح ڈالی جاتی ہے۔ وہ سب کچھ آنکھوں کے ساتھ دیکھ لیا ﴿وَاعْلَمْ﴾ اور اے ابراہیم! جان لے ﴿اَنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ﴾ بے شک اللہ تعالیٰ غالب بھی ہے حکمت والا بھی ہے۔ وہ جو چاہے کرے اُس کے لیے کوئی کام مشکل نہیں ہے۔

﴿مَثَلُ الَّذِیْنَ﴾ مثال ان لوگوں کی ﴿یُنْفِقُوْنَ﴾ جو خرچ کرتے ہیں ﴿اَمْوَالَهُمْ﴾ اپنے مال ﴿فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ﴾ اللہ تعالیٰ کے راستے میں ﴿كَمَثَلِ حَبَّةٍ﴾ جیسے مثال ہے دانے کی ﴿اَنْۢبَتَتْ﴾ جس دانے نے اُگائے ﴿سَبْعَ سَنَابِلَ﴾ سات خوشے ﴿فِیْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ﴾ ہر خوشے میں ﴿مِّائَةُ حَبَّةٍ﴾ سو دانے ہیں ﴿وَاللّٰهُ یُضٰعِفُ﴾ اور اللہ بڑھاتا ہے ﴿لِمَنْ یَّشَآءُ﴾ جس کے لیے چاہے ﴿وَاللّٰهُ﴾ اور اللہ تعالیٰ ﴿وَاسِعٌ﴾ کشائش کرنے والا ہے ﴿عَلِیْمٌ﴾ جاننے والا ہے ﴿اَلَّذِیْنَ﴾ وہ لوگ ﴿یُنْفِقُوْنَ﴾ جو خرچ کرتے ہیں ﴿اَمْوَالَهُمْ﴾ اپنے مال ﴿فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ﴾ اللہ تعالیٰ کے راستے میں ﴿ثُمَّ لَا یُتْبِعُوْنَ﴾ پھر نہیں جتاتے اُس کے پیچھے ﴿مَاۤ اَنْفَقُوْا﴾ جو اُنھوں نے خرچ کیا ﴿مَنًّا﴾ احسان ﴿وَّلَاۤ اَذًى﴾ نہ اذیت دیتے ہیں ﴿لَّهُمْ اَجْرُهُمْ﴾ ان کے واسطے ان کا اجر ہے ﴿عِنْدَ رَبِّهِمْ﴾ اُن کے رب کے ہاں ﴿وَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ﴾ اور نہ خوف ہوگا ان پر ﴿وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ﴾ اور نہ وہ غم کریں گے ﴿قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ﴾ بات اچھی ﴿وَّمَغْفِرَةٌ﴾ اور درگزر کرنا ﴿خَیْرٌ﴾ بہتر ہے ﴿مِّنْ صَدَقَةٍ﴾ اس صدقے سے ﴿یَّتْبَعُهَاۤ اَذًى﴾ جس صدقے کے پیچھے دکھ اور اذیت ہو ﴿وَاللّٰهُ غَنِیٌّ﴾ اور اللہ تعالیٰ بے پروا ہے ﴿حَلِیْمٌ﴾ تحمل کرنے والا ہے ﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا﴾ اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو ﴿لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ﴾ نہ باطل کرو اپنے صدقات کو ﴿بِالْمَنِّ﴾ احسان جتلا کر ﴿وَالْاَذٰى﴾ اور اذیت پہنچا کر ﴿كَالَّذِیْ﴾ اس شخص کی طرح ﴿یُنْفِقُ مَالَهٗ﴾ جو خرچ کرتا ہے اپنا مال ﴿رِئَآءَ النَّاسِ﴾ لوگوں کو دکھانے کے لیے ﴿وَلَا یُؤْمِنُ﴾ اور نہیں

ایمان لاتا ﴿ بِاللّٰهِ ﴾ اللہ تعالیٰ پر ﴿ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ﴾ اور آخرت کے دن پر ﴿ فَمَثَلُهٗ ﴾ پس اس کی مثال ﴿ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ ﴾ جیسے مثال ہے ایک چٹان کی ﴿ عَلَيْهِ تُرَابٌ ﴾ اس چٹان پر مٹی ہے ﴿ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ ﴾ پس پہنچی اس پر زور کی بارش ﴿ فَتَرَكَهٗ صَلْدًا ﴾ پس چھوڑ دیا اس چٹان کو صاف ﴿ لَا يَقْدِرُوْنَ ﴾ نہیں قادر ﴿ عَلٰى شَيْءٍ ﴾ کسی چیز پر ﴿ مِّمَّا كَسَبُوْا ﴾ جو اُنھوں نے کمائی ﴿ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ﴾ اور اللہ تعالیٰ ہدایت نہیں دیتا اس قوم کو جو کفر پر اَڑی رہے۔

انفاق فی سبیل اللہ کی شرائط

اس سے دو رکوع پہلے ذکر تھا ﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ ﴾ "اے ایمان والو! خرچ کرو اس مال میں سے جو ہم نے تمھیں دیا ہے۔" اب مال کے قبول ہونے کی شرائط کا ذکر کرتے ہیں۔ اور کچھ شرائط اس رکوع میں بیان ہوں گی اور کچھ اگلے رکوع میں۔ اے ایمان والو! جو مال تم خرچ کرتے ہو اس کے واسطے کچھ شرائط بھی ہیں۔ اگر وہ شرائط پائی گئیں تو پھر تمھارا مال اللہ تعالیٰ کے راستے میں قبول ہوگا۔ ان تمام شرائط کا میں خلاصہ بیان کرتا ہوں۔ تمام اعمال کے لیے پہلی اور بنیادی شرط ایمان ہے۔ اگر ایمان ہے تو نماز بھی قبول ہے، خیرات بھی قبول ہے، روزہ اور حج بھی قبول ہے۔ غرضیکہ جو بھی نیکی کرو گے قبول ہوگی کیوں کہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ ایمان کی حالت میں جو بھی نیکی کرو گے قبول کروں گا۔ اگر ایمان نہیں تو کوئی نیکی قبول نہیں ہے۔

تیرھویں پارے میں رب تعالیٰ نے مثال کے ذریعہ سمجھایا ہے ﴿ مَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ اَعْمَالُهُمْ كَرَمَادِ ۟اشْتَدَّتْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ يَوْمٍ عَاصِفٍ ﴾ [ابراہیم:۱۸] "جن لوگوں نے اپنے پروردگار سے کفر کیا اُن کے اعمال کی مثال راکھ کی سی ہے کہ آندھی کے دن اُس پر زور کی ہوا چلے تو اُسے اُڑا کر لے جاتی ہے۔" کیوں کہ اس میں ٹھہرنے کی قوت نہیں ہے۔ اسی طرح کافروں کے اعمال ہیں کہ وہ ایمان کے بغیر راکھ کے ڈھیر کی طرح ہیں کیوں کہ کافر بھی اچھے کام کرتے ہیں۔ انھوں نے ہسپتال بنائے، سڑکیں اور پُل بناتے ہیں یعنی رفاہِ عام کے کام وہ کرتے ہیں۔ بلکہ تم یہ کہہ سکتے ہو کہ مسلمان قوم سے بڑھ چڑھ کر کرتے ہیں۔ اس واسطے وہ کہتے تھے کہ ہم جو نیک کام کرتے ہیں کیا ہمیں ان کا اجر نہیں ملے گا؟ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ کفر کی حالت میں جو کام کرتے ہیں وہ راکھ کے ڈھیر کی مانند ہیں۔

تو اعمال کی بنیاد ایمان ہے اور ایمان میں جتنی قوت ہوگی عمل اُتنا ہی وزنی ہوگا۔ دوسری شرط ہے اخلاص۔ اگر عمل ہے اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے تو اس کا اجر ملے گا۔ اور اگر ریاکاری کے لیے ہے تو اس کے متعلق فرمایا ﴿ كَالَّذِيْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ ﴾ اس شخص کی طرح جس نے خرچ کیا لوگوں کو دکھانے کے لیے تو وہ برباد ہے اس کا کوئی اجر نہیں ہے بلکہ گناہ ہے۔ تیسری شرط ہے اتباعِ سنت یعنی اگر عمل سنت کی پیروی میں ہوگا تو قبول ہوگا اور اگر ظاہری طور پر عمل اچھا نظر آتا ہے مگر سنت کی مہر نہیں لگی

ہوئی تو وہ برباد اور بے کار ہے۔ ایمان، اخلاص اور اتباعِ سنت۔ اگر یہ تین شرطیں موجود ہیں تو اعمال اللہ تعالیٰ کے ہاں مقبول ہیں۔ پھر آگے مال کے لیے یہ شرط بھی آئے گی کہ حلال اور طیب بھی ہو۔ کیوں کہ حرام کے مال کا صدقہ خیرات قبول نہیں ہے۔

اس مقام پر ارشاد ہے:

﴿مَثَلُ الَّذِیْنَ﴾ ان لوگوں کے خرچ کرنے کی مثال ﴿یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ﴾ جو خرچ کرتے ہیں اپنے مال اللہ تعالیٰ کے راستے میں۔ عام حالات میں ایک نیکی کا اجر دس گنا ہے۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا﴾ جس نے نیکی کی پس اس کو دس گنا اجر ملے گا۔ مثلاً: ایک مرتبہ کہتا ہے سبحان اللہ! تو اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کی دس نیکیاں لکھی گئیں۔ اسی طرح ایک مرتبہ کسی مسلمان بھائی کو کہتا ہے السلام علیکم! دس نیکیاں مل گئیں یا سلام کا جواب دیتا ہے وعلیکم السلام! اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے دس نیکیاں مل گئیں اور فی سبیل اللہ کی مد میں ادنیٰ نیکیاں سات سو گنا ہیں اور فی سبیل اللہ کی کافی مدات ہیں۔

پہلے نمبر کی مد علم دین حاصل کرنا ہے۔ جو حضرات دین کا علم حاصل کرتے ہیں یعنی طالب العلم ہیں ان پر خرچ کرنے والے کو ایک پیسہ کا سات سو پیسہ اور ایک روپیہ کا سات سو روپیہ کے حساب سے ملے گا۔ یہ ادنیٰ درجہ ہے زیادہ جس کو چاہے رب تعالیٰ دے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص علم حاصل کرنے کے لیے ایک قدم بھی رکھے گا تو اس کو سات سو نیکیاں ملیں گی۔ مثال کے طور پر تم صبح گھر سے چلے ہو یہ ارادہ لے کر کہ ان شاء اللہ تعالیٰ ہم نے قرآن پاک کا یا حدیث شریف کا درس سننا ہے۔ کیوں کہا ((اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ)) کہ اعمال کا دارومدار نیت پر ہے۔ تو ایک ایک قدم پر سات سات سو نیکیاں ہیں اور قدم دونوں طرف کے شمار ہوں گے۔ یعنی آتے ہوئے بھی اور جاتے ہوئے بھی۔ اور اگر کسی شخص نے کرایہ خرچ کیا ہے یا سکوٹر وغیرہ میں تیل ڈلوایا ہے تو جتنا خرچ کیا ہے ایک روپے کے بدلے سات سو روپے کے حساب سے ملے گا۔

فی سبیل اللہ کی دوسری مد تبلیغ دین ہے۔ یعنی دین کی تبلیغ کے لیے نکلنا۔ تو وہ لوگ جو دین کی تبلیغ کر رہے ہیں ان کا سفر اور ان کا پیسہ خرچ کرنا یا ان پر پیسہ خرچ کرنا یہ بھی فی سبیل اللہ کی مد میں ہے۔ فی سبیل اللہ کی تیسری مد جہاد ہے۔ اِعلاء کلمۃ اللہ کے لیے کافروں سے لڑنا۔ اور جہاد بھی اسلام کا جزء ہے۔ جس طرح تبلیغ ایک شعبہ ہے اسی طرح جہاد بھی ایک شعبہ ہے۔ فی سبیل اللہ کی چوتھی مد باطل کی تردید کے لیے تحریر کرنا ہے یعنی جہاد بالقلم۔ اسی طرح جو لوگ دین کی حمایت میں چندہ دیتے ہیں وہ بھی فی سبیل اللہ کی مد میں ہے۔ اسی طرح جو حاجی حج کے لیے جا رہا ہے اس کے قدم بھی فی سبیل اللہ کی مد میں ہیں۔ بخاری شریف اور مسلم شریف کی روایت کے مطابق جو آدمی جمعہ پڑھنے کے لیے جاتا ہے اس کے قدم بھی فی سبیل اللہ کی مد میں ہیں۔ اسی طرح وہ شخص جو جائز کمائی کے لیے گھر سے نکلتا ہے چاہے وہ تجارت کرتا ہے، زراعت کرتا ہے، ملازمت کرتا ہے یا مزدوری کرتا ہے بشرطیکہ کام جائز ہو اور عقیدہ بھی صحیح ہو اور نماز روزے کا بھی پابند ہو تو اس کا جو قدم ہوگا وہ بھی فی سبیل اللہ کی مد میں ہے۔

تو فرمایا ﴿مَثَلُ الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ﴾ مثال ان لوگوں کی جو خرچ کرتے ہیں ﴿اَمْوَالَهُمْ﴾ اپنے مالوں کو ﴿فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ﴾

اللہ تعالیٰ کے راستے میں ﴿كَمَثَلِ حَبَّةٍ﴾ جیسے مثال ہے دانے کی ﴿اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ﴾ اُگاتا ہے وہ دانہ سات خوشے۔ سَنَابِلَ جمع ہے سُنْۢبُلَةٌ کی، خوشہ۔ ﴿فِیْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ﴾ ہر خوشے کے ساتھ سو دانے ہیں۔ ہم نے پہاڑی علاقوں میں مکئی کو دیکھا ہے۔ بسا اوقات ایک ایک پودے کے ساتھ سات سات، آٹھ آٹھ خوشے بھی لگے ہوتے ہیں اور ایک ایک خوشے سے سو سو سے زیادہ دانے بھی نکلتے ہیں۔ تو کسان نے زمین میں ایک دانہ ڈالا ہے اللہ تعالیٰ نے اس سے جو پودا اُگایا ہے اس کے سات خوشے لگے ہوتے ہیں اور ہر خوشے میں سو سو دانے ہیں۔ تو جو اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرتا ہے اس کو اسی طرح سمجھو کہ جو بھی نیکی کرے گا وہ سات سو گنا تک بڑھ جاتی ہے اور اسی پر بس نہیں ﴿وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ﴾ اور اللہ تعالیٰ بڑھا دیتا ہے جس کے لیے چاہتا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ جس کے لیے چاہے اس سے بڑھا دے ﴿وَاللّٰهُ وَاسِعٌ﴾ اور اللہ تعالیٰ بڑی وسعت والا ہے ﴿عَلِيْمٌ﴾ سب کچھ جاننے والا ہے۔ اس سے زیادہ علم کس کے پاس ہے۔

صدقہ کے بعض احکام

آگے صدقات کو باقی رکھنے کی شرائط کا ذکر ہے۔ ایمان، اخلاص، اتباعِ سنت یہ شرطیں ہیں قبولیت کی۔ اور صدقات کو باقی رکھنے کی شرائط یہ ہیں۔ اور یہ شرائط بڑی سمجھنے والی ہیں اور یاد رکھنے کے قابل ہیں۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ﴿اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ﴾ وہ لوگ جو خرچ کرتے ہیں ﴿اَمْوَالَهُمْ﴾ اپنے مال ﴿فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ اللہ تعالیٰ کے راستے میں ﴿ثُمَّ لَا يُتْبِعُوْنَ﴾ پھر پیچھے نہ لگائے ﴿مَآ﴾ اس چیز کے ﴿اَنْفَقُوْا﴾ جو اُنھوں نے خرچ کی ﴿مَنًّا﴾ احسان۔ یعنی احسان نہیں جتلاتے کہ میں نے تیرے ساتھ یہ بھلائی کی ہے ﴿وَّلَآ اَذًى﴾ اور نہ اذیت دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک شخص نے خاصی رقم اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر کسی شخص کو دے دی۔ اگر اس شخص نے یہ نیکی ایمان، اخلاص اور اتباعِ سنت کے ساتھ کی ہے تو اسے امید رکھنی چاہیے کہ اسے اجر ملے گا۔ لیکن ایک ماہ گزرنے کے بعد یا پانچ سال کے بعد یا دس سال کے بعد یا بیس سال کے بعد یا پچاس سال کے بعد اس نے اس کو احسان جتایا کہ میں نے تجھے فلاں وقت اتنی رقم دی تھی، نیکی ضائع ہوگئی۔ اور اس احسان جتانے کا گناہ الگ ہے۔ چاہے پہلے دن احسان جتلائے یا سو سال بعد جتلائے۔

اور دوسری چیز ہے اذیت دینا۔ اور اذیت دینا یہ ہے کہ مثال کے طور پر کسی آدمی نے جس پر احسان کیا ہے اُس نے کوئی بات اس کی مرضی کے خلاف کر دی اور اس نے کہا میرا کھانے والے میرے سامنے باتیں کرتا ہے اور بولتا ہے۔ تو ایسا کرنے سے اس کے صدقے کا اجر بالکل باطل ہوگیا۔ یا ویسے اس کو حقیر سمجھے کہ اس کے ساتھ ایسا معاملہ کرے کہ جس میں اس کی حقارت اور ذلت ہو۔ کیوں کہ اذیت قولی بھی ہوتی ہے اور فعلی بھی۔

تو جو نہ احسان جتلاتے ہیں اور نہ اذیت پہنچاتے ہیں ﴿لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ﴾ ان کے لیے ان کا اجر ہے اُن کے رب کے پاس ﴿وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ﴾ اور نہ ان پر کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ رب تعالیٰ فرماتے ہیں

﴿قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ﴾ اچھی بات ﴿وَّ مَغْفِرَةٌ﴾ اور درگزر کردینا ﴿خَيْرٌ﴾ بہتر ہے ﴿مِّنْ صَدَقَةٍ﴾ اس صدقے سے ﴿يَّتْبَعُهَاۤ اَذًى﴾ کہ جس کے پیچھے اذیت دی جائے۔مثال کے طور پر کسی آدمی نے کسی کو پانچ دس روپے دیئے اور دینے کے بعد اسے کوستا ہے ذلیل کرتا ہے کہ تو موٹا تازہ، ہٹا کٹا ہے اور مانگتا پھرتا ہے۔تو دینے کے بعد ایسے الفاظ کہنے سے بہتر ہے کہ دینے سے پہلے کہہ دے بابا معاف کر۔اور اگر مقصد سمجھانا ہے تو پہلے سمجھائے کہ بھائی جی! تم اچھے بھلے ہو آنکھیں تمھاری صحیح ہیں، ہاتھ پاؤں تمھارے درست ہیں، صحت مند ہو، مانگنا اچھی عادت نہیں۔دینے کے بعد اذیت نہ پہنچاؤ کہ اس طرح صدقہ بھی باطل ہوگیا اور اس کی دل آزاری کا گناہ الگ ہے ﴿وَاللّٰهُ غَنِيٌّ﴾ اور اللہ تعالیٰ بے پرواہ ہے کہ وہ تمھارے صدقات کا محتاج نہیں ہے ﴿حَلِيْمٌ﴾ حوصلے والا ہے کہ اگر تمھیں فوری طور پر سزا نہیں دیتا تو وجہ یہ ہے کہ تحمل والا ہے، جلد باز نہیں ہے۔

آگے مزید فرماتے ہیں ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو ﴿لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ﴾ نہ ضائع کرو اپنے صدقات کو ﴿بِالْمَنِّ﴾ احسان جتلا کر ﴿وَالْاَذٰى﴾ اور اذیت دے کر۔تو یہ نص قطعی واضح کر رہی ہے کہ صدقہ کرنے کے بعد احسان جتلائے گا یا اذیت پہنچائے گا تو صدقہ ضائع ہو جائے گا ﴿كَالَّذِيْ﴾ اس شخص کی طرح (اپنے صدقات کو باطل نہ کرو) ﴿يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ﴾ جو اپنا مال خرچ کرتا ہے لوگوں کو دکھانے کے لیے ﴿وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ﴾ اور نہیں ایمان لاتا اللہ تعالیٰ پر ﴿وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ﴾ اور آخرت کے دن پر۔یعنی جس طرح اس شخص کے صدقات باطل ہیں جو ریا اور دکھاوے کے طور پر خرچ کرتا ہے اُسی طرح تم اپنے صدقات، احسان اور اذیت پہنچا کر ضائع نہ کرو۔سبق کے طور پر بات کو یاد رکھنا کہ جس کے ساتھ تم نے نیکی کی ہے اگر وہ بعد میں بگڑ بھی جائے۔(کیوں کہ ہم نے ایسے دیکھے ہیں کہ جن کی پرورش ہوتی ہے لیکن بعد میں بگڑ جاتے ہیں۔) تو تم نے اس پر جو نیکی کی ہے وہ یاد نہیں کرانی کیوں کہ اگر تم ایسا کرو گے تو تمھاری نیکی ضائع ہو جائے گی۔مثلاً: کسی ایسے شخص کو جس کی پرورش تم نے کی ہے یہ کہو کہ آج تو باتیں کرتا ہے حالانکہ ہمارا ہی کھا کے تو جوان ہوا ہے۔بس اتنے الفاظ سے صدقہ باطل ہوگیا۔

آگے اللہ تعالیٰ ایک مثال کے ذریعے سمجھانا چاہتے ہیں۔مثال یہ ہے کہ ایک بہت بڑی چٹان ہے اور اس پر کافی مٹی پڑی ہوئی ہے۔اور اللہ تعالیٰ نے مٹی میں یہ خاصیت رکھی ہے کہ اس میں چیزیں اُگتی ہیں۔کسی آدمی نے اس مٹی میں کوئی چیز کاشت کی پھر بارش ہوئی وہ اُگ گئی اب اُمید تھی کہ سبزی کھائیں گے فصل کاٹیں گے اور فائدہ ہوگا، لیکن بعد میں اتنی زور کی بارش ہوئی کہ چٹان پر جو مٹی تھی اس کو بہا کر لے گئی۔تو جب مٹی ہی نہ رہی تو فصل کہاں رہی؟ پس وہ چٹان صاف ہوگئی۔اسی طرح تم صدقہ خیرات کرتے ہو اور اس میں اخلاص نہیں محض دکھاوا ہے تو اس کو تم اس طرح سمجھو کہ ایک چٹان ہے اور اس پر مٹی ہے اور اس میں تم نے سبزی وغیرہ کاشت کی ہے پھر احسان جتانے کی اور اذیت پہنچانے کی بارش آئی اور سب کچھ ضائع ہوگیا۔یعنی وہ فصل جو صدقہ وخیرات کی صورت میں کاشت کی تھی وہ ضائع ہوگئی تمھارے ہاتھ کچھ نہیں آئے گا۔

فرمایا ﴿فَمَثَلُهٗ﴾ پس مثال اس احسان جتلانے والے اور اذیت دینے والے کی ایسے ہی ہے ﴿كَمَثَلِ صَفْوَانٍ﴾

جیسے مثال ہے چٹان کی ﴿عَلَیْہِ تُرَابٌ﴾ اس پر مٹی ہے اور اس میں چیزیں ہیں ﴿فَاَصَابَہٗ وَابِلٌ﴾ پس پہنچی اس پر موسلا دھار بارش ﴿فَتَرَکَہٗ صَلْدًا﴾ پس چھوڑ دیا اس چٹان کو صاف، ساری مٹی بہا کر لے گئی ﴿لَا یَقْدِرُوْنَ عَلٰی شَیْءٍ مِّمَّا کَسَبُوْا﴾ نہ قادر ہوئے وہ کسی شے پر اس میں سے جو انھوں نے کمایا ہے۔ تو جس طرح اس شخص کی محنت ضائع ہوگئی اسی طرح تم نیکی (صدقہ وخیرات) کرنے کے بعد احسان جتلاؤ گے یا اذیت پہنچاؤ گے تو تمھاری نیکی ضائع ہوجائے گی ﴿وَاللّٰہُ لَا یَھْدِی الْقَوْمَ الْکٰفِرِیْنَ﴾ اور اللہ تعالیٰ جبراً ہدایت نہیں دیتا کافر قوم کو اس نے انسانوں کو اختیار دیا ہے ﴿فَمَنْ شَآءَ فَلْیُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْیَکْفُرْ﴾ پس جس کا جی چاہے ایمان لائے اور جس کا جی چاہے کفر کرے۔

﴿وَمَثَلُ الَّذِیْنَ﴾ اور مثال ان لوگوں کی ﴿یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَھُمُ﴾ جو خرچ کرتے ہیں اپنے مال ﴿ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰہِ﴾ اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے کے لیے ﴿وَتَثْبِیْتًا مِّنْ اَنْفُسِھِمْ﴾ اور اپنے دلوں کی پختگی کے لیے ﴿کَمَثَلِ جَنَّۃٍ﴾ اس باغ کی طرح ہے ﴿بِرَبْوَۃٍ﴾ جو بلندی پر واقع ہے ﴿اَصَابَھَا وَابِلٌ﴾ پہنچے اس کو موسلا دھار بارش ﴿فَاٰتَتْ اُکُلَھَا ضِعْفَیْنِ﴾ پس وہ اپنا پھل دُگنا دے ﴿فَاِنْ لَّمْ یُصِبْھَا وَابِلٌ﴾ پس اگر نہ پہنچے اس کو زور کی بارش ﴿فَطَلٌّ﴾ تو پھوار ہی اس کے لیے کارآمد ہوگی ﴿وَاللّٰہُ﴾ اور اللہ تعالیٰ ﴿بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ﴾ جو کچھ تم کرتے ہو خوب دیکھتا ہے ﴿اَیَوَدُّ اَحَدُکُمْ﴾ کیا تم میں سے کوئی اس بات کو پسند کرتا ہے ﴿اَنْ تَکُوْنَ لَہٗ جَنَّۃٌ﴾ یہ کہ ہو اس کا باغ ﴿مِّنْ نَّخِیْلٍ﴾ کھجوروں کا ﴿وَّاَعْنَابٍ﴾ اور انگوروں کا ﴿تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھَا الْاَنْھٰرُ﴾ بہتی ہوں اس کے نیچے نہریں ﴿لَہٗ فِیْھَا مِنْ کُلِّ الثَّمَرٰتِ﴾ اس کے واسطے اس باغ میں ہر طرح کے پھل موجود ہوں ﴿وَاَصَابَہُ الْکِبَرُ﴾ اور پہنچ جائے اس کے مالک کو بڑھاپا ﴿وَلَہٗ ذُرِّیَّۃٌ﴾ اور ہو اس کی اولاد ﴿ضُعَفَآءُ﴾ کمزور ﴿فَاَصَابَھَآ اِعْصَارٌ﴾ پس پہنچے اس باغ کو بگولا ﴿فِیْہِ نَارٌ﴾ اس میں آگ ہو ﴿فَاحْتَرَقَتْ﴾ پس وہ بگولا اس کو جلا دے گا ﴿کَذٰلِکَ﴾ اسی طرح ﴿یُبَیِّنُ اللّٰہُ﴾ بیان کرتا ہے اللہ تعالیٰ ﴿لَکُمُ﴾ تمھارے واسطے ﴿الْاٰیٰتِ﴾ احکامات ﴿لَعَلَّکُمْ تَتَفَکَّرُوْنَ﴾ تاکہ تم غور وفکر کرو ﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا﴾ اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو ﴿اَنْفِقُوْا﴾ خرچ کرو تم ﴿مِنْ طَیِّبٰتِ﴾ پاکیزہ چیزیں ﴿مَا کَسَبْتُمْ﴾ وہ جو تم نے کمائی ہیں ﴿وَمِمَّآ اَخْرَجْنَا لَکُمْ﴾ اور اس میں جو ہم نے تمھارے لیے نکالی ہے ﴿مِّنَ الْاَرْضِ﴾ زمین سے ﴿وَلَا تَیَمَّمُوا الْخَبِیْثَ مِنْہُ﴾ اور نہ ارادہ کرو ادنیٰ چیز کا اس سے ﴿تُنْفِقُوْنَ﴾ کہ خرچ کرو تم ﴿وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِیْہِ﴾ اور تم خود اس کو لینے کے لیے تیار نہیں ہو ﴿اِلَّآ اَنْ تُغْمِضُوْا فِیْہِ﴾ مگر یہ کہ تم آنکھیں بند کرلو ﴿وَاعْلَمُوْٓا﴾ اور جان لو ﴿اَنَّ اللّٰہَ﴾ بے شک اللہ تعالیٰ ﴿غَنِیٌّ﴾ بے پرواہ ہے

﴿حَمِیْدٌ﴾ تعریفوں والا ہے ﴿اَلشَّیْطٰنُ یَعِدُکُمُ﴾ شیطان تمھیں ڈراتا ہے ﴿الْفَقْرَ﴾ غربت سے ﴿وَیَاْمُرُکُمْ بِالْفَحْشَآءِ﴾ اور تمھیں حکم دیتا ہے بُرائی کا ﴿وَاللّٰهُ یَعِدُکُمْ مَّغْفِرَةً مِّنْهُ﴾ اور اللہ تعالیٰ تمھارے ساتھ وعدہ کرتا ہے مغفرت کا اپنی طرف سے ﴿وَفَضْلًا﴾ اور فضل کا ﴿وَاللّٰهُ وَاسِعٌ﴾ اور اللہ تعالیٰ کشائش والا ہے ﴿عَلِیْمٌ﴾ جاننے والا ہے ﴿یُّؤْتِی الْحِکْمَةَ﴾ اللہ تعالیٰ حکمت عنایت کرتا ہے ﴿مَنْ یَّشَآءُ﴾ جس کو چاہتا ہے ﴿وَمَنْ یُّؤْتَ الْحِکْمَةَ﴾ اور جس کو حکمت اور دانائی ملی ﴿فَقَدْ اُوْتِیَ خَیْرًا کَثِیْرًا﴾ پس تحقیق دی گئی اس کو زیادہ بھلائی ﴿وَمَا یَذَّکَّرُ﴾ اور نہیں نصیحت حاصل کرتے ﴿اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ﴾ مگر عقلمند ﴿وَمَآ اَنْفَقْتُمْ﴾ اور جو چیز تم خرچ کرتے ہو ﴿مِّنْ نَّفَقَةٍ﴾ کوئی بھی خرچہ ﴿اَوْ نَذَرْتُمْ مِّنْ نَّذْرٍ﴾ یا کوئی نذر مانتے ہو نذر ماننا ﴿فَاِنَّ اللّٰهَ﴾ پس بے شک اللہ تعالیٰ ﴿یَعْلَمُهٗ﴾ اس کو جانتا ہے ﴿وَمَا﴾ اور نہیں ہے ﴿لِلظّٰلِمِیْنَ مِنْ اَنْصَارٍ﴾ ظالموں کا کوئی مددگار۔

اس سے پہلی آیات میں ان لوگوں کا ذکر تھا جو مال کو ریا کاری کے طور پر خرچ کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کی رضا مقصود نہیں ہوتی۔ اور اب ان کا ذکر ہے جو اپنا مال اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے خرچ کرتے ہیں۔

فرمایا ﴿وَمَثَلُ الَّذِیْنَ﴾ اور مثال اُن لوگوں کی ﴿یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ﴾ جو خرچ کرتے ہیں اپنے مال ﴿ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ﴾ اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے۔ اصل مقصد بھی اللہ تعالیٰ کی رضا ہے جس سے اللہ تعالیٰ راضی ہو گیا اس کو سب کچھ مل گیا اور جس سے اللہ تعالیٰ ناراض ہو گیا وہ ہر چیز سے محروم ہو گیا۔ تو فرمایا جو لوگ اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے مال خرچ کرتے ہیں ﴿وَتَثْبِیْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ﴾ اور اپنے دلوں کی پختگی کے لیے یعنی اللہ تعالیٰ کی رضا کے ساتھ ساتھ ان کا مقصد اصلاحِ نفس بھی ہوتا ہے تاکہ دل انفاق فی سبیل اللہ اور نیکی کے دوسرے کاموں پر ثابت قدم رہے اور ان کے دلوں سے بخل کا مادہ دور ہو جائے۔ فرمایا ایسے لوگوں کی مثال ﴿کَمَثَلِ جَنَّةٍۭ بِرَبْوَةٍ﴾ اس باغ جیسی ہے جو اُونچی جگہ پر واقع ہو ﴿اَصَابَهَا وَابِلٌ﴾ پہنچے اس کو موسلا دھار بارش ﴿فَاٰتَتْ اُکُلَهَا ضِعْفَیْنِ﴾ تو وہ دُگنا پھل دے ﴿فَاِنْ لَّمْ یُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ﴾ پس اگر تیز بارش نہ پہنچے تو پھوار بھی اس کے لیے کارآمد ہوگی۔

مفسرین کرام رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ یہاں پر تیز بارش سے مراد یہ ہے کہ کوئی شخص فیاضی کا خوب مظاہرہ کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے راستے میں کھل کر خرچ کرتا ہے تو اس مثال کے مطابق وہ کئی گنا زیادہ اجر و ثواب کا مستحق ہے۔ اور معمولی بارش یعنی تھوڑی مقدار میں خرچ کرتا ہے تو اس کی کامیابی کے لیے وہ بھی کافی ہے۔ بشرطیکہ اس کی نیت درست ہو یعنی احسان جتلانے، اذیت دینے اور ریا سے پاک ہو۔ نیت بمنزلہ زمین کے ہے۔ اگر زمین زرخیز ہے یعنی نیت درست ہے تو تھوڑا خرچ کرنا بھی اس کے لیے مفید ہوگا۔ جیسا کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں آتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((اَخْلِصْ فِیْ دِیْنِكَ یَکْفِیْكَ قَلِیْلٌ مِّنَ الْعَمَلِ)) "اپنے دین میں اخلاص پیدا کر لو تو تھوڑا عمل بھی کفایت کرے گا۔" لہٰذا نیکی کے ہر کام میں

رضائے الٰہی پیش نظر ہونی چاہیے۔ قبولیت کا یہی معیار ہے۔ ﴿وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ﴾ تم جو کچھ بھی عمل کرتے ہو اللہ تعالیٰ اس کو خوب دیکھ رہا ہے۔ وہ تمھارے کسی عمل سے غافل نہیں ہے تمھارے دلوں کے حالات اور نیت سے واقف ہے۔

بخل اور ریاکاری کا نتیجہ

کسی متوقع نعمت کے ضائع ہو جانے پر کس قدر پریشانی ہوتی ہے اس کی وضاحت چٹان والی مثال میں ہو چکی ہے۔ اب اللہ تعالیٰ اس قسم کی ایک اور مثال بیان کرتے ہیں جس میں یہ بات سمجھائی گئی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نعمت ہی پر انحصار ہو اور وہ ضائع ہو جائے تو انسان کو کس قدر دکھ ہوتا ہے۔ اسی طرح جب کوئی شخص نیکی کا کام کرنے کے باوجود بعض وجوہ کی بنا پر اس کے اجر و ثواب سے محروم ہو جاتا ہے تو اس کے لیے کتنا اذیت ناک ہوتا ہے۔

فرمایا ﴿اَيَوَدُّ اَحَدُكُمْ﴾ کیا تم میں سے کوئی شخص اس بات کو پسند کرتا ہے ﴿اَنْ تَكُوْنَ لَهٗ جَنَّةٌ﴾ یہ کہ ہو اس کے لیے ایک باغ ﴿مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّاَعْنَابٍ﴾ کھجوروں اور انگوروں کا ﴿تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ﴾ بہتی ہوں گی اس کے نیچے نہریں ﴿لَهٗ فِيْهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ﴾ اس کے واسطے اس باغ میں ہر طرح کے پھل موجود ہوں ﴿وَاَصَابَهُ الْكِبَرُ﴾ اور پہنچ جائے اس کے مالک کو بڑھاپا ﴿وَلَهٗ ذُرِّيَّةٌ ضُعَفَآءُ﴾ اور اس کی اولاد کمزور ہو۔ یعنی اس کے لیے اور کوئی ذریعہ معاش بھی نہ ہو اور ایسی حالت میں ﴿فَاَصَابَهَآ اِعْصَارٌ﴾ پس پہنچے اس باغ کو بگولا ﴿فِيْهِ نَارٌ﴾ اس میں آگ ہو ﴿فَاحْتَرَقَتْ﴾ پس وہ آگ کا بگولا اس کو جلا کر راکھ کر دے تو اندازہ کیجیے ایسی صورت میں اس باغ کے مالک کی کیا حالت ہوگی کہ یہی باغ اس کا ذریعہ معاش تھا اور یہی باغ اس کی کل پونجی تھی۔ جس پر اس کا اور اس کی اولاد کا انحصار تھا۔ جب یہی سارا جل کر راکھ ہو گیا تو وہ کس طرح ہر چیز سے محروم ہو گیا۔ فرمایا احسان جتلانے والے، ایذا پہنچانے والے اور ریاکاری کے لیے خرچ کرنے والے کی حالت بھی قیامت کے دن ایسی ہوگی۔ جس طرح وہ باغ اپنے مالک کا بڑھاپے کا سہارا تھا اسی طرح یہ شخص اپنے خرچ کردہ مال کے اجر و ثواب کی امید لگائے بیٹھا تھا مگر جب قیامت کا دن ہوگا تو ایسا شخص اسی طرح ثواب سے محروم ہو جائے گا جس طرح باغ کا مالک باغ کے جل جانے کے بعد اس کے پھلوں سے محروم ہو گیا۔ اور وہاں پریشانی کے سوا کچھ حاصل نہ ہوگا۔

فرمایا ﴿كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ﴾ اسی طرح بیان فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ تمھارے واسطے احکامات ﴿لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ﴾ تاکہ تم غور و فکر کرو اور اچھی اور بُری چیز کا امتیاز کر سکو۔ صدقات کے باقی رہنے کے متعلق تین شرائط کا پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ کسی کو خیرات دے کر نہ تو اس پر احسان جتلایا جائے، نہ اسے تکلیف پہنچائی جائے اور نہ خرچ کرتے وقت ریاکاری کا عنصر شامل ہو۔

اللہ تعالیٰ کی راہ میں پاک مال خرچ کرو

آج کے درس میں باقی رہنے کی چوتھی شرط مال کی پاکیزگی کا بیان ہے۔ فرمایا ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا﴾ اے وہ لوگو جو

ایمان لائے ہو ﴿اَنْفِقُوْا﴾ خرچ کرو تم ﴿مِنْ طَیِّبٰتِ﴾ پاکیزہ چیزیں ﴿مَا كَسَبْتُمْ﴾ وہ جو تم نے کمائی ہیں۔ گویا قبولیت صدقہ کے لیے یہ بھی ایک شرط ہے کہ صاف ستھری اور بہتر چیز اللہ کے راستے میں دی جائے۔ مفسرین کرام رحمہم اللہ نے ﴿طَیِّبٰتِ﴾ کی تفصیل میں دو چیزیں بیان کی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ مال حلال ہو۔ حرام مال سے ادا کردہ صدقہ قابل قبول نہیں ہے۔ مثال کے طور پر اگر کوئی شخص چوری، ڈاکا یا رشوت کا مال صدقہ کرتا ہے تو وہ بارگاہِ ایزدی میں کیسے قبول ہوگا؟ بلکہ ایسا کرنے سے اُلٹا گنہگار ہوگا۔ مسند احمد کی روایت میں ہے جو شخص حرام کمائی کی خوراک کھائے یا لباس پہنے گا نہ اس کی عبادت قبول ہوگی اور نہ اس کا صدقہ خیرات قبول ہوگا۔

﴿طَیِّبٰتِ﴾ کا دوسرا مفہوم یہ ہے کہ جو چیز تم اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرو وہ اعلیٰ اور بہتر ہو، نکمی اور ردی نہ ہو۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ اچھی چیز اپنے لیے رکھ لی جائے اور کمتر چیز صدقات خیرات میں دی جائے۔ یہ بھی مناسب نہیں ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ بعض لوگ ایسے ہیں جو کھجور کے اچھے گچھے اپنے واسطے محفوظ کر لیتے ہیں اور نکمے گچھے اصحابِ صفہ کے لیے لٹکا دیتے ہیں۔ جب تم خود ردی چیز کو پسند نہیں کرتے تو اللہ اسے کیسے پسند کرے گا۔ لہٰذا زکوٰۃ، صدقات میں بہتر اور اچھی چیز دینی چاہیے نہ کہ گھٹیا۔ کیوں کہ دینے والا تو وہ خود ہی ہے براہِ راست محنت کر کے کمانے کے علاوہ ایک ذریعہ آمدنی زرعی پیداوار بھی ہے۔ آگے اس کے متعلق فرمایا کہ اس میں سے خرچ کرو۔

﴿وَمِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ﴾ اور اس میں سے بھی خرچ کرو جو ہم نے تمھارے لیے زمین سے نکالا۔ مثلاً: گندم، جو، چاول، مکئی، باجرہ، دالیں اور جو چیز بھی زمین سے پیدا ہوتی ہے اس میں عشر آئے گا۔ تو ﴿وَمِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ﴾ سے مراد صرف فصلیں اور پھل ہی نہیں ہیں بلکہ یہ حکم سب چیزوں کے لیے ہے۔ مثلاً: پیاز، لہسن، گوبھی، آلو، مرچ، غرضیکہ جو چیز بھی زمین سے حاصل ہوتی ہے۔ اس سے عشر نکالنا پڑے گا۔ مثلاً: اگر کوئی چیز دس کلو نکلی ہے تو ایک کلو دینا پڑے گا۔ دس پیازوں میں سے ایک پیاز دینا پڑے گا، دس مرچوں میں سے ایک مرچ دینی پڑے گی، اگرچہ یہ چیزیں کسی نے گھر ہی میں کیوں نہ لگائی ہوں ان میں سے بھی عشر دینا پڑے گا۔ کیوں کہ قرآن پاک کے الفاظ ہیں: ﴿وَمِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ﴾ اور اس سے جو کچھ ہم نے تمھارے لیے نکالی ہے، پیدا کی ہے ﴿مِّنَ الْاَرْضِ﴾ زمین سے۔ تو جو چیز بھی زمین سے پیدا ہوتی ہے اس میں باقاعدہ عشر ہے۔ البتہ اس مد میں دو حصے ہیں، بارانی زمین یعنی جو زمین مالک کی مشقت کے بغیر سیراب ہوتی ہے اس میں دسواں حصہ ہے اور اگر ٹیوب ویل، نہر یا نلکے کے ذریعے پانی دیا گیا ہے تو بیسواں حصہ ہے۔

﴿وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ﴾ اور نہ ارادہ کرو ادنیٰ چیز کا اس کمائی میں سے۔ وہ کمائی تجارت کے ذریعہ ہے یا کھیتی باڑی کے ذریعے تم اللہ تعالیٰ کے راستے میں ناقص چیز نہ دو ﴿تُنْفِقُوْنَ﴾ خرچ کرو ﴿وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ﴾ اور خود تم اس کو لینے کے لیے تیار نہیں ہو ﴿اِلَّآ اَنْ تُغْمِضُوْا فِيْهِ﴾ مگر یہ کہ تم آنکھیں بند کر لو یعنی اگر تم چشم پوشی کر لو تو الگ بات ہے لہٰذا جب تم اللہ تعالیٰ کے راستے میں دو تو بیکار اور ناقص چیز نہ دو ﴿وَاعْلَمُوْٓا﴾ اور جان لو ﴿اَنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ﴾ بے شک اللہ تعالیٰ بے پروا ہے تمھارے

صدقے خیرات کا محتاج نہیں ہے۔ ساری کائنات کا خالق مالک ہے اس کے خزانے بڑے وسیع ہیں ﴿حَمِيْدٌ﴾ قابل تعریف ہے۔ اگر تم اللہ تعالیٰ کی حمد نہیں کرتے تو اللہ تعالیٰ ﴿ فِیْ حَدِّ ذَاتِہٖ ﴾ قابل تعریف ہے ﴿وَ اِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِہٖ﴾ [بنی اسرائیل: ۴۴] "اور کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو اللہ تعالیٰ کی تعریف نہ کرتی ہو۔" کوئی زبانِ حال سے تعریف کرتی ہے اور کوئی زبانِ قال سے۔

تو اللہ تعالیٰ تمھاری تعریفوں کا محتاج نہیں ہے ﴿اَلشَّیْطٰنُ یَعِدُکُمُ الْفَقْرَ﴾ شیطان تمھیں غربت سے ڈراتا ہے۔ یعنی جب تم زکوٰۃ اور عشر دیتے ہو یا عام صدقہ خیرات کرتے ہو تو شیطان تمھارے دل میں وسوسے ڈالتا ہے کہ مال کم ہو جائے گا اور فقیر ہو جاؤ گے۔ یہ کام وہی کرے گا جس کا ایمان کامل ہوگا یعنی زکوٰۃ بھی دے گا، عشر بھی نکالے گا اور اللہ تعالیٰ کے جتنے حقوق ہیں ادا کرے گا۔ اس پر شیطان کا کوئی اثر نہیں ہوگا ﴿وَیَاْمُرُکُمْ بِالْفَحْشَآءِ﴾ اور تمھیں حکم دیتا ہے بُرائی کا۔ بُرے کاموں پر دل کھول کر خرچ کرتے ہیں۔

دیکھو! لوگ شادیاں کرتے ہیں ان میں بینڈ باجے ہوتے ہیں، ڈھول تماشے ہوتے، ضرورت سے زیادہ روشنی ہوتی ہے، مرچوں اور قمقموں سے گلیاں سجائی جاتی ہیں۔ یہ سب تبذیر (فضول خرچی) ہے۔ اور قرآن کریم میں ہے: ﴿اِنَّ الْمُبَذِّرِیْنَ كَانُوْۤا اِخْوَانَ الشَّیٰطِیْنِ﴾ [بنی اسرائیل: ۲۷] "بے شک فضول خرچی کرنے والے شیطان کے بھائی ہیں۔" پھر عام رواج ہونے کی وجہ سے ان کو گناہ بھی نہیں سمجھا جاتا۔ کہتے ہیں کہ جی خوشی کا موقع ہے۔

تین چار دن ہو گئے ہیں میں نے اخبار میں پڑھا ہے کہ اوکاڑہ کے علاقہ میں ایک بوڑھی عورت فوت ہو گئی۔ اُس کے تیجے پر فیصل آباد سے بھانڈ منگوا کر بھنگڑا ڈلوایا گیا اور اس کا ثواب اُس مائی کو پہنچایا گیا۔ یہ مسلمانوں کے کارنامے ہیں۔ اسی طرح آج سے چند سال پہلے اسی علاقے میں ایک بوڑھا بابا فوت ہوا۔ اس نے مرتے وقت وصیت کی کہ میرے جنازے کے ساتھ بھنگڑا ڈالنے والے اور ناچنے والے ضرور ہوں۔ یعنی میرا جنازہ ڈھول کی تھاپ اور بھنگڑے کے ساتھ جائے۔ (حضرت نے مسکرا کر فرمایا کہ وہ ان شاء اللہ بابے کو فائدہ دیں گے۔)

مسلمانوں کا ذہن گندہ ہو گیا کہ خدا پناہ! ہندوؤں اور سکھوں والی ساری رسمیں چھلانگیں لگا کر ان میں آ گئی ہیں ﴿وَاللّٰهُ یَعِدُکُمْ مَّغْفِرَةً﴾ اور اللہ تعالیٰ تمھارے ساتھ وعدہ کرتا ہے مغفرت کا ﴿مِّنْهُ﴾ اپنی طرف سے ﴿وَفَضْلًا﴾ اور فضل کا یعنی اللہ تعالیٰ تم پر مہربانی کرے گا۔

یاد رکھنا! استاد کے بغیر بات سمجھ نہیں آتی۔ یہاں ایک بات سمجھ لیں وہ یہ کہ جن کو تھوڑی بہت سمجھ ہے ان کے دل میں ضرور یہ بات آئی ہوگی کہ پہلے ﴿یَعِدُ﴾ کا معنیٰ کیا ڈرانے کا اور دوسرے ﴿یَعِدُ﴾ کا معنیٰ کیا ہے وعدے کا۔ جب کہ لفظ ایک جیسے ہیں۔ تو یاد رکھنا! گرامر کے بغیر قرآن شریف صحیح معنیٰ میں سمجھ آ ہی نہیں سکتا۔ باقی طوطے والی رٹ تو ہو سکتی ہے۔

علم صرف والے فرماتے ہیں کہ مصدر بدلنے سے باب کا معنیٰ بدل جاتا ہے۔ تو اگر وَعَدَ یَعِدُ کا مصدر وَعِیْدٌ

آئے تو معنیٰ ہوگا ڈرانا۔ اور اگر وَعَدَ یَعِدُ کا مصدر وَعْدًا آئے تو اس کا معنیٰ ہوگا وعدہ کرنا۔ تو پہلا یَعِدُ وَعِیْدًا سے اور دوسرا یَعِدُ وَعْدًا سے ہے۔ ﴿وَاللّٰہُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ﴾ اور اللہ تعالیٰ کشائش والا ہے جاننے والا ہے۔

حکمت کا معنیٰ

﴿یُؤْتِی الْحِکْمَۃَ مَنْ یَّشَآءُ﴾ اللہ تعالیٰ حکمت عنایت کرتا ہے جس کو چاہتا ہے۔ حکمت کا معنیٰ اہل علم بیان کرتے ہیں اَلْعِلْمُ النَّافِعُ اَلْمُؤَدِّیْ اِلَی الْعَمَلِ "ایسا نافع علم جو عمل تک پہنچائے۔" یعنی ایسا نافع علم کہ جس کے ساتھ عمل بھی ہو۔ ایک خالی علم ہے کہ چیزوں کی معلومات ہیں مگر عمل نہیں ہے اس کو حکمت نہیں کہتے۔

فرمایا ﴿وَمَنْ یُّؤْتَ الْحِکْمَۃَ فَقَدْ اُوْتِیَ خَیْرًا کَثِیْرًا﴾ اور جس کو حکمت اور دانائی ملی یعنی جس کو اللہ تعالیٰ نے علم نافع دیا اور علم پر عمل کی بھی توفیق عطا فرمائی تو اس کو بہت بڑی خیر مل گئی ﴿وَمَا یَذَّکَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ﴾ اور نہیں نصیحت حاصل کرتے مگر عقل مند یعنی جن کو اللہ تعالیٰ نے صحیح عقل دی ہے نصیحت وہی حاصل کرتے ہیں۔ کہتے ہیں پتھر کو جونک نہیں لگتی۔ اسی طرح نادان آدمی پر نصیحت کا کوئی اثر نہیں ہے۔ آنے والی بات کو اچھی طرح سمجھنا۔

﴿وَمَآ اَنْفَقْتُمْ﴾ اور جو چیز بھی تم خرچ کرتے ہو ﴿مِّنْ نَّفَقَۃٍ﴾ کوئی بھی خرچہ۔ وہ چاہے تم جائز طریقے پر کرو یا ناجائز طریقے پر کرو ﴿اَوْ نَذَرْتُمْ مِّنْ نَّذْرٍ﴾ یا کوئی نذر مانو نذر ماننا۔ تو یاد رکھنا! ﴿فَاِنَّ اللّٰہَ یَعْلَمُہٗ﴾ پس بے شک اللہ تعالیٰ اس کو جانتا ہے۔ تم جو خرچ کرتے ہو اللہ تعالیٰ اس کو جانتا ہے اور جس نیت کے ساتھ خرچ کرتے ہو رب اس کو بھی جانتا ہے اور جس مال سے کرتے ہو اس کو بھی جانتا ہے۔ اور جو نذر تم مانتے ہو رب اس کو بھی جانتا ہے۔

نذر و منت کے بعض احکام

نذر کا معنیٰ سمجھ لو۔ حدیث پاک میں آتا ہے: ((اَلنَّذْرُ لَا یَاْتِیْ اِبْنَ اٰدَمَ بِشَیْءٍ)) نذر ماننا اچھی شے نہیں ہے۔ نذر یہ ہے کہ بیمار آدمی نذر مانتا ہے کہ اگر میں صحت یاب ہو گیا تو اللہ تعالیٰ کے راستے میں دیگ دوں گا یا کوئی مقدمے میں پریشان ہے اور کہتا ہے کہ اگر مجھے مقدمہ میں کامیابی نصیب ہوئی تو دس آدمیوں کو کھانا کھلاؤں گا یا یہ کہتا ہے کہ اگر میں امتحان میں کامیاب ہو گیا تو اتنے روزے رکھوں گا یا کہتا ہے کہ اگر تجارت میں نفع ہوا تو پانچ سو روپے اللہ تعالیٰ کے راستہ میں دوں گا، اس کو شریعت پسند نہیں کرتی۔ اس لیے کہ اس میں ایک قسم کی سودا بازی ہے اور مومن کا عمل تو اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کرے یا نہ کرے تُو اُس کا بندہ ہے تُو کر۔

لیکن اگر کسی نے نذر مانی اور اس کا کام ہو گیا تو نذر کا پورا کرنا واجب ہے اور نذر کے مال کا مصرف وہی ہے جو زکوٰۃ کا مصرف ہے۔ یعنی مال دار نہیں کھا سکتا، کافر نہیں کھا سکتا، سید نہیں کھا سکتا۔ جو لوگ نذر کی دیگ محلے میں تقسیم کرتے ہیں نادانی کرتے ہیں۔ اس طرح سر سے ذمہ نہیں اُترتا۔ اس کے لیے مستحق لوگوں کو تلاش کر کے کھلانا پڑے گا۔ بلکہ مسئلہ یہ ہے اگر دیگ

کا نمک مسالا چکھنا ہے تو اس کو نگل نہیں سکتا تھوک دے۔ اگر مال دار کھائیں گے تو حرام کھائیں گے۔ اور ایک غیر اللہ کی نذر ہے۔ مثلاً: اگر کوئی شخص کہتا ہے کہ اگر میرا کام ہو گیا تو میں حضرت علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ کی قبر پر اتنی دیگیں چڑھاؤں گا۔

تو فقہائے کرام رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ یہ قطعی کافر ہو گیا اور اس کی بیوی کو طلاق ہو گئی کیوں کہ نذر عبادت ہے اور عبادت مخلوق میں سے کسی کے واسطے جائز نہیں ہے۔ لوگ بڑی تاویل یہ کرتے ہیں کہ ہمارا مقصود تو اللہ کی رضا ہے البتہ وہاں اس واسطے تقسیم کرتے ہیں کہ فقیر اکٹھے مل جاتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ وہ لوگ مصرف ہی نہیں ہیں کہ ان میں اکثر گندے عقیدے کے اور بے نماز ہوتے ہیں۔ پھر ان میں اکثر نشئی ہوتے ہیں ان کو دینا کس طرح جائز ہے؟

﴿فَاِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُهٗ﴾ پس بے شک اللہ تبارک وتعالیٰ اس کو جانتا ہے ﴿وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ﴾ اور ظالموں کا کوئی مددگار نہیں ہے۔

﴿اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ﴾ اگر تم صدقات ظاہر کر کے دو ﴿فَنِعِمَّا هِيَ﴾ تو یہ بھی اچھا ہے ﴿وَاِنْ تُخْفُوْهَا﴾ اگر تم چھپا کر دو تو یہ خوب تر ہے ﴿وَتُؤْتُوْهَا الْفُقَرَآءَ﴾ اور دو تم صدقات فقراء اور مساکین کو ﴿فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ﴾ تو وہ تمھارے لیے بہت ہی بہتر ہے ﴿وَيُكَفِّرُ عَنْكُمْ مِّنْ سَيِّاٰتِكُمْ﴾ اور اللہ تعالیٰ مٹا دے گا تم سے تمھاری خطائیں ﴿وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ﴾ اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے اُس عمل کو جو تم کرتے ہو ﴿لَيْسَ عَلَيْكَ﴾ نہیں ہے آپ کے ذمے ﴿هُدٰىهُمْ﴾ ان کی ہدایت ﴿وَلٰكِنَّ اللّٰهَ﴾ اور لیکن اللہ تعالیٰ ﴿يَهْدِيْ﴾ ہدایت دیتا ہے ﴿مَنْ يَّشَآءُ﴾ جس کو چاہے ﴿وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ﴾ اور جو بھی تم خرچ کرو گے بھلائی (مال) ﴿فَلِاَنْفُسِكُمْ﴾ پس تمھاری اپنی جانوں کے لیے ہے ﴿وَمَا تُنْفِقُوْنَ﴾ اور تم نہیں خرچ کرتے ﴿اِلَّا﴾ مگر ﴿ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ﴾ اللہ تعالیٰ کی رضا طلب کرتے ہوئے ﴿وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ﴾ اور جو بھی خرچ کرو گے مال ﴿يُّوَفَّ اِلَيْكُمْ﴾ تمھیں پورا پورا بدلہ دیا جائے گا ﴿وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ﴾ اور تم پر ظلم نہیں کیا جائے گا ﴿لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ﴾ یہ صدقات ان محتاجوں کے لیے ہیں ﴿اُحْصِرُوْا﴾ جو روکے گئے ﴿فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ اللہ تعالیٰ کے راستے میں ﴿لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ﴾ نہیں طاقت رکھتے ﴿ضَرْبًا﴾ چلنے کی ﴿فِي الْاَرْضِ﴾ زمین میں ﴿يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ﴾ ناواقف آدمی ان کو سمجھتا ہے ﴿اَغْنِيَآءَ﴾ غنی ﴿مِنَ التَّعَفُّفِ﴾ سوال سے بچنے کی وجہ سے ﴿تَعْرِفُهُمْ﴾ تو ان کو پہچانے گا ﴿بِسِيْمٰهُمْ﴾ ان کی علامتوں کے ساتھ ﴿لَا يَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ﴾ نہیں سوال کرتے لوگوں سے ﴿اِلْحَافًا﴾ چمٹ کر ﴿وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ﴾ اور جو بھی تم مال خرچ کرو گے ﴿فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ﴾ تو بے شک اللہ تعالیٰ اس کو جانتا ہے ﴿اَلَّذِيْنَ﴾ وہ لوگ ﴿يُنْفِقُوْنَ﴾ جو

خرچ کرتے ہیں ﴿اَمْوَالَهُمْ﴾ اپنے مال ﴿بِالَّيْلِ﴾ رات کو ﴿وَالنَّهَارِ﴾ اور دن کو ﴿سِرًّا﴾ پوشیدہ طور پر ﴿وَّعَلَانِيَةً﴾ اور ظاہری طور پر ﴿فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ﴾ پس ان کے لیے ان کا اجر ہوگا ﴿عِنْدَ رَبِّهِمْ﴾ ان کے رب کے ہاں ﴿وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ﴾ اور نہ ان پر خوف ہوگا ﴿وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ﴾ اور نہ وہ غم کریں گے۔

پہلے سے صدقات وخیرات کا ذکر چلا آرہا ہے اور صدقے کی قبولیت کی شرائط بھی بیان ہوئی ہیں کہ ایمان، اخلاص، اتباعِ سنت کے ساتھ ساتھ مال کا حلال اور طیب ہونا اور بھی ضروری ہے۔ اگر ان میں سے کوئی شرط نہ پائی گئی تو صدقے کا کوئی ثواب نہ ہوگا۔ اور اگر صدقہ مذکورہ شرائط کے ساتھ دیا تو پھر اس کے باقی رہنے کی شرط کہ احسان نہ جتلائے اور اذیت نہ پہنچائے آگے بھی اسی کے متعلق بیان ہے۔

مخفی صدقہ کے فوائد؟

﴿اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ﴾ اگر تم ظاہری طور پر صدقات دو ﴿فَنِعِمَّا هِيَ﴾ تو یہ بھی اچھا ہے۔ اگر دینے والے کی نیت ریا کی نیت نہیں ہے اور لوگوں کے سامنے صدقہ دیتا ہے اور دل میں یہ ہے کہ رب میرے سے راضی ہو جائے تو اس طرح صدقہ دینے میں بھی کوئی حرج نہیں ہے کیوں کہ ریا کا تعلق دل کے ساتھ ہے اور اس کے دل میں اللہ تعالیٰ کی رضا اور فقیر کی حاجت کو پورا کرنا ہے ﴿وَاِنْ تُخْفُوْهَا﴾ اور اگر تم صدقات مخفی طور پر دو ﴿وَتُؤْتُوْهَا الْفُقَرَآءَ﴾ اور دو فقیروں اور محتاجوں کو ﴿فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ﴾ تو یہ مخفی طریقہ پر دینا بہت بہتر ہے اور اس کے بہتر ہونے کی ایک وجہ یہ ہے کہ ریا سے پاک ہوگا۔ اس لیے کہ کوئی دیکھنے والا ہی نہیں ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے معاشرے میں ہر طرح کے آدمی ہوتے ہیں، نیک بھی ہوتے ہیں اور بد بھی ہوتے ہیں، چور، ڈاکو بھی ہوتے ہیں تو یہ جب سب کے سامنے کسی مستحق کو ایک ہزار روپیہ زکوٰۃ دے گا تو دیکھنے والا چور ڈاکو حساب لگائے گا کہ اس نے ایک ہزار روپیہ زکوٰۃ کا دیا ہے تو انتالیس ہزار اس کے گھر میں پڑا ہے لہٰذا وہ چوری ڈکیتی کا منصوبہ بنائے گا۔ اگر مخفی طریقے پر دے گا تو ان کے شر سے بھی محفوظ رہے گا۔ جس زمانے میں قرآن کریم نازل ہوا اس زمانے میں بینکوں کا تصور بھی نہیں تھا لہٰذا لوگوں کے پاس جو کچھ ہوتا تھا گھروں میں محفوظ کرتے تھے اور آج کل تو بینک بھی محفوظ نہیں ہیں۔ لوگ بدی (بُرائی) میں بہت آگے نکل گئے ہیں۔

﴿وَيُكَفِّرُ عَنْكُمْ مِّنْ سَيِّاٰتِكُمْ﴾ اور ان صدقات خیرات کی برکت سے اللہ تعالیٰ تمھاری خطائیں معاف فرمادے گا۔ اس موضوع پر کافی احادیث ہیں۔ ایک حدیث میں آتا ہے ((اَلصَّدَقَةُ تُطْفِئُ غَضَبَ الرَّبِّ)) کہ صدقہ اللہ تعالیٰ کے غصہ کو ٹھنڈا کرتا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ بندے سے ناراض ہے اور وہ بندہ صدقہ خیرات کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ معاف فرما دیتا ہے۔ اور یہ حدیث بھی آتی ہے کہ ((اَلصَّدَقَةُ تَدْفَعُ الْبَلَايَا)) صدقہ اور خیرات کی برکت سے مصیبتیں ٹل جاتی ہیں۔ تو صدقہ اچھی چیز ہے مگر

لوگوں نے اس کا مفہوم نہیں سمجھا۔ عام طور پر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ کالی سری دے دو تو مصیبتیں ٹل جاتی ہیں یا اس سے آگے بڑھیں گے تو کالا بکرا دے دیں گے۔ تو یاد رکھنا! اصل صدقے کا مفہوم ہے غریب کی ضرورت پوری کرنا۔ اب غریب کی ضرورت کپڑا ہے، جوتا ہے۔ بیمار ہے تو دوا کی ضرورت ہے۔ اس کے بچے پڑھتے ہیں کتابوں کی ضرورت ہے تو وہ کالی سری کہاں کہاں کام آئے گی؟ یہ سری اور گوشت دینا فی الجملہ صدقہ ہے۔ حقیقی صدقہ غریب کی ضرورت پوری کرنا ہے۔ بعض ایسے جاہل ہیں کہ بیمار کی طرف سے صدقہ دینے سے پہلے صدقہ کو بیمار کے سر کا طواف کراتے ہیں۔ بھائی! معاملہ تمھارا رب کے ساتھ ہے وہ تمھاری نیتوں کو جانتا ہے کہ صدقہ کس لیے تم نے دیا ہے۔ رب کو بتانا چاہتے ہو کہ اس کی طرف سے دے رہے ہیں ﴿وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ﴾ اور اللہ تعالیٰ جو کچھ تم کرتے ہو اس سے خبردار ہے۔ معاملہ تمھارا رب کے ساتھ ہے۔ وہ ظاہر باطن کو جاننے والا ہے۔

یہاں پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا صدقہ خیرات غیر مسلم کو دیا جا سکتا ہے یا نہیں۔ اس کے متعلق مسئلہ یہ ہے کہ نفلی صدقہ کافر کو دیا جا سکتا ہے مگر اس کے لیے شرط ہے کہ وہ محارب (مسلمانوں کے خلاف لڑنے والا نہ ہو۔) کیوں کہ ایسا کافر جو مسلمانوں کے ساتھ برسرِ پیکار ہے اس کو نفلی صدقہ دینا جائز نہیں اگرچہ وہ محتاج ہی کیوں نہ ہو۔ اسی طرح ایسے کافر کو بھی دینا جائز نہیں ہے جو کفر کی تبلیغ کرتا ہو اور مسلمانوں کو گمراہ کرتا ہو۔ البتہ وہ صدقات جو فرض ہیں وہ کافروں کو دینا جائز نہیں ہیں۔ مثلاً: زکوٰۃ، فطرانہ، عشر، قسم کا کفارہ، نماز روزے کا فدیہ۔

شروع شروع میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مالی طور پر کمزور کافروں کو نفلی صدقہ خیرات دے دیتے تھے۔ بعد میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس نظریہ کے تحت روک لیا کہ شاید تنگ ہو کر ایمان قبول کر لیں۔ تو اللہ تعالیٰ نے حکم نازل فرمایا ﴿لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ﴾ اے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم! ان کو ہدایت دینا آپ کے ذمے نہیں ہے ﴿وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ﴾ اور لیکن اللہ تعالیٰ ہدایت دیتا ہے جس کو چاہتا ہے۔ تو ان کو صدقات خیرات اس واسطے روکنا کہ وہ مجبور ہو کر ایمان لے آئیں، یہ مناسب نہیں ہے۔ کیوں کہ ہدایت دینا اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے وہ جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے اور ہدایت کے متعلق اس کا قانون ہے ﴿فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ﴾ "تو جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کفر میں رہے۔" یعنی جس کا جی چاہے اپنی مرضی اور اختیار سے ایمان لائے اور جو چاہے اپنی مرضی اور اختیار سے کفر اختیار کرے۔ لہٰذا ایمان لانے میں بھی آدمی کی مرضی کا دخل ہے اور کفر اختیار کرنے میں بھی ارادے کا دخل ہے۔ اور ہدایت اللہ تعالیٰ اسے دیتا ہے ﴿مَنْ يُّنِيْبُ﴾ جو اس کی طرف رجوع کرتا ہے اور اس سے ہدایت طلب کرتا ہے ﴿فَلَمَّا زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ﴾ [صف:۵] "تو جب ان لوگوں نے کج روی اختیار کی تو اللہ تعالیٰ نے بھی ان کے دل ٹیڑھے کر دیے۔" یعنی جو لوگ پیٹھ پھیر کر کفر کی طرف جائیں تو رب تعالیٰ ایسے لوگوں کو جبراً ہدایت نہیں دیں گے۔

صدقہ کا دس گنا اجر ہے؟

﴿وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ﴾ اور جو بھی تم مال خرچ کرو گے ﴿فَلِاَنْفُسِكُمْ﴾ تو تمھارے اپنے لیے ہے یعنی اس کا ثواب

تمھیں ہی ملے گا ﴿وَمَا تُنۡفِقُوۡنَ اِلَّا ابۡتِغَآءَ وَجۡهِ اللّٰهِ﴾ اور نہیں خرچ کرتے تم مگر رب تعالیٰ کی رضا طلب کرنے کے لیے۔ اس میں ترغیب ہے کہ صدقہ خیرات رب تعالیٰ کو راضی کرنے کے لیے کرو شہرت، دکھاوا، بڑائی کے لیے نہ کرو ﴿وَمَا تُنۡفِقُوۡا مِنۡ خَيۡرٍ﴾ اور جو بھی تم مال خرچ کرو گے ﴿يُّوَفَّ اِلَيۡكُمۡ﴾ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمھیں پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔ عام بدلہ ہے دس گنا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ﴿مَنۡ جَآءَ بِالۡحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشۡرُ اَمۡثَالِهَا﴾ جو ایک نیکی کرے گا اللہ تعالیٰ اس کو دس گنا اجر عطا فرمائے گا۔ اور وہ نیکی جو فی سبیل اللہ کی مد میں ہے اس کا ادنیٰ ترین بدلہ سات سو ہے ﴿وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنۡ يَّشَآءُ﴾ اور اللہ تعالیٰ بڑھاتا ہے جس کے لیے چاہتا ہے ﴿وَاَنۡتُمۡ لَا تُظۡلَمُوۡنَ﴾ اور تم پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔ تمھاری کوئی نیکی کم نہیں کی جائے گی۔ اب سوال یہ ہے کہ صدقہ وخیرات کن لوگوں کو دینا ہے؟

تو فرمایا ﴿لِلۡفُقَرَآءِ الَّذِيۡنَ اُحۡصِرُوۡا فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ﴾ ان محتاجوں اور ضرورت مندوں کو دو جو رب تعالیٰ کے راستہ میں روکے گئے ہیں ﴿لَا يَسۡتَطِيۡعُوۡنَ ضَرۡبًا فِى الۡاَرۡضِ﴾ وہ زمین میں چلنے پھرنے کی طاقت نہیں رکھتے۔

اصحاب صفہ۔ صُفّہ کے معنیٰ ہیں چھپّر۔ تو اصحابِ صفہ کے معنیٰ ہوئے چھپّر والے۔ یہ مسجد نبوی کے اندر ہی ایک کونے میں ایک جگہ تھی جہاں سائے کے لیے انھوں نے ایک چھپر بنایا تھا اس کے نیچے اس وقت کے طلبہ رہتے تھے۔ آنحضرت ﷺ سے قرآن وحدیث کی تعلیم حاصل کرتے اور دین سیکھتے اور اگر ضرورت پیش آتی تو جہاد پر بھی چلے جاتے تھے۔ تو ظاہر بات ہے جو دین سیکھے گا اور جہاد پر جائے گا تو وہ اور کوئی کام تو نہیں کرسکتا۔ تو ایسے لوگوں کے لیے حکم دیا گیا ہے جو دین کے لیے وقف ہیں یا تبلیغ کے لیے وقف ہیں یا کفار کے مقابلے میں جہاد کرتے ہیں اور دوسرا کوئی کام نہیں کرسکتے اور ہیں بھی ضرورت مند تو تمھارے صدقے خیرات ان لوگوں کے لیے ہیں۔

دینی تعلیم کی اہمیت

اُس وقت دینی تعلیم حاصل کرنے والے غریب لوگ تھے اور اب بھی ہمارے علاقوں میں دینی تعلیم حاصل کرنے والوں کی اکثریت غریبوں کی ہے۔ البتہ کراچی میں ہم نے دیکھا ہے کہ وہاں امیر لوگ بھی دین کی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ افریقہ میں بھی مال داروں کے بچے دینی تعلیم حاصل کرتے ہیں مگر ہمارے علاقوں میں وہ دین کی تعلیم حاصل کرتے ہیں جو سکولوں کی فیسیں نہیں دے سکتے، کتابیں نہیں خرید سکتے۔ بلکہ آج سے ساٹھ ستر سال پہلے یہ حالت تھی کہ جو نابینا ہوتے انھیں ہمارے حوالے کیا جاتا کہ ان کو قرآن کریم حفظ کراؤ اور جو بچے اچھے بھلے ہوتے انھیں سکولوں، کالجوں میں بھیجتے تھے۔ اب اتنا انقلاب آیا ہے کہ آنکھوں والے بھی قرآن حفظ کرتے ہیں اور مال داروں کے بچے بچیاں قرآن کریم حفظ کر رہے ہیں۔ اب قرآن کریم امیروں کے گھروں میں داخل ہو گیا ہے۔ اور مزید انقلاب آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

آج سے تقریباً پچپن سال پہلے سیٹھی محمد یوسف صاحب (مرحوم) میرے پاس آئے اور کہنے لگے مجھے وقت دیں،

ملک کا دورہ کریں۔ میں نے پوچھا دورہ کس کام کے لیے کرنا ہے؟ تو کہنے لگے کہ جب رمضان شریف کا مہینہ آتا ہے ہمیں قرآن سنانے کے لیے حافظ نہیں ملتے کیوں کہ حافظوں کی تعداد بہت کم ہے۔ کیمل پور موجودہ اٹک اور میاں والی کے علاقوں سے چند حافظ مل جاتے ہیں مگر ضرورت زیادہ حفاظ کی ہوتی ہے۔ پھر جو ملتے ہیں تجوید وقرأت کے بغیر سادہ قرآن پڑھے ہوتے ہیں لہٰذا لوگوں کو ترغیب دیں کہ وہ بچوں کو حفظ کے لیے بھیجیں اور یہ بھی بتائیں کہ قرآن کریم صرف غریبوں کے لیے نہیں ہے امیروں کے لیے بھی ہے۔ تاکہ مال دار لوگ بھی اپنے بچوں کو حفظ کرائیں اور صرف اندھوں کے لیے نہیں بلکہ آنکھوں والوں کے لیے بھی ہے۔

چنانچہ میں ان کے ساتھ گیا اور ملک کے مختلف علاقوں کے دورے کیے۔ ایک جگہ میں نے اپنا دامن پھیلا دیا اور کہا میں تم سے چندہ وصول کرنے کے لیے آیا ہوں مگر روپے، پیسے اور کپڑے وغیرہ کا چندہ نہیں بلکہ چندہ بچوں کا لینا ہے۔ لوگ بڑے حیران ہوئے کہ یہ مولوی ہمارے بچوں کو جھولی میں ڈال کر کہاں لے جائے گا؟ میں نے کہا پریشان نہ ہوں تمھارے بچے یہیں رہیں گے، تم پڑھنے کے لیے بچے دو ہم معلم دیں گے۔ سیٹھی صاحب کافی مخیر آدمی تھے۔ اس سلسلے میں انھوں نے کافی کام کیا۔

اب تو اللہ تعالیٰ کا فضل ہے ملک میں مدرسوں کا جال بچھا ہوا ہے۔ صرف ہمارے گکھڑ میں دس مدرسے ہیں اور ہماری انجمن کے تحت جو بچے حفظ کر رہے ہیں تقریباً دو سو ہیں۔ گوجرانوالہ میں مدرسہ جامعہ قاسمیہ ہے میں اس کا برائے نام سرپرست ہوں اور میرے نام کی تختی بھی لگی ہوئی ہے۔ اس میں بچوں کے علاوہ تقریباً تین سو بچیاں قرآن کریم کی تعلیم حاصل کر رہی ہیں اور ان میں امیر گھرانوں کی بچیاں بھی ہیں۔ جہلم میں جامعہ حنفیہ میں میری درمیانی بچی پڑھاتی ہے۔ اس مدرسہ میں تقریباً چار سو بیرونی بچیاں ہیں جو قرآن کریم کی تعلیم حاصل کر رہی ہیں۔ اس مدرسہ میں حفظ وقرأت کے ساتھ ساتھ درس نظامی کا شعبہ بھی ہے۔

امریکہ کا یہ خیال تھا کہ پاکستان میں ہم انھیں بے دین بنا دیں گے۔ الحمدللہ! اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم کے ساتھ علماء نے اس کا راستہ روکا ہے اور لوگ دین کو پہلے سے زیادہ سمجھتے ہیں۔ اور بہ نسبت پہلے کے دین کی طرف مائل بھی زیادہ ہیں۔ یہاں تک کہ جو لوگ دین کا نام تک سننے کے لیے تیار نہیں تھے ان کے بچے بھی قرآن کریم کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ تو وہ مسافر غریب بچے جوان مدرسوں میں دینی تعلیم حاصل کر رہے ہیں اور وہ مدرسہ میں پابند ہو کر رہ گئے ہیں یہ تمھارے صدقہ وخیرات کا مصرف ہیں۔

تو فرمایا ﴿لِلْفُقَرَآءِ الَّذِیْنَ﴾ یہ صدقات ان محتاجوں کے لیے ہیں ﴿اُحْصِرُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ﴾ جو روک دیئے گئے ہیں اللہ کے راستے میں ﴿لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ﴾ نہیں طاقت رکھتے ﴿ضَرْبًا فِی الْاَرْضِ﴾ زمین میں چلنے کی ﴿یَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ﴾ ناواقف آدمی ان کو سمجھتا ہے ﴿اَغْنِیَآءَ﴾ مال دار ہیں ﴿مِنَ التَّعَفُّفِ﴾ سوال سے بچنے کی وجہ سے ﴿تَعْرِفُهُمْ﴾ تو ان لوگوں کو پہچانے گا ﴿بِسِیْمٰهُمْ﴾ اُن کی علامتوں کے ساتھ ﴿لَا یَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا﴾ نہیں سوال کرتے لوگوں سے چمٹ کر ﴿وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَیْرٍ﴾ اور جو بھی تم مال خرچ کرو گے ﴿فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِیْمٌ﴾ تو بے شک اللہ تعالیٰ اُن کو جانتا ہے۔

اب آگے یہ مسئلہ بیان ہو رہا ہے کہ صدقات وخیرات کے لیے کوئی وقت متعین نہیں ہے۔ فرمایا ﴿اَلَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِالَّیْلِ وَالنَّهَارِ﴾ وہ لوگ جو خرچ کرتے ہیں اپنے مالوں کو رات کو اور دن کو یعنی صدقہ وخیرات کے لیے کوئی خاص وقت متعین نہیں ہے بلکہ چوبیس گھنٹوں میں جب چاہو خرچ کرو۔ ہم لوگوں نے تو صدقہ وخیرات کے لیے جمعرات متعین کی ہوئی ہے کہ جمعرات آئے گی تو صدقہ کریں گے۔ یادسواں، چالیسواں ہوگا تو خیرات ہوگی۔ قرآن کا حکم ہے کہ رات کو کرو دن کو کرو ﴿سِرًّا﴾ مخفی طریقہ پر کرو ﴿وَّعَلَانِیَةً﴾ اور ظاہر کر کے کرو نیت صاف ہے تو جس طرح چاہو خرچ کرو کوئی وقت متعین نہیں ہے۔

اور یہ مسئلہ یاد رکھنا! تم نے کسی مسکین کو دس روپے دیئے ہیں اس نیت کے ساتھ کہ اے پروردگار! اس کا ثواب میرے والدین کو پہنچا دے تو جتنا ثواب اس کے والدین کو ملے گا اتنا اس دینے والے کو بھی ملے گا۔ تم نے تین دفعہ سورۂ اخلاص پڑھی اور نیت کی کہ اس کا ثواب ہمارے والدین کو دادا دادی، نانا نانی کو یا جتنے لوگوں کی نیت کرو گے ان سب کو برابر، برابر ثواب ملے گا اور پڑھنے والوں کو بھی پورا ثواب ملے گا خسارے والی کوئی بات نہیں ہے کہ تم نے خیرات کر کے یا پڑھ کر ثواب پہنچایا تو تم محروم ہو گئے اور سارا ثواب آگے چلا گیا، بلکہ سب کو برابر ملے گا۔ ﴿فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ﴾ پس ایسے لوگوں کے لیے ان کے رب کے ہاں اجر ہے ﴿وَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ﴾ اور نہ ان پر خوف ہوگا قیامت والے دن اور نہ وہ غم کریں گے۔

﴿اَلَّذِیْنَ﴾ وہ لوگ ﴿یَاْكُلُوْنَ﴾ جو کھاتے ہیں الرِّبٰوا ﴿سود﴾ ﴿لَا یَقُوْمُوْنَ﴾ نہیں کھڑے ہوں گے ﴿اِلَّا﴾ مگر ﴿كَمَا یَقُوْمُ﴾ جیسا کھڑا ہوتا ہے ﴿الَّذِیْ﴾ وہ شخص ﴿یَتَخَبَّطُهُ﴾ جس کو بدحواس کر دیا ہو ﴿الشَّیْطٰنُ﴾ جن نے ﴿مِنَ الْمَسِّ﴾ چمٹ کر ﴿ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ﴾ یہ اس لیے کہ بے شک انھوں نے ﴿قَالُوْۤا﴾ کہا ﴿اِنَّمَا﴾ پختہ بات ہے ﴿الْبَیْعُ﴾ خرید وفروخت ﴿مِثْلُ الرِّبٰوا﴾ سود کی طرح ہے ﴿وَاَحَلَّ اللّٰهُ﴾ اور حالانکہ حلال کیا ہے اللہ تعالیٰ نے ﴿الْبَیْعَ﴾ بیچنا ﴿وَحَرَّمَ الرِّبٰوا﴾ اور حرام کیا ہے اللہ تعالیٰ نے سود کو ﴿فَمَنْ﴾ پس وہ شخص ﴿جَآءَهٗ﴾ جس کے پاس آئی ﴿مَوْعِظَةٌ﴾ نصیحت ﴿مِّنْ رَّبِّهٖ﴾ اس کے رب کی طرف سے ﴿فَانْتَهٰی﴾ پس وہ باز آ گیا ﴿فَلَهٗ﴾ پس اس کے لیے ہے ﴿مَا سَلَفَ﴾ جو پہلے ہو چکا ﴿وَاَمْرُهٗۤ اِلَی اللّٰهِ﴾ اور معاملہ اس کا اللہ تعالیٰ کے حوالے ہے ﴿وَمَنْ عَادَ﴾ اور جو شخص پھر لینے لگا ﴿فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ﴾ پس وہ دوزخ والے ہیں ﴿هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ﴾ وہ دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے ﴿یَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا﴾ مٹاتا ہے اللہ تعالیٰ سود کو ﴿وَیُرْبِی الصَّدَقٰتِ﴾ اور بڑھاتا ہے صدقات کو ﴿وَاللّٰهُ﴾ اور اللہ تعالیٰ ﴿لَا یُحِبُّ﴾ نہیں محبت کرتا ﴿كُلَّ كَفَّارٍ اَثِیْمٍ﴾ کسی ناشکری کرنے والے گناہ گار سے ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ﴾ بے شک وہ لوگ ﴿اٰمَنُوْا﴾ جو ایمان لائے ﴿وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ﴾ اور انھوں نے

عمل کیے اچھے ﴿وَ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ﴾ اور قائم کی انھوں نے نماز ﴿وَ اٰتَوُا الزَّکٰوۃَ﴾ اور دی انھوں نے زکوٰۃ ﴿لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ﴾ ان کے لیے ان کا اجر ہے ان کے رب کے ہاں ﴿وَ لَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ﴾ اور نہ خوف ہوگا ان پر ﴿وَ لَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ﴾ اور نہ وہ غم کریں گے ﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا﴾ اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو ﴿اتَّقُوا اللّٰهَ﴾ ڈرو اللہ تعالیٰ سے ﴿وَ ذَرُوْا﴾ اور چھوڑ دو ﴿مَا بَقِیَ مِنَ الرِّبٰۤوا﴾ جو باقی ہے سود ﴿اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ﴾ اگر ہو تم مومن ﴿فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا﴾ پس اگر تم نہیں کرو گے ﴿فَاْذَنُوْا﴾ تو اعلان سن لو تم ﴿بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ﴾ اللہ تعالیٰ کے ساتھ لڑنے کا ﴿وَ رَسُوْلِهٖ﴾ اور اس کے رسول کے ساتھ ﴿وَ اِنْ تُبْتُمْ﴾ اور اگر تم توبہ کرلو ﴿فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ﴾ تو تمھیں تمھارے اصل مال مل جائیں گے ﴿لَا تَظْلِمُوْنَ﴾ نہ تم ظلم کرو ﴿وَ لَا تُظْلَمُوْنَ﴾ اور نہ تم پر ظلم کیا جائے۔

سُود کی حرمت

اس سے پہلی آیات میں صدقات اور زکوٰۃ کا بیان تھا۔ بہ ظاہر ان کے ادا کرنے سے مال میں کمی آتی ہے یعنی جب تم نے زکوٰۃ ادا کی، فطرانہ دیا یا عُشر دیا تو جتنی رقم ادا کی اُتنی رقم کم ہوگئی۔ اسی طرح جو صدقہ خیرات کیا جاتا ہے بہ ظاہر مال میں تھوڑی سی کمی آتی ہے اور اس کے مقابلہ میں سود سے بہ ظاہر مال میں اضافہ ہوتا ہے۔ یہاں یہ بات مدنظر رہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت ملی اُس وقت نہ سود حرام تھا نہ شراب حرام تھی اور بھی بعض چیزیں حرام نہ تھیں۔ مثلاً: مومن کا فر کا نکاح جائز تھا۔ رفتہ رفتہ ان چیزوں پر پابندیاں لگیں۔

تو اللہ تبارک وتعالیٰ ان چیزوں کی حقیقت کو بیان فرماتے ہیں: ﴿اَلَّذِیْنَ یَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا﴾ وہ لوگ جو سود کھاتے ہیں اور سود قطعی طور پر حرام ہے جیسا کہ آگے یہ جملہ آرہا ہے ﴿وَ حَرَّمَ الرِّبٰوا﴾ اور اللہ تعالیٰ نے سود کو حرام فرمایا ہے۔ سود کو حلال سمجھنے والا شخص دائرۂ اسلام سے خارج ہے اور حرام سمجھتے ہوئے اگر ایسا کرتا ہے تو وہ گنہ گار ہے۔ کیوں کہ فقہی طور پر مسئلہ یہ ہے کہ حرام قطعی کو حلال سمجھنا کفر ہے اور حرام کو حرام سمجھ کر کرنا گناہ ہے۔

حدیث شریف میں آتا ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب کسی قوم کو دو روحانی بیماریاں لگ جائیں ((فَقَدْ اَحَلُّوْا بِاَنْفُسِهِمْ سَخَطَ اللّٰهِ)) تو تحقیق انھوں نے اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی ناراضی کا مستحق بنالیا۔ یعنی انھوں نے اللہ تعالیٰ کے عذاب کو جان بوجھ کر دعوت دی۔ وہ دو بیماریاں کون کون سی ہیں؟ فرمایا ایک زنا ہے اور دوسری ربٰوا (سود) ہے۔ اگر رب تعالیٰ رحمٰن ورحیم اور حلیم نہ ہو تو سب لوگ تباہ ہو جائیں۔

تو جو لوگ سود کھاتے ہیں ﴿لَا یَقُوْمُوْنَ﴾ نہیں کھڑے ہوں گے قبروں سے نکل کر قیامت والے دن ﴿اِلَّا كَمَا یَقُوْمُ﴾

﴿الَّذِیْ﴾ مگر ایسے جیسے کھڑا ہوتا ہے وہ شخص ﴿یَتَخَبَّطُهُ الشَّیْطٰنُ﴾ جس کو بدحواس کردے جن ﴿مِنَ الْمَسِّ﴾ چمٹ کر۔یعنی جس طرح آسیب زدہ آدمی کے ہوش وحواس اُڑ جاتے ہیں اسی طرح سودخوروں کی حالت ہوگی کہ جس وقت وہ اللہ تعالیٰ کی عدالت میں پیشی کے لیے قبروں سے نکلیں گے تو وہ بدحواس ہوں گے۔

امام سرخسی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں اور دیگر مفسرین نے بھی لکھا ہے کہ جنات انسان کو تکلیف پہنچا سکتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ اہل سنت والجماعت کا اس پر اتفاق ہے۔مگر آج کل اکثر لوگ وہم میں مبتلا ہیں کہ طبعی بیماریوں کو آسیب قرار دیتے ہیں یا جادو کہہ دیتے ہیں اور یہ کمزوری عموماً ضعیف الاعتقاد لوگوں میں ہے اور خصوصاً عورتوں میں کہ جب کوئی تکلیف ہو تو کہہ دیتی ہیں کہ مجھے کسی نے کچھ کردیا ہے۔کوئی عورت پھر گئی ہے، فلاں ہمارے گھر آئی تھی اس کے نتیجے میں مجھے یہ ہوگیا ہے۔حالانکہ یہ سب وہم ہیں اور غلط نظریے ہیں۔بے شک جادو حق ہے اور ہم اس کا انکار بھی نہیں کرتے لیکن ہر چیز کی کڑی اس کے ساتھ ملانا غلط ہے۔

خرافات کا مطلب

شمائل ترمذی میں روایت آتی ہے اور امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مسند میں بھی ذکر کی ہے کہ ایک موقع پر حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا حَدِیْثُ خُرَافَةٍ یہ خرافہ کی بات ہے۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سنا اور فرمایا خرافہ کیا شے ہے؟ تو اُم المومنین رضی اللہ عنہا نے کہا کہ جو بات مہمل ہو اور سمجھ نہ آئے اُسے حدیث خُرافہ کہتے ہیں، باقی مجھے حقیقت کا علم نہیں ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا خُرَافَةُ اِسْمُ رَجُلٍ اصل میں ایک آدمی کا نام تھا اَسَرَتِ الْجِنُّ اس کو جنات اُٹھا کر لے گئے اور کئی سال اس کو قید میں رکھا، پھر رہا کردیا۔جب وہ آیا تو جنات کی عجیب وغریب باتیں کرتا تھا جو لوگوں کو سمجھ میں نہیں آتی تھیں۔ تو پھر جو بات سمجھ نہ آتی اُسے کہہ دیتے دَعْ حَدِیْثُ خُرَافَةٍ چھوڑو یہ خرافہ کی بات ہے اور اسی خُرافہ سے خرافات کا لفظ نکلا ہے۔تو اس روایت سے معلوم ہوا کہ جنات انسان کو قید کرکے لے جاسکتے ہیں۔

گم شدہ خاوند کی بیوی کا حکم

اَلْمُدَوَّنَةُ الْکُبْرٰی میں روایت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ خلیفہ تھے۔ایک نوجوان خوب صورت عورت سامنے آکر کھڑی ہوگئی اور کہا کہ حضرت میری طرف توجہ فرمائیں۔حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کیا کہنا چاہتی ہو۔کہنے لگی حضرت میرے خاوند کا پتا نہیں کہ وہ کہاں چلا گیا ہے اور یہ بھی بتا کر نہیں گیا کہ وہ کدھر جارہا ہے اور نہ ہی گھر کوئی خرچہ چھوڑ کر گیا ہے اور میرے والدین بھی غریب ہیں، میرے بارے میں کوئی حکم فرمائیں۔حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ آج کے دن سے چار سال تک انتظار کرو جب چار سال مکمل ہوجائیں تو پھر چار ماہ دس دن عدت گزار کر تیرا نکاح ہوسکتا ہے اور اس عرصہ میں تیرا خرچہ بیت المال کے ذمہ ہے۔

مفقود کے بارے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ فتویٰ بڑا آسان ہے۔حضرت علی رضی اللہ عنہ کا فتویٰ بہت سخت ہے۔وہ فرماتے ہیں کہ وہ آدمی جس دن گم ہوا ہے اس کے بعد ستر سال تک عورت انتظار کرے، پھر چار مہینے دس دن عدت گزارے پھر اگر موقع ہے

تو نکاح کرے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فتویٰ کے مطابق امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فتویٰ دیا۔ تو بے سمجھ لوگوں نے آسمان سر پہ اُٹھالیا کہ دیکھو اتنے انتظار کے بعد تو پھر منکر نکیر کے ساتھ ہی نکاح ہوگا اور تو کسی سے ہو نہیں سکتا۔ تو امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کو برا بھلا کہنے کی ضرورت نہیں۔ یہ فتویٰ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ہے جو خلیفہ راشد ہیں۔ فقہائے کرام رحمہم اللہ نے سہولت کی خاطر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے فتویٰ کے مطابق فتویٰ دیا ہے۔

تو اس عورت کو بیت المال سے خرچہ ملتا رہا چار سال گزر گئے اور عدت کے چار ماہ دس دن گزرنے کے بعد اس کا نکاح دوسرے آدمی سے کر دیا گیا، اولاد بھی ہو گئی۔ اس کے بعد پہلا خاوند بھی آ گیا۔

مسئلہ یہ ہے کہ پہلے خاوند کے آتے ہی دوسرا نکاح خود بہ خود ٹوٹ جاتا ہے۔ جس طرح کسی نے تیمم کیا ہو اور پانی مل جائے اور یہ پانی کے استعمال پر قادر بھی ہو تو تیمم خود بہ خود ٹوٹ جاتا ہے۔ تو پہلے خاوند نے آ کر مقدمہ دائر کر دیا کہ حضرت! یہ میری بیوی دوسرے کے گھر ہے اور اس کے ہاں اولاد بھی ہو گئی ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا تو عجیب آدمی ہے کہ نہ تو تُو نے بیوی کو خرچہ دیا نہ یہ بتایا کہ میں کہاں جا رہا ہوں۔ تو اب تک کہاں رہا ہے؟ اس نے اپنا سارا واقعہ سنایا کہ مجھے جنات اُٹھا کر لے گئے تھے اور اب رہا کیا ہے میرے اختیار میں کچھ نہیں تھا۔ تو احتیاطاً دوسرے کو حکم دیا کہ تو طلاق دے دے اور عدت گزارنے کے بعد پہلے کے حوالے کر دی گئی۔ کیوں کہ ایسی صورت میں عدت گزارنی پڑتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ دوسرے سے حاملہ ہو۔ کیوں کہ شریعت نسب کی بڑی حفاظت کرتی ہے۔ اور یہ مسئلہ بھی یاد رکھنا! ایسی عورت جس کا خاوند گم ہو گیا ہو اس کی مدت یَوْمُ الْمُرَافَعَہ سے شمار ہوگی۔ یعنی جس دن کیس قاضی کی عدالت میں دائر ہوا ہے۔ اس سے پہلے کا عرصہ شمار نہ ہوگا، چاہے وہ ایک ماہ ہو یا ایک سال ہو یا پانچ سال گزر گئے ہوں۔

تو جنات انسان کو تکلیف پہنچا سکتے ہیں۔ علامہ بدرالدین شبلی رحمۃ اللہ علیہ بڑے چوٹی کے محدث گزرے ہیں۔ اُنھوں نے جنات کے متعلق کتاب تحریر فرمائی ہے "احکام المرجان فی احکام الجان" اس میں اُنھوں نے عجیب عجیب واقعات بیان فرمائے ہیں۔ تو ﴿يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ﴾ بھی اس بات کی دلیل ہے کہ جنات انسان کو تکلیف پہنچا سکتے ہیں۔ اور یہ سود خور قبروں سے آسیب زدہ کی طرح حواس باختہ ہو کر کیوں کھڑے ہوں گے؟

حرام کو حلال سمجھنا کفر ہے

فرمایا ﴿ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ﴾ یہ اس واسطے کہ سود خوروں نے ﴿قَالُوْٓا﴾ کہا ﴿اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا﴾ پختہ بات ہے کہ خرید و فروخت سود کی طرح ہے۔ یعنی بیع اس واسطے جائز ہے کہ اس میں اسی طرح فائدہ ہے جس طرح سود میں فائدہ ہے۔ رِبٰوا کے لفظی معنی ہیں زیادتی۔ تو سود میں زیادتی ہوتی ہے۔ تو اُنھوں نے سود کو جواز میں اصل قرار دیا اور کہا کہ بیع اس واسطے جائز ہے کہ سود جائز ہے۔ اُلٹی گنگا بہائی۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ﴿وَ اَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ﴾ اور حال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خرید وفروخت کو حلال کیا ہے، واو حالیہ ہے۔ ﴿وَ حَرَّمَ الرِّبٰوا﴾ اور ربٰوا کو حرام کیا ہے۔ آج کل جو رقوم بینکوں میں رکھی جاتی ہیں ان کے متعلق ضیاء الحق کے دور میں مضاربت اور اشتراک کے نام پر مسئلہ چلا تھا جس کی تفصیل کا ہمیں علم نہیں ہے۔ مضاربت کی تعریف یہ ہے کہ ایک آدمی کی رقم ہو اور دوسرا آدمی اس رقم کے ساتھ کاروبار کرے اور طے کرلیں کہ اس رقم سے جو منافع حاصل ہوگا دونوں میں نصف نصف ہوگا یا دو حصے ایک کے اور ایک حصہ دوسرے کا، اس طرح بھی کر سکتے ہیں۔ یا تین حصے ایک کے اور چوتھا حصہ دوسرے کا اس طرح بھی کر سکتے ہیں۔ اور اگر نقصان ہوا تو اصل رقم کا بھی ہوگا۔ لیکن ہمیں معلوم ہوا ہے کہ وہ نفع فکس کر دیتے ہیں۔ مثلاً: ایک سو روپے کے سات، آٹھ روپے دے دیئے۔ تو یہ مضاربت کی تعریف میں نہیں آتا یہ خالص سود ہے۔ بس فرق صرف اتنا ہے کہ پہلے اس کا نام خنزیر تھا اور اب اس کا نام بکرا رکھ دیا ہے۔ البتہ اگر ایسی کوئی شق ہو کہ اس میں نفع ونقصان دونوں شامل ہیں تو پھر درست ہے۔

﴿فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ﴾ پس جس شخص کے پاس نصیحت آ گئی ﴿مِّنْ رَّبِّهٖ﴾ اس کے رب کی طرف سے ﴿فَانْتَهٰى﴾ پس وہ سود لینے سے باز آ گیا ﴿فَلَهٗ﴾ تو اس کے لیے ہے ﴿مَا سَلَفَ﴾ جو پہلے گزر چکا یعنی نہی سے پہلے جو کچھ کھا پی چکا اس پر کوئی گرفت نہیں ہوگی۔ یعنی اس کا تاوان نہیں دینا پڑے گا کیوں کہ حکم اب نازل ہوا ہے ﴿وَ اَمْرُهٗۤ اِلَى اللّٰهِ﴾ اور اس کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد ہے۔ یعنی بخشش کرے یا نہ کرے، یہ اللہ تعالیٰ کا کام ہے ﴿وَ مَنْ عَادَ﴾ اور جس نے اعادہ کیا ہمارے اس حکم کے نازل ہونے کے بعد ﴿فَاُولٰٓىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ﴾ پس یہ دوزخ والے ہیں ﴿هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ﴾ وہ دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے۔

﴿هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ﴾ کے بارے میں مفسرین کرام رحمہم اللہ یہ فرماتے ہیں کہ اگر وہ سُود کو حلال سمجھ کر لیتا ہے تو پھر وہ ہمیشہ ہمیشہ دوزخ میں رہے گا۔ کیوں کہ حرام قطعی کو حلال سمجھنا کفر ہے اور اگر سود کو حرام سمجھتے ہوئے کھاتا ہے تو اس وقت خُلود کا معنی تے ہیں کہ دیر تک دوزخ میں رہے گا۔ کیوں کہ کافر نہیں گنہ گار ہے جتنی سزا رب تعالیٰ دے گا اس کے بعد نکل آئے گا۔

﴿يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا﴾ اللہ تعالیٰ سود کو مٹاتا ہے ﴿وَ يُرْبِي الصَّدَقٰتِ﴾ اور صدقات کو بڑھاتا ہے۔ اسی مضمون کی ایک ت کریمہ اکیسویں پارہ سورۃ روم میں آتی ہے۔ اس کی تفسیر میں حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

سُود، بیاج سے گو بہ ظاہر مال بڑھتا دکھائی دیتا ہے لیکن حقیقت میں گھٹ رہا ہے جیسے کسی آدمی کا بدن ورم سے پھول جائے وہ بیماری یا پیامِ موت ہے۔ اور زکوٰۃ نکالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مال کم ہوگا فی الحقیقت وہ بڑھتا ہے جیسے کسی مریض کا بدن مسہل یا تنقیہ سے گھٹتا دکھائی دے مگر انجام اس کا صحت ہو۔ سُود اور زکوٰۃ کا حال بھی انجام کے اعتبار سے ایسا ہی سمجھ لو۔ یعنی سود کو اس طرح سمجھو کہ ایک آدمی بیمار ہے اور بیماری کی وجہ سے جسم میں ورم آ گیا ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ میں موٹا اور پہلوان بن گیا ہوں یہ اس کی نادانی ہے۔ اسی طرح بہ ظاہر سُود سے رقم بڑھتی ہے لیکن یہ اس کی تباہی کا سبب ہے۔ اور صدقات خیرات کو اس طرح سمجھو کہ جسم میں فاسد مواد جمع ہو جائے تو حکیم صاحب جلاب دیتے ہیں جس سے جسم کمزور ہو جاتا ہے۔ مگر اس کمزوری میں اس کی صحت ہے۔ تو صدقات خیرات سے بہ ظاہر مال میں کمی آتی ہے لیکن حقیقتاً وہ اضافہ ہے۔

مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے جس ترجمہ کا حاشیہ اور مختصر تفسیر لکھی ہے وہ ترجمہ شیخ الہند مولانا محمود الحسن رحمۃ اللہ علیہ نے مالٹا میں اسیری کی حالت میں لکھا ہے۔ وہ اس طرح ہوا کہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ فریضۂ حج ادا کرنے کے لیے مکہ مکرمہ میں موجود تھے۔ یہ انگریز کے اقتدار کے زمانے کی بات ہے۔ اس وقت عرب کا اقتدار حسین شریف مکہ کے پاس تھا۔ وہ شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سے ترکوں کے بارے میں فتویٰ لینا چاہتا تھا کہ وہ کافر ہیں۔ اور اس کی وجہ یہ تھی کہ مصطفیٰ کمال نے حسین شریف مکہ سے مخالفت کی وجہ سے اسلام دشمنی شروع کردی کہ قرآن شریف کی تلاوت پر پابندی لگادی کہ یہ عربی میں ہے۔ اذان بند کرادی کہ عربی میں ہے، اسی طرح حج پر پابندی لگائی۔ اس نادان نے بھی نہ سوچا کہ تیری دشمنی شریف حسین سے ہے قرآن سے تو نہیں ہے۔ حج اور کعبہ سے تو نہیں ہے کہ تو نے ان پر پابندی لگادی ہے۔ اور یہ پابندی پچیس سال تک رہی۔ پھر جلال بایار آیا اس نے حج کی بھی اجازت دی، تلاوتِ قرآن کی بھی اجازت دی۔

تو شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ میں ایک شخص کی نادانی کی وجہ سے ساری قوم کو کافر کس طرح کہہ دوں۔ حضرت نے فتویٰ دینے سے انکار کردیا تو اس جرم کی پاداش میں حضرت کو بمع مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا عزیز گل وغیرہ کے گرفتار کر لیا گیا اور ہندوستان کی انگریز حکومت کے حوالے کردیا گیا۔ آپ کئی سال مالٹا کی جیل میں رہے۔ اُنھوں نے قرآن کریم کا ترجمہ لکھا اور سورۃ فاتحہ اور بقرہ کی تفسیر بھی لکھی پھر فوت ہوگئے۔ پھر سورۃ آلِ عمران سے لے کر آخر تک حاشیہ اور مختصر تفسیر مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھی۔ یہ تفسیر اتنی مقبول ہے کہ شاہ فہد نے بھی اس کو طبع کرا کے لاکھوں کی تعداد میں تقسیم کی ہے۔

سُود اللہ کے خلاف اعلانِ جنگ ہے

تو صدقہ خیرات سے بہ ظاہر مال میں کمی آتی ہے لیکن حقیقتاً وہ اضافہ ہے۔ اور سُود کے ذریعہ بہ ظاہر مال میں اضافہ ہوتا ہے لیکن حقیقتاً وہ ورم ہے۔ یہ ہلاکت کا سبب بنے گا۔ ﴿وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ أَثِيمٍ﴾ اور اللہ تعالیٰ پسند نہیں کرتا کسی ناشکری کرنے والے گنہ گار کو ﴿إِنَّ الَّذِينَ﴾ بے شک وہ لوگ ﴿آمَنُوا﴾ جو ایمان لائے ﴿وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ﴾ اور عمل کیے اچھے ﴿وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ﴾ اور نماز قائم کی ﴿وَآتَوُا الزَّكَاةَ﴾ اور زکوٰۃ ادا کی ﴿لَهُمْ أَجْرُهُمْ﴾ ان کے لیے ان کا اجر ہے ﴿عِنْدَ رَبِّهِمْ﴾ ان کے رب کے ہاں ﴿وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ﴾ اور نہ ان پر خوف ہوگا ﴿وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ﴾ اور نہ وہ غم کریں گے ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا﴾ اے ایمان والو! ﴿اتَّقُوا اللّٰهَ﴾ اللہ تعالیٰ کے غضب اور عذاب سے ڈرو ﴿وَذَرُوا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبَا﴾ اور چھوڑ دو جو باقی ہے سود۔ یعنی اس کے حکم کے نازل ہونے کے بعد جو سُود کی رقم باقی رہتی ہے وہ نہ لو، چھوڑ دو ﴿إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ﴾ اگر تم مومن ہو ﴿فَإِنْ لَمْ تَفْعَلُوا﴾ پس اگر تم ایسا نہیں کرو گے ﴿فَأْذَنُوا بِحَرْبٍ مِنَ اللّٰهِ وَرَسُولِهِ﴾ تو اعلان سن لو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی طرف سے لڑنے کا۔ جب یہ حکم نازل ہوا تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کہا: لَا نَسْتَطِيعُ الْحَرْبَ بِاللّٰهِ وَ رَسُولِهِ "ہم نہیں طاقت رکھتے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے ساتھ لڑنے کی۔"

یادرکھو! اس سے زیادہ سخت حکم قرآن کریم میں نازل نہیں ہوا ﴿وَ اِنْ تُبْتُمْ﴾ اور اگر تم توبہ کرلو ﴿فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ﴾ تو تمھارے اصل مال تمھارے ہی ہیں البتہ اس کے ساتھ تم نے جو سود لینا تھا وہ نہیں لینا ﴿لَا تَظْلِمُوْنَ﴾ نہ تم کسی پر ظلم کرو کہ اصل رقم کے ساتھ سود لو ﴿وَلَا تُظْلَمُوْنَ﴾ اور نہ تم پر ظلم کیا جائے کہ تمھاری اصل رقم بھی تمھیں نہ ملے۔ یہ سود کے بارے میں رب تعالیٰ کے قطعی فیصلے ہیں۔ افسوس ہے کہ اب لوگ تاویلیں کرتے ہیں اور علی الاعلان سود کو حلال کہنے والے بھی موجود ہیں، لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ۔ اللہ تعالیٰ محفوظ رکھے اور ان کے شر سے بچائے۔ [آمین]

﴿وَ اِنْ كَانَ﴾ اور اگر ہے وہ مقروض ﴿ذُوْ عُسْرَةٍ﴾ تنگ دست ﴿فَنَظِرَةٌ﴾ پس اس کو مہلت دینی ہے ﴿اِلٰى مَيْسَرَةٍ﴾ فراخی تک ﴿وَ اَنْ تَصَدَّقُوْا﴾ اور یہ کہ تم صدقہ دو ﴿خَيْرٌ لَّكُمْ﴾ تمھارے لیے بہتر ہے ﴿اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ﴾ اگر ہو تم جانتے ﴿وَ اتَّقُوْا يَوْمًا﴾ اور ڈرو اس دن سے ﴿تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ﴾ جس میں تم لوٹائے جاؤ گے ﴿اِلَى اللّٰهِ﴾ اللہ تعالیٰ کی طرف ﴿ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ﴾ پھر ہر نفس کو پورا پورا دیا جائے گا ﴿مَّا كَسَبَتْ﴾ جو اس نے کمایا ﴿وَ هُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ﴾ اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا﴾ اے لوگو جو ایمان لائے ہو ﴿اِذَا تَدَايَنْتُمْ﴾ جب تم معاملہ کرو ﴿بِدَيْنٍ﴾ اُدھار اور قرض کا ﴿اِلٰۤى اَجَلٍ﴾ ایک میعاد تک ﴿مُّسَمًّى﴾ جو مقرر ہے ﴿فَاكْتُبُوْهُ﴾ پس تم اس اُدھار کو لکھ لو ﴿وَ لْيَكْتُبْ﴾ اور چاہیے کہ لکھے ﴿بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌۢ﴾ تمھارے درمیان لکھنے والا ﴿بِالْعَدْلِ﴾ انصاف کے ساتھ ﴿وَ لَا يَاْبَ كَاتِبٌ﴾ اور نہ انکار کرے لکھنے والا ﴿اَنْ يَّكْتُبَ﴾ یہ کہ وہ لکھے ﴿كَمَا عَلَّمَهُ اللّٰهُ﴾ جیسا کہ اس کو اللہ تعالیٰ نے لکھنے کی تعلیم دی ہے ﴿فَلْيَكْتُبْ﴾ پس چاہیے کہ وہ لکھے ﴿وَ لْيُمْلِلِ الَّذِيْ﴾ اور چاہیے کہ تحریر کروائے وہ شخص ﴿عَلَيْهِ الْحَقُّ﴾ جس نے حق دینا ہے ﴿وَ لْيَتَّقِ اللّٰهَ﴾ اور چاہیے کہ ڈرے اللہ تعالیٰ سے ﴿رَبَّهٗ﴾ جو اس کا رب ہے ﴿وَ لَا يَبْخَسْ مِنْهُ﴾ اور نہ کمی کرے اس حق سے ﴿شَيْـًٔا﴾ کچھ بھی ﴿فَاِنْ كَانَ الَّذِيْ﴾ پس اگر ہے وہ شخص ﴿عَلَيْهِ الْحَقُّ﴾ جس کے ذمے حق ہے ﴿سَفِيْهًا﴾ بے وقوف ﴿اَوْ ضَعِيْفًا﴾ یا کمزور ہے ﴿اَوْ لَا يَسْتَطِيْعُ﴾ یا وہ طاقت نہیں رکھتا ﴿اَنْ يُّمِلَّ﴾ یہ کہ وہ لکھوا سکے ﴿هُوَ﴾ وہ خود ﴿فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهٗ﴾ پس چاہیے کہ لکھوائے اس کا مختار یعنی وکیل ﴿بِالْعَدْلِ﴾ انصاف کے مطابق ﴿وَ اسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ﴾ اور گواہ بنالو تم دو گواہ ﴿مِنْ رِّجَالِكُمْ﴾ اپنے مردوں میں سے ﴿فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ﴾ پس اگر نہیں ہیں وہ دو مرد ﴿فَرَجُلٌ﴾ پس ایک مرد ﴿وَّ امْرَاَتٰنِ﴾ اور دو عورتیں ﴿مِمَّنْ تَرْضَوْنَ﴾ ان لوگوں میں سے ہوں

جن کو تم پسند کرتے ہو ﴿مِنَ الشُّهَدَآءِ﴾ گواہوں میں سے ﴿اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا﴾ (یہ دو عورتیں اس لیے ہیں) کہ اگر ان دو میں سے ایک بھول جائے ﴿فَتُذَكِّرَ﴾ پس یاد کرائے ﴿اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰى﴾ ان دو میں سے ایک دوسری کو ﴿وَلَا يَاْبَ الشُّهَدَآءُ﴾ اور نہ انکار کریں گواہ ﴿اِذَا مَا دُعُوْا﴾ جب ان کو گواہی کے لیے بلایا جائے ﴿وَلَا تَسْـَٔمُوْٓا﴾ اور نہ تم اُکتاؤ ﴿اَنْ تَكْتُبُوْهُ﴾ یہ کہ تم اس کو لکھو ﴿صَغِيْرًا اَوْ كَبِيْرًا﴾ چھوٹی چیز ہو یا بڑی ﴿اِلٰٓى اَجَلِهٖ﴾ اس کی میعاد تک۔

اس سے پہلے سُود کا بیان تھا۔ اور جو مال حرام ہیں ان میں سُود سرفہرست ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے صاف لفظوں میں فرمایا ﴿وَحَرَّمَ الرِّبٰوا﴾ اور حرام فرمایا ہے اللہ تعالیٰ نے سُود کو۔ مزید فرمایا کہ اگر تم سُود سے باز نہیں آتے ﴿فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ﴾ تو اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ لڑائی کے لیے تیار ہو جاؤ۔ اگر کوئی شخص سُود کو جائز سمجھ کر لیتا دیتا ہے تو وہ پکا کافر ہے۔ اس کے کفر میں کوئی شک نہیں ہے اور اگر سُود کو حرام سمجھ کر لیتا دیتا ہے تو گناہِ کبیرہ کا مرتکب ہے۔

اس سُود خور کو حکم ہے کہ ﴿وَاِنْ كَانَ﴾ اور اگر وہ مقروض (جس کو تم نے قرض دیا ہے اور اس نے تمھیں اصل رقم کے ساتھ سُود بھی دینا ہے تو سود تو حرام ہو گیا اور اصل رقم باقی رہ گئی) ﴿ذُوْ عُسْرَةٍ﴾ تنگ دست ہے ﴿فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ﴾ پس اس کو مہلت دو فراخی تک یعنی اگر تمھارا مقروض واقعتاً تنگ دست ہے تو فراخی تک مہلت دو۔ البتہ اگر کوئی شخص بدنیت ہے قرضہ واپس کر سکتا ہے لیکن نیت خراب ہے واپس نہیں کرتا تو اس پر سختی کرنا جائز ہے ﴿وَاَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ﴾ اور یہ کہ اگر تم صدقہ کرو یہ تمھارے لیے بہتر ہے ﴿اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ﴾ اگر تم جانتے ہو۔ تو صدقے کی صورت یہ ہے کہ تم معاف کر دو۔ پھر اس میں تفصیل ہے کہ ساری رقم معاف کر دو، آدھی معاف کر دو، کچھ حصہ معاف کر دو، جس طرح چاہو کر سکتے ہو اس کا تمھیں حق حاصل ہے اور مہلت دینا بھی صدقے کی ایک قسم ہے۔

ایک مسئلہ یاد رکھنا کہ اگر کسی شخص نے دوسرے کو قرض دیا ہے اور مقروض قرض ادا نہیں کر سکتا اور زکوٰۃ کا مستحق ہے اور تم یہ چاہتے ہو کہ زکوٰۃ میں وہ رقم چھوڑ دو تو اس طرح تمھاری زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی۔ کیوں کہ زکوٰۃ میں مال کی تملیک شرط ہے ﴿اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ﴾ میں لام تملیک کی ہے۔ اگر تم ایسا کرنا چاہتے ہو تو اس کی صورت یہ ہے کہ زکوٰۃ کی جتنی رقم تم اس کو دینا چاہتے ہو وہ اس کو دے دو۔ وہ جب وصول کرے گا مالک بن جائے گا۔ اس کے بعد تم کہو کہ تو نے میرا قرض دینا ہے دے دو۔ تو اس طرح تمھاری زکوٰۃ بھی ادا ہو جائے گی اور اس کا قرض بھی اُتر جائے گا۔

﴿وَاتَّقُوْا يَوْمًا﴾ اور ڈرو تم اس دن کے عذاب سے ﴿تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ﴾ جس دن تم لوٹائے جاؤ گے ﴿اِلَى اللّٰهِ﴾ اللہ تعالیٰ کی طرف ﴿ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ﴾ پھر پورا پورا دیا جائے گا ہر نفس کو ﴿مَّا كَسَبَتْ﴾ جو اُس نے کمایا یعنی تم نے نیکی بدی جو بھی کمائی کی ہے اس کا پورا پورا بدلہ ملے گا اور انسان کو اپنے کیے کا پتا ہوگا کیوں کہ وہاں حافظہ قوی کر دیا جائے گا۔ اگرچہ دنیا میں

انسان بہت سارے کام کر کے بھول جاتا ہے لیکن وہاں سارے یاد آجائیں گے اور فرشتوں کا تحریر کردہ اعمال نامہ بھی سامنے کر دیا جائے گا اور کہا جائے گا کہ اس کو پڑھ اور دیکھ کہ میرے فرشتوں نے کوئی کمی بیشی تو نہیں کی۔ انسان کہے گا لَا یَا رَبِّ اے میرے رب کوئی زیادتی نہیں ہوئی۔ اور انسان اپنا نامہ اعمال پڑھ کر حیران ہوگا اور کہے گا ﴿مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّ لَا كَبِيْرَةً اِلَّآ اَحْصٰهَا﴾ [الکہف:۴۹] "یہ کیسی کتاب ہے نہ چھوٹی بات کو چھوڑتی ہے نہ بڑی کو مگر اسے لکھ رکھا ہے۔" ﴿وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ﴾ اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔

قرض کے بعض ضروری احکام

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا﴾ اے لوگو! جو ایمان لائے ہو ﴿اِذَا تَدَايَنْتُمْ﴾ جب تم آپس میں معاملہ کرو ﴿بِدَيْنٍ﴾ قرض اور اُدھار کا ﴿اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى﴾ مقررہ میعاد تک ﴿فَاكْتُبُوْهُ﴾ تو اس کو لکھ لو تا کہ تمھیں مدت بھی معلوم ہو کہ فلاں تاریخ کو میں نے دینا ہے اور یہ بھی معلوم ہو کہ رقم کتنی ہے۔ کیوں کہ بعض آدمیوں کے حافظے کمزور ہوتے ہیں وہ بھول جاتے ہیں پھر جھگڑے ہوتے ہیں لہٰذا لکھ لو۔ ﴿وَلْيَكْتُبْ بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌ﴾ اور چاہیے کہ لکھے تمھارے درمیان لکھنے والا ﴿بِالْعَدْلِ﴾ انصاف کے ساتھ، نہ اُس کا حق مارے اور نہ اُس پر زیادتی کرے۔ مفسرین کرام رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ لکھنے والا اگر مزدوری لینا چاہے تو اس کو حق پہنچتا ہے وہ لے سکتا ہے۔

﴿وَلَا يَاْبَ كَاتِبٌ﴾ اور انکار نہ کرے لکھنے والا ﴿اَنْ يَّكْتُبَ﴾ لکھنے سے ﴿كَمَا عَلَّمَهُ اللّٰهُ﴾ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو لکھنے کی تعلیم دی اور وہ لکھنا جانتا ہے۔ یہ اس پر اللہ تعالیٰ کا احسان ہے تو اس احسان کا شکر یہ ہے کہ دوسروں کے کام آئے ﴿فَلْيَكْتُبْ﴾ پس چاہیے کہ لکھے۔ بغیر اُجرت کے لکھے تو ﴿نُوْرٌ عَلٰى﴾ نُور ہے اور اگر اُجرت لینا چاہے تو اس کا بھی اس کو حق ہے ﴿وَلْيُمْلِلِ﴾ اور چاہیے کہ اِملاء کرائے (اِمْلَال اور اِملاء دونوں ہم معنیٰ ہیں۔) ﴿الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ﴾ وہ شخص جس پر حق ہے یعنی مقروض لکھوائے کہ میں نے اتنی رقم دینی ہے کیوں کہ اس کو معلوم ہے کہ اس نے کتنے لیے ہیں اور اس پر لازم ہے ﴿وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ﴾ اور چاہیے کہ وہ مقروض اللہ سے ڈرے جو اس کا رب ہے۔ یعنی ٹھیک لکھوائے کسی قسم کی خیانت نہ کرے، ڈنڈی نہ مارے ﴿وَلَا يَبْخَسْ مِنْهُ شَيْئًا﴾ اور مقروض نے جو حق دینا ہے اس میں کسی چیز کی کمی نہ کرے، ٹھیک ٹھیک لکھوا دے کہ اتنا حق دینا ہے اور فلاں تاریخ کو دینا ہے۔

﴿فَاِنْ كَانَ الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ﴾ پس اگر ہے وہ شخص کہ جس کے ذمے حق ہے ﴿سَفِيْهًا﴾ بے عقل، پاگل قسم کا آدمی ہے تو بدحواس کیا لکھوائے گا ﴿اَوْ ضَعِيْفًا﴾ یا کمزور ہے۔ مثلاً: بچہ ہے کہ وہ لکھوا نہیں سکتا یا بہت بوڑھا ہے کہ لوگ اس کی بات ہی نہیں سمجھتے ﴿اَوْ لَا يَسْتَطِيْعُ اَنْ يُّمِلَّ هُوَ﴾ یا وہ خود لکھوانے کی طاقت نہیں رکھتا۔ مثلاً: گونگا ہے یا مُنشی کی زبان اور ہے اور اِس کی زبان اور ہے اور یہ اپنی زبان میں اس کو لکھوانے کی طاقت نہیں رکھتا ﴿فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهٗ بِالْعَدْلِ﴾ تو چاہیے کہ اس کا سرپرست

لکھوائے انصاف کے ساتھ۔ یعنی وہ اپنا مختار یا وکیل بنائے اور اس کو کہے تو میری طرف سے تحریر کروا دے۔ تو جب تم کسی کو اُدھار دو کسی میعاد تک اس کا پہلا حکم یہ ہے کہ اس کو تحریر میں لاؤ۔ اگر کوئی شخص اس حکم پر عمل نہیں کرے گا یعنی تحریر نہیں کروائے گا تو وہ گنہگار ہوگا۔

دوسرا حکم: ﴿وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ﴾ اور دو گواہ بنالو اپنے مردوں میں سے یعنی مومن ہوں کیوں کہ خطاب ایمان والوں کو ہے ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا﴾ اور یاد رکھنا کہ مومن کے کسی معاملہ میں غیر مسلم کو گواہ نہیں بنایا۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿لَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا﴾ "اور ہرگز نہیں بنائے گا اللہ تعالیٰ کافروں کے لیے مومنوں پر کوئی راستہ۔" کافر مسلمان کے حق میں کسی مسئلہ پر گواہی نہیں دے سکتا۔

﴿فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ﴾ پس اگر دو مرد نہ ہوں ﴿فَرَجُلٌ﴾ تو ایک مرد ﴿وَّامْرَاَتٰنِ﴾ اور دو عورتیں ﴿مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ﴾ جن کو تم گواہ پسند کرتے ہو۔ اور مومن اسی گواہ کو پسند کرے گا جو مومن اور عادل ہو اور عادل اسے کہتے ہیں جو صوم وصلوٰۃ کا پابند ہو۔ اس طرح کہ اس کے ذمہ ایک نماز اور ایک روزہ بھی نہ ہو اور سچ بولنے والا ہو۔ اگر اس نے جھوٹ بولا ہے اور جھوٹ سے توبہ نہیں کی تو وہ بھی گواہ نہیں بن سکتا۔ اور نماز باجماعت کا پابند ہو۔ اگر بغیر کسی مجبوری کے جماعت کے ساتھ نماز نہیں پڑھتا تو بھی گواہ نہیں بن سکتا۔ البتہ ایک آدھ نماز جماعت کے ساتھ نہیں پڑھ سکا تو کوئی بات نہیں ہے۔ اور اگر عادت ہے جماعت کی نماز چھوڑنے کی تو اس کی گواہی منظور نہیں ہے۔ اسی طرح ایسا آدمی بھی گواہ نہیں بن سکتا جو بغیر کسی عذر کے جمعہ چھوڑ دے۔ کیوں کہ جمعہ کی نماز بھی فرض عین ہے۔ فقہائے کرام رحمہم اللہ فرماتے ہیں: کہ جو شخص گلی محلوں میں ننگے سر پھرتا ہے یا لوگوں کے سامنے سڑکوں کے کنارے بیٹھ کر پیشاب کرتا ہے یا وہ شخص جو گلی بازاروں میں چلتے پھرتے کھاتا ہے وہ بھی گواہ نہیں بن سکتا۔ لہٰذا اس دور میں شرعی گواہ کا ملنا مشکل ہے۔

عورت کی گواہی

تو مسئلہ یہ بیان ہو رہا ہے کہ دو گواہ مرد ہونے چاہئیں اور اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں ہوں۔ تنہا عورتوں کی گواہی حدود میں مقبول نہیں ہے۔ مثلاً: زنا کے مسئلے میں ایک لاکھ عورت بھی گواہی دے تو قبول نہیں ہے۔ اس لیے کہ جج کے سامنے زنا کو جن صریح الفاظ میں بیان کرنا ہے عورت فطرتاً ان صریح الفاظ کو بیان نہیں کر سکتی۔ شریعت ان کی گواہی صرف ولادت اور رضاعت کے سلسلے میں منظور کرتی ہے یا عام حالات میں قتل کا مسئلہ ہے، چوری کا مسئلہ ہے یا نکاح، طلاق کا مسئلہ ہے یا اس طرح کے اور مسئلے ہیں کہ ان میں ایک مرد اور دو عورتیں گواہ بن سکتی ہیں۔

ایک موقع پر آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ عورتیں ناقصاتِ عقل بھی ہیں اور ناقصاتِ دین بھی۔ ایک عورت بولی حضرت! ہم ناقص العقل کیوں ہیں یعنی ہم میں کیا کمزوری پائی جاتی ہے؟ تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ کیا گواہی کے مسئلہ

میں دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کے برابر نہیں ہے؟ وہ عورت کہنے لگی حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) یہ بات تو صحیح ہے۔ (مگر آج کی عورت ہوتی تو کبھی نہ مانتی۔ بلکہ کہتی کہ ہماری عقل پوری ہے بلکہ مردوں سے بھی زیادہ ہے۔) اور فرمایا دین کا نقصان یہ ہے کہ ماہواری کے دنوں میں تم نماز، روزہ ادا نہیں کرسکتی۔ اسی طرح نفاس کے دنوں میں بھی نماز نہیں پڑھ سکتی، البتہ روزوں کی قضا ہوگی اور نماز کی معافی ہے۔ گواہی کے بارے میں یہ حکم قرآن پاک کا ہے اور حدیثِ متواتر کا ہے۔ اور اس پر اُمت کا اجماع ہے۔

آج بے دین قسم کے مرد اور عورتیں کہتی ہیں کہ عورت کی گواہی آدھی ہے کیا عورت کی نگاہ پوری نہیں ہوتی؟ یہ لوگ رب تعالیٰ کے حکم کا مذاق اُڑاتے ہیں حالانکہ مومن کو رب تعالیٰ کا حکم مان لینا چاہیے۔ تو گواہی کے مسئلہ میں دو عورتیں اس لیے ہیں ﴿اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا﴾ یہ کہ اُن دو میں سے ایک کوئی ضروری بات بھول جائے ﴿فَتُذَكِّرَ اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰى﴾ تو ان دو میں سے ایک یاد کرا دے گی دوسری کو یعنی اگر کوئی خاص بات ہے کہ جس پر گواہی موقوف ہے اور وہ ایک عورت کے ذہن سے نکل گئی ہے تو دوسری اس کو یاد کرا دے گی۔ عورتیں اگرچہ باتونی ہوتی ہیں لیکن اصل بات بھول جاتی ہیں اور دائیں بائیں کی باتیں کرتی رہتی ہیں۔ فرمایا: ﴿وَلَا يَاْبَ الشُّهَدَآءُ﴾ اور گواہ انکار نہ کریں ﴿اِذَا مَا دُعُوْا﴾ جب اُن کو بلایا جائے۔

مسئلہ یہ کہ اگر کسی شخص کی گواہی پر معاملہ موقوف ہے تو گواہی دینا واجب ہے اور نفسِ شہادت پر اُجرت لینا بھی جائز نہیں ہے۔ البتہ اگر مزدور آدمی ہے اور اس دن کی مزدوری رہ گئی ہے جس دن اس نے عدالت میں جا کر گواہی دی ہے تو اس دن کی مزدوری لے سکتا ہے اور آنے جانے کا کرایہ بھی لے سکتا ہے اور قاعدے کے مطابق کھانا بھی کھا سکتا ہے اور یہ ساری چیزیں اس کے ذمہ ہیں جس کے حق میں اس نے گواہی دینی ہے۔ البتہ یہ ساری چیزیں ہوں گی گواہ کی حیثیت کے مطابق۔ یعنی اگر وہ پہلے تھرڈ کلاس میں سفر کرتا ہے تو اس کو تھرڈ کلاس کا کرایہ دیا جائے گا۔ یہ جائز نہیں ہے کہ وہ فرسٹ کلاس کے ٹکٹ کا مطالبہ کرے۔ اسی طرح گھر میں اگر دال سبزی کھاتا ہے تو اس کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ مُرغے کا مطالبہ کرے۔

﴿وَلَا تَسْئَمُوْٓا﴾ اور نہ اُکتاؤ تم ﴿اَنْ تَكْتُبُوْهُ﴾ یہ کہ لکھو تم اُدھار کو ﴿صَغِيْرًا اَوْ كَبِيْرًا﴾ اُدھار چاہے تھوڑا ہو یا زیادہ ﴿اِلٰٓى اَجَلِهٖ﴾ اس کو میعاد تک لکھ لینا چاہیے اور لکھنے سے گھبرانا نہیں چاہیے۔ ان آیات میں دو مسئلے بیان ہوئے۔ ایک یہ کہ اگر معاملہ اُدھار کا ہے تو لکھ لو تاکہ بعد میں گڑبڑ نہ ہو۔ دوسرا یہ کہ گواہ بناؤ۔ باقی باتیں آگے آرہی ہیں۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

﴿ذٰلِكُمْ﴾ یہ حکم ﴿اَقْسَطُ﴾ زیادہ انصاف والا ہے ﴿عِنْدَ اللّٰهِ﴾ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ﴿وَاَقْوَمُ﴾ اور زیادہ درست ہے ﴿لِلشَّهَادَةِ﴾ گواہی دینے کے لیے ﴿وَاَدْنٰٓى﴾ اور زیادہ قریب ہے ﴿اَلَّا تَرْتَابُوْٓا﴾ اس کے کہ تم شک نہ کرو ﴿اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ﴾ مگر یہ کہ ہو ﴿تِجَارَةً حَاضِرَةً﴾ تجارت حاضر ﴿تُدِيْرُوْنَهَا﴾ جس کو تم لیتے دیتے ہو ﴿بَيْنَكُمْ﴾ آپس میں ﴿فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ﴾ پس نہیں ہے تم پر کوئی گناہ ﴿اَلَّا تَكْتُبُوْهَا﴾ یہ کہ تم اس کو نہ لکھو

﴿وَاَشْهِدُوْٓا﴾ اور گواہ بنالو تم ﴿اِذَا تَبَایَعْتُمْ﴾ جب تم خرید و فروخت کرو ﴿وَلَا یُضَآرَّ كَاتِبٌ﴾ اور نہ نقصان پہنچایا جائے لکھنے والے کو ﴿وَّلَا شَهِیْدٌ﴾ اور نہ گواہ کو ﴿وَاِنْ تَفْعَلُوْا﴾ اور اگر تم کرو گے ﴿فَاِنَّهٗ فُسُوْقٌۢ بِكُمْ﴾ تو بے شک یہ تمھاری نافرمانی ہوگی ﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ﴾ اور ڈرو تم اللہ تعالیٰ سے ﴿وَیُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ﴾ اور اللہ تعالیٰ تمھیں تعلیم دیتا ہے ﴿وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ﴾ اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کو جانتا ہے ﴿وَاِنْ كُنْتُمْ عَلٰی سَفَرٍ﴾ اور اگر ہو تم سفر میں ﴿وَّلَمْ تَجِدُوْا كَاتِبًا﴾ اور نہ پاؤ تم لکھنے والا ﴿فَرِهٰنٌ مَّقْبُوْضَةٌ﴾ پس رہن ہے قبضہ کیا ہوا ﴿فَاِنْ اَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا﴾ پس اگر مطمئن ہو جائیں بعض تمھارے بعض سے ﴿فَلْیُؤَدِّ الَّذِی﴾ پس چاہیے کہ ادا کرے وہ شخص ﴿اؤْتُمِنَ﴾ جس کو امین سمجھا گیا ہے ﴿اَمَانَتَهٗ﴾ اپنی امانت کو ﴿وَلْیَتَّقِ اللّٰهَ﴾ اور چاہیے کہ ڈرے اللہ تعالیٰ سے ﴿رَبَّهٗ﴾ جو اس کا رب ہے ﴿وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ﴾ اور نہ چھپاؤ تم گواہی ﴿وَمَنْ یَّكْتُمْهَا﴾ اور جو شخص چھپائے گا اس گواہی کو ﴿فَاِنَّهٗٓ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ﴾ تو بے شک گناہ گار ہونے والا ہے دل اس کا ﴿وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِیْمٌ﴾ اور اللہ تعالیٰ جو تم عمل کرتے ہو جانتا ہے۔

بڑے سودے تحریر کیے جائیں:

میں نے کل عرض کیا تھا کہ سارے قرآن میں سب سے لمبی اور بڑی آیت یہ ہے جو ﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا﴾ سے شروع ہوئی اور ﴿وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ﴾ پر ختم ہوئی۔ اور کل میں نے یہ بھی عرض کیا تھا کہ چھوٹی آیات دو حرفوں والی ہوتی ہیں جیسے حٰمٓ آیت ہے، یٰسٓ آیت ہے، طٰهٰ آیت ہے۔ تو اس آیت کریمہ میں بہت سارے احکامات بیان ہوئے ہیں۔ کل کے سبق میں تم نے پڑھا کہ جس وقت تم کسی سے اُدھار کرو یا قرض کا معاملہ کرو تو اس کے متعلق پہلا حکم یہ ہے کہ تم اس کو لکھ لو کہ فلاں نے اتنی رقم لینی ہے اور فلاں نے اتنی رقم دینی ہے۔ اور دوسرا حکم تھا کہ گواہ بنالو تا کہ آئندہ کسی قسم کی گڑبڑ نہ ہو۔ اسلام جھگڑے کا بالکل قائل نہیں ہے۔

اسی واسطے فقہائے کرام رحمہم اللہ نے صاف اور واضح احکام تحریر فرمائے ہیں کہ تم نے اگر کسی سے کوئی کام کروانا ہے تو پہلے اس سے اُجرت طے کر لو۔ مثال کے طور پر کسی سے کپڑا سلوانا ہے یا جوتے کی سلائی کروانی ہے تو پہلے اس سے اُجرت طے کرو۔ اگر تمھاری سمجھ میں آئے تو کام کراؤ ورنہ نہیں۔ مگر بات کو گول مول نہ رکھو کہ کام ہو جانے کے بعد وہ کہے کہ میں نے اتنی مزدوری لینی ہے اور تم یہ کہو ہم نے اتنی دینی ہے، تو جھگڑا ہوگا۔ اور اگر پہلے طے نہیں کریں گے تو دونوں گنہگار ہوں گے۔ لہٰذا ساری بات اچھی طرح طے کر لینی چاہیے۔ ہم لوگ عموماً پہلے شرم مین رہتے ہیں اور بعد میں جھگڑتے ہیں۔ ہاں اگر کسی چیز کی اُجرت یا قیمت متعین ہے چاہے سرکاری لحاظ سے یا عرف عام کے اعتبار سے۔ مثال کے طور پر گوجرانوالا سے لاہور جانے کے لیے ویگن کا

کرایہ متعین ہے۔ سب جانتے ہیں کہ کتنا ہے لہٰذا پہلے طے کرنے کی ضرورت نہیں۔ تو پہلے دو مسئلے بیان ہوئے کہ تم اگر کسی کو اُدھار دو یا قرض دو تو اس کو تحریر میں لاؤ اور اس پر گواہ ہونے چاہئیں۔ اس کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ذٰلِكُمْ﴾ یہی چیز یعنی گواہ اور تحریر ہو ﴿اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ﴾ اللہ تعالیٰ کے ہاں بڑی انصاف والی بات ہے ﴿وَاَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ﴾ اور زیادہ درست ہے گواہی دینے کے لیے۔ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ گواہ تو دیانت دار ہوتے ہیں مگر زیادہ عرصہ گزر جانے کی وجہ سے ان کو یاد نہیں رہتا کہ ہم نے کتنی رقم کی گواہی دینی ہے۔ یا تاریخ بھول جاتے ہیں کہ کون سی تاریخ متعین ہے۔ تو جب تحریر سامنے ہوگی تو گواہوں کو معلوم ہوگا کہ ہم نے فلاں چیز کی گواہی دینی ہے ﴿وَاَدْنٰۤى اَلَّا تَرْتَابُوْۤا﴾ اور یہ تحریر میں آجانا اور گواہوں کا متعین ہونا زیادہ قریب ہے کہ تم شک میں نہ پڑو ﴿اِلَّاۤ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً حَاضِرَةً﴾ مگر یہ کہ ہو تجارت حاضر ﴿تُدِيْرُوْنَهَا بَيْنَكُمْ﴾ جس کو تم آپس میں لیتے دیتے ہو ﴿فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ﴾ پس تم پر کوئی حرج نہیں ہے ﴿اَلَّا تَكْتُبُوْهَا﴾ یہ کہ تم اس کو نہ لکھو۔

جیسے: لوگ دکانوں سے سودا لیتے ہیں کہ چیز لی اور پیسے دے دیئے تو یہاں جھگڑے کا کوئی خطرہ نہیں ہے۔ کیوں کہ نقد ہے لہٰذا لکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اور یہاں لکھنے میں دکان دار کو بھی تکلیف ہے کہ وہ لکھے کہ میں نے نمک بیچا ہے، ہلدی بیچی ہے، مرچیں بیچی ہیں وغیرہ۔ لیکن ساتھ ہی فرمایا کہ تجارت تو ﴿حَاضِرَةً﴾ ہے مگر کوئی اہم چیز ہے، قیمتی ہے تو ﴿وَاَشْهِدُوْۤا﴾ اور گواہ بنالو ﴿اِذَا تَبَايَعْتُمْ﴾ جب تم خرید و فروخت کرو۔ مثال کے طور پر تم نے مکان خریدا ہے رقم نقد دے دی ہے اور قبضہ کر لیا یا کوئی قیمتی جانور خریدا تو اس پر بھی گواہ بناؤ تاکہ بعد میں کسی قسم کی گڑبڑ نہ ہو۔ کیوں کہ ہوسکتا ہے کہ اس چیز کے قیمتی ہونے کی وجہ سے کوئی گمراہ کرے اور اُکسائے کہ تو نے سستا بیچ دیا ہے اور وہ پھسل جائے ﴿وَلَا يُضَآرَّ كَاتِبٌ وَّلَا شَهِيْدٌ﴾ اور نہ نقصان پہنچایا جائے لکھنے والے کو اور نہ گواہ کو۔ مثلاً کاتب کا کوئی اپنا ضروری کام ہے یا اس نے کہیں ضروری جانا ہے جس کی وجہ سے وہ فوری طور پر تمھارا کام نہیں کرسکتا اور تم اس کو پکڑ لو اور کہو کہ مجھے پہلے لکھ دے پھر جہاں جانا ہے جا اور اپنا کام بعد میں کر لینا۔ اس طرح کاتب کو ضرر پہنچانا ٹھیک نہیں ہے، تم کوئی اور کاتب تلاش کرلو اور اس کو اپنے ضروری کام یا ڈیوٹی پر جانے دو۔

اسی طرح گواہ کہ اس نے کہیں خوشی میں شریک ہونا ہے یا اس کا ماتم ہوگیا ہے یا اس کی باقاعدہ کہیں ڈیوٹی ہے جس پر اس نے پہنچنا ہے اور تم کہو کہ سارے کام چھوڑ دے اور میرے ساتھ گواہی کے لیے چل۔ تو اس طرح تم اس کو تکلیف پہنچاتے ہو۔ آخر وہ بھی انسان ہے اس کی بھی ضروریات ہیں، مسائل ہیں تو اس کو مجبور کرنا صحیح نہیں۔ ایسے موقع پر تم عدالت کو کہہ سکتے ہو کہ میرا گواہ فلاں مجبوری کی وجہ سے نہیں آسکا کوئی اور تاریخ دے دی جائے۔ قانون بھی اور شریعت بھی اس چیز کی اجازت دیتی ہے۔ قانون اور شریعت میں ایسی شقیں موجود ہیں۔ تو ہر حال میں مجبور کرکے ساتھ لے جانا اس کو ضرر پہنچانا صحیح نہیں بلکہ تمھیں اس چیز کا حق نہیں ہے۔ یہ تفسیر اس صورت میں ہے کہ ﴿لَا يُضَآرَّ﴾ کو نفی مجہول کا صیغہ بنایا جائے۔

اور ﴿لَا یُضَآرَّ﴾ نفی معلوم کا صیغہ بھی بن سکتا ہے۔ اس وقت معنٰی ہوگا اور ضرر نہ پہنچائے کاتب اور گواہ۔ کیوں کہ لکھنے والا ہوشیار ہوتا ہے لکھنے میں دھوکا دے سکتا ہے اور حق والے کو نقصان پہنچا سکتا ہے لہٰذا اس کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ کسی کو تحریر میں نقصان پہنچائے۔ اور گواہ بھی نفس الامر کے مطابق صحیح گواہی دے۔ غلط گواہی دے کر گواہ بھی حق والے کو نقصان نہ پہنچائے ﴿وَاِنْ تَفْعَلُوْا﴾ اور اگر تم ایسی کارروائی کرو گے کہ ان شریف آدمیوں کو نقصان پہنچاؤ گے اور ان کے ساتھ زیادتی کرو گے ﴿فَاِنَّهٗ فُسُوْقٌۢ بِكُمْ﴾ تو بے شک یہ تمھاری نافرمانی ہے کہ تم نے رب کا حکم نہیں مانا ﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ﴾ اور ہر وقت اللہ کے عذاب سے ڈرو ﴿وَيُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ﴾ اور اللہ تعالیٰ تمھیں ان احکام کی تعلیم دیتا ہے اور ان احکامات کا تمھاری زندگی کے ساتھ گہرا تعلق ہے اور اچھی طرح سمجھ لو ﴿وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ﴾ اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کو جانتا ہے۔ یہاں تک تھی آیت مُدایَنَۃ۔

یہاں ایک فقہی مسئلہ سمجھ لیں کہ ہر رکعت میں کم از کم تین آیات پڑھنی ہیں چاہے امام ہو یا منفرد ہو۔ اگر کوئی تین آیات سے کم پڑھے گا تو اس کی نماز نہیں ہوگی۔ یا ایک آیت اتنی لمبی ہو جو تین چھوٹی آیتوں کے برابر ہو تو اس کا پڑھنا بھی جائز ہے نماز ہو جائے گی۔ جیسے یہ آیت مداینہ ہے یا چھٹے ساتویں پارے میں ہیں اور تین آیتوں کی شرط اس لیے ہے کہ قرآن کریم کی کوئی سورت تین آیات سے کم نہیں ہے۔ چھوٹی سورتوں میں سورۃ العصر، سورۃ الکوثر، سورۃ النصر ہیں۔ ان سب کی تین تین آیات ہیں۔

رہن کے احکام

آگے اور حکم ہے: ﴿وَاِنْ كُنْتُمْ عَلٰى سَفَرٍ﴾ اور اگر تم سفر پر ہو ﴿وَلَمْ تَجِدُوْا كَاتِبًا﴾ اور نہ پاؤ تم لکھنے والا۔ مثلاً قافلہ جا رہا ہے اور اس میں بہت سارے آدمی ہیں۔ اس قافلے میں سے کسی کو دوسرے سے رقم لینے کی ضرورت پڑی اور وہاں لکھنے والا کوئی نہیں تو ﴿فَرِهٰنٌ مَّقْبُوْضَةٌ﴾ پس رہن ہے قبضہ کیا ہوا۔ یعنی جس سے رقم لے اس کے پاس کوئی چیز گروی رکھ دے کہ میں جب تجھے رقم دوں گا تو اپنی چیز واپس لے لوں گا اور جس طرح گروی رکھنا سفر میں جائز ہے اسی طرح اقامت میں یعنی عام حالات میں بھی جائز ہے۔ سفر میں چوں کہ اس کی ضرورت زیادہ پیش آتی ہے کہ لکھنے والا نہیں ملتا اس واسطے سفر کی قید لگائی ہے۔ اقامت کی حالت میں رہن خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے ثابت ہے۔

چنانچہ بخاری شریف کی روایت میں آتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو گھریلو اخراجات کے سلسلہ میں جَو درکار تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے گھریلو خادم حضرت انس رضی اللہ عنہ (کہ اکثر گھر کا سودا سلف یہی لاتے تھے اور کبھی کبھی یہ ڈیوٹی حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے سپرد بھی ہوتی تھی۔) کو ابو شحم نامی یہودی کے پاس بھیجا جو بڑا سخت مزاج تھا۔ اُنھوں نے اس کو جا کر کہا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو تیس صاع جو بطور قرض کے چاہئیں (ایک صاع ساڑھے تین کلو کا ہوتا ہے) اس نے کہا میرے پاس کوئی چیز گروی رکھو تب

دوں گا۔ خادموں نے آ کر کہا کہ حضرت! وہ ادھار دینے کے لیے تیار نہیں ہے جب تک کہ اس کے پاس کوئی چیز گروی نہ رکھی جائے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی زِرہ مبارک دی کہ یہ گروی رکھ کر جَو لے آؤ۔ کیوں کہ مجبوری تھی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زِرہ اس یہودی کے پاس گروی رکھی اور تیس صاع جو لا کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں پیش کیے۔ اتفاق کی بات ہے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وہ زرہ اپنی حیاتِ مبارکہ میں واپس نہ لے سکے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال کے بعد حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے قرض ادا کر کے زرہ واپس لی۔ مقصد یہ ہے کہ رہن آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مدینہ میں قیام کے دوران رکھا تھا لہٰذا سفر کی قید اتفاقی ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تول کر جَو اپنی بیویوں میں برابر تقسیم کیے۔ اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نو بیویاں اور دو لونڈیاں تھیں۔ تول کر اس واسطے تقسیم کیے کہ کسی کی حق تلفی نہ ہو۔ اور آج بھی اگر کسی کی دو یا تین بیویاں ہوں تو اخراجات کے سلسلہ میں عدل و انصاف کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا تقویٰ

ضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی دو بیویاں تھی، اولاد نہ تھی، لاولد تھے۔ آج کل کا موسم تھا۔ ایک عقیدت مند نے دو تربوز ہدیۃً پیش کیے۔ (اور مسئلہ یہ ہے کہ ہدیہ قبول کر لینا چاہیے رد کرنا خلافِ سنت ہے۔) شاید دو اس واسطے پیش کیے کہ بیویاں دو ہیں دونوں کو ایک ایک دیں گے اور وہ شخص ہدیہ دے کر چلا گیا تو حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے خادم کو بھیجا کہ چھری لاؤ اور دو پراتیں بھی لے آؤ۔ خادم نے کہا حضرت! دو پراتوں کا کیا کرنا ہے؟ فرمایا یہ تربوز برابر کاٹنے ہیں اور آدھا اس میں سے اور آدھا اُس میں سے ایک بیوی کو دینا ہے اور آدھا اس میں سے اور آدھا اس میں سے دوسری بیوی کو دینا ہے۔ خادم نے کہا حضرت ایک تربوز ایک بیوی کو اور دوسرا دوسری بیوی کو دے دیں۔ فرمایا بیٹے بعض تربوز میٹھے ہوتے ہیں اور بعض پھیکے۔ تو اگر ایک کا میٹھا اور دوسری کا پھیکا نکلا تو حق تلفی ہو گی۔ یہ درست نہیں ہے۔ تو ایک کاٹ کر آدھا آدھا کر کے دیا پھر دوسرا کاٹ کر آدھا آدھا کر کے دیا۔ جو اس طرح انصاف کر سکتا ہو اس کو شریعت ایک سے زائد شادیاں کرنے اجازت دیتی ہے ورنہ فَوَاحِدَةً پس ایک پر ہی گزارا کرے۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے تقویٰ کا یہ عالم تھا کہ ایک دفعہ حضرت سفر سے واپس تھانہ بھون آ رہے تھے کہ ایک عقیدت مند نے گنے کی ایک گٹھری ہدیۃً دی، حضرت نے قبول کر لی اور خادم کو فرمایا کہ اس کا وزن کراؤ۔ اگر ہم قانون کے مطابق بغیر کرایہ کے لے جا سکتے ہیں تو ٹھیک ہے ورنہ ان کا ٹکٹ لینا ہے۔ (یہ انگریز کے دور کی بات ہے۔) گارڈ حضرت کو جانتا تھا اس نے کہا حضرت وزن کی کیا ضرورت ہے، جہاں تک میں نے جانا ہے میں لے جاؤں گا آپ کو کوئی نہیں پوچھے گا۔ حضرت نے فرمایا تو نے کہاں تک جانا ہے؟ اس نے کہا مظفر نگر تک۔ فرمایا میں نے تو آگے جانا ہے۔ تو گارڈ نے کہا حضرت آپ سہارن پور تک جائیں گے تو کوئی بات نہیں میں آگے کا بھی انتظام کر دوں گا۔ حضرت نے فرمایا میں نے تو سہارن پور سے آگے

جاتا ہے۔کیا آپ آگے کا بھی انتظام کردیں گے۔ مطلب یہ تھا کہ میں نے آخرت کی طرف جانا ہے قیامت کے دن سوال ہوگا اس کا جواب کون دے گا؟ تیری تو جہاں تک ڈیوٹی ہے وہاں تک پہنچا دے گا آگے کیا بنے گا؟ اب ایسے متقی لوگ کہاں ہیں جن کو دیکھنے کے لیے نگاہیں ترستی ہیں۔ یہ حضرات علم کے بھی پہاڑ تھے اور تقویٰ کے بھی۔

تو مسئلہ یہ ہے کہ جس طرح سفر میں گروی رکھ سکتے ہیں اسی طرح حضر میں بھی رکھ سکتے ہیں۔لیکن یاد رکھنا! کہ رہن شدہ چیز سے فائدہ اُٹھانا حرام ہے۔مثلاً: مکان گروی رکھا گیا ہے تو اس میں سکونت اختیار نہیں کر سکتے۔ زمین رہن رکھی گئی ہے تو اس میں کاشت نہیں کر سکتے۔سواری والا جانور ہے تو اس پر سوار نہیں ہو سکتے اور اگر دودھ والا جانور ہے تو اس کا دودھ نہیں پی سکتے۔اگر کوئی مشین ہے تو اس کو اپنے کام کے لیے نہیں چلا سکتے۔ یہ تمھارے پاس صرف وثیقہ ہے تاکہ تمھاری رقم ضائع نہ ہو۔

﴿فَاِنْ اَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا﴾ پس اگر امن میں ہوں بعض تمھارے بعض سے ﴿فَلْيُؤَدِّ الَّذِی اؤْتُمِنَ اَمَانَتَهٗ﴾ تو چاہیے کہ ادا کرے وہ جس کو امین سمجھا گیا ہے اپنی امانت یعنی اس کے پاس جو امانت رکھی گئی ہے وہ اپنی امانت واپس کردے جو مقروض ہے وہ امین ہے اس قرض کا جو اس نے لیا ہے۔لہٰذا وہ قرض والی امانت قرض خواہ کو واپس کرے۔اگر اس نے کوئی چیز رہن رکھے بغیر قرض دیا ہے تو قرضِ حسنہ ہے۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ صدقہ کی دس نیکیاں ہیں اور قرضِ حسنہ کی سترہ نیکیاں ہیں۔اب سوال یہ ہے کہ اتنا فرق کیوں ہے کہ صدقے میں دس نیکیاں اور قرض حسنہ میں سترہ نیکیاں۔ جب کہ صدقہ جو دیا گیا ہے وہ واپس نہیں ملتا اور قرضِ حسنہ کی رقم واپس ملتی ہے۔

محققین فرماتے ہیں کہ صدقہ کرنے والا صرف اپنا فائدہ سوچتا ہے کہ مجھے اس کا ثواب ملے گا۔جب کہ قرضِ حسنہ میں دوسرے کا فائدہ ملحوظ رکھا جاتا ہے کہ یہ ضرورت مند ہے اس لیے قرضِ حسنہ کا ثواب زیادہ ہے۔

﴿وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ﴾ اور چاہیے کہ ڈرے اللہ تعالیٰ سے جو اس کا پروردگار ہے کہ اگر امانت واپس نہ کی تو گرفت ہوگی ﴿وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ﴾ اور نہ چھپاؤ تم گواہی کو۔مگر آج کل کے زمانہ میں سچی گواہی دینا بہت مشکل ہے۔ بلکہ مقدمے کی پیروی کرنا ہی بڑا مشکل ہے۔ بے چارے وکیلوں کی جانیں چلی جاتی ہیں۔ایسا دور آ گیا ہے کہ خدا پناہ! ظلم کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔﴿وَمَنْ يَّكْتُمْهَا﴾ اور جو گواہی کو چھپائے گا ﴿فَاِنَّهٗۤ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ﴾ تو بے شک اس کا دل گنہ گار ہوگا ﴿وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ﴾ اور جو تم عمل کرتے ہو اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے۔ معاملہ تمھارا اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہے اس واسطے اس کا خوف دل میں رکھو، آخرت اور قبر نہ بھولو، قبر کو یاد رکھو اور اپنے اعمال درست کرلو۔

﴿ لِلّٰهِ ﴾ اللہ تعالیٰ ہی کے واسطے ہے ﴿ مَا فِي السَّمٰوٰتِ ﴾ جو کچھ آسمانوں میں ہے ﴿ وَمَا فِي الْاَرْضِ ﴾ اور جو کچھ زمین میں ہے ﴿ وَاِنْ تُبْدُوْا ﴾ اور اگر تم ظاہر کرو گے ﴿ مَا ﴾ اس چیز کو ﴿ فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ ﴾ جو تمھارے دلوں میں ہے ﴿ اَوْ تُخْفُوْهُ ﴾ یا تم اس کو مخفی رکھو گے ﴿ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ ﴾ تو اللہ تعالیٰ اس کا حساب لے گا تم سے ﴿ فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ ﴾ پس بخش دے گا جس کو چاہے گا ﴿ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ﴾ اور سزا دے گا جس کو چاہے گا ﴿ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴾ اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے ﴿ اٰمَنَ الرَّسُوْلُ ﴾ ایمان لایا ہے رسول ﴿ بِمَآ ﴾ اُس چیز پر ﴿ اُنْزِلَ اِلَيْهِ ﴾ جو اُتاری گئی ہے اس کی طرف ﴿ مِنْ رَّبِّهٖ ﴾ اس کے رب کی طرف سے ﴿ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ﴾ اور مومن بھی ایمان لائے ہیں ﴿ كُلٌّ اٰمَنَ ﴾ یہ سب ایمان لائے ہیں ﴿ بِاللّٰهِ ﴾ اللہ تعالیٰ پر ﴿ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ ﴾ اور اس کے فرشتوں پر ﴿ وَكُتُبِهٖ ﴾ اور اس کی کتابوں پر ﴿ وَرُسُلِهٖ ﴾ اور اس کے رسولوں پر (یہ کہتے ہوئے) ﴿ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ ﴾ ہم نہیں تفریق کرتے اُس کے رسولوں میں سے کسی ایک کے درمیان ﴿ وَقَالُوْا ﴾ اور کہا اُنھوں نے ﴿ سَمِعْنَا ﴾ ہم نے سن لیا ﴿ وَاَطَعْنَا ﴾ اور ہم نے اطاعت کی ﴿ غُفْرَانَكَ ﴾ تیری بخشش چاہتے ہیں ﴿ رَبَّنَا ﴾ اے ہمارے رب ﴿ وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ﴾ اور تیری ہی طرف لوٹنا ہے ﴿ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ ﴾ نہیں تکلیف دیتا اللہ تعالیٰ ﴿ نَفْسًا ﴾ کسی نفس کو ﴿ اِلَّا وُسْعَهَا ﴾ مگر اس کی طاقت کے مطابق ﴿ لَهَا ﴾ اس نفس کے لیے ہے ﴿ مَا كَسَبَتْ ﴾ جو اُس نے کمایا ﴿ وَعَلَيْهَا ﴾ اور اس پر وبال پڑے گا ﴿ مَا اكْتَسَبَتْ ﴾ اس چیز کا جو اس نے کمائی ﴿ رَبَّنَا ﴾ اے ہمارے رب ﴿ لَا تُؤَاخِذْنَآ ﴾ مؤاخذہ نہ کر ہمارا ﴿ اِنْ نَّسِيْنَآ ﴾ اگر ہم بھول جائیں ﴿ اَوْ اَخْطَاْنَا ﴾ یا ہم سے خطا ہو جائے ﴿ رَبَّنَا ﴾ اے ہمارے رب ﴿ وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ ﴾ اور نہ ڈال ہم پر ﴿ اِصْرًا ﴾ بوجھ ﴿ كَمَا حَمَلْتَهٗ ﴾ جیسا ڈالا تم نے بوجھ ﴿ عَلَى الَّذِيْنَ ﴾ اُن لوگوں پر ﴿ مِنْ قَبْلِنَا ﴾ جو ہم سے پہلے تھے ﴿ رَبَّنَا ﴾ اے ہمارے رب ﴿ وَلَا تُحَمِّلْنَا ﴾ اور نہ اُٹھوا ہم سے ﴿ مَا ﴾ وہ چیز ﴿ لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ ﴾ جس کی ہم طاقت نہیں رکھتے ﴿ وَاعْفُ عَنَّا ﴾ پس تُو معاف کر دے ہم کو ﴿ وَاغْفِرْ لَنَا ﴾ اور بخش دے ہم کو ﴿ وَارْحَمْنَا ﴾ اور ہم پر رحم فرما ﴿ اَنْتَ مَوْلٰىنَا ﴾ تو ہی ہمارا آقا ہے ﴿ فَانْصُرْنَا ﴾ پس تو ہماری مدد فرما ﴿ عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴾ کافر قوم کے مقابلے میں۔

قرآن کریم کی تمام سورتوں میں سے سب سے بڑی سورۃ البقرہ ہے۔ جو ﴿ الٓمّٓ ﴾ سے شروع ہوتی ہے اور ﴿ فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴾ پر ختم ہوتی ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے بہت سارے احکام بیان فرمائے ہیں۔ توحید کا بیان ہے، شرک کا رد ہے، نبوت کا اثبات ہے، قیامت کا اثبات ہے، نکاح، طلاق کے مسائل ہیں۔ اور بہت سارے مسائل ہیں۔ ان مسائل کو سن

کرناواقف آدمی گھبراجاتا ہے کہ اتنی پابندیاں۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ﴿لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ﴾ اللہ تعالیٰ ہی کے واسطے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے۔ سب کا مالک پروردگار ہے۔ وہ اپنی مِلک میں جس طرح چاہے تصرف کرے جو حکم چاہے نافذ کرے اس کے سامنے کوئی قیل وقال نہیں کرسکتا ﴿وَاِنْ تُبْدُوْا﴾ اور اگر تم ظاہر کرو گے ﴿مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ﴾ ان چیزوں کو جو تمھارے دلوں میں ہے یعنی جو تمھارے دلوں میں اچھے یا بُرے خیالات آتے ہیں ﴿اَوْ تُخْفُوْهُ﴾ یا تم اس کو مخفی رکھو۔ فرمایا اچھی طرح یادرکھنا! ﴿يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ﴾ اللہ تعالیٰ اس کا حساب لے گا تم سے۔

وسوسے کی اقسام

اس مسئلے کو اچھی طرح سمجھ لیں۔ جو خیالات اور وساوس آتے ہیں وہ دو قسم کے ہیں۔ ایک تو وہ ہیں کہ ان کا خیال خود بہ خود آتا ہے بغیر قصد اور ارادے کے۔ یہ خیالات جیسے بھی ہوں ان پر کوئی گرفت نہیں ہے کیوں کہ وہ انسان کے اختیار میں نہیں۔ بخاری شریف کی روایت ہے: صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کہا حضرت! بعض دفعہ ہمارے دل میں ازخود ایسے خیالات آتے ہیں کہ ہم ان کو زبان پر لانے کے لیے آمادہ نہیں ہیں بلکہ ان کو زبان پر لانے کے بجائے اس کو آسان سمجھتے ہیں کہ ہم جل کر کوئلہ ہو جائیں۔ مثلاً: یہ خیال آجاتا ہے کہ ﴿مَنْ خَلَقَ اللّٰهَ﴾ اللہ تعالیٰ کو کس نے پیدا کیا ہے؟

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ((ذٰلِكَ صَرِيْحُ الْاِيْمَانِ)) یہ تو ایمان کی واضح علامت ہے۔ یعنی خیال کا آجانا تو تمھارے اختیار میں نہیں ہے لیکن اس سے تمھارا اتنا متنفر ہونا کہ زبان پر لانے کے بجائے جل کر کوئلہ ہونے کو آسان سمجھنا یہ صریح ایمان ہے۔ تو بُرے سے بُرا خیال بھی اگر ذہن میں ازخود آجائے تو اس پر گرفت نہ ہوگی۔ دوسرے وہ خیالات اور چیزیں ہیں کہ ان کو قصد اور ارادے سے دل ودماغ میں لایا جائے تو ان پر باقاعدہ گرفت ہوگی۔ اس آیت کریمہ میں ایسے ہی خیالات کا ذکر ہے۔

پھر فرمایا ﴿فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ﴾ پس جس کو چاہے گا رب بخشے گا۔ جو اچھے ارادے اور اچھی چیزیں دل میں لایا اسے بخشے گا ﴿وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ﴾ اور سزا دے گا جس کو چاہے گا۔ جو بُرے ارادے اور خیالات کا قصد لائے گا اس کو گرفت اور سزا ہوگی ﴿وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ﴾ اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔

معراج کے خاص تحفے

﴿اٰمَنَ الرَّسُوْلُ﴾ سے لے کر آخر تک اصولی طور پر دو آیتیں بنتی ہیں۔ ویسے تو سارا قرآن کریم حق ہے مگر ان دو آیتوں کی خصوصیت ہے کہ یہ دو آیتیں اللہ تعالیٰ نے معراج کی رات حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو جبرئیل علیہ السلام کے واسطے کے بغیر عطا فرمائیں۔ باقی سارا قرآن کریم جبرئیل علیہ السلام کے واسطے سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ملا۔ نسائی شریف کی روایت میں تصریح ہے کہ

اللہ تعالیٰ نے معراج کی رات مجھے تین تحفے عطا فرمائے۔

① پہلے نمازیں پچاس تھیں اور پھر پانچ رہ گئیں۔

② دوسرا تحفہ سورۃ البقرہ کی آخری آیتیں۔یعنی ﴿اٰمَنَ الرَّسُوْلُ﴾ سے لے کر آخر تک۔

③ تیسرا تحفہ: اللہ تبارک وتعالیٰ نے میرے ساتھ یہ وعدہ فرمایا ہے کہ تیری امت میں سے ہروہ شخص جو اس حال میں فوت ہوا کہ اس نے میرے ساتھ کسی شے کو شریک نہیں کیا میں اس کو بخش دوں گا۔تو یہ آیتیں اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو براہِ راست عطا فرمائیں۔

فرمایا ﴿اٰمَنَ الرَّسُوْلُ﴾ ایمان لایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ﴿بِمَآ﴾ اُس چیز پر ﴿اُنْزِلَ اِلَيْهِ﴾ جو اس کی طرف نازل کی گئی ہے ﴿مِنْ رَّبِّهٖ﴾ اس کے رب کی طرف سے۔ یہاں یہ مسئلہ بھی سمجھ لیں کہ جس طرح قرآن کریم مُنَزَّلٌ مِنَ اللهِ ہے۔اسی طرح احادیث میں جو احکام ہیں وہ بھی رب کی طرف سے نازل ہوئے ہیں۔فرق صرف اتنا ہے کہ قرآن کریم کے الفاظ بھی رب کی طرف سے اور معانی بھی رب کی طرف سے ہیں۔اور جو احادیث ہیں الفاظ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہیں اور مفہوم مِن جانبِ اللہ ہے۔تو یہ جو فرمایا کہ ﴿بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ﴾ جو کچھ نازل کیا گیا اس کی طرف۔اس میں قرآن بھی ہے اور حدیث بھی ہے۔کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوا ہے اس پر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم بھی ایمان لائے ہیں ﴿وَالْمُؤْمِنُوْنَ﴾ اور مومن بھی ایمان لائے ہیں۔اور مومن قیامت تک آتے رہیں گے۔

﴿كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ﴾ یہ سب اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے ہیں۔اس طرح کہ اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات اور اس کے سب احکام کو مانتے ہیں ﴿وَمَلٰٓئِكَتِهٖ﴾ اور اس کے فرشتوں پر ایمان لائے ہیں۔فرشتوں کے بارے میں آتا ہے خُلِقَتِ الْمَلٰئِكَةُ مِنْ نُّوْرٍ "فرشتوں کو نور سے پیدا کیا گیا ہے۔" اور یہ نور مخلوق ہے جس طرح پانی مخلوق ہے، آگ مخلوق ہے، مٹی مخلوق ہے، ہوا مخلوق ہے، اسی طرح یہ نور بھی مخلوق ہے جس سے فرشتوں کو پیدا کیا گیا۔فرشتے نر مادہ نہیں ہوتے اور نہ ہی ان میں جنسی خواہشات ہوتی ہیں، وہ نہ کھاتے ہیں نہ پیتے ہیں، ان کی خوراک ہے سبحان اللہ۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے ﴿يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ﴾ وہ اپنے رب کی تسبیح بیان کرتے ہیں۔اور فرشتوں کی تعداد کو اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔﴿وَمَا يَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ اِلَّا هُوَ﴾ [المدثر:۳۱]

﴿وَكُتُبِهٖ﴾ اور اللہ تعالیٰ کی کتابوں پر ایمان لائے ہیں۔اللہ تعالیٰ نے کتنی کتابیں اور صحیفے نازل فرمائے ہیں؟ ان کی صحیح تعداد کا کسی کو علم نہیں ہے۔مگر کافی کتابیں اور صحیفے نازل ہوئے ہیں۔چار کتابیں مشہور ہیں: قرآن کریم، تورات، زبور اور انجیل۔تو رب کی طرف سے جتنی کتابیں اور صحیفے نازل ہوئے وہ سب پر ایمان لاتے ہیں کہ یہ مِن جانب اللہ ہیں اور اپنے اپنے زمانے میں بہترین دستور تھیں۔اور قرآن کریم کے آنے کے بعد سب منسوخ ہوگئی ہیں۔اب نجات صرف قرآن کریم پر عمل کرنے میں ہے۔

﴿ وَرُسُلِهٖ ﴾ اور اللہ تعالیٰ کے سب رسولوں پر ایمان لائے ہیں۔ رسولوں کی صحیح تعداد کا ذکر نہ تو قرآن کریم میں ہے اور نہ ہی کسی صحیح حدیث میں ہے۔ ایک روایت میں ایک لاکھ چوبیس ہزار کا ذکر ہے اور ایک میں دو لاکھ چوبیس ہزار کا مگر دونوں روایتیں کمزور ہیں۔ پہلے پیغمبر آدم ہیں اور آخری پیغمبر جن پر اللہ تعالیٰ نے نبوت ختم فرما دی خاتم النبیین حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔ ہمارے ایمان کے لیے اتنا کافی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے جتنے پیغمبر تشریف لائے ہیں ہمارا سب پر ایمان ہے۔ ہم سب کو مانتے ہیں۔ قرآن کریم میں صرف چھ فرشتوں کے نام آئے ہیں اور پچیس پیغمبروں کے۔ مگر اللہ تعالیٰ کا فضل وکرم کہ اس نے ہمیں تمام کی گنتی کا پابند نہیں بنایا۔ جتنے بھی ہیں ہمارا سب پر ایمان ہے ﴿ لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ ﴾ ہم نہیں تفریق کرتے اللہ تعالیٰ کے رسولوں میں سے کسی ایک کے درمیان ﴿ یُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّ نَكْفُرُ بِبَعْضٍ ﴾ کہ بعض پیغمبروں پر ایمان لائیں اور بعض پر ایمان نہ لائیں۔ یہ یہود و نصاریٰ کا کام ہے۔

یہود نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پیغمبر ہونے کا انکار کیا بلکہ ان کو حلال زادہ ماننے کے لیے تیار نہ تھے۔ قرآن کریم میں ہے ﴿ وَّبِكُفْرِهِمْ وَقَوْلِهِمْ عَلٰى مَرْیَمَ بُهْتَانًا عَظِیْمًا ﴾ [النساء:۱۵۶] "اور اُن کے کفر کی وجہ سے اور مریم پر بہتان عظیم باندھنے کی وجہ سے کہ اُس نے جو بچہ جنا ہے وہ حلال زادہ نہیں، معاذ اللہ تعالیٰ۔" تو جب یہودیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا انکار کیا تو نصاریٰ نے ضد میں آکر موسیٰ علیہ السلام کا انکار کیا ﴿ وَّقَالَتِ النَّصٰرٰى لَیْسَتِ الْیَهُوْدُ عَلٰى شَیْءٍ ﴾ [البقرۃ:۱۱۳] "اور کہا نصاریٰ نے یہودی کسی شے پر نہیں ہیں۔" یعنی جھوٹے ہیں۔ تو اس طرح اُنھوں نے نبیوں میں تفریق ڈالی کہ بعض پر ایمان لائے اور بعض کا انکار کیا۔ اور ہم سب کو مانتے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے نبی ہیں۔ یہ مطلب ہے تفریق نہ کرنے کا۔ باقی رہی بات فضیلت کی تو اس کے بارے میں خود رب تعالیٰ نے اس پارے کے شروع میں فرمایا ہے:

﴿ تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ﴾ "یہ رسول ہیں ہم نے ان میں سے بعض کو بعض پر فضیلت بخشی ہے۔" تو فضیلت کے اعتبار سے تفریق ہے۔ تمام پیغمبروں میں حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا درجہ سب سے بلند ہے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کی ساری مخلوق میں سب سے بلند درجہ ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد حضرت ابراہیم کا درجہ بہت بلند ہے۔ ان کے بعد پھر حضرت موسیٰ کا مقام ہے۔ تو درجات میں تو تفریق ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس کو جو درجہ عطا فرمایا ہے وہ اسی کا ہے۔ باقی بعض کو ماننے اور بعض کو نہ ماننے میں تفریق نہیں ہے بلکہ ہم سب کو مانتے ہیں۔

﴿ وَقَالُوْا ﴾ اور اللہ تعالیٰ کے پیغمبر اور مومنوں نے کہا ﴿ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ﴾ ہم نے اللہ تعالیٰ کا حکم سنا اور ہم نے اطاعت کی یعنی اللہ تعالیٰ نے جو احکام نازل فرمائے ہیں وہ ہم تک پہنچ گئے ہیں ہم ان کی دل وجان سے فرماں برداری کرتے ہیں ﴿ غُفْرَانَكَ رَبَّنَا ﴾ اے پروردگار! ہم تیری بخشش چاہتے ہیں، ہم گناہ گار ہیں، خطاکار ہیں، انسان ہیں، ہم سے گناہ ہوتے رہتے ہیں اس لیے تیری بخشش کے طلب گار ہیں ﴿ وَاِلَیْكَ الْمَصِیْرُ ﴾ اور تیری ہی طرف لوٹنا ہے۔ یعنی ہم نے آنا بھی تیری طرف ہے۔

شرعی احکام میں سہولتیں

فرمایا: ﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا﴾ اللہ تعالیٰ تکلیف نہیں دیتا کسی نفس کو مگر اس کی طاقت کے مطابق۔ طاقت سے زیادہ رب تعالیٰ نے کسی کے ذمہ عبادت نہیں لگائی۔ مثال کے طور پر نماز میں قیام فرض ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص بیمار ہے کہ کھڑے ہو کر نہیں پڑھ سکتا تو بیٹھ کر پڑھے اور اگر بیٹھ کر بھی نہیں پڑھ سکتا تو اشارے کے ساتھ پڑھ لے۔ اگر وضو اور غسل کے لیے پانی نہیں ملتا تو تیمم کر کے پڑھ لے۔ اسی طرح زکوٰۃ، قربانی، فطرانہ اُس پر آئے گا جو صاحبِ نصاب ہوگا۔ اگر اس کے پاس نصاب کے برابر رقم نہیں ہے تو نہ اس پر زکوٰۃ ہے، نہ قربانی، نہ فطرانہ۔ الغرض اللہ تعالیٰ نے ایسا کوئی حکم نہیں دیا جو انسان کے بس میں نہ ہو۔ اور جو چیز انسان کے بس میں نہیں ہے اس کے نہ کرنے پر مؤاخذہ بھی نہیں ہوگا۔

اسی لیے فرمایا ﴿لَهَا مَا كَسَبَتْ﴾ اُس نفس کے لیے ہے جو اُس نے کمایا۔ یعنی جو نیکی بھلائی کرے گا اس کو اس کا پھل ملے گا ﴿وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ﴾ اور اسی پر وبال پڑے گا جو اُس نے کمایا یعنی جو بدی کرے گا اس کا وبال بھی اسی نفس پر پڑے گا ﴿رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا اِنْ نَّسِيْنَآ﴾ اے ہمارے رب! اگر ہم بھول جائیں تو ہمارا مؤاخذہ نہ کر ﴿اَوْ اَخْطَاْنَا﴾ یا ہم سے خطا ہو جائے۔ نسیان کی صورت یہ ہے مثلاً ایک آدمی کا روزہ ہے مگر اس کو یاد نہیں ہے کہ میں روزے سے ہوں اور کھا پی لے تو اس کے روزے پر کوئی زد نہیں آئے گی۔

رمضان شریف کا مہینہ تھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک شخص گھبرایا ہوا آیا اور کہنے لگے حضرت! میرے بارے میں کیا حکم ہے میں نے روزہ رکھا ہوا تھا بھول کر میں نے کھا پی لیا ہے۔ کیا اب میرا روزہ ہے یا نہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((اِنَّمَا اَطْعَمَكَ اللّٰهُ وَ سَقَاكَ)) پختہ بات ہے کہ تجھے رب تعالیٰ نے کھلایا پلایا۔

اور خطا کو اس طرح سمجھو کہ ایک آدمی روزہ دار ہے اور روزے کی حالت میں وضو یا غسل کرتا ہے اور غرارہ کرتا ہے اور اسے یہ بھی یاد ہے کہ میرا روزہ ہے، بغیر ارادے کے پانی حلق سے نیچے چلا جاتا ہے تو اس کو خطا کہتے ہیں۔ اس کے حکم کے بارے میں ائمہ کا اختلاف ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس کے روزے پر کوئی زد نہیں پڑے گی۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا فتویٰ یہ ہے کہ خطا کی صورت میں روزہ قضا کرنا پڑے گا کفارہ نہیں ہے کیوں کہ خطا کی صورت میں اگر بالکل معافی ہوتی تو قتلِ خطا میں کفارہ نہ ہوتا حالاں کہ قتل خطا کی صورت میں کفارہ ہے۔ چنانچہ پانچویں پارے میں رب تعالیٰ نے حکم بیان فرمایا ہے کہ اگر کوئی شخص کسی مسلمان کو خطاءً قتل کردے تو اس کو باقاعدہ کفارہ دینا پڑے گا البتہ آخرت کی سزا سے بچ جائے گا۔

اُمتِ مسلمہ کی چند خصوصیات

تو اے پروردگار! ﴿لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا﴾ ہمارا مؤاخذہ نہ کرنا اگر ہم بھول جائیں یا ہم سے خطا ہو جائے

﴿رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا﴾ اے ہمارے رب نہ ڈال ہم پر بوجھ ﴿كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا﴾ جس طرح تو نے ڈالا بوجھ اُن لوگوں پر جو ہم سے پہلے تھے۔ یہاں پر بوجھ سے مراد مشکل احکام ہیں جو پہلی اُمتوں پر وارد ہوئے۔ مثلاً: ہم پر چالیسواں حصہ زکوٰۃ ہے اور اُن پر چوتھا حصہ زکوٰۃ فرض تھی کہ اگر کسی کے پاس چار سو ہے تو ایک سو دینار دینا پڑتا۔ اگر چار ہزار ہے تو ایک ہزار دینا پڑتا۔ چار لاکھ ہے تو ایک لاکھ دینا پڑتا تھا اور ہمیں چار سو میں سے دس روپے اور چار ہزار میں سے ایک سو دینا پڑتا ہے اور چار لاکھ میں سے دس ہزار دینا پڑتے ہیں۔

اسی طرح ان پر نماز مسجد میں پڑھنا فرض تھی مسجد کے باہر ان کی نماز نہیں ہوتی تھی۔ چنانچہ وہ سفر اس انداز ے سے کرتے تھے کہ نماز کے وقت مسجد میں پہنچ جائیں۔ اور ہمارے واسطے اللہ تعالیٰ نے ساری زمین مسجد بنا دی ہے۔ جو بھی پاک جگہ ہو وہاں نماز پڑھنے کی اجازت ہے۔ جس جگہ نماز کا وقت ہو جائے وہیں پڑھ لو۔ اسی طرح ان کو تیمم کی اجازت نہ تھی۔ ہر حال میں وضو ہی کرنا ہوتا تھا۔ اور ہمیں رب تعالیٰ نے اجازت دی ہے کہ وضو کرنا ہے، غسل کرنا ہے اور پانی نہیں ہے یا پانی استعمال کرنے سے نقصان ہوتا ہے تو تیمم کر لو۔ اسی طرح اگر ان کے کپڑوں پر گندگی لگ جاتی کوئی بچہ پیشاب کر دیتا، خون لگ جاتا وغیرہ ذلک ، تو وہ کپڑا دھونے سے پاک نہیں ہوتا تھا بلکہ کاٹنے کا حکم تھا۔ مثلاً: کسی نے بچہ اُٹھایا ہوا ہے اُس نے پیشاب کر دیا، کسی کی نکسیر پھوٹ پڑی یا پھوڑا ہے، اُس سے خون یا پیپ نکل آئی یا کہیں سے خون لگ گیا تو وہ کپڑا دھونے سے پاک نہیں ہوتا تھا اس کو قینچی سے کاٹنا پڑتا تھا۔ تو اس میں ان کو کتنی تکلیف تھی۔ خصوصاً سردیوں میں لوگ گرم کپڑے پہنتے ہیں اور وہ قیمتی ہوتے ہیں تو کتنا نقصان ہے۔ ہمیں رب تعالیٰ نے اجازت دی ہے کہ جہاں گندگی لگے چاہے وہ جیسی بھی ہو دھو لو کپڑا پاک ہو گیا چاہے گندگی کی رنگت نہ بھی جائے۔

اسی طرح وہ لوگ جب گناہ کرتے تھے تو فرشتے رات کو ان کے دروازوں پر لکھ جاتے تھے کہ اس نے یہ گناہ کیا ہے۔ اسی طرح اگر کوئی مرتد ہو جاتا تو اس کی توبہ بغیر قتل کے قبول نہیں ہوتی تھی یعنی اس کو قتل کرنا ہوتا تھا۔ اور ہماری شریعت میں مسئلہ یہ ہے کہ اگر کوئی مرتد ہو گیا ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس کو دوبارہ کلمہ پڑھنے کی توفیق عطا فرمائی ہے تو اس کا یہ کلمہ پڑھنا معتبر ہے۔ اور اسی طرح اس کی توبہ قبول ہے۔ غنیمت کا مال ان کے لیے حلال نہیں تھا بلکہ وہ اکٹھا کر کے میدان میں رکھ دیتے تھے آگ آتی تھی جلا دیتی تھی۔ قربانی کا گوشت بھی ان کے لیے حلال نہ تھا بلکہ قربانی کر کے رکھ دیتے تھے آگ آتی تھی اور جلا دیتی تھی ﴿بِقُرْبَانٍ تَاْكُلُهُ النَّارُ﴾ اور ہمارے لیے بڑی سہولتیں ہیں حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وسیلے اور برکت سے کہ ہمارے لیے مالِ غنیمت بھی حلال ہے اور قربانی کا گوشت بھی حلال ہے اور باقی بہت ساری سہولتیں رب تعالیٰ نے ہمیں عطا فرمائی ہیں۔

فرمایا ﴿رَبَّنَا﴾ اے ہمارے رب ﴿وَلَا تُحَمِّلْنَا﴾ اور نہ اُٹھوا ہم سے ﴿مَا﴾ وہ احکام ﴿لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ﴾ جن کی ہم میں طاقت نہیں ہے۔ یعنی اے پروردگار! ہمیں ایسے احکام نہ دے کہ جن کو ادا کرنے کی ہم میں طاقت نہیں ہے ﴿وَاعْفُ عَنَّا﴾

اور پروردگار! ہمارے کبیرہ گناہ معاف فرما ﴿وَاغْفِرْ لَنَا﴾ اور پروردگار! ہمارے صغیرہ گناہ بھی معاف فرما ﴿وَارْحَمْنَا﴾ اور پروردگار! اپنی رحمت ہم پر نازل فرما ﴿اَنْتَ مَوْلٰىنَا﴾ پروردگار! تو ہمارا آقا ہے ہم اپنے عاجز ہونے کا اقرار کرتے ہیں تیرے سوا ہمارا کوئی نہیں ہے ﴿فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ﴾ پروردگار! بس تو ہماری مدد فرما کافر قوم کے مقابلے میں۔ کیوں کہ تو قادر ہے اور ہم عاجز ہیں۔ یہ آیتیں اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو براہِ راست بغیر جبرئیل علیہ السلام کے واسطے کے عطا فرمائی ہیں۔

آج بہ تاریخ ۴ر جمادی الاولیٰ ۱۴۳۲ھ بمطابق ۱۵ر جولائی ۲۰۰۲ء سورۃ البقرہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم اور حضرت شیخ دامت برکاتہ العالیہ کی دعاؤں سے مکمل ہوئی۔

والحمد للہ علیٰ ذالک

(مولانا) محمد نواز بلوچ

مہتمم: مدرسہ ریحان المدارس، جناح روڈ، گوجرانوالہ

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

روزانہ درسِ قرآن پاک

تفسیر

سُوۡرَۃُ اٰلِ عِمۡرٰنَ مَدَنِیَّۃٌ

پارہ ⇐ تِلۡكَ الرُّسُلُ ، لَنۡ تَنَالُوا
(۳) (۴)

فہرست عنوات

ذخیرۃ الجنان فی فہم القرآن

(حصہ سوم)

اہلِ علم سے گزارش

بندۂ ناچیز امام المحدثین مجدد وقت شیخ الاسلام حضرت العلام مولانا محمد سرفراز خان صفدر رحمہ اللہ تعالیٰ کا شاگرد بھی ہے اور مرید بھی۔

اور محترم لقمان اللہ میر صاحب حضرت اقدس کے مخلص مرید اور خاص خدام میں سے ہیں۔

ہم وقتاً فوقتاً حضرت اقدس کی ملاقات کے لیے جایا کرتے۔خصوصاً جب حضرت شیخ اقدس کو زیادہ تکلیف ہوتی تو علاج معالجہ کے سلسلے کے لیے اکثر جانا ہوتا۔جانے سے پہلے ٹیلیفون پر رابطہ کر کے اکٹھے ہو جاتے۔ایک دفعہ جاتے ہوئے میر صاحب نے کہا کہ حضرت نے ویسے تو کافی کتابیں لکھی ہیں اور ہر باطل کا رد کیا ہے مگر قرآن پاک کی تفسیر نہیں لکھی تو کیا حضرت اقدس جو صبح بعد نمازِ فجر درس قرآن ارشاد فرماتے ہیں وہ کسی نے محفوظ نہیں کیا کہ اسے کیسٹ سے کتابی شکل سے منظر عام پر لایا جائے تاکہ عوام الناس اس سے مستفید ہوں۔اور اس سلسلے میں جتنے بھی اخراجات ہوں گے وہ میں برداشت کرونگا اور میرا مقصد صرف رضائے الٰہی ہے، شاید یہ میرے اور میرے خاندان کی نجات کا سبب بن جائے۔یہ فضیلت اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے مقدر فرمائی تھی۔

اس سے تقریباً ایک سال قبل میر صاحب کی اہلیہ کو خواب آیا تھا کہ ہم حضرت شیخ اقدس کے گھر گئے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ حضرت کیلوں کے چھلکے لے کر باہر آرہے ہیں۔میں نے عرض کیا حضرت مجھے دے دیں میں باہر پھینک دیتی ہوں۔حضرت نے وہ مجھے دے دیے اور میں نے باہر پھینک دیے۔

چوں کہ حضرت خواب کی تعبیر کے بھی امام ہیں۔میں نے مذکورہ بالا خواب حضرت سے بیان کیا اور تعبیر پوچھنے پر حضرت نے فرمایا کہ میرا یہ جو علمی فیض ہے اس سے تم بھی فائدہ حاصل کرو گے۔چنانچہ وہ خواب کی تعبیر تفسیر قرآن "ذخیرۃ الجنان" کی شکل میں سامنے آئی۔

میر صاحب کے سوال کے جواب میں مَیں نے کہا اس سلسلے میں مجھے کچھ معلوم نہیں حضرت اقدس سے پوچھ لیتے ہیں۔چنانچہ جب گکھڑ حضرت کے پاس پہنچ کر بات ہوئی تو حضرت نے فرمایا کہ درس دو تین مرتبہ ریکارڈ ہو چکا ہے اور محمد سرور منہاس کے پاس موجود ہے ان سے رابطہ کر لیں۔اور یہ بھی فرمایا کہ گکھڑ والوں کے اصرار پر میں یہ درسِ قرآن پنجابی زبان میں دیتا رہا ہوں اس کو اُردو زبان میں منتقل کرنا انتہائی مشکل اور اہم مسئلہ ہے۔

اس سے دو دن پہلے میرے پاس میرا ایک شاگرد آیا تھا اس نے مجھے کہا کہ میں ملازمت کرتا ہوں تنخواہ سے اخراجات

پورے نہیں ہو پاتے، دورانِ گفتگو اس نے یہ بھی کہا کہ میں نے ایم۔اے پنجابی بھی کیا ہے۔اس کی یہ بات مجھے اس وقت یاد آ گئی۔میں نے حضرت سے عرض کی کہ میرا ایک شاگرد ہے اس نے پنجابی میں ایم۔اے کیا ہے اور کام کی تلاش میں ہے، میں اس سے بات کرتا ہوں۔

حضرت نے فرمایا اگر ایسا ہو جائے تو بہت اچھا ہے۔ہم حضرت کے پاس سے اٹھ کر محمد سرور منہاس صاحب کے پاس گئے اور ان کے سامنے اپنی خواہش رکھی انھوں نے کیسٹیں دینے پر آمادگی ظاہر کر دی۔کچھ کیسٹیں ریکارڈ کرانے کے بعد اپنے شاگرد ایم۔اے پنجابی کو بلایا اور اس کے سامنے یہ کام رکھا اُس نے کہا کہ میں یہ کام کر دوں گا، میں نے اسے تجرباتی طور پر ایک عدد کیسٹ دی کہ یہ لکھ کر لاؤ پھر بات کریں گے۔دینی علوم سے ناواقفی اس کے لیے سدّ راہ بن گئی۔وہ قرآنی آیات، احادیث مبارکہ اور عربی عبارت سمجھنے سے قاصر تھا۔تو میں نے فیصلہ کیا کہ یہ کام خود ہی کرنے کا ہے میں نے خود ایک کیسٹ سنی اور اُردو میں منتقل کر کے حضرت اقدس کی خدمت میں پیش کی۔حضرت نے اس میں مختلف مقامات میں سے پڑھ کر اظہارِ اطمینان فرمایا۔اس اجازت پر پوری تن دہی سے متوکل علی اللہ ہو کر کام شروع کر دیا۔

میں بنیادی طور پر دنیاوی تعلیم کے لحاظ سے صرف پرائمری پاس ہوں، باقی سارا فیض علمائے ربانیین سے دورانِ تعلیم حاصل ہوا۔اور میں اصل رہائشی بھی جھنگ کا ہوں وہاں کی پنجابی اور لاہور، گوجرانوالا کی پنجابی میں زمین آسمان کا فرق ہے۔لہٰذا جہاں دشواری ہوتی وہاں حضرت مولانا سعید احمد صاحب جلالپوری شہید رحمۃ اللہ علیہ سے رجوع کرتا یا زیادہ ہی الجھن پیدا ہو جاتی تو براہ راست حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ سے رابطہ کر کے تشفی کر لیتا لیکن حضرت کی وفات اور مولانا جلالپوری رحمۃ اللہ علیہ کی شہادت کے بعد اب کوئی ایسا آدمی نظر نہیں آتا جس کی طرف رجوع کروں۔اب اگر کہیں محاورہ یا مشکل الفاظ پیش آئیں تو پروفیسر ڈاکٹر اعجاز سندھو صاحب سے رابطہ کر کے تسلی کر لیتا ہوں۔

اہل علم حضرات سے التماس ہے کہ اس بات کو بھی مدنظر رکھیں کہ یہ چونکہ عمومی درس ہوتا تھا اور یادداشت کی بنیاد پر مختلف روایات کا ذکر کیا جاتا تھا اس لیے ضروری نہیں ہے کہ جو روایت جس کتاب کے حوالہ سے بیان کی گئی ہے وہ پوری روایت اسی کتاب میں موجود ہو۔بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ روایت کا ایک حصہ ایک کتاب میں ہوتا ہے جس کا حوالہ دیا گیا ہے مگر باقی تفصیلات دوسری کتاب کی روایت بلکہ مختلف روایات میں ہوتی ہیں۔جیسا کہ حدیث نبویؐ کے اساتذہ اور طلبہ اس بات کو اچھی طرح سمجھتے ہیں اس لیے ان دروس میں بیان کی جانے والی روایات کا حوالہ تلاش کرتے وقت اس بات کو ملحوظ رکھا جائے۔

علاوہ ازیں کیسٹ سے تحریر کرنے سے لے کر مسودہ کے زیورِ طباعت سے آراستہ ہونے تک کے تمام مراحل میں اس مسودہ کو انتہائی ذمہ داری کے ساتھ میں بذاتِ خود اور دیگر تعاون کرنے والے احباب مطالعہ اور پروف ریڈنگ کے دوران غلطیوں کی نشاندہی کرتے ہیں اور حتی المقدور اغلاط کو دور کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔کمپوزنگ اور اغلاط کی نشاندہی کے بعد میں

ایک مرتبہ دوبارہ مسودہ کو چیک کرتا ہوں تب جا کر انتہائی عرق ریزی کے بعد مسودہ اشاعت کے لیے بھیجا جاتا ہے۔ لیکن بایں ہمہ ہم سارے انسان ہیں اور انسان نسیان اور خطا سے مرکب ہے غلطیاں ممکن ہیں۔ لہٰذا اہل علم سے گزارش ہے کہ تمام خامیوں اور کمزوریوں کی نسبت صرف میری طرف ہی کی جائے اور ان غلطیوں سے مطلع اور آگاہ کیا جائے تا کہ آئندہ ایڈیشن میں اصلاح ہو سکے۔

العارض

محمد نواز بلوچ

فارغ التحصیل مدرسہ نصرۃ العلوم و فاضل وفاق المدارس العربیہ، ملتان

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اللّٰھمّ صلّ علیٰ محمّدٍ

وّعلیٰ اٰلِ محمّدٍ کما صلّیت

علیٰ ابراھیم وعلیٰ اٰلِ ابراھیم

انّک حمیدٌ مّجیدٌ ۝

اللّٰھمّ بارک علیٰ محمّدٍ وّعلیٰ

اٰلِ محمّدٍ کما بارکت علیٰ

ابراھیم وعلیٰ اٰلِ ابراھیم

انّک حمیدٌ مّجیدٌ ۝

آیاتھا ۲۰۰ ③ سُوْرَۃُ اٰلِ عِمْرٰنَ مَدَنِیَّۃٌ ۸۹ رکوعاتھا ۲۰

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

﴿الٓمّٓ ۝ اَللّٰهُ﴾ اللہ تعالیٰ ہی ہے ﴿لَآ اِلٰهَ﴾ نہیں ہے کوئی معبود ﴿اِلَّا هُوَ﴾ مگر وہی ﴿الْحَیُّ﴾ زندہ ہے ﴿الْقَیُّوْمُ﴾ قائم رہنے والا ہے ﴿نَزَّلَ عَلَیْكَ الْكِتٰبَ﴾ اس نے نازل کی تم پر کتاب ﴿بِالْحَقِّ﴾ حق کے ساتھ ﴿مُصَدِّقًا﴾ یہ کتاب تصدیق کرنے والی ہے ﴿لِّمَا﴾ ان کتابوں کی ﴿بَیْنَ یَدَیْهِ﴾ جو اس سے پہلے نازل ہوئیں ﴿وَاَنْزَلَ التَّوْرٰىةَ﴾ اور نازل کی اللہ تعالیٰ نے تورات ﴿وَالْاِنْجِیْلَ﴾ اور انجیل ﴿مِنْ قَبْلُ﴾ اس قرآن کریم سے پہلے ﴿هُدًى﴾ جو ہدایت تھیں ﴿لِّلنَّاسِ﴾ اُس وقت کے لوگوں کے لیے ﴿وَاَنْزَلَ الْفُرْقَانَ﴾ اور اُس نے نازل کیا قرآن کریم ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا﴾ بے شک وہ لوگ جنھوں نے انکار کیا ﴿بِاٰیٰتِ اللّٰهِ﴾ اللہ تعالیٰ نے آیات کا ﴿لَهُمْ عَذَابٌ شَدِیْدٌ﴾ ان کے واسطے عذاب ہے سخت ﴿وَاللّٰهُ﴾ اور اللہ تعالیٰ ﴿عَزِیْزٌ﴾ غالب ہے ﴿ذُو انْتِقَامٍ﴾ بدلا لینے والا ہے ﴿اِنَّ اللّٰهَ﴾ بے شک اللہ تعالیٰ لَا یَخْفٰى عَلَیْهِ شَیْءٌ﴾ نہیں مخفی اُس پر کوئی شے ﴿فِی الْاَرْضِ﴾ زمین میں ﴿وَلَا فِی السَّمَآءِ﴾ اور نہ آسمان میں ﴿هُوَ الَّذِیْ﴾ وہ، وہ ذات ہے ﴿یُصَوِّرُكُمْ﴾ جو تمھاری تصویر بناتا ہے ﴿فِی الْاَرْحَامِ﴾ ماں کے رحموں میں ﴿كَیْفَ یَشَآءُ﴾ جیسے چاہے ﴿لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ﴾ نہیں ہے کوئی معبود مگر وہی ﴿الْعَزِیْزُ﴾ غالب ہے ﴿الْحَكِیْمُ﴾ حکمت والا ہے۔

آلِ عمران کی وجہ تسمیہ

اس سورت کا نام سورۃ آلِ عمران اس واسطے ہے کہ اس سورت میں عمران کے خاندان کا ذکر ہے۔ بنی اسرائیل کے خاندان میں ایک بزرگ، نیک پارسا عمران ابن ماثان رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ یہ اپنے وقت میں مسجد اقصیٰ کے امام اور خطیب تھے۔ ان کو اللہ تعالیٰ نے ایک لڑکا عطا فرمایا جس کا نام ہارون تھا۔ وہ بھی بڑا نیک اور پارسا تھا مگر جوانی میں ہی فوت ہو گیا۔ حضرت عمران کی بیوی کا نام حَنَّه بِنْتِ فَاقُوْذَہ رحمہا اللہ تعالیٰ تھا۔ جوان بیٹا فوت ہو گیا اور حضرت عمران بھی بڑھاپے کو پہنچ گئے تو حضرتِ حَنَّه پریشان ہو گئیں کہ آئندہ ہم سے مسجد اقصیٰ کی دینی خدمت نہیں ہو سکے گی۔ تو انھوں نے منت مانی کہ اے پروردگار! اگر تو مجھے بیٹا عطا کرے گا تو میں وعدہ کرتی ہوں کہ میں اس کو تیرے دین اور مسجد اقصیٰ کی خدمت کے لیے وقف کر دوں گی (اس واقعہ کی مزید تفصیل آئے گی)۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت کہ لڑکے کی بجائے لڑکی پیدا ہوئی جس کا نام مریم رکھا گیا جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ ماجدہ ہیں۔

تو آلِ عمران کا مطلب ہے عمران بن ماثان کی اولاد۔ حضرت مریم علیہا السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی آگے نسل نہیں چلی۔ کیوں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو تینتیس [۳۳] سال کی عمر میں آسمانوں پر اٹھالیا گیا تھا۔ البتہ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام نازل ہوں گے تو ان کا نکاح ازدشنوء قبیلے میں ہوگا۔ جیسا کہ علم کلام کی کتاب شرح عقیدۃ السفارینی میں مذکور ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو دولڑکے عطا فرمائیں گے۔ ایک کا نام موسیٰ رکھیں گے اور دوسرے کا نام محمد۔ اس کے بعد کا معلوم نہیں کیا ہوگا؟

یہ سورۃ مدینہ طیبہ میں نازل ہوئی اور اس سے پہلے اٹھاسی [۸۸] سورتیں نازل ہو چکی تھیں۔ اس سورت کے بیس [۲۰] رکوع اور دوسو [۲۰۰] آیات ہیں۔ یہ سورت بھی قرآن کریم کی طویل سورتوں میں سے ہے۔

حروفِ مقطعات کی بحث

الٓمّٓ، یہ حروفِ مقطعات ہیں (ان کی بحث پہلے پارے میں گزر چکی ہے۔ جو حضرات اس درس میں شریک نہیں ہوئے ان کی خاطر عرض ہے) مقطعات کا مطلب یہ ہے کہ کسی لفظ سے اختصار کے طور پر اک حرف الگ کیا جائے۔ جیسے: کسی کا نام ہو محمد شفیع۔ تو لفظ محمد سے "م" الگ کرلو اور شفیع سے "ش" الگ کردو تو یہ بن گیا م۔ش۔ ایک مشہور صحافی تھا، عرصہ دراز تک نوائے وقت میں م۔ش کی ڈائری کے عنوان سے لکھتا رہا ہے۔ اس کا نام تھا محمد شفیع مرحوم، وفات پا گئے ہیں۔ اس طرح سے تخفیف کرنا ہر زبان میں عام ہے۔ جیسے ڈی۔سی، ڈپٹی کمشنر کا مخفف ہے، اے۔سی، اسسٹنٹ کمشنر کا مخفف ہے وغیرہ ذلك۔

تو یہ حروفِ مقطعات ہیں۔ ان کے متعلق مفسرین کرام کے مختلف اقوال ہیں۔ ایک تفسیر یہ ہے کہ الف سے مراد اللہ جل جلالہٗ، لام سے مراد جبرئیل علیہ السلام اور میم سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم مراد ہیں۔ تو مفہوم یہ بنے گا کہ یہ قرآن اللہ تعالیٰ کی طرف سے جبرئیل علیہ السلام کی وساطت سے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا۔

اور بعض یہ تفسیر فرماتے ہیں کہ الف سے مراد ﴿اٰلَاۗءَ اللّٰهِ﴾ ہیں، اللہ تعالیٰ کی نعمتیں، ﴿فَبِاَیِّ اٰلَاۗءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ﴾ تو الف آلاء سے مخفف ہے اور لام لطف اللہ سے مخفف ہے اور میم ملک اللہ سے۔ تو معنیٰ یہ بنے گا کہ نعمتیں بھی رب تعالیٰ کی، لطف وکرم بھی رب تعالیٰ کا اور ملک بھی رب تعالیٰ کا۔ اور یہ حروفِ مقطعات انتیس (۲۹) سورتوں کے شروع میں آتے ہیں۔ جیسے: ﴿الٓمّٓ، الٓرٰ، طٰهٰ، یٰسٓ، حٰمٓ﴾ وغیرہ۔

اللہ جی! کہنا جائز نہیں

﴿اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ﴾ اللہ تعالیٰ ہی ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ الٰہ کے متعدد معنیٰ ہیں۔ مثلاً: حاجت روا، مشکل کشا، فریادرس، دست گیر، حاکم، مُقنِّن، قانون ساز۔ تو معنیٰ بنے گا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا حاجت روا، مشکل کشا، فریادرس، دست گیر، حاکم، قانون ساز، کوئی نہیں ہے۔

﴿اَلْحَیُّ﴾ ہمیشہ زندہ رہنے والا۔ جس کی نہ ابتدا ہے اور نہ انتہاء ﴿وَّیَبْقٰی وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ﴾

[الرحمٰن:۲۷] ”اور باقی رہے گی تیرے پروردگار کی ذات جو بزرگی اور عظمت والا ہے۔“ تو ہمیشہ رہنے والی ذات صرف پروردگار ہی کی ہے باقی سب پر موت آئے گی۔ یہاں تک کہ جان نکالنے والے فرشتے بھی مرجائیں گے۔ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی شے نہیں رہے گی۔

﴿الْقَيُّوْمُ﴾ ہمیشہ قائم رہنے والا، جس پر کسی وقت بھی زوال نہ آسکے گا۔ کی روایت میں آتا ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے خود دعا شروع کی اَلسَّلَامُ عَلَى اللهِ تَعَالٰی کہ اللہ تعالیٰ پر سلامتی ہو، اَلسَّلَامُ عَلٰی جِبْرَئِيْلَ، اَلسَّلَامُ عَلٰی مِيْكَائِيْلَ۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم اَلسَّلَامُ عَلَى اللهِ تَعَالٰی نہ کہو۔ کیوں کہ یہ لفظ وہاں بولا جاتا ہے جہاں خطرہ ہو۔ اللہ تعالیٰ کو تو کوئی خطرہ نہیں ہے کہ تم اس کے لیے سلامتی کی دعا کرتے رہو۔

مثلاً: ہم ایک دوسرے کو السلام علیکم کہتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تجھے چوروں اور ڈاکوؤں سے سلامتی میں رکھے، مصائب اور آلام سے سلامتی میں رکھے۔ تو رب تعالیٰ کو تو ان چیزوں کا خطرہ نہیں ہے کہ تم اس کے لیے یہ دعا اَلسَّلَامُ عَلَى اللهِ (اے اللہ! تو سلامتی میں رہے) کرو۔ اسی لیے کہ وہ تو خود سلام ہے۔ اسی بات کے پیش نظر علمائے کرام کہتے ہیں کہ اللہ جی! کہنا جائز نہیں ہے۔ کیوں کہ جی کا لفظ کلمہ دعائیہ ہے۔ اس کا معنیٰ ہے تو زندہ رہ۔ یہ وہاں بولا جاتا ہے جہاں موت کا خدشہ ہو۔ جیسے: ابا جی! اماں جی! اُستاد جی! مولوی جی! قاری جی! منشی جی! وغیرہ۔ کیوں کہ ان سب نے مرنا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ کو تو کوئی موت کا خطرہ نہیں ہے۔ وہ حَيٌّ قَيُّوْمٌ ہے۔ لیکن بعض لوگ بے چارے دین سے واقف نہیں ہوتے اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ عقیدت ہوتی ہے تو اللہ جی! کہہ دیتے ہیں۔ یہ جائز نہیں ہے۔ البتہ اللہ مالک کہیں، اللہ سائیں کہیں۔ اسی مناسبت سے ایک اور مسئلہ بھی سمجھ لیں کہ آج کل لوگ عموماً کیا مرد اور کیا عورتیں، نام ادھورے لیتے ہیں۔ مثلاً: عبدالوحید کو وحید کہتے ہیں، عبدالجبار کو جبار کہتے ہیں، عبدالرحمٰن کو رحمٰن بلکہ مان کہتے ہیں کہ وحید آیا ہے، جبار آیا ہے۔ یہ سخت گناہ ہے۔ کیوں کہ وہ تو عبدالجبار ہے، جبار کا بندہ ہے جبار تو نہیں ہے۔ عبدالرحمٰن، رحمٰن کا بندہ ہے رحمن تو نہیں ہے۔ عبدالوحید، وحید تو نہیں ہے۔

کل کی بات ہے کہ ایک عورت میرے پاس دم کرانے کے لیے آئی۔ کہنے لگی میں وحید کی بیوی ہوں۔ میں نے کہا لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ، وحید تو اللہ تعالیٰ کا نام ہے۔ تو کیا تم اللہ تعالیٰ کی بیوی ہو؟ وہ ہنس پڑی۔ پھر میں نے سمجھایا کہ تم یوں کہو کہ میں عبدالوحید کی بیوی ہوں۔ تو اس طرح ادھورے نام لینا سخت گناہ ہے۔ اور اس طرح کی تخفیف جائز نہیں ہے کہ تم عبدالرحمٰن کو رحمٰن بنادو اور عبدالجبار کو جبار کہو۔

پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم کتنے فرشتوں کا نام لے کر سلام کہو گے؟ مثلاً: اَلسَّلَامُ عَلٰی جِبْرَئِيْلَ، اَلسَّلَامُ عَلٰی مِيْكَائِيْلَ، اَلسَّلَامُ عَلٰی اِسْرَافِيْلَ عَلَيْهِمُ السَّلَامُ۔ یا کتنے نبیوں کا نام لے کر سلام کہو گے؟ مثلاً: اَلسَّلَامُ عَلٰی مُحَمَّدٍ ﷺ، اَلسَّلَامُ عَلٰی اِبْرَاهِيْمَ عَلَيْهِ السَّلَامُ، اَلسَّلَامُ عَلٰی مُوْسٰی عَلَيْهِ السَّلَامُ، اَلسَّلَامُ عَلٰی عِيْسٰی عَلَيْهِ السَّلَامُ، اَلسَّلَامُ عَلٰی نُوْحٍ عَلَيْهِ السَّلَامُ، اَلسَّلَامُ عَلٰی شِيْثَ عَلَيْهِ السَّلَامُ۔

اسی طرح کتنے صحابہ کا نام لے کر سلام کہو گے؟ کہ اَلسَّلَامُ عَلٰی اَبِیْ بَکْرٍ، اَلسَّلَامُ عَلٰی عُمَرَ، اَلسَّلَامُ عَلٰی عُثْمَانَ، اَلسَّلَامُ عَلٰی عَلِیٍّ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُمْ؟ تو تم یوں کہو اَلسَّلَامُ عَلَیْنَا وَعَلٰی عِبَادِ اللّٰہِ الصَّالِحِیْنَ۔ تو اس میں سب آ گئے۔ یعنی یہ جملہ کہنے سے تمھارا سلام تمام فرشتوں کو، تمام پیغمبروں کو، تمام مومنوں کو، چاہے وہ انسان ہوں یا جنات، چاہے آسمانوں پر رہوں یا زمین پر، سب کو خود بخود پہنچ جاتا ہے۔

تو اللہ تعالیٰ حَیٌّ ہے، ہمیشہ زندہ رہنے والا۔ اور قَیُّوْمٌ ہے، قائم رہنے والا۔ اور قیوم کا دوسرا معنیٰ قائم رکھنے والا بھی کیا ہے کہ زمینوں، آسمانوں بلکہ ساری کائنات کو قائم رکھنے والی ذات اللہ تعالیٰ ہی کی ہے۔ چنانچہ بخاری شریف کی روایت میں ہے اَنْتَ قَیِّمُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ "اے پروردگار! تو آسمانوں اور زمینوں کو قائم رکھنے والا ہے۔" دیکھو! آسمان کتنا وسیع ہے لیکن اس کے نیچے کوئی ستون، کوئی دیوار نہیں ہے۔ ہزار ہا سال سے اسی طرح چلا آ رہا ہے اور جب تک رب کو منظور ہو گا اسی طرح رہے گا۔ اور زمین اپنے مرکز پر ٹھہری ہوئی ہے۔ تو زمینوں اور آسمانوں کو قائم رکھنے والا صرف اللہ تعالیٰ ہے۔

مصدّق کا مطلب

﴿نَزَّلَ عَلَیْکَ الْکِتٰبَ اللّٰہ تعالیٰ﴾ نے نازل فرمائی تم پر کتاب ﴿بِالْحَقِّ﴾ حق کے ساتھ۔ یعنی قرآن کریم اور اس کتاب کی خوبی یہ ہے ﴿مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْہِ﴾ یہ کتاب تصدیق کرنے والی ہے ان کتابوں کی جو اس سے پہلے نازل ہوئیں۔ یعنی اس سے پہلے جو آسمانی کتابیں نازل ہوئی ہیں۔ جیسے: تورات ہے، زبور ہے، انجیل ہے۔ ان کی تصدیق کرتی ہے کہ وہ بھی اللہ تعالیٰ کی کتابیں ہیں۔ ان میں جو اصولی مسائل بیان ہوئے ہیں مثلاً: توحید، رسالت، قیامت وغیرہ ان کی بھی مصدّق ہے۔ ر یاد رکھنا! یہ مصدق ان کتابوں کی ہے جو اصل ہیں۔ تحریف شدہ کتابوں کے مضامین کی تصدیق نہیں کرتی۔ اور اس وقت سمانی کتابوں میں قرآن شریف کے سوا کوئی کتاب بھی اپنی اصل شکل میں موجود نہیں ہے۔ نہ تورات، نہ زبور، نہ انجیل، نہ ملاکی، نہ احبار، نہ سلاطین، نہ پیدائش وغیرہ۔ غرضیکہ پہلی تمام کتابوں میں تحریف ہوئی ہے اور اس بات کا خود پادریوں کو بھی اقرار ہے کہ گڑبڑ ہوئی ہے۔ یہ شرف صرف اللہ تعالیٰ کی کتاب قرآن کریم کو حاصل ہے کہ ایک زبر اور زیر کا بھی فرق نہیں پڑا اور نہ پڑے گا، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

﴿وَاَنْزَلَ التَّوْرٰىۃَ﴾ اور اللہ تعالیٰ نے تورات نازل فرمائی۔ قرآن کریم کے بعد تمام آسمانی کتابوں میں تورات کا مقام بہت بلند ہے۔ بڑی جامع مانع کتاب ہے۔ صدیوں تک اللہ تعالیٰ کے پیغمبر، علماء، مشائخ اور نیک لوگ اس پر عمل کرتے رہے ہیں۔

﴿وَالْاِنْجِیْلَ﴾ انجیل بھی اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی۔ اس وقت اصل انجیل کا ملنا مشکل ہے۔

اناجیل کے متعلق وضاحت

ہمارے ہاں اس وقت چار انجیلیں موجود ہیں۔متی، یوحنا، مرقس اور لوقا کی انجیل اور ایک برناباس کی انجیل ہے۔وہ بھی میرے پاس موجود ہے۔ برناباس (حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے صحابی ہیں۔اور متی، یوحنا، مرقس اور لوقا، یہ چاروں تابعی ہیں۔اور پادری صاحبان کہتے ہیں کہ برناباس کی انجیل صحیح نہیں ہے۔اور متی، یوحنا، مرقس اور لوقا کی انجیلیں صحیح ہیں۔بھئی! برناباس جو براہِ راست حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا صحابی ہے اس کی مرتب کردہ کتاب کیوں معتبر نہیں ہے؟ اور جو تابعین کی مرتب کردہ ہیں کس طرح معتبر ہو گئیں؟ تو انجیل برناباس کے انکار کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اس میں دو تین مقامات پر صراحتاً یہ الفاظ موجود ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ: لوگ مجھے رب کا بیٹا مانیں گے اور رب کا شریک بنائیں گے اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائیں گے اور وہ میری صفائی پیش کریں گے۔پس انہی الفاظ کی وجہ سے انکار کرتے ہیں کہ اگر یہ الفاظ ثابت ہو گئے تو ہمارا بھٹہ بیٹھ جائے گا۔ ہمارے پاس تو کوئی بھی نہیں رہے گا۔حالاں کہ اصل انجیل برناباس ہی کی ہے جو صحابی کی مرتب کردہ ہے اور باقی چار تابعین کی مرتب کردہ ہیں۔اور وہ بھی اصل شکل میں موجود نہیں ہیں۔مثلاً: سن انیس سو [۱۹۰۰ء] سے پہلے کی جو طبع ہیں ان میں الفاظ اور ہیں اور جو سن انیس سو ایک [۱۹۰۱ء] کے بعد کی طبع شدہ ہیں ان کے الفاظ اور ہیں۔جوں جوں سال گزرتے ہیں الفاظ بدلتے رہتے ہیں۔

قرآن کریم کی فضیلت

مگر قرآن کریم اللہ تعالیٰ کی ایسی کتاب ہے جو اپنی اصل شکل میں موجود ہے۔اور اس کی شان یہ ہے کہ اس کو باوضو ہاتھ لگانا ثواب ہے، اس کو پڑھنا ثواب ہے، اس کو سننا ثواب ہے، اس کو دیکھنا ثواب ہے، اس کو سمجھنا ثواب ہے۔

ابن ماجہ کی روایت میں آتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر ایک شخص سو رکعات نفل پڑھتا ہے اور ایک شخص قرآن کریم کی ایک آیت بغیر ترجمے کے سیکھتا ہے تو اس ایک آیت کی تعلیم حاصل کرنے کا ثواب سو رکعات نفل سے زیادہ ہے۔ اور اگر ایک آدمی ہزار رکعات نفل پڑھتا ہے اور ایک آدمی قرآن کریم کی ایک آیت کا ترجمہ سیکھتا ہے تو اس کا ثواب ہزار رکعات نفل سے زیادہ ہے۔(آخر ہزار رکعات پڑھنے پر بھی کچھ وقت لگے نا!) تو یہ اللہ تعالیٰ کی کتاب قرآن کریم ہمارے لیے خالص رحمت ہے۔باقی ہمارے اندر کوتاہی ہے کہ ہم نے نہ اس کو پڑھا نہ سمجھا نہ عمل کیا۔کاش کہ یہ صحیح معنیٰ میں کہیں نافذ ہو جائے تو سارے لوگ اس کی برکات کو دیکھ کر اپنے ملکوں میں اسلامی قانون نافذ کر دیں۔بشرطیکہ تعصب نہ ہو۔

تو فرمایا ﴿وَاَنْزَلَ التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ﴾ اور اللہ تعالیٰ نے نازل فرمائی تورات اور انجیل ﴿مِنْ قَبْلُ﴾ اس قرآن کریم سے پہلے ﴿هُدًى لِّلنَّاسِ﴾ ہدایت تھی اُن لوگوں کے لیے یعنی اپنے وقت میں تورات بھی ہدایت تھی اور انجیل بھی ہدایت تھی۔ اس وقت کے لوگوں کے لیے۔

﴿ وَ اَنْزَلَ الْفُرْقَانَ ﴾ اور اللہ تعالیٰ نے قرآن نازل کیا۔قرآن کا نام قرآن بھی ہے،فرقان بھی اور ذکر بھی ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ﴿ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ﴾ [الحجر:۹] "اور بے شک ہم نے ہی نازل کیا ہے ذکر (یعنی قرآن کو) اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔" قرآن کریم کی آج تک حفاظت ہوئی ہے اور قیامت تک حفاظت ہوگی۔ الحمدللہ! اس کے لفظوں کی حفاظت ہوئی ہے، معنیٰ کی حفاظت ہوئی ہے، تفسیر کی حفاظت ہوئی،لب ولہجہ کی حفاظت ہوئی ہے، رسم الخط کی بھی حفاظت ہوئی ہے۔اور اللہ تعالیٰ نے اس اُمت کو یہ شرف اور توفیق عطا فرمائی کہ قرآن کریم کو اصل شکل میں محفوظ رکھا۔

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ﴾ بے شک وہ لوگ جنھوں نے اللہ تعالیٰ نے آیات کا انکار کیا ﴿ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ﴾ ان کے لیے عذاب ہے سخت ﴿ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ ذُوانْتِقَامٍ ﴾ اور اللہ تعالیٰ غالب ہے بدلا لینے والا ہے۔

وفدِ نجران کے آنے کا سبب

اگلی آیت کے سمجھنے سے پہلے کچھ ضروری باتیں سمجھ لیں تاکہ آیت کے سمجھنے میں آسانی ہو۔ ۹ ہجری میں نجران کے عیسائیوں کا ایک وفد جو ساٹھ افراد پر مشتمل تھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آیا۔ان کے آنے کا سبب یہ تھا کہ جب مکہ فتح ہوکر عرب کی ساری آبادی اور یمن کے کچھ علاقے بھی مسلمانوں کے تسلط میں آگئے۔تو نجران جو یمن کے ایک علاقے کا نام ہے اور وہاں عیسائیت کی اکثریت تھی۔وہ خوف زدہ ہوگئے اور انھوں نے مشورہ کیا کہ سارا عرب اسلام کے جھنڈے تلے آگیا ہے اور یہود ذلیل وخوار ہوگئے ہیں۔لہٰذا ہم الگ تھلگ نہیں رہ سکتے اور مسلمانوں کے ساتھ لڑ بھی نہیں سکتے۔اس واسطے ہمیں خود جاکر بات کرنی چاہیے کہ ہم تمھاری وفادار رعیت ہوکر رہیں گے۔لہٰذا ہمارے ذمے جو ٹیکس اور جو قانون ضابطہ ہے اس سے ہمیں آگاہ کیا جائے اور ہمارے حقوق ہمیں بتائے جائیں۔

چنانچہ ساٹھ آدمیوں کا یہ قافلہ جس میں عیسائیوں کے مذہبی پیشوا بھی تھے اور سیاسی لیڈر اور وڈیرے بھی تھے، نجران سے مدینہ طیبہ پہنچا اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ملاقات کی۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ کتنے آدمی ہو؟ کہنے لگے ہم ساٹھ آدمی ہیں اور سواریاں بھی ہیں۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ ہم غریب لوگ ہیں ہمارے پاس اتنی بڑی عمارت نہیں ہے کہ جس میں سب کو اکٹھا رکھ سکیں۔لہٰذا مختلف ساتھیوں کے ہاں میں تمھیں ٹھہرنے کی جگہ دیتا ہوں۔کہنے لگے کہ ہم اکٹھے آئے ہیں اور اکٹھے رہیں گے۔تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ پھر ہمارے پاس یہ مسجد ہی ہے۔کہنے لگے کہ ٹھیک ہے ہم مسجد ہی میں ٹھہریں گے۔چنانچہ ان کو مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی میں ٹھہرایا گیا۔عیسائیوں نے کہا کہ ہم نے اپنی نماز بھی پڑھنی ہے۔آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا پڑھتے رہو اجازت ہے۔تو مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں عیسائیوں نے اپنی طرز کی نماز بھی پڑھی۔

تو خیر اصل مقصد تو ان کا سیاسی پناہ حاصل کرنا تھا اور اس سلسلے میں قواعد وضوابط حاصل کرنے تھے مگر علمی باتیں بھی

ہوئیں اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر بھی آیا۔

ابو حارثہ پادری سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا مکالمہ

ان میں ابو حارثہ بن علقمہ نامی ایک بڑا پادری بھی تھا۔ کہنے لگا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے بیٹے اور شریک ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مجھے یہ بتاؤ کہ اللہ تعالیٰ کسی سے پیدا ہوا ہے؟ کہنے لگے نہیں۔ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام حضرت مریم علیہا السلام کے پیٹ سے پیدا ہوئے ہیں؟ کہنے لگے ہاں! یہ بات ٹھیک ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کچھ کھاتا پیتا ہے؟ کہنے لگے نہیں۔ اور عیسیٰ کھاتے پیتے تھے؟ کہنے لگے ہاں!

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ بتاؤ کہ اللہ تعالیٰ کی ماں ہے کہ جس کے پیٹ میں رہے ہوں؟ کہنے لگے نہیں۔ اور عیسیٰ علیہ السلام ماں کے پیٹ میں رہے ہیں؟ کہنے لگے ہاں! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ بتاؤ کہ اللہ تعالیٰ سے زمین و آسمان کی کوئی شے پوشیدہ ہے؟ کہنے لگے نہیں۔ اور عیسیٰ علیہ السلام پر؟ کہنے لگے عیسیٰ علیہ السلام کو جتنا علم رب تعالیٰ نے دیا ہے اس سے زیادہ نہیں جانتے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ بتاؤ کہ اللہ تعالیٰ پر فنا آئے گی؟ کہنے لگے نہیں۔ اور عیسیٰ علیہ السلام پر؟ کہنے لگے یَاتِیْ عَلَیْہِ الْفَنَاءُ ان پر موت آئے گی۔ اور یہ یَاتِیْ عَلَیْہِ الْفَنَاءُ کے لفظ تفسیر "ابن جریر طبری" اور "روح المعانی" وغیرہ میں موجود ہیں۔

تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بیٹا باپ کے مشابہ ہوتا ہے۔ عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ سے کون سی مشابہت ہے جس کی وجہ سے تم ان کو اللہ تعالیٰ کا بیٹا اور شریک بناتے ہو؟ تو ان کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔ اور انھوں نے اور بھی کئی شوشے چھوڑے جن کا ذکر اگلی آیتوں میں آئے گا۔ زندگی رہی تو بیان کروں گا، ان شاء اللہ العزیز۔

تو اس بحث میں چوں کہ پیٹ میں رہنے کا بھی ذکر آیا تھا اور اللہ تعالیٰ پر زمین و آسمان میں کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہے اس کا بھی ذکر آیا۔ تو فرمایا ﴿اِنَّ اللّٰہَ لَا یَخْفٰی عَلَیْہِ شَیْءٌ فِی الْاَرْضِ وَلَا فِی السَّمَآءِ﴾ بے شک اللہ تعالیٰ پر کوئی شے مخفی نہیں ہے زمین میں اور نہ آسمان میں۔ ﴿ھُوَ الَّذِیْ یُصَوِّرُکُمْ فِی الْاَرْحَامِ﴾ وہی ذات ہے جو تمھاری تصویر بناتی ہے ماؤں کے رحموں میں کہ لڑکی ہے یا لڑکا ہے، کالا ہے یا گورا ہے، صحیح الاعضاء ہے یا ناقص الاعضاء ہے۔ یہ جتنی بھی صورتیں ہیں یہ سب تمھارا رب تمھیں عطا کرتا ہے۔ ﴿کَیْفَ یَشَآءُ﴾ جس طرح چاہتا ہے ﴿لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ﴾ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے ﴿الْعَزِیْزُ﴾ غالب ہے ﴿الْحَکِیْمُ﴾ حکمت والا ہے۔ اگر فوری طور پر کسی کی گرفت نہیں کرتا تو یہ نہ سمجھو کہ بچ گئے بلکہ اس میں اس کی کوئی حکمت ہے۔

﴿ھُوَ الَّذِیْٓ﴾ اللہ تعالیٰ کی ذات وہ ہے ﴿اَنْزَلَ عَلَیْکَ الْکِتٰبَ﴾ جس نے نازل کی تم پر کتاب ﴿مِنْہُ﴾ اس کتاب میں سے ایک حصہ ہے ﴿اٰیٰتٌ مُّحْکَمٰتٌ﴾ آیتیں ہیں اٹل ﴿ھُنَّ اُمُّ الْکِتٰبِ﴾ وہی کتاب کا اصل حصہ ہیں ﴿وَاُخَرُ﴾ اور کچھ اور آیتیں ہیں ﴿مُتَشٰبِھٰتٌ﴾ جن کی مراد معلوم نہیں ہے ﴿فَاَمَّا الَّذِیْنَ﴾ پس وہ لوگ ﴿فِیْ

قُلُوۡبِهِمۡ زَيۡغٌ﴾ کہ جن کے دلوں میں کجی ہے ﴿فَيَتَّبِعُوۡنَ﴾ پس وہ پیروی کرتے ہیں ﴿مَا تَشَابَهَ مِنۡهُ﴾ ان کی جو ان میں متشابہ ہیں ﴿ابۡتِغَآءَ الۡفِتۡنَةِ﴾ فتنہ طلب کرتے ہوئے ﴿وَابۡتِغَآءَ تَاۡوِيۡلِهٖ﴾ اور اس کی حقیقت طلب کرتے ہوئے ﴿وَمَا يَعۡلَمُ تَاۡوِيۡلَهٗ﴾ اور حالاں کہ کوئی نہیں جانتا اس کی حقیقت کو ﴿اِلَّا اللّٰهُ﴾ سوائے اللہ تعالیٰ کے ﴿وَالرّٰسِخُوۡنَ فِى الۡعِلۡمِ﴾ اور وہ جو پختہ ہیں علم میں ﴿يَقُوۡلُوۡنَ﴾ کہتے ہیں ﴿اٰمَنَّا بِهٖ﴾ ہم اس پر ایمان لائے ﴿كُلٌّ مِّنۡ عِنۡدِ رَبِّنَا﴾ کہ یہ سب ہمارے رب کی طرف سے ہیں ﴿وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّاۤ اُولُوا الۡاَلۡبَابِ﴾ اور نہیں نصیحت حاصل کرتے مگر عقل مند لوگ ﴿رَبَّنَا﴾ اے ہمارے رب ﴿لَا تُزِغۡ قُلُوۡبَنَا﴾ نہ ٹیڑھا کر ہمارے دلوں کو ﴿بَعۡدَ اِذۡ هَدَيۡتَنَا﴾ بعد اس کے کہ تو نے ہمیں ہدایت دی ﴿وَهَبۡ لَنَا مِنۡ لَّدُنۡكَ رَحۡمَةً﴾ اور دے تو ہمیں اپنی طرف سے رحمت ﴿اِنَّكَ اَنۡتَ الۡوَهَّابُ﴾ بے شک تو ہی دینے والا ہے ﴿رَبَّنَاۤ﴾ اے ہمارے رب ﴿اِنَّكَ﴾ بے شک تو ﴿جَامِعُ النَّاسِ﴾ اکٹھا کرنے والا ہے لوگوں کو ﴿لِيَوۡمٍ﴾ ایسے دن میں ﴿لَّا رَيۡبَ فِيۡهِ﴾ جس میں کوئی شک نہیں ہے ﴿اِنَّ اللّٰهَ﴾ بے شک اللہ تعالیٰ ﴿لَا يُخۡلِفُ الۡمِيۡعَادَ﴾ وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرتا۔

وفدِ نجران کی مزید تفصیل

پہلے کچھ تھوڑی سی بات بیان ہوئی ہے کہ ۸ ہجری میں مکہ مکرمہ فتح ہو گیا۔ مکہ مکرمہ کی حیثیت دار الخلافہ اور مرکز کی تھی۔ اور جب دار الخلافہ فتح ہو جائے تو باقی ملک بھی فتح سمجھا جاتا ہے۔ یوں سمجھو کہ جب مکہ مکرمہ فتح ہو گیا تو سارے عرب پر اسلام کا جھنڈا لہرا دیا گیا اور سارا عرب اسلام کے جھنڈے تلے آ گیا۔ جس وقت مدینہ طیبہ، طائف اور خیبر کے علاقوں پر اسلام غالب آ گیا۔ ساتھ ہی یمن تھا جس کے دو صوبے تھے اور وہاں یہودی آباد تھے۔ آنحضرت ﷺ نے دونوں صوبوں میں اپنے گورنر بھیج دیے کہ ان سے معاملات طے کر لو کہ ان شرائط پر تم نے جزیہ اور ٹیکس ادا کرنا ہے اور ہم یہ شرائط پوری کریں گے۔ (یعنی جو تمھارے ذمے کام ہیں وہ تم نے کرنے ہیں اور جو ہماری ذمہ داری ہے وہ ہم نبھائیں گے)۔ یہودی بڑے شاطر اور چالاک لوگ تھے۔ اُنھوں نے ظاہری طور پر کوئی مزاحمت نہیں کی۔ وہ موقع کی تلاش میں تھے۔ تو اس وقت ان کے سامنے جو شرطیں پیش کی گئیں انھوں نے وہ ساری تسلیم کر لیں۔

یمن کے ساتھ نجران کا علاقہ تھا۔ وہاں عیسائی آباد تھے۔ اُنھوں نے سوچا کہ سارا عرب اسلام کے جھنڈے تلے آ گیا ہے اور یمن کے یہودیوں نے بھی سرِ تسلیم ختم کر دیا ہے۔ اب ہم الگ تھلگ نہیں رہ سکتے۔ کیوں کہ ہمارے پاس اتنی قوت اور طاقت نہیں ہے کہ ہم مسلمانوں کا مقابلہ کر سکیں۔ اور ملک کے ایک حصے میں رہ کر ملکی قانون کو نہ ماننا بھی بڑی مشکل بات ہے۔ لہٰذا اپنا ایک وفد بھیجو جو مدینہ طیبہ جا کر حضرت محمد ﷺ کے ساتھ براہِ راست گفتگو کرے کہ ہم تمھاری وفادار رعیت بن کے رہنا

چاہتے ہیں۔ لہٰذا ہمارے ذمے جو حقوق ہیں ان سے ہمیں آگاہ کیا جائے، وہ ہم پورے کریں گے۔ اور ہمارے حقوق جو تمھارے ذمہ ہیں وہ تم پورے کرو۔

چنانچہ ساٹھ آدمیوں پر مشتمل یہ وفد جس میں ان کے سیاسی لیڈر، مذہبی پیشوا اور وڈیرے (مال دار لوگ) بھی شامل تھے اور خاصا بااثر وفد تھا۔ قافلے میں جو مذہبی لوگ تھے وہ پیش پیش تھے۔ یہ لوگ جب مدینہ طیبہ پہنچے تو آنحضرت ﷺ کے بارے میں دریافت کیا کہ ہم نے ان سے ملنا ہے۔ مسجد نبوی کے ساتھ چھوٹا سا حجرہ تھا آپ ﷺ اس وقت اس حجرے میں تشریف فرما تھے۔ ان کو بتایا گیا کہ آپ ﷺ اس حجرے میں رہتے ہیں کوئی پہرہ نہیں، کوئی باڈی گارڈ نہیں۔ وہ لوگ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ آپ ﷺ اس چھوٹے سے حجرے میں رہتے ہیں اور کوئی پہرے دار اور محافظ نہیں ہے۔

خیر آپ ﷺ مسجد میں تشریف لائے اور ان سے ملاقات ہوئی۔ آپ ﷺ نے پوچھا کہ تم کون لوگ ہو اور کہاں سے آئے ہو؟ کہنے لگے ہم عیسائی ہیں اور نجران کے علاقے سے آئے ہیں۔ اور اس واسطے آئے ہیں کہ سارے عرب پر تمھارا قبضہ ہو چکا ہے اور نجران کا علاقہ بھی عرب کا حصہ ہے۔ ہم از خود آگئے ہیں کہ تمھاری رعیت بن کے رہیں گے۔ لہٰذا ہمارے ذمہ جو حقوق ہیں ہمیں بتادو وہ ہم پورے کریں گے۔ اور ہمارے حقوق جو تمھارے ذمے ہیں وہ تم پورے کرو۔

وفد نجران کو مسجد میں ٹھہرایا گیا

آنحضرت ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بلایا اور فرمایا یہ مہمان ہیں۔ سب سے پہلے ان کی رہائش اور خوراک کا انتظام کرو اور ان کی سواریوں کے کھڑے کرنے کا انتظام کرو۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے کہا کہ حضرت! اس طرح کرتے ہیں کہ ہم دو، دو، تین، تین آدمی آپس میں تقسیم کر لیتے ہیں۔ اس میں ہمیں بھی سہولت ہوگی اور انہیں بھی سہولت ہوگی۔

آنحضرت ﷺ کو یہ تجویز پسند آئی۔ آپ ﷺ نے ان کے امیر عاقب اور حارث کو کہا کہ ہم غریب لوگ ہیں ہمارے پاس اتنے وسیع مکان نہیں ہیں کہ ہم تمھارے ساٹھ آدمیوں اور سواریوں کو ایک جگہ رکھ سکیں۔ اس لیے ہم نے اس میں سہولت سمجھی ہے کہ ہم تمھارے دو، دو، تین، تین، آدمی اپنے ساتھیوں کے حوالے کردیں، وہ ان کی رہائش، خوراک اور سواریوں کا بھی انتظام کرلیں گے۔

ان کے بڑوں نے آپس میں مشورہ کیا اور کہا یہ ہمیں منظور نہیں ہے۔ کیوں کہ ان کو اس بات کا خدشہ تھا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بڑے بااخلاق لوگ ہیں اور تبلیغ سے باز نہیں آتے۔ اور سچی بات دل پر ضرور اثر کرتی ہے۔ اگر ہماری یہ بھیڑیں دو تین دن ان کے پاس رہیں تو ان سے متاثر ہو جائیں گی اور یہ ہمارے آدمیوں کو قابو کرلیں گے۔ اس لیے انھوں نے کہا کہ حضرت! ہم اکٹھے آئے ہیں اور اکٹھے رہیں گے اور اکٹھے جائیں گے۔ آنحضرت ﷺ پریشان ہو گئے کہ ساٹھ آدمیوں کے اکٹھے رہنے کا ایک جگہ انتظام نہیں ہو سکتا تھا۔ پھر کسی کے پاس خچر ہے، کسی کے پاس گھوڑا ہے، کسی کے پاس اُونٹ ہے (یعنی ان

کی سواریاں بھی تھیں) ان کو بھی سنبھالنا تھا۔ (واہ رے اللہ! ایک وہ وقت تھا کہ ساٹھ آدمیوں کو اکٹھا ٹھہرانے کی جگہ نہیں تھی اور اب چالیس، پچاس لاکھ کا مجمع ٹھہرتا ہے اور کسی کو پریشانی بھی نہیں ہوتی اور ہر ایک کی ضرورت بھی پوری ہوتی ہے۔نواز بلوچ)

بہرحال انھوں نے کہا ہم نے اکٹھے رہنا ہے۔آپ ﷺ نے فرمایا کہ پھر ہمارے پاس صرف یہی مسجد ہے۔کہنے لگے ہم یہیں مسجد میں رہیں گے۔ ہماری سواریوں کا انتظام کردو۔ چنانچہ وہ مسجد نبوی ﷺ ہی میں ٹھہرے۔

کہنے لگے کہ ہم نے اپنی نماز بھی پڑھنی ہے۔آپ ﷺ نے فرمایا کہ پڑھ لینا۔ چنانچہ وہ اپنے قبلے کی طرف چہرہ کر کے اپنے طرز کی نماز بھی پڑھتے رہے۔ ان کی جو خدمت آپ ﷺ سے ہوسکی وہ آپ ﷺ نے کی۔ان میں سے بعض نے آہستہ سے کہا کہ ہم شراب بھی پیتے ہیں۔صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کہا کہ اس کا نام بھی نہ لینا۔ باقی جو جائز خدمت ہے وہ ہم کریں گے لیکن ہم سے یہ توقع نہ رکھنا کہ ہم تمھیں شراب بھی پلائیں گے اور خنزیر بھی کھلائیں گے۔ ہاں! جو حلال چیزیں ہیں وہ جتنی ہمارے بس میں ہوئیں ان سے تمھاری خدمت کریں گے۔

چنانچہ گفتگو شروع ہوئی اور اُنھوں نے کہا کہ ہم تمھاری وفادار رعایا بن کے رہیں گے۔ہم پر جو ٹیکس وغیرہ ہے ہمیں بتادو۔اور آنے کا مقصد بھی یہی تھا۔ یہ تمام باتیں طے ہوگئیں۔

نصاریٰ نجران کی اپنے عقیدہ سے متعلق وضاحت کرنا

اس اثناء میں مذہبی اور علمی گفتگو بھی شروع ہوگئی۔ کیوں کہ پڑھے لکھے لوگ بھی تھے اور ان کے لاٹ پادری بھی ساتھ تھے۔ چنانچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق بات چلی تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ تمھارا عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق کیا نظریہ ہے؟ کہنے لگے کہ ہم ان کو اللہ تعالیٰ کا بیٹا بھی کہتے ہیں اور خدائی میں شریک بھی مانتے ہیں۔قرآن پاک میں عیسائیوں کے تین فرقوں کا ذکر ہے۔

ایک وہ ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ابن اللہ مانتا ہے، ﴿وَقَالَتِ النَّصٰرَی الْمَسِیْحُ ابْنُ اللّٰهِ﴾ [التوبہ:۳۰] دوسرا فرقہ وہ ہے جو کہتا ہے ﴿اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ﴾ [المائدہ:۷۳] "بے شک اللہ تیسرا ہے تینوں میں۔" ان کے نزدیک خدائی کے تین رکن ہیں۔

- پہلا رکن اللہ تعالیٰ کی ذات۔
- دوسرا رکن حضرت عیسیٰ علیہ السلام۔
- اور تیسرا رکن بعض کے نزدیک حضرت مریم علیہا السلام ہیں اور بعض کے نزدیک حضرت جبرئیل علیہ السلام ہیں۔یعنی تیسرے رکن میں دو طبقے ہیں۔ایک حضرت مریم علیہا السلام کو رکن مانتا ہے اور دوسرا حضرت جبرئیل علیہ السلام کو۔

اور تیسرا فرقہ کہتا ہے ﴿اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِیْحُ ابْنُ مَرْیَمَ﴾ [المائدہ:۷۲] "بے شک اللہ تعالیٰ وہ مسیح ابن مریم علیہما السلام ہی ہے۔" یہ کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں تو بندے مگر انھوں نے اتنی کثرت سے عبادت کی کہ اللہ تعالیٰ عیسیٰ علیہ السلام کے وجود میں

حلول کر گیا ہے، داخل ہو گیا ہے۔ ان کے ہاتھ پر جو معجزات صادر ہوئے ہیں دراصل وہ اس رب سے صادر ہوئے ہیں جو ان کے اندر داخل ہے۔

انھوں نے جب اپنے یہ عقائد بیان کیے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ باپ اور بیٹے میں کچھ مشابہت ہوتی ہے۔ یہ بتاؤ کہ اللہ تعالیٰ کسی سے پیدا ہوا ہے؟ کیا اس کے ماں باپ ہیں؟ کہنے لگے نہیں۔ اور عیسیٰ علیہ السلام کے؟ کہنے لگے ہاں! عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ ہے۔

دوسرا سوال کیا کہ اللہ تعالیٰ ماں کے رحم میں رہے ہیں؟ کہنے لگے نہیں۔ اور عیسیٰ علیہ السلام؟ کہنے لگے ہاں! وہ ماں کے رحم میں رہے ہیں۔

پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اچھا یہ بتاؤ کہ عیسیٰ علیہ السلام غیب جانتے ہیں؟ کہنے لگے نہیں! اتنا ہی جانتے ہیں جتنا رب نے بتایا ہے۔ فرمایا رب تعالیٰ غیب جانتا ہے؟ کہنے لگے ہاں! جانتا ہے (زمین وآسمان کی کوئی چیز اس پر مخفی نہیں ہے)۔

فرمایا یہ بتاؤ کہ رب تعالیٰ کھاتا پیتا بھی ہے؟ کہنے لگے نہیں۔ فرمایا اللہ تعالیٰ کو پیشاب پاخانے کی ضرورت بھی پیش آتی ہے؟ کہنے لگے نہیں اور عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق کیا رائے ہے؟ کہنے لگے وہ کھاتے پیتے بھی تھے اور باقی بشری تقاضے کے تحت پیشاب پاخانہ کی ضرورت بھی ان کو پیش آتی تھی۔

فرمایا یہ بتاؤ کہ اللہ تعالیٰ پر کبھی موت آئے گی؟ کہنے لگے نہیں۔ اور عیسیٰ علیہ السلام پر؟ کہنے لگے یَأْتِيْ عَلَيْهِ الْفَنَا ان پر فنا اور موت آئے گی۔

جب یہ تمام باتیں ہو چکیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب عیسیٰ علیہ السلام میں خدائی اختیارات اور اوصاف نہیں ہیں تو تم کس دلیل سے ان کو رب تعالیٰ کا بیٹا مانتے ہو؟ رب تعالیٰ کو بھوک نہیں لگتی، اس کو کھانے کی ضرورت نہیں اور عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق آج بھی انجیل متی میں ہے جس کو وہ انجیلوں میں پہلے درجے کی انجیل سمجھتے ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنے ساتھیوں کے ساتھ سفر میں تھے۔ فرمایا بھوک لگی ہے کسی کے پاس کھانے کے لیے کوئی شے ہے؟ سارے ساتھیوں نے، حواریوں نے اپنے تھیلوں کی تلاشی لی۔ کسی کے پاس نہ ستو تھے نہ کھجوریں۔ کوئی کھانے کی چیز نہیں تھی۔ آگے دیکھا تو ایک انجیر کا درخت تھا۔ انجیل میں ہے کہ بڑی تیزی کے ساتھ اس کے پاس پہنچے کہ شاید انجیر پر پھل لگا ہوا ہو۔ جب قریب پہنچے تو خیال کیا کہ یہ تو انجیر کا موسم ہی نہیں ہے۔

یہ جس وقت میں نے انجیل میں پڑھا تو مجھے ہنسی آئی کہ یہ لوگ عیسیٰ علیہ السلام کو الٰہ مانتے ہیں، رب مانتے ہیں، رب تعالیٰ کو بھی کبھی بھوک لگی ہے؟ اور رب تعالیٰ نے بھی کبھی اپنے حواریوں کو کہا ہے کہ اپنے تھیلوں میں سے کھانے کے لیے کوئی چیز تلاش کر کے دو؟ پھر بھوک کی وجہ سے انجیر کے درخت کے پاس جاتے ہیں اور یہ بھی علم نہیں کہ انجیر کا تو موسم ہی نہیں ہے۔ ایسے بھولے رب کو خدائی دے کر کیا کرنا ہے جس کو موسم کا بھی علم نہیں ہے۔ جس میں اتنی کمزوریاں ہوں وہ خدا نہیں ہوتا۔

﴿لَا تَأْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ﴾ اللہ تعالیٰ کو نہ اُونگھ آتی ہے اور نہ نیند آتی ہے۔ اور نہ اس کو بھوک اور پیاس لگتی ہے، نہ وہ بیمار

ہوتا ہے۔ یہودی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دشمن تھے ﴿وَ اَیَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ﴾ [البقرہ:۲۵۳] "اور تائید کی ہم اس کی روح القدس کے ساتھ۔" اکثر اوقات حضرت جبرئیل علیہ السلام ان کی حفاظت کے لیے موجود ہوتے تھے تا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو تسلی رہے کہ کسی وقت حواری آگے پیچھے ہو بھی جائیں تو میں بے یار و مددگار نہیں ہوں۔ بھئی! رب تعالیٰ کو بھی کسی کی حفاظت کی ضرورت ہے؟

دنیا میں خاموش تو کوئی نہیں رہتا۔ ان باتوں میں وہ لاجواب ہو گئے تو کہنے لگے تم جو کہتے ہو عیسیٰ علیہ السلام خدا نہیں ہیں تو تمھارے قرآن میں ﴿وَ كَلِمَتُهٗ ۚ اَلْقٰهَاۤ اِلٰى مَرْيَمَ وَ رُوْحٌ مِّنْهُ﴾ [النساء:۱۷۱] کیوں آیا ہے؟ کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے روح ہیں۔ یہ انھوں نے شوشہ چھوڑا کہ روح اللہ کا کیا معنیٰ ہے اور ﴿كَلِمَتُهٗ﴾ کا لفظ قرآن میں ہے۔ اس کا کیا معنیٰ ہے؟ تو اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ کو کلمۃ اللہ بھی کہا ہے ﴿رُوْحٌ مِّنْهُ﴾ بھی کہا ہے تو کوئی تعلق تو رب تعالیٰ کے ساتھ ہے نا عیسیٰ علیہ السلام کا۔

بات سمجھ لیں۔ قرآن کریم میں اکثر حصہ محکم ہے۔ محکم کا یہ معنیٰ ہے کہ ان کی مراد بالکل واضح ہو۔ ہر ایک آدمی سمجھ سکے۔ کچھ آیتیں متشابہات ہیں۔ متشابہات وہ ہیں کہ جن کی حقیقت کو رب تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ ہمارے لیے بس اتنا ہی کافی ہے کہ ان متشابہات پر ایمان رکھیں۔ مثلاً: قرآن پاک میں آتا ہے ﴿بِيَدِهِ الْمُلْكُ﴾ "اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ملک ہے۔" یہ بھی آتا ہے ﴿بَلْ يَدٰهُ مَبْسُوْطَتٰنِ﴾ "بلکہ اللہ تعالیٰ کے دونوں ہاتھ کشادہ ہیں۔" اب دیکھو! ہمارے ہاتھ ہیں کہ ہتھیلی ہے، پانچ انگلیاں ہیں، کوئی چھوٹی ہے کوئی بڑی ہے۔ ہم اللہ تعالیٰ کو ان کے ساتھ تو تشبیہ نہیں دے سکتے۔ رب تعالیٰ کے لیے ہاتھ کی صفت ہماری سمجھ سے بالاتر ہے۔ ﴿وَ كَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا﴾ "اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ کلام کیا کلام کرنا۔" ہم کلام کرتے ہیں ہمارے دانت کھلتے ہیں، ہونٹ بھی کھلتے ہیں، ہماری زبان چلتی ہے، تالو کے ساتھ لگتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے لیے کلام کی یہ صفت تو نہیں ہے کہ اس کے دانت بھی نہیں، اس کے ہونٹ بھی نہیں، زبان بھی نہیں ہے، تالو بھی نہیں ہے۔ اسی طرح ﴿اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى﴾ "رحمٰن عرش پر مستوی ہے۔" میں اس وقت مصلے پر بیٹھا ہوں تم دریوں پر بیٹھے ہو، کوئی کرسی پر بیٹھا ہوتا ہے، کوئی چارپائی پر، کوئی چٹائی پر، کوئی نیچے زمین پر۔ تو اللہ تعالیٰ کے بیٹھنے کو کسی شے کے ساتھ تشبیہ نہیں دے سکتے کہ جس طرح ہم بیٹھتے ہیں اللہ تعالیٰ اسی طرح بیٹھا ہے۔ جس طرح ہم مصلے پر بیٹھتے ہیں، کرسی پر بیٹھتے ہیں اللہ تعالیٰ اس طرح بیٹھا ہے حاشا وکلا! ہرگز کسی شے کے ساتھ تشبیہ نہیں دے سکتے۔ یہ متشابہات ہیں ان کی حقیقت اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔

یہ آیت بھی متشابہات میں سے ہے۔ حقیقت تو رب تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے لیکن اس کا ظاہری مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خرق عادت کے طور پر جبرئیل علیہ السلام کے واسطے سے حضرت مریم علیہا السلام کو پھونک ماری اور اندر روح پڑ گئی۔ ہم یہ کہیں گے ﴿رُوْحٌ مِّنْهُ﴾ کا معنیٰ ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے روح ہیں۔ کلمۃ اللہ کا معنیٰ ہے اللہ تعالیٰ نے کلمہ کن کے ساتھ ان کو پیدا کیا ہے۔ اس سے ان کا خدا ہونا تو ثابت نہیں ہوتا۔ اور نہ یہ ابن اللہ ہونے کی دلیل ہے۔ مگر ہر آدمی اپنی بات منوانے کے لیے ہاتھ پاؤں تو مارتا ہے کیوں کہ دنیا میں خاموش کوئی نہیں رہتا۔

لوگوں نے ایک قصہ بنایا ہوا ہے کہ پدی روڑی پر دھاگوں میں پھنس گئی۔ اُڑتی ہے پھڑ پھڑ کر کے بیٹھ جاتی ہے۔

کوے نے دیکھا کہ خالہ پھنسی ہوئی ہے ہمدردی کے لیے قریب آیا اور پوچھا خالہ کیا بات ہے؟ تو پدّی نے کہا کہ میں زمین تول رہی ہوں۔ تو پدی نے بھی ہار نہیں مانی۔ خاموش تو پدی بھی نہیں رہی۔ حالاں کہ محاورہ ہے کیا پدی اور کیا پدی کا شوربا۔

جن دنوں پاکستان بن رہا تھا اُن دنوں میں ایک مولوی صاحب نے یہاں گکھڑ میں تقریر کی کہ اولیاء اللہ ہماری مدد اور مشکل کشائی کرتے ہیں۔ میں نے جمعہ میں اس کی تردید کی۔ کیوں کہ باطل کی تردید کرنا فرض کفایہ ہے۔ اگر کوئی بھی باطل کی تردید نہ کرے تو سارے مسلمان گناہ گار ہوں گے اور اگر ایک نے بھی تردید کردی تو سارے گناہ سے بچ گئے۔

تو میں نے اس کی تردید کرتے ہوئے کہا کہ مشرقی پنجاب میں جو ظلم ہو رہا ہے کہ تقریباً دس لاکھ مسلمان شہید ہوئے، عورتوں کے پیٹ چاک کر کے بچے ضائع کیے گئے، مسجدوں کی بے حرمتی کی گئی، قرآن پاک کو سیڑھی بنا کر گھڑیاں اُتاری گئیں۔ کون سا ظلم تھا جو اس وقت نہ ہوا۔ میں نے کہا یہ ولی ان کی مدد کیوں نہیں کرتے؟ اور تو چھوڑو یہ سرہند میں شاہ احمد سرہندی مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ جیسی شخصیت موجود ہے اور ان کے علاوہ بے شمار اولیاء اللہ ہیں۔ انھوں نے کیوں نہیں مشکل کشائی کی؟ یہ وقت تھا مشکل کشائی کرنے کا اور کون سا وقت آتا ہے جب وہ امداد اور مشکل کشائی کریں گے؟ میں نے دلائل کے ساتھ تردید کی۔

ایک کتری ڈاڑھی والا آدمی کھڑا ہوا اور کہنے لگا کہ یہ بزرگ آج کل حج کرنے کے لیے گئے ہوئے ہیں۔

میں نے کہا پہلی بات تو یہ ہے کہ مرنے کے بعد حج ہوتا ہی نہیں ہے۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ آج کل حج کے دن بھی نہیں ہیں۔ کون سا حج کرنے کے لیے گئے ہوئے ہیں؟ اندازہ لگاؤ دنیا میں خاموش کوئی بھی نہیں رہتا۔

تو عیسائیوں کو بھی جب کوئی جواب نہ آیا تو انھوں نے یہ شوشہ چھوڑ دیا کہنے لگے تمھارے قرآن میں جو آتا ہے ﴿وَكَلِمَتُهٗ ۚ اَلْقٰىهَآ اِلٰى مَرْيَمَ وَرُوْحٌ مِّنْهُ﴾ عیسیٰ علیہ السلام اللہ کا کلمہ ہیں، اللہ تعالیٰ کی روح ہیں۔ تو روح اللہ کا کیا مطلب ہے اور کلمۃ اللہ کا کیا معنیٰ ہے؟ تو اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کوئی تعلق ہے نا۔ ہمارے نزدیک تعلق کا مطلب بیٹا ہے۔ یہ کہہ کر بات کو رول گول کر دیا۔ اس کا ذکر ہے۔

﴿هُوَ الَّذِيْٓ﴾ اللہ تعالیٰ کی ذات وہ ہے ﴿اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ﴾ جس نے آپ پر کتاب نازل کی ﴿مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ﴾ اس کتاب میں بعض آیتیں محکم ہیں، اٹل ہیں، واضح ہیں۔ یعنی ان کا مطلب بالکل واضح ہے ان میں کسی قسم کا شک شبہ نہیں ہے۔ محکم اس آیت کو کہتے ہیں کہ جس کا مطلب بالکل واضح ہو کہ لغت کے اعتبار سے اور کوئی مفہوم نہ نکل سکے۔ جیسے: ﴿اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ﴾ "بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔" دیکھو! لفظ اللہ کا مفہوم بھی واضح ہے، ﴿شَيْءٍ﴾ کے معنیٰ میں بھی کوئی تردد نہیں ہے اور قدیر کا مفہوم بھی واضح ہے۔ اسی طرح ﴿اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ﴾ ﴿يَا سَمِيْعًا بَصِيْرًا﴾ ہے، ﴿اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ﴾ ہے، ﴿اٰتُوا الزَّكٰوةَ﴾ ہے، ﴿كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ﴾ ہے۔ یہ تمام آیات محکمات ہیں۔

فرمایا ﴿هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ﴾ یہ آیتیں کتاب کی اصل ہیں۔ عقیدے بھی واضح ہیں، اعمال بھی واضح ہیں، اخلاق بھی واضح تھا، معاملات کے احکامات بھی واضح ہیں ﴿وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ﴾ اور دوسری آیتیں متشابہ ہیں جن کی مراد معلوم نہیں۔ جن کے معنیٰ

کے متعلق آگے آتا ہے ﴿وَ مَا یَعْلَمُ تَاْوِیْلَهٗۤ اِلَّا اللّٰهُ﴾۔ اللہ تعالیٰ کے سوا ان کی حقیقت کو کوئی نہیں جانتا۔ مثلاً:

﴿اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى﴾ والی آیت ہے ﴿بِیَدِهِ الْمُلْكُ﴾ والی آیت ہوئی ﴿بَلْ یَدٰهُ مَبْسُوْطَتٰنِ﴾ والی آیت ہے ﴿وَ كَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِیْمًا﴾ کی آیت ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ سمیع ہے۔ ہم تو سنتے ہیں کانوں سے۔ کیا ہم یہ کہیں گے کہ اللہ تعالیٰ کے بھی اس طرح کے کان ہیں جس طرح ہمارے ہیں۔ ہرگز نہیں۔ بصیر بھی ہے۔ ہماری آنکھیں ہیں، آنکھوں میں پتلیاں ہیں ان کے ذریعے ہم دیکھتے ہیں۔ تو کیا رب کے لیے اس طرح کی آنکھیں ثابت کریں گے؟ ہرگز نہیں! تو اللہ تعالیٰ کی حقیقت کیا ہے؟ ہم کسی شے کے ساتھ تشبیہ نہیں دے سکتے۔ اس لیے کہ ﴿لَیْسَ كَمِثْلِهٖ شَیْءٌ﴾ [الشوریٰ:۱۱] "اس کے مثل کوئی شے نہیں ہے۔" اس طرح کی تمام آیات متشابہات ہیں۔

﴿فَاَمَّا الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ زَیْغٌ﴾ پس بہر حال وہ لوگ جن کے دلوں میں کجی ہے ﴿فَیَتَّبِعُوْنَ﴾ پس وہ پیروی کرتے ہیں، پیچھے لگتے ہیں ﴿مَا تَشَابَهَ مِنْهُ﴾ ان کی جو ان میں متشابہ ہیں۔ جیسے عیسائیوں نے ﴿كَلِمَتُهٗ ۚ اَلْقٰىهَاۤ اِلٰى مَرْیَمَ﴾ کے لفظ سے استدلال کیا ﴿رُوْحٌ مِّنْهُ﴾ سے استدلال کیا کہ عیسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کا کلمہ ہیں جو اللہ تعالیٰ نے حضرت مریم علیہا السلام کی طرف القاء کیا اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے روح ہیں۔ ﴿ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ﴾ فتنہ طلب کرتے ہوئے، شرارت چاہتے ہوئے ﴿وَ ابْتِغَآءَ تَاْوِیْلِهٖ﴾ اور اس کی حقیقت طلب کرتے ہوئے کہ ﴿رُوْحٌ مِّنْهُ﴾ سے یہ مراد ہے کہ اللہ تعالیٰ کی روح اس میں داخل ہوگئی ہے۔

رب تعالیٰ فرماتے ہیں ﴿وَ مَا یَعْلَمُ تَاْوِیْلَهٗۤ اِلَّا اللّٰهُ﴾ اور حالاں کہ کوئی نہیں جانتا اس کی حقیقت کو ﴿اِلَّا اللّٰهُ﴾ سوائے اللہ تعالیٰ کے۔ متشابہ کی حقیقت کو رب تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ ﴿وَ الرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ﴾ اور وہ جو پختہ ہیں علم میں ﴿یَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ﴾ وہ کہتے ہیں ہم اس پر ایمان لے آئے کہ ﴿بِیَدِهِ الْمُلْكُ﴾ بھی صحیح ہے ﴿بَلْ یَدٰهُ مَبْسُوْطَتٰنِ﴾ بھی حق ہے۔ اللہ تعالیٰ سمیع بھی ہے بصیر بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ کلام کرنا بھی حق ہے۔ ﴿اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى﴾ رحمٰن عرش پر مستوی بھی ہے۔ سب کچھ حق ہے۔ ﴿كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا﴾ یہ سب کچھ ہمارے رب کی طرف سے ہیں مگر ہم ان کی حقیقت نہیں جانتے۔ ہم یہی کہتے ہیں کہ جو رب تعالیٰ کی شان کے لائق ہاتھ ہیں جو اس کی شان کے لائق کلام ہے، جو رب تعالیٰ کی شان کے لائق دیکھنا ہے، سننا ہے، دیکھتا سنتا ہے۔ ﴿وَ مَا یَذَّكَّرُ اِلَّاۤ اُولُوا الْاَلْبَابِ﴾ اور نہیں نصیحت حاصل کرتے مگر عقل مند۔ عقل مند ہی بات کو سمجھتے ہیں دوسرے نہیں سمجھتے۔

اُوپر چوں کہ ذکر تھا کہ جن کے دلوں میں کجی ہے تو اللہ تعالیٰ نے آگے سبق دیا کہ تم یہ دعا پڑھو ﴿رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا﴾ اے رب ہمارے! نہ ٹیڑھا کر ہمارے دلوں کو ﴿بَعْدَ اِذْ هَدَیْتَنَا﴾ بعد اس کے کہ تو نے ہمیں ہدایت دی۔ اب اپنے فضل وکرم سے ہدایت پر قائم رکھ۔ اور اے پروردگار! ﴿وَ هَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً﴾ اور دے تو ہمیں اپنی طرف سے رحمت۔ اپنی رحمت کا ہمیں مستحق بنا، ہم پر رحمت نازل فرما۔ کیوں؟ ﴿اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ﴾ بے شک دینے والا تو ہی ہے اور کوئی دینے والا نہیں ہے۔

کتابوں میں لکھا ہوا ہے، محققین بیان فرماتے ہیں کہ بندہ جلد بازی نہ کرے تو جس پر رزق کی تنگی ہے ہر فرض نماز کے ساتھ یہ تین مرتبہ پڑھے یَا بَاسِطُ ، یَارَزَّاقُ ، یَاوَهَّابُ ، اللہ تعالیٰ اس کا رزق کشادہ کر دے گا۔ نہ نماز رہے اور نہ وظیفہ رہے۔ صرف تین مرتبہ۔ مگر توجہ شرط ہے۔ کیوں کہ دعا کا گر توجہ ہے۔ دعا پورے اخلاص کے ساتھ ہو۔ بَاسِطُ کا معنٰی رزق کشادہ کرنے والا ، رَزَّاق کا معنٰی رزق دینے والا ، وَهَّابُ کا معنٰی تمام نعمتیں عطا کرنے والا۔

﴿رَبَّنَآ اِنَّكَ جَامِعُ النَّاسِ﴾ اے ہمارے رب بے شک تو اکٹھا کرنے والا ہے لوگوں کو ﴿لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيْهِ﴾ ایسے دن میں جس میں کوئی شک نہیں ہے۔ قیامت والے دن ساری کائنات اکٹھی ہوگی کیا انسان، کیا فرشتے، کیا حیوانات، کیا کیڑے مکوڑے، تمام کی تمام مخلوق وہاں اکٹھی ہوگی ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ﴾ بے شک اللہ تعالیٰ وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرتا۔ جو اس نے فرمایا ہے اس کو پورا کرتا ہے۔ یہ دعا بھی کثرت سے پڑھو ﴿رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ﴾ اللہ تعالیٰ عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ [امین]

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا﴾ بے شک وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا ﴿لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ﴾ ہرگز نہیں کام آئیں گے ان کو ﴿اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ﴾ ان کے مال اور نہ ان کی اولاد ﴿مِّنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا﴾ اللہ تعالیٰ کے عذاب سے کچھ بھی ﴿وَاُولٰٓئِكَ هُمْ وَقُوْدُ النَّارِ﴾ اور یہی لوگ ہیں دوزخ کا ایندھن ﴿كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ﴾ ان کی عادت ہے جیسے عادت تھی فرعونیوں کی ﴿وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ﴾ اور ان لوگوں کی جو ان سے پہلے تھے ﴿كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا﴾ انھوں نے جھٹلایا ہماری آیتوں کو ﴿فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ﴾ پس پکڑا ان کو اللہ تعالیٰ نے ﴿بِذُنُوْبِهِمْ﴾ ان کے گناہوں کی وجہ سے ﴿وَاللّٰهُ شَدِيْدُ الْعِقَابِ﴾ اور اللہ تعالیٰ سخت سزا دینے والا ہے ﴿قُلْ لِّلَّذِيْنَ﴾ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کہہ دیں ان لوگوں کو ﴿كَفَرُوْا﴾ جو کافر ہیں ﴿سَتُغْلَبُوْنَ﴾ عن قریب تم شکست کھاؤ گے ﴿وَتُحْشَرُوْنَ﴾ اور تم اکٹھے کیے جاؤ گے ﴿اِلٰى جَهَنَّمَ﴾ جہنم کی طرف ﴿وَبِئْسَ الْمِهَادُ﴾ اور بہت برا ٹھکانا ہے ﴿قَدْ كَانَ لَكُمْ﴾ تحقیق ہے تمھارے لیے ﴿اٰيَةٌ﴾ نشانی ﴿فِيْ فِئَتَيْنِ﴾ دو گروہوں میں ﴿الْتَقَتَا﴾ جن دو گروہوں کا آمنا سامنا ہوا ﴿فِئَةٌ تُقَاتِلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ ایک گروہ لڑ رہا تھا اللہ تعالیٰ کے راستے میں ﴿وَاُخْرٰى كَافِرَةٌ﴾ اور دوسرا گروہ کافروں کا ہے ﴿يَّرَوْنَهُمْ﴾ وہ کافر دیکھتے ہیں اپنے آپ کو ﴿مِّثْلَيْهِمْ﴾ ان سے دُگنا ﴿رَاْيَ الْعَيْنِ﴾ آنکھ کے ساتھ دیکھنا ﴿وَاللّٰهُ يُؤَيِّدُ بِنَصْرِهٖ﴾ اور اللہ تعالیٰ تائید کرتا ہے اپنی مدد سے ﴿مَنْ يَّشَآءُ﴾ جس کی چاہتا ہے ﴿اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ﴾ بے شک اس میں ﴿لَعِبْرَةً لِّاُولِي الْاَبْصَارِ﴾ البتہ عبرت ہے آنکھیں رکھنے والوں کے لیے۔

یہودِ مدینہ کا اثر ورسوخ

پہلی دو آیتوں میں یہود کی ضد کا بیان ہے اور تیسری آیت میں غزوۂ بدر کا مختصر سا بیان ہے۔ یاد رکھنا! یہودی ذہین بھی بڑے ہیں اور ضدی بھی بڑے ہیں۔ من حیث القوم جتنی ضد اِن میں ہے وہ اور کسی قوم میں نہیں ہے۔

مدینہ طیبہ میں یہود کے تین خاندان آباد تھے۔ بنونضیر، بنوقریظہ اور بنوقینقاع۔ اور مدینہ طیبہ کی تمام منڈیوں پر ان کا قبضہ تھا۔ یعنی تجارت ان کے ہاتھ میں تھی اور علم میں بھی ماہر تھے اور افرادی قوت بھی ان کو حاصل تھی۔ اور ظاہر بات ہے کہ جس قوم کے پاس تجارت ہو، علم ہو اور افرادی قوت بھی ہو تو اس قوم کو غلبہ حاصل ہوتا ہے۔ اور یہ سب چیزیں یہودِ مدینہ کو حاصل تھیں۔ جس کی وجہ سے وہ خاصے بگڑے ہوئے تھے اور ان کا اتنا اثر ورسوخ تھا کہ اوس اور خزرج جو کافر ولی کے خاندان تھے وہ اپنی لڑکی اور لڑکے کی شادی ان کی اجازت کے بغیر نہیں کر سکتے تھے۔ حالاں کہ اِن کا مذہب اور تھا اور اُن کا مذہب اور تھا۔ مثلاً: اوس اور خزرج کے خاندان میں سے کسی نے اگر اپنی لڑکی یا لڑکے کی شادی کرنی ہوتی ہے تو اس کے محلے میں جو یہودی رئیس ہوتا تھا اس سے مشورہ کرتا کہ فلاں جگہ پر میں اپنی لڑکی یا لڑکے کی شادی کرنا چاہتا ہوں تمھاری کیا رائے ہے؟ اگر وہ کہہ دیتا کہ ٹھیک ہے تو شادی کر دیتا اور اگر وہ قیل وقال کرتا تو وہاں شادی کرنے کی جرأت نہیں ہوتی تھی۔

بلکہ اوس اور خزرج کے کسی آدمی نے اگر کسی اہم سفر پر بھی جانا ہوتا تھا تو اجازت لے کر اور اطلاع دے کر جاتا تھا۔

اس سے اندازہ لگاؤ کہ یہود کا مدینہ طیبہ میں کتنا اثر ورسوخ تھا۔

یہود کا مدینہ منورہ آنے کا سبب

رہا یہ سوال کہ یہود مدینہ طیبہ میں کس طرح آئے؟ اور یہاں آکر آباد ہوئے۔ تو ان کے مدینہ طیبہ آنے کا سبب ایک خط تھا جو ان کے بڑوں نے پڑھا تھا۔ اس خط کی حقیقت اس طرح ہے کہ تُبّع اسد بن ملیک رحمۃ اللہ علیہ یمن کے بادشاہوں میں سے ایک نیک اور پارسا بادشاہ تھا۔ ابوکرب اس کی کنیت تھی اور حِمْیَر قبیلے کے ساتھ تعلق تھا۔ اور یہ وہی تبع ہے جس کا ذکر قرآن پاک میں ہے۔ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نو سو سال پہلے گزرا ہے۔ اس کو علم تھا کہ خاتم النّبیین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مکہ مکرمہ سے ہجرت کر کے مدینہ طیبہ تشریف لائیں گے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مہمانی کا شرف اہل مدینہ کو حاصل ہوگا۔ اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نام بڑا عقیدت مندانہ خط لکھا کہ کہ اگر تم میری زندگی میں آجاؤ تو میں تمھاری خدمت کروں گا اور تمھارے پاؤں دھوؤں گا اور اگر تم بعد میں آؤ تو میں مرنے سے پہلے تمھارا کلمہ پڑھتا ہوں۔ اس نے یہ خط لکھ کر اس خاندان کے حوالے کیا کہ تم نے یہ خط حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وخاتم النّبیین کو دینا ہے۔ چنانچہ وہ خط حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کے خاندان میں منتقل ہوتا چلا آیا۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہجرت فرما کر مدینہ طیبہ تشریف لائے تو وہ خط حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں پیش فرمایا۔

تو یہود کے آباؤ اجداد تجارت وغیرہ کے سلسلے میں مدینہ طیبہ آئے تھے اور انھوں نے یہ خط سنا تھا۔ تو جلدی کے ساتھ

مدینہ طیبہ آ گئے کہ ہمیں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت کا موقع ملے۔ اس طرح یہود کے بڑے بڑے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت سے چار سو سال پہلے مدینہ طیبہ آ گئے تھے تاکہ ہمیں ان کی خدمت کا موقع ملے۔ یہودیوں کے وڈیرے تو اس نظریے اور عقیدے کے تھے مگر جب نئی نسل چلی تو انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو زہر بھی دیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو شہید کرنے کے بھی درپے ہوئے۔ اور یہ سب کچھ انھوں نے ضد میں آ کر کیا اور ضد کا دنیا میں کوئی علاج نہیں ہے۔

بہر حال مدینہ طیبہ میں یہودیوں کو دوسرے لوگوں پر غلبہ حاصل تھا اور ان کی مرضی کے بغیر وہ لوگ اپنی اولاد کی شادیاں تک نہیں کر سکتے تھے۔ اور بدر میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو بے سروسامانی کی حالت میں کامیابی عطا فرمائی جس کا ذکر اگلی آیت کریمہ میں آ رہا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہود کو اسلام کی دعوت دینا اور اُن کا جواب

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم غزوۂ بدر سے جب واپس تشریف لائے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہودیوں کے تینوں خاندانوں، بنونضیر، بنوقریظہ اور بنوقینقاع کے سرداروں کے سامنے توحید بیان فرمائی، قرآن پاک کی صداقت کا ذکر کیا اور نبوت اور رسالت کو بڑے اچھے انداز میں بیان فرمایا اور قیامت کا بھی ذکر فرمایا اور ان کو اسلام کی دعوت دی۔ ایک شرارتی یہودی کعب بن اشرف ان کا پادری تھا۔ کہنے لگا اے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! تم نے ناتجربہ کار جاہلوں کے ساتھ لڑائی کر کے فتح حاصل کی ہے اور اب تم اتنے دلیر ہو گئے ہو کہ ہمیں قابو کرنا چاہتے ہو۔ انہیں کیا پتا تھا کہ لڑائی کیا چیز ہوتی ہے؟ جب ہمارے ساتھ ٹکراؤ گے تو پتا چل جائے گا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے تمھیں کوئی لڑائی کی دھمکی تو نہیں دی۔ میں نے صرف یہ کہا ہے کہ تم پڑھے لکھے لوگ ہو اسلام قبول کر لو۔ تورات تمھارے پاس موجود ہے اس میں صراحت کے ساتھ میری علامات کا بیان ہے جو تم پڑھتے ہو۔ یہودیوں کا یہ کردار قابلِ تعجب ہے۔ اس واسطے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دنیا میں تشریف لانے سے پہلے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وسیلے سے دشمنوں پر فتح یابی کے لیے دعا کرتے تھے۔

چنانچہ قرآن پاک کے پہلے پارے میں موجود ہے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ﴿ وَ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ﴾ [البقرۃ:۸۹] "اور وہ تھے اس سے پہلے فتح کے لیے توسل حاصل کرتے ان لوگوں کے خلاف جو کافر ہیں ﴿ فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ ﴾ پس جب آئی ان کے پاس وہ ذات یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جس کو انھوں نے پہچان لیا تو اس کا انکار کر گئے۔" اور اس چیز کا ذکر تفسیروں میں بھی موجود ہے اور تاریخ میں بھی۔ اور قرآن کریم کے دوسرے پارے میں آتا ہے ﴿ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ ﴾ "یہ بنی اسرائیل حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس طرح پہچانتے ہیں جس طرح اپنی اولاد کو پہچانتے ہیں لیکن ضد کا کوئی علاج نہیں ہے۔"

تو کہنے لگے کہ مال ہمارے پاس زیادہ ہے، افرادی قوت ہمارے پاس زیادہ ہے۔ مدینہ طیبہ شہر اور باہر دیہات میں

مضبوط قلعے ہمارے پاس ہیں پھر تم ہمیں خفیہ انداز میں دھمکیاں دیتے ہو اور کہتے ہو کہ اسلام قبول کرلو۔ جب ہمارے ساتھ ٹکراؤ گے تو پتا چل جائے گا۔

لَنۡ تُغۡنِیَ عَنۡہُمۡ اَمۡوَالُہُمۡ کا شانِ نزول

اس موقع پر اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں ﴿اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا﴾ بے شک وہ لوگ جنھوں نے کفر اختیار کیا۔ اور یاد رکھنا! کہ ﴿کَفَرُوۡا﴾ سے ساری دنیا کے کافر مراد ہیں۔ اگر چہ شانِ نزول مدینہ طیبہ کے یہودِ بنونضیر، بنوقریظہ اور بنوقینقاع ہیں۔ لیکن حکم شانِ نزول میں بند نہیں ہوتا۔

﴿لَنۡ تُغۡنِیَ عَنۡہُمۡ اَمۡوَالُہُمۡ وَلَاۤ اَوۡلَادُہُمۡ مِّنَ اللّٰہِ شَیۡئًا﴾ ہرگز نہیں کام آئیں گے ان کے مال اور نہ ان کی اولاد اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں کچھ بھی۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی گرفت سے ان کو کوئی شے نہیں بچا سکے گی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ جب یہود کے ساتھ اہل حق کی لڑائی ہوئی تو بنونضیر اور بنوقینقاع نے کہا ہمیں نہ مارو ہم جلاوطن ہونے کے لیے تیار ہیں۔ تو یہ دھمکیاں دینے والے اپنی زمین، مکانات اور جائیدادیں چھوڑ کر خیبر بھاگ گئے۔ البتہ بنوقریظہ نے ٹکر لی مگر بالآخر انھوں نے بھی ہتھیار ڈال دیے۔ نوجوان مارے گئے، ان کی عورتوں اور بچوں کو غلام بنالیا گیا۔ تو جس طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا اسی طرح ہوا کہ تم اپنے مال اور اپنی اولاد پر گھمنڈ نہ کرو۔ یہ چیزیں تمھیں اللہ تعالیٰ کی گرفت سے نہیں بچا سکیں گی ﴿وَاُولٰٓئِکَ ہُمۡ وَقُوۡدُ النَّارِ﴾ اور یہی لوگ ہیں دوزخ کا ایندھن۔ یعنی یہ جتنے بھی ہیں سارے کے سارے دوزخ کی آگ کا ایندھن بنیں گے اور سب دوزخ کی آگ میں جلیں گے۔

فرمایا ان لوگوں کی عادت ایسے ہی ہے ﴿کَدَاۡبِ اٰلِ فِرۡعَوۡنَ﴾ جیسے عادت تھی فرعونیوں کی کہ انھوں نے بھی ضد کی اور حق کے ساتھ ٹکر لی۔ ﴿وَالَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِہِمۡ﴾ اور ان لوگوں کی عادت کی طرح ہے جو ان سے پہلے تھے۔ اور ان کی عادت یہ تھی ﴿کَذَّبُوۡا بِاٰیٰتِنَا﴾ کہ انھوں نے جھٹلایا ہماری آیتوں کو اور نشانیوں کو ﴿فَاَخَذَہُمُ اللّٰہُ بِذُنُوۡبِہِمۡ﴾ پس پکڑا ان کو اللہ تعالیٰ نے ان کے گناہوں کی وجہ سے۔ فرعون کو اللہ تعالیٰ کے عذاب سے نہ حکومت بچا سکی، نہ فوجیں، نہ مال۔ جس وقت بحر قلزم میں غوطے کھائے تو کہنے لگا ﴿اٰمَنۡتُ اَنَّہٗ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا الَّذِیۡۤ اٰمَنَتۡ بِہٖ بَنُوۡۤا اِسۡرَآءِیۡلَ وَاَنَا مِنَ الۡمُسۡلِمِیۡنَ﴾ ایمان لایا میں کہ بے شک شان یہ ہے کہ کوئی معبود نہیں ہے مگر وہی جس پر ایمان لائے ہیں بنی اسرائیل اور میں بھی فرماں برداروں میں سے ہوں۔

حضرت جبرئیل علیہ السلام فرماتے ہیں کہ اس وقت میں نے دریا کا جو نچلے حصے کا کالا گارا ہوتا ہے اس کے گلے میں ٹھونسا کہ یہ بڑا واویلا کر رہا ہے کہیں اس پر اللہ تعالیٰ کو ترس نہ آجائے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿آٰلۡـٰٔنَ وَقَدۡ عَصَیۡتَ قَبۡلُ﴾ اب ایمان لاتا ہے اور تحقیق تو انکار کر چکا ہے اس سے پہلے۔ یعنی جب تجھے ہوش تھی اس وقت تو تو ایمان کے قریب نہیں آیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿فَالۡیَوۡمَ نُنَجِّیۡکَ بِبَدَنِکَ لِتَکُوۡنَ لِمَنۡ خَلۡفَکَ اٰیَۃً﴾ پس آج ہم تجھے باہر پھینک دیں گے تاکہ تو پچھلوں کے لیے نشانی بن جائے۔ لوگ تجھے دیکھیں اور کہیں کہ یہ ہے جو کہتا تھا ﴿اَنَا رَبُّکُمُ الۡاَعۡلٰی﴾ "میں ہوں تمھارا بڑا رب۔" اور آج مشکیزہ بنا پڑا ہے اور پانی

منہ سے، ناک سے بہہ رہا ہے اور رب جانے کہاں کہاں سے بہہ رہا ہے۔فرعون کو آج تک دفن نہیں کیا گیا مصر میں محفوظ ہے۔ کبھی کبھی انسان دیکھ کر حیران ہوتا ہے کہ یہ اپنے آپ کو رب الاعلیٰ کہتا تھا۔

﴿وَاللّٰهُ شَدِيْدُ الْعِقَابِ﴾ اور اللہ تعالیٰ سخت سزا دینے والا ہے ﴿قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا﴾ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کہہ دیں ان کافروں کو جو یہودی ہیں جنھوں نے متکبرانہ انداز میں کہا کہ ہمارے ساتھ ٹکراؤ گے تو پتا چل جائے گا ﴿سَتُغْلَبُوْنَ﴾ عن قریب تم شکست کھاؤ گے اور یہ دنیا کی سزا ہوگی ﴿وَتُحْشَرُوْنَ اِلٰى جَهَنَّمَ﴾ اور مرنے کے بعد تم اکٹھے کیے جاؤ گے جہنم کی طرف۔ چنانچہ آٹھ نو سال بعد تمام یہود نے شکست کھائی اور ذلیل و خوار ہوئے۔جن کے بارے میں کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ یہ مدینہ طیبہ سے نکلیں گے۔ ان میں سے کئی مارے گئے اور دوسرے جلا وطن ہو گئے۔اور جس طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا اسی طرح ہوا ﴿وَبِئْسَ الْمِهَادُ﴾ اور دوزخ بہت برا ٹھکانا ہے۔اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے تمام مومنین اور مومنات کو تمام مسلمین اور مسلمات کو دوزخ سے بچائے۔

واقعہ بدر کا ذکر

﴿قَدْ كَانَ لَكُمْ اٰيَةٌ﴾ تحقیق ہے تمھارے لیے نشانی ﴿فِيْ فِئَتَيْنِ الْتَقَتَا﴾ دو گروہوں میں جن دو گروہوں کا آمنا سامنا ہوا ﴿فِئَةٌ تُقَاتِلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ ایک گروہ لڑ رہا تھا اللہ تعالیٰ کے راستے میں ﴿وَاُخْرٰى كَافِرَةٌ﴾ اور دوسرا گروہ کافروں کا تھا۔ اس آیت کریمہ میں واقعہ بدر کا ذکر ہے اور بدر مدینہ طیبہ سے اسی [۸۰] میل دور ایک مقام کا نام تھا۔ بدر نامی ایک شخص نے اس جگہ ایک کنواں کھودا تھا۔تو اس کنویں کا نام بدر پڑ گیا۔پھر اس علاقے کا نام بدر ہو گیا۔

قرآن کریم کے چوتھے پارے میں ذکر ہے ﴿وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّاَنْتُمْ اَذِلَّةٌ﴾ اور تحقیق رب تعالیٰ نے تمھیں بدر کے مقام میں کامیابی عطا فرمائی اور حالاں کہ تم کمزور تھے۔ اس مقام پر مسلمانوں کی تعداد تین سو تیرہ [۳۱۳] تھی۔ ستتر [۷۷] مہاجرین اور دو سو چھتیس [۲۳۶] انصار تھے۔اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قیادت فرما رہے تھے۔ان کے پاس سامان دو گھوڑے کہ ایک مرثد بن ابی مرثد رضی اللہ عنہ کے پاس تھا اور ایک مقداد بن عمرو رضی اللہ عنہ کے پاس تھا، ستر اونٹ، چھ زرہیں اور آٹھ تلواریں تھیں۔یعنی تین سو تیرہ کے پاس تلواریں بھی مکمل نہ تھیں۔

اور جس وقت یہ مدینہ طیبہ سے چلے تھے تو دسویں پارے میں آتا ہے کہ یہود ان کا مذاق اُڑاتے تھے۔ایک دوسرے کو اشارے کر کے کہتے تھے کہ دیکھو بھئی! یہ پہلوان بہادر، یہ جوان، قریش کے ساتھ لڑنے جا رہے ہیں۔اُن کے سر کاٹیں گے اور قیدی بنا کے لائیں گے۔رب تعالیٰ کی قدرت کہ اس نے ان کے مذاق کو حقیقت بنا دیا۔ جب جنگ ہوئی ستر کافر مارے گئے، ستر قیدی بنا لیے گئے اور باقیوں کو بھاگتے ہوئے راستہ نہ ملا۔ مسلمانوں میں سے صرف چودہ آدمی شہید ہوئے۔ چھ مہاجرین میں سے اور آٹھ انصار میں سے۔اور ان کی قبریں آج بھی اس مقام پر زیارت گاہ بنی ہوئی ہیں۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب ساتھیوں

کے ہمراہ مدینہ طیبہ تشریف لائے تو مذاق اُڑانے والے حیران رہ گئے کہ ہم کیا کہتے تھے اور یہ کیا ہو گیا۔

تو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی تعداد تین سو تیرہ [۳۱۳] تھی اور مقابلے میں ایک ہزار کا لشکر تھا اور ہر طرح کے کیل کانٹے سے لیس تھا اور ابو جہل ان کی قیادت کر رہا تھا۔ یہ غزوہ ہجرت کے دوسرے سال سترہ رمضان المبارک جمعہ کے دن پیش آیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھی مسافر تھے اس واسطے جمعہ ان پر فرض نہیں تھا اور ویسے بھی بدر کوئی شہر تو تھا نہیں کہ وہاں مسلمانوں کی آبادی ہوتی۔

عشاء کی نماز کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے خیمہ میں تشریف لے گئے اور عاجزی اور زاری کے ساتھ دعائیں کیں۔ اے پروردگار! یہ بھوکے ہیں تو نے ان کو سیر کرنا ہے، یہ پیاسے ہیں تو نے ان کو پانی پلانا ہے، یہ بے سہارا ہیں ان کا سہارا تو ہے، یہ بے ہتھیار ہیں ان کا ہتھیار تیری مدد ہے۔ اے میرے پروردگار! یہ میری پندرہ سال کی کمائی ہے اور اگر یہ ختم ہو گئے تو خالص تیری عبادت کرنے والا کوئی نہ ہوگا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سجدے میں پڑے ہیں اور رو رہے ہیں، آنکھوں سے آنسو جاری ہیں اور ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ خیمہ سے باہر تھے۔ انھوں نے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عاجزی اور زاری دیکھی تو خیمے میں تشریف لائے۔ کہنے لگے حضرت! بس کرو لَقَدْ اَلْحَحْتَ تحقیق آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑی عاجزی اور زاری کی ہے رب تعالیٰ ضرور تمھاری دعائیں سنے گا۔

صبح جس وقت لڑائی ہوئی اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے تین سو تیرہ [۳۱۳] نہتوں نے ایک ہزار کو شکست دی۔ ہزار تلوار اور آٹھ تلواروں کا کوئی تقابل نہیں تھا۔ اور پھر ان تین سو تیرہ میں اکثر ننگے سر اور ننگے پاؤں تھے اور دھوپ میں سر اور پاؤں جل رہے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اس واقعہ سے یہودِ مدینہ کو عبرت حاصل کرنے کی تلقین فرمائی۔

﴿ يَرَوْنَهُمْ مِّثْلَيْهِمْ رَاْيَ الْعَيْنِ ﴾ وہ کافر دیکھتے ہیں اپنے آپ کو ان سے دُگنا کھلی آنکھ کے ساتھ۔ اور بڑے خوش ہوتے تھے اور کہتے تھے کہ ہم زیادہ ہیں اور تھے تو وہ دوگنا بھی زیادہ لیکن ﴿ وَاللّٰهُ يُؤَيِّدُ بِنَصْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ﴾ اور اللہ تعالیٰ تائید کرتا ہے اپنی مدد سے جس کی چاہتا ہے۔ جس طرح یہاں مسلمانوں کی تائید فرمائی کہ آٹھ تلواروں کو ہزار تلواروں پر کامیابی نصیب فرمائی اور تین سو تیرہ کو ہزار پر غلبہ عطا فرمایا ﴿ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّاُولِي الْاَبْصَارِ ﴾ بے شک اس میں البتہ عبرت ہے ان لوگوں کے لیے جو آنکھیں کھول کر حقیقت کو دیکھنا چاہتے ہیں۔ اور اگر آنکھیں بند کر لیں تو دنیا میں اس کا کوئی علاج نہیں ہے۔

﴿ زُيِّنَ ﴾ مزین کی گئی ﴿ لِلنَّاسِ ﴾ لوگوں کے لیے ﴿ حُبُّ الشَّهَوٰتِ ﴾ خواہشات کی محبت ﴿ مِنَ النِّسَآءِ ﴾ عورتوں کی خواہش ﴿ وَالْبَنِيْنَ ﴾ اور بیٹوں کی خواہش ﴿ وَالْقَنَاطِيْرِ ﴾ اور مال کی خواہش ﴿ الْمُقَنْطَرَةِ ﴾ جو بہت ہو ﴿ مِنَ الذَّهَبِ ﴾ سونے سے ﴿ وَالْفِضَّةِ ﴾ اور چاندی سے ﴿ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ ﴾ اور نشان لگائے ہوئے گھوڑوں سے ﴿ وَالْاَنْعَامِ ﴾ اور مال مویشی سے ﴿ وَالْحَرْثِ ﴾ اور کھیتی سے ﴿ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ﴾ یہ دنیا کی

زندگی کا فائدہ ہے ﴿وَاللّٰہُ عِنْدَہٗ﴾ اور اللہ تعالیٰ کے پاس ﴿حُسْنُ الْمَاٰبِ﴾ اچھا ٹھکانا ہے ﴿قُلْ﴾ ان کو کہہ دیں ﴿اَؤُنَبِّئُكُمْ﴾ کیا میں تمھیں خبر دوں ﴿بِخَيْرٍ مِّنْ ذٰلِكُمْ﴾ اس سے بہتر چیز کی ﴿لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا﴾ ان لوگوں کے لیے جو ڈرتے ہیں ﴿عِنْدَ رَبِّهِمْ﴾ اُن کے رب کے ہاں ﴿جَنّٰتٌ﴾ باغات ہیں ﴿تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ﴾ جاری ہیں اُن باغوں کے نیچے نہریں ﴿خٰلِدِيْنَ فِيْهَا﴾ ہمیشہ رہیں گے ان میں ﴿وَاَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ﴾ اور جوڑے ہوں گے پاکیزہ ﴿وَّرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ﴾ اور اللہ تعالیٰ کی رضا ہوگی ﴿وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ﴾ اور اللہ تعالیٰ دیکھ رہا ہے بندوں کو ﴿اَلَّذِيْنَ﴾ اللہ کے بندے وہ ہیں ﴿يَقُوْلُوْنَ﴾ جو کہتے ہیں ﴿رَبَّنَآ﴾ اے ہمارے رب ﴿اِنَّنَآ اٰمَنَّا﴾ بے شک ہم ایمان لائے ﴿فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا﴾ پس تو بخش دے ہم کو ہمارے گناہ ﴿وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ﴾ اور بچا ہم کو دوزخ کے عذاب سے ﴿اَلصّٰبِرِيْنَ﴾ صبر کرنے والے ہیں تکلیفوں میں ﴿وَالصّٰدِقِيْنَ﴾ اور سچے ہیں ﴿وَالْقٰنِتِيْنَ﴾ اور اطاعت کرنے والے ہیں ﴿وَالْمُنْفِقِيْنَ﴾ اور خرچ کرنے والے ہیں ﴿وَالْمُسْتَغْفِرِيْنَ بِالْاَسْحَارِ﴾ اور معافی مانگنے والے ہیں اللہ تعالیٰ سے سحر کے وقت ﴿شَهِدَ اللّٰهُ﴾ اللہ تعالیٰ نے گواہی دی ﴿اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ﴾ بے شک نہیں ہے کوئی معبود مگر وہی ﴿وَالْمَلٰٓئِكَةُ﴾ اور فرشتوں نے بھی گواہی دی ﴿وَاُولُوا الْعِلْمِ﴾ اور علم والے بھی ﴿قَآئِمًاۢ بِالْقِسْطِ﴾ قائم ہوتے ہوئے انصاف پر ﴿لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ﴾ نہیں ہے کوئی الٰہ مگر وہی ﴿الْعَزِيْزُ﴾ غالب ہے ﴿الْحَكِيْمُ﴾ حکمت والا ہے۔

مال ودولت کا ہونا اللہ تعالیٰ کے راضی ہونے کی دلیل نہیں؟

اس رکوع کے پہلے حصے میں یہ بات بیان ہوئی تھی کہ مدینہ طیبہ میں رہنے والے یہودیوں نے کہا تھا کہ ہمارے پاس مال اور اولاد کافی ہے تم ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ اور ہم حق پر ہیں اگر ہم حق پر نہ ہوتے تو ہمیں اتنا مال اور اولاد نہ ملتی۔ آگے اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے کہ یہ چیزیں عارضی ہیں اور دنیا میں فائدہ اُٹھانے کا سامان ہیں۔ یہ حق پر ہونے کی دلیل نہیں ہیں۔ جو لوگ جو ان چیزوں سے محبت میں تجاوز کرتے ہیں وہ گمراہ ہو جاتے ہیں۔

فرمایا ﴿زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ﴾ مزین کی گئی لوگوں کے لیے خواہشات کی محبت۔ یعنی لوگوں کے دلوں میں طبعی طور پر ان چیزوں کی محبت ڈال دی ہے جو خواہشات لوگوں کے دلوں میں ہیں۔ اور جو خواہشات ہیں آگے ان کا ذکر ہے ﴿مِنَ النِّسَآءِ﴾ عورتوں کی خواہش ہے۔ یعنی عورتوں کی محبت انسانوں کے دلوں میں مزین کر دی گئی ہے۔ مردوں کو عورتوں کی خواہش ﴿وَالْبَنِيْنَ﴾ اور بیٹوں کی خواہش لوگوں کے دلوں میں مزین کر دی گئی ہے۔

ہر زمانے میں لوگ اس بات کو پسند کرتے آئے ہیں کہ ہمیں لڑکا ملے لڑکی نہ ملے۔ یہ ایک خواہش ہے ورنہ ہوتا وہی

ہے جو رب چاہے۔ کہ کسی کو لڑکا دے یا لڑکی دے یا لڑکا اور لڑکی ملا کر دے یا کچھ بھی نہ دے بانجھ کر دے۔ مگر طبعی طور پر خواہش تو ہے نا!

﴿وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ﴾ اور زیادہ مال کی محبت انسانوں کے دلوں میں پکی کر دی گئی ہے۔ قَنَاطِیْر قِنْطَار کی جمع ہے۔ اور قِنْطَار کے معنیٰ ہیں المال الکثیر زیادہ مال مُقَنْطَرَة کا معنیٰ ہے ڈھیر لگایا ہوا۔ اس زمانے میں سونے چاندی کا سکہ ہوتا تھا کاغذ کے نوٹ نہیں ہوتے تھے۔ آج کل تو سارا نظام نوٹوں کے ذریعے چلتا ہے مگر اس زمانے میں سونے چاندی کے سکوں کے ذریعے نظام چلتا تھا اور بینک بھی نہیں ہوتے تھے۔ گھروں میں ہی مال کے اوپر نیچے ڈھیر لگے ہوتے تھے اور گھروں میں ہی بوریوں، برتنوں کے ذریعے یا جس جگہ مناسب سمجھتے تھے محفوظ کر لیتے تھے۔ اسی طرح وہ ڈھیروں مال کو دیکھ کر خوش ہوتے تھے۔ آگے اس کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔

فرمایا ﴿مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ﴾ وہ بہت سارا مال سونے اور چاندی سے ہے ﴿وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ﴾ اور نشان لگائے ہوئے گھوڑوں سے۔ مُسَوَّمه کا ایک معنیٰ یہ کرتے ہیں کہ جو گھوڑے اصیل نسل کے ہوتے تھے ان کے منہ پر یا پیٹھ پر نشان لگاتے تھے تاکہ پتا چلے کہ یہ اصیل ہے۔ اور یہ معنیٰ بھی کرتے ہیں کہ خوب صورت گھوڑا جس کے اعضاء بالکل صحیح سالم ہوں اور دیکھنے میں حسین نظر آئے۔ چوں کہ اس زمانے میں گھوڑے پر سواری کی جاتی تھی اور گھوڑوں کے ذریعے جنگ لڑی جاتی تھی اس واسطے ان کی اہمیت تھی۔

﴿وَالْاَنْعَامِ﴾ اور مال مویشی کی محبت۔ جس کے بارے میں قرآن پاک میں ایک مستقل سورت ہے جس کا نام "اَنْعَام" ہے۔ ساتویں پارے سے شروع ہوتی ہے اور آٹھویں پارے میں ختم ہوتی ہے۔ اس میں اَنعام بیان فرمائے ہیں کہ گائے، بھینس، بھیڑ، بکری، اونٹ وغیرہ۔ ان کی محبت بھی انسانوں کے دلوں میں ڈال دی گئی ہے۔

﴿وَالْحَرْثِ﴾ اور کھیتی کی محبت۔ جس زمانے میں یہ آیتِ کریمہ نازل ہوئی ہے وہ زمانہ صنعت اور کارکانوں کا زمانہ نہ تھا۔ ان لوگوں کے لیے یہی مال ہوتے تھے جن کا ذکر ہو رہا ہے۔

مال اچھا ہے اگر جائز طریقے سے کمایا جائے

رب تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جن چیزوں کا ذکر ہو رہا ہے ﴿ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا﴾ یہ دنیا کی زندگی کا سامان ہے۔ یعنی یہ چیزیں دنیا کی زندگی میں فائدہ حاصل کرنے کا ذریعہ ہیں مگر اصل مقصود تو آخرت کی زندگی ہے۔ اگر ان چیزوں کی محبت میں آخرت سے غافل ہو گیا تو سخت خسارے کا سودا کیا۔ ہاں! اگر کوئی مسلمان ہے اور ان کو جائز طریقے سے حاصل کرتا ہے اور شریعت کے مطابق خرچ کرتا ہے تو پھر یہ مال بہت اچھا ہے کوئی عیب کی بات نہیں۔ اگر مطلقاً مال معیوب ہوتا تو اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبروں کو عطا نہ فرماتا۔ حالاں کہ حضرت ایوب علیہ السلام کے پاس تین ہزار اونٹ، پانچ سو جوڑی بیلوں کی یعنی ایک ہزار بیل اور

بڑا وسیع رقبہ تھا جس میں کاشت کاری کرتے تھے اور بہت بڑی چراگاہ تھی جس میں جانور چرتے تھے۔ اور لوگوں کے وفدوں کے وفد آتے تھے۔ ان کے لیے الگ مہمان خانہ تھا جہاں ان کی عزت کی جاتی تھی اور کھانا کھلایا جاتا تھا۔ حضرت ایوب علیہ السلام ان کو دین سکھاتے اور مسائل بیان کرتے تھے۔ اتنی وافر دولت رب تعالیٰ نے ان کو عطاء فرمائی تھی حالاں کہ وہ خدا کے پیغمبر تھے۔

اسی طرح حضرت داؤد علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے پیغمبر اور خلیفۃ اللہ فی الارض تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو بہت کچھ عطاء فرمایا تھا۔ مگر وہ سب ان کے ہاتھ کی کمائی تھی۔ تلواریں اور زرہ بناتے تھے، خود تیار کرتے تھے اور اسی کمائی سے وہ اپنا نظام چلاتے تھے۔ انھوں نے جتنا عرصہ بھی بادشاہی کی ہے قوم اور پبلک کی رقم استعمال نہیں فرمائی۔ یہی حال حضرت سلیمان علیہ السلام کا تھا۔

اس واسطے اگر کسی کے پاس سونے چاندی کا ڈھیر ہو، زمین ہو، مال مویشی ہوں تو کوئی عیب کی بات نہیں ہے۔ بشرطیکہ جائز طریقے سے حاصل کیے ہوں اور جائز طریقے سے خرچ کرتا ہو تو رب تعالیٰ کی نعمت ہے۔ مگر یہ سب چیزیں دنیا کا فائدہ ہیں کوئی کتنی دیر زندہ رہے گا اور کتنا کھا پی لے گا اور پہن لے گا۔ ﴿وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ﴾ اور اللہ تعالیٰ کے پاس اچھا ٹھکانا ہے۔ یعنی آخرت کی چیزیں ان چیزیوں سے بہت اچھی ہیں۔ لہٰذا دنیا کی چیزوں پر اعتماد نہ کرو۔ اعتماد صرف رب تعالیٰ کی ذات پر کرو۔

آخرت کے میوے دنیا کے میووں کی طرح نہیں ہوں گے

﴿قُلْ﴾ ان کو کہہ دیں اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم ! ﴿اَؤُنَبِّئُكُمْ﴾ کیا میں تمھیں خبر دوں ﴿بِخَيْرٍ مِّنْ ذٰلِكُمْ﴾ اس سے بہتر چیز کی جس کا ذکر اُوپر ہوا ہے۔ مگر وہ اچھی چیز کن لوگوں کے لیے ہے؟ ﴿لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا﴾ ان لوگوں کے لیے ہے جو رب سے ڈرے ہیں ﴿عِنْدَ رَبِّهِمْ﴾ ان کے رب کے ہاں ان کو ملے گی۔ وہ کیا چیز ہے؟ فرمایا ﴿جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ﴾ باغات ہیں جاری ہیں ان باغوں کے نیچے نہریں۔ آخرت کے باغات اور میوے دنیا کے باغات اور میووں کی طرح نہیں ہیں۔ دنیا کے سارے میوے فصلی اور موسمی ہیں۔ موسم میں آتے ہیں اور جب موسم ختم ہو جاتا ہے تو میوہ اور پھل بھی ختم ہو جاتا ہے۔ مگر اللہ تبارک وتعالیٰ نے جنت کے میووں میں یہ خاصیت رکھی ہے کہ کبھی ختم ہونے میں نہیں آئیں گے۔

ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ قرآن پاک میں فرماتے ہیں ﴿لَا مَقْطُوْعَةٍ وَّلَا مَمْنُوْعَةٍ﴾ وہ میوے کبھی ختم نہیں ہوں گے۔ جہاں سے تم نے دانہ توڑا دیکھتے ہی دیکھتے اور لگ جائے گا اور نہ وہاں کوئی کسی کو روکے گا۔ اس واسطے کہ جنت میں باغات ہی باغات ہوں گے اور وہ بھی سدا بہار۔ اپنے باگات سے کھائے یا جس جگہ سیر وسیاحت کے لیے جائے کوئی رکاوٹ نہیں ہوگی اور جنت کی نہریں دنیا کی نہروں کی طرح نہیں ہوں گی کہ زمین میں گہری ہو اور اس میں پانی چلے۔ جنت کی نہریں زمین کی سطح سے اُوپر ہوں گی اور کناروں پر موتیوں کے بند ہوں گے۔ بڑی صاف ستھری نہریں ہوں گی۔ دودھ کی نہر، شہد کی نہر اور شرابِ طہور کی نہر، صاف پانی کی نہر اور بڑا کچھ ہوگا۔ ﴿خٰلِدِيْنَ فِيْهَا﴾ ہمیشہ انھی باغات میں رہیں گے۔ وہاں سے نکالے جانے کا کوئی کھٹکا نہیں ہوگا۔ ﴿وَاَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ﴾ اور جوڑے ہوں گے پاکیزہ۔ مردوں کو پاکیزہ بیویاں ملیں گی اور عورتوں کو پاکیزہ خاوند

ملیں گے۔ پاکیزہ ہوں گے اخلاق کے لحاظ سے بھی اور ظاہری لحاظ سے بھی۔ نہ وہاں پیشاب، نہ پاخانہ، نہ نزلہ، نہ زکام، نہ ناک سے بلغم، نہ گلے سے بلغم۔

بخاری شریف کی روایت میں آتا ہے: لَا یَبُوْلُوْنَ وَ لَا یَتَغَوَّطُوْنَ "نہ پیشاب کریں گے نہ پاخانہ کریں گے وَلَا یَتَمَخَّطُوْنَ نہ ناک سے بلغم نکلے گی، نہ گلے سے بلغم نکلے گی۔"

جنتیوں کے کھانے کی مقدار اور اس کا ہضم ہونا

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا گیا کہ حضرت! جنتی کچھ کھائیں پئیں گے بھی؟ فرمایا ایک جنتی سو آدمیوں کے برابر کھائے گا اور اللہ تعالیٰ کی قدرت سے بدن سے پسینہ نکلے گا جس کی خوش بو کستوری کی طرح ہوگی اور اس پسینے کے ذریعے سب کھانا ہضم ہو جائے گا۔ اور فرمایا جنتیوں کو ڈکار آئے گا۔ اس کی بھی خوش بو کستوری کی طرح ہوگی۔ اس سے آناً فاناً کھانا ہضم ہو جائے گا۔ اور ایک دوسرے کے بارے میں ذہن شیشے کی طرح صاف ہوں گے۔ کسی کو کسی کے ساتھ کوئی بغض، کینہ اور عداوت نہ ہوگی۔ وہاں انتقام کا جذبہ بالکل نہ ہوگا۔

بہشت آں جا است کہ آزارے نہ باشد
کسے را بہ کسے کارے نہ باشد

"بہشت اس جگہ کا نام ہے جہاں کوئی تکلیف نہیں ہوگی، کسی کو کسی کے ساتھ کوئی کام نہ ہوگا۔"

﴿ وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ ﴾ اور اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل ہوگی۔ اللہ تعالیٰ جنتیوں پر ہر وقت راضی رہے گا۔ ﴿ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ﴾ اور اللہ تعالیٰ دیکھتا ہے اپنے بندوں کو۔

ایمان والوں کی خوبیاں

اللہ تعالیٰ کے بندے کون ہیں اور ان کی خوبیاں کیا ہیں؟ آگے اس کا بیان ہے۔ فرمایا ﴿ اَلَّذِيْنَ ﴾ اللہ کے بندے وہ ہیں ﴿ يَقُوْلُوْنَ ﴾ جو کہتے ہیں ﴿ رَبَّنَآ اِنَّنَآ اٰمَنَّا ﴾ اے رب ہمارے بے شک ہم ایمان لائے۔ تو اللہ تعالیٰ کے بندوں کی پہلی خوبی یہ ہے کہ وہ ایمان لاتے ہیں جن جن چیزوں پر ایمان لانا ہے اور کہتے ہیں ﴿ فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا ﴾ پس تو بخش دے ہم کو ہمارے گناہ۔ کیوں کہ ہم خطا کار ہیں، گناہ گار ہیں، ﴿ وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴾ اور ہمیں آگ کے عذاب سے بچا۔ اور ان کی خوبیاں ہیں ﴿ اَلصّٰبِرِيْنَ ﴾ وہ صبر کرنے والے ہیں۔ یعنی اگر تکلیفیں پیش آتی ہیں تو صبر سے کام لیتے ہیں۔ شرعی دائرے میں رہ کر بیماری کا علاج کرانا بھی صحیح ہے، دشمن سے دفاع کرنا بھی صحیح ہے مگر بے صبری اور بے قراری نہ ہو۔ رب تعالیٰ کی ذات پر اعتماد ہو۔

﴿ وَالصّٰدِقِيْنَ ﴾ اور سچ بولنے والے ہیں، مومن کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((يُطْبَعُ الْمَرْءُ مَعَ كُلِّ خَصْلَةٍ اِلَّا الْكِذْبَ وَ الْخِيَانَةَ)) یعنی ہوسکتا ہے کہ مومن میں کچھ عیب بھی ہوں مگر

جھوٹ اور خیانت یہ مومن میں نہیں آسکتیں۔ جھوٹ آئے گا ایمان چلا جائے گا، خیانت آئے گی ایمان چلا جائے گا۔

آنحضرت ﷺ سے دریافت کیا گیا کہ حضرت! یہ ارشاد فرماؤ کہ مومن بزدل بھی ہوتا ہے؟ فرمایا ہاں! کمزور قسم کا ایمان ہو تو اس کے ساتھ بزدلی بھی آسکتی ہے۔ حضرت! یہ فرماؤ کہ مومن بخیل بھی ہوسکتا ہے؟ فرمایا ہاں! کمزور ایمان کے ساتھ بخل بھی اکٹھا ہوسکتا ہے۔ عرض کیا حضرت! یہ فرماؤ کہ مومن جھوٹا بھی ہوسکتا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ((کَلَّا وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِہٖ)) ہرگز نہیں اس رب کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے ایمان اور جھوٹ اکٹھے نہیں ہوسکتے۔ جھوٹ کا مفہوم کیا ہے؟ یاد رکھنا! ہر وہ بات جو واقعہ کے خلاف ہو وہ جھوٹ ہے۔

تو مومنوں کی صفت ہے کہ وہ سچ بولتے ہیں ﴿وَالْقٰنِتِیْنَ﴾ اور اطاعت کرنے والے ہیں۔ اطاعت میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور آنحضرت ﷺ کی اطاعت اور جائز کاموں میں والدین کی اطاعت، خاوند کی اطاعت، ہر بڑے کی اطاعت، غرضیکہ جن جن کاموں میں اطاعت کرنی ہے ﴿قٰنِتِیْنَ﴾ سب کو شامل ہے۔

﴿وَالْمُنْفِقِیْنَ﴾ اور اپنے مال خرچ کرتے ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی رجا کے لیے زکوٰۃ ادا کرتے ہیں، عشر نکالتے ہیں، فطرانہ ادا کرتے ہیں اور قربانی بھی کرتے ہیں۔ ﴿وَالْمُسْتَغْفِرِیْنَ بِالْاَسْحَارِ﴾ اور معافی مانگنے والے ہیں اللہ تعالیٰ سے سحری کے وقت۔ یہ بات یاد رکھیں کہ اللہ تعالیٰ ہر وقت ہر ایک کی سنتا ہے، وقت کی کوئی پابندی نہیں ہے مگر بعض اوقات ایسے ہوتے ہیں کہ ان میں دعا زیادہ اثر رکھتی ہے۔ جیسے: سحری کا وقت کہ رات کا جب تیسرا حصہ رہ جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی طرف خصوصی توجہ فرماتے ہیں ھَلْ مِنْ مُّسْتَغْفِرٍ ؟ کہ ہے کوئی بخشش طلب کرنے والا کہ میں اس کو بخش دوں ھَلْ مِنْ مُّسْتَرْزِقٍ اَرْزُقُہٗ ہے کوئی رزق طلب کرنے والا کہ میں اس کو رزق دوں ھَلْ مِنْ کَذَا ؟ ھَلْ مِنْ کَذَا؟ تو سحری کے وقت د استغفار زیادہ اثر رکھنے والے ہیں۔

﴿شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ﴾ اللہ تعالیٰ گواہی دیتا ہے کہ بے شک نہیں ہے کوئی معبود مگر وہی۔ کوئی معبود نہیں ہے، و مشکل کشا نہیں ہے، کوئی خالق، کوئی مالک نہیں ہے، کوئی رازق نہیں ہے، کوئی مُقَنِّن، قانون بنانے والا نہیں ہے۔ کوئی نذر و نیاز کے لائق نہیں ہے۔ ﴿وَالْمَلٰٓئِكَةُ﴾ اور فرشتوں بھی گواہی دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں ہے ﴿وَاُولُوا الْعِلْمِ﴾ اور علم والے بھی گواہی دیتے ہیں۔ علم والوں میں سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کے پیغمبر علیہم السلام ہیں، پھر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، پھر تابعین اور پھر تبع تابعین رحمہم اللہ ہیں، پھر ائمہ دین، فقہائے کرام اور محدثین عظام ہیں (رحمہم اللہ)۔ یہ سب گواہی دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا عبادت کے لائق اور کوئی نہیں۔

﴿قَآئِمًۢا بِالْقِسْطِ﴾ یہ سب عدل وانصاف پر قائم ہیں اور ان کی یہ شہادت بالکل حق ہے کہ ﴿لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ﴾ نہیں ہے کوئی الٰہ مگر وہی ﴿الْعَزِیْزُ﴾ غالب ذات ہے ﴿الْحَكِیْمُ﴾ حکمت والی ذات ہے۔

﴿اِنَّ الدِّیْنَ﴾ بے شک پسندیدہ دین ﴿عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ﴾ اللہ تعالیٰ کے ہاں ﴿وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِیْنَ﴾ اور نہیں اختلاف کیا ان لوگوں نے ﴿اُوْتُوا الْكِتٰبَ﴾ جن کو کتاب دی گئی ﴿اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ﴾ مگر بعد اس کے کہ ان کے پاس علم آچکا ﴿بَغْیًۢا بَیْنَهُمْ﴾ سرکشی کرتے ہوئے آپس میں ﴿وَمَنْ یَّكْفُرْ﴾ اور جو شخص انکار کرے گا ﴿بِاٰیٰتِ اللّٰهِ﴾ اللہ تعالیٰ کی آیات کا ﴿فَاِنَّ اللّٰهَ﴾ پس بے شک اللہ تعالیٰ ﴿سَرِیْعُ الْحِسَابِ﴾ جلدی حساب لینے والا ہے ﴿فَاِنْ حَآجُّوْكَ﴾ پس اگر یہ آپ سے جھگڑا کریں ﴿فَقُلْ﴾ پس آپ کہہ دیں ﴿اَسْلَمْتُ﴾ میں نے جھکا دیا ﴿وَجْهِیَ﴾ اپنا چہرہ ﴿لِلّٰهِ﴾ اللہ تعالیٰ کے سامنے ﴿وَمَنِ اتَّبَعَنِ﴾ اور انھوں نے بھی جنھوں نے میری پیروی کی ﴿وَقُلْ لِّلَّذِیْنَ﴾ اور کہہ دے ان لوگوں کو ﴿اُوْتُوا الْكِتٰبَ﴾ جن کو کتاب دی گئی ﴿وَالْاُمِّیّٖنَ﴾ اور ان پڑھ لوگوں کو بھی کہہ دو ﴿ءَاَسْلَمْتُمْ﴾ کیا تم مسلمان ہونا چاہتے ہو؟ ﴿فَاِنْ اَسْلَمُوْا﴾ پس اگر وہ ایمان لے آئیں ﴿فَقَدِ اهْتَدَوْا﴾ پس تحقیق انھوں نے ہدایت حاصل کر لی ﴿وَاِنْ تَوَلَّوْا﴾ اور اگر وہ اعراض کریں ﴿فَاِنَّمَا عَلَیْكَ الْبَلٰغُ﴾ پس پختہ بات ہے کہ تیرے ذمہ بات پہنچانا ہے ﴿وَاللّٰهُ بَصِیْرٌۢ بِالْعِبَادِ﴾ اور اللہ تعالیٰ دیکھنے والا ہے بندوں کو ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ﴾ بے شک وہ لوگ ﴿یَكْفُرُوْنَ﴾ جو انکار کرتے ہیں ﴿بِاٰیٰتِ اللّٰهِ﴾ اللہ تعالیٰ کی آیتوں کا ﴿وَیَقْتُلُوْنَ النَّبِیّٖنَ﴾ اور قتل کرتے ہیں پیغمبروں کو ﴿بِغَیْرِ حَقٍّ﴾ ناحق ﴿وَّیَقْتُلُوْنَ الَّذِیْنَ﴾ اور قتل کرتے ہیں ان لوگوں کو ﴿یَاْمُرُوْنَ بِالْقِسْطِ﴾ جو حکم کرتے ہیں انصاف کا ﴿مِنَ النَّاسِ﴾ لوگوں میں سے ﴿فَبَشِّرْهُمْ﴾ پس آپ ان کو خوش خبری سنا دیں ﴿بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ﴾ دردناک سزا کی ﴿اُولٰٓىِٕكَ﴾ وہ لوگ ہیں ﴿الَّذِیْنَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ﴾ کہ ضائع ہو چکے ان کے اعمال ﴿فِی الدُّنْیَا﴾ دنیا میں ﴿وَالْاٰخِرَةِ﴾ اور آخرت میں ﴿وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِیْنَ﴾ اور نہیں ہوں گے ان کے لیے مددگار۔

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ کا مفہوم

مفسرین کرام رحمہم اللہ ﴿اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ﴾ کا معنی کرتے ہیں بے شک پسندیدہ اور مقبول دین اللہ تعالیٰ کے ہاں اسلام ہے۔ کیوں کہ اسی پارے کے آخر میں آیت کریمہ آئے گی ﴿وَمَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْهُ﴾ "اور جو شخص اسلام کے سوا کسی اور دین کو طلب کرے گا پس اس سے وہ ہرگز قبول نہ کیا جائے گا۔" اس آیت کریمہ کی روشنی میں پسندیدہ اور مقبول ترجمہ کرتے ہیں کہ بے شک مقبول اور پسندیدہ دین اللہ تعالیٰ کے ہاں اسلام ہے۔ چھٹے پارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ﴿اَلْیَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِیْنَكُمْ﴾ [المائدۃ: ۳] "آج کے دن میں نے تمھارے لیے تمھارا دین مکمل کر دیا ہے۔" تو اس مکمل

کے مفہوم کو سامنے رکھتے ہوئے یہ ترجمہ بھی کرتے ہیں کہ بے شک مکمل دین اللہ تعالیٰ کے ہاں اسلام ہے۔ اور اس آیت کریمہ میں یہ جملہ بھی ہے ﴿وَرَضِیۡتُ لَکُمُ الۡاِسۡلَامَ دِیۡنًا﴾ "اور میں نے پسند کیا تمھارے واسطے اسلام کو دین۔" تو اس جملے کو سامنے رکھتے ہوئے یہ ترجمہ بھی کرتے ہیں: اِنَّ الدِّیۡنَ الۡمَرۡضِی "بے شک پسندیدہ دین اللہ تعالیٰ کے ہاں اسلام ہے۔"

تو ﴿اِنَّ الدِّیۡنَ عِنۡدَ اللّٰہِ الۡاِسۡلَامُ﴾ کا مفہوم بنے گا بے شک اللہ تعالیٰ کے ہاں پسندیدہ دین، مقبول دین اور کامل اور اکمل دین، نجات دینے والا دین اسلام ہے۔ اور یہ سب مفہوم صحیح ہیں۔

اب نجات صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کلمے میں ہے

یہاں ایک ضروری بات سمجھ لیں کہ اسلام کا لغوی معنیٰ ہے فرماں بردار ہونا، سر جھکا دینا۔ اس اعتبار سے اللہ تعالیٰ کے جتنے بھی پیغمبر تشریف لائے ہیں سب کے سب مسلمان تھے، فرماں بردار تھے۔ جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا ﴿اَسۡلَمۡتُ لِرَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ﴾ [البقرۃ: ۱۳۱] مگر اصطلاحی طور پر لقب اور علم کے طور پر اس دین کا نام اسلام ہے۔ اس کو اس طرح سمجھو کہ لغوی طور پر سب اللہ تعالیٰ کے بندے ہیں مگر اصطلاح کے اعتبار سے وہ ہے جس کا نام عبد اللہ ہے۔ تو اصطلاحی طور اب اس دین کا نام اسلام ہے اور اب نجات صرف دین اسلام میں ہے اور حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کلمے میں ہے۔ کسی اور کے کلمے میں نجات نہیں ہے۔ بے شک اپنے اپنے دور میں سارے پیغمبر برحق تھے اور اُس وقت اُن کا کلمہ حق تھا۔ مثلاً:

حضرت آدم علیہ السلام کا کلمہ تھا لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ اٰدَمُ صَفِیُّ اللّٰہِ، حضرت نوح علیہ السلام کا کلمہ تھا لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ نُوۡحٌ نَجِیُّ اللّٰہِ، اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کا کلمہ تھا لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ اِبۡرَاھِیۡمُ خَلِیۡلُ اللّٰہِ، حضرت داؤد علیہ السلام کا کلمہ تھا لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ دَاوٗدُ خَلِیۡفَۃُ اللّٰہِ، حضرت موسیٰ علیہ السلام کا کلمہ تھا لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُوۡسٰی کَلِیۡمُ اللّٰہِ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا کلمہ تھا لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ عِیۡسٰی رُوۡحُ اللّٰہِ۔ اور جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو کلمہ ہے لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوۡلُ اللّٰہِ۔ اور اب نجات اسی کلمہ میں ہے۔

اہل کتاب کے اختلاف کی حقیقت

مگر اہل کتاب نے اس میں اختلاف کیا۔ آگے اللہ تعالیٰ نے ان کے اختلاف کی حقیقت بیان فرمائی ہے ﴿وَمَا اخۡتَلَفَ الَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡکِتٰبَ﴾ اور نہیں اختلاف کیا ان لوگوں نے جن کو کتاب دی گئی۔ یعنی تورات، انجیل، زبور وغیرہ۔ ﴿اِلَّا مِنۡۢ بَعۡدِ مَا جَآءَھُمُ الۡعِلۡمُ﴾ مگر بعد اس کے کہ ان کے پاس علم آ گیا۔ یعنی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق تمام نشانیاں معلوم کرنے کے باوجود آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی ماننے پر تیار نہ ہوئے۔ کیوں؟ ﴿بَغۡیًۢا بَیۡنَھُمۡ﴾ سرکشی کرتے ہوئے آپس میں۔ یعنی کم علمی اور غلط فہمی نہ تھی بلکہ دیدہ دانستہ طور پر ایمان نہیں لائے اور آخری پیغمبر اور کتاب کے ساتھ اختلاف کیا اور اس کا دنیا میں کوئی علاج نہیں ہے۔ کیوں کہ غلط فہمی تو دور ہو سکتی ہے مگر ضد کا کوئی علاج نہیں ہے۔ تو انھوں نے سرکشی کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی آیات کا انکار کیا۔

﴿وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ﴾ اور جو شخص انکار کرے گا اللہ تعالیٰ کی آیات کا تو وہ یاد رکھے ﴿فَاِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ﴾ پس بے شک اللہ تعالیٰ جلدی حساب لینے والا ہے۔

آنحضرت ﷺ کے پیروکار قیامت تک رہیں گے

﴿فَاِنْ حَآجُّوْكَ﴾ پس یہ لوگ اگر آپ سے جھگڑا کریں ﴿فَقُلْ﴾ تو آپ کہہ دیں ﴿اَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلّٰهِ﴾ میں نے جھکا دیا اپنا چہرہ اللہ تعالیٰ کے سامنے۔ اب یہ پیشانی کسی اور سامنے نہیں جھکے گی اور جس طرح میں رب تعالیٰ کا فرماں بردار ہوں ﴿وَمَنِ اتَّبَعَنِ﴾ اور وہ جو میری پیروی کرنے والے ہیں وہ بھی مسلمان ہیں۔ یعنی انھوں نے بھی اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کا تابع بنا لیا ہے، وہ بھی اللہ تعالیٰ کے فرماں بردار ہیں۔

اور ﴿وَمَنِ اتَّبَعَنِ﴾ میں سب سے مقدم حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں پھر تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور قیامت تک جتنے بھی آپ ﷺ پر ایمان لائیں گے وہ سب آپ ﷺ کے پیروکار ہیں۔ یعنی جو بھی آپ ﷺ کا کلمہ پڑھتا ہے، پڑھے گا، آپ ﷺ کے دین پر چلتا ہے یا چلتا رہے گا، وہ سب آپ ﷺ کے پیروکاروں میں داخل ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ان بزرگوں جیسا اخلاص بعد میں پیدا نہیں ہوسکتا۔ کیوں کہ اصل، اصل ہوتی اور نقل، نقل ہوتی ہے۔ مگر بہر حال آپ ﷺ کی پیروی کرنے والے قیامت تک رہیں گے (ان شاء اللہ تعالیٰ)۔

آنحضرت ﷺ کا فرمان ہے: ((لَا تَزَالُ طَائِفَةٌ مِّنْ اُمَّتِيْ ظَاهِرِيْنَ عَلَى الْحَقِّ)). "میری امت میں سے ایک گروہ حق پر ڈٹا رہے گا ﴿لَا يَضُرُّهُمْ مَنْ خَالَفَهُمْ﴾ جو ان کی مخالفت کرے گا وہ ان کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکے گا۔" یعنی آپ ﷺ کی امت میں سے ایک جماعت (ساری امت نہیں) قیامت تک حق پر ڈٹی رہے گی اور جو صحیح اسلام ہے اس کی قولی اور عملی طور پر حفاظت کرے گی۔

﴿وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ﴾ اور آپ ﷺ کہہ دیں ان لوگوں کو جن کو کتاب دی گئی یعنی یہود و نصاریٰ کو۔ کیوں کہ اُس وقت مدینہ طیبہ میں اکثریت یہودیوں کی تھی۔ تجارت پر ان کا قبضہ تھا، علم میں وہ بہت آگے تھے، ان کے قلعے بڑے مضبوط تھے، طاقت بہت زیادہ تھی، جنگی کارروائیوں میں بھی بہت ماہر تھے۔ عیسائی بھی تھے مگر بہت تھوڑے۔ سکہ یہود کا ہی چلتا تھا۔ یہ بات ان کے تصور میں بھی نہیں تھی کہ ہمیں کوئی اپنے علاقے سے نکالے گا یا ہم یہاں سے نکلیں گے۔

یہودِ مدینہ کے ساتھ میثاقِ امن

آنحضرت ﷺ مدینہ طیبہ تشریف لے گئے تو ان کے ساتھ تحریری معاہدہ ہوا کہ اَنْتُمْ وَنَحْنُ قَوْمٌ عَلٰی مَنْ سِوَانَا۔ اگر بیرونی مقابلہ ہوا تو ہم سب مل کر مقابلہ کریں گے۔ اپنے اپنے مذہب پر چلتے ہوئے۔ لیکن یہودوں کو چوں کہ اپنی افرادی قوت اور مالی برتری پر بڑا گھمنڈ تھا انھوں نے کسی تحریر کی کوئی پروانہ کی اور شرارتیں شروع کر دیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے

آپ ﷺ کو اور حق والوں کو جہاد کا حکم دیا تو پھر حق والوں کا مقابلہ نہ کر سکے۔ بنونضیر اور بنوقینقاع جلاوطن کیے گئے اور تیسرے خاندان بنوقریظہ کا صفایا کر دیا۔ اور اس سے پہلے ان کو اسلام کی دعوت دی گئی کہ اسلام قبول کرلو اسی میں تمھاری بھلائی ہے۔

﴿وَقُلْ لِلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ﴾ اور کہہ دے ان لوگوں کو جن کو کتاب دی گئی ﴿وَالْاُمِّيّٖنَ﴾ اور عرب کے اَن پڑھ لوگوں کو بھی کہہ دو جو مشرک تھے اور اکثریت ان کی اَن پڑھ تھی۔ ان میں پڑھے لکھے نسبتاً بہت کم تھے۔ تو فرمایا کہ ان کو دعوت دیں ﴿ءَاَسْلَمْتُمْ﴾ کیا تم اسلام میں داخل ہونا چاہتے ہو؟ ﴿فَاِنْ اَسْلَمُوْا﴾ پس اگر وہ لوگ اسلام لے آئیں ﴿فَقَدِ اهْتَدَوْا﴾ پس تحقیق انھوں نے ہدایت حاصل کرلی ﴿وَاِنْ تَوَلَّوْا﴾ اور اگر وہ اعراض کریں، روگردانی کریں، نہ مانیں ﴿فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ﴾ پس پختہ بات ہے کہ تیرے ذمہ بات پہنچانا ہے تسلیم کرانا تمھارے ذمہ نہیں ہے۔

ہادی ہونے کا مطلب

اور یاد رکھنا! اللہ تعالیٰ کے جتنے بھی پیغمبر تشریف لائے ہیں ان کا کام تھا حق بات کو لوگوں تک پہنچانا، سمجھانا۔ یہ اختیار اللہ تعالیٰ نے کسی پیغمبر کو نہیں دیا کہ لوگوں کے دلوں سے کفر و شرک کو نکال کر ایمان بھر دیں۔ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ﴾ [القصص:۵۶] "اے نبی کریم ﷺ! آپ بھی ہدایت نہیں دے سکتے اس کو جس سے آپ کو محبت ہے اور لیکن اللہ تعالیٰ ہدایت دیتا ہے جس کو چاہتا ہے۔" تم ہادی اس معنیٰ میں ہو کہ لوگوں کو راستہ بتاؤ، ان کی راہنمائی کرو۔ اس معنیٰ میں ہادی نہیں ہو کہ کفر و شرک دلوں سے نکال کر ایمان کی دولت بھر دو۔ ﴿وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ﴾ اور اللہ تعالیٰ بہ خوبی دیکھتا ہے بندوں کو وہ خود ان سے نمٹ لے گا۔

آگے اللہ تعالیٰ نے ایک واقعہ بیان فرمایا ہے۔ اس سے پہلے ایک ضروری وضاحت سمجھ لیں۔ وہ یہ کہ حضرت محمد ﷺ کی بعثت کل کائنات کے لیے ہے۔ آپ ﷺ تمام قوموں کے نبی اور رسول ہیں۔ کیا عربی اور کیا عجمی، کیا گورے اور کیا کالے۔ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ﴿يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا﴾ [الاعراف:۱۵۸] "اے نبی کریم ﷺ! آپ اعلان فرما دیں اے انسانو! میں اللہ تعالیٰ کا رسول ہوں تم سب کی طرف۔" بلکہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ((بُعِثْتُ اِلَى الْاَسْوَدِ وَالْاَحْمَرِ)) "مجھے رب تعالیٰ نے جنوں اور انسانوں، کالے اور گورے، سب کے لیے پیغمبر بنا کر بھیجا ہے۔" اور قرآن پاک میں دوسرے مقام پر آتا ہے ﴿لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا﴾ تمام جہانوں کے واسطے نبی بنا کر بھیجا ہے۔ تو آنحضرت ﷺ کی بعثت تمام کائنات کے لیے ہے

تینتالیس پیغمبروں کی شہادت

پہلے زمانوں میں ہر قوم کا الگ نبی ہوتا تھا۔ چنانچہ حضرت ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ جو عشرہ مبشرہ میں سے ایک صحابی

ہیں۔ آنحضرت ﷺ نے ان کو ((اَمِیْنُ ھٰذِہِ الْاُمَّۃِ)) کا لقب عطا فرمایا ہے کہ اس امت کے تمام افراد میں سے سب سے زیادہ امین ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دورِ حکومت میں تمام اسلامی فوجوں کے سپہ سالار یعنی چیف کمانڈر تھے۔ وہ روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ایک بڑا وسیع علاقہ تھا جہاں تینتالیس [۴۳] قومیں آباد تھیں اور ہر قوم کا اپنا الگ پیغمبر تھا۔ لیکن قومیں بڑی نافرمان تھیں۔ اُس علاقے کے سارے لوگوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ ان پیغمبروں نے ہمارے کان کھا لیے ہیں۔ دن کو تبلیغ، رات کو تبلیغ، گھروں میں تبلیغ، بازاروں میں تبلیغ، نہ خوشی کا موقع چھوڑتے ہیں نہ غمی کا، ہر جگہ پہنچ جاتے ہیں۔ اور ان کی ایک صدا ہوتی ہے ﴿یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰہَ مَا لَکُمْ مِّنْ اِلٰہٍ غَیْرُہٗ﴾ "اے میری قوم! عبادت کرو اللہ تعالیٰ کی اس کے سوا عبادت کے لائق کوئی نہیں ہے۔" لہٰذا ان سے خلاصی حاصل کرو۔ چنانچہ ہر قوم کے بدمعاش اور غنڈے اکٹھے ہوئے اور انھوں نے ایک دن میں تینتالیس [۴۳] پیغمبروں کو شہید کر دیا۔ اور ان پیغمبروں کی نصرت اور امداد کے لیے ایک سو ستر [۱۷۰] آدمی جان ہتھیلی پر رکھ کر نکلے تو ان کو بھی شہید کر دیا۔ ان کا ذکر ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْفُرُوْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰہِ﴾ بے شک وہ لوگ جو انکار کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کی آیتوں کا ﴿وَیَقْتُلُوْنَ النَّبِیّٖنَ بِغَیْرِ حَقٍّ﴾ اور قتل کرتے ہیں نبیوں کو ناحق۔

قتل حق کی تین صورتیں

کیوں کہ قتل بالحق کی اسلام میں تین صورتیں ہیں اور اللہ تعالیٰ کے پیغمبران تینوں صورتوں سے پاک اور منزہ تھے۔

قتل بالحق کی ایک صورت یہ ہے کہ العیاذ باللہ کوئی شخص اسلام قبول کرنے کے بعد مرتد ہو جائے تو اس کو تین دن کی مہلت دی جائے گی۔ تاکہ وہ اپنے شبہات پیش کر کے اپنی اصلاح کر کے توبہ کر لے۔ اگر تین دن میں اس کی اصلاح نہ ہوئی تو اس مرتد کو قتل کر دیا جائے گا۔ تو اللہ تعالیٰ کے پیغمبروں کے بارے میں اس چیز کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

قتل بالحق کی دوسری صورت یہ ہے کہ شادی شدہ مرد یا عورت زنا کرے تو اس کو سنگسار کر دیا جائے گا۔ اور اللہ تعالیٰ کے پیغمبروں کے بارے میں اس بدکاری کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اور قتل بالحق کی تیسری صورت یہ ہے کہ کوئی کسی کو ناحق قتل کر دے تو قاتل کو قصاص میں قتل کیا جائے گا۔ اور اللہ تعالیٰ کے کسی پیغمبر نے کسی کو قصداً و ارادۃً ناحق قتل نہیں کیا۔

لہٰذا ان ظالموں نے اللہ تعالیٰ کے پیغمبروں کو ناحق قتل کیا ﴿وَّیَقْتُلُوْنَ الَّذِیْنَ یَاْمُرُوْنَ بِالْقِسْطِ مِنَ النَّاسِ﴾ اور وہ قتل کرتے ہیں ان لوگوں کو جو حکم کرتے ہیں انصاف کا لوگوں میں سے۔ یعنی اتنے ظالم لوگ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے تینتالیس [۴۳] پیغمبروں کو بھی قتل کیا اور ان کے ایک سو ستر صحابیوں اور حواریوں کو بھی قتل کیا اور ان نیک اور مخلص حواریوں کو بھی معاف نہیں کیا۔ ﴿فَبَشِّرْھُمْ بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ﴾ پس آپ ان کو دردناک عذاب کی خوش خبری سنا دیں جنھوں نے اللہ تعالیٰ کے پیغمبروں اور ان کے حواریوں کو قتل کیا۔ یہ طنز ہے۔ ورنہ عذاب کی خوش خبری تو نہیں ہوتی۔ خوش خبری تو اچھی چیز کی ہوتی ہے۔ اور پھر عذاب بھی

معمولی نہیں بلکہ دردناک عذاب فرمایا۔

﴿اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ﴾ ان کے اعمال دنیا اور آخرت دونوں مقامات میں ضائع ہو گئے ہیں۔اعمال کے دنیا میں ضائع ہونے کا مطلب یہ ہے کہ قاتلینِ انبیاء میں وہ ظالم بھی تھے جو ان کا کلمہ پڑھتے تھے مگر خواہشاتِ نفسانی کا ان پر غلبہ تھا جس وجہ سے وہ اس گناہ میں شریک ہو گئے۔تو ان کے اعمال دنیا میں بھی اکارت ہو گئے کہ ان کا ذبح کیا ہوا حلال نہیں ہے اور ان کا نکاح بھی ٹوٹ گیا۔ان کو وراثت بھی نہیں مل سکتی وہ دوسرے وارثوں کے پاس رہے گی۔اور ان کا جنازہ بھی نہیں پڑھا جائے گا اور ان کو مسلمانوں کے قبرستان میں دفن بھی نہیں کیا جائے گا۔

یاد رکھیں! کہ اگر قادیانی اور رافضی جانور ذبح کریں تو ان کا ذبح کیا ہوا جانور حرام ہے۔کیوں کہ یہ بالکل کافر ہیں اور کافر کا ذبیحہ درست نہیں ہے۔

حضرت یحییٰ علیہ السلام کے قتل کا سبب

اب رہی یہ بات کہ اللہ کے نبی پر بھی ایمان رکھتا ہو اور قتل بھی کرے؟ تو تاریخ بتاتی ہے کہ حضرت یحییٰ علیہ السلام کے دور میں ایک بادشاہ تھا۔وہ حضرت یحییٰ علیہ السلام کا کلمہ پڑھنے والا تھا۔اس کی حقیقی بھانجی بڑی خوب صورت تھی۔اس نے کہا میں نے اس سے نکاح کرنا ہے۔حالاں کہ اس کے نکاح میں اور عورتیں بھی تھیں اور لونڈیاں بھی تھیں۔لوگوں نے اس کو بڑا سمجھایا کہ بھانجی کے ساتھ نکاح جائز نہیں ہے۔مگر وہ مصر تھا کہ میں نے نکاح کرنا ہی کرنا ہے۔حضرت یحییٰ علیہ السلام کو معلوم ہوا تو وہ خود تشریف لے گئے۔فرمایا میں نے سنا ہے کہ تو ایسی کارروائی کرنا چاہتا ہے۔یہ بات ٹھیک ہے یا خالی افواہ ہے؟ کہنے لگا تو جا کر اللہ، اللہ کر تجھے ایسے کاموں سے کیا تعلق؟ حضرت یحییٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ حق بات کہنا اور غلطی سے روکنا یہ بھی اللہ، اللہ کرنے کا حصہ ہے۔تو اس کو غصہ آ گیا اور یحییٰ علیہ السلام کو قتل کر دیا کہ تو کون ہوتا ہے مجھے وعظ و نصیحت کرنے والا؟ تو ایسے لوگوں کے اعمال دنیا میں بھی ضائع ہو جائیں گے اور آخرت کی خرابی الگ ہے۔

﴿وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِیْنَ﴾ اللہ تعالیٰ کی گرفت سے چھڑانے والا ان کا کوئی مددگار نہیں ہوگا۔رب تعالیٰ سے زیادہ طاقت ور کون ہے جو اس کی گرفت سے چھڑا سکے۔تو دنیا میں ایسے ظالم بھی گزرے ہیں جن کا ذکر اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں کیا ہے۔

﴿اَلَمْ تَرَ﴾ کیا نہیں دیکھا آپ نے ﴿اِلَى الَّذِیْنَ﴾ اُن لوگوں کی طرف ﴿اُوْتُوْا﴾ جن کو دیا گیا ﴿نَصِیْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ﴾ حصہ کتاب سے ﴿یُدْعَوْنَ﴾ ان کو بلایا جاتا ہے ﴿اِلٰى كِتٰبِ اللّٰهِ﴾ اللہ تعالیٰ کی کتاب کی طرف ﴿لِیَحْكُمَ بَیْنَهُمْ﴾ تاکہ وہ فیصلہ کرے ان کے درمیان ﴿ثُمَّ یَتَوَلّٰى﴾ پھر منہ پھیرتا ہے ﴿فَرِیْقٌ مِّنْهُمْ﴾ ان میں

سے ایک فریق ﴿ وَهُمۡ مُّعۡرِضُوۡنَ ﴾ اور وہ ہیں اعراض کرنے والے ﴿ ذٰلِكَ ﴾ یہ اس وجہ سے کہ ﴿ بِاَنَّهُمۡ قَالُوۡا ﴾ بے شک انھوں نے کہا ﴿ لَنۡ تَمَسَّنَا النَّارُ ﴾ ہر گز نہیں چھوئے گی ہمیں آگ ﴿ اِلَّاۤ اَيَّامًا مَّعۡدُوۡدٰتٍ ﴾ مگر چند دن گنے ہوئے ﴿ وَغَرَّهُمۡ ﴾ اور ان کو دھوکے میں ڈالا ﴿ فِىۡ دِيۡنِهِمۡ ﴾ ان کے دین کے بارے میں ﴿ مَّا كَانُوۡا يَفۡتَرُوۡنَ ﴾ اس چیز نے جو افترا باندھتے تھے ﴿ فَكَيۡفَ ﴾ پس کیسے ہوگا ﴿ اِذَا جَمَعۡنٰهُمۡ ﴾ جب ہم ان کو اکٹھا کریں گے ﴿ لِيَوۡمٍ ﴾ اس دن میں ﴿ لَّا رَيۡبَ فِيۡهِ ﴾ جس میں کوئی شک نہیں ہے ﴿ وَوُفِّيَتۡ ﴾ اور پورا پورا دیا جائے گا ﴿ كُلُّ نَفۡسٍ ﴾ ہر نفس کو ﴿ مَّا كَسَبَتۡ ﴾ جو اُس نے کمایا ﴿ وَهُمۡ لَا يُظۡلَمُوۡنَ ﴾ اور اُن پر ظلم نہیں کیا جائے گا ﴿ قُلِ اللّٰهُمَّ ﴾ کہہ دے اے اللہ! ﴿ مٰلِكَ الۡمُلۡكِ ﴾ جو بادشاہی کا مالک ہے ﴿ تُؤۡتِى الۡمُلۡكَ مَنۡ تَشَآءُ ﴾ تو دیتا ہے ملک جس کو چاہتا ہے ﴿ وَتَنۡزِعُ الۡمُلۡكَ مِمَّنۡ تَشَآءُ ﴾ اور چھین لیتا ہے ملک جس سے تو چاہتا ہے ﴿ وَتُعِزُّ مَنۡ تَشَآءُ ﴾ اور عزت دیتا ہے تو جس کو چاہے ﴿ وَتُذِلُّ مَنۡ تَشَآءُ ﴾ اور تو ذلیل کرتا ہے جسے چاہے ﴿ بِيَدِكَ الۡخَيۡرُ ﴾ تیرے ہاتھ میں ہے بھلائی ﴿ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ قَدِيۡرٌ ﴾ بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے۔

اللہ تعالیٰ کے احکام ٹالنے میں سب یہودی برابر ہیں

اس سے پہلی آیات میں یہود کا ذکر تھا کہ ان ظالموں نے پیغمبروں اور ان کے مخلص ساتھیوں کو شہید کیا۔ یہ پہلے یہودیوں کا حال تھا اور اب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں جو یہودی تھے ان کا ایک واقعہ ذکر کر کے سمجھایا جا رہا ہے کہ جس طرح پہلے یہودی اللہ تعالیٰ کے احکامات ٹالتے تھے اور اپنی مرضی کرتے تھے پچھلوں کا بھی وہی حال ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ خیبر میں ایک اونچے خاندان کے مرد اور اونچے خاندان کی ایک عورت نے زنا کا ارتکاب کیا اور دونوں شادی شدہ تھے۔ بڑوں نے اس معاملے کو دبا دیا مگر عوام نے شور مچایا کہ اگر ہم سے کوئی غلطی ہو جائے تو ہمیں کوئی نہیں چھوڑتا اور جب وڈیروں نے یہ کام کیا ہے تو اس پر پردہ ڈال دیا گیا ہے۔ اور عوام نے اس بات کو اتنا اچھالا کہ وڈیرے مشورہ کرنے پر مجبور ہو گئے۔

چنانچہ ان کے مذہبی اور سیاسی وڈیرے مل بیٹھے اور مشورہ کیا کہ تورات کے احکام کے مطابق تو دونوں کو رجم کرنا پڑے گا۔ کیوں کہ دونوں شادی شدہ ہیں۔ اور رجم نہیں کرنا کوئی تھوڑی سی سزا دے دی جائے تاکہ عوام کا منہ بند ہو جائے۔ اور کہنے لگے کہ آپس میں بیٹھے ہوئے ہیں اور یہ گھر کی بات ہے ہم سب جانتے ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ تعالیٰ کے سچے پیغمبر ہیں اور عوام کے سامنے تو ہم نہیں مانتے کہ وہ اس کا کلمہ نہ پڑھ لیں مگر ہے تو حقیقت۔ اور ان کی شریعت ہماری شریعت سے بڑی نرم ہے۔ لہٰذا عوام کا منہ بند کرنے کے لیے ہم ان سے فیصلہ کروا لیتے ہیں۔

چنانچہ اس مشورہ کے مطابق خیبر سے مدینہ طیبہ آئے۔ حالاں کہ مدینہ طیبہ خیبر سے دوسو میل دور ہے۔ مدینہ طیبہ پہنچ کر کچھ تو منافقوں کے گھروں میں ٹھہرے اور کچھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گئے اور کہا کہ ہم یہودی ہیں اور خیبر سے آئے ہیں۔ ہمیں وقت چاہیے۔ ہم نے تمھارے سامنے ایک مقدمہ پیش کرنا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ فلاں وقت آ جاؤ۔ مثال کے طور پر صبح دس بجے۔ چنانچہ اس بات کی خوب شہرت ہوئی کہ خیبر کے یہودیوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس صبح مقدمہ پیش کرنا ہے۔ یہودیوں کا ڈیرہ منافقوں کے ہاں تھا۔ انھوں نے پھر مشورہ کیا کہ اگر کوئی نرم سی سزا دیں تو لے لینا اور اگر رجم کا حکم کریں تو نہ لینا۔ کیوں کہ یہ تو ہماری کتاب میں بھی ہے۔

ابن صوریا کی خیانت

اس وقت تمام یہودیوں میں سب سے بڑا عالم عبداللہ بن صوریا تھا جو فدک کے مقام پر رہائش پذیر تھا۔ اور فدک خیبر سے تین میل کے فاصلے پر تھا۔ یہ ابن صوریا بھی اس وفد میں شامل تھا۔ یہ ایک آنکھ سے کانا تھا مگر تورات اور دوسری کتابوں کا بڑا ماہر تھا۔ صبح کو یہ یہودی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے کہ ہمارا فیصلہ کریں۔ بڑا مجمع تھا۔ یہودی بھی تھے، مومن بھی تھے، منافق بھی تھے، ہر طبقے کے لوگ موجود تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کیا فیصلہ کرنا ہے؟ کہنے لگے کہ ہم میں سے ایک عورت اور ایک مرد نے جو کہ شادی شدہ ہیں زنا کا ارتکاب کیا ہے۔ اس کی کیا سزا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس جرم کی سزا تمھاری کتاب میں نہیں ہے؟ کہنے لگے ہے تو سہی مگر کوئی واضح حکم نہیں ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تورات لے کر آؤ۔ تورات لے آئے اور ان کا جو بڑا مولوی تھا ابن صوریا، اس نے پڑھنی شروع کی مگر جہاں سزا کا حکم تھا وہ چھوڑ دیا اور اس سے پہلے اور بعد کا حصہ پڑھ دیا۔

مثال کے طور پر اس نے شروع کیا ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝﴾ اور درمیان کا حصہ ﴿مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۝﴾ کھا گیا۔ اس مجلس میں حضرت عبداللہ ابن سلام رضی اللہ عنہ بھی موجود تھے جو پہلے یہودیوں کے بڑے عالم اور پیر تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ایمان کی توفیق عطا فرمائی اور مسلمان ہو گئے تھے۔ یہ بھی تورات کے بڑے ماہر تھے۔ فرمانے لگے حضرت! كَذَبَ عَدُوُّ اللّٰهِ اللہ تعالیٰ کا دشمن غلط کاری سے کام لے رہا ہے۔ وہ آیات جن میں یہ حکم ہے ان کو کھا گیا ہے اور اس سے اگلی اور پچھلی آیتیں پڑھ دی ہیں۔ پھر کتاب تورات اس کے ہاتھ سے لے کر خود پڑھ کر سنائی تو اس میں بھی زنا کی سزا رجم ہی تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم نے میرے سامنے مقدمہ پیش کیا ہے اور اس جرم کی سزا تورات میں بھی رجم ہے اور میری شریعت میں بھی رجم ہے لہٰذا میں دونوں کے رجم کا فیصلہ کرتا ہوں۔ چنانچہ ان دونوں کو مدینہ طیبہ میں رجم کیا گیا۔

تو جب وہ مقدمہ لے کر آئے تھے ان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ تمھارے پاس اللہ تعالیٰ کی کتاب تورات

ہے اس کے مطابق فیصلہ کرلو۔ تو انھوں نے کہا تھا کہ اس کو چھوڑو تم ہمیں اپنی شریعت کے مطابق فیصلہ دو۔ اس کا ذکر ہے۔

﴿اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ﴾ کیا نہیں دیکھا آپ نے اُن لوگوں کی طرف جن کو دیا گیا حصہ کتاب سے ﴿يُدْعَوْنَ اِلٰى كِتٰبِ اللّٰهِ﴾ ان کو بلایا جاتا ہے اللہ تعالیٰ کی کتاب کی طرف کہ تورات بھی اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے اس پر فیصلہ کر لو ﴿لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ﴾ تاکہ وہ کتاب فیصلہ کردے ان کے درمیان ﴿ثُمَّ يَتَوَلّٰى فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ﴾ پھر منہ پھیرتا ہے ان میں سے ایک فریق ﴿وَهُمْ مُّعْرِضُوْنَ﴾ اور وہ ہیں اعراض کرنے والے۔ حالانکہ تورات ان کی مرکزی کتاب تھی مگر انھوں نے اس سے گریز کیا۔ کیوں کہ اس میں رجم کا حکم تھا۔ لیکن رجم سے بچ پھر بھی نہ سکے۔

جزا سزا کے متعلق یہود ونصاریٰ کا نظریہ

یہ جب واپس گئے تو لوگوں نے کہا کہ وہاں جانے کا کیا فائدہ ہوا؟ شرمندہ بھی ہوئے اور سزا بھی بھگتی۔ اس سے بہتر تھا کہ اپنی کتاب کے مطابق یہی فیصلہ کر لیتے۔ کیوں کہ عوام تو عوام ہی ہوتے ہیں چاہے کسی طبقے کے ہوں۔ وہ کب معاف کرتے ہیں۔ تو وڈیرے کہنے لگے کہ کوئی بات نہیں ہم گناہ کریں گے بھی تو سات دن یا چالیس دن دوزخ میں رہیں گے پھر نکل آئیں گے۔ بقول ان کے سات دن اس واسطے کہ دُنیا کی کل زندگی سات ہزار سال ہے۔ اور ہر ہزار سال کے بدلے میں ہم ایک دن دوزخ میں رہیں گے۔

اور چالیس دن کا نظریہ اس واسطے بنایا کہ ہمارے بڑوں نے چالیس دن بچھڑے کی پوجا کی تھی۔ لہٰذا اس جرم کی وجہ سے ہم چالیس دن دوزخ میں رہیں گے پھر باہر نکل آئیں گے۔ یہ عجیب بات ہے کہ بچھڑے کی پوجا وہ کریں اور سزا تم بھگتو۔ جرم کوئی کرے اور بھگتے کوئی۔

اور اس کے برعکس عیسائیوں نے یہ نظریہ اپنا لیا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام ہمارے منجی ہیں۔ وہ ہمارے طرف سے سولی پر لٹکا دیے گئے ہیں۔ وہ ہمارے گناہوں کا کفارہ ہو گئے ہیں۔ بھئی! عجیب بات ہے کہ گناہ تم کرو دو ہزار سال بعد اور وہ سولی پر لٹک جائیں دو ہزار سال پہلے۔ یہ کیسا مسئلہ ہوا؟ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں اس گندے عقیدے کی تردید فرمائی ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى﴾ [الانعام: ۱۶۴]

"کوئی کسی کا بوجھ نہیں اُٹھائے گا۔ ہر ایک نے اپنے کیے کا بھرنا ہے۔"

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میرے احکامات سے اس واسطے اعراض کرتے ہیں کہ ﴿ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا﴾ یہ اس وجہ سے کہ بے شک کہتے ہیں ﴿لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ﴾ ہرگز نہیں چھوئے گی ہمیں دوزخ کی آگ مگر چند دن گنے ہوئے کہ سات دن یا بعض کے نزدیک چالیس دن۔ اللہ تعالیٰ نے تردید فرمائی ہے۔ فرمایا ﴿وَغَرَّهُمْ فِيْ دِيْنِهِمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ﴾ اور ان

کودھوکے میں ڈالا ان کے دین کے بارے میں اس چیز نے جوافترا باندھتے تھے۔ یہ چالیس دن اور سات دن والا بھی افترا ہی تھا حقیقت کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ ﴿فَكَيْفَ إِذَا جَمَعْنٰهُمْ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيْهِ﴾ پس کیسے ہوگا جب ہم ان کو اکٹھا کریں گے اس دن میں جس میں کوئی شک نہیں ہے۔ یعنی قیامت کا دن کہ جس کے قائم ہونے میں کوئی شک نہیں ہے۔ ﴿وَوُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ﴾ اور پورا پورا دیا جائے گا ہر نفس کو جو اُس نے کمایا، نیکی یا بدی۔ ذرہ برابر کسی سے زیادتی نہیں ہوگی اور ذرہ برابر کسی کی نیکی میں کمی نہیں کی جائے گی ﴿وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ﴾ اور اُن پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔

یادرکھنا! قیامت مرنے کا نام ہے۔ جو مرا اس کی قیامت قائم ہوگئی۔ یہ جو درمیان والی زندگی ہے اس کو حوالات سمجھو کہ جو آدمی حوالات میں ہے وہ سرکاری تحویل میں ہے۔ آنکھیں بند ہونے کی دیر ہے ساری حقیقت سامنے آجائے گی۔ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہوجائے گا۔

غزوۂ بدر کے بعد ایک دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ طیبہ کے ایک بازار سے گزر رہے تھے اور یہ بازار یہود بنو قینقاع کا تھا۔ خاصا لمبا بازار تھا۔ دکان دار حضرات آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارد گرد جمع ہوگئے۔ اکثریت یہودیوں کی تھی۔ مسلمان بھی تھے اور عیسائی بھی تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہودیوں اور عیسائیوں کو وعظ کیا، نصیحت کی، اسلام کی دعوت دی مگر انھوں نے تسلیم نہ کیا۔ وہاں جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم موجود تھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں فرمایا کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے تمھیں غزوۂ بدر میں کامیابی عطا فرمائی ہے ایک وقت آئے گا کہ روم اور ایران بھی تمھارے قبضے میں ہوں گے۔

اس وقت بڑی حکومتیں دو ہی تھیں۔ ایک ایران، جس کے بادشاہ کا لقب کسریٰ ہوتا تھا۔ اور دوسری روم کی حکومت تھی۔ جس کے بادشاہ کا لقب قیصر ہوتا تھا۔ باقی سب ان دو کے ساتھ ملے ہوئے تھے۔ یہ خلیج فارس کی جتنی حکومتیں ہیں، ابوظہبی، مسقط، بحرین، دوحہ وغیرہ۔ یہ سب ایران کے ماتحت تھیں۔

تو جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک وقت آئے گا اللہ تعالیٰ تمھیں روم پر بھی فتح عطاء فرمائے گا اور ایران پر بھی۔ تو یہودیوں نے بھنگڑا ڈالا اور مذاق اُڑایا اور کہنے لگے اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)! تجھے مکہ مکرمہ کے ناتجربہ کار لوگوں پر کامیابی حاصل ہوئی ہے جو لڑائی کے فن کو نہیں جانتے تھے۔ اب تجھے ایران اور روم کے فتح کرنے کی خواہش ہورہی ہے۔ وہ بڑی منظم حکومتیں ہیں۔ اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ظاہری طور پر وہ بڑی منظم اور طاقت ور حکومتیں تھیں۔ صرف جنگ یرموک کو دیکھ لو جس کا آغاز حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دور میں ہوا اور اختتام حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں ہوا۔ اس جنگ میں مسلمانوں کی تعداد پینتالیس ہزار تھی اور مقابلہ میں رومیوں کی سات لاکھ فوج تھی۔ اس جنگ میں تین ہزار مسلمان شہید ہوئے اور ایک لاکھ تیس ہزار رومی مارے گئے اور باقی بھاگ گئے۔ تو اس سے اندازہ لگاؤ کہ کتنی منظم اور طاقت ور حکومتیں تھیں۔

اور عیسائیوں نے بھی ایک دوسرے سے کہا کہ تمھیں معلوم ہے کہ انھوں نے اب ایران اور روم کو فتح کرنا ہے۔ تو اس موقع پر یہ آیات نازل ہوئیں۔

قُلِ اللّٰھُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ کا شانِ نزول:

فرمایا﴿قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ﴾ آپ کہہ دیں اے اللہ! جو بادشاہی کا مالک ہے ﴿تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ﴾ تو دیتا ہے ملک جس کو چاہتا ہے ﴿وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ﴾ اور چھین لیتا ہے ملک جس سے تو چاہتا ہے۔ تو مالک ہے، تو رب ہے۔

دیکھو! ایک دفعہ گلیڈ اسٹون جو کہ برطانیہ کا وزیرِاعظم تھا اور اتنا سخت آدمی تھا کہ وہ اس کو مردِ آہن کہتے تھے، نے دارالعوام میں تقریر کی اور ہندوستانیوں کو ڈراتے ہوئے کہا کہ ہمارے ساتھ نہ ٹکرانا۔ ہمارے پاس اتنی قوت اور طاقت ہے کہ اگر آسمان بھی ہمارے اوپر گرنا چاہے تو ہم اسے سنگینوں کی نوکوں پر تھام لیں گے۔ لیکن اس کے کچھ عرصہ بعد حالات ایسے پیدا ہوئے کہ مجبوراً انہیں ہندوستان چھوڑنا پڑا، اگرچہ ان کا ارادہ نہ تھا۔ اور یہ برطانیہ کہ جس کی حکومت میں سورج نہیں ڈوبتا تھا بالآخر سمٹ کر جزیرے میں بند ہو کر رہ گیا ہے۔

اسی طرح ایران کے بادشاہ رضا شاہ پہلوی کا حال ہوا۔ وہ اس علاقے میں امریکہ کا تھانے دار تھا اور اس کے مفادات کا محافظ تھا۔ پاکستان بننے کے تقریباً دو تین سال بعد کا واقعہ ہے کہ ہمارے صحافیوں میں سے کسی نے یہ تحریر کیا کہ شاہِ ایران نے یہ کہا ہے۔ تو ایرانی سفارت کاروں نے اس صحافی کو نوٹس بھیجا اور یہ نوٹس باقاعدہ اخبارات میں چھپا کہ تم نے ہمارے بادشاہ کو شاہِ ایران لکھ کر اس کی توہین کی ہے۔ وہ شاہِ ایران نہیں ہے بلکہ شہنشاہِ ایران ہے۔ لہٰذا یا تو معذرت کرو اور اپنی غلطی کا اعتراف کرو یا مقدمہ کے لیے تیار ہو جاؤ۔ چنانچہ اخبارات والوں نے معافی مانگی کہ ہم سے غلطی ہوئی ہے ہم آئندہ شہنشاہِ ایران لکھیں گے۔

اور یاد رکھنا! پاکستان میں دو سفارت خانے بہت تیز ہیں۔ ایک امریکہ کا اور دوسرا ایران کا۔ اتنا تیز اور کسی ملک کا سفارت خانہ نہیں ہے۔ پھر وہ وقت بھی آیا کہ عوام اس کی مخالف ہو گئی اور قوم نے اس کو رد کر دیا اور وہ جہاز پر سوار ہو کر فرار ہو گیا۔ اس نے بہت سارے ملکوں سے اپنی جان کی بھیک مانگی کہ مجھے جہاز اُتارنے کی اجازت دے دو۔ مگر وہ جس ملک سے رابطہ کرتا وہ کہتا کہ ہم مجبور ہیں تمہیں اُترنے کی اجازت نہیں دے سکتے۔ بالآخر مصر پہنچا اور کہا کہ میرا پٹرول بالکل ختم ہے میں ہوا میں مر جاؤں گا مجھے اُترنے کی اجازت دے دو۔ تو مصر نے دل مضبوط کیا اور اس کو اترنے کی اجازت دی۔

تو ملک کا مالک اللہ تعالیٰ ہے جس کو چاہے دے اور جس سے چاہے چھین لے۔ رضا شاہ پہلوی کے بعد خمینی آیا۔ اس نے سب سے پہلے سنی علماء قتل کرائے اور سنیوں کی مسجدیں شہید کرائیں اور وہاں دوسری بلڈنگیں بنوا دیں۔ تہران میں پانچ لاکھ مسلمان ہیں مگر ایک بھی مسجد نہیں ہے۔ لوگ گھروں اور دفتروں میں نمازیں پڑھ لیتے ہیں اور عید کی نماز مسلمان ملکوں کے سفارت خانوں میں پڑھ کر اپنا شوق پورا کر لیتے ہیں۔ کچھ پاکستان کے سفارت خانے میں اور کچھ دوسرے مسلمان ملکوں کے سفارت خانوں میں۔ یہ سب قدرت رب تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔

عزت ذلت اللہ کے ہاتھ میں ہے

فرمایا ﴿وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ﴾ اور اے پروردگار! عزت دیتا ہے تو جس کو چاہے اور تو ذلیل کرتا ہے جسے چاہے ﴿بِيَدِكَ الْخَيْرُ﴾ تیرے ہاتھ میں ہے بھلائی ﴿إِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ﴾ بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے۔ جب یہ آیات نازل ہوئیں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ساتھیوں کو آگاہ فرمایا کہ میں ذاتی طور پر کچھ نہیں کہتا۔ میں نے تمھیں جو ایران اور روم کے فتح ہونے کی بشارت سنائی ہے یہ رب تعالیٰ نے فرمایا ہے اور اس کا حکم ہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں ایران مکمل فتح ہو گیا اور روم کا خاصہ حصہ فتح ہو گیا۔ کچھ حصہ بعد میں حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے دور میں فتح ہوا۔ اسی طرح افغانستان کا خاصہ علاقہ فتح ہو گیا اور وہ ساری کی ساری قوم ہی مسلمان ہو گئی۔

دُنیا میں تین قوموں کی نظیر نہیں ملتی

حضرت مولانا انور شاہ صاحب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ دنیا میں تین قوموں کی نظیر نہیں ملتی۔ ایک عرب کہ جب وہ مسلمان ہوئے پھر ان میں کوئی کافر نہیں رہا۔ دوسرے ترکی کہ جب وہ مسلمان ہوئے پھر ان میں کوئی کافر نہیں رہا۔ ترکی وہ ہے کہ خلافت ان کے پاس تھی، اسلام کا جھنڈا ان کے پاس تھا۔ اور تنہا ترکی نے سارے یورپ کو آگے لگائے رکھا۔ لیکن افسوس کہ آج وہاں اسلام کا نام نہیں لے سکتے۔ یہ وقت بھی آنا تھا۔

اور تیسرے افغانی ہیں کہ جب وہ مسلمان ہوئے تو پھر ان میں کوئی کافر نہیں رہا۔ افغانی بہت غیرت مند ہیں۔ ان کو روس نے اپنے قبضہ میں لیا۔

ہم بخاری شریف کا سبق پڑھ رہے تھے کہ حضرت حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کو کسی نے اخبار کا تراشا دیا کہ ظاہر شاہ نے روس کی پیش کش کو قبول کر لیا ہے۔ اور پیش کش یہ تھی کہ میں اپنے خرچے پر تمھارے کالجوں اور اسکولوں میں پروفیسر اور ماسٹر بھیجتا ہوں۔ یعنی ان کی تنخواہیں اور اخراجات میرے ذمہ ہیں تم قبول کر لو۔ اور پیش کش کا دوسرا حصہ یہ تھا کہ تم اپنے لڑکے ہمارے کالجوں میں بھیجو۔ ان کے بھی تمام اخراجات ہم برداشت کریں گے۔ حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ سبق پڑھاتے ہوئے رو پڑے اور فرمایا ظاہر شاہ تو نے بڑی نادانی کی ہے۔ وہاں سے جو معلم اور اساتذہ آئیں گے وہ کفر سکھائیں گے اور جو تمھارے بچے روس میں جا کر پڑھیں گے وہ کافر بن کر وہاں سے نکلیں گے۔

یقین جانو! حضرت نے جو فرمایا صحیح فرمایا۔ اس وقت یہ دوستم وغیرہ جتنے ہیں یہ سب ان کی پیداوار ہیں۔ وہ لوگ بڑی بصیرت والے تھے۔ ان بزرگوں نے جو کچھ فرمایا حقیقت ہے ہم نے آج تک اس کے خلاف ایک حرف بھی نہیں دیکھا۔ تو بہرحال اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے جو چاہے کرے۔ باقی کل ان شاء اللہ تعالیٰ

﴿تُوْلِجُ الَّیْلَ﴾ تو داخل کرتا ہے رات کو ﴿فِی النَّهَارِ﴾ دن میں ﴿وَتُوْلِجُ النَّهَارَ﴾ اور تو داخل کرتا ہے دن کو ﴿فِی الَّیْلِ﴾ رات میں ﴿وَتُخْرِجُ الْحَیَّ﴾ اور تو نکالتا ہے زندہ کو ﴿مِنَ الْمَیِّتِ﴾ مردہ سے ﴿وَتُخْرِجُ الْمَیِّتَ﴾ اور تو نکالتا ہے مردہ کو ﴿مِنَ الْحَیِّ﴾ زندہ سے ﴿وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَآءُ﴾ اور تو رزق دیتا ہے جس کو چاہے ﴿بِغَیْرِ حِسَابٍ﴾ بغیر حساب کے ﴿لَا یَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ﴾ اور نہ بنائیں مومن ﴿الْکٰفِرِیْنَ﴾ کافروں کو ﴿اَوْلِیَآءَ﴾ دوست ﴿مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِیْنَ﴾ سوائے مومنوں کے ﴿وَمَنْ یَّفْعَلْ ذٰلِكَ﴾ اور جس نے یہ کارروائی کی ﴿فَلَیْسَ مِنَ اللّٰهِ فِیْ شَیْءٍ﴾ پس نہیں ہے وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی شے میں ﴿اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً﴾ مگر یہ کہ ڈرو تم ان سے ڈرنا ﴿وَیُحَذِّرُکُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ﴾ اور اللہ تعالیٰ تمھیں ڈراتا ہے اپنی ذات سے ﴿وَاِلَى اللّٰهِ الْمَصِیْرُ﴾ اور اللہ تعالیٰ ہی کی طرف لوٹنا ہے ﴿قُلْ اِنْ تُخْفُوْا﴾ آپ کہہ دیں کہ اگر تم مخفی رکھو ﴿مَا فِیْ صُدُوْرِکُمْ﴾ جو کچھ تمھارے دلوں میں ہے ﴿اَوْ تُبْدُوْهُ﴾ یا تم اس کو ظاہر کرو ﴿یَعْلَمْهُ اللّٰهُ﴾ اللہ تعالیٰ اس کو جانتا ہے ﴿وَیَعْلَمُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ﴾ اور جانتا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے ﴿وَمَا فِی الْاَرْضِ﴾ اور جو کچھ زمین میں ہے ﴿وَاللّٰهُ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ﴾ اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے ﴿یَوْمَ تَجِدُ﴾ جس دن پائے گا ﴿کُلُّ نَفْسٍ﴾ ہر نفس ﴿مَّا عَمِلَتْ﴾ اس چیز کو جو اس نے عمل کیا ﴿مِنْ خَیْرٍ﴾ نیکی سے ﴿مُّحْضَرًا﴾ حاضر پائے گا ﴿وَّمَا عَمِلَتْ مِنْ سُوْٓءٍ﴾ اور جو اس نے عمل کیا برا اس کو بھی پائے گا ﴿تَوَدُّ لَوْ اَنَّ بَیْنَهَا﴾ وہ نفس پسند کرے گا اس بات کو کہ بے شک اس کے درمیان ﴿وَبَیْنَهٗٓ﴾ اور اس کی برائی کے درمیان ﴿اَمَدًۢا بَعِیْدًا﴾ مسافت ہو دور کی ﴿وَیُحَذِّرُکُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ﴾ اور اللہ تعالیٰ تمھیں ڈراتا ہے اپنی ذات سے ﴿وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ﴾ اور اللہ تعالیٰ شفقت کرنے والا ہے بندوں پر۔

اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانیاں

اس سے پہلے اس چیز کا ذکر تھا کہ ملک کا لینا اور دینا، عزت دینا، ذلیل کرنا، رب تعالیٰ کا کام ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ آگے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ رب تعالیٰ کی قدرت کا تم دن اور رات میں مشاہدہ کرتے ہو۔ ﴿تُوْلِجُ الَّیْلَ فِی النَّهَارِ وَتُوْلِجُ النَّهَارَ فِی الَّیْلِ﴾ تو داخل کرتا ہے رات کو دن میں اور تو داخل کرتا ہے دن کو رات میں۔ مثلاً: جون سے دن گھٹنا شروع ہو جاتا ہے۔ منٹوں کے حساب سے کم ہوتا چلا جائے گا اور رات بڑھتی جائے گی پھر دسمبر سے دن منٹوں کے حساب سے بڑھنا شروع ہو جائے گا اور رات کم ہونا شروع ہو جائے گی۔ تو جب دن بڑھتا ہے رات دن میں داخل ہو جاتی ہے اور جب رات بڑھتی ہے دن رات میں داخل ہو جاتا ہے۔ اور یہ دن رات کا گھٹنا بڑھنا سب کے مشاہدے میں ہے۔ تو وہ ذات جو دن رات کو

گھٹانے بڑھانے پر قادر ہے وہ ملک دینے اور لینے پر بھی قادر ہے۔

قدرت کی اور دلیل: ﴿وَتُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ﴾ اور اے پروردگار! تو نکالتا ہے زندہ کو مردہ سے۔ جیسے: نطفہ بے جان سے بچہ پیدا ہوتا ہے، مردہ انڈے سے چوزہ نکلتا ہے۔ اور حقیقی زندگی بھی مراد ہے کہ کافر سے مومن پیدا کرتا ہے۔ یعنی باپ کافر ہے بیٹا مسلمان ہو جاتا ہے۔ اور یہ حقیقی زندگی ہے۔ ﴿وَتُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ﴾ اور اے پروردگار! تو نکالتا ہے مردہ کو زندہ سے۔ جیسے: انسان زندہ ہے اس سے نطفہ نکلتا ہے۔ اسی طرح مرغی زندہ ہے اس سے انڈہ نکلتا ہے۔ اور حقیقی موت بھی مراد ہے کہ مومنوں سے کافر پیدا کرتا ہے۔ جیسے: حضرت نوح علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے پیغمبر ہیں اور پیغمبر سے بڑھ کر شان کسی کی نہیں ہوتی، مگر بیٹا کنعان کافر ہے۔ ایسے ہی بعض لوگ بڑے جاہل ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کی اولاد کو عالم بنا دیتا ہے۔ اور بعض عالم ہوتے ہیں اور اولاد بڑی جاہل ہوتی ہے۔ یہ سب معانی اس آیتِ کریمہ کے مفہوم میں داخل ہیں۔ یہ سب پروردگار کا نظام ہے جو ہم دیکھتے ہیں۔

وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ کا مطلب

﴿وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ﴾ اور تو رزق دیتا ہے جس کو چاہے بغیر حساب کے۔ مفسرِ قرآن علامہ ابو سعود رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ قرآن پاک میں ﴿بِغَيْرِ حِسَابٍ﴾ کا جملہ تین معنوں میں آیا ہے۔ ایک یہ کہ بے شمار یعنی حساب میں نہ آئے۔ جیسے: قارون اور اس کا نام منور تھا۔ اور یہ موسیٰ علیہ السلام کا چچازاد بھائی تھا لیکن تھا منافق۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو اتنا مال دیا تھا کہ خود اس کو معلوم نہیں تھا کہ میرے پاس کتنا مال ہے۔ کبھی کبھی حساب لگانے کے لیے بیٹھتا تھا اور حساب لگاتے لگاتے تھک جاتا تھا اور یہ کہہ کر چھوڑ دیتا تھا کہ جتنا ہے ہونے دو۔ یعنی اپنے مال کو شمار نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے خزانوں کی چابیاں اچھی خاصی جماعت بڑی مشکل سے اُٹھاتی تھی۔ تو ایک یہ معنیٰ ہے ﴿بِغَيْرِ حِسَابٍ﴾ کا یعنی بے شمار۔

اور دوسرا معنیٰ ہے بغیر مشقت اور تکلیف کے۔ یعنی تو رزق دیتا ہے جس کو چاہتا ہے بغیر مشقت اور تکلیف کے۔ دنیا میں ایسے لوگ بھی ہیں جو آرام سکون سے بیٹھے ہیں اور ان کو دولت وافر مقدار میں ملتی ہے۔ اور ایسے بھی ہیں کہ وہ اس قدر محنت کرتے ہیں، تکلیف میں پڑتے ہیں کہ بے چاروں کا خون پسینہ ایک ہو جاتا ہے مگر رات کو گھر کے افراد کی روٹی بھی پوری نہیں کر سکتے۔ یاد رکھو! دولت رب کے اختیار میں ہے۔ اور اگر محنت مشقت سے ملتی تو اس مزدور کو ملتی جو صبح سے شام تک پسینے میں ڈوبا ہوتا ہے۔ تو ایک معنیٰ ﴿بِغَيْرِ حِسَابٍ﴾ کا "بغیر مشقت" کا کرتے ہیں۔ جب وہ دینے پر آتا ہے تو بغیر محنت کے عطاء فرما دیتا ہے۔ حلال طریقے سے حاصل کرنا چاہیں تو حلال طریقے سے دیتا ہے اور حرام طریقے پر کمانا چاہیں تو حرام طریقے پر دیتا ہے۔ اور جس طریقے پر کماؤ گے اس کے مطابق حساب لے لے گا۔

حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ عشرہ مبشرہ میں سے ایک صحابی ہیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پھوپھی زاد بھائی ہیں۔

بخاری شریف کی روایت میں آتا ہے کہ جب وہ شہید ہوئے تو ان کے مال کا حساب لگایا گیا۔ جس میں زمین بھی تھی، مکانات بھی تھے۔ تو چھ کروڑ درہم مالیت بنی۔

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کی جائیداد وفات کے وقت

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ جب ہجرت کر کے مدینہ منورہ آئے تھے تو ان کے پاس سر چھپانے کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سعد ابن ربیع رضی اللہ عنہ کو بلا کر فرمایا کہ یہ ہمارا ساتھی ہے میں اس کو تمھارا بھائی بناتا ہوں۔ تم نے اس کا خرچہ برداشت کرنا ہے۔ حضرت سعد ابن ربیع انصاری رضی اللہ عنہ نے عرض کیا حضرت! ان شاء اللہ تعالیٰ! میں اس کو باقاعدہ اپنی جائیداد میں شریک کروں گا۔ چنانچہ انھوں نے رہنے کے لیے کمرہ بھی دیا اور روٹی بھی ان کے گھر سے آتی تھی۔ چند دن ان کے گھر سے کھاتے رہے۔ چوں کہ تاجر آدمی تھے تجارت شروع کر دی۔ تھوڑی مدت کے بعد شادی بھی کر لی۔ جب ان کی وفات ہوئی تو چار بیویاں تھیں۔

اور مسئلہ یہ ہے کہ اگر خاوند صاحبِ اولاد ہو چاہے ایک لڑکی ہی کیوں نہ ہو تو بیوی کو آٹھواں حصہ ملتا ہے۔ ایک بیوی ہو، چاہے دو بیویاں ہوں، تین ہوں، چاہے چار ہوں، سب آٹھویں حصے میں شریک ہوں گی۔

تو حضرت عبدالرحمٰن ابن عوف رضی اللہ عنہ کی وراثت کا آٹھواں حصہ جب چار بیویوں پر تقسیم کیا گیا تو ہر ایک بیوی کے حصے میں اَسّی [۸۰] اسّی [۸۰] ہزار دینار آئے۔ تو اس سے حساب لگالو کہ خزانہ کتنا ہوگا۔ اور وہ لوگ حلال طریقے سے کماتے تھے۔ تو شریعت میں کوئی پابندی نہیں ہے جتنی دولت اکٹھی کر و مگر ہو حلال طریقے سے اور خرچ بھی حلال طریقے سے ہو۔

اور ﴿بِغَیْرِ حِسَابٍ﴾ کا تیسرا معنیٰ کرتے ہیں کہ بغیر مطالبے کے دیتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کو فرمایا ﴿هٰذَا عَطَآؤُنَا﴾ یہ مال ہماری بخشش ہے ﴿فَامْنُنْ اَوْ اَمْسِكْ﴾ پس تو احسان کر یا رکھ چھوڑ ﴿بِغَیْرِ حِسَابٍ﴾ تیرے سے کوئی مطالبہ نہیں ہے۔

یہود و نصاریٰ سے دوستی جائز نہیں

آگے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جب تمھیں اس بات کا علم ہو گیا کہ یہود وغیرہ جو کافر ہیں ﴿یَقْتُلُوْنَ النَّبِیّٖنَ بِغَیْرِ حَقٍّ﴾ کہ یہ اللہ تعالیٰ کے پیارے پیغمبروں کو ناحق قتل کرتے ہیں ﴿الَّذِیْنَ یَاْمُرُوْنَ بِالْقِسْطِ﴾ اور ان کو بھی قتل کرتے ہیں جو انصاف کا حکم دیتے ہیں۔ تو پھر اے مومنو! تمھارے اندر غیرت ہونی چاہیے کہ ﴿لَا یَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْكٰفِرِیْنَ اَوْلِیَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِیْنَ﴾ اور نہ بنائیں مومن کافروں کو دوست سوائے مومنوں کے۔ یعنی ایمان والوں کی دوستی ایمان والوں سے ہونی چاہیے۔

مفسرین کرام رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ ایک ہوتی ہے محبت قلبی، جس کو موالات کہتے ہیں۔ یہ تعلق اور محبت کافروں کے ساتھ جائز نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے چھٹے پارے میں فرمایا ہے ﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْیَهُوْدَ وَ النَّصٰرٰۤى اَوْلِیَآءَ بَعْضُهُمْ

﴿اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۚ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ﴾ [المائدہ:۵۱] "اے ایمان والو! نہ بناؤ یہود ونصاریٰ کو دوست یہ ایک دوسرے کے دوست ہیں جو شخص ان کو دوست بنائے گا تم میں سے وہ بھی انہی میں سے ہوگا۔" یعنی اس کا شمار یہود ونصاریٰ میں سے ہوگا۔ اور اس سے اگلے رکوع میں فرمایا کہ یہود ونصاریٰ کو بھی دوست نہ بناؤ ﴿وَالْكُفَّارَ اَوْلِيَآءَ﴾ اور دوسرے کافروں کو بھی دوست نہ بناؤ۔

علماء کی حق گوئی پر سعودی حکومت کی سزا

لیکن سعودی شہزادوں کا حال دیکھو کہ اپنے بچاؤ اور ذاتی تحفظ کی خاطر ایک لاکھ کے قریب امریکی فوج اپنے علاقے میں بٹھائی ہوئی ہے اور اس کا سارا خرچہ برداشت کرتے ہیں۔ وہاں کے علمائے حق نے یہ آیتیں پڑھیں اور جمعوں میں تقریریں کیں کہ یہ ہمارا وہ ملک ہے جس میں قرآن پاک نازل ہوا ہے اور یہ اسلام کا منبع اور چشمہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہود ونصاریٰ کے ساتھ دوستی سے منع فرمایا ہے اور تم نے ان کو گھر لاکر بٹھایا ہے اور ان کا خرچہ بھی برداشت کرتے ہو۔

اور ان علماء نے یہ مطالبہ بھی کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خلافت کا سلسلہ رائج فرمایا تھا اور تم نے بادشاہت قائم کی ہوئی ہے کہ باپ مر گیا تو بیٹا بادشاہ، بیٹا مر گیا تو پوتا بادشاہ۔ اور خلافت یہ ہوتی ہے کہ ملک میں جو سب سے اچھا آدمی ہو وہ امیر ہے۔ اگر وہ مر جائے تو پھر ملک میں جو سب سے اچھا ہو وہ امیر ہوگا۔ تو اس مطالبے نے جلتی پر تیل کا کام کیا اور یہ الفاظ ان کو بہت چبھے کہ یہ تو ہمارے گریبان میں ہاتھ ڈال رہے ہیں۔ ان علمائے حق کو گرفتار کر لیا گیا۔ یہ سینکڑوں علمائے حق جن میں فقہاء، محدثین اور اہل اللہ بھی ہیں، جیلوں میں ڈال دیے گئے۔ جن میں سے بعض ابھی تک جیلوں میں ہیں۔ کسی کو دس سال ہو گئے ہیں، کسی کو چھ سال ہو گئے ہیں، کسی کو پانچ سال ہو گئے ہیں۔ کئی ایسے بھی ہیں کہ جن کا علم نہیں ہے کہ کہاں ہیں؟ حق کوئی بھی نہیں سنتا اور یہ سب کچھ انھوں نے اپنے بچاؤ کے لیے کیا ہے کہ ہمارا اقتدار نہ کوئی چھین لے۔ اللہ تعالیٰ برائی سے محفوظ فرمائے۔ یہ انسان سے ایمان بھی لے جاتی ہے۔

تو بہر حال موالات یعنی قلبی دوستی کافروں سے بالکل جائز نہیں ہے، ممنوع ہے۔ دوسری چیز مدارات ہے۔ مدارات کا معنیٰ ہے خوش اخلاقی کے ساتھ پیش آنا۔ مثلاً: کوئی کافر تمھارا مہمان ہے تو اس کے ساتھ خوش اخلاقی سے پیش آؤ۔ کیوں کہ مہمان کا حق ہے۔ یا کسی کافر کے مسلمان ہونے کی توقع ہے تو اس سے خوش اخلاقی سے پیش آؤ۔ یا کافر ظالم ہے، حاکم ہے، اس کے شر سے بچنے کے لیے اس کے ساتھ خوش اخلاقی سے پیش آؤ تو اس کی اجازت ہے۔ مگر نفع اور مالی مفاد حاصل کرنے کے لیے نہ ہو۔ اور دلی محبت بھی نہ ہو۔ صرف ظاہری طور پر خوش اخلاقی ہو تو ٹھیک ہے۔

کافر حربی نہ ہو تو اس کی مدد کر سکتے ہیں

اور تیسری چیز مواسات ہے۔ اور مواسات کا معنیٰ ہے مالی ہمدردی۔ تو کافروں کے ساتھ مالی ہمدردی کر سکتے ہیں یا نہیں؟ تو اس کا ضابطہ اللہ تعالیٰ نے سورۃ ممتحنہ کے اندر بیان فرمایا ہے ﴿لَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ﴾ اللہ تعالیٰ تمھیں منع نہیں کرتا ﴿عَنِ

﴿الَّذِیْنَ﴾ ان لوگوں سے ﴿لَمْ یُقَاتِلُوْكُمْ﴾ جو تمھارے ساتھ نہیں لڑے ﴿فِی الدِّیْنِ﴾ دین کے بارے میں ﴿وَلَمْ یُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِیَارِكُمْ﴾ اور نہ تمھیں تمھارے گھروں سے نکالا ﴿اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْۤا اِلَیْهِمْ﴾ [الممتحنہ:۸] "یہ کہ تم بھلائی کرو ان کے ساتھ اور ان کے ساتھ انصاف کا سلوک کرو۔" یعنی وہ کافر جو دین کے معاملے میں تم سے لڑے نہیں اور نہ ہی انھوں نے تمھیں گھروں سے نکالا ہے ان کے ساتھ تم مالی ہم دردی کر سکتے ہو۔ جیسے: جاپان اور چین ہیں کہ دوسرے ملکوں کی بہ نسبت انھوں نے کوئی زیادتی نہیں کی۔ البتہ اس وقت جو مسلمان چین میں ہیں، چیزن ان کے ساتھ زیادتیاں کر رہا ہے۔

اور وہ کافر جو دین کے معاملہ میں تمھارے ساتھ لڑیں۔ ان کے ساتھ مواسات یعنی مالی ہم دردی بھی جائز نہیں ہے۔ یہ قرآن پاک کا فیصلہ ہے۔

﴿وَمَنْ یَّفْعَلْ ذٰلِكَ﴾ اور جس نے یہ کارروائی کی۔ یعنی کافروں کے ساتھ قلبی محبت کا تعلق رکھا ﴿فَلَیْسَ مِنَ اللّٰهِ فِیْ شَیْءٍ﴾ پس نہیں ہے وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی شے میں۔ یعنی اللہ تعالیٰ اس کا کوئی عذر، کوئی بہانہ، کوئی دلیل نہیں سنے گا ﴿اِلَّاۤ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً﴾ مگر یہ کہ ڈرو تم ان سے ڈرنا۔ یعنی ایسے موقع پر تم ان کے ساتھ ظاہری خوش اخلاقی سے پیش آ سکتے ہو جب کہ تمھیں ان کی طرف سے ضرر کا اندیشہ ہو۔ لیکن فائدہ اُٹھانے کے لیے نہیں۔ ﴿وَیُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ﴾ اور اللہ تعالیٰ تمھیں ڈراتا ہے اپنی جان سے۔ اپنی جان سے ڈرانے کا مطلب یہ ہے کہ اپنے عذاب سے ڈراتا ہے کہ اگر نافرمانی کرو گے تو عذاب دے گا۔ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ اور اللہ تعالیٰ اس سے بروقت آگاہ کرتا ہے ورنہ خدا کی ذات تو بڑی مہربان اور شفیق ہے۔ ﴿وَاِلَى اللّٰهِ الْمَصِیْرُ﴾ اور اللہ تعالیٰ ہی کی طرف لوٹنا ہے۔ سب نے اللہ تعالیٰ کے پاس جانا ہے۔

﴿قُلْ اِنْ تُخْفُوْا مَا فِیْ صُدُوْرِكُمْ﴾ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کہہ دیں کہ اگر تم مخفی رکھو ان چیزوں کو جو بھی تمھارے دلوں میں ہیں۔ مثلاً: کافروں سے محبت وغیرہ ﴿اَوْ تُبْدُوْهُ﴾ یا تم اس کو ظاہر کرو ﴿یَعْلَمْهُ اللّٰهُ﴾ اللہ تعالیٰ اس کو جانتا ہے۔ معاملہ تمھارا اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہے۔ اس واسطے مومن کو سب سے پہلے رب کے حکم کی تکمیل کرنی چاہیے اور اللہ تعالیٰ کے جو احکام ہیں ان پر عمل کرنا چاہیے۔ باقی دنیا کی جو باتیں ہیں وہ بعد کی ہیں۔

فرمایا کیا پوچھتے ہو اللہ تعالیٰ کا علم؟ ﴿وَیَعْلَمُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ﴾ اور جانتا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے۔ سب کچھ اس کے علم میں ہے۔ ﴿لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ [الشوریٰ:۴۹] "آسمانوں اور زمینوں کی بادشاہی بھی اسی کی ہے۔" ﴿وَلِلّٰهِ غَیْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ [النحل:۷۷] "اور آسمانوں اور زمینوں کا غیب بھی اسی کے پاس ہے۔" اور آسمانوں اور زمینوں کا اختیار بھی اسی کے پاس ہے۔ اور زمینوں اور آسمانوں کا علم بھی اسی کے پاس ہے۔ ایک ذرہ بھی اس کے علم سے خارج نہیں ہے ﴿وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ﴾ اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔ وہ قادرِ مطلق ہے جو چاہے کر سکتا ہے۔

﴿یَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ﴾ جس دن پائے گا ہر نفس ﴿مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَیْرٍ مُّحْضَرًا﴾ اس چیز کو جو اس نے عمل کیا نیکی سے حاضر پائے گا۔ یعنی جو اس نے نیکی کی ہے قیامت والے دن اس کے سامنے آئے گی ﴿وَمَا عَمِلَتْ مِنْ سُوْٓءٍ﴾ اور جو اس نے عمل

کیا بُرا اس کو بھی سامنے پائے گا۔ دنیا میں ہمارے حافظے کمزور ہو جاتے ہیں۔ بہت سارے کام جو ہم نے کیے ہوئے ہیں مگر وہ بھول جاتے ہیں۔ لیکن قیامت والے دن اللہ تعالیٰ ہر ایک کے حافظے کو اتنا قوی کر دے گا کہ اس نے دنیا میں جو کچھ بھی کیا ہے سب یاد آ جائے گا۔

اور آج دنیا میں بہت سارے لوگ ایسے ہیں کہ پڑھنا لکھنا نہیں جانتے۔ مگر حدیث پاک میں آتا ہے کہ قیامت والے دن اللہ تعالیٰ سب کو پڑھنے کی توفیق عطاء فرمائیں گے اور نامہ اعمال ہر ایک کے ہاتھ میں پکڑائیں گے اور حکم ہوگا ﴿اِقْرَاْ كِتٰبَكَ ؕ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا﴾ [بنی اسرائیل: ۱۴] "اپنا نامہ اعمال خود پڑھ لے آج کے دن تمھارا اپنا نفس ہی محاسبے کے لیے کافی ہے۔" تو آدمی اپنا اعمال نامہ خود پڑھے گا اور بڑی روانی کے ساتھ پڑھے گا جس طرح اچھے خاصے تعلیم یافتہ پڑھتے ہیں۔ جب دو چار صفحے پڑھ چکے گا تو اللہ تعالیٰ فرمائیں گے بتا میرے فرشتوں نے لکھنے میں تیرے اُوپر کوئی زیادتی تو نہیں کی؟ کہے گا لَا يَا رَبِّ "اے میرے رب! کوئی زیادتی نہیں کی۔" جو میں نے نیکی بدی کی تھی وہی لکھی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے اچھا اور پڑھ۔ دو چار صفحے اور پڑھے گا۔ پھر اللہ تعالیٰ فرمائیں گے بتا میرے بندے! میرے فرشتوں نے لکھنے میں تیرے ساتھ ظلم تو نہیں کیا؟ وہ کہے گا نہیں پروردگار! کوئی ظلم نہیں کیا۔

تو بندہ جب اپنے بُرے اعمال دیکھے گا تو کہے گا ﴿تَوَدُّ لَوْ اَنَّ بَيْنَهَا وَبَيْنَهٗۤ اَمَدًۢا بَعِيْدًا﴾ وہ نفس پسند کرے گا اس بات کو کہ بے شک اس کے درمیان اور اس کے بُرے اعمال کے درمیان مسافت ہو دور کی۔ یعنی نفس یہ پسند کرے گا کہ میرے اور بُرے اعمال کے درمیان لمبا چوڑا فاصلہ ہو کہ یہ مجھے نظر نہ آئیں۔ مگر ہوگا کچھ بھی نہیں۔ یہ تو اس دن گلے کا ہار ہوگا۔

﴿وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ﴾ اور اللہ تعالیٰ تمھیں ڈراتا ہے اپنی ذات سے۔ یعنی اللہ تعالیٰ اپنی مخالفت اور عذاب سے تمھیں ڈراتا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے ڈر جاؤ۔ اور یہ ڈرانا بھی اس کا شفقت کی وجہ سے ہے کہ تم راہِ راست پر آ جاؤ۔ ﴿وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ﴾ اور اللہ تعالیٰ شفقت کرنے والا ہے بندوں پر۔ یہ اس کی شفقت کا نتیجہ ہے کہ اس نے تمھیں بروقت سب چیزیں بتا دیں اور ہر ایک کے انجام سے آگاہ کر دیا۔ تاکہ تم یہ نہ کہہ سکو کہ ہمیں معلوم نہیں تھا، ہم بے خبر تھے۔

﴿قُلْ﴾ آپ کہہ دیں ﴿اِنْ كُنْتُمْ﴾ اگر ہو تم ﴿تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ﴾ محبت کرتے اللہ تعالیٰ کے ساتھ ﴿فَاتَّبِعُوْنِيْ﴾ پس تم میری پیروی کرو ﴿يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ﴾ اللہ تعالیٰ تمھارے ساتھ محبت کرے گا ﴿وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ﴾ اور تمھارے گناہ معاف کر دے گا ﴿وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾ اور اللہ تعالیٰ بخشنے والا، مہربان ہے ﴿قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ﴾ آپ کہہ دیں اطاعت کرو اللہ تعالیٰ کی ﴿وَالرَّسُوْلَ﴾ اور رسول ﷺ کی ﴿فَاِنْ تَوَلَّوْا﴾ پس اگر یہ پھر جائیں اطاعت سے ﴿فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ﴾ پس بے شک اللہ تعالیٰ نہیں محبت کرتا کافروں سے ﴿اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰۤى﴾ بے

شک اللہ تعالیٰ نے چن لیا ﴿اٰدَمَ وَنُوْحًا﴾ آدم علیہ السلام کو اور نوح علیہ السلام کو ﴿وَّاٰلَ اِبْرٰهِيْمَ وَاٰلَ عِمْرٰنَ﴾ اور ابراہیم علیہ السلام کی اولاد کو اور عمران رحمہ اللہ کی اولاد کو ﴿عَلَى الْعٰلَمِيْنَ﴾ جہان والوں پر ﴿ذُرِّيَّةًۢ بَعْضُهَا مِنْۢ بَعْضٍ﴾ ان میں سے بعض، بعض کی اولاد ہیں ﴿وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ﴾ اور اللہ تعالیٰ سنتا ہے، جانتا ہے ﴿اِذْ قَالَتِ امْرَاَتُ عِمْرٰنَ﴾ جب کہا عمران (رحمہ اللہ) کی بیوی نے ﴿رَبِّ اِنِّيْ نَذَرْتُ لَكَ﴾ اے میرے رب! بے شک میں نے نذر مانی تیرے واسطے ﴿مَا فِيْ بَطْنِيْ﴾ جو کچھ میرے پیٹ میں ہے ﴿مُحَرَّرًا﴾ وہ تیرے لیے آزاد کر دیا جائے گا ﴿فَتَقَبَّلْ مِنِّيْ﴾ پس تو مجھ سے قبول فرما ﴿اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ﴾ بے شک تو ہی سننے والا جاننے والا ہے ﴿فَلَمَّا وَضَعَتْهَا﴾ پس جب اس نے جنا اس کو ﴿قَالَتْ رَبِّ﴾ کہنے لگی اے میرے رب! ﴿اِنِّيْ وَضَعْتُهَآ اُنْثٰى﴾ بے شک میں نے جنی ہے لڑکی ﴿وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ﴾ اور اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے جو اس نے جنا ہے ﴿وَلَيْسَ الذَّكَرُ كَالْاُنْثٰى﴾ اور نہیں ہے وہ معہود لڑکا اس لڑکی کی طرح ﴿وَاِنِّيْ سَمَّيْتُهَا مَرْيَمَ﴾ اور بے شک میں نے اس کا نام رکھا ہے مریم ﴿وَاِنِّيْٓ اُعِيْذُهَا بِكَ﴾ اور بے شک میں اس کو تیری پناہ میں دیتی ہوں ﴿وَذُرِّيَّتَهَا مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ﴾ اور اس کی اولاد کو، اس شیطان سے جو مردود ہے۔

دُنیا میں دو قسم کے لوگ موجود ہیں ؟

دنیا میں دو قسم کے لوگ موجود ہیں۔

- ایک وہ ہیں جو اللہ تعالیٰ کے وجود کے قائل ہیں۔ یعنی رب تعالیٰ کی ذات کو مانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہے۔ اگرچہ وہ مانتے اپنے اپنے انداز اور طریقے سے ہیں۔ مسلمانوں کے علاوہ یہود و نصاریٰ رب تعالیٰ کے وجود کے قائل ہیں۔ ہندو بھی رب تعالیٰ کے وجود کو مانتے ہیں۔
- نمبر دو ایسے بد بخت اور دہریہ قسم کے لوگ بھی موجود ہیں جو کہتے ہیں کہ رب نہیں ہے۔ وہ رب تعالیٰ کے وجود کے منکر ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم نے دور بین اور خورد بین کے ذریعہ دیکھ لیا ہے۔ بلکہ ایسے آلات ایجاد ہو چکے ہیں کہ جن کے ذریعے پانی جو ہم پیتے ہیں اس میں اور دودھ میں بے شمار جراثیم ہوتے ہیں، وہ نظر آتے ہیں۔ اسی طرح خون میں جراثیم ہوتے ہیں۔ یہ سب ہم نے دیکھ لیے ہیں مگر تمھارا خدا ہمیں نظر نہیں آیا۔ اگر ہے تو بتاؤ کہاں ہے؟ ایسے بد بخت بھی موجود ہیں۔

روس نے خدا اور مذہب کا جنازہ نکالا ؟

غالباً ۱۹۳۷ء۔ ۱۹۳۸ء کا واقعہ ہے کہ جب روس اپنی بے دینی کے پورے عروج پر تھا اور اس نے آس پاس کے

بڑے علاقوں پر قبضہ کیا۔ مسلمانوں کو بڑی بے دردی کے ساتھ شہید کیا۔ اور بہت کچھ کیا۔ تو روس کے جو بے دین قسم کے لوگ تھے انھوں نے دو مصنوعی جنازے تیار کیے۔ ایک چارپائی پر کچھ مصنوعی سی چیزیں اور اُو پر پھول ڈالے ہوئے تھے کہ یہ خدا کا جنازہ ہے۔ اور دوسرا جنازہ مذہب کا تھا۔ ڈھول باجوں کی تھاپ کے ساتھ بھنگڑا ڈالتے ہوئے یہ جنازے ملکی سرحد پر لے گئے اور بڑی بے قدری کے ساتھ لاتوں کے ذریعے سرحد سے باہر دھکیل دیے اور کہا کہ ہم نے اپنے ملک سے مذہب اور خدا کو باہر دھکیل دیا ہے۔ کیوں کہ جھگڑوں کی بنیاد یہی دو چیزیں ہیں۔ یہ باقاعدہ اخبار میں آیا تھا مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ اور وہ حضرات جو میری عمر کے ہیں ان کو بھی یاد ہوگا۔

اللہ تعالیٰ کی شان کہ تھوڑا وقت گزرا تھا کہ ہٹلر نے حملہ کر دیا۔ ہٹلر یہود کو سمجھ گیا تھا کہ یہ سازشی قوم ہے اور دنیا میں جتنے فساد ہیں سب یہودیوں کی وجہ سے ہیں۔ اور جتنے مالی وسائل ہیں وہ سب ان کے پاس ہیں۔ اور بڑے پالیسی باز ہیں۔ اور بہت کچھ کرتے ہیں مگر کھل کر سامنے نہیں آتے۔ سب خبیث ہیں۔ اندرونِ خانہ سازشوں کے ذریعے اپنا کام نکالتے ہیں۔

ہٹلر نے جب ان کو خوب مار پلائی تو پھر اس وقت روس کے صدر نے اعلان کیا کہ ہمارے ملک میں جو قومیں آباد ہیں وہ اپنے اپنے انداز میں رب تعالیٰ سے دعا کریں کہ اے پروردگار! ہمیں اس بلا سے چھٹکارا عطا فرما۔

تو انھوں نے اپنے خیال کے مطابق رب تعالیٰ کو نکال دیا تھا مگر خدا پھر آ گیا۔ بھائی! خدا جاتا کہاں ہے؟

اللہ کی محبت آخری پیغمبر کی اتباع میں ہے

تو بہر حال ایک وہ لوگ ہیں جو رب تعالیٰ کے وجود کے قائل ہیں۔ اور دوسرے وہ لوگ ہیں جو رب تعالیٰ کے وجود کے منکر ہیں۔ لیکن جو رب تعالیٰ کے وجود کے قائل ہیں ان میں سے ہر ایک یہ چاہتا ہے کہ رب تعالیٰ مجھ سے راضی ہو جائے۔ باقی رب تعالیٰ کو راضی کرنے کا انداز ہر ایک کا اپنا ہے۔ مگر یہ جذبہ سب میں موجود ہے۔

اللہ تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ کے ذریعے اعلان کروایا اور اپنے راضی ہونے کا طریقہ بتلایا۔ ﴿قُلْ﴾ آپ کہہ دیں ﴿اِنْ كُنْتُمْ﴾ اگر ہو تم ﴿تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ﴾ محبت کرتے اللہ تعالیٰ کے ساتھ ﴿فَاتَّبِعُوْنِيْ﴾ پس تم میری پیروی کرو۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت کرنے کا واحد طریقہ حضرت محمد ﷺ کی قولاً فعلاً اتباع ہے۔ آپ ﷺ نے جو فرمایا ہے اور جو عملی طور پر کیا ہے اس کے مطابق عمل کرے۔ آج اگر کوئی شخص آنحضرت ﷺ کی پیروی نہیں کرتا اور کہتا ہے کہ میری رب تعالیٰ کے ساتھ محبت ہے تو غلط کہتا ہے۔ کیوں کہ اللہ تعالیٰ کی محبت بند ہے ﴿فَاتَّبِعُوْنِيْ﴾ میں۔ اللہ تعالیٰ نے اعلان کروادیا کہ اللہ تعالیٰ کی محبت متصف ہے میری پیروی میں۔ اور جب تم میری پیروی کرو گے ﴿يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ﴾ اللہ تعالیٰ تمھارے ساتھ محبت کرے گا ﴿وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ﴾ اور تمھارے گناہ معاف کر دے گا۔ آنحضرت ﷺ کی پیروی کی برکت سے رب تعالیٰ کی محبت بھی حاصل ہوگی اور رب تعالیٰ تمھاری خطائیں اور گناہ معاف کر دے گا ﴿وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾ اور اللہ تعالیٰ بخشنے والا، مہربان ہے۔

بندہ ہر وقت اپنے آپ کو گناہ گار سمجھے اور رب تعالیٰ سے معافی مانگتا رہے۔ توبہ کا دروازہ ہر وقت کھلا ہے۔ یہ اس وقت بند ہوگا جب سورج مغرب سے طلوع ہوگا۔ اس کے بعد اگر کوئی شخص ایمان لائے گا تو قبول نہ ہوگا اور گناہوں سے توبہ کرے گا تو گناہ بھی معاف نہ ہوں گے۔

اس کے بعد فرمایا ﴿قُلْ اَطِیْعُوا اللّٰهَ﴾ اے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم! آپ کہہ دیں اطاعت کرو اللہ تعالیٰ کی یعنی اس کے حکم کو مانو ﴿وَالرَّسُوْلَ﴾ اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے جو فرمایا اور کیا ہے اس کو مانو اور اس پر عمل کرو ﴿فَاِنْ تَوَلَّوْا﴾ پس اگر یہ لوگ پھر جائیں اور روگردانی کریں اطاعت سے ﴿فَاِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْكٰفِرِیْنَ﴾ تو بے شک اللہ تعالیٰ نہیں محبت کرتا کافروں سے۔ یعنی جب یہ رب تعالیٰ سے محبت نہیں کرتے تو رب تعالیٰ کو کون سی مجبوری ہے کہ وہ ان سے محبت کرے۔ وہ بندوں کا محتاج نہیں ہے۔ اس کے ہاں کسی چیز کی کمی نہیں ہے۔ بندے رب کے محتاج ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی محبت کو اجاگر اور واضح کرنے کے لیے حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پیغمبر مبعوث فرمائے اور انھوں نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت کا طریقہ سمجھایا۔ سب سے پہلے پیغمبر آدم علیہ السلام ہیں۔ انھوں نے لوگوں کو بتایا کہ اس وقت میری شریعت کی پیروی کرو گے تو رب تعالیٰ تمھارے ساتھ محبت کرے گا۔ اس واسطے فرمایا ﴿اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰۤی اٰدَمَ﴾ بے شک اللہ تعالیٰ نے منتخب کیا آدم علیہ السلام کو۔ وہ اپنے دور میں رب تعالیٰ کی محبت کی طرف دعوت دیتے رہے۔ اس وقت ان کی شریعت سچی شریعت تھی اور اس پر چلنے سے ہی رب تعالیٰ کی رضا اور محبت حاصل ہوتی تھی۔

﴿وَنُوْحًا﴾ اور نوح علیہ السلام کو منتخب کیا۔ یعنی آدم علیہ السلام کے بعد نوح علیہ السلام آئے اور انھوں نے بھی اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت کا سبق پیش کیا کہ میرا کلمہ پڑھو اور میری اطاعت کرو پھر تمھیں اللہ تعالیٰ کی محبت حاصل ہوگی۔

آلِ ابراہیم کا ذکر

﴿وَاٰلَ اِبْرٰهِیْمَ﴾ اور ابراہیم علیہ السلام کی اولاد کو منتخب فرمایا۔ یعنی ابراہیم علیہ السلام اور ان کے اہل کو رب تعالیٰ نے اپنے تقرب کا ذریعہ بنایا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پانچ بیٹے تھے۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام، حضرت اسحاق علیہ السلام، حضرت مدین، حضرت مدائن اور حضرت قیدار رحمہم اللہ۔ ان میں حضرت اسماعیل اور حضرت اسحاق علیہما السلام تو اللہ تعالیٰ کے پیغمبر تھے اور دوسرے نیک فرزند تھے۔ ان سب سے آگے نسل چلی۔ تو ان کو بھی اللہ تعالیٰ نے چنا۔

حضرت مریم علیہا السلام کے خاندان کا ذکر

وَاٰلَ عِمْرٰنَ اور عمران رحمہ اللہ کی اولاد کو چنا۔ آلِ عمران سے کون مراد ہیں؟ بعض مفسرین کرام رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے والد ماجد کا نام تھا عمران بن قیس بن لاوی بن یعقوب علیہم السلام۔ تو آلِ عمران سے مراد موسیٰ علیہ السلام، ہارون علیہ السلام اور ان کی اولاد در اولاد ہے۔

لیکن اکثر مفسرین کرام رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ اس مقام پر جس عمران کا ذکر ہے یہ عمران بن ماثان رحمہ اللہ تعالیٰ ہیں۔ جو بڑے نیک پارسا بزرگ تھے اور مسجدِ اقصیٰ کے امام اور خطیب تھے اور لوگوں کی اخلاقی اور روحانی تربیت کرتے تھے، جو حضرت مریم علیہا السلام کے والد تھے، وہ مراد ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو بیٹا دیا تھا جس کا نام ہارون تھا۔ وہ بھی بڑا نیک پارسا تھا مگر جوانی میں ہی فوت ہوگیا تھا۔ حضرت عمران بن ماثان رحمہ اللہ کی اہلیہ کا نام تھا حنہ بنت فاقوذہ۔ یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نانی تھیں اور حضرت مریم علیہا السلام کی والدہ ماجدہ۔ یہ بڑی نیک پارسا خاتون تھیں۔ حضرت حنہ کی ایک ہمشیرہ تھیں، ان کا نام تھا ایشاع بنتِ فاقوذہ۔ یہ حضرت زکریا علیہ السلام کے نکاح میں تھیں۔

تو جس وقت حضرت حنہ بنتِ فاقوذہ کا جوان سال بیٹا ہارون رحمہ اللہ فوت ہوگیا تو وہ بہت پریشان ہوئیں۔ اور پریشانی کی وجہ یہ تھی کہ میرے خاوند عمران بن ماثان رحمہ اللہ تعالیٰ نے ساری زندگی مسجدِ اقصیٰ کی خدمت کی ہے اور لوگوں کے عقیدے، عمل اور اخلاق کی تربیت میں گزاری ہے اور اب وہ بوڑھے ہوگئے ہیں۔ اُمید تھی کہ میرا لڑکا باپ کی جگہ سنبھالے گا۔ مگر وہ بھی فوت ہوگیا۔ تو ہم مسجدِ اقصیٰ کی خدمت سے محروم ہوجائیں گے۔ مگر اس دوران میں ان کو بچی بچے کی امید ہوگئی اور خیال تھا کہ شاید لڑکا ہوگا۔ کہنے لگیں اے پروردگار! میں تیرے ساتھ وعدہ کرتی ہوں، نذر مانتی ہوں کہ جو میرے پیٹ میں ہے یہ تیرے لیے وقف ہوگا۔ یعنی جس طرح میرا خاوند دین کی خدمت کرتا ہے اسی طرح یہ بھی تیرے دین کی خدمت کرے گا۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت کہ لڑکی پیدا ہوئی۔ حضرت حنہ بنت فاقوذہ نے افسوس کے طور پر کہا کہ اے پروردگار! امید تو اور تھی مگر لڑکی پیدا ہوگئی ہے لیکن میں نے اپنی منت پوری کرنی ہے۔ کیوں کہ میں نے کہا تھا کہ جو میرے پیٹ میں ہے تیرے لیے وقف ہے۔ اور بچی کا نام مریم رکھا۔

امام بخاری رحمہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مریم کا معنیٰ ہے عَابِدَةٌ، عبادت کرنے والی۔ اور مریم عبرانی زبان کا لفظ ہے۔

اور مسئلہ یاد رکھنا! کہ اس طرح کی نذر و منت ان کی شریعت میں جائز تھی۔ ہماری شریعت میں یہ حکم ہے لَا نَذْرَ فِیْمَا لَا یَمْلِكُ ابْنُ اٰدَمَ "جو چیز ابن آدم کی ملکیت میں نہیں ہے اس کی منت نہیں مان سکتا۔" یعنی ابن آدم اپنے فعل کی منت مان سکتا ہے دوسرے کے فعل کی منت نہیں مان سکتا۔ مثلاً: کوئی کہے کہ اے اللہ! میرا فلاں کام ہو جائے تو اتنے نفل پڑھوں گا یا اتنے روزے رکھوں گا یا اتنی دیگیں تیرے نام پر اُتاروں گا یا فلاں کام کروں گا۔ یہ ٹھیک ہے۔ لیکن جو بیٹا بیٹی پیدا ہوگا ان کے افعال ہم نہیں کر سکتے۔ کیوں کہ ان کا وجود الگ ہے۔ وہ اپنے افعال کے خود مالک ہے۔ تو ایسی نذر ہماری شریعت میں جائز نہیں ہے اُن کی شریعت میں جائز تھی۔

جس وقت حضرت مریم علیہا السلام پیدا ہوئیں تو ان کی والدہ نے انتظامیہ کمیٹی کے پاس پہنچا دی کہ میں نے منت مانی تھی لہٰذا یہ تمھارے سپرد ہے اور اس کی ساری ذمہ داری دودھ وغیرہ پلانے کی تمھارے ذمہ ہے۔

مسجدِ اقصیٰ کی انتظامیہ

اس وقت مسجدِ اقصیٰ کی انتظامیہ انتیس [۲۹] افراد پر مشتمل تھی۔ کسی کے ذمہ پانی کا انتظام تھا، کسی کے ذمے روشنی کا انتظام تھا، کسی کے ذمے چٹائیاں بچھانا، کسی کے ذمے ٹوٹی پھوٹی چیز کو ٹھیک کروانا، کسی کی ڈیوٹی تھی پڑھنے والوں کی نگرانی کرنا۔ اور اس کمیٹی میں حضرت زکریا علیہ السلام بھی شامل تھے۔

حضرت مریم علیہا السلام کی کفالت پر اختلاف

اگلے رکوع میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ کہ حضرت مریم علیہا السلام کی پرورش کے سلسلہ میں انتظامیہ کمیٹی کا آپس میں جھگڑا ہوا۔ کمیٹی کے انتیس افراد میں سے ہر ایک کی خواہش تھی کہ اس کی نگرانی میں کروں۔ کیوں کہ ہمارے امام، خطیب اور بزرگ کی بیٹی ہے۔ لہٰذا اس کا خرچہ اور نگرانی میرے ذمہ ہے۔

آج کا زمانہ ہوتا تو عنوان اور ہوتا اور ہر ایک ذمہ داری سے بھاگتا اور کہتا کہ بچی کا معاملہ ہے کون اس کی نگرانی کرے گا؟ اور جوان ہونے پر کون اس کی شادی کرے گا؟ تو ہر ایک یہ کہتا کہ میں نہیں کر سکتا۔ مگر اس وقت ہر ایک اپنے موقف پر ڈٹا ہوا تھا اور اپنے موقف کو چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تھا۔

آگے آئے گا ان شاء اللہ العزیز کہ بات یہ طے پائی کہ تم اردن کی نہر پر جاؤ جو کہ قریب ہی تھی۔ اور اس طرح کرو کہ جن قلموں کے ساتھ لکھتے ہو ہر آدمی اپنے قلم کے ساتھ نشانی لگا کر نہر میں پھینک دے۔ آگے دو تفسیریں آتی ہیں کہ مریم اس کے سپرد کی جائے گی جس کا قلم رکا رہا کہ پانی اس کو بہا کر نہ لے گیا۔ اور جن کے قلم پانی میں بہہ گئے ان کے سپرد نہیں کی جائے گی۔ اور بخاری وغیرہ میں یہ تفسیر بھی آتی ہے کہ نہر کا پانی تیزی کے ساتھ جس طرف سے آرہا ہے جس کا قلم اس طرف کو چل پڑا یعنی الٹی سمت تیرنے لگ گیا وہ کامیاب ہے۔ مریم اس کے سپرد کی جائے گی۔ اور جن کے قلموں کو پانی بہا کر لے گیا ان کو نہیں ملے گی۔

چنانچہ قرعہ اندازی ہوئی اور حضرت زکریا علیہ السلام کا قرعہ نکلا کہ ان کا قلم پانی میں رکا رہا اور پانی چلتا رہا۔ اور دوسری تفسیر کے مطابق حضرت زکریا علیہ السلام کا قلم جس طرف سے پانی آرہا تھا اس طرف چل پڑا۔ بڑی عجیب بات تھی کہ قلم پانی کی مخالف سمت کو جا رہا ہے۔ اور ہماری شریعت میں بھی قرعہ اندازی ایک مسئلہ ہے کہ اگر سب کے حقوق برابر ہوں تو قرعہ اندازی کر لیں۔ شریعت اس کو تسلیم کرتی ہے، جائز ہے۔ چنانچہ حضرت مریم علیہا السلام حضرت زکریا علیہ السلام کے سپرد کر دی گئیں۔ وہاں ایک کمرہ تھا اور اس کے اوپر جالی دار چوبارہ تھا۔ اس کا انتظام اور اس کی چابی حضرت زکریا علیہ السلام کے پاس ہوتی تھی جس کا ذکر آگے آئے گا، ان شاء اللہ العزیز۔

تو اس مقام پر فرمایا کہ عمران کی اولاد کو منتخب فرمایا ﴿عَلَى الْعٰلَمِيْنَ﴾ جہان والوں پر۔ حضرت آدم علیہ السلام کو اپنے وقت میں، حضرت نوح علیہ السلام کو اپنے وقت میں، حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنے وقت میں اور ان کی اولاد کو اپنے وقت میں۔ عمران بن

ماثان رحمہ اللہ کو اپنے وقت میں منتخب فرمایا۔ یعنی اپنے اپنے دور میں ان کو سب پر فضیلت حاصل تھی۔ ﴿ذُرِّيَّةً بَعْضُهَا مِنْ بَعْضٍ﴾ ان میں سے بعض، بعض کی اولاد ہیں۔ مثلاً: عمران رحمہ اللہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے تھے اور ابراہیم علیہ السلام نوح علیہ السلام کی اولاد میں سے تھے اور نوح علیہ السلام آدم علیہ السلام کی اولاد میں سے تھے۔ ﴿وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ﴾ اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کو سنتا بھی ہے، جانتا بھی ہے۔

﴿إِذْ قَالَتِ امْرَاَتُ عِمْرٰنَ﴾ جب کہا عمران (رحمہ اللہ) کی بیوی نے ﴿رَبِّ إِنِّيْ نَذَرْتُ لَكَ﴾ اے میرے رب! بے شک میں نے نذر مانی تیرے واسطے ﴿مَا فِيْ بَطْنِيْ﴾ جو کچھ میرے پیٹ میں ہے ﴿مُحَرَّرًا﴾ وہ تیرے لیے آزاد کر دیا جائے گا ﴿فَتَقَبَّلْ مِنِّيْ﴾ پس تو مجھ سے قبول فرما ﴿إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ﴾ بے شک تو ہی سننے والا جاننے والا ہے ﴿فَلَمَّا وَضَعَتْهَا﴾ پس جب اس نے جنا اس کو ﴿قَالَتْ رَبِّ﴾ کہنے لگی اے میرے رب! ﴿إِنِّيْ وَضَعْتُهَا أُنْثٰى﴾ بے شک میں نے جنی ہے لڑکی ﴿وَاللّٰهُ أَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ﴾ اور اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے جو اس نے جنا ہے۔

رب تعالیٰ فرماتے ہیں ﴿وَلَيْسَ الذَّكَرُ كَالْأُنْثٰى﴾ اور نہیں ہے وہ معہود لڑکا اس لڑکی کی طرح۔ یعنی جو تمھارے ذہن میں فرضی لڑکا تھا وہ اس لڑکی کو کب پہنچ سکتا ہے۔ حضرت مریم علیہا السلام بہت اونچے درجے والی عورتوں میں سے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے خرقِ عادت کے طور پر بغیر خاوند کے ان کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام جیسی شخصیت عطاء فرمائی۔ اور بعض نے یہ مطلب بیان کیا ہے کہ لڑکا لڑکی کی طرح نہیں ہے۔ یعنی جس طرح لڑکا بے پردہ پھرتا ہے اور جو عمومی خدمات لڑکا کر سکتا ہے وہ لڑکی نہیں کر سکتی۔

﴿وَإِنِّيْ سَمَّيْتُهَا مَرْيَمَ﴾ اور بے شک میں نے اس کا نام رکھا ہے مریم ﴿وَإِنِّيْ أُعِيْذُهَا بِكَ﴾ اور بے شک میں اس کو تیری پناہ میں دیتی ہوں ﴿وَذُرِّيَّتَهَا مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ﴾ اور اس کی اولاد کو، اس شیطان سے جو مردود ہے۔

حدیث پاک میں آتا ہے کہ جب بچہ پیدا ہوتا ہے شیطان چوکا لگاتا ہے، اپنا ٹیکا لگاتا ہے۔ اپنا اثر ڈالنے کے لیے۔ لیکن حضرت مریم علیہا السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام محفوظ رہے ان کو چوکا نہیں مارا ان کی والدہ کی دعا کی وجہ سے۔ کیوں کہ ان کی دعا تھی کہ مریم علیہا السلام کو بھی بچا اور اس کی اولاد کو بھی اور اولاد میں عیسیٰ علیہ السلام ہیں۔ اور جب عیسیٰ علیہ السلام آسمان سے نازل ہوں گے اور بہت جلد آنے والے ہیں۔ (ان شاء اللہ تعالیٰ) کیوں کہ قرائن اور شواہد سارے مل رہے ہیں۔ آ کر عرب کے قبیلہ ازدشنوءہ خاندان کی ایک عورت سے نکاح کر لیں گے۔ یہ خاندان سارے کا سارا طبعی طور پر شریف ہے۔ اس عورت سے دو لڑکے ہوں گے۔ ایک کا نام موسیٰ اور دوسرے کا نام محمد رکھیں گے۔ یہاں تک تو ثابت ہے آگے رب جانتا ہے کیا ہوگا۔

﴿فَتَقَبَّلَهَا﴾ پس قبول کیا اس کو ﴿رَبُّهَا بِقَبُوْلٍ حَسَنٍ﴾ اس کے رب نے اچھے طریقے سے قبول کرنا ﴿وَّاَنْۢبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا﴾ اور اس کو بڑھایا، بڑھانا اچھے طریقے سے ﴿وَّ كَفَّلَهَا زَكَرِيَّا﴾ اور اس کی سرپرستی کی زکریا علیہ السلام نے ﴿كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ﴾ جب کبھی بھی داخل ہوتے زکریا علیہ السلام اس کے پاس کمرے میں ﴿وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا﴾ پاتے تھے اس کے پاس رزق ﴿قَالَ يٰمَرْيَمُ﴾ فرمایا اے مریم! ﴿اَنّٰى لَكِ هٰذَا﴾ کہاں سے آیا ہے یہ تیرے پاس رزق ﴿قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ﴾ وہ کہتی تھیں وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آیا ہے ﴿اِنَّ اللّٰهَ يَرْزُقُ﴾ بے شک اللہ تعالیٰ رزق دیتا ہے ﴿مَنْ يَّشَآءُ﴾ جس کو چاہے ﴿بِغَيْرِ حِسَابٍ﴾ بغیر حساب کے ﴿هُنَالِكَ دَعَا زَكَرِيَّا رَبَّهٗ﴾ اس جگہ میں دعا کی زکریا علیہ السلام نے اپنے رب سے ﴿قَالَ رَبِّ هَبْ لِيْ﴾ فرمایا اے میرے رب دے مجھے ﴿مِنْ لَّدُنْكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً﴾ اپنی طرف سے اولاد ستھری ﴿اِنَّكَ سَمِيْعُ الدُّعَآءِ﴾ بے شک تو ہی سننے والا ہے دعا کا ﴿فَنَادَتْهُ الْمَلٰٓئِكَةُ﴾ پس آواز دی ان کو فرشتوں نے ﴿وَهُوَ قَآئِمٌ يُّصَلِّيْ فِي الْمِحْرَابِ﴾ اور وہ کھڑے تھے نماز پڑھتے کمرے میں ﴿اَنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكَ بِيَحْيٰى﴾ بے شک اللہ تعالیٰ خوش خبری دیتے ہیں تجھے یحییٰ علیہ السلام کی ﴿مُصَدِّقًا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ﴾ جو تصدیق کرنے والے ہوں گے اللہ تعالیٰ کے ایک کلمے کی ﴿وَسَيِّدًا وَّحَصُوْرًا﴾ اور سردار ہوں گے اور اپنے آپ کو عورتوں سے دور رکھنے والے ہوں گے ﴿وَنَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ﴾ اور نبی ہوں گے نیکوں میں سے ﴿قَالَ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ﴾ کہا زکریا علیہ السلام نے اے میرے رب! کس طرح ہوگا میرا لڑکا ﴿وَّقَدْ بَلَغَنِيَ الْكِبَرُ﴾ اور تحقیق پہنچ چکا ہے مجھے بڑھاپا ﴿وَامْرَاَتِيْ عَاقِرٌ﴾ اور بیوی میری بانجھ ہے ﴿قَالَ كَذٰلِكَ اللّٰهُ يَفْعَلُ﴾ فرشتے نے کہا اسی طرح اللہ تعالیٰ کرتا ہے ﴿مَا يَشَآءُ﴾ جو چاہے ﴿قَالَ﴾ کہا زکریا علیہ السلام نے اے میرے رب! ﴿رَبِّ اجْعَلْ لِّيْٓ اٰيَةً﴾ بنا میرے لیے نشانی ﴿قَالَ اٰيَتُكَ﴾ فرمایا تیری نشانی یہ ہے ﴿اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ﴾ کہ تو کلام نہیں کر سکے گا لوگوں کے ساتھ ﴿ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ اِلَّا رَمْزًا﴾ تین دن مگر اشارے سے ﴿وَاذْكُرْ رَّبَّكَ﴾ اور ذکر کر اپنے رب کا ﴿كَثِيْرًا﴾ کثرت سے ﴿وَّسَبِّحْ﴾ اور اللہ تعالیٰ کی پاکیزگی بیان کر ﴿بِالْعَشِيِّ وَالْاِبْكَارِ﴾ پچھلے پہر اور صبح کے وقت۔

مسجد اقصیٰ پر یہودیوں کا قبضہ!

کل کے سبق میں یہ بیان ہوا تھا کہ بیت المقدس کے شہر میں جو مسجد اقصیٰ ہے جس پر ء میں یہودیوں نے قبضہ کیا اور ابھی تک ان کے قبضے میں ہے۔ اور بے غیرت مسلمان ابھی تک ان سے قبضہ چھڑا نہیں سکے۔ اس مسجد اقصیٰ کے امام اور خطیب تھے

حضرت عمران بن ماثان رحمہ اللہ تعالیٰ ۔ جو بڑے نیک، پارسا اور حق گو بزرگ تھے۔ اور ان کی بیوی بھی بڑی نیک اور پارسا تھی۔ جوان سال بیٹے ہارون رحمہ اللہ کے فوت ہونے پر پریشان ہوگئیں کہ میرے خاوند عمران تو دینی خدمت کرتے ہیں لیکن ان کے بعد یہ گدی خالی ہوجائے گی۔ اور ادھر بچے بچی کی امید ہوگئی اور منت مان لی کہ میں اس کو دین کے لیے وقف کردوں گی۔ چنانچہ جب حضرت مریم علیہا السلام پیدا ہوئیں تو مسجدِ اقصیٰ کی انتیس آدمیوں کی کمیٹی میں سے قرعہ اندازی کے بعد یہ خدمت حضرت زکریا علیہ السلام کے سپرد ہوئی اور بچی ان کے حوالے کردی گئی۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ﴿فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُوْلٍ حَسَنٍ﴾ پس قبول کیا اس کو اس کے رب نے اچھے طریقے سے قبول کرنا۔ ماں کی نیت بہت اچھی تھی، باپ نیک، خالو حضرت زکریا علیہ السلام، اللہ تعالیٰ کے پیغمبر، خالہ نیک، سارا گھرانا ہی نیکوں کا تھا۔ ﴿وَّاَنْۢبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا﴾ اور اس کو بڑھایا، بڑھانا اچھے طریقے سے۔ تفسیروں میں لکھا ہے کہ صحت مند بچہ پندرہ دنوں میں جتنا بڑھتا ہے وہ ایک دن میں اس قدر بڑھ جاتی تھیں۔ اور یہ بھی لکھا ہے کہ صحت مند بچہ دو ماہ میں جتنا بڑھتا ہے وہ دو دن میں اتنی بڑھ جاتی تھیں۔ رب تعالیٰ نے اس کو بڑھایا اور اچھے طریقے سے نشوونما فرمائی۔

﴿وَّ كَفَّلَهَا زَكَرِيَّا﴾ اور اس کی سرپرستی فرمائی زکریا علیہ السلام نے۔ کل میں نے عرض کیا تھا کہ انھوں نے ایک جالی دار چوبارہ بنوایا ہوا تھا جس نے نیچے کا منظر دور دور تک نظر آتا تھا۔ حضرت زکریا علیہ السلام کہیں جاتے تھے تو تالا لگا کر چابی ساتھ لے جاتے تھے۔ اس کا ذکر ہے ﴿كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ﴾ جب کبھی بھی داخل ہوتے زکریا علیہ السلام مریم علیہا السلام کے پاس کمرے میں، جہاں وہ رہتی تھیں ﴿وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا﴾ پاتے تھے اس کے پاس رزق۔ تفسیروں میں لکھا ہے کہ سردیوں کے موسم کا پھل گرمیوں میں اور گرمیوں کے موسم کا پھل سردیوں میں وافر ہوتا۔ ﴿قَالَ يٰمَرْيَمُ﴾ فرمایا اے مریم! ﴿اَنّٰى لَكِ هٰذَا﴾ یہ پھل تیرے پاس کہاں سے آتے ہیں؟ کمرے کو میں تالا لگا کر جاتا ہوں، چابی میرے پاس ہوتی ہے۔ ادھر کمرے کی طرف آنے کی کسی کو جرأت نہیں اور یہ پھلوں کے انبار لگے ہوئے ہیں۔ یہ کہاں سے آتے ہیں؟ ﴿قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ﴾ حضرت مریم علیہا السلام کہتی تھیں وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آیا ہے۔

کرامت اور معجزے کا ذکر قرآن میں

یہ حضرت مریم علیہا السلام کی کرامت تھی۔ اور کرامت اللہ تعالیٰ کا فعل ہوتا ہے ولی کے ہاتھ پر صادر ہوتا ہے۔ اور ولی چاہے مرد ہو یا عورت ہو کرامت ان کا فعل نہیں ہوتا۔ اسی طرح معجزہ بھی اللہ تعالیٰ کا فعل ہوتا ہے اور نبی کے ہاتھ پر صادر ہوتا ہے مگر نبی کا اس میں کچھ دخل نہیں ہوتا۔ معجزے کا لغوی معنیٰ ہے دوسروں کو عاجز کرنے والی چیز۔ یہ اللہ تعالیٰ کا فعل ہوتا ہے۔

دیکھو! قرآن پاک میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بہت سارے معجزات کا ذکر ہے۔ ان میں اس معجزے کا بھی ذکر ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی اہلیہ محترمہ کے ساتھ مدین سے واپس مصر تشریف لا رہے تھے۔ جب وادی طویٰ (جو طور کے دامن میں

ہے) پہنچے۔ رات کا وقت تھا وہاں روشنی تھی جو درحقیقت اللہ تعالیٰ کی تجلی تھی۔ جب وہاں پہنچے من جانب اللہ نبوت اور رسالت عطاء ہوئی تو ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے تصدیق رسالت کے لیے معجزہ بھی عطاء فرمایا۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے ﴿وَاَنْ اَلْقِ عَصَاكَ ۭ فَلَمَّا رَاٰهَا تَهْتَزُّ كَاَنَّهَا جَاۗنٌّ وَّلّٰى مُدْبِرًا وَّلَمْ يُعَقِّبْ﴾ [القصص:۳۱] "اور یہ کہ ڈال دے اپنی لاٹھی پھر جب دیکھا اس کو پھن ہلاتے جیسے پتلا سانپ الٹا پھرا منہ موڑ کر اور نہ دیکھا پیچھے پھر کر۔" پہلے لاٹھی پتلا سانپ بن جاتی تھی اور بڑھتے بڑھتے اژدھا کی شکل اختیار کر لیتی تھی۔ جیسا کہ دوسرے مقام پر ﴿ثُعْبَانٌ مُّبِيْنٌ﴾ [الاعراف:۱۰۷] (بڑا اژدھا) کے الفاظ آئے ہیں۔ یا یوں کہہ لیں کہ ابتدائی طور پر پتلا سانپ اور فرعون کے پاس بڑا اژدھا بن کر وہ لاٹھی نمودار ہوئی۔

رب تعالیٰ نے فرمایا اے موسیٰ! تیرے دائیں ہاتھ میں کیا ہے؟ جب کہ رب تعالیٰ کو علم تھا مگر موسیٰ علیہ السلام کو تنبیہ فرمائی کہ دیکھ لے کہیں ایسا نہ ہو کہ جب یہ لاٹھی سانپ بنے تو تجھے خیال ہو کہ میں لاٹھی کی جگہ سانپ اٹھائے پھرتا ہوں۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا میری لاٹھی ہے۔ فرمایا پھینک دے۔ جب پھینکی تو پتلا سانپ بن گیا۔ سانپ نے اِدھر اُدھر دوڑنا شروع کر دیا۔ موسیٰ علیہ السلام نے بھی دوڑنا شروع کر دیا اس خیال سے کہ موذی چیز ہے۔ اور موذی چیز سے ڈرنا ایمان کے خلاف نہیں ہے۔ کیوں کہ موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے پیغمبر ہیں اور پیغمبر سے زیادہ قوی ایمان کسی کا نہیں ہوسکتا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے موسیٰ! ڈرو نہ اس پر ہاتھ رکھو ﴿سَنُعِيْدُهَا سِيْرَتَهَا الْاُوْلٰى﴾ [طٰہٰ:۲۱] "ہم اس کو پہلی حالت میں بدل دیں گے۔" یہ لاٹھی کی لاٹھی ہو جائے گی۔ اب اگر معجزہ اپنے اختیار میں ہوتا تو معلوم ہوتا کہ یہ اب پھر لاٹھی بن جائے گی۔ سانپ تو ہے نہیں یہ تو میری لاٹھی ہے۔

تو یاد رکھنا! کہ معجزہ اور کرامت اللہ تعالیٰ کا فعل ہوتے ہیں۔ معجزہ نبی کے ہاتھ پر صادر ہوتا ہے اور کرامت ولی کے ہاتھ پر صادر ہوتی ہے۔ معجزے میں نبی کا دخل نہیں اور کرامت میں ولی کا دخل نہیں ہوتا۔ تو یہ بے موسے پھلوں کا آنا حضرت مریم علیہا السلام کی کرامت تھی۔ اور ولی کو جو کرامت حاصل ہوتی ہے پیغمبر کی پیروی کی وجہ سے حاصل ہوتی ہے۔ چوں کہ وہ صحیح معنی میں اللہ تعالیٰ کے پیغمبر کا پیروکار رہتا ہے اس واسطے اللہ تعالیٰ ان کے ہاتھ عجیب وغریب چیزیں صادر فرما دیتے ہیں۔

سورۃ النمل میں حضرت سلیمان علیہ السلام کے صحابی آصف بن برخیار حمہ اللہ کی کرامت کا ذکر ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام شام میں تھے۔ وہاں سے سبا کے علاقے کا سفر ایک مہینے کا تھا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے فرمایا کہ کون ہے جو بلقیس کا تخت مجھے لا کر دے ﴿قَالَ عِفْرِيْتٌ مِّنَ الْجِنِّ﴾ ایک بہت بڑا جن تھا اس نے کہا حضرت! تم ابھی اپنی مجلس سے نہیں اٹھو گے یعنی تم اپنے جس دفتر میں بیٹھ کر کام کرتے ہو اس سے تم ابھی فارغ نہیں ہو گے کہ میں تمھیں تخت لا کر دے دوں گا اللہ تعالیٰ کے حکم سے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام اس سے بھی جلدی چاہتے تھے۔ آصف بن برخیا رحمۃ اللہ علیہ نے کہا حضرت! میں چشمِ زدن میں لا کر دے دوں گا۔ یعنی تم نگاہ اُٹھا کر آسمان کی طرف دیکھو اور پھر نیچے دیکھو تو تخت حاضر ہوگا۔ چنانچہ انھوں نے اتنی دیر میں تخت لا کر رکھ دیا اور کہا ﴿هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّيْ﴾ یہ میرے رب کا کام ہے۔

تو معجزات اور کرامتوں کا ذکر قرآن پاک میں ہے ان کا انکار نہ کرو مگر ان کی حقیقت کو سمجھو۔ منکرین حدیث اور باطل

فرقے معجزات اور کرامات کا انکار کرتے ہیں۔ اس واسطے کہ وہ معجزے اور کرامت کی حقیقت کو نہیں سمجھے۔

فرمایا ﴿اِنَّ اللّٰهَ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ﴾ بے شک اللہ تعالیٰ رزق دیتا ہے جس کو چاہتا ہے بغیر حساب کے۔ رازق صرف رب تعالیٰ ہے اس کے سوا رزق کا اختیار کسی کو حاصل نہیں ہے۔ حضرت مریم علیہا السلام کے پاس بے موسے پھل دیکھ کر حضرت زکریا علیہ السلام نے خیال کیا کہ جو رب تعالیٰ مریم علیہا السلام کو بے موسے پھل دے سکتا ہے وہ مجھے بھی اولاد دے سکتا ہے۔ کیوں کہ اولاد کا موسم تو میرا ابھی نہیں ہے کہ ایک سو بیس [۱۲۰] سال میری عمر ہے اور اٹھانوے [۹۸] سال میری بیوی کی عمر ہے۔ ﴿هُنَالِكَ دَعَا زَكَرِيَّا رَبَّهٗ﴾ اس کمرے میں دعا کی زکریا علیہ السلام نے اپنے رب سے ﴿قَالَ رَبِّ هَبْ لِيْ﴾ عرض کیا اے میرے رب! دے مجھے ﴿مِنْ لَّدُنْكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً﴾ اپنی طرف سے پاکیزہ اولاد ﴿اِنَّكَ سَمِيْعُ الدُّعَآءِ﴾ بے شک تو ہی ہے دعائیں سننے والا ہے۔ سمیع بھی تو ہے بصیر بھی تو ہے، دینے والا بھی تو ہی ہے تیرے سوا کوئی اور نہیں دے سکتا۔

اللہ تعالیٰ قرآن پاک میں ارشاد فرماتے ہیں ﴿يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ﴾ "وہ پیدا کرتا ہے جو چاہتا ہے ﴿يَهَبُ لِمَنْ يَّشَآءُ اِنَاثًا﴾ جسے چاہتا ہے بیٹیاں عطا کرتا ہے ﴿وَّيَهَبُ لِمَنْ يَّشَآءُ الذُّكُوْرَ﴾ اور جسے چاہتا ہے بیٹے بخشتا ہے ﴿اَوْ يُزَوِّجُهُمْ ذُكْرَانًا وَّاِنَاثًا﴾ یا ان کو بیٹے بیٹیاں دونوں عطا فرماتا ہے۔ اس کے خزانے میں کیا کمی ہے ﴿وَيَجْعَلُ مَنْ يَّشَآءُ عَقِيْمًا﴾ [سورۃ الشوریٰ] اور جس کو چاہتا ہے بانجھ کر دیتا ہے۔" سارے ڈاکٹروں اور حکیموں سے علاج کرائیں، سارے دم درود والوں سے علاج کرائیں، جب رب کسی کو نہ دے تو کوئی کسی کو کچھ نہیں دے سکتا۔

چنانچہ حضرت زکریا علیہ السلام نماز میں کھڑے تھے ﴿فَنَادَتْهُ الْمَلٰٓئِكَةُ﴾ پس آواز دی ان کو فرشتوں نے۔ جبرئیل علیہ السلام آئے اور ان کے ساتھ اور بھی فرشتے تھے۔ البتہ گفتگو کرنے والے جبرئیل علیہ السلام تھے ﴿وَهُوَ قَآئِمٌ يُّصَلِّيْ فِي الْمِحْرَابِ﴾ اور وہ کھڑے تھے نماز پڑھتے تھے کمرے میں۔ یہ وہی کمرہ تھا جہاں حضرت مریم علیہا السلام رہتی تھیں۔ فرشتے نے کہا ﴿اَنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكَ بِيَحْيٰى﴾ بے شک اللہ تعالیٰ خوش خبری دیتے ہیں تجھے یحییٰ نامی لڑکے کی۔ سورۃ مریم میں آتا ہے ﴿لَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ سَمِيًّا﴾ "نہیں بنایا ہم نے اس کے لیے اس سے پہلے کوئی ہم نام۔" یعنی ان سے پہلے کسی بچے کا نام یحییٰ نہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے خود ہی ان کا نام یحییٰ رکھا (علیہ السلام)۔ ﴿مُصَدِّقًا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ﴾ جو تصدیق کرنے والے ہوں گے اللہ تعالیٰ کے ایک کلمے کی۔ اور کلمے سے مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں کہ ان کو اللہ تعالیٰ نے کلمہ کن سے پیدا فرمایا بغیر باپ کے۔

حضرت یحییٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ایک ہی دور تھا۔ چوں کہ اس وقت یہودیوں کا زور تھا اور انھوں نے دین کا نقشہ بدل کے رکھ دیا تھا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جب حق کی باتیں بیان فرمائیں تو سارے دشمن ہو گئے۔ مگر حضرت یحییٰ علیہ السلام حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تائید اور تصدیق فرماتے تھے کہ یہ جو کچھ بیان فرماتے ہیں حق ہے۔

﴿وَسَيِّدًا وَّحَصُوْرًا﴾ اور اپنے دور کے سردار ہوں گے اور اپنے آپ کو عورتوں سے دور رکھنے والے ہوں گے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ پیغمبروں میں حضرت یحییٰ علیہ السلام نے شادی نہیں فرمائی۔

پیغمبروں کی چار سنتیں

اور جامع صغیر صفحہ ۳۸ جلد ا میں روایت آتی ہے آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ((أَرْبَعٌ مِّنْ سُنَنِ الْمُرْسَلِيْنَ)) چار چیزیں پیغمبروں کی سنتوں میں سے ہیں۔

① اَلْحَيَاءُ یعنی تمام پیغمبر صاحبِ حیا تھے۔

② وَالتَّعَطُّرُ اور خوشبو لگانا۔ تمام پیغمبر خوش بو استعمال فرماتے تھے۔ یعنی خوشبو لگانا پیغمبروں کی سنت ہے۔

③ وَالنِّكَاحُ اور نکاح کرنا۔ یعنی شادی کرنا پیغمبروں کی سنت ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے شادی نہیں کی۔ کیوں کہ وہ تینتیس [۳۳] سال کی عمر میں زندہ آسمانوں پر اُٹھا لیے گئے۔ جب نازل ہوں گے تو عرب کے قبیلہ از دشنوء کی ایک عورت سے شادی کریں گے۔ جیسا کہ کل میں نے بیان کیا تھا۔

④ چوتھی چیز فرمایا وَالسِّوَاكُ اور مسواک کرنا، یہ بھی پیغمبرانہ سنت ہے۔

دوسری حدیث میں آتا ہے کہ جو نماز مسواک کر کے پڑھی جائے اس کا درجہ ستر گنا بڑھ جاتا ہے اس نماز سے جو بغیر مسواک کیے پڑھی جائے۔ اور فرمایا ((أَلْمِسْوَاكُ مِطْهَرَةٌ لِفَمٍ وَمَرْضَاتٌ لِلرَّبِّ)) "کہ مسواک منہ کو پاک صاف رکھتی ہے اور رب کو راضی رکھنے والی چیز ہے۔" اور ایک حدیث شریف میں آتا ہے کہ جبرئیل جب بھی تشریف لاتے تھے مجھے دو چیزوں کی بڑی تاکید فرماتے تھے۔ ایک مسواک کرنے کی، حتیٰ کہ میں نے مسواک کر کر کے اپنے مسوڑے چھیل لیے۔ اور دوسرا پڑوسی کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کی ((حَتّٰى ظَنَنْتُ اَنَّهٗ سَيُوَرِّثُهٗ)) حتیٰ کہ مجھے یہاں تک گمان ہوا کہ مرنے کے بعد پڑوسی کو وراثت ملے گی۔ اور ایک روایت میں ((أَلْخِتَانُ)) کا بھی ذکر آتا ہے کہ ختنہ کرنا بھی انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی سنت ہے۔

تو ﴿حَصُوْرًا﴾ کا معنیٰ بیان کر رہا تھا کہ ﴿حَصُوْرًا﴾ کے معنیٰ ہیں اپنے آپ کو عورتوں سے الگ رکھنا۔ اور یہ کوئی معمولی بات نہیں۔ کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے انسان میں طبعی خواہشات رکھی ہیں مگر پیغمبر پیغمبر ہوتا ہے۔ جس طرح وہ اپنے جسم پر کنٹرول کر سکتا ہے اس طرح کوئی دوسرا نہیں کر سکتا۔ اسی واسطے آنحضرت ﷺ نے فرمایا ((يَا مَعْشَرَ الشَّبَابِ)) اے نوجوانو کے گروہ! تم نکاح کرو ((اَغَضُّ لِلْبَصَرِ وَ اَحْسَنُ لِلْفَرَجِ)) تمھاری نگاہیں بھی پست رہیں گی اور شرم گاہ بھی حرام کاری سے محفوظ رہے گی۔ اور فرمایا کہ جس کو شادی کی توفیق نہ دی گئی ہو اس کو چاہیے کہ وہ مسلسل روزے رکھے۔ روزوں کی برکت سے خواہشات میں کمی آئے گی۔ مسئلہ یہ ہے کہ شادی کی توفیق ہوتے ہوئے تاخیر گناہ ہے۔

﴿وَنَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ﴾ اور نبی ہوگا نیکوں میں سے۔ نبی سارے ہی نیک ہوتے ہیں۔ نبیوں سے بڑھ کر کون نیک ہو سکتا ہے۔ دعا کی قبولیت پر حضرت زکریا علیہ السلام تعجب میں مبتلا ہو گئے کہ بہ ظاہر اسباب ایسے نہیں ہیں کہ اولاد ہو سکے۔ کیوں کہ وہ تو خود بوڑھے ہو چکے تھے اور بیوی بھی بانجھ تھی۔ تاہم وہ کیفیت معلوم کرنا چاہتے تھے۔

﴿قَالَ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ﴾ کہا زکریا علیہ السلام نے اے میرے رب! کس طرح ہوگا میرا لڑکا ﴿وَّقَدْ بَلَغَنِيَ الْكِبَرُ﴾ اور تحقیق پہنچ چکا ہے مجھے بڑھاپا۔ سر کے بال اور ڈاڑھی سفید تھی ﴿وَهَنَ الْعَظْمُ مِنِّيْ﴾ [سورۃ مریم] کے الفاظ بھی قرآن پاک میں آتے ہیں کہ میری ہڈیاں کمزور ہوگئی ہیں ﴿مِنَ الْكِبَرِ عِتِيًّا﴾ اور جب میں چلتا ہوں تو کبڑا ہو کر چلتا ہوں۔ اور بڑھاپے میں ایسا ہوجاتا ہے۔

﴿وَامْرَاَتِيْ عَاقِرٌ﴾ اور بیوی میری (جس کا نام رحمت تھا) بانجھ ہے۔ ﴿قَالَ كَذٰلِكَ اللّٰهُ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ﴾ فرشتے نے کہا اسی طرح اللہ تعالیٰ کرتا ہے جو چاہتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ فرشتے نے کہا کہ اے اللہ تعالیٰ کے پیغمبر! میں خود نہیں آیا مجھے اللہ تعالیٰ نے بھیجا ہے۔ ﴿قَالَ رَبِّ﴾ کہا زکریا علیہ السلام نے اے میرے رب! ﴿اجْعَلْ لِّيْٓ اٰيَةً﴾ میرے لیے کوئی نشانی مقرر فرما دے جس سے میں سمجھ جاؤں کہ میری بیوی باامید ہوگئی ہے۔

نبی، ولی کو پیٹ کی خبر نہیں ہوتی

دیکھو! پیٹ کی خبر اللہ تعالیٰ کا پیغمبر بھی نہیں جانتا۔ اور پھر عجیب بات ہے کہ اپنی بیوی کے متعلق نہیں جانتا۔ اور یہاں لوگ دعویٰ کرتے ہیں کہ ولی بھی پیٹ کی خبریں جانتے ہیں۔ حالاں کہ زکریا علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے پیغمبر ہیں اور پیغمبر سے بڑھ کر کس کی حیثیت ہے۔ ﴿قَالَ اٰيَتُكَ﴾ فرمایا تیری نشانی یہ ہے ﴿اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ﴾ کہ تو کلام نہیں کر سکے گا لوگوں کے ساتھ ﴿ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ﴾ تین دن۔ اور دوسری جگہ لَيَالٍ کا لفظ بھی آیا ہے، تین راتیں۔ تو پھر مطلب یہ بنے گا کہ تم تین دن اور تین راتیں جب لوگوں کے ساتھ کلام کرنا چاہو گے تو تمھاری زبان نہیں چلے گی ﴿اِلَّا رَمْزًا﴾ مگر اشارے کے ساتھ لوگوں کو سمجھاؤ گے کہ وضو کرو، نماز پڑھو۔ تو جب یہ کیفیت ہو تو سمجھ جانا کہ میری بیوی باامید ہوگئی ہے۔

﴿وَاذْكُرْ رَّبَّكَ كَثِيْرًا﴾ اور ذکر کر اپنے رب کا کثرت سے ﴿وَّسَبِّحْ﴾ اور اللہ تعالیٰ کی پاکیزگی بیان کر، تسبیح پڑھ سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ۔ حدیث شریف میں آتا ہے سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ اَفْضَلُ الْكَلَامِ ہے۔ ہمیں اور آپ کو اس کا ذکر کثرت کے ساتھ کرنا چاہیے۔ اور بخاری شریف کی ایک روایت میں ہے اَفْضَلُ الْكَلِمَاتِ اَرْبَعٌ۔ چار کلمے بڑے افضل ہیں سُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَلَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ۔ ان کلمات کا ذکر وضو ہو یا نہ کیا جا سکتا ہے۔ گاڑی میں بیٹھے ہوئے گھر بیٹھے ہوئے، لیٹے ہوئے ہو، چل پھر رہے ہو، کام کر رہے ہو، ہر حال میں کیا جا سکتا ہے۔ دیکھو کتنی سہولت رب تعالیٰ نے دی ہے۔

تو فرمایا رب کی تسبیح بیان کر ﴿بِالْعَشِيِّ﴾ پچھلے پہر۔ دوپہر کے بعد کا جو وقت ہے اس کو عربی میں عَشِيٌّ کہتے ہیں ﴿وَالْاِبْكَارِ﴾ اور پہلے پہر بھی رب کا ذکر کر۔ مطلب یہ ہے کہ صبح شام رب کے ذکر میں مشغول رہ۔

﴿وَ اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓىِٕكَةُ﴾ اور جب کہا فرشتوں نے ﴿یٰمَرْیَمُ اِنَّ اللّٰهَ﴾ اے مریم! بے شک اللہ تعالیٰ نے ﴿اصْطَفٰىكِ وَ طَهَّرَكِ﴾ تجھے چن لیا ہے اور تجھے پاک رکھا ہے ﴿وَ اصْطَفٰىكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِیْنَ﴾ اور تجھے چنا ہے سب جہان والی عورتوں پر ﴿یٰمَرْیَمُ اقْنُتِیْ لِرَبِّكِ﴾ اے مریم! فرماں برداری کر اپنے رب کی ﴿وَ اسْجُدِیْ وَ ارْكَعِیْ﴾ اور سجدہ کر اور رکوع کر ﴿مَعَ الرّٰكِعِیْنَ﴾ رکوع کرنے والوں کے ساتھ ﴿ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَیْبِ﴾ یہ غیب کی خبروں میں سے ہے ﴿نُوْحِیْهِ اِلَیْكَ﴾ اس کو ہم وحی کرتے ہیں تیری طرف ﴿وَ مَا كُنْتَ لَدَیْهِمْ﴾ اور نہ تھے آپ ان کے پاس ﴿اِذْ یُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ﴾ جس وقت انھوں نے پھینکیں اپنی قلمیں ﴿اَیُّهُمْ یَكْفُلُ مَرْیَمَ﴾ ان میں کون سرپرست بنے مریم کا ﴿وَ مَا كُنْتَ لَدَیْهِمْ﴾ اور نہ تھے آپ ان کے پاس ﴿اِذْ یَخْتَصِمُوْنَ﴾ جب انھوں نے آپس میں جھگڑا کیا ﴿اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓىِٕكَةُ یٰمَرْیَمُ﴾ جس وقت کہا فرشتوں نے اے مریم! ﴿اِنَّ اللّٰهَ یُبَشِّرُكِ﴾ بے شک اللہ تعالیٰ تجھے خوش خبری دیتا ہے ﴿بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ﴾ اپنی طرف سے ایک کلمے کی ﴿اسْمُهُ الْمَسِیْحُ عِیْسَى ابْنُ مَرْیَمَ﴾ نام اس کا مسیح عیسیٰ ابن مریم ہوگا ﴿وَجِیْهًا فِی الدُّنْیَا وَ الْاٰخِرَةِ﴾ رتبے والا ہوگا دنیا میں اور آخرت میں ﴿وَ مِنَ الْمُقَرَّبِیْنَ﴾ اور اللہ تعالیٰ کے مقربین میں سے ہوگا ﴿وَ یُكَلِّمُ النَّاسَ﴾ اور کلام کرے گا لوگوں کے ساتھ ﴿فِی الْمَهْدِ وَ كَهْلًا﴾ گود میں اور اُدھیڑ عمر میں ﴿وَّ مِنَ الصّٰلِحِیْنَ﴾ اور نیکوں میں سے ہوگا ﴿قَالَتْ رَبِّ﴾ کہا اُس نے اے میرے رب! ﴿اَنّٰى یَكُوْنُ لِیْ وَلَدٌ﴾ کس طرح ہوگا میرا لڑکا ﴿وَّ لَمْ یَمْسَسْنِیْ بَشَرٌ﴾ اور نہیں ہاتھ لگایا مجھے کسی مرد نے ﴿قَالَ كَذٰلِكِ اللّٰهُ﴾ کہا فرشتے نے اسی طرح اللہ تعالیٰ ﴿یَخْلُقُ مَا یَشَآءُ﴾ پیدا کرتا ہے جو چاہتا ہے ﴿اِذَا قَضٰۤى اَمْرًا﴾ جب طے کرتا ہے کسی معاملے کو ﴿فَاِنَّمَا یَقُوْلُ لَهٗ﴾ پس پختہ بات ہے کہتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو ﴿كُنْ فَیَكُوْنُ﴾ ہو جا، پس وہ ہو جاتی ہے۔

حضرت مریم علیہا السلام کی جوانی کا ذکر

یہ واقعہ پیچھے سے چلا آ رہا ہے کہ حضرت مریم علیہا السلام کی سرپرستی حضرت زکریا علیہ السلام کے ذمہ تھی۔ انھوں نے اس کی پرورش کی۔ حضرت مریم علیہا السلام جوان ہوگئیں۔ آگے اس کا ذکر ہے۔

﴿وَ اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓىِٕكَةُ﴾ اور جس وقت کہا اللہ تعالیٰ کے فرشتوں نے۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام تشریف لائے اور ان کے ہمراہ اور فرشتے بھی تھے مگر متکلم حضرت جبرئیل علیہ السلام تھے۔ فرمایا ﴿یٰمَرْیَمُ اِنَّ اللّٰهَ﴾ اے مریم! بے شک اللہ تعالیٰ نے ﴿اصْطَفٰىكِ وَ طَهَّرَكِ﴾ تجھے چن لیا ہے اور تجھے پاک رکھا ہے برے اخلاق اور بری نظروں سے اور تمام بُری چیزوں سے ﴿وَ اصْطَفٰىكِ عَلٰى

﴿نِسَآءِ الْعٰلَمِیْنَ﴾ اور تجھے چنا ہے سب جہان والی عورتوں پر۔ یعنی جہان کی تمام عورتوں پر تجھے فضیلت عطاء فرمائی۔ وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے تجھے بغیر خاوند کے حضرت عیسیٰ علیہ السلام جیسا لڑکا عطاء فرمایا۔ اور اس کی نظیر نہ اس امت میں ہے نہ پہلی کسی امت میں کہ کسی عورت نے خاوند کی ملاقات کے بغیر بچہ جنا ہو۔ حضرت آدم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرتِ کاملہ کے ساتھ بغیر ماں باپ کے مٹی سے پیدا فرمایا۔ چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے ﴿خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ﴾ [آل عمران:۵۹] "پیدا کیا ہے اس کو اللہ تعالیٰ نے مٹی سے۔" پھر اماں حوا علیہا السلام کو ان کی پسلی سے پیدا فرمایا۔ تو حضرت مریم علیہا السلام کو اللہ تعالیٰ لڑکا عطاء فرمایا جس کے بارے میں کچھ بات آج ہوگی اور کچھ کل کی آیتوں میں آئے گی۔ (ان شاء اللہ تعالیٰ)

اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر واجب ہے

فرمایا ﴿یٰمَرْیَمُ اقْنُتِیْ لِرَبِّكِ﴾ اے مریم! فرماں برداری کر اپنے رب کی کہ رب تعالیٰ نے تجھے درجہ عطاء فرمایا ہے، مقام عطاء فرمایا ہے، اپنے رب کا شکریہ ادا کر۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم رات کو اتنی دیر تک قیام فرماتے تھے کہ تَوَرَّمَتْ قَدَمَاهُ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قدم مبارک سوج جاتے تھے۔ اور سردیوں میں جب ٹھنڈے پانی کے ساتھ وضو فرماتے تھے تو تَشَقَّقَتْ قَدَمَاهُ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قدم مبارک پھٹ جاتے تھے۔ ساتھیوں نے دیکھا تو کہنے لگے حضرت! آپ کے قدم مبارک سوج گئے ہیں اور پھٹ گئے ہیں آپ اتنی عبادت نہ کریں اللہ تعالیٰ نے آپ کے بڑے درجے بلند فرمائے ہیں۔ بخاری شریف کی روایت میں آتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ((أَفَلَا أَكُوْنَ عَبْدًا شَكُوْرًا)) تو کیا میں اللہ تعالیٰ کا شکرگزار بندہ نہ بنوں؟ اللہ تعالیٰ نے مجھے اتنے درجات سے نوازا ہے تو میں اس کا شکریہ ادا نہ کروں؟ مجھے زیادہ عبادت کرنی چاہیے۔

تو اللہ تعالیٰ نے حضرت مریم علیہا السلام کو فرمایا تو اپنے رب کی عبادت کر ﴿وَاسْجُدِیْ وَارْكَعِیْ﴾ اور سجدہ کر اور رکوع کر ﴿مَعَ الرّٰكِعِیْنَ﴾ رکوع کرنے والوں کے ساتھ۔ یعنی جماعت کے ساتھ نماز پڑھ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بھی عورتیں جماعت کے ساتھ نماز پڑھتی تھیں۔ لیکن جب حالات بدلنے لگے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پابندی لگا دی۔ ہاں! آج بھی اگر فتنے کا خطرہ نہ ہو اور عورتیں پردہ کر کے پورے اہتمام کے ساتھ آئیں تو جائز ہے۔ ہمارے ہاں بھی عورتیں جمعہ پڑھنے کے لیے آتی ہیں۔ نمازیں بھی پڑھتی ہیں اور اس وقت اوپر بیٹھی درس بھی سن رہی ہیں۔ لیکن چونکہ زمانہ بڑا نازک ہے، فتنے کا دور ہے، اس واسطے احتیاط ضروری ہے۔

حضرت مریم علیہا السلام کی کفالت بارے جھگڑا

آگے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ حضرت مریم علیہا السلام کا یہ واقعہ جو ہم نے تمہیں بتایا ہے ﴿ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَیْبِ﴾ یہ غیب کی خبروں میں سے ہے ﴿نُوْحِیْهِ اِلَیْكَ﴾ اس کو ہم وحی کرتے ہیں تیری طرف۔ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب ہے۔ ﴿وَمَا كُنْتَ لَدَیْهِمْ﴾ اور نہ تھے آپ ان کے پاس ﴿اِذْ یُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ﴾ جس وقت انھوں نے پھینکیں اپنی قلمیں قرعہ اندازی کے لیے

﴿اَیُّهُمْ یَكْفُلُ مَرْیَمَ﴾ ان میں کون سرپرست بنے مریم کا؟

یہ بات پہلے بیان ہو چکی ہے کہ حضرت مریم علیہا السلام کی والدہ نے منت مانی تھی کہ جو کچھ میرے پیٹ میں ہے میں اس کو دین کے لیے وقف کر دوں گی۔ تو جس وقت حضرت حنہ بنت فاقوذہ نے حضرت مریم علیہا السلام کو جنم دیا تو پاک صاف کر کے مسجد اقصیٰ کی انتظامیہ کمیٹی کے پاس پہنچا دیا کہ یہ میری منت ہے وہ میں نے پوری کر دی ہے آگے انتظام کرنا تمھارا کام ہے۔

تو انتظامیہ کمیٹی جو انتیس [۲۹] آدمیوں پر مشتمل تھی ان میں خاصا جھگڑا ہوا کہ ہر آدمی کی خواہش تھی کہ اس کا انتظام میرے سپرد ہو اور اس کی خدمت میں کروں۔ کیوں کہ ہمارے امام، خطیب کی بیٹی ہے۔ اور کوئی آدمی بھی اپنے دعویٰ کو چھوڑنے کے لیے تیار نہ تھا۔ تو انھوں نے اس کا فیصلہ بذریعہ قرعہ اندازی کرنے پر اتفاق کر لیا اور اس کا طریقہ یہ طے پایا کہ ہر ایک اپنی اپنی قلم لے آئے اور اس پر نشانی لگا لے اور قریب ہی جو نہر اردن ہے سب حضرات اپنی قلمیں اس میں ڈال دیں۔ جس کی قلم رک جائے اور دوسری تفسیر کے مطابق الٹی سمت تیرنے لگے وہ کامیاب ہے۔ چنانچہ انتیس [۲۹] آدمیوں نے اپنے اپنے قلم نہر میں ڈال دیے۔ ان میں سے حضرت زکریا علیہ السلام جیت گئے کہ خدا کی قدرت سے ان کا قلم جس طرف سے پانی آ رہا تھا اس طرف چل پڑا۔ تو سب نے جب خلافِ عادت یہ بات دیکھی تو سب کو یقین ہو گیا اور ہر ایک نے اپنا دعویٰ واپس لے لیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کا ذکر فرمایا ہے۔

﴿وَمَا كُنْتَ لَدَیْهِمْ﴾ اور نہ تھے آپ ان کے پاس ﴿اِذْ یَخْتَصِمُوْنَ﴾ جب اُنھوں نے آپس میں جھگڑا کیا اور ہر ایک یہ چاہتا تھا کہ حضرت مریم علیہا السلام کا کفیل میں بنوں۔ یہ واقعہ اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بذریعہ وحی بتایا ہے۔ یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت اور رسالت کی دلیل ہے۔

حضرت مریم علیہا السلام اور حضرت جبرئیل علیہ السلام کا مکالمہ

حضرت مریم علیہا السلام جب سنِ بلوغت کو پہنچ گئیں تو فرشتوں نے آ کر آپ کو بشارت دی۔ آگے اس کا ذکر ہے۔ ﴿اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ یٰمَرْیَمُ﴾ جس وقت کہا فرشتوں نے اے مریم! اس مقام پر اجمال ہے اور سولھویں پارے میں سورۃ مریم میں تفصیل ہے کہ حضرت مریم علیہا السلام حضرت زکریا علیہ السلام کے پاس جس کمرے میں رہتی تھیں اس کی بیرونی دیوار کا جو کونہ تھا جہاں دو دیواریں اکٹھی ہوتی تھیں۔ دونوں دیواروں پر کیل ٹھونکے ہوئے تھے اور ان کیلوں کے ساتھ ٹاٹ باندھ کر لٹکایا ہوا تھا۔ چوں کہ سادہ زمانہ تھا۔ تو جب غسل کرنا ہوتا تھا تو ٹاٹ لٹکا لیتی تھیں۔ ایک دن ٹاٹ لٹکایا اور غسل کیا اور کپڑے پہنے تو ﴿فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِیًّا﴾ "پس وہ فرشتہ متمثل ہوا ان کے سامنے ایک پورے انسان کی شکل میں۔" یعنی دیکھا تو ایک موٹا تازہ خوب صورت، تندرست نوجوان سامنے کھڑا ہے۔ حضرت مریم علیہا السلام گھبرا گئیں کہ اس تنہائی کے مقام میں اس مرد کا آنا اچھی نیت سے نہیں ہے ﴿قَالَتْ﴾ "کہنے لگیں" ﴿اَعُوْذُ بِالرَّحْمٰنِ مِنْكَ اِنْ كُنْتَ تَقِیًّا﴾ "میں تجھ سے خدائے رحمٰن کی پناہ میں آتی ہوں اگر تو متقی ہے۔"

یعنی اگر تو پرہیزگار ہے رب سے ڈرتا ہے تو میں تجھے رحمٰن کا واسطہ دیتی ہوں چلا جا تو یہاں کیوں آیا ہے؟ اس نے بڑے اطمینان کے ساتھ کہا ﴿ اِنَّمَآ اَنَا رَسُوْلُ رَبِّكِ ﴾ بے شک میں تو بھیجا ہوا ہوں تیرے رب کی طرف سے۔ یعنی میں جبرئیل ہوں تجھے خوش خبری سنانے کے لیے آیا ہوں۔ جبرئیل علیہ السلام کے ساتھ اور فرشتے بھی تھے مگر متکلم جبرئیل علیہ السلام تھے۔ یہاں یہ الفاظ ہیں۔

﴿ اِنَّ اللّٰهَ یُبَشِّرُكِ ﴾ بے شک اللہ تعالیٰ تجھے خوش خبری دیتا ہے ﴿ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ ﴾ اپنی طرف سے ایک کلمے کی۔ مراد عیسیٰ علیہ السلام ہیں۔ کیوں کہ عیسیٰ کو روح اللہ بھی کہتے ہیں اور کلمۃ اللہ بھی کہتے ہیں۔ اس واسطے کہ اللہ تعالیٰ نے باپ کی وساطت کے بغیر کلمہ کن کے ساتھ پیدا فرمایا اور نام بھی اللہ تعالیٰ نے خود رکھا ﴿ اسْمُهُ الْمَسِیْحُ عِیْسَى ابْنُ مَرْیَمَ ﴾ نام اس کا مسیح عیسیٰ ابن مریم ہوگا۔ مسیح ان کا لقب اور عیسیٰ ان کا نام تھا (علیہ السلام)۔

مسیح کا معنیٰ :

محققین فرماتے ہیں کہ لفظ عیسیٰ ایشوع کا معرب ہے۔ یعنی عیسیٰ علیہ السلام کا نام عبرانی زبان میں ایشوع تھا۔ اور مسیح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بھی کہتے ہیں اور دجال کو بھی۔ لیکن فقہائے کرام، محدثین عظام اور مفسرین کرام رحمہم اللہ دو طرح سے فرق بیان کرتے ہیں۔

- ایک یہ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو جو مسیح کہا جاتا ہے وہ مَسَحَ یَمْسَحُ سے ہے۔ معنیٰ ہے ہاتھ پھیرنا۔ اور اسی سے ہے ﴿ وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ ﴾ اور مسح کرو اپنے سروں کا۔ یعنی اپنے سروں پر ہاتھ پھیرو۔ تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نابینے کی آنکھوں پر ہاتھ پھیرتے تھے وہ رب کے حکم سے بینا ہو جاتا تھا۔ برص والے کے جسم پر ہاتھ پھیرتے تھے وہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے ٹھیک ہو جاتا تھا۔ اس واسطے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مسیح کہا جاتا ہے۔

دجال ساری زمین پر پھرے گا سوائے چار جگہوں کے :

اور دجال کا نام جو مسیح ہے وہ سَاحَ یَسِیْحُ سَیَاحَةً سے ہے۔ جس کا معنیٰ ہے سیر و سیاحت کرنا۔ اور دجال ساری زمین پر پھرے گا سوائے چار جگہوں کے۔ مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ، بیت المقدس کا شہر اور طور کا پہاڑ۔ ان چار جگہوں کے علاوہ ساری زمین پر اس کے ناپاک قدم پڑیں گے۔ اس واسطے اس کو مسیح کہتے ہیں۔ مذکورہ چار جگہوں میں بھی داخل ہونے کی بڑی کوشش کرے گا مگر اللہ تعالیٰ کے فرشتے اس کا منہ پھیر دیں گے۔ دجال دنیا میں صرف چالیس دن رہے گا۔ پہلا دن ایک سال کے برابر ہوگا۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ حضرت! وہ ایک دن جو سال کے برابر لمبا ہوگا تو اس میں نمازیں ایک دن کی پڑھیں گے یا ایک سال کی؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نمازیں ایک سال کی پڑھنی ہیں۔ دوسرا دن ایک ماہ کے برابر ہوگا اور نمازیں ایک ماہ کی پڑھنی ہیں۔ تیسرا دن ایک ہفتے کے برابر ہوگا اور نمازیں ایک ہفتے کی پڑھنی ہیں۔ باقی

سینتیس[۳۷] دن عام دنوں کے برابر ہوں گے یعنی چوبیس گھنٹوں کے۔

استدراج دجال کا ذکر :

تو دجال چالیس دن دنیا میں رہے گا اور بڑا فتور مچائے گا۔ خدائی کا دعویٰ کرے گا۔ ایسی جگہ جائے گا جہاں پانی کا ایک قطرہ بھی نہیں ہوگا۔ لوگ کہیں گے اگر تو خدا ہے تو ہم پر بارش برسا۔ مسمریزم کے ذریعے اشارہ کرے گا بادل اکٹھے ہو جائیں گے، بارش ہوگی۔ لوگ کہیں گے ہمیں اور کون سا خدا چاہیے بس یہی خدا ہے۔ کوئی کہے گا میرے پاس کوئی شے نہیں ہے میں بھوکا مر رہا ہوں۔ زمین پر پاؤں مارے گا زمین سونا چاندی اگل دے گی۔ کہے گا اُٹھا لے مزے کر۔ اور جو اس کو نہیں مانے گا اس کے گھر کا سارا سامان اس کے پیچھے چل پڑے گا۔ کیا پیٹیاں یا چار پائیاں اور کیا پیڑیاں۔ مسلمان کا گھر اس طرح صاف ہو جائے گا جس طرح ہتھیلی ہوتی ہے۔ مسلمانوں کے لیے کھانے کے واسطے بھی کچھ نہ ہوگا۔ اور مسلمان کی خوراک ہوگی سبحان اللہ، سبحان اللہ۔ بعض بدحواس ہوں گے جو یہ کلمات نہ پڑھ سکیں گے۔ ریت اور مٹی پھانکیں گے رب تعالیٰ اس کو شکر بنا دے گا۔

- اور دوسرا فرق مسیح علیہ السلام اور مسیح دجال میں یہ بیان کرتے ہیں کہ اگر اس کو دونوں جگہ مَسَحَ ہی سے لیا جائے تو فعیل کا وزن فاعل کے معنیٰ میں بھی آتا ہے اور مفعول کے معنیٰ میں بھی آتا ہے۔ تو عیسیٰ علیہ السلام کے نام کے ساتھ مسیح کا لفظ فاعل کے معنیٰ میں ہے، مسح کرنے والے۔ اور دجال کے ساتھ مسیح کا لفظ مفعول کے معنیٰ میں ہے۔ یعنی ممسوح عینہٗ اس کی ایک آنکھ کا نور مٹا ہوا ہوگا۔ دائیں آنکھ سے کانا ہوگا۔ اس کی آنکھ جو کانی ہے وہ باہر نکلی ہوگی اور بڑی بُری نظر آئے گی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یاد رکھو! میں تمھیں اس کی ایک ایسی علامت بتاتا ہوں کہ مجھ سے پہلے کسی پیغمبر نے نہیں بتائی۔ فرمایا دجال کانا ہوگا اور تمھارا رب کانا نہیں ہے۔ اس کے جادو اور مسمریزم سے متاثر ہو کر اس کو رب نہ بنا لینا۔ اور بڑا کچھ کرے گا مگر اپنی آنکھ ٹھیک نہیں کر سکے گا۔ اس کی رب تعالیٰ اس کو قدرت نہیں دے گا۔ باقی سب استدراج ہوگا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ماں کی گود میں تقریر :

﴿ وَجِيْهًا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ﴾ حضرت عیسیٰ علیہ السلام رتبے والے ہوں گے دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی ﴿ وَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ﴾ اور اللہ تعالیٰ کے مقربین میں سے ہوں گے۔ اور ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے پیغمبر سے زیادہ مقرب کون ہو سکتا ہے ﴿ وَيُكَلِّمُ النَّاسَ ﴾ اور کلام کرے گا لوگوں کے ساتھ ﴿ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا ﴾ گود میں اور ادھیڑ عمر میں۔ لغت عرب میں تیس اور چالیس سال کی درمیانی عمر کو کہولت کہتے ہیں۔ اس وقت بدنی قوتیں عروج پر ہوتی ہیں اور چالیس سال کے بعد آہستہ آہستہ کم ہونا شروع ہو جاتی ہیں۔

تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام جس طرح جوانی میں گفتگو کریں گے گود میں بھی اسی طرح گفتگو کریں گے۔ اور گود میں گفتگو کرنے کا ذکر سولھویں پارے میں آتا ہے کہ حضرت مریم علیہا السلام جب عیسیٰ علیہ السلام کو لے کر آئیں تو لوگوں نے سوال کیا ﴿ يٰمَرْيَمُ لَقَدْ جِئْتِ

شَیْئًا فَرِیًّا ﴾ "اے مریم! البتہ تحقیق لائی ہے تو ایک چیز او پری۔" کہ یہ کیا حرکت ہے؟ نہ تیری شادی، نہ تیرا خاوند اور بچہ اُٹھائے پھرتی ہے ﴿ فَاَشَارَتْ اِلَیْهِ ﴾ "پس حضرت مریم علیہا السلام نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف اشارہ کیا کہ اس سے پوچھو کہاں سے آیا ہے؟ ﴿ قَالُوْا كَیْفَ نُكَلِّمُ مَنْ كَانَ فِی الْمَهْدِ صَبِیًّا ﴾ کہنے لگے ہم کیسے پوچھیں اس بچے سے جو گود میں ہے۔ وہ کیا بات کرے گا؟ تو بتا۔

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے تقریر شروع فرما دی ﴿ اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰهِ ﴾ تحقیق میں اللہ تعالیٰ کا بندہ ہوں۔ نہ خدا ہوں نہ خدا کا بیٹا ہوں، نہ اس کی خدائی میں شریک ہوں ﴿ اٰتٰىنِیَ الْكِتٰبَ وَ جَعَلَنِیْ نَبِیًّا ﴾ اللہ تعالیٰ نے میرے ساتھ کتاب دینے کا وعدہ فرمایا ہے اور رب تعالیٰ نے مجھے نبی بنایا ہے۔ یہ ولادت کا پہلا یا دوسرا دن تھا۔ اور یہ سب کچھ سنتے اور دیکھتے ہوئے بھی ان کے دلوں پر تالے لگے ہوئے تھے، نہ مانے۔ بلکہ بدستور آج تک ﴿ وَّ بِكُفْرِهِمْ وَ قَوْلِهِمْ عَلٰى مَرْیَمَ بُهْتَانًا عَظِیْمًا ﴾ [النساء:۱۵۶] "باندھا انھوں نے حضرت مریم علیہا السلام پر بہتانِ عظیم" کہ معاذ اللہ یہ بچہ حلالی نہیں ہے۔ ہم اس کو نبی کیوں مانیں؟ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْمِ۔ ضد اور ہٹ دھرمی کا دنیا میں کوئی علاج نہیں ہے۔

فرمایا ﴿ وَّ مِنَ الصّٰلِحِیْنَ ﴾ اور نیکوں میں سے ہوگا ﴿ قَالَتْ رَبِّ ﴾ کہا اُس نے اے میرے رب! ﴿ اَنّٰى یَكُوْنُ لِیْ وَلَدٌ ﴾ کس طرح ہوگا میرا لڑکا ﴿ وَّ لَمْ یَمْسَسْنِیْ بَشَرٌ ﴾ اور نہیں ہاتھ لگایا مجھے کسی بشر نے۔ نہ جائز طریقے سے اور نہ ناجائز طریقے سے۔ اور سولھویں پارے میں ہے ﴿ وَّ لَمْ اَكُ بَغِیًّا ﴾ اور نہیں ہوں میں بدکار۔ کیوں کہ بچہ ملنے کے دو ہی طریقے ہیں۔ حلال طریقے سے یا حرام طریقے سے۔ اور یہاں دونوں نہیں ہیں۔

﴿ قَالَ كَذٰلِكِ اللّٰهُ ﴾ اللہ تعالیٰ کے فرشتے نے کہا اسی طرح اللہ تعالیٰ ﴿ یَخْلُقُ مَا یَشَآءُ ﴾ پیدا کرتا ہے جو چاہتا ہے اس کے لیے کوئی کام مشکل نہیں ہے ﴿ اِذَا قَضٰۤى اَمْرًا ﴾ جب طے کرتا ہے کسی معاملے کو ﴿ فَاِنَّمَا یَقُوْلُ لَهٗ ﴾ پس پختہ بات ہے کہتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو ﴿ كُنْ فَیَكُوْنُ ﴾ تو ہو جا، پس وہ ہو جاتا ہے۔ تو اس وقت حضرت جبرئیل علیہ السلام نے حضرت مریم علیہا السلام کو ان الفاظ کے ساتھ خوش خبری سنائی کہ رب دینے والا ہے میں خوش خبری سنانے والا ہوں تمھیں کیا پریشانی ہے۔

﴿ وَ یُعَلِّمُهُ الْكِتٰبَ ﴾ اور اللہ تعالیٰ اس کو تعلیم دے گا کتاب کی ﴿ وَ الْحِكْمَةَ ﴾ اور دانائی کی ﴿ وَ التَّوْرٰىةَ وَ الْاِنْجِیْلَ ﴾ اور تورات اور انجیل کی ﴿ وَ رَسُوْلًا اِلٰى بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ ﴾ اور رسول بنا کر بھیجے گا بنی اسرائیل کی طرف (عیسیٰ علیہ السلام نے کہا) ﴿ اَنِّیْ قَدْ جِئْتُكُمْ ﴾ بے شک میں تحقیق لایا ہوں تمھارے پاس ﴿ بِاٰیَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ﴾ نشانی تمھارے رب کی طرف سے ﴿ اَنِّیْۤ اَخْلُقُ لَكُمْ مِّنَ الطِّیْنِ ﴾ بے شک میں بناتا ہوں تمھارے لیے گارے سے ﴿ كَهَیْـَٔةِ الطَّیْرِ ﴾ پرندے کی شکل کی طرح ﴿ فَاَنْفُخُ فِیْهِ ﴾ پس میں اس میں پھونک مارتا ہوں ﴿ فَیَكُوْنُ طَیْرًا ﴾ پس ہو جاتا ہے وہ پرندہ ﴿ بِاِذْنِ اللّٰهِ ﴾ اللہ تعالیٰ کے حکم کے ساتھ ﴿ وَ اُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَ الْاَبْرَصَ ﴾ اور اچھا کرتا ہوں میں مادر زاد

اندھوں کو اور برص والوں کو ﴿وَ اُحْیِ الْمَوْتٰى بِاِذْنِ اللّٰهِ﴾ اور زندہ کرتا ہوں مردوں کو اللہ تعالیٰ کے حکم کے ساتھ ﴿وَ اُنَبِّئُكُمْ بِمَا تَاْكُلُوْنَ﴾ اور میں تمھیں خبر دیتا ہوں اُس چیز کی جو تم کھاتے ہو ﴿وَ مَا تَدَّخِرُوْنَ فِیْ بُیُوْتِكُمْ﴾ اور جو تم ذخیرہ کرتے ہو اپنے گھروں میں ﴿اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لَّكُمْ﴾ بے شک البتہ اس میں نشانی ہے تمھارے واسطے ﴿اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ﴾ اگر ہو تم مومن ﴿وَ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیَّ﴾ اور میں تصدیق کرنے والا ہوں اُس چیز کی جو مجھ سے پہلے نازل ہوئی ﴿مِنَ التَّوْرٰىةِ﴾ تورات سے ﴿وَ لِاُحِلَّ لَكُمْ﴾ اور تاکہ میں حلال کر دوں تمھارے واسطے ﴿بَعْضَ الَّذِیْ﴾ بعض وہ چیزیں ﴿حُرِّمَ عَلَیْكُمْ﴾ جو تم پر حرام کی گئی تھیں ﴿وَ جِئْتُكُمْ بِاٰیَةٍ﴾ اور میں آیا ہوں تمھارے پاس نشانی لے کر ﴿مِّنْ رَّبِّكُمْ﴾ تمھارے رب کی طرف سے ﴿فَاتَّقُوا اللّٰهَ﴾ پس ڈرو تم اللہ تعالیٰ سے ﴿وَ اَطِیْعُوْنِ﴾ اور میری اطاعت کرو ﴿اِنَّ اللّٰهَ رَبِّیْ وَ رَبُّكُمْ﴾ بے شک اللہ تعالیٰ میرا رب ہے اور تمھارا رب ہے ﴿فَاعْبُدُوْهُ﴾ پس تم اس کی عبادت کرو ﴿هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِیْمٌ﴾ یہ ہے سیدھا راستہ۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا سب پیغمبر لکھنا پڑھنا جانتے تھے

کل کے درس میں یہ بیان ہوا تھا کہ جب حضرت جبرئیل علیہ السلام نے حضرت مریم علیہا السلام کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی خوش خبری سنائی تو انھوں نے کہا کہ میرے ہاں لڑکا کیسے ہوگا؟ جب کہ مجھے کسی بشر نے ہاتھ تک نہیں لگایا۔ جبرئیل علیہ السلام نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تمھیں اسی حالت میں عطا فرمائے گا اس کے لیے کوئی مشکل نہیں ہے۔ وہ بچہ بھی عنایت فرمائے گا ﴿وَ یُعَلِّمُهُ الْكِتٰبَ﴾ اور اللہ تعالیٰ اس کو تعلیم دے گا کتاب کی۔ کتاب سے کیا مراد ہے؟ تو مفسرین کرام رحمہم اللہ اس کی ایک تفسیر یہ فرماتے ہیں کہ لکھنا مراد ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ عیسیٰ علیہ السلام کو لکھنا سکھائے گا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے جتنے پیغمبر تشریف لائے ہیں سب لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ اور یہ صرف آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت ہے ﴿یَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِیَّ الْاُمِّیَّ﴾ [الاعراف:۱۵۷] "وہ اتباع کرتے ہیں رسول کی جو نبی اُمی ہے۔" ﴿وَ لَا تَخُطُّهٗ بِیَمِیْنِكَ﴾ [العنکبوت:۴۸] "اور نہ لکھتے تھے اس کو اپنے دائیں ہاتھ سے۔" یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے۔ تو ایک تفسیر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ عیسیٰ علیہ السلام کو لکھنے کی تعلیم دے گا اور دانائی کی تعلیم دے گا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام قرآن وسنت کی تعلیم دیں گے

بعض مفسرین کرام رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ کتاب سے مراد قرآن کریم ہے اور حکمت سے مراد حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ عیسیٰ علیہ السلام کو قرآن کریم اور سنت کی تعلیم دیں گے۔ چوں کہ اہل اسلام کا اجماعی عقیدہ ہے اور اس پر قرآن پاک کی آیات اور احادیث متواترہ موجود ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام زندہ آسمانوں پر اُٹھائے گئے ہیں اور قیامت سے پہلے

زمین پر نازل ہوں گے اور چالیس سال تک اس اُمت پر حکمرانی کریں گے اور قرآن وسنت کے مطابق ہی فیصلے فرمائیں گے۔ لہٰذا قرآن وسنت کا علم ان کے لیے ضروری ہے۔ یہ علم ہوگا تو اس کی روشنی میں فیصلے فرمائیں گے اور اسی کے مطابق خود بھی عمل کریں گے۔ مثلاً: بنی اسرائیل پر دو نمازیں فرض تھیں۔ وہ دو نمازیں پڑھتے تھے۔ لیکن حضرت عیسیٰ علیہ السلام جب تشریف لائیں گے تو پانچ نمازیں پڑھیں گے اور پانچ ہی پڑھائیں گے جس طرح ہم پڑھتے ہیں۔

نزولِ عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پہلی نماز فجر کی نماز ہوگی۔ وہ اس طرح کہ دمشق کی جامع مسجد اُموی میں صبح کی نماز تیار ہوگی۔ امام مہدی علیہ السلام آگے مصلے پر کھڑے ہوں گے اور تکبیر ہو رہی ہوگی کہ پیچھے سے آوازیں آئیں گی نَزَلَ عِیْسَی ابْنُ مریم کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام تشریف لے آئے ہیں اور ان کا مقام بہت بلند ہے۔

صحابہ رضی اللہ عنہم کا درجہ امام مہدی علیہ السلام سے زیادہ ہے

اور یاد رکھنا! کہ بے شک امام مہدی علیہ السلام کا مقام بھی اپنی جگہ بہت بلند ہے مگر وہ کسی صحابی کے درجے کو نہیں پہنچ سکتے۔ جب امام مہدی علیہ السلام کسی صحابی کے درجے کو نہیں پہنچ سکتے تو نبی کے درجے کو کس طرح پہنچ سکتے ہیں؟ کیوں کہ پیغمبر، پیغمبر ہے۔

تو حضرت امام مہدی علیہ السلام جب پیچھے ہٹنے کی کوشش کریں گے تو حدیث پاک میں آتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ان کے کندھے پر ہاتھ رکھیں گے اور فرمائیں گے تم نماز پڑھاؤ میں نے نماز تمھارے پیچھے پڑھنی ہے۔ تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام پہلی نماز فجر کی امام مہدی علیہ السلام کے پیچھے کھڑے ہو کر دمشق کی جامع مسجد اُموی میں پڑھیں گے۔ پھر یہی (یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام) پانچ نمازیں پڑھائیں گے اور اسی دین پر عمل کریں گے۔

آگے فرمایا ﴿وَالْحِكْمَةَ﴾ اور دانائی کی (تعلیم بھی اللہ تعالیٰ انہیں دے گا۔) ﴿وَالتَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ﴾ اور اللہ تعالیٰ سکھائے گا ان کو تورات اور انجیل۔ تورات بنی اسرائیل کی مرکزی کتاب تھی اور بڑی جامع مانع تھی۔ آسمانی کتابوں میں قرآن کریم کے بعد تورات کا مقام بہت بلند ہے اور انجیل کا تتمہ ہے۔ اور انجیل کی حیثیت تم اس طرح سمجھو کہ ایک ہوتا ہے اخبار اور ایک ہوتا ہے ضمیمہ۔ اصل اخبار ہوتا ہے جس میں خبروں کی تفصیل ہوتی ہے۔ اور ضمیمے میں دو چار موٹی موٹی باتیں ہوتی ہیں۔ تو اصل کتاب تو تورات تھی اور انجیل اس کا ضمیمہ تھی۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات کا ذکر

﴿وَرَسُوْلًا اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ﴾ اور رسول بنا کر بھیجا بنی اسرائیل کی طرف۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی رسالت صرف بنی اسرائیل کے لیے تھی اور کسی قوم کے لیے نہیں تھی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل سے فرمایا ﴿اَنِّیْ قَدْ جِئْتُكُمْ﴾ بے شک میں

تحقیق لایا ہوں تمھارے پاس ﴿بِاٰیَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ﴾ نشانی (معجزہ) تمھارے رب کی طرف سے۔ اپنی طرف سے نہیں۔ کیوں کہ معجزہ اللہ تعالیٰ کا فعل ہوتا ہے اور نبی کے ہاتھ پر صادر ہوتا ہے۔ معجزے میں نبی کا ذاتی طور پر کوئی دخل نہیں ہوتا اور کرامت میں ولی کا ذاتی طور پر کوئی دخل نہیں ہوتا۔ آگے نشانی کا ذکر ہے۔

﴿اَنِّیْٓ اَخْلُقُ لَكُمْ مِّنَ الطِّیْنِ﴾ بے شک میں بناتا ہوں تمھارے لیے گارے سے ﴿كَهَیْـَٔةِ الطَّیْرِ﴾ پرندے کی شکل کی طرح ﴿فَاَنْفُخُ فِیْهِ﴾ پس میں اس میں پھونک مارتا ہوں ﴿فَیَكُوْنُ طَیْرًا﴾ پس ہو جاتا ہے وہ پرندہ ﴿بِاِذْنِ اللّٰهِ﴾ اللہ تعالیٰ کے حکم کے ساتھ۔ یعنی وہ مٹی سے بنایا ہوا پرندہ سچ مچ اُڑ جائے گا۔ رہی یہ بات کہ وہ کون سا پرندہ تھا؟ تو مفسرین کرام رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ چمگادڑ تھا۔ اور چمگادڑ کافی چیزوں میں انسان کے مشابہ تھا۔

انسان کے متعلق سائنس دانوں کی تحقیق اور قرآن

لطیفہ: ڈارون، ہیکسلے، ہیگل اور ہیون، یہ سائنس دان گزرے ہیں۔ ان مردودوں کی تحقیق یہ ہے کہ انسان پہلے مینڈک تھا پھر بندر بنا، دم کٹی تو انسان بن گیا۔ یہ ڈارون کا نظریہ تھا۔ پھر اس کے مقابلے میں ایسے ہی پاگل اور اٹھے۔ وہ افریقہ اور دوسرے ملکوں کے سائنس دان ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ڈارون کا نظریہ غلط ہے کہ انسان بندر سے بنا ہے۔ بلکہ انسان چمگادڑ سے بنا ہے۔ اے آدم کے بیٹو! انسان کو انسان ہی رہنے دو۔ تمھیں کیا تکلیف ہے؟ کبھی مینڈک بناتے ہو، کبھی بندر بناتے ہو، کبھی چمگادڑ بناتے ہو۔

انسان کو اللہ تعالیٰ نے انسان ہی بنایا ہے۔ چنانچہ فرمایا ﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِیْنٍ﴾ [المومنون:۱۲] "اور ہم نے انسان کو مٹی کے خلاصے سے پیدا کیا۔" ان لوگوں کی عقلیں ماری گئی ہیں یہ بے وقوف لوگ ہیں۔ انسان جس شکل میں ہے رب تعالیٰ نے اسی شکل میں پیدا فرمایا ہے۔ باقی سب خرافات ہیں۔

تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام مٹی سے چمگادڑ بناتے اس میں پھونک مارتے وہ رب تعالیٰ کے حکم سے اُڑ کر چلی جاتی اور یہ منظر سب لوگ دیکھتے تھے۔ ﴿وَاُبْرِئُ الْاَكْمَهَ﴾ اور اچھا کرتا ہوں میں مادرزاد اندھوں کو آکمہ مادرزاد اندھے کو کہتے ہیں اور اس کا طب اور ڈاکٹری کی دنیا میں کوئی علاج نہیں ہے۔ مگر عیسیٰ علیہ السلام اس کی آنکھوں پر ہاتھ پھیرتے تھے وہ بینا ہو جاتا تھا اور اس طرح دیکھتا تھا جس طرح میں اور آپ ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں۔ ﴿وَالْاَبْرَصَ﴾ اور برص والوں کو ٹھیک کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے حکم سے۔ برص پھلبہری کو بھی کہتے ہیں اور برص کا معنیٰ جذام کا بھی کیا ہے۔ اور جذام میں سوداوی مادہ بڑھ جاتا ہے اور اس کے مریض کے ہاتھ پاؤں کی انگلیاں اور ناک وغیرہ گل کر گر جاتے ہیں۔ طب والے کہتے ہیں کہ یہ متعدی بیماری ہے۔ یعنی ایک سے دوسرے کو لگ جاتی ہے۔ بخاری شریف میں روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((فِرَّ مِنَ الْمَجْذُوْمِ فِرَارَكَ مِنَ الْاَسَدِ)) "کوڑھے سے اس طرح بھاگو جس طرح شیر سے بھاگا جاتا ہے۔" ہاں! اگر کسی کا ایمان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جیسا ہو

تو الگ بات ہے۔ کیوں کہ آنحضرت ﷺ نے مجذوم کے ساتھ بیٹھ کر روٹی کھائی بھی ہے اور کھلائی بھی ہے اور یہ دیکھ کر لوگ حیران رہ گئے۔ کیوں کہ اللہ تعالیٰ کی مرضی کے بغیر کچھ نہیں ہوسکتا۔ مگر عوام کا حال یہ ہے کہ اگر کسی بیمار کی تیمارداری کے لیے جائیں اور اس کے اسی مرض سے بیمار ہو جائیں تو اسی کی طرف نسبت کرتے ہیں کہ فلاں نے مجھے بھی بیمار کر دیا ہے۔ لہٰذا عقیدے کی اصلاح ضروری ہے۔

قرآن کریم بھلانے والوں کا انجام

اور حدیث پاک میں آتا ہے کہ جس نے قرآن یاد کیا اور پھر بھول گیا اس کو قیامت والے دن کوڑھا کر کے اُٹھایا جائے گا۔ اس واسطے میں کہا کرتا ہوں کہ ہر بچے کو حفظ نہ کراؤ۔ پہلے تم اس کا حافظہ دیکھ لو۔ اگر حافظہ قوی ہے قرآن پاک کو یاد رکھ سکتا ہے تو ٹھیک ہے ورنہ حفظ نہ کراؤ۔ کیوں کہ یاد کرنا فرض نہیں ہے فضیلت کی بات ہے۔ لیکن یاد کر کے بھول جانا بہت بڑا گناہ ہے۔ اور میں اساتذہ کو بھی سبق دیتا ہوں کہ تم بچے کا اندازہ لگاؤ، لڑکا ہو یا لڑکی۔ وہ اس طرح کہ اس کو ایک پارہ یاد کراؤ اور دیکھو کہ کتنی دیر میں یاد کیا ہے، منزل کیسی ہے؟ اگر مضبوط حافظے والا ہے تو ٹھیک ہے ورنہ قرآن پاک کا ترجمہ اور دوسرے دینی علوم اس کو پڑھاؤ۔ کیوں کہ یہ بھی دین کا حصہ ہیں۔

تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کوڑھ کی بیماری والے کو بھی ٹھیک کرتے تھے اللہ تعالیٰ کے فضل سے اور ایمان کی شرط کے ساتھ۔ وہ اس طرح کہ بیمار سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرماتے کہ دیکھ بھائی! ٹھیک اللہ تعالیٰ نے کرنا ہے میرا کام ہے ہاتھ پھیرنا۔ باقی کارروائی میرے بس میں نہیں ہے وہ اللہ تعالیٰ کا کام ہے۔ لیکن یہ وعدہ کر کہ مثال کے طور پر رب تعالیٰ تجھے آنکھیں بینائی والی عنایت فرما دے تو تو ایمان لے آئے گا یا تو مومن ہو جائے گا۔ اگر وہ کہتا کہ ہاں! میں ایمان لے آؤں گا۔ تب ہاتھ پھیرتے تھے۔ اسی طرح برص کے مرض والے کے ساتھ بھی پہلے طے کر لیتے تھے۔ اور تفسیر جلالین وغیرہ میں لکھا ہے کہ تقریباً پچاس ہزار آدمی ان بیماریوں والے انھوں نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے اچھے کیے۔

﴿وَاُحْیِ الْمَوْتٰی بِاِذْنِ اللّٰہِ﴾ اور زندہ کرتا ہوں مردوں کو اللہ تعالیٰ کے حکم کے ساتھ۔ اس مقام پر تفسیروں میں لکھا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے چار مردوں کو زندہ کیا۔ پہلا حضرت نوح علیہ السلام کا بیٹا سام تھا۔ ویسے حضرت نوح علیہ السلام کے چار بیٹے تھے۔ حام، سام، یافث اور کنعان جس کا نام یام تھا۔ یہ کفر پر مرا۔ باقی تین مسلمان تھے۔ تو سام کو زندہ کیا۔ وہ کچھ مدت زندہ رہا پھر فوت ہو گیا۔ دوسرا عازر رحمۃ اللہ علیہ تھا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا دوست تھا۔ اللہ تعالیٰ کے حکم سے اس کو زندہ کیا اور یہ دیر تک زندہ رہا۔ اس نے شادی بھی کی اور اولاد بھی ہوئی۔ تیسرا: ایک بوڑھی عورت تھی اس کا بیٹا تھا۔ اس کے فوت ہونے پر بے چاری غمگین رہتی تھی۔ اللہ تعالیٰ کے حکم سے اس کو زندہ کیا۔ وہ بھی دیر تک زندہ رہا اور آگے اس سے نسل چلی۔ چوتھا ایک چونگی پر ملازم تھا۔ عاشر اس کا نام تھا۔ اس کی بیٹی فوت ہو گئی اور یہ بے چارہ بڑا غمگین رہتا تھا۔ اللہ تعالیٰ کے حکم سے اُس کی بیٹی کو زندہ کیا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام صرف بنی اسرائیل کے پیغمبر تھے

﴿وَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا تَاْكُلُوْنَ﴾ اور میں تمھیں خبر دیتا ہوں اس چیز کی جو تم کھاتے ہو ﴿وَمَا تَدَّخِرُوْنَ فِيْ بُيُوْتِكُمْ﴾ اور جو تم ذخیرہ کرتے ہو اپنے گھروں میں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام یہ خبریں صرف بنی اسرائیل کی قوم کو دیتے تھے کہ تو فلاں چیز کھا کے آیا ہے اور تو نے گھر کے فلاں کونے میں یہ چیز رکھی ہے اور فلاں کونے میں یہ چیز رکھی ہے۔ اور یہ سب خبریں بطور معجزہ کے تھیں اور خاص بنی اسرائیل قوم کے لیے تھیں۔ حالانکہ وہاں اور بھی کافی قومیں آباد تھیں۔ لیکن حضرت عیسیٰ علیہ السلام چوں کہ صرف بنی اسرائیل کے واسطے رسول بنا کر بھیجے گئے تھے لہٰذا ان سب چیزوں کا تعلق قوم بنی اسرائیل کے ساتھ تھا۔

چنانچہ انجیل متی میں مذکور ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنے حواریوں اور شاگردوں کو درس دے رہے تھے کہ ایک عورت آئی اور کہنے لگے کہ میں بھی آپ سے کچھ فیض حاصل کرنا چاہتی ہوں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ تیرا کس خاندان سے تعلق ہے؟ اس نے کہا کہ کنعان کے خاندان سے۔ یہ بنی اسرائیل سے الگ ایک خاندان تھا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ میرا فیض تیرے لیے نہیں ہے۔ کیوں میرا فیض صرف بنی اسرائیل کے لیے ہے تو میری کلاس میں شامل ہی نہیں ہے۔ وہ عورت بھی بڑی ضدی تھی بیٹھی رہی اور بار بار کہتی رہی کہ مجھے بھی فیض دو۔ شاگردوں نے کہا حضرت! اس عورت سے جان چھڑاؤ۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ میں نے تو اس کو بڑے احسن طریقے سے کہہ دیا ہے کہ میرا فیض تیرے لیے نہیں ہے میں تو صرف بنی اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے لیے بھیجا گیا ہوں۔ (لیکن افسوس کہ آج ان بھیڑوں نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی کھیتی کو چر لیا ہے) پھر فرمایا لڑکوں کی روٹی لے کر کتوں کو ڈال دینا اچھا نہیں۔ یعنی گھر کے بچوں کے لیے ضرورت کے مطابق جو کھانا تیار کیا ہے وہ کتوں کو نہ ڈالو۔ یہ مثال ہے کہ میرا وقت تمھارے لیے نہیں ہے۔

تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت صرف بنی اسرائیل کے لیے تھی۔ اور جب قیامت سے پہلے آئیں گے تو وصفِ نبوت کے ساتھ آئیں گے۔ کیوں کہ نبوت چھینی نہیں جاتی۔ مگر آئیں گے امتی ہونے کی حیثیت سے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جرنیل اور باوفا کمانڈر کی حیثیت سے اسلام کو نافذ کریں گے۔ اور جس علاقے میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہوں گے وہاں اسلام کے بغیر کوئی اور دین باقی نہیں رہے گا۔ ﴿اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لَّكُمْ﴾ بے شک البتہ اس میں نشانی ہے تمھارے واسطے ﴿اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ﴾ اگر ہو تم مومن۔ یعنی اتنے معجزے تمھیں دکھا دیے کہ بفضلِ اللہ تعالیٰ نابینا، بینا ہو گئے۔ اتنی چیزیں دیکھ کر بھی اگر تم ایمان نہ لاؤ تو ضد کا دنیا میں کوئی علاج نہیں ہے۔

بریلویوں نے یہودیوں کی طرح اسلام کا نقشہ بگاڑ دیا ہے

یہودی کہتے تھے کہ یہ ہمارے دین کا مخالف ہے۔ کیوں کہ یہودیوں نے دین کی شکل مسخ کر کے رکھ دی تھی اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس کی اصلاح فرماتے تھے۔ جس طرح آج کل اہل بدعت (بریلویوں) نے اس دین کا حلیہ بگاڑ کے رکھ دیا ہے جو

دین آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پیش فرمایا تھا اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے حاصل کر کے اس پر عمل کیا تھا۔ جو تابعین، تبع تابعین سے چلا آرہا تھا۔ اسے اس حد تک بگاڑا کہ جو بدعات ہیں وہ سنت بن گئی ہیں۔ اور جو سنت کو بیان کرے، حق بیان کرے اس کو وہابی کہہ دیتے ہیں۔

تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام جب اصل دین پیش کرتے تو یہودی کہتے کہ یہ ہمارے دین کا مخالف ہے۔ تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ان کا شبہ دور فرمایا کہ ظالمو! سن لو میں تو ﴿وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ﴾ اور میں تصدیق کرنے والا ہوں اُس چیز کی جو مجھ سے پہلے نازل ہوئی ﴿مِنَ التَّوْرٰىةِ﴾ تورات سے۔ یعنی میں تو تورات کا مُصَدِّق ہوں جھٹلانے والا نہیں ہوں۔ میرا تو اصل مذہب ہی تورات ہے۔ تم نے تورات کی تعلیم کو بدل ڈالا ہے میں تصحیح کرنے کے لیے آیا ہوں۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے خلاف یہودیوں کا احتجاج

اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی مخالفت کا اس وجہ سے بھی ان کو موقع مل گیا (آٹھویں پارے میں اس کا ذکر آئے گا، ان شاء اللہ تعالیٰ) کہ یہود کی سرکشی اور نافرمانی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان پر کچھ چیزیں حرام فرمائی تھیں۔ مثلاً: اونٹ اور بطخ اور شتر مرغ ان پر حرام تھا۔ ﴿ذٰلِكَ جَزَيْنٰهُمْ بِبَغْيِهِمْ﴾ [الانعام: ۱۴۶] "یہ سزا ہم نے ان کو دی تھی ان کی شرارت کے سبب سے۔" یہ چیزیں اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ذریعے ان پر حلال فرمادیں۔ یہودیوں کو بڑا مضبوط بہانہ مل گیا کہ دیکھو جی! یہ چیزیں حرام تھیں اور یہ کہتا ہے حلال ہیں۔ یہ ہمارے دین کو بگاڑتا ہے۔ یہودیوں نے احتجاج کیا، مظاہرے کیے کہ اس شخص کو روکو، اس کو سولی پر لٹکاؤ۔ یہ ہمارے بڑوں کی تعلیم کی مخالفت کرتا ہے۔ اس وقت رومیوں کی حکومت تھی اور شام کا گورنر تھا ہیروڈ۔ اس نے مرکز کو حالات سے آگاہ کیا۔ اگلی آیات میں بات آرہی ہے کہ جب انھوں نے بہت شور ڈالا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو سولی پر لٹکانے کا پروگرام بنالیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کے سارے منصوبے خاک میں ملادیے اور عیسیٰ علیہ السلام کو اپنے پاس اُٹھالیا۔

فرمایا ﴿وَلِأُحِلَّ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِيْ حُرِّمَ عَلَيْكُمْ﴾ اور تاکہ میں حلال کردوں تمھارے واسطے بعض وہ چیزیں جو تم پر حرام کی گئی تھیں۔ یعنی جو چیزیں تمھاری سرکشی اور نافرمانی کی وجہ سے حرام کی گئی تھیں وہ اللہ تعالیٰ نے میری وجہ سے تم پر حلال کردی ہیں۔ ﴿وَجِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ﴾ اور میں لایا ہوں تمھارے پاس نشانیاں تمھارے رب کی طرف سے ﴿فَاتَّقُوا اللّٰهَ﴾ پس اے لوگو! ڈرو تم اللہ تعالیٰ سے ﴿وَاَطِيْعُوْنِ﴾ اور میری اطاعت کرو۔

معجزاتِ عیسیٰ علیہ السلام

اور یہ چیزیں چوں کہ عموماً انسان سے صادر نہیں ہوسکتیں۔ مثلاً: مٹی کا پرندہ بنا کے اُڑا دینا، مردے کو زندہ کر دینا، کوڑھے کو اچھا کر دینا، اندھے کو بینا کر دینا۔ تو کہیں یہ نرالی اور اوپری چیزوں کا مجھ سے صدور دیکھ کر مجھے رب نہ سمجھ لینا ﴿اِنَّ اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ﴾ بے شک اللہ تعالیٰ میرا بھی رب ہے اور تمھارا بھی رب ہے۔ یہ تو معجزے ہیں رب تعالیٰ نے میرے ہاتھ پر صادر

کیے ہیں ﴿فَاعْبُدُوْهُ﴾ پس تم اس کی عبادت کرو۔ یعنی عبادت صرف رب کی کرنی ہے ﴿هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ﴾ یہ ہے سیدھا راستہ۔ جس کی دعوت دینے کے لیے میں آیا ہوں۔

﴿فَلَمَّآ﴾ پس جس وقت ﴿اَحَسَّ عِيْسٰى﴾ محسوس کیا عیسیٰ علیہ السلام نے ﴿مِنْهُمُ﴾ اُن بنی اسرائیلیوں سے ﴿الْكُفْرَ﴾ کفر ﴿قَالَ﴾ فرمایا ﴿مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ﴾ کون میری مدد کرتا ہے اللہ تعالیٰ کے ہاں جانے تک ﴿قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ﴾ کہا حواریوں نے ﴿نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ﴾ ہم اللہ تعالیٰ کے دین کے مددگار ہیں ﴿اٰمَنَّا بِاللّٰهِ﴾ ایمان لائے ہم اللہ تعالیٰ پر ﴿وَاشْهَدْ﴾ اور اے عیسیٰ علیہ السلام گواہ بن جانا ﴿بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ﴾ بے شک ہم فرماں بردار ہیں ﴿رَبَّنَآ اٰمَنَّا﴾ اے ہمارے رب ہم ایمان لائے ﴿بِمَآ اَنْزَلْتَ﴾ اُس چیز پر جو تو نے نازل کی ﴿وَاتَّبَعْنَا الرَّسُوْلَ﴾ اور ہم نے پیروی کی رسول کی ﴿فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ﴾ پس تو لکھ ہمیں حق کی گواہی دینے والوں میں سے ﴿وَمَكَرُوْا﴾ اور ان کافروں نے تدبیریں کیں ﴿وَمَكَرَ اللّٰهُ﴾ اور اللہ تعالیٰ نے بھی تدبیر کی ﴿وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ﴾ اور اللہ تعالیٰ سب سے بہتر تدبیر کرنے والا ہے ﴿اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسٰٓى﴾ جب فرمایا اللہ تعالیٰ نے اے عیسیٰ (علیہ السلام)! ﴿اِنِّيْ مُتَوَفِّيْكَ﴾ بے شک میں تجھے پورا پورا لینے والا ہوں ﴿وَرَافِعُكَ اِلَيَّ﴾ اور اپنی طرف تجھے اُٹھانے والا ہوں ﴿وَمُطَهِّرُكَ﴾ اور تجھے پاک کرنے والا ہوں ﴿مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا﴾ ان لوگوں سے جو کافر ہیں ﴿وَجَاعِلُ الَّذِيْنَ﴾ اور کرنے والا ہوں ان لوگوں کو ﴿اتَّبَعُوْكَ﴾ جنھوں نے تیری پیروی کی ﴿فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا﴾ اُوپر ان لوگوں کے جو کافر ہیں ﴿اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ﴾ قیامت کے دن تک ﴿ثُمَّ اِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ﴾ پھر میری طرف ہی ہے تمھارا لوٹنا ﴿فَاَحْكُمُ بَيْنَكُمْ﴾ پس میں فیصلہ کروں گا تمھارے درمیان ﴿فِيْمَا﴾ ان چیزوں میں ﴿كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ﴾ کہ جن میں تم اختلاف کرتے تھے ﴿فَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا﴾ پس بہر حال وہ لوگ جنھوں نے کفر اختیار کیا ﴿فَاُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا﴾ پس میں ان کو سزا دوں گا سخت سزا ﴿فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ﴾ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی ﴿وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ﴾ اور نہیں ہوگا ان کا کوئی مددگار ﴿وَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ اور بہر حال وہ لوگ جو ایمان لائے ﴿وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ﴾ اور عمل کیے انھوں نے اچھے ﴿فَيُوَفِّيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ﴾ پس ان کو اللہ تعالیٰ پورے پورے اجر دے گا ﴿وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ﴾ اور اللہ تعالیٰ نہیں محبت کرتا ظالموں کے ساتھ۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا بنی اسرائیل سے خطاب

اس سے پہلی آیات میں ان معجزات کا ذکر تھا جو اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ پر ظاہر فرمائے۔ مثلاً: مٹی کا پرندہ بنا کر اس میں پھونک مارنا اور اس کا اللہ تعالیٰ کے حکم سے پرندہ بن کر اُڑ جانا اور مادر زاد اندھے کا بینا ہو جانا اور پھلبہری والے کا ٹھیک ہو جانا، مردوں کا زندہ ہونا۔ اور یہ سب کچھ لوگوں نے آنکھوں سے دیکھا مگر لوگ ضد پر اڑے رہے اور ہٹ دھرمی سے باز نہیں آئے۔ حالاں کہ یہ کوئی معمولی نشانیاں نہیں تھیں مگر ضد اور ہٹ دھرمی کا دنیا میں کوئی علاج نہیں ہے کہ ایک آدمی اس بات پر ڈٹا ہوا ہے کہ میں نہیں مانتا۔ تو اس کو کون منوا سکتا ہے؟ تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے حجت پوری کر دی۔ زبانی طور پر بھی ان کو سمجھایا اور عملی طور پر یہ سارے معجزے بھی ان کو دکھائے لیکن ان پر کوئی اثر نہ ہوا۔ بلکہ انھوں نے عیسیٰ علیہ السلام کے خلاف سازشیں شروع کر دیں۔ اس کا ذکر ہے۔

فرمایا ﴿فَلَمَّآ اَحَسَّ عِیْسٰی مِنْهُمُ الْكُفْرَ﴾ پس جب محسوس کیا عیسیٰ علیہ السلام نے اُن بنی اسرائیلیوں سے کفر کہ انھوں نے یہ سب کچھ دیکھ کر بھی انکار کر دیا ہے اُلٹا میرے خلاف منصوبے بنا رہے ہیں۔ تو ﴿قَالَ﴾ فرمایا ﴿مَنْ اَنْصَارِیْۤ اِلَى اللّٰهِ﴾ رب تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے کے لیے کون میری مدد کرے گا کیوں کہ عالم اسباب میں دارومدار اسباب پر ہے۔ اگرچہ اسباب میں اثر رب رکھتا ہے مگر اسباب کو مدنظر رکھنا ضروری ہے۔ اس واسطے فرمایا اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کے لیے میری مدد کون کرے گا؟

حواری کون تھے؟

﴿قَالَ الْحَوَارِیُّوْنَ﴾ کہا حواریوں نے ﴿نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ﴾ ہم اللہ تعالیٰ کے دین کی مدد کرنے والے ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھیوں کو حواری کہنے کی ایک وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ حواری حور سے ہے اور حور کے معنیٰ ہیں سفیدی۔ کیوں کہ ان کے دل بڑے صاف تھے۔ جو دل میں ہوتا تھا زبان پر بھی وہی ہوتا تھا۔ ان میں دورنگی نہیں تھی کہ دل کسی طرف ہو اور زبان کسی طرف ہو۔ تو اس واسطے ان کو حواری کہا گیا ہے کہ وہ دل کے بڑے صاف تھے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان کے چہرے سفید تھے یعنی سفید فام لوگ تھے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ دھوبی تھے۔ کپڑے سفید کرتے تھے اس واسطے ان کو حواری کہا گیا۔ غریب تھے لیکن تھے مومن۔ اور یاد رکھنا! دنیا میں جو جائز پیشے ہیں ان سے اسلام نہیں روکتا۔ اور یہ وجہ بھی بیان کی گئی ہے کہ وہ سفید کپڑے پہنتے تھے اس واسطے ان کو حواری کہا گیا ہے، کیوں کہ حور کے معنیٰ سفیدی کے ہوتے ہیں۔ یہ ساری وجوہ تفسیروں میں موجود ہیں۔

تو یہ حواری اگرچہ بہت تھوڑے آدمی تھے مگر مخلص تھے اور اخلاص کا اثر کچھ اور ہوتا ہے۔ تو حواریوں نے کہا کہ ہم اللہ تعالیٰ کے دین کی مدد کرنے والے ہیں ﴿اٰمَنَّا بِاللّٰهِ﴾ ہم اللہ تعالیٰ پر ایمان لا چکے ہیں ﴿وَاشْهَدْ بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ﴾ اور اے عیسیٰ علیہ السلام گواہ بن جانا بے شک ہم فرماں بردار ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے فرماں بردار بھی ہیں اور آپ کی فرماں برداری بھی کریں گے۔

پھران حواریوں نے دعا کی ﴿رَبَّنَآ اٰمَنَّا بِمَآ اَنْزَلْتَ﴾ اے ہمارے رب ہم ایمان لائے اُس چیز پر جو تو نے نازل کی عیسیٰ علیہ السلام پر۔ یعنی کتاب انجیل نازل فرمائی، وحی نازل فرمائی اوران پر جو معجزات نازل فرمائے ہم سب پر ایمان لائے ﴿وَاتَّبَعْنَا الرَّسُوْلَ﴾ اوراے پروردگار! ہم نے تیرے رسول کی پیروی کی۔﴿فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ﴾ پس تو اے پروردگار! ہمیں لکھ دے ان لوگوں کے ساتھ جو حق کی گواہی دینے والے ہیں۔ یعنی ہمیں بھی حق کی گواہی دینے والوں میں شامل فرما کہ ہم بھی گواہی دیتے ہیں کہ اے پروردگار! تو ہمارارب ہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام پیغمبر ہیں اوران پر جو کتاب نازل ہوئی ہے حق ہے اوران کو جو معجزات دیئے گئے ہیں حق ہیں۔ ہماراان سب پر ایمان ہے۔﴿وَمَكَرُوْا﴾ اوران کافروں نے تدبیریں کیں ﴿وَمَكَرَ اللّٰهُ﴾ اوراللہ تعالیٰ نے بھی تدبیر کی۔

تفسیروں میں موجود ہے اور تاریخ میں بھی مذکور ہے کہ شام کا صوبہ تھا، رومیوں کی بادشاہی تھی اور ہیروڈ اس وقت رومیوں کی طرف سے شام کا گورنر تھا۔ یہودیوں نے حضرت علیہ السلام عیسیٰ کے خلاف بڑا شور مچایا، احتجاج کیا، جلوس نکالے، نعرے بازی کی کہ ایک ایسا شخص کہ نسب بھی معلوم نہیں ہے وہ نبی ہونے کا دعویٰ کرتا ہے اوراس کے ہاتھ پر جو کچھ ظاہر ہوتا ہے وہ سب جادو ہے اور یہ جادوگر ہے۔ بڑا شور مچایا گلیوں میں، محلوں میں۔ کیوں کہ اکثریت ان کی تھی اور حواری تو گنتی کے لوگ تھے جو اکثر عیسیٰ علیہ السلام کے پاس رہتے تھے تا کہ ان کو کوئی تکلیف نہ پہنچائے۔ یہودی احتجاج کرتے ہوئے گورنر کے پاس گئے اور کہا تم ہمارے حاکم ہو، گورنر ہو، ہماری پریشانی کا سد باب کرو۔ اس شخص نے ہمارے دین میں فتور ڈالا ہے۔ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جو اصطلاحات کی تھیں وہ گورنر کے سامنے رکھیں اور کہا کہ ہمارے باپ دادا یہ کرتے تھے اور یہ اس طرح کہتا ہے۔ اور جو کچھ ہمارے باپ دادا کرتے تھے اس سے ہمیں روکتا ہے۔ لہٰذا اس کو سولی پر لٹکاؤ۔

وہابی کا طعنہ

اس کو اس طرح سمجھو جس طرح آج کل اہل بدعت ہیں کہ جتنی بدعات ہیں وہ ان کا دین ہے اور اہل سنت والجماعت کی علامات سمجھی جاتی ہیں۔ اور جو بدعات کا رد کرے اس کے خلاف سراپا احتجاج بن جاتے ہیں اوراس کو وہابی کہتے ہیں۔ اور جس کو وہابی کہہ دیا بس وہ اچھوت بن گیا۔ لہٰذا ایک دفعہ وہابی کہہ دینا کافی ہے۔

حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ ایک واقعہ سنایا کرتے تھے کہ ہمارے گاؤں میں ایک ہندو دکان دار تھا۔ محلے کی مسجد کا امام روزانہ اس سے تھوڑی سی نسوار مانگ کر لے جاتا اور پیسے نہیں دیتا تھا۔ (امام نسوار کا عادی تھا اور شرعاً نسوار مکروہ ہے)۔ ایک دن اس ہندو دکان دار نے کہا میاں جی! تم روزانہ مفت نسوار لے جاتے ہو میں بھی کمزور آدمی ہوں اور میرے بال بچے بھی ہیں اور یہ نسوار میں خرید کر لاتا ہوں۔ مجھے کوئی پیسہ دھیلا دے دیا کرو۔ میاں جی کو یہ بات بڑی ناگوار گزری کہ مجھ سے پیسے مانگتا ہے۔ کہنے لگا میں تیرا علاج کر لیتا ہوں۔ نماز کا وقت ہوا مسجد پہنچے نماز پڑھائی اور نماز سے فارغ ہو کر جب مقتدی

جانے لگے تو میاں جی نے آواز دی کہ ذرا ٹھہر جاؤ میں نے تمھارے ساتھ ایک بات کرنی ہے۔مقتدی بیٹھ گئے تو میاں جی نے کہا کہ فلاں ہندو دکان دار وہابی ہو گیا ہے اس سے سودا نہ لینا۔

کئی دن گزرے اس سے کسی نے سودا نہ خریدا۔وہ بے چارہ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گیا۔ایک دن مولوی صاحب وہاں سے گزرے تو کہنے لگے تجھے پتا تو چل گیا ہے نا! اس کو تو پتا چل ہی گیا تھا کہ میاں جی نے مجھے وہابی بنا دیا ہے۔ہندو نے کہا میاں جی میں توبہ کرتا ہوں مجھے معاف کر دو اور نسوار جتنی چاہتے ہو لے جایا کرو مگر میرے سے یہ وہابیت کی دُم اُتار دو۔ (ڈبلیو، ڈبلیو ہنٹر نامی ایک انگریز تھا۔اس نے وہابی کا لفظ ایجاد کیا۔اس نے کہا تھا کہ ہم نے ان کے ساتھ ایک ایسی دم لگا دی ہے کہ ساری زندگی اُتارتے پھریں گے اُترے گی نہیں)۔

یہودیوں کا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو سولی پر لٹکانے کا مطالبہ

تو جب یہودیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو سولی پر لٹکانے کا مطالبہ کیا تو گورنر نے کہا دیکھو! ملک میں ایسی باتیں ہوتی رہتی ہیں حوصلے سے کام لو۔یہ پھر گورنر کے پاس گئے اور کہنے لگے اگر تم نے کچھ نہ کیا تو پھر ہم خود اس کا علاج کریں گے۔گورنر نے مرکز کو خط لکھا کہ بنی اسرائیل میں سے ایک آدمی ہے وہ نئی نئی باتیں کرتا ہے اور سب لوگ اس کے مخالف ہو گئے ہیں اور اس کو سولی پر لٹکانے کا مطالبہ کر رہے ہیں میرے لیے کیا حکم ہے؟ مرکز نے کہا کہ اگر ایک آدمی کو سولی پر لٹکانے سے ملک میں امن قائم ہوتا ہے تو لٹکا دو۔وہ کون سا ہمارے چچا کا بیٹا ہے۔پولیس رومی تھی کیوں کہ حکومت رومیوں کی تھی۔جس طرح ہم پر انگریز مسلط تھے۔پولیس والوں کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زیادہ شناخت نہیں تھی۔کیوں کہ ان کو ملاقات کا زیادہ موقع نہیں ملا تھا۔انھوں نے شمعون قرینی کو سولی پر لٹکا دیا۔کیوں کہ اس کی شکل حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے ملتی جلتی تھی۔جس طرح میرے ساتھ میرے چھوٹے بھائی صوفی عبدالحمید کی شکل ملتی ہے۔اس کی وضع قطع بالکل میری طرح ہے۔ایک آدھ دفعہ دیکھنے والا ہمارے درمیان فرق نہیں کر سکتا کہ بڑا کون ہے اور چھوٹا کون ہے؟ رند کون ہے اور صوفی کون ہے؟

بالکل اسی طرح شمعون قرینی کی شکل حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے ملتی تھی۔اور یہ بات خود انگریز تسلیم کرتا ہے کہ جس کو سولی پر لٹکایا گیا وہ شمعون قرینی تھا۔چنانچہ انسائیکلوپیڈیا آف برٹانیکا میں اس کی تصریح موجود ہے۔تو شمعون قرینی کو سولی پر لٹکا کر وہ مطمئن ہو گئے۔اور حضرت عیسیٰ کو اللہ تعالیٰ نے زندہ آسمانوں پر اُٹھا لیا اور وہ اس وقت بھی آسمانوں پر زندہ موجود ہیں۔قیامت کے قریب زمین پر نازل ہوں گے۔اور ان کے نازل ہونے کی نشانیاں قریب آ رہی ہیں۔دیکھو کب نازل ہوتے ہیں؟ اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے۔

تو انھوں نے تدبیریں کیں مارنے کی ﴿وَمَكَرَ اللّٰهُ﴾ اور اللہ تعالیٰ نے بھی تدبیر کی بچانے کی ﴿وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ﴾ اور اللہ تعالیٰ تدبیر کرنے والوں میں سب سے بہتر تدبیر کرنے والا ہے۔

مرزائیت کا فتنہ

﴿اِذْ قَالَ اللّٰهُ یٰعِیْسٰۤی اِنِّیْ مُتَوَفِّیْكَ﴾ جب فرمایا اللہ تعالیٰ نے اے عیسیٰ (علیہ السلام)! بے شک میں تجھے پورا پورا لینے والا ہوں۔ نوجوان ساتھیو یاد رکھنا! مرزائیت کا فتنہ بھی بہت بڑا فتنہ ہے۔ اور باوجود اس کے کہ وہ قانوناً بھی غیر مسلم اقلیت قرار دیے جا چکے ہیں اور ان پر اس بات کی پابندی ہے کہ وہ اپنے آپ کو مسلمان نہیں۔ مگر پھر بھی وہ اپنی حرکتوں سے باز نہیں آتے۔ بیرون ملک بھی انھوں نے کئی مسلمانوں کو مرتد کیا ہے اور ملک میں بھی کم نہیں ہوئے۔ بلکہ یہاں بھی لوگوں کو مختلف لالچ (مال کا، ملازمتوں کا، باہر جانے والوں کے لیے ویزوں کا لالچ) دے کر احمدی بنا رہے ہیں۔ اور وہ بے ایمان ویزے لے کر احمدی بن کر باہر جاتے ہیں اور اپنا ایمان ضائع کر دیتے ہیں۔ لوگوں کو مغالطہ ہے کہ ہم نے زبانی طور پر اس طرح کر کے داؤ لگایا ہے کہ ویزا حاصل کرلیا ہے۔ بے شک چاہے وہ دل میں خوش ہوں مگر ایسا کرنے سے وہ کافر ہو گئے ہیں۔

مسئلہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص یہ کہے کہ میں فلاں کام کروں تو ہندو ہو جاؤں یا عیسائی ہو جاؤں یا یہودی ہو جاؤں تو شریعت میں وہ ایسا ہی ہو گیا چاہے وہ اپنے آپ کو مسلمان سمجھے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں مرزائیوں کا عقیدہ

لہٰذا میں ایک اہم مسئلہ سمجھانا چاہتا ہوں اس کو نوٹ کرلیں۔ اس پر تمام اہل حق کا اتفاق ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام زندہ ہیں۔ اور مرزائی قادیانی کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام فوت ہو گئے ہیں اور اس آیتِ کریمہ سے دھوکا دیتے ہیں ﴿اِذْ قَالَ اللّٰهُ یٰعِیْسٰۤی اِنِّیْ مُتَوَفِّیْكَ﴾ اور ترجمہ کرتے ہیں "جب فرمایا اللہ تعالیٰ نے اے عیسیٰ (علیہ السلام)! بے شک میں تجھے وفات دوں گا۔" پھر کہتے ہیں کہ دیکھو! قرآن میں ہے کہ میں تجھے وفات دوں گا اور عیسیٰ علیہ السلام فوت ہو گئے۔ تو عوام جن کو علم سے مس نہیں ہے وہ دھوکا کھا جاتے ہیں کہ واقعی قرآن میں ﴿مُتَوَفِّیْكَ﴾ کا لفظ موجود ہے۔

اب ذرا غور سے بات کو سمجھیں۔ یہ جو لفظ ہے مُتَوَفِّیْ، اس کا مجرد مادہ وفات نہیں ہے بلکہ وفا ہے۔ اگر مجرد مادہ وفات ہو تو معنیٰ ہے فوت ہونا۔ اور جب باب تفعل پر لے جائیں گے تو معنیٰ ہو گا وفات دینا۔ اور اگر مجرد مادہ وفا ہو تو معنیٰ ہے پورا کرنا۔ چنانچہ مقولہ ہے:

اَلْكَرِیْمُ اِذَا وَعَدَ وَفَا۔ "شریف آدمی جب وعدہ کرتا ہے تو پورا کرتا ہے۔"

اسی طرح وعدہ وفا مشہور لفظ ہے۔ اور جب اس کو باب تفعل پر لے جائیں گے تو معنیٰ بنے گا پورا پورا لینا۔ تو ﴿اِنِّیْ مُتَوَفِّیْكَ﴾ کا معنیٰ بنتا ہے بے شک میں تجھے پورا پورا لینے والا ہوں یہ یہودی تیرا بال بھی بیکا نہیں کر سکیں گے۔ اور اگر بالفرض ہم مان بھی لیں کہ یہ وفات سے ہے اور اس کا معنیٰ ہے مُمِیْتُكَ کہ میں تجھے مارنے والا ہوں۔ تو مُتَوَفِّیْ اسم فاعل کا صیغہ ہے اور اسم فاعل میں مضارع کی طرح حال کا معنیٰ بھی آتا ہے اور استقبال کا معنیٰ بھی آتا ہے۔ تو اس صورت میں معنیٰ بنے گا "اے عیسیٰ!

میں تجھے اپنے وقت پر وفات دوں گا ﴿وَرَافِعُكَ إِلَيَّ﴾ اور اب میں اپنی طرف تجھے اُٹھاتا ہوں۔" لہٰذا اس صورت میں بھی قادیانیوں کا دعویٰ صحیح نہیں ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام فوت ہو گئے ہیں۔

اور چھٹے پارے میں آتا ہے ﴿وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ﴾ [النساء: ۱۵۷] " حالانکہ انھوں نے نہیں قتل کیا عیسیٰ علیہ السلام کو اور نہ ان کو سولی پر چڑھایا بلکہ بات ان کے لیے مشتبہ کر دی گئی۔" مزید فرمایا ﴿وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا ۝ بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ إِلَيْهِ﴾ " اور نہیں قتل کیا انھوں نے عیسیٰ علیہ السلام کو یقیناً بلکہ اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کو اپنی طرف اُٹھا لیا۔" اسی طرح متواتر درجے کی احادیث ہیں جو اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام آسمانوں پر زندہ ہیں اور قیامت سے پہلے زمین پر تشریف لائیں گے۔ اس موضوع پر میرا چھوٹا سا رسالہ ہے " توضیح المرام فی نزول المسیح علیہ السلام "۔ اس میں قرآن کریم کی آیات کی تفسیر بھی ہے اور احادیث بھی باحوالہ ذکر کی ہیں اور علم کلام، فقہ، تاریخ اور صوفیاء کرام کے حوالے بھی ذکر کیے ہیں۔ اس کا مطالعہ کر لینا۔

﴿وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا﴾ اور تجھے پاک کروں گا ان لوگوں سے جو کافر ہیں۔ دیکھیے! اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو فرمایا کہ میں تجھے پاک کروں گا۔ ادھر مرزا قادیانی کہتا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کی قبر سری نگر میں ہے۔ اور حوالہ دیتا ہے فرانس کے ایک انگریز کا۔ جیسی روح ویسے فرشتے۔ جیسا مرزا اور اس کے دعوے ویسے ہی اس کی نبوت کے لیے گواہ۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام شام میں تھے اور وہاں مسلمان بھی تھے اگرچہ تھوڑے تھے مگر تھے ضرور۔ اور اس زمانے میں کشمیر تو خالص کفر گڑھ تھا۔ تو اللہ تعالیٰ نے اچھا پاک کیا کہ جہاں تھوڑے بہت مسلمان تھے وہاں سے نکال کر کفر گڑھ میں پہنچا دیا، لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ۔

﴿وَجَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ﴾ اور کرنے والا ہوں ان لوگوں کو جنھوں نے تیری پیروی کی ﴿فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا إِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ﴾ اوپر ان لوگوں کے جو کافر ہیں قیامت کے دن تک۔ صاحب روح المعانی اور علامہ رازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ کامل پیروی تو کی ہے مسلمانوں نے اور ناقص پیروی کی ہے عیسائیوں نے اور ان دونوں کا آج تک یہودیوں پر تسلط چلا آ رہا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ آج اگر امریکہ بے ایمان اور فرانس اور برطانیہ شیطان اسرائیل کی پشت پناہی سے ہٹ جائیں اسرائیل چند گھنٹے نہیں ٹھہر سکتا۔ تو عیسیٰ علیہ السلام کی اتباع کی عیسائیوں نے اور کفر کیا یہودیوں نے۔ تو عیسائیوں کی یہودیوں پر آج تک فوقیت چلی آ رہی ہے اور قیامت تک رہے گی ﴿ثُمَّ إِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَأَحْكُمُ بَيْنَكُمْ فِيْمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ﴾ پھر میری طرف ہی ہے تمھارا لوٹنا پس میں فیصلہ کروں گا تمھارے درمیان ان چیزوں میں کہ جن میں تم اختلاف کرتے تھے۔ وہ فیصلہ اس طرح ہو گا کہ ﴿فَأَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا﴾ پس بہر حال وہ لوگ جنھوں نے کفر اختیار کیا ﴿فَأُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا﴾ پس میں ان کو سزا دوں گا سخت سزا ﴿فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ﴾ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ وہ قتل ہوں گے، جزیہ دیں گے اور

مسلمانوں کی رسوائی کی وجہ ؟

اس وقت اس علاقے میں مسلمانوں کی افرادی قوت بہت زیادہ ہے کہ بارہ کروڑ ہیں اور یہودی اسی لاکھ بھی نہیں ہیں۔ مگر ساری دنیا میں یہودی اسلحہ کے اعتبار سے تیسرے نمبر پر ہیں اور اور اس اسلحہ سے شہزادے ڈرتے ہیں۔ حالاں کہ یہودی بزدل ہیں۔ اگر کسی وقت جذبات میں آکر چند نوجوان کھڑے ہوجائیں تو یہودیوں کا پاخانہ خطا ہوجاتا ہے اور پوچھتے پھرتے ہیں کیا ہوا، کیا بنا۔ جو قوم موت سے ڈرتی ہے وہ ترقی نہیں کرسکتی۔ کاش! کہ ان بے غیرت مسلمانوں میں کچھ غیرت آجائے تو بڑی بات ہے۔ مگر یہ بہت بے غیرت بن گئے ہیں۔ شام نے امریکہ سے رقم لے کر صلح کی ہے اور مصر نے امریکہ سے رقم لے کر نہ لڑنے کا معاہدہ کیا ہے۔ او بے ایمانو! کچھ تو خیال کرو۔ یہ نام کے مسلمان ہیں حقیقت میں پرلے درجے کے بے ایمان ہیں۔

اور سب سے بڑے شیطان سعودیہ کے حکمران ہیں جنھوں نے ایک لاکھ بیس ہزار امریکی فوج لاکر عرب میں بٹھائی ہے۔ حالانکہ آنحضرت ﷺ کا فرمانِ مبارک ہے: ((اَخْرِجُوْا الْیَهُوْدَ وَالنَّصَارٰی مِنْ جَزِیْرَةِ الْعَرَبِ)) "یہود و نصاریٰ کو عرب کے جزیرہ سے نکال دو۔" یہ حدیث جب علمائے کرام نے ممبروں پر پڑھی تو سعودی حکومت کو تکلیف ہوئی اور انھوں نے علمائے کرام کو گرفتار کرکے جیلوں میں ڈال دیا۔ اس وقت بھی سینکڑوں علمائے کرام جیلوں میں پڑے ہیں۔ تاکہ شہزادوں کی حکومت برقرار رہے۔ اقتدار بہت بری چیز ہے۔ اگر صحیح نہ ہو تو پھر ایسی ہی کارروائی ہوتی ہے۔ تو فرمایا میں ان کو سخت سزا دوں گا دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی ﴿وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِیْنَ﴾ اور نہیں ہوگا ان کا کوئی مددگار۔ ﴿وَاَمَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ﴾ اور بہرحال وہ لوگ جو ایمان لائے اور عمل کیے انھوں نے اچھے ﴿فَیُوَفِّیْهِمْ اُجُوْرَهُمْ﴾ پس ان کو اللہ تعالیٰ پورا پورا اجر دے گا ﴿وَاللّٰهُ لَا یُحِبُّ الظّٰلِمِیْنَ﴾ اور اللہ تعالیٰ نہیں محبت کرتا ظالموں کے ساتھ۔ اللہ تعالیٰ ظالموں کے ظلم سے بچائے اور محفوظ رکھے۔ آمین!

﴿ذٰلِكَ نَتْلُوْهُ عَلَیْكَ﴾ یہ واقعہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ہے، اس کو ہم تلاوت کرتے ہیں آپ پر ﴿مِنَ الْاٰیٰتِ﴾ اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ﴿وَالذِّكْرِ الْحَكِیْمِ﴾ اور وہ ذکر ہے جو حکمت والا ہے ﴿اِنَّ مَثَلَ عِیْسٰی﴾ بے شک عیسیٰ علیہ السلام کی مثال ﴿عِنْدَ اللّٰهِ﴾ اللہ تعالیٰ کے ہاں ﴿كَمَثَلِ اٰدَمَ﴾ ایسی ہے جیسے مثال ہے آدم علیہ السلام کی ﴿خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ﴾ اللہ تعالیٰ نے اس کو پیدا کیا مٹی سے ﴿ثُمَّ قَالَ لَهٗ﴾ پھر کہا اس کو ﴿كُنْ﴾ ہو جا ﴿فَیَكُوْنُ﴾ پس وہ ہو گئے ﴿اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ﴾ حق تیرے رب کی طرف سے ہے ﴿فَلَا تَكُنْ﴾ پس ہرگز نہ ہونا ﴿مِّنَ الْمُمْتَرِیْنَ﴾ شک کرنے والوں میں سے ﴿فَمَنْ حَآجَّكَ﴾ پھر جو شخص جھگڑا کرے گا تیرے ساتھ ﴿فِیْهِ﴾ عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق ﴿مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ﴾ بعد اس کے کہ تیرے پاس علم آچکا ﴿فَقُلْ﴾ پس کہہ تو ﴿تَعَالَوْا﴾ آؤ ﴿نَدْعُ

﴿اَبۡنَآءَنَا﴾ بلائیں ہم اپنے بیٹوں کو ﴿وَ اَبۡنَآءَ کُمۡ﴾ اور تم اپنے بیٹوں کو ﴿وَنِسَآءَنَا وَنِسَآءَ کُمۡ﴾ اور ہم اپنی عورتوں کو اور تم اپنی عورتوں کو ﴿وَ اَنۡفُسَنَا وَ اَنۡفُسَکُمۡ﴾ اور ہم اپنی جانوں کو اور تم اپنی جانوں کو ﴿ثُمَّ نَبۡتَهِلۡ﴾ پھر ہم مباہلہ کریں ﴿فَنَجۡعَلۡ لَّعۡنَتَ اللّٰهِ﴾ پس ڈالیں ہم اللہ تعالیٰ کی لعنت ﴿عَلَى الۡكٰذِبِيۡنَ﴾ جھوٹوں پر ﴿اِنَّ هٰذَا﴾ بے شک یہ ﴿لَهُوَ الۡقَصَصُ الۡحَقُّ﴾ البتہ بیان ہے سچا ﴿وَمَا مِنۡ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ﴾ اور نہیں ہے کوئی الٰہ اللہ تعالیٰ کے سوا ﴿وَاِنَّ اللّٰهَ﴾ اور بے شک اللہ تعالیٰ ﴿لَهُوَ الۡعَزِيۡزُ الۡحَكِيۡمُ﴾ البتہ وہ غالب ہے حکمت والا ہے ﴿فَاِنۡ تَوَلَّوۡا﴾ پس اگر وہ اعراض کریں ﴿فَاِنَّ اللّٰهَ﴾ پس بیشک اللہ تعالیٰ ﴿عَلِيۡمٌ﴾ جانتا ہے ﴿بِالۡمُفۡسِدِيۡنَ﴾ فساد کرنے والوں کو۔

نجران کے عیسائیوں کا وفد

دو تین رکوع پہلے سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی والدہ ماجدہ حضرت مریم علیہا السلام کا ذکر چلا آ رہا ہے۔ اور یہ سارے واقعات عجیب وغریب ہیں۔ مثلاً: حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا بغیر باپ کے پیدا ہونا کہ دنیا میں اس کی کوئی اور نظیر موجود نہیں ہے۔ پھر پیدائش کے ساتھ ہی بات چیت شروع کر دینا کہ ﴿قَالَ اِنِّىۡ عَبۡدُ اللّٰهِ ۗ اٰتٰنِىَ الۡكِتٰبَ وَجَعَلَنِىۡ نَبِيًّا﴾ [مریم: ۳۰] کہ میں اللہ کا بندہ ہوں وہ مجھے کتاب دے گا اور نبی بنائے گا۔ پھر ان کے معجزات بھی عجیب وغریب ہیں۔ مٹی کے گارے سے بنے ہوئے پرندے کا اُڑ جانا، برص والے مریض کا ٹھیک ہو جانا، مردوں کا زندہ ہونا، پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا زندہ آسمانوں پر اُٹھایا جانا۔ یہ سارے عجیب وغریب واقعات ہیں۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ﴿ذٰلِكَ نَتۡلُوۡهُ عَلَيۡكَ﴾ یہ واقعات اے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم! ہم تلاوت کرتے ہیں آپ پر ﴿مِنَ الۡاٰيٰتِ﴾ اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانیوں میں سے ہیں ﴿وَالذِّكۡرِ الۡحَكِيۡمِ﴾ اور ایسا ذکر ہے جو بڑا محکم اور حکمت والا ہے۔ کوئی شک شبہے والی بات نہیں ہے۔

یہ بات تم پہلے تفصیل کے ساتھ سن چکے ہو کہ ساٹھ آدمیوں پر مشتمل نجران کے عیسائیوں کا ایک وفد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا تھا۔ اس وفد میں ان کے سیاسی لیڈر اور مذہبی رہنما بھی تھے۔ عاقب ابن عبد المسیح ان کا سیاسی لیڈر تھا، ایہم سید نظم ونسق کا امیر تھا اور ابو حارثہ ابن علقمہ مذہبی رہنما تھا اور اس وقت نجران کے علاقے میں اس سے بڑا پادری کوئی نہ تھا۔ اس وفد کا اصل مقصد تو سیاسی پناہ حاصل کرنا تھا مگر مذہبی گفتگو بھی ہوئی اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر بھی آیا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ بات تم بھی تسلیم کرتے ہو کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام حضرت مریم علیہا السلام کے پیٹ میں رہے ہیں اور پیدا ہوئے ہیں اور یہ بات بھی تسلیم کرتے ہو کہ وہ کھاتے پیتے بھی تھے اور بیماری، تندرستی بھی ان کے ساتھ لگی ہوئی تھی۔ تو ایسی شخصیت الٰہ اور معبود تو نہیں بن سکتی۔ یہ ساری باتیں تسلیم کرنے کے بعد کہنے لگے کہ ہم ان کو رب کا بیٹا مانتے ہیں۔ اور کہنے

لگے کہ اگر وہ رب کے بیٹے نہیں ہیں تو تم بتاؤ کہ رب کے بغیر ان کا باپ کون ہے؟ کوئی باپ ہوتا تو آنحضرت ﷺ بتاتے کہ فلاں آدمی اُن کا باپ ہے۔ یہ تو مرزا غلام احمد قادیانی ملعون کی خرافات ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے باپ کا نام یوسف نجار تھا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے چھ بہن بھائی تھے، لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ ۔ مرزا قادیانی کے کفر کے لیے تو بس اتنی ہی بات کافی ہے۔ یاد رکھنا! حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا کوئی باپ تھا، نہ بہن بھائی تھے۔ آپ تن تنہا تھے اور حضرت مریم کے پیٹ سے رب تعالیٰ نے اپنی قدرتِ کاملہ سے انہیں پیدا فرمایا تھا۔

تو عیسائیوں نے ضد کی کہ بتاؤ اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا باپ رب نہیں ہے تو اور کون ہے؟ اس پر موقع پر اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ﴿ اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ ﴾ بے شک عیسیٰ علیہ السلام کی مثال اللہ تعالیٰ کے ہاں ایسی ہے جیسے مثال ہے آدم علیہ السلام کی۔ اگر تمھاری منطق مان لیں کہ جس کا ظاہری طور پر باپ نہ ہو اس کا باپ رب ہے اور وہ رب کا بیٹا ہے تو پھر کہو نا کہ آدم علیہ السلام بھی رب کے بیٹے ہیں اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تو والدہ ہے اور حضرت آدم علیہ السلام کی تو نہ والدہ ہے اور نہ والد۔ تو پھر آدم علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے پہلے بیٹے ہوئے اور ہم سب اللہ تعالیٰ کے پوتے اور پڑپوتے ہوئے، معاذ اللہ تعالیٰ۔

﴿ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴾ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو پیدا کیا مٹی سے پھر کہا اس کو ہو جا پس وہ ہو گئے۔ یعنی جس طرح آدم علیہ السلام کو مٹی سے کلمہ کن کے ساتھ پیدا فرمایا اسی طرح عیسیٰ علیہ السلام کو حضرت مریم علیہا السلام کے پیٹ سے کلمہ کن کے ذریعے پیدا فرمایا۔ جس طرح آدم علیہ السلام کا ماں باپ نہیں ہے مگر یہ کہنا درست نہیں ہے کہ وہ رب کے بیٹے ہیں۔ اسی طرح عیسیٰ علیہ السلام کے باپ نہ ہونے کی وجہ سے ان کو رب کا بیٹا کہنا جائز نہیں ہے۔

ایک اور تشبیہ بھی ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام مرد تھے اللہ تعالیٰ نے ان کی پسلی سے حضرت حوا علیہا السلام کو پیدا فرمایا۔ کس طرح پیدا فرمایا؟ یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آسکتی۔ مگر چوں کہ رب تعالیٰ کا ارشاد ہے اور قرآن پاک میں موجود ہے ﴿ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا ﴾ [النساء:۱] "اور پیدا فرمایا اللہ تعالیٰ نے اس سے اس کے جوڑے کو۔" لہٰذا ہم مانتے ہیں۔ تو مرد کی پسلی سے اللہ تعالیٰ نے عورت پیدا فرمائی۔ حضرت مریم علیہا السلام عورت ہیں۔ ان سے مرد پیدا فرمایا۔

ایک اور مشابہت بھی ہے کہ آدم زمین پر پیدا ہوئے پھر اللہ تعالیٰ حضرت آدم علیہ السلام اور حوا علیہا السلام کو جنت میں لے گئے پھر زمین پر اُتارا۔ اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے زمین پر پیدا فرمایا پھر آسمانوں پر لے گئے اور قیامت سے پہلے پھر زمین پر اُتاریں گے۔ تو عیسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے بندے ہیں۔ نہ الٰہ ہیں اور نہ ہی اللہ تعالیٰ کے بیٹے ہیں۔ اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ حق تیرے رب کی طرف سے ہے ﴿ فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْمُمْتَرِيْنَ ﴾ پس ہرگز نہ ہو شک کرنے والوں میں سے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو بغیر ماں باپ کے پیدا فرمایا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بغیر باپ کے۔ یہ حقیقت ہے اس میں ہرگز شک نہ کرنا۔ کیوں کہ جب کوئی بات قرآن پاک میں آجائے تو اس کے یقینی، قطعی اور محکم ہونے میں ہرگز شک نہ کرو کہ اللہ کی ذات سے زیادہ کوئی ذات سچی نہیں ہے اور اس کے کلام سے سچا کوئی اور کلام نہیں ہے۔

مباہلہ سے اجتناب

﴿فَمَنْ حَآجَّكَ فِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ﴾ پس جو شخص جھگڑا کرے تیرے ساتھ عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق بعد اس کے کہ تیرے پاس علم آچکا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کو مباہلے کا چیلنج دیں ﴿فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَاَبْنَآءَكُمْ وَنِسَآءَنَا وَنِسَآءَكُمْ وَاَنْفُسَنَا وَاَنْفُسَكُمْ﴾ پس کہہ تو آؤ بلائیں ہم اپنے بیٹوں کو اور تم اپنے بیٹوں کو اور ہم اپنی عورتوں کو اور تم اپنی عورتوں کو اور ہم اپنی جانوں کو اور تم اپنی جانوں کو ﴿ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ﴾ پھر ہم مباہلہ کریں پس ڈالیں ہم اللہ تعالیٰ کی لعنت جھوٹوں پر۔ مباہلہ کا معنیٰ ہے عاجزی کے ساتھ دعا کرنا کہ دونوں فریق کھلے میدان میں آجائیں اور اپنا عقیدہ اور نظریہ بیان کریں اور گڑگڑا کر دعا کریں اور کہیں کہ جھوٹوں پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے سامنے اپنا عقیدہ اور نظریہ یہی بیان فرمایا۔ اور بعد میں بھی یہی بیان کرنا تھا کہ اللہ تعالیٰ وحدہٗ لاشریک لہ ہے۔ نہ اس کا بیٹا ہے، نہ بیٹی، نہ ماں، نہ باپ، نہ بیوی۔ اس کی صفت ہے ﴿لَمْ يَلِدْ ۙ وَلَمْ يُوْلَدْ﴾ نہ وہ کسی سے پیدا ہوا ہے اور نہ آگے اس سے اولاد چلی ہے۔ اور تم حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کا بیٹا قرار دیتے ہو اور اس کا شریک بناتے ہو۔ آؤ میدان میں اپنے عقیدے کو بیان کرو۔ پھر ہم دعا کرتے ہیں کہ اے پروردگار! جس کا عقیدہ سچا ہے اس کو نجات دے اور جس کا عقیدہ جھوٹا ہے اس کو تباہ کردے تاکہ لوگ دیکھیں اور بات ان پر واضح ہو جائے۔

چنانچہ جب صبح ہوئی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دوسرے ساتھیوں کے علاوہ گھر کے یہ افراد حضرت حسن، حضرت حسین، حضرت فاطمہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہم کو ساتھ لے کر میدان میں تشریف فرما ہوئے اور ان پر کمبل ڈال دیا۔ اور عورتوں کو ساتھ لے جانا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مناسب نہ سمجھا۔ پھر ان کو فرمایا کہ آؤ میدان میں تاکہ مباہلہ کریں۔ لیکن عیسائیوں نے رات کو ہی آپس میں مشورہ کر لیا تھا کہ مباہلہ نہیں کرنا۔ کہنے لگے یہ تو تم جانتے ہو کہ یہ اللہ تعالیٰ کے سچے پیغمبر ہیں اور پیغمبر سے جو مباہلہ کرتا ہے وہ بچ کے نہیں جا سکتا۔ باقی ہم ضد کی وجہ سے ایمان نہیں لائے ہیں۔ تو محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اللہ تعالیٰ کے سچے پیغمبر ہیں لہٰذا ہم نے مباہلہ نہیں کرنا۔ اور یہ بات اپنی قوم کو بھی نہیں بتانی ورنہ وہ شور مچائیں گے کہ تم نے مباہلہ کیوں نہیں کیا؟ اور مباہلہ کسی قیمت پر نہیں کرنا۔

چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آئے اور کہنے لگے حضرت! تم بھی رب کو مانتے ہو ہم بھی رب کو مانتے ہیں، تم بھی قیامت کے قائل ہو ہم بھی قیامت کے قائل ہیں، تم بھی آسمانی کتابوں کو مانتے ہو ہم بھی آسمانی کتابوں کو مانتے ہیں، تم بھی پیغمبروں کو مانتے ہو ہم بھی مانتے ہیں، تم بھی نمازیں پڑھتے ہو ہم بھی پڑھتے ہیں، تم بھی روزے رکھتے ہو ہم بھی روزے رکھتے ہیں۔ اس لیے ہم آپ کے ساتھ مباہلہ نہیں کریں گے۔ ہم آپ کی وفادار رعیت ہیں۔ ہم پر جو ٹیکس اور جزیہ عائد ہوتا ہے وہ ہمیں بتاؤ ہم ادا کریں گے۔ اس طرح بات کو ٹالا اور چلے گئے۔

آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ یہ اگر مباہلہ کرتے تو اسی مقام پر ختم ہو جاتے۔ ایک بھی زندہ بچ کر نہ جا سکتا۔ اللہ تعالیٰ کے پیغمبر کے ساتھ مباہلہ کرنا اور بچ کے جانا، سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

جزیہ کا مفہوم

ن کے ساتھ جزیہ یہ طے ہوا کہ تیس عدد اونٹ، تیس عدد گھوڑے، تیس عدد نیزے، تیس عدد خود، تیس عدد زرہیں اور دو ہزار سوٹ کپڑوں کے سالانہ ادا کریں گے۔ معاہدہ طے ہو گیا تحریر لکھی گئی اور وہ واپس چلے گئے۔

یہاں جزیہ کا مفہوم بھی سمجھ لیں۔ غیر مسلم جو اسلامی ملک میں آباد ہیں ان میں سے جو جوان سال ہیں اور فوج میں بھرتی نہیں ہونا چاہتے، وہ جزیہ ادا کریں گے۔ اور اگر فوج میں بھرتی ہو جائیں اور حکومت ان پر اعتماد بھی کرے تو ان پر کوئی جزیہ نہیں ہے۔ جیسا کہ بچے پر کوئی جزیہ نہیں، بوڑھے پر کوئی جزیہ نہیں۔ ان کے جو مذہبی پیشوا ہیں ان پر بھی کوئی جزیہ نہیں۔ صرف جوانوں پر ہوگا۔ کیوں کہ ملک میں آخر ان کے بھی کارخانے ہیں، زمینیں ہیں اور باغات ہیں، دکانیں ہیں۔ ملک محفوظ ہوگا تو وہ بھی محفوظ ہوں گے اور اگر ملک محفوظ نہ رہا تو وہ بھی محفوظ نہیں رہیں گے۔ اس لیے ملکی دفاع اور اپنے مال و جان کے تحفظ کے لیے ٹیکس ادا کریں۔ تو یہ ملکی دفاع اور جان و مال کے تحفظ کے لیے جو تھوڑی سی رقم دیں گے اس کا نام جزیہ ہے۔ اور یہ نہ تو عقل کے خلاف ہے اور نہ ہی نقل کے۔

اسلام میں ٹیکس کی حقیقت

وہ جزیہ کتنا ہوگا؟ تو آنحضرت ﷺ اور خلفائے راشدین کے زمانہ میں جو امیر ترین آدمی ہوتا تھا اس سے سالانہ اڑتالیس درہم لیے جاتے تھے جو اس وقت تقریباً پندرہ سو روپے بنتے ہیں۔ اور درمیانے قسم کے آدمی سے چوبیس درہم سالانہ اور معمولی آمدنی والے سے بارہ درہم لیے جاتے تھے۔ اور جس علاقے میں ان کی حفاظت کا انتظام نہیں ہو سکتا تھا وہاں ان کو جزیے کی رقم واپس دے دی جاتی تھی۔

چنانچہ حضرت ابو عبیدہ ابن جراح رضی اللہ عنہ چیف کمانڈر تھے۔ انھوں نے عراق کے علاقے میں اپنے فوجی افسروں کو تحریری حکم بھیجا کہ غیر مسلموں سے جو تم نے جزیہ وصول کیا ہے وہ ان کو واپس کر دو۔ کیوں کہ اس وقت ہماری رومیوں کے ساتھ جنگ ہے ہم ان کی حفاظت کی ذمہ داری پوری نہیں کر سکتے۔ لہٰذا دیانت داری کا تقاضا ہے کہ ان کی رقم ان کو واپس کر دو۔ چنانچہ وہ رقم واپس کر دی گئی۔ جب ان کو رقم واپس کی گئی تو انھوں نے سوال کیا کہ یہ رقم تم نے واپس کیوں کی ہے؟ تو ان کو آگاہ کیا گیا ہے کی کہ یہ رقم ہم لیتے ہیں تمھاری جان، مال، عزت و آبرو کی حفاظت کے لیے۔ اور اس وقت ہم خود لڑائی کا شکار ہیں لہٰذا تمھارا تحفظ نہیں کر سکتے۔ اس واسطے جزیے کی رقم واپس کر دی ہے۔ یہ جن کو جزیے کی رقم واپس کی گئی وہ عیسائی تھے اور جن کے ساتھ مسلمانوں کی لڑائی تھی یعنی رومی، وہ بھی عیسائی تھے۔ لیکن اس کے باوجود ان عیسائیوں نے دعا کی کہ رب تعالیٰ تمھیں فتح نصیب

فرمائے اورتم کامیاب ہوکرواپس آؤ۔

اسلام میں ٹیکس کی حقیقت آپ حضرات نے سمجھ لی۔اب اپنی حکومت کا حال بھی سن لیں۔راہوالی کے سیٹھ محمد یوسف صاحب تین بھائی تھے۔ان کے بڑے بھائی کا نام عبداللہ تھا،وہ فوت ہوگئے۔اورایک کا نام سعید تھا۔غالباً وہ زندہ ہیں۔اور سیٹھ محمد یوسف صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی فوت ہوگئے۔آگے ان کی اولاد در اولاد ہے۔آپ میں جو بوڑھے ہیں انھوں نے سیٹھ محمد یوسف صاحب کودیکھا ہوگا۔میرے ساتھ ان کو بڑا انس اور پیار تھا۔دینی مدارس قائم کرنے کے لیے ہم نے کئی جگہ جلسے کیے اورلوگوں کوترغیب دی۔الحمدللہ! ملک اور بیرون ملک آج بھی حفظ وناظرہ کے مدارس موجود ہیں۔

توسیٹھ صاحب کا گتے کا کارخانہ تھا،فیکٹری تھی۔میں نے کہا سیٹھ صاحب! یہ جوتم نے کارخانہ لگایا ہےتم سے حکومت کوئی ٹیکس بھی لیتی ہے؟ ہنس پڑے اور کہنے لگے سو میں سے ترانوے روپے حکومت ٹیکس لیتی ہے۔میں نے کہا پھرتمھارے پاس کیا بچا؟ پھر ہنس پڑے اور کہنے لگے ہمیں سات روپے بچتے ہیں اوران میں بھی فلاں فلاں ٹیکس ہے۔

آج پوراٹیکس کون ادا کرتا ہے؟ اگر یہ کارخانہ داراور تاجر حضرات پوراپوراٹیکس ادا کردیں اور ہمارے حکمرانوں نے جو اربوں روپے اپنے کھاتوں میں جمع کیے ہوئے ہیں وہ ان سے واپس لے لیے جائیں تو پھر ہمیں کسی سے قرضہ لینے کی ضرورت نہیں ہے۔اورقرض دینے والوں نے ہمیں ایسے شکنجے میں کسا ہوا ہے کہ مہاجن بنیے سے جان چھڑانا آسان ہے مگران کے شکنجے سے نکلنا مشکل ہے۔

توعیسائیوں کا یہ کہنا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے بیٹے ہیں بالکل غلط ہے۔صحیح بات وہی ہے جواللہ تعالیٰ نے بیہ فرمائی کہ وہ اللہ تعالیٰ کے بندے اور رسول ہیں اوران کواللہ تعالیٰ نے کلمہ کن کے ساتھ بغیر باپ کے پیدا فرمایا ہے۔﴿اِنَّ ھٰذَا لَھُوَ الْقَصَصُ الْحَقُّ﴾ بے شک یہ بیان ہے جوعیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں ہوا ہے حق ہے ﴿وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ﴾ اورنہیں ہے کوئی الٰہ اللہ تعالیٰ کے سوا۔معبود صرف پروردگار ہے۔نہ عیسیٰ علیہ السلام ہیں،نہ ان کی والدہ،نہ کوئی ولی،نہ کوئی امام،نہ کوئی فرشتہ،نہ کوئی پیغمبر۔﴿وَاِنَّ اللّٰهَ لَھُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ﴾ اور بے شک اللہ تعالیٰ البتہ غالب اورحکمت والا ہے ﴿فَاِنْ تَوَلَّوْا﴾ پس اگر یہ لوگ حق کی بات سننے سے گریز کریں ﴿فَاِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِالْمُفْسِدِيْنَ﴾ پس بے شک اللہ تعالیٰ فسادیوں کوخوب جانتا ہے۔وہ خودان سے نمٹ لے گا۔

﴿قُلْ﴾ آپ کہہ دیں ﴿يٰٓاَھْلَ الْكِتٰبِ﴾ اے کتاب والو! ﴿تَعَالَوْا﴾ آؤ ﴿اِلٰى كَلِمَةٍ﴾ ایک بات کی طرف ﴿سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ﴾ جو برابر ہے ہمارے درمیان اور تمھارے درمیان ﴿اَلَّا نَعْبُدَ﴾ یہ کہ ہم نہ عبادت کریں ﴿اِلَّا اللّٰهَ﴾ مگرصرف اللہ تعالیٰ کی ﴿وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا﴾ اورہم نہ شریک کریں اس کے ساتھ کسی چیز کو

﴿وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا﴾ اور نہ بنائیں ہم میں سے بعض بعض کو ﴿اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ رب تعالیٰ کے سوا کارساز ﴿فَاِنْ تَوَلَّوْا﴾ پس اگر وہ لوگ پھر جائیں ﴿فَقُوْلُوا﴾ پس تم کہو ﴿اشْهَدُوْا﴾ تم گواہ بن جاؤ ﴿بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ﴾ بے شک ہم مسلمان ہیں ﴿يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ﴾ اے کتاب والو! ﴿لِمَ تُحَآجُّوْنَ﴾ کیوں جھگڑا کرتے ہو تم ﴿فِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ﴾ ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں ﴿وَمَآ اُنْزِلَتِ التَّوْرٰىةُ﴾ اور نہیں اُتاری گئی تورات ﴿وَالْاِنْجِيْلُ﴾ اور انجیل ﴿اِلَّا مِنْۢ بَعْدِهٖ﴾ مگر ان کے بعد ﴿اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ﴾ کیا پس تم نہیں سمجھتے ﴿هٰٓاَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ﴾ خبردار تم یہ ہو ﴿حَاجَجْتُمْ﴾ جھگڑا کرتے ہو ﴿فِيْمَا﴾ ان چیزوں کے بارے میں ﴿لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ﴾ جن کا تمھیں کچھ نہ کچھ علم ہے ﴿فَلِمَ تُحَآجُّوْنَ﴾ پس کیوں تم جھگڑا کرتے ہو؟ ﴿فِيْمَا﴾ ان چیزوں کے بارے میں ﴿لَيْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ﴾ جن کا تمھیں کچھ بھی علم نہیں ہے ﴿وَاللّٰهُ يَعْلَمُ﴾ اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے ﴿وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ اور تم نہیں جانتے ﴿مَا كَانَ اِبْرٰهِيْمُ يَهُوْدِيًّا﴾ نہیں تھے ابراہیم یہودی ﴿وَّلَا نَصْرَانِيًّا﴾ اور نہ نصرانی ﴿وَّلٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا﴾ اور لیکن تھے ایک طرف کے ہونے والے (یکسو ہونے والے) ﴿مُّسْلِمًا﴾ اللہ تعالیٰ کے فرماں بردار ﴿وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ﴾ اور نہ تھے شرک کرنے والوں میں سے۔

زبان سے اقرار عملی انکار

اس سے پہلی آیات میں تفصیل کے ساتھ یہ بات بیان ہو چکی ہے کہ ساٹھ آدمیوں پر مشتمل نجران کے عیسائیوں کا ایک وفد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا۔ جس میں سیاسی زعماء، ان کے سردار اور مذہبی راہنما بھی تھے۔ یہ خاصے پڑھے لکھے لوگ تھے۔ ان کے آنے کا اصل مقصد تو یہ تھا کہ ہم تمھاری وفادار رعیت بن کے رہنا چاہتے ہیں۔ ہمارے اوپر جو قانون لاگو ہوتے ہیں ہمیں ان سے آگاہ کیا جائے اور ہمارے ذمہ جو ٹیکس ہے وہ بتایا جائے۔ مگر مذہبی گفتگو بھی ہوئی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو مباہلہ کا چیلنج بھی دیا مگر ان کو مباہلہ کے لیے سامنے آنے کی ہمت نہ ہوئی۔ چوں کہ اس مقام پر خاصا مجمع تھا۔ جس میں یہودی بھی تھے، عیسائی بھی تھے، مشرک بھی تھے، مجوسی بھی تھے (مجوسی انجیل کو نہیں مانتے) اور صائبین بھی تھے جن کا دعویٰ تھا کہ ہم زبور کو مانتے ہیں۔ اگرچہ یہ گنے چنے افراد تھے۔ سرزمین عرب میں زیادہ تر آبادی مشرکوں کی تھی۔ دوسرے نمبر پر یہودی تھے، تیسرے نمبر پر عیسائی۔ صابی اور مجوسی بھی اکا دکا ہوتے تھے۔ اور اس موقع پر سب لوگ موجود تھے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ان کو دعوت دو۔

﴿قُلْ﴾ اے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم! آپ کہہ دیں ﴿يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ﴾ اے کتاب والو! یعنی جو آسمانی کتابوں کو ماننے کا دعویٰ کرتے ہو ان کو ہمارا خطاب ہے ﴿تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ﴾ آؤ ایک بات کی طرف جو برابر ہے، مسلّم ہے

ہمارے درمیان اور تمھارے درمیان۔ یعنی ہم بھی مانتے ہیں اور تم بھی ماننے کا دعویٰ کرتے ہو۔ ہم تو دل سے مانتے ہیں اور عمل سے اس کا ثبوت دیتے ہیں اور تم صرف زبان سے اقرار کرتے ہو مگر عمل اس کے خلاف کرتے ہو۔ وہ بات یہ ہے کہ ﴿اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ﴾ یہ کہ ہم اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں۔ کہتے وہ بھی تھے کہ ہم اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی عبادت نہیں کرتے۔

جیسے: آج کل بعض جاہل قسم کے لوگ کہتے یہی ہیں کہ عبادت اللہ تعالیٰ کی ہے۔ مگر قبروں پر بھی جھکتے ہیں، مرادیں بھی مانگتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ ان کی تعظیم ہے عبادت نہیں ہے۔ حالانکہ کسی سے مراد مانگنا، تکلیف میں پکارنا، طواف کرنا، عبادت ہے۔ نذر و نیاز دینا، منت ماننا، عبادت ہے۔ تو دعویٰ یہ کرتے ہیں کہ ہم اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی عبادت نہیں کرتے مگر عملی طور پر کر رہے ہیں۔

یہی حال یہود و نصاریٰ اور دوسرے گمراہ فرقوں کا تھا۔ کہتے تھے کہ عبادت صرف اللہ تعالیٰ کی ہونی چاہیے۔ مگر غیر اللہ کی عبادت کرتے تھے۔ ﴿وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا﴾ اور نہ ہم شریک کریں اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی شے کو۔ زبانی طور پر وہ بھی دعویٰ کرتے تھے کہ ہم اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہراتے اور ہم بھی کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی شریک نہیں ہے۔ نہ ذات میں، نہ صفات میں، نہ افعال میں۔ اور تمھیں ہم اسی چیز کی دعوت دیتے ہیں کہ جس طرح تم زبانی طور پر دعویٰ کرتے ہو عمل بھی اس کے مطابق کرو۔

﴿وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ اور نہ بنائیں ہم میں سے بعض بعض کو رب تعالیٰ کے سوا کارساز۔ یعنی ہم بھی کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی رب نہیں ہے اور تم بھی دعویٰ کرتے ہو کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی رب نہیں۔ لہٰذا اس پر عمل کرو کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو رب نہ بناؤ۔ مگر یہ بھی ان کا فقط دعویٰ ہی دعویٰ تھا عملی طور پر انھوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور اپنے مولویوں اور پیروں کو رب بنایا ہوا تھا۔ چنانچہ قرآن پاک میں آتا ہے:

﴿اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ﴾ [التوبہ: ۳۱، پارہ: ۱۰]

"انھوں نے رب بنالیا اپنے مولویوں اور پیروں کو اور عیسیٰ علیہ السلام کو۔"

حضرت عدی ابن حاتم رضی اللہ عنہ پہلے مشرک تھے اور پڑھے لکھے تھے۔ پھر عیسائی ہو گئے اور عیسائیوں کے پادری بن گئے۔ ان کو تبلیغ کرتے۔ مشہور سخی حاتم طائی کے بیٹے تھے۔ ان کا باپ بڑا سخی تھا۔ آج بھی سخاوت کی دنیا میں اس کا نام ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ بھئی! فلاں تو حاتم طائی ہے۔ طے قبیلے کی طرف نسبت ہے۔ اس کی طرف نسبت کی وجہ سے طائی کہا جاتا ہے۔ حاتم طائی خود تو مسلمان نہیں ہوا لیکن اللہ تعالیٰ نے حضرت عدی ابن حاتم رضی اللہ عنہ کو توفیق عطا فرمائی اور یہ ۱۰ھ میں مسلمان ہو گئے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب یہ آیت پڑھی ﴿اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ﴾ کہ اہل کتاب نے اپنے مولویوں اور پیروں کو رب بنالیا ہے۔ تو حضرت عدی ابن حاتم رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں عیسائیوں کا پادری اور مبلغ رہا ہوں مگر میرے علم میں نہیں ہے کہ ہم نے مولویوں کو اور پیروں کو رب بنایا ہوا تھا۔ ترمذی شریف اور مسند احمد کی روایت

میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ تمہارے مولوی اور پیر بغیر کسی شرعی دلیل کے جو تمہیں کہتے تھے تم مانتے تھے یا نہیں؟ اور بغیر کسی شرعی دلیل جس چیز کو حلال کہتے تھے تم حلال سمجھتے تھے اور جس چیز کو حرام کہتے تھے اس کو تم حرام سمجھتے تھے۔ حضرت عدی رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ایسا تو ہم کرتے رہے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہی تو رب بنانا ہے۔ کسی آدمی کی بات تب حجت ہے کہ وہ دلیل کے ساتھ کرے کہ یہ بات قرآن میں آئی ہے یا حدیث میں آئی ہے یا اجتہادی مسئلہ ہے۔ اور فقہ اسلامی سے پیش کرتا ہے تو ٹھیک ہے یہ سب وہی احکامات ہیں۔ مولوی، پیر اگر اپنی طرف سے کچھ کہتا ہے بغیر کسی شرعی دلیل کے تو نہ مانو۔ اگر مانو گے تو شرک کے مرتکب ہوگے۔

حکم صرف اللہ تعالیٰ کا ہے

کیوں کہ ﴿اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ﴾ [یوسف: ۴۰] "حکم صرف اللہ تعالیٰ کا ہے۔" مولوی، پیر کا ذاتی حکم کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ آج کل کے جاہل قسم کے لوگ تعویذ لینے کے بعد کہتے ہیں کہ بتاؤ کہ ہم کون سی چیز کھانی چھوڑ دیں؟ کیوں کہ غلط کار لوگوں نے ذہن بنادیا ہے کہ تعویذ تب اثر کرتا ہے جب کوئی چیز کھانی چھوڑ دو۔

اسی قسم کی ایک عورت تعویذ کرانے آئی تھی۔ بڑی اڑیل تھی۔ کہنے لگی بتاؤ میں کون سی چیز کھانی چھوڑ دوں؟ میں نے کہا بی بی! جو چیزیں اللہ تعالیٰ نے حلال فرمائی ہیں وہ کھاؤ اور جو حرام فرمائی ہیں ان کے نزدیک نہ جاؤ۔ پھر کہنے لگی نہیں بتاؤ میں کون سی چیز کھانی چھوڑ دوں؟ میں نے کہا بی بی! جو چیزیں اللہ تعالیٰ نے حلال فرمائی ہیں وہ کھاؤ اور جو حرام فرمائی ہیں ان کے نزدیک نہ جاؤ۔ لیکن وہ پھر کہنے لگی کہ بتاؤ میں کون سی چیز نہ کھاؤں؟ تو میں نے کہا کہ میرا مغز نہ کھا باقی سب کچھ کھا۔

اس سے اندازہ لگاؤ کہ کہاں تک ذہن بنا ہوا ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ فلاں چیز چھوڑ دے کوئی کہتا ہے فلاں چیز چھوڑ دے۔ کوئی کہتا ہے فلاں جگہ نہ جانا، سوتک ہے سوتک۔ سوتک لگائی ہوئی ہے۔ یہی تو شرکیہ رسمیں ہیں۔ جو مولوی، پیر کہہ دیں اس پر آمین کہنی ہے۔ حالانکہ شرعی حکم صرف اللہ تعالیٰ کا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے احکامات کے مقابلہ میں اگر کوئی کسی مولوی اور پیر کا حکم مانتا ہے تو مشرک ہے۔

تو پھر فرمایا ان کو یہ دعوت دو ﴿فَاِنْ تَوَلَّوْا﴾ پس اگر وہ لوگ پھر جائیں یعنی نہ مانیں ﴿فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ﴾ تو اے مومنو! تم کہہ دو اے اہل کتاب! تم گواہ بن جاؤ بے شک ہم مسلمان ہیں۔ یعنی اے اہل کتاب! اگر تم نہیں مانتے نہ مانو ہم اللہ تعالیٰ کے فرماں بردار ہیں۔ ہم مانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی عبادت صحیح نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کا کوئی شریک نہیں ہے۔ نہ اس کی ذات میں کوئی شریک ہے، نہ اس کے اوصاف میں کوئی شریک ہے، نہ کوئی پیر، نہ کوئی مولوی، نہ کوئی پیغمبر، نہ کوئی بڑا، نہ کوئی چھوٹا۔

اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں حضرت ابراہیم علیہ السلام بڑی مسلم شخصیت ہیں۔ اور یہ بات بھی آپ کئی دفعہ سن چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ

کی مخلوق میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مقام سب سے بلند ہے۔ اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں اس درجے اور اس شان کا کوئی اور نہیں ہے۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد درجہ ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بعد درجہ ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا۔ اللہ تعالیٰ کی ساری مخلوق میں یہ منتخب بزرگ ہیں۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام تمام مذاہب میں مسلم شخصیت تھے۔ ہر آدمی اپنی کڑی ان کے ساتھ ملاتا تھا۔ یہودی کہتے تھے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ہمارے تھے، عیسائی کہتے تھے کہ ہمارے تھے، صابی کہتے تھے کہ ہمارے تھے۔ اور اس بات پر ان کا آپس میں بڑا شور شرابہ ہوتا تھا۔

مشرک اور بدعتی کا فقہ سے کوئی تعلق نہیں ہے

اس کو تم اس طرح سمجھو جس طرح آج کل کے مشرک اور بدعتی اپنے آپ کو حنفی کہتے ہیں۔ وجہ اس کی یہی ہے کہ فقہ حنفی چوں کہ مشہور ہے اس واسطے یہ اپنی کڑی فقہ حنفی کے ساتھ ملاتے ہیں ورنہ حقیقت میں مشرکوں اور بدعتیوں کا فقہ حنفی کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔ الحمد للہ! میں نے فقہ حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی سب کا مطالعہ کیا ہے۔ میں اس وقت باوضو ہوں اور قرآن شریف میرے سامنے موجود ہے۔ میں پورے دعویٰ سے یہ بات کہتا ہوں کہ شرک اور بدعت کی جتنی تردید فقہ حنفی میں ہے اتنی اور کسی فقہ میں نہیں ہے۔ فقہ حنفی کی کوئی مستند کتاب دیکھ لیں۔ مثلاً: شامی ہے، البحر الرائق ہے اور تو اور عالم گیری ہی دیکھ لیں۔ یہ اورنگ زیب عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ کے حکم سے پانچ سو علمائے کرام نے مرتب کی تھی اور ہندوستان کے لیے قانون بنایا تھا۔ میں بلا مبالغہ کہتا ہوں کہ وہ پانچ سو علمائے کرام ایسے تھے کہ اس وقت ساری دنیا میں علم و عمل کے اعتبار سے ان میں سے ایک عالم کی بھی نظیر نہیں ملتی۔ تو عالمگیری میں دیکھ لیں شرک اور بدعت کی کتنی تردید ہے۔ مگر اس کے باوجود یہ مشرک اور بدعتی اپنے آپ کو حنفی کہتے ہیں۔

یہود و نصاریٰ اور مشرکین کا ابراہیمی ہونے کا دعویٰ

اسی طرح یہودی اور عیسائی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی مسلم شخصیت سے ناجائز فائدہ اُٹھاتے تھے اور آپس میں جھگڑتے تھے۔ اور ہر ایک دعویٰ کرتا تھا کہ ابراہیم ہمارے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ﴿يَٰٓأَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تُحَآجُّوْنَ فِيٓ إِبْرٰهِيْمَ﴾ اے کتاب والو! کیوں جھگڑا کرتے ہو تم ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں ﴿وَمَآ أُنْزِلَتِ التَّوْرٰىةُ وَالْإِنْجِيْلُ إِلَّا مِنْۢ بَعْدِهٖ﴾ اور نہیں اُتاری گئی تورات اور انجیل مگر ان کے بعد۔ تورات حضرت ابراہیم علیہ السلام سے تقریباً ڈیڑھ ہزار سال بعد نازل ہوئی ہے۔ اور انجیل تقریباً ساڑھے تین ہزار سال بعد نازل ہوئی ہے۔ اور تورات کا مذہب یہودیت ہے اور انجیل کا مذہب نصرانیت ہے۔ بڑی عجیب بات ہے کہ کتابیں بعد میں نازل ہوئیں اور مذہب والے پہلے آ کے چلے گئے۔ کیا کہتے ہو؟ ﴿أَفَلَا تَعْقِلُوْنَ﴾ کیا پس تم اتنی موٹی بات بھی نہیں سمجھتے کہ قانون بعد میں بنا ہے اور ماننے والے پہلے آ کے چلے جاتے ہیں؟

﴿هٰٓأَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ حٰجَجْتُمْ﴾ خبردار! تم یہ ہو جھگڑا کرتے ہو ﴿فِيْمَا لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ﴾ ان چیزوں کے بارے میں جن کا تمھیں کچھ نہ کچھ علم ہے۔ جھگڑا کرتے رہے ہو اور کرتے ہو لیکن ﴿فَلِمَ تُحَآجُّوْنَ فِيْمَا لَيْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ﴾ پس کیوں تم جھگڑا

کرتے ہو؟ ان چیزوں کے بارے میں جن کا تمھیں کچھ بھی علم نہیں ہے ﴿وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔ رب تعالیٰ کے علم کے مقابلے میں کسی کے علم کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ لہٰذا اب تم رب تعالیٰ کا فیصلہ سن لو ﴿مَا كَانَ اِبْرٰهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّلَا نَصْرَانِيًّا وَّلٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا﴾ نہیں تھے ابراہیم علیہ السلام یہودی اور نہ عیسائی اور لیکن تھے ایک طرف کے ہونے والے، اللہ تعالیٰ کے فرماں بردار۔ حنیف کا معنیٰ ہے ایک طرف ہو کے رہنے والے، مُوَحِّد، مُسْلِم ﴿وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ﴾ اور نہ تھے شرک کرنے والوں میں سے۔ اور تم سر سے لے کر پاؤں تک شرک میں ڈوبے ہوئے ہو اور اپنی کڑی ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ ملاتے ہو۔ اور مکے کے مشرک بھی کہتے تھے کہ ہم نسل کے اعتبار سے بھی اور مسلک کے اعتبار سے بھی ابراہیمی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے واضح طور پر فرمادیا ﴿وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ﴾ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام شرک کرنے والوں میں سے نہیں تھے۔ یہ سب تمھارے خالی دعوے ہیں۔ اب اتنی واضح بات کے بعد بھی کوئی نہ مانے تو اس کا کیا علاج ہو سکتا ہے۔

﴿اِنَّ اَوْلَى النَّاسِ﴾ بے شک لوگوں میں سے زیادہ قریب ﴿بِاِبْرٰهِيْمَ﴾ ابراہیم علیہ السلام کے ﴿لَلَّذِيْنَ﴾ البتہ وہ لوگ ہیں ﴿اتَّبَعُوْهُ﴾ جنھوں نے ان کی پیروی کی ﴿وَهٰذَا النَّبِيُّ﴾ اور ہمارے یہ نبی ان کے قریب ہیں ﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ اور وہ لوگ جو ایمان لائے ﴿وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ اور اللہ تعالیٰ دوست ہے مومنوں کا ﴿وَدَّتْ طَّآئِفَةٌ﴾ پسند کیا ایک گروہ نے ﴿مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ﴾ اہل کتاب میں سے ﴿لَوْ يُضِلُّوْنَكُمْ﴾ اس بات کو کہ تمھیں گمراہ کردیں ﴿وَمَا يُضِلُّوْنَ﴾ اور وہ نہیں گمراہ کر سکتے ﴿اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ﴾ مگر اپنی جانوں کو ﴿وَمَا يَشْعُرُوْنَ﴾ اور وہ نہیں سمجھتے ﴿يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ﴾ اے اہل کتاب! ﴿لِمَ تَكْفُرُوْنَ﴾ کیوں انکار کرتے ہو؟ ﴿بِاٰيٰتِ اللّٰهِ﴾ اللہ تعالیٰ کی آیتوں کا ﴿وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ﴾ اور حالاں کہ تم گواہی دیتے ہو ﴿يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ﴾ اے کتاب والو! ﴿لِمَ تَلْبِسُوْنَ الْحَقَّ﴾ کیوں خلط ملط کرتے ہو حق کو ﴿بِالْبَاطِلِ﴾ باطل کے ساتھ ﴿وَتَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ﴾ اور کیوں چھپاتے ہو حق کو ﴿وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ﴾ اور حالاں کہ تم جانتے ہو ﴿وَقَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ﴾ اور کہا ایک گروہ نے اہل کتاب میں سے ﴿اٰمِنُوْا﴾ ایمان لاؤ ﴿بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ﴾ اُس چیز پر جو نازل کی گئی ﴿عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ ان لوگوں پر جو ایمان لائے ﴿وَجْهَ النَّهَارِ﴾ دن کے ابتدائی حصے میں ﴿وَاكْفُرُوْٓا اٰخِرَهٗ﴾ اور انکار کرو اس کے آخری حصے میں ﴿لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ﴾ تاکہ وہ بھی دین سے پھر جائیں ﴿وَلَا تُؤْمِنُوْٓا﴾ اور نہ تصدیق کرنا ﴿اِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِيْنَكُمْ﴾ مگر اس کی جس نے تمھارے دین کی پیروی کی ﴿قُلْ اِنَّ الْهُدٰى﴾ کہہ دے بے شک ہدایت ﴿هُدَى اللّٰهِ﴾ اللہ تعالیٰ کی ہدایت ہے ﴿اَنْ يُّؤْتٰٓى اَحَدٌ﴾ (ضد اس لیے کرتے ہو) کہ دیا جائے کوئی اور ﴿مِّثْلَ مَآ اُوْتِيْتُمْ﴾ مثل

اس چیز کے جو دیے گئے تم ﴿اَوۡ یُحَآجُّوۡکُمۡ﴾ یا وہ جھگڑا کریں تمھارے ساتھ ﴿عِنۡدَ رَبِّکُمۡ﴾ تمھارے رب کے ہاں ﴿قُلۡ اِنَّ الۡفَضۡلَ بِیَدِ اللّٰہِ﴾ کہہ دے بے شک فضیلت اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے ﴿یُؤۡتِیۡہِ مَنۡ یَّشَآءُ﴾ دیتا ہے وہ فضیلت جس کو وہ چاہے ﴿وَاللّٰہُ وَاسِعٌ عَلِیۡمٌ﴾ اور اللہ تعالیٰ کشائش کرنے والا ہے، جاننے والا ہے ﴿یَّخۡتَصُّ بِرَحۡمَتِہٖ﴾ خاص کرتا ہے اپنی رحمت کے ساتھ ﴿مَنۡ یَّشَآءُ﴾ جس کو چاہے ﴿وَاللّٰہُ ذُو الۡفَضۡلِ الۡعَظِیۡمِ﴾ اور اللہ تعالیٰ بڑی مہربانی کرنے والا ہے۔

کل کے سبق میں تم نے یہ بات پڑھی کہ یہود و نصاریٰ اور مشرکین میں سے ہر ایک کا دعویٰ تھا کہ جو ہمارا دین ہے ہمارے عقائد اور نظریات ہیں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بھی یہی تھے۔ اور ہر ایک اپنی کڑی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ جوڑتا تھا۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بڑی سختی کے ساتھ تردید کرتے تھے کہ ان کا حضرت ابراہیم علیہ السلام سے قطعاً کوئی تعلق نہیں ہے۔ تو رب تعالیٰ نے ان سب کے دعوے کی تردید فرمائی کہ جھوٹے ہیں۔ ابراہیم علیہ السلام نہ یہودی تھے، نہ عیسائی تھے، نہ مشرک تھے بلکہ وہ موحّد اور فرماں بردار تھے۔

اور اب جن لوگوں کا ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ تعلق ہے وہ بیان فرمارہے ہیں ﴿اِنَّ اَوۡلَی النَّاسِ بِاِبۡرٰهِیۡمَ لَلَّذِیۡنَ اتَّبَعُوۡهُ﴾ بے شک لوگوں میں سے زیادہ قریب ابراہیم علیہ السلام کے البتہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے صحیح معنیٰ میں ان کی پیروی کی ﴿وَهٰذَا النَّبِیُّ﴾ اور ہمارے یہ نبی ان کے قریب ہیں۔ ان کا ان کے ساتھ تعلق ہے ﴿وَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا﴾ اور ان لوگوں کا ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ تعلق ہے جو ایمان لائے۔ جیسے: حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت علی وغیرہم رضوان اللہ علیہم اجمعین۔ اور یہود و نصاریٰ اور مشرکین کے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ تعلق کے دعوے بالکل باطل ہیں۔ کیوں کہ ابراہیم علیہ السلام تو شرک کی جڑیں کاٹنے والے تھے اور تم سر سے لے کر پاؤں تک شرک میں ڈوبے ہوئے ہو۔ تمھارا ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ کیا تعلق ہے؟

او ظالمو! حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جو گھر خالص رب تعالیٰ کی عبادت کے لیے بنایا تھا تم نے اس کی بیرونی دیواروں پر تین سو ساٹھ [۳۶۰] بت نصب کیے ہوئے ہیں اور ان میں حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت اسماعیل علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مجسمے بھی تھے۔ حضرت مریم علیہا السلام کا مجسمہ بھی تھا۔ ان کی تم تقسیم کر کے پوجا کرتے ہو کہ آج اس کی پوجا اور چڑھاوا کل اس کی پوجا اور چڑھاوا۔ رب کے گھر کو تم نے بت خانہ بنایا ہوا ہے۔ تم کس منہ سے اپنے آپ کو ابراہیمی کہتے ہو؟ اور جن کا صحیح معنیٰ میں ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ تعلق ہے ان کی تم نفی کرتے ہو اور کہتے ہو کہ یہ صابی ہیں ان کا ابراہیم علیہ السلام کے دین کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔

سرزمین عرب کا پہلا مشرک ؟

اصل بات یہ ہے کہ صدیوں تک عربوں میں حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت اسماعیل علیہ السلام کا سچا دین رائج رہا ہے۔ یہ

سارے لوگ صحیح العقیدہ تھے۔ پہلا بد بخت اور منحوس شخص جس نے عرب کی سرزمین میں شرک کی بنیاد رکھی قبیلہ بنوخزاعہ کا عمرو ابن لُحی ابن قمعہ تھا۔ یہ شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت سے تقریباً اڑھائی سو سال پہلے گزرا ہے۔ اس شخص کی اخلاقی حالت کا ذکر بخاری شریف کی روایت میں آتا ہے۔ اس شخص نے اپنی لاٹھی کے ساتھ کنڈی لگائی ہوئی تھی جس طرح مچھلیاں پکڑنے والی کنڈی ہوتی ہے۔ طواف کرتے وقت دیکھتا جس شخص کی چادر یا کمبل اچھا ہوتا کنڈی کے ذریعے اُسے کھینچ لیتا۔ وہ آدمی اپنے دھیان میں طواف کرتا رہتا۔ (لوگ بھی تھوڑے ہوتے تھے اب تو اللہ تعالیٰ کی مخلوق کافی ہوگئی ہے)۔ اگر کسی کو پتا چل جاتا تو کہتا کہ معاف کرنا یہ کنڈی ویسے ہی اُڑ گئی ہے۔ تو جو بے ایمان طواف کرتے وقت لوگوں کی چادریں اُتارتا تھا اس پر کیا اعتبار ہوسکتا ہے؟

اَوَّلُ مَنْ سَيَّبَ السَّوَائِبَ " یہی وہ پہلا شخص ہے جس نے سائبہ کی رسم ڈالی۔" سائبہ اس جانور کو کہتے ہیں جو بزرگوں کے نام پر تقرب کے طور پر چھوڑ دیا جاتا ہے تاکہ وہ بزرگ ان پر راضی رہیں۔ جیسے: گوجرانوالا میں تمھیں کئی گائیں اور بیل آوارہ پھرتے نظر آئیں گے۔ یہ جاہل لوگوں نے بابوں (پیروں) کے نام پر چھوڑے ہوئے ہیں ان کو چھیڑتا مارتا کوئی نہیں ہے کہ بابا (پیر) ہمیں نقصان پہنچائے گا۔ یہاں تک کہ اگر وہ کسی کی دکان یا ریڑھی میں منہ ڈال دیں تو بڑے پیار سے ہٹاتے ہیں جس طرح بچے کو۔ کیوں کہ یہ پیر صاحب کی گائے ہے۔ اس کی تردید اللہ تعالیٰ نے ساتویں پارہ میں فرمائی ہے ﴿مَا جَعَلَ اللّٰهُ مِنْۢ بَحِيْرَةٍ وَّلَا سَآئِبَةٍ﴾ [المائدہ:۱۰۳] "اللہ تعالیٰ نے کوئی بحیرہ نہیں بنایا، نہ سائبہ بنایا ہے۔"

اور اس زمانے میں موحد بھی تھے جیسا کہ تم سن چکے ہو کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے چچا حضرت زید بن عمرو بن نفیل۔ یہ زمانہ جاہلیت کے موحدین میں سے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اظہارِ نبوت سے پہلے فوت ہوگئے۔ اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ہوتے تو ان لوگوں میں سے ہوتے جنھوں نے سب سے پہلے کلمہ پڑھا۔ اور جو ایمان والے ہیں ﴿وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ اور اللہ تعالیٰ دوست ہے مومنوں کا۔ یعنی محبت ایمان والوں ہی سے کرتا ہے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تکالیف

آگے فرمایا کہ یہ گمراہی میں اتنے آگے چلے گئے ہیں جو لوگ راہِ راست پر ہیں ان کو بھی گمراہ کرنے کے درپے ہیں۔ فرمایا ﴿وَدَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يُضِلُّوْنَكُمْ﴾ پسند کیا ایک گروہ نے اہل کتاب میں سے اس بات کو کہ تمھیں گمراہ کردیں۔ ان میں پڑھے لکھے خبیثوں کی ایک جماعت تھی جو مسلمانوں کو گمراہ کرنے کے حیلے سوچتے رہتے تھے۔ اور وہ گمراہ کس طرح کرتے تھے؟ اس کا ذکر آگے تیسری آیتِ کریمہ میں آرہا ہے۔ یعنی ان کا طریقہ واردات کیا تھا؟ ﴿وَمَا يُضِلُّوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ﴾ اور وہ نہیں گمراہ کرسکتے مگر اپنی جانوں کو۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بڑے پختہ قسم کے لوگ تھے ہماری طرح لوٹے نہیں تھے کہ صبح کو کچھ شام کو کچھ، دن کو کچھ اور رات کو

کچھ۔ بلکہ بڑے پختہ اور مضبوط مسلمان تھے۔ یہ ان کو تو گمراہ نہ کر سکے مگر اس کا وبال ان کی جانوں پر پڑا کہ ان کے گناہوں میں اضافہ ہوا۔ انھوں نے بڑا زور لگایا، منصوبے بنائے گمراہ کرنے کے مگر اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے جو مخلص مومن تھے پھسلے نہیں۔ ہاں وہ لوگ جو مسلمان ہی منافقانہ طور پر ہوئے ان کی بات الگ ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بڑی بڑی تکلیفیں برداشت کیں مگر اسلام نہیں چھوڑا۔

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ہے "الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ" جس میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے حالات وواقعات ہیں۔ اس میں نوعمر بچی کا ذکر کرتے ہیں۔ اس کا نام عرینہ اور کنیت ام شریک تھی۔ ابھی شادی نہیں ہوئی تھی اللہ تعالیٰ نے اس کو اسلام کی توفیق عطا فرمائی اور وہ مسلمان ہوگئی۔ گھر کے سارے افراد ماں، باپ، بہن بھائی نے مارا پیٹا کہ کلمہ چھوڑ دے مگر اس نے یہ سب کچھ برداشت کیا کلمہ نہیں چھوڑا۔ ایک دفعہ دور کے سفر کا اتفاق ہوا۔ کوئی خوشی یا غمی کا سفر تھا۔ سب گھر والوں نے جانا تھا۔ اس کو بھی ساتھ لے گئے اور سب نے ایکا کیا کہ اس کو پانی نہیں دینا۔ سفر میں عموماً پیاس زیادہ لگتی ہے۔ مجبور ہو کر کلمہ چھوڑ دے تب پانی ملے گا۔ ماں سے مانگا، باپ سے مانگا، بھائیوں سے، بہنوں سے، سب نے یہی جواب دیا۔ بالآخر وہ بے ہوش ہو کر گر پڑی۔ کہنے لگے اس کے منہ میں شہد ڈالو، گرم ہوتا ہے تلخی لگے گی پانی مانگے گی اور مجبور ہو کر کلمہ چھوڑ دے گی۔ مگر اس اللہ کی بندی نے کلمہ نہ چھوڑا اور پانی انھوں نے نہ دیا۔ سب انتظار میں تھے کہ اب مری اور اب مری۔ لیکن اسی اثنا میں آسمان سے پانی کا بھرا ہوا ایک ڈول رسی کے ساتھ لٹکتا ہوا اس کے سینے پر آرکا۔ اس نے وہ پانی پیا اور جان بچی۔ جن کے ذہن صاف تھے انھوں نے جب یہ عجیب کرشمہ دیکھا تو اسلام کے قائل ہوگئے اور کلمہ پڑھ لیا۔ اور جو ضدی تھے آخر دم تک ضد پر اڑے رہے۔ مرد تو درکنار عورتوں نے بھی کلمہ نہیں چھوڑا۔

حضرت یاسر رضی اللہ عنہ کی بیوی حضرت سمیہ رضی اللہ عنہا جو کہ حضرت عمار رضی اللہ عنہ کی والدہ ہیں، کے بارے میں تاریخ کے اندر مختلف واقعات آتے ہیں۔ ایک یہ کہ ابوجہل نے ان کا ایک پاؤں ایک اُونٹ کے ساتھ باندھ دیا اور دوسرا پاؤں دوسرے اُونٹ کے ساتھ باندھ دیا۔ اسی طرح ایک بازو ایک اُونٹ کے ساتھ اور دوسرا بازو دوسرے اُونٹ کے ساتھ اور کہا کہ کلمہ چھوڑ دے ورنہ اُونٹوں کو مخالف سمتوں پر دوڑا دوں گا اور تو ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گی۔ مگر حضرت سمیہ رضی اللہ عنہا نے کلمہ نہیں چھوڑا۔ اور یہ بھی آتا ہے کہ ان کے نازک مقام پر برچھا مار کر ان کو شہید کر دیا مگر انھوں نے کلمہ نہیں چھوڑا۔

تو یہودیوں نے گمراہ کرنے کے بڑے حیلے کیے مگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو پھسلا نہیں سکے۔ ﴿وَمَا يَشْعُرُوْنَ﴾ اور وہ اہل کتاب نہیں سمجھتے ہیں کہ ہماری اس کارستانی کا نتیجہ کیا نکلے گا؟ ﴿يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ﴾ اے اہل کتاب! کیوں انکار کرتے ہو؟ اللہ تعالیٰ کی آیتوں کا ﴿وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ﴾ اور حالاں کہ تم گواہی دیتے ہو۔ یہودی نجی محفلوں میں ایک دوسرے کو کہتے تھے کہ یہ وہی رسول ہیں جنھوں نے آنا تھا ﴿الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ﴾ [الاعراف: ۱۵۷] "وہ پاتے ہیں اس کو لکھا ہوا اپنے پاس تورات میں اور انجیل میں۔" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر اور علامتیں انجیل میں بھی اور تورات میں بھی

تھیں۔آپس میں بیٹھے ہوئے کہتے تھے۔ اِنَّ الرَّسُوْلَ حَقٌّ "بے شک یہ سچا رسول ہے۔"اور جب باہر نکلتے تو کہتے کہ یہ وہ نہیں ہے وہ اور ہے۔اب اس کا کیا علاج ہے۔

شریعت میں بدعت کی تردید

تو فرمایا﴿یٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَلْبِسُوْنَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ﴾ اے کتاب والو! کیوں خلط ملط کرتے ہو حق کو باطل کے ساتھ ﴿وَتَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ﴾ اور کیوں چھپاتے ہو حق کو؟ ﴿وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ﴾ اور حالانکہ تم جانتے ہو۔حق اور باطل کے درمیان امتیاز کر سکتے ہو۔تمھیں معلوم ہے کہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے سچے رسول ہیں مگر تم خلط ملط کرتے ہو۔کوئی بات حق کی کرتے ہو اور کوئی باطل کی۔

حق کو باطل کے ساتھ خلط ملط کرنا بہت بڑا گناہ ہے۔اس واسطے شریعت نے شرک کے بعد سب سے زیادہ تردید بدعت کی کی ہے۔بخاری شریف کی روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((مَنْ اَحْدَثَ فِيْ اَمْرِنَا هٰذَا مَا لَيْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ)) "جس کسی نے ہمارے اس معاملے میں کوئی نئی بات نکالی تو وہ مردود ہوگی۔" یعنی کسی شخص نے دین کے معاملہ میں کوئی ایسی چیز نکالی جو دین میں نہیں ہے تو وہ مردود ہے۔

یہ بات میں کئی دفعہ کہہ چکا ہوں کہ سو گناہ کبیرہ کا اتنا گناہ نہیں جتنا بدعت کا ہے۔اس واسطے کہ کبیرہ گناہ کرنے والا جانتا ہے کہ میں گناہ کر رہا ہوں اور دیکھنے والا بھی سمجھتا ہے کہ یہ گناہ کر رہا ہے۔تو گناہ سے دین کا نقشہ نہیں بدلتا۔اور بدعت سے دین کا نقشہ بدل جاتا ہے۔غیر دین، دین بن جاتا ہے اور کرنے والا دین سمجھ کر کرتا ہے اور دیکھنے والا بھی یہی سمجھتا ہے کہ دین کا کام ہو رہا ہے۔یہی وجہ ہے کہ بدعتی کو توبہ کی توفیق نصیب نہیں ہوتی۔

مجمع الزوائد میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے جس کے بارے میں علامہ ہیثمی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں رُوَاتُهٗ مُوَثَّقُوْنَ "اس کے تمام راوی ثقہ ہیں۔" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((اِنَّ اللهَ تَعَالٰى قَدْ حَجَبَ التَّوْبَةَ عَنْ كُلِّ صَاحِبِ بِدْعَةٍ)) "بے شک اللہ تعالیٰ نے ہر بدعتی پر توبہ کا دروازہ بند کر دیا ہے۔" یعنی بدعتی کو توبہ کی توفیق نصیب نہیں ہوتی۔ایک تو بدعت کی نحوست اتنی ہوتی ہے کہ بدعتی میں توبہ کی صلاحیت باقی نہیں رہتی۔دوسرا یہ کہ وہ تو نیکی سمجھ کے کر رہا ہے، ثواب سمجھتا ہے، توبہ کیوں کرے۔توبہ تو آدمی گناہ سے کرتا ہے۔مثلاً: دیکھو! تمھارے سامنے قرآن کریم ہے جس کا پڑھنا بھی ثواب، دیکھنا بھی ثواب، ہاتھ لگانا بھی ثواب، سمجھنا بھی ثواب۔تو جب اُٹھو گے تو کہو گے الحمد للہ! تیرا شکر ہے پروردگار! ہم نے تیری کتاب کو دیکھا، پڑھا اور سمجھا ہے۔یہ تو نہیں کہو گے کہ یا اللہ! میری توبہ میں نے درس سنا۔کیوں کہ عبادت ہے۔عبادت سے توبہ نہیں ہے توبہ گناہ سے ہے۔تو بدعتی بدعت کو عبادت اور نیکی سمجھ کے کرتا ہے اس واسطے اس سے توبہ کی توفیق سلب ہو جاتی ہے۔

اگلی آیت کریمہ میں ان کا طریقہ واردات بیان فرماتے ہیں کہ وہ کس طرح گمراہ کرتے ہیں؟ ﴿وَقَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ

اَہۡلِ الۡکِتٰبِ ﴾ اور کہا ایک گروہ نے اہل کتاب میں سے ﴿ اٰمِنُوۡا بِالَّذِیۡۤ اُنۡزِلَ عَلَی الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَجۡہَ النَّہَارِ ﴾ ایمان لاؤ اُس چیز پر جو نازل کی گئی ان لوگوں پر جو ایمان لائے دن کے ابتدائی حصے میں ﴿ وَاکۡفُرُوۡۤا اٰخِرَہٗ ﴾ اور انکار کرو اس کے آخری حصے میں۔

اہل کتاب کے پانچ سات پڑھے لکھے غنڈے اکٹھے ہوئے اور مسلمانوں کو گمراہ کرنے کا منصوبہ بنایا کہ اس طرح کرو کہ صبح کے وقت جہاں مسلمانوں کا مجمع ہو وہاں جا کر کہہ دو کہ ہم بھی مومن ہیں اور جو کچھ تمھارے اُوپر نازل ہوا ہے قرآن پاک اور دوسرے احکامات ہم ان پر ایمان لائے ہیں۔ مسلمان خوش ہو جائیں گے کہ دیکھو جی! یہودی مسلمان ہو گئے ہیں۔ اور جب سورج غروب ہونے لگے تو ان کے مجمع میں یہ کہہ کر واپس آ جاؤ کہ ہمیں اسلام میں کوئی سچائی نظر نہیں آئی اس واسطے ہم اپنے پہلے مذہب پر چلے گئے ہیں ﴿ لَعَلَّہُمۡ یَرۡجِعُوۡنَ ﴾ تاکہ وہ بھی دین سے پھر جائیں۔ اس طرح مسلمان سوچیں گے کہ پڑھے لکھے لوگ تھے تو اسلام قبول کیا۔ اگر ضد ہوتی تو اسلام قبول ہی نہ کرتے۔ پھر ایک دن بھی اسلام میں نہیں رہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اسلام سچا نہیں ہے۔ تو وہ شک میں پڑ کر اسلام سے منحرف ہو جائیں گے۔ یہودیوں کا حیلہ اور تدبیر دیکھو! لیکن مسلمانوں پر ان کا کوئی حیلہ بھی کامیاب نہ ہوا۔

اور ان کو یہ بھی سمجھا کے بھیجا گیا تھا ﴿ وَلَا تُؤۡمِنُوۡۤا اِلَّا لِمَنۡ تَبِعَ دِیۡنَکُمۡ ﴾ اور نہ تصدیق کرنا مگر اس کی جس نے تمھارے دین کی پیروی کی۔ یعنی مومنوں کی تصدیق نہ کرنا ﴿ قُلۡ اِنَّ الۡہُدٰی ہُدَی اللّٰہِ ﴾ اے نبی کریم ﷺ! آپ کہہ دیں بے شک ہدایت اللہ تعالیٰ کی ہدایت ہے وہ جس کو چاہے دے۔ اور تم اس واسطے ضد کرتے ہو کہ ﴿ اَنۡ یُّؤۡتٰۤی اَحَدٌ مِّثۡلَ مَاۤ اُوۡتِیۡتُمۡ ﴾ یہ کہ دیا جائے کوئی مثل اس چیز کے جو تم دیے گئے ہو۔ یعنی جس طرح تمھیں رسالت ملی، تمھارے پیغمبروں پر کتابیں نازل ہوئیں، وحی نازل ہوئی، اللہ تعالیٰ نے نبوت و رسالت عطاء فرمائی اس طرح ان کو کیوں ملی ہے اب ہمیں کیوں نہیں ملی۔ اس بنیاد پر تم یہ حرکتیں کرتے ہو۔

﴿ اَوۡ یُحَآجُّوۡکُمۡ عِنۡدَ رَبِّکُمۡ ﴾ یا وہ جھگڑا کریں تمھارے ساتھ تمھارے رب کے ہاں۔ یعنی اگر تم نے ان کی تصدیق کر دی تو وہ آخرت میں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں تمھارے خلاف حجت قائم کریں گے کہ اے پروردگار! ان لوگوں نے سچے دین کی تصدیق کرنے کے باوجود تیرے آخری نبی اور تیری کتاب قرآن پاک کو تسلیم نہ کیا۔ اس طرح اہلِ اسلام قیامت والے دن اللہ تعالیٰ کے سامنے تم پر غالب آ جائیں گے۔ لہٰذا اسلامتی اسی میں ہے کہ صرف اس کی تصدیق کی جائے جو تمھارے دین کا تبع ہے اس کے علاوہ کسی دوسرے کی تصدیق نہ کرنا۔

﴿ قُلۡ اِنَّ الۡفَضۡلَ بِیَدِ اللّٰہِ ﴾ آپ ﷺ کہہ دیں! بے شک فضیلت اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے ﴿ یُؤۡتِیۡہِ مَنۡ یَّشَآءُ ﴾ دیتا ہے وہ فضیلت جس کو وہ چاہے ﴿ وَاللّٰہُ وَاسِعٌ عَلِیۡمٌ ﴾ اور اللہ تعالیٰ کشائش کرنے والا ہے، جاننے والا ہے ﴿ یَّخۡتَصُّ بِرَحۡمَتِہٖ مَنۡ یَّشَآءُ ﴾ خاص کرتا ہے اپنی رحمت کے ساتھ جس کو چاہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے کہ جس کو نبی بنانا ہے اور اس پر وحی نازل کرنی ہے۔ اس میں بندوں کو کوئی دخل نہیں ہے۔ نہ ہی نبوت کسبی چیز ہے کہ محنت کر کے کوئی نبی بن جائے، حاشا وکلا۔

قادیانیوں کا باطل عقیدہ

اہل اسلام کا یہ اتفاقی عقیدہ ہے کہ رب جسے چاہے نبوت دے یہ اس کی مہربانی ہے۔ اور آنحضرت ﷺ پر نبوت ختم کر دی گئی ہے آپ ﷺ آخری نبی ہیں۔ آپ ﷺ کے بعد کسی کو نبوت ملنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

یہ قادیانیوں کا باطل عقیدہ ہے کہ عبادت کرتے کرتے آدمی بلند مقام پر پہنچ جائے تو اس کو نبوت مل جاتی ہے۔ جیسا کہ مرزا بشیر احمد ملعون نے "سیرۃ مہدی" میں لکھا ہے کہ اگر کوئی شخص عبادت کرتے کرتے ایسے مقام پر پہنچ جائے جو بہت بلند ہو تو اس کو نبوت مل جاتی ہے۔ بلکہ حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کے درجے سے بھی بڑھ سکتا ہے، لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ۔

تو یاد رکھنا! نبوت کسبی چیز نہیں ہے یہ اللہ تعالیٰ کا عطیہ ہے۔ ﴿وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ﴾ اور اللہ تعالیٰ بڑی مہربانی کرنے والا ہے۔

﴿وَمِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ﴾ اور اہل کتاب میں سے بعض ﴿مَنْ﴾ وہ ہیں ﴿اِنْ تَاْمَنْهُ بِقِنْطَارٍ﴾ اگر تو ان کے پاس امانت رکھے بہت سارا مال ﴿يُّؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَ﴾ وہ ادا کر دیں گے اس مال کو تجھے ﴿وَمِنْهُمْ مَّنْ﴾ اور ان اہل کتاب میں سے وہ بھی ہیں ﴿اِنْ تَاْمَنْهُ بِدِيْنَارٍ﴾ اگر تو اس کے پاس امانت رکھے صرف ایک دینار ﴿لَّا يُؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَ﴾ نہیں ادا کرے گا وہ اس دینار کو تجھے ﴿اِلَّا مَا دُمْتَ عَلَيْهِ قَآئِمًا﴾ مگر جب تک قائم رہے تو اس پر کھڑا ﴿ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا﴾ یہ اس وجہ سے کہ بے شک انھوں نے کہا ﴿لَيْسَ عَلَيْنَا﴾ نہیں ہے ہم پر ﴿فِي الْاُمِّيّٖنَ سَبِيْلٌ﴾ ان پڑھ لوگوں کے مال لینے میں کوئی الزام کا راستہ ﴿وَيَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ﴾ اور یہ بولتے ہیں اللہ تعالیٰ پر جھوٹ ﴿وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ﴾ اور حالاں کہ وہ جانتے ہیں ﴿بَلٰى﴾ کیوں نہیں ان پر الزام کا راستہ ﴿مَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ﴾ جو اپنا عہد پورا کرے گا ﴿وَاتَّقٰى﴾ اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتا رہے گا ﴿فَاِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ﴾ پس بے شک اللہ تعالیٰ متقیوں سے محبت کرتا ہے ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يَشْتَرُوْنَ﴾ بے شک وہ لوگ جو خریدتے ہیں ﴿بِعَهْدِ اللّٰهِ﴾ اللہ تعالیٰ کے عہد کے بدلے ﴿وَاَيْمَانِهِمْ﴾ اور اپنی قسموں کے بدلے ﴿ثَمَنًا قَلِيْلًا﴾ تھوڑی قیمت ﴿اُولٰٓئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ﴾ وہ لوگ ہیں کوئی حصہ نہیں ہوگا ان کے لیے اچھائی کا ﴿فِي الْاٰخِرَةِ﴾ آخرت میں ﴿وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ﴾ اور اللہ تعالیٰ ان سے پیار کا کلام نہیں کرے گا ﴿وَلَا يَنْظُرُ اِلَيْهِمْ﴾ اور نہ ان کی طرف نگاہِ شفقت فرمائیں گے ﴿يَوْمَ الْقِيٰمَةِ﴾ قیامت کے دن ﴿وَلَا يُزَكِّيْهِمْ﴾ اور نہ ان کو اللہ تعالیٰ پاک کرے گا ﴿وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ﴾ اور ان کے

لیے دردناک عذاب ہے ﴿وَاِنَّ مِنْهُمْ﴾ اور بے شک ان اہل کتاب میں سے ﴿لَفَرِيْقًا﴾ ایک گروہ ایسا ہے ﴿يَّلْوٗنَ اَلْسِنَتَهُمْ بِالْكِتٰبِ﴾ جو موڑتے ہیں اپنی زبانوں کو کتاب کے ساتھ ﴿لِتَحْسَبُوْهُ﴾ تاکہ تم سمجھو اس کو ﴿مِنَ الْكِتٰبِ﴾ کتاب سے ﴿وَمَا هُوَ مِنَ الْكِتٰبِ﴾ حالانکہ وہ کتاب میں سے نہیں ہے ﴿وَيَقُوْلُوْنَ﴾ اور وہ کہتے ہیں ﴿هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ﴾ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے ﴿وَمَا هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ﴾ حالانکہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہیں ہوتا ﴿وَيَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ﴾ اور وہ کہتے ہیں اللہ تعالیٰ پر جھوٹ ﴿وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ﴾ حالانکہ وہ جانتے ہیں۔

حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کی امانت داری

اس سے پہلے بھی اہلِ کتاب کا ذکر تھا اور اب بھی اہلِ کتاب کا ذکر ہے ﴿وَمِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مَنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِقِنْطَارٍ﴾ اور اہل کتاب میں سے بعض وہ ہیں اگر تو ان کے پاس امانت رکھے بہت سارا مال ﴿يُّؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَ﴾ وہ ادا کر دیں گے اس مال کو تجھے۔ جیسے: حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ۔ تفسیر اور احادیث کی کتابوں میں آتا ہے کہ ایک مسافر آیا جو کہ تاجر تھا۔ اس کے پاس بارہ اوقیہ سونا تھا۔ ایک اوقیہ چالیس درہم کا ہوتا ہے اور ایک درہم ساڑھے تین ماشے کا ہوتا ہے۔ اس وقت کے لحاظ سے تقریباً بیس لاکھ رقم بنتی ہے۔ (یہ اس وقت کا تخمینہ ہے جب حضرت نے یہ درس دیا تھا)۔ اس تاجر نے حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کو دیکھا کہ شریف آدمی ہے۔ ان کو الگ بلایا اور کہنے لگا کہ میں مسافر ہوں اور تاجر آدمی ہوں میرے پاس کچھ رقم ہے میں تمھارے پاس امانت رکھنا چاہتا ہوں۔ جب میں واپس جانے لگوں گا واپس لے لوں گا۔ فرمایا رکھ دے۔ وہ شخص سونا بغیر کسی گواہ اور تحریر کے ان کے پاس امانت رکھ کر چلا گیا۔ جو جو کام اس نے کرنے تھے کیے اور کچھ عرصہ کے بعد واپس آیا اور کہنے لگا کہ میں اب واپس گھر جانا چاہتا ہوں اور میں نے تمھارے پاس امانت رکھی تھی وہ مجھے واپس کر دو۔ حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ اس وقت یہودی تھے مسلمان نہیں ہوئے تھے مگر فطرتِ سلیمہ کے مالک اور نیک طبع آدمی تھے۔ انھوں نے سارا سونا لا کر اس کے حوالے کر دیا۔ اتنی بڑی رقم کا سونا اور اس پر گواہ کوئی نہیں ہے، تحریر کوئی نہیں ہے مگر دیانت داری بڑی چیز ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسی دیانت کی برکت سے ایمان کی توفیق عطاء فرمائی اور مسلمان ہو گئے۔

ان کا سارا گھرانہ علمی تھا۔ مرد، عورتیں سب تورات کے ماہر تھے۔ یہ اپنی پھوپھی سے نبی آخر الزمان کی نشانیاں اور علامتیں سنا کرتے تھے۔ وہ انھوں نے نوٹ کی ہوئی تھیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ طیبہ تشریف لائے تو یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ملنے کے لیے پہنچ گئے۔ پہلی مجلس میں انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تقریر سنی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے لوگو! اللہ تعالیٰ کے بندے بن جاؤ اَفْشُوا السَّلَامَ بَيْنَكُمْ "آپس میں سلام کو عام کرو۔" یعنی ایک دوسرے کو کثرت کے ساتھ سلام کرو، ربط اور تعلق پیدا ہوگا۔ اَطْعِمُوا الطَّعَامَ "جن کو رب تعالیٰ نے مال کی توفیق عطاء فرمائی ہے وہ غریبوں کو کھانا کھلائیں۔" وَصَلُّوْا

بِاللَّيْلِ وَالنَّاسُ نِيَامٌ " راتوں کو اُٹھ کر نمازیں پڑھا کرو اس حال میں کہ لوگ سوئے ہوئے ہوں۔" وَلِيْنَ الْكَلَامِ " اور گفتگو کرو نرمی کے ساتھ، سختی نہ کرو۔" حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ ابتدائی تقریر سنی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ بشرہ دیکھا تو فیصلہ کیا اِنَّ هٰذَا الْوَجْهَ لَيْسَ بِوَجْهِ كَذَّابٍ " بے شک یہ چہرہ جھوٹے کا نہیں ہو سکتا۔" سب کے سامنے کلمہ شہادت اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَ رَسُوْلُهٗ پڑھا اور مسلمان ہو گئے۔

یہود کو علم ہوا کہ عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ مسلمان ہو گئے ہیں تو ان کا پارہ بہت چڑھا اور بہت غصے ہوئے۔ کیوں کہ ان کو معلوم تھا کہ وہ اثر ورسوخ والا آدمی ہے۔ اس کے گھر والے بھی مسلمان ہو جائیں گے اور دوسرے لوگوں پر بھی اثر پڑے گا۔ حقیقت معلوم کرنے کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آنے کا پروگرام بنایا۔ ادھر عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کو معلوم ہوا کہ یہودی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آ رہے ہیں۔ اس وقت مسجدِ نبوی نہیں بنی تھی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کے گھر رہائش پذیر تھے۔ اور کمرے کی ایک جانب پردہ لٹکایا ہوا تھا اگر کوئی عورت آتی تو پردے کی اوٹ میں بیٹھ جاتی تھی۔ حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نے کہا حضرت! معلوم ہوا ہے کہ یہودی آپ کے پاس آ رہے ہیں۔ میں پردے کے پیچھے چلا جاتا ہوں اور آپ ان سے میرے بارے میں اور میرے والد کے بارے میں پوچھنا کہ وہ کیسے آدمی ہیں؟

چنانچہ یہودی جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ بتاؤ عبداللہ بن سلام تم میں کیسا شخص ہے یہود نے کہا خَيْرُنَا وَابْنُ خَيْرِنَا " ہم میں سے سب سے بہتر اور سب سے بہتر کا بیٹا ہے اَعْلَمُنَا وَ ابْنُ اَعْلَمِنَا ہم میں سے سب سے بڑا عالم ہے اور سب سے بڑے عالم کا بیٹا ہے اَفْضَلُنَا وَ ابْنُ اَفْضَلِنَا ہم میں سے سب سے افضل اور سب سے افضل کا بیٹا ہے سَيِّدُنَا وَ ابْنُ سَيِّدِنَا ہمارا سردار ہے اور ہمارے سردار کا بیٹا ہے۔" بخاری شریف میں ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر عبداللہ بن سلام مسلمان ہو جائے تو کیا پھر تم مسلمان ہو جاؤ گے؟ یہودی کہنے لگے اَعَاذَهُ اللهُ مِنَ الْاِسْلَامِ " اللہ تعالیٰ اس کو اسلام سے بچائے۔" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر واقعتاً وہ مسلمان ہو جائے تو پھر تم کیا کہو گے؟ کہنے لگے بڑا سمجھ دار آدمی ہے وہ اسلام قبول نہیں کرے گا۔ یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ پردے سے باہر تشریف لے آئے اور بلند آواز سے کہا: اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَ رَسُوْلُهٗ۔ یہودی کہنے لگے شَرُّنَا وَ ابْنُ شَرِّنَا " ہم میں سے بڑا اشرارتی ہے اور اس کا باپ بھی بڑا اشرارتی تھا۔" اس سے یہودیوں کا اندازہ کرو کہ مجلس نہیں بدلی، وقت نہیں بدلا، لوگ بھی وہی ہیں، کس طرح بدلے۔

عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ چوں کہ مضبوط آدمی تھے اس واسطے انھوں نے کسی کی کوئی پروا نہیں کی۔ اور حدیث پاک میں آتا ہے: ((اَلْمُؤْمِنُ الْقَوِيُّ خَيْرٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِ الضَّعِيْفِ)) " طاقت ور مومن بہتر ہے کمزور مومن سے۔" کیوں کہ مضبوط ہوگا تو خود بھی ایمان پر قائم رہے گا اور دوسروں کا بھی خیال رکھے گا۔ ویسے اللہ تعالیٰ سب مومنوں کی قدر کرتا ہے مگر ((اَلْمُؤْمِنُ الْقَوِيُّ اَحَبُّ اِلَى اللهِ مِنَ الْمُؤْمِنِ الضَّعِيْفِ)) " طاقت ور مومن زیادہ محبوب ہے اللہ تعالیٰ کو کمزور مومن سے۔" تو حضرت عبداللہ

بن سلام رضی اللہ عنہ اسلام لانے سے پہلے بھی بڑے دیانت دار تھے۔

فخاص بن عازورا بددیانت تھا

اہل کتاب میں بڑے بڑے بددیانت بھی تھے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ﴿وَمِنْهُمْ مَّنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِدِيْنَارٍ﴾ اور ان اہل کتاب میں سے وہ بھی ہیں اگر تو اس کے پاس امانت رکھے صرف ایک دینار ﴿لَّا يُؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَ﴾ نہیں ادا کرے گا وہ اس دینار کو تجھے ﴿اِلَّا مَا دُمْتَ عَلَيْهِ قَآئِمًا﴾ مگر جب تک قائم رہے تو اس پر کھڑا۔ مدینہ طیبہ میں یہودیوں کا ایک بہت بڑا پیر اور مولوی تھا فخاص ابن عازورا۔ اس کی وضع قطع، شکل وصورت ایسی تھی کہ آدمی کو شبہ پڑتا تھا کہ شاید خضر علیہ السلام یہی ہیں۔ اور گفتگو کا انداز ایسا تھا کہ لوگ شوق سے سنتے تھے۔ قریش خاندان کا ایک مسافر مدینہ طیبہ آیا تو فخاص کو شکل وصورت سے بڑا بزرگ خیال کر کے اس کے پاس گیا۔ اس وقت اس کے شاگرد اور مرید بھی اس کے پاس موجود تھے۔ اس مسافر نے کہا غریب آدمی ہوں اور میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں یہ میرے پاس ایک دینار ہے تمھارے پاس امانت رکھتا ہوں جب میں واپس گھر جاؤں گا تم سے لے لوں گا۔ وہ مسافر کچھ عرصہ کے بعد آیا۔ اس وقت بھی فخاص کے مرید اور شاگرد اس کے پاس موجود تھے۔ کہنے لگا کہ اب میرا گھر جانے کا ارادہ ہے لہٰذا میرا وہ دینار جو میں نے تمھارے پاس امانت رکھا تھا واپس دے دو۔ فخاص نے اس مسافر کو گھور کر دیکھا اور کہنے لگا کون سا دینار؟ اور کب تو نے امانت رکھی تھی؟ خواہ مخواہ بزرگوں پر بہتان لگا رہا ہے۔ بھاگ جا یہاں سے۔ اس کو جھڑک دیا۔ وہ بے چارہ باہر چلا گیا۔

شاگردوں اور مریدوں نے کہا حضرت! اس نے ایک دینار تمھارے پاس امانت کے طور پر رکھا تو تھا تم بھول گئے ہو۔ فخاص کہنے لگا اس بات کو چھوڑو یہ اَن پڑھ لوگ ہیں ہم نے فیسیں دے کر تعلیم حاصل کی ہے ان کا مال کھانا ہمارے لیے جائز ہے۔ یہ تو ہمارے گدھے ہیں جس طرح چاہو ان پر سواری کرلو۔ اس کے مریدوں میں کوئی تجربہ کار آدمی تھا۔ وہ اس مسافر کے پاس آیا اور کہا کہ یہ ہمارے پیر صاحب ہیں ان کو میں جانتا ہوں یہ اس طرح دینار نہیں دیں گے میں تجھے طریقہ بتاتا ہوں اس طرح کر تجھے دینار مل جائے گا۔

تو جا کر اس کو کہہ کہ اللہ تعالیٰ کی قسم ہے میرا دینار دے دے ورنہ میں محلوں میں، گلیوں میں پھروں گا اور شور مچاؤں گا کہ فخاص بن عازورا میرا دینار کھا گیا ہے۔ اس مسافر نے جب اس طرح جا کر کہا تو گھبرایا اور جیب سے ایک دینار نکال کر اس کی طرف پھینکا اور کہا کہ خواہ مخواہ ویسے ہی بدنام کرتا ہے۔ لے یہ دینار اور نکل جا یہاں سے۔ تو جو شخص اتنا بددیانت ہو کہ ایک دینار پر بے ایمان ہو جائے جب کہ اس وقت تقریباً دینار کی قیمت دو سو روپیہ ہے تو ایسے شخص کو رب تعالیٰ ایمان جیسی دولت کیوں عطاء فرمائے۔ برتن صاف ہوگا تو اس میں کوئی چیز پڑے گی۔ اور اگر غلاظت سے بھرا ہوا ہو تو اگر اس میں اچھی چیز بھی ڈالو گے تو خراب ہو جائے گی۔

توان جیسوں سے امانت ڈنڈے کے ساتھ وصول کرنی ہے۔ کیوں ان کا نظریہ ہے ﴿ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْاُمِّيّٖنَ سَبِيْلٌ﴾ یہ اس وجہ سے کہ بے شک انھوں نے کہا نہیں ہے ہم پر ان پڑھ لوگوں کے مال لینے میں کوئی الزام کا راستہ۔ یعنی جس طرح چاہو اور جس طریقے سے چاہو ان اَن پڑھوں سے مال لینا درست ہے۔ زبردستی یا دھوکے سے یا تجارت میں خیانت کر کے، ہر طرح جائز ہے۔ جب انسان اتنا بد دیانت ہو تو اللہ تعالیٰ اس کو اسلام جیسی عزیز متاع کیوں نصیب کرے۔ پھر یہ بات اللہ تعالیٰ کے ذمہ لگاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اُمیوں کا مال کھانے کی اجازت دی ہے۔

فرمایا ﴿وَيَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ﴾ اور یہ بولتے ہیں اللہ تعالیٰ پر جھوٹ ﴿وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ﴾ اور حالانکہ وہ جانتے ہیں۔ اگر کوئی شخص غلط فہمی کا شکار ہو تو وہ الگ بات ہے۔ جان بوجھ کر کہنا کہ ہم بڑے نیک اور پرہیز گار لوگ ہیں اور پڑھے ہوئے ہیں اور یہ اَن پڑھ لوگ ہمارے گدھے اور ٹٹو ہیں۔ ان پر سوار ہو جاؤ یہ ہمیں رب کا حکم ہے۔ فرمایا یہ بالکل جھوٹ بولتے ہیں ﴿بَلٰى﴾ کیوں نہیں ان پر الزام کا راستہ ﴿مَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ﴾ جو اپنا عہد پورا کرے گا ﴿وَاتَّقٰى﴾ اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتا رہے گا جس طرح حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نے اپنا عہد پورا کیا اور ان کو رب کا خوف تھا ورنہ اگر وہ رقم ہضم کرنا چاہتے تو کر سکتے تھے اور یہ ان کے لیے آسان تھا۔ کیوں کہ نہ تحریر تھی اور نہ کوئی گواہ تھا۔ کافی رقم کا سونا تھا۔ دیکھنے والا بھی کوئی نہیں تھا۔

اور دوسری طرف فنحاص بن عازورا کے پاس جب رقم رکھی گئی تو اس کے شاگرد اور مرید دیکھ رہے تھے اور انھوں نے یاد دہانی بھی کرائی مگر اس نے ان کو بھی جھڑک دیا۔ تو ایسوں کو اللہ تعالیٰ پسند نہیں کرتا ﴿فَاِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ﴾ پس بے شک اللہ تعالیٰ متقیوں سے محبت کرتا ہے۔

حضرت اشعث بن قیس رضی اللہ عنہ کا یہودی سے جھگڑا

آگے ایک اور واقعہ ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک صحابی حضرت اشعث بن قیس رضی اللہ عنہ کا ایک یہودی کے ساتھ کنویں کے سلسلہ میں جھگڑا تھا۔ یہودی کہتا تھا کہ کنواں میرا ہے اور حضرت اشعث بن قیس رضی اللہ عنہ کا دعویٰ تھا کہ کنواں میرا ہے۔ اور حقیقت میں تھا بھی حضرت اشعث بن قیس رضی اللہ عنہ کا اور یہودی نے ویسے ہی ناجائز قبضہ کیا ہوا تھا۔ اور اُس زمانے میں آج کی طرح رجسٹری انتقال وغیرہ نہیں ہوتا تھا کہ کام پختہ ہو جائے۔ لوگوں نے کہا جھگڑو نہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے فیصلہ کرا لو۔ حق کا فیصلہ ہو جائے گا۔ چنانچہ یہ فیصلہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے گئے اور اپنا مدعا بیان کیا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت اشعث بن قیس رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ تو دعویٰ کرتا ہے کہ کنواں تیرا ہے تو کیا تیرے پاس گواہ ہیں؟ (کیوں کہ شریعت کا ضابطہ ہے اَلْبَيِّنَةُ عَلَى الْمُدَّعِيْ وَالْيَمِيْنُ عَلٰى مَنْ اَنْكَرَ کہ گواہ مدعی کے ذمہ ہیں اور منکر پر قسم آتی ہے۔ یعنی مدعی اگر گواہ نہ پیش کر سکے تو مدعا علیہ سے قسم لی جائے گی۔) حضرت اشعث رضی اللہ عنہ نے کہا کہ حضرت! یہ کنواں جدی پشتی (باپ دادا سے) ہمارے پاس چلا آ رہا ہے۔ میرے بڑوں نے جب یہ کنواں کھودا تھا اس وقت میں پیدا بھی نہیں ہوا

تھا۔اس وقت کے گواہ تو میرے پاس نہیں ہیں۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ پھر مدعا علیہ کی قسم پر فیصلہ ہوگا۔حضرت اشعث رضی اللہ عنہ نے کہا کہ حضرت! یہ تو فاسق فاجر آدمی ہے اس طرح تو یہ سارے مدینہ پر قبضہ کر لے گا۔اس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی۔

﴿اِنَّ الَّذِیۡنَ یَشۡتَرُوۡنَ بِعَهۡدِ اللّٰهِ وَ اَیۡمَانِهِمۡ ثَمَنًا قَلِیۡلًا﴾ بے شک وہ لوگ جو خریدتے ہیں اللہ تعالیٰ کے عہد کے بدلے اور اپنی قسموں کے بدلے تھوڑی قیمت۔یعنی اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کا عہد کیا تھا مگر ایمان نہیں لائے وہ وعدہ پورا نہیں کیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو حکم دیا تھا امانت کے ادا کرنے کا لیکن یہ حق دار کو امانت ادا نہیں کرتے اور قسم کے بدلے حقیر مال خریدتے ہیں اور دنیا ساری ہی قلیل ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دنیا و مافیہا کی قدر اگر اللہ تعالیٰ کے ہاں مچھر کے پر کے برابر ہوتی تو کافر کو ایک گھونٹ پانی کا بھی نہ دیتا۔تو جو دنیا کی خاطر جھوٹی قسمیں کھاتے ہیں اور عہد پورا نہیں کرتے اور امانت ادا نہیں کرتے ہیں ﴿اُولٰٓئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمۡ فِی الۡاٰخِرَةِ﴾ وہ لوگ ہیں کوئی حصہ نہیں ہوگا ان کے لیے اچھائی کا آخرت میں ﴿وَ لَا یُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ﴾ اور اللہ تعالیٰ ان سے پیار کا کلام نہیں فرمائیں گے، محبت کی گفتگو نہیں ہوگی ﴿وَ لَا یَنۡظُرُ اِلَیۡهِمۡ یَوۡمَ الۡقِیٰمَةِ﴾ اور نہ ان کی طرف نگاہِ شفقت فرمائیں گے قیامت کے دن۔ویسے دیکھے گا تو سب کو۔یعنی مطلقاً دیکھنے کی نفی نہیں ہے شفقت سے دیکھنے کی نفی ہے ﴿وَ لَا یُزَكِّیۡهِمۡ﴾ اور نہ اللہ تعالیٰ ان کو گناہوں سے پاک کرے گا ﴿وَ لَهُمۡ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ﴾ اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔

ملتے جلتے الفاظ سے دھوکا

آگے یہودیوں کی ایک شرارت کا ذکر ہے۔فرمایا ﴿وَ اِنَّ مِنۡهُمۡ لَفَرِیۡقًا یَّلۡوٗنَ اَلۡسِنَتَهُمۡ بِالۡكِتٰبِ﴾ اور بے شک ان اہل کتاب میں سے ایک گروہ ایسا ہے جو موڑتے ہیں اپنی زبانوں کو کتاب کے ساتھ ﴿لِتَحۡسَبُوۡهُ مِنَ الۡكِتٰبِ﴾ تاکہ تم سمجھو اس کو کتاب سے ﴿وَ مَا هُوَ مِنَ الۡكِتٰبِ﴾ حالانکہ وہ کتاب میں سے نہیں ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں پڑھے لکھے لوگ بھی ہوتے تھے اور اَن پڑھ بھی، ذہین بھی اور غبی بھی، شہری بھی اور دیہاتی بھی۔اور ہر مجلس کا یہی حال ہوتا ہے۔تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کہتے تھے رَاعِنَا حضرت! ہماری رعایت فرمائیں کہ ہم سب سمجھیں۔اور یہودی زبان تھوڑی سی دبا کر کہتے تھے رَاعِیۡنَا کہ عین کے بعد یا پیدا ہو جاتی تھی۔تو اس کا معنیٰ بنتا ہے متکبر۔جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ فلاں عورت میں بڑی رعونت ہے یعنی تکبر ہے۔پہلے پارے میں تم یہ بات پڑھ چکے ہو کہ اللہ تعالیٰ نے یہ لفظ بولنے سے منع فرما دیا۔فرمایا ﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَقُوۡلُوۡا رَاعِنَا وَ قُوۡلُوا انۡظُرۡنَا﴾ [البقرہ:۱۰۴] "اے ایمان والو! رَاعِنَا نہ کہو اور اُنۡظُرۡنَا کہو۔" کہ حضرت! ہم پر شفقت فرماؤ۔کیوں کہ ایسے ملتے جلتے الفاظ سے یہ لوگوں کو دھوکا دیتے ہیں۔

پاکستان کے معرضِ وجود میں آنے سے پہلے کا واقعہ ہے۔ایک طالب علم نے چوری کی۔مقدمہ اساتذہ کے سامنے پیش ہوا۔قسم پر فیصلہ طے ہوا۔چور نے قسم اُٹھائی کہ میں نے چوری نہیں کی۔دوسرے ساتھیوں نے ملامت کی کہ تو نے چوری

ہمارے سامنے کی ہے اور قسم اُٹھالی ہے۔ تو اس نے کہا کہ تمھیں معلوم ہے کہ میں نے قسم کن الفاظ کے ساتھ اُٹھائی ہے؟ ساتھیوں نے کہا کہ تو نے اللہ تعالیٰ کی قسم اُٹھائی ہے۔ کہنے لگا نہیں میں تو " آلّاں " کی قسم اُٹھائی ہے۔" آلّاں " کدو کی طرح ایک سبزی ہوتی ہے کدو گول ہوتا ہے اور یہ لمبی ہوتی ہے۔ تو لہجے سے کتنا فرق ہو گیا۔ زبر زیر سے فرق ہو جاتا ہے۔ جیسے: بَکْرِی اور بِکْرِی۔ معلوم، مجہول پڑھنے سے فرق آجاتا ہے۔ جیسے: تھُوک اور تھوک۔

تو اسی طرح یہودی دھوکا دیتے تھے اور کہتے تھے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہیں ہوتا۔ ﴿وَيَقُوْلُوْنَ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللهِ﴾ اور وہ کہتے ہیں یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے ﴿وَمَا هُوَ مِنْ عِنْدِ اللهِ﴾ حالاں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہیں ہوتا ﴿وَيَقُوْلُوْنَ عَلَى اللهِ الْكَذِبَ﴾ اور وہ بولتے ہیں اللہ تعالیٰ پر جھوٹ ﴿وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ﴾ حالاں کہ وہ جانتے ہیں کہ ہم ہیرا پھیری کر رہے ہیں۔ اور اس طرح کی ہیرا پھیری کرنا بڑا سخت گناہ ہے۔

جھوٹا گواہ چور کی طرح مجرم ہے

حدیث پاک میں آتا ہے کہ جس نے جھوٹی قسم اُٹھائی یا شہادت میں غلط بیانی کی تو وہ چور کی طرح مجرم ہے۔ اور آج وہ زمانہ ہے کہ کوئی سچی گواہی نہیں دے سکتا۔ عام لوگ تو عام ہیں ججوں کا یہ حال ہے کہ بے چارے جب بیان لیتے ہیں تو نقاب پہن لیتے ہیں کہ ہمیں پہچان نہ لیں اور بعد میں مار نہ دیں۔ یہ حالات ہیں کہ غنڈہ گردی دنیا میں عام ہو چکی ہے۔ اللہ تعالیٰ بچائے اور محفوظ رکھے۔

﴿مَا كَانَ لِبَشَرٍ﴾ نہیں حق پہنچتا کسی بشر کو ﴿اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللهُ الْكِتٰبَ﴾ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو کتاب دی ہو ﴿وَالْحُكْمَ﴾ اور حکم دیا ہو ﴿وَالنُّبُوَّةَ﴾ اور نبوت دی ہو ﴿ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ﴾ پھر کہے لوگوں کو ﴿كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ﴾ ہو جاؤ تم میرے بندے ﴿مِنْ دُوْنِ اللهِ﴾ اللہ تعالیٰ سے ورے ورے ﴿وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ﴾ اور لیکن وہ یہ کہے گا کہ ہو جاؤ تم رب والے ﴿بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ﴾ اس واسطے کہ تم تعلیم دیتے ہو کتاب کی ﴿وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ﴾ اور اس واسطے کہ تم پڑھتے ہو کتاب کو ﴿وَلَا يَاْمُرَكُمْ﴾ اور وہ تم کو حکم نہیں دے گا ﴿اَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰٓئِكَةَ﴾ اس بات کا کہ تم بنا لو فرشتوں کو ﴿وَالنَّبِيّٖنَ اَرْبَابًا﴾ اور اللہ تعالیٰ کے پیغمبروں کو رب ﴿اَيَاْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ﴾ کیا وہ تمھیں حکم کرے گا کفر کا ﴿بَعْدَ اِذْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ﴾ بعد اس کے کہ تم مسلمان ہو چکے ہو۔

بندے صرف اللہ تعالیٰ کے

کافی تفصیل کے ساتھ یہ بات پہلے بیان ہو چکی ہے کہ ۸ ھ میں جب مکہ مکرمہ فتح ہو گیا اور سارا عرب اسلام کے جھنڈے تلے آ گیا اور نجران بھی عرب کا علاقہ تھا اور وہاں عیسائیوں کی اکثریت تھی۔ تو انھوں نے سوچا کہ ہم اب الگ تھلگ

نہیں رہ سکتے۔اور اگر مقابلہ کرتے ہیں تو مشکل بات ہے۔لہٰذا بہتر ہے کہ ان کی حکومت کو تسلیم کرلو۔اس مقصد کے لیے ۹ ہجری میں نجران کے عیسائیوں کا ایک وفد جو ساٹھ آدمیوں پر مشتمل تھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور انھوں نے الگ الگ رہنا پسند نہ کیا جس کی وجہ سے انہیں مسجد نبوی میں ٹھہرایا گیا۔ان کے آنے کا اصل مقصد تو یہ تھا کہ ہم تمھاری رعیت بننے کے لیے آئے ہیں۔مگر پڑھے لکھے لوگ تھے علمی گفتگو بھی ہوئی جس کا ذکر پہلے ہوا ہے۔اس گفتگو میں انھوں نے یہ بھی کہا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ہمارے بڑوں کو کہا تھا کہ مجھے رب سمجھنا اس واسطے ہم عیسیٰ علیہ السلام کے بندے ہیں اور وہ ہمارے رب ہیں۔یہاں اللہ تعالیٰ نے اس کا رد فرمایا ہے۔

﴿مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ﴾ نہیں حق پہنچتا کسی بشر کو اس کے بعد یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو کتاب دی ہو اور حکم دیا ہو اور نبوت دی ہو۔اب ان قیود کے بعد پیغمبروں کے علاوہ دوسرے بشر خارج ہو گئے۔کیوں کہ دوسروں پر نہ تو کتابیں نازل ہوئی ہیں، نہ ان کو اللہ تعالیٰ نے نبوت عطا فرمائی ہے نہ ان پر وحی نازل ہوئی ہے۔اس میں صرف اور صرف پیغمبر آتے ہیں۔تو جو بشر پیغمبر ہے اس کو حق نہیں پہنچتا کہ یہ چیزیں ملنے کے بعد ﴿ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ پھر وہ کہے لوگوں کو ہو جاؤ تم میرے بندے اللہ تعالیٰ کے سوا۔یہ تو پیغمبر کا حق ہی نہیں ہے اور یہ اس کی شان کے لائق ہی نہیں ہے۔یہ تمھاری خانہ ساز باتیں ہیں۔حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ہرگز یہ نہیں فرمایا کہ تم میرے بندے بن جاؤ۔نہ حضرت داؤد علیہ السلام نے فرمایا، نہ موسیٰ علیہ السلام نے، نہ کسی اور پیغمبر نے فرمایا ہے۔

ذو معنیٰ الفاظ سے پرہیز

اسی آیت کریمہ کے پیش نظر مفسرین کرام، فقہائے کرام اور محدثین عظام رحمہم اللہ نے لکھا ہے کہ عبد النبی، عبد الرسول، عبد المصطفیٰ نام رکھنا جائز نہیں ہے۔بعض لوگ یہ تاویل کرتے ہیں کہ عبد سے مراد غلام ہے۔تو اس صورت میں عبد النبی کا معنیٰ بنے گا غلام نبی اور عبد الرسول کا معنیٰ غلام رسول اور عبد المصطفیٰ کا معنیٰ غلام مصطفیٰ۔یہ ٹھیک ہے۔لیکن فقہائے کرام نے تصریح فرمائی ہے کہ عبد سے مراد اگر بندہ ہو جیسے عبد اللہ، عبد الرب اور عبد الکریم میں ہے تو پھر خالص شرک ہے۔اور اگر غلام والا معنیٰ لیں تو شرک تو نہیں ہے مگر مکروہ ہے۔کیوں کہ لفظ ذُوْ مَعْنَيَيْنِ ہے۔اور ایسا لفظ بولنا کہ جس کا ایک معنیٰ ایسا نکلتا ہو کہ جس سے لوگ غلط فائدہ اُٹھائیں تو وہ بولنا صحیح نہیں ہے۔اور یہ بات تم سن چکے ہو کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے راعنا کا لفظ بولتے تھے جس کے معنیٰ ہیں ہماری رعایت فرمائیں۔لفظ بھی صحیح تھا اور کہنے والوں کی نیت بھی درست تھی۔لیکن یہودی اس کو زبان دبا کر راعینا بولتے تھے۔لہٰذا ایسا لفظ جس کا مفہوم شریعت کے خلاف نکل سکتا ہو اور لوگ اس سے غلط فائدہ اُٹھائیں تو اس کا استعمال جائز نہیں ہے۔

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ علیہ سے کسی نے سوال کیا کہ حضرت! اَلصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ کے الفاظ کے ساتھ درود پڑھا جا سکتا ہے یا نہیں؟ تو حضرت نے فرمایا کہ یہ بھی درود کے مختصر الفاظ ہیں لیکن پڑھنے والا اس نظریے

کے ساتھ پڑھے کہ اس درود کو فرشتے آنحضرت ﷺ کے پاس پہنچاتے ہیں۔ اور اگر آنحضرت ﷺ کو حاضر ناظر سمجھ کر پڑھے گا تو کفر اور شرک ہوگا۔ اور اب چوں کہ لوگوں کے ذہن خراب ہیں اور اَلصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلَیْكَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ سے یہ سمجھتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ حاضر ناظر ہیں۔ اس واسطے عام آدمی یہ الفاظ کہنے اور بولنے سے گریز کرے تاکہ باطل کی تائید نہ ہو۔ ورنہ فی نفسہٖ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ کہنا اور محض پیار اور محبت میں کہنا جائز اور صحیح ہے۔

اس کو تم اس طرح سمجھو کہ کوئی آدمی راستے پر چلتے چلتے گر پڑے اور کہے ہائے او میری ماں! یا ہائے او میری بے بے! اب ماں اور بے بے وہاں موجود تو نہیں ہیں مگر محبت ہوتی ہے اس واسطے بے ساختہ زبان پر ان کا نام آتا ہے۔ اسی طرح اگر آپ ﷺ کو حاضر ناظر نہ سمجھے اور آپ ﷺ سے مدد مانگنے کا نظریہ نہ ہو تو یا رسول اللہ! کہنا صحیح ہے۔ لیکن عوام چوں کہ غلط فائدہ اُٹھاتے ہیں اور وہ ان الفاظ سے آپ ﷺ کو حاضر و ناظر سمجھتے ہیں اور آپ سے مدد مانگتے ہیں اس واسطے یہ لفظ نہیں بولنے چاہئیں۔ اور جتنے بھی موہوم الفاظ ہیں ان کا یہی حکم ہے۔ مثلاً:

ایک شخص "یا علی مشکل کشا" کہتا ہے اور اس کی علی سے مراد رب کی ذات ہے کیوں کہ اللہ تعالیٰ کا نام علی بھی ہے، ﴿وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ﴾۔ تو یہ کہنا فی نفسہٖ صحیح ہے مگر عوام میں یہ جملہ اس وقت تک نہ بولے جب تک ان کو سمجھا نہ دے کہ بھئی! علی اللہ تعالیٰ کا نام بھی ہے اور میں جو کہتا ہوں "یا علی مشکل کشا" تو اس سے میری مراد رب تعالیٰ کی ذات ہے۔ اور اگر یہ تشریح نہیں کرے گا تو لوگ سمجھیں گے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مدد مانگ رہا ہے۔ جو کہ عوام کا ذہن بنا ہوا ہے۔

یہاں ایک بات سمجھ لیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نام کے ساتھ مشکل کشا کا لفظ کتابوں میں آتا ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جو لوگوں نے سمجھا ہوا ہے۔ بلکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مشکل کشا اس واسطے کہا جاتا ہے کہ وہ مشکل سے مشکل مسئلہ حل فرما دیتے تھے۔ کیوں ان کو اللہ تعالیٰ نے بڑی سمجھ عطاء فرمائی تھی۔ ایک موقع پر ایک مسئلہ پیش آیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: قَضِيَّةٌ وَ لَا اَبَا حَسَنٍ "مشکل مسئلہ پیش آیا ہے اور ابو الحسن علی موجود نہیں ہیں۔" صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا لقب تھا حَلَّالُ الْمَهَامِلِ "مشکل مسائل کی گرہ کھولنے والا۔"

بعض بزرگانِ دین کے شجروں میں جو یہ الفاظ آتے ہیں کہ پروردگار علی مشکل کشا کے واسطے۔ چنانچہ حضرت مولانا حسین احمد مدنی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے شجرہ میں بھی یہ الفاظ ہیں "اے پروردگار یہ میرا کام کر علی مشکل کشا کے واسطے۔" تو اس سے یہی مراد ہے مشکل مسائل کی گرہ کھولنے والا۔ یہ مراد نہیں ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ مافوق الاسباب لوگوں کی مشکلیں حل کرنے والے ہیں۔ چنانچہ کسی ناسمجھ نے حضرت مدنی کو خط لکھا کہ تم دیوبندی ایک طرف تو کہتے ہو کہ علی مشکل کشا کہنا شرک ہے اور دوسری طرف تمھارے شجروں میں علی مشکل کشا کے لفظ موجود ہیں۔ تو حضرت مدنی کے مکتوبات میں موجود ہے فرماتے ہیں دیکھو بھائی! حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنے دور میں مشکل سے مشکل مسئلے حل فرماتے ہیں۔ عربی میں ان کو "حل المهامل" کہتے تھے، مشکل مسئلوں کی گرہ کھولنے والا۔ اور فارسی والوں نے اس کا ترجمہ کیا ہے مشکل کشا۔ تو مشکل کشا سے یہ مراد ہے۔ باقی ہماری مشکلیں رب تعالیٰ

ہی حل فرماتے ہیں۔رب تعالیٰ کے سوا کوئی مشکل کشا نہیں ہے۔

نام اچھا رکھو

تو مسئلہ یہ ہے کہ ایسا نام نہ رکھو جس سے شرکیہ مفہوم نکلتا ہو۔ناموں میں بہتر نام وہ ہیں جن میں رب تعالیٰ کی طرف نسبت ہو۔جیسے:عبد اللہ ہے،عبد الرب ہے۔کیوں کہ حدیث پاک میں آتا ہے کہ سب سے اچھے وہ نام ہیں جن کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہو۔جیسے:عبد اللہ،عبد الرحمٰن،عبد الرحیم،عبد الجلیل،عبد الکریم،عبد الرب،عبد المومن،عبد المہیمن،عبد المنعم، عبد المحسن،عبد المقیت،عبد المبین،عبد المتین۔دوسرے نمبر پر وہ نام ہیں جن میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نام آئے۔جیسے محمد قاسم،حسین احمد،غلام محمد۔پھر وہ ہیں جن میں دوسرے پیغمبروں کے نام آئیں۔جیسے:محمد ابراہیم،محمد اسماعیل،محمد داؤد،محمد اسحاق،محمد زکریا۔ پھر وہ نام ہیں جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے نام ہوں۔جیسے:ابوبکر،عمر،عثمان،علی رضی اللہ عنہم۔ان ناموں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سنا اور اجازت بھی دی کہ صحیح ہیں۔اگر کسی صحابی کا نام غلط ہوتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم بدل دیتے تھے۔

دیہات سے ایک موٹا تازہ شخص آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور اس کے ساتھ ایک کتا بھی تھا۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے فرمایا کہ بھائی! تیرا کیا نام ہے؟ کہنے لگا میرا نام ظالم ہے اور میرے کتے کا نام راشد ہے۔اور راشد کا معنیٰ ہے ہدایت یافتہ۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تو بندہ ہو کے بھی ظالم ہے اور وہ کتا ہو کے راشد ہے۔فرمایا میں نے نام بدل دیا ہے۔ آج کے بعد تیرے کتے کا نام ظالم ہے اور تیرا نام راشد ہے۔اپنے علاقے میں جا کر لوگوں کو بتا دینا۔منیب الطبع اور سلیم الطبع شخص تھا کوئی قیل وقال نہیں کی۔کہنے لگا حضرت! ٹھیک ہے۔اور اگر اَڑنا چاہتا تو کہہ سکتا تھا کہ حضرت! میرا کوئی اور نام رکھ دو کتے کا نام تو میرا نہ رکھو۔

اور بعض اَڑ بھی جاتے تھے۔جیسے:رئیس التابعین حضرت سعید ابن المسیب رحمۃ اللہ علیہ کے دادا حضرت حزن رضی اللہ عنہ۔حضرت سعید مشہور تابعی ہیں۔ان کے باپ مسیب رضی اللہ عنہ صحابی ہیں اور دادا حزن رضی اللہ عنہ بھی صحابی ہیں۔یہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمھارا نام کیا ہے؟ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم عموماً نام دریافت فرماتے تھے۔انھوں نے بتایا کہ میرا نام حزن ہے۔اور حزن کے معنیٰ ہیں کھردرا۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ نام اچھا نہیں ہے اگر تو چاہے تو میں تیرا نام سہل رکھ دوں۔سہل کے معنیٰ ہیں نرم۔حضرت حزن رضی اللہ عنہ نے کہا حضرت! اس میں شرعی طور پر کوئی گناہ تو نہیں ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نہیں گناہ تو نہیں ہے۔کہنے لگے یہ نام میرے باپ دادا نے رکھا ہے لہٰذا میں حزن ہی ٹھیک ہوں۔حضرت سعید ابن مسیب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ قدرتی طور پر وہ دادے والی سختی ہم میں بھی ہے۔کاش! کہ ہمارا دادا اس وقت مان لیتا اور ان کا نام سہل ہو جاتا اور ہم میں بھی نرمی ہوتی۔

تو ناموں میں اثر ہوتا ہے۔لہٰذا مہمل اور اجنبی نام نہیں رکھنا چاہیے۔عورتیں کئی مہمل قسم کے نام لے آتی ہیں اور پوچھتی ہیں کہ اس کا کیا معنیٰ ہے؟ تو ساری لغتیں تو یاد نہیں ہوتیں جس زبان کا لفظ ہے اس لغت میں دیکھ لو کیا معنیٰ ہے؟ اور عورتوں کے

ناموں میں وہ نام اچھے ہیں جو صحابیات کے ہیں اور آنحضرت ﷺ کی صاحب زادیوں کے نام ہیں۔ اور ایسے ناموں سے گریز کرنا چاہیے جن کے شرکیہ معنیٰ بنتے ہوں۔ تاکہ لوگ غلط فہمی کا شکار نہ ہوں۔

تو کسی پیغمبر نے یہ سبق نہیں دیا کہ تم میرے بندے بن جاؤ بلکہ وہ تو یہ تعلیم دیتے ہیں ﴿وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ﴾ اور لیکن وہ یہ کہے گا کہ ہو جاؤ تم رب والے ﴿بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ﴾ اس واسطے کہ تم تعلیم دیتے ہو کتاب کی ﴿وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ﴾ اور اس واسطے کہ تم پڑھتے ہو کتاب کو۔ خطاب تو عیسائیوں کو ہے اور وہ کتاب پڑھتے بھی تھے اور اس کی تعلیم بھی دیتے تھے مگر وہ بات کہ جس سے ان پر زد پڑتی تھی اس کو چھوڑ دیتے تھے۔ ﴿وَلَا يَاْمُرَكُمْ اَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰٓئِكَةَ وَالنَّبِيّٖنَ اَرْبَابًا﴾ اور وہ تم کو حکم نہیں دے گا اس بات کا کہ تم بنا لو فرشتوں کو اور اللہ تعالیٰ کے پیغمبروں کو رب۔ یہودیوں نے حضرت عزیر علیہ السلام کو رب بنایا اور عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو رب بنایا اور صابیوں نے فرشتوں کو اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں بنایا پھر ان کی پوجا شروع کر دی۔

اور آج کل بعض جاہل قسم کے لوگ تعویذات پر لکھتے ہیں یا جبرئیل، یا میکائیل، یا اسرافیل، یا عزائیل وغیرہ۔ یہ بالکل ناجائز ہے۔ اس واسطے کہ کام تو سارے رب کرتا ہے فرشتوں کے تو بس میں ہی کچھ نہیں ہے۔ ان کو پکارنے کا کیا فائدہ؟ وہ تو رب تعالیٰ کے حکم کے پابند ہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو لوگ جب آگ کے بھٹے میں ڈالنے لگے تو جبرئیل علیہ السلام آئے اور کہنے لگے میرے لائق کوئی خدمت ہو۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا: حَسْبِیَ اللّٰہ "مجھے میرا اللہ کافی ہے۔" وہ دیکھ رہا ہے مجھے تیری ضرورت نہیں ہے۔

﴿اَيَاْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ بَعْدَ اِذْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ﴾ کیا وہ تمھیں حکم کرے گا کفر کا بعد اس کے کہ تم مسلمان ہو چکے ہو۔ اللہ تعالیٰ کا پیغمبر اسلام سکھانے کے لیے آتا ہے یا کفر سکھانے کے لیے آتا ہے؟ کیا وہ تمھیں یہ تعلیم دیتا ہے کہ تم عبدالمسیح علیہ السلام، عبد موسیٰ علیہ السلام، عبد داؤد علیہ السلام، عبدالرسول اور عبدالمصطفیٰ بن جاؤ۔ یہ تو کفر کی بات ہے۔ پیغمبر یہ تعلیم نہیں دیتے وہ تو تعلیم دیتے ہیں اللہ تعالیٰ کے بندے بنو اور نام بھی وہ رکھو جن میں اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت ہو یا اس میں نبی کا نام آئے یا صحابہ رضی اللہ عنہم کا اور عورتیں بھی صحابیات رضی اللہ عنہن کے ناموں والے نام رکھیں۔ ناموں کا اثر ہوتا ہے۔ ابھی تم بخاری شریف کی حدیث سن چکے ہو۔ اللہ تعالیٰ توفیق عطا فرمائے۔ [آمین!]

﴿وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ﴾ اور جس وقت لیا اللہ تعالیٰ نے ﴿مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ﴾ وعدہ پیغمبروں سے ﴿لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ﴾ البتہ وہ چیز جو میں تمھیں دوں گا ﴿مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ﴾ کوئی کتاب اور دانائی ﴿ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ﴾ پھر آئے گا تمھارے پاس رسول ﴿مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ﴾ تصدیق کرنے والا ہوگا اُس چیز کی جو تمھارے پاس ہے ﴿لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ﴾ البتہ ضرور تم اس پر ایمان لاؤ گے ﴿وَلَتَنْصُرُنَّهٗ﴾ اور البتہ ضرور تم اس کی مدد کرو گے ﴿قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ﴾ فرمایا پروردگار

نے کیا تم نے اقرار کیا؟ ﴿ وَ اَخَذْتُمْ ﴾ اور لیا تم نے ﴿ عَلٰی ذٰلِكُمْ اِصْرِیْ ﴾ اس پر میرا وعدہ ﴿ قَالُوْۤا اَقْرَرْنَا ﴾ کہنے لگے ہم نے اقرار کیا ﴿ قَالَ فَاشْهَدُوْا ﴾ رب تعالیٰ نے فرمایا پس گواہ بن جاؤ ﴿ وَ اَنَا مَعَكُمْ ﴾ اور میں تمھارے ساتھ ﴿ مِّنَ الشّٰهِدِیْنَ ﴾ گواہوں میں سے ﴿ فَمَنْ تَوَلّٰی ﴾ پس جس نے اعراض کیا ﴿ بَعْدَ ذٰلِكَ ﴾ اس کے بعد ﴿ فَاُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴾ پس وہی لوگ نافرمان ہیں ﴿ اَفَغَیْرَ دِیْنِ اللّٰهِ ﴾ کیا اللہ تعالیٰ کے دین کے سوا کوئی اور دین ﴿ یَبْغُوْنَ ﴾ یہ تلاش کرتے ہیں ﴿ وَ لَهٗۤ اَسْلَمَ ﴾ اور اسی کے سامنے جھکی ہوئی ہے وہ مخلوق ﴿ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ﴾ جو آسمانوں میں ہے اور زمین میں ہے ﴿ طَوْعًا وَّ كَرْهًا ﴾ خوشی کے ساتھ اور جبراً ﴿ وَّ اِلَیْهِ یُرْجَعُوْنَ ﴾ اور اُسی کی طرف لوٹائے جائیں گے ﴿ قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ ﴾ آپ کہہ دیجیے ہم ایمان لائے اللہ تعالیٰ پر ﴿ وَ مَاۤ اُنْزِلَ عَلَیْنَا ﴾ اور اُس چیز پر جو ہم پر نازل کی گئی ﴿ وَ مَاۤ اُنْزِلَ عَلٰۤی اِبْرٰهِیْمَ ﴾ اور اُس چیز پر جو نازل کی گئی ابراہیم علیہ السلام پر ﴿ وَ اِسْمٰعِیْلَ وَ اِسْحٰقَ وَ یَعْقُوْبَ ﴾ اور اسماعیل علیہ السلام پر اور اسحاق علیہ السلام پر اور یعقوب پر ﴿ وَ الْاَسْبَاطِ ﴾ اور ان کی اولاد در اولاد پر ﴿ وَ مَاۤ اُوْتِیَ مُوْسٰی وَ عِیْسٰی ﴾ اور اُس چیز پر جو دی گئی موسیٰ علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام کو ﴿ وَ النَّبِیُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ﴾ اور جو دی گئی سب نبیوں کو ان کے رب کی طرف سے ﴿ لَا نُفَرِّقُ ﴾ ہم نہیں تفریق کرتے ﴿ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ﴾ ان میں سے کسی ایک کے درمیان ﴿ وَ نَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴾ اور ہم اسی رب تعالیٰ کے فرماں بردار ہیں۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول

اس سے پہلے تم یہ بات خاصی تفصیل کے ساتھ سن چکے ہو کہ ۹ ہجری میں نجران کے عیسائیوں کا ایک وفد جو ساٹھ آدمیوں پر مشتمل تھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا۔ اور ان کے آنے کا اصل مقصد تو اتنا ہی تھا کہ ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی باوفا رعایا ہیں۔ ہم پر جو ٹیکس وغیرہ عائد ہوتا ہے اس کی تفصیل ہمیں بتادو۔ لیکن چونکہ پڑھے لکھے لوگ تھے مختلف قسم کی علمی باتیں بھی ہوئیں جن کے متعلق پہلے بیان ہو چکا ہے۔ آخر میں انھوں نے شوشہ چھوڑا کہ ٹھیک ہے تم نبی ہو مگر عربوں کے لیے۔ ہم بنی اسرائیل ہیں یا دوسری قومیں ہیں ان کے لیے تمھاری نبوت تسلیم کرنا ضروری نہیں ہے۔

اس سلسلے میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیتیں نازل فرمائیں کہ ان کا یہ دعویٰ بالکل بے بنیاد ہے۔ کیوں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا اقرار تو اللہ تعالیٰ نے تمام پیغمبروں سے لیا کہ میرے اس پیغمبر پر ایمان لانا ضروری ہوگا جو سب سے بعد میں آئے گا۔ اور تمام پیغمبروں نے اس کا اقرار کیا کہ ہم مانتے ہیں۔ اور ان پیغمبروں میں موسیٰ بھی علیہ السلام ہیں، عیسیٰ علیہ السلام بھی ہیں اور داؤد علیہ السلام بھی ہیں۔ تو اے یہودیو! اور اے عیسائیو! اور اے صابیو! تمھارے پیغمبر تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا اقرار کریں اور تم کس باغ کی مولی ہو کہ انکار کرو اور کہو کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت صرف عربوں کے لیے ہے ہمارے لیے نہیں ہے۔ یہ تمھارا دعویٰ بالکل بے بنیاد ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت اتنی عام تھی کہ میں نے تمام پیغمبروں سے اس کا اقرار لیا۔ فرمایا ﴿وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ﴾ اور جس وقت لیا اللہ تعالیٰ نے وعدہ پیغمبروں سے۔ یہ وعدہ کب لیا گیا؟ اس بارے میں دو تفسیریں منقول ہیں۔ ایک تفسیر یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے عالم ازل، عالم ارواح، عالم میثاق میں ساری مخلوق کی ارواح کو اکٹھا کیا اور ان کو ادراک اور شعور عطاء فرمایا اور سب کو کہا ﴿اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ﴾ [الاعراف:۱۷۲] کیا میں تمھارا رب نہیں ہوں؟ ﴿قَالُوْا بَلٰى﴾ سب نے جواب دیا اور کہا کیوں نہیں تو ہمارا رب ہے۔ تو جس مقام پر اپنی الوہیت کا وعدہ لیا تھا وہیں پر تمام پیغمبروں کو الگ کر کے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کا اقرار لیا کہ میں ایک نبی بھیجوں گا اس پر سب کا ایمان لانا ضروری ہے۔ سب نے کہا ہمیں منظور ہے۔ اکثر یہی تفسیر بیان کرتے ہیں۔

اور دوسری تفسیر یہ ہے کہ دنیا میں جب پیغمبر تشریف لائے سب سے الگ الگ وعدہ لیا گیا۔ مثلاً: جب آدمی دنیا میں تشریف لائے تو اللہ تعالیٰ نے ان سے وعدہ لیا کہ ایک نبی آئے گا اس پر ایمان لانا ضروری ہے۔ اگر تمھارے دور میں آجائے تو اس کی مدد کرنا ضروری ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام نے کہا کہ میرا ایمان ہے۔ اسی طرح شیث علیہ السلام تشریف لائے تو ان سے وعدہ لیا گیا اور جب حضرت نوح علیہ السلام تشریف لائے تو ان سے وعدہ لیا گیا۔ پھر جب ابراہیم علیہ السلام تشریف لائے تو ان سے وعدہ لیا گیا۔ یعنی جو پیغمبر جس وقت دنیا میں تشریف لائے ان سے اس وقت وعدہ لیا گیا۔ اور وعدہ اس عنوان سے لیا گیا ﴿لَمَاۤ اٰتَيْتُكُمْ﴾ البتہ وہ چیز جو میں تمھیں دوں گا ﴿مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ﴾ کوئی کتاب اور حکمت اور نبوت۔ یعنی میں تمھیں کتاب دوں گا، وحی آئے گی، حکم دوں گا، دانائی کی باتیں دوں گا۔ یہ تمھارا منصب ہے اس کو سمجھ لو کہ تم کون ہو؟

پیغمبروں کے نبی

﴿ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ﴾ پھر آئے گا تمھارے پاس رسول ﴿مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ﴾ تصدیق کرنے والا ہوگا اُس چیز کی جو تمھارے پاس ہے۔ توحید، رسالت، معاد، جو بھی اُصولی باتیں ہیں وہ ان کی تصدیق کرے گا۔ پھر وہ پیغمبر جب تمھارے پاس آئے تو یہ وعدہ کرو ﴿لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ﴾ البتہ ضرور بضرور تم اس پر ایمان لاؤ گے ﴿وَلَتَنْصُرُنَّهٗ﴾ اور البتہ ضرور تم اس کی مدد کرو گے۔ یہ وعدہ اللہ تعالیٰ نے لیا۔

﴿قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ﴾ فرمایا پروردگار نے کیا تم نے اقرار کیا اس وعدے کا کہ وہ آخری پیغمبر جب آئے گا اس پر ایمان لاؤ گے؟ اور اگر تمھارے دور میں آ گیا تو اس کی مدد بھی کرو گے ﴿وَاَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِيْ﴾ اور لیا تم نے اس پر میرا وعدہ اور مان لیا ﴿قَالُوْۤا اَقْرَرْنَا﴾ پیغمبروں نے کہا ہم اقرار کرتے ہیں کہ ہم اس عہد کو پورا کریں گے۔ آنے والے پیغمبر پر ایمان بھی لائیں گے اور اگر ہمارے دور میں آیا تو ہم اس کی مدد بھی کریں گے۔ ﴿قَالَ فَاشْهَدُوْا﴾ رب تعالیٰ نے فرمایا پس گواہ بن جاؤ کہ تم نے میرے ساتھ وعدہ کیا ہے کہ جو پیغمبر بعد میں آنا ہے تم اس پر ایمان لاؤ گے اور اگر تمھارے دور میں آ گیا تو اس کی مدد بھی کرو گے

﴿وَاَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ﴾ اور حق کے گواہوں میں سے میں بھی تمھارے ساتھ ہوں کہ انھوں نے میرے ساتھ یہ عہد کیا ہے۔

اب دیکھو! کتنی عجیب بات ہے کہ اللہ تعالیٰ تمام پیغمبروں سے آنحضرت ﷺ کی نبوت کا وعدہ لے اور اگر ان کے دور میں آجائیں تو امداد کا بھی وعدہ اور تمام پیغمبر اس کا اقرار کریں اور ان پیغمبروں کا نام لینے والے یہ کہیں کہ ان کی نبوت ہمارے لیے نہیں ہے۔ کیا ان کی یہ بات درست ہے؟ مگر دنیا میں کوئی خاموش نہیں رہتا۔ کوئی نہ کوئی شوشہ چھوڑتا رہتا ہے۔ عربی کا ایک مشہور مقولہ ہے کہ:

مَالَا يُدْرَكُ كُلُّهٗ لَا يُتْرَكُ كُلُّهٗ . "جو چیز ساری حاصل نہ ہو ساری چھوڑی نہ جائے۔"

مطلب یہ ہے کہ اگر بندے کو ساری نہ ملے تو کچھ نہ کچھ تو ملنی چاہیے۔ پھر وہ پیغمبر عملی طور پر آپ ﷺ کی مدد نہ کر سکے تو اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اس مقصد کے لیے زندہ رکھا ہوا ہے۔ وہ آسمان سے نازل ہوں گے اور آپ ﷺ کے دین کی مدد کریں گے اور ﴿لَتَنْصُرُنَّهٗ﴾ کا پورا پورا ثبوت دیں گے۔

وہ اس طرح کہ جامع مسجد دمشق میں امام مہدی صبح کی نماز کی تیاری کرا چکے ہوں گے کہ فرشتے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو آسمان سے لے کر آئیں گے اور جامع مسجد دمشق کے منارہ پر لا کر بٹھائیں گے۔ وہ منارہ سفید رنگ کا آج بھی موجود ہے۔ جب میں دمشق گیا تھا تو میں نے اسے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ دروازہ بند تھا اور اندر نہیں جا سکا۔ اس وقت کھولنے کی اجازت نہیں تھی اور انتظار میں نے نہیں کیا چونکہ وقت تھوڑا تھا۔ پھر سیڑھیوں کے ذریعے نیچے تشریف لائیں گے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے آنے کی آوازیں شروع ہو جائیں گی۔ اس وقت امام مہدی علیہ السلام مصلے پر کھڑے ہو چکے ہوں گے۔ جب سنیں گے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نازل ہو چکے ہیں تو مصلے سے پیچھے ہٹ جائیں گے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے ملاقات کریں گے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو کہیں گے کہ حضرت! نماز پڑھاؤ۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرمائیں گے کہ نہیں اب میری حیثیت امتی کی ہے تمھارے پیچھے نماز پڑھوں گا۔

تو پہلی نماز فجر کی جامع مسجد دمشق سوق الحمیدیہ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام امام مہدی علیہ السلام کے پیچھے کھڑے ہو کر پڑھیں گے۔ نماز کے بعد اعلان ہوگا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام تشریف لا چکے ہیں۔ مسلمانوں کی خوشی کی کوئی انتہاء نہیں ہوگی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام جہاد کا حکم دیں گے۔ سب سے پہلے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اسرائیل کے علاقے میں ایک مقام ہے جس کا نام ہے "لُد" اس کے دروازے پر دجال کو اپنے ہاتھ مبارک سے قتل کریں گے۔ یعنی سچا مسیح جھوٹے مسیح کو قتل کرے گا۔ پھر یہود و نصاریٰ اور دوسرے کافروں کے ساتھ لڑائی ہوگی۔ جن علاقوں میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا اثر و رسوخ ہوگا ان علاقوں میں اسلام کے سوا کوئی دین نہیں رہے گا۔ اسلام ہی اسلام ہوگا۔ یہی پانچ نمازیں اور تیس روزے ہوں گے جو ہم پڑھتے اور رکھتے ہیں۔ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام قرآن و حدیث کے مطابق فیصلے فرمائیں گے اور اس طرح وہ آنحضرت ﷺ کے دین کی مدد و نصرت فرمائیں گے۔

اور پختہ عہد کرنے کے بعد ﴿فَمَنْ تَوَلّٰى بَعْدَ ذٰلِكَ﴾ پس جس نے اعراض کیا اس کے بعد۔ یعنی پیغمبروں نے تو

آپ ﷺ کی نبوت کا اور آپ ﷺ کی نصرت کا اقرار کیا اور دوسرے لوگ اعراض کریں گے ﴿فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ﴾ تو وہی لوگ نافرمان ہیں کہ پیغمبر تو اقراری ہوں اور اُمتی کہیں کہ آپ ﷺ کی نبوت اور دین ہمارے لیے نہیں ہے۔ اور آپ ﷺ پر ایمان لانا اور آپ ﷺ کے دین کی مدد کرنا ہمارے لیے ضروری نہیں ہے۔ ہمارے لیے ہمارا اپنا مذہب ہے۔ یہ کیسی منطق ہے؟ بھئی! بے شک حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا مذہب اپنے دور میں حق تھا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مذہب اپنے دور میں حق تھا، اسی طرح باقی پیغمبروں کا۔ مگر جب آنحضرت ﷺ تشریف لے آئے تو پہلے سب دین منسوخ ہو گئے۔

اس کو تم اس طرح سمجھو کہ آسمان میں ستارے ہیں کسی کی روشنی کم ہے اور کسی کی زیادہ ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ﴿وَبِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُوْنَ﴾ [النحل:۱۶، پارہ:۱۴] اور لوگ ستاروں سے بھی راستے معلوم کرتے ہیں۔ یعنی لوگ ستاروں سے بھی فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ مگر جب سورج طلوع ہو جائے تو پھر ستاروں کی روشنی کی کیا ضرورت ہے؟ دوسرے پیغمبر ستاروں کی مانند ہیں اور آنحضرت ﷺ آفتابِ نبوت ہیں۔ آپ ﷺ کی تشریف آوری کے بعد ستاروں کی روشنی تلاش کرنے والا دیوانہ اور مجنون ہے۔ اُسے پاگل خانے میں بند کرنا چاہیے۔ ان پیغمبروں کی شریعتیں اپنے اپنے زمانے میں حق اور سچ تھیں۔ جب آنحضرت ﷺ تشریف لے لائے تو سارے دین ختم اور منسوخ ہو گئے۔ اب کامیابی صرف اسلام میں ہے۔

فرمایا ﴿اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ﴾ کیا پس اللہ تعالیٰ کے دین کے سوا کوئی اور دین یہ تلاش کرتے ہیں ﴿وَلَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ اور اسی کے سامنے جھکی ہوئی ہے وہ مخلوق جو آسمانوں میں ہے اور زمین میں ہے۔ آسمانوں میں فرشتے ہیں یا جو بھی رب کی مخلوق ہے سب اس کے احکام مانتے ہیں اور اس کے احکام کے سامنے جھکے ہوئے ہیں۔ اور جو زمین میں ہیں وہ رب کے سامنے جھکے ہوئے ہیں ﴿طَوْعًا وَّ كَرْهًا﴾ کوئی خوشی کے ساتھ جھکا ہوا ہے اور کوئی مجبوراً اللہ تعالیٰ کے حکم کے سامنے جھکا ہوا ہے۔ جو مسلمان ہیں وہ سارے خوشی کے ساتھ رب کے سامنے سر جھکائے ہوئے ہیں اور جو جہاد میں قید ہو کر آتے ہیں پہلے تو وہ مجبور ہوتے ہیں پھر اللہ تعالیٰ ان کے دلوں میں اسلام کی محبت ڈال دیتا ہے اور وہ سچے دل سے قبول کر لیتے ہیں۔ تو وہ جبر اب خوشی میں تبدیل ہو گیا۔

تشریعی اور تکوینی احکام

پھر اللہ تعالیٰ کے احکام دو قسم کے ہیں۔ تشریعی اور تکوینی۔ تشریعی یہ ہیں کہ مثلاً: تم رب پر ایمان لاؤ، پیغمبروں پر ایمان لاؤ، کتابوں پر ایمان لاؤ، فرشتوں پر ایمان لاؤ، تقدیر پر ایمان لاؤ، نمازیں پڑھو، روزے رکھو، قیامت پر ایمان لاؤ، قبر حشر پر ایمان لاؤ۔ یہ شرعی احکام ہیں اور مومن ان کو خوشی کے ساتھ دل سے تسلیم کرتے ہیں۔

اور تکوینی احکام یہ ہیں مثلاً: رب تعالیٰ کسی کو بیمار کرتا ہے، کسی کو مارتا ہے، کسی کو اولاد دے کر چھین لیتا ہے، کسی مال دے کر چھین لیتا ہے۔ تو اس کے تکوینی احکام جبراً مانتے ہیں۔ ہے کوئی جو انکار کرے کہ میں نے بیمار نہیں ہونا، میں نے مرنا نہیں ہے؟ یا میں اپنی اولاد کو مرنے نہیں دوں گا یا مال ہاتھ سے نہیں جانے دوں گا۔ تو تکوینی احکام مومن کافر سب مانتے ہیں۔ مومن خوشی کے

ساتھ راضی برضاءِ الٰہی ہوتے ہیں اور کافر رب کے یہ احکام ماننے پر مجبور ہوتے ہیں۔

﴿وَّاِلَیْهِ یُرْجَعُوْنَ﴾ اور اُسی کی طرف لوٹائے جائیں گے۔ یعنی جانا سب نے رب کے پاس ہے۔ اور جب انسان اپنے ذہن میں یہ نکتہ بٹھائے گا کہ میں نے رب تعالیٰ کے پاس جانا ہے اور رب تعالیٰ نے مجھ سے نیکی بدی کا سوال کرنا ہے تو پھر تیاری بھی کرے گا۔ دیکھو! سکولوں، کالجوں، یونیورسٹیوں کے امتحان ہوتے ہیں۔ ان کے لیے بچے خود بھی تیاری کرتے ہیں اور ماں باپ بھی تیاری کراتے ہیں۔ استاد بھی مجبور کرتے ہیں کہ تیاری کرو۔ سب کو فکر لگی ہوتی ہے۔ حالانکہ یہ امتحان آخرت کے امتحان کے مقابلے میں اس طرح ہے جس طرح بچوں کا کھیل ہوتا ہے۔ مگر اس کی کتنی تیاری ہوتی ہے؟

افسوس کہ آخرت کے سچے اور حقیقی امتحان کی تیاری بہت کم ہے۔ ہم میں سے کتنے اللہ کے بندے ہیں جو نمازیں پڑھتے ہیں اور روزے رکھتے ہیں۔ رب تعالیٰ کی فرماں برداری کر کے اس کے احکام کی تعمیل کرتے ہیں اور اپنے نصاب کی پوری زکوٰۃ نکالتے ہیں اور عشر ادا کرتے ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ بالکل نہیں ہیں۔ بلکہ مجموعی حیثیت سے کہتا ہوں کہ نسبت کیا ہے؟ سو میں سے کتنے آدمی رب تعالیٰ کے احکامات کی تعمیل کرنے والے ہیں؟ تو جب یہ بات ذہن میں بٹھائے گا کہ رب تعالیٰ کے پاس جانا ہے تو پھر اس کی تیاری بھی کرے گا۔

آگے فرمایا اہل کتاب نے تو حصے کیے ہوئے ہیں کہ یہودی کہتے ہیں کہ ہم موسیٰ علیہ السلام کے سوا کسی کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ صابی کہتے ہیں ہم حضرت داؤد علیہ السلام کے سوا کسی کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ اور عیسائی کہتے ہیں کہ ہم عیسیٰ علیہ السلام کے سوا کسی کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ ہماری وسعتِ قلبی اور فراخ دلی بھی سن لو۔ فرمایا ﴿قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ﴾ آپ کہہ دیجیے ہم ایمان لائے اللہ تعالیٰ پر ﴿وَمَآ اُنْزِلَ عَلَیْنَا﴾ اور اُس چیز پر جو ہم پر نازل کی گئی ﴿وَمَآ اُنْزِلَ عَلٰٓی اِبْرٰهِیْمَ وَاِسْمٰعِیْلَ وَاِسْحٰقَ وَیَعْقُوْبَ﴾ اور اُس چیز پر جو نازل کی گئی ابراہیم علیہ السلام پر اور اسماعیل علیہ السلام پر اور اسحاق علیہ السلام پر اور یعقوب علیہ السلام پر ﴿وَالْاَسْبَاطِ﴾ اور ان کی اولاد در اولاد کی طرف جو نازل کی گئی ہے۔ کیوں کہ اسباط جمع ہے سبط کی اور سبط کے معنیٰ ہیں بیٹا اور پوتا۔ تو معنیٰ ہوں گے اولاد در اولاد۔

اور خاص طور پر وہاں چونکہ یہودی اور عیسائی تھے جن کے ساتھ بات ہو رہی تھی اس واسطے خصوصیت کے ساتھ فرمایا ﴿وَمَآ اُوْتِیَ مُوْسٰی وَعِیْسٰی﴾ اور اُس چیز پر جو دی گئی موسیٰ علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام کو ﴿وَالنَّبِیُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ﴾ اور سب نبیوں کو جو دی گئی ان کے رب کی طرف سے ہم سب پر ایمان رکھتے ہیں۔ او ظالمو! ہم تو سارے پیغمبروں کی قدر کرتے ہیں اور ان کی طرف جو رب کی طرف سے احکام نازل ہوئے ہیں ہم سب پر ایمان لاتے ہیں ﴿لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ﴾ ہم نہیں تفریق کرتے ان میں سے کسی ایک کے درمیان۔ اوپر چوں کہ ﴿اٰمَنَّا﴾ ہے اس واسطے تفریق سے مراد ایمان کی تفریق ہے کہ ہم ایمان کے سلسلے میں تفریق نہیں کرتے کہ ﴿نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّنَكْفُرُ بِبَعْضٍ﴾ [النساء: ۱۵۰] بعض پر ایمان لائیں اور بعض پر ایمان نہ لائیں۔ بلکہ ہمارا سب پر ایمان ہے کہ سارے اللہ تعالیٰ کے سچے پیغمبر تھے اور اپنے اپنے زمانے میں بہترین نمونہ تھے۔ باقی رہی بات درجوں کی

تو وہ پیغمبروں کے اپنے اپنے درجے ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ﴿تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ﴾ ”یہ سب رسول ہیں ہم نے ان میں بعض کو بعض پر فضیلت بخشی۔“ پندرھویں پارے میں آتا ہے ﴿وَ لَقَدْ فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِيّٖنَ عَلٰى بَعْضٍ﴾ [اسراء:۵۵] ”البتہ تحقیق ہم نے بعض پیغمبروں کو بعض پر فضیلت عطاء فرمائی ہے۔“ تمام پیغمبروں میں سب سے اعلیٰ اور بلند مرتبہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ہے۔ پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ہے پھر موسیٰ علیہ السلام کا ہے۔ و علیٰ ھذا القیاس دوسرے پیغمبر ہیں۔

﴿وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ﴾ اور ہم اسی رب تعالیٰ کے فرماں بردار ہیں۔ ہم تمھاری طرح نہیں ہیں کہ اپنی خواہشات پر چلیں۔ ان نجران کے لوگوں نے آخری پیغمبر کے متعلق یہ شوشہ چھوڑا کہ نبی ہوں گے مگر ہمارے لیے نہیں ہیں۔ بھئی! جب تمام پیغمبروں نے وعدہ کیا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لانے اور نصرت کرنے کا تو تم کون ہوتے ہو نہ ماننے والے؟ پھر تمھارا ان پیغمبروں پر ایمان کیا ہے کہ جس کو تمھارے پیغمبر مانتے ہیں اس کو تم نہ مانو۔ اللہ تعالیٰ حق سمجھنے اور کہنے کی توفیق عطاء فرمائے۔ [آمین]

﴿وَمَنْ يَّبْتَغِ﴾ اور وہ شخص کہ جس نے تلاش کیا ﴿غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا﴾ اسلام کے علاوہ کوئی اور دین ﴿فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ﴾ پس ہرگز وہ اس سے قبول نہیں کیا جائے گا ﴿وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ﴾ اور وہ شخص آخرت میں ﴿مِنَ الْخٰسِرِيْنَ﴾ نقصان اُٹھانے والوں میں سے ہوگا ﴿كَيْفَ يَهْدِي اللّٰهُ﴾ کیسے اللہ تعالیٰ ہدایت دے ﴿قَوْمًا كَفَرُوْا﴾ اس قوم کو جس نے کفر اختیار کیا ﴿بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ﴾ ایمان لانے کے بعد ﴿وَشَهِدُوْٓا﴾ اور انھوں نے گواہی دی ﴿اَنَّ الرَّسُوْلَ حَقٌّ﴾ کہ بے شک وہ رسول برحق ہے ﴿وَّجَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ﴾ اور آگئیں ان کے پاس واضح دلیلیں ﴿وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ﴾ اور اللہ تعالیٰ نہیں ہدایت دیتا ظالم قوم کو ﴿اُولٰٓئِكَ جَزَآؤُهُمْ﴾ وہ لوگ ہیں بدلا ان کا ﴿اَنَّ عَلَيْهِمْ لَعْنَةَ اللّٰهِ﴾ بے شک ان پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہے ﴿وَالْمَلٰٓئِكَةِ﴾ اور فرشتوں کی ﴿وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ﴾ اور تمام انسانوں کی ﴿خٰلِدِيْنَ فِيْهَا﴾ ہمیشہ رہیں گے اس لعنت میں ﴿لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ﴾ نہ ہلکا کیا جائے گا ان سے عذاب ﴿وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ﴾ اور نہ ان کو مہلت دی جائے گی ﴿اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا﴾ مگر وہ لوگ جنھوں نے توبہ کی ﴿مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ﴾ اس کے بعد ﴿وَاَصْلَحُوْا﴾ اور اصلاح کر لی ﴿فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾ پس بے شک اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا﴾ بے شک وہ لوگ جنھوں نے انکار کیا ﴿بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ﴾ ایمان لانے کے بعد ﴿ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا﴾ پھر بڑھ گئے وہ کفر میں ﴿لَّنْ تُقْبَلَ تَوْبَتُهُمْ﴾ ہرگز نہیں قبول کی جائے گی ان کی توبہ ﴿وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الضَّآلُّوْنَ﴾ اور یہی لوگ گمراہ ہیں ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا﴾ بے شک وہ لوگ جنھوں نے کفر

ختیار کیا ﴿وَمَاتُوْا﴾ اور مرے اس حالت میں ﴿وَهُمْ كُفَّارٌ﴾ کہ وہ کافر تھے ﴿فَلَنْ يُّقْبَلَ﴾ پس ہرگز نہیں قبول کی جائے گی ﴿مِنْ اَحَدِهِمْ﴾ ان میں سے کسی ایک سے ﴿مِّلْءُ الْاَرْضِ ذَهَبًا﴾ سونے سے بھری ہوئی زمین ﴿وَّلَوِافْتَدٰى بِهٖ﴾ اور اگر چہ وہ اس کو بہ طور فدیہ کے دے دے ﴿اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ﴾ یہی لوگ ہیں جن کے لیے دردناک عذاب ہے ﴿وَّمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ﴾ اور نہیں ہوگا ان کا کوئی مددگار۔

پہلے سے یہ بات تفصیل کے ساتھ چلی آ رہی ہے کہ نجران کے عیسائیوں نے اور ان کے ساتھ مل کر یہود نے یہ شوشہ چھوڑا تھا کہ اول تو ہم آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نبی نہیں مانتے اور اگر نبی ہوں بھی تو دوسروں کے لیے ہوں گے ہمارے لیے نہیں ہیں۔ کل کے درس میں تفصیل کے ساتھ سن چکے ہو کہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت اتنی عام ہے کہ عام تو عام آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خاصوں کے بھی یعنی پیغمبروں کے بھی نبی اور رسول ہیں۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کا تمام پیغمبروں نے اقرار کیا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لانے اور نصرت کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ اور ان پیغمبروں میں موسیٰ علیہ السلام، داؤد علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام بھی شامل ہیں۔ تو ان کے پیغمبر تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کو تسلیم کریں اور یہ انکار کریں اور پیغمبروں کے ماننے کا دعویٰ بھی کریں۔ تو اس دعوے کی کیا حیثیت ہے۔ پھر تو سیدھی سادھی بات ہے کہ ان اہل کتاب نے اپنے پیغمبروں کو ہی نہیں مانا۔

حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تشریف لانے کے بعد پہلے تمام ادیان منسوخ ہو گئے ہیں اب کامیابی صرف اسلام میں ہے۔ ارشاد ہے ﴿وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ﴾ اور وہ شخص کہ جس نے تلاش کیا اسلام کے علاوہ کوئی اور دین پس ہرگز وہ اس سے قبول نہیں کیا جائے گا۔ بے شک اپنے وقت میں حضرت داؤد علیہ السلام کا دین بھی صحیح تھا، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جو دین پیش کیا اپنے وقت میں وہ بھی صحیح تھا۔ اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جو دین پیش کیا اپنے زمانے میں وہ بھی حق تھا۔ مگر جب اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مبعوث فرمایا تو پہلی ساری شریعتیں منسوخ ہو گئیں۔ اب کل کائنات کے واسطے حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نبی اور رسول ہیں اور سب کی نجات اسی دین میں ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پیش فرمایا ہے۔

اس دین کو صحیح معنیٰ میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے سمجھا اور عمل کیا۔ پھر یہ دین اطرافِ عالم میں پھیلا اور عرب کے بعد افغانستان، ہندوستان، پاکستان، بنگلہ دیش میں جڑیں مضبوط ہوئیں اور ان لوگوں نے دین کو سمجھا۔ یہاں کا گیا گزرا مسلمان بھی ضروریاتِ دین سے واقف ہے۔ فرائض کی پابندی تو الگ بات ہے یہاں تو مستحبات کی پابندی کرنے والے بھی موجود ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ دین میں بعض چیزیں تو فرض، واجب اور سنتِ مؤکدہ ہیں کہ جن پر عمل کرنا ضروری ہے اور چھوڑنے والا گناہ گار ہے۔ اور بعض چیزیں مستحب ہیں کہ جن کے کرنے سے ثواب ملتا ہے اور نہ کرنے پر گرفت نہیں ہوتی۔ تو الحمد للہ! ان علاقوں میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو دین کے مستحبات سے بھی واقف ہیں۔ سب کی بات تو نہیں ہو رہی مگر موجود ہیں۔ دوسرے ملکوں میں اتنا بھی نہیں ہے۔ سوائے سعودیہ کے کہ سعودی باشندے عقائد اور نظریات میں تو پختہ ہیں مگر عمل نہیں ہے۔ اور باقی ملکوں کے

لوگ فرائض سے بھی ناواقف ہیں۔ وہ دین کی حقیقت کو نہیں سمجھتے۔

میں ایک واقعہ کا ذکر کرتا ہوں اس سے اندازہ کرلیں۔ دوپہر کے وقت ہم مدینہ طیبہ سے چلے اور ذوالحلیفہ پہنچے جس کو آج کل بئر علی کہا جاتا ہے۔ ذوالحلیفہ کے نام سے لوگ آج کل واقف نہیں ہیں۔ مغربی علاقے کے ایک آدمی نے بالکل ننگا ہو کر غسل کرنا شروع کر دیا۔ وہاں کثیر تعداد میں مرد اور عورتیں موجود تھیں۔ غسل کرنے کے بعد جب اس نے احرام کے کپڑے پہن لیے اور اس سے پوچھا گیا کہ تو نے یہ کیا حرکت کی ہے؟ تو کہنے لگا کہ میں نے حدیث پر عمل کیا ہے۔ ترمذی شریف میں حدیث آتی ہے: ((تَجَرَّدَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ لِلْغُسْلِ قَبْلَ الْإِحْرَامِ)). "کہ آنحضرت ﷺ نے احرام باندھنے سے پہلے غسل کے لیے کپڑے اُتارے۔" تو کپڑے اُتارنے کا یہ معنیٰ تو نہیں تھا جو اس نے سمجھا تھا کہ آپ ﷺ نے ننگے ہو کر غسل کیا، معاذ اللہ تعالیٰ۔ غسل کے وقت لوگ کپڑے اُتارتے ہی ہیں اور اُتارنے جائز بھی ہیں۔ یہ مطلب تو نہیں ہے کہ تم لوگوں کے سامنے ننگے ہو جاؤ۔ اور کیا اس کا نام ہے حدیث پر عمل کرنا۔ یہ واقعہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور اس کا جواب کانوں سے سنا ہے۔ تو ایسے کم علم لوگ ہیں۔

تحریف شدہ قرآن

اور آج سے تقریباً چالیس سال پہلے کی بات ہے کہ یہود نے ایسے لوگوں کی اس لاعلمی سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے عمدہ کاغذ پر اچھی طباعت کے ساتھ تحریف شدہ قرآن کریم طبع کرایا اور ان علاقوں میں بھیجا جہاں نہ تو قرآن کریم کے حافظ تھے اور نہ ہی دین سے زیادہ واقف تھے۔ اس وقت رسائل اور اخبارات میں اکیس بائیس تحریفات شائع ہوئی تھیں۔ ان میں سے ایک یہ تھی کہ آیت ﴿ وَمَنْ يَّبْتَغِ الْإِسْلَامَ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ﴾ "اور جو شخص اسلام کو تلاش کرے گا بطورِ دین کے تو اس سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا۔" یعنی جس نے اب دین اسلام کو قبول کیا تو اس سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا۔ اور آیت کا صحیح مطلب یہ ہے "اور جو شخص اسلام کے سوا کسی اور دین کو تلاش کرے گا پس اس سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا۔" اور تحریفات بھی اسی طرح کی تھیں۔

اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطاء فرمائے جمال عبدالناصر کو جو اس وقت مصر کا صدر تھا اور قرآن کا حافظ تھا اور عمل بھی ویسا ہی تھا جیسے مصری ہوتے ہیں کہ ان کے قاریوں نے بھی ڈاڑھیاں صاف کی ہوتی ہیں۔ بس آوازیں ہی آوازیں ہیں۔ بہر حال پھر بھی اس کو اسلامی غیرت آئی اور اس نے دین کے بڑے اچھے کام کیے۔

① ان میں سے ایک کام یہ کیا کہ قاہرہ میں ایک مستقل ریڈیو اسٹیشن قائم کیا جو چوبیس گھنٹے چلتا ہے اور آج تک اس سے قرآن کریم نشر ہوتا چلا آ رہا ہے۔ تاکہ مسلمان اپنے کانوں سے اس قرآن کریم کو سنیں جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوا ہے۔

② اور دوسرا کام اس نے یہ کیا کہ علماء اور قُرّاء کے وفد بنا کر ان علاقوں میں بھیجے جہاں یہودیوں نے تحریف شدہ قرآن تقسیم کیے تھے۔ تاکہ ان کو جا کر آگاہ کریں کہ اصل قرآن یہ ہے جو ہمارے پاس ہے۔ اور جو یہودیوں نے طبع کر کے تقسیم کیا ہے اس

میں غلطیاں ہیں۔

④ اور تیسرا کام یہ کیا کہ قرآن پاک کے صحیح نسخے لاکھوں کی تعداد میں طبع کرا کر تقسیم کیے۔

اوراب یہ کام سعودیہ نے بھی کیا ہے کہ اچھے سائز میں عمدہ کاغذ پر طبع کرا کر دنیا بھر میں قرآن کریم تقسیم کیا جا رہا ہے۔ سادہ بھی اور مختلف زبانوں میں ترجمہ کرا کے بھی۔ انگریزی زبان میں، بروہی زبان میں اور بروہی زبان کے ترجمہ والا ایک نسخہ میری طرف بھی بھیجا جو میرے پاس موجود ہے۔ اُردو ترجمہ اور تفسیر کے لیے اُنھوں نے علماء سے مشورہ کیا۔ تو علمائے کرام نے ان کو بتایا کہ اس وقت اُردو زبان میں بہترین ترجمہ اور مختصر تفسیر حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن رحمۃ اللہ علیہ کی ہے۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے یہ ترجمہ اور سورۃ بقرہ کی تفسیر اس وقت لکھی جب آپ مالٹا کے مقام میں قید تھے۔ اور سورۃ آل عمران سے لے کر آخر تک کی تفسیر حضرت کے شاگرد مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے کی۔ جنھوں نے پاکستان بننے کے بعد مغربی پاکستان میں جھنڈا لہرایا تھا۔ اور مشرقی پاکستان میں جھنڈا مولانا ظفر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے لہرایا تھا۔

اور مالٹا میں قید ہونے کا سبب یہ تھا کہ انگریز اپنے ٹاؤٹ حسین شریفِ مکہ کے ذریعہ حضرت شیخ الہند سے ترکوں کے خلاف کفر کا فتویٰ حاصل کرنا چاہتا تھا کہ فتویٰ دو کہ ترکی کافر ہیں۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ مصطفیٰ کمال پاشا یا چند اشخاص کے کفر کی وجہ سے میں سارے ترکی کو کافر نہیں کہہ سکتا۔ کیوں کہ مصطفیٰ کمال اور اس کے ساتھیوں نے عرب دشمنی میں اسلام اور خلافت کی مخالفت شروع کر رکھی تھی اور خلافت کے خاتمہ کے لیے سازشوں کے علاوہ انھوں نے ایک باغیرت عثمانی خلیفہ سلطان عبد الحمید خان کو معزول کرا دیا تھا۔ بعد میں مصطفیٰ کمال اتاترک نے ترکی کا صدر بننے پر خلافت کے خاتمہ اور اسلامی قوانین کی منسوخی کے ساتھ ساتھ قرآن شریف عربی میں پڑھنے اور اذان عربی میں دینے پر بھی پابندی لگا دی تھی۔

جس طرح ترکوں نے کل قانون پاس کیا ہے کہ سولہ سال کی عمر تک کوئی دین حاصل نہیں کر سکتا۔ حالانکہ یہی عمر ہوتی ہے دین حاصل کرنے کی۔ تو جو سولہ سال تک دین حاصل نہیں کرے گا اس کے بعد اس کو فرصت نہیں ملے گی۔ بے دین اور بے ایمان ہی مرے گا۔ مگر اس کے باوجود ترکی میں مسلمان بھی ہیں اور اربکان وغیرہ ڈٹے ہوئے ہیں کہ ہم اس قانون کو تسلیم نہیں کرتے۔

تو چند آدمیوں کے کفر کی وجہ سے سب کو تو کافر نہیں کہا جا سکتا۔ یہی بات حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے فرمائی کہ مصطفیٰ کمال جیسے چند افراد کی وجہ سے سارے ترکوں کو میں کافر کس طرح کہوں؟ تو حضرت کا یہ جرم تھا کہ انھوں نے ترکوں کو کافر کہنے سے انکار کر دیا تھا جس کی وجہ سے ان کو گرفتار کر کے مالٹا کی جیل میں ڈال دیا گیا۔

اور حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سے فتویٰ لینے کی وجہ یہ تھی کہ سارا ہندوستان ان کے علم، تقویٰ اور سیاست پر اعتماد کرتا تھا۔ تو اگر حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ یہ فتویٰ دے دیں تو ہمارے لیے راستہ صاف ہو جائے گا۔ تو حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کا یہ ترجمہ اور تفسیر جو انھوں نے مالٹا کی اسیری کے ایام میں لکھا تھا سعودی حکومت نے کروڑوں کی تعداد میں طبع کرایا۔ لیکن بعض فرقوں کو ناگوار گزرا کہ دیوبند مکتبہ فکر کے عالم کا ترجمہ کیوں طبع ہوا اور اس پر انھوں نے شور برپا کیا تو سعودی حکومت نے دوبارہ علماء کو

اکٹھا کیا کہ یہ لوگ کیا کہتے ہیں؟ تو علماء نے کہا کہ یہ بالکل غلط کہتے ہیں اور تعصب اور ضد سے کام لے رہے ہیں۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کا ترجمہ وتفسیر بالکل صحیح اور درست ہے۔ تو سعودی حکومت نے ان کے احتجاج کو بالکل مسترد کر دیا۔ (اب یہ ترجمہ شائع نہیں ہو رہا۔ بلکہ اس کی جگہ محمد جونا گڑھی کا ترجمہ شائع ہو رہا ہے)۔

تو بات یہ ہو رہی تھی کہ یہودیوں نے ان کی لاعلمی سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے تحریف شدہ قرآن کریم طبع کرا کے ان میں تقسیم کر دیے۔ اور نمونے کے طور پر میں نے ایک تحریف بیان کی ہے کہ آیت ﴿وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ﴾ سے ﴿غَيْرَ﴾ کا لفظ نکال دیا اور معنیٰ بن گیا" اور جو شخص اسلام کو تلاش کرے گا، اپنائے گا دین کے طور پر پس اس سے ہرگز نہ قبول کیا جائے گا۔" حالاں کہ آیت کریمہ کا صحیح مطلب یہ ہے کہ جو شخص اسلام کے سوا کسی اور دین کو تلاش کرے گا پس اس سے ہرگز نہ قبول کیا جائے گا ﴿وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ﴾ اور وہ شخص آخرت میں نقصان اُٹھانے والوں میں سے ہوگا۔ یہ اہل کتاب یعنی یہود ونصاریٰ جو اس وقت قرآن اور صاحبِ قرآن آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دشمن بنے ہوئے ہیں ان کو معلوم ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ تعالیٰ کے آخری نبی ہیں۔ کیوں کہ قرآن کریم میں آتا ہے: ﴿الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ﴾ [الاعراف:۱۵۷] "یہ رسول امی وہ ہے کہ اس کو پاتے ہیں لکھا ہوا اپنے پاس تورات میں اور انجیل میں۔" یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خوبیاں اور اوصاف اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حلیہ مبارک ان کو تورات اور میں بھی لکھا ہوا ملتا تھا اور انجیل میں بھی لکھا ہوا ملتا تھا۔

اور پہلے پارے میں تم پڑھ چکے ہو ﴿وَكَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا﴾ [البقرہ:۸۹] کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تشریف لانے سے پہلے یہود ونصاریٰ جب دشمنوں سے لڑتے تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وسیلے سے دعائیں مانگتے تھے کہ اے پروردگار! نبی آخر الزمان کے وسیلے سے ہمیں کافروں پر فتح عطاء فرما۔ ﴿فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ﴾ پس جب وہ نبی برحق ان کے پاس آ گیا اور انھوں نے ان کو پہچان بھی لیا تو انکار کر دیا۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ﴿كَيْفَ يَهْدِي اللّٰهُ قَوْمًا كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ﴾ کیسے اللہ تعالیٰ ہدایت دے اس قوم کو جنھوں نے کفر اختیار کیا ایمان لانے کے بعد ﴿وَشَهِدُوْٓا﴾ اور انھوں نے گواہی دی ﴿اَنَّ الرَّسُوْلَ حَقٌّ﴾ کہ بے شک وہ رسول برحق ہے ﴿وَّجَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ﴾ اور آ گئیں ان کے پاس واضح دلیلیں کہ اس پیغمبر سے معجزات صادر ہوئے اور ان کو انھوں نے آنکھوں سے دیکھ لیا پھر بھی کفر پر اَڑے رہے۔ تو یہ ظالم ہیں ﴿وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ﴾ اور اللہ تعالیٰ نہیں ہدایت دیتا ظالم قوم کو۔ رب تعالیٰ ہدایت ان کو دیتا ہے، ایمان ان کو دیتا ہے جو اس کے طالب ہوں، زبردستی کسی کو ایمان نہیں دیتا۔ ﴿اُولٰٓئِكَ جَزَآؤُهُمْ﴾ وہ لوگ ہیں بدلا ان کا ﴿اَنَّ عَلَيْهِمْ لَعْنَةَ اللّٰهِ﴾ بے شک ان پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہے ﴿وَالْمَلٰٓئِكَةِ﴾ اور فرشتوں کی لعنت ہے ﴿وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ﴾ اور تمام انسانوں کی لعنت ہے۔ کیوں کہ ایسے لوگ جو پیغمبر کے آنے سے پہلے اس کے طفیل اور وسیلے سے دعائیں کریں اور ان کے تشریف لانے کے بعد کہیں کہ یہ وہی پیغمبر ہے جس نے آنا تھا اور ایمان لانے سے انکار کریں تو ملعون

ہیں۔ ﴿خٰلِدِیْنَ فِیْهَا﴾ ہمیشہ رہیں گے اس لعنت میں ﴿لَا یُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ﴾ نہ ہلکا کیا جائے گا ان سے عذاب ﴿وَلَا هُمْ یُنْظَرُوْنَ﴾ اور فیصلے کے بعد ان کو مہلت بھی نہیں دی جائے گی۔

ایسا نہیں ہوگا جس طرح دنیا میں فیصلے ہوتے ہیں اور سزا مؤخر ہو جاتی ہے پھر کچھ عرصہ بعد دی جاتی ہے۔ وہاں کوئی مہلت نہیں ہوگی۔ جس وقت فیصلہ ہوگا فوراً سزا ہوگی۔ ہاں! وہ لوگ سزا سے بچ جائیں گے ﴿اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ﴾ مگر وہ لوگ جنھوں نے توبہ کی اس کے بعد ﴿وَاَصْلَحُوْا﴾ اور اپنے عقائد اور اعمال کو درست کیا، اللہ اور رسول کی مرضی کے مطابق عقائد بنائے اور پہلے والے عقائد اور اعمال چھوڑ دیے ﴿فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ﴾ پس بے شک اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے۔

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا﴾ بے شک وہ لوگ جنھوں نے انکار کیا ﴿بَعْدَ اِیْمَانِهِمْ﴾ ایمان لانے کے بعد کہ پہلے ایمان لائے پھر منکر ہو گئے ﴿ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا﴾ پھر بڑھ گئے وہ کفر میں یعنی مزید پختہ ہو گئے ﴿لَّنْ تُقْبَلَ تَوْبَتُهُمْ﴾ ہرگز نہیں قبول کی جائے گی ان کی توبہ۔ اس توبہ کی کیا حیثیت ہے؟ کہ کفر پر بھی اَڑے رہیں اور منہ سے توبہ، توبہ بھی کہتے رہیں۔ تو یہ توبہ تو نہیں ہے بلکہ یہ تو خالص مکاری ہے ﴿وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الضَّآلُّوْنَ﴾ اور یہی لوگ گمراہ ہیں ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا﴾ بے شک وہ لوگ جنھوں نے کفر اختیار کیا ﴿وَمَاتُوْا﴾ اور مرے اس حالت میں ﴿وَهُمْ كُفَّارٌ﴾ کہ وہ کافر تھے ﴿فَلَنْ یُّقْبَلَ﴾ پس ہرگز نہیں قبول کی جائے گی ﴿مِنْ اَحَدِهِمْ﴾ ان میں سے کسی ایک سے ﴿مِّلْءُ الْاَرْضِ ذَهَبًا﴾ سونے سے بھری ہوئی زمین۔ اور چوبیسویں [۲۴] پارے میں آتا ہے ﴿وَلَوْ اَنَّ لِلَّذِیْنَ ظَلَمُوْا﴾ [الزمر: ۴۷] "اور اگر ہو بے شک ان لوگوں کے لیے جنھوں نے ظلم کیا ﴿مَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا﴾ جو کچھ ہے زمین میں سارے کا سارا ﴿وَّمِثْلَهٗ مَعَهٗ﴾ اور اس جیسا مزید بھی اس کے ساتھ ﴿لَافْتَدَوْا بِهٖ﴾ پھر وہ فدیہ دے دیں اس کے ساتھ ﴿مِنْ سُوْٓءِ الْعَذَابِ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ﴾ بُرے عذاب سے قیامت کے دن۔"

یعنی قیامت والے دن اللہ تعالیٰ فرمائیں گے اے میرے بندے! بتا یہ زمین سونے کی بھری ہوئی ہو۔ اس طرح کہ سطح زمین سے لے کر آسمان تک اور مشرق سے لے کر مغرب تک اور شمال سے لے کر جنوب تک سونے سے بھری ہوئی ہو اور اتنی دنیا اور بھی تصور کر لے کہ وہ بھی سونے سے بھری ہوئی ہو تو کیا تو یہ فدیہ کے طور پر دے کر جان چھڑانے کے لیے راضی ہے؟ کہے گا یا رب! میں راضی ہوں۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ وہاں سونا ہوگا کس کے پاس؟ اور ہو بھی کہ رب تعالیٰ وہاں دے دے تو قبول نہیں کیا جائے گا۔ ﴿وَّلَوِ افْتَدٰی بِهٖ﴾ اور اگرچہ وہ اس کو بہ طور فدیہ کے دے دے ﴿اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ﴾ یہی لوگ ہیں جن کے لیے دردناک عذاب ہے ﴿وَّمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِیْنَ﴾ اور نہیں ہوگا ان کا کوئی مددگار۔ بے یار و مددگار رہوں گے۔ اس واسطے آج تمھیں وہاں کے واقعات و حالات بتا رہے ہیں تاکہ قیامت کے لیے تیاری کر لو۔

﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ﴾ ہرگز تم حاصل نہیں کر سکتے کامل نیکی ﴿حَتّٰى تُنْفِقُوْا﴾ یہاں تک کہ تم خرچ کرو ﴿مِمَّا تُحِبُّوْنَ﴾ اس چیز میں سے جس کو تم پسند کرتے ہو ﴿وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَیْءٍ﴾ اور جو چیز بھی تم خرچ کرو گے ﴿فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِیْمٌ﴾ پس بے شک اللہ تعالیٰ اس کو جانتا ہے ﴿كُلُّ الطَّعَامِ﴾ ہر قسم کی خوراک ﴿كَانَ حِلًّا﴾ حلال تھی ﴿لِّبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ﴾ بنی اسرائیل کے لیے ﴿اِلَّا مَا حَرَّمَ﴾ مگر وہ جو حرام قرار دی ﴿اِسْرَآءِیْلُ عَلٰى نَفْسِهٖ﴾ اسرائیل علیہ السلام نے اپنے نفس کے لیے ﴿مِنْ قَبْلِ اَنْ تُنَزَّلَ التَّوْرٰىةُ﴾ اس سے پہلے کہ توراۃ نازل کی جاتی ﴿قُلْ فَاْتُوْا بِالتَّوْرٰىةِ﴾ آپ کہہ دیجیے! پس لاؤ تم تورات ﴿فَاتْلُوْهَآ﴾ پس تم اس کو پڑھو ﴿اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ﴾ اگر تم سچے ہو ﴿فَمَنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ﴾ پس جس نے گھڑا اللہ تعالیٰ پر جھوٹ ﴿مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ﴾ اس کے بعد ﴿فَاُولٰٓىِٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ﴾ پس وہی لوگ ہیں ظالم ﴿قُلْ صَدَقَ اللّٰهُ﴾ آپ کہہ دیجیے! سچ فرمایا اللہ تعالیٰ نے ﴿فَاتَّبِعُوْا﴾ پس تم پیروی کرو ﴿مِلَّةَ اِبْرٰهِیْمَ﴾ ابراہیم علیہ السلام کی ملت کی ﴿حَنِیْفًا﴾ جو ایک طرف ہونے والے تھے ﴿وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ﴾ اور نہیں تھے وہ شرک کرنے والوں میں سے ﴿اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ﴾ بے شک پہلا گھر ﴿وُّضِعَ لِلنَّاسِ﴾ جو مقرر کیا گیا لوگوں کی عبادت کے لیے ﴿لَلَّذِیْ بِبَكَّةَ﴾ البتہ وہ ہے جو مکہ میں ہے ﴿مُبٰرَكًا﴾ برکت والا ﴿وَّهُدًى لِّلْعٰلَمِیْنَ﴾ اور ہدایت ہے جہان والوں کے لیے ﴿فِیْهِ اٰیٰتٌۢ بَیِّنٰتٌ﴾ اس میں کئی نشانیاں ہیں صاف صاف ﴿مَّقَامُ اِبْرٰهِیْمَ﴾ ایک ان میں سے مقامِ ابراہیم ہے ﴿وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا﴾ اور جو اس میں داخل ہوگا، ہوگا امن والا ﴿وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ﴾ اور اللہ تعالیٰ کے واسطے لوگوں پر لازم ہے ﴿حِجُّ الْبَیْتِ﴾ بیت اللہ کا حج ﴿مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَیْهِ سَبِیْلًا﴾ جو طاقت رکھتا ہے اس کی طرف راستے کی ﴿وَمَنْ كَفَرَ﴾ اور جس نے انکار کیا ﴿فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِیٌّ عَنِ الْعٰلَمِیْنَ﴾ پس بے شک اللہ تعالیٰ بے پروا ہے جہان والوں سے۔

اس سے پہلے ذکر تھا کہ اگر کافر سونے سے بھری ہوئی زمین بھی فدیے کے طور پر دیں تو قبول نہیں کی جائے گی۔ کیوں کہ ایمان کے بغیر کوئی نیکی قبول نہیں ہوتی۔ اور ایمان والے تھوڑی چیز بھی خرچ کریں تو قبول ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ سمجھاتے ہیں کہ چیز کیسی خرچ کرنی چاہیے۔

فرمایا ﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ﴾ ہرگز تم حاصل نہیں کر سکتے کامل نیکی ﴿حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ﴾ یہاں تک کہ تم خرچ کرو اس چیز میں سے جس کو تم پسند کرتے ہو۔ اللہ تعالیٰ کے راستے میں ردی اور بے کار چیز خرچ کرنے میں کوئی ثواب نہیں ہے۔ تیسرے پارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ﴿وَلَا تَیَمَّمُوا الْخَبِیْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِیْهِ﴾ [البقرۃ: ۲۶۷] "اور نہ ارادہ کرو ادنیٰ چیز کا کہ

اس سے خرچ کرو تم اور تم خود اس کو لینے کے لیے تیار نہیں ہو۔" یعنی جس چیز کو تم خود لینے کے لیے تیار نہیں ہو اس کو تم اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے کیوں خرچ کرتے ہو؟

حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کے پاس ایک بڑا قیمتی باغ تھا۔ جب یہ آیت سنی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آئے اور عرض کیا حضرت! اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تم کامل نیکی حاصل نہیں کر سکتے جب تک تم وہ چیز نہ خرچ کرو جو تمھیں محبوب ہے۔ حضرت! میرے پاس اور مال بھی ہے مگر یہ باغ جس کا نام بَیرحاء ہے مجھے سب سے زیادہ عزیز ہے۔ یہ باغ میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حوالے کرتا ہوں جہاں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا جی چاہے اس کو صرف کریں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا بَخٍ بَخٍ "واہ واہ! تو نے اچھا کیا ہے۔" پھر فرمایا تیری برادری میں جو غریب لوگ ہیں ان میں تقسیم کر۔ اس واسطے کہ اپنی برادری میں جو غریب ہوں وہ صدقہ خیرات کے زیادہ مستحق ہیں۔ قرآن پاک میں آتا ہے ﴿وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰی حَقَّهٗ﴾ [بنی اسرائیل: ۲۶] "قرابت داروں کو ان کا حق دے۔" تو ذوالقربیٰ کا بڑا حق ہے۔ مگر اس کے واسطے کچھ شرطیں ہیں۔ محض قرابت دار ہونا کافی نہیں ہے۔

❀...... پہلی شرط تو یہ ہے کہ وہ مسلمان ہو مشرک کافر نہ ہو۔ کیوں کہ زکوٰۃ، فطرانہ وغیرہ کافر مشرک کو نہیں دیے جا سکتے۔ یعنی زکوٰۃ، فطرانہ وغیرہ کافر، مشرک کو دینا جائز نہیں ہیں۔

❀...... دوسری شرط یہ ہے کہ وہ دین دار ہو۔ یعنی نماز روزے کا پابند ہو۔ بے دین کو زکوٰۃ، فطرانہ وغیرہ دینا درست نہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے منع فرمایا ہے۔ حدیث پاک میں آتا ہے: ((لَا يَأْكُلُ طَعَامَكَ إِلَّا تَقِيٌّ)) "تیرا کھانا صرف پرہیزگار کھائے۔" بے دین کھا کر قوت والا ہو کر رب تعالیٰ کی نافرمانی کرے گا تو بھی اس میں شریک ہوگا۔ تو اللہ تعالیٰ نے سبق دیا ہے کہ تم اس وقت تک کامل نیکی حاصل نہیں کر سکتے جب تک وہ چیز نہ خرچ کرو جو تمھیں عزیز اور پیاری ہو۔

﴿وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ﴾ اور جو چیز بھی تم خرچ کرو گے ﴿فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ﴾ پس بے شک اللہ تعالیٰ اس کو جانتا ہے۔ یعنی معاملہ تمھارا رب کے ساتھ ہے اور اس سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہے۔ دو رکوع پہلے یہ بیان ہوا تھا کہ ﴿اِنَّ اَوْلَى النَّاسِ بِاِبْرٰهِيْمَ لَلَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ وَهٰذَا النَّبِيُّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ "بے شک تمام لوگوں میں سے اعمال اور عقائد کے اعتبار سے ابراہیم علیہ السلام کے قریب وہ لوگ ہیں جنھوں نے ان کی پیروی کی اور یہ پیغمبر حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عقائد اور اعمال میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قریب ہیں اور وہ جو مومن ہیں۔"

یہودیوں نے جب یہ آیت سنی تو شوشہ چھوڑا کہ تم کہتے ہو کہ اس پیغمبر کو اور تمھیں ابراہیم علیہ السلام کا قرب حاصل ہے اور تمھارے اعمال وعقائد ابراہیم علیہ السلام والے ہیں۔ یہ تمھارا کہنا غلط ہے۔ اس واسطے کہ ابراہیم علیہ السلام تو اُونٹ کا گوشت نہیں کھاتے تھے اور نہ اُونٹنی کا دودھ پیتے تھے۔ اور تم اُونٹ کا گوشت بھی کھاتے ہو اور اُونٹنی کا دودھ بھی پیتے ہو اور اپنے آپ کو ابراہیمی بھی کہتے ہو۔ یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کی مخالفت بھی کرو اور ابراہیمی بھی بن جاؤ۔ تو یہودیوں کے اس شوشے کا اللہ تعالیٰ نے جواب دیا۔

﴿ كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلًّا لِّبَنِيٓ اِسْرَآءِيْلَ ﴾ ہر قسم کی خوراک حلال تھی بنی اسرائیل کے لیے ﴿ اِلَّا مَا حَرَّمَ اِسْرَآءِيْلُ عَلٰى نَفْسِهٖ ﴾ مگر وہ جو حرام قرار دی اسرائیل علیہ السلام نے اپنے نفس پر۔ یعنی تمھارا یہ کہنا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اُونٹ کا گوشت نہیں کھاتے تھے اور اُونٹنی کا دودھ نہیں پیتے تھے یہ بات بالکل غلط ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام تو بہت پہلے کے بزرگ ہیں یہ تمام چیزیں بنی اسرائیل کے لیے بھی حلال تھیں مگر حضرت یعقوب علیہ السلام نے جن کا لقب اسرائیل تھا انھوں نے صرف اپنی ذات کے واسطے اُونٹ کا گوشت اور اُونٹنی کا دودھ حرام قرار دیا تھا۔

تفسیروں میں اس طرح آتا ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کو عرق النساء کی تکلیف تھی۔ جس کو لنگڑی کا درد کہتے ہیں۔ عرق النساء کا معنیٰ ہے رینگڑ کا درد۔ یہ ایک پٹھا ہوتا ہے جو کولہے سے شروع ہو کر ران سے ہوتا ہوا انگوٹھے تک جاتا ہے۔ یہ بڑا ظالم درد ہوتا ہے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام نے منت مانی تھی کہ اگر اللہ تعالیٰ نے مجھے اس تکلیف سے شفا عطاء فرمائی تو میں اپنی خوراک میں سے مرغوب چیز کو چھوڑ دوں گا۔ اور ان کو اُونٹ کا گوشت اور اُونٹنی کا دودھ بڑا لذیذ لگتا تھا۔ چنانچہ جب اللہ تعالیٰ نے ان کو صحت عطاء فرمائی تو انھوں نے اُونٹ کا گوشت اور اُونٹنی کا دودھ اپنے اوپر حرام کر کے اپنی منت پوری کی۔ اور حضرت یعقوب علیہ السلام نے منت کے تحت یہ صرف اپنی ذات کے لیے کیا تھا۔ مگر ان کے دیکھا دیکھی ان کی اولاد نے بھی اُونٹ کا گوشت اور اُونٹنی کے دودھ کا استعمال کرنا چھوڑ دیا۔ حالانکہ یہ ان کے لیے بالکل جائز تھا۔

اور اس طرح کی منت ان کی شریعت میں جائز تھی اور ہماری شریعت میں اس چیز کی اجازت نہیں ہے کہ کوئی شخص منت مانے کہ میرا فلاں کام ہو گیا تو میرے اوپر فلاں چیز حرام ہے۔ ہاں! کوئی جائز کام ہو تو اس کی منت مان لے تو صحیح ہے۔ مثلاً: یوں کہے کہ میرا فلاں کام ہو جائے تو میں اتنے نفل پڑھوں گا یا اتنے روزے رکھوں گا یا فقیروں، مسکینوں کو اتنا کھانا کھلاؤں گا یا مسجد میں قالین بچھاؤں گا یا دری ڈالوں گا یا صف یا مصلیٰ رکھ دوں گا۔ یہ صحیح ہے۔

پھر حضرت یعقوب علیہ السلام کا اپنے اُوپر اُونٹ کا گوشت حرام کرنا اور دودھ کا حرام کرنا حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے بارہ تیرہ سو سال پہلے کی بات ہے۔ کیوں کہ نسب نامہ اس طرح ہے موسیٰ ابن عمران بن قاہث بن لاوی بن یعقوب بن اسحاق بن ابراہیم علیہم السلام۔ اور توراۃ نازل ہوئی ہے موسیٰ پر اور تورات کے ماننے والے یہودی کہلاتے ہیں۔

تو ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں یہ دعویٰ کہ وہ اُونٹ کا گوشت نہیں کھاتے تھے اور اُونٹنی کا دودھ نہیں پیتے تھے سراسر غلط ہے۔ اور حضرت یعقوب علیہ السلام نے بھی منت کی وجہ سے اپنی ذات کے لیے یہ حرام کی تھیں ﴿ مِنْ قَبْلِ اَنْ تُنَزَّلَ التَّوْرٰىةُ ﴾ اس سے پہلے کہ تورات نازل کی جاتی ﴿ قُلْ فَاْتُوْا بِالتَّوْرٰىةِ فَاتْلُوْهَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴾ آپ کہہ دیجیے! پس لاؤ تم تورات پس تم اس کو پڑھو اگر تم سچے ہو۔ دکھاؤ تورات میں کہاں لکھا ہوا ہے کہ اُونٹ حرام ہے یا اُونٹنی کا دودھ حرام ہے؟ قطعاً کوئی حکم نہیں ہے۔ یہ تم نے اپنی طرف سے بنایا ہوا ہے اور ذمے خدا کے لگاتے ہو۔ ﴿ فَمَنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ﴾ پس جس نے افتراء باندھا اللہ تعالیٰ پر جھوٹ کا ﴿ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ ﴾ حق واضح ہو جانے کے بعد ﴿ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴾ پس وہی لوگ ہیں ظالم۔ کیوں کہ

حلال حرام کرنے کا اختیار صرف اللہ تعالیٰ کو ہے۔مخلوق میں سے کسی کو حلال حرام کرنے کا اختیار نہیں ہے۔

دیکھیے! اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر کسی کو مقام حاصل نہیں ہے۔لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خانگی مصلحت کے پیشِ نظر صرف اپنی ذات کے لیے شہد حرام کیا تھا نہ اُمت کے لیے اور نہ اہلِ خانہ کے لیے۔لیکن چوں کہ حلال کرنا پیغمبر کا منصب نہیں ہے پیغمبر کا کام ہے کسی چیز کی حلت اور حرمت کو بیان کرنا۔تو رب تعالیٰ نے قرآن پاک میں مستقل سورۃ نازل فرمائی ﴿يَاَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ ۚ تَبْتَغِيْ مَرْضَاتَ اَزْوَاجِكَ﴾ [التحریم:۱-۲، پارہ:۲۸] "اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم! آپ کیوں حرام کرتے ہیں جو چیز اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے حلال کی ہے آپ اپنی عورتوں کی رضامندی چاہتے ہیں ﴿وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾ اور اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے ﴿قَدْ فَرَضَ اللّٰهُ لَكُمْ تَحِلَّةَ اَيْمَانِكُمْ﴾ تحقیق اللہ تعالیٰ نے فرض کیا ہے تمھارے لیے تمھاری قسموں کا کھول دینا۔" یعنی قسم توڑ دو اور کفارہ ادا کرو۔

چنانچہ احادیث اور تفسیر کی کتابوں میں آتا ہے کہ ان آیات کے نازل ہونے کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے شہد استعمال کیا اور قسم کے کفارے میں غلام آزاد کیا۔اور قسم کا کفارہ ہے دس مسکینوں کو دو وقت کا کھانا کھلانا یا دس مسکینوں کو کپڑے پہنانا یا غلام آزاد کرنا۔چاہے مرد ہو یا لونڈی۔ان تینوں چیزوں میں اختیار ہے جس پر بھی عمل کرو کفارہ ادا ہو جائے گا۔کفارے کی تین صورتیں بیان کرنے کے بعد فرمایا ﴿فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ﴾ پس جو شخص ان تینوں صورتوں میں سے کوئی بھی نہ کر پائے۔یعنی نہ تو وہ کھانا کھلانے کی استطاعت رکھتا ہے اور نہ کپڑا پہنانے کی اور نہ غلام آزاد کرنے کی ﴿فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ﴾ [المائدہ:۸۹] تو تین دن کے روزے رکھے۔اور حضرت عبداللہ ابن عباس اور حضرت اُبی ابن کعب اور عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہم کی روایت میں آتا ہے ((فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ مُتَتَابِعَاتٍ)) یعنی یہ تین روزے مسلسل رکھنے ہیں۔ان کے درمیان وقفہ نہ آئے۔اور یہ روزوں والا کفارہ ہر آدمی کے لیے نہیں ہے بلکہ اس شخص کے لیے ہے جو دس آدمیوں کو کھانا نہیں کھلا سکتا یا دس مسکینوں کو کپڑے نہیں پہنا سکتا یا غلام آزاد نہیں کر سکتا۔

اور یہ بھی فقہائے کرام رحمہم اللہ علیہم فرماتے ہیں کہ اگر کسی شخص نے کفارے کے دو روزے رکھے ہیں ابھی تیسرا روزہ باقی ہے کہ اس کے پاس اتنا مال آگیا ہے مثلاً: کسی نے ہدیہ کر دیا یا کہیں سے انعام کے طور پر مل گئے یا وراثت کے طور پر مل گئے کہ جس سے دس مسکینوں کو کھانا کھلا سکتا ہے یا کپڑا پہنا سکتا ہے یا ایک غلام آزاد کر سکتا ہے تو روزوں سے کفارہ ادا نہیں ہوگا۔کیوں کہ اب یہ مسکینوں کو کھانا کھلانے پر قادر ہو گیا ہے۔بلکہ پہلی تین صورتوں میں سے کوئی ایک پوری کرنا پڑے گی اور جو دو روزے رکھے ہیں وہ نفلی بن جائیں گے اور نفلی روزوں کا ثواب ملے گا۔ہاں اگر تیسرا روزہ بھی رکھ لیا پھر پیسے مل گئے تو اب کفارہ ادا ہو گیا ہے۔

﴿قُلْ صَدَقَ اللّٰهُ﴾ آپ کہہ دیجیے! سچ فرمایا اللہ تعالیٰ نے کہ تورات میں اُونٹ کے گوشت کی حرمت اور اُونٹنی کے دودھ کی حرمت کا کوئی حکم نہیں ہے۔اور ملتِ ابراہیمی کے اصول بھی واضح کر دیے ہیں اور حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی دعوت دینے والے ہیں ﴿فَاتَّبِعُوْا مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا﴾ پس تم پیروی کرو ابراہیم علیہ السلام کی ملت کی جو ایک طرف ہونے والے تھے،

موحد تھے ﴿وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ﴾ اور نہیں تھے وہ شرک کرنے والوں میں سے۔

مکہ کا مطلب و مفہوم

﴿اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ﴾ بے شک پہلا گھر جو مقرر کیا گیا لوگوں کی عبادت کے لیے ﴿لَلَّذِيْ بِبَكَّةَ﴾ البتہ وہ ہے جو مکہ میں ہے۔ مکہ کو مکہ بھی کہتے ہیں اور بکہ بھی کہتے ہیں۔ مکہ کا معنیٰ ہے ناف۔ یہ مکہ مکرمہ ساری دنیا کی ناف ہے۔ یہاں سے رب تعالیٰ نے زمین کو مشرق، مغرب اور شمال جنوب کی طرف پھیلایا اور اس وجہ سے بھی ناف ہے کہ جس طرح بچہ جب تک ماں کے پیٹ میں ہوتا ہے اس کو خوراک ناف والی رگ کے ذریعہ ملتی ہے۔ اسی طرح سارے جہان کو روحانی خوراک مکہ سے ملتی ہے۔ اور بکہ کا معنیٰ ہے گردن توڑنے والا اور گردن توڑنے کا معنیٰ بھی کرتے ہیں کہ جو بھی مسلمان ہے چاہے امیر ہے یا غریب ہے، بادشاہ ہے یا رعایا ہے، نماز میں سب کی گردنیں اس کی طرف جھکتی ہیں۔ یعنی مسجود الیہ ہے اور جھکتی رب تعالیٰ کے لیے ہیں۔ تو رب تعالیٰ مسجود لہٗ ہے۔ سجدہ بکہ کی طرف کرنا ہے اور کرنا رب تعالیٰ کو ہے۔

اور گردن توڑنے کا یہ معنیٰ بھی ہے کہ جن لوگوں نے کعبۃ اللہ کی توہین کا ارادہ کیا اللہ تعالیٰ نے ان کی گردنیں توڑ کر رکھ دیں۔ ابرہہ ساٹھ ہزار کا لشکر لے کر آیا تھا کعبۃ اللہ کو گرانے کے لیے۔ اللہ تعالیٰ نے ابابیل بھیجے۔ ان چھوٹے چھوٹے پرندوں نے تین تین کنکر مسور کے دانے کے برابر اُٹھائے ہوئے تھے۔ ایک دائیں پنجے میں اور ایک بائیں پنجے میں اور ایک چونچ میں۔ جب وہ کنکر اُوپر سے پھینکتے تھے تو آدمی کے سر پر لگتا اور آدمی کو چیرتا ہوا ہاتھی کو چیر کر چلا جاتا تھا اور دونوں تڑپ کر مر جاتے تھے۔ اور جو بچ گئے وہ راستے میں تڑپ تڑپ کر مر گئے۔ واپس ایک بھی نہیں گیا۔ یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت تھی ورنہ عادتاً مسور کے دانے کے برابر کنکر سے آدمی نہیں مرتا۔

سب سے پہلے آدم علیہ السلام نے فرشتوں کی معاونت سے بیت اللہ کی تعمیر کی۔ اس کے چالیس سال بعد آپ علیہ السلام نے شام کا سفر کیا تو وہاں بیت المقدس تعمیر کیا۔ اس طرح بیت اللہ اور بیت المقدس کی تعمیر میں چالیس سال کا وقفہ ہے۔ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دریافت کیا حضرت! زمین پر سب سے پہلے عبادت کے لیے کون سا گھر بنایا گیا؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا مسجد حرام جس میں بیت اللہ شریف واقع ہے۔ پھر حضرت ابوزر غفاری رضی اللہ عنہ نے سوال کیا کہ دوسرے نمبر پر کون سی مسجد تعمیر ہوئی؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا مسجدِ اقصیٰ جو بیت المقدس میں ہے۔ پھر عرض کیا ان دونوں کے درمیان کتنا وقفہ ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا چالیس سال۔

پھر دونوں قبلے طوفانِ نوح کی وجہ سے شہید ہو گئے تھے۔ پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے بیٹے اسماعیل علیہ السلام سے مل کر یکم ذوالقعدہ سے بیت اللہ کی تعمیر شروع کی اور پچاس دنوں میں باپ بیٹے نے تعمیر مکمل کر لی۔ کعبۃ اللہ کی پیمائش چوالیس [۴۴] مربع فٹ ہے۔ یعنی چاروں طرف سے چوالیس، چوالیس فٹ ہے اور پچاس فٹ بلندی ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت

اسماعیل علیہ السلام کی تعمیر کے چالیس سال بعد حضرت یعقوب علیہ السلام نے مسجد اقصیٰ کی تعمیر کی۔ حضرت یعقوب علیہ السلام نے چھوٹا سا کمرہ بنایا تھا۔ پھر حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانے میں جب لوگ زیادہ ہو گئے تو انھوں نے اس میں توسیع کی۔ اس کے بعد جب حضرت سلیمان علیہ السلام کا زمانہ آیا تو انھوں نے بڑی شاہی ٹھاٹھ باٹھ کے ساتھ مسجد اقصیٰ کو تعمیر کیا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں بیت المقدس فتح ہوا اور ہمارے پاس رہا۔ ۱۹۶۷ء میں یہود نے ہم سے چھین لیا اور ابھی تک یہود کے قبضے میں ہے اور بے غیرت مسلمان سوئے ہوئے ہیں اور امریکہ سے قرضے معاف کراتے پھرتے ہیں۔ اور اس گناہ میں شام، مصر اور دوسرے سب شامل ہیں۔

تو دنیا میں سب سے پہلا گھر جو عبادت کے لیے تعمیر کیا گیا وہ بیت اللہ شریف ہے ﴿مُبٰرَكًا﴾ برکت والا ہے ﴿وَّ هُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ﴾ اور ہدایت ہے جہان والوں کے لیے ﴿فِيْهِ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ﴾ اس میں اور بھی کئی نشانیاں ہیں صاف صاف ﴿مَّقَامُ اِبْرٰهِيْمَ﴾ ایک ان میں سے مقام ابراہیم ہے۔ مقام ابراہیم اس پتھر کا نام ہے جس پر کھڑے ہو کر ابراہیم نے بیت اللہ شریف تعمیر کیا تھا۔ اس پتھر میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاؤں کے نشان ہیں۔ پہلے یہ پتھر نیچے صف میں جڑا ہوا تھا اور کعبۃ اللہ کے قریب تھا۔ پھر جب لوگ زیادہ ہو گئے تو سعودی حکومت نے ایک شیشے کے مینار نما ڈبے میں بند کر کے کعبۃ اللہ سے تھوڑے سے فاصلے پر رکھ دیا تاکہ طواف کرنے والوں کو تکلیف نہ ہو۔ طواف کے سات چکر پورے کرنے کے بعد وہاں دو رکعات نفل پڑھنے ہوتے ہیں۔

﴿وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا﴾ اور جو اس مسجد حرام میں داخل ہوگا، امن والا ہو گیا ﴿وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ﴾ اور اللہ تعالیٰ کے واسطے لوگوں پر لازم ہے بیت اللہ کا حج۔ حَجَّ يَحُجُّ ، نصر کا باب ہے اور اس کا مصدر حَجٌّ بالفتح بھی آتا ہے اور حِجٌّ بالکسر بھی آتا ہے اور دونوں قرآن پاک میں موجود ہیں۔ اور حج کس پر فرض ہے؟ تو فرمایا ﴿مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا﴾ جو طاقت رکھتا ہے اس کی طرف راستے کی۔

مسئلہ ❀ ایسا شخص کہ جس کی گھر کی ضروریات پوری ہیں اور اس پر قرض بھی نہیں ہے اور ہے بھی تندرست کہ نابینا بھی نہیں ہے، لنگڑا لولا بھی نہیں ہے، راستہ بھی پُر امن ہے اور اس کے پاس اتنی رقم بھی ہے کہ آ جا سکتا ہے۔ اور جتنے دن اس مقدس سفر پر رہنا ہے اتنے عرصہ کے لیے گھر کے اخراجات بھی موجود ہیں تو ایسے شخص پر حج فرض ہے۔ اگر وہ حج نہیں کرتا تو حدیث پاک میں آتا ہے: ((فَلْيَمُتْ اِنْ شَاءَ يَهُوْدِيًّا اَوْ نَصْرَانِيًّا)) پس وہ چاہے یہودی ہو کر مر جائے یا عیسائی ہو کے (ہمیں اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے)۔ باقی لوگ بڑے بہانے بناتے ہیں جن کی شرعی طور پر کوئی حیثیت نہیں ہے۔ مثلاً: کہیں گے کہ لڑکے لڑکی کی شادی کرنی ہے۔ جن کی ابھی تک نہ تو منگنی ہوئی ہے اور نہ یہ معلوم ہے کہ منگنی کب کرنی ہے اور کہاں کرنی ہے؟ البتہ اگر کوئی بچے بچی کی شادی طے کر لیتا ہے اور رقم ضروریات پر خرچ ہو گئی ہے اور اب اس کے پاس اتنی رقم نہیں ہے کہ جس سے حج کر سکے تو معافی ہے۔ یا نقصان ہو گیا ہے اور رقم باقی نہیں رہی تو بھی معافی ہے۔ اور اگر حیثیت تو ہے مگر کمزور ہے یا مرض الموت میں مبتلا

ہے کہ حج نہیں کر سکتا تو وہ وصیت کرے کہ میرے ذمہ حج ہے وہ تم میری طرف سے ادا کر دینا۔ اور اگر خود بھی نہیں کرتا اور وصیت بھی نہیں کرتا تو گناہ گار ہے۔

﴿وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ﴾ اور جس نے انکار کیا پس بے شک اللہ تعالیٰ بے پرواہ ہے جہان والوں سے۔ ساری مخلوق اس کی محتاج ہے وہ کسی کا محتاج نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ سمجھ عطاء فرمائے۔ [اٰمین یارب العالمین!]۔

﴿قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ﴾ کہہ دے اے کتاب والو! ﴿لِمَ تَكْفُرُوْنَ﴾ کیوں تم انکار کرتے ہو ﴿بِاٰيٰتِ اللّٰهِ﴾ اللہ تعالیٰ کی آیات کا ﴿وَاللّٰهُ شَهِيْدٌ عَلٰى مَا تَعْمَلُوْنَ﴾ اور اللہ تعالیٰ گواہ ہے اس کارروائی پر جو تم کرتے ہو ﴿قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ﴾ کہہ دے اے کتاب والو! ﴿لِمَ تَصُدُّوْنَ﴾ کیوں تم روکتے ہو؟ ﴿عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ اللہ تعالیٰ کے راستے سے ﴿مَنْ اٰمَنَ﴾ ان کو جو ایمان لائے ﴿تَبْغُوْنَهَا عِوَجًا﴾ تلاش کرتے ہو تم اللہ تعالیٰ کے راستے میں کجی ﴿وَّاَنْتُمْ شُهَدَآءُ﴾ اور حالاں کہ تم گواہ ہو ﴿وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ﴾ اور نہیں ہے اللہ تعالیٰ غافل ﴿عَمَّا تَعْمَلُوْنَ﴾ اس کارروائی سے جو تم کرتے ہو ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا﴾ اے ایمان والو! ﴿اِنْ تُطِيْعُوْا﴾ اگر تم اطاعت کرو ﴿فَرِيْقًا مِّنَ الَّذِيْنَ﴾ ایک گروہ کی ان لوگوں میں سے ﴿اُوْتُوا الْكِتٰبَ﴾ جن کو کتاب دی گئی ﴿يَرُدُّوْكُمْ﴾ وہ تمھیں لوٹا دیں گے ﴿بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ كٰفِرِيْنَ﴾ تمھارے ایمان کے بعد کفر کی طرف ﴿وَكَيْفَ تَكْفُرُوْنَ﴾ اور تم کیسے انکار کرتے ہو؟ ﴿وَاَنْتُمْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ﴾ اور حالاں کہ تم پر تلاوت کی جاتی ہیں ﴿اٰيٰتُ اللّٰهِ﴾ اللہ تعالیٰ کی آیتیں ﴿وَفِيْكُمْ رَسُوْلُهٗ﴾ اور تمھارے درمیان اللہ تعالیٰ کے رسول بہ نفسِ نفیس موجود ہیں ﴿وَمَنْ يَّعْتَصِمْ بِاللّٰهِ﴾ اور جس نے مضبوطی کے ساتھ پکڑا اللہ تعالیٰ کے دین کو ﴿فَقَدْ هُدِيَ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ﴾ پس تحقیق اس کو ہدایت دی گئی صراطِ مستقیم کی ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا﴾ اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو ﴿اتَّقُوا اللّٰهَ﴾ ڈرو اللہ تعالیٰ سے ﴿حَقَّ تُقٰتِهٖ﴾ جیسے حق ہے اس سے ڈرنے کا ﴿وَلَا تَمُوْتُنَّ﴾ اور ہرگز نہ مرو تم ﴿اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ﴾ مگر اس حال میں کہ تم مسلمان ہو ﴿وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ﴾ اور مضبوطی کے ساتھ پکڑو اللہ تعالیٰ کی رسی کو ﴿جَمِيْعًا﴾ سارے ﴿وَّلَا تَفَرَّقُوْا﴾ اور نہ تفرقہ ڈالو ﴿وَاذْكُرُوْا﴾ اور یاد کرو ﴿نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ﴾ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو جو تم پر ہوئیں ﴿اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً﴾ جب تھے تم ایک دوسرے کے دشمن ﴿فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ﴾ پس اُس نے الفت ومحبت ڈالی تمھارے دلوں میں ﴿فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖۤ﴾ پس تم ہو گئے اللہ تعالیٰ کے فضل اور نعمت سے ﴿اِخْوَانًا﴾ بھائی، بھائی

﴿وَ كُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ﴾ اور تھے تم گڑھے کے کنارے ﴿مِّنَ النَّارِ﴾ آگ کے ﴿فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا﴾ پس اللہ تعالیٰ نے تمھیں اس سے بچایا ﴿كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ﴾ اسی طرح بیان کرتا ہے اللہ تعالیٰ تمھارے لیے ﴿اٰيٰتِهٖ﴾ اپنی آیتیں ﴿لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ﴾ تا کہ تم ہدایت پا جاؤ۔

یہود کی شرارت اور مسلمانوں کو تنبیہ

اس سے پہلے ملتِ ابراہیمی کے مرکزی قبلہ کا ذکر تھا اور یہ بھی بیان ہو چکا ہے کہ حضرت محمد رسول اللہ ﷺ اور ان کے ساتھی اصل ملتِ ابراہیمی پر قائم ہیں۔ اب اللہ تعالیٰ اہل کتاب کو تنبیہ فرماتے ہیں کہ جب یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ آخری پیغمبر اور اس کے اصحاب ہی ملتِ ابراہیمی کی پیروی کرنے والے ہیں اور تمھارے ادیان خود ساختہ ہیں تو تمھیں اس حقیقت کو تسلیم کر لینا چاہیے اور انکار نہیں کرنا چاہیے۔

فرمایا ﴿قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ﴾ اے نبی کریم ﷺ! آپ ان سے کہہ دیں اے کتاب والو! ﴿لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ﴾ کیوں تم انکار کرتے ہو اللہ تعالیٰ کی آیات کا ﴿وَاللّٰهُ شَهِيْدٌ عَلٰى مَا تَعْمَلُوْنَ﴾ اور اللہ تعالیٰ گواہ ہے اس کارروائی پر جو تم کرتے ہو۔ یعنی بجائے حق کو تسلیم کرنے کے اُلٹا ایمان والوں میں افتراق پیدا کرتے ہو۔ جس کا ذکر آگے آرہا ہے کہ یہودیوں نے مسلمانوں کو آپس میں لڑانے کی کس طرح ناکام کوشش کی۔ اس واقعہ سے پہلے بطورِ تمہید ایک بات سمجھنی ضروری ہے۔

مدینہ طیبہ میں یہودیوں کے تین خاندان آباد تھے۔ بنو قینقاع، بنو نظیر اور بنو قریظہ۔ ان کی آپس میں تھوڑی بہت چپقلش بھی ہوتی رہتی تھی مگر یہودیت کے ناطے سے ایک تھے۔ کافی رقبے یعنی زمین کے مالک تھے اور انھوں نے بڑے بڑے قلعے بنائے ہوئے تھے۔ پڑھے لکھے لوگ تھے۔ سکول کالج بھی ان کے تھے اور تجارت پر بھی انہی کا قبضہ تھا۔ یہود کے علاوہ مدینہ طیبہ میں دو خاندان مشرکوں کے تھے، اُوس اور خزرج۔ باوجود ایک جگہ رہنے کے اور آمنے سامنے گھر ہونے کے ایک دوسرے کے سخت دشمن تھے اور بات بات پر لڑتے تھے۔ ان میں ایک لڑائی تریسٹھ [۶۳] سال رہی، ایک لڑائی ترانوے [۹۳] سال اور ایک لڑائی ایک سو بیس [۱۲۰] سال رہی۔ اور اُوس اور خزرج کے لوگ یہودیوں سے اس قدر دبے ہوئے تھے' اپنے بچے، بچی کا رشتہ ان کی مرضی کے بغیر نہیں کر سکتے تھے۔ یہودی دور سے آتا ہوا نظر آتا تو جھک کر اس کو سلوٹ کرتے۔

آنحضرت ﷺ جب ہجرت فرما کر مدینہ طیبہ تشریف لے آئے تو اوس اور خزرج کے لوگ کثرت کے ساتھ مسلمان ہونا شروع ہو گئے۔ مرد بھی، عورتیں بھی، بچے بھی، بوڑھے بھی۔ اور مخلص مسلمان ہماری طرح نام کے مسلمان نہیں۔ بلکہ آنحضرت ﷺ کی برکت سے اور قرآن کریم کی حقانیت کی برکت سے صحیح معنیٰ میں مخلص مسلمان تھے۔

تھوڑے دنوں میں بڑا انقلاب برپا ہو گیا کہ جو لوگ ایک دوسرے کو گوارہ نہیں کرتے تھے اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے آنحضرت ﷺ کی برکت سے اکٹھے اُٹھتے بیٹھتے تھے، کھاتے پیتے تھے، ایک ہی جگہ نماز پڑھتے تھے۔ اور کبھی ایک امام ہے

اور دوسرا مقتدی ہے۔ یہود نے جب یہ دیکھا تو ان کو گوارہ نہ ہوا کہ یہ لوگ جو ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے آج ایک دوسرے پر جانیں قربان کرتے ہیں۔ کل تک یہ ہماری مرضی کے بغیر رشتہ نہیں کر سکتے تھے اور آج ہمیں سلام کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

اور مسئلہ یہ ہے کہ کافروں کو سلام کرنے میں پہل نہیں کرنی اور اگر ابتداء کرو تو ان الفاظ کے ساتھ ﴿اَلسَّلٰمُ عَلٰی مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰی﴾ [طٰہٰ:۴۷] "سلامتی اس پر ہو جو ہدایت کی اتباع کرے۔" اور وہ سلام میں پہل کریں تو جواب میں بھی یہی الفاظ کہنے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ "السلام علیکم، وعلیکم السلام" کے الفاظ کے ساتھ ان کو خطاب نہیں کرنا۔ تو اس سے ان کو بڑی تکلیف ہوئی کہ یہ لوگ روز بہ روز ہم سے باغی ہو رہے ہیں۔ حالاں کہ یہاں ہمارا اقتدار تھا اور ان پر ہمارا حکم چلتا تھا۔ اور آج حالت یہ ہے کہ ہمیں پوچھتا ہی کوئی نہیں ہے۔

چنانچہ ایک مجلس میں اوس اور خزرج کے وہ لوگ جو مسلمان ہو چکے تھے خاصی تعداد میں بیٹھے تھے اور خوش گپیوں میں مشغول تھے کہ شاس بن قیس یہودی نے جو تعلیم یافتہ ہونے کے ساتھ ساتھ بڑا خبیث تھا، دیکھا تو جل گیا کہ یہ لوگ تو ایک دوسرے کے سائے سے بھاگتے تھے اور آج اکٹھے بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف ہیں۔ اس نے جا کر ایک دوسرے یہودی کو تیار کیا اس کو کچھ اشعار بتائے اور کہا کہ تو بھی جا کے ان کی مجلس میں بیٹھ جا اور کچھ دیر ٹھہر کر یہ اشعار پڑھ دینا۔ چنانچہ وہ یہودی مجلس میں آکر بیٹھ گیا اور ان کے ساتھ باتوں میں مشغول ہو گیا اور وہ وہ اشعار پڑھ دیے جن میں ان زیادتیوں کا ذکر تھا جو اوس اور خزرج کے بڑوں نے کفر کے زمانے میں ایک دوسرے پر کی تھیں۔ آخر عصبیت اور قومی چیزیں بھی ہوتی ہیں۔ ایک قبیلے والوں نے دوسروں سے کہا کہ تمھارے بڑوں نے ہمارے بڑوں پر بہت ظلم کیا تھا۔ انھوں نے کہا ہاں! کیا تھا۔ بات بڑھی اور آپس میں گتھم گتھا ہو گئے۔ لاٹھیاں چلیں، مکے چلے اور چادروں کے مٹھے بنا کر ایک دوسرے کو مارنے لگے اور آپس میں طے ہوا کہ فلاں دن، فلاں جگہ پر ہماری تمھاری لڑائی ہو گی۔ دیکھ لیں گے تمھارے بڑوں نے ہمارے بڑوں پر کس طرح زیادتی کی تھی۔ تو اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے پہلے یہودیوں کی زجر و توبیخ کی اور ڈانٹا۔ پھر مسلمانوں کو تنبیہ فرمائی۔

﴿قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ﴾ کہہ دے اے کتاب والو! ﴿لِمَ تَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ کیوں تم روکتے ہو اللہ تعالیٰ کے راستے سے؟ ﴿مَنْ اٰمَنَ﴾ ان کو جو ایمان لائے کہ جو لوگ ایمان کی دولت سے مالا مال ہو چکے ہیں تم چاہتے ہو کہ وہ ایمان سے پھر جائیں اور ان میں افتراق پیدا کرنے کے لیے منصوبے بناتے ہو اور اپنی خواہش کی تکمیل کے لیے ﴿تَبْغُوْنَهَا عِوَجًا﴾ تلاش کرتے ہو تم اللہ تعالیٰ کے راستے میں کجی۔ حالاں کہ اللہ تعالیٰ کا راستہ سیدھا ہے ﴿وَّاَنْتُمْ شُهَدَآءُ﴾ اور حالانکہ تم گواہ ہو۔ یعنی تم جانتے ہو کہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے سچے اور آخری پیغمبر ہیں۔ کیوں کہ ان کی کتابوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف بیان کیے گئے تھے کہ ان اوصاف والا پیغمبر تشریف لائے گا۔

قرآن پاک میں ہے ﴿الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ﴾ [الاعراف:۱۵۷] "جن کو پاتے ہیں یہ

لکھا ہوا اپنے پاس تورات اور انجیل میں۔" چنانچہ جب آپس میں گفتگو کرتے تھے تو کہتے تھے کہ ایک پیغمبر نے آنا ہے۔ اگر ہمارے دور میں آ گئے تو ہم ان پر ایمان لائیں گے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے کسی سے لڑتے تھے تو فتح کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے وسیلے سے دعائیں کرتے تھے کہ اے اللہ جل جلالہٗ! نبی آخر الزمان کے وسیلے سے ہمیں فتح عطاء فرما۔ ﴿وَ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚ فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ﴾ [البقرہ:۸۹] "اور تھے اس سے پہلے فتح کے لیے توسل حاصل کرتے ان لوگوں کے خلاف جو کافر ہیں پس جس وقت آئی ان کے پاس وہ ذات جس کو انھوں نے پہچان لیا اس کا انکار کر گئے۔ تو ان کا یہ انکار کرنا محض ضد کی بنا پر تھا۔"

﴿وَ مَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ﴾ اور نہیں ہے اللہ تعالیٰ غافل اس کارروائی سے جو تم کرتے ہو۔ ان دو آیتوں میں یہود کو تنبیہ تھی کہ یہ تمھاری حرکتیں پسندیدہ نہیں ہیں۔ آگے مومنوں کو تنبیہ ہے۔ ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا﴾ اے ایمان والو! ﴿اِنْ تُطِيْعُوْا فَرِيْقًا مِّنَ الَّذِيْنَ﴾ اگر تم اطاعت کرو ایک گروہ کی ان لوگوں میں سے ﴿اُوْتُوا الْكِتٰبَ﴾ جن کو کتاب دی گئی ﴿يَرُدُّوْكُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ كٰفِرِيْنَ﴾ وہ تمھیں لوٹا دیں گے تمھارے ایمان کے بعد کفر کی طرف۔ یعنی تم نے اگر ان کی بات مانی تو وہ تمھیں کافر بنائیں گے۔ اور اے مسلمانو! ﴿وَ كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ﴾ اور تم کیسے انکار کرتے ہو؟ کفر کرتے ہو؟ ﴿وَ اَنْتُمْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ اٰيٰتُ اللّٰهِ﴾ اور حالانکہ تم پر تلاوت کی جاتی ہیں اللہ تعالیٰ کی آیتیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مسجد نبوی میں بھی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو قرآن شریف پڑھ کر سناتے تھے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم چونکہ عربی تھے اور ان کی مادری زبان عربی تو ترجمہ پڑھانے کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ ہاں! اگر کوئی بات سمجھ نہیں آتی تھی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھ لیتے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو تفصیل کے ساتھ سمجھا دیتے تھے۔

اور یاد رکھنا! قرآن کریم ایسی معجز اور فصیح کتاب ہے کہ اگر کوئی شخص اس کو انصاف کے ساتھ پڑھے اور سمجھے گا تو یقیناً اس کے دل پر اثر ہوگا۔ لیکن آج ہمارے دل زنگ آلود ہیں اور تعصب کے غلاف چڑھے ہوئے ہیں۔ ہمارے دل کا شیشہ صاف نہیں ہے جس کی وجہ سے ہمیں قرآن کی بات سمجھ نہیں آتی، اور ہمیں قرآن سے کوئی محبت اور الفت نہیں ہے جو محرومی کا باعث ہے۔ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دل صاف تھے قرآن کریم کے ساتھ ان کو محبت تھی، سمجھنے کا شوق تھا اس واسطے وہ ہدایت یافتہ اور کامیاب ہو گئے۔

اور فرمایا ﴿وَ فِيْكُمْ رَسُوْلُهٗ﴾ اور تمھارے درمیان اللہ تعالیٰ کے رسول بنفسِ نفیس موجود ہیں مدینہ طیبہ میں۔ کیوں کہ یہ واقعہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ہوا ہے۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم حاضر و ناظر ہیں۔ بلکہ جس وقت یہ واقعہ ہوا تھا اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ طیبہ میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے درمیان موجود تھے۔ اور اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو سمجھایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی آیتیں تم پر پڑھی جاتی ہیں اور اللہ تعالیٰ کا پیغمبر بہ نفسِ نفیس تمھارے درمیان موجود ہے جن کے وسیلے سے اللہ تعالیٰ نے تمھیں ایمان کی توفیق عطاء فرمائی ہے اور تم بھائی بھائی بن گئے۔ حالاں کہ پہلے تم ایک دوسرے کے دشمن تھے، خون کے

پیاسے تھے۔ آج تمھیں کیا ہوگیا ہے کہ ایک یہودی کے اُکسانے پر تم نے پرانی دشمنی تازہ کر لی ہے۔ ان کی بات مت مانو اللہ تعالیٰ کی رسی کو مضبوطی کے ساتھ پکڑو۔

﴿وَمَنْ يَّعْتَصِمْ بِاللّٰهِ﴾ اور جس نے مضبوطی کے ساتھ پکڑا اللہ تعالیٰ کے دین کو ﴿فَقَدْ هُدِيَ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ﴾ پس تحقیق اس کو ہدایت دی گئی صراطِ مستقیم کی ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا﴾ اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو ﴿اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ﴾ ڈرو اللہ تعالیٰ سے جیسے حق ہے اس سے ڈرنے کا۔ اس سے درنے کا حق یہ ہے کہ اس کے امر اور نہی پر صحیح معنیٰ میں عمل کرو۔ ایسا نہیں کہ زبان سے تو کہے کہ میں اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہوں اور عملی طور پر ساری بدمعاشیاں کرتا پھرے۔ یہ تو ڈرنا نہ ہوا۔

ترمذی شریف میں روایت آتی ہے کہ خاصا مجمع تھا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو بات سمجھانے کی خاطر سید القراء حضرت ابی ابن کعب رضی اللہ عنہ سے دریافت فرمایا کہ تقویٰ کسے کہتے ہیں؟ یعنی تقوے کا مفہوم سمجھا سکتے ہو؟ حضرت اُبی ابن کعب رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہاں سمجھا سکتا ہوں۔ (عربوں کے کرتے اس وقت بھی لمبے ہوتے تھے اور آج بھی وہی دستور ہے)۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے تین قسم کے کُرتے ثابت ہیں۔

① گھٹنوں سے تھوڑا سا نیچے۔ جس طرح عموماً ہمارے کُرتے ہوتے ہیں۔

② نصف پنڈلی تک۔

③ ٹخنے سے تھوڑا سا اُوپر، دو تین انچ۔

اس کے علاوہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کوئی کرتا ثابت نہیں ہے۔ تو اگر کوئی شخص ٹخنوں سے نیچے لے جائے تو یہ جائز نہیں ہے۔ بلکہ یہ بڑے گناہوں میں سے ایک گناہ ہے۔ چنانچہ بخاری شریف اور مسلم شریف میں روایت آتی ہے کہ ((سُبُلُ الْاِزَارِ فِي النَّارِ)) کہ مردوں کا ٹخنوں سے نیچے کپڑا لٹکانا سیدھا دوزخ میں جانا ہے۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ دونوں صورتوں میں حرام ہے۔ چاہے تکبر کی نیت کرے یا نہ کرے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ٹخنوں سے نیچے کپڑا لٹکانا ہے ہی تکبر۔

یہ تو درمیان میں ضمنی بات آگئی تھی۔ تو حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ تقویٰ کا معنیٰ سمجھا سکتا ہوں۔ فرمایا اگر آپ ایسے راستے سے گزریں کہ جہاں خاردار جھاڑیاں ہوں تو کس طرح گزریں گے؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اپنے کپڑوں کو اچھی طرح سمیٹ کر اور پوری احتیاط کے ساتھ گزروں گا تا کہ کوئی کانٹا میرے کپڑوں کے ساتھ نہ اُڑ جائے۔ فرمایا یہی تقویٰ ہے۔ [ابن کثیر]

اسی طرح آدمی زندگی اس طرح گزارے کہ گناہوں کے کانٹے کے ساتھ نہ اُڑے۔

فرمایا ﴿وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ﴾ اور ہرگز نہ مرو تم مگر اس حال میں کہ تم مسلمان ہو۔ یعنی اسلامی احکامات کی فکر میں لگے رہو اور کوشش کرو اسلام پر رہنے کی اور اسلام کے کام کرو۔ نمازیں پڑھو، روزے رکھو، نیکی کے کام کرو، برائی سے بچو۔

کوشش کرو گے تو اللہ تعالیٰ ضرور نتیجہ مرتب فرمائیں گے اور ان نیکیوں کی برکت سے خاتمہ بالخیر ہوگا اور اللہ تعالیٰ اسلام پر موت دے گا۔ اور اگر گناہ کی طرف جاؤ گے تو خاتمہ بالشر کا خطرہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو خاتمہ بالشر سے بچائے۔ اور تمام مسلمانوں کا خاتمہ ایمان اور اسلام پر ہو۔

﴿وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِیْعًا﴾ اور مضبوطی کے ساتھ پکڑو اللہ تعالیٰ کی رسی کو سارے۔ رسی سے مراد اسلام، دین اور شریعت ہے اس کو مضبوطی کے ساتھ پکڑو ﴿وَّلَا تَفَرَّقُوْا﴾ اور نہ تفرقہ ڈالو۔ جن چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے حرام فرمایا ہے ان کو حرام سمجھو اور جن کو حلال فرمایا ہے ان کو حلال سمجھو۔ اور جن کاموں کے کرنے کا حکم دیا ہے وہ کرو اور جن چیزوں سے منع فرمایا ہے ان کے قریب نہ جاؤ۔

اور اے اوس اور خزرج کے لوگو! ﴿وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ﴾ اور یاد کرو اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو جو تم پر ہوئیں ﴿اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً﴾ جب تھے تم ایک دوسرے کے دشمن ﴿فَاَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِكُمْ﴾ پس اُس نے الفت و محبت ڈالی تمھارے دلوں میں ﴿فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖۤ﴾ پس تم ہو گئے اللہ تعالیٰ کے فضل اور نعمت سے ﴿اِخْوَانًا﴾ بھائی، بھائی۔ یعنی پہلے تم ایک دوسرے کے دشمن تھے اور اب اسلام کی برکت سے ایک دوسرے کے بھائی بھائی ہو ﴿وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ﴾ اور تھے تم آگ کے گڑھے کے کنارے پر۔

فائدہ ❀ شفا اگر شین کے کسرہ کے ساتھ ہو تو معنیٰ ہے بیماری سے تندرست ہونا۔ چنانچہ قرآن پاک میں شہد کے بارے میں آتا ہے ﴿فِیْهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ﴾ [النحل:٦٩] "اس میں لوگوں کے واسطے شفا ہے۔" اور دوسری جگہ آتا ہے ﴿شِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوْرِ﴾ [یونس:۵۷] "یہ قرآن پاک ان بیماریوں کے لیے شفا ہے جو دلوں میں ہیں۔" اور اگر شین کے فتح کے ساتھ ہو تو اس کا معنیٰ ہے کنارہ۔ تو یہاں معنیٰ بنے گا اور تھے تم دوزخ کے گڑھے کے کنارے پر ﴿فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا﴾ پس اللہ تعالیٰ نے تمھیں اس دوزخ سے بچا لیا ﴿كَذٰلِكَ یُبَیِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ﴾ اسی طرح بیان کرتا ہے اللہ تعالیٰ تمھارے لیے ﴿اٰیٰتِهٖ﴾ اپنی آیتیں ﴿لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ﴾ تاکہ تم ہدایت پا جاؤ اور ظاہری دشمنی سے محفوظ رہو۔

﴿وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ﴾ اور چاہیے کہ ہو تم میں سے ﴿اُمَّةٌ﴾ ایک گروہ ﴿یَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَیْرِ﴾ جو دعوت دے لوگوں کو نیکی کی ﴿وَیَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ﴾ اور حکم کریں وہ معروف کا ﴿وَیَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ اور منع کریں وہ برائی سے ﴿وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾ اور وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں ﴿وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِیْنَ﴾ اور نہ ہو تم ان لوگوں کی طرح ﴿تَفَرَّقُوْا﴾ جنھوں نے تفرقہ ڈالا ﴿وَاخْتَلَفُوْا﴾ اور انھوں نے اختلاف کیا ﴿مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْبَیِّنٰتُ﴾ بعد اس کے کہ ان کے پاس آ گئے واضح دلائل ﴿وَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ﴾ اور وہ لوگ ہیں ان کے لیے عذاب

ہے بڑا ﴿یَّوْمَ تَبْیَضُّ وُجُوْہٌ﴾ جس دن کہ سفید ہوں گے کچھ چہرے ﴿وَّ تَسْوَدُّ وُجُوْہٌ﴾ اور سیاہ ہوں گے کچھ چہرے ﴿فَاَمَّا الَّذِیْنَ﴾ پس بہر حال وہ لوگ ﴿اسْوَدَّتْ وُجُوْھُھُمْ﴾ جن کے چہرے سیاہ ہوں گے (ان سے کہا جائے گا) ﴿اَكَفَرْتُمْ بَعْدَ اِیْمَانِكُمْ﴾ کیا تم نے کفر اختیار کیا ایمان کے بعد ﴿فَذُوْقُوا الْعَذَابَ﴾ پس چکھو تم عذاب کو ﴿بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ﴾ اس واسطے کہ تم کفر کرتے تھے ﴿وَاَمَّا الَّذِیْنَ﴾ اور بہر حال وہ لوگ ﴿ابْیَضَّتْ وُجُوْھُھُمْ﴾ کہ سفید ہوں گے چہرے ان کے ﴿فَفِیْ رَحْمَةِ اللّٰهِ﴾ پس وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت میں ہوں گے ﴿هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ﴾ اور وہ اس رحمت کے مقام میں ہمیشہ رہیں گے ﴿تِلْكَ اٰیٰتُ اللّٰهِ﴾ یہ اللہ تعالیٰ کی آیتیں ہیں ﴿نَتْلُوْهَا عَلَیْكَ بِالْحَقِّ﴾ ہم اس کی تلاوت کرتے ہیں آپ پر حق کے ساتھ ﴿وَمَا اللّٰهُ﴾ اور نہیں ہے اللہ تعالیٰ ﴿یُرِیْدُ﴾ ارادہ کرتا ﴿ظُلْمًا لِّلْعٰلَمِیْنَ﴾ ظلم کا جہان والوں کے لیے ﴿وَلِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ﴾ اور اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے ﴿وَمَا فِی الْاَرْضِ﴾ اور جو کچھ زمین میں ہے ﴿وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ﴾ اور اللہ تعالیٰ ہی کی طرف لوٹائے جاتے ہیں سب کام۔

کل کے درس میں قدرے تفصیل کے ساتھ آپ نے یہ بات سنی کہ مدینہ طیبہ میں تین خاندان یہود کے تھے اور دو مشرکین کے، اوس اور خزرج۔ جو اسلام سے پہلے ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے مگر اسلام قبول کرنے کے بعد بھائی بھائی بن گئے۔ اکٹھے اُٹھتے بیٹھتے تھے اور اکٹھے کھاتے پیتے تھے اور ایک دوسرے کا احترام کرتے تھے۔ اور یہ اسلام کی بنیادی تعلیم میں سے ہے کہ اپنے سے بڑے کی عزت کرو اور جو ہم عمر ہو اس سے بھی اخلاق سے پیار سے پیش آؤ۔ اور ایسا انداز اختیار نہ کرو کہ جس سے اس کی دل شکنی ہو۔ اور چھوٹوں پر شفقت کرو۔

اُوس اور خزرج کا شیر و شکر ہو جانا یہود کو گوارہ نہ ہوا اور شماس ابن قیس یہودی نے سازش کر کے ان کو آپس میں لڑا دیا اور اوس اور خزرج کے لوگوں نے ایک دوسرے کو مکے مارے، لاٹھیاں چلیں، جوتے چلے۔ خوب ایک دوسرے کو مارے اور آئندہ لڑنے کے لیے وقت بھی مقرر ہوا۔ مجلس میں اوس اور خزرج کے علاوہ کچھ اور لوگ بھی تھے جو دوسرے قبیلوں سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ لڑائی میں شریک نہیں ہوئے لیکن حیران تھے کہ ہم کیا کریں؟ اللہ تعالیٰ نے ان کو تنبیہ فرمائی کہ تمھیں خاموش نہیں رہنا چاہیے تھا بلکہ مداخلت کر کے ان کی آپس میں صلح صفائی کروا دیتے۔ آگے اس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے ضابطہ بیان فرمایا ہے۔

نیکی کی دعوت

﴿وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ﴾ اور چاہیے کہ ہو تم میں سے ایک گروہ ﴿یَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَیْرِ﴾ جو دعوت دے لوگوں کو نیکی کی ﴿وَیَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ﴾ اور حکم کریں وہ معروف کا ﴿وَیَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ اور منع کریں وہ برائی سے۔ تمام فقہائے کرام حنفی،

شافعی، مالکی، حنبلی، جن کی قدر کی جاتی ہے، کا اس مسئلے پر اتفاق ہے کہ دعوت الی اللہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر فرض کفایہ ہے۔ جس طرح جنازہ فرضِ کفایہ ہے کہ اگر کچھ مسلمان ادا کر دیں تو باقی تمام سے ساقط ہو جاتا ہے۔ اور اگر کوئی بھی نہیں پڑھے گا تو وہاں کے رہنے والے سب کے سب گناہ گار ہوں گے۔ اسی طرح دعوت الی اللہ بھی فرضِ کفایہ ہے فرضِ عین نہیں ہے۔

فرضِ عین کا مطلب یہ ہے کہ ہر ہر آدمی پر لازم ہو۔ مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کی ایک جماعت اس فریضہ کو ادا کرتی رہے تو وہ سب کی طرف سے فرض ادا ہو گیا۔ اس فریضہ کو ادا نہ کرنے کی وجہ سے کوئی بھی گناہ گار نہ ہوگا کیوں کہ فرض کفایہ ہے۔ اور اگر کسی جگہ کوئی بھی اس فرض کو ادا نہیں کرے گا تو سب کے سب گناہ گار ہوں گے۔ البتہ اپنی اصلاح کے لیے نکلنا الگ بات ہے کہ کوئی آدمی اس نظریہ کے تحت جائے کہ اپنی اصلاح ہو جائے گی، کیوں کہ جماعت میں جانے والوں کا سارا وقت نیکی کے لیے صرف ہوتا ہے اور دین کی باتیں اچھی طرح سمجھ آتی ہیں۔ اور یہ بات ہے بھی حقیقت اس میں کوئی شک نہیں ہے۔

ایک اور بات بھی ذہن نشین کر لیں۔ وہ یہ کہ اس آیتِ کریمہ کے تحت تمام مفسرین نے یہاں تک کہ جلالین شریف میں بھی موجود ہے جو تمام تفسیروں میں مختصر تفسیر ہے کہ پڑھنا پڑھانا، درس دینا، اسلام کی خاطر کتابیں لکھنا بھی تبلیغ ہے۔ اور اِن کاموں کے لیے چندہ دینا بھی تبلیغ ہے۔ تبلیغ صرف اس میں بند نہیں ہے کہ بستر اُٹھا کر سہ روزہ لگانا اور دس روزہ لگانا اور چلّہ لگانا۔ بے شک یہ بھی تبلیغ کا حصہ ہے۔ چنانچہ چھٹیوں میں ہمارے مدارس کے اساتذہ اور طلباء بھی سہ روزہ اور دس روزہ لگانے کے لیے جاتے ہیں۔ اور جن کو زیادہ توفیق ملتی ہے وہ اس سے زیادہ وقت بھی لگاتے ہیں۔ مگر جب تعلیم و تعلم کا سلسلہ جاری ہو تو پھر اس کا ثواب بستر اُٹھا کر پھرنے سے زیادہ ہے۔

بعض نادان قسم کے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جو تبلیغ کے لیے نہیں نکلتے وہ دین کا کام نہیں کر رہے۔ یہ ذہن غلط ہے۔ چنانچہ ایک بابا جی تھے، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے، بڑے سادہ آدمی تھے۔ وہ میری کلاس میں بیٹھ کر سبق سنتے تھے۔ نصرۃ العلوم میں اس وقت طلباء کی خاصی تعداد ہوتی تھی۔ صرف میری کلاس میں چار سو طلباء تھے۔ ایک دن وہ بابا جی مجھے کہنے لگے کہ ماشاء اللہ بڑا کام ہو رہا ہے لیکن دین کا کام نہیں ہو رہا۔ میں نے کہا بابا جی! دین کا کام کیسے ہو؟ تو کہنے لگے کہ آپ نے کبھی چلّہ تو دیا نہیں ہے۔ میں نے کہا کہ ان کو کون پڑھائے گا؟ کہنے لگے ان کو اللہ تعالیٰ پڑھائے گا۔ تو اللہ تعالیٰ اس طرح بندوں کو نہیں پڑھاتا۔ اس نے بندے مقرر فرمائے ہیں کہ وہ پڑھائیں۔ تو تبلیغ فرضِ کفایہ ہے، فرضِ عین نہیں ہے۔ ایک گروہ کے ادا کرنے سے سب کی گردنوں سے فریضہ اُتر جاتا ہے۔ ﴿وَ اُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾ اور وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔

اغیار و اشرار کی علامت

﴿ وَ لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِیْنَ تَفَرَّقُوْا ﴾ اور نہ ہو تم ان لوگوں کی طرح جنھوں نے تفرقہ ڈالا ﴿ وَ اخْتَلَفُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْبَیِّنٰتُ ﴾ اور انھوں نے اختلاف کیا بعد اس کے کہ ان کے پاس آگئے واضح دلائل۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ یہود

کے اکہتر[۷۱] فرقے ہوئے اور نصاریٰ کے بہتر[۷۲] فرقے ہوئے اور میری اُمت تہتر[۷۳] فرقوں میں تقسیم ہوگی (یہ ان سے پیچھے نہیں رہے گی)۔سب کے سب دوزخ میں جائیں گے مگر صرف ایک دوزخ سے بچنے والا ہوگا۔لوگوں نے آپ ﷺ سے پوچھا وہ کون سا فرقہ ہوگا؟ تو فرمایا آپ ﷺ نے وہ فرقہ ہے جو اس راستے پر ہوگا جو میرا اور میرے صحابہ کا ہے۔اور اسی ناجی فرقہ کا نام ہے اہل سنت والجماعت۔سنت سے مراد حضورِ انور ﷺ کی سنت ہے اور جماعت سے مراد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہیں۔تو اہل سنت والجماعت کا معنیٰ بنے گا آنحضرت ﷺ کی سنت کو اپنانے والا اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے طریقے کو لازم پکڑنے والا۔اور وہ شخص جو ایسے ایسے کام کرے گا جو آنحضرت ﷺ نے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے نہیں کیے تو وہ گمراہ ہے۔

تو فرمایا ان لوگوں کی طرح نہ ہونا جنھوں نے تفرقہ ڈالا اور اختلاف کیا حالانکہ ان کے پاس واضح دلائل آچکے تھے۔ ایسا انھوں نے خواہشاتِ نفسانی کی وجہ سے کیا ہے جہالت کی وجہ سے نہیں کیا۔﴿وَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ﴾ اور وہ لوگ ہیں ان کے لیے عذاب ہے بڑا۔اور یہ عذاب ہوگا کب؟ ﴿يَّوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوْهٌ﴾ جس دن کہ سفید ہوں گے کچھ چہرے ﴿وَّتَسْوَدُّ وُجُوْهٌ﴾ اور سیاہ ہوں گے کچھ چہرے۔حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ ﴿يَّوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوْهٌ﴾ کا ترجمہ کرتے ہیں اہل سنت والجماعت۔اور ﴿وَّتَسْوَدُّ وُجُوْهٌ﴾ کا ترجمہ کرتے ہیں اہل بدعت۔یعنی قیامت والے دن اہل سنت والجماعت کے چہرے سفید ہوں گے اور اہل بدعت اور دین میں افتراق ڈالنے والوں کے چہرے سیاہ ہوں گے۔اور یاد رکھنا! کہ تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں بحیثیت مفسر قرآن عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کا دوسرا نمبر ہے۔پہلا نمبر ہے حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا۔حضرت کا قد چھوٹا اور جسم ہلکا پھلکا تھا۔دیکھنے والا سمجھتا تھا بچہ پھر رہا ہے۔مگر اللہ تعالیٰ نے ان کو دو ایسی خوبیاں عطاء فرمائی تھیں کہ وہ اور کسی کو حاصل نہیں تھیں۔

① تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں پہلے درجے کے مفسر قرآن۔

② اَفْقَهُ الْاُمَّة تھے۔یعنی ساری امت میں سب سے بڑے فقیہ تھے۔

ان کے بعد حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ قرآن پاک کی تفسیر کے بڑے ماہر تھے۔حالانکہ ان کی عمر مبارک کوئی زیادہ نہ تھی۔آنحضرت ﷺ جب دنیا سے رخصت ہوئے اس وقت ان کی عمر تقریباً چودہ پندرہ سال تھی۔لیکن یہ عظمت آنحضرت ﷺ کی دعا سے حاصل ہوئی۔وہ اس طرح کہ ایک دفعہ آنحضرت ﷺ قضائے حاجت کے لیے تشریف لے گئے جب واپس تشریف لائے تو دیکھا کہ ایک لوٹا پانی کا بھرا ہوا بڑی موزوں اور مناسب جگہ پر رکھا ہوا ہے جو کہ باپردہ تھی۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ((مَنْ وَّضَعَهٗ هٰهُنَا؟)) یہ لوٹا پانی کا یہاں کس نے رکھا ہے؟ حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے کہا کہ حضرت! یہ لوٹا پانی کا بھرا ہوا میں نے رکھا ہے۔میرے دل میں خیال آیا کہ آپ ﷺ قضائے حاجت سے تشریف لیں گے تو طہارت کرنی ہے۔اس وقت ان کی عمر آٹھ سال تھی۔آنحضرت ﷺ کے قلبِ مبارک میں رقت پیدا ہوئی کہ دیکھو یہ بچہ ہے اور اس کے دل میں خیال آیا ہے کہ پہلے لوٹا تلاش کیا پھر پانی تلاش کیا پھر اس کو بھر کر ایسے مقام پر رکھا کہ جو

باپردہ اور مناسب ہے۔ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی ((اَللّٰھُمَّ عَلِّمْہُ التَّأْوِیْلَ وَ فَقِّھْہُ فِی الدِّیْنِ)) "اے پروردگار! اس کو قرآن پاک کی تفسیر کا ماہر بنا اور اس کو دین کی فقاہت عطاء فرما۔"

حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے دورِ خلافت میں مجلسِ شوریٰ کے اجلاس میں ان کو اپنے ساتھ بٹھاتے تھے۔ حالانکہ اس وقت ان کی عمر تقریباً سترہ اٹھارہ سال تھی۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے کہا حضرت! یہ مجلسِ شوریٰ ہے یہاں اہم امور طے پاتے ہیں جن کا عوام کے سامنے فوری طور پر ظاہر کرنا مناسب نہیں ہوتا۔ یہ بچہ ہے اس سے کوئی راز افشاء ہو سکتا ہے اور آپ نے اس کو یہاں بٹھایا ہے۔ پھر ہمارے بھی بچے ہیں اس کو دیکھا دیکھی وہ بھی آ بیٹھیں گے۔ تو مجلسِ شوریٰ پر بچوں کا قبضہ ہو جائے گا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اس کو محض بچہ نہ سمجھو یہ بڑا سمجھ دار ہے۔

اور حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کی قابلیت کو اس طرح عیاں فرمایا کہ حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ عمر رضی اللہ عنہ مجھے اپنی مجلس میں اس وقت بھی بلا لیتے جب وہاں بدر کی جنگ میں شریک ہونے والے بزرگ بیٹھے ہوتے۔ ان میں سے ایک بزرگ نے کہا اس نوجوان کو ہماری مجلس میں کیوں بلاتے ہو؟ اس جیسے ہمارے بچے بھی ہیں۔ اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا وہ تو ان لوگوں میں سے ہے جن کو آپ جانتے ہیں۔ پھر ایک دن ان حضرات اکابر کو بلایا اور مجھے بھی بلایا۔ فرمایا میرا خیال ہے کہ مجھے اس دن آپ نے اس لیے بلایا تھا تاکہ انہیں دکھا سکیں (آپ رضی اللہ عنہ کا علم وکمال) پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دریافت فرمایا کہ سورۃ ﴿اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ﴾ کے بارے میں کیا کہتے ہو؟ (یعنی اس میں گُر کی کیا بات ہے؟) تو ان میں سے کسی نے کہا کہ ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کی حمد کریں اور اس سے بخشش مانگیں۔ جب کہ ہماری مدد کی جائے اور ہمیں فتح دی جائے۔ اور ان میں سے بعض نے کہا کہ ہم نہیں جانتے۔ اور ان میں سے بعض نے کچھ بھی نہ کہا۔

تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مجھ سے کہا کہ اے ابن عباس! تو اس بارے میں یہی کچھ کہتا ہے؟ میں نے جواب دیا نہیں پھر پوچھا کہ تم کیا جواب دو گے؟ تو میں نے کہا اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کا وقت قریب ہونے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع دی ہے کہ جب مکہ فتح ہو جائے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کا وقت قریب ہونے کی علامت ہے۔ تو اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کثرت سے اللہ تعالیٰ کی تسبیح کریں اور اس کی مغفرت طلب کریں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میرے علم میں بھی یہی بات تھی۔ تو حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کا تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں بحیثیت مفسر قرآن دوسرا نمبر ہے۔ پہلا نمبر ہے حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا۔

﴿فَاَمَّا الَّذِیْنَ اسْوَدَّتْ وُجُوْهُهُمْ﴾ پس بہر حال وہ لوگ جن کے چہرے سیاہ ہوں گے ان سے کہا جائے گا ﴿اَكَفَرْتُمْ بَعْدَ اِیْمَانِكُمْ﴾ کیا تم نے کفر اختیار کیا ایمان کے بعد۔ یعنی دعویٰ تو تمھارا ایمان کا تھا کہ ہم مومن ہیں پھر تم نے کفر اختیار کیا۔ یعنی اعمال سارے کافروں والے ہیں زبانی دعویٰ کرنے کا کیا فائدہ؟

بخاری شریف اور دیگر کتابوں میں حدیث آتی ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حوضِ کوثر پر تشریف فرما ہوں گے اور لوگ

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حوضِ کوثر پر پانی پینے کے لیے آئیں گے۔ کچھ لوگوں کو فرشتے دھکے مار کر کہیں گے کہ پیچھے چلے جاؤ۔ شور سن کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم توجہ فرمائیں گے اور فرشتوں سے کہیں گے کہ یہ تو میرے امتی معلوم ہوتے ہیں ان کو تم پیچھے کیوں ہٹاتے ہو؟ اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے آواز آئے گی اِنَّكَ لَا تَدۡرِیۡ مَا اَحۡدَثُوۡا بَعۡدَكَ "بہ تحقیق آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نہیں جانتے کہ جو بدعات انھوں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد پیدا کی ہیں" فَاَقُوۡلُ سُحۡقًا سُحۡقًا پس میں کہوں گا ان کو میری نظروں سے ہٹادو۔" تو فرشتے ان کو حوضِ کوثر کے قریب نہیں آنے دیں گے۔ حوضِ کوثر سے وہ لوگ پانی پئیں گے جو موحد ہوں گے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت کے پابند ہوں گے۔

اب رہا یہ مسئلہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان لوگوں کو کس طرح پہچانیں گے کہ یہ میرے امتی ہیں؟ تو حدیث پاک میں آتا ہے کہ وضو والے اعضاء سفید ہوں گے۔ جو مخلص ہوں گے ان کی سفیدی زیادہ ہوگی اور جو کھوٹے ہوں گے آخر وضو تو انھوں نے بھی کیا ہوگا لہٰذا تھوڑی بہت چمک ان کے اعضاء پر بھی ہوگی۔ اس چمک کو دیکھ کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرمائیں گے کہ میرے امتی معلوم ہوتے ہیں۔

تو جو ظاہری طور پر مسلمانوں کے ساتھ ملے جلے رہے اور کچھ اعمال بھی ادا کرتے رہے مگر صحیح معنیٰ میں مسلمان نہ ہوئے ان کو کہا جائے گا کیا تم نے ایمان کے بعد کفر اختیار کیا؟ ﴿فَذُوۡقُوا الۡعَذَابَ بِمَا كُنۡتُمۡ تَكۡفُرُوۡنَ﴾ پس چکھو تم عذاب کو اس واسطے کہ تم کفر کرتے تھے، شریعت کے قانون کا انکار کرتے تھے ﴿وَاَمَّا الَّذِیۡنَ ابۡیَضَّتۡ وُجُوۡهُهُمۡ﴾ اور بہر حال وہ لوگ کہ سفید ہوں گے چہرے ان کے ﴿فَفِیۡ رَحۡمَةِ اللّٰهِ﴾ پس وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت میں ہوں گے ﴿هُمۡ فِیۡهَا خٰلِدُوۡنَ﴾ اور وہ اس رحمت کے مقام میں ہمیشہ رہیں گے۔ ﴿تِلۡكَ اٰیٰتُ اللّٰهِ﴾ یہ اللہ تعالیٰ کی آیتیں ہیں ﴿نَتۡلُوۡهَا عَلَیۡكَ بِالۡحَقِّ﴾ ہم تلاوت کرتے ہیں آپ پر حق کے ساتھ۔ قرآن حق ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ تعالیٰ کے نبی برحق ہیں اور جو اللہ تعالیٰ کا فرشتہ لا کے سناتا ہے وہ بھی حق ہے۔ تو یہ سب حق ہی حق ہے۔

اور یاد رکھو! ﴿وَمَا اللّٰهُ یُرِیۡدُ ظُلۡمًا لِّلۡعٰلَمِیۡنَ﴾ اور نہیں ہے اللہ تعالیٰ ارادہ کرتا ظلم کا جہان والوں کے لیے۔ اللہ تعالیٰ بڑا مہربان اور نہایت رحم کرنے والا ہے۔ اس کی صفت ہے رحمٰن اور رحیم۔ وہ بلا وجہ کسی کو سزا نہیں دیتا حجت مکمل ہونے کے بعد سزا دیتا ہے اور اس کی سزا سے کوئی بچ نہیں سکتا، بھاگ نہیں سکتا ﴿وَلِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الۡاَرۡضِ﴾ اور اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے۔ آسمانوں کا خالق، مالک اور متصرف بھی وہی ہے اور زمینوں میں بھی اس کے سوا کسی کا دخل نہیں ہے۔ جو رب تعالیٰ کرتا ہے وہی ہوتا ہے اس کی اجازت کے بغیر ایک پتا بھی زمین پر نہیں گرتا۔ اور اس کی مرضی کے بغیر کوئی ذرہ اپنی جگہ سے اِدھر اُدھر نہیں ہو سکتا۔ اور یہ خدائی اختیارات اس نے نہ تو فرشتوں کو دیے ہیں، نہ پیغمبروں کو، نہ پیروں فقیروں کو۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو جو مرتبے اور مقام عطاء فرمائے ہیں وہ حق ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں میں سے بعض کو نبوت و رسالت عطاء فرمائی، بزرگی عطاء فرمائی۔ بعض کو صحابہ (رضی اللہ عنہم) بنایا،

پیشوا بنایا۔ محدث بنائے، فقیہ بنائے، ولایت دی۔ لیکن خدائی اختیارات کسی کو نہیں دیے۔ سارے تو کجا ایک ماشہ بھی کسی کو عطاء نہیں کیا۔ ﴿وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ﴾ اور اللہ تعالیٰ ہی کی طرف لوٹائے جاتے ہیں سب کام۔ سب نے اسی کی عدالت میں پیش ہونا ہے۔ سب کام سامنے آجائیں گے۔ یہ توحید کا بنیادی سبق ہے اس کو یاد رکھنا۔

﴿كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ﴾ ہو تم تمام اُمتوں میں سے بہتر ﴿اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ﴾ جن کو نکالا گیا لوگوں کے لیے ﴿تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ﴾ حکم کرتے ہو نیکی کا ﴿وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ اور منع کرتے ہو بُرائی سے ﴿وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ﴾ اور اللہ تعالیٰ پر ایمان لاتے ہو ﴿وَلَوْ اٰمَنَ اَهْلُ الْكِتٰبِ﴾ اور اگر ایمان لائیں اہل کتاب ﴿لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ﴾ البتہ ایمان لانا ان کے حق میں بہتر ہوتا ﴿مِنْهُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ﴾ ان میں سے کچھ مومن ہیں ﴿وَاَكْثَرُهُمُ الْفٰسِقُوْنَ﴾ اور اکثر ان کے نافرمان ہیں ﴿لَنْ يَّضُرُّوْكُمْ اِلَّآ اَذًى﴾ وہ تمھیں ہرگز ضرر نہیں پہنچا سکیں گے مگر کچھ اذیت ﴿وَاِنْ يُّقَاتِلُوْكُمْ﴾ اور اگر تمھارے ساتھ لڑیں گے ﴿يُوَلُّوْكُمُ الْاَدْبَارَ﴾ تو تمھاری طرف پیٹھ پھیر دیں گے ﴿ثُمَّ لَا يُنْصَرُوْنَ﴾ پھر اُن کی مدد نہیں کی جائے گی ﴿ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ﴾ مسلط کر دی گئی ہے ان پر ذلت ﴿اَيْنَ مَا ثُقِفُوْٓا﴾ جہاں کہیں وہ پائے جائیں گے ﴿اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ﴾ مگر اللہ تعالیٰ کی رسی کو پکڑنے سے ﴿وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ﴾ اور لوگوں کی رسی کو پکڑنے سے ﴿وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ﴾ اور لوٹے وہ اللہ تعالیٰ کا غضب لے کر ﴿وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ﴾ اور اُن پر مسلط کی گئی ہے مسکنت، ذلت ﴿ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ﴾ یہ اس واسطے کہ بے شک وہ ﴿كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ﴾ اللہ تعالیٰ کی آیتوں کا انکار کرتے تھے ﴿وَيَقْتُلُوْنَ الْاَنْۢبِيَآءَ﴾ اور قتل کرتے رہے اللہ تعالیٰ کے نبیوں کو ﴿بِغَيْرِ حَقٍّ﴾ ناحق ﴿ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا﴾ یہ اس وجہ سے کہ انھوں نے نافرمانی کی ﴿وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ﴾ اور تھے وہ تجاوز کرنے والے۔

اس سے پہلی آیات کا شان نزول آپ سن چکے ہیں کہ شماس ابن قیس یہودی کی شرارت کے نتیجے میں مسلمانوں کے دو گروہ اوس اور خزرج آپس میں لڑ پڑے اور خاصی بدمزگی پیدا ہوئی۔ جس پر اللہ تعالیٰ نے پہلے یہودیوں کو تنبیہ فرمائی کہ تم ایسی شرارتیں کر کے مسلمانوں کو کیوں روکتے ہو؟ پھر مسلمانوں کو تنبیہ فرمائی کہ اللہ تعالیٰ کی آیتیں تم پر پڑھی جارہی ہیں اللہ تعالیٰ کا رسول تم میں موجود ہے پھر تم کیوں لڑتے ہو؟

اور لڑائی کے وقت کچھ ایسے مسلمان تھے جو دوسرے خاندانوں کے ساتھ تعلق رکھتے تھے۔ وہ خاموش رہے کہ نہ تو لڑائی میں شریک ہوئے اور نہ ہی ان کو سمجھایا اور روکا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو بھی تنبیہ فرمائی کہ تمھارا کام تھا کہ ان کو لڑائی سے روکتے۔

حدیث شریف میں آتا ہے ﴿اُنْصُرْ اَخَاكَ ظَالِمًا اَوْ مَظْلُوْمًا﴾ "اپنے بھائی کی مدد کر چاہے وہ ظالم ہو یا مظلوم ہو۔" بخاری شریف کی روایت ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے سوال کیا حضرت! مظلوم کی مدد کا معنیٰ تو سمجھ آتا ہے ظالم کی مدد کا کیا مطلب ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ ظالم کو ظلم سے روک دو یہ اس کی مدد ہے۔ وہ اس طرح کہ مثال کے طور پر ظالم کسی پر ظلم کرتا ہے اس کو قتل کر دیتا ہے تو دنیا میں قصاص آئے گا اور آخرت میں بھی سزا ہوگی۔ اگر تم نے روک لیا تو اس کی مدد ہوگی کہ نہ تو قصاصاً قتل کیا جائے گا اور نہ آخرت کی سزا میں مبتلا ہوگا۔

اور یاد رکھنا! مظلوم کی مدد نہ کرنا گناہِ کبیرہ ہے۔ الترغیب والترہیب حدیث کی کتاب ہے۔ اس میں حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک قبرستان کے پاس سے گزر رہے تھے کہ ایک قبر کے پاس کافی دیر تک کھڑے رہے۔ دریافت کیا گیا حضرت کیا بات ہے؟ فرمایا اس قبر والے کو اس وجہ سے عذاب ہو رہا ہے کہ ایک مظلوم پر ظلم ہو رہا تھا اور یہ پاس سے گزر گیا اس کی مدد نہیں کی۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان کو تنبیہ فرمائی کہ تمھارا کام تھا ان کو لڑائی سے روکنا۔

اُمتِ محمدیہ کی شان

آگے فرمایا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اس امت کے فریضہ میں شامل ہے۔ ﴿كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ﴾ ہو تم تمام اُمتوں میں سے بہتر امت ﴿اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ﴾ جن کو نکالا گیا لوگوں کے لیے۔ یعنی تمھیں اپنے کاموں کے لیے نہیں پیدا کیا گیا بلکہ دوسرے لوگوں کے لیے پیدا کیا گیا ہے ﴿تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ﴾ حکم کرتے ہو نیکی کا ﴿وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ اور منع کرتے ہو بُرائی سے۔ مجموعی حیثیت سے اس امت کا یہ فریضہ ہے۔ پہلے اس طرح ہوتا تھا کہ ایک پیغمبر دنیا میں تشریف لاتا جب وہ دنیا سے چلا جاتا تو امت میں بگاڑ پیدا ہو جاتا۔ دوسرا پیغمبر تشریف لاتا اور اصلاح کرتا۔ اسی طرح سلسلہ چلتا رہا۔ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آخری پیغمبر ہیں۔ آپ کے بعد کوئی پیغمبر پیدا ہی نہیں ہوسکتا۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے اس دین کے تحفظ کی ذمہ داری امت کے کندھے پر ڈالی ہے۔

الحمدللہ! اس امت نے یہ فریضہ ادا کیا اور خدا رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اعتماد پر پورے اترے اور دین کو محفوظ رکھا۔ آج دین کے سمجھانے والے بھی موجود ہیں اور سمجھنے والے بھی موجود ہیں اور اس پر عمل کرنے والے بھی موجود ہیں۔ اور سچا دین کتابوں میں بھی موجود ہے، عمل میں بھی موجود ہے۔ ہمارے علاقے میں انگریز نے دین کو ختم کرنے کے لیے پوری قوت صرف کی مگر دین کو ختم نہ کر سکا۔ تو چونکہ نبوت ختم ہے اور نبوت کا کام امت کے کندھے پر ہے تو یہ کام امت نے ہی کرنا ہے اور کر بھی رہی ہے۔

یہاں ایک مسئلہ سمجھ لیں۔ وہ یہ کہ ایک ہے دعوت الی اللہ اور ایک ہے امر بالمعروف نہی عن المنکر۔ تو دعوت الی اللہ کے بارے میں پہلے سبق میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ وہ ہر آدمی کا کام نہیں ہے۔ بلکہ فرمایا: ﴿وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ﴾ "اور چاہیے کہ تم میں ایک جماعت ہو جو دعوت دے بھلائی کی۔" تو یہ سب کا کام نہیں ہے بلکہ ایک گروہ کا کام ہے۔ علماء اور سمجھ دار

لوگوں کا کام ہے جہلاء کا کام نہیں ہے۔ اور فرض کفایہ ہے۔ اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہر امتی کا کام ہے۔ اگر کسی کو بھلائی کی ایک بات بھی معلوم ہے تو وہ اس کو آگے پہنچائے اور دین کی اشاعت اور تبلیغ کی وجہ سے کمائی کے درجے قائم ہوئے ہیں۔

چنانچہ فقہائے کرام رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ کمائی کے جو پیشے ہیں ان میں مسلمانوں کی کمائی کا پہلا درجہ مالِ غنیمت ہے اور غنیمت ملتی ہے جہاد کے نتیجے میں۔ اور جہاد ہوتا ہے اللہ تعالیٰ کے کلمہ کو بلند کرنے کے لیے اور یہ بہت بلند عمل ہے اصل رقم نہیں بلکہ وہ ذریعہ دیکھنا ہے جس سے وہ حاصل ہوئی ہے۔ اگر نفسِ رقم کو دیکھا جائے تو وہ کافروں کا مال ہے اس میں سود کی رقم بھی ہوگی، شراب اور خنزیر کی تجارت کی رقم بھی ہوگی اور بہت کچھ کیا ہوگا۔ کیوں کہ ان کے ہاں حلال وحرام کی تمیز تو نہیں ہے صرف دولت کا اکٹھا کرنا مقصود ہے۔ لہٰذا جس طرح بھی آئے لیکن جب ملکیت بدل گئی کہ ان کی ملکیت سے مسلمانوں کی ملکیت میں آگئی تو بالکل پاک صاف ہوگئی۔ تو مالِ غنیمت سب سے اعلیٰ کمائی ہے۔ کیونکہ ذریعہ جہاد ہے۔

❀...... دوسرے نمبر پر مالِ تجارت ہے۔ تاجر کی کمائی اس وجہ سے اعلیٰ ہے کہ تجارت بھی دین کی تبلیغ کا ذریعہ ہے۔ کیونکہ تجارت میں لوگوں کے ساتھ اختلاط ہوتا ہے۔ کوئی اس کے پاس آرہا ہے اور کسی کے پاس یہ جارہا ہے۔ تو دین کے مسائل ان کو سمجھائے گا، دعوت دے گا، دکان دار ہے تو اس کے پاس گاہک آئیں گے گاہکوں کو مسئلے سمجھائے گا، تبلیغ کا کام چلتا رہے گا۔ تو تجارت چوں کہ تبلیغ دین کا ذریعہ ہے اور اس ذریعہ سے جو کمائی حاصل ہوگی وہ اعلیٰ ہے۔ مگر آج ہم نے تجارت کو ٹھگنے کا ذریعہ سمجھ لیا ہے۔ کسی کے پاس کچھ نہ رہے سب میرے پاس آجائے۔

❀...... تیسرے درجے میں زراعت کا مال ہے۔ کاشت کاری تیسرے درجے میں اس واسطے ہے کہ کاشت کار کے آگے بیل ہوتے اور یہ ان کے پیچھے ہوتا ہے۔ نہ اس نے کسی سے ملنا ہے اور نہ اس کو کسی نے ملنا ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ کوئی روٹی پہنچادے گا اور کوئی پانی۔ تو اس بے چارے کو تبلیغ کا موقع کم ملتا ہے اس واسطے اس کا تیسرا درجہ ہے۔ البتہ اس کو ثواب ملتا رہتا ہے کہ اس کی کمائی انسان بھی کھاتے ہیں، حیوان بھی کھاتے ہیں، پرندے اور کیڑے مکوڑے بھی کھاتے ہیں۔ راضی ہو کر بھی کھاتے ہیں، نہ ہو پھر بھی کھاتے ہیں۔

تو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اس امت کے ہر فرد کا فریضہ ہے۔ ﴿وَ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ﴾ اور اللہ تعالیٰ پر ایمان لاتے ہو۔ اس کے احکام بجالاتے ہیں۔ ﴿وَ لَوْ اٰمَنَ اَهْلُ الْكِتٰبِ﴾ اور اگر ایمان لائیں اہل کتاب ﴿لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ﴾ البتہ ایمان لانا ان کے حق میں بہتر ہو۔ یہودی بھی اور عیسائی بھی سمجھتے تھے کہ ﴿اَنَّ الرَّسُوْلَ حَقٌّ﴾ "بے شک یہ سچا رسول ہے۔" مگر ضد اور ہٹ دھرمی پر اَڑے رہے۔ اکثریت ان کی ایمان نہیں لائی۔ لیکن خدا کی طرف سے ایمان کا دروازہ کھلا ہے۔

اہلِ کتاب کا سعادت مند گروہ

﴿مِنْهُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ وَ اَكْثَرُهُمُ الْفٰسِقُوْنَ﴾ ان میں سے کچھ مومن ہیں اور اکثر ان کے نافرمان ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

کے زمانے میں حضرت عبداللہ ابن سلام رضی اللہ عنہ، حضرت اسید رضی اللہ عنہ، حضرت ثعلبہ رضی اللہ عنہ، حضرت بن یامین رضی اللہ عنہ مسلمان ہوئے۔اور حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ غسیل الملائکہ، جن کو فرشتوں نے غسل دیا۔ جنگ احد کے موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اعلان فرمایا کہ جو مسلمان جس حالت میں ہے فوراً اُحد کے مقام پر پہنچے۔حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ کی ابھی نئی نئی شادی ہوئی تھی، ہم بستر ہوئے تھے، انھوں نے خیال کیا کہ اگر غسل کیا تو دیر ہو جائے گی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرمان کی مخالفت ہوگی۔اسی طرح چلے گئے اور جنگ میں شریک ہو گئے۔لڑائی زوروں پر تھی شہید ہو گئے۔لوگوں نے آنکھوں سے دیکھا کہ فرشتوں نے ان کو غسل دیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تحقیق کرائی، ان کی بیوی سے دریافت کیا۔بیوی نے بتایا کہ رات میرے ساتھ لیٹے ہوئے تھے، ہم بستری ہوئی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حکم آیا کہ جس حالت میں ہو پہنچے تو وہ غسل کیے بغیر چلے گئے۔تو حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ غسیل الملائکہ کے لقب سے مشہور ہوئے۔ یہ بھی پہلے یہودی تھے۔ان کا باپ ابو عامر راہب اسلام کا بدترین دشمن تھا اور ہر وقت اسلام اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلاف لٹھ لیے پھرتا تھا۔بدر سے لے کر تبوک تک تمام لڑائیوں میں اس شیطان کا ہاتھ تھا۔

اسی طرح کچھ لوگ عیسائیوں میں سے بھی مسلمان ہوئے۔حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ، حضرت تمیم داری رضی اللہ عنہ، عرب کے مشہور سخی حاتم طائی کے بیٹے حضرت عدی رضی اللہ عنہ، یہ سب پہلے عیسائی تھے اللہ تعالیٰ نے ان کو اسلام کی توفیق عطا فرمائی۔لیکن یہود و نصاریٰ کی اکثریت کفر پر اَڑی رہی۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ﴿لَنۡ یَّضُرُّوۡکُمۡ اِلَّاۤ اَذًی﴾ وہ تمھیں ہرگز ضرر نہیں پہنچا سکیں گے مگر کچھ تکلیف۔وہ مسلمانوں کے وجود کو ختم کر دیں اور اسلام کو مٹا دیں، حاشا وکلّا ایسا ہرگز نہیں کر سکیں گے۔بس قولی اور فعلی طور پر چھیڑ خانی کریں گے۔ہاں! اگر تم خود ایمان و عمل کو چھوڑ بیٹھو تو اللہ تعالیٰ کا کوئی وعدہ نہیں ہے۔﴿وَ اِنۡ یَّخۡذُلۡکُمۡ فَمَنۡ ذَا الَّذِیۡ یَنۡصُرُکُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِہٖ﴾ [آل عمران: ۱۶۰] تمھاری بداعمالیوں کی وجہ سے اگر اللہ تعالیٰ تمھیں رسوا کر دے تو پھر کوئی مددگار نہیں ہوگا۔

۱۹۶۷ء میں یہودیوں نے کچھ علاقہ مصر سے، کچھ اُردن سے اور کچھ شام سے چھینا۔ جولان کی پہاڑیاں وغیرہ۔اور وہ ابھی تک ان کے پاس ہے اور وہاں انھوں نے اپنی بستیاں آباد کر لی ہیں۔ان کے وزیر اعظم یاہو نے کہا ہے کہ ہم یہاں سے نہیں جائیں گے یہ ہمارا علاقہ ہے۔اور مسلمان حکمران بے غیرت ہیں ان کو کوئی احساس نہیں ہے۔اسی زمانے میں میں نے حج کا سفر کیا۔واپسی پر مجھے براہِ راست پاکستان کا جہاز نہ ملا۔شام کے راستے واپس آنا پڑا۔ہمیں دو دن دمشق رہنا پڑا۔

وہاں ایک بڑی وسیع مسجد تھی اور بڑے بڑے مینار تھے اور بہت خوب صورت تھی۔جس طرح شاہی مسجد ہے۔سلیمان خان قانونی ترکی بادشاہ گزرا ہے اس نے بنوائی تھی۔اور اس کے ساتھ کمرے بنے ہوئے تھے۔ پانی کا بڑا انتظام تھا۔مؤذن نے لاؤڈ سپیکر پر اذان دی۔ جماعت کے وقت ایک امام اور دو آدمی مقامی تھے اور میرے علاوہ تین چار اور پاکستانی تھے۔نماز پڑھنے کے بعد ہم نے امام سے دریافت کیا کہ کیا وجہ ہے؟ اتنی بڑی مسجد ہے اور نمازی نہیں ہیں۔اس نے کہا مُنْقَطِعٌ عَنِ الْبَلَایَا یہ مسجد شہر سے الگ ہے۔آبادی ذرا دُور ہے۔میں نے کہا کہ مسجد کے ساتھ جو کمرے ہیں ان میں لوگ رہتے ہیں یا

نہیں؟ کہنے لگا اس میں فوجی رہتے ہیں۔ میں نے کہا کہ وہ مسلمان ہے؟ اس نے کہا ہاں! مسلمان ہیں۔ میں نے کہا انھوں نے اذان سنی ہے، مسجد کے کمروں میں رہتے ہیں اور نماز نہیں پڑھی۔ تو اس نے بہت بڑی گالی دے کر کہا کہ اگر یہ نمازی ہوتے تو ہمیں یہودیوں سے ذلیل کراتے۔ تو ہمیں بدعملی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے دشمن کے ہاتھوں ذلیل ورسوا کیا۔ اور اگر ہم پختہ مومن ہوں اور احکاماتِ خداوندی کے پابند ہوں تو ذلت سے بچ سکتے ہیں۔

﴿وَاِنْ يُّقَاتِلُوْكُمْ يُوَلُّوْكُمُ الْاَدْبَارَ﴾ اور اگر تمھارے ساتھ لڑیں گے تو تمھاری طرف پیٹھ پھیر دیں گے ﴿ثُمَّ لَا يُنْصَرُوْنَ﴾ پھر اُن کی مدد نہیں کی جائے گی۔ یہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے مگر اس صورت میں کہ جب تمھارا ایمان اور عمل درست ہو۔ دیکھو! اسرائیل کی آبادی اسی لاکھ کے قریب ہے اور سارے تربیت یافتہ فوجی قسم کے لوگ ہیں۔ ان خبیثوں کو امریکہ، برطانیہ، روس اور فرانس نے وہاں اکٹھا کیا ہے اور اس کے آس پاس جو مسلمان ملک ہیں ان کی آبادی تیرہ کروڑ ہے اور یہ اسی [۸۰] لاکھ سے ڈرتے ہیں کہ ہمارا چچا امریکہ ناراض نہ ہو جائے۔ کیوں کہ اگر وہ ناراض ہو گیا تو ہمیں ڈالر نہیں دے گا ہمارے قرضے معاف نہیں کرے گا۔ اگر یہ ڈٹ جائیں تو ان کا کوئی کچھ نہیں کر سکتا جیسے لیبیا ڈٹا ہوا ہے، صدام ڈٹا ہوا ہے۔ انتیس حکومتیں مل کر بھی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں۔ ہماری مہربان حکومت بھی ان میں شامل تھی۔ صدام زندہ پھر رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو سمجھ عطا فرمائے اور غیرتِ ایمانی عطاء فرمائے۔

﴿ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ﴾ مسلط کر دی گئی ہے ان پر ذلت ﴿اَيْنَ مَا ثُقِفُوْٓا﴾ جہاں کہیں وہ پائے جائیں گے۔ مسکنت کا مطلب ہے کہ خود انسان اپنے آپ کو کمتر اور گھٹیا سمجھے۔ سب کچھ ہونے کے باوجود اپنے آپ کو مسکین سمجھے۔ تو یہ اہل کتاب خصوصاً یہودی جہاں بھی ہوں ان کا یہی حال ہوگا ﴿اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ﴾ مگر اللہ تعالیٰ کی رسی کو پکڑنے سے اور لوگوں کی رسی کو پکڑنے سے۔ اللہ تعالیٰ کی رسی کو پکڑنے کا مطلب ہے کہ مسلمان ہو جائیں یا مسلمان حکومت کے ٹیکس گزار ہو کر رہیں گے۔ اور لوگوں کی رسی پکڑنے کا مطلب ہے ان کی پناہ میں رہیں۔

جس طرح اسرائیل اقوام متحدہ خصوصاً امریکہ اور برطانیہ کی پناہ میں ہے۔ ان سے الگ ہو کر نہیں رہ سکتے۔ صدام حسین نے دو چار بم پھینکے تھے تو ان کے ہوش وحواس ہی گم ہو گئے تھے اور اپنے علاقے چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔ مگر پھر امریکہ نے ان کا دفاع کیا اور یہ واپس آئے۔

﴿وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ﴾ اور لوٹے وہ اللہ تعالیٰ کا غضب لے کر ﴿وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ﴾ اور اُن پر مسلط کی گئی ہے مسکنت، ذلت ﴿ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ﴾ یہ اس واسطے کہ بے شک وہ اللہ تعالیٰ کی آیتوں کا انکار کرتے تھے ﴿وَيَقْتُلُوْنَ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ﴾ اور قتل کرتے رہے اللہ تعالیٰ کے نبیوں کو ناحق۔

تیسرے پارے میں اس آیتِ کریمہ کی تحت ﴿وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۙ وَّيَقْتُلُوْنَ الَّذِيْنَ يَاْمُرُوْنَ بِالْقِسْطِ مِنَ النَّاسِ﴾ آپ سن چکے ہیں کہ ایک علاقہ تھا اس میں مختلف قومیں آباد تھیں جس طرح پاکستان میں مختلف قومیں آباد ہیں۔ اور

اس وقت ہر قوم کی طرف الگ الگ پیغمبر بھیجا جاتا تھا۔ یہ صرف آنحضرت ﷺ کی خصوصیت ہے کہ آپ ﷺ تمام قوموں کی طرف پیغمبر بنا کر بھیجے گئے ہیں۔ تو اس علاقے کے مجرم اکٹھے ہو گئے اور انھوں نے باہم مشورہ کیا کہ ہم ان کی تبلیغ سے تنگ آ گئے ہیں۔ یہ ہماری نہ دن کو جان چھوڑتے ہیں نہ رات کو ہر وقت وعظ ہی وعظ ہے۔ لہٰذا ان کا صفایا کرو۔ حضرت ابو عبیدہ ابن جراح رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ دو پہر تک انھوں نے تینتالیس [۴۳] پیغمبر شہید کیے اور ایک سو ستر [۱۷۰] حواری اور صحابی جوان کی مدد کے لیے آئے تھے ان کو ناحق قتل کیا۔

قتلِ حق کی تین صورتیں ہیں اور وہ تینوں صورتیں پیغمبروں میں نہیں پائی جاتیں۔

❀...... پہلی صورت یہ ہے کہ معاذ اللہ تعالیٰ کوئی مرتد ہو جائے تو اس کو تین دن کی مہلت دی جائے گی تا کہ وہ اپنے شکوک وشبہات دور کر لے اور توبہ کرلے۔ ورنہ قتل کر دیا جائے گا۔ پیغمبر کے بارے میں کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا کہ وہ اسلام کو چھوڑ دیں گے۔

❀...... اور دوسری صورت کہ شادی شدہ آدمی زنا کرے۔ تو اللہ تعالیٰ کا پیغمبر معصوم اور بڑے بلند اخلاق کا مالک ہوتا ہے۔ دیکھو! زلیخا نے حضرت یوسف علیہ السلام کو بڑا ورغلایا، پھسلایا اور بہت کچھ کیا مگر یوسف علیہ السلام نے اس کی شرارتوں کی ساری کڑیاں توڑ دیں اور فرمایا ﴿قَالَ مَعَاذَ اللهِ اِنَّهٗ رَبِّيْٓ اَحْسَنَ مَثْوَايَ﴾ "پناہ بخدا بے شک وہ میرا مالک ہے اس نے میرا ٹھکانا اچھا بنایا ہے ﴿اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ﴾ بے شک ظلم کرنے والے فلاح نہیں پاتے۔"

❀...... اور تیسری صورت ہے کہ کسی کو قصداً ناحق قتل کرنا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے خطأ ایک آدمی قتل ہوا تھا۔ وہ بڑا بدمغز تھا۔ موسیٰ علیہ السلام نے اس کو سمجھایا کہ بنی اسرائیلیوں سے تو ایندھن اُٹھواتا ہے ان کو مزدوری بھی دیا کر۔ کہنے لگا یہ ایندھن تیرے تنور کے واسطے تو ہے تو بھی وہاں سے روٹی کھاتا ہے۔ بڑی واہی تباہی باتیں کیں۔ موسیٰ علیہ السلام نے اس کو ایک مکا ٹکا دیا تا کہ اس کو ذرا سمجھ آ جائے ﴿فَقَضٰى عَلَيْهِ﴾ پس وہ مر گیا۔ حالاں کہ عادتاً مکے سے کوئی آدمی نہیں مرتا اور نہ ہی مکا آلہ قتل ہے۔ اگر مکے سے کوئی مرتا تو محمد علی کلے کبھی کا مر چکا ہوتا۔ جس نے مکے کھا کھا کے دولت اکٹھی کی ہے۔ یا اس جیسے جو دوسرے مکے باز ہیں۔ تو وہ اگرچہ خطأً قتل ہوا تھا مگر اس پر بھی اللہ تعالیٰ سے معافی مانگی اور رب تعالیٰ نے معاف کر دیا۔

تو یہود و نصاریٰ پر اس واسطے اللہ تعالیٰ کا غضب ہوا اور مسکنت مسلط کی گئی کہ وہ نبیوں کو ناحق قتل کرتے تھے ﴿ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّ كَانُوْا يَعْتَدُوْنَ﴾ یہ اس وجہ سے کہ انھوں نے نافرمانی کی اور تھے وہ تجاوز کرنے والے۔ اللہ تعالیٰ نے جو حدیں مقرر فرمائی تھیں ان سے وہ تجاوز کر گئے۔

﴿لَیْسُوْا سَوَآءً﴾ وہ اہلِ کتاب سب برابر نہیں ہیں ﴿مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ﴾ اہلِ کتاب میں سے ایک گروہ ہے ﴿قَآىِٕمَةٌ﴾ جو سیدھے راستے پر قائم ہے ﴿یَّتْلُوْنَ اٰیٰتِ اللّٰهِ﴾ جو تلاوت کرتا ہے اللہ تعالیٰ کی آیات کی ﴿اٰنَآءَ الَّیْلِ﴾ رات کے اوقات میں ﴿وَ هُمْ یَسْجُدُوْنَ﴾ اور وہ سجدہ کرتے ہیں ﴿یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ﴾ ایمان لاتے ہیں اللہ تعالیٰ پر ﴿وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ﴾ اور آخرت کے دن پر ﴿وَ یَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ﴾ اور حکم کرتے ہیں نیکی کا ﴿وَ یَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ اور منع کرتے ہیں بُرائی سے ﴿وَ یُسَارِعُوْنَ فِی الْخَیْرٰتِ﴾ اور وہ جلدی کرتے ہیں اچھے کاموں کے کرنے میں ﴿وَ اُولٰٓىِٕكَ مِنَ الصّٰلِحِیْنَ﴾ اور وہی لوگ نیکوں میں سے ہیں ﴿وَ مَا یَفْعَلُوْا مِنْ خَیْرٍ﴾ اور جو بھی کریں گے وہ اچھا کام ﴿فَلَنْ یُّكْفَرُوْهُ﴾ پس ہرگز ان کی ناقدری نہیں کی جائے گی ﴿وَ اللّٰهُ عَلِیْمٌۢ بِالْمُتَّقِیْنَ﴾ اور اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے پرہیزگاروں کو ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا﴾ بے شک وہ لوگ جنھوں نے کفر اختیار کیا ﴿لَنْ تُغْنِیَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ﴾ ہرگز نہیں کفایت کریں گے ان کو ان کے مال ﴿وَ لَاۤ اَوْلَادُهُمْ﴾ اور نہ ان کی اولاد ﴿مِّنَ اللّٰهِ شَیْــٴًـا﴾ اللہ تعالیٰ کی پکڑ سے کچھ بھی ﴿وَ اُولٰٓىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ﴾ اور وہ لوگ دوزخ والے ہیں ﴿هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ﴾ وہ دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے ﴿مَثَلُ مَا یُنْفِقُوْنَ﴾ مثال اس چیز کی جو وہ خرچ کرتے ہیں ﴿فِیْ هٰذِهِ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا﴾ اس دنیا کی زندگی میں ﴿كَمَثَلِ رِیْحٍ﴾ اُس ہوا کی مثال ہے ﴿فِیْهَا صِرٌّ﴾ جس میں سخت ٹھنڈک ہے ﴿اَصَابَتْ حَرْثَ قَوْمٍ﴾ وہ پہنچی ایسی قوم کی کھیتی کو ﴿ظَلَمُوْۤا اَنْفُسَهُمْ﴾ جنھوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا ﴿فَاَهْلَكَتْهُ﴾ پس اس ہوا نے اس کو ہلاک کر دیا ﴿وَ مَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ﴾ اور نہیں ظلم کیا اُن پر اللہ تعالیٰ نے ﴿وَ لٰكِنْ اَنْفُسَهُمْ یَظْلِمُوْنَ﴾ اور لیکن وہ اپنی جانوں پر خود ظلم کرتے تھے۔

پہلے سے یہود کا ذکر چلا آرہا ہے اب بھی انہی کا ذکر ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ﴿لَیْسُوْا سَوَآءً مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ﴾ وہ اہلِ کتاب سب برابر نہیں ہیں اہلِ کتاب میں سے ایک گروہ ہے ﴿قَآىِٕمَةٌ﴾ جو سیدھے راستے پر قائم ہے ﴿یَّتْلُوْنَ اٰیٰتِ اللّٰهِ﴾ جو تلاوت کرتا ہے اللہ تعالیٰ کی آیات کی ﴿اٰنَآءَ الَّیْلِ﴾ رات کے اوقات میں۔ جیسے: حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ جب یہود تھے ایک مسافر نے ان کے پاس بارہ سو اوقیہ سونا امانت رکھی بغیر کسی تحریر اور گواہ کے جو تقریباً بیس لاکھ روپیہ بنتا ہے۔ کچھ مدت کے بعد آیا اور امانت طلب کی۔ انھوں نے وہ امانت فوراً اُٹھا کر اس کے حوالے کر دی۔ جس کا ذکر تیسرے پارے کے آخر میں گزر چکا ہے۔ اور ان کے مقابلہ میں فخاص ابن عازورا کہ اس کے پاس ایک مسافر نے ایک دینار رکھا۔ جب وہ واپس لینے کے لیے آیا تو اس نے کئی پینترے بدلے۔

﴿اُمَّةٌ قَآىِٕمَةٌ﴾ سے مراد حضرت عبداللہ بن سلام، حضرت اسد، حضرت اسید، حضرت بن یامین، حضرت ثعلبہ رضی اللہ عنہم جیسے لوگ مراد ہیں۔ اسی طرح نصاریٰ میں سے حضرت سلمان فارسی، حضرت تمیم داری، حضرت عدی ابن حاتم رضی اللہ عنہم جیسے لوگ مراد ہیں۔

﴿یَتْلُوْنَ اٰیٰتِ اللّٰهِ﴾ کی ایک تفسیر یہ کرتے ہیں کہ قرآن پاک نازل ہونے سے پہلے جب تورات، انجیل، زبور منسوخ نہیں ہوئی تھیں تو یہ ان کتابوں کی تلاوت کرتے تھے اور ان پر عمل کرتے تھے حق پر قائم تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے منتظر تھے۔ اور مفسرین کرام کا ایک گروہ یہ تفسیر کرتا ہے کہ ﴿اٰیٰتِ اللّٰهِ﴾ سے مراد قرآن پاک کی آیتیں ہیں کہ وہ مسلمان ہوئے اور قرآن پاک کی تلاوت کرتے ہیں۔

﴿اٰنَآءَ الَّیْلِ﴾ اٰنَآءَ جمع ہے اِنًی کی۔ رسم الخط اس کا اِنًی کی طرح ہے مگر یہاں نون پر دو زبریں ہیں۔ معنیٰ ہے وقت۔ تو ﴿اٰنَآءَ الَّیْلِ﴾ کا معنیٰ بنے گا رات کے اوقات۔ جو تلاوت کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کی آیتوں کو رات کے اوقات میں ﴿وَهُمْ یَسْجُدُوْنَ﴾ اور وہ سجدہ کرتے ہیں۔ یعنی تہجد کی نماز پڑھتے ہیں۔ ﴿یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ﴾ ایمان لاتے ہیں اللہ تعالیٰ پر اور آخرت کے دن پر ﴿وَیَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ اور حکم کرتے ہیں نیکی کا اور منع کرتے ہیں بُرائی سے ﴿وَیُسَارِعُوْنَ فِی الْخَیْرٰتِ﴾ اور وہ جلدی کرتے ہیں اچھے کاموں کے کرنے میں۔ جیسے: حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ اپنی کھجوروں سے کھجوریں اُتار رہے تھے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کی اطلاع ہوئی آواز آئی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ طیبہ میں داخل ہو گئے ہیں۔ تو وہ اس حالت میں کہ کھجوریں ہاتھ میں ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ کیوں کہ پہلی کتابوں میں نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کی نشانیاں پڑھی ہوئی تھیں۔ یہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچے آپ صلی اللہ علیہ وسلم بیان فرما رہے تھے اے لوگو! ((اَفْشُوا السَّلَامَ)) "سلام کو خوب پھیلاؤ ((وَاَطْعِمُوا الطَّعَامَ)) اور غریبوں مسکینوں کو کھانا کھلاؤ ((وَلَیِّنُوْا بِالْكَلَامِ)) اور آپس میں گفتگو کرو تو نرمی کے ساتھ کرو ((فَصَلُّوْا بِاللَّیْلِ وَالنَّاسُ نِیَامٌ)) پس تم راتوں کو جاگ کر نماز پڑھو جب لوگ سوئے ہوئے ہوں۔"

حضرت عبداللہ ابن سلام رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا بیان سنا اور چہرہ اقدس دیکھا تو فیصلہ کیا اِنَّ هٰذَا الْوَجْهَ لَیْسَ بِوَجْهِ كَذَّابٍ "بے شک یہ چہرہ جھوٹے کا چہرہ نہیں ہے۔" چوں کہ دل کا شیشہ بالکل صاف تھا بیان فوراً ذہن میں اُتر گیا اور اسی مجلس میں کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو گئے۔

دوسرے یہودیوں کو بھی معلوم ہو گیا کہ عبداللہ ابن سلام رضی اللہ عنہ پہنچ گئے ہیں ہم بھی جائیں دیکھیں۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو علم ہوا کہ دوسرے یہودی بھی آرہے ہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ ابن سلام رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ یہودی آرہے ہیں ان کو میں تمہارے حوالے سے ایمان کی دعوت دوں گا کہ عبداللہ ابن سلام مسلمان ہو گیا ہے تم بھی مسلمان ہو جاؤ۔ تو حضرت عبداللہ ابن سلام رضی اللہ عنہ نے کہا حضرت! میں پردے کے پیچھے بیٹھ جاتا ہوں پہلے ان سے میرے بارے میں دریافت فرمائیں کہ

میرا ان کے ہاں کیا مقام ہے؟ اگر وہ مسلمان ہو جائے تو تم بھی مسلمان ہو جاؤ گے؟ چنانچہ بخاری شریف کی روایت ہے کہ یہ پردے کی اوٹ میں بیٹھ گئے۔ جب دوسرے یہودی آئے ان سے گفتگو ہوئی۔ دورانِ گفتگو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ((کیف نیك عبدالله ابن سلام ؟)) "عبداللہ ابن سلام تم میں کیسا آدمی ہے؟" کہنے لگے:

((خَیْرُنَا وَابْنُ خَیْرِنَا سَیِّدُنَا وَابْنُ سَیِّدِنَا اَفْضَلُنَا وَابْنُ اَفْضَلِنَا اَعْلَمُنَا وَابْنُ اَعْلَمِنَا)).

یہ چاروں لفظ بخاری شریف کی مختلف روایتوں میں موجود ہیں کہ: "ہم میں سے سب بہتر ہے اور سب سے بہتر کا بیٹا ہے اور ہمارا سردار ہے اور ہمارے سردار کا بیٹا ہے اور ہم میں سے افضل ہے اور افضل کا بیٹا ہے اور ہم میں بڑا عالم ہے اور بڑے عالم کا بیٹا ہے۔"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ عبداللہ ابن سلام رضی اللہ عنہ مسلمان ہو جائے تو پھر تمھاری کیا پوزیشن ہو گی؟ یہودی کہنے لگے ((اَعَاذَہُ اللہُ مِنَ الْاِسْلَامِ)) "اللہ تعالیٰ اس کو اسلام سے بچائے۔" یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ عبداللہ ابن سلام رضی اللہ عنہ پردے سے نکل کر سامنے آ گئے اور سب کے سامنے نکا کر پڑھا ((اَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْكَ لَہٗ وَاَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَ رَسُوْلُہٗ)). جب کلمہ سنا تو وہی یہودی کہنے لگے ((شَرُّنَا وَابْنُ شَرِّنَا)) "ہم میں سے بڑا شرارتی ہے اور بڑے شرارتی کا بیٹا ہے۔"

تو یہودیوں میں اچھے لوگ بھی تھے نیکیوں میں سبقت لے جانے والے۔ نیکی میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرنا اچھا جذبہ ہے۔ رب تعالیٰ جس کو توفیق عطاء فرمائے۔ یہ حسد نہیں ہے۔ اس کو غبطہ اور رشک کہتے ہیں کہ فلاں جتنی نیکیاں کرتا ہے میں اس سے زیادہ کروں۔ البتہ نیکی کا دار و مدار نیت پر ہے۔

ابوداؤد شریف میں روایت ہے کہ ایک موقع پر جہادی مہم کے لیے رقم کی ضرورت تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہمیں رقم کی ضرورت ہے جو جتنی زیادہ سے زیادہ دے سکتا ہے دے۔ ان دنوں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی مالی پوزیشن مضبوط تھی۔ فرمانے لگے کہ اس موقع پر میں ابوبکر رضی اللہ عنہ سے نمبر لے جاؤں گا۔ کیوں کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایک دوسرے کے حالات سے واقف تھے۔ ان کو معلوم تھا کہ میری مالی پوزیشن ابوبکر سے مضبوط ہے۔ وہ تھوڑا مال لائیں گے اور میں زیادہ مال لاؤں گا۔

خاصا مجمع تھا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے رقم رکھی۔ مثال کے طور پر وہ پانچ ہزار تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے رقم لا کر رکھی۔ مثال کے طور پر وہ بیس ہزار تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ عمر کیا لائے ہو اور گھر والوں کے لیے کیا چھوڑ کر آئے ہو؟ کہنے لگے حضرت! آدھا مال لے کر آیا ہوں اور آدھا مال گھر والوں کے لیے چھوڑ آیا ہوں۔ فرمایا ٹھیک ہے گھر والوں کا بھی حق ہے۔ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ تم کیا لائے ہو اور گھر والوں کے لیے کیا چھوڑ کر آئے ہو؟ کہنے لگے حضرت! گھر میں جو کچھ تھا سارا صاف کر کے لایا ہوں۔ گھر والوں کے لیے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت چھوڑ کر آیا ہوں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ باپ سے نمبر لے جانا مشکل ہے۔

کیوں کہ نیکی کا مدار نیت پر ہے۔ ہم تم بھی نیکیاں کرتے ہیں اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بھی نیکیاں کیں۔ مگر یقین جانو! ان کی ایک نیکی کو ہماری ہزاروں نیکیاں نہیں پہنچ سکتیں۔ کیوں جتنا اخلاص، للّٰہیت اور اتباع سنت کا جذبہ ان میں تھا معاف رکھنا! وہ ہم میں نہیں ہے۔ تو جو نیکی میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

فرمایا ﴿وَاُولٰٓئِکَ مِنَ الصّٰلِحِیْنَ﴾ اور وہی لوگ نیکوں میں سے ہیں ﴿وَمَا یَفْعَلُوْا مِنْ خَیْرٍ﴾ اور جو بھی کریں گے وہ اچھا کام ﴿فَلَنْ یُّکْفَرُوْہُ﴾ پس ہرگز ان کی ناقدری نہیں کی جائے گی۔ اللہ تعالیٰ شاکر و علیم ہے ان کی نیکی کو قبول فرما کر بہتر اجر عطاء فرمائے گا۔ بلکہ حدیث پاک کے مطابق ایسے لوگوں کو دوہرا اجر ملے گا۔ پہلے موسیٰ یا عیسیٰ پر ایمان لائے تھے۔ ایک اجر اس ایمان کا ملے گا اور دوسرا اجر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لانے کا۔ اور ویسے بھی اس کے ہاں عطاء کا یہ عالم ہے کہ اگر کوئی شخص ایمان کی حالت میں کھجور کا ایک دانہ صدقہ کرتا ہے تو وہ اس کو بڑھا بڑھا کر پہاڑ کے برابر کر دیتا ہے۔ قیامت والے دن جب اس کو بدلہ ملے گا تو وہ بندہ کہے گا میں نے تو ایک دانہ کھجور کا صدقہ کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ میں نے اس کو حسنِ نیت کی وجہ سے اتنا بڑھا دیا ہے۔ اور عام طور پر اللہ تعالیٰ کا ضابطہ ہے کہ ایک نیکی کا اجر دس گنا ملتا ہے۔ اور اگر نیکی فی سبیل اللہ کی مد میں ہو تو ایک نیکی کا اجر سات سو گنا ملتا ہے ﴿وَاللّٰہُ یُضٰعِفُ لِمَنْ یَّشَآءُ﴾ [البقرۃ: ۲۶۱] ”اور اللہ تعالیٰ جس کے مال کو چاہتا ہے زیادہ کرتا ہے۔“ ﴿وَاللّٰہُ عَلِیْمٌۢ بِالْمُتَّقِیْنَ﴾ اور اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے پرہیزگاروں کو۔

آگے اللہ تعالیٰ نے کافروں کے باطل قیاس کا رد فرمایا ہے۔ وہ کہتے تھے کہ اول تو قیامت کوئی شے ہے ہی نہیں۔ اور اگر بالفرض ہوئی بھی تو ہمیں وہاں بھی بہت کچھ ملے گا۔ وہ دنیا پر آخرت کو قیاس کرتے تھے۔ تو چونکہ دُنیا میں رب تعالیٰ نے ہمیں کافی مال اور اولاد عطاء فرمائی ہے یہ اس بات کی دلیل ہے کہ وہ ہم پر راضی ہے۔ لہٰذا اگر قیامت ہوئی تو وہاں بھی ہمیں بہت کچھ ملے گا۔ وہ مال و دولت کی کثرت کو اللہ تعالیٰ کے راضی ہونے کی دلیل سمجھتے تھے۔ یہ ان کا باطل اور غلط قیاس تھا۔ کیوں کہ دنیا کا سلسلہ اور ہے اور آخرت کا سلسلہ اور ہے۔

دنیا میں تو فرعون اور قارون جیسے شخص کو بہت کچھ ملا ہے اور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ حالت تھی کہ دو دو مہینے چولہے میں آگ نہیں جلتی تھی۔ اور ساری زندگی میں گھر کے اندر ایک دفعہ چراغ کا جلنا ثابت ہے۔ سحری کے وقت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اندھیرے میں ہی نماز پڑھتے تھے۔ چھوٹا سا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کمرہ تھا جس میں صرف چار قبروں کی جگہ ہے۔ ظاہری طور پر کوئی حفاظت نہیں تھی کوئی پہرے دار نہیں تھا۔ صرف رب تعالیٰ کی حفاظت تھی۔ تو ان کا یہ قیاس کرنا کہ جس کو دنیا مل گئی اس پر اللہ تعالیٰ راضی ہے اور جس کو نہیں ملی اس پر اللہ تعالیٰ ناراض ہے، یہ قیاس غلط ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا﴾ بے شک وہ لوگ جنھوں نے کفر اختیار کیا ﴿لَنْ تُغْنِیَ عَنْھُمْ اَمْوَالُھُمْ وَلَآ اَوْلَادُھُمْ مِّنَ اللّٰہِ شَیْئًا﴾ ہرگز نہیں کفایت کریں گے ان کو ان کے مال اور نہ ان کی اولاد اللہ تعالیٰ کی پکڑ سے کچھ بھی ﴿وَاُولٰٓئِکَ

اَصْحٰبُ النَّارِ﴾ اور وہ لوگ دوزخ والے ہیں ﴿هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ﴾ وہ دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے کبھی بھی دوزخ سے نکلنا نصیب نہیں ہوگا۔ دوزخ سے صرف اہل ایمان اور اہل توحید ہی نکلیں گے جو عملی کمزوریوں کی وجہ سے دوزخ میں جائیں گے۔ اور دوزخ کا اوپر والا طبقہ انہی لوگوں کے لیے ہے۔ ایک وقت آئے گا کہ یہ طبقہ سارے کا سارا خالی ہو جائے گا۔ کیوں جو مسلمان سب سے بڑا گناہ گار ہوگا وہ بھی نکل آئے گا۔ جہنم کے باقی جو چھ طبقات ہوں گے ان میں بدستور ہمیشہ جہنمی رہیں گے۔ اور ان کو اتنی سخت سزا ہوگی کہ جہنم کے انچارج فرشتوں کو کہیں گے کہ ﴿ادْعُوْا رَبَّكُمْ يُخَفِّفْ عَنَّا يَوْمًا مِّنَ الْعَذَابِ﴾ [المومن:۴۹، پارہ:۲۴] "اپنے پروردگار سے گزارش کرو کہ ایک دن کے لیے ہم سے عذاب ہلکا کر دے کہ ہم سکھ کا سانس لے سکیں ﴿قَالُوْٓا اَوَلَمْ تَكُ تَاْتِيْكُمْ رُسُلُكُمْ بِالْبَيِّنٰتِ﴾ (انچارج فرشتے جواب دیں گے) کہیں گے کیا تمھارے پاس پیغمبر نشانیاں لے کر نہیں آئے تھے۔" اللہ تعالیٰ کے احکام نہیں پہنچے؟ وہ کہیں گے سب کچھ پہنچا مگر ﴿غَلَبَتْ عَلَيْنَا شِقْوَتُنَا﴾ [المومنون:۱۰۶] "ہم پر ہماری بدبختی غالب آگئی تھی۔" یہ کہیں گے پھر اب بھگتو ہم کچھ نہیں کر سکتے۔

اگلی آیت میں کافروں کے ایک مشہور اعتراض کا جواب دیا گیا ہے۔ ان کا اعتراض یہ ہے کہ اگر تم نیکی کرو تو تمھیں اس کا ثواب دس گنا ملے اور ہم اگر نیکی کریں تو ہمارے لیے کوئی ثواب نہ ہو۔ یہ کیسی تقسیم ہوئی؟ اور یاد رکھنا! کافر اس وقت بھی بڑے بڑے صدقے اور خیرات کرتے تھے اور اب بھی کرتے ہیں۔ بلکہ اگر مجموعی طور پر دیکھا جائے تو کافر حکومتیں رفاہِ عام کے کام بہ نسبت مسلمان حکومتوں کے زیادہ کرتی ہیں۔ اور وہ لوگ جو کام کرتے ہیں پوری دیانت داری کے ساتھ کرتے ہیں۔ اور ہم مسلمان ہونے کے باوجود پرلے درجے کے بددیانت ہیں۔ الا ماشاء اللہ ہزار میں سے کوئی ایک دیانت دار نکل آئے تو بڑی بات ہے۔ دھوکا، فراڈ اور بددیانتی کا نام ہم نے ہنر اور چالاکی رکھ لیا ہے۔ اور بڑے سے لے کر چھوٹے تک سب اس میں مبتلا ہیں۔

سڑکوں کے ٹھیکے داروں کو ہی دیکھ لو! ریت سڑک پر لگ جاتی ہے اور باقی میٹریل ان کی کوٹھیوں پر لگ جاتا ہے۔ سڑک چھ ماہ میں ٹوٹ پھوٹ جاتی ہے اور کافروں کی بنی ہوئی سڑکیں سالہا سال تک چلتی ہیں۔ کافر پیکنگ کرتے ہیں اوپر جو کچھ لکھا ہوتا ہے اندر بھی وہی کچھ ہوتا ہے۔ اور مسلمانوں کی حالت یہ ہے کہ اوپر کچھ لکھا ہوا ہے اور اندر کچھ ہوتا ہے۔ بُری قوموں کی ساری علامتیں اور نشانیاں اور ان کے کام ہم نے اپنا لیے ہیں اور ہمارے اچھے کام سارے انھوں نے لے لیے ہیں۔

تو کافر اس وقت بھی صدقہ خیرات کرتے تھے اور اب بھی کرتے ہیں۔ حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کے بھتیجے حکیم ابن حزام رضی اللہ عنہ نے حالت کفر میں سو غلام آزاد کیے تھے اور سو اونٹ غریبوں میں تقسیم کیے تھے کہ تم ان کے ذریعے اپنا کام چلاؤ۔ اسی طرح اور لوگوں نے بھی بڑے بڑے صدقے کیے تھے۔ تو وہ کہتے تھے کہ تم نیکی کرو تو بدلا ملے اور ہم نیکی کریں تو بدلا نہ ملے۔ یہ کیسی تقسیم ہے؟ یہ تھا کافروں کا اعتراض۔

اللہ تعالیٰ نے اس کا جواب مثال کے ذریعے دیا ہے۔ اس کو اچھی طرح سمجھنا۔ وہ اس طرح کہ جو لوگ دسمبر جنوری کے مہینے میں سبزیاں کاشت کرتے ہیں ان سبزیوں کو سرد ہواؤں سے بچانے کے لیے اوپر چھپر لگاتے ہیں تاکہ سبزیاں مر نہ

جائیں۔ تو جس طرح سبزیوں کو سرد ہواؤں سے محفوظ رکھنے کے لیے چھپر کی ضرورت ہے اسی طرح نیکیوں کو محفوظ رکھنے کے لیے ایمان، اخلاص اور اتباع سنت کی ضرورت ہے۔ یہ نیکیوں کے لیے چھپر ہے۔ کافر نیکیاں تو کرتے ہیں مگر ان کو محفوظ رکھنے کے لیے چھپر نہیں بناتے۔ اس واسطے ان کی نیکیاں ضائع ہو جاتی ہیں۔ بعض علاقوں میں گرم ہواؤں کی وجہ سے بھی سبزیاں سڑ جاتی ہیں۔ وہ بھی حفاظت کے لیے چھپر بناتے ہیں۔

اس ﴿صِرٌّ﴾ کے معنیٰ گرمی کے کریں گے۔ کیوں کہ صِرٌّ کے دو معنیٰ مستعمل ہیں۔ سردی کے بھی اور گرمی کے بھی۔ البتہ ہمارے علاقوں میں عموماً سردی میں چھپر بناتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ﴿مَثَلُ مَا یُنْفِقُوْنَ فِیْ هٰذِهِ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا﴾ مثال اس چیز کی جو وہ خرچ کرتے ہیں اس دنیا کی زندگی میں ﴿كَمَثَلِ رِیْحٍ فِیْهَا صِرٌّ﴾ اُس ہوا کی مثال ہے جس میں سخت ٹھنڈک ہو ﴿اَصَابَتْ حَرْثَ قَوْمٍ﴾ وہ پہنچی ایسی قوم کی کھیتی کو ﴿ظَلَمُوْۤا اَنْفُسَهُمْ﴾ جنھوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا کہ تحفظ کے لیے اس کے اوپر چھپر نہیں بنایا ﴿فَاَهْلَكَتْهُ﴾ پس اس تیز اور سرد ہوا نے اس کھیتی کو تباہ اور برباد کر دیا۔ اسی طرح اگر ایمان، اخلاص اور اتباع سنت کا چھپر نہیں بناؤ گے تو کفر اور شرک کی آندھی سے تمھارے اعمال برباد ہو جائیں گے۔ ﴿وَمَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ﴾ اور نہیں ظلم کیا اُن پر اللہ تعالیٰ نے ﴿وَلٰكِنْ اَنْفُسَهُمْ یَظْلِمُوْنَ﴾ اور لیکن وہ اپنی جانوں پر خود ظلم کرتے تھے کہ انھوں نے اپنی نیکیوں کو محفوظ کرنے کے لیے ایمان، اخلاص اور اتباع سنت کا چھپر نہیں بنایا۔ اس وجہ سے کافروں اور مشرکوں کی نیکیاں تباہ اور برباد ہو جاتی ہیں اور آخرت میں ان کو کوئی بدلا نہیں ملے گا۔ اور ایمان والوں کی نیکیاں ایمان، اخلاص اور اتباع سنت کی وجہ سے محفوظ ہو جاتی ہیں۔ لہٰذا ان کو بدلا ملے گا۔

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا﴾ اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو ﴿لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً﴾ نہ بناؤ تم راز دان ﴿مِّنْ دُوْنِكُمْ﴾ اپنے سوا دوسروں کو ﴿لَا یَاْلُوْنَكُمْ خَبَالًا﴾ وہ نہیں کمی کرتے تمھارے واسطے فساد کی ﴿وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ﴾ وہ پسند کرتے ہیں اس کو کہ تم مشقت میں پڑ جاؤ ﴿قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَآءُ﴾ تحقیق ظاہر ہو گیا بغض ﴿مِنْ اَفْوَاهِهِمْ﴾ ان کے مونہوں سے ﴿وَمَا تُخْفِیْ صُدُوْرُهُمْ﴾ اور جو مخفی رکھتے ہیں ان کے سینے ﴿اَكْبَرُ﴾ وہ بہت بڑی چیز ہے ﴿قَدْ بَیَّنَّا لَكُمُ الْاٰیٰتِ﴾ تحقیق ہم نے بیان کی ہیں تمھارے واسطے آیتیں ﴿اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ﴾ اگر تم سمجھتے ہو ﴿هٰۤاَنْتُمْ اُولَآءِ﴾ خبردار تم یہ ہو ﴿تُحِبُّوْنَهُمْ﴾ ان کے ساتھ محبت کرتے ہو ﴿وَلَا یُحِبُّوْنَكُمْ﴾ اور وہ تمھارے ساتھ محبت نہیں کرتے ﴿وَتُؤْمِنُوْنَ بِالْكِتٰبِ كُلِّهٖ﴾ اور تم ایمان رکھتے ہو سب کتابوں پر ﴿وَاِذَا لَقُوْكُمْ﴾ اور جس وقت وہ ملتے ہیں تمھیں ﴿قَالُوْۤا اٰمَنَّا﴾ کہتے ہیں ہم بھی ایمان لائے ﴿وَاِذَا خَلَوْا﴾ اور جس وقت وہ الگ ہوتے ہیں ﴿عَضُّوْا عَلَیْكُمُ الْاَنَامِلَ﴾ کاٹتے ہیں وہ تم پر انگلیوں کے سرے ﴿مِنَ الْغَیْظِ﴾ غصے کی وجہ سے ﴿قُلْ مُوْتُوْا بِغَیْظِكُمْ﴾ کہہ

دیجیے! مر جاؤ تم اپنے غصے میں ﴿اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ﴾ بے شک اللہ تعالیٰ جانتا ہے ﴿بِذَاتِ الصُّدُوْرِ﴾ دلوں کے رازوں کو ﴿اِنْ تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ﴾ اگر پہنچتی ہے تمھیں راحت ﴿تَسُؤْهُمْ﴾ انہیں بری لگتی ہے ﴿وَاِنْ تُصِبْكُمْ سَيِّئَةٌ﴾ اور اگر پہنچتی ہے تمھیں تکلیف ﴿يَّفْرَحُوْا بِهَا﴾ تو اس پر وہ خوش ہوتے ہیں ﴿وَاِنْ تَصْبِرُوْا﴾ اور اگر تم صبر کرو ﴿وَتَتَّقُوْا﴾ اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو ﴿لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْئًا﴾ نہیں نقصان پہنچائے گی تمھیں ان کی تدبیر کچھ بھی ﴿اِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ﴾ بے شک اللہ تعالیٰ جو کچھ وہ عمل کرتے ہیں ﴿مُحِيْطٌ﴾ احاطہ کرنے والا ہے۔

بدعقیدہ لوگوں سے دوستی کی ممانعت

اس سے پہلی آیات میں اس چیز کا بیان تھا کہ عقیدے کی خرابی کی وجہ سے اعمال برباد ہو جاتے ہیں۔ آج کی آیات میں اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں کو حکم دیا ہے کہ بدعقیدہ لوگوں کے ساتھ تمھارا دوستانہ نہیں ہونا چاہیے۔ کیوں کہ دوستی میں نرمی ہوتی ہے اور مومن ویسے ہی نرم ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ﴿رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ﴾ "رحم دل ہیں آپس میں" یعنی ایک دوسرے کے ساتھ بڑی شفقت کرتے ہیں۔ اور حدیث پاک میں آتا ہے کہ مومن کی شان یہ ہے کہ لوگ اس کے قریب ہوں اس سے نفرت نہ کریں۔ مطلب یہ ہے کہ مومن اخلاق کے لحاظ سے، بول چال کے لحاظ سے، برتاؤ کے اعتبار سے ایسا ہو کہ لوگ اس کے قریب آئیں۔ برے معاملہ والا اور بداخلاق نہ ہو کہ لوگ اس سے دور بھاگیں۔ ظاہر بات ہے کہ جو زبان اور معاملہ کا برا ہوگا اس کے قریب کون آئے گا؟

اور یہ بھی حدیث میں آتا ہے کہ: ((اَلْمُؤْمِنُ غِرٌّ كَرِيْمٌ)) "مومن بھولا بھالا اور سادہ ہوتا ہے ((وَالْفَاجِرُ خَبٌّ لَئِيْمٌ)) اور منافق دھوکے باز اور کمینہ ہوتا ہے۔" وہ گفتگو اور برتاؤ میں اپنا کمینہ پن نہیں چھوڑتا۔ تو مومن چونکہ نرم دل اور سادہ ہوتا ہے تو بعض مومن اپنی سادگی کی بنا پر کچھ باتیں یہودیوں اور منافقوں کو بتا دیتے تھے جس سے قومی نقصان ہوتا تھا۔ تو اللہ تعالیٰ نے تنبیہ فرمائی۔

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو ﴿لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ﴾ نہ بناؤ تم رازدان اپنے دوسروں کو۔ کسی کافر کے ساتھ ایسا دوستانہ کہ راز کی باتیں اسے بتائی جائیں ممنوع ہے۔ کیوں کہ دشمن، دشمن ہے۔ اگر اس تمھاری راز کی باتیں معلوم ہو گئیں تو تمھیں بحیثیت مسلمان کے نقصان ہوگا۔ لہٰذا کسی کافر کو اپنی خاص باتوں کا رازدان نہ بناؤ۔ ہاں! اس کے ساتھ ظاہر داری رکھو کہ اچھے طریقے سے پیش آؤ۔ ویسے بھی آنحضرت ﷺ نے دوستی اور دشمنی کے بارے میں ایک ضابطہ بیان فرمایا ہے۔ چنانچہ ترمذی شریف میں روایت آتی ہے آنحضرت ﷺ نے فرمایا ((اَحْبِبْ حَبِيْبَكَ هَوْنًا مَّا)) "کسی کے ساتھ دوستی کرو تو اعتدال کے ساتھ۔ اتنے گھل مل نہ جاؤ کہ ساری راز کی باتیں بتا دو بلکہ اعتدال کی حد میں رہو ((عَسٰى اَنْ يَّكُوْنَ بَغِيْضَكَ يَوْمًا مَّا)) ہو سکتا ہے کسی وقت تیرا دشمن ہو جائے تو تمھاری ساری پوتھلیاں کھول دے اور تمھیں

زک پہنچائے۔ مشہور مقولہ ہے: "گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے۔"

اور فرمایا ((اَبْغِضْ بَغِيْضَكَ هَوْنًا مَّا)) اور جن کے ساتھ تیری عداوت ہے وہ بھی اعتدال کے ساتھ ہو ((عَسٰى اَنْ يَّكُوْنَ حَبِيْبَكَ هَوْنًا مَّا)) ہوسکتا ہے وہ تیرا دشمن کسی وقت تیرا دوست بن جائے تو اس وقت دشمنی کے دور میں جو سخت باتیں کی ہوں گی ان پر تجھے پشیمانی ہوگی۔" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو فرمایا ہے عین فطرت کے مطابق ہے کہ دوستی بھی اعتدال کے ساتھ اور دشمنی بھی اعتدال کے ساتھ۔

لیکن کافروں کے ساتھ دوستی اور ان کو راز دان بنانا ممنوع ہے۔ کیونکہ ﴿لَا يَاْلُوْنَكُمْ خَبَالًا﴾ وہ نہیں کمی کرتے تمھارے واسطے فساد کی۔ وہ ہر وقت فساد کے درپے ہیں۔ ان کو راز کی بات بتا کر خواہ مخواہ اپنے آپ کو مشقت میں ڈالتے ہو ﴿وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ﴾ وہ پسند کرتے ہیں اس کو کہ تم مشقت میں پڑ جاؤ، مصیبت میں مبتلا ہو جاؤ۔ یعنی وہ اس کو پسند کرتے ہیں کہ کسی طرح تمھارے اوپر مصیبت آئے ﴿قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَآءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ﴾ تحقیق ظاہر ہو گیا بغض ان کے مونہوں سے ﴿وَمَا تُخْفِيْ صُدُوْرُهُمْ اَكْبَرُ﴾ اور جو مخفی رکھتے ہیں ان کے سینے وہ بہت بڑی چیز ہے۔ یعنی تمھارے خلاف جو نفرت اور کینہ ہے وہ تو بہت زیادہ ہے۔

تو کافر کافر ہے اس کی دوستی سے کبھی غلط فہمی کا شکار نہیں ہونا چاہیے کہ بھارت نے تمھیں کھیل کے لیے بلا لیا اور تم کھیل میں جیت گئے تو بھنگڑے ڈالنا شروع کر دیے۔ ٹھیک ہے کھیل میں تم کامیاب ہو گئے ہو۔ جیت لیا تو کیا ہو گیا؟ انھوں نے تمھارے کروڑوں روپے کے ٹینکر تباہ کر دیے اور مجاہد شہید کر دیے۔ اس پر تمھیں رونا چاہیے۔ کس چیز کے لڈو بانٹتے ہو؟ میچ جیت کر تم نے ہندوستان فتح کر لیا ہے؟ دشمن دشمن ہے اس کو دشمن ہی سمجھو۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ ایک وقت آئے گا تمھاری ہندوستان کے ساتھ سخت لڑائی ہوگی کہ طرفین سے کوئی قسمت والا ہی بچے گا۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ وہ وقت تو قریب ہی آ گیا ہے معلوم نہیں کب جنگ چھڑ جائے؟

﴿قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيٰتِ﴾ تحقیق ہم نے بیان کی ہیں تمھارے واسطے آیتیں ﴿اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ﴾ اگر تم عقل اور سمجھ رکھتے ہو تو ان آیتوں پر عمل کرو اور کافر پر کسی وقت بھی اعتماد نہ کرو۔ کافر بڑا مکار اور چال باز ہوتا ہے۔

جنگ بدر کے موقع پر ایک کافر جاسوسی کے لیے آیا۔ بڑی میٹھی اور نرم زبان رکھتا تھا۔ مسلمانوں کے ساتھ نرم نرم باتیں کیں۔ کہنے لگا میں کلمہ پڑھتا ہوں دیکھو اس میں کوئی غلطی تو نہیں ہے؟ اور قرآن پاک کی کچھ سورتیں بھی اس کو یاد تھیں وہ بھی سنائیں اور مسلمانوں کو اعتماد میں لینے کی پوری کوشش کی۔ بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے سمجھا کہ یہ تو ہمارا پختہ مسلمان بھائی ہے کہ اس نے بعض وہ مسائل بیان کیے ہیں کہ جن کا ہمیں بھی علم نہیں ہے۔ اور بڑے مسائل بیان کر رہا ہے۔ اور جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بڑے زیرک اور ذہین تھے ان کو شک ہوا۔ کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے سب کو برابر سمجھ عطاء نہیں فرمائی۔ ہر دور میں ذہین بھی ہوتے ہیں اور غبی بھی۔ تو انھوں نے پکڑا اور چھترول کی تو مان گیا کہ میں جاسوس ہوں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بڑی کوشش کی کہ معلوم ہو جائے کہ

کافروں کی کتنی تعداد ہے؟ مگر وہ بڑا پختہ آدمی تھا۔ جب پٹائی ہوتی تو کہتا بتاتا ہوں اور جب چھوڑ دیتے تو کہتا معلوم نہیں ہے۔

آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ سختی نہ کرو اس کو میرے پاس لاؤ۔ آپ ﷺ کے پاس لایا گیا۔ آنحضرت ﷺ نے بڑی نرمی سے پوچھا کہ تیرا نام کیا ہے اور تو کس قبیلے سے تعلق رکھتا ہے، تیرا باپ کیا کام کرتا ہے؟ یہ دریافت کرنے کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا کہ مکہ سے تم کتنے آدمی آئے ہو؟ تو کہنے لگا کہ مجھے معلوم نہیں ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا اچھا یہ بتاؤ کہ کھانے کے لیے تم روزانہ کتنے اُونٹ ذبح کرتے ہو؟ کہنے لگا دس اُونٹ۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ایک ہزار آدمی ہے ان شاء اللہ تعالیٰ۔ کیوں کہ ایک اونٹ سو آدمیوں کو کفایت کرتا ہے۔ اور واقعی آپ ﷺ کا اندازہ صحیح تھا۔ تو اس اندازے سے آپ ﷺ نے اس سے حالات معلوم کیے۔

جتنے بھی باطل لوگ ہیں وہ اپنے مشن میں سخت ہیں۔ الحمد للہ! جن کو اللہ تعالیٰ نے ایمان کی توفیق عطاء فرمائی ہے اور وہ پختہ مسلمان ہیں ان بے چاروں کے جسم سے گوشت نوچا جاتا ہے، ان کی رگیں کاٹی جاتی ہیں لیکن ایمان نہیں چھوڑتے اپنے مشن سے نہیں ہٹتے۔ اس وقت کشمیر میں جو قیدی ہیں ان کے حالات معلوم کرو کہ ان پر کتنا ظلم ہو رہا ہے اور کیا کیا سختیاں کی جا رہی ہیں۔ اور عورتوں پر کتنا ظلم ہو رہا ہے اور ہماری بے غیرت حکومت مظلوموں کی نصرت کی بجائے کافروں سے صلح کی اپیلیں کرتی ہے اور ہمارے حکمران کہتے ہیں کہ ہم نے تمھارے ساتھ جنگ نہیں کرنی ہمارے ساتھ صلح کرو۔ حالاں کہ کافروں کو صلح کی دعوت دینا ناجائز ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ﴿فَلَا تَهِنُوْا وَ تَدْعُوْٓا اِلَى السَّلْمِ﴾ [محمد: ۳۵] ”پس تم ہمت نہ ہارو اور (دشمنوں کو) صلح کی طرف نہ بلاؤ۔“ ہاں! اگر وہ خود صلح کی پیش کش کریں تو سوچو اور غور و فکر کرو۔ اگر فائدہ ہے تو کرلو۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ﴿وَ اِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا﴾ [الانفال: ۶۱] ”اور اگر یہ لوگ صلح کی طرف مائل ہوں تو تم بھی صلح کی طرف مائل ہو جاؤ ﴿وَ تَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ﴾ اور اللہ تعالیٰ پر بھروسہ رکھو۔“ قانون تو یہ ہے مگر تم خود جا کر کہتے ہو کہ صلح کرلو جنگ نہ کرو۔ مسلمانوں میں اتنی کمزوری؟ اصل بات یہ ہے کہ مسلمان ہوں تو تب ہے نا!

اور جب مسلمان تھے، ایک موقع پر آنحضرت ﷺ نے فرمایا ((اُكْتُبُوْا لِيْ مَنْ يَّلْفُظُ بِالْاِسْلَامِ)) ”مجھے مردم شماری کر کے بتاؤ کہ مسلمان کتنے ہیں؟ مردم شماری والے افسر نے آکر بتایا کہ ((نَحْنُ مَا بَيْنَ سِتِّ مِائَةٍ اِلٰى سَبْعِ مِائَةٍ)) ہم چھ سو اور سات سو کے درمیان ہیں۔ یعنی چھ سو سے زائد اور سات سو پورے نہیں ہوتے۔“ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے سوال کیا حضرت! مردم شماری کرائی ہے، خیر ہے؟ کوئی ہم پر حملہ آور ہونا چاہتا ہے؟ حضرت! اگر یہ بات ہے تو آپ پریشان نہ ہوں اگر آپ ﷺ ہمیں حکم دیں تو ہم پوری دنیا کے ساتھ ٹکرانے کے لیے تیار ہیں۔ اندازہ لگاؤ! ہمت کا کہ ہمیں کفر نہیں مٹا سکتا۔

اور اس وقت پاکستان کی چودہ کروڑ کی آبادی ہے اور کافروں سے ڈرتے ہیں اور صلح کی پیش کش کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم نے جنگ نہیں کرنی۔ کیا اس طرح وہ تمھیں چھوڑ دیں گے؟ اور تمھارے ساتھ جنگ نہیں کریں گے؟ ان کی افرادی

قوت اور اسلحہ کے مقابلہ میں ہماری کیا حقیقت ہے کہ وہ نوے کروڑ ہیں اور ہم چودہ کروڑ ہیں۔ گویا ہم سے ان کی فوج چھ گنا زیادہ ہے۔ اور یہی نسبت ہے اسلحہ کی۔ ظاہری اسباب کو دیکھو تو بچاؤ کی کوئی صورت نہیں ہے۔ اگر بچاؤ کی صورت ہے تو ایمان اور عمل ہے۔ ایمان بڑی قوت اور عمل بڑی طاقت ہے۔ اس کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔ کاش! کہ یہ بات تمھیں سمجھ آ جائے۔ اور کافروں سے دوستی ختم کر کے ایمان و عمل کو پختہ کرو کہ کافروں سے دوستی جائز نہیں ہے۔

رب تعالیٰ فرماتے ہیں ﴿هٰٓاَنْتُمْ اُولَآءِ﴾ خبردار اے مومنو! تم یہ ہو ﴿تُحِبُّوْنَهُمْ﴾ ان کے ساتھ محبت کرتے ہو ﴿وَلَا يُحِبُّوْنَكُمْ﴾ اور وہ تمھارے ساتھ محبت نہیں کرتے ﴿وَتُؤْمِنُوْنَ بِالْكِتٰبِ كُلِّهٖ﴾ اور تم ایمان رکھتے ہو سب کتابوں پر۔ یعنی تورات، زبور، انجیل اور جتنے بھی صحیفے رب تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئے ہیں تم سب پر ایمان لاتے ہو اور وہ آخری، حتمی اور قطعی کتاب کو نہیں مانتے۔ اسی طرح تم سارے پیغمبروں کو مانتے ہو اور وہ حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کو نہیں مانتے۔ غیرت برابر ہونی چاہیے۔ وہ اتنے بخیل ہوں کہ تمھارے پیغمبر پر ایمان لانے کے لیے تیار نہ ہوں اور تم اتنے سخی کہ ان سے محبت کرو۔ اور ان کا حال یہ ہے کہ ﴿وَاِذَا لَقُوْكُمْ﴾ اور جس وقت وہ ملتے ہیں تمھیں ﴿قَالُوْٓا اٰمَنَّا﴾ کہتے ہیں ہم بھی ایمان لائے ﴿وَاِذَا خَلَوْا﴾ اور جس وقت وہ الگ ہوتے ہیں۔ یعنی تنہائی میں جاتے ہیں ﴿عَضُّوْا عَلَيْكُمُ الْاَنَامِلَ﴾ کاٹتے ہیں وہ تم پر انگلیوں کے سرے ﴿مِنَ الْغَيْظِ﴾ غصے کی وجہ سے ﴿قُلْ مُوْتُوْا بِغَيْظِكُمْ﴾ آپ ﷺ کہہ دیجیے! مر جاؤ تم اپنے غصے میں ﴿اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ﴾ بے شک اللہ تعالیٰ جانتا ہے دلوں کے رازوں کو۔

یہودی منافقوں کا یہ حال ہے کہ ﴿اِنْ تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ﴾ اگر پہنچتی ہے تمھیں راحت تو انہیں بری لگتی ہے۔ یعنی مسلمانوں کو فتح ہو جائے، غنیمت مل جائے تو وہ بڑے پریشان ہوتے ہیں کہ یہ کیا ہوا؟ ﴿وَاِنْ تُصِبْكُمْ سَيِّئَةٌ﴾ اور اگر پہنچتی ہے تمھیں تکلیف ﴿يَّفْرَحُوْا بِهَا﴾ تو اس پر وہ خوش ہوتے ہیں۔ اُحد کے مقام پر ستر [۷۰] صحابہ شہید ہوئے، بہت سارے زخمی ہوئے اور آنحضرت ﷺ کو عتبہ بن ابی وقاص نے پتھر مارا۔ آپ ﷺ کے سامنے والے دو دانتوں کے ساتھ والا دانت شہید ہو گیا۔ ابن قمیہ کافر نے تلوار ماری خود کٹ گیا۔ آپ ﷺ کا چہرہ مبارک زخمی ہوا اور خون بہنے لگا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ ڈول میں پانی لاتے تھے اور حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا زخموں کو دھوتی تھیں کہ خون رک جائے مگر خون نہ رکا۔ سادہ زمانہ تھا جب خون نہ رکا تو پرانی چٹائی کا ایک ٹکڑا پڑا تھا حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا نے اس کو جلا کر اس کی راکھ زخموں پر رکھی۔ اس سے مسام بند ہوئے اور خون رک گیا۔ یہ بخاری شریف کی حدیث کا خلاصہ ہے۔

اور ادھر مشہور ہو گیا کہ اِنَّ مُحَمَّدًا قَدْ قُتِلَ "بے شک محمد ﷺ قتل ہو گئے ہیں۔" کافروں کی خوشی کی انتہا نہ تھی، بھنگڑے ڈالتے تھے۔ اور مومنوں کی پریشانی کی کوئی حد نہیں تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسے بہادر آدمی ہمت ہار بیٹھے۔ ایک چٹان کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑے ہو گئے۔ حضرت انس ابن نضر رضی اللہ عنہ جو حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کے چچا تھے۔ انھوں نے کہا عمر! کیا بات ہے؟ فرمایا میری کمر ٹوٹ گئی ہے۔ حضرت انس ابن نضر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ مرہم پٹی کی ہے؟ فرمایا اس طرح نہیں ٹوٹی۔ وہ اس

طرح ٹوٹی ہے کہ تو نے سنا نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم شہید ہو گئے ہیں۔ حضرت انس ابن نضر رضی اللہ عنہ نے کہا تو کیا تمھارے لیے شہادت کا دروازہ بند ہو گیا ہے؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میری ٹانگیں ساتھ نہیں دے رہیں۔ یعنی اتنا صدمہ تھا۔

مومنوں کو جب معلوم ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم زندہ ہیں تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس جمع ہو گئے۔ رات کا وقت تھا ابوسفیان ابھی مسلمان نہیں ہوئے تھے بلکہ اُحد میں مشرکوں کی کمان ان کے ہاتھ میں تھی۔ ابوسفیان نے آواز دی أَفِيكُمْ مُحَمَّدٌ کیا محمد زندہ ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا لَا تُجِيبُوا جواب نہ دو۔ پھر کہا أَفِيكُمْ اَبُوْ بَكْرٍ کیا تم میں ابوبکر ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا جواب نہ دو۔ پھر کہا اَفِيكُمْ عُمَرُ کیا تم میں عمر ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا جواب نہ دو۔ جب اس کو جواب نہ ملا تو اس نے نعرہ لگایا اُعْلُ هُبَلُ اُعْلُ هُبَلُ "ہبل زندہ باد، ہبل زندہ باد۔" حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا حضرت! اب تو میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا جواب دو۔ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ او اللہ کے دشمن! میں عمر بول رہا ہوں، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم زندہ موجود ہیں اور یہ ابوبکر زندہ موجود ہیں۔ تمھارا بندوبست کرنے کے لیے ہم موجود ہیں خوش کس بات پر ہوتے ہو؟

تو فرمایا ان کافروں کی طرف سے تکلیفیں آئیں گی ﴿وَاِنْ تَصْبِرُوْا﴾ اور اگر تم صبر کرو ﴿وَتَتَّقُوْا﴾ اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو گے ﴿لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْـًٔا﴾ نہیں نقصان پہنچائے گی تمھیں ان کی تدبیر کچھ بھی ﴿اِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ﴾ بے شک اللہ تعالیٰ جو کچھ وہ عمل کرتے ہیں احاطہ کرنے والا ہے۔ اس کے علم سے کوئی چیز باہر نہیں۔ بس اے مومنو! تمھارا تقویٰ اور پرہیز گاری درکار ہے۔ اگر یہ ہے تو سب کچھ ہے ورنہ کچھ بھی نہیں۔

﴿وَاِذْ غَدَوْتَ﴾ اور جب آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نکلے صبح کے وقت ﴿مِنْ اَهْلِكَ﴾ اپنے گھر سے ﴿تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بتا رہے تھے ٹھکانے ایمان والوں کو ﴿مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ﴾ لڑائی کی جگہوں کے (وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ﴾ اور اللہ تعالیٰ سننے والا ہے، جاننے والا ہے ﴿اِذْ هَمَّتْ طَّآئِفَتٰنِ مِنْكُمْ﴾ جب ارادہ کیا تم میں سے دو گروہوں نے ﴿اَنْ تَفْشَلَا﴾ یہ کہ وہ بزدلی دکھائیں ﴿وَاللّٰهُ وَلِيُّهُمَا﴾ اور اللہ تعالیٰ ان دونوں کا آقا ہے ﴿وَعَلَى اللّٰهِ﴾ اور اللہ تعالیٰ ہی پر ﴿فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ﴾ پس چاہیے کہ توکل کریں ایمان والے ﴿وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ﴾ اور البتہ تحقیق مدد کی اللہ تعالیٰ نے تمھاری ﴿بِبَدْرٍ﴾ بدر میں ﴿وَّاَنْتُمْ اَذِلَّةٌ﴾ اور حالاں کہ تم کمزور تھے ﴿فَاتَّقُوا اللّٰهَ﴾ پس اللہ تعالیٰ سے ڈرو ﴿لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ﴾ تا کہ تم اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر ادا کرو ﴿اِذْ تَقُوْلُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ﴾ جب کہا آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ایمان والوں کو ﴿اَلَنْ يَّكْفِيَكُمْ﴾ کیا کافی نہیں ہے تمھیں ﴿اَنْ يُّمِدَّكُمْ رَبُّكُمْ﴾ یہ کہ امداد

کرے تمھاری تمھارا رب ﴿بِثَلٰثَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ﴾ تین ہزار فرشتوں سے ﴿مُنْزَلِيْنَ﴾ اُتارے ہوئے ﴿بَلٰٓى﴾ کیوں نہیں ﴿اِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا﴾ اگر تم صبر کرو گے اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو گے ﴿وَيَاْتُوْكُمْ مِّنْ فَوْرِهِمْ هٰذَا﴾ اور دشمن آجائیں تمھارے پاس فوری طور پر ﴿يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ﴾ تمھاری مدد کرے گا تمھارا رب ﴿بِخَمْسَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ﴾ پانچ ہزار فرشتوں کے ساتھ ﴿مُسَوِّمِيْنَ﴾ جو نشان لگانے والے ہوں گے ﴿وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ﴾ اور نہیں کیا اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کے نزول کو ﴿اِلَّا بُشْرٰى لَكُمْ﴾ مگر تمھارے لیے خوش خبری ﴿وَلِتَطْمَئِنَّ قُلُوْبُكُمْ بِهٖ﴾ اور تاکہ تمھارے دل مطمئن ہو جائیں اس کے ذریعے ﴿وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ﴾ اور نہیں ہے مدد مگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ﴿الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ﴾ جو غالب ہے حکمت والا ہے ﴿لِيَقْطَعَ طَرَفًا﴾ تاکہ کاٹ دے وہ ایک حصہ ﴿مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا﴾ ان لوگوں میں سے جو کافر ہیں ﴿اَوْ يَكْبِتَهُمْ﴾ یا ان کو ذلیل کر دے ﴿فَيَنْقَلِبُوْا خَآئِبِيْنَ﴾ پس وہ لوٹیں نامراد ہو کر۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بحیثیت سپہ سالار

پہلی آیتِ کریمہ میں ذکر تھا ﴿وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْـًٔا﴾ "اور اگر تم صبر سے کام لو گے اور تقویٰ اختیار کرو گے اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو گے تو کافروں کی طاقت، ان کا مکر اور تدبیر تمھارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گی۔" آگے اللہ تعالیٰ نے دو موقع بیان فرمائے ہیں کہ ایک موقع پر یعنی بدر میں تمھارے اندر تقویٰ عَلٰی وَجْهِ الْاَتَمّ موجود تھا۔ باوجود بے سروسامانی کے اللہ تعالیٰ نے کامیابی عطاء فرمائی۔ اور دوسرا موقع غزوۂ احد کا تھا کہ غزوۂ احد کے موقع پر بعض سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی ہوئی تو اس کا نتیجہ سب کو بھگتنا پڑا۔

ان آیات میں زیادہ ذکر اُحد کا ہے۔ درمیان میں بدر کا بھی ذکر ہے۔ اُحد پہاڑ کا نام ہے جو اُس وقت مدینہ طیبہ سے تقریباً دو تین میل کے فاصلہ پر واقع تھا۔ اب وہ مدینہ منورہ کی حدود میں ہے۔ اس کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ اُحد پہاڑ ہم سے محبت کرتا ہے اور ہم اُحد پہاڑ سے محبت کرتے ہیں۔ چوں کہ یہ غزوۂ احد (ہجرت کے تیسرے سال گیارہ شوال ہفتے والے دن) پہاڑ کے دامن میں پیش آیا تھا اس واسطے اس کو غزوۂ احد کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ اس غزوہ میں مسلمانوں کی تعداد سات سو تھی اور مقابلے میں تین ہزار کافر تھے۔

اُحد پہاڑ کے پاس ایک چھوٹا سا ٹیلہ ہے۔ اس کو جبلِ رُماۃ کہتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پچاس آدمیوں کا ایک دستہ حضرت عبداللہ ابن جبیر رضی اللہ عنہ کی امارت میں مقرر فرمایا کہ تم نے جبلِ رُماۃ پر ٹھہرنا ہے اور پہرہ دینا ہے، نگرانی کرنی ہے۔ فتح ہو یا شکست، تم نے مورچہ نہیں چھوڑنا جب تک میرا حکم نہ آجائے۔

اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو فتح عطاء فرمائی اور کافروں کو ہزیمت ہوئی۔ وہ ہتھیار چھوڑ کر، کپڑے چھوڑ کر، جوتے اور پگڑیاں چھوڑ کر بھاگے۔ جب یہ میدان مسلمانوں کے ہاتھ آ گیا تو یہ پچاس آدمی جو جبلِ رُماۃ پر تھے ان میں سے بعض نے کہا کہ ہم بھی جا کر مالِ غنیمت اکٹھا کریں۔ امیر لشکر نے کہا کہ آنحضرت ﷺ نے حکم دیا تھا کہ ہمیں فتح ہو یا شکست، تم نے مورچہ نہیں چھوڑنا۔ دوسرے جذباتی لوگ کہنے لگے ہاں! بالکل ٹھیک ہے آپ ﷺ نے فرمایا تھا۔ آپ ﷺ کا حکم سر آنکھوں پر۔ مگر مقصد یہ تھا کہ یہاں ہماری ضرورت پڑے گی اور اب یہاں ہماری ضرورت کیا ہے؟ امیر لشکر کے منع کرنے کے باوجود وہ مورچہ چھوڑ کر چلے گئے۔ امیر لشکر اور تقریباً دس ساتھی مورچہ پر قائم رہے۔

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے اور جنگی امور کے بڑے ماہر تھے۔ جب انھوں نے دیکھا کہ اہم مورچہ خالی ہو گیا ہے تو وہ دوسو آدمی لے کر عقب سے حملہ آور ہوئے۔ جو حضرات مورچے پر تھے وہ اکثر وہاں شہید ہو گئے، چند ایک بچے۔ خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے آواز دی کہ میں پیچھے سے آ گیا ہوں تم آگے سے پلٹو۔ کافروں کی ہمت بڑھ گئی۔ وہ آگے سے پلٹ آئے۔ افراتفری مچ گئی۔ گھمسان کی جنگ شروع ہوگئی۔ ڈھول اُڑ رہی تھی، پتا نہیں چل رہا تھا کہ کون کس کو مار رہا ہے۔ حتیٰ کہ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کے والد حضرت یمان رضی اللہ عنہ مسلمانوں کی تلوار سے شہید ہو گئے۔ آنحضرت ﷺ کا دانت مبارک شہید ہوا، چہرۂ اقدس زخمی ہوا۔ سید الشہداء حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ شہید ہو گئے۔ اور یاد رکھنا! سید الشہداء کا لقب صرف حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کا ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں یہ لقب اور کسی کو نہیں ملا۔ امتیوں میں علی الاطلاق یہ لقب صرف حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کا ہے۔ قرآن پاک میں آتا ہے ﴿وَيَقْتُلُونَ النَّبِيِّنَ بِغَيْرِ حَقٍّ﴾ "اور انھوں نے پیغمبروں کو ناحق قتل کیا۔" تو جو پیغمبر شہید ہوئے ہیں ان کا درجہ سب سے بلند ہے۔ پیغمبروں کے بعد سید الشہداء کا خطاب صرف حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کا ہے۔ ہاں لغوی طور پر کوئی کسی کو کہے تو کہے۔ مگر اصطلاحی طور پر سید الشہداء صرف حضرت حمزہ ہی ہیں۔

تو ان آیات میں غزوۂ احد کا ذکر ہے۔ جس وقت آپ ﷺ غزوۂ احد کے لیے تشریف لے گئے اس وقت آپ ﷺ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرے میں تھے۔ وہاں سے آپ ﷺ تشریف لے گئے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ﴿وَإِذْ غَدَوْتَ مِنْ أَهْلِكَ﴾ اور جب آپ ﷺ نکلے صبح کے وقت اپنے گھر سے۔ تو اہل کا مصداق حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا ہیں۔ کیوں کہ آپ ﷺ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے حجرے میں تشریف فرما تھے اور وہاں سے احد کے لیے تشریف لے گئے۔ ﴿تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِينَ﴾ آپ ﷺ بتا رہے تھے ٹھکانے ایمان والوں کو ﴿مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ﴾ لڑائی کی جگہوں کے۔ مَقَاعِدَ جمع ہے مَقْعَد کی، ٹھکانے لڑائی کے۔ جس طرح فوج کا کمانڈر فوجیوں کو لڑائی کے مورچے بتاتا ہے اسی طرح آپ ﷺ مورچے بتا رہے تھے کہ تو نے یہاں ڈیوٹی دینی ہے تو نے یہاں کھڑا ہونا ہے اور فلاں نے اس جگہ کھڑا ہونا ہے ﴿وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ﴾ اور اللہ تعالیٰ سننے والا ہے، جاننے والا ہے۔

غزوۂ احد کے لیے جب مسلمان مدینہ طیبہ سے چلے تھے تو ایک ہزار کی تعداد تھی۔ ان میں تین سو منافق تھے۔ جب

اُحد کے مقام پر پہنچے تو ابھی کافر نہیں آئے تھے "خوئے بدرا بہانہ بسیار" مَن حرامی ہو تو بڑے بہانے کرتا ہے۔ منافق کہنے لگے کس کے ساتھ لڑنا ہے؟ یہاں آدمی تو ہے کوئی نہیں۔ چلو واپس۔ حالاں کہ ان کو علم تھا کہ دشمن آرہا ہے۔ چنانچہ یہ بہانہ بنا کر تین سو منافق واپس چلے گئے۔ جب یہ واپس جارہے تھے ان کو دیکھ کر دو مخلص گروہ بنو حارثہ اور بنو سلمہ جو مسجد قبلتین کے پاس رہتے تھے انھوں نے بھی جانے کا ارادہ کیا کہ یہ لوگ جارہے ہیں ہم بھی جائیں۔ لیکن چوں کہ مخلص تھے ایمان کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے ان کو جانے نہیں دیا۔ سوچنے لگے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم واپس جارہے ہیں؟ کیا ابوبکر رضی اللہ عنہ واپس جارہے ہیں، عمر رضی اللہ عنہ واپس جارہے ہیں؟ اگر وہ واپس نہیں جارہے تو ہم نے بھی نہیں جانا۔ اس کا ذکر ہے۔

فرمایا ﴿اِذْ هَمَّتْ طَّآىِٕفَتٰنِ مِنْكُمْ﴾ جب ارادہ کیا تم میں سے دو گروہوں نے ﴿اَنْ تَفْشَلَا﴾ یہ کہ وہ بزدلی دکھائیں اور میدان چھوڑ دیں ﴿وَاللّٰهُ وَلِیُّهُمَا﴾ اور اللہ تعالیٰ ان دونوں کا آقا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ایمان واخلاص کی برکت سے ان دونوں کو مضبوط کر دیا ﴿وَعَلَى اللّٰهِ فَلْیَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ﴾ اور اللہ تعالیٰ ہی پر پس چاہیے کہ توکل کریں ایمان والے۔ اس سے اگلی آیتیں غزوۂ بدر کے متعلق ہیں۔

ایک آدمی تھا بدر ابن قیس ابن صباح۔ اس نے ایک کنواں کھودا تھا۔ اس کنویں کا نام بدر پڑ گیا۔ پھر اس کنویں کی وجہ سے سارے علاقے کا نام بدر ہو گیا۔ بدر مدینہ طیبہ سے اسی [۸۰] میل دور ہے۔ یہ معرکہ ہجرت کے دوسرے سال سترہ [۱۷] رمضان المبارک جمعہ کے دن پیش آیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تین سو بارہ [۳۱۲] آدمی تھے۔ تیرھویں آپ صلی اللہ علیہ وسلم خود تھے۔ اور اس تین سو تیرہ [۳۱۳] کے لشکر کے پاس ہتھیار یہ تھے۔ آٹھ تلواریں، چھ زرہیں، دو گھوڑے، ستر [۷۰] اُونٹ۔ اور ان میں اکثریت ان کی تھی جن کے پاؤں میں جوتا نہیں تھا۔ وہ علاقہ سخت اور پتھریلا تھا۔ سڑکیں تو اب بنی ہیں اس وقت سڑکیں کہاں تھیں۔ اس سخت اور پتھریلے علاقہ میں ننگے پاؤں چلتے تھے۔ اور سواریوں کی یہ حالت تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت اُسید ابن حضیر رضی اللہ عنہ تینوں بزرگوں کے حصے میں ایک اُونٹنی آئی۔ باری باری سوار ہو کر پہنچے۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چلنے کی باری آتی یہ دونوں ساتھی کہتے حضرت! ہم چلتے ہیں آپ سوار رہیں۔ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے اللہ تعالیٰ نے مجھے بھی طاقت عطاء فرمائی ہے میں بھی پیدل چلوں اور اللہ تعالیٰ کے راستے میں اپنے پاؤں پر دھول ڈالوں۔ لہٰذا اپنی باری پر چلوں گا اور اپنی باری پر سوار ہوں گا۔ اور ایسے ساتھی بھی تھے جن کے سر پر پگڑی نہیں تھی، ایسے بھی تھے جن کے پاس کھانے کے لیے کچھ نہ تھا۔

جب بدر کے مقام پر پہنچے تو پانی کے کنویں پر کافروں کا قبضہ ہو چکا تھا اور صاف میدان پر مشرکوں نے پڑاؤ ڈال لیا تھا۔ اور جس مقام پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھی تھے وہاں ریت تھی اور پانی بھی نہیں تھا۔ نویں پارہ سورۃ الانفال میں آتا ہے کہ شیطان نے بعض ساتھیوں کے دل میں وسوسہ ڈالا کہ تم اچھے حق پر ہو کہ تمھیں پانی بھی نہیں ملا اور جہاں کھڑے ہو وہاں ریت ہی ریت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بارش برسائی۔ ریت پتھر کی طرح سخت ہو گئی اور اپنی ضرورت کے لیے پانی بھی جمع کر

لیا اور جانوروں کو بھی پلایا۔ مقابلے میں ایک ہزار کافر تھے اور ہر طرح کے اسلحہ سے مسلح تھے۔ آنحضرت ﷺ نے ایک مٹھی ریت اور کنکریوں کی بھری اور شَاهَتِ الوجوہ "اللہ تعالیٰ کافروں کے چہروں کو تباہ و برباد کرے۔" پڑھ کر کافروں کی طرف پھینکی۔ قرآن پاک میں آتا ہے ﴿وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى﴾ [الانفال: ۱۷] "مٹھی خاک کہ جب پھینکی آپ نے نہیں پھینکی اور لیکن اللہ تعالیٰ نے پھینکی۔" وہ کافر جہاں جہاں کھڑے تھے وہ ریت ان کی آنکھوں میں پڑ گئی۔ یہ آنحضرت ﷺ کا معجزہ تھا۔ اور معجزہ اور کرامت کے متعلق تفصیل کے ساتھ میں نے اپنی کتاب "راہِ ہدایت" کے اندر بیان کیا ہے اس کو پڑھ لینا۔ یہاں صرف اس آیت کے متعلق سمجھ لیں کہ اگرچہ ظاہری طور پر یہ مٹھی خاک اور کنکریوں کی جناب رسول اللہ ﷺ نے پھینکی تھی مگر کسی بشر کا یہ فعل عادتاً نہیں ہوسکتا کہ مٹھی بھر کنکریاں دور نزدیک آگے اور پیچھے ہر سپاہی کی آنکھ میں پڑ کر ایک مسلح لشکر کی ہزیمت کا سبب بن جائے۔ اور یہ اگرچہ آنحضرت ﷺ کا معجزہ ہے مگر یہ فعل صرف اللہ تعالیٰ کا تھا۔ تو اللہ تعالیٰ کی قدرت سے کنکریوں کے ریزے ہر کافر کی آنکھ میں پہنچے۔ وہ سب آنکھیں ملنے لگے۔ ادھر مسلمانوں نے دھاوا بول دیا۔ ستر کافر مارے گئے، ستر گرفتار ہوئے اور باقیوں کو بھاگنے کے لیے راستہ نہ ملا۔ اس غزوہ میں چودہ مسلمان شہید ہوئے۔ آٹھ انصار میں سے اور چھ مہاجرین میں سے۔ اور ان کی قبریں آج بھی بدر کے مقام پر ایک چار دیواری کے اندر موجود ہیں۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ﴿وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ﴾ اور البتہ تحقیق مدد کی اللہ تعالیٰ نے تمھاری بدر میں ﴿وَّاَنْتُمْ اَذِلَّةٌ﴾ اور حالاں کہ تم کمزور تھے۔ اَذِلَّةٌ ذلیل کی جمع ہے۔ اور ذلیل کے معنیٰ ہیں کمزور۔ یعنی تعداد کے لحاظ سے اسلحہ اور ساز و سامان کے اعتبار سے تم بڑے کمزور تھے لیکن اللہ تعالیٰ نے تمھاری نصرت فرمائی۔ ﴿فَاتَّقُوا اللّٰهَ﴾ پس اللہ تعالیٰ سے ڈرو ﴿لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ﴾ تا کہ تم اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر ادا کرو ﴿اِذْ تَقُوْلُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ﴾ جب کہا آپ ﷺ نے ایمان والوں کو ﴿اَلَنْ يَّكْفِيَكُمْ﴾ کیا کافی نہیں ہے تمھیں ﴿اَنْ يُّمِدَّكُمْ رَبُّكُمْ﴾ یہ کہ امداد کرے تمھاری تمھارا رب ﴿بِثَلٰثَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ﴾ تین ہزار فرشتوں سے ﴿مُنْزَلِيْنَ﴾ اُتارے ہوئے۔ سورۃ الانفال میں ایک ہزار فرشتوں کا بھی ذکر آیا ہے۔ پہلے اللہ تعالیٰ نے ایک ہزار فرشتوں کا وعدہ فرمایا۔ کیوں کہ کافر ایک ہزار تھے۔ لیکن چوں کہ کافر مسلمانوں سے تین گنا زیادہ تھے تو اللہ تعالیٰ نے مزید وعدہ فرمایا کہ تین ہزار فرشتے اُتاروں گا جو کافروں سے تین گنا زیادہ ہوں گے۔ پھر عین جنگ کے دوران یہ خبر بھی آئی کہ کُرز بن جابر فہری کافر جس کا بہت سارے قبیلوں پر اثر و رسوخ تھا کافروں کی مدد کے لیے آرہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اگر وہ گروہ آئے گا تو میں پانچ ہزار فرشتوں کو نازل کروں گا۔ مگر یہ مشروط تھا۔ وہ نہیں آیا لہٰذا پانچ ہزار فرشتے بھی نازل نہیں ہوئے۔ تین ہزار فرشتے نازل فرمائے۔

اب سوال یہ ہے کہ فرشتوں نے لڑائی کی ہے یا نہیں؟ تو اس میں اختلاف ہے۔ مگر صحیح بات یہ ہے کہ فرشتے لڑائی میں شریک ہوئے ہیں۔ حضرتِ عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے بدر کے موقع پر دو آدمیوں کو دیکھا کہ سفید کپڑے اور سفید پگڑیاں باندھے ہوئے ہیں اور ان کے ہاتھ میں چابک ہے۔ اور وہ چابک اس طرح کافروں کو مارتے ہیں کہ وہ اسی

وقت نیچے گر کر مرجاتا ہے۔ میں نے کہا کہ یہ آدمی ہمارے ساتھ تو نہیں آئے۔ تو ان میں سے ایک نے کہا: اَقْدِمْ حَیْزُوْم "اے حیزوم! تو آگے بڑھ۔"

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے اس کا ذکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا وہ جبرئیل اور میکائیل علیہما السلام تھے۔ اور حضرت جبرئیل علیہ السلام جس گھوڑے پر سوار تھے اس کا نام حَیْزُوْم تھا۔ اور حیزوم میں "ح" حلوے والی ہے۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام حیزوم کو فرما رہے تھے کہ آگے بڑھ۔ فرشتوں کو اللہ تعالیٰ نے بڑی طاقت عطاء فرمائی ہے۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے حضرت لوط علیہ السلام کی بستیوں کو ایک پر پر اُٹھا کر پھینک دیا تھا۔ اسی واسطے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿ذِیْ قُوَّۃٍ﴾ "قوت والے بھی ہیں۔" اور حضرت لوط علیہ السلام کی بستیاں کتنے علاقہ میں تھیں؟ اس طرح سمجھو جتنا ضلع گوجرانوالا کا رقبہ ہے (جبکہ حافظ آباد بھی اس میں شامل تھا)۔ تو اللہ تعالیٰ نے فرشتوں میں بڑی طاقت اور قوت رکھی ہے۔ فرمایا اے مسلمانو! اگر تم اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو گے تو اللہ تعالیٰ تمھاری ضرور مدد کرے گا۔ علامہ اقبال مرحوم نے کیا خوب کہا ہے ۔

فضائے بدر پیدا کر فرشتے تیری نصرت کو
اُتر سکتے ہیں گردوں سے قطار اندر قطار اب بھی

اے مسلمان! اللہ تعالیٰ سے ڈر اور اس کے احکام کی پابندی کر فرشتے تیری نصرت کے لیے تیار ہیں۔ اگر کمی ہے تو تیرے اندر ہے رب تعالیٰ کی رحمتوں میں کوئی کمی نہیں ہے۔ فرمایا ﴿بَلٰۤی﴾ کیوں نہیں ﴿اِنْ تَصْبِرُوْا وَ تَتَّقُوْا﴾ اگر تم صبر کرو گے اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو گے ﴿وَ یَاْتُوْكُمْ مِّنْ فَوْرِهِمْ هٰذَا﴾ اور دشمن آجائیں تمھارے پاس فوری طور پر۔ یعنی کرز ابن جابر فہری کا لشکر اگر فوری طور پر آئے گا تو ﴿یُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ﴾ تمھاری مدد کرے گا تمھارا رب ﴿بِخَمْسَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓىِٕكَةِ مُسَوِّمِیْنَ﴾ پانچ ہزار فرشتوں کے ساتھ جو نشان لگے ہوں گے۔ جس طرح فوجیوں کو بیج لگے ہوتے ہیں۔ کسی کے ایک، کسی کے دو، کسی کے تین، عہدوں کے اعتبار سے۔ اسی طرح فرشتے بھی چوں کہ فوج کی شکل میں آئیں گے لہٰذا انھوں نے بھی نشان لگائے ہوئے ہوں گے۔

﴿وَ مَا جَعَلَهُ اللّٰهُ﴾ اور نہیں کیا اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کے نزول کو ﴿اِلَّا بُشْرٰى لَكُمْ﴾ مگر تمھارے لیے خوش خبری ﴿وَ لِتَطْمَىِٕنَّ قُلُوْبُكُمْ بِهٖ﴾ اور تاکہ تمھارے دل مطمئن ہو جائیں اس کے ذریعے کہ ہمارے ساتھ فرشتے بھی ہیں۔ اور یاد رکھنا! فرشتے کیا ہیں؟ اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں ﴿وَ مَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ الْعَزِیْزِ الْحَكِیْمِ﴾ اور نہیں ہے مدد مگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو غالب ہے، حکمت والا ہے ﴿لِیَقْطَعَ طَرَفًا﴾ تاکہ کاٹ دے وہ ایک حصہ ﴿مِّنَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْۤا﴾ ان لوگوں میں سے جو کافر ہیں۔ ستر ایسے کافر جو کفر کی جڑ تھے بدر کے موقع پر مارے گئے۔ ﴿اَوْ یَكْبِتَهُمْ﴾ یا ان کو ذلیل کردے۔ ستر ان میں سے گرفتار ہوئے اور باقیوں کو بھاگتے ہوئے راستہ نہ ملا ﴿فَیَنْقَلِبُوْا خَآىِٕبِیْنَ﴾ پس وہ لوٹیں نامراد ہو کر۔

پھر یہ جو بھاگنے والے تھے جب گھروں میں پہنچے تو شرم کے مارے کئی کئی مہینے گھروں سے باہر نہ نکلے۔ عورتیں طعنے

دیتی تھیں کہ تمھارا باپ مر گیا ہے، بھائی مر گیا ہے، تو بھی مر جاتا بھاگتا نہ۔ چوں کہ بدر کے موقع پر تقویٰ اور پرہیز گاری اعلیٰ درجے کی تھی اللہ تعالیٰ نے بے سروسامانی کی حالت میں مدد فرمائی۔ آگے کئی رکوعوں تک احد کا واقعہ جائے گا۔

﴿لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ﴾ نہیں ہے تیرے لیے اس معاملے میں کچھ بھی ﴿اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ اَوْ يُعَذِّبَهُمْ﴾ یا تو اللہ تعالیٰ ان پر رجوع فرمائے یا ان کو سزا دے ﴿فَاِنَّهُمْ ظٰلِمُوْنَ﴾ پس بے شک وہ فی الحال ظالم ہیں ﴿وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ﴾ اور اللہ تعالیٰ ہی کے واسطے ہے جو کچھ کہ آسمانوں میں ہے ﴿وَمَا فِي الْاَرْضِ﴾ اور جو کچھ زمین میں ﴿يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ﴾ بخشے گا جس کو چاہے گا ﴿وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ﴾ اور سزا دے گا جس کو چاہے گا ﴿وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾ اور اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو ﴿لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰوٓا﴾ نہ کھاؤ سود ﴿اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً﴾ دگنا چگنا کر کے ﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ﴾ اور ڈرو اللہ تعالیٰ سے ﴿لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ﴾ تاکہ تم فلاح پاؤ ﴿وَاتَّقُوا النَّارَ﴾ اور بچو تم آگ سے ﴿الَّتِيْٓ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ﴾ وہ آگ جو تیار کی گئی ہے کافروں کے لیے ﴿وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ﴾ اور اطاعت کرو اللہ تعالیٰ اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ﴿لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ﴾ تاکہ تم پر رحمت نازل کی جائے ﴿وَسَارِعُوْٓا﴾ اور جلدی کرو ﴿اِلٰى مَغْفِرَةٍ﴾ مغفرت حاصل کرنے کی طرف ﴿مِّنْ رَّبِّكُمْ﴾ اپنے رب کی طرف سے ﴿وَجَنَّةٍ﴾ اور جنت کی طرف جلدی کرو ﴿عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ﴾ جس کا عرض آسمانوں اور زمین جیسا ہے ﴿اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ﴾ تیار کی گئی ہے پرہیز گاروں کے لیے ﴿الَّذِيْنَ﴾ پرہیز گار وہ ہیں ﴿يُنْفِقُوْنَ﴾ جو خرچ کرتے ہیں ﴿فِي السَّرَّآءِ﴾ راحت میں ﴿وَالضَّرَّآءِ﴾ اور تکلیف میں ﴿وَالْكٰظِمِيْنَ﴾ اور پی جاتے ہیں ﴿الْغَيْظَ﴾ غصہ ﴿وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ﴾ اور معاف کرتے ہیں لوگوں کو ﴿وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ﴾ اور اللہ تعالیٰ محبت کرتا ہے نیکی کرنے والوں کے ساتھ۔

پہلے غزوۂ احد کا ذکر تھا پھر غزوۂ بدر کا ذکر ہوا۔ اب پھر غزوۂ احد کا ذکر ہے۔ غزوۂ احد میں جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دانت مبارک شہید ہوا اور چہرۂ اقدس زخمی ہوا تو بخاری شریف کی روایت آتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بعض کافروں یعنی حارث ابن ہشام، سہیل ابن عمرو اور صفوان ابن امیہ کا نام لے کر بددعا فرمائی۔ اور چوں کہ اللہ تعالیٰ کے علم میں تھا کہ یہ مسلمان ہو جائیں گے (اور ۸ ہجری فتح مکہ والے سال یہ تینوں مسلمان ہو گئے)۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بددعا سے منع فرما دیا۔

ارشادِ ربانی ہے ﴿لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ﴾ نہیں ہے تیرے لیے اس معاملے میں کچھ بھی ﴿اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ اَوْ يُعَذِّبَهُمْ﴾ یا تو اللہ تعالیٰ ان پر رجوع فرمائے یا ان کو سزا دے ﴿فَاِنَّهُمْ ظٰلِمُوْنَ﴾ پس بے شک وہ فی الحال ظالم ہیں۔ حارث

ابن ہشام ابوجہل کا بھائی تھا، صفوان ابن امیہ مکہ مکرمہ کے سرداروں میں سے تھا اور سہیل ابن عمرو صلح حدیبیہ کے موقع پر کافروں کی نمائندگی کرتا تھا۔ جب کہ یہ تینوں کافر اور مشرک تھے۔ آپ ﷺ کو تکلیف دینے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کرتے تھے۔ لیکن بعد میں تینوں حضرات رضی اللہ عنہم ہو گئے اور آپ ﷺ کے سپاہی بن گئے۔

بخشنا اور بخش سکنا میں فرق

﴿وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ﴾ اور اللہ تعالیٰ ہی کے واسطے ہے جو کچھ کہ آسمانوں میں ہے ﴿وَمَا فِي الْاَرْضِ﴾ اور جو کچھ زمین میں ﴿يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ﴾ بخشے گا جس کو چاہے گا۔ اللہ تعالیٰ قادرِ مطلق ہے جو چاہے کر سکتا ہے۔ وہ چاہے تو ابوجہل کو بخش دے اور اگر چاہے تو ابولہب جس کے بارے میں سورۃ ﴿تَبَّتْ يَدَآ﴾ نازل ہوئی ہے، کو بخش دے۔ بخش سکتا ہے مگر وہ بخشے گا نہیں۔ کیوں کہ وہ فرما چکا ہے کہ میں مشرکوں کو نہیں بخشوں گا۔ لیکن اس کو بخشنے کی قدرت ہے۔

اللہ تعالیٰ کی قدرت کو سارے اہل حق مانتے ہیں اور باطل فرقے جیسے: معتزلہ، رافضی اور خارجی ہیں، اہل بدعت ہیں، یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کے منکر ہیں۔ کہتے ہیں رب تعالیٰ بخش ہی نہیں سکتا۔ یعنی اس کو بخشنے کی قدرت بھی نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت کو انھوں نے محدود کر دیا۔ اور اہل حق کہتے ہیں کہ بخشنا اور ہے اور بخش سکنا اور ہے۔ بخش سکتا ہے لیکن بخشے گا نہیں۔

ہندوستان میں حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے باطل فرقوں کی خوب سرکوبی کی ہے۔ یہ بہت بڑے بزرگ تھے۔ یقین جانو! اگر ایسے بزرگ دنیا میں نہ آتے تو ہر طرف کفر ہی کفر ہوتا۔ ہندوستان کے اکبر بادشاہ نے دینِ اکبری بنایا تھا۔ اس کے خلاف جدوجہد اور اس کے بیٹے جہانگیر کی ذہن سازی کرنا انہی بزرگوں کا کام تھا۔ جہانگیر کا ایسا ذہن تیار کیا کہ بیٹے نے باپ کے باطل مذہب کو فنا کر کے رکھ دیا۔ اکبر ہمایوں کا بیٹا تھا جس نے ہندوستان میں رافضیت پھیلائی تھی۔ اس سے پہلے ہندوستان میں رافضیت نہیں تھے۔ وہ اس طرح ہوا کہ ہمایوں سے جب بادشاہی چھینی گئی تو یہ ایران چلا گیا۔ ایرانیوں نے اس کی خوب ذہن سازی کی اور اس کو خوب رافضی بنا کر ہندوستان بھیجا۔ تو ہندوستان میں رافضیت ہمایوں کی وجہ سے آئی ہے۔

تو یہ رافضی اور دوسرے باطل فرقے اللہ تعالیٰ کی قدرت کو محدود کرتے ہیں اور اہل حق کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ قادرِ مطلق ہے۔ جو چاہے جس طرح چاہے کر سکتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ جس کو چاہے گا بخش دے گا ﴿وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ﴾ اور سزا دے گا جس کو چاہے گا۔ اور بخشے گا اسی کو جو اہل ایمان اور اہل توحید میں سے ہوگا اور جو اس کے ساتھ شرک کرے گا اس کو سزا دے گا۔ اللہ تعالیٰ نے ضابطہ بیان فرمایا ہے ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ﴾ "بے شک اللہ تعالیٰ نہیں بخشتا اس بات کو کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے ﴿وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ﴾ [النساء: ۴۸] اور بخش دے گا اس کے سوا جس کو چاہے گا۔" اور اللہ تعالیٰ کا اٹل فیصلہ ہے ﴿اِنَّهٗ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ﴾ [المائدہ: ۷۲] "بے شک جس نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کیا پس تحقیق اس پر اللہ تعالیٰ نے جنت حرام فرما دی ہے ﴿وَمَاْوٰىهُ النَّارُ﴾ اور ٹھکانا اس کا دوزخ ہے۔"

﴿وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾ اور اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے۔ اوپر ذکر تھا ﴿وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْـًٔا﴾ " کہ اے مسلمانو! اگر تم صبر کرو گے اور تقویٰ اختیار کرو گے تو کافروں کی تدبیر تمھارا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔" اور تقویٰ میں سب سے اہم چیز أَكْلِ حلال ہے۔ اور کئی دفعہ سن چکے ہو کہ اگر آدمی ایک لقمہ حرام کا کھائے تو چالیس دن اور چالیس راتیں اس کی دعا قبول نہیں ہوتی۔ یعنی دعا کی قبولیت سے محروم ہو جاتا ہے۔ اور ابوداؤد شریف کی روایت کا حوالہ بھی کئی دفعہ سن چکے ہو کہ اگر کسی شخص کے جسم پر کرتا ہے جس کی مالیت دس درہم ہے اور اس میں نو درہم حلال کے ہیں اور ایک درہم حرام کا ہے تو جب تک اس کے جسم پر یہ کپڑا رہے گا اس وقت تک اس کی نماز نہیں ہوگی۔ اور ہماری تو ماشاء اللہ ساری خوراک ہی ایسی ہے۔ (یہ حضرت نے گفتہ آید درحدیثِ دیگراں کے تحت فرمایا ہے وگرنہ حضرت شیخ الحدیث صاحب مشکوک چیز کے قریب کبھی نہیں گئے۔ بلوچ)۔

حرمتِ سود کا بیان

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو ﴿لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰوٓا﴾ نہ کھاؤ سود ﴿اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً﴾ دُگنا چگنا کر کے۔ اور تیسرے پارے میں آپ پڑھ چکے ہیں ﴿وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا﴾ "اللہ تعالیٰ نے خرید و فروخت کو حلال فرمایا ہے اور سود کو حرام کیا ہے۔" کتنے صاف الفاظ ہیں ﴿حَرَّمَ الرِّبٰوا﴾ لیکن ہمارے ذمہ دار یا پالی افسر کہتے ہیں کہ سود حرام نہیں ہے۔ بلکہ اب کسی سفیر نے کہا ہے کہ شراب حرام نہیں ہے۔ کیوں کہ قرآن پاک میں اس کی حرمت کا ذکر نہیں ہے۔ ملک کے جب ایسے سفیر باہر ہوں گے تو ان کا کیا اثر ہوگا؟ کہ جو کہیں کہ شراب بھی حرام نہیں ہے، سود بھی حرام نہیں ہے۔ ان سے توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ خنزیر کو حرام سمجھیں گے؟ اور آج ہمارے بہت سارے افسر شراب میں لت پت ہیں الا ماشاء اللہ۔ اور وہ افسر جن میں خدا خوفی تھی اور ان چیزوں سے بچتے تھے ان کو جیلوں میں ڈال دیا گیا ہے۔ جیسے: جنرل ظہیر الاسلام عباسی، مستنصر باللہ، کرنل عنایت اللہ اور زاہد منہاس۔ یہ لوگ نماز روزے کے پابند تھے، شراب کو نزدیک نہیں آنے دیتے تھے۔ بلکہ جو افسر شراب پیتا تھا اس سے بگڑ جاتے تھے۔

اس حکومت کا حال ایسے ہی ہے جیسے شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے۔ شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ بڑے بزرگ گزرے ہیں۔ ان کی کتابیں آج بھی پڑھی پڑھائی جاتی ہیں۔ یہ کہیں جا رہے تھے سردی کا زمانہ تھا اور ہاتھ میں لاٹھی بھی نہیں تھی۔ ان کے پیچھے کتے پڑ گئے اور پتھر سردی کی وجہ سے جمے ہوئے تھے۔ جس پر ہاتھ ڈالیں وہ ہاتھ نہ آئے۔ کہنے لگے عجیب لوگ ہیں پتھر باندھ دیے ہیں اور کتے کھول دیے ہیں۔ یہاں بھی وہی قصہ ہے کہ نیک لوگوں کو باندھ دیا ہے اور خبیثوں کو کھلا چھوڑا ہوا ہے۔

تو نص قطعی سے ثابت ہے کہ سود حرام ہے لہٰذا اس کو حلال سمجھنے والا قطعی کافر ہے اور اس کے کفر میں شک کرنے والا بھی کافر ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ سود نہ کھاؤ اور سود کا تو ایک پیسہ بھی حرام ہے۔ چہ جائیکہ اس کو ﴿اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً﴾ بڑھا چڑھا کر کھاؤ۔ اصل رقم کتنی ہوتی ہے اور سود کی رقم بڑھ کر کہاں چلی جاتی ہے۔ پھر بنیے کیا کرتے ہیں کہ سود کی رقم کو اصل رقم میں ملا

کر جمع کرتے ہیں اور اس کا سود بناتے ہیں۔ ہم اس وقت تقریباً بارہ ارب ڈالر کے مقروض ہیں۔ جس کا کروڑوں ڈالر سالانہ سود جاتا ہے۔ اور ہم بڑے خوش ہوتے ہیں کہ ٹھگ کمپنی نے ہمارے لیے قرضہ منظور کر لیا ہے۔ اور قرضے کے ساتھ جو سود دینا ہے اس کا ہم نام ہی نہیں لیتے۔

﴿ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ﴾ اور ڈرو اللہ تعالیٰ سے ﴿ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴾ تاکہ تم فلاح پا جاؤ ﴿ وَاتَّقُوا النَّارَ ﴾ اور بچو تم آگ سے ﴿ الَّتِيْٓ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ ﴾ وہ آگ جو تیار کی گئی ہے کافروں کے لیے ﴿ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ ﴾ اور اطاعت کرو اللہ تعالیٰ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ﴿ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴾ تاکہ تم پر رحمت نازل کی جائے ﴿ وَسَارِعُوْٓا ﴾ اور جلدی کرو ﴿ اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ﴾ مغفرت حاصل کرنے کی اپنے رب کی طرف سے۔ یعنی جس وقت بھی کسی سے کوئی گناہ سرزد ہو جائے تو فوراً توبہ کرے اور اللہ تعالیٰ سے معافی مانگے۔ یہ نہ کہے کہ کل توبہ کر لوں گا یا فلاں دن توبہ کر لوں گا یا فلاں وقت توبہ کر لوں گا۔

یاد رکھنا! گناہ کی وجہ سے دل پر سیاہ دھبہ پڑ جاتا ہے۔ پھر اور گناہ کرے گا اور دھبہ پڑ جائے گا۔ تو یہ دل دھبوں سے ڈھک جائے گا اور توبہ کی توفیق سلب ہو جائے گی۔ دل سے خدا خوفی اُٹھ جائے گی۔ جس طرح نکمی خوراک کا جسم پر اثر ہوتا ہے اسی طرح گناہ کا روح پر اثر ہوتا ہے اور انسان نکما اور بے کار ہو جاتا ہے۔

﴿ وَجَنَّةٍ ﴾ اور جنت کی طرف جلدی کرو ﴿ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ ﴾ جس کا عرض آسمانوں اور زمین جیسا ہے۔ یعنی وہ اتنی وسیع ہے کہ اس کا عرض یعنی چوڑائی آسمانوں اور زمین کے برابر ہے کہ زمین اور آسمانوں کو ملاؤ تو کتنا طول بنتا ہے، جنت کا اتنا عرض ہے۔ آج ہم اس جہان میں جنت کی وسعت کو نہیں سمجھ سکتے۔ آنکھیں بند ہونے کے بعد معلوم ہوگا کہ جنت کیا چیز ہے اور جہنم کیا چیز ہے۔ ﴿ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴾ تیار کی گئی ہے پرہیز گاروں کے لیے۔ آگے اللہ تعالیٰ نے پرہیز گاروں کے کچھ اوصاف بیان فرمائے ہیں۔

﴿ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِي السَّرَّآءِ ﴾ پرہیز گار وہ ہیں جو راحت اور آرام میں بھی اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرتے ہیں ﴿ وَالضَّرَّآءِ ﴾ اور جب تکلیف میں ہوتے ہیں اس وقت بھی اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرتے ہیں ﴿ وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ ﴾ اور پی جاتے ہیں غصے کو۔ مگر وہاں جہاں غصہ پینے کا موقع ہو ہر جگہ نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی صفت بیان فرمائی ہے ﴿ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ ﴾ " کافروں پر سخت ہے اور آپس میں مہربان ہیں۔" یعنی کافروں کے لیے سخت ہیں اور مومنوں کے لیے بڑے نرم ہیں۔ بشرطیکہ مومن بھی مومن ہوں۔ اور اگر مومن غلطی پر ہے اور اپنی غلطی تسلیم کرنے کے لیے بھی تیار نہیں ہے تو اس کے لیے سختی جائز ہے۔ یعنی ایک آدمی اپنی غلطی تسلیم کرتا ہے کہ یہ میری غلطی ہے تو اس کے لیے نرمی ہے۔ اور دوسرا آدمی سر سے لے کر پاؤں تک غلطی میں ڈوبا ہوا ہے مگر غلطی کو غلطی ماننے کے لیے تیار نہیں ہے تو اس کے ساتھ سختی کرنا کوئی گناہ نہیں ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے اصولی طور پر مومنوں کی یہ صفت بھی بیان فرمائی ہے کہ اگر کوئی ان کے ساتھ زیادتی کرتا ہے تو انتقام بھی لیتے ہیں۔ ہر چیز اپنے اپنے مقام پر ہوتی ہے۔

﴿وَالْعَافِیْنَ عَنِ النَّاسِ﴾ اور معاف کرتے ہیں لوگوں کو اگر معاف کرنے کا موقع ہو۔ اور اگر کوئی آدمی غلطی کر کے نہیں مانتا تو اس کو معاف کرنے کا کوئی معنیٰ نہیں ہے۔ تو یہ اللہ تعالیٰ نے مومنوں کی صفتیں بیان فرمائی ہیں۔ یعنی مالی طور پر خرچ کرنے والے ہیں اور عملی طور پر غصہ پینے والے ہیں۔ تو جب ان میں یہ خوبیاں ہوں گی ﴿وَاللّٰهُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ﴾ اور اللہ تعالیٰ محبت کرتا ہے نیکی کرنے والوں کے ساتھ۔ اللہ تعالیٰ کسی کی نیکی ضائع نہیں کرتا۔

قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا یُضِیْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِیْنَ﴾ [التوبہ: ۱۲۰] "بے شک اللہ تعالیٰ نیکی کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔" رتی بھر نیکی کی ہوگی تو اس کا اجر ضرور ملے گا۔ تو ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے ترغیب دی ہے کہ جنت حاصل کرو، مغفرت کی طرف قدم بڑھاؤ اور گناہوں سے بچو۔

﴿وَالَّذِیْنَ﴾ اور وہ لوگ ﴿اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً﴾ جب کرتے ہیں کوئی بے حیائی ﴿اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ﴾ یا ظلم کرتے ہیں اپنی جانوں پر ﴿ذَكَرُوا اللّٰهَ﴾ اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے ہیں ﴿فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ﴾ پس معافی مانگتے ہیں اپنے گناہوں کے لیے ﴿وَمَنْ یَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ﴾ اور کون بخشتا ہے گناہوں کو ﴿اِلَّا اللّٰهُ﴾ مگر صرف اللہ تعالیٰ ﴿وَلَمْ یُصِرُّوْا﴾ اور نہیں اصرار کرتے ﴿عَلٰی مَا فَعَلُوْا﴾ اس کارروائی پر جو انھوں نے کی ﴿وَهُمْ یَعْلَمُوْنَ﴾ اور حالاں کہ وہ جانتے ہیں ﴿اُولٰٓئِكَ﴾ وہ لوگ ہیں ﴿جَزَآؤُهُمْ مَّغْفِرَةٌ﴾ بدلا ان کا بخشش ہوگا ﴿مِّنْ رَّبِّهِمْ﴾ ان کے رب کی طرف سے ﴿وَجَنّٰتٌ﴾ اور باغات ہوں گے ﴿تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ﴾ جاری ہوں گی ان باغوں کے نیچے نہریں ﴿خٰلِدِیْنَ فِیْهَا﴾ ہمیشہ رہیں گے ان میں ﴿وَنِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِیْنَ﴾ اور کیا اچھا بدلا ہے عمل کرنے والوں کا ﴿قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ﴾ بہ تحقیق گزر چکے ہیں تم سے پہلے ﴿سُنَنٌ﴾ طریقے ﴿فَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ﴾ پس سیر کرو زمین کی ﴿فَانْظُرُوْا﴾ پس دیکھو! ﴿كَیْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِیْنَ﴾ کیسا تھا انجام جھٹلانے والوں کا ﴿هٰذَا بَیَانٌ لِّلنَّاسِ﴾ یہ قرآن کریم بیان ہے لوگوں کے لیے ﴿وَهُدًی وَّمَوْعِظَةٌ﴾ اور ہدایت اور نصیحت ہے ﴿لِّلْمُتَّقِیْنَ﴾ پرہیزگاروں کے لیے ﴿وَلَا تَهِنُوْا﴾ اور نہ سستی کرو ﴿وَلَا تَحْزَنُوْا﴾ اور نہ غمگین ہو ﴿وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ﴾ اور تم ہی غالب ہوگے ﴿اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ﴾ اگر تم مومن ہو۔

اس سے پہلی آیت کریمہ میں متقیوں کے چند اوصاف بیان ہوئے تھے کہ وہ راحت اور آرام کی حالت میں بھی اور دکھ اور تکلیف کی حالت میں بھی اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرتے ہیں اور غصے کو پی جاتے ہیں جہاں پینا جائز ہو۔ اور لوگوں سے درگزر کرتے ہیں۔ اور اگر وہ اپنی خطا کو تسلیم کرے تو اللہ تعالیٰ نیکی کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ آگے بھی انھی پرہیزگاروں کے

اوصاف کا بیان ہے۔

فرمایا﴿وَالَّذِیْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً﴾ اور وہ لوگ جب کرتے ہیں کوئی بے حیائی۔یعنی کبیرہ گناہ کرتے ہیں﴿اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ﴾ یا ظلم کرتے ہیں اپنی جانوں پر کہ ان سے کوئی صغیرہ گناہ سرزد ہوتا ہے﴿ذَكَرُوا اللّٰهَ﴾ اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے ہیں۔یعنی غافل نہیں ہیں۔اگر ان سے کوئی گناہ ہو جاتا ہے تو اس پر پشیمان ہوتے ہیں اور فوراً رب کے خوف سے اسے یاد کرتے ہیں ﴿فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ﴾ پس معافی مانگتے ہیں اپنے گناہوں کے لیے کہ اے پروردگار! مجھ سے یہ گناہ سرزد ہو گیا ہے تو مجھے معاف فرما دے۔رب تعالیٰ فرماتے ہیں ﴿وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ﴾ اور کون بخشتا ہے گناہوں کو سوائے اللہ تعالیٰ کے۔غَافِرُ الذُّنُوْبِ صرف اللہ تعالیٰ ہے۔

گناہ کا نقصان اور نیکی کی برکت سے گناہوں کا معاف ہونا

اور ان پرہیزگاروں کی خوبی یہ ہے کہ ﴿وَلَمْ يُصِرُّوْا عَلٰى مَا فَعَلُوْا﴾ اور نہیں اصرار کرتے اس کارروائی پر جو انھوں نے کی ہے۔گناہ پر اصرار کرنا بہت بُری بات ہے۔فقہائے کرام رحمہم اللہ دین میں بڑا محتاط طبقہ ہے۔وہ فرماتے ہیں صغیرہ گناہ بار بار کرنے سے کبیرہ بن جاتا ہے۔اور اگر کبیرہ پر اصرار کرے گا تو خطرہ ہے کہ کفر تک نوبت نہ پہنچ جائے۔اس واسطے گناہ پر اصرار نہیں کرنا چاہیے۔حدیث پاک میں آتا ہے:

((اِذَا اَذْنَبَ الْعَبْدُ ذَنْبًا نُكِتَتْ عَلٰى قَلْبِهٖ سَوْدَآءُ)).

"جب آدمی کوئی گناہ کرتا ہے تو اس گناہ کی وجہ سے اس کے دل پر سیاہ دھبہ لگ جاتا ہے۔"

اور گناہ کیا اور دھبہ لگ گیا۔اگر وہ توبہ کرے تو وہ داغ دھل جاتا ہے اور دل صاف ہو جاتا ہے اور اگر توبہ نہ کرے معافی نہ مانگے اور دوسرے گناہ کا ارتکاب کرے تو سیاہ دھبہ بڑھ جاتا ہے اور اس کا دل سیاہ ہو جاتا ہے۔اسی کو اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿كَلَّا بَلْ ۜ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ﴾ [پارہ:۳۰]

"خبردار! (ہرگز ایسا نہیں ہے) بلکہ ان کے دل زنگ آلود ہو گئے ہیں ان اعمال کی وجہ سے جو وہ کرتے تھے۔"

تو گناہوں کی وجہ سے دل زنگ آلود ہو جاتا ہے اور اس پر غلاف چڑھ جاتا ہے۔اور اس کی علامت یہ ہے کہ آدمی نیکی کے کاموں میں بڑا سست ہو جاتا ہے اور بُرے کاموں کی طرف دوڑ دوڑ کر جاتا ہے اللہ کرے کسی مسلمان کی یہ حالت نہ ہو۔اگر ہو جائے تو بہت بری حالت ہے۔توبہ کرے اللہ تعالیٰ سے معافی مانگے اور نیکیوں کی طرف بڑھے۔کیوں کہ بعض گناہ تو ایسے ہیں کہ وہ نیکی کی برکت سے معاف ہو جاتے ہیں۔

حدیث پاک میں آتا ہے کہ ایک قدم مسجد کی طرف اُٹھاؤ تو اس کی برکت سے خود بہ خود ایک صغیرہ گناہ معاف ہو جاتا

ہے اور دس نیکیاں بھی اس کے نامہ اعمال میں درج ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح جب آدمی وضو کرتا ہے تو وضو کی برکت سے کئی صغیرہ گناہ جھڑ جاتے ہیں۔ جب ہاتھ دھوتا ہے تو گناہ جو ہاتھ سے کیے ہیں جھڑ جاتے ہیں۔ جب کلی کرتا ہے تو زبان والے جھڑ جاتے ہیں۔ جب منہ دھوتا ہے تو آنکھوں والے پلکوں سے جھڑ جاتے ہیں۔

بعض حقوق اللہ اور حقوق العباد ایسے ہیں جو توبہ سے معاف نہیں ہوتے

مگر بعض گناہ ایسے ہیں کہ نیکیوں کی برکت سے نہیں جھڑتے نہ خالی توبہ کرنے سے معاف ہوتے ہیں۔ جیسے: حقوق العباد ہیں کہ جب تک بندوں کا حق ادا نہیں کیا جائے گا لاکھ مرتبہ توبہ کرنے سے بھی معاف نہیں ہوگا۔ اسی طرح کچھ حقوق اللہ بھی ایسے ہیں کہ محض توبہ کرنے سے معاف نہیں ہوتے۔ مثلاً: بالغ ہونے کے بعد کسی مرد یا عورت کے ذمہ نماز یا روزہ ہے چاہے ایک ہی کیوں نہ ہو کروڑ مرتبہ بھی توبہ کرنے سے معاف نہیں ہوگا جب تک اس کی قضا نہیں کرے گا۔ اور اس پر ائمہ اربعہ امام اعظم ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل اور تمام فقہائے کرام رحمہم اللہ اور امام بخاری اور امام مسلم رحمہما اللہ سمیت سو فیصد محدثین اس پر متفق ہیں کہ اگر کسی کے ذمہ ایک نماز بھی ہے تو وہ کروڑ مرتبہ توبہ کرنے سے معاف نہیں ہوگی۔ اسی طرح اگر کسی کے ذمہ ایک روزہ بھی ہے تو کروڑ مرتبہ توبہ کرنے سے بھی معاف نہیں ہوگا۔ جب تک حساب کر کے قضا نہ کیا جائے۔ بہت سارے لوگ غلط فہمی کا شکار ہیں کہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ توبہ کرنے کے ساتھ سب کچھ ہضم ہو جائے گا۔ ہرگز نہیں ہوگا۔ نہ زکوٰۃ معاف ہوگی، نہ عشر معاف ہوگا، نہ نماز، نہ روزہ۔

اگر ایسا ہوتا تو محدثین کرام رحمہم اللہ بَابُ قَضَاءِ الْفَوَائِت قائم نہ کرتے۔ اور اس میں چن چن کر احادیث نہ بیان فرماتے۔ اور فقہائے عظام رحمہم اللہ بَابُ قَضَاءِ الْفَوَائِت قائم کر کے ان کو پڑھنے کا طریقہ نہ بیان فرماتے۔ اگر توبہ سے معاف ہوتی تھیں تو آسان نسخہ تھا "گزشتہ را صلوٰت آئندہ را احتیاط۔"

اور نہ بندوں کے حقوق معاف ہوتے ہیں۔ اگر ایک سوئی بھی کسی کی تمہارے پاس ہے تو جب تک دے نہیں دو گے معافی نہیں ملے گی۔ شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب "غنیۃ الطالبین" میں ایک بزرگ کا واقعہ نقل فرماتے ہیں کہ ایک بڑا پارسا اور نیک آدمی تھا۔ فوت ہو گیا۔ وفات کے بعد کسی کو خواب میں ملا۔ اس نے دریافت کیا کہ تمہارے ساتھ کیا معاملہ ہوا؟ بزرگ نے کہا کہ مجھے سزا تو نہیں ہوئی مگر جنت کا دروازہ بند ہے فرشتے اندر نہیں جانے دیتے۔ کہتے ہیں کہ اِسْتَعَرْتُ اِبْرَةً مِّنَ الْجَارِ فَلَمْ تَرُدَّهَا۔ "تو پڑوسی سے سوئی مانگ کر لایا تھا واپس نہیں کی جب تک وہ سوئی واپس نہیں کرے گا جنت میں داخل نہیں ہو سکتا۔" اور آج تو ہم نے لوگوں کے کارخانے ہضم کر لیے ہیں اور کوئی پروا نہیں ہے۔ سوئی تو کیا لوگوں کی مشینیں کھا گئے ہیں اور انجام کا احساس نہیں ہے۔ یہ بات آدمی کو اس وقت سمجھ آتی ہے جب خدا خوفی ہو اور آخرت سامنے ہو۔

اس واقعہ کے ساتھ ہی دوسرا واقعہ پیش فرماتے ہیں کہ ایک نیک آدمی کی کسی نے دعوت کی۔ دعوت کھا کے واپس

جارہے تھے۔ راستہ میں کسی نے فصل کاشت کی ہوئی تھی۔ گندم تھی یا باجرہ تھا۔ اس کا تنکا توڑ کر انھوں نے دانتوں کا خلال کیا۔ وفات کے بعد ان کی کسی دوست سے خواب میں ملاقات ہوئی۔ اس نے دریافت کیا کہ کیا معاملہ ہوا ہے؟ تو کہنے لگے مجھے کہتے ہیں کہ تو نے فلاں کی فصل کا تنکا توڑ کر دانتوں کا خلال کیا تھا۔ جب تک اس کا حق ادا نہیں کرے گا جنت میں داخل نہیں ہوسکتا۔ تمھارا جنت میں داخلہ ممنوع ہے۔

تو ایسے حقوق اللہ جن کی قضا ہے وہ توبہ کرنے سے معاف نہیں ہوتے۔ توبہ بے شک حق ہے مگر جب تک حقوق ادا نہیں کیے جائیں گے زبانی توبہ سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ اسی طرح حقوق العباد ہیں کہ جب تک بندوں کو حقوق ادا نہ کردیے جائیں یا وہ اپنی رضا سے معاف نہ کردیں محض زبان سے توبہ کرنے سے معافی نہیں ملتی۔ بڑا مشکل مسئلہ ہے۔

بخاری شریف کی روایت کا خلاصہ ذکر کرتا ہوں کہ میدانِ محشر میں کچھ لوگوں کو اللہ تعالیٰ کے پاس لایا جائے گا حساب کتاب کے لیے۔ ان کے پاس نیکیوں کے پہاڑ ہوں گے۔ وہ بڑے خوش ہوں گے کہ خیر ہے بڑی نیکیاں ہیں۔ مگر ان کے ذمہ حقوق اللہ بھی ہوں گے اور حقوق العباد بھی ہوں گے۔ کچھ نیکیاں تو حقوق اللہ کی مد میں جمع کی جائیں گی۔ پھر بندوں کے حقوق کی باری آئے گی۔ بندوں کے حقوق کے بدلے نیکیاں دی جائیں گی۔ نیکیاں ختم ہوجائیں گی اور حق لینے والے ابھی باقی ہوں گے تو ان کے گناہ اُٹھا کے ان کے سروں پر رکھ دیے جائیں گے اور حکم ہوگا ان کو جہنم میں پھینک دو؟ تو پہاڑوں کے پہاڑ نیکیوں کے اُڑ جائیں گے اور دوسروں کے گناہ سر پر آپڑیں گے۔ اس واسطے بات اچھی طرح سمجھ لو۔ اور حقوق اللہ بھی ادا کرو اور حقوق العباد بھی۔ اور بیٹھ کر سوچو اور غور وفکر کرو کہ جس دن سے بالغ ہوئے ہو، بالغ ہونے کے بعد کتنی نمازیں رہ گئی ہیں اور کتنے روزے رہ گئے ہیں۔ ایک دن لگے گا، دو دن لگیں گے، ہفتہ لگے گا، آج محنت کر کے باقاعدہ اس کی فہرست تیار کرو کہ اتنی نمازیں میرے ذمہ ہیں اور اتنے روزے میرے ذمہ ہیں۔ پھر ان کی قضا کرو۔ فرض نماز کی قضا ہے اور وتر واجب ہیں ان کی بھی قضا ہے۔ سنتوں کی قضا نہیں ہے۔

ایک اور مسئلہ بھی سمجھ لیں وہ بھی بڑا ضروری ہے کہ جس طرح وقتی نمازوں میں تعیین اور ترتیب ضروری ہے کہ یہ فجر کی نماز پڑھ رہا ہوں، یہ ظہر کی نماز پڑھ رہا ہوں۔ اور ترتیب کا مطلب یہ ہے کہ پہلے فجر ہے پھر ظہر ہے۔ ہفتے کی فجر پہلے ہے اتوار کی فجر بعد میں ہے۔ اسی طرح قضا نمازوں میں بھی تعیین اور ترتیب ضروری ہے کہ میں کون سی نماز پڑھ رہا ہوں؟ فجر کی یا ظہر کی۔ اور یہ تعیین کرنا بھی ضروری ہے کہ پہلی پڑھ رہا ہوں یا دوسری پڑھ رہا ہوں۔ فرض کرو کہ ایک آدمی کے ذمہ فجر کی ایک ہزار نمازیں ہیں اور وہ نیت اس طرح کرتا ہے کہ میرے ذمے جو فجر کی نمازیں ہیں ان میں سے ایک پڑھتا ہوں۔ ساری عمر پڑھتا رہے بریٔ الذمہ نہیں ہوگا۔ کیوں کہ جس طرح وقتی نمازوں میں ترتیب ضروری ہے قضا نمازوں میں بھی ترتیب ضروری ہے۔ تو اس طرح ترتیب قائم کرے گا کہ میرے ذمہ جو فجر کی ہزار نمازیں ہیں ان میں سے پہلی پڑھتا ہوں۔ جب بھی پڑھے گا یہی کہے کہ جو باقی میرے ذمہ ہیں ان میں سے پہلی پڑھتا ہوں۔ بس پہلی پہلی کہتا جائے تعیین ہوجائے گی۔ یا آخر سے شروع کرے کہ

میرے ذمہ جو فجر کی نمازیں ہیں ان میں سے آخری پڑھتا ہوں۔ ہر دفعہ یہی کہے کہ جو باقی میرے ذمہ ہیں ان میں سے آخری پڑھتا ہوں۔ بس آخری آخری کہتا جائے اور پڑھتا جائے۔ اس طرح تعیین کرے گا تو ادا ہوگی۔

تو نیکیاں ضائع نہ کرو اور گناہوں پر اصرار نہ کرو ﴿وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ﴾ اور حالانکہ وہ جانتے ہیں کہ گناہ پر اصرار کرنا اچھی بات نہیں ہے۔ ﴿اُولٰٓئِكَ﴾ یہ لوگ جن کی یہ خوبیاں بیان ہوئی ہیں ﴿جَزَآؤُهُمْ مَّغْفِرَةٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ﴾ ان کا بدلہ یہ ہے کہ ان کی بخشش ہوگی ان کے رب کی طرف سے ﴿وَجَنّٰتٌ﴾ اور ایسے باغات ہوں گے ﴿تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ﴾ جاری ہوں گی ان باغوں کے نیچے نہریں ﴿خٰلِدِيْنَ فِيْهَا﴾ ہمیشہ رہیں گے ان میں ﴿وَنِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ﴾ اور کیا اچھا بدلہ ہے عمل کرنے والوں کا۔

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

یعنی عمل کے بغیر کچھ بھی نہیں ہے۔ اور فارسی کے شاعر نے بہت اچھی بات کہی ہے۔

از مکافاتِ عمل غافل مشو
گندم ز گندم بہ روید جو ز جو

"اے بندے! عمل کے بدلے سے غافل نہ ہو۔ گندم بوئے گا تو گندم پیدا ہوگی جَو بوئے گا تو جَو پیدا ہوں گے۔" جو بوئے گا سو کاٹے گا۔ اور آج ہماری حالت یہ ہے کہ بوتے کچھ بھی نہیں ہیں اور کہتے ہیں کہ کاٹنا سب کچھ ہے۔ یعنی نیکی تو کوئی کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں اور سارے بہشت پر قبضے کی تیاریاں ہیں۔

چوں کہ غزوۂ احد میں مسلمانوں کو کافی پریشانی ہوئی تھی اور بڑی تکلیف اُٹھانی پڑی تھی کہ ستر [۷۰] ساتھی شہید ہوئے۔ اور کوئی ہوگا جو زخمی نہ ہوا ہوگا۔ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دندان مبارک شہید ہوئے، چہرۂ اقدس زخمی ہوا۔ تو اگلی آیتِ کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو تسلی دی ہے کہ حق و باطل کی ٹکر شروع سے چلی آ رہی ہے اور پہلے حق والوں نے بھی کافی تکلیفیں اٹھائی ہیں لہٰذا پریشان نہ ہوں۔

فرمایا ﴿قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ﴾ بہ تحقیق گزر چکے ہیں تم سے پہلے طریقے۔ یعنی بڑے بڑے حالات گزرے ہیں ﴿فَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ﴾ پس سیر کرو زمین کی ﴿فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ﴾ پس دیکھو! کیسا تھا انجام جھٹلانے والوں کا کہ جن لوگوں نے حق کو جھٹلایا اور حق کے مقابلے میں آئے ان کا انجام کیا ہوا؟ ﴿هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ﴾ یہ قرآن کریم بیان ہے لوگوں کے لیے۔ اس کتاب سے زیادہ واضح اور قطعی اور کوئی کتاب نہیں ہے۔ یہ بڑی عظمت والی کتاب ہے۔ اس کا پڑھنا ثواب، اس کو سمجھنا ثواب، اس کا بیان کرنا ثواب، اس کو ہاتھ لگانا ثواب، دیکھنا ثواب، اس کے ورقوں کا پلٹنا، ثواب ہی ثواب ہے۔ مگر افسوس کہ ہم نے تو قرآن پاک کو تیجے، ساتویں اور دسویں کے لیے رکھا ہوا ہے۔ یا قسمیں اُٹھانے کے لیے یا جانوروں کو وبائی امراض سے بچانے کے لیے قرآن پاک کے نیچے سے گزار دو تو اس کی برکت سے وہ محفوظ ہو جائیں گے۔ بھئی! قرآن جس مقصد

کے لیے آیا تھا وہ تو ہم نے حاصل نہیں کیا۔ قرآن پاک تو نازل ہوا تھا تا کہ تم اس کو پڑھو، سمجھو اور اس پر عمل کرو۔

اور یاد رکھنا! ضروریاتِ دین میں سے ہے ہر بالغ مسلمان مرد ہو یا عورت قرآن پاک کو پڑھے اور سمجھے۔ یہ فرض ہے۔ اس میں کوئی شخص معذور نہیں ہوگا۔ البتہ بعض مسائل ایسے ہیں کہ ان کا جاننا ہر مسلمان پر لازم نہیں ہے۔ اگر قصبے میں ایک ایسا جید عالم موجود ہے جو لوگوں کے مسائل حل کر دے تو سارا قصبہ گناہ سے پاک ہوگا۔ اور اگر کوئی ایسا قصبہ ہے کہ وہاں کوئی ایک بھی ایسا عالم نہیں ہے جو بہ وقتِ ضرورت مسئلہ بیان کرے یا لوگوں کے مسائل حل کرے تو سارا قصبہ گناہ گار ہوگا۔ کیوں کہ بعض مسئلے ایسے ہیں کہ ان کا جاننا فرض کفایہ ہے۔ لیکن وہ مسائل جو ضروریاتِ دین میں سے ہیں وہ فرضِ عین ہیں۔ ان کا جاننا ہر آدمی کے ذمے ہے۔

فقہائے کرام رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ ایک نابالغ لڑکی کا نکاح ہوا۔ جب وہ بالغ ہوگئی فَاسْتُوْصِفَتْ عَنِ الْاِيْمَانِ "تو اس سے ایمان کے بارے میں سوال کیا گیا کہ ایمان کی تعریف کیا ہے؟ فَقَالَتْ لَا اَدْرِيْ پس اس نے کہہ دیا کہ مجھے معلوم نہیں ہے تو بَانَتْ مِنْ زَوْجِهَا اس کا نکاح ٹوٹ گیا۔" بحر الرائق، بزازیہ، عالمگیری میں یہ جزئی موجود ہے۔ کیوں کہ بالغ ہونے کے وقت اس پر لازم تھا کہ وہ جانتی کہ ایمان کی تعریف کیا ہے؟ ایمان کسے کہتے ہیں؟ ایمان کی حقیقت کیا ہے؟ کیوں کہ یہ ضروریاتِ دین میں سے ہے۔ اس میں کوئی شخص معذور نہیں ہے۔ اور یہاں تو حالت یہ ہے کہ ہماری دادیاں نانیاں نہیں جانتیں کہ ایمان کیا ہوتا ہے؟ اس کی تعریف کیا ہے؟ اس کی حقیقت کیا ہے؟

کفار پر غلبہ کی شرط

تو قرآن پاک واضح بیان ہے لوگوں کے لیے ﴿وَهُدًى وَّمَوْعِظَةٌ﴾ اور ہدایت اور نصیحت ہے ﴿لِّلْمُتَّقِيْنَ﴾ پرہیز گاروں کے لیے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں اے مومنو! غزوۂ احد میں اگر تمھیں شکست ہوئی ہے ﴿وَلَا تَهِنُوْا﴾ اور نہ سستی کرو ﴿وَلَا تَحْزَنُوْا﴾ اور نہ غمگین ہو ﴿وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ﴾ اور تم ہی غالب ہو گے ﴿اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ﴾ اگر تم مومن ہو۔

فاتح مصر حضرت عمرو ابن العاص رضی اللہ عنہ نے امیر المومنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خط لکھا کہ قلعہ بولس کا ہم نے محاصرہ کیا ہوا ہے۔ کافی دن ہو گئے ہیں مگر فتح نہیں ہو رہا۔ میرے پاس آٹھ ہزار فوج ہے۔ مزید فوج بھی بھیجو اور طریقہ بھی بتاؤ۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خط پڑھا اور رو پڑے اور کہنے لگے کہ آٹھ ہزار مسلمان ہیں اور کہتے ہیں ہم نے قلعہ کا محاصرہ کیا ہوا ہے اور فتح نہیں ہو رہا۔ خط کا جواب تحریر فرمایا کہ غور کرو تم لوگوں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی سنت رہ گئی ہے جس کی وجہ سے نصرت الٰہی میں تاخیر ہوگئی ہے۔ اور حقیقت یہ تھی کہ بعض ساتھیوں سے مسواک والی سنت رہ گئی تھی۔

اور آج حالت یہ ہے کہ فرائض غائب ہیں، واجبات غائب ہیں۔ فرمایا تم آٹھ ہزار ہو اور میں چار ہزار مزید فوج بھیجتا ہوں۔ اب تم بارہ ہزار ہو جاؤ گے اور بارہ ہزار مومن قلت کی وجہ سے شکست نہیں کھا سکتے اگر کوئی اور وجہ نہ ہو۔ اور وہ مزید چار

ہزار فوج صرف چار آدمی تھے جن کو بھیجا۔ حضرت زبیر بن العوام، حضرت عبادۃ ابن صامت، حضرت خارجہ ابن حذافہ اور حضرت حذیفہ ابن یمان رضی اللہ عنہم۔ فرمایا یہ چار ہزار فوج ہے۔ تو ایمان بڑی قوت ہے۔ اے مسلمان! جب تو مسلمان تھا تجھ میں ایمان تھا تو ایک آدمی ایک ہزار کے برابر ہوتا تھا۔ کاش! کہ کوئی اس بات کو سمجھے۔ تو اللہ تعالیٰ کا فرمان بالکل سچا ہے کہ اگر تم مومن ہو تو تم ہی غالب آؤ گے۔ رب تعالیٰ سب کو ایمان اور عمل کی توفیق عطاء فرمائے۔ [آمین]

﴿اِنْ یَّمْسَسْكُمْ﴾ اگر پہنچے ہیں تمھیں ﴿قَرْحٌ﴾ زخم ﴿فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ﴾ پس تحقیق پہنچے ہیں اس قوم کو بھی ﴿قَرْحٌ﴾ زخم ﴿مِّثْلُهٗ﴾ اس جیسے ﴿وَتِلْكَ الْاَیَّامُ﴾ اور یہ دن ﴿نُدَاوِلُهَا بَیْنَ النَّاسِ﴾ ان کو ہم پھیرتے رہتے ہیں لوگوں کے درمیان ﴿وَلِیَعْلَمَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا﴾ اور تا کہ ظاہر کر دے اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو جو ایمان لائے ہیں ﴿وَیَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَآءَ﴾ اور تا کہ بنائے تم میں سے کچھ شہید ﴿وَاللّٰهُ لَا یُحِبُّ الظّٰلِمِیْنَ﴾ اور اللہ تعالیٰ نہیں محبت کرتا ظالموں کے ساتھ ﴿وَلِیُمَحِّصَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا﴾ اور تا کہ خالص کر دے ان لوگوں کو جو ایمان لائے ﴿وَیَمْحَقَ الْكٰفِرِیْنَ﴾ اور تا کہ مٹا دے کافروں کو ﴿اَمْ حَسِبْتُمْ﴾ کیا تم خیال کرتے ہو ﴿اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ﴾ یہ کہ تم داخل ہو جاؤ گے جنت میں ﴿وَلَمَّا یَعْلَمِ اللّٰهُ﴾ اور ابھی تک ظاہر نہیں کیا اللہ تعالیٰ نے ﴿الَّذِیْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ﴾ ان لوگوں کو جنھوں نے جہاد کیا تم میں سے ﴿وَیَعْلَمَ الصّٰبِرِیْنَ﴾ اور جانتا ہے صبر کرنے والوں کو ﴿وَلَقَدْ كُنْتُمْ﴾ اور البتہ تحقیق تھے تم ﴿تَمَنَّوْنَ الْمَوْتَ﴾ آرزو کرتے موت کی ﴿مِنْ قَبْلِ اَنْ تَلْقَوْهُ﴾ پہلے اس سے کہ تم موت کے ساتھ ملاقات کرتے ﴿فَقَدْ رَاَیْتُمُوْهُ﴾ پس تحقیق تم دیکھ چکے اس کو ﴿وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ﴾ اور تم بہ خوبی دیکھ رہے ہو ﴿وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ﴾ اور نہیں ہیں محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مگر رسول ﴿قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ﴾ تحقیق گزر چکے ہیں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پہلے رسول ﴿اَفَاۡئِنْ مَّاتَ﴾ بھلا اگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وفات پا جائیں ﴿اَوْ قُتِلَ﴾ یا قتل کر دیے جائیں ﴿انْقَلَبْتُمْ عَلٰۤى اَعْقَابِكُمْ﴾ پلٹ جاؤ گے تم، اپنی ایڑیوں کے بل ﴿وَمَنْ یَّنْقَلِبْ﴾ اور جو شخص پھر جائے گا ﴿عَلٰى عَقِبَیْهِ﴾ اپنی ایڑیوں پر ﴿فَلَنْ یَّضُرَّ اللّٰهَ شَیْــًٔا﴾ پس وہ ہرگز ضرر نہیں دے گا اللہ تعالیٰ کو کسی چیز کا ﴿وَسَیَجْزِی اللّٰهُ الشّٰكِرِیْنَ﴾ اور بدلا دے گا اللہ تعالیٰ شکر گزاروں کو۔

اس سے پہلے آپ غزوۂ احد کا ذکر تفصیل کے ساتھ سن چکے ہیں کہ غزوۂ احد ہجرت کے تیسرے سال گیارہ شوال ہفتے والے دن پیش آیا تھا۔ جس میں مسلمانوں کی تعداد سات سو تھی اور مقابلے میں تین ہزار کافر تھے۔ ابتدائی مرحلے میں مجاہدین اسلام کو فتح نصیب ہوئی۔ پھر ایک غلطی کی وجہ سے فتح شکست میں بدل گئی۔ غلطی یہ ہوئی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پچاس صحابہ

کرام رضی اللہ عنہم کو ایک مورچے پر ٹھہرایا اور فرمایا کہ ہمیں فتح ہو یا شکست تم نے یہیں ٹھہرنا ہے، لیکن وہ وہاں نہ ٹھہر سکے۔ چوں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی خلاف ورزی ہوئی اللہ تعالیٰ نے نتیجہ بھی ظاہر فرما دیا کہ ستر صحابہ رضی اللہ عنہم شہید ہوئے، کافی ساتھی زخمی ہوئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پیارے چچا حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو بڑی بے دردی کے ساتھ شہید کیا گیا۔ آپ کا ناک کاٹا گیا، کلیجہ نکالا گیا۔ مسلمان بہت پریشان تھے۔ اللہ تعالیٰ نے مجاہدین اسلام کو تسلی دی۔

فرمایا ﴿اِنْ یَّمْسَسْکُمْ قَرْحٌ﴾ اگر پہنچے ہیں تمھیں زخم۔ تمھارے ستر ساتھی شہید ہوئے ہیں اور بہت سارے زخمی ہوئے ہیں ﴿فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهٗ﴾ پس تحقیق پہنچے ہیں اس قوم کو بھی زخم اس جیسے کہ جنگِ بدر میں ان کے بھی ستر سرکردہ آدمی مارے گئے جو کفر کے ستون تھے۔ اور ستر قیدی بنے اور ان کو فدیہ دینا پڑا اور بڑی ذلت اُٹھانا پڑی۔

گردشِ ایام کا فلسفہ

یاد رکھو! دن ایک جیسے نہیں رہتے۔ اللہ تعالیٰ مشیت اور مصلحت کے مطابق حالات بدلتے رہتے ہیں۔

بخاری شریف میں حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ جب ہرقل روم نے ابوسفیان سے سوال کیا کہ تمھارے اور مسلمانوں کے درمیان معاملات کیسے رہتے ہیں اور ان کے ساتھ کبھی مڈبھیڑ بھی ہوئی ہے اور اس کا نتیجہ کیا نکلا ہے؟ تو ابوسفیان نے جواب دیا ((اَلْحَرْبُ سِجَالٌ بَیْنَنَا وَ بَیْنَهُمْ)) "ہمارے اور ان کے درمیان لڑائی کا معاملہ پانی کے ڈول کی مانند ہوتا ہے۔" کبھی کسی نے ڈول کنویں میں ڈال کر پانی نکال لیا اور کبھی کسی نے۔ یعنی لڑائی کی صورت میں کبھی ہم غالب آجاتے ہیں اور کبھی مسلمان غالب آجاتے ہیں۔ ہرقل نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کے رسولوں کا معاملہ ایسا ہی ہوتا ہے۔ انہیں دشمن کے مقابلے میں کبھی فتح ہوتی ہے اور کبھی شکست۔ مگر بالآخر اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں کو غلبہ عطاء فرماتا ہے۔

تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے مسلمانو! اُحد کی شکست سے نہ گھبراؤ ﴿وَ تِلْكَ الْاَیَّامُ نُدَاوِلُهَا بَیْنَ النَّاسِ﴾ اور یہ دن ان کو ہم ادلتے بدلتے رہتے ہیں لوگوں کے درمیان۔ ہمیشہ ایک سی حالت نہیں رہتی کہ ہمیشہ فتح یا ہمیشہ شکست ہو۔ اور تکلیف پہنچنے میں اللہ تعالیٰ نے یہ حکمت رکھی ہے ﴿وَ لِیَعْلَمَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا﴾ اور تاکہ ظاہر کردے اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو جو ایمان لائے ہیں۔ یہاں علم کا معنیٰ جاننا نہیں ہے۔ کیوں کہ ہر چیز اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے۔ حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما معنیٰ کرتے ہیں تاکہ بتادے اللہ تعالیٰ دوسرے لوگوں کو کہ اہل ایمان تکلیفیں اُٹھا کر بھی ایمان پر قائم رہتے ہیں اور حق کے راستے کو ترک نہیں کرتے۔ اور جو منافق ہیں وہ قربانی کے وقت چھپتے ہیں اور جھوٹے بہانے بنا کر جان چھڑاتے ہیں۔ سختی کے موقع پر مخلص غیر مخلص کا پتا چلتا ہے۔

شہداء کے بلند درجات

﴿وَ یَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَآءَ﴾ اور تاکہ بنائے تم میں سے کچھ شہید۔ شہید کا مقام بہت بلند ہے۔ بظاہر تو وہ شہید ہو گیا

ہے، مر گیا ہے مگر اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کی بڑی عزت اور قدر ہے۔ حدیث پاک میں آتا ہے کہ شہید کے خون کے قطرے زمین پر گرنے سے پہلے حوریں آجاتی ہیں ان قطروں کو اُٹھانے کے لیے۔ اللہ تعالیٰ کے فرشتے اس کی روح کو اُٹھا کر لے جاتے ہیں۔ جسم تو یہیں رہے گا۔ ہاں جس وقت جسم کو قبر میں دفن کر دیا جاتا ہے تو روح کا جسم کے ساتھ گہرا تعلق جوڑ دیا جاتا ہے۔ جسم چاہے ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا ہو اور سر کہیں ہو اور دھڑ کہیں ہو۔ چاہے اس کو جلا کر راکھ بنا کر ذرہ ذرہ کر کے اُڑا دیا جائے پھر بھی روح کا اس کے اجزاء کے ساتھ باقاعدہ تعلق ہوتا ہے۔ یہ اہل سنت والجماعت کا مسلک ہے۔ اور آپ یہی عقیدہ رکھیں اور کسی غلط آدمی کے بہکاوے میں نہ آئیں۔

تو شہداء کے اللہ تعالیٰ کے ہاں بڑے درجے ہیں۔ حدیث پاک میں آتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جنت میں سو سو منزلہ مکان ہوں گے (اتنے بلند ہوں گے کہ آدمی جب ان کو دیکھے گا تو ٹوپی پگڑی گر جائے گی)۔ سوال کیا گیا حضرت! وہ مکان انبیائے کرام علیہم السلام کے ہوں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ پیغمبروں کے مکان تو ان سے بھی بلند ہوں گے۔ وہ تو شہیدوں کے ہوں گے۔ تو شہیدوں کو اللہ تعالیٰ بڑے عہدے اور بڑے درجے عطاء فرمائیں گے۔ ان کے عہدوں اور درجوں کو دیکھ کر چار پائیوں پر مرنے والے افسوس کریں گے اور کہیں گے لَوْ اَنَّ اَبْدَانَنَا قُرِضَتْ بِالْمَقَارِيْضِ "کاش کہ ہمیں اللہ تعالیٰ کے راستے میں بڑی بڑی تکلیفیں آتیں اور ہمارے بدن قینچیوں کے ساتھ کاٹ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے جاتے اور ہمیں بھی یہ درجے ملتے۔"

تو فرمایا تاکہ تم میں سے کچھ کو شہید بنائے اور آخرت کی جو اعلیٰ منزلیں ہیں ان کو پہنچیں ﴿وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ﴾ اور اللہ تعالیٰ نہیں محبت کرتا ظالموں کے ساتھ۔ بسا اوقات مہلت دیتا ہے۔ حدیث پاک میں آتا ہے: ((اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى لَيُمْلِي الظَّالِمَ حَتّٰى اِذَا اَخَذَهٗ لَمْ يُفْلِتْهُ))۔ "بے شک اللہ تعالیٰ ظالم کو مہلت دیتا ہے کہ یہ جتنا ظلم کر سکتا ہے کر لے یہاں تک کہ جب پکڑتا ہے تو پھر چھوڑتا نہیں ہے۔" ﴿وَلِيُمَحِّصَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ اور تاکہ خالص کر دے ان لوگوں کو جو ایمان لائے ﴿وَيَمْحَقَ الْكٰفِرِيْنَ﴾ اور تاکہ مٹا دے کافروں کو۔ اگر تکلیفیں نہ آئیں تو یہ چیزیں ظاہر نہیں ہوتیں۔

مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ نے مثنوی میں سمجھانے کے لیے بڑی عجیب حکایتیں ذکر فرمائی ہیں۔ لیلیٰ مجنوں کا قصہ تاریخ میں مشہور ہے۔ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے پہلے گزرے ہیں۔ کچھ دور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی پایا ہے۔ اس کے متعلق مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ ایک حکایت بیان فرماتے ہیں کہ ایک موٹا تازہ آدمی لیلیٰ کی سہیلیوں کے پاس آیا اور کہنے لگا میں مجنوں ہوں اور مجھے بھوک لگی ہے کھانے کے لیے کچھ دو۔ انھوں نے اس کو کھانے کے لیے بہت کچھ دیا۔ گوشت بھی، کھیر بھی، چوری بھی۔ سب کچھ ہضم کر گیا۔ دوسرے دن پھر کھانا بھیجا، کھا گیا۔ تیسرے دن پھر بھیجا، کھا گیا۔

لیلیٰ کہنے لگی یہ بناوٹی مجنوں لگتا ہے اصلی کو خوراکوں سے کوئی غرض نہیں ہے اور یہ گوشت بھی کھا جاتا ہے، چوری کھا جاتا ہے، کھیر بھی کھا جاتا ہے اور بھی سب کچھ ہضم کر جاتا ہے۔ اس کا امتحان لو۔ اس کو جا کر کہو کہ لیلیٰ نے یہ پیالہ دے کر بھیجا ہے کہ اس کو خون کی ضرورت ہے اپنے بدن سے خون نکال کر دے۔ کہنے لگا میں تو چوری کھانے والا مجنوں ہوں خون دینے والے مجنوں کو

جنگل کے اس کونے میں تلاش کرو۔ معاف رکھنا! ہم اکثر چوری کھانے والے مجنوں ہیں۔ کچھ خون دینے والے بھی ہیں مگر بہت تھوڑے ہیں۔ یہ مجاہدین جو دین کی سربلندی کے لیے جانوں کے نذرانے پیش کرتے ہیں اور حق کی تائید کرتے ہیں یہ خون دینے والے ہیں۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ﴿اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ﴾ کیا تم خیال کرتے ہو یہ کہ تم داخل ہو جاؤ گے جنت میں ﴿وَ لَمَّا یَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِیْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ﴾ اور ابھی تک ظاہر نہیں کیا اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو جنھوں نے جہاد کیا تم میں سے ﴿وَ یَعْلَمَ الصّٰبِرِیْنَ﴾ اور ظاہر نہیں کیا ان لوگوں کو جو مصیبتوں اور تکلیفوں پر صبر کرنے والے ہیں۔ جنت بہت قیمتی ہے۔ حدیث پاک میں آتا ہے کہ جنت کی ایک چابک کے برابر جگہ دُنْیَا وَ مَا فِیْهَا کے خزانوں سے زیادہ قیمتی ہے۔ اور جنت میں جو عورتیں ہوں گی صرف ان کے دوپٹے کی قیمت دنیا وَ مَا فِیْهَا کے خزانے پوری نہیں کر سکتے۔ باقی لباس تو در کنار۔ تو اتنی قیمتی چیز مفت میں نہیں مل سکتی اور تم یہ سمجھتے ہو کہ صرف کلمہ پڑھنے سے ہم جنت کے ٹھیکے دار بن گئے ہیں۔

فرمایا ﴿وَ لَقَدْ كُنْتُمْ تَمَنَّوْنَ الْمَوْتَ﴾ اور البتہ تحقیق تھے تم آرزو کرتے موت کی۔ تم کہتے تھے کہ شہادت کا موقع آئے تو ہم اللہ تعالیٰ کے راستہ میں جانیں دیں گے ﴿مِنْ قَبْلِ اَنْ تَلْقَوْهُ﴾ پہلے اس سے کہ تم موت کے ساتھ ملاقات کرتے۔ جو لوگ غزوۂ بدر میں شریک نہیں ہو سکے تھے ان کے جذبات بڑے تیز تھے۔ وہ دشمن سے دوبارہ ٹکر لینے کے لیے بے تاب رہتے تھے اور خواہش کرتے تھے کہ جہاد کا موقع آئے تو انہیں بھی شہادت جیسا بلند مقام نصیب ہو۔ تو پہلے تم آرزو کرتے تھے کہ آئندہ کوئی موقع آئے گا تو ہم بھی اپنی جرأت کا مظاہرہ کریں گے ﴿فَقَدْ رَاَیْتُمُوْهُ﴾ پس تحقیق تم دیکھ چکے اس کو ﴿وَ اَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ﴾ اور تم بہ خوبی دیکھ رہے ہو کہ وہ شہید ہو گیا، وہ شہید ہو گیا، وہ شہید ہو گیا۔ تم نے اپنی آنکھوں سے موت کا منظر دیکھ لیا ہے۔

اور اس معرکے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دندان مبارک شہید ہوئے، چہرۂ اقدس زخمی ہوا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کی شکل آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ ملتی جلتی تھی۔ وہ شہید ہو گئے۔ چوں کہ افراتفری کا موقع تھا اپنوں نے بھی یہی سمجھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم شہید ہو گئے ہیں۔ اور دشمنوں کو موقع مل گیا اور خبر مشہور ہو گئی کہ اِنَّ مُحَمَّدًا قَدْ قُتِلَ "کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم شہید ہو گئے ہیں۔" کافروں کی خوشی کی کوئی انتہاء نہ تھی۔ لیکن معلوم ہوا کہ خبر غلط تھی۔ تو مسلمانوں کے سارے غم غلط ہو گئے۔

اس چیز کا اندازہ آپ حضرات اس واقعہ سے لگائیں کہ حضرت عمرو ابن جموع رضی اللہ عنہ غزوۂ اُحد میں شہید ہو گئے تھے۔ ان کی اہلیہ جس کا نام ہندتھا، یہ اپنے گھر مدینہ طیبہ میں آٹا گوندھ رہی تھیں کہ کسی نے اطلاع دی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم شہید ہو گئے ہیں۔ یہ اسی طرح آٹا چھوڑ کر باہر گلی میں آ کر کھڑی ہو گئیں۔ اُحد کی طرف سے آنے والے ایک آدمی سے پوچھا: مَا فَعَلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ؟ اس نے کہا کہ تیرا باپ، بھائی، خاوند اور بیٹا شہید ہو گئے ہیں۔ وہ دیوانہ وار کہنے لگی کہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق پوچھ رہی ہوں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کیا حال ہے؟ حالاں کہ عورت کے لیے تو یہی رشتے سرمایہ ہوتے ہیں۔ مگر اس کو صرف

آنحضرت ﷺ کی فکر تھی۔ کہنے لگی یہ بتاؤ کہ آنحضرت ﷺ کا کیا حال ہے؟ آنے والے نے بتایا کہ آنحضرت ﷺ صرف زخمی ہیں مگر زخم اتنے خطرناک نہیں ہیں کہ باعثِ تشویش ہوں۔ حضرت ہند کہنے لگیں كُلُّ مُصِيبَةٍ بَعْدَكَ جَلَلٌ "تیرے ہوتے ہوئے سب مصیبتیں ہیچ ہیں۔" یعنی آنحضرت ﷺ ہیں تو سب زندہ ہیں۔ مولانا شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس واقعہ کو اس طرح منظوم کیا ہے۔

میں بھی اور باپ بھی شوہر بھی برادر بھی فدا

اے شہہِ دیں تیرے ہوتے ہوئے کیا چیز ہیں ہم

اس سے اندازہ کرو کہ عورت نے سارے صدمے سنے جب معلوم ہوا کہ آپ ﷺ زندہ ہیں تو اس نے کہا کوئی بات نہیں سارے قربان ہو جائیں۔ آپ ﷺ زندہ ہیں تو سب زندہ ہیں۔

تو آنحضرت ﷺ کی شہادت کی خبر سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بڑا صدمہ تھا جس کی وجہ سے بددلی پیدا ہو گئی تھی۔ تو اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو تنبیہ فرمائی۔ فرمایا ﴿وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ﴾ اور نہیں ہیں محمد ﷺ مگر رسول ﴿قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ﴾ تحقیق گزر چکے ہیں آپ ﷺ سے پہلے رسول ﴿اَفَائِنْ مَّاتَ﴾ بھلا اگر آپ ﷺ وفات پا جائیں ﴿اَوْ قُتِلَ﴾ یا قتل کر دیے جائیں ﴿انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ﴾ پلٹ جاؤ گے تم اپنی ایڑیوں کے بل۔ یعنی کیا دین سے پھر جاؤ گے؟ اور کفر اختیار کر لو گے۔ اس میں ان لوگوں کو تنبیہ کی گئی ہے جنھوں نے ہمت اور جرأت کا ثبوت نہیں دیا۔ آپ ﷺ اللہ تعالیٰ رسول ہیں خود خدا نہیں ہیں۔ ایک نہ ایک دن دنیا سے جانا ہے۔ ابدی ذات صرف اللہ تعالیٰ کی ہے۔ نبی رسول کی زندگی ایک نہ ایک دن ختم ہونے والی ہے۔ لہٰذا رسول کی موت کے بعد مسلمانوں کا دین سے پلٹ جانا ہرگز جائز نہیں ہے بلکہ مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ اگر آپ ﷺ دنیا سے تشریف لے جائیں تو آپ ﷺ کی جو امانت ان کے سپرد ہے اس کو آگے پہنچائیں۔ آپ ﷺ سے پہلے بھی پیغمبر آئے۔ پھر بعض تو اپنی طبعی وفات کے ساتھ دنیا سے رخصت ہوئے اور بعض کو شہید کیا گیا۔ جن کا ذکر قرآن پاک میں موجود ہے ﴿وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ حَقٍّ﴾ [پارہ:۳] "اور قتل کرتے ہیں نبیوں کو ناحق۔" ﴿وَقَتْلَهُمُ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ﴾ [آل عمران:۱۸۱] "اور ان کا نبیوں کو ناحق قتل کرنا۔" بہت سارے پیغمبر شہید ہوئے۔

ایک دفعہ ظالموں نے ایک دن میں تینتالیس پیغمبر شہید کیے۔ حضرت یحییٰ علیہ السلام کو شہید کیا گیا، حضرت زکریا علیہ السلام کو شہید کیا گیا، حضرت شعیب علیہ السلام کو شہید کیا گیا۔ تو پیغمبروں کے قتل کا ذکر قرآن پاک میں موجود ہے۔ تو اس سے زیادہ وزنی دلیل اور کیا ہو سکتی ہے؟ لہٰذا جاہلوں نے جو یہ مشہور کیا ہوا ہے کہ پیغمبر کو کوئی قتل نہیں کر سکتا اور پیغمبر پر چھری نہیں چل سکتی۔ یہ خرافات ہیں۔ ان کا حقیقت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔

تو پیغمبروں کو طبعی موت بھی آتی ہے، شہید بھی ہوتے ہیں لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ ان کے دنیا سے چلے جانے کے بعد ان کا مشن ختم ہو جاتا ہے بلکہ مشن زندہ رہتا ہے اور اُمت کی ذمہ داری اور بڑھ جاتی ہے۔ ﴿وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ﴾

اور جو شخص پھر جائے گا اپنی ایڑیوں پر ﴿فَلَنْ یَّضُرَّ اللّٰهَ شَیْـًٔا﴾ پس وہ ہرگز ضرر نہیں دے گا اللہ تعالیٰ کو کسی چیز کا۔ یعنی اس نے اپنا ہی نقصان کرنا ہے اللہ تعالیٰ کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔ کیوں کہ کلمہ چھوڑے گا، اسلام چھوڑے گا، خدا کا کیا نقصان ہوا۔

ساری کائنات بد ہو جائے تو اس کے نظام میں ایک رتی کا فرق نہیں آئے گا۔ اور سارے نیک ہو جائیں تو رب تعالیٰ کی حکومت میں اضافہ نہیں ہوگا۔ رب وہی ہے جو ہے۔ یہ نیکیاں بدیاں تمھارے واسطے ہیں۔ ان کے انجام کا تعلق تمھارے ساتھ ہے ﴿وَ سَیَجْزِی اللّٰهُ الشّٰكِرِیْنَ﴾ اور بدلا دے گا اللہ تعالیٰ شکر گزاروں کو۔ مطلب یہ ہے کہ وہ ثابت قدم رہنے والوں کو اچھا بدلا دے گا اور مسلمانوں کو کسی حالت میں بد دل نہیں ہونا چاہیے۔ دنیا میں کسی کو دوام نہیں ہے صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہمیشہ قائم دائم ہے۔ تمھارا کام تھا جب تمھیں معلوم ہوا کہ آنحضرت ﷺ شہید ہو گئے ہیں ہمت سے آگے بڑھتے، کام سنبھالتے اور چلاتے۔ نہ کہ دل چھوڑ کے بیٹھ جاتے۔

﴿وَ مَا كَانَ لِنَفْسٍ﴾ اور نہیں اختیار کسی نفس کو ﴿اَنْ تَمُوْتَ﴾ یہ کہ وہ مرے ﴿اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ﴾ مگر اللہ تعالیٰ کے حکم کے ساتھ ﴿كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا﴾ نوشتہ ہے مقرر کیا ہوا ﴿وَ مَنْ یُّرِدْ﴾ اور جو شخص ارادہ کرتا ہے ﴿ثَوَابَ الدُّنْیَا﴾ بدلا دنیا کا ﴿نُؤْتِهٖ مِنْهَا﴾ ہم اس کو دے دیتے ہیں ﴿وَ مَنْ یُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ﴾ اور جو شخص ارادہ کرے گا آخرت کے بدلے کا ﴿نُؤْتِهٖ مِنْهَا﴾ ہم اس کو اس میں سے دیں گے ﴿وَ سَنَجْزِی الشّٰكِرِیْنَ﴾ اور ہم بدلا دیں گے شکر گزاروں کو ﴿وَ كَاَیِّنْ مِّنْ نَّبِیٍّ﴾ اور کتنے ہی نبی تھے ﴿قٰتَلَ مَعَهٗ﴾ ان کے ساتھ مل کر جہاد کیا ﴿رِبِّیُّوْنَ كَثِیْرٌ﴾ بہت سارے رب والوں نے ﴿فَمَا وَهَنُوْا﴾ پس نہیں کی انھوں نے سستی ﴿لِمَاۤ اَصَابَهُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ﴾ اس وجہ سے جو تکلیف پہنچی ان کو اللہ تعالیٰ کے راستے میں ﴿وَ مَا ضَعُفُوْا﴾ اور نہ انھوں نے کمزوری دکھائی ﴿وَ مَا اسْتَكَانُوْا﴾ اور نہ وہ دشمن کے سامنے دبے ﴿وَ اللّٰهُ یُحِبُّ الصّٰبِرِیْنَ﴾ اور اللہ تعالیٰ محبت کرتا ہے صبر کرنے والوں سے ﴿وَ مَا كَانَ قَوْلَهُمْ﴾ اور نہیں تھی بات ان کی ﴿اِلَّاۤ اَنْ قَالُوْا﴾ مگر یہ کہ کہا انھوں نے ﴿رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا﴾ اے ہمارے رب ہمیں بخش دے ہمارے گناہ ﴿وَ اِسْرَافَنَا﴾ اور جو ہم نے زیادتیاں کی ہیں ﴿فِیْۤ اَمْرِنَا﴾ اپنے معاملے میں (ان کو بھی معاف کر دے) ﴿وَ ثَبِّتْ اَقْدَامَنَا﴾ اور ہمارے قدموں کو ثابت رکھ ﴿وَ انْصُرْنَا﴾ اور ہماری مدد فرما ﴿عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِیْنَ﴾ کافر قوم کے مقابلے میں ﴿فَاٰتٰىهُمُ اللّٰهُ﴾ پس دیا اُن کو اللہ تعالیٰ نے ﴿ثَوَابَ الدُّنْیَا﴾ دنیا کا بدلا ﴿وَ حُسْنَ ثَوَابِ الْاٰخِرَةِ﴾ اور آخرت کا اچھا بدلا بھی ﴿وَ اللّٰهُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ﴾ اور اللہ تعالیٰ محبت کرتا ہے نیکی کے کام کرنے والوں سے۔

موت وحیات کا اختیار اللہ تعالیٰ کو ہے

اس سے پہلے غزوۂ احد کا ذکر چلا آرہا تھا۔ غزوۂ احد میں ستر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم شہید ہوئے تھے۔ اور بہت سارے زخمی ہوئے۔ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی زخمی ہوئے۔ کوئی کم ہی ایسے بچے رہ گئے ہوں گے کہ جن کو کوئی نہ کوئی گزند نہ پہنچا ہو۔ تو دفعتاً اتنی موتیں ہو جائیں کہ لاشوں سے میدان بھرا ہوا ہو۔ جب کہ موت تو ایک بھی بڑی ہے۔ پھر جو زندہ ہوا ان کے بدنوں سے خون بہہ رہا ہو تو طبعی طور پر صدمہ تو ہوتا ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو سبق دیا ہے ﴿وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ﴾ اور نہیں اختیار کسی نفس کو یہ کہ وہ مرے مگر اللہ تعالیٰ کے حکم کے ساتھ۔ یعنی موت وحیات بندے کے اختیار میں نہیں ہے جو کچھ ہوا ہے اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہوا ہے۔ خدا کو ایسے ہی منظور تھا۔ شاعر نے کہا ہے ؎

لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے
نہ اپنی خوشی آئے نہ اپنی خوشی چلے

اللہ تعالیٰ کے حکم کے بغیر موت نہیں آسکتی۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی قبر شام کے شہر حمص میں ہے۔ ان کا واقعہ آپ کئی مرتبہ سن چکے ہیں کہ جب وہ بیمار ہوئے تو لوگ تیمارداری کے لیے آتے تھے۔ یہ جب کسی ساتھی کو دیکھتے تو رونا شروع کر دیتے۔ لوگوں نے سمجھا چوں کہ موت نزدیک ہے شاید موت کے ڈر سے روتے ہیں۔ تو تسلی دیتے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر اب تک جتنی مخلوق آئی ہے باری باری سارے ہی جا رہے ہیں ﴿كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ﴾ [العنکبوت:۵۷] "ہر نفس نے موت کا ذائقہ چکھنا ہے۔" فرمایا اس لیے نہیں رو رہا کہ میری دنیا والی زندگی ختم ہو رہی ہے اور نہ ہی میں کبھی موت سے ڈرا ہوں۔ سر سے لے کر پاؤں تک میرے بدن میں کوئی عضو ایسا نہیں ہے کہ جس پر کافر کا تیر، تلوار اور نیزہ نہ لگا ہو۔ روتا اس لیے ہوں کہ مجھے شہادت کی موت نصیب نہیں ہوئی اَمُوْتُ كَمَوْتِ الْحِمَارِ "اور گدھے کی طرح مر رہا ہوں۔" یعنی طبعی موت۔ لیکن وہ اللہ تعالیٰ کی تلوار تھے کافر اللہ تعالیٰ کی تلوار کو کس طرح توڑ سکتے تھے۔ اگر کافر توڑ دیں تو وہ اللہ تعالیٰ کی تلوار تو نہ ہوئی۔ رب تعالیٰ نے اپنی تلوار خود سنبھالے رکھی۔

تو نفس اپنی مرضی سے نہیں مر سکتا اور مرے گا بھی ﴿كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا﴾ نوشتہ ہے مقرر کیا ہوا۔ موت اپنے وقت سے ایک سیکنڈ بھی آگے پیچھے نہیں ہو سکتی۔ کسی کی موت کا جو وقت تحریر شدہ ہے وہ ٹل نہیں سکتا۔ اگر کوئی یہ سمجھے کہ علاج معالجے سے میری زندگی بڑھ جائے گی یا ہسپتال میں داخل ہونے سے یا مہنگی دوائی کھانے سے میرے سانس بڑھ جائیں گے **حاشا و کلا** ہرگز ایسا نہیں ہوگا۔ یہ سوچ بالکل غلط ہے۔ علاج اس واسطے کرائے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ اے اللہ کے بندو! جب تم بیمار ہو تو علاج کراؤ۔ اور جب سنت سمجھ کر علاج کرائے گا شفایاب ہو یا نہ ہو جو خرچہ کیا ہے اس کا ثواب ملے گا۔ کیوں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی تعمیل میں علاج کرا رہا ہے۔ باقی اس سے موت نہیں ٹل سکتی۔ ہاں! اتنا ہو سکتا ہے کہ اس کا سانس آسانی کے ساتھ نکلے۔ لیکن سانس بڑھ نہیں سکتا۔ اور ہر شخص کو ثواب اس کی نیت اور ارادے کے مطابق ملتا ہے۔

فرمایا ﴿ وَمَنْ یُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْیَا ﴾ اور جو شخص ارادہ کرتا ہے دنیا کے بدلے کا ﴿ نُؤْتِهٖ مِنْهَا ﴾ ہم اس کو دے دیتے ہیں اس میں سے کچھ۔ یعنی اگر کسی کا ارادہ صرف دنیا کا ہے تو کمائے، محنت کرے، مشقت کرے دنیا مل جائے گی مگر ہر خواہش پوری نہیں ہوگی۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کا منشاء ہے جتنا چاہے عطاء کر دے۔ میں دیکھتا ہوں کہ وہ لوگ جو لوہا کوٹتے تھے آج کئی کئی کارخانوں کے مالک ہیں۔ کوشش کی، حلال، حرام جو بھی ہے بہر حال ان کو ترقی ملی ہے۔ ﴿ وَمَنْ یُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ ﴾ اور جو شخص ارادہ کرے گا آخرت کے بدلے کا ﴿ نُؤْتِهٖ مِنْهَا ﴾ ہم اس کو اس میں سے دیں گے۔ یہ دنیا مَزْرَعَةُ الْاٰخِرَةِ ہے۔ یہاں جو کاشت کرے گا وہاں وہی کچھ کاٹے گا۔ دنیا کمانے والوں کو دنیا مل جائے گی اور آخرت کمانے والوں کو آخرت۔ پھر اللہ تعالیٰ کا فضل وکرم دیکھو کہ آخرت حاصل کرنے کے لیے بندوں کو وہ کام نہیں بتائے جو ان کے بس میں نہ ہوں، اختیار میں نہ ہوں۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جتنی بھی عبادتیں ہیں وہ بندے کے بس میں ہیں۔ مثلاً: ایک آدمی گھر میں ہے تو حکم ہے کہ نماز پوری پڑھے اور سفر کی مشقت کی وجہ سے آدھی کر دی اور سنتوں کا درجہ مستحب دے دیا۔ بیمار ہے قیام رکوع نہیں کر سکتا فرمایا بیٹھ کر پڑھ لے۔ سفر پر ہے روزہ نہیں رکھ سکتا اس کو اجازت ہے کہ چھوڑ دے۔ لیکن بعد میں جتنے روزے چھوڑے ہیں ان کی گنتی پوری کرے، قضا کرے۔ اسی طرح ایک آدمی غریب ہے شریعت نے اس کو اس کا مکلف نہیں بنایا کہ عقیقہ کرے، قربانی دے، زکوٰۃ ادا کرے یا حج کرے۔ اس واسطے کہ اس کے پاس مال نہیں ہے۔ اور اگر مال ہو تو حج فرض ہے، قربانی واجب ہے، عقیقہ مستحب ہے ﴿ وَسَنَجْزِی الشّٰكِرِیْنَ ﴾ اور ہم بدلا دیں گے شکر گزاروں کو۔ جو لوگ رب تعالیٰ کے انعامات کا شکر ادا کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے وہ ضرور ان کو بدلا دے گا۔ ایک نیکی کرے گا دس گنا بدلا ملے گا، فی سبیل اللہ کی مد میں کرے گا تو کم از کم سات سو گنا بدلا ملے گا ﴿ وَاللّٰهُ یُضٰعِفُ لِمَنْ یَّشَآءُ ﴾ اور اللہ تعالیٰ بڑھاتا ہے جس کے لیے چاہتا ہے۔

آگے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جہاد پہلی اُمتوں پر بھی فرض تھا اور انھوں نے استقلال کا مظاہرہ کیا۔ لہٰذا مسلمانوں کے لیے اچھا نمونہ ہیں۔ ﴿ وَكَاَیِّنْ مِّنْ نَّبِیٍّ ﴾ اور کتنے ہی نبی تھے ﴿ قٰتَلَ مَعَهٗ ﴾ ان کے ساتھ مل کر جہاد کیا ﴿ رِبِّیُّوْنَ كَثِیْرٌ ﴾ بہت سارے رب والوں نے۔ مسلمانوں کو سمجھایا جا رہا ہے کہ جہاد کا حکم صرف آخری امت کے لیے ہی مخصوص نہیں ہے بلکہ سابقہ انبیائے کرام علیہم السلام کی قوم پر جہاد فرض ہوا تھا یہ الگ بات ہے کہ انھوں نے تسلیم نہیں کیا تھا۔ ﴿ قَالُوْا ﴾ کہنے لگے ﴿ یٰمُوْسٰۤی اِنَّ فِیْهَا قَوْمًا جَبَّارِیْنَ ﴾ [سورۃ المائدہ] "اے موسیٰ وہاں بڑے سخت لوگ ہیں ہم ان کے ساتھ نہیں لڑ سکیں گے الی اَنْ ﴿ فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَاۤ ﴾ پس تم اور تمھارا رب جاؤ پس لڑو ﴿ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ ﴾ ہم یہیں بیٹھے رہیں گے۔" کتنے غلط انداز میں انھوں نے جواب دیا۔

لیکن کیا بات ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پروانوں کی کہ انھوں نے کہا اے اللہ کے رسول! اگر آپ ہمیں حکم دیں گے تو ہم اپنی پیشانیاں پہاڑوں کے ساتھ ٹکرا دیں گے اور اپنے گھوڑے دریا میں ڈال دیں گے۔ یقین جانو! آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھیوں جیسے فدائی اور شیدائی کسی پیغمبر کو نصیب نہیں ہوئے۔ کیا مرد اور کیا عورتیں۔

تو کتنے پیغمبروں کے ساتھ مل کر اللہ والوں نے جہاد کیا ﴿فَمَا وَهَنُوا﴾ پس نہیں کی انھوں نے سستی ﴿لِمَآ اَصَابَهُمۡ فِیۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ﴾ اس وجہ سے جو تکلیف پہنچی ان کو اللہ تعالیٰ کے راستے میں ﴿وَمَا ضَعُفُوۡا﴾ اور نہ انھوں نے کمزوری دکھائی ﴿وَمَا اسۡتَكَانُوۡا﴾ اور نہ وہ دشمن کے سامنے دبے۔ ان لوگوں پر بڑی بڑی آزمائشیں آئیں مگر ان کے پاؤں میں لغزش نہ آئی۔ اور ان سے بڑھ کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہ رضی اللہ عنہم پر ہر طرح کی آزمائشیں آئیں مگر ان کو کوئی ایمان سے ہٹا نہ سکا۔ ۱

حضرت حبیب بن زید رضی اللہ عنہ کی ایمان میں ثابت قدمی

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دور میں مسیلمہ کذاب کے ساتھ جنگ ہوئی حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی کمان میں۔ مسیلمہ کذاب کا قبیلہ بنو حنیفہ اور بنو ثقیف اور ہوازن عرب کی جنگ جو قومیں تھیں۔ یہ قبیلے لڑائی میں بڑے مشہور تھے۔ مسیلمہ کے خلاف یمامہ کی جنگ میں چودہ سو مسلمان شہید ہوئے۔ جن میں سات سو حافظ قرآن تھے۔ اور کچھ گرفتار ہوئے۔

انصار کے ایک خوب صورت نوجوان حضرت حبیب بن زید انصاری رضی اللہ عنہ ایک موقع پر گرفتار ہوئے۔ ۲۵۔ ۲۶ سال عمر تھی۔ ان کو ملزم کی حیثیت سے مسیلمہ کذاب کے پاس لایا گیا۔ مسیلمہ کذاب نے سوال کیا کہ تیرا کیا نام ہے؟ کس قبیلے کے ساتھ تعلق رکھتا ہے؟ پھر پوچھا کہ لڑنے کے لیے کیوں آئے ہو؟ حضرت حبیب رضی اللہ عنہ نے کہا اس واسطے کہ تو نے حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد نبوت کا دعویٰ کیا ہے اور آپ کے بعد نبوت کا دعویٰ کرنا کفر ہے اور ہم نے کافر کے ساتھ لڑنا ہے۔

مسیلمہ کذاب نے کہا کہ میں تو کلمہ پڑھتا ہوں اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَ اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ۔ اور یاد رکھنا! مسیلمہ کذاب کلمہ بھی پڑھتا تھا اور کہتا تھا کہ میں محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی نبوت کا منکر تو نہیں ہوں۔ مجھے تو نبوت ملی ہے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صدقے اور طفیل سے۔ جس طرح یہ قادیانی مرزا غلام احمد قادیانی کے بارے میں کہتے ہیں کہ وہ ظلی بروزی نبی ہے، لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ۔

مسیلمہ کذاب نے کہا اے نوجوان! اپنی جوانی پر ترس کھا اور باز آ جا مجھے نبی تسلیم کر ورنہ اُقَطِّعُكَ اِرْبًا اِرْبًا "میں تیرا ایک ایک جوڑ الگ کر دوں گا۔" حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے یہ واقعہ نقل فرمایا ہے کہ حضرت حبیب ابن زید رضی اللہ عنہ نے فرمایا اَنْتَ وَ ذَاكَ "جو تیرے دل میں آئے کر لے۔" اس نے جلاد کو بلایا اور تیز ٹوکا اس کے ہاتھ میں دیا اور کہا کہ اس کا ہاتھ کلائی سے کاٹ دے۔ اس نے کاٹ دیا۔ پھر ان سے سوال کیا۔ انھوں نے کہا کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ تعالیٰ کے سچے رسول ہیں اور تو کذاب ہے۔ پھر اس نے کہا کہ اب کہنی تک کاٹ۔ ایک ایک جوڑ سے کٹواتا گیا اور سوال کرتا گیا اور وہ وہی جواب دیتے رہے۔ دونوں بازوؤں کے بعد پاؤں کو ایک ایک بند سے کاٹا اور انھوں نے وہی جواب دیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سچے رسول ہیں اور تو کذاب ہے۔ پھر ان لوگوں نے سینے پر برچھا مار کر شہید کر دیا۔ جان دے دی مگر ایمان نہیں چھوڑا۔

ہمیں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ اس نے ہمیں سخت امتحان میں نہیں ڈالا اور ہم اس کے قابل بھی نہیں ہیں۔ بالکل

نہیں ہیں۔ان کے ایمان بڑے مضبوط تھے اس واسطے امتحان بھی سخت تھے۔ہمارے ایمان کمزور ہیں ہم ان باتوں کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ بلکہ آج ہماری حالت تو یہ ہے کہ ہم عدم جارحیت کی پیش کش کرتے ہیں کہ ہم نہیں لڑیں گے۔اور یہ قرآن پاک کے بالکل خلاف ہے۔قرآن پاک میں آتا ہے کہ ﴿وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا﴾ [الانفال:۶۱] "اور اگر وہ صلح کی پیش کش کریں تو آپ ان سے صلح کر لیں۔" یعنی اگر کافر پیش کش کریں نہ لڑنے کی تو تم سوچ سمجھ کر پیش کش قبول کر لو۔آج حالت یہ ہے کہ وہ ہر مورچے پر ہمارے جوان شہید کر رہے ہیں، آبادیوں پر بم پھینک رہے ہیں اور ہمارے حکمران امریکہ کو خوش کرنے کے لیے کہتے ہیں کہ ہم بھارت کے ساتھ عدمِ جارحیت کا معاہدہ کرتے ہیں، لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ ۔وہ تمھاری پیش کش کو سمجھیں گے کہ یہ کمزور ہیں۔

امتحان کا وقت آ جائے تو تکلیفوں پر صبر کرو ﴿وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ﴾ اور اللہ تعالیٰ محبت کرتا ہے صبر کرنے والوں سے۔ صبر بھی کرو اور اللہ تعالیٰ سے مانگو بھی۔ پہلوں کا بھی یہی طریقہ رہا ہے۔فرمایا ﴿وَمَا كَانَ قَوْلَهُمْ﴾ اور نہیں تھی بات ان کی ﴿اِلَّآ اَنْ قَالُوْا رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا﴾ مگر یہ کہ کہا انھوں نے اے ہمارے رب ہمیں بخش دے ہمارے گناہ ﴿وَاِسْرَافَنَا فِيْٓ اَمْرِنَا﴾ اور جو ہم نے زیادتیاں کی ہیں زندگی میں جو ہم سے زیادتیاں ہوئی ہیں اپنے معاملے میں ان کو بھی معاف کر دے۔اور اے پروردگار! ﴿وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا﴾ اور ہمارے قدموں کو ثابت رکھ دشمن کے مقابلے میں۔مسلمان کا جب ایمان مضبوط ہو اور صبر کا دامن نہ چھوڑے اور زبان پر اللہ تعالیٰ سے نصرت کی دعا ہو تو مسلمانوں کی تھوڑی تعداد بھی کافروں پر غالب آتی ہے۔دوسرے پارے کے آخر میں آپ حضرت طالوت رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ سن چکے ہیں کہ یہ کل تین سو تیرہ [۳۱۳] تھے بمع حضرت طالوت رحمۃ اللہ علیہ کے۔اور مقابلے میں کافروں کا جرنیل جالوت ایک لاکھ فوج کے ساتھ تھا۔کیا نسبت ہے تین سو تیرہ کو ایک لاکھ کے ساتھ۔لیکن قرآن پاک میں آتا ہے ﴿كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةًۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ﴾ [البقرۃ:۲۴۹] "کتنی ہی چھوٹی جماعتیں غالب آ جاتی ہیں بہت ساری جماعتوں پر اللہ کے حکم کے ساتھ اور اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔" چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ان تین سو تیرہ کو ایک لاکھ پر فتح عطا فرمائی۔قرآن پاک میں ہے ﴿فَهَزَمُوْهُمْ بِاِذْنِ اللّٰهِ﴾ "پس ان مومنوں نے شکست دی ان کافروں کو اللہ تعالیٰ کے حکم سے۔" تو قلت، کثرت کا سوال نہیں ہے اصل بات ایمان کی ہے۔

پوری دنیا میں دو جگہوں پر ٹینکوں کی سب سے بڑی لڑائی ہوئی ہے۔ایک ہٹلر کے دور میں عالمین کے مقام پر اور دوسری ہمارے ہاں چونڈہ ضلع سیالکوٹ کے مقام پر۔اس محاذ پر بڑا پختہ مسلمان کیپٹن ایس۔اے زبیری تھا۔اس کے پاس تین ٹینک اور ایک سو نو جوان تھے۔مقابلہ میں ایک ہزار ٹینک اور ہزاروں کی تعداد میں فوجی تھے مردِ مومن کیپٹن ایس۔اے زبیری نے اپنے مرکز سے رابطہ قائم کیا اور صورتِ حال سے آگاہ کیا کہ میرے پاس تین ٹینک اور ایک سو جوان ہیں اور مقابلے میں ایک ہزار ٹینک اور ہزاروں کی تعداد میں فوجی ہیں۔ مجھے کیا حکم ہے؟ مرکز نے کہا کہ جوانوں کو نہ مرواؤ، واپس آ جاؤ۔مجاہد زبیری نے کہا قرآن پاک میں آتا ہے کہ ﴿كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةًۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ﴾ لہٰذا تم مجھے صرف چوبیس

گھنٹوں کی اجازت دے دو۔ مرکز نے اجازت دے دی۔ ایک سو آدمیوں نے تین ٹینکوں کے ساتھ چھ ہزار کا مقابلہ کیا اور ایک ہزار ٹینک کے پرخچے اُڑا دیے۔ اللہ تعالیٰ نے نصرت فرمائی اور غالب آئے۔ تو قلت، کثرت کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ اصل بات ہے ایمان کی۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوؤں کی تعداد نوے کروڑ ہے اور ہم پاکستانی چودہ کروڑ ہیں مگر وہ ہم سے ڈرتے ہیں۔ کاش! کہ ہمارے شرابی حکمران خدا سے ڈریں تو بات ہی اور ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ ان کو ہدایت عطا فرمائے۔ اگر ہمارے حکمران صحیح معنیٰ میں مسلمان بن جائیں تو ہم ہندوؤں کو اس طرح چیر پھاڑ دیں جس طرح چیتا بھیڑوں کو چیرتا پھاڑتا ہے۔

فرمایا ﴿وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ﴾ اور ہماری مدد فرما کافر قوم کے مقابلے میں۔ ﴿فَاٰتٰىهُمُ اللّٰهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا﴾ پس دیا اُن کو اللہ تعالیٰ نے دنیا کا بدلا کہ مالِ غنیمت اتنا دیا کہ اُٹھا نہیں سکتے تھے ﴿وَحُسْنَ ثَوَابِ الْاٰخِرَةِ﴾ اور آخرت کا اچھا بدلا بھی۔ اللہ تعالیٰ کا قانون یہ ہے کہ ﴿وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ﴾ اور اللہ تعالیٰ محبت کرتا ہے نیکی کے کام کرنے والوں سے۔ جو اچھے کام کرے گا اللہ تعالیٰ کا محبوب قرار پائے گا۔ اللہ تعالیٰ سب کو توفیق عطاء فرمائے۔

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا﴾ اے وہ لوگو! جو ایمان لائے ہو ﴿اِنْ تُطِيْعُوا﴾ اگر تم اطاعت کرو گے ﴿الَّذِيْنَ كَفَرُوْا﴾ ان لوگوں کی جو کافر ہیں ﴿يَرُدُّوْكُمْ﴾ تمھیں وہ لوٹا دیں ﴿عَلٰۤى اَعْقَابِكُمْ﴾ تمھاری ایڑیوں کے بل ﴿فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِيْنَ﴾ پس تم لوٹو گے نقصان اُٹھاتے ہوئے ﴿بَلِ اللّٰهُ مَوْلٰىكُمْ﴾ بلکہ اللہ ہی تمھارا آقا ہے ﴿وَهُوَ خَيْرُ النّٰصِرِيْنَ﴾ اور وہ تمام مدد کرنے والوں میں بہتر مدد کرنے والا ہے ﴿سَنُلْقِيْ﴾ عن قریب ہم ڈالیں گے ﴿فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ﴾ ان لوگوں کے دلوں میں جو کافر ہیں رعب ﴿بِمَاۤ اَشْرَكُوْا بِاللّٰهِ﴾ اس وجہ سے کہ انھوں نے شریک ٹھہرایا اللہ کے ساتھ ﴿مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا﴾ ان چیزوں کو کہ نہیں نازل فرمائی اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں کوئی دلیل ﴿وَمَاْوٰىهُمُ النَّارُ﴾ اور ان کا ٹھکانا دوزخ ہے ﴿وَبِئْسَ مَثْوَى الظّٰلِمِيْنَ﴾ اور بُرا ٹھکانا ہے ظالموں کا ﴿وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ﴾ اور البتہ تحقیق سچ کر دکھایا اللہ نے تمھارے ساتھ ﴿وَعْدَهٗۤ﴾ اپنا وعدہ ﴿اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ﴾ جب تم ان کو قتل کر رہے تھے اللہ کے حکم سے ﴿حَتّٰۤى اِذَا فَشِلْتُمْ﴾ یہاں تک کہ جب تم نے بزدلی کا اظہار کیا ﴿وَتَنَازَعْتُمْ فِي الْاَمْرِ﴾ اور تم نے جھگڑا کیا اس معاملے میں ﴿وَعَصَيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَاۤ﴾ اور تم نے نافرمانی کی اس کے بعد ﴿اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ﴾ اللہ نے تمھیں دکھائی وہ چیز جس کو تم پسند کرتے تھے ﴿مِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الدُّنْيَا﴾ تم میں سے وہ بھی تھے جو دنیا کا ارادہ کرتے تھے ﴿وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الْاٰخِرَةَ﴾ اور تم میں سے وہ بھی تھے جو آخرت کا ارادہ کرتے تھے ﴿ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ﴾ پھر پھیر دیا اللہ تعالیٰ نے تمھیں ان سے

﴿لِیَبْتَلِیَکُمْ﴾ تاکہ اللہ تمھیں امتحان میں ڈالے ﴿وَلَقَدْ عَفَا عَنْکُمْ﴾ اور البتہ تحقیق اللہ تعالیٰ نے تمھیں معاف کر دیا ہے ﴿وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْمُؤْمِنِیْنَ﴾ اور اللہ تعالیٰ فضل والا ہے ایمان والوں پر۔

غزوۂ اُحد کے موقع پر منافقین کا پروپیگنڈہ

پہلے سے غزوۂ احد کا ذکر چلا آرہا ہے۔ اس غزوہ میں مشرکین مکہ بڑی تیاری کے ساتھ آئے تھے۔ کیوں کہ غزوہ بدر میں ان کا بڑا نقصان ہوا تھا کہ ان کے ستر سردار مارے گئے اور ستر گرفتار ہوئے، باقیوں کو بھاگنے کا راستہ نہ ملا۔ اس کا ان کو بڑا صدمہ تھا کہ ہم تعداد میں بھی زیادہ تھے اور ہمارے پاس اسلحہ بھی وافر مقدار میں تھا اور ضروریاتِ زندگی بھی ہمارے پاس کافی تھیں مگر تھوڑے سے آدمیوں نے آٹھ تلواروں کے ساتھ ہمارے سر کاٹ دیے۔ اس وجہ سے ان کے جذبات کافی بھڑکے ہوئے تھے۔ چنانچہ مشرکین مکہ ہجرت کے تیسرے سال تین ہزار کا مسلح لشکر لے کر چلے اور اس چلنے کو انھوں نے خفیہ رکھا کہ اچانک جا کر مسلمانوں پر حملہ کر دیں گے۔ اور خفیہ طور پر یہودی بھی ان کے ساتھ ملے ہوئے تھے اور یہودیوں کی طاقت بھی کافی تھی۔ جب مدینہ طیبہ کے بالکل قریب آگئے تو معلوم ہوا کہ دشمن کا بہت بڑا لشکر جنگ کے لیے آگیا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر دی گئی کہ حضرت! دشمن کا بہت بڑا لشکر ڈھول بجاتے ہوئے، بھنگڑا ڈالتے ہوئے اور اُچھلتے کودتے ہوئے قریب آگیا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ فوراً میدان جنگ میں پہنچو۔ مسلمان جب چلنے لگے تو منافقوں نے ان کی ہمتیں پست کرنے کے لیے خاصا پروپیگنڈہ کیا کہ پچھلے سال ان کو شکست ہوئی تھی اور اُن کا بڑا نقصان ہوا تھا۔ انھوں نے خوب بدلا لینا ہے وہ تمھیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ لہٰذا نہ جاؤ۔ لیکن مسلمانوں نے ان کے اس پروپیگنڈے کا کچھ اثر نہ لیا اور چل پڑے۔ بادلِ نخواستہ منافقوں کو بھی ساتھ جانا پڑا۔ لیکن خفیہ طور پر منافقوں نے آپس میں مشورہ کر کے یہ طے کر لیا تھا کہ جنگ میں شریک نہیں ہونا۔ چنانچہ ایک ہزار کا یہ لشکر اُحد کے دامن میں پہنچ گیا۔ جس میں تین سو منافقین تھے۔

منافق کہنے لگے کہ ہم نے ہر حال میں واپس جانا ہے کوئی بہانہ بناؤ تاکہ ہمیں لڑنا نہ پڑے اور واپس گھر چلے جائیں۔ اس بہانے کا ذکر بھی آگے آرہا ہے۔ کہنے لگے ﴿لَوْ نَعْلَمُ قِتَالًا لَّا اتَّبَعْنٰکُمْ﴾ "اگر ہم جانتے کوئی لڑائی ہے تو ضرور تمھارا اتباع کرتے۔" چوں کہ مشرک ابھی پہنچے نہیں تھے اس لیے کہنے لگے کہ یہاں تو لڑائی کا کوئی سماں نہیں ہے۔ پتھروں سے لڑنا ہے؟ ہم جارہے ہیں۔

اور ایک یہ مطلب بیان کرتے ہیں کہ یہ کوئی لڑائی ہے کہ ایک طرف تھوڑے سے آدمی اور دوسری طرف اتنا بڑا لشکر۔ یہ تو خالص موت ہے۔ لڑائی تو یہ ہوتی ہے کہ دشمن ایک گنا زیادہ ہو یا دوگنا زیادہ ہو۔ یہ تو خدا کی مخلوق چل کے آئی ہوئی ہے۔ ان کے ساتھ لڑنا تو موت کے منہ میں جانا ہے۔ یہ بہانا بنا کر واپس چل پڑے۔ ہر دور میں کچھ لوگ سمجھ دار ہوتے ہیں اور کچھ سادہ ہوتے ہیں۔ شریر قسم کے لوگ ان کی سادگی سے ناجائز فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ چنانچہ جب یہ بہانہ بنا کر چلے تو کچھ مخلص لوگ بھی

اس کا شکار ہو گئے جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے کہ قبیلہ بنو سلمہ اور بنو حارثہ والے کہنے لگے کہ یہ واپس جا رہے ہیں لہٰذا ہم بھی واپس جائیں۔ پھر ایک دوسرے سے پوچھنے لگے کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جا رہے ہیں؟ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ جا رہے ہیں؟ عمر فاروق رضی اللہ عنہ جا رہے ہیں؟ معلوم ہوا کہ نہیں جا رہے۔ چوں کہ مخلص لوگ تھے صرف ان کے پروپیگنڈے کا شکار ہو گئے تھے ایمان کی برکت سے ان کو اللہ تعالیٰ نے استقامت عطاء فرمائی۔ کہنے لگے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم واپس نہیں جا رہے تو ہم بھی نہیں جائیں گے جو ہوگا دیکھا جائے گا۔

آج کی آیات میں اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو تنبیہ فرمائی ہے کہ منافقین کے پروپیگنڈے سے متاثر نہیں ہونا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ﴿يَآ أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوٓا إِن تُطِيعُوا الَّذِينَ كَفَرُوا﴾ اے وہ لوگو! جو ایمان لائے ہو اگر تم اطاعت کرو گے ان لوگوں کی جو کافر ہیں ﴿يَرُدُّوكُمْ عَلَىٰٓ أَعْقَابِكُمْ﴾ تمھیں وہ لوٹا دیں تمھاری ایڑیوں کے بل۔ یعنی جس طرح پہلے تم کافر تھے پھر اسی طرح کافر ہو جاؤ ﴿فَتَنقَلِبُوا خَاسِرِينَ﴾ پس تم لوٹو گے نقصان اُٹھاتے ہوئے۔ مطلب یہ ہے کہ دین پر قائم رہو اور کافروں کی باتوں پر توجہ نہ دو۔ اور جو منافق ہیں یہ کھلے کافروں سے زیادہ خطرناک ہیں۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے منافقوں کی سزا دوزخ میں سب سے زیادہ رکھی ہے۔ فرمایا ﴿إِنَّ الْمُنَافِقِينَ فِي الدَّرْكِ الْأَسْفَلِ مِنَ النَّارِ﴾ [النساء: ۱۴۵] "بے شک منافق لوگ دوزخ کے سب سے نچلے حصے میں ہوں گے" اور نیچے والے حصے میں سب سے زیادہ سخت سزا ہوگی۔ اس لیے کہ کھلا دشمن اتنا خطرناک نہیں ہوتا جتنا خفیہ۔

یہ منافق مارِ آستین ہیں کہ بہ ظاہر کلمہ بھی پڑھتے ہیں، نمازیں بھی بلکہ مخلص مومن مسجد میں تاخیر سے آتے تھے اور یہ پہلی صفوں پر بیٹھے ہوتے تھے۔ مگر دلوں میں کھوٹ تھا۔ اور بات اتنی غور سے سنتے تھے کہ آدمی سمجھتا تھا کہ میری بات ان کے دلوں پر اثر کر رہی ہے۔ فرمایا ان سے بچو ﴿بَلِ اللَّهُ مَوْلَاكُمْ﴾ بلکہ اللہ ہی تمھارا آقا ہے اور پروردگار ہے۔ وہی تمھارا خالق ہے۔ بے شک کافر زیادہ ہیں لیکن ﴿وَهُوَ خَيْرُ النَّاصِرِينَ﴾ اور وہ تمام مدد کرنے والوں میں بہتر مدد کرنے والا ہے۔ قاعدے کے مطابق اگر رب تعالیٰ سے مدد طلب کی جائے تو اس کے سامنے کوئی کچھ نہیں ہے۔ وہ ایک لمحے میں بہت کچھ کر سکتا ہے۔ دیکھو! اس وقت صنعتی اعتبار سے جاپان پوری دنیا میں پہلے نمبر پر ہے۔ اور آج سے چند سال پہلے وہاں صرف سترہ [۱۷] سیکنڈ زلزلہ آیا تھا۔ جاپانی لیڈروں اور سائنس دانوں نے بیان جاری کیا تھا کہ اس سترہ سیکنڈ کے زلزلے سے جو نقصان ہوا ہے وہ ہم پورا زور صرف کر کے بھی کئی سالوں میں پورا نہیں کر سکتے۔ حالاں کہ جاپان نے صنعت میں یورپ کو بھی مات دے دی ہے اور صنعت " کے لیے بچوں کا کھیل ہے۔ تو ان کا یہ حال ہے۔ تو اللہ تعالیٰ کے سامنے کسی شے کی کوئی حیثیت نہیں ہے، وہ رب ہے۔

فرمایا کافروں سے نہ ڈرو ﴿سَنُلْقِي فِي قُلُوبِ الَّذِينَ كَفَرُوا الرُّعْبَ﴾ عنقریب ہم ڈالیں گے ان لوگوں کے دلوں میں جو کافر ہیں رعب۔ اُحد کے موقع پر ایسا ہی ہوا۔ بہ ظاہر کافروں کو کامیابی حاصل ہوئی، بہت سارے اکابر مسلمان شہید ہوئے مگر پھر کافر وہاں ٹھہر نہ سکے۔ ایک موقع پر ابوسفیان کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ مسلمان تعداد میں تھوڑے سے تو تھے ان میں سے

شہید اور زخمی بھی ہوئے مگر ہم پھر بھی واپس پلٹ رہے ہیں۔ واپس جا کر ان کا کام تمام کر دینا چاہیے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں ایسا رعب ڈالا کہ انہیں دوبارہ حملہ کرنے کی ہمت نہ ہوئی واپس مکے لوٹ گئے۔ البتہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے زخمی صحابہ رضی اللہ عنہم نے آٹھ میل تک کفار کا تعاقب کیا۔

اور ان پر رعب اس لیے مسلط کیا ﴿بِمَآ اَشْرَكُوْا بِاللّٰهِ﴾ اس وجہ سے کہ انھوں نے شریک ٹھہرایا اللہ کے ساتھ ﴿مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا﴾ ان چیزوں کو کہ نہیں نازل فرمائی اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں کوئی سند۔ یعنی مشرکین کے پاس شرک پر کوئی دلیل نہیں ہے۔ کسی نے لات کو، کسی نے منات کو، کسی نے عزیٰ کو اللہ تعالیٰ کا شریک بنایا ہوا تھا۔ کوئی کسی کو حاجت روا سمجھتا ہے مگر ان کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے کہ ان میں خدائی اوصاف کس طرح آ گئے ہیں۔ اور جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرتے ہیں ﴿وَمَاْوٰىهُمُ النَّارُ﴾ اور ان کا ٹھکانا دوزخ ہے ﴿وَبِئْسَ مَثْوَى الظّٰلِمِيْنَ﴾ اور بُرا ٹھکانا ہے ظالموں کا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حکم عدولی کا انجام

پہلے یہ بات بیان ہو چکی ہے کہ اے ایمان والو! اگر تم تقویٰ اختیار کرو گے اور صبر کی راہ پر قائم رہو گے تو یقیناً تمھیں فتح اور سربلندی حاصل ہو گی۔ چنانچہ غزوۂ اُحد میں ابتداً اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو فتح عطا فرمائی۔ حالاں کہ کافر تعداد میں بھی زیادہ تھے اور اسلحہ بھی ان کے پاس وافر مقدار میں تھا۔ کیوں کہ مسلمان ایک ہزار تھے اور ان میں سے بھی تین سو منافق واپس آ گئے تھے اور باقی جو سات سو تھے ان کے پاس بھی اسلحہ نامکمل تھا۔ جس طرح بدر میں آٹھ تلواریں تھیں اسی طرح غزوۂ احد میں بھی اکثریت تلواروں سے محروم تھی اور تین ہزار مسلح افراد کے ساتھ مقابلہ تھا مگر اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو فتح عطاء فرمائی۔

بخاری شریف کی روایت کے مطابق کافر پگڑیاں، چادریں اور اپنے ہتھیار چھوڑ کے بھاگے۔ مگر مسلمانوں کی ایک کوتاہی کی وجہ سے جنگ کا پانسہ پلٹ گیا اور فتح شکست میں تبدیل ہو گئی۔ اُحد کے دامن میں ایک چھوٹا سا ٹیلا ہے جس کو جبلِ رُماۃ کہتے ہیں۔ رُماۃ رامی کی جمع ہے، تیر اندازوں کی پہاڑی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جبلِ رُماۃ پر حضرت عبد اللہ بن جبیر رضی اللہ عنہ کی قیادت میں پچاس تیر اندازوں کی ایک جماعت مقرر فرمائی تھی اور انہیں حکم دیا تھا کہ ہمیں فتح ہو یا شکست تم نے اس مورچے کو نہیں چھوڑنا۔ میدان جانے اور ہم جانیں۔ تم دیکھو کہ ہمارے جسموں کو پرندے نوچ رہے ہیں پھر بھی اس مورچے کو نہیں چھوڑنا۔ جب تیر اندازوں نے دیکھا کہ مسلمانوں کو فتح حاصل ہو گئی ہے اور دشمن بھاگ نکلا ہے اور میدان مالِ غنیمت سے بھرا ہوا ہے اور ہمارے ساتھیوں نے اس کو سمیٹنا شروع کر دیا ہے تو ہمیں بھی جا کر غنیمت اکٹھی کرنی چاہیے۔ اور اس میں کوئی ذاتی لالچ نہیں۔ کیوں کہ جمع کرنے والا مالک نہیں بن جاتا۔ بلکہ مالِ غنیمت کے متعلق اصول یہ ہے کہ جب مالِ غنیمت جمع ہو جاتا ہے تو امیر لشکر اس کے پانچ حصے کرتا ہے۔ پانچواں حصہ خمس کہلاتا ہے (بیت المال کا ہوتا ہے) اور باقی چار حصے امیر لشکر مجاہدین میں تقسیم کرتا ہے۔ بس شوقیہ طور پر کہ یہ تلوار میں لاتا ہوں کہ میرا نام ہو یہ بات ذہن میں آئی۔

لیکن تیر اندازوں میں اختلافِ رائے پیدا ہوا۔ ان کے قائد کی رائے یہ تھی کہ آنحضرت ﷺ کے حکم کے مطابق نہیں یہیں موجود رہنا چاہیے۔ تاہم اکثریت کی رائے تھی آنحضرت ﷺ کا موجود رہنے کا حکم تاکیدی تھا اور مطلب یہ تھا کہ ہماری ضرورت پڑے گی۔ اور اب جب فتح حاصل ہوگئی ہے تو اب وہیں ٹھہرنا کچھ ضروری نہیں رہا۔ اب تو میدان ہمارا ہے۔ امیر لشکر حضرت عبداللہ بن جبیر رضی اللہ عنہ نے کافی سمجھایا کہ ایسا نہ کرو آپ ﷺ کی پاک زبان مبارک سے نکلے ہوئے لفظوں کی قدر کرو، مورچہ نہ چھوڑو۔

چنانچہ جو جلد باز ساتھی تھے جبلِ رُماۃ سے اُتر کر مالِ غنیمت کے جمع کرنے میں مشغول ہو گئے اور پہاڑی پر حضرت عبداللہ بن جبیر رضی اللہ عنہ کے ساتھ صرف دس آدمی باقی رہ گئے۔ ادھر خالد بن ولید جو اس وقت تک رضی اللہ عنہ نہیں ہوئے تھے اور جنگی امور کے بڑے ماہر تھے انھوں نے دیکھا کہ فوجی اعتبار سے جو اہم مورچہ تھا وہ کمزور ہو گیا ہے۔ وہ اپنے دستہ کے دو سو گھوڑ سواروں کے ہمراہ اس جبلِ رُماۃ پر حملہ آور ہوئے جیسے مسلمان تیر اندازوں کی اکثریت چھوڑ چکی تھی۔ مورچے پر موجود مجاہدین کو شہید کیا، آگے بڑھے اور آواز دی او قریشیو! میں خالد بن ولید ہوں۔ میں نے پیچھے سے حملہ کر دیا ہے تم آگے سے پلٹو۔ اس طرح مسلمان کافروں کے دو لشکروں کے درمیان گھر گئے۔ ان میں ایسی افراتفری پھیلی کہ خود مسلمان، مسلمانوں کے ہاتھوں شہید ہونے لگے۔ حتی کہ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کے والد حضرت یمان رضی اللہ عنہ مسلمانوں کے ہاتھوں شہید ہو گئے۔

نتیجہ یہ ہوا کہ ستر مسلمان شہید ہو گئے اور کوئی رہ گیا ہو گا جو زخمی نہ ہوا ہو۔ خود آنحضرت ﷺ کا چہرہ اقدس زخمی ہوا۔ نیچے کا ایک دانت مبارک شہید ہوا، آپ ﷺ پر بے ہوشی طاری ہوگئی اور آپ ﷺ زمین پر گر گئے۔ آپ ﷺ کا دفاع کرنے والے دس میں سے نو شہید ہو گئے۔ حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر نیزے اور تیر کے اتنے زخم آئے جس سے ہاتھ شل ہو گیا۔ حضرت ابو دجانہ رضی اللہ عنہ نے اپنی پشت کو ڈھال بنا کر آنحضرت ﷺ کا دفاع کیا۔ تو یہ سارا نقصان پیغمبر کی حکم عدولی کی وجہ سے ہوا۔ اگرچہ وہ حکم عدولی اجتہاداً ہوئی۔ تو رب تعالیٰ نے اپنا وعدہ پورا کر دیا کہ جب تم قاعدے کے مطابق لڑے اللہ تعالیٰ نے فتح عطاء فرمائی۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ﴿وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗ﴾ اور البتہ تحقیق سچ کر دکھایا اللہ نے تمھارے ساتھ اپنا وعدہ ﴿اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ﴾ جب تم ان کو قتل کر رہے تھے اللہ کے حکم سے ﴿حَتّٰۤى اِذَا فَشِلْتُمْ﴾ یہاں تک کہ جب تم نے بزدلی کا اظہار کیا ﴿وَتَنَازَعْتُمْ فِی الْاَمْرِ﴾ اور تم نے جھگڑا کیا اس معاملے میں کہ کچھ نے کہا کہ ہمیں اُتر کر مالِ غنیمت اکٹھا کرنا چاہیے۔ کیوں کہ اب یہاں ہماری ضرورت نہیں ہے اور کچھ نے کہا نہیں بلکہ ہمیں یہیں کھڑا رہنا چاہیے۔ کیوں کہ آنحضرت ﷺ کا حکم ہے کہ فتح ہو یا شکست تم نے مورچہ نہیں چھوڑنا۔ اس جھگڑے کا ذکر ہے۔

﴿وَعَصَيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَاۤ اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ﴾ اور تم نے نافرمانی کی بعد اس کے اللہ نے تمھیں دکھائی وہ چیز جس کو تم پسند کرتے تھے۔ یعنی فتح کو تم پسند کرتے تھے وہ تمھیں حاصل ہوگئی مگر جب تم نے آنحضرت ﷺ کے حکم کو ماننے نہ ماننے کے

متعلق اختلاف کیا اور مالِ غنیمت کے پیچھے پڑ گئے تو کایا پلٹ گئی ﴿مِنۡكُمۡ مَّنۡ يُّرِيۡدُ الدُّنۡيَا﴾ تم میں سے وہ بھی تھے جو دنیا کا ارادہ کرتے تھے۔ یعنی مالِ غنیمت کا ﴿وَمِنۡكُمۡ مَّنۡ يُّرِيۡدُ الۡاٰخِرَةَ﴾ اور تم میں سے وہ بھی تھے جو آخرت کا ارادہ کرتے تھے۔ امیر لشکر اور تقریباً نو، دس آدمی اور جو اس کے ساتھ مورچے پر کھڑے رہے۔ اور پچھلی طرف سے خالد بن ولید نے جو اس وقت تک رضی اللہ عنہ نہیں ہوئے تھے دو سو گھوڑ سواروں کے دستے کے ہمراہ حملہ کر دیا۔ جو مورچے پر تھے بمع امیر لشکر حضرت عبداللہ بن جبیر رضی اللہ عنہ کے، وہاں شہید ہو گئے۔ حضرت امیر حمزہ رضی اللہ عنہ اور حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن جبیر رضی اللہ عنہ ان تینوں بزرگوں کی قبریں ایک ہی جگہ پر ہیں۔ چوکونی کے اندر۔ اور باقی شہداء کی قبریں آگے ہیں۔ پہلے کوئی پابندی نہیں ہوتی تھی اور اب حکومت نے اردگرد چار دیواری کھڑی کر دی ہے۔ اب دور سے جالیوں سے دیکھ سکتے ہیں۔

اسی طرح پہلے جنت البقیع میں بھی عام لوگ ہر وقت جا سکتے تھے مگر اب صرف مخصوص وقت میں جا سکتے ہیں۔ پابندی کی وجہ یہ ہوئی کہ کسی خبیث نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی قبر پر پاخانہ کر دیا تھا۔ حالاں کہ جنت البقیع میں جتنے لوگ مدفون ہیں ان میں سب سے زیادہ درجہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا ہے۔ تو اس شرارت کے نتیجہ میں سعودی حکومت نے مجبوراً چار دیواری کرا دی اور پابندی لگا دی تاکہ کوئی خبیث شرارت نہ کر سکے اور بزرگوں کی توہین نہ ہو۔

جنرل ضیاء الحق کے دور میں سڑک کے دوسرے کنارے ایک بہت بڑا ہوٹل تھا۔ اس کو ایرانیوں نے کرایہ پر لیا۔ اس کے نیچے سے ایک سرنگ نکالی حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا کے جسد مبارک کو نکال کر ایران لے جانے کے لیے۔ رات کو مٹی نکال کر دُور پھینک آتے تھے۔ معلوم ہونے پر پکڑے گئے۔ ان کو کڑی سزا ملی اور ہوٹل گرا کر سڑک بنا دی گئی۔ اللہ تعالیٰ ان شریر لوگوں سے بچائے۔

فرمایا ﴿ثُمَّ صَرَفَكُمۡ عَنۡهُمۡ﴾ پھر پھیر دیا اللہ تعالیٰ نے تمھیں ان سے۔ پہلے تم غالب تھے پھر وہ غالب ہو گئے ﴿لِيَبۡتَلِيَكُمۡ﴾ تاکہ اللہ تمھیں امتحان میں ڈالے کہ کفار کا پلہ بھاری ہونے کے بعد کس حد تک ثابت قدم رہتے ہو۔ اور یہ اس غلطی کا خمیازہ تھا کہ تم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صریح حکم کی مخالفت کی۔ لیکن ﴿وَلَقَدۡ عَفَا عَنۡكُمۡ﴾ اور البتہ تحقیق اللہ تعالیٰ نے تمھیں معاف کر دیا ہے۔ کیوں کہ یہ جو کچھ تم سے ہوا غلط فہمی کی وجہ سے ہوا بدنیتی سے نہیں ہوا۔ غلط فہمی اور چیز ہے اور بدنیتی اور چیز ہے۔ دونوں میں بڑا فرق ہے ﴿وَاللّٰهُ ذُوۡ فَضۡلٍ عَلَى الۡمُؤۡمِنِيۡنَ﴾ اور اللہ تعالیٰ فضل والا ہے ایمان والوں پر۔

﴿اِذۡ تُصۡعِدُوۡنَ﴾ جب تم پہاڑ پر چڑھے جا رہے تھے ﴿وَلَا تَلۡوٗنَ عَلٰۤى اَحَدٍ﴾ اور تم مڑ کے نہیں دیکھتے تھے کسی کو ﴿وَّالرَّسُوۡلُ يَدۡعُوۡكُمۡ﴾ اور رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تمھیں بلاتے تھے ﴿فِىۡۤ اُخۡرٰٮكُمۡ﴾ تمھاری پچھلی صفوں میں سے ﴿فَاَثَابَكُمۡ﴾ پس پہنچایا اللہ تعالیٰ نے تمھیں ﴿غَمًّا بِغَمٍّ﴾ غم پر غم ﴿لِّكَيۡلَا تَحۡزَنُوۡا﴾ تاکہ تم آئندہ نہ غم کھاؤ ﴿عَلٰى مَا

﴿فَاتَكُمْ﴾ ان چیزوں پر جو تمھارے ہاتھوں سے نکل گئی ہیں ﴿وَلَا مَآ اَصَابَكُمْ﴾ اور نہ اس تکلیف پر جو تمھیں پہنچی ہے ﴿وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ﴾ اور اللہ تعالیٰ خبردار ہے ان عملوں سے جو تم کرتے ہو ﴿ثُمَّ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ﴾ پھر نازل کیا تم پر ﴿مِّنْۢ بَعْدِ الْغَمِّ﴾ غم کے بعد ﴿اَمَنَةً نُّعَاسًا﴾ امن اُونگھ تھی ﴿يَّغْشٰى طَآئِفَةً مِّنْكُمْ﴾ جو ڈھانپ رہی تھی تم میں سے ایک گروہ کو ﴿وَطَآئِفَةٌ﴾ اور ایک گروہ تھا ﴿قَدْ اَهَمَّتْهُمْ اَنْفُسُهُمْ﴾ کہ ان کو پریشان کر دیا تھا ان کی جانوں نے ﴿يَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ﴾ خیال کرتے تھے اللہ تعالیٰ کے بارے میں ﴿غَيْرَ الْحَقِّ﴾ ناحق ﴿ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ﴾ (زمانہ) جاہلیت کے گمان کی طرح ﴿يَقُوْلُوْنَ﴾ وہ کہتے تھے ﴿هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَيْءٍ﴾ کیا ہے ہمارے لیے اس معاملے میں کچھ بھی ﴿قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ﴾ کہہ دیجیے! بے شک معاملہ سارے کا سارا اللہ تعالیٰ کے قبضے میں ہے ﴿يُخْفُوْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ﴾ یہ مخفی رکھتے ہیں اپنے دلوں میں ﴿مَّا لَا يُبْدُوْنَ لَكَ﴾ اس چیز کو جو نہیں ظاہر کرتے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے سامنے ﴿يَقُوْلُوْنَ﴾ کہتے ہیں ﴿لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ﴾ اگر ہوتی ہمارے لیے اس معاملے میں کوئی شے ﴿مَّا قُتِلْنَا هٰهُنَا﴾ ہم نہ قتل کیے جاتے یہاں ﴿قُلْ لَّوْ كُنْتُمْ فِيْ بُيُوْتِكُمْ﴾ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کہہ دیں! اگر ہوتے تم اپنے گھروں میں ﴿لَبَرَزَ الَّذِيْنَ﴾ البتہ نکلیں وہ لوگ ﴿كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ﴾ جن پر لکھا گیا ہے قتل ہونا ﴿اِلٰى مَضَاجِعِهِمْ﴾ اپنے گرنے کی جگہوں کی طرف ﴿وَلِيَبْتَلِيَ اللّٰهُ﴾ اور تاکہ اللہ تعالیٰ امتحان لے ﴿مَا فِيْ صُدُوْرِكُمْ﴾ اس چیز کا جو تمھارے دلوں میں ہے ﴿وَلِيُمَحِّصَ﴾ اور تاکہ اللہ تعالیٰ خالص کر دے ﴿مَا فِيْ قُلُوْبِكُمْ﴾ اس چیز کو جو تمھارے دلوں میں ہے ﴿وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ﴾ اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے دلوں کے رازوں کو۔

پہلے سے غزوۂ اُحد کا ذکر چلا آ رہا ہے۔ اور غزوہ اس جنگ کو کہتے ہیں جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود شریک ہوئے ہوں۔ اور اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جہاد کا حکم دیا ہو کہ تم فلاں جگہ پر جاؤ تو اس کو سریہ کہتے ہیں۔ اور جس جہاد میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم شریک نہیں ہوئے یا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا حکم نہیں دیا تو وہ محض جہاد کہلاتا ہے۔ ہجرت کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دس سال مدینہ طیبہ میں رہے ہیں۔ اور نو سالوں میں ستائیس غزوے ہوئے ہیں۔ یوں سمجھو کہ اوسطاً ایک سال میں تین غزوے ہوئے ہیں۔ اور ان غزوں میں طرفین سے جو آدمی مارے گئے ہیں ان کی کل تعداد ایک ہزار اڑتالیس | ۱۰۴۸ | ہے۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جو جہاد ہوئے ہیں ان میں مسلمان بھی بہت شہید ہوئے ہیں اور کافر بھی کافی تباہ ہوئے ہیں۔

تو غزوۂ اُحد ہجرت کے تیسرے سال پیش آیا جس کی خاصی تفصیل آپ سن چکے ہیں کہ مسلمانوں کو پیشگی اطلاع کیے بغیر اچانک تین ہزار کا لشکر مدینہ طیبہ کے قریب آ گیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع دی گئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بعض باتیں

محض افواہ ہوتی ہیں۔ تحقیق کرلو کہ واقعتاً دشمن حملہ آور ہو رہا ہے یا کوئی مسافر قافلہ ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بڑے پھرتیلے، کام میں چست اور چلنے میں اتنے تیز تھے کہ جس کا کوئی حساب نہیں ہے۔ تحقیق کی گئی تو معلوم ہوا واقعتاً قریش مکہ بمع کچھ اور خاندانوں کے مسلمانوں پر حملہ آور ہونے کے لیے آئے ہیں تاکہ بدر کی ذلت کا بدلا چکائیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہنگامی حالت کا اعلان فرمادیا اور حکم دیا کہ فوراً احد کے میدان میں پہنچو۔ یہ احد پہاڑ مدینہ سے دو تین میل کی مسافت پر ہے۔ اور اب تو مدینہ طیبہ کی آبادی دور دور تک چلی گئی ہے۔ تو احد پہاڑ کے دامن میں جنگ کی تیاری شروع ہوئی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ مدینہ طیبہ سے ایک ہزار آدمی آیا تھا مگر تین سو منافق حیلہ بہانہ کر کے واپس چلے گئے۔ باقی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ سات سو رہ گئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مختلف دستے بنا کر مختلف ساتھیوں کی کمان میں دے دیے کہ فلاں دستے کا کمانڈر فلاں ہوگا اور فلاں دستے کا کمانڈر فلاں ہوگا۔ اور یہ بھی سمجھا دیا کہ کس نے کس جگہ کھڑا ہونا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو پروگرام بنایا تھا بڑا معقول تھا۔ ایک چھوٹے سے ٹیلے پر جس کو جبلِ رُماۃ کہتے ہیں، پچاس تیرانداز بٹھائے اور حکم دیا کہ ہمیں فتح ہو یا شکست تم نے یہ مورچہ نہیں چھوڑنا۔

ابتدائی مرحلے میں اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے مسلمانوں کو کافروں پر غلبہ ہوا اور کافر ہتھیار، کپڑے، پگڑیاں اور سامان چھوڑ کر بھاگے اور ان کے سامان سے میدان بھر گیا۔ اور مسلمانوں نے مالِ غنیمت سمیٹنا شروع کر دیا۔ تو وہ پچاس آدمی جو جبلِ رُماۃ پر بٹھائے گئے تھے انھوں نے کہا کہ فتح ہوگئی ہے ہم بھی چل کر مالِ غنیمت اکٹھا کریں۔ امیر لشکر حضرت عبداللہ بن جبیر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ہمیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حکم ہے کہ فتح ہو یا شکست تم نے مورچہ نہیں چھوڑنا۔ دوسروں نے کہا کہ بے شک آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرمان کا مقصد یہ تھا کہ یہاں ہماری ضرورت پڑے گی اور اب تو تم دیکھ رہے ہو کہ اللہ تعالیٰ نے فتح عطاء فرمادی ہے اور میدان سارا ہمارے پاس ہے اور کافر بھاگ گئے ہیں۔ مگر ان کی یہ سوچ غلط تھی۔ اطاعتِ امیر نہ کی اور اکثر ساتھی ٹیلے سے اُتر کر مالِ غنیمت اکٹھا کرنے میں مشغول ہو گئے۔ ادھر خالد بن ولید جو اس وقت کافر تھے دو سو آدمیوں کا دستہ لے کر پچھلی طرف سے حملہ آور ہوئے۔ مورچے والوں کو یہاں شہید کیا اور آواز دی کہ قریشیو! میں خالد بن ولید پچھلی طرف سے حملہ آور ہو چکا ہوں تم آگے سے پلٹو۔ مسلمان اس وقت دو لشکروں کے نرغے میں آگئے اور افراتفری پھیل گئی۔ عتبہ بن ابی وقاص نے پتھر مارا جس کے نتیجہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نیچے کے سامنے والے جو دانت ہیں ان کے ساتھ جو دائیں طرف والا دانت ہے شہید ہو گیا۔ ابن قمیہ کافر نے تلوار ماری جس سے خود کٹا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا چہرۂ اقدس زخمی ہوا۔ سید الشہداء حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو بے دردی کے ساتھ شہید کیا گیا۔ اس افراتفری میں خود مسلمان جان بچانے کے لیے پہاڑ پر گئے۔ اس کا ذکر ہے۔

﴿ إِذْ تُصْعِدُونَ ﴾ جب تم پہاڑ پر چڑھے جارہے تھے۔ صعود کا معنیٰ ہے بلندی پر چڑھنا۔ اُحد پہاڑ پر چڑھ کر اپنی جان بچانے کی فکر کی ﴿ وَلَا تَلْوٗنَ عَلٰٓى اَحَدٍ ﴾ اور تم مڑ کے نہیں دیکھتے تھے کسی کو کہ دوسروں کا کیا حال ہے؟ انسان جب انتہائی مصیبت میں مبتلا ہو جائے تو صرف اپنی جان کی فکر ہوتی ہے ﴿ وَّالرَّسُوْلُ يَدْعُوْكُمْ ﴾ اور رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تمھیں بلاتے تھے

﴿فِيْٓ اُخْرٰىكُمْ﴾ تمھاری پچھلی صفوں میں سے۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم پچھلی صفوں میں تھے۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے آواز دی او کلمہ پڑھنے والو! تمھیں کیا ہوگیا ہے؟ کہاں بھاگ رہے ہو؟ ﴿فَاَثَابَكُمْ﴾ پس پہنچایا اللہ تعالیٰ نے تمھیں ﴿غَمًّا بِغَمٍّ﴾ غم پر غم۔ایک غم ساتھیوں کے شہید ہونے کا اور دوسرا غم مالِ غنیمت کے ہاتھ سے نکلنے کا۔اور بعض مفسرین کرام رحمۃ اللہ علیہم ترجمہ کرتے ہیں ﴿فَاَثَابَكُمْ غَمًّا بِغَمٍّ﴾ پس بدلا دیا اللہ تعالیٰ نے تمھیں غم کا بہ سبب غم کے۔کیوں کہ تم نے اللہ تعالیٰ کے پیغمبر کے حکم کی تعمیل نہ کر کے ان کو غم پہنچایا۔اس کے بدلے میں اللہ تعالیٰ نے تمھیں غم میں ڈال دیا کہ تمھارے ساتھی بھی شہید ہوئے اور مالِ غنیمت بھی ہاتھ سے نکل گیا اور تم جیتا ہوا میدان ہار بیٹھے۔لیکن ہر کام میں کوئی حکمت ہوتی ہے ﴿لِّكَيْلَا تَحْزَنُوْا﴾ تاکہ تم آئندہ غم نہ کھاؤ ﴿عَلٰي مَا فَاتَكُمْ﴾ ان چیزوں پر جو تمھارے ہاتھوں سے نکل گئی ہیں۔اس واقعہ میں تمھیں سبق دیا گیا ہے کہ ہاتھ میں آئی ہوئی چیز اگر نکل جائے، ضائع ہو جائے تو اس پر افسوس نہ کرنا، پریشان اور غمگین نہ ہونا بلکہ یہ سمجھنا کہ ہماری قسمت میں نہ تھی۔﴿وَلَا مَآ اَصَابَكُمْ﴾ اور نہ اس تکلیف پر جو تمھیں پہنچی ہے کہ کچھ ساتھی شہید ہوئے ہیں اور کچھ ساتھی زخمی ہوئے ہیں اور آئندہ کوئی ایسی تکلیف پہنچے گی تو تم پریشان نہیں ہو گے اور تمھارے ذہن میں ہوگا کہ پہلے بھی ایسا ہوا تھا ﴿وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ﴾ اور اللہ تعالیٰ خبردار ہے ان عملوں سے جو تم کرتے ہو۔پھر اچانک ایسا ہوا کہ جب ساتھیوں نے دیکھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم زخمی حالت میں میدان میں ہیں تو فوراً اپنے گناہ سے تائب ہوئے اور واپس آگئے۔پھر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے غم اور پریشانی کو کس طرح اطمینان میں تبدیل کیا اس کا ذکر ہے۔

﴿ثُمَّ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ﴾ پھر نازل کیا تم پر ﴿مِّنْۢ بَعْدِ الْغَمِّ﴾ غم کے بعد ﴿اَمَنَةً﴾ امن ﴿نُّعَاسًا﴾ اونگھ تھی۔یعنی کافر جب اپنا غصہ نکال چکے تو اللہ تعالیٰ نے ان پر رعب ڈال دیا اور وہ بھاگ گئے اور تمھارے اوپر اللہ تعالیٰ نے امن اور اطمینان کی کیفیت طاری فرما دی ﴿يَّغْشٰى طَآىِٕفَةً مِّنْكُمْ﴾ جو ڈھانپ رہی تھی تم میں سے ایک گروہ کو۔یعنی نیند طاری ہوگئی۔حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میرے ہاتھ میں تلوار تھی اور میں کھڑا تھا۔نیند کی وجہ سے تلوار میرے ہاتھ سے گر جاتی تھی۔میں پکڑ لیتا پھر گر جاتی، پھر پکڑتا پھر گر جاتی۔

حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر جہاد کے موقع پر نیند آئے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتی ہے۔اور اگر پڑھتے پڑھاتے وقت نیند آئے تو یہ شیطان کی طرف سے ہوتی ہے۔دیکھو! کئی آدمی درس میں برائے نام بیٹھے رہتے ہیں۔درس سننے میں ان کی توجہ نہیں ہوتی۔اور کئی ایسے ہوتے ہیں کہ درس میں وہ تسبیح پھیرتے رہتے ہیں۔بھائی! اگر تو نے تسبیح پھیرنی ہے تو درس سننے کا کیا معنیٰ ہے؟ درس توجہ کے ساتھ سنو تسبیح آگے پیچھے (اوقات میں) کر لو۔درس کے موقع پر انتہائی خاموشی ہونی چاہیے اور اطمینان اور توجہ سے سننا چاہیے۔تاکہ جتنا سنو سمجھ میں آئے۔درس کے موقع پر تسبیح پھیرنا ناجائز ہے۔اور اگر کسی کو نیند آ جائے تو اُٹھ کر باہر چلا جائے کہ اس کو دیکھ کر دوسرے بھی سونا شروع کر دیں گے۔آپ نے دیکھا ہوگا کہ گاڑیوں پر لکھا ہوتا ہے: فرنٹ سیٹ پر سونا منع ہے۔اب کا مجھے علم نہیں پہلے لکھا ہوتا تھا۔کیوں کہ اگر فرنٹ سیٹ والے کو نیند آ گئی تو اس کا اثر

﴿فِیْٓ اُخْرٰىكُمْ﴾ تمھاری پچھلی صفوں میں سے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پچھلی صفوں میں تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے آواز دی او کلمہ پڑھنے والو! تمھیں کیا ہوگیا ہے؟ کہاں بھاگ رہے ہو؟ ﴿فَاَثَابَكُمْ﴾ پس پہنچایا اللہ تعالیٰ نے تمھیں ﴿غَمًّا بِغَمٍّ﴾ غم پر غم۔ ایک غم ساتھیوں کے شہید ہونے کا اور دوسرا غم مالِ غنیمت کے ہاتھ سے نکلنے کا۔ اور بعض مفسرین کرام رحمہم اللہ ترجمہ کرتے ہیں ﴿فَاَثَابَكُمْ غَمًّا بِغَمٍّ﴾ پس بدلا دیا اللہ تعالیٰ نے تمھیں غم کا بہ سبب غم کے۔ کیوں کہ تم نے اللہ تعالیٰ کے پیغمبر کے حکم کی تعمیل نہ کر کے ان کو غم پہنچایا۔ اس کے بدلے میں اللہ تعالیٰ نے تمھیں غم میں ڈال دیا کہ تمھارے ساتھی بھی شہید ہوئے اور مالِ غنیمت بھی ہاتھ سے نکل گیا اور تم جیتا ہوا میدان ہار بیٹھے۔ لیکن ہر کام میں کوئی حکمت ہوتی ہے ﴿لِّكَیْلَا تَحْزَنُوْا﴾ تاکہ تم آئندہ غم نہ کھاؤ ﴿عَلٰى مَا فَاتَكُمْ﴾ ان چیزوں پر جو تمھارے ہاتھوں سے نکل گئی ہیں۔ اس واقعہ میں تمھیں سبق دیا گیا ہے کہ ہاتھ میں آئی ہوئی چیز اگر نکل جائے، ضائع ہو جائے تو اس پر افسوس نہ کرنا، پریشان اور غمگین نہ ہونا بلکہ یہ سمجھنا کہ ہماری قسمت میں نہ تھی۔ ﴿وَلَا مَآ اَصَابَكُمْ﴾ اور نہ اس تکلیف پر جو تمھیں پہنچی ہے کہ کچھ ساتھی شہید ہوئے ہیں اور کچھ ساتھی زخمی ہوئے ہیں اور آئندہ کوئی ایسی تکلیف پہنچے گی تو تم پریشان نہیں ہوگے اور تمھارے ذہن میں ہوگا کہ پہلے بھی ایسا ہوا تھا ﴿وَاللّٰهُ خَبِیْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ﴾ اور اللہ تعالیٰ خبردار ہے ان عملوں سے جو تم کرتے ہو۔ پھر اچانک ایسا ہوا کہ جب ساتھیوں نے دیکھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم زخمی حالت میں میدان میں ہیں تو فوراً اپنے گناہ سے تائب ہوئے اور واپس آ گئے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے غم اور پریشانی کو کس طرح اطمینان میں تبدیل کیا اس کا ذکر ہے۔

﴿ثُمَّ اَنْزَلَ عَلَیْكُمْ﴾ پھر نازل کیا تم پر ﴿مِّنْۢ بَعْدِ الْغَمِّ﴾ غم کے بعد ﴿اَمَنَةً﴾ امن ﴿نُّعَاسًا﴾ اُونگھ تھی۔ یعنی کافر جب اپنا غصہ نکال چکے تو اللہ تعالیٰ نے ان پر رعب ڈال دیا اور وہ بھاگ گئے اور تمھارے اوپر اللہ تعالیٰ نے امن اور اطمینان کی کیفیت طاری فرما دی ﴿یَّغْشٰى طَآىِٕفَةً مِّنْكُمْ﴾ جو ڈھانپ رہی تھی تم میں سے ایک گروہ کو۔ یعنی نیند طاری ہوگئی۔ حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میرے ہاتھ میں تلوار تھی اور میں کھڑا تھا۔ نیند کی وجہ سے تلوار میرے ہاتھ سے گر جاتی تھی۔ میں پکڑ لیتا پھر گر جاتی، پھر پکڑتا پھر گر جاتی۔

حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر جہاد کے موقع پر نیند آئے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتی ہے۔ اور اگر پڑھتے پڑھاتے وقت نیند آئے تو یہ شیطان کی طرف سے ہوتی ہے۔ دیکھو! کئی آدمی درس میں برائے نام بیٹھے رہتے ہیں۔ درس سننے میں ان کی توجہ نہیں ہوتی۔ اور کئی ایسے ہوتے ہیں کہ درس میں وہ تسبیح پھیرتے رہتے ہیں۔ بھائی! اگر تو نے تسبیح پھیرنی ہے تو درس سننے کا کیا معنیٰ ہے؟ درس توجہ کے ساتھ سنو تسبیح آگے پیچھے (اوقات میں) کر لو۔ درس کے موقع پر انتہائی خاموشی ہونی چاہیے اور اطمینان اور توجہ سے سننا چاہیے۔ تاکہ جتنا سنو سمجھ میں آئے۔ درس کے موقع پر تسبیح پھیرنا نا جائز ہے۔ اور اگر کسی کو نیند آ جائے تو اُٹھ کر باہر چلا جائے کہ اس کو دیکھ کر دوسرے بھی سونا شروع کر دیں گے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ گاڑیوں پر لکھا ہوتا ہے: فرنٹ سیٹ پر سونا منع ہے۔ اب کا مجھے علم نہیں پہلے لکھا ہوتا تھا۔ کیوں کہ اگر فرنٹ سیٹ والے کو نیند آ گئی تو اس کا اثر

ڈرائیور پر ہوگا اور وہ بھی سو جائے گا۔ کیوں کہ خربوزہ خربوزے سے رنگ پکڑتا ہے۔ اور اگر ڈرائیور سو گیا تو سب کا بیڑہ غرق ہو جائے گا۔ اس لیے وعظ تبلیغ کے وقت خاموشی ضروری ہے۔

اور یہ مسئلہ بھی یاد رکھنا کہ درس ہو رہا ہو، نصیحت ہو رہی ہو تو سلام کرنا جو سنت ہے، گناہ ہے۔ آنے والا اسلام نہیں کہہ سکتا۔ بلکہ آرام سے بیٹھ جائے۔ اگر سلام کرے گا تو گناہ گار ہوگا۔ اس واسطے کہ سلام کرنا سنت ہے اور جواب دینا واجب ہے۔ اور اگر وہ جواب دیں گے تو ان کی توجہ اور فکر درس و نصیحت سے ہٹ کر سلام کہنے والے کی طرف ہو جائے گی۔ اور بسا اوقات آدمی یہ بھی دیکھتا ہے کہ سلام کہنے والا کون ہے؟ تو اس میں بے فکری ہو جائے گی اور بعض مسئلے رہ جائیں گے۔ لہٰذا درس سننے والے سلام کا جواب نہ دیں اور درس سننے میں مشغول رہیں۔

﴿ وَطَآئِفَةٌ قَدْ اَهَمَّتْهُمْ اَنْفُسُهُمْ ﴾ اور ایک گروہ تھا کہ ان کو پریشان کر دیا تھا ان کی جانوں نے۔ یہ ان منافقوں کی بات ہے جو میدانِ جنگ سے واپس مدینہ طیبہ چلے گئے تھے۔ جب انھوں نے سنا کہ بہت سارے مسلمان شہید ہو گئے ہیں اور بہت سارے زخمی ہیں تو گھر میں ہوتے ہوئے بھی ان کا سانس خشک ہو رہا تھا اور ان کے اوسان خطا ہو گئے تھے کہ اب وہ ہمیں بھی آ کر قتل کر دیں گے۔ وہ گھروں میں بیٹھے ہوئے پریشان تھے اور ﴿ يَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ ﴾ خیال کرتے تھے اللہ تعالیٰ کے بارے میں ناحق ﴿ ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ ﴾ زمانہ جاہلیت کے گمان کی طرح کہ اگر ہم حق پر ہوتے تو ہمارے آدمی کیوں مارے جاتے، اور کیوں زخمی ہوتے اور ہمیں شکست کیوں ہوتی؟ موقع جو مل گیا ان کو۔

﴿ يَقُوْلُوْنَ ﴾ وہ کہتے تھے ﴿ هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَيْءٍ ﴾ کیا ہے ہمارے لیے اس معاملے میں کچھ۔ یعنی ہمیں اس معاملہ میں کیا حاصل ہوا۔ آدمی بھی مروائے، مالِ غنیمت بھی ہاتھ سے نکل گیا اور میدان بھی ہاتھ سے نکل گیا ﴿ قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ ﴾ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کہہ دیجیے! بے شک معاملہ سارے کا سارا اللہ تعالیٰ کے قبضے میں ہے۔ دنیا میں دن بدلتے رہتے ہیں، کبھی فتح، کبھی شکست، کبھی اُتار، کبھی چڑھاؤ۔ دنیا میں ایک جیسی حالت کبھی نہیں رہی ﴿ يُخْفُوْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ ﴾ یہ مخفی رکھتے ہیں اپنے دلوں میں ﴿ مَّا لَا يُبْدُوْنَ لَكَ ﴾ اس چیز کو جو نہیں ظاہر کرتے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے۔ یعنی دل کے اندر جو بغض، کینہ اور عناد ہے اور اسلام کے خلاف سازشیں اور گندے خیالات جن کو یہ چھپاتے ہیں اور تمھارے سامنے ظاہر نہیں کرتے۔ مگر اللہ تعالیٰ سے تو کوئی کچھ نہیں چھپا سکتا۔ کیوں کہ ظاہر، باطن، نیک، بد اور نیکی، بدی سب اس کے سامنے ہے۔ ہر شے کو وہ جانتا ہے۔

• اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ منافق بدبخت اپنی منافقت کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں ﴿ يَقُوْلُوْنَ ﴾ کہتے ہیں ﴿ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ ﴾ اگر ہوتی ہمارے لیے اس معاملے میں کوئی شے ﴿ مَّا قُتِلْنَا هٰهُنَا ﴾ ہم نہ قتل کیے جاتے یہاں۔ یعنی اللہ تعالیٰ کو ہماری بھلائی منظور ہوتی تو ہمارے اتنے آدمی شہید نہ ہوتے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ان کا یہ خیال باطل ہے کہ اگر جنگ میں شریک نہ ہوتے تو بچ جاتے۔ بلکہ فرمایا ﴿ قُلْ لَّوْ كُنْتُمْ فِيْ بُيُوْتِكُمْ ﴾ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کہہ دیں! اگر ہوتے تم اپنے گھروں میں ﴿ لَبَرَزَ الَّذِيْنَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ ﴾ البتہ نکلیں وہ لوگ جن پر لکھا گیا ہے قتل ہونا ﴿ اِلٰى مَضَاجِعِهِمْ ﴾ اپنے گرنے کی جگہوں کی

طرف۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے کہ کس نے کہاں مرنا ہے اور کب مرنا ہے؟ لہٰذا یہ ان کی خام خیالی ہے کہ اگر گھروں میں بیٹھے رہتے تو قتل نہ ہوتے۔ جس خداوندِ کریم نے ان کے قتل کا مقام مقرر فرما دیا وہ ان کے مقام پر پہنچ جانے کا انتظام بھی فرما دیتا۔

﴿ وَلِيَبْتَلِيَ اللّٰهُ مَا فِيْ صُدُوْرِكُمْ ﴾ اور تا کہ اللہ تعالیٰ امتحان لے اس چیز کا جو تمھارے دلوں میں ہے۔ ایسی مشکل صورتِ حال میں کھرے کھوٹے کی پہچان ہوتی ہے۔ اگر تکلیف نہ پہنچتی، ستر آدمی شہید نہ ہوتے اور کئی آدمی زخمی نہ ہوتے تو مومن اور منافق کا امتحان نہ ہوسکتا۔ چنانچہ اس موقع پر منافقوں نے بڑی باتیں کیں جن سے ان کا نفاق ظاہر ہو گیا اور مومن ثابت قدم رہے۔ اس آزمائش کی دوسرے حکمت کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ﴿ وَلِيُمَحِّصَ مَا فِيْ قُلُوْبِكُمْ ﴾ اور تا کہ اللہ تعالیٰ خالص کر دے اس چیز کو جو تمھارے دلوں میں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ دلوں میں جو مختلف وسوسے اور شبہات پیدا ہورہے تھے اللہ تعالیٰ نے ان کو دور کر کے ایمان والوں کے دلوں کو ایسی اشیاء سے پاک کر دیا ہے۔ اس مقام پر آزمائش کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے صدور کا لفظ فرمایا کہ تمھارے سینوں میں جو بات پوشیدہ ہے اس کو آزمائے۔ اور آگے جہاں پاک صاف کرنے کا ذکر ہے وہاں قلوب کا لفظ آیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عقیدہ، ایمان اور اخلاص کا مرکز دل ہے۔ لہٰذا اس کی پاکیزگی کی ضرورت ہے۔ تا کہ انسان کا عقیدہ اور ایمان درست ہو جائے اور اس میں دین کے لیے اخلاص پیدا ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ مومن لوگ امتحان میں پاک صاف ہو کر نکلتے ہیں۔ جب کہ روگی دل والے تباہ و برباد ہو جاتے ہیں۔

بہر حال اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اس آزمائش کے ذریعے ہم نے تمھارے دلوں میں موجود میل کچیل کو صاف فرما دیا ہے۔
﴿ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴾ اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے دلوں کے رازوں کو۔ اس سے تمھاری کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہے۔ خواہ وہ زبان پر آئے یا نہ آئے۔

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ ﴾ بے شک وہ لوگ ﴿ تَوَلَّوْا مِنْكُمْ ﴾ جنھوں نے پیٹھ پھیری تم میں سے ﴿ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ ﴾ اُس دن جب آمنے سامنے ہوئیں دو جماعتیں ﴿ اِنَّمَا ﴾ پختہ بات ہے ﴿ اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطٰنُ ﴾ ان کو پھسلایا شیطان نے ﴿ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوْا ﴾ ان کی بعض کمائی کی وجہ سے ﴿ وَلَقَدْ عَفَا اللّٰهُ عَنْهُمْ ﴾ اور البتہ تحقیق اللہ تعالیٰ نے معاف کر دیا ان کو ﴿ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴾ بے شک اللہ تعالیٰ بخشنے والا، تحمل کرنے والا ہے ﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ﴾ اے وہ لوگو! جو ایمان لائے ہو ﴿ لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ ﴾ نہ ہو جاؤ تم ان لوگوں کی طرح ﴿ كَفَرُوْا ﴾ جنھوں نے کفر اختیار کیا ﴿ وَقَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ ﴾ اور کہا انھوں نے اپنے بھائیوں کے بارے میں ﴿ اِذَا ضَرَبُوْا فِي الْاَرْضِ ﴾ جب وہ چلے زمین میں ﴿ اَوْ كَانُوْا غُزًّى ﴾ یا تھے وہ غازی اور مجاہد ﴿ لَّوْ كَانُوْا عِنْدَنَا ﴾ اگر ہوتے وہ ہمارے پاس ﴿ مَا مَاتُوْا ﴾ نہ مرتے ﴿ وَمَا قُتِلُوْا ﴾ اور نہ قتل کیے جاتے ﴿ لِيَجْعَلَ اللّٰهُ ذٰلِكَ ﴾ تا کہ کر دے اللہ تعالیٰ ان کی اس بات

کو ﴿حَسْرَةً فِي قُلُوبِهِمْ﴾ افسوس کی چیز ان کے دلوں میں ﴿وَاللّٰهُ يُحْيِي﴾ اور اللہ تعالیٰ ہی زندہ کرتا ہے ﴿وَيُمِيتُ﴾ اور مارتا ہے ﴿وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ﴾ اور اللہ تعالیٰ جو عمل تم کرتے ہو دیکھتا ہے ﴿وَلَئِنْ قُتِلْتُمْ﴾ اور البتہ اگر تم قتل کر دیے جاؤ ﴿فِي سَبِيلِ اللّٰهِ﴾ اللہ تعالیٰ کے راستے میں ﴿أَوْ مُتُّمْ﴾ یا طبعی موت مرجاؤ ﴿لَمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ﴾ البتہ بخشش اللہ تعالیٰ کی طرف سے ﴿وَرَحْمَةٌ﴾ اور اللہ تعالیٰ کی رحمت ﴿خَيْرٌ﴾ بہت ہی بہتر ہے ﴿مِّمَّا يَجْمَعُونَ﴾ اس چیز سے جس کو یہ جمع کرتے ہیں ﴿وَلَئِنْ مُّتُّمْ﴾ اور اگر تم مرجاؤ ﴿أَوْ قُتِلْتُمْ﴾ یا مارے جاؤ ﴿لَإِلَى اللّٰهِ تُحْشَرُونَ﴾ البتہ تم اللہ تعالیٰ ہی کی طرف جمع کیے جاؤ گے۔

آپ خاصی تفصیل کے ساتھ سن چکے ہیں کہ غزوۂ اُحد میں مسلمانوں کو کافی نقصان اُٹھانا پڑا کہ ستر آدمی شہید ہو گئے اور بہت سارے زخمی ہوئے، مالِ غنیمت ہاتھ سے نکل گیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرۂ اقدس زخمی ہوا اور کافروں نے طرفین سے اس طرح حملہ کیا کہ بارہ تیرہ آدمیوں کے سوا کوئی بھی میدان میں نہ ٹھہر سکا۔ بارہ تیرہ آدمی میدان میں کھڑے رہے اور ڈٹ کر لڑتے رہے۔ باقی سارے بھاگ گئے۔ ان بھاگنے والوں میں عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ جن کو آج تک مخالف معاف کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف یہ ذہن آج کی پیداوار نہیں ہے بلکہ رافضیوں کے دادا عبداللہ بن سبا یہودی یمنی کا تیار کیا ہوا ہے۔ مصر میں اس نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے خلاف ذہن بنایا عموماً اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف ذہن بنایا خصوصاً چونکہ حضرت عثمان خلیفہ رضی اللہ عنہ تھے اس لیے مصریوں نے ان کے خلاف خوب پروپیگنڈہ کیا۔

ایک مصری کا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر اعتراضات کرنا اور ابن عمر رضی اللہ عنہما کا جواب دینا

بخاری شریف اور دیگر کتابوں میں روایت آتی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ مسجد حرام میں لوگوں کا ایک مجمع تھا۔ اس میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما تشریف فرما تھے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما ان لوگوں میں درجے کے اعتبار سے بھی بڑے تھے۔ لہٰذا کچھ لوگ تو ان سے مسائل پوچھ رہے تھے، کچھ زیارت کر رہے تھے اور کچھ لوگ ان کی مجلس میں بیٹھنے کو سعادت سمجھتے ہوئے بیٹھے تھے۔ (اور احادیث میں آتا ہے کہ نیک لوگوں پر اللہ تعالیٰ رحمت نازل کرتا ہے۔ تو نیک لوگوں کی مجلس پر اللہ تعالیٰ کی رحمت برستی ہے وہاں بیٹھنے والے بھی رحمت سے محروم نہیں ہوتے چاہے خاموش ہی بیٹھے رہیں)۔

تو اس مجمع میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما تشریف فرما تھے اور لوگ ان کے اردگرد جمع تھے جَاءَ رَجُلٌ مِّنْ أَهْلِ مِصْرَ ایک مصری آدمی آیا اور سوال کیا کہ یہ بابا جی کون ہیں جس کے اردگرد لوگ جمع ہیں؟ لوگوں نے بتایا کہ عبداللہ ابن عمر ابن الخطاب رضی اللہ عنہما ہیں۔ یہ مصری بڑا منہ پھٹ تھا۔ کہنے لگا کہ نام تو میں نے سنا تھا لیکن دیکھا نہیں تھا۔ آدمیوں سے گزرتا ہوا ابن عمر رضی اللہ عنہما کے سامنے جا کر بیٹھ گیا۔ کہنے لگا میں نے آپ سے کچھ پوچھنا ہے۔ حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا پوچھ لو۔

❀ کہنے لگا کہ یہ بتاؤ کہ عثمان اچھا آدمی تھا یا بُرا؟ حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی کے بعد درجہ ہے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا۔ ان کے بعد درجہ ہے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا۔ ان کے بعد درجہ ہے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا۔ وہ بہت اچھے انسان تھے۔ وہ مصری کہنے لگا عثمان کا درجہ کس چیز کا ہے؟ مجھے یہ بتاؤ کہ عثمان غزوۂ بدر میں شریک تھا؟ فرمایا نہیں۔ کہنے لگا تمام غزوات میں غزوۂ بدر ہی تو بڑا اہم غزوہ تھا اور اس غزوے میں وہ غیر حاضر رہا اور تم کہتے ہو کہ وہ اچھا آدمی تھا۔

❀ دوسرا سوال یہ کیا کہ بتاؤ غزوۂ احد کے بھاگنے والوں میں عثمان بھی تھا یا نہیں؟ حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ ہاں بھاگنے والوں میں وہ بھی تھا۔ کہنے لگا پھر کس طرح وہ اچھا ہوا اور درجے والا ہوا؟

❀ تیسرا سوال: کہنے لگا یہ بتاؤ کہ حدیبیہ کے مقام پر کیکر کے درخت کے نیچے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ مبارک پر صحابہ رضی اللہ عنہم نے بیعت کی تھی عثمان اس بیعت میں شریک تھا؟ فرمایا نہیں۔ خوشی کی وجہ سے اس نے نعرہ لگایا اللہ اکبر! اسلام میں یہی تین مقام تو اچھے ہیں اور وہ ان تینوں موقعوں پر غیر حاضر رہا۔ پھر تم اس کی فضیلت کے گیت گاتے ہو؟ جب نعرہ لگا کر اُٹھ کے جانے لگا تو حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما نے اس کو دامن سے پکڑ لیا اور فرمایا صرف سوال نہ ذہن میں جمائے رکھ ان کے جوابات بھی سن لو۔

بدر کے موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹی حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے نکاح میں تھیں، وہ بیمار تھیں اور گھر میں کوئی اور آدمی نہ تھا۔ نہ کوئی مرد، نہ کوئی عورت، نہ بوڑھا، نہ جوان، نہ بچہ۔ غزوۂ بدر کے موقع پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بھی پانی کی کُپّی لی، ستو اور کھجوروں والا تھیلا بھی پکڑا، تلوار اور ضروری ہتھیار لیے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ چل پڑے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا عثمان (رضی اللہ عنہ)! تو نہیں جا سکتا۔ عرض کیا حضرت! اَوَّلُ غَزْوَةٍ فِي الْإِسْلَامِ "اسلام میں یہ پہلا غزوہ اور جہاد ہے۔" اور میں اس میں شریک نہیں ہو سکتا۔ فرمایا ہاں! نہیں ہو سکتے۔ حضرت کیوں؟ فرمایا تیری بیوی میری لختِ جگر بیٹی سخت بیمار ہے اور تیرے گھر تیرے سوا اور کوئی آدمی نہیں ہے جو اس کی خبر گیری کرے۔ اس کو دوائی کون دے گا؟ اٹھائے، بٹھائے گا کون؟ اس کو روٹی پانی کون کھلائے پلائے گا؟ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے کہا حضرت! میں نے محلے کی عورتوں کو کہہ دیا ہے وہ آ کر خدمت کریں گی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا محلے کی عورتیں دن کو آ جائیں گی (مثال کے طور پر) رات کو تو وہ اپنا گھر سنبھالیں گی، اپنے بچے سنبھالیں گی یا اس کا انتظام اور خدمت کریں گی؟

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ رو پڑے کہ حضرت! اسلام میں پہلا جہاد ہے میں اس سے محروم ہو جاؤں گا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا رقیہ (رضی اللہ عنہا) تیری بیوی ہے اور میری بیٹی ہے۔ اس کا بھی تیرے اوپر حق ہے۔ عرض کیا حضرت! میں جہاد کی فضیلت سے محروم رہوں گا۔ فرمایا نہیں۔ جتنا اجر و ثواب بدر میں لڑنے والوں کو ملے گا اتنا تجھے گھر بیٹھے ملے گا۔ اور مالِ غنیمت جتنا دوسروں کو ملے گا تجھے بھی اتنا ہی ملے گا۔ تو گھر بیٹھے برابر کا شریک ہے۔ (اسی لیے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو بدریوں میں شمار کرتے ہیں۔

حالاں کہ وہ بہ نفسِ نفیس بدر میں شریک نہیں ہوئے تھے مگر آنحضرت ﷺ نے ان کو حکماً بدر میں شریک فرمایا۔ چنانچہ عثمان رضی اللہ عنہ کو بدر کی غنیمت میں سے برابر حصہ دیا گیا)۔

حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ اے مصری! اس کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر اعتراض کرنا سراسر غلط ہے۔ وہ تو غزوۂ بدر میں شرکت کے لیے بے چین تھے مگر آنحضرت ﷺ نے حکماً فرمایا کہ تو نے گھر ٹھہرنا ہے۔ اس میں ان کا کیا قصور ہے؟

اور تیرا دوسرا اعتراض ہے احد سے بھاگنے کا۔ تو ان کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ﴾ بے شک وہ لوگ ﴿تَوَلَّوْا مِنْكُمْ﴾ جنھوں نے پیٹھ پھیری تم میں سے ﴿یَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ﴾ اُس دن جب آمنے سامنے ہوئیں دو جماعتیں ﴿اِنَّمَا﴾ پختہ بات ہے ﴿اسْتَزَلَّهُمُ الشَّیْطٰنُ﴾ ان کو پھسلایا شیطان نے ﴿بِبَعْضِ مَا كَسَبُوْا﴾ ان کی بعض کمائی کی وجہ سے۔ کل تفصیل کے ساتھ آپ سن چکے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کے ایک حکم کی تعمیل نہیں ہوئی تھی اس وجہ سے شیطان نے ان کو پھسلایا اور غلطی ہوگئی۔ مگر اب تم رب تعالیٰ کا فیصلہ سن لو ﴿وَلَقَدْ عَفَا اللّٰهُ عَنْهُمْ﴾ اور البتہ تحقیق اللہ تعالیٰ نے معاف کر دیا ان کو۔ اب ذرا توجہ کرو۔ لام بھی تاکید کا، قد بھی تاکید کا اور ماضی پر داخل ہیں۔ معنیٰ بنے گا اور البتہ تحقیق اللہ تعالیٰ نے معاف کر دیا۔ بھئی! ان سے لغزش اور غلطی ہوئی ہے اور اللہ تعالیٰ نے معاف کر دیا۔ پھر اس کو گناہ گناہ کہتے پھرنا خود گناہ ہے اور یہ کہنے والا مجرم ہے۔ ﴿اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِیْمٌ﴾ بے شک اللہ تعالیٰ بخشنے والا، تحمل کرنے والا ہے۔

باقی رہا حدیبیہ کا مسئلہ کہ بیعت کے وقت حضرت عثمان نہیں تھے۔ تو اس کی حقیقت یہ ہے کہ ۶ ہجری میں جب آپ ﷺ نے پندرہ سو [۱۵۰۰] صحابہ کرام کے ہمراہ مکہ مکرمہ کا قصد فرمایا تو جب مکہ مکرمہ کے قریب پہنچے تو آنحضرت ﷺ کے جاسوس نے آکر آپ ﷺ کو اطلاع دی کہ اہلِ مکہ نے آپ ﷺ کی خبر پاتے ہی لشکر جمع کیا ہے اور آپ ﷺ کے مقابلہ کے لیے تُل گئے ہیں۔ اور یہ عہد کیا ہے کہ آپ ﷺ کو مکہ مکرمہ میں داخل نہیں ہونے دیں گے۔ آنحضرت ﷺ نے تھوڑا سا ہٹ کر حدیبیہ میں قیام کرنے کے بعد حضرت خراش بن امیہ خزاعی رضی اللہ عنہ کو ایک اونٹ پر سوار کر کے اہلِ مکہ کے پاس بھیجا کہ ان کو خبر کر دیں کہ ہم فقط بیت اللہ کی زیارت کے لیے آئے ہیں جنگ کے لیے نہیں آئے۔ مکہ والوں نے ان کے اونٹ کو ذبح کر ڈالا اور ارادہ کیا ان کو بھی قتل کرنے کا مگر وہ اپنی جان بچا کر واپس آئے اور رسول اللہ ﷺ کے سامنے سارا واقعہ بیان فرمایا۔ اس کے بعد مکہ والوں کے یکے بعد دیگرے کئی نمائندے آئے مگر گرم سرد ہو کر واپس چلے جاتے۔

صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا حضرت! ہمیں بھی کوئی اپنا نمائندہ بھیجنا چاہیے۔ تاکہ وہ ان کے بڑوں سے گفتگو کرے شاید ان کو سمجھ آجائے کہ ہم لڑنے کے لیے نہیں آئے۔ ہم نے احرام باندھے ہوئے ہیں اور ہم زبان سے اَللّٰهُمَّ لَبَّیْكَ اَللّٰهُمَّ لَبَّیْكَ کے نعرے لگا رہے ہیں۔ ہم صرف عمرہ کرنا چاہتے ہیں۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا تمھاری رائے صحیح ہے ہمیں بھی کوئی نمائندہ بھیجنا چاہیے۔ پھر آپ ﷺ نے خیال فرمایا کہ عمر رضی اللہ عنہ کو بھیجنا چاہیے۔ چنانچہ ان کو بلایا اور فرمایا عمر! قریشِ مکہ کے

نمائندے آتے رہے ہیں اور گرمی کھا کے (غصہ کر کے) جاتے رہے ہیں۔ ساتھیوں کا بھی خیال ہے اور میری بھی رائے ہے کہ ہم بھی کوئی اپنا نمائندہ بھیجیں تاکہ ان کے جو سمجھ دار معمر آدمی ہیں ان کے ساتھ بات چیت کرے۔ شاید وہ ہمیں عمرے کی اجازت دے دیں۔ یہاں سے مکہ کا سفر اب صرف چھ میل باقی رہ گیا ہے اور اب تو مکہ حدیبیہ سے بھی آگے چلا گیا ہے۔ پھر فرمایا عمر! تم چلے جاؤ اور اہلِ مکہ سے بات کرو۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ حضرت! آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشاد کی دو شقیں ہیں۔ ایک شق یہ ہے کہ ہمارا کوئی نمائندہ جانا چاہیے۔ میں اس شق کے ساتھ تو میں اتفاق کرتا ہوں۔ اور دوسری شق یہ ہے کہ میں نمائندہ بن کے جاؤں۔ تو مجھے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم سے انکار نہیں ہے۔ مگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جانتے ہیں کہ میری طبیعت میں تیزی ہے خلافِ طبیعت کوئی بات میں سن نہیں سکتا (اپنا اپنا مزاج ہوتا ہے)۔ حضرت! وہاں اگر کوئی ایسی بات ہو جائے جو تیزی کی ہو اور بات بننے کی بجائے بگڑ نہ جائے۔ حضرت! میری رائے ہے کہ عثمان بن عفان (رضی اللہ عنہ) کو بھیجو۔ وہ ٹھنڈی طبیعت کا آدمی ہے۔ سنے گا بھی اور سنائے گا بھی۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا مزاج ایسا تھا جیسے برف کی ڈلی ہو)۔

چنانچہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو نمائندہ بنا کر بھیج دیا گیا۔ جس وقت یہ وہاں پہنچے تو کافروں نے کہا کہ تو احرام کی حالت میں ہے عمرہ کر لے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے کہا کہ نہیں۔ جب تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کعبۃ اللہ کا طواف اور سعی بین الصفا والمروہ نہیں کریں گے میں بھی نہیں کروں گا۔ قریشِ مکہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو کعبۃ اللہ میں بند کر کے تالا لگا دیا اور مشہور کر دیا کہ اِنَّ عُثْمَانَ قَدْ قُتِلَ "عثمان کو شہید کر دیا گیا ہے۔" اس سے وہ مسلمانوں کا ردِ عمل دیکھنا چاہتے تھے کہ اس پر مسلمانوں کا کیا ردِ عمل ہے؟ ورنہ وہ اتنے پاگل نہیں تھے کہ سفیر کو قتل کر دیتے۔

چنانچہ یہ خبر جب حدیبیہ کے مقام پر پہنچی کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو قتل کر دیا گیا ہے۔ دوپہر کا وقت تھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کیکر کے درخت کے نیچے تشریف فرما تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ آؤ میرے ہاتھ پر بیعت کرو۔ کس بات کی بیعت؟ تو بخاری شریف میں دو لفظ آئے ہیں۔ ایک عَلَى الْمَوْت کا کہ ہم جانیں قربان کر دیں گے اور سفیر کا بدلا لیں گے اور دوسرا لفظ آیا ہے عَلٰی اَنْ لَّا نَفِرَّ کہ ہم بھاگیں گے نہیں۔ پندرہ سو صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہاتھ مبارک پر بیعت فرمائی۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنا داہنا ہاتھ بلند فرمایا اور فرمایا یہ کیا ہے؟ صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین نے کہا کہ حضرت! یہ آپ کا دایاں ہاتھ ہے۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنا بایاں ہاتھ اُٹھایا اور فرمایا یہ کیا ہے؟ صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین نے عرض کیا کہ حضرت! یہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا بایاں ہاتھ ہے۔ فرمایا اس بیعت کا بڑا درجہ ہے اور عثمان کو میں نے اپنے کام بھیجا ہے۔ وہ اس بیعت سے محروم نہ رہ جائیں۔ فرمایا یہ میرا بایاں ہاتھ عثمان کا ہاتھ سمجھو۔ اس کی طرف سے بیعت لیتا ہوں۔ چنانچہ اپنے بائیں ہاتھ کو دائیں ہاتھ پر رکھ کر فرمایا کہ یہ بیعت عثمان کی جانب سے ہے۔ اس بیعت کا تو سبب ہی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ تھے اور ان کی طرف سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بیعت بھی لی۔ تو وہ کس طرح محروم ہو گئے، معاذ اللہ تعالیٰ۔

توان وجوہات کی وجہ سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر اعتراض کرنا بڑی نادانی اور حماقت ہے۔ اللہ تعالیٰ سمجھ عطاء فرمائے۔

منافقوں کی شرارت سے مسلمانوں کو بچنے کی نصیحت

آگے اللہ تعالیٰ نے منافقوں کی ایک شرارت کا ذکر فرما کر مسلمانوں کو ان سے بچنے کی نصیحت فرمائی ہے۔ فرمایا ﴿یٰۤاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا﴾ اے وہ لوگو! جو ایمان لائے ہو ﴿لَا تَکُوْنُوْا کَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا﴾ نہ ہو جاؤ تم ان لوگوں کی طرح جنھوں نے کفر اختیار کیا۔ یعنی منافقین۔ ﴿وَقَالُوْا لِاِخْوَانِھِمْ﴾ اور کہا انھوں نے اپنے بھائیوں کے بارے میں ﴿اِذَا ضَرَبُوْا فِی الْاَرْضِ﴾ جب وہ چلے زمین میں مدینہ منورہ سے جہاد کے لیے ﴿اَوْ کَانُوْا غُزًّی﴾ یا تھے وہ غازی اور مجاہد۔

منافقین کے ساتھ رشتہ داریاں تو تھیں۔ کوئی کسی کا باپ تھا، کسی کا چچا تھا، کسی کا بھائی تھا۔ تو انھوں نے یہ کہا ﴿لَّوْ کَانُوْا عِنْدَنَا﴾ اگر ہوتے وہ ہمارے پاس ﴿مَا مَاتُوْا وَمَا قُتِلُوْا﴾ نہ مرتے اور نہ قتل کیے جاتے۔ یعنی یہ منافق کہتے ہیں کہ ہم نے جاتے وقت کہا تھا کہ نہ جاؤ لیکن ہماری بات کسی نے نہیں سنی۔ اگر ہماری بات مان لیتے تو بچ جاتے۔ فرمایا ان کافروں کی طرح نہ ہو جانا جو یہ کہہ رہے ہیں ﴿لِیَجْعَلَ اللّٰہُ ذٰلِکَ حَسْرَۃً فِیْ قُلُوْبِھِمْ﴾ تا کہ کر دے اللہ تعالیٰ ان کی اس بات کو افسوس کی چیز ان کے دلوں میں کہ اللہ تعالیٰ منافقوں کے دلوں میں حسرت پیدا کر دے کہ جب قیامت کے دن غازیوں اور مجاہدوں کو درجے ملیں گے تو یہ منافق افسوس کریں گے اور کہیں گے کاش! کہ ہمارے بدن قینچیوں کے ساتھ کاٹ دیے جاتے اور ہم بھی ان کی راہ پر چلتے۔ مگر

اب پچھتائے کیا ہوت
جب چڑیاں چگ گئیں کھیت

﴿وَاللّٰہُ یُحْیٖ وَیُمِیْتُ﴾ اور اللہ تعالیٰ ہی زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے ﴿وَاللّٰہُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ﴾ اور اللہ تعالیٰ جو عمل تم کرتے ہو دیکھتا ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ﴿وَلَئِنْ قُتِلْتُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ﴾ اور البتہ اگر تم قتل کر دیے جاؤ اللہ تعالیٰ کے راستے میں ﴿اَوْ مُتُّمْ﴾ یا اللہ تعالیٰ کی راہ میں نکلنے کے بعد طبعی موت مر جاؤ ﴿لَمَغْفِرَۃٌ مِّنَ اللّٰہِ﴾ البتہ بخشش اللہ تعالیٰ کی طرف سے ﴿وَرَحْمَۃٌ خَیْرٌ﴾ اور اللہ تعالیٰ کی رحمت بہت ہی بہتر ہے ﴿مِّمَّا یَجْمَعُوْنَ﴾ اس چیز سے جس کو یہ جمع کرتے ہیں۔ یعنی مال، دولت وغیرہ ﴿وَلَئِنْ مُّتُّمْ اَوْ قُتِلْتُمْ﴾ اور اگر تم مر جاؤ یا مارے جاؤ ﴿لَاِلَی اللّٰہِ تُحْشَرُوْنَ﴾ البتہ تم اللہ تعالیٰ ہی کی طرف جمع کیے جاؤ گے۔ یعنی جس حالت میں بھی کوئی مر جائے سب نے اللہ تعالیٰ ہی کے ہاں جانا ہے اور رتی رتی کا حساب ہونا ہے۔ اللہ تعالیٰ نیکیوں کا بدلا دے گا اور برائی کی سزا۔ یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لیں۔

﴿فَبِمَا رَحْمَةٍ﴾ پس بہ سبب رحمت کے ﴿مِّنَ اللّٰهِ﴾ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ﴿لِنْتَ لَهُمْ﴾ تو ان کے لیے نرم واقع ہوا ہے ﴿وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا﴾ اور اگر ہوتا سخت مزاج ﴿غَلِيْظَ الْقَلْبِ﴾ سخت دل والا ﴿لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ﴾ تو یہ بھاگ جاتے تیرے آس پاس سے ﴿فَاعْفُ عَنْهُمْ﴾ پس تو ان کو معاف کردے ﴿وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ﴾ اور ان کے لیے مغفرت طلب کر اللہ تعالیٰ سے ﴿وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ﴾ اور ان کے ساتھ مشورہ کر معاملات میں ﴿فَاِذَا عَزَمْتَ﴾ پس جب تو ارادہ کرلے ﴿فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ﴾ پس اللہ تعالیٰ پر توکل کر ﴿اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ﴾ بے شک اللہ تعالیٰ محبت کرتا ہے توکل کرنے والوں کے ساتھ ﴿اِنْ يَّنْصُرْكُمُ اللّٰهُ﴾ اگر تمھاری مدد کرے اللہ تعالیٰ ﴿فَلَا غَالِبَ لَكُمْ﴾ پس تم پر کوئی غالب نہیں آسکتا ﴿وَاِنْ يَّخْذُلْكُمْ﴾ اور اگر اللہ تعالیٰ تمھاری مدد ختم کردے ﴿فَمَنْ ذَا الَّذِيْ﴾ پس کون ہے وہ ذات ﴿يَنْصُرُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِهٖ﴾ جو تمھاری مدد کرے گی اللہ تعالیٰ کے بعد ﴿وَعَلَى اللّٰهِ﴾ اور اللہ تعالیٰ ہی کی ذات پر ﴿فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ﴾ پس چاہیے کہ توکل کریں ایمان والے ﴿وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ﴾ اور نہیں ہے لائق کسی نبی کے ﴿اَنْ يَّغُلَّ﴾ یہ کہ وہ خیانت کرے ﴿وَمَنْ يَّغْلُلْ﴾ اور جس نے خیانت کی ﴿يَاْتِ بِمَا غَلَّ﴾ لائے گا اس چیز کو جو اس نے خیانت کی ﴿يَوْمَ الْقِيٰمَةِ﴾ قیامت والے دن ﴿ثُمَّ تُوَفّٰى﴾ پھر پورا پورا دیا جائے گا ﴿كُلُّ نَفْسٍ﴾ ہر نفس کو ﴿مَّا كَسَبَتْ﴾ جو اس نے کمایا ﴿وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ﴾ اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا ﴿اَفَمَنِ اتَّبَعَ﴾ کیا پس وہ شخص جس نے پیروی کی ﴿رِضْوَانَ اللّٰهِ﴾ اللہ تعالیٰ کی رضا کی ﴿كَمَنْۢ بَآءَ﴾ اس شخص کی طرح ہو جائے گا جو لوٹا ﴿بِسَخَطٍ مِّنَ اللّٰهِ﴾ اللہ تعالیٰ کی ناراضگی لے کر ﴿وَمَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ﴾ اور جس کا ٹھکانا جہنم ہے ﴿وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ﴾ اور بُرا ہے وہ ٹھکانا ﴿هُمْ دَرَجٰتٌ﴾ ان کے درجے ہیں ﴿عِنْدَ اللّٰهِ﴾ ان کے رب کے ہاں ﴿وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ﴾ اور اللہ تعالیٰ دیکھ رہا ہے ﴿بِمَا يَعْمَلُوْنَ﴾ اس چیز کو جو وہ عمل کرتے ہیں۔

آنحضرت ﷺ کا ایمان والوں کے لیے نرم واقع ہونا

پہلے سے غزوۂ اُحد کا ذکر چلا آرہا ہے اور یہ بات بھی آپ قدرے تفصیل کے ساتھ سن چکے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے پچاس آدمیوں کا ایک دستہ حضرت عبداللہ بن جبیر رضی اللہ عنہ کی امارت میں جبلِ رُماۃ کے اہم مورچے پر مقرر فرمایا تھا اور ان کو بڑی تاکید کے ساتھ حکم دیا تھا کہ فتح ہو یا شکست تم نے مورچہ نہیں چھوڑنا۔ بلکہ آپ ﷺ نے یہاں تک تاکید فرمائی کہ دشمن نے ہمیں شہید کر دیا ہے اور پرندے ہمارا گوشت نوچ رہے ہیں تم نے مورچہ پھر بھی نہیں چھوڑنا۔ باوجود اتنی تاکید کے ان سے غلط فہمی کی بنیاد پر غلطی ہوئی۔ بدنیتی کی وجہ سے نہیں کم فہمی کی وجہ سے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ستر آدمی شہید ہوئے، آنحضرت ﷺ کا چہرہ

اقدس زخمی ہوا، جیتا ہوا میدان ہار گئے۔ بہت نقصان ہوا۔ چاہیے تو یہ تھا کہ جو مورچہ چھوڑ کر نیچے اتر آئے تھے اور زندہ بچ گئے تھے۔ ان کو کھڑا کر کے آنحضرت ﷺ تیروں سے اُڑا دیتے کہ تم نے میدانِ جنگ میں اتنی بڑی غلطی کی ہے اور تمھاری غلطی کی وجہ سے اتنا بڑا نقصان ہوا ہے۔ ظاہری حالات کو دیکھا جائے تو ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔ مگر آپ ﷺ نے کسی کو کچھ نہیں کہا۔ اس کا ذکر ہے۔

﴿فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ﴾ پس بہ سبب رحمت کے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ﴿لِنْتَ لَهُمْ﴾ تو ان کے لیے نرم واقع ہوا ہے۔ دیکھو! کتنی بڑی غلطی تھی اور اس سے کتنا بڑا نقصان ہوا لیکن اس کے باوجود آپ ﷺ نے کسی کو سزا نہیں دی۔ اور کل کے درس میں آپ سن چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے بھی معاف فرما دیا۔ انھوں نے اپنی غلطی سے توبہ کی اور حدیث پاک میں آتا ہے : ((اَلتَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ كَمَنْ لَّا ذَنْبَ لَهٗ)) "صحیح معنیٰ میں گناہ سے توبہ کرنے والا ایسا ہی ہے جیسے اس نے گناہ کیا ہی نہیں ہے۔" پھر رب توبہ قبول کر لے اور اعلان فرما دے کہ میں نے معاف کر دیا ہے تو پھر گناہ کہاں رہا؟ اور آنحضرت ﷺ کی نرمی کا اندازہ اس واقعہ سے بھی لگائیں۔

حدیث پاک میں آتا ہے کہ ہجرت کے آٹھویں سال مکہ مکرمہ سے بیس میل دور جعرانہ کے مقام پر جہاں سے بڑے عمرے کا احرام باندھا جاتا ہے۔ آنحضرت ﷺ وہ مالِ غنیمت تقسیم فرما رہے تھے جو حنین سے حاصل ہوا تھا اور آنحضرت ﷺ کے دور میں اتنا مالِ غنیمت کسی اور موقع پر حاصل نہیں ہوا جتنا غزوۂ حنین کے موقع پر حاصل ہوا تھا۔ چالیس ہزار بکریاں، چوبیس ہزار اُونٹ، منوں کے حساب سے سونا چاندی۔ آپ ﷺ نے یہ مال زیادہ تر ان لوگوں کو دیا جو نئے مسلمان ہوئے تھے۔ اور دیا بھی اس انداز سے کہ کسی کو سو اونٹ، کسی کو پچاس اونٹ۔

خرقوص نامی ایک آدمی تھا قبیلہ بنو تمیم کا۔ ذُوالْخُوَيْصَرَة اس کا لقب تھا۔ ایک بازو اس کا قدرتی طور پر نہیں تھا اور بازو کی جگہ گوشت کا لوتھڑا تھا جو لٹکتا رہتا تھا۔ اس نے جب دیکھا کہ اس انداز سے تقسیم ہو رہی ہے کہ کسی کو دو سو اونٹ، کسی کو سو، کسی کو دس اور کسی کو کچھ نہیں دیا جا رہا۔ تو اس نے مجلس میں کہا مَا عَدَلْتَ فِيْ قِسْمَتِكَ يَا مُحَمَّدُ "اے محمد! تو نے تقسیم میں ظلم کیا ہے عدل نہیں کیا۔" آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ((فَمَنْ يَّعْدِلُ اِنْ لَّمْ اَعْدِلْ)) "تو پھر اللہ تعالیٰ کی زمین پر کون انصاف کرے گا اگر میں انصاف نہیں کروں گا؟" اب پہلے تو اس کا طرزِ تخاطب دیکھو! کیا گستاخانہ ہے کہ یارسول اللہ! نہیں کہا یا نبیَّ اللہ! نہیں کہا یا حبیب اللہ! نہیں کہا۔ بغیر القاب کے صرف آپ ﷺ کا نام مبارک لیا۔ بے شک محمد آنحضرت ﷺ کا نام مبارک ہے لیکن بغیر القاب کے خالی یا محمد! کہہ کر پکارنے میں گستاخی کا پہلو نکلتا ہے۔ یارسول اللہ، یا نبی اللہ، یا حبیب اللہ میں ادب واحترام ہے۔

مثال کے طور پر میرا نام ہے محمد سرفراز۔ تو میرا نام لے کر میرے ساتھ وہ بات کریں گے جو میرے بے تکلف دوست ہوں گے یا مجھ سے عمر میں بڑے ہوں گے۔ اور اگر چھوٹوں میں سے کوئی میرا نام لے کر بات کرے گا آپ سب اس انداز کو بُرا

سمجھیں گے۔ تو یاد رکھنا! اسی طرح خالی یا محمد! کہنے میں بھی گستاخی کا پہلو ہے۔

پہلے تو اس نے اندازِ گفتگو غلط اختیار کیا اور پھر کہا کہ تو نے انصاف نہیں کیا۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ پاس موجود تھے۔ کہنے لگے حضرت! مجھے اجازت دو میں اس کا سر اتار دوں۔ اور واقعی وہ اس لائق تھا کہ اس کا سر قلم کر دیا جاتا۔ مگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا چھوڑ و کچھ نہ کہو۔ لوگ کہیں گے کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بڑے حوصلے والے بیان کیے جاتے ہیں مگر اتنا حوصلہ بھی نہیں تھا کہ اپنے خلاف ایک جملہ بھی برداشت کرتے۔ یہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نرمی کا نتیجہ تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کو کچھ نہیں کہا۔

اسی طرح قرآن پاک کے تیئیسویں [۲۳] پارے میں آتا ہے کہ کافر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ساحر اور کذاب کہتے تھے کہ یہ جادوگر اور بڑا جھوٹا ہے۔ مگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم برداشت کرتے تھے اور مسکرا کر چلے جاتے تھے۔ آج ہمیں کوئی جھوٹا کہہ کے دیکھے نا! پھر دیکھیے جاتا کہاں ہے۔ یا وہ نہیں ہے یا ہم نہیں ہیں۔

فرمایا ﴿وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا﴾ ۔ فَظ کا معنیٰ ہے سخت مزاج۔ اور اگر ہوتے آپ سخت مزاج ﴿غَلِيْظَ الْقَلْبِ﴾ سخت دل والے ﴿لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ﴾ تو یہ بھاگ جاتے تیرے آس پاس سے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس نہ بیٹھتے۔ اور ظاہر بات ہے آدمی بداخلاق، ضدی اور سخت دل ہو اور اپنی من مانی کرے تو اس کے قریب کون آئے گا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نرم مزاج، اعلیٰ اخلاق والے ہیں۔ اسی لیے غزوۂ اُحد میں جلیل القدر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے تتر بتر ہونے کے باوجود آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کوئی سرزنش نہیں فرمائی۔ البتہ دل میں رنجش کا امکان باقی تھا کہ انھوں نے خلافِ واقع عمل کیوں کیا ہے؟ اور جنگی نقطہ نظر سے بڑی غلطی کی ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے سفارش فرما دی کہ اے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! ﴿فَاعْفُ عَنْهُمْ﴾ پس تو ان کو معاف کر دے ﴿وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ﴾ اور ان کے لیے مغفرت طلب کر اللہ تعالیٰ سے کہ اے پروردگار! ان سے جو غلطی اور گناہ ہوا ہے کم فہمی کی وجہ سے ہوا ہے، بدنیتی کی وجہ سے نہیں ہوا۔ پروردگار! تو ان کو معاف فرما دے۔ ﴿وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ﴾ اور ان کے ساتھ مشورہ کر معاملات میں۔ یعنی آئندہ کوئی مسئلہ پیش آجائے تو ان کو مشورے میں شریک کرتا کہ یہ محسوس نہ کریں کہ شاید آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان سے ناراض ہیں۔ اس لیے قریب نہیں آنے دیتے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عادتِ مبارکہ تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جنگ یا دیگر معاملات میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مشورہ کر لیا کرتے تھے۔ ہاں! مشورہ کی ضرورت ان امور میں پیش آتی تھی جن میں وحی الٰہی کے ذریعے واضح حکم موجود نہیں ہوتا تھا۔ اور ایسے معاملات میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اجتہاد بھی کرتے تھے اور مشورہ بھی ہوتا تھا۔ اور یاد رکھیں! ایسی چیزیں جن کے متعلق احکامات قرآن میں نہیں ہیں، حدیث پاک میں نہیں ہیں اور اجماعِ امت سے ثابت نہیں ہیں ان کے متعلق مشورہ قیامت تک باقی رہے گا۔ اور ہر حکومت کو حق حاصل ہے کہ جو مسائل منصوص نہیں ہیں یعنی قرآن پاک سے ثابت نہیں ہیں، حدیث سے ثابت نہیں ہیں، اجماعِ امت سے ثابت نہیں ہیں ان کے متعلق آپس میں مشورہ کریں۔

حکم ہے ﴿وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ﴾ کوئی معاملہ پیش آجائے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کے ساتھ مشورہ کریں۔ حدیث پاک میں

آتا ہے جو لوگ فقیہ اور سمجھ دار ہیں ان سے مشورہ کرو۔ بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ ایک آدمی کا ذہن کسی طرف نہیں جاتا اور وہ بات دوسرے کی سمجھ میں آجاتی ہے۔ تو اس طرح مشورے کا فائدہ ہوگا اور معاملہ خوش اسلوبی کے ساتھ طے پا جائے گا۔ اور جو مسائل منصوص ہیں۔ قرآن سے ثابت ہیں، حدیث شریف سے ثابت ہیں اور اجماع امت سے ثابت ہیں، ان کے متعلق مشورے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جیسے: نماز ہے، روزہ ہے، حج ہے، زکوٰۃ ہے۔ چار عورتوں کے ساتھ نکاح کا جواز ہے یا سود کا حرام ہونا ہے۔ مثلاً: اب اگر کوئی مشورہ کرے کہ سود حرام ہے یا حلال ہے تو ایسا آدمی ملحد اور زندیق ہے۔

تو مشورہ ان چیزوں میں ہے جو منصوص نہیں ہے۔ اور مشورے کے بعد جب معاملہ طے ہو جائے ﴿فَاِذَا عَزَمْتَ﴾ پس جب تو ارادہ کر لے ﴿فَتَوَكَّلْ عَلَى اللهِ﴾ پس اللہ تعالیٰ پر توکل کر۔ سوچنے، سمجھنے اور ساتھیوں سے مشورہ کرنے کے بعد جب کسی کام کا ارادہ کر لیں تو پھر اللہ تعالیٰ کی ذات پر بھروسہ کرو ﴿اِنَّ اللهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ﴾ بے شک اللہ تعالیٰ محبت کرتا ہے توکل کرنے والوں کے ساتھ۔ کئی دفعہ بیان کر چکا ہوں کہ توکل کا یہ معنیٰ نہیں ہے کہ آدمی ہاتھ پاؤں نہ پھیلائے۔ بلکہ جو کام کرنا ہے اس کے لیے ہاتھ پاؤں مارے، محنت اور کوشش کرے اور اس کا نتیجہ رب تعالیٰ پر چھوڑ دے۔

توکل کا یہ مطلب ہے کہ خنجر تیز رکھ اپنا
پھر اس خنجر کی تیزی کو مقدر کے حوالے کر

اور اگر کام کے لیے ہاتھ پاؤں ہی نہیں ہلاتا، محنت، کوشش نہیں کرتا تو شریعت میں اس کا نام تَعَطُّل ہے۔ جس کو پنجابی میں ہڈحرامی کہتے ہیں۔

﴿اِنْ يَّنْصُرْكُمُ اللهُ﴾ اگر تمھاری مدد کرے اللہ تعالیٰ ﴿فَلَا غَالِبَ لَكُمْ﴾ پس تم پر کوئی غالب نہیں آسکتا۔ پھر تاریخ بتاتی ہے کہ موتہ کے مقام پر تین ہزار نے ایک لاکھ پر غلبہ حاصل کیا اور یرموک کے مقام پر پینتالیس ہزار [۴۵۰۰۰] نے سات لاکھ پر غلبہ پایا۔ بے شمار ایسے جہاد ہوئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی نصرت سے تھوڑے بہتوں پر غالب آئے ﴿وَاِنْ يَّخْذُلْكُمْ﴾ اور اگر اللہ تعالیٰ تمھاری مدد ختم کر دے ﴿فَمَنْ ذَا الَّذِيْ﴾ پس کون ہے وہ ذات ﴿يَنْصُرُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِهٖ﴾ جو تمھاری مدد کرے گی اللہ تعالیٰ کے بعد۔ اللہ تعالیٰ کے سوا ہے کوئی ٹھکانا؟ ہے کوئی مددگار؟ ہے کوئی مشکل کشا، حاجت روا، فریاد رس، کوئی دست گیر؟ بالکل نہیں ہے۔ ﴿وَعَلَى اللهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ﴾ اور اللہ تعالیٰ ہی کی ذات پر توکل کریں ایمان والے۔

آپ ﷺ کی امانت و دیانت کا بیان

اس سے پہلے آنحضرت ﷺ کے اخلاقِ عالی کا ذکر تھا۔ آگے فرمایا جس طرح پیغمبر کے اخلاق عالی ہیں اسی طرح وہ امین اور دیانت دار بھی ہیں۔ مالِ غنیمت کی تقسیم کے موقع پر ایک واقعہ پیش آیا تھا۔ بعض حضرات بدر کا بھی ذکر کرتے ہیں لیکن زیادہ تر اُحد کا معاملہ ہے۔ غزوۂ اُحد میں اگرچہ زیادہ تر مالِ غنیمت مسلمانوں کے ہاتھوں سے نکل گیا تھا مگر تھوڑا بہت مالِ غنیمت

مسلمانوں کے پاس رہ گیا تھا۔ اور تقسیم کے وقت منافق بھی پہنچ گئے تھے کہ شاید ہمیں بھی کچھ مل جائے۔ کسی نے کہا کہ مالِ غنیمت میں ایک عمدہ گرم کمبل تھا نظر نہیں آرہا۔ ایک منافق بے ایمان نے کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لیا ہوگا۔ بھائی! اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لینا ہوتا تو سب کے سامنے اُٹھا لیتا۔

احادیث میں موجود ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اجازت تھی کہ مالِ غنیمت میں سے جو چاہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم جو چیز پسند آئے اپنی مرضی سے لے سکتے ہیں۔ اگرچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی کوئی شے اس طرح لی نہیں ہے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس طرح چھپانے کی کیا ضرورت تھی؟

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ﴿وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّغُلَّ﴾ اور نہیں ہے لائق کسی نبی کے یہ کہ وہ خیانت کرے۔ غلول مالِ غنیمت میں سے کسی چیز کے چھپا لینے کو کہتے ہیں۔ تو نبی کی شان نہیں ہے کہ مالِ غنیمت میں سے کوئی چیز خفیہ طریقے سے لے۔ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے اجازت دی ہے کہ مالِ غنیمت میں جو چیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو پسند ہو، لے سکتے ہو۔ تو پھر اللہ تعالیٰ کے پیغمبر کو غلول کی کیا ضرورت ہے؟ معاذ اللہ تعالیٰ۔

فرمایا ﴿وَمَنْ يَّغْلُلْ﴾ اور جس نے خیانت کی ﴿يَاْتِ بِمَا غَلَّ﴾ لائے گا اس چیز کو جو اس نے خیانت کی ﴿يَوْمَ الْقِيٰمَةِ﴾ قیامت والے دن اس کی گردن پر ہوگی اور اس کا اس کو حساب دینا پڑے گا۔ وہاں تو سوئی دھاگے تک کا حساب دینا پڑے گا۔ دیکھنا! چوری کسی کی بھی کرنا گناہ ہے۔ لیکن ایک ہے شخصی چوری اور ایک ہے قومی اور جماعتی مال سے چوری۔ اس میں فرق ہے۔ اگر ایک آدمی کی چوری کی ہے ہوسکتا ہے وہ معاف کر دے۔ اور قومی اور جماعتی مال سے چوری جیسے: چندے کی چوری ہے، یہ معاملہ بڑا سخت ہے۔ کیوں کہ لوگوں کے مزاج مختلف ہیں۔ ہوسکتا ہے قیامت والے دن کوئی معاف کرے کوئی نہ کرے۔

﴿ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ﴾ پھر پورا پورا دیا جائے گا ہر نفس کو ﴿مَّا كَسَبَتْ﴾ جو اس نے کمایا ﴿وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ﴾ اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔ وہاں رتی برابر بھی کسی پر ظلم نہیں ہوگا۔ فرمایا ﴿اَفَمَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَ اللّٰهِ﴾ کیا پس وہ شخص جس نے پیروی کی اللہ تعالیٰ کی رضا کی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم مانا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کر کے رب تعالیٰ کی رضا حاصل کی ﴿كَمَنْۢ بَآءَ بِسَخَطٍ مِّنَ اللّٰهِ﴾ اس شخص کی طرح ہو جائے گا جو لوٹا اللہ تعالیٰ کی ناراضگی لے کر۔ ایک فرماں بردار ہے ایک نافرمان ہے، ایک نیک ہے ایک بد ہے، کیا یہ برابر ہو جائیں گے ﴿وَمَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ﴾ اور نافرمان کا ٹھکانا جہنم ہے ﴿وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ﴾ اور دوزخ بُرا ٹھکانا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے تمام مومنین اور مومنات کو دوزخ سے بچائے۔ ﴿هُمْ دَرَجٰتٌ﴾ ان کے درجے ہیں ﴿عِنْدَ اللّٰهِ﴾ اللہ تعالیٰ کے ہاں۔ نیکوں کے درجے اور ہیں بُروں کے درجے اور ہیں۔ پھر نیکی کے بھی درجات ہیں اور بدی کے بھی درجات ہیں۔ جس قسم کا عمل ہوگا اسی قسم کی سزا ہوگی ﴿وَاللّٰهُ بَصِيْرٌ﴾ اور اللہ تعالیٰ دیکھ رہا ہے ﴿بِمَا يَعْمَلُوْنَ﴾ اس چیز کو جو وہ عمل کرتے ہیں۔ جو کچھ وہ کر رہے ہیں سب اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے۔ اس کے علم سے کوئی چیز باہر نہیں ہے۔

﴿لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ﴾ البتہ تحقیق احسان کیا اللہ تعالیٰ نے ﴿عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ مومنوں پر ﴿اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا﴾ جب بھیجا اللہ تعالیٰ نے ان میں ایک رسول ﴿مِّنْ اَنْفُسِهِمْ﴾ ان کی جانوں میں سے ﴿يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ﴾ وہ تلاوت کرتا ہے ان پر اللہ تعالیٰ کی آیتیں ﴿وَيُزَكِّيْهِمْ﴾ اور ان کو پاک کرتا ہے ﴿وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ﴾ اور تعلیم دیتا ہے ان کو کتاب کی ﴿وَالْحِكْمَةَ﴾ اور سنت کی ﴿وَاِنْ كَانُوْا﴾ اور اگرچہ وہ تھے ﴿مِنْ قَبْلُ﴾ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد سے پہلے ﴿لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ﴾ البتہ کھلی گمراہی میں ﴿اَوَلَمَّآ اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ﴾ کیا جس وقت پہنچی تمھیں مصیبت ﴿قَدْ اَصَبْتُمْ مِّثْلَيْهَا﴾ تم پہنچا چکے تھے اس جیسی دو مصیبتیں ﴿قُلْتُمْ اَنّٰى هٰذَا﴾ تم نے کہا یہ کہاں سے آئی ہے؟ ﴿قُلْ﴾ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کہہ دیجیے ﴿هُوَ مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِكُمْ﴾ وہ تمھارے نفسوں کی طرف سے آئی ہے ﴿اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ﴾ بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے ﴿وَمَآ اَصَابَكُمْ﴾ اور وہ چیز جو تمھیں پہنچی ﴿يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ﴾ جس دن آنے سامنے آئیں دو جماعتیں ﴿فَبِاِذْنِ اللّٰهِ﴾ پس اللہ تعالیٰ کے حکم سے ﴿وَلِيَعْلَمَ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ اور تاکہ ظاہر کردے اللہ تعالیٰ مومنوں کو ﴿وَلِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ﴾ اور تاکہ ظاہر کردے ان لوگوں کو ﴿نَافَقُوْا﴾ جو منافق ہیں ﴿وَقِيْلَ لَهُمْ﴾ اور کہا گیا ان کو ﴿تَعَالَوْا قَاتِلُوْا﴾ آؤ لڑو ﴿فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ اللہ تعالیٰ کے راستے میں ﴿اَوِ ادْفَعُوْا﴾ یا دفاع کرو ﴿قَالُوْا﴾ کہنے لگے ﴿لَوْ نَعْلَمُ قِتَالًا﴾ اگر ہم جانتے لڑائی ﴿لَّاتَّبَعْنٰكُمْ﴾ البتہ ہم ضرور تمھاری پیروی کرتے ﴿هُمْ لِلْكُفْرِ﴾ وہ کفر کی طرف ﴿يَوْمَىِٕذٍ اَقْرَبُ﴾ اس دن زیادہ قریب تھے ﴿مِنْهُمْ لِلْاِيْمَانِ﴾ بہ نسبت ایمان کے ﴿يَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِهِمْ﴾ کہتے ہیں اپنے مونہوں سے ﴿مَّا لَيْسَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ﴾ وہ چیز جو ان کے دلوں میں نہیں ہے ﴿وَاللّٰهُ اَعْلَمُ﴾ اور اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے ﴿بِمَا يَكْتُمُوْنَ﴾ وہ جو چھپاتے ہیں۔

پہلے سے غزوۂ احد کا ذکر چلا آرہا ہے اور اس سے پہلی آیات میں بیان تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے بلند اخلاق والے اور نرم واقع ہوئے ہیں۔ لہٰذا اگر ساتھیوں سے کم فہمی کی بنا پر غلطی بھی ہوجائے تو درگزر فرماتے ہیں۔ اب اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میرا تم پر احسان ہے کہ میں نے ایسا شان والا پیغمبر تمھاری طرف مبعوث فرمایا ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت خدا کا احسان عظیم ہے:

ارشادِ ربانی ہے ﴿لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ﴾ البتہ تحقیق احسان کیا اللہ تعالیٰ نے ﴿عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ مومنوں پر ﴿اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا﴾ جب بھیجا اللہ تعالیٰ نے ان میں ایک رسول ﴿مِّنْ اَنْفُسِهِمْ﴾ ان کی جانوں میں سے یعنی انھی میں سے۔ اللہ تعالیٰ کا یہ

احسان کافروں پر بھی ہے کیوں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کل کائنات کے لیے پیغمبر بنا کر بھیجے گئے ہیں۔لیکن کافروں نے اس احسان سے فائدہ نہیں اُٹھایا اور مومنوں نے صحیح معنیٰ میں اس احسان سے فائدہ اُٹھایا ہے لہٰذا احسان بھی انھی پر ہے۔جس طرح قرآن پاک سب لوگوں کے لیے ہدایت ہے مگر چوں کہ فائدہ اس سے متقی حضرات اُٹھاتے ہیں اس لیے فرمایا ﴿هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ﴾ "ہدایت ہے پرہیزگاروں کے لیے۔" اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کل کائنات کے لیے رحمت ہے اور سب پر رب تعالیٰ کا انعام واحسان ہے مگر کافروں نے اس انعام اور احسان کی قدر نہیں کی اور مومنوں نے قدر کی ہے۔اور بھیجا بھی انھی میں سے۔انھی میں سے کا مطلب ہے کہ آپ انسانوں میں سے ہیں۔پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قریشی اور ہاشمی بھی ہے۔مطلب یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نہ تو ملائکہ میں سے ہیں اور نہ ہی جنات میں سے ہیں بلکہ جنسِ انسانی میں سے ہیں۔اور حقیقت یہ ہے کہ دوسری نوع اور جنس سے فائدہ نہیں اُٹھایا جاسکتا۔

بشر رسول ہی بشر کی تسلی کا سامان کرسکتا ہے

مثال کے طور پر حضرت جبرئیل علیہ السلام جو فرشتوں کے سردار ہیں۔اگر ان کو انسانوں کے لیے پیغمبر بنا کر بھیجا جاتا جن کو نہ بھوک لگتی ہے، نہ پیاس لگتی ہے، نہ گرمی، نہ سردی، نہ دکھ، نہ تکلیف۔وہ ہر چیز سے پاک ہیں۔تو ان کو انسانی ضروریات کا کیا احساس ہوتا؟ جس کو بھوک کا احساس نہیں ہے وہ روزے کا کیا حکم دیتا؟ کہ روزے رکھو۔جس کو گرمی سردی کا احساس نہیں ہے وہ کیا حکم کرے گا کہ سردیوں میں چاہے پانی ٹھنڈا ہو یا گرم، تم نے غسل بھی کرنا ہے اور وضو بھی۔جس کو بیماری کی تکلیف کا احساس ہی نہیں ہے وہ صبر کی کیا تلقین کرے گا۔جس کا باپ نہیں ہے، بیٹا نہیں ہے، بھائی نہیں ہیں، بہنیں نہیں ہیں، خالائیں اور پھوپھیاں نہیں ہیں اس کو ان کے مرنے پر دکھ اور صدمے کا کیا احساس ہوسکتا ہے؟ کہ ان کے مرنے پر انسان پر کیا گزرتی ہے؟ وہ کیا صبر کی تلقین کرے گا جب اس کو معلوم ہی نہیں ہے کہ موت کا صدمہ کیا ہوتا ہے؟ یہاں بشر ہی بشر کی تسلی کا سامان کرسکتا ہے۔جس کو ان ساری چیزوں کا احساس ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرزند حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ اُٹھارہ مہینوں کے تھے، دودھ پیتے تھے بیمار ہو گئے۔اور دوسری طرف یہ ہوا کہ مدینہ منورہ سے ایک میل کی مسافت پر ایک مقام تھا "سرار"۔آج کل وہ مدینہ طیبہ کی آبادی میں شامل ہو گیا ہے۔وہاں ایک آدمی تھا ابوالحداد۔لوہے کا کام کرتا تھا۔اس کا دودھ پیتا بچہ فوت ہو گیا اور اس کی بیوی بڑی صحت مند تھی۔دودھ اس کا وافر تھا۔اس نے اپنے خاوند کو کہا کہ ہمارا بچہ فوت ہو گیا ہے اور دودھ ضائع ہو جائے گا۔میرا خیال ہے کہ تو جا کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پیش کش کر کہ وہ اپنا بچہ دودھ پلانے کے لیے ہمیں دے دیں۔

چنانچہ اس کے خاوند نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے درخواست کی۔آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا سے مشورہ کیا کیوں کہ حضرت ابراہیم ان کے پیٹ سے تھے۔انھوں نے کہا حضرت! بالکل ٹھیک ہے۔چنانچہ ابوالحداد رضی اللہ عنہ کی بیوی بڑی

چاہت اور شوق کے ساتھ لے گئی۔ لیکن خدا کی شان کہ کچھ مدت کے بعد وہ ان کے پاس بیمار ہو گیا۔ انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اطلاع دی کہ حضرت بچے کی حالت بڑی نازک ہے آپ تشریف لائیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم چند ساتھیوں کے ہمراہ تشریف لے گئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب بچے کو اُٹھایا تو تَفْسُهٗ يَتَقَعْقَعُ اس کا سانس اکھڑ رہا تھا۔ بے اختیار آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے فرمایا حضرت! آپ تو رونے سے منع فرماتے ہیں اور اب خود رو رہے ہیں فَاَشَارَ اِلٰى لِسَانِهٖ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے زبانِ مبارک کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ میں نے جس رونے سے منع کیا ہے اس کا تعلق زبان کے ساتھ ہے۔ یعنی نوحہ، بین کرنا، واویلا کرنا منع ہے۔ دل میں صدمہ ہو اور آنکھوں سے آنسو گر رہے ہوں تو اس میں کوئی گناہ نہیں ہے۔

حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ فوت ہو گئے تو اس موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اِنَّ الْعَيْنَ تَدْمَعُ " آنکھ آنسو بہاتی ہے وَالْقَلْبَ يَحْزَنُ اور دل غمگین ہوتا ہے وَ لَا نَقُوْلُ اِلَّا مَا يَرْضٰى رَبُّنَا مگر ہم زبان سے وہی لفظ نکالتے ہیں جس سے ہمارا رب خوش ہو وَ اِنَّا بِفِرَاقِكَ لَمَحْزُوْنُوْنَ اور اے ابراہیم! بے شک ہم تیری جدائی پر بہت دکھی ہیں۔" [بخاری جلد ۱، صفحہ ۱۷۴]

ایسے موقع پر تسلی تو بشر ہی دے سکتا ہے، فرشتہ کیا تسلی دے گا؟ جس کا نہ کوئی رشتہ دار اور نہ قیامت سے پہلے کوئی موت، نہ سر درد، نہ پیٹ درد، نہ گھٹنوں میں درد، نہ ٹخنوں میں درد، اس کے سامنے کوئی جا کر ان چیزوں کا ذکر کرے تو اسے کیا احساس ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے انسانوں پر احسان فرمایا کہ بشر کو پیغمبر بنا کر بھیجا جس کے ساتھ یہ ساری ضرورتیں لگی ہوئی ہیں۔ گرمی بھی لگتی ہے، سردی بھی محسوس ہوتی ہے، تکلیف کا بھی احساس ہوتا ہے۔

ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گھٹنے میں ایسی تکلیف ہوئی کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بیٹھ کر پیشاب نہیں کر سکتے تھے، کھڑے ہو کر پیشاب کیا۔ اور بخاری شریف کی روایت میں ہے کہ ایک دفعہ دردِ شقیقہ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اتنا پریشان کیا کہ دو دن آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم گھر سے باہر تشریف نہیں لائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھوک کی وجہ سے پیٹ پر پتھر باندھے۔ ہجرت کے سفر میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو فرمایا ابوبکر! پیاس لگی ہے کہیں سے پانی تلاش کرو۔

تو انسانوں کی ہدایت کا ذریعہ وہی بنے گا جس کو یہ ساری ضرورتیں پیش آئیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دو بیویاں فوت ہوئیں، پھوپھیاں فوت ہوئیں، بیٹے فوت ہوئے، تین بیٹیاں فوت ہوئیں۔ تو انسانوں کے لیے وہی نمونہ بنے گا جس کو صدمات کا احساس ہو۔ تو اللہ تعالیٰ کا بڑا احسان ہے کہ اس نے بشر کو پیغمبر بنا کر بھیجا کوئی جن یا فرشتہ نہیں بھیجا۔ پھر چوں کہ اول مخاطبین عربی تھے اس لیے عربی بھیجا۔ اگر پیغمبر عجمی ہوتا تو وہ فائدہ نہیں اُٹھا سکتے تھے۔

اسی آیت کریمہ کے تحت علامہ سید محمود آلوسی رحمۃ اللہ علیہ جو آخری دور کے عظیم مفسر گزرے ہیں، حوالہ نقل فرماتے ہیں اور یہ حوالہ عالمگیری، بحر الرائق اور جتنی مستند کتابیں ہیں ان میں بھی موجود ہے کہ شیخ ولی الدین عراقی سے سوال کیا گیا کہ کیا یہ جاننا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بشر اور عربی ہیں صحتِ ایمان کے لیے شرط ہے یا فرضِ کفایہ ہے؟ تو انھوں نے اس کا جواب دیا کہ یہ صحت

ایمان کے لیے شرط ہے۔سو اگر کسی شخص نے یہ کہا کہ میں حضرت محمد ﷺ کی رسالت کو تمام مخلوق کے لیے مانتا ہوں لیکن میں یہ نہیں جانتا کہ آپ بشر تھے یا فرشتہ یا جن۔ یا یہ کہا کہ میں نہیں جانتا کہ آپ ﷺ عربی تھے یا عجمی؟ فَلَا شَكَّ فِيْ كُفْرِهٖ "تو اس شخص کے کفر میں کوئی شک نہیں ہے۔" کیوں کہ اس نے قرآن پاک کی تکذیب کی ہے اور اس چیز کا انکار کیا ہے جس کی خلف سلف اگلے پچھلے تمام قرون اسلام میں تلقی بالقبول کرتے رہے ہیں۔[روح المعانی جلد ۴، صفحہ ۱۰۱]

کیوں کہ اس بات کا جاننا کہ آپ ﷺ بشر تھے اور عربی تھے فرض عین ہے۔یعنی ہر مسلمان پر لازم ہے۔اور فرضِ عین کو نہ جاننا کفر ہے۔اور ایک ہوتا ہے فرضِ کفایہ کہ اس کو اگر چند آدمی بھی ادا کر دیں تو باقی بری الذمہ ہو جاتے ہیں۔جیسے نماز جنازہ ہے کہ کچھ آدمی اس فرض کو ادا کر دیں تو باقیوں پر کوئی گناہ نہیں ہے۔اسی طرح تبلیغ دین فرضِ کفایہ ہے۔اگر کچھ افراد فرض ادا کر رہے ہیں تو باقی گناہ سے فارغ ہیں۔اور جو عبادتیں فرضِ عین ہیں ان کا سمجھنا اور ادا کرنا ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے۔ جیسے: نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، حلال، حرام، یہ ضروریاتِ دین میں سے ہیں۔اور ان میں کوئی شخص بھی معذور نہیں ہے۔

رسالت مآب ﷺ کی ذمہ داریاں

آگے اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کی ڈیوٹیاں بیان فرمائی ہیں کہ آپ ﷺ کے ذمہ کام کون کون سے ہیں۔فرمایا ﴿يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ﴾ وہ تلاوت کرتا ہے ان پر اللہ تعالیٰ کی آیتیں۔یعنی ان کو قرآن مجید پڑھ کر سناتا ہے اور آیاتِ کے اول مخاطبین عربی تھے اور قرآن مجید بھی عربی زبان میں تھا۔لہٰذا اکثر آیات کا مفہوم وہ خود بہ خود سمجھ جاتے تھے۔

اور دوسری ڈیوٹی ہے ﴿وَيُزَكِّيْهِمْ﴾ اور ان کو پاک کرتا ہے۔آپ ﷺ انسان کی باطنی گندگی کو دور کرتے ہیں۔یعنی کفر، شرک، نفاق اور بد اخلاقی سے پاک کر کے ایمان، توحید، اخلاص اور اچھے اخلاق بھر دیتے ہیں۔حقیقتاً تزکیہ تو اللہ تعالیٰ کا کام ہے۔قرآن پاک میں دوسری جگہ آتا ہے ﴿وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يُزَكِّيْ مَنْ يَّشَآءُ﴾[النور:۲۱] "اور اللہ تعالیٰ پاک کرتا ہے جس کو چاہتا ہے۔"

اور آپ ﷺ کی طرف تزکیہ کی نسبت مجازی ہے۔کیوں کہ آنحضرت ﷺ سبب ہیں تزکیہ کا کہ آپ ﷺ ان کو تعلیم دیتے ہیں اور آپ ﷺ کی تعلیم اور تربیت کی برکت سے ان کے دل پاک ہو جاتے ہیں اور دلوں کا تزکیہ شرعاً مطلوب ہے۔اور جو صحیح پیری مریدی ہے، ٹھگوں کی بات نہیں کرتا ان کی بات کرتا ہوں جو صحیح معنوں میں اللہ والے ہیں۔ان کی پیری مریدی اس آیتِ کریمہ کی تشریح ہے۔جو مرشد کامل ہیں وہ اپنے مرید کی اخلاقی تربیت کریں گے، ان کو سبق دیں گے کہ تم یہ کام کرو اور فلاں کام چھوڑ دو۔ یہ وظیفہ پڑھو اور فلاں وظیفہ نہ پڑھو۔تو اللہ تعالیٰ کے صالح لوگوں کی تعلیم اور تربیت سے انسان کفر، شرک سے، رسم و رواج سے، تکبر، بغض، کینہ اور حبِ دنیا جیسی بیماریوں سے بچ جاتا ہے اور اصلاح ہو جاتی ہے۔

آنحضرت ﷺ کے صحابی حضرت حنظلہ بن سدیس رضی اللہ عنہ کے بارے میں حدیث میں آتا ہے کہ یہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو ملے تو کہنے لگے ابوبکر! میں منافق ہو گیا ہوں۔فرمایا سبحان اللہ! تو کس طرح منافق ہو گیا ہے؟ کہنے لگے اس

طرح کہ جب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مجلس میں ہوتا ہوں تو دل کی کیفیت کچھ اور ہوتی ہے اور جب گھر یا بازار جاتا ہوں تو دل کی کیفیت وہ نہیں رہتی۔ اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ میں منافق ہوں۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اس طرح کی کیفیت تو میری بھی ہے۔ لہٰذا آؤ دونوں چلتے ہیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھ لیتے ہیں۔ تو انھوں نے اپنا مسئلہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پیش کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ دلوں کی وہ کیفیت جو میری مجلس میں ہوتی ہے وہ اس کے بعد نہیں رہ سکتی۔ (کیوں کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کی جو بارش آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ہو رہی ہے وہ دوسری جگہ تو نہیں ہے اس لیے وہ کیفیت کس طرح باقی رہ سکتی ہے)۔ لہٰذا اس کیفیت کے بدلنے سے آدمی منافق نہیں ہو جاتا۔ یہ مسلم شریف کی حدیث کا خلاصہ ہے جو میں نے بیان کیا ہے۔

تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مجلس اقدس میں تھوڑی دیر بیٹھنے والے کی اتنی صفائی ہو جاتی تھی کہ ساٹھ ساٹھ سال مجاہدہ اور ریاضتیں کرنے والوں کی اتنی صفائی نہیں ہوتی۔ بزرگانِ دین نے شرعی دائرہ میں رہ کر جو چلہ کشی کی ہے اور ریاضتیں کی ہیں بعض سطحی قسم کے لوگ ان پر اعتراض کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ انھوں نے غلط کیا ہے۔ کیوں کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے چلہ کشی نہیں کی تھی۔ بھئی! ٹھیک ہے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے چلہ کشی نہیں کی مگر ان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی موجودگی میں ضرورت ہی کیا تھی۔ شیشہ صاف ہو تو اس کو صاف کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ صاف تو اس وقت کیا جاتا ہے جب اس پر میل کچیل ہو۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے شیشے ویسے ہی صاف تھے پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مجلس میں بیٹھنے سے اتنے صیقل ہو جاتے تھے کہ ساٹھ سالہ مجاہدے سے بھی وہ کیفیت حاصل نہیں ہو سکتی۔ تو ان کو مجاہدے کی کیا ضرورت تھی کہ وہ چلہ کشی کرتے۔ مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد وہ کیفیت باقی نہیں رہی۔ اس لیے دلوں کی صفائی کے لیے مجاہدہ کرنا پڑتا ہے۔

یاد رکھنا! کثرت کے ساتھ ذکر کرنے سے دلوں کی صفائی ہوتی ہے۔ لہٰذا کلمے کا ورد کرو، تیسرا کلمہ پڑھتے رہو، استغفار کرو، درود شریف پڑھو، قرآن پاک کی تلاوت کرو، قبر کو یاد کرو، آخرت کا خیال کرو، اپنی نظر کو محفوظ رکھو، اس سے دلوں کی صفائی ہوتی ہے۔ اور تزکیہ نفس شریعت میں مطلوب ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا تیسرا کام: فرمایا ﴿وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ﴾ اور تعلیم دیتا ہے ان کو کتاب کی اور حکمت کی۔ قرآن پاک اگرچہ عربی زبان میں نازل ہوا اور اس کے اولین مخاطبین بھی عربی تھے اس کے باوجود ان کو بعض دفعہ سمجھنے کی ضرورت پیش آتی تھی۔ چنانچہ پانچویں پارے میں آتا ہے ﴿مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ﴾ [النساء: ۱۲۳] "جو شخص برا عمل کرے گا اس کو اس کا بدلا دیا جائے گا۔" حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اس آیت کریمہ سے آخرت کا بدلا سمجھا کہ قبر میں عذاب ہوگا، دوزخ کی سزا ہوگی۔ تو انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سوال کیا کہ حضرت! ہم میں سے کون سا ایسا آدمی ہے کہ جس سے کوئی نہ کوئی خطا نہ ہوئی ہو۔ کیوں کہ معصوم تو صرف انبیاء ہیں۔ پھر تو کوئی بھی نہیں بچ سکتا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اے ابوبکر! اس بدلے سے جو تو سمجھا ہے کہ آخرت کی سزا ہوگی، قبر میں مار کٹائی ہوگی یہ مراد نہیں ہے۔ بلکہ مومنوں کو اس کا بدلا دنیا ہی میں دے دیا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ جب مومن اللہ تعالیٰ سے ملاقات کریں گے

تو ان پر کوئی گناہ نہیں ہوگا۔ مطلب یہ ہے کہ مومنوں کو دنیا میں جو تکلیفیں آتی ہیں وہ ان کے گناہوں کا کفارہ بن جاتی ہیں (سبحان اللہ)۔ مثلاً: سر درد ہے، پیٹ درد ہے، ناک میں تکلیف ہے، گھٹنوں میں درد ہو گیا ہے، ٹخنوں میں درد ہو گیا، اور کوئی تکلیف ہوگئی، کوئی صدمہ پیش آگیا، جیب میں رقم تھی، گر گئی پھر ملی نہیں۔ یہاں تک کہ گرمی سردی بھی مسلمانوں کے گناہوں کا کفارہ ہیں۔ کیوں کہ ان میں بھی تکلیف ہوتی ہے۔ تو مسلمانوں کو دنیا ہی میں بدلا دے دیا جاتا ہے۔ یہ خلاصہ ہے ترمذی شریف کی روایت کا۔ تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ جیسی شخصیت آیتِ کریمہ کا صحیح مفہوم نہیں سمجھ سکی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وضاحت فرمائی تو سمجھ آیا کہ یہ مطلب ہے۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ حضرت! آپ نے فرمایا ہے ((مَنْ نُوْقِشَ فِي الْحِسَابِ عُذِّبَ)) "کہ جس سے صحیح معنیٰ میں حساب لے لیا اس کی خیر نہیں ہے۔" اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ﴿فَسَوْفَ يُحَاسَبُ حِسَابًا يَّسِيْرًا﴾ [پارہ: ۳۰] "پس عنقریب اس سے آسان حساب لیا جائے گا۔" یعنی مومنوں کا حساب آسان ہوگا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا عائشہ! ان دونوں باتوں کا آپس میں کوئی ٹکراؤ نہیں ہے۔ آیتِ کریمہ کا مفہوم یہ ہے کہ مومنوں کا حساب سرسری اور آسان ہوگا۔ وہ یہ ہے کہ حساب کتاب کا اللہ تعالیٰ کے حضور پیش ہو جانا ہی عرض اور یہی حسابِ یسیر ہے۔ اور میں نے کہا کہ جس سے پوچھ لیا گیا، مناقشہ ہوا، حساب میں باریکی ہوئی تو ایسا شخص بچ نہیں سکے گا۔ آسان حساب یہ ہے کہ بس حساب پیش کیا گیا کچھ تعرض نہ فرمایا جان بچ گئی۔

تو سرسری حساب اور چیز ہے اور پورا پورا حساب اور چیز ہے۔ تو ام المومنین رضی اللہ عنہا کو آیت سمجھنا پڑی۔ اسی طرح ساتواں پارہ سورۃ انعام میں آتا ہے ﴿اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يَلْبِسُوْٓا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْاَمْنُ وَهُمْ مُّهْتَدُوْنَ﴾ "وہ لوگ جو ایمان لائے اور نہیں ملایا انھوں نے اپنے ایمانوں کو ظلم کے ساتھ یہی لوگ ہیں جن کے لیے امن ہوگا اور یہی ہدایت یافتہ لوگ ہیں۔" بخاری شریف میں روایت ہے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے سوال کیا اَيُّنَا لَمْ يَظْلِمْ نَفْسَهٗ "ہم میں سے کون ایسا شخص ہے جس نے اپنی جان پر زیادتی نہیں کی؟" ظلم کا معنیٰ ہے زیادتی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس مقام پر ظلم سے مراد وہ نہیں ہے جو تم سمجھے ہو کہ زبانی طور پر کسی سے زیادتی ہوگئی یا ہاتھ سے ہوگئی، قلم کے ساتھ کسی سے زیادتی ہوگئی۔ ہیں یہ بھی زیادتیاں مگر اس مقام پر ظلم سے مراد شرک ہے۔ تو آیتِ کریمہ کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ لوگ جو ایمان لائے اور اپنے ایمانوں کے ساتھ شرک کی ذرہ بھر ملاوٹ نہیں کی ان کو امن نصیب ہوگا اور یہی لوگ ہدایت یافتہ ہیں۔ جیسا کہ حضرت لقمان بن باعور بن ناحور رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے بیٹے ساران رحمۃ اللہ علیہ کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا ﴿يٰبُنَيَّ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ ۗ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ﴾ [لقمان: ۱۳] "اے میرے پیارے بیٹے! اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک نہ کرنا بے شک شرک بڑا ظلم ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ظلم سے مراد شرک ہے۔"

تو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو بھی کچھ آیتیں سمجھ نہیں آتی تھیں باوجود عربی ہونے کے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کو سمجھاتے تھے۔ چہ جائیکہ آج چودھویں [۱۴] صدی میں کوئی دعویٰ کرے کہ مجھے قرآن پاک سمجھنے کے لیے نہ حدیث کی ضرورت ہے، نہ

کسی صحابی کی، نہ تابعی کی، نہ کسی فقیہ اور امام اور محدث کی ضرورت ہے۔ میں خود قرآن پاک کو سمجھتا ہوں۔ ایسا شخص پرلے درجے کا ملحد اور بے دین ہے۔ یاد رکھنا! قرآن پاک کی وہ تفسیر معتبر ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی ہے یا جو تفسیر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین نے کی ہے، تابعین نے یا تبع تابعین نے کی ہے اور ائمہ دین نے کی ہے یا فقہائے کرام نے کی ہے اور مفسرین رحمہم اللہ علیہم نے کی ہے۔ ان بزرگوں پر اعتماد کرو۔ اپنی طرف سے کوئی بات نہ کرو۔

یہ جتنے باطل فرقے گمراہ ہوئے ہیں اسی وجہ سے ہوئے ہیں کہ انھوں نے قرآن پاک کی تفسیر اپنی رائے سے کی ہے۔ غلام احمد پرویز ملحد اور بے دین آدمی تھا۔ اس نے چار جلدوں میں قرآن مجید کی تفسیر لکھی ہے۔ جس کا نام "معارف القرآن" رکھا ہے۔ چوں کہ وہ اردو ادب کا بڑا ماہر تھا اس واسطے اردو ادب والے اس کو بڑے شوق سے پڑھتے ہیں۔ لیکن یاد رکھنا! اس میں بڑا کفر بھرا ہوا ہے۔ اور اس کا دعویٰ ہے کہ آج تک میرے سوا کسی نے قرآن کریم کو نہیں سمجھا۔ اور اس کی حیثیت یہ ہے کہ ساری زندگی انگریز کے بوٹ صاف کرتا رہا ہے۔ کیوں کہ سرکاری ملازم تھا۔ اور اس کا خاص ملازم جو کافی مدت تک اس کے پاس رہا ہے اس نے مجھے خود یہ بات بتائی ہے کہ ڈاڑھی منڈواتا تھا اور روزے نہیں رکھتا تھا۔ اور کہتا تھا کہ آج تک جتنی تفسیریں لکھی گئی ہیں وہ ساری غلط ہیں سوائے میری تفسیر کے۔

اس کی تفسیر کے زیادہ نہیں صرف ایک حوالہ پیش کرتا ہوں۔ وہ کہتا ہے کہ "سائنس اگر ثابت بھی کر دے کہ چند منٹوں، سیکنڈوں میں کوئی آدمی چاند پر جا بھی سکتا ہے اور واپس بھی آسکتا ہے میں پھر بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جسمانی معراج کو تسلیم نہیں کروں گا۔" یہ ہے اس کی تفسیر۔

نوجوانو یاد رکھو! ہر تفسیر کو تفسیر نہ سمجھو۔ سلف صالحین کا دامن نہ چھوڑو۔ مودودی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اپنی تفسیر اور دیگر کتابوں میں بہت ساری غلط باتیں لکھی ہیں۔ علماء کی ان پر تنقید بے جا نہیں ہے۔ اگر زندگی رہی تو باقی کل بیان کروں گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

کل کے درس میں آپ نے پہلی آیتِ کریمہ کے چند جملوں کی تشریح سنی ﴿لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ﴾ البتہ تحقیق احسان کیا اللہ تعالیٰ نے مومنوں پر جب بھیجا اللہ تعالیٰ نے ان میں سے ایک رسول ان کی جانوں میں سے۔ اگرچہ اللہ تعالیٰ کا یہ احسان تمام کائنات کے لیے ہے۔ جنات کے لیے، انسانوں کے لیے، عربی، عجمی سب کے لیے ہے لیکن چوں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم سے فائدہ صرف مومنوں نے اٹھایا ہے اس لیے مومنوں کی تخصیص فرمائی۔ اور بھیجا بھی انھی میں سے۔ یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم انسان ہیں، بشر ہیں۔ مگر شان اور مرتبہ اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ عطاء فرمایا کہ مخلوق میں سے کسی کو حاصل نہیں ہے۔ نہ جنوں کو، نہ انسانوں کو، نہ فرشتوں کو۔ ان سب سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا درجہ بہت بلند ہے۔ یہ بنیادی عقیدہ ہے اس کو یاد رکھنا بھولنا نہیں۔ اور کام آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چار تھے۔

❀ پہلا کام: ﴿یَتۡلُوۡا عَلَیۡہِمۡ اٰیٰتِہٖ﴾ کہ وہ ان کو اللہ تعالیٰ کا قرآن پڑھ کے سناتے ہیں۔ سننے والے چوں کہ عربی تھے اس لیے اکثر آیتوں کا مطلب خود بہ خود سمجھ جاتے تھے۔

❀ دوسرا کام: ﴿وَیُزَکِّیۡہِمۡ﴾ اور ان کو پاک کرتے ہیں۔ اور یہ بات کل کے درس میں بیان ہو چکی ہے کہ حقیقتاً تزکیہ اللہ تعالیٰ کا کام ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم سبب ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کی برکت سے اور اخلاقِ حسنہ کی برکت سے لوگوں کے دلوں کی صفائی ہوتی ہے۔

❀ تیسرا کام: ﴿وَیُعَلِّمُہُمُ الۡکِتٰبَ﴾ اور اللہ کا نبی تعلیم دیتا ہے ان کو کتاب کی۔ اللہ تعالیٰ کی کتاب کی تعلیم بہت بلند کام ہے۔ ابن ماجہ کی حدیث میں کئی دفعہ بیان کر چکا ہوں کہ ایک آدمی سو نفل پڑھتا ہے (اور سو نفل پڑھنے میں خاصا وقت لگتا ہے)۔ اور ایک آدمی قرآن شریف کی ایک آیت پڑھتا ہے تو ایک آیت پڑھنے کا ثواب سو نفل پڑھنے سے زیادہ ہے۔ اور دوسری حدیث میں ہے کہ ایک آدمی ہزار نفل پڑھتا ہے (اور اگر رات لمبی ہو تو ایک ہزار نفل اکٹھے پڑھ سکے گا)۔ اور ایک آدمی قرآن کریم کی ایک آیت ترجمہ کے ساتھ سیکھتا ہے تو اس کا ثواب ہزار نفل پڑھنے والے سے زیادہ ہے۔ تو قرآن کریم کی تعلیم، اس کو سمجھنا، سمجھانا بہت بڑی عبادت ہے۔

❀ آپ کا چوتھا کام: ﴿وَالۡحِکۡمَۃَ﴾ اور سنت کی تعلیم دیتے ہیں۔ حکمت سے مراد ہے سنت اور حدیث۔

اکثر محدثین کرام رحمہم اللہ علیہم فرماتے ہیں کہ سنت اور حدیث کا ایک ہی معنیٰ ہے۔ اور بعض حضرات نے سنت اور حدیث میں فرق کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ جو بات آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے زبان سے فرمائی ہے وہ حدیث ہے اور جو کام آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عملی طور پر کیا ہے وہ سنت ہے۔ لیکن نوے فیصد محدثین کرام رحمہم اللہ علیہم فرماتے ہیں کہ سنت اور حدیث کا ایک ہی معنیٰ ہے۔ تو حکمت سے مراد سنت اور حدیث۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو حدیث کے الفاظ بیان فرمائے ہیں اور ان کا مطلب اور تشریح بھی بیان فرمائی ہے۔ اس لیے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین عربی ہونے کے باوجود بعض احادیث کا صحیح مفہوم نہیں سمجھ سکتے تھے۔ سمجھانے کے لیے میں دو تین باتیں عرض کرتا ہوں۔

①...... مسلم شریف میں حدیث ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس آدمی کے دل میں رائی برابر بھی تکبر ہوگا وہ جنت میں نہیں جائے گا ((لَا یَدۡخُلُ الۡجَنَّۃَ مَنۡ کَانَ فِیۡ قَلۡبِہٖ حَبَّۃُ خَرۡدَلٍ مِنۡ کِبۡرٍ)) "نہیں داخل ہوگا جنت میں وہ شخص جس کے دل میں رائی کے دانے کے برابر بھی تکبر ہوگا۔" صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے جب یہ حدیث سنی تو پریشان ہو گئے اور تکبر کا معنیٰ یہ سمجھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ حضرت! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جس شخص کے دل میں رائی کے دانے کے برابر بھی تکبر ہوگا وہ جنت میں نہیں جائے گا۔ پھر تو کوئی بھی جنت میں داخل نہیں ہوگا۔ کیوں کہ سارے ہی تکبر کرتے ہیں۔ ہم میں سے کون ہے جو تکبر سے بچا ہوا ہے۔ اس لیے کہ کُنَّا نُحِبُّ اَنۡ یَّکُوۡنَ ثَوۡبُہٗ حَسَنًا "ہم سب پسند کرتے ہیں کہ ہمارے کپڑے اچھے ہوں وَ شَعۡرُہٗ حَسَنًا اور اس کے بال اچھے ہوں۔ یعنی پٹے رکھے ہوئے ہوں اور ان پر تیل لگا ہوا ہو، کنگھی کی

ہوئی ہو۔" اور مسند احمد کی روایت میں ہے اَنْ يَّكُوْنَ نَعْلُهٗ حَسَنًا "ہر آدمی چاہتا ہے کہ اس کا جوتا اچھا ہو۔" یعنی طبعی طور پر پسند کرتا ہے کہ اس کا لباس اچھا ہو، وضع قطع اچھی ہو، جوتا اچھا ہو۔ اس طرح تو ہم سارے تکبر میں پھنسے ہوئے ہیں۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ جس کو تم تکبر سمجھتے ہو یہ تکبر نہیں ہے۔ یہ تو تَجَمُّل ہے، خوب صورتی ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ جَمِيْلٌ وَ يُحِبُّ الْجَمَالَ "بے شک اللہ تعالیٰ خوب صورت ہے اور خوب صورتی کو پسند کرتا ہے۔"

مسئلہ یہ ہے کہ شرعی دائرے میں رہ کر اچھا ستھرا لباس پہننا اور نفیس اور قیمتی جوتا پہننا تکبر نہیں ہے۔ بلکہ اگر کسی شخص کو اللہ تعالیٰ نے توفیق عطاء فرمائی ہے کہ اس کی مالی پوزیشن اچھی ہے اور وہ اپنی حیثیت کے مطابق کپڑا اور جوتا نہیں پہنتا تو گناہ گار ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو توفیق عطاء فرمائی ہے اور یہ اپنی حیثیت کے مطابق کپڑے نہیں پہنتا، میلا کچیلا رہتا ہے، ناشکرا ہے۔ شریعت اس کو پسند نہیں کرتی۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے سوال کیا حضرت! پھر تکبر کسے کہتے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ((بَطَرُ الْحَقِّ وَ غَمْطُ النَّاسِ)) "حق کی بات کو ٹھکرا دینا اور لوگوں کو حقیر سمجھنا تکبر ہے۔" مثلاً: چھوٹی قوم کا کوئی غریب آدمی وڈیرے کو کوئی بات کہے اور وڈیرہ کہے کہ کمی ہو کر مجھے بات سمجھاتا ہے۔ یا بیٹا باپ کو کوئی بات کہے اور وہ کہے کہ بیٹا ہو کر مجھے سمجھاتا ہے۔ یا شاگرد استاذ کو کوئی بات کہے اور استاذ کہے کہ شاگرد ہو کر مجھے سمجھاتا ہے۔ یہ تکبر ہے۔ یا مرید پیر کو کوئی حق بات کہے اور وہ کہے کہ مرید ہو کر مجھے سمجھاتا ہے۔

یا ویسے ہی دوسروں کو حقیر سمجھتا ہے۔ بھائی! تجھے کیا معلوم کہ اس کا قد چھوٹا ہے اور اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کا درجہ بڑا ہو اور تیرا قد بڑا ہے اور اللہ تعالیٰ کے ہاں تیرا درجہ چھوٹا ہو۔ اسی طرح کسی کو حقیر سمجھنا تکبر ہے۔ یا گورا کالے کو حقیر سمجھے۔ ہوسکتا ہے کہ ظاہری طور پر اس کا رنگ کالا ہے اور باطن گورا ہو اور تیرا ظاہری طور پر رنگ گورا ہے اور اندرونی طور پر کالا ہو۔ یہ تو رب تعالیٰ جانتا ہے۔

جیسے: حضرت بلال رضی اللہ عنہ رنگ کے کالے تھے اندر روشن تھا۔ اللہ اور رسول ﷺ کے محبوب تھے۔ اور عبد العزیٰ ابولہب آپ ﷺ کا حقیقی چچا تھا اور بڑا خوب صورت تھا لیکن اندر سیاہ تھا۔ دوزخ کا ایندھن بنا۔ تو جو تکبر کرے گا جنت میں داخل نہیں ہوسکے گا۔ لیکن اس میں بھی تفصیل ہے۔ اگر وہ تکبر کو حلال سمجھ کر کرتا ہے تو کفر ہے۔ لہٰذا کبھی جنت میں داخل نہیں ہوسکے گا۔ اور اگر تکبر کو حرام سمجھتا ہے مگر کرتا ہے تو گناہ گار ہے۔ پھر لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ کا مطلب ہوگا کہ اس کو دخولِ اول نصیب نہیں ہوگا۔ سزا بھگتنے کے بعد کبھی نہ کبھی جنت میں داخل ہو جائے گا۔

تو دیکھو! صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تکبر کا مفہوم نہ سمجھ سکے۔ آنحضرت ﷺ نے سمجھایا تو سمجھ آیا۔ اسی طرح بخاری شریف، مسلم اور دیگر صحاح ستہ کی کتابوں میں حدیث آتی ہے۔ کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ انسان کے جسم میں تین سو ساٹھ جوڑ ہیں اور ہر جوڑ پر روزانہ صدقہ واجب ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے حیران اور غمگین ہو کر پوچھا وَ مَنْ يُّطِيْقُ ذٰلِكَ "حضرت! اس

کی طاقت کون رکھتا ہے؟" کہ روزانہ تین سو ساٹھ صدقے ادا کرے۔

مثال کے طور پر ایک روپیہ کے سو پیسے ہیں۔ اگرچہ اب روپے کی بھی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ ایک وقت تھا بچے کو ایک آنہ ملتا تھا تو وہ لڈی ڈالتا (خوشی سے اُچھلتا کودتا) تھا کہ مجھے آنہ ملا ہے۔ اور اب اٹھنی، روپیہ دو تو پھینک دیتا ہے کہ اس کا کچھ نہیں ملتا۔ مگر میں سمجھانے کے لیے کہتا ہوں کہ اگر کوئی ایک جوڑ کے بدلے ایک پیسہ بھی صدقہ کرے تو روزانہ کے تین روپے ساٹھ پیسے بنتے ہیں۔ اور غریب آدمی یہ بھی نہیں کر سکتا۔

تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پریشان ہو کر سوال کیا کہ حضرت! اس کی کون طاقت رکھتا ہے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم صدقے کا مفہوم نہیں سمجھے۔ فرمایا صدقہ صرف گندم، چنے ہی دینے کا نام نہیں ہے۔ اگرچہ یہ بھی صدقہ ہے۔ فرمایا جنس کے علاوہ صدقے کی اور بڑی قسمیں ہیں۔

فرمایا تم ایک دفعہ کہو سبحان اللہ! صدقہ ادا ہو گیا، الحمد للہ! کہو صدقہ ادا ہو گیا، لا الٰہ الا اللہ کہو صدقہ ادا ہو گیا، اللہ اکبر! کہو صدقہ ادا ہو گیا۔ سلام کا جواب دیا صدقہ ادا ہو گیا، تمھیں کوئی تکلیف پہنچی مثلاً: پاؤں میں کانٹا چبھ گیا، ٹھوکر لگ گئی، صدقہ ادا ہو گیا، راستے پر پانی کی وجہ سے کیچڑ بن گیا ہے تم نے مٹی ڈال کر راستہ صاف کر دیا تا کہ آنے جانے والوں کو کوئی تکلیف نہ ہو، نہ کوئی پھسلے، صدقہ ادا ہو گیا۔ درود شریف پڑھا، اس کے ساتھ دس نیکیاں بھی مل گئیں اور اس کے ساتھ صدقہ بھی ادا ہو گیا۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر عمل کیا یعنی لوگوں کو نیکی کا کہا کہ بھئی! نماز پڑھا کرو، روزہ رکھا کرو۔ لوگوں کے ساتھ اخلاق سے ساتھ پیش آؤ اور برائی سے منع کیا۔ کہ جھوٹ نہ بولو، کسی کی غیبت نہ کرو، صدقہ ادا ہو گیا۔ اسی طرح کوئی آدمی گھوڑے پر سوار ہو، چاہتا ہے لیکن ہو نہیں سکتا آپ اسے سہارا دے کر سوار کر دیں یہ بھی صدقہ ہے۔ وزنی سامان کی گٹھڑی ہے خود اُٹھا کر سر پہ نہیں رہ سکتا تم نے رکھوا دی، یہ بھی صدقہ ہے۔ یا سر سے نیچے اُتروا دی، یہ بھی صدقہ ہے۔ اور اگر کوئی آدمی چاہتا ہے کہ ایک ہی کام میں تین سو ساٹھ صدقے آ جائیں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ چاشت کے دو نفل پڑھ لے تو تین سو ساٹھ صدقے اس میں آ گئے۔ اور آج کل چاشت کا وقت تقریباً آٹھ بجے سے لے کر ساڑھے گیارہ بجے تک رہتا ہے۔ اگر کوئی کرنا چاہے تو بہت کچھ کر سکتا ہے۔ حدیث پاک میں آتا ہے کہ جو شخص فجر کی نماز پڑھے اور پھر اپنے وقت میں دو رکعت اشراق کے پڑھے اس کو پورے حج کا ثواب ملے گا اور پورے عمرے کا ثواب ملے گا۔ روایت ہے ترمذی شریف کی۔

اور یاد رکھنا! یہ کوئی ضروری نہیں کہ تم فجر پڑھ کر اشراق کے لیے مسجد ہی میں بیٹھے رہو۔ اگر کوئی کاروباری ہے، مسجد میں نہیں بیٹھ سکتا، چلا جائے گھر جا کے پڑھ لے۔ جہاں کاروبار کرتا ہے وہاں جا کر پڑھ لے۔ اسی طرح اگر کوئی ملازم ہے اپنے دفتر میں جا کر پڑھ لے۔ دکان دار ہے دکان میں جا کر پڑھ لے۔ اور یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ اشراق اسی وضو کے ساتھ پڑھے کہ جس کے ساتھ فجر پڑھی ہے۔ انسان، انسان ہے کسی کو معدے کی تکلیف ہوتی ہے، کسی کو پیشاب کی تکلیف ہوتی ہے، بار بار پیشاب آتا ہے۔ بعض لوگ غلط فہمی کا شکار ہیں کہ اشراق کے لیے مسجد میں بیٹھنا چاہیے اور وضو بھی فجر والا ہو۔ یاد رکھنا! یہ کوئی شرعی

مسئلہ نہیں ہے۔

تو خیر اللہ تعالیٰ کے خزانے میں تو کوئی کمی نہیں ہے، کمی ہمارے اندر ہے۔ رب تعالیٰ کی رحمت بڑی وسیع ہے۔ تو دیکھو! صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین صدقے کا مفہوم نہ سمجھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سمجھایا کہ صدقہ صرف جنس کا نام نہیں ہے صدقے کے اور بھی بڑے طریقے ہیں۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کتاب کی بھی تعلیم دی، سنت کی بھی تعلیم دی۔ ﴿وَاِنْ كَانُوْا﴾ اور بے شک وہ تھے ﴿مِنْ قَبْلُ﴾ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد سے پہلے ﴿لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ﴾ البتہ کھلی گمراہی میں۔ جگہ جگہ بت رکھے ہوئے تھے۔ حتیٰ کہ بیت اللہ میں تین سو ساٹھ بت رکھے ہوئے تھے۔ پوری قوم شرک کی لعنت میں گرفتار تھی، سوائے اکا دکا کے۔

اور اخلاقیات کی بھی یہی پوزیشن تھی جو آج کل ہے۔ قتل، اغوا، لوٹ کھسوٹ، بدکاری، بدمعاشی آج کل کی طرح تھی۔ ہم نے امن کا زمانہ دیکھا ہے۔ حقیقت پوچھو تو لوگ یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ ان کی حکومت سے انگریز کی حکومت اچھی تھی کہ کم از کم جان تو محفوظ تھی۔ آج کل تو کسی کی جان بھی محفوظ نہیں ہے۔ آج یہ لٹیرے ساری دولت کھا گئے ہیں اور عوام رو رہے ہیں۔

اگلی آیات کا تعلق بھی غزوۂ احد کے ساتھ ہے۔ اس جنگ میں مسلمانوں کی کوتاہی کی وجہ سے کافی نقصان اٹھانا پڑا۔ فتح شکست میں تبدیل ہوگئی، ستر مسلمان شہید ہوئے اور بہت سے زخمی ہوئے۔ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جسم اقدس پر چوٹیں آئیں۔ تو اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو تسلی دی۔ فرمایا ﴿اَوَلَمَّآ اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ﴾ کیا جس وقت پہنچی تمھیں مصیبت۔ اُحد کے میدان میں کہ ستر آدمی تمھارے شہید ہوئے اور باقی زخمی ہوئے ﴿قَدْ اَصَبْتُمْ مِّثْلَيْهَا﴾ تم پہنچا چکے تھے اس جیسی دو مصیبتیں بدر میں کہ ان کے ستر آدمی مارے اور ستر گرفتار کیے۔ اور اب احد میں تمھیں پہنچی ہے تو ﴿قُلْتُمْ اَنّٰى هٰذَا﴾ تم نے کہا یہ کہاں سے آئی ہے؟ ﴿قُلْ﴾ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کہہ دیجیے ﴿هُوَ مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِكُمْ﴾ وہ تمھارے نفسوں کی طرف سے آئی ہے۔ جس کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پچاس آدمیوں کو حضرت عبد اللہ بن جبیر رضی اللہ عنہ کی امارت میں ایک اہم مورچے جبلِ رُماۃ پر بٹھایا تھا اور فرمایا کہ ہمیں فتح ہو یا شکست تم نے اس مورچے کو نہیں چھوڑنا۔ مگر ان سے غلطی ہوگئی کہ مورچہ چھوڑ دیا۔ اللہ تعالیٰ کے پیغمبر کی نافرمانی ہوئی اور اس کے نتیجہ میں یہ تکلیف آئی ﴿اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ﴾ بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔

﴿وَمَآ اَصَابَكُمْ﴾ اور وہ چیز جو تمھیں پہنچی ﴿يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ﴾ جس دن آمنے سامنے آئیں دو جماعتیں کہ فتح شکست میں تبدیل ہوگئی اور مالِ غنیمت بھی تمھارے ہاتھ سے نکل گیا ﴿فَبِاِذْنِ اللّٰهِ﴾ پس اللہ تعالیٰ کے حکم سے ﴿وَلِيَعْلَمَ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ اور تاکہ ظاہر کردے اللہ تعالیٰ مومنوں کو ﴿وَلِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ﴾ اور تاکہ ظاہر کردے ان لوگوں کو ﴿نَافَقُوْا﴾ جو منافق ہیں ایمان والوں سے۔ کیوں کہ سختی نہ آئے تو جھوٹے سچے خلط ملط رہتے ہیں۔ مخلص غیر مخلص کا پتا نہیں چلتا۔ اور سختی کے موقع پر معلوم ہوجاتا ہے کہ مخلص لوگ نکھر کر سامنے آجاتے ہیں۔

﴿وَقِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا قَاتِلُوْا﴾ اور کہا گیا ان کو آؤ لڑو ﴿فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ اللہ تعالیٰ کے راستے میں۔ اور اگر لڑنا نہیں چاہتے تو ﴿اَوِ ادْفَعُوْا﴾ یا دفاع کرو۔ حملہ ہو چکا ہے جانیں تو بچاؤ نا! ﴿قَالُوْا﴾ کہنے لگے ﴿لَوْ نَعْلَمُ قِتَالًا﴾ اگر ہم جانتے لڑائی۔ یعنی

ہم یہ سمجھیں کہ یہ لڑائی ہے ﴿لَّا اتَّبَعْنٰكُمْ﴾ البتہ ہم ضرور تمھاری پیروی کرتے ، تمھارا ساتھ دیتے ۔ یہ کوئی لڑائی تھوڑی ہے یہ تو سیدھا موت کے منہ میں جانا ہے کہ یہ تھوڑے سے آدمی بھلا ساری دنیا کا مقابلہ کر سکتے ہیں؟ ﴿هُمْ لِلْكُفْرِ يَوْمَئِذٍ اَقْرَبُ﴾ وہ کفر کی طرف اس دن زیادہ قریب تھے ﴿مِنْهُمْ لِلْاِيْمَانِ﴾ بہ نسبت ایمان کے ۔ یعنی زبان سے ایمان کا دعویٰ کرتے تھے لیکن دل کافروں کے ساتھ ۔ اور بات تو دل کی ہوتی ہے ، زبان کا کیا ہے ، دو تولے کی زبان جدھر چاہو پھیر لو ۔

﴿يَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِهِمْ مَّا لَيْسَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ﴾ کہتے ہیں اپنے مونہوں سے وہ چیز جو ان کے دلوں میں نہیں ہے ۔ زبان سے کلمہ پڑھتے ہیں اور مسلمانوں کی حمایت کا دم بھرتے ہیں مگر دل میں نفاق بھرا ہوا ہے اور چاہتے ہیں کہ مسلمان ختم ہو جائیں ۔ مسلمانوں کے ساتھ اپنے مونہوں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں بڑی واہی تباہی باتیں کرتے ہیں ﴿وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يَكْتُمُوْنَ﴾ اور اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے وہ جو چھپاتے ہیں ۔ ان کی ساری حقیقت رب تعالیٰ کو بہ خوبی معلوم ہے ۔ اس کے علم سے کوئی چیز باہر نہیں ہے ۔

﴿اَلَّذِيْنَ﴾ وہ لوگ (کفر کے زیادہ قریب ہیں) ﴿قَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ﴾ جنھوں نے کہا اپنے بھائیوں کے بارے میں ﴿وَقَعَدُوْا﴾ اور خود جہاد سے بیٹھے رہے ﴿لَوْ اَطَاعُوْنَا﴾ اگر وہ ہماری بات مان لیتے ﴿مَا قُتِلُوْا﴾ نہ قتل کیے جاتے ﴿قُلْ فَادْرَءُوْا﴾ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کہہ دیجیے! پس تم ٹال دو ﴿عَنْ اَنْفُسِكُمُ الْمَوْتَ﴾ اپنی جانوں سے موت ﴿اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ﴾ اگر ہو تم سچے ﴿وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ﴾ اور ہرگز نہ خیال کرنا ان لوگوں کے بارے میں ﴿قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ جو قتل کیے گئے اللہ تعالیٰ کے راستے میں ﴿اَمْوَاتًا﴾ مردے ﴿بَلْ اَحْيَاءٌ﴾ بلکہ وہ زندہ ہیں ﴿عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ﴾ اپنے رب کے ہاں ان کو رزق دیا جاتا ہے ﴿فَرِحِيْنَ﴾ خوش ہیں ﴿بِمَا اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ﴾ ان نعمتوں پر جو ان کو اللہ تعالیٰ نے دی ہیں ﴿مِنْ فَضْلِهٖ﴾ اپنے فضل سے ﴿وَيَسْتَبْشِرُوْنَ﴾ اور خوشی مناتے ہیں ﴿بِالَّذِيْنَ﴾ ان لوگوں کے بارے میں ﴿لَمْ يَلْحَقُوْا بِهِمْ﴾ جو ابھی تک ان کو نہیں ملے ﴿مِّنْ خَلْفِهِمْ﴾ ان کے پچھلوں سے ﴿اَلَّا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ﴾ یہ کہ نہ خوف ہوگا ان پر ﴿وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ﴾ اور نہ وہ غمگین ہوں گے ﴿يَسْتَبْشِرُوْنَ﴾ خوشی مناتے ہیں ﴿بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ﴾ اللہ تعالیٰ کی نعمت کے ساتھ ﴿وَفَضْلٍ﴾ اور اللہ تعالیٰ کے فضل کے ساتھ ﴿وَّاَنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ﴾ اور بے شک اللہ تعالیٰ نہیں ضائع کرتا ﴿اَجْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ ایمان والوں کا اجر ۔

موت سے کسی کو مفر نہیں:

پہلے سے غزوۂ احد کا ذکر چلا آ رہا ہے ۔ مجاہدین اسلام جس وقت ہتھیار لے کر اپنے گھروں سے چلنے لگے تو منافقوں

نے ان کو روکنے کی بڑی کوشش کی کہ موت کے منہ میں نہ جاؤ۔ اس لیے کہ گزشتہ سال تم نے ان کے ستر مارے اور ستر قید کیے ان کو اس کا بڑا غصہ ہے۔ قریشی بڑی تعداد میں لشکر لے کر آئے ہوئے ہیں اور ان کے ساتھ ان کے حمایتی بھی ہیں۔ وہ تم سے پچھلے سال کا بدلا لیں گے۔ یہ منافق چوں کہ مسلمانوں کے رشتہ دار تھے کوئی کسی کا باپ، کسی کا بھائی تھا، کوئی کسی کا سالا تھا، کسی کا بہنوئی تھا، اس لیے روکنے کی پوری کوشش کی۔ تو ان منافقوں کا ذکر ہے۔

فرمایا ﴿اَلَّذِیْنَ﴾ وہ منافق کفر کے زیادہ قریب ہیں ﴿قَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ﴾ جنھوں نے کہا اپنے بھائیوں کو۔ کیوں کہ وہ آپس میں رشتہ دار تھے ﴿وَقَعَدُوْا﴾ اور خود جہاد سے بیٹھے رہے جہاد کے لیے گئے نہیں۔ جو جہاد کے لیے گئے اور شہید ہو گئے ان کے متعلق کہا ﴿لَوْ اَطَاعُوْنَا﴾ اگر وہ ہماری بات مان لیتے ﴿مَا قُتِلُوْا﴾ نہ قتل کیے جاتے۔ ہم نے تو ان کو پہلے ہی منع کیا تھا کہ موت کے منہ میں نہ جاؤ لیکن انھوں نے ہماری بات نہیں سنی اس لیے قتل اور شہید ہوئے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں دوسروں کو موت سے بچنے والا نسخہ بتانے والو! تم خود کرلو۔ ﴿قُلْ فَادْرَءُوْا﴾ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کہہ دیجیے! پس تم ٹال دو ﴿عَنْ اَنْفُسِكُمُ الْمَوْتَ﴾ اپنی جانوں سے موت ﴿اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ﴾ اگر ہو تم سچے۔ حالاں کہ موت سے کوئی بچ نہیں سکتا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ﴿اَیْنَ مَا تَكُوْنُوْا﴾ "جہاں بھی تم ہو گے ﴿یُدْرِكْكُّمُ الْمَوْتُ﴾ پالے گی تمھیں موت ﴿وَلَوْ كُنْتُمْ فِیْ بُرُوْجٍ مُّشَیَّدَةٍ﴾ [النساء: ۷۸] اگر چہ ہو تم مستحکم قلعوں میں۔" موت سے نہیں بچ سکتے۔ مثال کے طور پر اس طرح سمجھو کہ ایک آدمی ایسا مکان تیار کرلے کہ جس میں نہ روشن دان ہو، نہ کھڑکیاں، نہ دروازے ہوں بلکہ سوئی داخل ہونے کا بھی سوراخ نہ ہو اور اس میں چھپ کر بیٹھ جائے کہ موت سے بچ جائے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ایسے مکان میں بھی نہیں بچ سکتا ﴿وَلَوْ كُنْتُمْ فِیْ بُرُوْجٍ مُّشَیَّدَةٍ﴾ اگر چہ تم ایسے قلعوں میں چھپ جاؤ کہ جن میں سوئی داخل ہونے کی بھی جگہ نہیں ہے۔ موت سے نہیں بچ سکتے۔ موت وہاں بھی آئے گی۔ کیوں کہ فرشتوں کے لیے یہ پکی دیواریں ایسے ہی ہیں جیسے پرندوں کے لیے ہوا۔ جس طرح ہوا پرندوں کو نہیں روک سکتی اس طرح یہ پکی دیواریں فرشتوں کو نہیں روک سکتیں۔

دیکھو! بچہ جان پڑ جانے کے بعد پانچ ماہ ماں کے پیٹ میں زندہ رہتا ہے۔ ظاہری طور پر نہ وہاں ہوا جا سکتی ہے، نہ خوراک۔ رب تعالیٰ کی قدرت اور نظام ہے کہ اس نے انتڑیوں کو ماں کے پیٹ سے جوڑ دیا۔ اس کو خون کے ذریعے خوراک پہنچتی رہتی ہے۔ اندر نہ پیشاب، نہ پاخانہ، مگر بچہ پلتا رہتا ہے۔ ماں کے پیٹ میں نقل و حرکت بھی کرتا ہے۔ رب تعالیٰ رحمِ مادر میں سب کچھ تیار کر دیتا ہے۔ اور بعض بچے رحمِ مادر میں ہی فوت ہو جاتے ہیں۔ فرشتہ وہاں بھی پہنچ جاتا ہے۔ جب کہ رحم میں سوئی داخل ہونے کا سوراخ بھی نہیں ہوتا۔

تو فرشتوں سے کہاں چھپو گے؟ موت کا وقت مقرر ہے وہ ٹل نہیں سکتا۔ اور آدمی نے جس جگہ مرنا ہوتا ہے وہاں پہنچ جاتا ہے۔ موت کی جگہ تک پہنچانے کے لیے اللہ تعالیٰ اس کی کوئی ضرورت وہاں پیدا فرما دیتا ہے۔ وہ ضرورت اس کو وہاں لے جاتی ہے۔ تو موت سے آدمی نہیں بچ سکتا۔ ہاں شرعی دائرے میں رہ کر اسباب کو کام میں لانے کا حکم ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے

﴿خُذُوْا حِذْرَكُمْ﴾ [النساء:۷۱] "دشمن سے اپنے بچاؤ کا جتنا انتظام ہوسکتا ہے کرو۔" اور رب تعالیٰ کا حکم ہے کہ اے اللہ کے بندو! جب تم بیمار ہوتو علاج کراؤ۔ تو اگر علاج آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی تعمیل میں کرایا جاتا ہے تو ثواب ملے گا۔ باقی علاج سے موت نہیں ٹلتی۔ اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ میں قابل سے قابل ڈاکٹر کے پاس پہنچ گیا تو زندگی بڑھ جائے گی یا کسی حاذق حکیم کے پاس جانے سے زندگی کا کوئی دن بڑھ جائے گا یا قیمتی سے قیمتی دوائی کھانے سے یا اعلیٰ قسم کے ٹیکے لگوانے سے سانس بڑھ جائے گا، حاشا وکلا! ہرگز ایسا نہیں ہوگا۔ موت کا جو وقت لکھا ہوا ہے اس سے ایک سیکنڈ آگے پیچھے نہیں ہوسکتا۔ باقی عالم اسباب میں اسباب کو کام میں لانا ہے اللہ تعالیٰ کا حکم سمجھتے ہوئے۔

چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب آرام فرماتے تھے تو ساتھی باقاعدہ پہرہ دیتے تھے مگر جب اللہ تعالیٰ کا حکم نازل ہوا ﴿وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ﴾ [المائدہ:۶۷] "اے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم! رب تعالیٰ آپ کو لوگوں سے بچائے گا۔" اس وقت حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ پہرہ دے رہے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سعد! اب تو چلا جا۔ کیوں کہ رب تعالیٰ نے میری حفاظت کا ذمہ خود لے لیا ہے۔ یعنی اب اسباب کی بھی ضرورت نہیں ہے۔

شہید کی حیاتِ سرمدی اور اس کا انعام

منافقوں نے کہا تھا کہ اگر ہماری بات مان جاتے تو نہ مرتے۔ آگے اس کا جواب دیا ہے کہ جن کو تم مردہ کہتے ہو ان کو تو حیاتِ جاوداں مل چکی ہے۔ فرمایا ﴿وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ اور ہرگز نہ خیال کرنا ان لوگوں کے بارے میں جو قتل کیے گئے اللہ تعالیٰ کے راستے میں ﴿اَمْوَاتًا﴾ ان کو مردے نہ خیال کرنا ﴿بَلْ اَحْيَآءٌ﴾ بلکہ وہ زندہ ہیں ﴿عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ﴾ اپنے رب کے ہاں ان کو رزق دیا جاتا ہے۔ یعنی جو لوگ دین کی سربلندی کے لیے شہید ہوئے ہیں اور اقامتِ دین کے لیے انھوں نے جان دی ہے ان کو مردہ مت گمان کرو۔ یہ نہ سمجھو کہ وہ ختم ہو گئے ہیں بلکہ وہ زندہ ہیں اور ان کو رب کے ہاں رزق دیا جاتا ہے۔ اور دوسرے پارے میں تم پڑھ چکے ہو ﴿وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ﴾ [البقرہ:۱۵۴] "اور نہ کہو ان لوگوں کے متعلق جو قتل کیے گئے اللہ تعالیٰ کے راستہ میں کہ وہ مردے ہیں۔"

تو یہاں پر کچھ باتیں سمجھنے والی ہیں۔ وہ یہ کہ جو حضرات کافروں کے ہاتھوں شہید ہوئے ہیں ان میں بعض ایسے شہداء بھی ہوتے ہیں یہ ظالم ان کے سر کو دھڑ سے الگ کر دیتے ہیں۔ اور اس حقیقت کا کوئی بھی انکار نہیں کرتا، نہ شریعت انکار کرتی ہے کہ اس کے بدن سے روح نکل جاتی ہے اور شہید کو باقاعدہ دفن کیا جاتا ہے اور اس کے مال میں وراثت جاری ہوتی ہے۔ یعنی ان کا مال شرعی وارثوں میں تقسیم ہوتا ہے اور عدت کے بعد اس کی بیوی آگے نکاح بھی کرسکتی ہے۔ جب کہ زندہ آدمی کا نہ مال وارثوں میں تقسیم ہوتا ہے نہ اس کی بیوی آگے نکاح کرسکتی ہے۔

دیکھو! ایک آدمی کو سزائے موت ہو جاتی ہے اور حکومت فیصلہ سنا دیتی ہے کہ یہ زندہ جیل سے نہیں جاسکتا۔ پھر اس کے

باوجود نہ اس کے مال میں وراثت جاری ہوگی نہ اس کی بیوی آگے نکاح کر سکتی ہے۔ کیوں وہ زندہ ہے۔ اسی طرح ایک آدمی کو عمر قید کی سزا ہو جاتی ہے اور حکومت فیصلہ سنا دیتی ہے کہ جب تک یہ مرے گا نہیں جیل سے باہر نہیں جا سکتا۔ اس کا مال بھی وارثوں میں تقسیم نہیں ہو سکتا اور نہ ہی اس کی بیوی آگے نکاح کر سکتی ہے۔ کیوں کہ زندہ ہے۔ اگرچہ عمر قید کی سزا ہے۔

مگر شہادت کے بعد شہید پر وہ سارے احکامات جاری ہوتے ہیں جو دنیا کی زندگی ختم ہونے کے احکامات ہیں کہ دفن بھی کیا جائے گا، مال میں وراثت بھی جاری ہوگی، عدت کے بعد اس کی بیوی آگے نکاح بھی کر سکتی ہے۔ اور ان سب احکامات کے جاری ہونے کے باوجود وہ زندہ ہے۔ کیوں کہ اس کی یہ زندگی قبر کی زندگی ہے، برزخ کی زندگی ہے، جنت کی زندگی ہے۔ دنیا کی زندگی تو ختم ہوگئی۔ اور اگر دنیا کی زندگی ہو، دنیا میں زندہ ہو پھر اس کی وراثت نہیں تقسیم ہو سکتی۔ کیوں کہ زندہ کی وراثت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اسی طرح اس کی بیوی آگے نکاح بھی نہیں کر سکتی۔

تو شہداء اور دوسرے مردوں کی زندگی اگلے جہان کی زندگی ہے۔ اور یہ زندگی روح کے جسم کے ساتھ تعلق کی وجہ سے ہے۔ اور یہ بات صحیح متواتر احادیث سے ثابت ہے اور امت کا اس پر اجماع ہے کہ جنازہ پڑھنے کے بعد آدمی کو جب قبر میں رکھا جاتا ہے تو اس کی روح کو جسم میں لوٹا دیا جاتا ہے۔ چنانچہ حدیث پاک میں آتا ہے: ((فَتُعَادُ رُوْحُهٗ فِيْ جَسَدِهٖ))۔ [مسند احمد، ج ۴، ص ۲۸۷] "پس اس کی روح اس کے جسم میں لوٹائی جاتی ہے۔" یہ متواتر اور مشہور حدیث ہے۔ تو روح کے جسم کے ساتھ تعلق کی وجہ سے وہ زندہ ہے۔ اور بخاری شریف، مسلم شریف اور ابوداؤد شریف میں روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ((اَلْعَبْدُ اِذَا وُضِعَ فِيْ قَبْرِهٖ)) "بندہ جب قبر میں رکھا جاتا ہے" ((وَتَوَلّٰى وَ ذَهَبَ اَصْحَابُهٗ)) اور اس کے ساتھی اس سے چلے جاتے ہیں ((حَتّٰى اَنَّهٗ يَسْمَعُ قَرْعَ نِعَالِهِمْ)) ابھی وہ جانے والوں کی جوتیوں کی کھٹکھٹاہٹ ہی سن رہا ہوتا ہے ((اَتَاهُ مَلَكَانِ))۔ [بخاری، ج ۱، ص ۱۷۸] کہ اچانک دو فرشتے آجاتے ہیں۔" تو مردہ دفن کے بعد قبر میں قبر سے واپس ہونے والے لوگوں کی جوتیوں کی آہٹ اور آواز سنتا ہے۔ اہلِ حق کا یہی مذہب ہے۔ معتزلہ، رافضیوں اور خارجیوں کے سوا اس کا کوئی منکر نہیں ہے۔ باقی اس کی زندگی کو ہم سمجھ نہیں سکتے۔ کیوں کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ﴿وَلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ﴾ [البقرہ: ۱۵۴] "اور لیکن تم شعور نہیں رکھتے۔"

مثال کے طور پر اگر کسی شہید کی قبر کھل جائے تو نہ وہ تمھارے ساتھ بات کرے گا اور نہ ہی اس کی کوئی نقل و حرکت ہوگی مگر ہے وہ زندہ اور یہ زندگی دنیا والی نہیں ہے۔ پھر اگر وہ زندہ نہیں ہے تو اس سے سوال جواب کا کیا مطلب ہے کہ ابھی وہ دفنا کے جانے والوں کے قدموں کی آہٹ سن رہا ہوتا ہے کہ دو فرشتے آجاتے ہیں اور اس سے سوال کرتے ہیں مَنْ رَّبُّكَ "تیرا رب کون ہے؟" وہ جواب بھی دیتا ہے رَبِّيَ اللّٰهُ "میرا رب اللہ تعالیٰ ہے۔" پھر سوال کرتے ہیں مَنْ نَبِيُّكَ "تو کس نبی کا امتی ہے؟" وہ جواب دیتا ہے نَبِيِّيْ مُحَمَّدٌ ﷺ۔ "میں محمد ﷺ کا امتی ہوں۔" پھر سوال کرتے ہیں مَا دِيْنُكَ "تو کس دین پر ہے؟" وہ کہتا ہے دِيْنِيَ الْاِسْلَامُ "میرا دین اسلام ہے۔" جب وہ امتحان میں کامیاب ہو جاتا ہے تو جہنم کی طرف سے کھڑکی

کھولی جاتی ہے۔ وہ گھبرا جاتا ہے کہ میں نے تو سوالوں کے جواب بھی صحیح دیے ہیں پھر مجھے یہ آگ کیوں دکھائی گئی ہے؟ فرشتے کہتے ہیں کہ گھبرا نہیں یہ تیرا ٹھکانا نہیں ہے۔ یہ تجھے صرف اس واسطے دکھایا گیا ہے کہ تجھے معلوم ہو کہ ایمان کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے تجھے کیسی سخت جگہ سے بچایا ہے۔ پھر فوراً جنت کی طرف سے کھڑکی کھول دی جاتی ہے اور جنت کی ہوا اور خوشبوئیں اُسے نصیب ہوتی ہیں اور فرشتے کہتے ہیں کہ اب تو دلہن کی طرح بڑے سکون سے سو جا۔

اور اگر کافر ہے، منافق ہے، بے ایمان ہے، اُسے پوچھتے ہیں مَنْ رَّبُّكَ "تیرا رب کون ہے؟" وہ کہتا ہے ھَا ھَا لَا اَدْرِیْ "میں نہیں جانتا۔" مَنْ نَبِیُّكَ کہتا ہے ھَا ھَا لَا اَدْرِیْ "میں نہیں جانتا۔" مَا دِیْنُكَ "میں نہیں جانتا۔" پھر اُسے فرشتے مارتے ہیں۔ حدیث پاک میں آتا ہے کہ اس پر ایسا فرشتہ مسلط کیا جاتا ہے اَعْمٰی وَ اَصَمّ "جو اندھا اور بہرہ ہوتا ہے۔" اور اس کو ایسے زور سے ہتھوڑے مارے جاتے ہیں کہ کسی پہاڑ کی چوٹی پر ماریں جائیں تو وہ ریزہ ریزہ ہو جائے۔ اور اس کی خوب پٹائی ہوتی ہے۔

اب دیکھو! وہ فرشتوں کے سوالوں کو سمجھتا بھی ہے اور جواب بھی دیتا ہے۔ اور اس کے جوابوں کا اعتبار بھی ہے کہ اس پر جزا سزا ہے۔ اگر نیک ہے تو اس کی قبر کو جنت کے باغوں میں سے ایک باغ بنا دیا جاتا ہے۔ اور اگر بد ہے تو جہنم کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا بنا دیا جاتا ہے۔ اگر زندگی نہیں ہے تو ان چیزوں کی کیا حیثیت ہے۔ زندگی کے بغیر وہ عذاب ثواب کس طرح محسوس کرتا ہے؟ اس لیے یاد رکھنا! قبر کی زندگی حق ہے اور یہ زندگی روح کے جسم کے ساتھ تعلق کی وجہ سے ہے۔

امام اعظم امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے عقائد کے متعلق ایک کتاب لکھی ہے "الفقہ الاکبر" اس میں انھوں نے جہاں یہ مسئلے بیان فرمائے ہیں کہ جنت حق ہے، دوزخ حق ہے، حساب کے لیے ترازو حق ہے، حشر نشر حق ہے، پل صراط حق ہے، وہاں یہ بھی بیان فرمایا کہ وَ اِعَادَۃُ الرُّوْحِ اِلَی الْعَبْدِ فِیْ قَبْرِہٖ حَقٌّ "قبر میں روح کا بندے کی طرف لوٹایا جانا حق ہے۔" تو اہل حق شہداء کی برزخی زندگی کے بھی قائل ہیں اور عام مُردوں کی زندگی کے بھی قائل ہیں۔

انبیاء علیہم السلام اپنی قبروں میں روح اور جسد عنصری کے تعلق کے ساتھ حیات ہیں

اور اللہ تعالیٰ کے پیغمبروں کی زندگی تو سب سے اعلیٰ ہے۔ صحیح حدیث ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اَلْاَنْبِیَاءُ اَحْیَاءٌ فِیْ قُبُوْرِھِمْ یُصَلُّوْنَ "حضرات انبیاءِ کرام علیہم السلام اپنی قبروں میں زندہ ہیں اور نمازیں پڑھتے ہیں۔" زندہ ہیں تو روضہ اقدس پر پڑھا جانے والا درود شریف سنتے اور جواب دیتے ہیں۔ چنانچہ حدیث پاک میں آتا ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مَنْ صَلّٰی عِنْدَ قَبْرِیْ سَمِعْتُہٗ "جس نے میری قبر کے پاس درود شریف پڑھا تو میں خود سنتا ہوں وَمَنْ صَلّٰی عَلَیَّ مِنْ بَعِیْدٍ اُعْلِمْتُہٗ اور جس نے مجھ پر دور سے درود شریف پڑھا تو وہ مجھے بواسطہ فرشتوں کے بتلایا جاتا ہے۔" اور ابوداؤد شریف کی روایت میں آتا ہے کہ میں سلام کا جواب بھی دوں گا۔

یاد رکھنا! یہ کوئی معمولی مسئلہ نہیں ہے۔ قرآن حدیث کا بڑا مضبوط اور پختہ مسئلہ ہے۔ دار العلوم دیو بند کے صدر مفتی جناب مہدی حسن خان رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایسے عقیدے والے آدمی کے پیچھے جو قبر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات کا قائل نہیں ہے نماز مکروہ ہے۔ اور اسی فتویٰ کی تائید کی ہے استاد الکل حضرت مولانا رسول خان صاحب مغفور مرحوم نے۔ اور مفتی جمیل احمد صاحب تھانوی مرحوم و مغفور نے بھی فتویٰ دیا ہے کہ جو شخص انبیاء کرام علیہم السلام کی حیات فی القبر کا قائل نہیں ہے اس کے پیچھے نماز مکروہ ہے۔ کیوں کہ یہ عقیدہ قرآن پاک کے خلاف ہے۔ لہٰذا اپنی نمازیں ضائع نہ کرنا۔ معتزلہ وغیرہ باطل فرقے کہتے ہیں کہ روح کا جسم کے ساتھ تعلق نہیں ہے یہ صرف روح کی زندگی ہے۔ یہ بھی غلط کہتے ہیں۔ کیوں کہ روح کے جسم کے ساتھ تعلق پر صحیح حدیث موجود ہے جو آپ پہلے سن چکے ہیں۔ پھر اگر زندگی نہیں ہے تو قبر میں جزا سزا کیسی ہے اور کس کو ہو رہی ہے؟

دیکھنا! آج کل ایک نیا فرقہ پیدا ہوا ہے، مماتی۔ ممکن ہے کہ وہ تمھیں دھوکا دیں کہ قبر میں جو زندگی ہے وہ روح کی ہے جسم کی نہیں ہے۔ اور عام طور پر وہ یہ مغالطہ دیتے ہیں کہ قبر کی زندگی تو ہے مگر جسدِ عنصری کا اس کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔ لیکن قرآن پاک ان کے اس نظریے کی تردید کرتا ہے۔ ارشادِ ربانی ہے ﴿وَلَا تَحۡسَبَنَّ الَّذِیۡنَ قُتِلُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ اَمۡوَاتًا﴾ اور ہرگز نہ گمان کرنا ان لوگوں کے بارے میں جو اللہ تعالیٰ کے راستے میں قتل کیے گئے ہیں کہ وہ مُردہ ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ قتل روح ہوئی ہے یا جسم؟ جس کو قتل کیا گیا ہے وہی زندہ ہے۔ اور دوسرے پارے میں ہے ﴿وَلَا تَقُوۡلُوۡا لِمَنۡ یُّقۡتَلُ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ اَمۡوَاتٌ﴾ "اور جو اللہ تعالیٰ کے راستہ میں قتل کیے گئے ہیں ان کو مردہ نہ کہو ﴿بَلۡ اَحۡیَآءٌ﴾ بلکہ وہ زندہ ہیں۔" تو جو قتل کیا گیا ہے وہی زندہ ہے۔ قتل جسم ہوتا ہے روح تو نہیں ہوتی۔ لہٰذا زندہ بھی جسم ہے۔

اسی طرح بعض لوگ یہ مغالطہ دیتے ہیں کہ سزا اور جزا جسم مثالی کو ہوتی ہے۔ یہ بھی غلط کہتے ہیں۔ پہلے تم جسدِ مثالی کا مطلب سمجھو۔ وہ اس طرح کہ تم رات کو خوابیں دیکھتے ہو۔ کسی کو خوابیں زیادہ آتی ہیں کسی کو کم۔ سوداوی اور تبخیری مزاج والے کو زیادہ آتی ہیں اور دوسروں کو کم۔ مگر آتی سب کو ہیں۔ خواب سے خالی کوئی آدمی نہیں ہے۔ تو خواب میں دوسروں سے ملاقاتیں ہوتی ہیں، ایک دوسرے کو کھلاتے پلاتے بھی ہو، باتیں بھی ہوتی ہیں۔ دشمنوں سے بھی ٹکراؤ ہو جاتا ہے۔ کبھی تم ان کو مارتے ہو کبھی خود مار کھاتے ہو۔ صبح کو تم ان سے پوچھو کہ رات میری تیرے ساتھ ملاقات ہوئی ہے اور میں نے تیری یہ خدمت کی ہے تو وہ انکار کرے گا کہ مجھے تو کوئی علم نہیں ہے۔ کیوں کہ رات کو جس سے ملاقات ہوئی ہے وہ جسدِ مثالی تھا، اصل نہیں تھا۔ اصل کو معلوم ہی نہیں ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کو جب زلیخا نے بدکاری کی دعوت دی تو یعقوب علیہ السلام سامنے آکر کھڑے ہو گئے۔ انگلی منہ پر رکھ کر فرمایا کہ یہ کام نہیں کرنا۔ تو یہ یعقوب علیہ السلام کا جسدِ مثالی تھا۔ خود حضرت یعقوب علیہ السلام کو اس کا علم نہ تھا۔ کیوں کہ اگر ان کو علم ہوتا کہ میرا بیٹا یوسف مصر کے بادشاہ کے گھر ہے تو رو رو کر اپنی بینائی نہ ضائع کرتے۔

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے مکتوب میں اس پر خاصی بحث فرمائی ہے۔ اسی طرح ان کے فرزند خواجہ محمد معصوم

صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے مکتوباتِ معصومیہ میں بھی اس موضوع پر خاصی بحث فرمائی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے نیک لوگوں کے اجسادِ مثالیہ کے ساتھ ملاقات ہوتی ہے اور اجسادِ مثالیہ بعینہٖ اصل کی طرح ہوتے ہیں۔ جس نے ملاقات کی ہے وہ سمجھتا ہے کہ میں نے فلاں بزرگ سے ملاقات کی ہے۔ حالانکہ اس بزرگ کو کوئی علم نہیں ہوتا۔ کیوں کہ ملاقات جسدِ مثالی سے ہوئی ہے۔ اسی طرح بسا اوقات آدمی کہیں پھنس جاتا ہے تو اجسادِ مثالیہ آکر راہ نمائی کرتے ہیں۔ اصل کو کوئی علم نہیں ہوتا۔

تو جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ جزا سزا مثالی کو ہوتی ہے وہ بھی غلط کہتے ہیں۔ کیوں کہ یہ بڑے ظلم کی بات ہے کہ گرمی سردی کی تکلیف تو برداشت کرے جسدِ عنصری، ٹھنڈے پانی کے ساتھ وضو اور غسل تو کرے جسدِ عنصری اور مزے اُڑائے جسدِ مثالی۔ اسی طرح گناہ تو کرے جسدِ عنصری اور سزا بھگتے جسدِ مثالی۔ یہ کون سا انصاف ہے؟ اللہ تعالیٰ کے راستے میں قتل تو ہو جسدِ عنصری اور زندگی ملے جسدِ مثالی کو۔ یہ عجیب منطق ہے۔ لہٰذا صحیح عقیدہ اور نظریہ یہی ہے کہ حیاتِ برزخیہ فی القبر روح کے تعلق کے ساتھ جسدِ عنصری کو حاصل ہے۔ عام مردے اور شہداء جسدِ عنصری کے ساتھ زندہ ہیں۔

﴿فَرِحِيْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ﴾ خوش ہیں ان نعمتوں پر جو ان کو اللہ تعالیٰ نے دیں ﴿مِنْ فَضْلِهٖ﴾ اپنے فضل سے ﴿وَيَسْتَبْشِرُوْنَ﴾ اور خوشی مناتے ہیں ﴿بِالَّذِيْنَ﴾ ان لوگوں کے بارے میں ﴿لَمْ يَلْحَقُوْا بِهِمْ﴾ جو ابھی تک ان کو نہیں ملے ﴿مِّنْ خَلْفِهِمْ﴾ ان کے پچھلوں سے۔ یعنی پچھلوں کے متعلق کہتے ہیں کہ خدا کرے وہ بھی شہید ہو کر آئیں اور ہمارے جیسے درجے پائیں۔

﴿اَلَّا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ﴾ یہ کہ نہ خوف ہوگا ان پر ﴿وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ﴾ اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ آئندہ کسی چیز کا خطرہ ہو تو اس کو خوف کہتے ہیں۔ اور جنت میں ان کو کسی قسم کا کوئی خطرہ نہیں ہوگا۔ اور گزشتہ کسی چیز کے ضائع ہونے پر افسوس کرنے کو حزن کہتے ہیں کہ کاش! ہم اِس طرح کرتے اور اُس طرح کرتے۔ اور وہ چوں کہ ساری نیکیاں کر چکے ہیں اس واسطے ان کو گزشتہ پر بھی افسوس نہیں ہوگا ﴿يَسْتَبْشِرُوْنَ﴾ خوشی مناتے ہیں ﴿بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ﴾ اللہ تعالیٰ کی نعمت کے ساتھ ﴿وَفَضْلٍ﴾ اور اللہ تعالیٰ کے فضل کے ساتھ ﴿وَّاَنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ﴾ اور بے شک اللہ تعالیٰ نہیں ضائع کرتا ﴿اَجْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ ایمان والوں کا اجر۔ اللہ تعالیٰ کا پختہ وعدہ ہے کہ مومنوں کو اجر ضرور دے گا۔

﴿اَلَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا﴾ وہ لوگ جنھوں نے حکم مانا ﴿لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ﴾ اللہ تعالیٰ کا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ﴿مِنْۢ بَعْدِ مَآ اَصَابَهُمُ﴾ بعد اس کے کہ ان کو پہنچا ﴿الْقَرْحُ﴾ زخم ﴿لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا﴾ ان لوگوں کے لیے جنھوں نے نیکی کی ﴿مِنْهُمْ﴾ ان میں سے ﴿وَاتَّقَوْا﴾ اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہے ﴿اَجْرٌ عَظِيْمٌ﴾ اجر ہے بڑا ﴿اَلَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ﴾ وہ لوگ ہیں کہا ان کو ﴿النَّاسُ﴾ لوگوں نے ﴿اِنَّ النَّاسَ﴾ بے شک لوگوں نے ﴿قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ﴾ تحقیق جمع کیے ہیں لشکر تمھارے لیے ﴿فَاخْشَوْهُمْ﴾ پس تم ان سے ڈرو ﴿فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا﴾ پس زیادہ کر دیا اس بات

نے ان کے ایمان کو ﴿وَّ قَالُوْا﴾ اور کہا انھوں نے ﴿حَسْبُنَا اللّٰهُ﴾ ہمیں اللہ تعالیٰ کافی ہے ﴿وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ﴾ اور اچھا ہے کارساز ﴿فَانْقَلَبُوْا﴾ پس وہ لوٹے ﴿بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ﴾ اللہ تعالیٰ کی نعمت لے کر اور اللہ تعالیٰ کا فضل لے کر ﴿لَّمْ يَمْسَسْهُمْ سُوْٓءٌ﴾ نہ پہنچی ان کو کوئی تکلیف ﴿وَّاتَّبَعُوْا رِضْوَانَ اللّٰهِ﴾ اور انھوں نے پیروی کی اللہ تعالیٰ کی رضا کی ﴿وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَظِيْمٍ﴾ اور اللہ تعالیٰ بڑی مہربانی کرنے والا ہے ﴿اِنَّمَا ذٰلِكُمُ الشَّيْطٰنُ﴾ پختہ بات ہے (وہ جو تمھیں ڈراتا تھا) وہ شیطان ہے ﴿يُخَوِّفُ اَوْلِيَآءَهٗ﴾ وہ ڈراتا ہے اپنے ساتھیوں سے ﴿فَلَا تَخَافُوْهُمْ﴾ پس تم ان سے خوف نہ کرو ﴿وَخَافُوْنِ﴾ اور مجھ سے خوف کرو ﴿اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ﴾ اگر ہو تم مومن ﴿وَلَا يَحْزُنْكَ﴾ اور تجھے غم میں نہ ڈالیں ﴿الَّذِيْنَ يُسَارِعُوْنَ﴾ وہ لوگ جو دوڑ کے جاتے ہیں ﴿فِي الْكُفْرِ﴾ کفر میں ﴿اِنَّهُمْ﴾ بے شک وہ ﴿لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْـًٔا﴾ ہرگز نہیں نقصان پہنچا سکیں گے اللہ تعالیٰ کو کچھ بھی ﴿يُرِيْدُ اللّٰهُ﴾ اللہ تعالیٰ ارادہ کرتا ہے ﴿اَلَّا يَجْعَلَ لَهُمْ﴾ اس چیز کا کہ نہ کرے ان کے واسطے ﴿حَظًّا﴾ حصہ ﴿فِي الْاٰخِرَةِ﴾ آخرت میں ﴿وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ﴾ اور ان کے لیے عذاب ہوگا بڑا ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا﴾ بے شک وہ لوگ جنھوں نے خریدا ﴿الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ﴾ کفر کو ایمان کے بدلے ﴿لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْـًٔا﴾ وہ ہرگز اللہ تعالیٰ کا نقصان نہیں کر سکتے ﴿وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ﴾ اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔

سچے فدا کاروں کا طرزِ عمل

پہلے سے غزوۂ احد کا ذکر چلا آ رہا ہے جو آپ تفصیل کے ساتھ سن چکے ہیں کہ مسلمانوں کو پہلے فتح ہوئی پھر بعض صحابہ کی غلطی کی وجہ سے فتح شکست میں تبدیل ہو گئی۔ میدان کافروں کے ہاتھ چلا گیا اور مسلمانوں کو کافی نقصان اُٹھانا پڑا۔ ستر ساتھی شہید ہوئے اور باقی زخمی۔ فتح حاصل کرنے کے باوجود بغیر کسی ظاہری سبب کے کافر میدان چھوڑ کر چلے گئے۔ بس اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں رعب ڈال دیا۔

مدینہ طیبہ سے آٹھ میل دور حمراء الاسد کے مقام پر جب پہنچے تو ایک دوسرے سے پوچھنے لگے کہ بھئی! جب ہماری فتح ہو گئی تھی تو ان کا صفایا کیے بغیر ہم کیوں آ گئے؟ یعنی جو مسلمان بچ گئے تھے ان کا بھی صفایا ہو جانا چاہیے تھا۔ ایک نے کہا میں نے تجھے آتے دیکھا میں بھی چل پڑا۔ دوسرے نے کہا میں نے تجھے آتے دیکھا میں بھی چل پڑا۔ تو ان کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ کہنے لگے اب بھی پلٹ کر ان کا صفایا کر دینا چاہیے۔ چنانچہ وہ حمراء الاسد کے مقام پر کافی دن ٹھہرے رہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر پہنچی کہ وہ حمراء الاسد کے مقام پر اکٹھے ہو رہے ہیں اور تازہ دم ہو کر دوبارہ حملہ کرنا چاہتے ہیں۔ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے باقی ماندہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کو جو زخموں سے چور تھے جمع فرمایا کہ پہلے اس سے کہ مشرکین پلٹ کر ہم پر

حملہ کریں کیوں نہ ہم ان کا تعاقب کر کے ان کے ناپاک ارادوں کو خاک میں ملا دیں۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اگرچہ تھکے ماندے اور زخموں سے چور چور تھے پھر بھی لڑنے کی حامی بھر لی اور تیار ہو گئے۔ اگرچہ ایسے موقع پر دوبارہ لڑنے کی حامی بھرنا مشکل ہوتی ہے لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پروانے ان تکلیفوں کو برداشت کرتے تھے۔ اس کا ذکر ہے۔

﴿اَلَّذِیۡنَ اسۡتَجَابُوۡا﴾ وہ لوگ جنھوں نے حکم مانا ﴿لِلّٰهِ وَ الرَّسُوۡلِ﴾ اللہ تعالیٰ کا اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ﴿مِنۡۢ بَعۡدِ مَاۤ اَصَابَهُمُ الۡقَرۡحُ﴾ بعد اس کے کہ ان کو پہنچا زخم۔ اُحد کے موقع پر ان کو کافی جانی نقصان برداشت کرنا پڑا کہ ستر ساتھی شہید ہو چکے تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سمیت بہت سے ساتھی زخمی تھے۔ کسی نے بازو پر پٹی باندھی ہوئی ہے، کسی نے سر پر، کسی نے ٹانگ پر، لیکن اس کے باوجود حمراء الاسد کے مقام پر جا پہنچے۔ کافروں نے جب سنا مسلمان زخمی حالت میں بھی حملے کے لیے ہماری طرف آرہے ہیں تو گھبرا گئے اور کہنے لگے زخمی شیر کا حملہ بہت خطرناک ہوتا ہے۔ لہٰذا یہ ہمیں چھوڑیں گے نہیں۔ اس موقع پر معبد خزاعی جس کا تعلق قبیلہ بنو خزاعہ سے تھا ابھی تک مسلمان نہیں ہوا تھا مگر دل میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا طرف دار تھا۔ بعد میں رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہو گئے۔ اور قبیلہ بنو خزاعہ کو یہ فخر حاصل ہے کہ کافر ہوتے ہوئے بھی انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کھل کر مخالفت نہیں کی۔ بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تائید ہی کرتے رہے ہیں۔ تو معبد خزاعی مدینہ طیبہ سے مکہ مکرمہ جا رہا تھا۔ جس وقت وہاں پہنچا جہاں کافروں نے پڑاؤ ڈالا ہوا تھا۔ کافروں نے ان سے دریافت کیا کہ بتاؤ تم نے زخمیوں کو دیکھا ہے؟ اس نے کہا کہ وہ تو تازہ دم ہو کر آئے ہوئے ہیں اور پہلے سے زیادہ مستعد ہیں اور آدمی بھی کافی ہیں (تاکہ یہ سمجھیں کہ اور آدمی ان کے ساتھ شامل ہو گئے ہیں) لہٰذا تم یہاں نہ ٹھہرو۔ اس بات نے بھی ان کے دلوں میں رعب ڈالا تو وہ وہاں سے بھاگ گئے کہ یہ ہمیں چھوڑیں گے نہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے ساتھیوں کے ہمراہ حمراء الاسد کے مقام پر پہنچے اور وہاں تین دن قیام فرمایا سترہ [۱۷]، اٹھارہ [۱۸]، انیس [۱۹] شوال بروز سوموار، منگل، بدھ۔ تین دن کے انتظار کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم واپس تشریف لے آئے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ﴿لِلَّذِیۡنَ اَحۡسَنُوۡا﴾ ان لوگوں کے لیے جنھوں نے نیکی کی ﴿مِنۡهُمۡ وَ اتَّقَوۡا﴾ ان میں سے اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہے ﴿اَجۡرٌ عَظِیۡمٌ﴾ اجر ہے بڑا۔

اس موقع پر قبیلہ عبدالقیس کے تاجروں کا ایک قافلہ مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ کی طرف آرہا تھا۔ اس قافلہ کا ایک شخص تھا نُعیم بن مسعود اشجعی۔ جو بعد میں مسلمان ہو گیا تھا۔ کافروں نے ان کو لالچ دیا کہ تجھے دس اُونٹ دیں گے اور چمک دکھائی کہ تو جا کر مسلمانوں پر ہمارا رعب ڈال اور کہہ کہ مکے والوں نے بڑے قبیلے اکٹھے کیے ہیں۔ وہ تمھارا صفایا کرنے کے لیے تیار ہیں۔ اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ملاقات کی اور کہنے لگا کہ تمھیں معلوم ہے کہ ابوجہل کے مرنے کے بعد اب قریشیوں کی کمان ابوسفیان کے پاس ہے اور وہ قبیلہ کتنا مضبوط اور جنگ جو ہے؟ (اور یہ بات حقیقت ہے ابوسفیان جب کافر تھے تو کفر میں بڑے بہادر اور مضبوط تھے۔ ۸ھ تک اس نے کافروں کے لشکر کی کمان کی ہے۔ ۸ھ میں مسلمان ہو گئے۔ مسلمان ہونے کے بعد اسلام میں بھی اسی طرح بہادر اور مضبوط تھے اور ان کے خاندان نے دین کے لیے بہت خدمات سرانجام دی ہیں)۔ تو نُعیم بن

مسعود اشجعی نے کافی ڈرانے کی کوشش کی۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے سنا تو بہ یک زبان ہو کر کہا ﴿حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ﴾ "ہمیں اللہ تعالیٰ کافی ہے اور وہی ہمارا کارساز ہے۔" اس کا ذکر فرمایا۔

﴿اَلَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ﴾ (پیغمبر کے ساتھی) وہ لوگ ہیں کہا ان کو لوگوں نے ﴿اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ﴾ بے شک لوگوں نے تحقیق جمع کیے ہیں لشکر تمھارے لیے ﴿فَاخْشَوْهُمْ﴾ پس تم ان سے ڈرو، ان کا مقابلہ نہ کرنا۔ یہ بات جب ان کے ایجنٹوں نے کہی ﴿فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا﴾ پس زیادہ کر دیا اس بات نے ان کے ایمان کو ﴿وَّقَالُوْا﴾ اور کہا انھوں نے ﴿حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ﴾ ہمیں اللہ تعالیٰ کافی ہے اور اچھا ہے کارساز۔ یعنی کام بنانے والا وہی رب تعالیٰ ہی ہے۔

ابراہیم علیہ السلام کا اللہ تعالیٰ پر توکل

تاریخ اور تفسیر کی کتابوں میں موجود ہے کہ جب نمرود بن کنعان نے ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں جلانے کا حکم دیا تو اس کے لیے بہت بڑا بھٹہ تیار کیا گیا۔ اس میں لکڑیاں ڈال کر ان کو آگ لگائی گئی۔ آگ کے شعلے بھڑک اُٹھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو منجنیق (آلے) کے ذریعے آگ کے بھٹہ میں ڈالا گیا۔ یہ آلہ اس وقت کے انجینئر "ہیزن" نامی آدمی نے تیار کیا تھا۔ جس کے ذریعے وہ بڑے بڑے پتھر قلعوں پر ڈالتے تھے۔ دارمی شریف کی روایت میں ہے جُرِّدَ عَنِ الثِّيَابِ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈالتے وقت ننگا کر دیا گیا۔

اسی لیے بخاری شریف کی روایت میں آتا ہے کہ لوگ جب قبروں سے نکلیں گے تو سب سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو لباس پہنایا جائے گا۔ فرمایا اس کے بعد مجھے لباس پہنایا جائے گا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو پہلے لباس پہنانے کی یہی وجہ ہے کہ ان کو ننگا کر کے ہاتھ پاؤں رسیوں سے جکڑ کر منجنیق آلے کے ذریعے آگ کے بھٹے میں پھینکا گیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جب منجنیق میں رکھا گیا تو مخالفین نے نمرود زندہ باد کے نعرے لگانے شروع کیے اور اس خوشی میں بھنگڑا ڈال رہے تھے کہ ابھی اس کا سر پھٹے گا ،ٹھاہ ہو گی اور ہمارے کلیجے ٹھنڈے ہوں گے اور ہم بت توڑنے کا انتقام لیں گے۔ اس حالت میں حضرت جبرئیل علیہ السلام تشریف لائے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام سے فرمایا کہ میرے لائق کوئی خدمت ہو تو بتاؤ۔ اس موقع پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا ﴿حَسْبِيَ اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ﴾ "مجھے میرا رب کافی ہے اور وہ بہترین کارساز ہے۔" مجھے تیری مدد کی ضرورت نہیں ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جب آگ میں ڈالا گیا، بخاری شریف کی روایت میں ہے کہ گھروں میں چھپکلی ہوتی ہے اس کو عربی میں "وزغ" کہتے ہیں۔ اس نے پھونکیں مارنی شروع کیں کہ آگ تیز ہو۔ اگرچہ اس کی پھونکوں سے کچھ نہیں بنتا تھا مگر اس نے اپنا خبثِ باطن تو ظاہر کر دیا کہ میں کیا ہوں۔ اور ایک سیاہ رنگ کا پرندہ ہوتا ہے اس کو "کالی کات" کہتے ہیں۔ وہ بڑی دور سے اپنی چونچ میں پانی لے کر بلندی سے پھینکتا تھا۔ اس کو پرندوں نے کہا کہ کیا تیرے اس پانی کے قطرے سے آگ بجھ جائے گی؟ اس نے کہا کہ آگ کا بجھانا میرا فریضہ نہیں ہے میں نے اللہ تعالیٰ کے خلیل کی مدد کے لیے اپنی توفیق کے مطابق چونچ

استعمال کرنی ہے۔

کاش! کہ ہم بھی اسلام کی مدد کے لیے اپنی چونچ استعمال کریں۔ یعنی جس کو اللہ تعالیٰ نے جتنی توفیق عطاء فرمائی ہے اتنی خدمت کرے۔ کیوں کہ ﴿لَا یُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا﴾ "اللہ تعالیٰ نے کسی شخص کو اس کی طاقت سے زیادہ کا مکلف نہیں بنایا۔" اور کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ ہونا کہ اسلام مٹ جائے گا۔ یاد رکھنا! کافر جتنا زور لگالیں اسلام کو نہیں مٹا سکتے۔ اس کی حفاظت کا ذمہ اللہ تعالیٰ نے خود لیا ہے۔ باقی ہمیں اپنی ہمت کے مطابق محنت کرنی چاہیے تا کہ اس میں ہمارا بھی حصہ ہو جائے۔

﴿فَانْقَلَبُوْا بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ﴾ پس وہ لوٹے اللہ تعالیٰ کی نعمت لے کر اور اللہ تعالیٰ کا فضل لے کر۔ عبدِ قیس قبیلے کے تاجروں کا جو قافلہ آ رہا تھا اس سے سامان خریدا۔ چوں کہ تاجر لوگ تھے تھوک کے حساب سے ان کو سستا سامان مل گیا۔ جس کا ان کو بڑا فائدہ ہوا۔ اس کا ذکر ہے ﴿لَّمْ یَمْسَسْهُمْ سُوْٓءٌ﴾ نہ پہنچی ان کو کوئی تکلیف ﴿وَّاتَّبَعُوْا رِضْوَانَ اللّٰهِ﴾ اور انھوں نے پیروی کی اللہ تعالیٰ کی رضا کی۔ اس طرح کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی تعمیل کی باوجود زخمی ہونے کے۔ حالاں کہ وہ کہہ سکتے تھے کہ حضرت! ابھی تو ہمارے زخم ٹھیک نہیں ہوئے۔ جب زخم ٹھیک ہو جائیں گے تو پھر چلیں گے۔ لیکن صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے کوئی قیل وقال نہیں کی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کو تسلیم کیا ﴿وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَظِیْمٍ﴾ اور اللہ تعالیٰ بڑی مہربانی کرنے والا ہے۔

آگے اللہ تعالیٰ مشرکوں کے ایجنٹ کے بارے میں فرماتے ہیں جس نے ڈرایا تھا کہ قریشیوں نے بڑی فوجیں جمع کی ہیں اور تمھارے مقابلے کے لیے آرہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ﴿اِنَّمَا ذٰلِكُمُ الشَّیْطٰنُ﴾ پختہ بات ہے وہ جو تمھیں ڈراتا تھا وہ شیطان ہے ﴿یُخَوِّفُ اَوْلِیَآءَهٗ﴾ وہ ڈراتا ہے اپنے ساتھیوں سے۔ چوں کہ کافر تھا اور طبعی طور پر آدمی اپنے نظریے کا حامی ہوتا ہے ﴿فَلَا تَخَافُوْهُمْ﴾ پس تم ان سے خوف نہ کرو۔ اے مومنو! تم ان سے نہ ڈرنا ﴿وَخَافُوْنِ﴾ اور مجھ سے خوف کرو۔ یعنی میری مخالفت سے ڈرنا کافر تمھارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے ﴿اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ﴾ اگر ہو تم مومن۔ یعنی اگر تم سچے مومن ہو تو مجھ سے ڈرو کہ کہیں میرے حکم کی خلاف ورزی نہ ہو جائے۔ اور مومن جب مومن ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی نصرت اور مدد ساتھ ہوتی ہے۔ پھر کافر چاہے کتنے زیادہ کیوں نہ ہوں فتح ایمان والوں کو حاصل ہوتی ہے۔

چنانچہ متعدد مقامات ایسے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے تھوڑوں کو بہتوں پر فتح عطاء فرمائی ہے۔ دوسرے پارے میں تم پڑھ چکے ہو ﴿كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِیْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِیْرَةًۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ﴾ "کتنی ہی تھوڑی جماعتیں غالب آ جاتی ہیں بہت ساری جماعتوں پر اللہ تعالیٰ کے حکم کے ساتھ۔" حضرت طالوت رحمہ اللہ تعالیٰ کے لشکر میں بمع ان کے تین سو تیرہ آدمی تھے اور مقابلے میں جالوت کا لشکر ایک لاکھ کا تھا۔ تو کیا نسبت ہے تین سو تیرہ کی ایک لاکھ کے ساتھ؟ مگر قرآن پاک میں آتا ہے ﴿فَهَزَمُوْهُمْ بِاِذْنِ اللّٰهِ﴾ "پس مومنوں نے شکست دی کافروں کو اللہ تعالیٰ کے حکم سے۔"

اسی طرح موتہ کے مقام پر تین ہزار نے ایک لاکھ کا مقابلہ کیا اور ان کو اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے شکست دی۔ اور یرموک کے مقام پر پینتیس [۳۵] ہزار کا ذکر بھی آتا ہے اور چھیالیس [۴۶] ہزار کا ذکر بھی آتا ہے۔ اور مقابلے میں رومیوں کی

سات لاکھ فوج تھی۔ مسلمانوں نے سات لاکھ فوج کو شکست فاش دی۔ سب سے بڑی قوت ایمان اور عملِ صالح ہے۔ ان کے ہوتے ہوئے ہتھیار چاہے معمولی بھی ہوں اللہ تعالیٰ کی نصرت ہوگی۔ خالی ہتھیاروں پر بھروسہ ہو تو پھر کچھ بھی حاصل نہ ہوگا۔ سب سے بڑی قوت ایمان ہے۔ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے ﴿وَ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ﴾ [آل عمران: ۱۳۹] "اور غالب تم ہی ہوگے بشرطیکہ تم مومن ثابت ہو۔"

پھر وہ منافق جو الگ ہو گئے تھے ان کی علیحدگی کا آپ ﷺ کو طبعی طور پر صدمہ تھا۔ کیوں کہ ایک آدمی ساتھ مل کر پھر الگ ہو جائے اور دشمنوں کا ساتھ دے تو صدمہ تو ہوتا ہے۔ اور یہ منافق بھی ایسے ہی تھے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ﴿وَلَا يَحْزُنْكَ﴾ اور تجھے غم میں نہ ڈالیں ﴿الَّذِيْنَ يُسَارِعُوْنَ﴾ وہ لوگ جو دوڑ کے جاتے ہیں ﴿فِي الْكُفْرِ﴾ کفر میں۔ یہ منافق جو کافروں کی طرف دوڑ کے جاتے ہیں اور ان کے ساتھ مراسم قائم کرتے ہیں اور تمھارے لیے گردشوں کے منتظر ہیں اس سے آپ ﷺ فکر مند نہ ہوں ﴿اِنَّهُمْ لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْـًٔا﴾ بے شک وہ ہرگز نہیں نقصان پہنچا سکیں گے اللہ تعالیٰ کو کچھ بھی۔ تو جب وہ اللہ تعالیٰ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے تو آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کے پیغمبر ہیں آپ ﷺ کا کیا بگاڑ سکتے ہیں۔ اور رب، رب ہے۔ ایک آن میں دنیا کو آباد کر سکتا ہے اور ایک آن میں تباہ کر سکتا ہے۔

﴿يُرِيْدُ اللّٰهُ اَلَّا يَجْعَلَ لَهُمْ﴾ اللہ تعالیٰ ارادہ کرتا ہے اس چیز کا کہ نہ کرے ان کے واسطے ﴿حَظًّا فِي الْاٰخِرَةِ﴾ حصہ آخرت میں۔ کیوں کہ انھوں نے ایمان کا دعویٰ کر کے کفر کی طرف رجوع کیا ہے۔ زبانی طور پر کلمہ پڑھتے ہیں اور اندرونی طور پر کافروں کے ساتھ ہیں۔ لہٰذا جب وہ خود ایمان کی طرف نہیں آنا چاہتے تو رب تعالیٰ زبردستی کسی کو ایمان نہیں دیتا۔ ایمان لانے میں اور کفر اختیار کرنے میں انسان کو اختیار ہے۔ پندرھویں پارے میں آتا ہے ﴿فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّ مَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ﴾ "پس جو شخص چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کفر اختیار کرے۔" تو جب وہ کفر کی طرف مائل ہیں تو آخرت میں حصہ کس طرح ہو سکتا ہے ﴿وَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ﴾ اور ان کے لیے عذاب ہوگا بڑا کہ ﴿اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ﴾ "بے شک منافق جہنم کے سب سے نیچے والے طبقے میں ہوں گے۔" جہاں سب سے سخت عذاب ہوگا۔

اس آیت کریمہ میں کافروں کی آخرت میں ناکامی کا ذکر تھا۔ اگلی آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ دنیا میں بھی ناکام ہوں گے اور اللہ تعالیٰ اور اس کے دین کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔ ارشادِ ربانی ہے ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ﴾ بے شک وہ لوگ جنھوں نے خریدا کفر کو ایمان کے بدلے۔ ایمان سے مراد فطرتِ سلیمہ ہے جس پر بچہ پیدا ہوتا ہے۔ کافروں نے وہ فطرت ضائع کر دی اور کفر اختیار کر لیا۔ اور یہ بھی فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقل، سمجھ، حواس ظاہری اور باطنی جیسی قوتیں عطاء فرمائی ہیں ان سے ایمان اور نیکیاں خریدیں جو تمھیں جنت تک ساتھ لے جائیں گی۔ لیکن کافروں نے اس پونجی کو ضائع کیا اور ایمان کے بدلے کفر خریدا۔

فرمایا یاد رکھو! ﴿لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْـًٔا﴾ وہ ہرگز اللہ تعالیٰ کا نقصان نہیں کر سکتے اور نہ اس کے دین کا کچھ بگاڑ سکتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا دین حق اور صداقت پر مبنی ہے اس کو اختیار کرنے والے لوگ ہمیشہ قائم رہیں گے۔ یہاں تک کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نازل ہوں گے ﴿وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ﴾ اور جن لوگوں نے ایمان کے بدلے کفر خریدا ہے ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔

﴿وَلَا يَحْسَبَنَّ﴾ اور ہرگز نہ خیال کریں ﴿الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا﴾ وہ لوگ جو کافر ہیں ﴿اَنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ﴾ کہ بے شک جو ہم ان کو مہلت دیتے ہیں ﴿خَيْرٌ لِّاَنْفُسِهِمْ﴾ بہتر ہے اِن کی جانوں کے لیے ﴿اِنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ﴾ پختہ بات ہے ہم ان کو مہلت دیتے ہیں ﴿لِيَزْدَادُوْٓا اِثْمًا﴾ تا کہ اور زیادہ گناہ کما لیں ﴿وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ﴾ اور ان کے لیے عذاب ہے ذلیل کرنے والا ﴿مَا كَانَ اللّٰهُ﴾ نہیں ہے اللہ تعالیٰ ایسا ﴿لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ کہ چھوڑ دے مومنوں کو ﴿عَلٰى مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ﴾ اس حالت پر جس حالت پر تم ہو ﴿حَتّٰى يَمِيْزَ الْخَبِيْثَ﴾ یہاں تک کہ الگ کر دے ناپاک کو ﴿مِنَ الطَّيِّبِ﴾ پاک سے ﴿وَمَا كَانَ اللّٰهُ﴾ اور نہیں ہے اللہ تعالیٰ ایسا ﴿لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ﴾ کہ تمھیں اطلاع دے غیب پر ﴿وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِيْ﴾ اور لیکن اللہ تعالیٰ چنتا ہے ﴿مِنْ رُّسُلِهٖ﴾ اپنے رسولوں میں سے ﴿مَنْ يَّشَآءُ﴾ جس کو چاہے ﴿فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ﴾ پس ایمان لاؤ اللہ تعالیٰ پر اور اس کے رسولوں پر ﴿وَاِنْ تُؤْمِنُوْا﴾ اور اگر تم ایمان لاؤ ﴿وَتَتَّقُوْا﴾ اور ڈرتے رہو ﴿فَلَكُمْ اَجْرٌ عَظِيْمٌ﴾ پس تمھارے واسطے ہے اجر بڑا ﴿وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ﴾ اور ہرگز نہ خیال کریں وہ لوگ ﴿يَبْخَلُوْنَ﴾ جو بخل کرتے ہیں ﴿بِمَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ﴾ اس مال میں جو ان کو اللہ تعالیٰ نے دیا ہے ﴿مِنْ فَضْلِهٖ﴾ اپنے فضل سے ﴿هُوَ خَيْرًا لَّهُمْ﴾ کہ وہ ان کے لیے بہتر ہے ﴿بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ﴾ بلکہ وہ ان کے لیے بُرا ہے ﴿سَيُطَوَّقُوْنَ﴾ عن قریب ان کو طوق پہنایا جائے گا اس مال کا ﴿مَا بَخِلُوْا بِهٖ﴾ جس مال کے ساتھ انھوں نے بخل کیا ﴿يَوْمَ الْقِيٰمَةِ﴾ قیامت والے دن ﴿وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ﴾ اور اللہ تعالیٰ ہی کے واسطے ہے میراث ﴿السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ آسمانوں کی اور زمین کی ﴿وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ﴾ اور اللہ تعالیٰ ان کاموں سے خبردار ہے جو تم کرتے ہو۔

کفار کو ڈھیل دینے کی حکمت

جنگِ بدر میں بھی مسلمان اسلحہ اور مالی اعتبار سے کمزور تھے اور یہی حالت جنگِ اُحد میں تھی۔ تو بعض کافروں نے سادہ قسم کے مسلمانوں کو کہا کہ اے مومنو! تم دعویٰ کرتے ہو کہ رب ہم سے راضی ہے اور ہمیں کہتے ہو کہ اے کافرو! تم سے رب ناراض ہے۔ اور حقیقت بھی یہی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشادِ گرامی ہے ﴿لَا يَرْضٰى لِعِبَادِهِ الْكُفْرَ﴾ [الزمر: ۷، پارہ: ۲۳] "وہ اپنے بندوں

کے لیے کفر کو پسند نہیں کرتا۔" اور ایمان والوں سے راضی ہے ﴿لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ [الفتح:۲۸، پارہ:۲۶] تو یہ دونوں باتیں قرآن پاک میں موجود ہیں کہ مومنوں سے اللہ تعالیٰ راضی ہے اور کافروں سے ناراض ہے۔ لیکن کافر سادہ قسم کے مسلمانوں کو مغالطہ دیتے تھے کہ دیکھو! مال ہمارے پاس زیادہ ہے یا تمھارے پاس، اولاد ہماری زیادہ ہے یا تمھاری؟ بھوکے ننگے ہم رہتے ہیں یا تم رہتے ہو؟ (کیوں کہ بعض مسلمان ایسے تھے کہ دو، دو دن، تین، تین دن بھوکے رہتے تھے اور ایسے بہت تھے جن کے پاس جوتا نہیں تھا ننگے پاؤں چلتے تھے)۔ پھر کہتے دیکھو! لوگ تمھیں مارتے ہیں یا ہمیں مارتے ہیں۔ اے مسلمانو! اگر رب تم سے راضی ہوتا تو سارے خزانے تمھیں دے دیتا۔ اور ہم سے اگر ناراض ہوتا تو ہم سے سب کچھ چھین لیتا۔

اور سطحی قسم کے آدمی اس مغالطے کا شکار ہو جاتے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے کافروں کے اس شبہے کا جواب دیا۔

فرمایا ﴿وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا﴾ اور ہرگز نہ خیال کریں وہ لوگ جو کافر ہیں ﴿اَنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ خَيْرٌ لِّاَنْفُسِهِمْ﴾ کہ بے شک جو ہم ان کو مہلت دیتے ہیں بہتر ہے ان کی جانوں کے لیے ﴿اِنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ﴾ پختہ بات ہے ہم ان کو مہلت دیتے ہیں ﴿لِيَزْدَادُوْٓا اِثْمًا﴾ تا کہ اور زیادہ گناہ کما لیں۔ یہ مال و دولت اور دنیا کی ترقی اس لیے نہیں ہے کہ ہم ان سے راضی ہیں۔ بلکہ یہ تو ہم نے ان کو ڈھیل دی ہوئی ہے کہ گناہ زیادہ کر لیں اور پھر یک بارگی ہماری گرفت میں آ جائیں گے۔ حدیث پاک میں آتا ہے: ((اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى لَيُمْلِيْ الظَّالِمَ حَتّٰٓى اِذَا اَخَذَهٗ لَمْ يُفْلِتْهُ)). "بے شک اللہ تعالیٰ ظالم کی رسی ڈھیلی کر دیتا ہے کہ جتنا ظلم کر سکتا ہے کر لے۔ پھر جب پکڑتا ہے تو اس کو مہلت نہیں دیتا۔" ﴿وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ﴾ ان کے لیے عذاب ہے ذلیل اور رسوا کرنے والا۔

منافقین اور اہلِ ایمان کے مابین امتیاز بذریعہ امتحان

غزوۂ اُحد میں مسلمانوں کو خاصی پریشانی اُٹھانی پڑی تو بعض حضرات کے ذہنوں میں یہ بات آئی کہ ہمیں یہ تکلیف کیوں آئی ہے؟ اس کا ایک جواب تو آپ سن چکے ہیں کہ مسلمانوں کی اپنی غلطی کی وجہ سے تکلیف آئی کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ کے پیغمبر کے حکم کی خلاف ورزی کی۔ یہ تو اس کا ظاہری سبب تھا۔ اور ایک سبب اس کا تکوینی تھا۔ وہ یہ ہے ﴿مَا كَانَ اللّٰهُ﴾ نہیں ہے اللہ تعالیٰ ایسا ﴿لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ کہ چھوڑ دے مومنوں کو ﴿عَلٰى مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ﴾ اس حالت پر جس حالت پر تم ہو ﴿حَتّٰى يَمِيْزَ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ﴾ یہاں تک کہ الگ کر دے ناپاک کو پاک سے۔ کیوں کہ جب تک پریشانیاں نہ آئیں، تکلیف اور سختی نہ آئے تو ہر آدمی اپنے آپ کو مجنوں اور دیوانہ کہلاتا ہے۔ جب تکلیف اور پریشانی آتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اصلی مجنوں کون ہے اور چوری کھانے والا کون۔

چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ جو منافق تھے حیلے بہانے کر کے چلے گئے اور جو مخلص مومن تھے انھوں نے تکلیفیں برداشت کیں۔ یہ پاک لوگ تھے اور جو حیلے بہانے کر کے چلے گئے وہ ناپاک منافق تھے۔ پھر پاک لوگوں کا حال یہ تھا کہ جب کافر

حمراء الاسد کے مقام پر اکٹھے ہوئے اور آنحضرت ﷺ کو اطلاع ہوئی۔ آپ ﷺ نے ساتھیوں کو حکم دیا کہ ان کا پیچھا کرنا ہے۔ تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے باوجود زخمی ہونے کے آپ ﷺ کے حکم کی تعمیل کی اور پلید پھر پیچھے رہ گئے۔

تو اللہ تعالیٰ امتحان کے ذریعے پاک کو پلید سے الگ کر دیتا ہے۔ ہاں! ذہن میں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ کیا یہ ضروری تھا کہ امتحان کے ذریعے ہی خبیثوں کو طیب لوگوں سے الگ کرتا۔ وہ قادرِ مطلق ہے وحی کے ذریعے بھی منافقوں کی نشان دہی کرنے پر قادر تھا کہ مومنوں کو بتا دیتا کہ فلاں فلاں منافق ہے۔ اس کا جواب دیا۔ فرمایا ﴿وَمَا كَانَ اللّٰهُ﴾ اور نہیں ہے اللہ تعالیٰ ایسا ﴿لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ﴾ کہ تمھیں اطلاع دے غیب پر۔ اور ہر ایک کو دوسرے کے حال سے آگاہ کر دے کہ فلاں مومن ہے، فلاں منافق ہے، فلاں موحد ہے اور فلاں مشرک ہے ﴿وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِيْ مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ يَّشَآءُ﴾ اور لیکن اللہ تعالیٰ چنتا ہے اپنے رسولوں میں سے جس کو چاہتا ہے۔ یعنی غیب کی خبر اللہ تعالیٰ رسولوں کو دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی یہ شان نہیں ہے کہ عام لوگوں کو غیب کے علم پر اطلاع دے۔ ہاں! اپنے رسولوں میں سے جس کو چاہتا ہے منتخب کر لیتا ہے۔ اور ان کو بھی غیب کا علم نہیں دیتا بلکہ ﴿لِيُطْلِعَكُمْ﴾ "غیب کی اطلاع دیتا ہے، غیب پر مطلع کرتا ہے۔" کہ فلاں فلاں مومن ہیں اور فلاں فلاں کافر اور منافق ہیں۔

اہلِ بدعت کا غلط استدلال اور اس کا جواب

اس آیتِ کریمہ سے اہلِ بدعت نے غلط استدلال کیا ہے اور نبیوں کے لیے علم غیب ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کو سمجھ لیں۔ بریلوی حضرات کے امام ہیں احمد رضا خان صاحب۔ بریلوی ان کے نام پر کانفرنسیں بھی منعقد کرتے ہیں۔ انھوں نے اپنی کتابوں میں اس مسئلے پر خاصی بحث کی ہے۔ ان کی کتابیں ہیں "خالص الاعتقاد، نفی الفئ، الامن والعلیٰ" ان ساری کتابوں میں انھوں نے دعویٰ کیا ہے کہ جب سے دنیا پیدا ہوئی ہے اس وقت سے لے کر جنت، دوزخ میں داخل ہونے تک کی ساری خبریں اور مشرق سے لے کر مغرب تک، شمال سے لے کر جنوب تک، عرش سے لے کر فرش تک۔ اس درمیان میں کوئی ذرہ اور قطرہ ایسا نہیں ہے جس کا علم اللہ تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ کو نہ دیا ہو۔ علم "ما کان و ما یکون" جو کچھ ہوا ہے اور جو کچھ ہونے والا ہے، سب کا علم اللہ تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ کو دے دیا ہے۔

اس دعوے پر وہ جو دلائل پیش کرتے ہیں ان میں سے ایک دلیل یہ ہے ﴿وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِيْ مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ يَّشَآءُ﴾ "اور نہیں ہے اللہ تعالیٰ ایسا کہ تمھیں اطلاع دے غیب پر اور لیکن اللہ تعالیٰ چنتا ہے اپنے رسولوں میں سے جس کو چاہتا ہے۔" اور آنحضرت ﷺ رسول ہیں بلکہ تمام رسولوں کے امام ہیں۔ اور مجتبیٰ بھی ہیں کہ تمام رسولوں میں آپ ﷺ کا درجہ سب سے اعلیٰ ہے۔ اور اس سے کسی مسلمان کو انکار بھی نہیں ہے اور نہ کوئی انکار کر سکتا ہے۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو سب کچھ بتا دیا ہے۔ یہ ہے ان کا استدلال۔

جواب سے پہلے ایک بات سمجھ لیں۔ وہ یہ کہ قرآن مجید میں جہاں سورت کا نام لکھا ہوا ہے شروع میں ایک ہندسہ اس

سے پہلے لکھا ہوا ہے اور ایک ہندسہ بعد میں۔ مثلاً: یہ دیکھیں لکھا ہوا ہے سُوْرَۃُ اٰلِ عِمْرَانَ مَدَنِیَّۃٌ اس سے پہلے تین کا ہندسہ ہے اور بعد میں نواسی [۸۹] کا ہندسہ ہے۔ یہ تین والا ہندسہ یہ بتارہا ہے کہ قرآن کریم کی موجودہ ترتیب کے اعتبار سے یہ تیسری سورت ہے۔ اور بعد میں جو نواسی [۸۹] کا ہندسہ ہے وہ یہ بتارہا ہے کہ نزول کے اعتبار سے اس کا نواسیواں [۸۹] نمبر ہے۔ اور قرآن پاک میں کل سورتیں ایک سو چودہ [۱۱۴] ہیں۔

اب جواب سمجھیں۔ میں پوچھتا ہوں کہ اگر اس آیتِ کریمہ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو علم غیب کلی عطاء فرمادیا ہے تو اس کے بعد ایک حرف بھی قرآن کریم کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل نہ ہوتا۔ حالاں کہ دیگر احکام کے علاوہ قرآن کریم کی پچیس [۲۵] سورتیں اس آیتِ کریمہ کے بعد نازل ہوئی ہیں۔ موٹی سی بات ہے کہ قرآن غیب میں شامل ہے یا نہیں؟ اور یقیناً جواب یہی ہے کہ قرآن غیب میں شامل ہے۔ تو جو سورتیں بعد میں نازل ہوئی ہیں وہ بھی تو غیب کا حصہ ہیں۔ وہ کیوں نازل ہوئی ہیں؟ اور ان میں سورۃ مائدہ اور توبہ، نساء جیسی لمبی لمبی سورتیں بھی شامل ہیں۔ اگر سارا غیب عطاء کردیا گیا ہے تو ان کے بعد میں نازل ہونے کا کیا مطلب ہے؟

دوسری بات یہ ہے کہ اگر واقعی اس سے علم غیب ثابت ہوتا ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سب کچھ بتادیا گیا ہے تو پھر اس کے بعد جو سورتیں نازل کی گئی ہیں ان میں نفی کیوں آئی ہے؟ مثلاً: سورۃ النساء میں مذکور ہے ﴿وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنٰهُمْ عَلَیْكَ مِنْ قَبْلُ وَرُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَیْكَ﴾ [آیت: ۱۶۴] "اور کتنے ہی رسول ہم نے بھیجے جن میں سے بعض کے حالات ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس سے قبل سنادیے اور ان میں سے بعض کے حالات ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں بتائے۔" اسی طرح سورۃ توبہ بھی بعد میں نازل ہوئی ہے۔ اس میں ارشادِ ربانی ہے ﴿وَمِنْ اَهْلِ الْمَدِیْنَةِ مَرَدُوْا عَلَى النِّفَاقِ لَا تَعْلَمُهُمْ نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ﴾ [التوبۃ: ۱۰۱] "اور بعض مدینے والے اَڑے رہے ہیں نفاق پر اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! آپ ان کو نہیں جانتے صرف ہم ہی ان کو جانتے ہیں۔"

یہ آیتِ کریمہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ دور نہیں بلکہ مدینہ طیبہ میں اور معمولی منافقوں کو ہی نہیں بلکہ ان منافقوں کو جن کا نفاق حدِ کمال کو پہنچا ہوا تھا اور جو نفاق پر اَڑے ہوئے اور بضد تھے۔ ان کو بھی جنابِ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نہیں جانتے تھے۔ ان کا علم بھی صرف اللہ تعالیٰ ہی کو تھا۔ اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو علم غیب اور جمیع ما کان و مایکونُ کا علم حاصل ہوتا تو لا محالہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان منافقوں کے حالات معلوم ہوتے اور اللہ تعالیٰ یہ نہ فرماتا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو نہیں جانتے صرف ہم ہی ان کو جانتے ہیں۔ یہ موٹی سی بات ہے۔ سمجھ آئی ہے کہ نہیں؟ کہ اس آیتِ کریمہ سے اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے علم غیب کلی ثابت ہوتا تو بعد والی سورتوں میں اس کی نفی کیوں کی گئی ہے؟

باقی رہی بات غیب کی خبروں کی تو وہ حق ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ﴿ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَیْبِ نُوْحِیْهِ اِلَیْكَ﴾ [آل عمران: ۴۴] "یہ غیب کی خبریں ہیں جو ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف وحی کرتے ہیں۔" اور اسی طرح بارھویں پارے میں فرمایا ﴿تِلْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَیْبِ نُوْحِیْهَاۤ اِلَیْكَ﴾ [ہود: ۴۹] "یہ باتیں غیب کی خبروں میں سے ہیں ہم وحی کے ذریعے ان کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم تک

پہنچاتے ہیں۔" تو اللہ تعالیٰ نے بے شمار غیب کی خبریں آنحضرت ﷺ کو بتائی ہیں۔ پہلی قوموں کی بھی اور قیامت کی نشانیاں بھی، آنے والے حالات بھی بتائے، قبر، برزخ میں جو کچھ ہوگا۔ غرضیکہ بہت کچھ بتایا ہے۔ وہ دینے والا جانے اور لینے والا جانے۔ اس کی حد بندی ہم نہیں کر سکتے۔ مگر اتنی بات قرآن کریم سے ثابت ہے کہ غیب صرف اللہ تعالیٰ جانتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ﴿وَلِلّٰهِ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاِلَيْهِ يُرْجَعُ الْاَمْرُ كُلُّهٗ﴾ [ہود: ۱۲۳] "اور اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہے غیب آسمانوں کا اور زمین کا اور اسی کی طرف لوٹتے ہیں سب کام۔" تو آسمانوں اور زمینوں کے غیوب صرف رب تعالیٰ ہی جانتا ہے۔

پھر بعض چیزیں ایسی ہیں کہ وہ آنحضرت ﷺ کی شان کے لائق نہیں ہیں۔ سورۃ یٰسین میں رب تعالیٰ فرماتے ہیں ﴿وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهٗ﴾ "اور ہم نے ان (یعنی جناب نبی کریم ﷺ) کو شعر نہیں سکھایا اور یہ ان کے لائق بھی نہیں ہے۔" اس نص قطعی سے یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ کو شعر کا علم عطاء ہی نہیں کیا۔ کیوں کہ وہ آپ ﷺ کی بلند اور رفیع شان کے لائق ہی نہیں ہے۔ کیوں کہ آپ ﷺ حقیقت کے ترجمان ہیں مگر شاعریت کا حسن و کمال اکثر کذب اور مبالغے پر مبنی ہوتا ہے۔ اور شاعر لوگ تصور و خیال کی باتیں کہتے رہتے ہیں۔ اور شاعری میں جتنا جھوٹ زیادہ ہوگا اتنا مزہ آئے گا۔ اس دور کے شاعروں میں علامہ اقبال مرحوم بڑے بلند پائے کے شاعر تھے۔ مگر ان کو بھی کہنا پڑا:

گفتار کا یہ غازی تو بنا
کردار کا غازی بن نہ سکا

کیوں کہ جس طرح کی اس کی شاعری ہے اگر کردار بھی اسی طرح کا ہوتا تو علامہ اقبال مرحوم بہت بڑا ولی اللہ ہوتا۔ شاعر کہتا کچھ ہے اور کرتا کچھ ہے۔ علامہ اقبال نے جب بانگِ درا لکھی جو اس فن میں بڑی بلند کتاب ہے تو گجرات کا ایک مخبوط الحواس شاعر "امام دین" یہ قادیانی تھا۔ اس نے بانگِ درا کے مقابلہ میں بانگِ دہل لکھی۔ اس نے اس میں لکھا ہے:

اگر ہو تجھے کچھ قبض کی شکایت تو کھا مولیا اور مٹر مام دینا
جنت کی سیٹیں تو پُر ہو چکی ہیں جہنم میں بے خوف وَڑ مام دینا

چوں کہ قادیانی تھا جہنم میں پہنچ گیا ہوگا۔ اس کے سوا اس کا کوئی ٹھکانا نہیں ہے۔ اسی طرح ایک شعر ہے:

حکومت کو کہہ دو جہازوں کو روکے
یہ راتوں کو اُڑ کر میرا تراہ کاھڈتے ہیں

تو شاعروں کا کیا ہے کبھی کچھ کہتے ہیں، کبھی کچھ کہتے ہیں۔ اس واسطے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی (ﷺ) کو یہ علم نہیں عطاء فرمایا۔ یہ علم کی بات ہے۔ اور غیب اور چیز ہے اور غیب کی خبریں اور چیز ہیں۔ ان میں فرق ہے۔ اگر تفصیل کی ضرورت ہو تو میری کتاب "اِزالۃُ الرَّیب عَن عَقیدۃِ عِلمِ الغَیب" پڑھ لیں۔

﴿فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ﴾ پس ایمان لاؤ اللہ تعالیٰ پر اور اس کے رسولوں پر ﴿وَاِنْ تُؤْمِنُوْا﴾ اور اگر تم ایمان لاؤ ﴿وَ

تَتَّقُوْا﴾ اور ڈرتے رہو ﴿فَلَكُمْ اَجْرٌ عَظِیْمٌ﴾ پس تمھارے لیے ہے اجر بڑا۔

بخیل کی سزا

آگے اللہ تعالیٰ نے بخل کرنے والوں کی حالت بیان فرمائی ہے جو مال ہوتے ہوئے بخل سے کام لیتے ہیں زکوۃ، عشر، فطرانہ ادا نہیں کرتے اور مال ہوتے ہوئے حج نہیں کرتے۔ فرمایا ﴿وَ لَا یَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ﴾ اور ہرگز نہ خیال کریں وہ لوگ ﴿یَبْخَلُوْنَ﴾ جو بخل کرتے ہیں ﴿بِمَاۤ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ﴾ اس مال میں جو ان کو اللہ تعالیٰ نے دیا ہے ﴿مِنْ فَضْلِهٖ﴾ اپنے فضل سے ﴿هُوَ خَیْرًا لَّهُمْ﴾ کہ وہ ان کے لیے بہتر ہے ﴿بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ﴾ بلکہ وہ ان کے لیے برا ہے ﴿سَیُطَوَّقُوْنَ﴾ عن قریب ان کو طوق پہنایا جائے گا اس مال کا ﴿مَا بَخِلُوْا بِهٖ﴾ جس مال کے ساتھ انھوں نے بخل کیا ﴿یَوْمَ الْقِیٰمَةِ﴾ قیامت والے دن۔

حدیث پاک میں آتا ہے کہ ایسا سونا چاندی جس کی زکوۃ ادا نہیں کی گئی اور جو حق ہیں فطرانہ، قربانی وغیرہ ادا نہیں کیے تو اس کو دو مونہوں والا گنجا سانپ بنا کر گلے میں ڈالا جائے گا (جیسے مفلر ہوتا ہے)۔ وہ دونوں رخساروں پر ڈنگ مارے گا اور کہے گا اَنَا مَالُكَ اَنَا كَنْزُكَ "میں تیرا مال ہوں، تیرا خزانہ ہوں۔" اور فرمایا اتنی بات سارے سمجھ لو کہ جس کے پاس جتنا مال ہے ساتھ کسی نے نہیں لے جانا۔ یہ کسی کی ذاتی میراث نہیں ہے۔

﴿وَ لِلّٰهِ مِیْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ﴾ اور اللہ تعالیٰ ہی کے واسطے ہے میراث آسمانوں کی اور زمین کی۔ آدمی کا اپنا وہی ہے جو اس نے کھالیا، پی لیا، پہن لیا۔ باقی یا تو وارثوں کا ہے یا دوسرے لوگوں کا ہے۔ لہٰذا تم مال میں بخل نہ کرو اور اسے اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرو ﴿وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرٌ﴾ اور اللہ تعالیٰ ان کاموں سے خبردار ہے جو کچھ تم کرتے ہو۔ سب اس کے علم میں ہے۔ کسی کا کوئی عمل ایسا نہیں ہے جو رب تعالیٰ کے علم سے باہر ہو۔

﴿لَقَدْ سَمِعَ اللّٰهُ﴾ البتہ تحقیق اللہ تعالیٰ نے سن لی ہے ﴿قَوْلَ الَّذِیْنَ قَالُوْۤا﴾ بات ان لوگوں کی جنھوں نے کہا ﴿اِنَّ اللّٰهَ فَقِیْرٌ﴾ بے شک اللہ تعالیٰ محتاج ہے ﴿وَّ نَحْنُ اَغْنِیَآءُ﴾ اور ہم مال دار ہیں ﴿سَنَكْتُبُ مَا قَالُوْا﴾ بہ تاکید ہم لکھیں گے جو کچھ انھوں نے کہا ہے ﴿وَ قَتْلَهُمُ الْاَنْۢبِیَآءَ﴾ اور ان کا اللہ تعالیٰ کے نبیوں کو قتل کرنا ﴿بِغَیْرِ حَقٍّ﴾ ناحق ﴿وَّ نَقُوْلُ﴾ اور ہم کہیں گے ﴿ذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِیْقِ﴾ چکھو جلانے والی آگ کا عذاب ﴿ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ اَیْدِیْكُمْ﴾ یہ بہ سبب اس کے جو بھیجا آگے تمھارے ہاتھوں نے ﴿وَ اَنَّ اللّٰهَ﴾ اور بے شک اللہ تعالیٰ ﴿لَیْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِیْدِ﴾ نہیں ہے ظلم کرنے والا بندوں پر ﴿اَلَّذِیْنَ قَالُوْۤا﴾ وہ لوگ جنھوں نے کہا ﴿اِنَّ اللّٰهَ عَهِدَ اِلَیْنَاۤ﴾ بے شک اللہ تعالیٰ نے عہد کیا ہے ہمارے ساتھ ﴿اَلَّا نُؤْمِنَ لِرَسُوْلٍ﴾ یہ کہ ہم نہ ایمان لائیں کسی

رسول پر ﴿حَتّٰی یَاْتِیَنَا بِقُرْبَانٍ﴾ یہاں تک کہ وہ لائے ہمارے پاس ایسی قربانی ﴿تَاْكُلُهُ النَّارُ﴾ کہ کھا جائے اس کو آگ ﴿قُلْ قَدْ جَآءَكُمْ رُسُلٌ﴾ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کہہ دیں! کہ تحقیق آئے تمھارے پاس رسول ﴿مِّنْ قَبْلِیْ﴾ مجھ سے پہلے ﴿بِالْبَیِّنٰتِ﴾ واضح دلیلوں کے ساتھ ﴿وَبِالَّذِیْ قُلْتُمْ﴾ اور وہ چیز بھی جو تم نے کہی ہے ﴿فَلِمَ قَتَلْتُمُوْهُمْ﴾ پس تم نے ان کو کیوں قتل کیا؟ ﴿اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ﴾ اگر ہو تم سچے ﴿فَاِنْ كَذَّبُوْكَ﴾ پس اگر وہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو جھٹلائیں ﴿فَقَدْ كُذِّبَ﴾ پس تحقیق جھٹلائے گئے ﴿رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ﴾ کئی رسول آپ سے پہلے ﴿جَآءُوْ بِالْبَیِّنٰتِ﴾ لائے وہ واضح دلائل ﴿وَالزُّبُرِ﴾ اور صحیفے ﴿وَالْكِتٰبِ الْمُنِیْرِ﴾ اور ایسی کتابیں جو روشنی پہنچانے والی تھیں ﴿كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ﴾ ہر نفس موت کا ذائقہ چکھنے والا ہے ﴿وَاِنَّمَا تُوَفَّوْنَ﴾ اور پختہ بات ہے تمھیں پورا پورا دیا جائے گا ﴿اُجُوْرَكُمْ﴾ تمھارا اجر ﴿یَوْمَ الْقِیٰمَةِ﴾ قیامت والے دن ﴿فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ﴾ پس وہ شخص جو دور رکھا گیا دوزخ کی آگ سے ﴿وَاُدْخِلَ الْجَنَّةَ﴾ اور داخل کیا گیا جنت میں ﴿فَقَدْ فَازَ﴾ پس تحقیق وہ کامیاب ہو گیا ﴿وَمَا الْحَیٰوةُ الدُّنْیَآ﴾ اور نہیں ہے دنیا کی زندگی ﴿اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ﴾ مگر دھوکے کا سامان۔

یہود کی اللہ تعالیٰ کے بارے میں ہرزہ سرائی

اس سے پہلے درس میں بخل کی مذمت بیان کی گئی ہے۔ آج کی آیات بھی اسی سلسلہ میں ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو دعوتِ اسلام کا پیغام دے کر یہودِ بنوقینقاع کی طرف بھیجا۔ اس دعوت نامے کا عنوان ا طرح ہے کہ:

﴿اِتَّقُوا اللّٰهَ﴾ "اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور ایمان لے آؤ۔ کیوں کہ تم جانتے ہو کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم برحق ہیں اور اس بات کی گواہی خود تمھاری کتابوں میں موجود ہے۔ اور نماز قائم کرو، زکوٰۃ ادا کرو ﴿وَاَقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا﴾ اور اللہ تعالیٰ کو قرضِ حسنہ دو۔"

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ یہ خط لے کر بنوقینقاع پہنچے۔ اس وقت یہودیوں کا بڑا عالم فخاص بن عازورا بیت المدارس میں تعلیم دے رہا تھا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خط مبارک پڑھ کر کہنے لگا اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ فقیر ہے اور ہم مال دار ہیں۔ اس لیے تو ہم سے قرض مانگتا ہے، (العیاذ باللہ)۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ یہ سن کر برداشت نہ کر سکے اور اس یہودی عالم کو تھپڑ مارا اور فرمایا کہ اگر ہمارے تمھارے درمیان معاہدہ حائل نہ ہوتا تو میں تلوار سے تیرا کام تمام کر دیتا۔ فخاص بن عازورا نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے شکایت کی کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اس کے ساتھ زیادتی کی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دریافت کرنے پر

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اے اللہ کے رسول! اس شخص نے اللہ تعالیٰ کی شان میں گستاخی کی ہے۔ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے یہود کی اس گستاخی کا جواب دیا ہے۔

قرضِ حسنہ کی تعریف اور اس کا اجر وثواب

قرضِ حسنہ کا ذکر قرآن پاک میں موجود ہے ﴿مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا﴾ [البقرہ:۲۴۵] "کون ہے تم میں سے جو اللہ تعالیٰ کو قرضِ حسنہ دے۔" قرضِ حسنہ کی تعریف یہ ہے کہ کوئی آدمی ایسے شخص کو جو قرض لینے کا حق دار ہے اپنے حلال اور طیب مال میں سے دے اور قرض کی وصولی میں اُسے تنگ نہ کرے اور احسان بھی نہ جتلائے۔قرضِ حسنہ کا سترہ [۱۷] گنا ثواب ملتا ہے۔

ظاہری طور پر دیکھا جائے تو بات سمجھ میں نہیں آتی۔کیوں کہ صدقے میں تو پیسے ہاتھ سے نکل جاتے ہیں اور واپس دنیا میں نہیں ملتے۔اس کا ثواب ہے دس گنا۔اور قرضِ حسنہ جو واپس ملتا ہے اس کا ثواب ہے سترہ [۱۷] گنا۔تو ظاہری طور پر یہ بات عقل میں نہیں آتی مگر حقیقت اسی طرح ہے۔کیوں کہ جو شخص صدقہ دیتا ہے وہ اپنا فائدہ تلاش کرتا ہے کہ مصیبت ٹلے گی اور ثواب ملے گا۔اور قرضِ حسنہ دینے والا دوسرے کو فائدہ پہنچاتا ہے اور اس کی مجبوری کو سامنے رکھتا ہے۔اس لیے اس کے سات نمبر زیادہ ہیں۔مگر اس زمانے میں قرضِ حسنہ دینے اور لینے والے بہت کم ہیں۔اور اللہ تعالیٰ کو قرضِ حسنہ دینے میں تشبیہ ہے۔اور تشبیہ اس طرح ہے کہ جس طرح تم کسی کو قرض دیتے ہو تو تمھیں معلوم ہوتا ہے کہ یہ رقم مجھے ملے گی۔اسی طرح یہاں سمجھو کہ جو اللہ تعالیٰ کو قرض دے گا یعنی اسی کی مرضی کے مطابق رقم خرچ کرے گا وہ ضائع نہیں ہوگی بلکہ اس کا بدلہ ضرور ملے گا۔کیوں کہ تشبیہ من کل الوجوہ نہیں ہوتی۔بلکہ من وجہ ہوتی ہے۔

مثال کے طور پر بہادر آدمی کو کہتے ہیں کہ یہ شیر ہے۔تو اس کی تشبیہ صرف بہادری میں ہے۔کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ شیر ہے تو اس کی چار ٹانگیں دکھاؤ، دم دکھاؤ، گردن پر بال دکھاؤ۔کیوں کہ تشبیہ صرف بہادری میں ہے کہ جس طرح خشکی کے جانوروں میں شیر سب سے بہادر ہے یہ بھی شیر کی طرح بہادر ہے۔

یا کوئی آدمی کند ذہن ہے بات نہیں سمجھتا تو اُسے کہا جائے کہ گدھا ہے۔تو یہاں تشبیہ صرف بے سمجھی میں ہے۔یہ نہیں کہ اس کی چار ٹانگیں ہیں اور کان ہیں اور چوڑی پیٹھ ہے۔یا بخیل آدمی کے بارے میں کہا جائے کہ بھائی! وہ تو لوہے کا تھن ہے۔یعنی جس طرح لوہے کے تھن سے دودھ نہیں نکلتا اسی طرح اس آدمی سے بھی کچھ حاصل نہیں ہوگا۔اور کوئی آدمی زبان کا بڑا میٹھا ہو اور اندر سے چھری ہو تو اس کو کہا جائے کہ وہ سونے کی چھری ہے۔

تو اللہ تعالیٰ کو قرض دینے میں یہ تشبیہ ہے کہ تم جو اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرو گے اس کا صلہ ضرور ملے گا۔اور اس بات کو یہودی بھی سمجھتے تھے مگر شریر تھے۔اس واسطے کہا کہ مسلمانوں کا خدا فقیر ہو گیا ہے اور ہم مال دار ہیں اس لیے ہم سے

قرضہ مانگتا ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ﴿لَقَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا﴾ البتہ تحقیق اللہ تعالیٰ نے سن لی ہے بات ان لوگوں کی جنھوں نے کہا ﴿اِنَّ اللّٰهَ فَقِيْرٌ﴾ بے شک اللہ تعالیٰ محتاج ہے ﴿وَّنَحْنُ اَغْنِيَآءُ﴾ اور ہم مال دار ہیں۔ لہٰذا رب ہم سے قرض مانگتا ہے ﴿سَنَكْتُبُ مَا قَالُوْا﴾ بہ تاکید ہم لکھیں گے جو کچھ انھوں نے کہا ہے۔ یعنی ہم لکھنے کا حکم دیں گے کیوں کہ رب تعالیٰ خود نہیں لکھتا اس کے فرشتے کراماً کاتبین لکھتے ہیں۔ یہ بات جو انھوں نے کہی ہے یہ تو درج ہو گئی ہے۔

اس کے علاوہ یہ بات بھی ہمارے پاس لکھی ہوئی ہے ﴿وَقَتْلَهُمُ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ﴾ اور ان کا اللہ تعالیٰ کے نبیوں کو ناحق قتل کرنا۔ کیوں کہ اللہ تعالیٰ کے پیغمبر حق کہتے تھے وہ ان کو اچھا نہیں لگتا تھا۔ اس لیے ان کے خلاف ہو گئے اور ان کو قتل کر دیا۔ جیسے: شَعْیا علیہ السلام کو شہید کیا، یحییٰ علیہ السلام کو شہید کیا۔ اور کافی پیغمبر شہید کیے اور ناحق شہید کیے۔ کیوں کہ شریعت میں قتلِ حق کی تین صورتیں ہیں۔ ان تین صورتوں کے علاوہ کسی کو قتل کرنا جائز نہیں ہے۔

- پہلی صورت یہ ہے کہ کوئی شخص مرتد ہو جائے، العیاذ باللہ تعالیٰ، تو اس کو تین دن کی مہلت دی جائے گی۔ تاکہ وہ اپنے شکوک وشبہات دُور کر لے۔ اگر تین دن میں اس نے شکوک وشبہات دور کر کے توبہ نہ کی تو اسے قتل کر دیا جائے گا۔ اور پیغمبروں کے متعلق تو اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اسلام کو چھوڑ دیں گے۔
- دوسری صورت یہ ہے کہ کوئی آدمی دیدہ دانستہ طور پر آلۂ قتل کے ساتھ کسی بے گناہ کو قتل کر دے۔ تو اس قاتل کو قصاصاً قتل کیا جائے گا۔ اور پیغمبر کسی کو ارادتاً ناحق قتل نہیں کرتے۔
- اور تیسری صورت یہ ہے کہ شادی شدہ مرد عورت زنا کریں تو ان کو سزا کے طور پر رجم کیا جائے گا۔ اور پیغمبروں کے متعلق اس کا بھی تصور نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا جتنے پیغمبر بھی شہید کیے گئے ناحق شہید کیے گئے۔

﴿وَّنَقُوْلُ ذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ﴾ اور ہم کہیں گے چکھو جلانے والی آگ کا عذاب۔ تم نے دنیا میں رب تعالیٰ کو فقیر کہا اور اس کے پیغمبروں کو شہید کیا، حق کا مقابلہ کیا اب اس کا مزہ چکھو۔ اور ہم کہیں گے ﴿ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْكُمْ﴾ یہ بہ سبب اس کے جو بھیجا آگے تمھارے ہاتھوں نے۔ یعنی تمھارے ہاتھوں کے کرتوت ہیں ﴿وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ﴾ اور بے شک اللہ تعالیٰ نہیں ہے ظلم کرنے والا بندوں پر۔ اللہ تعالیٰ نے ظلم حرام کیا ہوا ہے اپنی ذات کے لیے بھی اور مخلوق کے لیے بھی۔ کسی نے قاعدے کے مطابق نیکی کی ہے تو اس کو اجر ملے گا اور اگر کسی نے ذرہ برابر بھی بدی کی ہے تو اس کی سزا پائے گا ﴿اِلَّا مَنْ رَّحِمَ اللّٰهُ﴾ [دخان: ۴۲]۔

یہود کی ایک شرارت کا ذکر

﴿اَلَّذِيْنَ قَالُوْٓا﴾ وہ لوگ جنھوں نے کہا ﴿اِنَّ اللّٰهَ عَهِدَ اِلَيْنَآ﴾ بے شک اللہ تعالیٰ نے عہد کیا ہے ہمارے ساتھ

﴿اَلَّا نُؤْمِنَ لِرَسُوْلٍ﴾ یہ کہ ہم نہ ایمان لائیں کسی رسول پر ﴿حَتّٰى يَاْتِيَنَا بِقُرْبَانٍ﴾ یہاں تک کہ وہ لائے ہمارے پاس ایسی قربانی ﴿تَاْكُلُهُ النَّارُ﴾ کہ کھا جائے اس کو آگ۔ اس آیتِ کریمہ میں یہودیوں کی ایک شرارت کا ذکر ہے۔ وہ اس طرح کہ یہودیوں کے جو بڑے لوگ تھے، تعلیم یافتہ، سیاسی اور مذہبی پیشوا۔ ان کا ایک وفد آنحضرت ﷺ کے پاس آیا اور کہنے لگے کہ تورات میں ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ کسی نبی کو اس وقت تک نہ مانو جب تک وہ قربانی کر کے میدان میں نہ رکھے اور آگ آ کر اس کو جلا نہ دے۔

امام رازی رحمۃ اللہ علیہ تفسیر کبیر میں نقل فرماتے ہیں کہ وہ حکم اس طرح تھا کہ دو پیغمبروں کے علاوہ جو بھی تمھارے سامنے نبوت کا دعویٰ کرے اس سے یہ معجزہ طلب کرو اور کہو کہ ہم تجھ پر اس وقت تک ایمان نہیں لائیں گے جب تک تم قربانی کر کے میدان میں نہ رکھو اور آگ اس کو جلا نہ دے۔ کیوں کہ اس زمانے میں بھی جھوٹی نبوت کا دعویٰ کرنے والے موجود تھے۔ تو جھوٹے اور سچے کو پرکھنے کا یہ معیار مقرر کیا گیا۔ مگر دو پیغمبروں کے علاوہ۔ ایک عیسیٰ علیہ السلام اور ایک حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کہ ان کے متعلق حکم تھا کہ ان کو ہر حال میں ماننا ہے، تسلیم کرنا ہے۔ یہ نشانی ان کے ہاتھ پر ظاہر نہ ہوگی۔ یہ بات بھی تورات میں لکھی ہوئی تھی لیکن انھوں نے آدھی بات بیان کی اور آدھی بات چھپائی۔

اس کو تم اس طرح سمجھو کہ ﴿لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ﴾ پڑھے اور ﴿وَ اَنْتُمْ سُكٰرٰى﴾ نہ پڑھے اور کہے کہ میں تو نماز اس لیے نہیں پڑھتا کہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے نماز کے قریب نہ جاؤ۔ تو اس کو کہا جائے گا بھائی! اس آیتِ کریمہ کا سیاق و سباق دیکھ! تجھے معلوم ہو جائے گا کہ نشے کی حالت میں نماز پڑھنے سے منع کیا گیا ہے۔ کیوں کہ پہلے نماز کے اوقات کے علاوہ شراب حلال تھی اور حکم تھا ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ "اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو ﴿لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَ اَنْتُمْ سُكٰرٰى﴾ نہ قریب جاؤ نماز کے اس حالت میں کہ تم نشے میں ہو ﴿حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ﴾ [النساء: ۴۳] جب تک کہ تم نہ سمجھو جو تم کہتے ہو۔" یعنی آدمی جو کچھ نماز میں پڑھتا ہے اس کے مفہوم کا اس کو علم ہونا چاہیے۔ اسے معلوم ہونا چاہیے کہ وہ کیا پڑھ رہا ہے، کیا کہہ رہا ہے۔

اور یاد رکھنا! ہم پر شراب کا نشہ تو نہیں ہے مگر جہالت کا نشہ ہے۔ ہمیں نہیں معلوم کہ ہم کیا پڑھتے ہیں، اس کا مفہوم کیا ہے؟ پرانے نمازیوں سے پوچھ لیں کہ وتروں کی نماز میں جو دعائے قنوت ہے اس میں ایک جملہ ہے نَحْفِدُ۔ تو اس نَحْفِدُ کا کیا معنیٰ ہے؟ نہیں بتا سکتے۔ سو میں سے دو چار ہی بتائیں گے اور بس۔ حالاں کہ قرآن کا حکم ہے ﴿حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ﴾ "یہاں تک کہ تم جان لو کہ کیا کہہ رہے ہو۔" تو جب تک سمجھو گے نہیں تمھاری نماز نہیں ہوگی۔ اور ہم نے طوطے کی طرح الفاظ رٹے ہوئے ہیں۔ حالاں کہ نماز کے الفاظ کا ترجمہ سمجھنا بھی ضروری ہے۔ کیوں کہ نصِ قطعی ہے ﴿حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ﴾ "یہاں تک کہ تم جان لو کہ کیا کہہ رہے ہو۔"

تو خیر یہودیوں نے آگے پیچھے سے کاٹ کر تورات کا حکم سنایا کہ ہمیں تو یہ حکم دیا گیا ہے کہ تم اس پیغمبر پر ایمان لاؤ جو قربانی کر کے میدان میں رکھے اور آسمان سے آگ آ کر اس کو جلا دے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے دو جواب دیے ہیں۔

پہلا جواب: ﴿قُلْ قَدْ جَآءَكُمْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِیْ بِالْبَیِّنٰتِ﴾ آپ ﷺ کہہ دیں! کہ تحقیق آئے تمھارے پاس رسول مجھ سے پہلے واضح دلیلوں کے ساتھ۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے کئی پیغمبر ایسے تشریف لائے جنھوں نے قربانی والا معجزہ تو نہیں دکھایا لیکن اس کے علاوہ کئی اور معجزے اور دلائل لائے مگر تم نے ان کو تسلیم نہیں کیا۔ کیوں کہ ایسے پیغمبر بھی تھے جن کے لیے قربانی والی نشانی نہیں تھی دوسرے معجزے اور دلائل تھے۔ کیوں کہ پیغمبر کے لیے تو نشانی چاہیے۔

دوسرا الزامی جواب ہے۔ ﴿وَبِالَّذِیْ قُلْتُمْ﴾ اور وہ نشانی بھی لائے جو تم کہتے ہو ﴿فَلِمَ قَتَلْتُمُوْهُمْ﴾ پس تم نے ان کو کیوں قتل کیا؟ ﴿اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ﴾ اگر ہو تم سچے۔

آگے اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر علیہ السلام اور ان کے متبعین کو تسلی دی ہے ﴿فَاِنْ كَذَّبُوْكَ﴾ پس اگر وہ آپ کو اے نبی کریم ﷺ! جھٹلائیں تو آپ ﷺ صبر کریں ﴿فَقَدْ كُذِّبَ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ﴾ پس تحقیق جھٹلائے گئے کئی رسول آپ سے پہلے ﴿جَآءُوْ بِالْبَیِّنٰتِ﴾ لائے وہ واضح دلائل اور معجزات ﴿وَالزُّبُرِ﴾ زبور کی جمع ہے، صحیفے۔ اور صحیفے لے کر آئے ﴿وَالْكِتٰبِ الْمُنِیْرِ﴾ اور ایسی کتابیں جو روشنی پہنچانے والی تھیں۔ یعنی دلوں کو روشن کرنے والی تھیں۔ ان لوگوں نے ان کو بھی جھٹلایا۔ کیوں کہ ان کا وطیرہ ہے نہ ماننا۔ لہٰذا آپ ﷺ اپنا کام کرتے جائیں ﴿كُلُّ نَفْسٍ ذَآىِٕقَةُ الْمَوْتِ﴾ ہر نفس موت کا ذائقہ چکھنے والا ہے۔ رب تعالیٰ کی ذات کے سوا موت سے کوئی بھی مستثنیٰ نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ﴿وَّیَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ﴾ [الرحمٰن:۲۷، پارہ:۲۷] "اور باقی رہے گی تیرے رب کی ذات جو صاحب جلال اور عظمت ہے۔" فرشتے ہزار ہا سال سے زندہ چلے آرہے ہیں مگر ایک وقت آئے گا ان سب پر فنا آئے گی۔ حتی کہ ملک الموت حضرت عزرائیل علیہ السلام بھی موت سے نہیں بچ سکتے۔ موت بہت زور آور چیز ہے۔

حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کی موت کے وقت کیفیت

حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ مجھے اس پر تعجب ہے جس کے ہوش وحواس قائم ہوں اور مرتے وقت موت کی کیفیت بیان نہ کر سکے۔ جب ان کی موت کا وقت آیا تو ان کے بیٹے حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے کہا ابا جی! صِفْ لَنَا الْمَوْتَ ابا جی! آپ فرمایا کرتے تھے کہ بندے کے ہوش وحواس ٹھکانے ہوں اور مرتے وقت موت کی کیفیت نہ بیان کرے، مجھے اس پر تعجب ہوتا ہے۔ لہٰذا اب آپ موت کی کیفیت بیان فرمائیں، کیا حال ہے۔ فرمایا نہ پوچھو۔ میری یہ کیفیت ہے جس طرح سوئی کے ناکے سے میری جان نکالی جا رہی ہے اور کسی نے رضویٰ پہاڑ اُٹھا کر میری گردن پر رکھ دیا ہے۔ یہ مدینہ طیبہ میں اُحد پہاڑ کے بعد سب سے بڑا پہاڑ ہے۔

﴿وَاِنَّمَا تُوَفَّوْنَ اُجُوْرَكُمْ﴾ اور پختہ بات ہے تمھیں پورا پورا دیا جائے گا تمھارا اجر ﴿یَوْمَ الْقِیٰمَةِ﴾ قیامت والے دن۔ بعض نیکیوں کا بدلا دنیا میں بھی مل جاتا ہے مال اور اولاد کی صورت میں، کاروبار کی ترقی کی صورت میں۔ مگر پورا، پورا بدلا

قیامت کو ملے گا۔

﴿ فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ ﴾ پس وہ شخص جو دور رکھا گیا یعنی بچا لیا گیا دوزخ کی آگ سے ﴿ وَاُدْخِلَ الْجَنَّةَ ﴾ اور داخل کیا گیا جنت میں ﴿ فَقَدْ فَازَ ﴾ پس تحقیق وہ کامیاب ہو گیا۔ فرمایا اچھی طرح سمجھ لو ﴿ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ﴾ اور نہیں ہے دنیا کی زندگی مگر دھوکے کا سامان۔ یہ دھوکا دیتی ہے اس زندگی کا کوئی اعتبار نہیں۔ اب ہے، معلوم نہیں تھوڑی دیر بعد ہے کہ نہیں۔ صبح ہے، شام کا علم نہیں ہے۔ موت کسی وقت بھی آسکتی ہے اس کا کوئی وقت مقرر نہیں ہے۔ لہٰذا اس زندگی کو عارضی اور فانی سمجھو۔

﴿ لَتُبْلَوُنَّ ﴾ البتہ ضرور تمھارا امتحان لیا جائے گا ﴿ فِيْٓ اَمْوَالِكُمْ ﴾ تمھارے مالوں میں ﴿ وَاَنْفُسِكُمْ ﴾ اور تمھاری جانوں میں ﴿ وَلَتَسْمَعُنَّ ﴾ اور البتہ تم ضرور سنو گے ﴿ مِنَ الَّذِيْنَ ﴾ ان لوگوں سے ﴿ اُوْتُوا الْكِتٰبَ ﴾ جن کو کتاب دی گئی ﴿ مِنْ قَبْلِكُمْ ﴾ تم سے پہلے ﴿ وَمِنَ الَّذِيْنَ ﴾ اور ان لوگوں سے ﴿ اَشْرَكُوْٓا ﴾ جنھوں نے شرک کیا ﴿ اَذًى كَثِيْرًا ﴾ اذیت بہت ساری ﴿ وَاِنْ تَصْبِرُوْا ﴾ اور اگر تم صبر کرو گے ﴿ وَتَتَّقُوْا ﴾ اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو گے ﴿ فَاِنَّ ذٰلِكَ ﴾ پس بے شک یہ چیز ﴿ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ﴾ پختہ کاموں میں سے ہے ﴿ وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ ﴾ اور جس وقت لیا اللہ تعالیٰ نے وعدہ ﴿ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ ﴾ ان لوگوں سے جن کو دی گئی کتاب ﴿ لَتُبَيِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ ﴾ البتہ ضرور تم بیان کرو گے اس کتاب کو لوگوں کے لیے ﴿ وَلَا تَكْتُمُوْنَهٗ ﴾ اور نہ اس کو چھپاؤ گے ﴿ فَنَبَذُوْهُ ﴾ پس انھوں نے پھینک دیا اس وعدے کو ﴿ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ ﴾ اپنی پیٹھوں کے پیچھے ﴿ وَاشْتَرَوْا بِهٖ ﴾ اور خریدی انھوں نے اس کے بدلے ﴿ ثَمَنًا قَلِيْلًا ﴾ تھوڑی سی قیمت ﴿ فَبِئْسَ مَا يَشْتَرُوْنَ ﴾ پس بُری ہے وہ چیز جو انھوں نے خریدی ﴿ لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ ﴾ ہرگز نہ خیال کرنا ان لوگوں کے بارے میں ﴿ يَفْرَحُوْنَ ﴾ جو خوش ہوتے ہیں ﴿ بِمَآ اَتَوْا ﴾ جو انھوں نے کی ﴿ وَّيُحِبُّوْنَ ﴾ اور وہ پسند کرتے ہیں ﴿ اَنْ يُّحْمَدُوْا ﴾ یہ کہ ان کی تعریف کی جائے ﴿ بِمَا لَمْ يَفْعَلُوْا ﴾ ان چیزوں پر جو انھوں نے نہیں کیں ﴿ فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ ﴾ پس ہرگز نہ خیال کرنا تم ان کے بارے میں ﴿ بِمَفَازَةٍ ﴾ کہ وہ کامیابی حاصل کرسکیں گے ﴿ مِّنَ الْعَذَابِ ﴾ عذاب سے ﴿ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴾ اور ان کے واسطے عذاب ہوگا دردناک ﴿ وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ ﴾ اور اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہے آسمانوں کا ملک ﴿ وَالْاَرْضِ ﴾ اور زمین کا ﴿ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴾ اور اللہ تعالیٰ ہر شے پر قادر ہے۔

مالی اور جانی امتحان

اس سے پہلی آیات میں آنحضرت ﷺ اور آپ ﷺ کے ساتھیوں کو تسلی دی گئی تھی اور آج کی آیتوں میں بھی آنحضرت ﷺ اور آپ ﷺ کے ساتھیوں کو تسلی دی گئی ہے۔ فرمایا ﴿لَتُبْلَوُنَّ فِيْٓ اَمْوَالِكُمْ وَ اَنْفُسِكُمْ﴾ البتہ ضرور تمھارا امتحان لیا جائے گا تمھارے مالوں میں اور تمھاری جانوں میں بھی۔ مالی امتحان کی ابتداء اس طرح ہوگی کہ یہ بتلاؤ کہ مال تم نے کس طرح حاصل کیا اور کمایا، کس طرح آیا؟ وہ از روئے شرع جائز تھا یا ناجائز، صحیح تھا یا غلط۔ پھر سوال ہوگا کہ مال کو تم نے خرچ کس جگہ کیا؟ آیا جہاں تم نے خرچ کیا وہاں خرچ کرنے کا رب نے حکم دیا تھا یا اپنی مرضی کی۔ اس مال کے ذریعے حقوق اللہ اور حقوق العباد ادا کیے یا نہیں۔ اور جن جگہوں پر تم نے خرچ کیا وہاں خرچ کرنا جائز تھا یا ناجائز۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے قرآن مجید میں دو چیزیں ذکر فرمائی ہیں۔ ایک یہ کہ ﴿لَا تُسْرِفُوْا﴾ اسراف نہ کرو۔ اور دوسرا فرمایا تبذیر نہ کرو۔ اسراف کا مطلب ہے کہ ایک ایسا مقام ہے جہاں تمھیں رقم خرچ کرنے کی اجازت ہے مگر ضرورت سے زیادہ خرچ کرتے ہو تو اسراف ہوگا۔ وہ اس طرح کہ پانچ روپے سے ضرورت پوری ہوتی ہے اور تم چھ روپے خرچ کرتے ہو تو یہ چھٹا روپیہ اسراف ہوگا۔

اور تبذیر کہتے ہیں ایسی جگہ خرچ کرنا جہاں خرچ کرنے کی اجازت ہی نہیں ہے۔ جس طرح لوگ شادی بیاہ کے موقع پر بجلی کی مرچیں لگا کر چراغاں کرتے ہیں۔ ڈھول باجے اور دھماکے، شرلیاں پٹاخوں پر خرچ کرتے ہیں۔ آتش بازی ہوتی ہے۔ یہ سب کے سب تبذیر ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے ﴿اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ﴾ [بنی اسرائیل: ۲۷] "بے شک فضول خرچی کرنے والے شیطانوں کے بھائی ہیں۔" تو جو بے جا خرچ کرتے ہیں وہ شیطانوں کے بھائی ہیں۔ دیکھو! آج اگر کسی کو کہو کہ تو شیطان کا بھائی ہے تو وہ لڑ پڑے گا۔ اور پروردگار نے فرمایا ہے کہ فضول خرچی کرنے والے شیطان کے بھائی ہیں ﴿وَ كَانَ الشَّيْطٰنُ لِرَبِّهٖ كَفُوْرًا﴾ "اور شیطان اپنے رب کا نافرمان ہے۔" تو تم اس کے بھائی کیوں بنتے ہو؟

تو یہ مالی امتحانات ہیں کہ کمایا کس طرح؟ خرچ کیسے کیا؟ کیا حقوق اللہ اور حقوق العباد ادا کیے یا نہیں کیے؟ اور ما امتحان اس طرح بھی ہوتا ہے کہ کبھی مال ضائع ہو جاتا ہے۔ تو اس موقع پر تم صبر کرتے ہو یا نہیں۔ اور جانی امتحان یہ ہے کہ یہ بدن تمھیں رب تعالیٰ نے دیا ہے یہ اس کی امانت ہے۔ اس کو تم رب کی عبادت میں لگاتے ہو یا اس کے ذریعے نافرمانیاں کرتے ہو۔ مطلب یہ ہے کہ اس کے ساتھ تم نماز پڑھتے ہو، روزے رکھتے ہو، استطاعت ہے تو حج کرتے ہو، اس کے ساتھ اچھے کام کرتے ہو یا یہ بدن شیطانی کاموں کے لیے وقف کیا ہوا ہے۔

اور بدنی امتحان اس طرح بھی ہوتا ہے کہ آدمی بیمار ہو جاتا ہے تو اس بیماری میں رب تعالیٰ کو یاد رکھتا ہے یا نہیں۔ اور اس حالت میں بھی رب تعالیٰ کی عبادت کرتا ہے یا نہیں۔ عام لوگ اس طرح کرتے ہیں کہ تندرستی کی حالت میں تو عبادت کرتے ہیں

اور بیمار ہوجائیں تو بیماری کو بہانہ بنا کر عبادت چھوڑ دیتے ہیں۔حالاں کہ بیماری کی حالت میں زیادہ عبادت کرنی چاہیے کہ ہوسکتا ہے کہ مرجائے۔لیکن ہم پہلی عبادت بھی چھوڑ دیتے ہیں۔اور رب تعالیٰ کی مہربانی دیکھو کہ اس نے کتنی رخصتیں دی ہیں۔کہا اگر کھڑے ہو کر نماز نہیں پڑھ سکتے تو بیٹھ کر پڑھ لو، رکوع سجود کے ساتھ نہیں پڑھ سکتے تو اشاروں کے ساتھ پڑھ لے۔تو یہ بدنی امتحان ہیں۔اسی طرح تکلیف میں صبر کرتا ہے یا بے صبری کرتا ہے۔اگر اللہ تعالیٰ کسی کو موت دے دے تو صبر کرتے ہو کہ نہیں۔یہ سب بدنی امتحان ہیں۔

یہود ومشرکین کے طعن وتشنیع پر صبر وتقویٰ کی تلقین

اور یہ بھی امتحان ہے ﴿وَلَتَسْمَعُنَّ﴾ اور البتہ تم ضرور سنو گے ﴿مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ﴾ ان لوگوں سے جن کو کتاب دی گئی تم سے پہلے۔یعنی یہود ونصاریٰ سے ﴿وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا﴾ اور ان لوگوں سے جنھوں نے شرک کیا۔کیا سنو گے؟ فرمایا ﴿اَذًى كَثِيْرًا﴾ اذیت بہت ساری۔دکھ تکلیف کی باتیں سنو گے یہود ونصاریٰ سے بھی اور مشرکوں سے بھی۔اور ایسی ایسی باتیں سنو گے کہ جو تمھارے وہم وگمان میں بھی نہیں ہوں گی۔وہ تمھیں ستانے کے لیے یہ باتیں کریں گے۔اور آج اپنے آپ کو مسلمان کہلانے والے مرد اور عورتیں اس بیماری میں مبتلا ہیں۔دوسروں کے بارے میں ایسی باتیں کریں گے کہ فرشتوں کو بھی اس بات کا علم نہیں ہوتا۔اللہ تعالیٰ ان کو ہدایت عطاء فرمائے۔آدمی سن کے حیران ہوجاتا ہے کہ اس نے جو بات کہی ہے وہ میرے تصور میں بھی نہیں آسکتی۔یاد رکھنا! رتی رتی کا حساب ہوگا۔کسی کے بارے میں ایسی بات نہ کرنا جو واقعہ کے خلاف ہو۔یہ سنگین قسم کا جرم ہے۔

تو فرمایا یہود ونصاریٰ سے بھی سنو گے اور مشرکوں سے بھی۔اور کسی نے بھی کوئی کمی نہیں کی۔نہ یہود نے، نہ نصاریٰ نے، نہ مشرکوں نے۔آنحضرت ﷺ کی ذاتِ گرامی کو لوگوں نے آپ کے سامنے مجنوں کہا کہ تو پاگل ہے۔ساحر کہا کہ تو جادوگر ہے۔اور کہا کہ تو مسحور ہے یعنی تیرے اُوپر جادو کیا گیا ہے۔کذاب کہا کہ تو بہت بڑا جھوٹا ہے، معاذ اللہ تعالیٰ۔اور مفتری کہا کہ تو اللہ تعالیٰ پر افتریٰ باندھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تجھے نبی بنایا ہے اور اپنا کلام نازل کیا ہے۔اور یہ سارے الفاظ قرآن مجید میں موجود ہیں۔داد دو آنحضرت ﷺ کے حوصلے کو کہ آپ ﷺ نے کسی لفظ کا کوئی جواب نہیں دیا۔کوئی معمولی بات ہے کہ کسی نے منہ پر کذاب کہا، کسی نے دیوانہ کہا۔اس سے زیادہ اذیت کیا ہوسکتی ہے۔

اسی طرح نوح علیہ السلام کے متعلق آتا ہے کہ وہ جب کسی مجلس میں بیٹھے ہوتے تو لوگ انہیں کہتے ﴿كَذَّابٌ اَشِرٌ﴾ "بہت بڑا جھوٹا ہے اور بڑا اشرارتی ہے۔" اَشِرٌ کا معنیٰ متکبر بھی ہوتا ہے اور شرارتی بھی ہوتا ہے۔اے ظالمو! وہ تو تمھیں بغیر کسی لالچ اور طمع کے اللہ تعالیٰ کا دین سکھاتا ہے اور تم اُسے کذاب اور اشر کہتے ہو۔

تو اللہ تعالیٰ کے پیغمبروں نے بھی دشمنوں سے بہت کچھ سنا اور اے مومنو! تم بھی بہت کچھ سنو گے۔تو پھر تمھارا کیا کام

ہونا چاہیے ﴿وَاِنْ تَصْبِرُوْا﴾ اور اگر تم صبر کرو گے ﴿وَتَتَّقُوْا﴾ اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو گے ﴿فَاِنَّ ذٰلِكَ﴾ پس بے شک یہ چیز ﴿مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ﴾ پختہ کاموں میں سے ہے۔ صبر کرنا اور رب تعالیٰ سے ڈرنا مضبوط کاموں میں سے ہیں۔ حوصلے اور ہمت کے بغیر یہ چیزیں حاصل نہیں ہوسکتیں۔ حوصلہ بھی بڑی چیز ہے۔ اور بسا اوقات جب بات حد سے نکل جاتی ہے تو بندہ مجبور ہوجاتا ہے۔ پھر مجبور ہوکر بددعا بھی کرنی پڑتی ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام نے ساڑھے نو سو سال تبلیغ فرمائی پھر رب تعالیٰ کی طرف سے حکم آیا ﴿لَنْ يُّؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ اِلَّا مَنْ قَدْ اٰمَنَ﴾ [ہود: ۳۶] "کوئی ایمان نہیں لائے گا تمھاری قوم میں سے سوا ان کے جو ایمان لاچکے ہیں۔" پھر حضرت نوح علیہ السلام نے بددعا کی کہ اے پروردگار! ﴿لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا﴾ [سورۃ نوح] "کسی کافر کو روئے زمین پر بسا رہنے نہ دے۔" کیوں کہ جب آپ نے کہہ دیا ہے کہ آئندہ کوئی ایمان نہیں لائے گا تو پھر اے پروردگار! ایک کافر بھی زمین پر چلتا پھرتا نظر نہ آئے۔

اسی طرح مکے والوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت تنگ کیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھیوں کو بہت تنگ کیا۔ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لیے بددعا فرمائی کہ اے پروردگار! ان پر ایسے سال مسلط فرما جس طرح یوسف علیہ السلام کے زمانے میں قحط کے سال مسلط فرمائے تھے۔ بخاری شریف کی روایت میں آتا ہے کہ باہر سے اناج بند ہوگیا اور جو پہلے موجود تھا وہ ختم ہو گیا حَتّٰى اَكَلُوا الْمَيْتَةَ وَالْجُلُوْدَ وَالْعِظَامَ یہاں تک کہ انھوں نے مردار جانوروں کے گوشت کھائے اور خشک چمڑے پانی میں بھگو کر نرم کرکے بھون کے کھائے اور ہڈیاں پیس پیس کر پھکی بنا کر کھاتے تھے۔ جب بھوک کی وجہ سے نڈھال ہوکر اُٹھتے تو سامنے دھواں ہی دھواں نظر آتا تھا۔

تو تنگ ہوکر آدمی بددعا بھی کردیتا ہے۔ گزشتہ سے پیوستہ سبق میں آپ نے پڑھا ہے کہ یہود و نصاریٰ نے کہا اللہ تعالیٰ نے ہم سے عہد لیا ہے کہ صرف اس نبی پر ایمان لائیں کہ جس کے ہاتھ پر قربانی والا معجزہ ظاہر ہو کہ وہ قربانی کرکے میدان میں رکھے اور آسمان سے آگ آکر اس کو جلادے۔ حالاں کہ اس عہد سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام مستثنیٰ تھے۔ لیکن انھوں نے غلط بیانی سے کام لیا۔ تو رب تعالیٰ فرماتے ہیں کہ آخری دو پیغمبروں کے بارے میں یہ عہد نہیں تھا مگر تم اپنی طرف سے بنا کر کہہ رہے ہو اور جو عہد تم سے رب تعالیٰ نے حقیقتاً لیا تھا وہ تم نے کب پورا کیا ہے؟ وہ عہد یہ تھا۔

﴿وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ﴾ اور جس وقت لیا اللہ تعالیٰ نے وعدہ ﴿الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ﴾ ان لوگوں سے جن کو دی گئی کتاب۔ وعدہ یہ لیا تھا ﴿لَتُبَيِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ﴾ البتہ ضرور تم بیان کرو گے اس کتاب کو لوگوں کے لیے ﴿وَلَا تَكْتُمُوْنَهٗ﴾ اور نہ اس کو چھپاؤ گے۔ تو تورات اور انجیل دونوں کتابوں میں تو یہ عہد تھا کہ جو کتاب میں نے تمھیں دی ہے اس کو لوگوں کے سامنے علی الاعلان بیان کرنا، اس کے احکام کو ظاہر کرنا اور اس کو چھپانے کی کوشش نہ کرنا۔ اور یاد رکھنا! اللہ تعالیٰ نے جو کتابیں نازل فرمائی ہیں ان کو سمجھنا اور بیان کرنا بہت بڑی عبادت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کو اسی لیے بھیجا۔ قرآن پاک میں آتا ہے ﴿وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ﴾ [النحل: ۴۴] "اور اتارا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ذکر تاکہ

آپ بیان کردیں لوگوں کے لیے وہ چیز جو اُتاری گئی ہے ان کی طرف اور تاکہ وہ لوگ غوروفکر کریں۔" اور یہ بات آپ کئی مرتبہ سن چکے ہیں کہ قرآن مجید کی ایک آیت کریمہ بغیر ترجمہ کے سیکھنا سو رکعت نماز نفل پڑھنے سے زیادہ ثواب ہے۔ اور ایک آیتِ کریمہ ترجمہ کے ساتھ سیکھنا، حاصل کرنا ایک ہزار رکعات نفل نماز سے زیادہ ثواب ہے۔ [رواہ ابن ماجہ]

اور یہ بات بھی دماغ میں بٹھائیں کہ ترجمہ سیکھنا صرف مولویوں کے لیے نہیں ہے تمام مسلمانوں پر فرض ہے چاہے مرد ہوں یا عورتیں۔ پہلے لوگ کہتے تھے کہ عورتیں ترجمہ سیکھنے کے لیے کہاں جائیں؟ اب الحمد للہ! گکھڑ میں سات آٹھ ادارے لڑکیوں کی دینی تعلیم کے لیے موجود ہیں۔ جہاں لڑکیاں ہی پڑھاتی ہیں اور ان تمام لڑکیوں نے ترجمہ قرآن مجید مجھ سے پڑھا ہے۔ اب کوتاہی آپ لوگوں کی طرف سے ہورہی ہے۔

خاندانِ شاہ ولی اللہ کی دینی خدمات

ہندوستان میں شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے خاندان کی بڑی خدمات ہیں۔ اور اس سلسلے میں انھوں نے بڑی تکلیفیں برداشت کی ہیں۔ ہندوستان میں اہل بدعت اور رافضیت کا بڑا زور تھا۔ شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے جب "ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء" لکھی۔ اور یہ کتاب خلفاء اربعہ کی فضیلت کے سلسلہ میں بڑی علمی کتاب ہے۔ اسی طرح "قُرَّةُ الْعَيْنَيْنِ فِيْ تَفْضِيْلِ الشَّيْخَيْنِ" یعنی آنکھوں کی ٹھنڈک ابوبکر عمر رضی اللہ عنہما کی فضیلت میں ہے۔ تو نجف خان رافضی اس وقت دہلی کا حاکم تھا۔ اس نے شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھوں کی کلائیاں اُتروادیں کہ ان کے ساتھ تو نے یہ کتابیں لکھی ہیں۔ اور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے جب قرآن پاک کا فارسی زبان میں ترجمہ کیا تو بھانڈ قسم کے مولوی شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پیچھے پڑ گئے کہ اس نے اللہ تعالیٰ کے راز ظاہر کردیے ہیں لہٰذا کافر ہوگیا ہے۔ پھر شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے بیٹوں نے قرآن کی خدمت کی۔ شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے تفسیر لکھی اور شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ نے اُردو میں ترجمہ کیا اور شاہ رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اُردو میں ترجمہ کیا۔ اور وہ تمام اُردو تراجم کے سردار ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ نے یہ کتابیں اس لیے نازل فرمائی ہیں کہ ان کو بیان کرو اور یہ راز ظاہر کرو اور اللہ تعالیٰ کے احکامات لوگوں کو بتاؤ۔ لیکن یہود نے کیا کیا۔

﴿فَنَبَذُوْهُ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ﴾ پس انھوں نے پھینک دیا اس وعدے کو اپنی پیٹھوں کے پیچھے۔ اور اس کی کتابوں کو بیان کرنا وہ تو تم نے پورا نہیں کیا اور جو عہد لیا ہی نہیں ہے اس کے حوالے دیتے پھرتے ہو۔ ﴿وَاشْتَرَوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا﴾ اور خریدی انھوں نے اس کے بدلے تھوڑی سی قیمت۔ یعنی اس وعدے کے بدلے میں انھوں نے تھوڑی سی قیمت لی۔ وہ دنیا کی چیزیں تھیں۔ مثلاً: تنخواہیں اور نذرانے۔ جتنا مال بھی لیں وہ قلیل ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ "دنیا کا سارا سامان بھی قلیل ہے۔" اور ترمذی شریف میں حدیث آتی ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر دنیا و مافیہا کی حیثیت اللہ تعالیٰ کے نزدیک مچھر کے پَر کے برابر بھی ہوتی تو کافر کو ایک گھونٹ پانی کا بھی نہ دیتا۔ تو دنیا و مافیہا کے خزانوں کی حیثیت اللہ تعالیٰ

کے ہاں مچھر کے پَر کے برابر بھی نہیں ہے۔تو کافروں کو زیادہ بھی مل جائے تو کیا ہے۔
﴿فَبِئْسَ مَا يَشْتَرُوْنَ﴾ پس بُری ہے وہ چیز جو انھوں نے خریدی۔یعنی انھوں نے جو سودا خریدا ہے بُرا ہے۔آگے فرمایا ﴿لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ﴾ ہرگز نہ خیال کرنا ان لوگوں کے بارے میں ﴿يَفْرَحُوْنَ﴾ جو خوش ہوتے ہیں ﴿بِمَآ اَتَوْا وَّ يُحِبُّوْنَ﴾ جو انھوں نے کی اور وہ پسند کرتے ہیں یعنی بُرے کام۔اور پسند کرتے ہیں ﴿اَنْ يُّحْمَدُوْا﴾ یہ کہ ان کی تعریف کی جائے ﴿بِمَا لَمْ يَفْعَلُوْا﴾ ان چیزوں پر جو انھوں نے نہیں کیں۔ چاہتے ہیں کہ ان میں بھی ان کی تعریف کی جائے۔﴿فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ﴾ پس ہرگز نہ خیال کرنا تم ان کے بارے میں ﴿بِمَفَازَةٍ﴾ کہ وہ کامیابی حاصل کر سکیں گے ﴿مِّنَ الْعَذَابِ﴾ عذاب سے۔کہ عذاب سے وہ چھٹکارہ پا جائیں گے۔
مَفَازَةٌ مصدر میمی بھی بن سکتا ہے۔تو اس وقت ترجمہ ہوگا کامیابی۔اور ظرف مکان بھی بن سکتا ہے، کامیابی کی جگہ۔تو معنیٰ ہوگا پس ہرگز نہ خیال کرنا تم ان کے متعلق کہ ان کو عذاب سے کامیابی کی کوئی جگہ مل جائے گی۔دونوں معنیٰ صحیح ہیں۔﴿وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ﴾ اور ان کے واسطے عذاب ہوگا دردناک۔اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ﴿وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ اور اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہے آسمانوں کا ملک اور زمینوں کا۔وہی مالک ہے، وہی خالق ہے، وہی متصرف ہے، وہی مدبر ہے۔زمینوں اور آسمانوں میں اس کے سوا کسی کا کوئی دخل نہیں ہے۔یہ اسلام کا بنیادی عقیدہ ہے۔اللہ تعالیٰ ہدایت دے ان لوگوں کو جو عوام کو شرکیہ تعلیم دیتے ہیں۔چنانچہ احمد رضا خان صاحب بریلوی کہتے ہیں:

ذی تصرف بھی ہے ماذون بھی ہے، مختار بھی ہے
کارِ عالم کا مدبر بھی ہے عبدالقادر

یعنی جہان میں جو کچھ ہوتا ہے وہ شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کرتے ہیں۔لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ۔
یاد رکھنا! یہ شرک ہے اور اگر رتی برابر بھی کسی میں شرک ہوگا تو اس کا کوئی عمل بھی قبول نہیں ہوگا۔﴿وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ﴾ اور اللہ تعالیٰ ہر شے پر قادر ہے۔

﴿اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ﴾ بے شک آسمانوں کے پیدا کرنے میں ﴿وَالْاَرْضِ﴾ اور زمین کے پیدا کرنے میں ﴿وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ﴾ اور رات اور دن کے مختلف ہونے میں ﴿لَاٰيٰتٍ﴾ البتہ کئی نشانیاں ہیں ﴿لِّاُولِي الْاَلْبَابِ﴾ عقل مندوں کے واسطے ﴿الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ﴾ عقل مند لوگ وہ ہیں جو اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے ہیں ﴿قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا﴾ کھڑے ہوئے اور بیٹھنے کی حالت میں ﴿وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ﴾ اور اپنے پہلوؤں کے بل بھی ﴿وَيَتَفَكَّرُوْنَ﴾ اور غور و فکر کرتے ہیں ﴿فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں (کہتے

ہیں) ﴿رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا﴾ اے ہمارے رب! تو نے نہیں پیدا کیا ان چیزوں کو بے کار ﴿سُبْحٰنَكَ﴾ پاک ہے تیری ذات ﴿فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ﴾ پس بچا تو ہمیں دوزخ کے عذاب سے ﴿رَبَّنَآ اِنَّكَ﴾ اے ہمارے رب! بے شک تو ﴿مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ﴾ جس کو داخل کرے گا دوزخ میں ﴿فَقَدْ اَخْزَيْتَهٗ﴾ پس تحقیق تو نے اس کو رسوا کر دیا ﴿وَ مَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ﴾ اور نہیں ہے ظالموں کے لیے کوئی مددگار ﴿رَبَّنَآ﴾ اے ہمارے پروردگار! ﴿اِنَّنَا سَمِعْنَا﴾ بے شک ہم نے سن لیا ﴿مُنَادِيًا﴾ پکارنے والے کو ﴿يُّنَادِيْ لِلْاِيْمَانِ﴾ جو پکارتا تھا ایمان کے لیے ﴿اَنْ اٰمِنُوْا بِرَبِّكُمْ﴾ یہ کہ ایمان لاؤ اپنے رب پر ﴿فَاٰمَنَّا﴾ (اے ہمارے رب) پس ہم ایمان لے آئے ﴿رَبَّنَا﴾ اے ہمارے پروردگار! ﴿فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا﴾ پس معاف کر دے ہمارے گناہ ﴿وَ كَفِّرْ عَنَّا﴾ اور مٹا دے ہم سے ﴿سَيِّاٰتِنَا﴾ ہماری برائیاں ﴿وَ تَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ﴾ اور ہمیں وفات دے نیک لوگوں کے ساتھ ﴿رَبَّنَا﴾ اے ہمارے رب! ﴿وَ اٰتِنَا﴾ اور دے ہمیں ﴿مَا وَعَدْتَّنَا﴾ وہ چیز جس کا وعدہ کیا ہے تو نے ہم سے ﴿عَلٰى رُسُلِكَ﴾ اپنے رسولوں کی زبانوں پر ﴿وَ لَا تُخْزِنَا﴾ اور نہ رسوا کرنا ہمیں ﴿يَوْمَ الْقِيٰمَةِ﴾ قیامت والے دن ﴿اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيْعَادَ﴾ بے شک تو وعدے کے خلاف نہیں کرتا۔

نظامِ کائنات میں غور و فکر اربابِ عقل کا کام ہے

کل کے سبق کی آخری آیت میں تھا کہ تمام سلطنت اللہ تعالیٰ کی ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ آج کی آیات میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کی کچھ نشانیاں بیان فرمائی گئی ہیں کہ ان میں ہر آدمی غور و فکر کر سکتا ہے۔ ارشادِ خداوندی ہے ﴿اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ﴾ بے شک آسمانوں کے پیدا کرنے میں اور زمین کے پیدا کرنے میں ﴿وَ اخْتِلَافِ الَّيْلِ وَ النَّهَارِ﴾ اور رات اور دن کے مختلف ہونے میں ﴿لَاٰيٰتٍ﴾ البتہ کئی نشانیاں ہیں ﴿لِّاُولِي الْاَلْبَابِ﴾ عقل مندوں کے واسطے۔

یہ پہلا آسمان تو ہمیں نظر آتا ہے۔ چلو باقی چھ ہمیں نظر نہیں آتے۔ تو جو نظر آتا ہے اس کو دیکھو کہ اس کے نیچے کوئی کھمبا، کوئی ستون، کوئی دیوار اور کوئی ٹیک نہیں ہے۔ کوئی سہارا نہیں ہے۔ جب کہ انسان چھوٹی چھوٹی عمارتیں بناتا ہے اس کے نیچے کتنے ستون ہوتے ہیں۔ دیکھو یہ چھوٹی سی عمارت ہے، دو ستون وہ کھڑے ہیں، دو ستون وہ کھڑے ہیں۔ لیکن آسمان کو دیکھو کتنا بڑا وسیع ہے اس کو بغیر سہارے کے کھڑا کرنا اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کے اختیار میں نہیں ہے۔ اگر انسان غور کرے تو اللہ تعالیٰ کی قدرت سمجھ میں آسکتی ہے۔ پھر ایک آسمان نہیں جمع کا صیغہ ہے۔ بے شک آسمانوں کے پیدا کرنے میں اسی طرح زمین کے پیدا کرنے میں غور و فکر کرو۔

زمین میں پھرو، مشرق مغرب کی طرف جاؤ، شمال جنوب کی طرف جاؤ۔ میدان نظر آئیں گے، پہاڑ نظر آئیں گے،

مختلف قسم کے درخت نظر آئیں گے، جڑی بوٹیاں نظر آئیں گی، زمین کے مختلف رنگ نظر آئیں گے۔ پھر اس میں بڑے بڑے دریا اور سمندر نظر آئیں گے۔ پھر اس میں تمھیں پھل، پھول، اَناج اور سبزیاں نظر آئیں گی۔ پھر زمین میں رہنے والی مخلوق مختلف شکلیں رنگ برنگی نظر آئیں گی۔ چینیوں کی علیحدہ، روسیوں کی علیحدہ، افریقیوں کی علیحدہ۔ گوروں کی شکلیں الگ، کالوں کی الگ۔ جب کہ ماں بھی ایک اور باپ بھی ایک۔ سب کے باپ آدم علیہ السلام ہیں اور سب کی ماں حوا علیہا السلام ہیں۔ ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہوتے ہیں کسی کا قد بڑا ہے کسی کا چھوٹا ہے، کوئی گورا ہے، کوئی گندمی ہے۔ کوئی نرم مزاج ہے، کوئی سخت مزاج ہے۔ کوئی حوصلے والا ہے، کوئی جلد باز ہے۔ تو ان چیزوں پر غور وفکر کرنے سے رب تعالیٰ کی قدرت سمجھ آسکتی ہے۔

﴿وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ﴾ اور دن رات کے مختلف ہونے میں غور وفکر کرو کہ رات تاریک اور سیاہ ہے، دن روشن ہے۔ پھر کبھی رات بڑھ جاتی ہے، کبھی دن بڑھ جاتا ہے۔ کبھی رات کم ہو جاتی ہے، کبھی دن کم ہو جاتا ہے۔ اب دیکھو! بائیس دسمبر تک راتیں لمبی ہوں گی دن چھوٹے ہوتے جائیں گے۔ پھر بائیس جون تک راتیں چھوٹی ہوتی جائیں گی اور دن لمبے ہوتے جائیں گے۔ اور یہ ایسی چیزیں ہیں جو ہر آدمی کی سمجھ میں آسکتی ہیں۔ باقی کوئی بڑا پاگل ہو تو اس کی بات نہیں کرتا۔ ہوش وحواس والا آدمی ان چیزوں پر غور وفکر کر کے رب تعالیٰ کی قدرت کی نشانیاں سمجھ سکتا ہے۔ یہ نشانیاں کن لوگوں کے لیے ہیں؟ فرمایا ﴿لِّاُولِي الْاَلْبَابِ﴾ الباب لُب کی جمع ہے اور لُب کا معنیٰ عقل ہے۔ اور اُولُو جمع ہے ذُوْ کی۔ تو ﴿لِّاُولِي الْاَلْبَابِ﴾ کے معنیٰ ہوں گے عقل والے، عقل مند۔ تو یہ نشانیاں ہیں عقل مندوں کے لیے۔ اور ہم تو عقل منداُسے کہتے اور سمجھتے ہیں جو دنیا بڑی کمانا جانتا ہو۔ لوگوں کو ٹھگنا جانتا ہو یا دنیا میں عجیب وغریب چیزیں ایجاد کرنا جانتا ہو۔ اگرچہ وہ چیزیں دنیا کی تباہی اور بربادی کا سبب بنیں۔

دیکھو! یہ کلاشنکوف بنانے والا روسی شخص ابھی تک زندہ ہے اور اس کی عمر ستتر [۷۷] سال ہوگئی ہے اور وہ کلاشن کوف کی ایجاد پر شرمندہ اور نادم ہے کہ کاش! میں اس کی جگہ کوئی اور چیز ایجاد کرتا۔ کیوں کہ یہ تو انسانوں کی نری تباہی کا سبب ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے ہاں عقل مند کون لوگ ہیں اس کو اچھی طرح سمجھ لیں۔

عقل مند لوگوں کی نشانیاں

فرمایا عقل مند وہ ہیں ﴿الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ﴾ عقل مند لوگ وہ ہیں جو اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے ہیں ﴿قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا﴾ کھڑے ہوئے اور بیٹھنے کی حالت میں ﴿وَّعَلٰي جُنُوْبِهِمْ﴾ اور اپنے پہلوؤں کے بل لیٹے ہوئے بھی۔ مطلب یہ ہے کہ وہ ہر حال میں اپنے رب کو یاد کرتے ہیں۔ کھڑے ہوں، بیٹھے ہوں، لیٹے ہوں۔ اور یہ بات بھی آپ کئی مرتبہ سن چکے ہیں کہ ذکر کے لیے وضو کی پابندی نہیں۔ وضو کے بغیر بھی ذکر کر سکتے ہیں۔ کیوں کہ انسان آخر انسان ہے۔ کبھی معدہ خراب ہو جاتا ہے، ہوا خارج ہوتی ہے، پیشاب بھی بار بار کرنا پڑتا ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے اجازت دی ہے کہ ذکر تم بغیر وضو کے بھی کر سکتے ہو۔

عقل مندوں کی دوسری نشانی: ﴿وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ اور غور وفکر کرتے ہیں آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں کہ رب تعالیٰ نے کتنی بڑی وسیع مخلوق پیدا فرمائی ہے آسمان اور زمین۔ پھر ان میں اور بہت کچھ پیدا فرمایا ہے۔ مثلاً: پہاڑ ہیں، دریا ہیں اور کیا کچھ ہے۔ یہ ویسے تو پیدا نہیں فرمائیں ان کا کوئی نہ کوئی مقصد ہے۔ مثلاً: یہ مسجد کی عمارت ہے۔ یہ اس واسطے بنائی گئی ہے کہ یہاں لوگ نماز پڑھیں اللہ تعالیٰ کا ذکر کریں، قرآن شریف پڑھیں اور بچوں کو پڑھائیں۔ یہ دین کا مرکز اور اڈا ہے۔ یہ کوئی یادگار کے طور پر نہیں بنائی گئی۔

اسی طرح لوگ مکان بناتے ہیں تو اس کا مقصد ہے کہ اس میں رہیں گے، اُٹھیں گے، بیٹھیں گے، آرام کریں گے۔ گرمی سردی سے بچنا ہے، غمی خوشی کے موقع پر دوست احباب آئیں گے تو ان کو بٹھائیں گے۔ ہم اگر کوئی چیز بناتے ہیں تو اس کا کوئی نہ کوئی مقصد ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے زمین آسمان بنائے ہیں تو اس کا بھی کوئی مقصد ہے۔ پھر یہ غور وفکر کرتے ہیں جس ذات نے اتنے بڑے زمین وآسمان بنائے ہیں خود وہ ذات کتنی بڑی ہے۔ اس کی قدرت کتنی وسیع ہے۔ وہ قادرِ مطلق ہے۔

دوسرے مقام پر ارشادِ ربانی ہے ﴿وَفِيْٓ اَنْفُسِكُمْ ۭ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ﴾ [الذاریات: ۲۱] "اے انسانو! تم اپنی جانوں کو نہیں دیکھتے کہ تم کیا تھے اور اللہ تعالیٰ نے تمھیں کیا بنا دیا ہے۔" اللہ تعالیٰ نے تمھیں حقیر نطفے سے پیدا فرمایا ہے۔ اس طرح کہ نطفے کا لوتھڑا بنایا پھر لوتھڑے کی بوٹی بنائی پھر بوٹی کی ہڈیاں بنائیں، ٹانگیں بنائیں، بازو بنایا، سر بنایا، آنکھیں بنائیں، ناک بنایا۔ غرضیکہ تمام اعضاء بنائے۔ پھر ان پر گوشت چڑھایا پھر چار ماہ کے بعد اس ڈھانچے میں جان ڈالی پھر تقریباً پانچ ماہ ماں کے رحم میں زندہ رہا۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت دیکھو کہ بچہ ماں کے رحم میں پھلتا پھولتا بھی ہے، ہاتھ پاؤں بھی حرکت کرتے ہیں اور سانس کے بغیر زندہ بھی ہے۔ پیدا ہونے کے بعد بغیر سانس کے زندہ نہیں رہ سکتا۔ اور وہاں اس کو باقاعدہ خوراک بھی ملتی رہی ہے مگر پیشاب پاخانہ نہیں ہے۔ اور پیدا ہونے کے بعد بچہ صرف عرق ہی پی لے تو پاخانہ آجاتا ہے۔ تو رب تعالیٰ نے فرمایا اے انسانو! اپنے وجود میں غور وفکر کرو تو قادرِ مطلق تمھیں سمجھ آجائے گا۔ اور اگر آنکھیں بند کر لو پھر دن بھی رات ہے۔ اس کا کوئی علاج نہیں ہے۔

تو عقل مند جب زمین اور آسمانوں کی تخلیق میں غور کرتے ہیں تو کہتے ہیں ﴿رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا﴾ اے ہمارے رب! تو نے نہیں پیدا کیا ان چیزوں کو بے کار ﴿سُبْحٰنَكَ﴾ پاک ہے تیری ذات تمام عیبوں سے۔ اور اس سے بھی کہ تو کوئی بے کار فعل کرے ﴿فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ﴾ پس بچا تو ہمیں دوزخ کے عذاب سے۔ جو اس نقطے کو سمجھ جاتے ہیں وہی کامیاب ہیں۔ کیوں کہ آخرت میں تو جانا ہی ہے لہٰذا جو دوزخ سے بچ گیا وہی کامیاب ہے ﴿رَبَّنَآ اِنَّكَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ﴾ اے ہمارے رب! بے شک تو جس کو داخل کرے گا دوزخ میں ﴿فَقَدْ اَخْزَيْتَهٗ﴾ پس تحقیق تو نے اس کو رسوا کر دیا۔ اس لیے کہ دوزخ میں داخل ہونے والا انتہائی رسوا ہوگا۔ دوزخیوں کے متعلق قرآن پاک میں آتا ہے ﴿وَهُمْ يَصْطَرِخُوْنَ فِيْهَا﴾ [فاطر: ۳۷، پارہ: ۲۲] "وہ دوزخ میں چیخیں ماریں گے۔" ﴿لَهُمْ فِيْهَا زَفِيْرٌ وَّشَهِيْقٌ﴾ [ہود: ۱۰۶، پارہ: ۱۲] "ان کے لیے دوزخ میں آوازیں ہوں گی۔" ﴿زَفِيْرٌ﴾ گدھے کی اُس آواز کو کہتے ہیں جو ابتداء میں بڑی بلند ہوتی ہے اور ﴿شَهِيْقٌ﴾ وہ آواز ہوتی ہے جو آخر میں نرم پڑ

جاتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ بدبخت لوگ دوزخ میں چیخیں گے، چلائیں گے۔ اور گدھے کی آواز کے ساتھ تشبیہ اس لیے دی ہے کہ گدھے کی آواز تمام آوازوں سے بُری ہوتی ہے۔

حضرت لقمان حکیم رحمہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بیٹے سے کہا جب بات کرنی ہو تو بلاضرورت زور سے نہ بولنا۔ کیوں کہ زور سے بولنا کوئی فخر کی بات ہوتی تو پھر ساری فضیلت گدھا لے جاتا۔ حالاں کہ ﴿اِنَّ اَنۡکَرَ الۡاَصۡوَاتِ لَصَوۡتُ الۡحَمِیۡرِ﴾ [لقمان:۱۹، پارہ:۲۱] "بے شک تمام آوازوں میں بُری آواز گدھے کی ہے۔" گھروں میں عورتوں کا بلاضرورت بلند آواز سے بات کرنا گناہ ہے۔ مرد ضرورت سے زیادہ بلند آواز سے بولے گناہ ہے۔ ہم ان باتوں کو نہیں سمجھتے بلکہ ہم تو چیخنے چلانے کو ہی خوبی سمجھتے ہیں۔ چاہے کسی کی نیند ضائع ہوتی ہو یا بیمار کو تکلیف ہوتی ہو یا کسی کی نماز میں خلل واقع ہوتا ہو یا کسی کے مطالعہ کرنے میں خلل واقع ہو رہا ہو۔ ہمیں کسی کی تکلیف سے کوئی غرض نہیں ہے ہم نے ضرور چیخنا ہے۔

ذکرِ خفی کی اہمیت وفضیلت

دیکھو! دین میں فقہائے کرام رحمہم اللہ کا طبقہ بہت محتاط طبقہ ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ امام جب نماز پڑھائے تو اتنی آواز نکالے جو مقتدی سنیں۔ یعنی جتنے مقتدی ہیں اتنی آواز نکالے۔ امام کا ضرورت سے زیادہ آواز کو بلند کرنا صحیح نہیں ہے۔ اس سے اندازہ لگائیں کہ شریعت نے آواز پر کتنا کنٹرول کیا ہے کہ امام بھی اگر ضرورت سے زیادہ آواز کو بلند کرے تو فقہاء فرماتے ہیں فَقَدۡ اَسَآءَ "اس نے بُرا کام کیا ہے۔" اسی طرح فقہائے کرام رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ ایسی جگہ پر بلند آواز سے قرآن شریف پڑھنا جائز نہیں ہے جہاں کوئی سویا ہوا ہو یا نماز پڑھ رہا ہو یا مطالعہ کر رہا ہو۔ اور ہم نے تو سارے محلے کو بےزار کرنے میں ثواب سمجھا ہوا ہے کہ شور کرو کسی کو سونے نہ دو۔ یاد رکھنا! یہ سب گناہ کی باتیں ہیں۔

احمد رضا خان صاحب بریلوی سے کسی نے سوال کیا کہ ایسی جگہ پر بلند آواز سے قرآن شریف پڑھنا اور ذکر کرنا، درود شریف پڑھنا کیسا ہے جہاں کوئی سویا ہوا ہو کہ اس کی نیند میں خلل پیدا ہوتا ہو یا بیمار ہو۔ تو وہ فتویٰ "فتاویٰ رضویہ" میں لکھتے ہیں کہ بلند آواز سے ذکر کرنے والا سخت گناہ گار ہے۔ پھر اس پر فقہائے کرام رحمہم اللہ کے حوالے پیش کیے ہیں کہ بلند آواز سے ذکر کرنا، قرآن شریف پڑھنا اور بلند آواز سے درود شریف پڑھنا ناجائز ہے۔ پھر کسی نے سوال کیا کہ ایسے شخص کے ساتھ کیا کرنا چاہیے؟ تو جواب دیا کہ قوت ہے تو ہاتھ سے روکو ورنہ زبان سے روکو۔ اور اب حالت یہ ہے کہ چیخیں بھی خان صاحب کے ماننے والے ہی مارتے ہیں۔ ان کو کون سمجھائے؟

یاد رکھنا! ذکر اذکار بھی آہستہ کرنا چاہیے۔ حدیث پاک میں آتا ہے خَیۡرُ الذِّکۡرِ الۡخَفِیُّ "بہترین ذکر وہ ہے جو مخفی ہو۔" اور ایک حدیث میں آتا ہے کہ بلند آواز سے ذکر کرنے کی بجائے آہستہ ذکر کرنے کا اجر ستر [۷۰] گنا زیادہ ہے۔ لہٰذا ذکر ایسے انداز سے کرو کہ اپنے کان سنیں دوسروں کے کان نہ کھاؤ۔ اور خدا رسول کی بات پر عمل کرو اور دوزخ کی رسوائی سے بچو۔

فرمایا ﴿وَ مَا لِلظّٰلِمِیْنَ مِنْ اَنْصَارٍ﴾ اور نہیں ہے ظالموں کے لیے کوئی مددگار ﴿رَبَّنَآ اِنَّنَا سَمِعْنَا﴾ اے ہمارے پروردگار! بے شک ہم نے سن لیا ﴿مُنَادِیًا﴾ پکارنے والے کو ﴿یُّنَادِیْ لِلْاِیْمَانِ﴾ جو پکارتا تھا ایمان کے لیے ﴿اَنْ اٰمِنُوْا بِرَبِّكُمْ﴾ یہ کہ ایمان لاؤ اپنے رب پر۔ ﴿فَاٰمَنَّا﴾ اے ہمارے رب! پس ہم ایمان لے آئے۔ منادی کون ہے؟ قرآن پاک کے نزول کے وقت سب سے بڑے منادی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لوگوں کو ایمان کی دعوت دی۔ پھر صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین، پھر تابعین اور تبع تابعین رحمہم اللہ علیہم منادی تھے۔ اور اب میں تمھارے لیے منادی ہوں میں تمھیں دعوت دیتا ہوں کہ ﴿اَنْ اٰمِنُوْا بِرَبِّكُمْ﴾ یہ کہ ایمان لاؤ اپنے رب پر۔ ہر مبلغ جو لوگوں کو قرآن کریم سناتا ہے اور دعوت دیتا ہے وہ منادی ہے اور اس میں شامل ہے۔ قرآن خود بھی منادی ہے اس کو بیان کرنے والا بھی منادی ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے جو عقل اور سمجھ عطاء فرمائی ہے وہ بھی منادی ہے۔

﴿رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا﴾ اے ہمارے پروردگار! پس معاف کر دے ہمارے صغیرہ گناہ ﴿وَ كَفِّرْ عَنَّا سَيِّاٰتِنَا﴾ اور مٹا دے ہمارے کبیرہ گناہ۔ یعنی چھوٹے بڑے سارے گناہ معاف فرما دے۔ کیوں کہ ہم سے صغیرہ بھی ہوتے ہیں اور کبیرہ بھی۔ ہم تو گناہوں کی پٹیاں ہیں تو معاف فرما دے۔ ﴿وَ تَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ﴾ اور ہمیں وفات دے نیک لوگوں کے ساتھ۔ انھی کے ساتھ ہمیں بیٹھنا نصیب ہو، انھی میں وفات ہو اور ان ہی میں ہمارا شمار ہو۔ اللہ تعالیٰ کے نیک بندے یہ دعائیں کرتے ہیں ﴿رَبَّنَا وَ اٰتِنَا﴾ اے ہمارے رب! دے ہمیں ﴿مَا وَعَدْتَّنَا﴾ وہ چیز جس کا وعدہ کیا ہے تو نے ہم سے ﴿عَلٰی رُسُلِكَ﴾ اپنے رسولوں کی زبانوں پر۔ اور ان کے ساتھ تیرا یہ وعدہ ہے کہ جو تجھ پر ایمان لائے گا تو اُسے جنت میں داخل کرے گا۔

حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک تمام پیغمبروں نے یہی سبق دیا ہے کہ ایمان کا صلہ جنت ہے۔ اور اگر کفر شرک اور بدی کرو گے تو جہنم میں جلو گے۔ اے پروردگار! تو سچا، تیرے پیغمبر سچے، تیرا وعدہ سچا، تو ہمیں قبر میں راحت نصیب فرما ﴿وَ لَا تُخْزِنَا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ﴾ اور نہ رسوا کرنا ہمیں قیامت والے دن۔ میدانِ حشر میں ہم ذلیل نہ ہوں۔ پل صراط سے ہم سیدھے گزر کر جنت میں پہنچ جائیں۔ سب سے زیادہ ذلت اور رسوائی قیامت کے دن کی ہے۔ اس کے مقابلے میں دنیا کی ذلت کوئی شے نہیں ہے۔ مگر آدمی دنیا کی ذلت سے بچنے کی تو کوشش کرتا ہے مگر آخرت کی ذلت سے بچنے کی کوشش نہیں کرتا۔ جب کہ دنیا کے امتحان آخرت کے مقابلے میں بچوں کے کھیل کی حیثیت بھی نہیں رکھتے۔

اے پروردگار! ہمیں دونوں امتحانوں میں کامیاب فرما ﴿اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيْعَادَ﴾ بے شک تو وعدے کے خلاف نہیں کرتا۔ رب تعالیٰ نے عقل مندوں کے اوصاف اور ان کی نشانیاں بیان فرمائی ہیں کہ وہ یہ یہ کام کرتے ہیں اور یہ یہ دعائیں کرتے ہیں۔ تو جو آدمی یہ کام نہیں کرے گا اور یہ دعائیں نہیں کرے گا وہ عقل مند نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں عقل مند بننے کی توفیق عطاء فرمائے اور ہمیں عقل مند بنائے۔ (آمین)

﴿فَاسْتَجَابَ لَهُمْ﴾ پس قبول کرلیں ان کی دعائیں ﴿رَبُّهُمْ﴾ ان کے رب نے (یہ فرماتے ہوئے) ﴿اَنِّیْ لَاۤ اُضِیْعُ﴾ بے شک میں ضائع نہیں کرتا ﴿عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ﴾ کسی کام کرنے والے کا کام تم میں سے ﴿مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى﴾ مرد ہو یا عورت ﴿بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ﴾ بعض تمھارے بعض سے ہیں ﴿فَالَّذِیْنَ هَاجَرُوْا﴾ پس وہ لوگ جنھوں نے ہجرت کی ﴿وَاُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِهِمْ﴾ اور نکالے گئے اپنے گھروں سے ﴿وَاُوْذُوْا فِیْ سَبِیْلِیْ﴾ اور ان کو اذیت دی گئی میرے راستے میں ﴿وَقٰتَلُوْا﴾ اور وہ (اللہ تعالیٰ کے راستے میں) لڑے ﴿وَقُتِلُوْا﴾ اور قتل کیے گئے ﴿لَاُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ﴾ البتہ ضرور مٹا دوں گا میں ان سے ﴿سَیِّاٰتِهِمْ﴾ ان کی برائیاں ﴿وَلَاُدْخِلَنَّهُمْ جَنّٰتٍ﴾ اور البتہ میں ان کو ضرور داخل کروں گا ایسے باغوں میں ﴿تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ﴾ کہ بہتی ہوں گی ان کے نیچے نہریں ﴿ثَوَابًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ﴾ یہ بدلا ہوگا اللہ تعالیٰ کی طرف سے ﴿وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ﴾ اور اللہ تعالیٰ کے پاس ﴿حُسْنُ الثَّوَابِ﴾ بہت اچھا بدلا ہے ﴿لَا یَغُرَّنَّكَ﴾ ہرگز نہ دھوکے میں ڈالے تجھے ﴿تَقَلُّبُ الَّذِیْنَ﴾ ان لوگوں کا چلنا پھرنا ﴿كَفَرُوْا﴾ جو کافر ہیں ﴿فِی الْبِلَادِ﴾ شہروں میں ﴿مَتَاعٌ قَلِیْلٌ﴾ (ان کے لیے) فائدہ ہے بہت تھوڑا ﴿ثُمَّ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ﴾ پھر ان کا ٹھکانا دوزخ ہے ﴿وَبِئْسَ الْمِهَادُ﴾ اور برا ٹھکانا ہے ﴿لٰكِنِ الَّذِیْنَ﴾ لیکن وہ لوگ ﴿اتَّقَوْا رَبَّهُمْ﴾ جو اپنے رب سے ڈرتے رہے ﴿لَهُمْ جَنّٰتٌ﴾ ان کے لیے باغات ہوں گے ﴿تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ﴾ بہتی ہوں گی ان کے نیچے نہریں ﴿خٰلِدِیْنَ فِیْهَا﴾ ہمیشہ انھی میں رہیں گے ﴿نُزُلًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ﴾ مہمانی ہوگی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ﴿وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ﴾ اور وہ چیز جو اللہ تعالیٰ کے پاس ہے ﴿خَیْرٌ لِّلْاَبْرَارِ﴾ بہتر ہے نیک لوگوں کے لیے ﴿وَاِنَّ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ﴾ اور بے شک اہلِ کتاب میں سے بعض ﴿لَمَنْ یُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ﴾ البتہ وہ ہیں جو اللہ تعالیٰ پر ایمان لاتے ہیں ﴿وَمَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْكُمْ﴾ اور اس چیز پر بھی ایمان لاتے ہیں جو آپ کی طرف نازل کی گئی ﴿وَمَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْهِمْ﴾ اور اس چیز پر بھی ایمان لاتے ہیں جو ان کی طرف نازل کی گئی ﴿خٰشِعِیْنَ لِلّٰهِ﴾ وہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہیں ﴿لَا یَشْتَرُوْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ﴾ وہ نہیں خریدتے اللہ تعالیٰ کی آیتوں کے بدلے میں ﴿ثَمَنًا قَلِیْلًا﴾ تھوڑی قیمت ﴿اُولٰٓىِٕكَ لَهُمْ اَجْرُهُمْ﴾ یہی لوگ ہیں ان کے واسطے اجر ہے ان کا ﴿عِنْدَ رَبِّهِمْ﴾ ان کے رب کے پاس ﴿اِنَّ اللّٰهَ سَرِیْعُ الْحِسَابِ﴾ بے شک اللہ تعالیٰ جلدی حساب لینے والا ہے ﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا﴾ اے وہ لوگو! جو ایمان لائے ہو ﴿اصْبِرُوْا﴾ صبر کرو ﴿وَصَابِرُوْا﴾ اور حق پر ڈٹ جاؤ ﴿وَرَابِطُوْا﴾ اور اپنی سرحدوں کو محفوظ رکھو ﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ﴾ اور اللہ تعالیٰ سے ڈرو ﴿لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ﴾

تاکہ تم کامیابی حاصل کرو۔

اللہ تعالیٰ کا قانونِ جزا مرد و عورت کے لیے برابر ہے:

اس رکوع کے پہلے حصے میں عقل مندوں کا ذکر تھا کہ وہ یہ یہ کام کرتے ہیں۔اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے ہیں کھڑے ہوں، بیٹھے ہوں، لیٹے ہوں۔اور آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں غور وفکر کرتے ہیں اور کہتے ہیں ﴿رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا﴾ کہ ان چیزوں کو تو نے فضول اور بے فائدہ پیدا نہیں کیا۔پھر آگے ان کی دعاؤں کا ذکر ہے کہ اے پروردگار! ہمارے صغیرہ اور کبیرہ گناہ معاف فرمادے اور ہمیں نیک لوگوں کے ساتھ وفات دے۔اے پروردگار ہمارے اور دے دے ہمیں جو تو نے وعدہ کیا ہے ہم سے اپنے رسولوں کی زبان پر اور نہ رسوا کر تو ہمیں قیامت والے دن بے شک تو وعدے کے خلاف نہیں کرتا۔یعنی جو وعدہ فرمایا ہے اس کو پورا فرما۔

آج کی آیتِ کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے ان دعاؤں کی قبولیت کی خوش خبری دی ہے۔اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ﴿فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ﴾ پس قبول کرلیں ان کی دعائیں ان کے رب نے یہ فرماتے ہوئے ﴿اَنِّيْ لَاۤ اُضِيْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ﴾ بے شک میں ضائع نہیں کرتا کسی کام کرنے والے کا کام تم میں سے۔نیکی کا عمل صحیح ہو یعنی قاعدے کے مطابق ہو اللہ تعالیٰ اس کو ضائع نہیں فرماتے ﴿مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى﴾ نیکی کرنے والا نر ہو یا مادہ ہو یعنی مرد ہو یا عورت ہو ﴿بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ﴾ بعض تمھارے بعض سے ہیں۔تم مرد عورتیں ایک دوسرے سے پیدا ہوئے ہو۔عورتوں سے مرد اور مردوں سے عورتیں۔اور یہ سلسلہ اللہ تعالیٰ نے قیامت تک چلانا ہے۔نہ مرد ہونے کی وجہ سے نیکی میں کمی آئے گی نہ عورت ہونے کی وجہ سے۔

﴿فَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا﴾ پس وہ لوگ جنھوں نے اللہ تعالیٰ کے راستے میں ہجرت کی۔دین کی حفاظت کے لیے، ایمان کی حفاظت کے لیے ﴿وَاُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ﴾ اور نکالے گئے اپنے گھروں سے۔بعض اوقات اہلِ ایمان کافروں کی ایذا رسانیوں سے تنگ آکر اپنا وطن چھوڑنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کیوں کہ اللہ تعالیٰ کا نام نہیں لے سکتے۔اور کافروں کو جب بھی موقع ملا ہے انھوں نے مسلمانوں کو ستانے میں کمی نہیں کی اور ان کو وہاں سے نکالا ہے۔

اس وقت برما میں مسلمانوں پر بڑا ظلم ہو رہا ہے۔اگرچہ برما میں مسلمانوں کی تعداد خاصی ہے مگر صحیح معنی میں مسلمان کم ہیں بھرتی زیادہ ہے۔وہاں بدھ مذہب کے لوگ ان کو کلمہ پڑھنے سے روکتے ہیں اور اپنے ساتھ مسلمان لڑکیوں کا نکاح کرنے پر مجبور کرتے ہیں کہ مسلمان ان کو اپنی لڑکیوں کا رشتہ دیں۔نمازیں پڑھنے سے بھی روکتے ہیں۔کچھ بے چارے بھاگ کر بنگلہ دیش چلے گئے ہیں اور کچھ وہیں مصیبتیں جھیل رہے ہیں۔اور دوسرے ملکوں کے مسلمان بے غیرت بنے ہوئے ہیں، خصوصاً حکمران، اور اپنے فرض کو ادا نہیں کر رہے۔کیوں کہ فقہائے کرام رحمہم اللہ نے یہ بیان فرمایا ہے:

اِمْرَاَةٌ سُبِيَتْ بِالْمَشْرِقِ وَجَبَ عَلٰى اَهْلِ مَغْرِبِ اَنْ يُّخَلِّصُوْهُ.

"اگر کوئی مسلمان عورت مشرق کے کونے میں کافروں کے ہاتھ قید ہو جائے تو مغرب کی طرف تمام رہنے والوں پر واجب ہے کہ اس کی مدد کریں اور اس کو رہا کرائیں۔"

اور آج ہمارے پڑوس کشمیر، افغانستان، بوسنیا، برما میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ سب کے سامنے ہے۔ مگر اس وقت مسلمانوں سے بڑا بے غیرت کوئی نہیں ہے۔ خصوصاً مسلمانوں کا حکمران طبقہ جہاں کہیں بھی ہے بڑا بے غیرت ہے۔ اور اتنے بے غیرت ہیں کہ آواز تک بلند کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ اپنا کوئی نقصان ہو تو چیختے چلاتے ہیں اور دوسرے مسلمانوں کے لیے اتنی آواز بھی نہیں نکال سکتے کہ اے ظالمو! ان مظلوموں پر ظلم نہ کرو۔ اس وقت برما میں بہت ظلم ہو رہا ہے مگر کوئی ان کی خبر لینے والا نہیں ہے۔

تو فرمایا جنھوں نے ہجرت کی اور اپنے گھروں سے نکالے گئے ﴿وَاُوْذُوْا فِيْ سَبِيْلِيْ﴾ اور ان کو اذیت دی گئی میرے راستے میں ﴿وَقٰتَلُوْا﴾ اور وہ اللہ تعالیٰ کے راستے میں لڑے ﴿وَقُتِلُوْا﴾ اور قتل کیے گئے۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ﴿لَاُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ﴾ البتہ ضرور مٹادوں گا میں ان سے ان کی بُرائیاں۔ یعنی میں ان کی خطائیں معاف کر دوں گا ﴿وَلَاُدْخِلَنَّهُمْ جَنّٰتٍ﴾ اور البتہ میں ان کو ضرور داخل کروں گا ایسے باغوں میں ﴿تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ﴾ کہ بہتی ہوں گی ان کے نیچے نہریں ﴿ثَوَابًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ﴾ یہ بدلا ہوگا اللہ تعالیٰ کی طرف سے ﴿وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الثَّوَابِ﴾ اور اللہ تعالیٰ کے پاس بہت اچھا بدلا ہے اور اس کے خزانے بڑے وسیع ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے خزانوں کی وسعت

حدیث پاک میں آتا ہے کہ جب سے اللہ تعالیٰ نے یہ کائنات پیدا فرمائی ہے اس وقت سے لے کر اس کے فنا ہونے تک اس میں جتنی مخلوقات آئی ہیں یا آئیں گی کیا انسان، کیا جنات، کیا کیڑے مکوڑے، کیا سمندری مخلوق اور کیا خشکی کی مخلوق، اللہ تعالیٰ ان پر خرچ کر رہا ہے۔ اس کے خزانوں میں اتنی بھی کمی نہیں آئی کہ تم سوئی سمندر میں ڈبو کے نکالو جتنا پانی اس کے ساتھ لگتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سمجھانے کے لیے فرمایا کہ جس طرح سوئی کے ذریعے سمندر کے پانی میں کمی نہیں آتی اسی طرح رب تعالیٰ کے خزانوں میں بھی کمی نہیں آسکتی۔

اور ایک حدیث پاک میں اس طرح آتا ہے: ((لَوْ اَنَّ اَوَّلَكُمْ وَاٰخِرَكُمْ وَجِنَّكُمْ وَاِنْسَكُمْ وَرَطْبَكُمْ وَيَابِسَكُمْ)) "اگر تمھارے اول سے لے کر آخر تک یعنی جو مر گئے ہیں یا موجود ہیں یا آئندہ آنے والے ہیں کیا انسان، کیا جنات یا خشکی کی مخلوق اور کیا سمندری مخلوق، کیا پہاڑوں میں رہنے والے یا میدانوں اور غاروں میں رہنے والے، یہ سارے ایک میدان میں جمع ہو جائیں اور اپنی اپنی خواہش کے مطابق رب تعالیٰ سے مانگیں یعنی جو جس کے دل میں آتا ہے وہ مانگے اور اللہ تعالیٰ ان کو ان کے مانگنے کے مطابق دے دے تو اس کے خزانوں میں اتنی کمی بھی نہیں آتی کہ سوئی سمندر میں ڈبو کر نکالو تو جتنا

اس کے ساتھ پانی لگتا ہے۔" تو اس کے خزانے بڑے وسیع ہیں اور اس کے پاس اچھا بدلا ہے۔

کفار کا مسلمانوں کو دھوکے میں ڈالنا

کافر سادہ لوح مسلمانوں کو دھوکے میں ڈالنے کے لیے کہتے کہ تم کہتے ہو کہ ہم رب تعالیٰ کے پیارے ہیں۔ اپنے کپڑے دیکھو پھٹے پرانے ہیں۔ کسی کو جوتا نصیب نہیں ہے، کسی کے سر پر پگڑی نہیں ہے۔ کئی کئی دن تم فاقوں میں گزارتے ہو، رہنے کے لیے تمھارے پاس معقول جگہ کوئی نہیں چھپروں میں گزارہ کرتے ہو۔ پھر بھی کہتے ہو کہ رب ہم پر راضی ہے۔ کس طرح راضی ہے؟ اگر راضی ہوتا تو تمھیں دولت دیتا، دنیا کی ضروریات تمھیں عطاء کرتا۔ اور ہمیں کہتے ہو کہ رب تم سے ناراض ہے۔ حالاں کہ ہمارے پاس کوٹھیاں ہیں، باغات ہیں، کارخانے ہیں، زمینیں ہیں، دولت ہے۔ اگر رب ہم سے ناراض ہوتا تو یہ چیزیں ہمیں کیوں دیتا۔ عوام کی اکثریت سطحی ہوتی ہے۔ جن کا کلمہ ایمان مضبوط نہیں ہوتا۔ وہ ایسے شبہات کا شکار ہو جاتے ہیں۔ حالاں کہ حقیقت یہ ہے کہ جن کو اللہ تعالیٰ نے دنیا کی نعمتیں دی ہیں وہ سارے پسندیدہ لوگ نہیں ہیں۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ﴿لَا يَغُرَّنَّكَ تَقَلُّبُ الَّذِيْنَ﴾ ہرگز نہ دھوکے میں ڈالے تجھے ان لوگوں کا چلنا پھرنا ﴿كَفَرُوْا فِي الْبِلَادِ﴾ جو کافر ہیں شہروں میں۔ یعنی کافروں کا ٹھاٹھ باٹھ سے شہروں میں چلنا پھرنا تجھے دھوکے میں نہ ڈالے کہ تم دیکھتے ہو وہ گاڑی پر جا رہے ہیں، کبھی سکوٹر پر، کبھی جہاز پر۔ فرمایا اس سے بالکل دھوکے میں نہ پڑنا کیوں کہ ﴿مَتَاعٌ قَلِيْلٌ﴾ ان کے لیے فائدہ ہے بہت تھوڑا۔ کتنے دن کھا پی لیں گے۔ دس دن، مہینہ، سال، دس سال، پچاس سال، سو سال۔ چند دن کی بہار ہے آخر موت ہے۔ آنکھیں بند ہونے کی دیر ہے معلوم ہو جائے گا راحت کس چیز کا نام ہے اور تکلیف کس چیز کا نام ہے۔ چند دن کی عیش کو انھوں نے رب تعالیٰ کی رضا سمجھ لیا ہے۔ ﴿ثُمَّ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ﴾ پھر ان کا ٹھکانا دوزخ ہے ﴿وَبِئْسَ الْمِهَادُ﴾ اور بُرا ہے ٹھکانا۔ اللہ تعالیٰ تمام مومنین اور مومنات، مسلمین اور مسلمات کو دوزخ کی آگ سے بچائے۔

﴿لٰكِنِ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ﴾ لیکن وہ لوگ جو اپنے رب سے ڈرتے رہے۔ چاہے ان کے کپڑے پھٹے پرانے ہیں، جوتیوں سے محروم ہیں، ٹوپی پگڑیوں سے محروم ہیں، ظاہری زیبائش اور آرائش سے محروم ہیں ﴿لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ﴾ ان کے لیے باغات ہوں گے بہتی ہوں گی ان کے نیچے نہریں ﴿خٰلِدِيْنَ فِيْهَا﴾ ہمیشہ اُنھی میں رہیں گے ﴿نُزُلًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ﴾ مہمانی ہوگی اللہ تعالیٰ کی طرف سے۔

لہٰذا ان چیزوں کو دیکھ کر دھوکے میں نہ پڑو اور نہ کسی کو دھوکے میں ڈالو اور یاد رکھو! ﴿وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ لِّلْاَبْرَارِ﴾ اور وہ چیز جو اللہ تعالیٰ کے پاس ہے بہتر ہے نیک لوگوں کے لیے۔ کیوں کہ وہ پائیدار ہے اور وہاں کی زندگی دنیا کی زندگی سے بہتر ہے۔ لہٰذا تم اپنی غربت پر افسوس نہ کرو اور ناداری پر پشیمان نہ ہو۔ آخرت کو سامنے رکھ کر اپنا تعلق اللہ تعالیٰ کے ساتھ جوڑ کر رکھو۔ رب تعالیٰ کی رحمت کو نہ بھولو۔

سارے اہلِ کتاب برابر نہیں

قرآن پاک کی یہ خوبی ہے کہ اگر کسی قوم کی خرابیوں کو بیان کرتا ہے تو ان کی خوبیوں کو بھی بیان کرتا ہے اگر ان میں خوبیاں ہوں۔ چنانچہ مسلسل کئی رکوعوں سے یہود و نصاریٰ کی تردید ہو رہی تھی۔ لہٰذا اس سے ذہن میں یہ بات آتی تھی کہ سارے اہلِ کتاب بُرے تھے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ایسی بات نہیں ہے ﴿وَاِنَّ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ﴾ اور بے شک اہلِ کتاب میں سے بعض ﴿لَمَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ﴾ البتہ وہ ہیں جو اللہ تعالیٰ پر صحیح معنیٰ میں ایمان لاتے ہیں ﴿وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ﴾ اور اس چیز پر بھی ایمان لاتے ہیں جو آپ کی طرف نازل کی گئی۔ کیوں کہ آخری کتاب اور آخری پیغمبر کا ان کی کتابوں میں ذکر تھا کہ نبی آخر الزمان آئیں گے اور اللہ تعالیٰ اپنا کلام ان کے منہ میں ڈالیں گے۔ چنانچہ قرآن پاک میں آتا ہے ﴿الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ﴾ [الاعراف: ۱۵۷] "وہ ہے جو پاتے ہیں اس پیغمبر کو لکھا ہوا اپنے پاس تورات اور انجیل میں۔" ایسے لوگ خاصی تعداد میں تھے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تو وہ مانتے تھے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے پیغمبر ہیں اور ان پر ایمان لانا چاہیے اور ایمان لائے بھی۔ جیسے:

حضرت عبداللہ بن سلام، حضرت ثعلبہ، حضرت اسد، حضرت اسید، حضرت بنیامین، رضوان اللہ علیہم اجمعین۔ یہ سارے پہلے یہودی تھے پھر مسلمان ہو گئے۔ اور نصاریٰ میں سے حضرت عدی بن حاتم، حضرت عدی بن بدرح، حضرت سلمان فارسی، حضرت تمیم داری، رضوان اللہ علیہم اجمعین۔ یہ سارے پہلے عیسائی تھے پھر مسلمان ہو گئے اور نیک بختی اور سعادت کا ثبوت دیا۔

﴿وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ﴾ اور اس چیز پر بھی ایمان لاتے ہیں جو ان کی طرف نازل کی گئی۔ جب وہ مسلمان نہیں ہوئے تھے تورات، انجیل پر ایمان رکھتے تھے اور یہ جو ایمان لائے ہیں ﴿خٰشِعِيْنَ لِلّٰهِ﴾ وہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہیں ﴿لَا يَشْتَرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ﴾ وہ نہیں خریدتے اللہ تعالیٰ کی آیتوں کے بدلے میں ﴿ثَمَنًا قَلِيْلًا﴾ تھوڑی قیمت۔ اور یاد رکھنا! دنیا و مافیہا سب قلیل ہے۔

ترمذی شریف کی روایت آپ کئی مرتبہ سن چکے ہو کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں دنیا و مافیہا کی قدر مچھر کے پَر کے برابر بھی ہوں تو کافر کو ایک گھونٹ پانی کا بھی نہ دیتا۔ تو یہ نہ سمجھ لینا کہ ثمن قلیل لینا تو صحیح نہیں ہے اور اگر بڑا گھپلا مار لیں تو صحیح ہو جائے گا۔ تو ساری دنیا بھی ثمنِ قلیل ہے۔ ﴿اُولٰٓئِكَ لَهُمْ اَجْرُهُمْ﴾ یہی لوگ ہیں ان کے واسطے اجر ہے ان کا ﴿عِنْدَ رَبِّهِمْ﴾ ان کے رب کے پاس ﴿اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ﴾ بے شک اللہ تعالیٰ جلدی حساب لینے والا ہے۔ آنکھیں بند ہونے کی دیر ہے حساب کتاب شروع ہو جائے گا۔

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا﴾ اے وہ لوگو! جو ایمان لائے ہو ﴿اصْبِرُوْا﴾ صبر کرو عبادات پر، تکالیف پر۔ جو حق بات کہنے کے جواب میں آئیں یا ویسے آئیں ﴿وَصَابِرُوْا﴾ اور حق پر ڈٹ جاؤ اور عبادت کے ادا کرنے پر ڈٹ جاؤ۔ ایسا نہیں کہ کبھی ادا

کرو اور کبھی ادا نہ کرو۔ اللہ تعالیٰ کی عبادات میں کمی نہیں آنی چاہیے، ناغہ نہیں ہونا چاہیے۔ اور حق پر بھی ڈٹے رہو ﴿وَرَابِطُوا﴾ اور اپنی سرحدوں کو محفوظ رکھو۔ ملکی سرحدوں کو بھی پختہ بناؤ اور نظریاتی سرحدوں کو بھی پختہ بناؤ۔

مُرَابَطَۃ کا معنیٰ ہے سرحد کو پختہ بنانا۔ تو دونوں سرحدیں مراد ہیں۔ ملکی بھی کہ کافر تمھیں کسی قسم کا نقصان نہ پہنچائیں اور مذہبی سرحدوں کو بھی پختہ بناؤ کہ جو تمھیں عقائد بتائے جاتے ہیں اور باطل فرقوں کی تردید کی جاتی ہے یہ اسی مد میں ہیں کہ اسلام کی سرحدیں سمجھ لو۔ کافر، کافر ہیں، مومن، مومن ہیں۔ توحید، توحید ہے او شرک، شرک ہے سنت، سنت ہے اور بدعت، بدعت ہے۔ ان ساری چیزوں کو سمجھو اور اسلام کی سرحدوں کو پختہ بناؤ تاکہ کوئی کافر، مشرک، بے دین تمھیں نقصان نہ پہنچا سکے۔

﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ﴾ اور اللہ تعالیٰ سے ڈرو۔ یہ کام کرو گے تو پھر ﴿لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ﴾ تاکہ تم کامیابی حاصل کرو۔ تمھاری کامیابی ان چیزوں پر موقوف ہے جو رب تعالیٰ نے بیان فرمائی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ان پر قائم رہنے کی توفیق عطاء فرمائے۔ آمین

آج ۲۲رشوال ۱۴۲۳ھ بمطابق ۲۷ردسمبر ۲۰۰۲ء سورۃ آلِ عمران مکمل ہوئی۔

والحمد للہ علیٰ ذالک

(مولانا) محمد نواز بلوچ

مہتمم: مدرسہ ریحان المدارس، جناح روڈ، گوجرانوالا

ناشر
لقمان اللہ میر برادران
سیٹلائٹ ٹاؤن گوجرانوالہ
0321 8741292